اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ ھُمُ الَّذِیْنَ نَظَرُوْا اِلٰی بَاطِنِ الدُّنْیَا اِذَا نَظَرَ النَّاسُ اِلٰی ظَاھِرِھَا

حضرت علی

ترجمہ

اولیاء اللہ وہ ہیں جو دُنیا کے باطن کو اُس وقت دیکھتے ہیں جب عام لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں۔

حُجّۃ الاسلام حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

کی

مشہورِ عالم تصنیف

کیمیائے سعادت

کا

آسان، سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ

بہ ترتیب و تہذیب جدید

نائب نقوی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز

لاہور ——— پشاور ——— حیدرآباد ——— کراچی

اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ ھُمُ الَّذِیْنَ نَظَرُوْا اِلٰی بَاطِنِ الدُّنْیَا اِذَا نَظَرَ النَّاسُ اِلٰی ظَاھِرِھَا
حضرت علی

ترجمہ

اولیاء اللہ وہ ہیں جو دُنیا کے باطن کو اُس وقت دیکھتے ہیں جب عام لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں:

حُجّۃ الاسلام حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ

کی

مشہورِ عالم تصنیف

کیمیائے سعادت

کا

آسان، سلیس اور بامُحاورہ اُردُو ترجمہ

بہ ترتیب و تہذیب جدید

نائب نقوی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز

لاہور ــــ پشاور ــــ حیدرآباد ــــ کراچی

کیمیائے سعادت

کے

موجودہ ترجمے

کے متعلق "عصر حاضر کے" ممتاز اخبارات کی رائیں، مختصر طور پر" پیش کی جا رہی ہیں جس سے برادرانِ اسلام کو ہمارے ترجمے کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے گا۔

یوں تو بہت سے اخبارات نے تبصرے شائع کئے ہیں۔ مگر ہم چند تبصروں کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

ماہنامہ استقلال رنگون۔ ستمبر ۱۹۵۹ء

حضرت امام غزالیؒ کی یہ مشہور عالم کتاب کا نیا ترجمہ ہے، جو پاکستان کے عظیم پبلشر شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کرایا ہے۔ بلکہ اس کتاب کو ترجمہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اسے یوں کہنا چاہیئے کہ کیمیائے سعادت کا اردو ایڈیشن ہے۔ اگر حضرت امام غزالیؒ کی فارسی کتاب کا اردو ایڈیشن جدید دَور کے معیار کے مطابق شائع ہوتا تو وہ اس قسم کا ہوتا۔ کتاب کے مترجم نقوی صاحب نے آسانی کے لئے کتاب کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں چار باب ہیں جس میں معرفت النفس، معرفت اللہ، معرفت عالم اور معرفت آخرت کے عنوانات ہیں۔ حصہ دوم میں اسلام کے چار ارکان سے بحث کی گئی ہے۔ حصہ سوم معاملاتِ حقوق سے متعلق ہے۔

چوتھے حصے میں مہلکات" یعنی وہ عادتیں جو انسان کے لئے تباہ کن ہیں۔ پانچویں حصے میں ان اعمال کا ذکر ہے، جو نجات کا باعث ہیں۔

ترجمے کی زبان صاف اور شگفتہ ہے۔ اپنے مقدمہ میں مترجم نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ اس سے پہلے جتنے تراجم تھے، ان میں سے اگر کسی ایک کی تلاش کرنی ہو، تو پوری کتاب پڑھ جانے پر بھی بمشکل مل سکے گی۔ موجودہ ترتیب و تہذیب نے کتاب کو سمجھنا اور آسان کر دیا ہے۔

برما میں جو لوگ دین کو اردو کے ذریعے سمجھتے اور پڑھتے ہیں انہیں پانچویں صدی ہجری کی یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔

نوائے وقت۔ ۲۴ مئی ۱۹۵۹ء

کیمیائے سعادت حضرت امام غزالیؒ کی شہرۂ آفاق

تصنیف ہے جس کے اب تک کئی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ مگر نائب نقوی صاحب نے اسے ایک نئے انداز سے مُرتّب کیا ہے اور شیخ غلام علی اینڈ سنز نے بڑے آب و تاب سے شائع کیا ہے۔

"کیمیائے سعادت" میں دریا کو گویا کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ بقول مترجم کیمیائے سعادت یُوں بظاہر تو تصوّف کی ایک کتاب ہے لیکن اس میں دُنیا کے تمام و معارف یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ سینکڑوں احادیث، اولیاء اللہ کے سینکڑوں واقعات اور حالاتِ زندگی، اسلام والوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔

کیمیائے سعادت میں اِسلام کے چار ارکان پر بحث کی گئی ہے اور ان ارکان میں ہر ایک کے دس دس اصول اور ان اصول کی تفصیلات مع دلائل و براہین پیش کی گئی ہیں۔

مترجم نے نہ صرف ترجمہ عام فہم، آسان اور بامحاورہ کیا ہے، بلکہ کتاب کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ مسائل تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

امروز - ۲۴ مئی ۱۹۵۹ء

یہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف ہے۔ جسے "نائب نقوی" نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔

یہ بلند پایہ تصنیف کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اسے امام صاحب کی تصانیف میں ہمیشہ بڑی اہم حیثیت دی گئی ہے۔ اور ایک زمانے میں یہ خاصی لمبی بحث کا موضوع بھی بن چکی ہے۔ اِس کتاب میں چار موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے (۱) اِنسان کی اپنی معرفت۔ (۲) معرفتِ پروردگار (۳) معرفتِ دُنیا (۴) معرفت قیامت و آخرت۔

کیمیائے سعادت کو غالباً پہلی مرتبہ اُردو کا جامہ پہنایا گیا ہے، یا کوئی ترجمہ اس سے پہلے ہو چکا ہے تو وہ مقبُول نہیں ہوا۔ بہر حال نائب نقوی نے اِس پر خاصی محنت کی اور اس کی ترتیب میں اس امر کا خیال رکھا ہے۔ کہ قاری کو پڑھنے یا کسی ایک مسئلے کو تلاش کرنے میں دِقّت نہ ہو۔

جنگ کراچی - ۲۴ مئی ۱۹۵۹ء

کیمیائے سعادت کا اُردو ترجمہ پہلی بار نہیں ہوا بلکہ پہلے بھی اِسے تین بار اُردو میں منتقل کیا جا چکا ہے۔ یہ اس کا چوتھا ترجمہ ہے، جو نائب نقوی نے کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مترجم نے ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے، جس میں اُنہوں نے اِس کتاب کی اہمیت، اور خود امام غزالیؒ کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے مختلف ابواب کے ضمنی عنوانات قائم کر کے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ رواں ہے اور مترجم نے بڑی محنت اور کاوشش سے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کی مذہبی اور دقیق کتابوں کا ترجمہ بھی ثقیل کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کتاب کے مترجم نے اس روش سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب بڑے سائز پر چھپی ہے۔ جس میں ۷۶۲ صفحات ہیں اور قیمت ۱۲ روپے ہے۔ یہ کتاب شیخ غلام علی اینڈ سنز

کشمیری بازار لاہور / بندر روڈ کراچی نے شائع کی ہے۔

نئی روشنی کراچی - ۲۵ر جولائی ۱۹۵۹ء

کیمیائے سعادت کے اب تک چار متراجم شائع ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے تو بمبئی کے ایک ناشر نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ دوسرا لکھنؤ سے نول کشور نے شائع کیا۔ تیسرا لاہور سے ملک دین محمدؐ نے شائع کیا اور زیر تبصرہ ترجمہ شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیا ہے۔ جسے جناب نائب نقوی نے ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ آپ نول کشور بک ڈپو کے جانشین تیج کمار بک ڈپو لکھنو سے وابستہ تھے۔ اس لئے آپ دوسرے ترجمہ میں تو دخل رکھتے تھے لیکن اپنی قدیم روش کو آپ بدل نہ سکتے تھے، جو نصف صدی قدیم تھی۔ اس لئے آپ نے حسبِ خواہش یہ ترجمہ تحریر فرمایا۔

نقوی صاحب نے تین قدیم ترجموں کی روش ترک کر کے کتاب کو مختلف ابواب و حصص میں تقسیم کر دیا ہے جس سے ہر قاری کو یہ آسانی و سہولت حاصل ہو گئی ہے کہ کوئی باب یا خاص موضوع وہ کسی وقت بھی مطالعہ کر سکتا ہے۔ اور ایک ایک ورق الٹنے کی دقت سے بچ جاتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت، بڑی الجھن یہ ہوتی ہے کہ کہیں مصنف کے کسی خیال سے انحراف نہ ہو جائے یا زبان اتنی ادق نہ ہو جائے کہ کم فہم سے بالاتر ہو۔ لیکن فاضل مترجم نے بہت خوبی سے سلیس زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے فرض کو بطریق احسن قرار دیا ہے۔

نام کتاب :- کیمیائے سعادت
مصنف :- حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ
مترجم اور مرتب :- نائب نقوی
صفحات :- ۷۶۲ بڑی تقطیع
کتابت وطباعت :- عمدہ
قیمت :- بارہ روپے
ناشر :- شیخ غلام علی اینڈ سنز
کشمیری بازار لاہور۔ بندر روڈ کراچی

لیل و نہار لاہور - ۲۱ر جون ۱۹۵۹ء

حضرت امام غزالیؒ کی مشہور عالم تصنیف 'کیمیائے سعادت' کا اردو ترجمہ نائب نقوی نے پیش کیا ہے۔ غالباً یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ زیر نظر کتاب کے متعدد تراجم پہلے بھی شائع ہو کر اسلامی شعائر کی تبلیغ و اشاعت کا وسیلہ بن چکے ہیں۔

کیمیائے سعادت کے اب تک جو تراجم شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلا نسخہ بمبئی سے، دوسرا لکھنؤ کے ادارہ نول کشور سے، اور تیسرا ملک دین محمد پبلشر لاہور کی جانب سے مرتب ہوا۔ ترتیب ان نسخوں کی وہی پرانی وضع پر رہی۔ یعنی عبارت کا از اول تا آخر تسلسل" جس میں کسی خاص مسئلہ کی تلاش دشوار اور دور از کار ہوا کرتی ہے۔ جناب مترجم نے زیرِ نظر ترجمے میں اول عبارت کی روانی پر بطور خاص توجہ کی ہے۔ دوم ذرا سی ذاتی" مداخلت سے کام لے کر مختلف ابواب اور عنوانات قائم کئے ہیں۔ جو واقعہ اور مسئلہ جس عنوان کے تحت اصل نسخے میں موجود ہے اسی کے

اصلی موضوع کا عنوان الگ باندھا گیا ہے۔

کیمیائے سعادت کے اِس نسخے کی کتابت اور طباعت نہایت اچھی ہے۔ مجلد رنگین اور دیدہ زیب سرورق سے مُزیّن ہے۔

کتابی دُنیا کراچی۔ جون سنہ ۱۹۵۹ء

ایک خط میں اکبر نے عمالِ حکومت کو نصیحت کی تھی کہ وہ چند کتابوں کو بالضرور زیر مطالعہ رکھا کریں۔ انہیں میں کیمیائے سعادت بھی تھی۔

فی الحقیقت یہ ان کتابوں میں سے ہے جن کا ایک زمانے میں دُنیائے اِسلام میں باقاعدہ درس دیا جاتا تھا۔

یہ ان کتابوں میں سے ہے جن کا مُطالعہ ہر گھر میں باقاعدہ ہونا چاہیئے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے"۔ وہ کافی شُستہ اور صاف ہے۔ اُلجھن کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔

رسالہ "آجکل" دہلی (انڈیا)

نام کتاب :- کیمیائے سعادت

ترجمہ :- شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

جلد :- خوبصورت، دیدہ زیب

لکھائی چھپائی :- پسندیدہ

قیمت : ۱۲ روپے

ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ کتاب کی ترتیب نئے انداز میں تبدیل ہونے سے ناظرین کو آسانی ہو جائے گی۔

کیمیائے سعادت

حجۃ الاسلام امام محمدؒ غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف

کیمیائے سعادت

کا اردو ترجمہ

مترجم
نائب نقوی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ـــــ حیدرآباد ـــــ کراچی

سلسلہ مطبوعات ۲۲۲

مترجم : نائب نقوی

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : علمی پرنٹنگ پریس لاہور

اشاعت چہارم : ۱۹۷۱ء

قیمت : ۱۸ روپے

کتابت : غلام مرتضیٰ

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز ادبی مارکیٹ چوک اردو بازار انارکلی لاہور

باسمہٖ وسُبحانہٗ

جائزہ

حصّہ اوّل

آغاز کتاب

حصّۂ دوم

حقائق و معرفتِ اسلام کے چار ارکان

جائزے

حصّۂ سوم ۲۴۱

حصۂ چہارم

تیسرا رکن:

مُقدّمه

تعارف

قابلِ صد تحسین و آفرین ہیں وہ ذواتِ اعلیٰ و ارفع، جنھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ اِس عالم ناپائدار کی رنگا رنگ دلچسپیوں سے بیگانہ ہو کر، دینِ حقہ، کی معرفت اور کدوکاوش میں صرف کر دیا۔ ان کو اس عالم کی نیرنگیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ لوگ صرف خُدا اور رسُول کے دین کی بُنیادوں کو استوار کرنے کے لئے خلق ہوئے، پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ اس دنیائے دوں کی رنگا رنگ بزم آرائیاں ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اُن کے لئے اگر سُورج طلوع ہوتا ہے، تو نمازِ فجر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اِس وقت ان کی زبان سے حمد و صلوٰۃ کے نغمے سُنائی دیتے ہیں۔ روزِ روشن کی چلچلاتی دھوپ میں وہ اہلِ اسلام کی معرفت کے لئے خوشہ چینی کرتے ہیں، اور بعد زوال آفتاب پھر سجدۂ حق میں گر جاتے ہیں۔ اُن کو دُنیاداری کے ہنگاموں سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی مطلب نہیں۔ خورشید عالمتاب کی آخری شعاعیں تک ان کی تحقیق و تدقیق کے ساتھ غروب ہو کر نمازِ مغربین کے لئے اپنی یادیں چھوڑ جاتی ہیں۔ چاند کی صاف و شفاف روشنیاں اُن کے قلوب کو یادِ الٰہی کے لئے جگمگاتی ہیں۔ رات کی بھیانک تاریکیوں میں بھی وہ جواہر نایاب تلاش کر لیتے ہیں کہ دُنیائے ظاہر کی بڑی سے بڑی دُوربین آنکھ بھی اس کو پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتی ہے۔ وہ ہیں جوہر شناس، ان کے لئے دُنیا پیدا ہوئی اور انھیں ذوات کے لئے خداوندِ عالم نے فرمایا۔ کہ میں ایک خزانہ پوشیدہ تھا۔ اپنے پہچانے کے لئے میں نے دُنیا کو پیدا کیا۔

کتنی عجیب و غریب ہیں وہ ہستیاں کہ پروردگارِ عالم کی معرفت حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہ کر اپنا بچپن اپنی جوانی، اپنا بڑھاپا، اپنی راتیں۔ اپنے دن اور اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیتے ہیں۔

گویا کہ ان کی تخلیق صرف اِسلام اور حقائقِ حقہ، کی معرفت کے لئے ہی ہوتی ہے۔ اُن کا خمیر صرف اِس لئے قسامِ ازلی نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا ہے۔ اُن کا گوشت پوست، اُن کی ظاہری ہڈیاں، ان کے ہاتھ پیر، ان کے جسم کے تمام اعضا و جوارح کی خلقت صرف اللہ کے لئے ہے۔ وہ اسلام کی خدمت کرتے ہیں، اور اسلام والوں کے لئے مشعلِ راہ ہدایت بن جاتے ہیں۔ ان کے قلوب کی نورانی شعاعوں سے اِسلام کو روشناس کیا جاتا ہے۔ ان کے حواسِ خمسہ کی تخلیقی بُنیادیں صرف اسلام کو اُجاگر کرنے کے لئے ودیعت فرمائی گئی ہیں۔ اُن کے دماغ کی ہر ہر رگ میں۔ "ھُوَاللہ" کی تعمیریں ہیں۔ ان کے اذہان، عرش و کرسی اور لوح و قلم سے معرفتِ حقہ، کی بُنیادوں کو سمجھ کر اِس دُنیا کے مسلمانوں کو روشنی بخشتے ہیں۔ اُن کا طائرِ رُوح

اس عالم کی گوناگوں مشغولیات سے کہیں دُور "ہو اللہ" کے بحرِ ذخّار سے دُرہائے درخشندہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ دُنیا کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بھی اُن کی کدو کاوش کے آگے ہیچ ہو جاتا ہے۔ وہ ایسے ایسے جواہرات کی تلاش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں کہ دُنیا کے بڑے بڑے فیلسوف، عالم کے بڑے سے بڑے سائنسدان بھی وہ نایاب موتی تلاش کرنے سے قاصر ہیں ـــــ دُنیا میں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ شاہانِ عالم کے بے شمار خزانوں کے مقابلے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اُن کا ہر ہر سانس فضائے بسیطہ میں "ہو اللہ" کی تلقین کرتا ہے ـــــ اُن کی ارواح دُنیاوی انسانوں سے بالکل الگ تھلگ، نہ معلوم کس خمیر سے بنائی گئی ہیں، جن میں تحقیق ہے، تدقیق ہے، کاوش ہے، کوشش ہے، معرفت ہے، حقیقت ہے، فرمن رسا ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس کے رسُول کے لئے ہے، اور اللہ والوں کے لیے ہے، بلکہ سب دُنیا والوں کے لئے ہے۔

اُن کی ظاہری نگاہیں، اِس دُنیا کی دلچسپیوں میں مشغول ہوتی ہیں۔ لیکن صرف اللہ کے لیے وہ کار ہائے دُنیا میں محو رہتے ہیں۔ لیکن اللہ کے لیے ہے۔ وُہ قلم اُٹھاتے ہیں تو اللہ کے لئے۔ وہ کاغذ سیاہ کرتے ہیں تو اللہ کے لیے۔ اُن کے قلم کی ہر ہر جنبش میں اس خدائے دو جہاں کی معرفتیں پوشیدہ ہیں۔ حد یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے لیے بھی "کیمیائے سعادت" بن جاتی ہیں۔

بظاہر وہ عوام الناس کی طرح زندہ ہیں، چلتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، سوتے ہیں، جاگتے ہیں، اُٹھتے ہیں، بیٹھتے ہیں ـــ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، وظائف پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کا ہر عمل صرف اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی خواہشات بھی صرف اس کے لیے ہیں۔ وہ خود اِس دنیا سے دُور کہیں فردوسِ آسمانی کی سیر کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں معرفت کی آخری منازل پر توحید کا دیدار کرتی ہیں۔ اُن کی زبان پر "اللہ" کے نعرے ہیں۔ ہو اللہ کی آوازیں ہیں، لیکن وہ "انا الحق" نہیں کہہ اُٹھتے۔

ہو اللہ کہتے ہیں، لیکن دُنیا کے صوفیائے کرام کے لئے وہ الفاظ ایک نمونہ ہو جاتے ہیں۔ وہ دیدارِ خداوند عالم میں مشغول ہیں۔ لیکن اِس دُنیا کے بڑے بڑے مکاشفات بھی ان کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ـــــ وہ فلسفہ، تصوّف، حکمت، فقہ اور تمام علوم عالم میں اپنی مثال خود ہی ہوتے ہیں۔

اگر کسی فلسفی کو کسی مسئلے میں مشکلات کی راہیں نظر آئیں تو اُن کے نقوش کو سمجھے۔ اگر کسی صوُفی کو ربُّ العالمین کے دیدار میں آخری منازل کی تگ و دو ہے، تو اُن کے آگے زانوئے ادب تہ کرے۔ اگر طبیب کو نباضیِ طبع کی حقائق اُجاگر کرنا ہیں تو اُن کے آستانے سے طب حاصل کرے۔ اگر علمائے زمانہ کو فقہی مسائل کی چھان بین کرنا ہے تو کیمیائے سعادت کی ورق گردانی کرے۔ یہ تمام علوم یہاں سنتے ہیں ـــــ اور بدرجۂ اتم ملتے ہیں

ان کی کتابوں کو سمجھنے کے لیے علوم روحانی کی ضرورت ہے - ان کے مسائل کو سمجھنے کے لیے عقل کی فراوانی کی ضرورت ہے - ان کی فقہ کو جاننے کے لئے لافانی علوم کے طوفانوں کی حاجت ہے - اُن کی منطق کے ادراک کے لیے متکلم حقیقی کی ضرورت ہے - ان کے فلسفے کے لیے بڑی بڑی وسیع النظر حکمتیں درکار ہیں۔

بڑی حیرت ہوتی ہے —— کہ اُن علوم کو جن کا تعلق تصوف و اخلاق سے نہ ہو، اور اس دلچسپ انداز میں تصوف کی کتاب میں سمو دیا جائے۔ کہ پڑھنے والا پڑھتا رہے اور دلچسپیاں بڑھتی ہی رہیں -

"کیمیائے سعادت" یوں بظاہر تصوف کی ایک کتاب ہے - لیکن اس میں دنیا کے تمام علوم و معارف کو یکجا کر کے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے - اب یہ آدمی کی ذاتی توفیق پر مبنی ہے کہ اس سے سب کچھ حاصل کرے یا کچھ بھی نہ کرے -

سینکڑوں احادیث، اولیاء اللہ کے سینکڑوں واقعات، اور حالاتِ زندگی، اسلام والوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں - بس چشمِ حقیقت کی ضرورت ہے - بصیرت چاہیئے اور خداوند عالم کی عطا —— انسانی زندگی اور اس کی ضرورت کے لئے کوئی پہلو ایسا نہیں کہ اس میں اجاگر نہ کر دیا گیا ہو - اگر آدمی دنیا داری میں رہ کر اللہ والا بننا چاہے تو اس کے لئے بھی "کیمیائے سعادت" آخرت کا تحفہ بن سکتی ہے ——

عباد اور زہاد کے لیے مشعلِ راہ آخرت بن سکتی ہے ——

علمائے اسلام کے لئے ہدایاتِ عامہ میں سب سے زیادہ ممد و مددگار اور چراغِ راہ ہدایت ہو سکتی ہے۔

کیمیائے سعادت

میں اسلام کے چار ارکان پر بحث کی گئی ہے اور ان ارکان میں ہر ایک کے دس دس اصول، اور اس کے اصول کی تفصیلات مع دلائل و براہین - اور فصول کو اس طرح بالتفصیل بیان کیا گیا ہے جو بشر کی قوتوں سے باہر ہے۔

انسان اپنی زندگی میں یوں تو ہزارہا کارہائے نمایاں کرتے ہیں اور اپنی بعد کی نسلوں کے لئے اپنی نیکیاں اعمالِ حسنہ - تصنیفات - تالیفات - مال و دولت یا جاہ و ثروت چھوڑ جاتا ہے، لیکن ایسی ہستیاں شاذ ہی پیدا ہوتی ہیں جو پسماندگان کے لیے خدائی داستانیں چھوڑ جاتے ہیں - وہ داستانیں جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جگمگاتی ہیں - دُنیا چاہے کتنی ہی ترقی کر جائے، لیکن ان کے نقوش کا لجھر ہوتے ہیں - وہ زندگی کی آخری منزلوں میں ویسے ہی نوادر پیش کرتے ہیں جو ابتدائے آفرینش میں ذہنی نشوونما کے لیے سکھائے گئے تھے ——

"کیمیائے سعادت" دراصل ایک تصوف اور اخلاق کی کتاب ہے - یہ ایسا خشک موضوع ہے جس میں فقہ، فلسفہ، منطق، احادیث سے کوئی لگاؤ نہیں - اس میں صرف وحدانیت اور اللہ ہی اللہ سے کام ہے - لیکن

اس میں صبح و شام کی نمازیں۔ رات کے تہجدات اور عبادات و اطاعت بھی شامل کر دیئے گئے ہیں، جن کا اصل تصوف اور اخلاق سے خواہ مخواہ کوئی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن یہ ایک معجزہ ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس خشک مضمون میں وہ تمام علوم عالم سمو دیئے ہیں، جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، دُنیا کی ترقّی سے ہے اور آخرت کے آخری منازل سے ہے۔

"احیاء العلوم" ایک بسیط کتاب ہے۔ اس میں اس قسم کے تمام مضامین کا آنا قرین قیاس ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن "کیمیائے سعادت" جو اصل کتاب صرف پانچسو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل ہے اس میں بحرِ زخّار کو کس طرح جمع کر دیا گیا —— یہ صرف اس ہستی کے تبحرِ علمی کا نتیجہ ہے کہ جس کے قلمِ قدرت میں دُنیا کے تمام علوم تھے۔ ہر شے کے متعلق معلومات تھی تحقیق تھی اور چشمِ بصیرت سے عالم و عالمیان کا مطالعہ کیا تھا —— اصل کتاب کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے کیسی کیسی بلند مرتبت ہستیاں پیدا کیں جو انسان کے لیے مشعلِ راہِ ہدایت ہیں —— اگر وہ صرف ان کی تصنیفات کا ہی بدل اور بغور مُطالعہ کر لے تو دنیا و آخرت کی صحیح معرفت حاصل کر سکتا ہے —— اور صرف دُنیا کی ظاہری باتیں ہی نہیں، بلکہ اپنے باطن کو بھی سنوارنے کی اہلیت پیدا ہو سکتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا کہ جس سے انسان کی شعبۂ زندگی سے ذرا سا بھی تعلق ہو، اور اس پر بہ وضاحت سب کچھ نہ لکھ دیا ہو۔

موضوعات کتاب کے متعلّق

ساتھ ہی ساتھ چند الفاظ کتاب کے عنوانات کے متعلق بھی لکھ دینا ضروری ہے —— "کیمیائے سعادت" میں سب سے پہلے انسان کی "ذاتی معرفت" کا بیان ہے، جو وجودِ انسانی کے لیے سب سے پہلی بنیاد ہے۔ اس کے بعد معرفتِ خدا حاصل کرنا۔ اس لیے کہ جب آدمی اپنے متعلّق سب کچھ سمجھ چکے، پھر خدا کی حق المقدور معرفت حاصل کرے۔ اس کے بعد تیسرا قدم دنیا داری کا ہے تاکہ اس کی اُونچ نیچ دیکھ کر سوچے، سمجھے اور معرفتِ دُنیا حاصل کر سکے۔ جب تینوں چیزوں کی علی الترتیب معرفت ہو جائے۔ اس کے بعد آخر میں معرفت آخرت کے لیے قدم اُٹھائے —— مقصد اس کا یہ ہے —— کہ انسان اپنے کو، اپنے خدا کو پہچان کر دُنیا کو نہ چھوڑ دے بلکہ دُنیا کے دھندوں میں بھی مشغول رہے۔ اس کے بعد ہی تکمیلِ انسانیّت ہوتی ہے —— جب انسانیت، بشریت اور مقصد تخلیقِ انسان سمجھ میں آ جائے، اس کے بعد آخرت کی فکر کرے اور دُنیا سے آزاد ہو کر —— یادِ خدا کے ساتھ آخرت کے لئے بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔

معرفتِ اسلام

جب ہر چاروں چیزیں کما حقہٗ، حاصل ہو جائیں، تب انسان سچا انسان ہوتا ہے اور گویا کہ راہِ دین پر چلنے کے لائق ہو جاتا ہے —— ان چاروں معرفتوں کا مجموعہ "معرفتِ اسلام" ہے۔

ارکانِ مسلمانی

ان معرفتوں کے بعد چار ارکان مسلمانی قائم کیے گئے ہیں —— جن میں ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے تاکہ آدمی بتدریج ہر رکن کو مطالعہ کر کے پورا کرتا رہے۔ اور رفتہ رفتہ دُنیا اور آخرت کی راہوں پر گامزن ہو جائے۔

ظاہری ارکان میں ہر قسم کی عبادات ظاہری شامل ہیں۔ اُن کو دس اصول پر منقسم کیا گیا ہے۔ جس میں تمام دُنیا کی ہر قسم کی عبادات، طریقہ عبادات، علومِ دُنیا، علومِ ربانی، طہارت، نجاست میں تمیز وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔

ظاہر ارکان میں ہمارے لیے، —— ہمارے آداب رہن سہن بتائے گئے، جن کے ذریعہ ہم کو شریعتِ اسلام کے ماتحت کھانا پینا، اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، حکومت کرنا، نوکری کرنا، سفر کرنا، روزی کمانا، دوستوں کے ساتھ سلوک کرنا اور اس کے علاوہ زندگی کے ہر پہلو کو روشن کر دیا گیا ہے۔

ظاہری ارکان کے بعد، ارکان باطنی کا نمبر آتا ہے

اس میں امام رحمۃ اللہ علیہ نے انسان میں جو خوبیاں یا بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، وہ سب کچھ ایک ایک کر کے بالتفصیل بیان کی ہیں۔ یہ سب وہ امور ہیں جو انسان کی صرف عادات سے ہی متعلق ہیں۔ ظاہری کاموں سے اُن کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ ہماری "عادات" یا اچھی ہوں گی یا بُری۔ انسان سے دو ہی قسم کے افعال سرزد ہوتے ہیں: اچھے یا بُرے، نیک یا بد۔ اس طرح ہمارے ذہن میں تخیلات اور تصورات دو ہی قسم کے پرورش پاتے ہیں۔ نیک یا بد —— لہٰذا "ارکانِ باطنی" کو بھی دو حصوں پر منقسم کیا گیا۔

پہلے وہ عادات جو بُری ہیں —— اُن کی مہلکات (یعنی ہلاکت میں ڈالنے والی عادات) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں جناب مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بُری عادات کے بیان کو اس لئے پہلے تحریر فرمایا کہ مسلمان اوّل بُرائیوں پر نظر کرے کہ میری عادات کیا ہیں۔ جب وہ ان کو چھوڑ دینے کا عادی ہو جائے گا۔ تب ہی اچھے کردار کو اپنا سکتا ہے۔ لہٰذا مہلکات اوّل بیان کئے گئے کہ فلاں فلاں عادات انسان کو قعرِ مذلت میں ڈال دینے والی ہیں۔ اس کے بھی دس اصول قائم کئے گئے ہیں۔ اگر آدمی ان اصولوں کو سمجھ لے گا تو ہلاکت سے بچ جائے گا۔

——— انسان کا دماغ اور ذہن جہاں تک یاوری کر سکتا ہے، وہ سب کچھ اس رُکن میں موجود ہے۔ مثلاً ہر قسم کی خواہشات غصّہ، حسد، کینہ، بُغض، عداوت اور اس کے علاوہ سب کچھ۔

اس کے بعد جب ایک مسلمان اپنی خراب عادات کو چھوڑ دیتا ہے، تب اُس کو اچھی عادات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے تاکہ ان کو چھوڑ کر ان اچھی عادات کو اختیار کر سکے۔

ان اچھی عادات کا نام "منجیات" رکھا گیا ———

"منجیات" کو بھی دس اصول پر تقسیم کیا گیا ہے، جس میں صبر و شکر، خوف و رجا، اخلاص نیت، تفکرات اعلیٰ توحید، عشقِ حقیقی کا رجحان، موت اور موت کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان اصول کے بعد انسان کو نہ کسی علم کی ضرورت رہتی ہے نہ تحقیق و تدقیق کی۔ اگر وہ "کیمیائے سعادت" کا مُطالعہ بغور کر لے، تو وہ ایک حقیقی مسلمان ہو سکتا ہے اور دُنیا و آخرت میں کسی طرح بھی خسارے میں نہیں رہ سکتا۔

مجموعی طور پر علاوہ مندرجہ بالا چار ابواب کے، جو معرفت کے متعلق ہیں اور جن کے بعد اسلام کی معرفت حقہ حاصل ہو جاتی ہے۔ چار ارکان بیان کئے گئے ہیں اور وہ ارکان چار ہیں، جن میں سب کے دس دس اصول ہیں، وہ سب مل کر چالیس اصول ہوتے ہیں ———

ان چالیس اصول میں انسان کے ظاہری، باطنی ——— عبادات، دُنیوی رہن سہن، عاداتِ حسنہ خواہشاتِ نفس ——— یہ سب کچھ موجود ہیں۔

اب سے پہلے

"کیمیائے سعادت" کے تین ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا بمبئی سے، دوسرا نول کشور بک ڈپو لکھنؤ سے اور تیسرا ملک دین محمد پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے۔ نول کشور بک ڈپو لکھنؤ میں کیمیائے سعادت کے ترجمے کا اٹھارواں ایڈیشن تیج کمار بکڈپو لکھنؤ کا اس وقت بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔

مَیں نے

وہ سب ترجمے تقریباً مکمّل طور پر دیکھے ——— اور تیج کمار بکڈپو لکھنؤ میں کئی سال سے چونکہ تصنیف و تالیف کا شعبہ میرے پاس تھا۔ وہاں کا آخری ایڈیشن ایک حد تک کافی طور پر دیکھنے کا موقع ملا ——— لیکن اس کی سابقہ روش کو نہ بدل سکا۔ اس کا وہ پُرانا ہی دھڑ (چلا آرہا ہے، جواب سے پچاس برس پہلے کا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اتنی کارآمد کتاب کو موجودہ اُردو کا لباس پہنا دیا جائے ——— تاکہ برادرانِ اسلام بآسانی سمجھ سکیں۔

اَب

جناب شیخ نیاز احمد صاحب مالک مطبع نے اتفاق سے یہ کام میرے ہی سپرد کر دیا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں میری

دلی مُسرت کو منجانب اللہ امداد دی یا کیا صُورت تھی؟ ——— بہر حال یہ ایک عظیم الشّان خدمت جناب شیخ موصوف نے میرے سپُرد کی ——— اور میں نے یہ بارِ گراں اُٹھا لینے کی ہمّت بھی کی۔

مجھے خوف ہے کہ میرے قدم ڈگمگا نہ گئے ہوں ——— لیکن خداوندِ عالم کی طرف سے بھروسہ ہے اور یقین ہے کہ اُس نے ضرور میری مدد کی ہوگی ———

اِستدعا

ساتھ ہی ساتھ برادرانِ اِسلام سے استدعا ہے کہ اگر کہیں کمی پیدا ہوگئی ہو، جہاں امام رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات کو پُوری طرح پیش نہ کرسکا ہوں اور صحیح صحیح ترجمانی سے قاصر رہ گیا ہوں، تو نظر انداز کر دیں گے۔

ہاں البتّہ

اِتنی بات ضرور ہے کہ میں نے ترجمہ کرنے میں حتی الامکان عام فہم الفاظ، عام فہم زبان استعمال کی ہے تاکہ صرف اُردو کی ابتدائی منزل پر پہنچے ہوئے لوگ بھی جناب مصنّف رحمۃ اللہ علیہ کی اِس نعمت سے محظوظ ہوسکیں، اور برادرانِ اسلام شریعتِ اسلام کا ہر ہر جُز سمجھ سکیں ———

تصوّف

بعض تصوّف کے مسئلے اتنے دقیق ہیں کہ جن کو خاصے پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عوام النّاس کا ذہن ان کے نکات کی طرف نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں خود بھی صُوفیت کا جوہر موجود ہو اور اس نے کسی بڑے پیر و مُرشد کے آگے زانوئے ادب طے کیا ہو۔ اور یہ سمجھ کر آدمی اِن مسائل کو چھوڑ دے۔ لیکن ان تمام مسائل کا تعلق کیمیائے سعادت سے اتنا ہی ضروری و لازمی تھا کہ اس کے مطالعہ کے بعد ہر مسلمان یہ سوچ لیتا کہ اگر اس سلسلے کو کتاب سے الگ کر دیا جائے تو ایک کمی ضرور رہ جائے گی ——— میں نے کوشش کی ہے کہ اِن مسائل کو آسان اُردو میں ترجمہ کر کے عوام تک پہنچا سکوں، اب نہیں معلوم کہ میں نے کیا ترجمہ کیا ہے اور حقیقتاً اپنی کوشش میں کامیاب ہوسکا ہوں کہ نہیں؟

وحدت الوجُود

مسلمان کے لیے سب سے زیادہ اہم ترین مسئلہ وحدت الوجود ہے، جو زندگی کے ظاہر و باطن اور عواقب و جوانب میں ہر طرح ضروری ہے۔ آفرینشِ عالم کے بعد تخلیقِ انسان کے وقت اس کے وجودِ ظاہری سے عالمِ سکرات تک حتّٰی کہ اِس وقت جب کہ اِنسان موت کی ہچکیاں لے رہا ہوتا ہے۔ نکیرین کی بھیانک شکلیں دونوں طرف نظر آتی ہیں۔ موت کا فرشتہ جھنجھوڑتا ہے ——— وہ نازک ترین وقت، جب اقربا و اعزا، ماں، باپ، بہن بھائی دوست، سب کچھ سامنے تصویر کی طرح ٹکٹکی لگائے بے بس کھڑے دیکھتے ہیں۔ اس وقت ایک سچے مسلمان کے

لیے یہ عقیدہ ہی کام آتا ہے ۔ اِس ڈگمگاتی کشتی کو پار لگانے والا صرف ایک یہی ذریعہ ہے ـــــ وہاں اِنسان کے اعضار کی طاقت اور بہادری سب کچھ ختم ہو جاتی ہے ۔

امام رحمۃ اللہ علیہ نے "کیمیائے سعادت" میں ایسے پیچیدہ مسائل کا تسلسل کچھ اس طرح ایک دوسرے سے مُنسلک کر دیا ہے کہ وہ سب چیزیں مسلمان کے لئے جان لینا بہت ضروری ہیں ۔ یہ اسلام کے لئے موتیوں کی وُہ لڑی ہے کہ اگر ایک جواہر ریزہ نکال لیا جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے ـــــ ایک کی کڑی دوسری سے وابستہ ہے ۔ اور ذرا ذرا سے مسئلے میں "آدمی" کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں ۔ ان سب مسائل کا بیان بالکل بروقت اور برمحل کیا گیا ہے ـــــ اور خاص بات یہ ہے کہ عوام کی سمجھ میں یہ سب باتیں آسکتی ہیں ۔

قرآن و احادیث

علوم کی فراوانی کا اندازہ اُس وقت ہوتا ہے کہ لکھنے والا لکھتے لکھتے اور کہنے والا کہتے کہتے خُدائی احکامات کے ذریعے انسان کو سب کچھ سمجھا دے ـــــ یہ اِنسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے بعض عقائد کی بِنا کے ماتحت کسی کی بات پر سرِ تسلیم خم کرنا تو کُجا ، سُننے کو تیار نہیں ہوتا ۔ لیکن کیمیائے سعادت سے ہر مسلمان کو مُفاد حاصل ہو سکتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ صرف فقہی مسائل کو سمجھنے کے لیے ـــــ یا اِسلامی کتاب کے نظریات سے ہی اس کو پڑھا جائے بلکہ ہر حیثیت سے اِس کتاب کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے ۔

اِس میں اِنسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو جو ابتداءً ناچیز سے ہوتے ہیں اور مسلمان اس کو لاشئے قرار دے کر نظر انداز کر جاتے ہیں ۔ لیکن اس کے نتائج نہایت عظیم ترین پہلو اختیار کر لیتے ہیں اور خود آدمی نہیں سمجھتا کہ میں کیا کر رہا ہوں ـــــ اور کس خطرناک اقدام کا مرتکب ہو رہا ہوں ۔ اگر کوئی عالم اور فقیہہ سمجھاتا بھی ہے تو وہ ایک کان سے سُن کر ، دوسرے کان میں اڑا دیتا ہے ۔ سُنی اَن سُنی کر دیتا ہے ۔ لیکن مسلمان کے دل میں قرآن اور احادیث کی اتنی وُقعت ہے کہ اس کو ان کی خلاف ورزی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ۔ قرآن میں تمام رطب و یابس موجود ہے دوسری طرف انبیا علیہم السلام کی زندگی کا ہر پہلو ، مسلمان کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے ۔

حکومت کرنے کے لیے بھی انبیا علیہم السلام نے سب کچھ طریقے عملی حیثیت سے بتاتے ہیں ـــــ جو باتیں عمل کرنے کے لائق تھیں ان کو عملی طور سے سمجھایا ، جو اقوال سے متعلق تھیں ، ان کو اقوال اور نصائح کے ذریعے اپنی اُمت کو بتا گئے ۔ اسلام میں ایک شہنشاہ سے لے کر ادنیٰ ترین غلام کے حالات اور طریق زندگی مل سکتے ہیں لیکن سمجھنے کے لیے ذہن کی ضرورت ہے ۔ دیکھنے کے لئے چشمِ بصیرت کی ضرورت ہے ـــــ اور ساتھ ہی ساتھ تائیدِ غیبی کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ جس کے لئے ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ خداوندِ عالم کا فضل شاملِ حال ہونے کی دُعا کرے ۔

میں نے جہاں تک شمار کیا ہے مصنف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً تین سو آیاتِ کلامُ اللہ اپنے دلائل اور ثبوت کے لئے کتاب میں شامل کی ہیں اور اتنی ہی احادیثِ نبوی بھی۔

اِس کے بعد اولیائے اللہ اور صالحین کے واقعات اور عملی زندگی کو ہر حیثیت سے پیش کیا ہے۔

خلفائے اسلام رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور اس کے تمام پہلو، رہن سہن کا طریقہ، صبح و شام کی مشغولیات، کردار، حکومت کا طریقہ، دوستی و محبت کے آداب، لوگوں کے ساتھ سلوک اور رواداری، محکوموں کے ساتھ برتاؤ، خدا کے دشمنوں کے ساتھ سختی ——— اور جہاد ——— غرضیکہ کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا گیا کہ جس کو کسی نہ کسی آیت کلام اللہ، حدیث رسولؐ یا صحابہؓ کی زندگی سے مطابقت نہ ہو۔

یہ باتیں کسی معمولی شخصیت سے متعلق نہیں ہوسکتیں - ایسے علوم کے بیان کرنے کے لئے ایسے آدمی کی ضرورت ہے کہ وہ ایک بحرِ ذخار کی حیثیت رکھتا ہو۔ جس طرف قلم اُٹھ جائے، معلوم ہو کہ مسئلہ پانی کی طرح رواں ہے۔

امام رحمۃ اللہ علیہ نے اس تصوف کی کتاب میں فقہ، حدیث، قرآن، روایات، فلسفہ، علم کلام اور الٰہیات سب کچھ لکھے اور کسی مسئلے میں کوئی اُلجھن نظر نہیں آتی ——— آدمی اگر یہ سوچنے کو بیٹھے کہ فلاں مسئلہ فلاں حیثیت سے تشنہ رہ گیا، اور اس میں باریک بینیوں سے کام لے تو بھی کسی کمی کو محسوس نہیں کرتا۔

تخلیقِ کائنات سے لے کر آخرت کی آخری کڑی تک سب کچھ اس چھوٹی سی کتاب میں سمو دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ غرض و غایت روحِ انسانی کا جسم و جسمانیات سے باہمی تعلق سب ہی کچھ بدرجہ اتم موجود ہے۔

ترتیب کتاب

جیسا کہ مختصر طریقہ پر پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کتاب میں چار ارکان مسلمانی پر روشنی ڈالی گئی ہے - زیرِ نظر ترجمے میں سب سے زیادہ اِس چیز کو مدِنظر رکھا ہے کہ ترجمہ ہی رہے اور اس لحاظ سے سوچا کہ کتاب کے چھوٹے چھوٹے حصے بنا دوں، تاکہ شائقین کو کسی خاص مسئلے کی تلاش میں زیادہ سر گردانی کی ضرورت نہ پڑے۔

پہلے زمانے میں کتابیں اس طرح لکھی جاتی تھیں کہ ابتدا سے انتہا تک کہیں تسلسل ختم نہ ہوتا تھا لیکن وہ فرسودہ ڈھرا، اِس دور میں تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔

نول کشور بک ڈپو لکھنو کی مطبوعہ اصل کتاب "کیمیائے سعادت" پانچ سو ستر سٹھ صفحات پر مشتمل ہے جس سے اگر ایک کوئی مخصوص مسئلہ تلاش کرنا چاہو، تو عوام کو اس کا مل جانا ناممکن سا ہی ہوگا، اگرچہ اِس کے

آخر میں ایک مختصر سی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔

موجودہ زمانے میں وہ طریقہ متروک ہوتا جا رہا ہے —— میں نے ان تمام چیزوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کتاب کو "آغازِ کتاب" سے پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ تاکہ اہلِ اسلام کو "مسئلے" کے دیکھنے میں آسانی ہو سکے

ترجمہ کرنے میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اس کی ترتیب سرِ مو تلپٹ نہ ہو سکے۔ اس لیئے کہ اگر اصل کتاب کی شکل تبدیل ہوگئی، تو وہ کتاب اصل کتاب نہ کہی جا سکے گی، بلکہ اس کا ایک خاکہ یا جو کچھ بھی اپنی اصلاح میں کہہ دیجئے، وُہ رہ جاتا ہے۔

کیمیائے سعادت میں کوئی حدیث، کوئی واقعہ، کوئی مسئلہ، کوئی آیت قرآنی ایسی نہیں کہ جس کو مترجم اپنی طرف سے نظر انداز کر دے۔ اس مترجم کو حق ہی نہیں پہنچتا، اور عموماً اس قسم کا دخل درمعقولات، ذاتی کمزوریوں پر مبنی کیا جایا کرتا ہے ——

کتاب کے ترجمے کا جہاں تک تعلق ہے۔ میں نے اس میں بہت آسان اور با محاورہ زبان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ تعقید سے پاک ہو جائے، اور ترجمہ کا مقصد بھی فوت نہ ہو۔ اس لئے اصل کتاب کے ہر جملے کا مطلب اُردو اصطلاحات کے مُطابق عام فہم زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔

البتہ اتنی ضرور ذاتی مداخلت کی ہے کہ جو واقعہ، جو مسئلہ جس عنوان کے ماتحت اصل کتاب میں ہے، اس کے اصل موضوع کا عنوان الگ الگ قائم کر دیا ہے۔ اگر کسی مسئلے پر الگ الگ فصل ہے تو اُن فصول کو دلائل، ثبوت اور توجیہات کے عنوانات کے ماتحت لکھ دیا گیا ہے۔ اگر کسی مسئلے کو سُلجھانے کے لیئے کوئی دلیل "فصل" کے عنوان سے لکھی گئی ہے، تو اس موضوع کا عنوان دلائل میں رکھ دیا ہے، یا اگر کسی موضوع کے متعلق اسباب اور توجیہات لکھی گئی ہیں، تو یہ ہی عنوان بھی قائم کر دیا ہے —— ایسے مواقع پر اصل مسئلہ —— روایات، احادیث، وجوہات، اسباب، دلائل وغیرہ کو الگ الگ عنوانات کے ماتحت تقسیم کر دینے سے میرے خیال میں کوئی ذاتی تصرف کا سوال نہیں پیدا ہوتا —— اور میں نے یہ جسارت بھی صرف اِس خیال سے کی کہ ناظرین کو آسانی ہو جائے اور ہر چیز کا الگ الگ مُطالعہ کر سکیں۔

لیکن کتاب کا دیباچہ، حمد باری تعالیٰ۔ نعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ سب کچھ آسان زبان میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد دیباچے میں مصنف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غرض وغایت تخلیقِ انسان، حقیقت رُوح اور اس کے ذیل میں سببِ تصنیفِ کتاب بھی لکھا ہے۔ البتہ ان سب موضوعات کو الگ الگ کر کے ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

حصّۂ اوّل

یہاں تک اصل کتاب سے کوئی تعلق نہیں، اس کے بعد "آغاز کتاب" کو حصّۂ اوّل سے موسُوم کیا ہے۔ اِس حصّہ میں صرف عنوانات کتاب ہی کا ذکر ہے۔ ابواب سبب الگ الگ ہیں

یہ ہو سکتا تھا کہ میں عنوانات کو ناموں سے موسُوم نہ کرتا اور صرف عنوان اوّل، عنوان دوم وغیرہ ہی لکھ دیتا۔ لیکن اِسس میں ردّ و بدل کر دیا ہے کہ عنوانات کتاب کے چاروں عنوانات کی بجائے ہر عنوان کو کسی باب سے موسُوم کر کے جس موضُوع کا عنوان ہے، اِس موضوع کے ماتحت قائم کر دیا ہے۔ مثلاً کتاب میں چار عنوانات ہیں، میں نے اُن چاروں عنوانات کو معرفت النفس۔ معرفت اللہ۔ معرفت العالم۔ معرفت آلاخرت کے ناموں سے موسوم کر دیا ہے، اور ان کے چار ابواب الگ الگ، بجائے عنوان کے قائم کر دیئے ہیں۔

ہر باب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق الگ الگ عنوانات کی تشریح کر دی ہے جیسا کہ فہرست میں ہر موضُوع کا نام الگ کر دیا ہے۔

پہلے عنوان میں اِنسان کو اپنی معرفت کے طریقے مع دلائل اور ثبوت کے بتائے گئے ہیں جس کا نام (پہلا باب معرفت النفس) ہے۔ اس کے بعد دوسرا باب معرفت اللہ، تیسرا باب معرفت العالم اور چوتھا باب معرفت الاخرت کے نام سے موسُوم ہے۔

میرے خیال میں موجودہ نام اور ابواب کی تقسیم اصل کتاب کی ترتیب سے نہ تو مختلف ہے اور نہ اِسس میں کسی تصرف ذاتی کا سوال ہی پیدا ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ کسی کتاب کے ترجمہ کرنے میں کسی بھی مترجم کو تصرفِ ذاتی کا کوئی اختیار نہیں پہنچتا —— اور تصرف کرنے سے مصنّف کتاب کے خیالات میں تغیر و تبدّل کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اصل مقصد کتاب اور مصنّف کتاب کا فوت ہو جانے کا اندیشہ ہی نہیں، بلکہ یقین کی حدود تک پہنچ جاتا ہے۔

میں نے ہر ہر قدم پر اس بات کی کوشش بلیغ کی ہے، بلکہ اگر یہ کہہ دُوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ کتاب کو قطعی اسی کی حیثیت پر برقرار رکھا ہے —— خُدا کرے کہ میرا خیال صحیح ہو

دوسرا حصّہ

عنوانات مندرجہ بالا کے بعد "ارکان مسلمانی" شروع ہوتے ہیں، جس میں سب سے پہلا رکن عبادات سے متعلق ہیں۔ اس کے متعلق چند الفاظ لکھ دینا ضروری ہیں تاکہ ناظرین کو کوئی مغالطہ نہ ہو سکے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہر رکن کے دس اصُول ہیں اور فارسی میں اصل کو اصل ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ لیکن اُردو میں ہم لوگ عام طور پر اصل کو "اصول" ہی بولتے ہیں۔ اگرچہ "اصول" اصل کی جمع ہے۔ اس میں یہ اعتراض

ہو سکتا ہے کہ "اصل اوّل" کا ترجمہ پہلا اصول کیوں کیا گیا؟ جبکہ پہلی اصل لفظی ترجمہ ہو سکتا تھا، لیکن اُردو بولنے والے لوگ جہاں کسی بُنیاد اور قاعدے کے تخیّل کو دُور کرتے ہیں، وہاں اصول ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں نے اسی لئے ایک عام فہم لفظ استعمال کیا ہے تاکہ لفظ "اصُول" سے کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو سکے

میرے خیال میں اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی ہوگی اور برادرانِ اسلام کو میرے اِس اصول پر کوئی اعتراض نہ ہوگا —— اصل کتاب کیمیائے سعادت میں ہر اصل کے بعد اس اصل کا نام موجود ہے۔ میں نے اس کو اُردو اِصطلاح میں جس طرح ہم لوگ بولتے ہیں اسی طرح ترجمہ کر دیا ہے۔ مثلاً

باب الطہارت۔ باب الصلوٰۃ۔ باب الزکوٰۃ۔ باب الصوم۔ باب الحج وغیرہ وغیرہ، تاکہ بحیثیت اُردو کے ترجمۂ کتاب میں بلاغت کا عنصر مفقود نہ ہو جائے۔

تیسرا حصّہ

کتاب کے دو حصّے رکن اوّل پر ختم ہوتے ہیں اور تیسرا حصّہ رکن دوم سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں یہ بھی لکھ دینا ضروری ہے کہ میں نے کتاب کے تسلسل قطعی کو اِس لیے کم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اُکتا نہ جائے —— بلکہ اصل مسئلہ اور جو چیز مخصوص طور پر دیکھنا مقصود ہو وہ دیکھ لے۔

اِس سے پہلے —— بہت سی کُتب کے ترجمے ہوتے رہے، لیکن ترجمے کا اصل تصور میں جہاں تک سمجھا ہوں وہ غالباً یہ ہی ہے کہ کتاب کا حقیقی موضوع اس کے اِلفاظ اور اس کا تحقیقی مقصد تو بالکل وہ ہی رہنا ضروری ہے، جو مصنّف کہنا چاہتا ہے یا مخاطب کو سمجھانا چاہتا ہے۔ لیکن اِس کتاب کی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لیے عام فہم اگر کر دیا جائے یا مُطالعے کی آسانیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے حواشی اور ہم معانی اصطلاحات بدل دیئے جائیں، تو شاید یہ تصرف نہ کہلا سکے گا، لیکن وہ سب اصطلاحات یا ترجمہ، عنوانات بالکل ہم مقصد ہونا ضروری ہیں۔ بہر حال اِس کے بعد بھی اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس کو نظر انداز کر دینا ایک سچے مسلمان کی حقیقی شان کے مترادف ہو گا۔

رکن دوم

(حصہ سوم)

مُعاملات دُنیا کے متعلق ہے۔ یہ رکن عوام الناس کے لیے اِنتہائی ضروری ہے۔ اس میں باب الطعام۔ باب النکاح، باب التجارت، حرام و حلال اشیاء، نیز دوسرے دنیا سے متعلق احکامات درج ہیں۔

تجارت پیشہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ "باب التجارت" کو بخوبی پڑھ لے تاکہ وہ دائرۂ اسلام اور شریعت اِسلام کے مُطابق اپنی تجارت کو فروغ دے سکے۔

اِس رکن میں سفر اور دوستوں، عزیزوں، ہمسایوں کے حقوق کے متعلق بھی تمام تفصیلات ہیں، جن کا ہر مسلمان کو پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔

اِس کا آخری اصول باب الحکومت ہے۔ "باب الحکومت" سے مقصد صرف شاہنشاہیت یا بادشاہت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں حکومت کے تمام ارکان شامل ہیں وہ خواہ سرکاری ملازمت سے ہی متعلق کیوں نہ ہو۔

رکن سوم

(حصۂ سوم)

مہلکات سے متعلق ہے، اس کے بھی دس اصول ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی ہر مسلمان کے لیے اشد ضروری ہے۔ اِس لیے کہ جہاں آدمی کو اپنے فوائد اور نیک خواہشات کو جاننا زندگی کو سنوارنے کے لیے ضروری ہے، وہاں خطرناک اور نقصان دہ اشیاء، نیز گناہوں کی معلومات ہونا بھی لازمی ہے۔

مہلکات، اُن اعمالِ انسانی پر مشتمل ہیں جو آدمی کو تباہی اور بربادی کے راستے پر لگا دیتے ہیں —— اِس رکن میں اِنسان کی عادات اور نفس کی بُنیادیں جن چیزوں کی وجہ سے حُسن و قبح کی طرف ملتفت ہوتی ہیں۔ اِن کو بصراحت بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً خوش اخلاقی انسان میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے —— اور بُری عادات سے کنارہ کشی کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔

عادات اور صحبت، وراثت اور حسب و نسب کے متعلق مصنّف کتاب، رحمۃ اللہ علیہ نے کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے متعلق چند الفاظ لکھ دینا مقدمے میں ضروری سے ہیں —— اگرچہ اصل مسئلہ انھوں نے کسی دوسری جگہ لکھا ہے، لیکن عادات کی بنیادیں جہاں سے استوار ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اُن کا ذکر کر دینا یہاں ضروری ہے ——

عادات کا تعلق صحبت (سوسائٹی) پر بہت زیادہ مبنی ہے۔ دُنیا میں ہر ملک میں اِس کی آب و ہوا کی مُطابقت سے اِنسان کا رنگ اور ناک نقشہ بنتا ہے۔ حالانکہ اجزاء، تمام عالم کی تخلیق کے لئے ایک ہیں۔ لیکن سب سے پہلے وہاں کی آب و ہوا کے اثرات ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ماں باپ اور گھر میں ہر وقت رہنے والوں کے چہرے، صُورتیں، آنکھ، ناک، کان، مُنہ، ہاتھ، پیر اور تمام اعضائے جسمانی کی ساخت بچّے کی اپنے ماں باپ سے ملی جُلی ہوتی ہے —— اور پیدائش کے بعد ان لوگوں کی عادات اور مزاجی کیفیات بھی اس کے عمل اور رہن سہن میں شامل ہوتی ہیں۔ اگر باپ بدمزاج ہے، چڑچڑا ہے، کمین پن کے خصائل اس میں موجود ہیں اور بچّے کو اس کی صحبت سے دُور بھی رکھا جائے تاکہ اس کی سوسائٹی کے اثرات سے وہ بچہ

متاثر نہ ہو سکے اور بعض پڑھے لکھے باپ اپنے کردار کے متعلق یہ سب جانتے ہوئے اپنے بچوں کے متعلق یہ جانتے ہیں کہ ہماری عادات اس میں سرایت نہ کر سکیں، لیکن جب وہ بچہ سنِ بلوغت کو پہنچتا ہے اور اختیارات کی باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں آتی ہے، تو اس میں بہت سی عادات اس کے آباؤ اجداد کی سی ہوتی ہیں۔ بہت سے اعمال اپنے خاندان والوں کے سے سرزد ہوتے ہیں ——

اِسی طرح اگر والدین اخلاقِ حسنہ کے حامل ہوتے ہیں۔ بخشش، سخن، عدل، اطاعت، شجاعت، علم و فضل اور دوسری اچھی خوبیاں رکھنے والے باپ کے بچے میں کچھ نہ کچھ اثرات ضرور آتے ہیں۔ دُنیا کے مشاہدات سے یہ بات مسلّم ہے کہ بہادر آدمی کا بیٹا بھی بہادر ہوتا ہے۔ ایسے شاذ واقعات ہیں کہ بہادر آدمی کا بیٹا بُزدل نکل جائے۔

معلوم ہوا کہ ہر آدمی پر اُس کے حسب نسب اور سوسائٹی کے اثرات ضرور ہوتے ہیں۔ لہٰذا آغوشِ مادر سے ہی اپنی اولاد کو اگر اچھی عادات کا خوگر بنایا جائے گا، تو یقیناً اس کی مزاجی کیفیات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہو جائیگی —— پھر بھی ایک آدھ جھلک باقی رہ جاتی ہے۔

اِس کے متعلق حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہیں کہیں اشارات کئے ہیں اور اولاد کی پرورش پر کافی زور دیا ہے کہ اوائل عمر میں بچوں کو سُدھارنے کا خیال رکھنا ضروری ہے اور زمانۂ طفل ہی سے بچوں میں عاداتِ حسنہ اور خوش اخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اِس کے بعد اس رکن میں "باب الشہوانیات" بھی شامل ہے، جس میں شہوتِ نفس اور دوسری تمام خواہشات شامل ہیں —— تیسرے اصول میں اِنسان کی گفتگو کے متعلق تفصیلی بیان ہے —— اسی اصول میں منافق کی شناخت کا ذریعہ بھی بتایا گیا ہے۔

بابُ الکلام کے بعد حسد، غصّہ، کینہ، سخاوت، بُخل۔ اس کے بعد "باب الطاعت" اور بابُ الکبر وغیرہ ہیں، جن کے متعلق ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے۔

رُکن چہارم

(پانچواں حصّہ)

یہ رکن کتاب کا آخری رکن ہے۔ اِسی میں منجیات پر بحث کی گئی ہے۔

منجیات، اُن اعمالِ حسنہ اور خوش اخلاقیوں کا مجموعہ ہیں، جو آدمی کو راہِ نجات کی طرف لے جاتے ہیں اور دُنیا و آخرت میں راہِ راست کی بُنیادیں اس پر استوار ہوتی ہیں۔

یہ کتاب کا آخری رُکن بھی دس اصول پر مبنی ہے —— اور ہر اصول کے الگ الگ باب اور عنوانات

مقرر کر دیئے گئے ہیں مثلاً

باب التوبہ، میں توبہ، ثواب توبہ، وجوب توبہ، قبولیت توبہ، گناہانِ کبیرہ وصغیرہ، توبہ کرنے کے اسباب اِن تمام عنوانات پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ مختلف علمائے اسلام کے فتاوے، واقعات اور خود مصنف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آرا موجود ہیں۔

دوسرا اصول، صبر و شکر۔ تیسرا خوف۔ چوتھا فقر و زہد۔ اس کے بعد بالترتیب۔ نیات۔ محاسبہ تفکر۔ توکل محبت و رضائے اللہ۔ موت۔ یہ سب کچھ انتہائی تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

رکن چہارم کا دسواں اصول، "باب الموت" کے عنوان کے ماتحت ترجمہ کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں ہر مسلمان کے لیئے اس اصول کا مطالعہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔

اصل کتاب چوتھے رکن پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد صرف چند سطور میں "ختم کتاب اور دعا" کے متعلق مصنف صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

ایک اجمالی نظر

اسلام ایک فطری مذہب ہے اور اس کا ہر حکم فطرت کی پیروی کر رہا ہے۔ اسلام کے اصول، فروع، عبادات، اوقات اور دنیوی زندگی کے صبح و شام بھی فطرت کے ماتحت ہیں۔ اس کے اصول ذہنی طور سے کسی شخص پر ناگوار اور بوجھ معلوم نہیں ہوتے۔ اسلام انسان کو نہ اس کا سبق دیتا ہے کہ وہ دنیاداری سے بالکل الگ تھلگ ہو کر صرف گوشہ نشینی اختیار کر لے اور نہ یہ کہتا ہے کہ صرف دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے۔۔ اور اندرون پردہ یہ ہی فطرت دوسری اقوام کے قلوب کو متاثر کرنے والی ہے کہ اسلام کی طرف لوگ دلچسپی اور محبت سے دیکھتے ہیں، اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے اصول کو پرکھتے ہیں، اس کی ایک ایک چیز کو دیکھتے ہیں۔ رہبرانِ اسلام کی تعلیمات کو پڑھتے ہیں۔ ان کے کردار اور روزمرہ کی زندگی پر نظر کرتے ہیں ——— کہ اگر ان کی پیشانیاں سجدہ گاہوں کے نشانات سے معمور ہیں۔ صبح کاذب سے پہلے ہی خواب سے بیدار ہو کر وہ رکوع و سجود اور آہ وزاری میں مشغول رہتے ہیں، جن کے چہروں سے یہ نہیں محسوس ہوتا کہ اب یہ دنیا کی طرف نظر بھر کر بھی دیکھیں گے لیکن ادھر خورشید عالمتاب کی سنہری کرنوں سے طبقہ زمین کو روشن کیا، اور ان رہبرانِ اسلام نے اپنے سجادے سمیٹے۔ اپنی مزدوریوں پر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اب وہ کسب معاش پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ باربرداری کے وقت ان میں مزدوروں کی شان نظر آتی ہے کہ جو اپنا موٗنہ خود ہیں۔ وہ شہنشاہِ وقت ہیں، خلیفہ وقت ہیں، لیکن بیت المال کا پیسہ بھی ان کے ذاتی اخراجات کے لیئے قطعاً حرام ہے۔ وہ عوام الناس کی طرح مزدوری کرتے

ہیں اور پیٹ پالتے ہیں ، اور اگر گھر میں کھانے کو نہیں ہوتا ـــــ تو اس رزاق مطلق کی عبادت میں سربسجود ہو کر شکر و تسبیح میں کمی نہیں کرتے ـــــ ان کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوتا ہے ـــــ وہ اپنے آگے کا کھانا اُٹھا کر مسکینوں کو دیتے ہیں اور متواتر ایسا ہی کرتے ہیں ـــــ ظاہری دُنیا کی آرائش اُن پر اثر انداز نہیں ہوتی ۔ وہ صرف خدا کے لئے جیتے ہیں ـــــ اُن کی آرائشیں ، اُن کی پیشانیوں کے سجدوں میں مضمر رہتی ہیں ـــــ ان کی زندگی مسجدوں میں گزرتی ہے ـــــ لیکن ہاں ! ـــــ جب اِسلام کے نام پر نعرۂ تکبیر کی آوازیں بلند ہوتی ہیں ، تو یہ صدائیں اُن کی جھکی ہوئی کمروں میں طاقت پیدا کر دیتی ہے کہ پھر سینہ تان کر تلواریں کمروں میں کسے ہوئے بے سوچے سمجھے دُشمنوں کی صفوں پر گر پڑتے ہیں ۔ نتیجہ کچھ بھی ہو ، وہ اس کے پس و پیش سے بے خبر ہوتے ہیں ۔ ان کی رُوح ، ان کا جسم ، ان کے اعضا ۔ یہ سب کچھ خدا کے لیے ہیں ۔ وہ خدا کے لیے پیدا ہوئے ، خدا کے لیے پرورش ہوئے ، خدا کے لیے پلے بڑھے ، جوان ہوئے اور اس کی راہ میں پروان چڑھتے ہیں ۔ ان کی تلواریں خورشید کی جہانتاب شعاعوں کو میدانِ جنگ میں آ کر ماند کر دیتی ہیں ـــــ ان کی تلواروں کا لوہا ـــــ دُنیا مان لیتی ہے وہ تلوار کے دھنی ہوتے ہیں ، اور جب صفِ جہاد سے واپس پھرتے ہیں ، پھر اُن میں وہ ہی عجز ، وہ ہی انکساری وہ ہی طاقت آجاتی ہے ـــــ

یہ ہیں اِسلام کے اصول ـــــ اور امیرانِ اسلام کے کردار ـــــ آج یہ ہی وجہ ہے ـــــ کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ، جہاں کی فضائیں ، نعرۂ تکبیر سے مرتعش نہ ہو رہی ہوں ، اور یہ ہی وجہ ہے کہ اسلام ایک فطری مذہب کہلاتا ہے ۔ دُنیا اُس کی طرف دیکھ رہی ہے ، للچاتی ہوئی نظروں سے ـــــ اور اس کی تاسی میں قدم اُٹھانے کی کوشش کرتی ہے ۔

اِسلام اپنی فطرت میں سب کچھ لے کر آیا ـــــ اس میں فلسفہ موجود ہے تاکہ دین دارانِ اسلام فلسفہ وحدانیت کو سمجھ کر دُنیا کے بڑے بڑے فلسفہ دان لوگوں کی صفوف میں ۔ سب سے آگے کھڑے ہو سکیں ـــــ اسلام میں علمِ کلام کی وہ لاتھاہ پیش کشیں موجود ہیں کہ دُنیا کے مقرر ، اسلامی خطیب کے آگے سرنگوں ہو سکتے ہیں ـــــ اِسلام میں تصوف کی وہ شان مضمر ہے جس کی جھنک سے " ہو اللہ " کی تعبیریں نظر آتی ہیں ـــــ اِسلام میں فقر و فاقہ کی ریاضتیں ہیں ـــــ اِسلام میں امارت و ریاست کے اصول پوشیدہ ہیں ـــــ اِسلام میں شاہنشاہیتیں ہیں ، لیکن عدل و انصاف کی بُنیادوں پر ـــــ اِسلام میں سائنس کی تمام کرامات مُضمر ہیں ۔ لیکن تعمیراتِ عامہ کے لیے اسلام نمونۂ اخلاق ہے ۔ دُنیا والوں کے لیے ـــــ اس کا رہبرِ اعظم ایک یہودی کے لیے اپنا دامنِ عبا پھیلا رہا ہے کہ آؤ اور اخوّت ہم سے سیکھو ـــــ اِسلام دُنیا داری کا سبق دیتا ہے ـــــ لیکن غربت و امارت ، اخلاق اور بدطینتی ، حکومت اور عوام ، ماں اور باپ کے مراتب اور اخوّت کا نمونہ بن کر کہتا ہے ـــــ کہ دنیا میں رہو ، لیکن اخلاق کا

نمونہ بن کر حکومت کرو، عوام کے محکوم بن کر مال حاصل کرو ـــــ لیکن حدود شرع میں ـــــ اسلام اپنے ساتھ سب کچھ لایا اور اپنے متبعین کو سبق دیا ـــــ اب چشمِ بصیرت کی ضرورت ہے کہ اس کو دیکھیں اور سمجھیں کہ وہ کیا سبق دے رہا ہے ـــــ اس میں سب کچھ موجود ہے ـــــ لیکن دیکھنے اور سمجھنے والوں کے لیے ـــــ افسوس اُن لوگوں پر ہے جو اسلام کی تعلیمات کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں ـــــ وہ فقہ پڑھتے ہیں، لیکن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حدیثیں پڑھتے ہیں، لیکن عمل نہیں کرتے۔ وحدت الوجود کے مسئلوں کو کتابوں کی اوراق گردانی کے لیے اپنا شعار بناتے ہیں ـــــ کتنی عجیب تھیں وہ ہستیاں کہ جنھوں نے اسلام کے بقا کے لیے پوری پوری عمریں گذار دیں۔ اسلام کے حقائق کو اسلام کے شائقین پر اُجاگر کیا۔ ہر مسئلے کے لیے تحقیق و جستجو میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ فقہ اسلام وحدت الوجود "تصوّف" اور فلسفہ ایک جگہ جمع کر کے محیر العقول کتابوں کی تصنیف میں صبح وشام دن، مہینے اور سال کے سال گذار دیئے ـــــ آج ہمارے سامنے اُن کی زندگی کے عجائبات ایک نمونہ ہیں۔ یہ تھیں وہ ذواتِ اعلیٰ و ارفع اور انھیں میں امام محمد غزالیؒ کی ذات گرامی بھی تھی کہ آپ نے اپنی تمام عمر صرف اسلام کی خدمت میں صرف کر دی۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی کتاب، جس کا اصل موضوع جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ سعی (تصوف) ہی ہو سکتا ہے، لیکن اس میں دُنیا کا کوئی علم ایسا نہیں کہ جو چھوڑ دیا گیا ہو ـــــ اور صرف ہر علم کو ایک سرسری نظر سے ہی بیان نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے مُدلّل بحثیں کی گئی ہیں۔ ثبوت میں، اور آخر میں اولیاء اللہ و اصحاب رضوان اللہ عنہم اجمعین کے واقعات سے بھی منطبق کیا ہے۔

ہر جگہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کا ہر ایک نمائندہ اپنی جگہ تمام خصوصیات کا حامل تھا ـــــ وہ فلسفہ اور تصوف کا پروردگار تھا، وُہ بہادری و شجاعت کا دلدادہ تھا۔ وہ گوشہ نشینی اور اعتکاف کا خوگر تھا ـــــ وہ سخاوت اور حلم و بردباری کا مجسّمہ تھا، وہ تلوار کا دھنی تھا۔ وہ خدا کا ایک ایسا ناچیز بندہ تھا۔ جس سے کمزوری کے باعث عبادت کے لئے کھڑا ہونا بھی بعض اوقات محال ہو جاتا ہے ـــــ اور یہ تمام صفات ہر شخص میں مضمر نہیں۔

اسی طرح کائنات کی تخلیق اور انسان و ملائکہ کے وجود کی ضرورت اور ساتھ ہی ساتھ "انسان" کا ہر ہر عضو، بدن، اُس کی مزاجی کیفیات اُس کی طبیعت کا تغیّر و تبدل، اس کی دماغی ساخت، دل کی حرکات، حواسِ خمسہ کی نشو و نما، عناصر اربعہ کا اتصال، ایک ایک کر کے اجمالی اور تفصیلی طور پر بیان کیے کہ جن کو پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے ـــــ

ایسے انسان "انسان نہیں"، کچھ اس سے بڑھ کر ہیں، جن کی آب و گل عوام کے خمیر سے جُداگانہ ہے،

وہ جب سے پیدا ہوئے اور جب تک اس عالم آب وگل میں رہے - ایک درخشندہ ستارے کی طرح روشن رہے ، اور مرنے کے بعد وہ اپنے علوم کے باعث آفتاب کی طرح روشن و منور ہوئے ، جن کے علوم کے باعث دنیا ہمیشہ ہمیشہ اُن کی یاد کرتی رہے گی ۔

ضروری ہے کہ مصنف کتاب امام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختصر حالات بھی شاملِ کتاب کر دیئے جائیں تاکہ برادرانِ اسلام آپ کی ذات والاصفات اور خاندانی وجاہت سے بھی آگاہ ہو جائیں - ایسے لوگوں کی زندگی سے سبق لینے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کی سوانح پڑھ کر ازبر کر لی جائیں ، تاکہ قدم قدم پر دُنیا کی لغزشوں سے راہِ نجات مل سکے ۔

سوانح حیات

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی "محمد" پدر بزرگوار اور داد کا نام بھی "محمد" ہی تھا۔ خاندان میں سوت
اور دھاگے کا کام کیا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے اپنے کو غزالی تحریر فرماتے ہیں۔ عربی کی اصطلاح میں "غزال"
اسی معانی میں استعمال ہوتا ہے ——— شہر طاہران خراسان میں ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۲ء کو ولادت
باسعادت ہوئی۔

اِس زمانے میں علماء، اپنے خاندانی پیشوں یا القاب پر ہی اپنے کو بھی مشہور کرتے تھے اور کسی پیشے کو
عار بھی نہ سمجھتے۔ اِس لیے خود تحریر فرمایا کہ میں خاندانی حیثیت سے جولاہا ہوں۔

والد بزرگوار بڑھئی کا پیشہ کرتے ——— اور اِس کے متعلق بھی خود لکھا ہے۔

امام صاحب کے نانا صاحب غالباً نانبائی کا پیشہ کرتے تھے۔ اِس نسبت کو بھی خود ہی تحریر فرمایا ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کے وقت طغرل بیگ سلجوقی کی حکومت تھی ——— یہ وہ زمانہ
تھا جب کہ مسلمان اپنے اِنتہائی عروج کے منازل طے کر رہے تھے ——— ہر طرف سکون اور امن کی زندگی
کا دور تھا۔ اِسلام کو چار چاند لگ رہے تھے۔ علماء و صالحین گوشۂ عبادت میں مصروف تھے اور بادشاہِ وقت
ان لوگوں کا خیال رکھتا۔ عوام ان لوگوں کے آگے زانوئے اَدب طے کرتے۔

تعلیم

اِس زمانے میں عموماً مسلمان پیشہ وری اور سپہ گری کو اچھا سمجھتے تھے۔ زیادہ تر علماء تحصیل علم سے فراغت
پا کر کوئی نہ کوئی پیشہ ہی اختیار کر لیا کرتے۔

امام صاحب کے والد بزرگوار خود بے پڑھے آدمی تھے، لیکن علم کی اعلیٰ خصوصیات سے واقف تھے
اور بیٹے کے لئے دِلی خواہش تھی کہ یہ پروان چڑھے ——— چنانچہ کچھ روپیہ صرف اسی نظریے کے ماتحت
جمع کیا، اور بیٹے کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب ذرا ہوش سنبھالا، تو خود بھی علم کی طرف راغب ہو گئے۔ دل میں خدا کی
معرفت کا نور تھا۔ ذہن رسا پایا تھا۔ باپ کی محبت بھری نگاہیں بھی علم کی طرف مشغول کر رہی تھیں۔ توفیقِ ایزدی
بھی شاملِ حال ہوئی ——— اور بچپن میں ہی ابتدائی علوم حاصل کیے۔

باپ نے کچھ جمع شدہ روپیہ بیٹے کو دیا ——— اور حصولِ علم کی وصیت کر کے رحلت کی۔ ——— کچھ ہی دنوں میں

وہ پُونجی ختم ہوگئی —— اور رفتہ رفتہ خالی ہاتھ ہو گئے

یہ وقت آپ کے لیے ذرا سخت گزرا، کیونکہ اب کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا، اور نہ باپ کی دولت ہی جیب میں رہ گئی تھی۔ آپ نے ابتدائی علوم طاہران ہی میں اپنے اُستاد احمد بن محمدؒ جو عالِم وقت بھی تھے حاصل فرمائے علوم ابتدائی تکمیل کے بعد ترقی کی منازل میں رکاوٹیں پیدا ہونا ضروری تھیں۔ چنانچہ آپ کے اُستاد نے ہی مدرسہ نظامی کی طرف رجوع کرنے کی نصیحت کی۔

اس زمانے میں صرف دینی تعلیم کا رواج تھا اور تمام مدارس بادشاہوں اور امراء و رؤسا کی امداد پر چلتے تھے —— آج تک وہ ہی رواج مسلمانوں کے عربی مدارس میں چلا آتا ہے، اور ملک کے بہت سے مدرسے اُس دستور کے مُطابق چل رہے ہیں —— جہاں مُسلمان بچوّں کے لیئے تعلیم اور کھانا وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ سب سے پہلے جرجان تشریف لے گئے۔ وہاں ابُونصر اسمٰعیلی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔

جرجان سے فارغ التحصیل ہوکر آپ عازم وطن ہُوئے، لیکن راستے میں قزاقوں کے گروہ نے سب کچھ لُوٹ لیا، حتیٰ کہ وُہ مجمُوعہ جو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت وکاوش سے وہاں تیار کیا تھا، وہ بھی ڈاکوؤں کے ہاتھ سے نہ بچ سکا۔ آپ کو اپنے سامان کی کوئی پرواہ نہ تھی، لیکن اِس مجمُوعے کو آپ جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ چنانچہ انتہائی بہادری اور اولوالعزمی کے ساتھ ڈاکوؤں کے گروہ میں پہنچے، اور اس گروہ کے سرغنہ سے فرمایا کہ تُم لوگ میرا سب کچھ لے سکتے ہو، لیکن وہ مجمُوعہ جو تمھارے کسی کام کا نہیں اور میرا سب کچھ اسی میں ہے یہ مجھے واپس کر دو۔

ڈاکوؤں کا سردار امام صاحبؒ کی اِس بات پر اوّل ہنسا، اور کہنے لگا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا وہ اس میں رکھ دیا ہے، اپنے پاس کچھ نہیں رکھا؟ یہ کہہ کر آپ کو وہ کتابچہ واپس کر دیا —— آپ کو سردار کی بات پر ندامت بھی ہُوئی، اور واپس آکر اِس پُورے کتابچے کو ازبر کر ڈالا

سفر نیشاپُور

امام صاحب رحمۃُ اللہ علیہ سب علوم کے آخری منازل طے کرنے کے خواہش مند تھے —— حالانکہ اس وقت اپنے زمانے کے علماء میں شمار ہونے لگے تھے۔

اس زمانے میں نیشاپور میں مدرسہ نظامیہ جو ملک کا سب سے بلند مدرسہ تھا، وہاں کا عزم کیا —— مدرسہ نظامیہ میں اس وقت وہاں کے ناظمِ اعلیٰ کو "امام الحرمین" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ چنانچہ امام رحمۃ اللہ علیہ نے آپ ہی کی شاگردی اختیار فرمائی۔

امام الحرمین اس وقت علاوہ دینی مسائل اور فتاوٰی کے سلطنت وحکومت کے احکامات میں بھی دخل دیا

کرتے تھے اور عموماً مسلمان اُن کے تمام احکامات کی پابندی کرتے، حتیٰ کہ اگر بادشاہِ وقت خلاف شرع حکم دیتا تو امام الحرمین اس کو رد کر دیا کرتے اور اُن کے آگے بادشاہ کی بھی نہ چل سکتی تھی۔

ناظمِ اعلیٰ امام الحرمین نے جب ۴۷۸ھ میں انتقال فرمایا، تو اس کے بعد ان کی جگہ پر تقرر کا سوال پیدا ہُوا۔ ——— جو بہت اہم اور مشکل تھا ———

عُہدہ نظامتِ اعلیٰ

ملک کی عظیمُ الشان درسگاہ کے ناظمِ اعلیٰ کے اِنتقال پر ہر طرف مایُوسی کی لہر دوڑ گئی۔ بازار بند رہے۔ چاروں طرف ماتمی لباس پہنے گئے، حتیٰ کہ شاہی دربار میں بھی سوگ منایا گیا۔

شاہی دربار میں امام صاحب بھی تشریف لے گئے۔ دوسرے علمار سے مباحثے اور مناظرے ہُوئے۔ چونکہ تمام علوم میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہی ہوا، کہ تمام علمار کے مقابلے میں گل سر سبز رہے اور آپ کو درس گاہ نظامی کا "ناظمِ اعلیٰ" مقرر کر دیا گیا ———

امورِ سلطنت

امام الحرمین کے وقت سے ہی یہ قاعدہ چلا آ رہا تھا کہ اس درسگاہ کا ناظمِ اعلیٰ مفتیٔ اعظم ہوتا تھا، اور وہ امورِ سلطنت میں بھی مداخلت کرتا تھا۔ لیکن امام رحمۃ اللہ علیہ جب اِس عہدے پر فائز ہُوئے تو مجبوراً ان حالات کا جائزہ لینا پڑا۔

قبُولیت آپ کے تبحّرِ علمی کی بنا پر تمام اراکینِ و امرارِ سلطنت، آپ کے معتقد ہو گئے، لہٰذا سلطنت کا کوئی اہم کام بغیر آپ کے حکم کے نہ ہو پاتا تھا ——— آخر زمانہ ایسا بھی آیا کہ بادشاہ وقت سے زیادہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سکہ عوام کے دِلوں پر چل رہا تھا ———

شاہی معاملات میں مداخلت یہی نہیں بلکہ یہاں تک ہُوا کہ ملک کی تخت نشینی اور خانہ جنگیوں میں بھی دخیل ہونا پڑا۔ چنانچہ ابُوالفتح سُلطان جلال الدین سلجوقی کا جب اِنتقال ہوا تو ملکۂ وقت نے اپنے بیٹے محمود کی جو اس وقت صرف چار سال کا تھا۔ تاجدارِ سلطنت بنانا چاہا، اور بڑے بھائیوں نے اس کی مخالفتیں کرنا شروع کیں۔ اس وقت ہو سکتا تھا کہ ملک میں ہنگامی حالات، پیدا ہو جائیں۔ لیکن بر وقت امام غزالی رحمۃُ اللہ علیہ نے مداخلت فرمائی، ملکہ کو سمجھایا اور اس مسئلے کو سُلجھا کر ہزاروں بندگانِ خدا کے کشت و خوں سے بچا لیا۔

سیاسیات کے ساتھ مشاغلِ دین اسی طرح دیگر امورِ سلطنت میں برابر مداخلت فرماتے رہے۔ عوام الناس کے دلوں پر آپ کا سِکّہ بیٹھا ہُوا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ سلطنت، و حکومت کے قضیئے بھی نبٹاتے تھے، اور دوسری طرف تعلیمی مشاغل سے بھی کسی وقت غفلت نہ ہونے پائی۔ درس و تدریس مواعظ اور تقاریر کا سلسلہ

برابر جاری رہتا - چنانچہ آپ کے وعظ اور تقاریر کا ایک مجموعہ "مجالسِ غزالیہ" کے نام سے مشہور ہے جس میں تقریباً ایک سو تراسی تقاریر اور وعظ ہیں -

شوقِ تصوّف تقریباً ستائیس سال کی عمر میں آپ نے شیخ ابو علی نارمدی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی تاکہ تصوف کے اعلیٰ مراتب میں مکاشفات ہو سکیں -

آپ نے پہلے پہل تمام مذاہبِ عالم کا مطالعہ فرمایا - نیشاپور میں اس وقت حنفی مذہب کا عروج تھا - لہٰذا آپ وہاں سے بغداد تشریف لے گئے - بغداد اس زمانے میں تمام مذاہب کے علماء و فضلا کا مرکز تھا، جس کی وجہ سے آپ کو بھی دوسرے مذاہب کی معلومات کا موقع مل گیا - لیکن آپ نے یہ سب کچھ کرنے کے بعد یہ سوچا کہ اس دُنیا کے ہنگاموں سے بچنے کے لیے صرف تصوف کا راستہ ہی بہتر ہے، لہٰذا دُنیوی لباس اور ظاہری بندشوں سے آزاد ہو کر فقیروں اور درویشوں جیسا لباس پہن کر گوشۂ عافیت اختیار فرمایا - لیکن لوگوں نے وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا - چنانچہ مجبور ہو کر اس عالم میں ایک وقت درس دینے کا عزم بھی کیا —— لیکن تصوف کے راستے پر گامزن رہے -

ترکِ دُنیا یہاں تک کہ آپ نے شاہی دربار میں شمولیت اور عطیاتِ شاہی، نیز مناظرہ اور مباحثہ وغیرہ سے بھی پرہیز شروع کر دیا - دس سال تک مختلف بلادِ اسلامیہ میں ریاضت نفس کی غرض سے بسر کیے -

عہدہ ناظمِ اعلیٰ آخر میں پھر نیشاپور تشریف لا کر مدرسہ نظامیہ کی نظامتِ اعلیٰ پر متمکن ہوئے —— یہ وہ وقت تھا جب کہ کفر و الحاد کی آندھیاں مذہبیت کے رنگ و بُو پر غالب آ رہی تھیں - لوگ اِسلام کے احکامات کو فراموش کر رہے تھے - آپ نے اُس وقت محسوس کیا کہ مذہب کی خدمت اس وقت ضروری ہے - اس وقت تمام حجابات اُٹھ چکے تھے اور تصوف کے اعلیٰ مراتب پر گامزن تھے —— پھر یہ ظاہری بندشیں آپ کے لیے کوئی مُفید نہ تھیں -

لیکن کچھ ہی دن بعد بادشاہ وقت کے وزیرِ سلطنت کو کسی نے قتل کر دیا، اور آپ اپنے عہدے سے بددل ہو کر مستعفی ہو گئے -

مراجعتِ وطن نیشاپور سے پھر طوس کا رُخ کیا، اور ایک مدرسے کی بُنیاد خود ڈالی - وہاں کچھ دنوں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا -

نظامت اعلیٰ کے لیے مُنہ توڑ جواب کچھ ہی دنوں بعد اہلِ اسلام کی نظریں پھر اس بلند ہستی کی طرف اُٹھیں اور آپ کو مجبور کیا گیا کہ بغداد کے مدرسہ نظامیہ کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے لیں - لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کسی حال میں بھی بغداد جانا پسند نہ کیا، اور بادشاہ وقت کو یہ عذر لکھ کر بھیج دیئے :

(اقتباس) ۱۔ میرے مدرسہ میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبا زیرِ تعلیم ہیں، جن کی وجہ سے میرا یہاں سے الگ ہونا مناسب نہیں ہے۔

۲۔ اب میں اپنے اہل و عیال کی وجہ سے وطن نہیں چھوڑ سکتا ــــــ

۳۔ مناظرہ وغیرہ سے احتراز کرنے کا عہد کر چکا ہوں، لیکن بغداد میں رہ کر اس عہد پر قائم نہ رہ سکوں گا

۴۔ شاہی دربار میں حاضری میرے لیے ناممکن ہے اور بغداد میں رہ کر مجھے مجبوراً وہاں سلام کو جانا پڑے گا۔

۵۔ شاہی خزانے سے کسی قسم کی تنخواہ یا وظیفہ لینا میں پسند نہیں کرتا۔ اگر بغداد آؤں گا تو بغیر تنخواہ یا وظیفے کے اپنے اہل و عیال کا پیٹ نہ بھر سکوں گا۔ لہٰذا وہاں آنا میرے لیے ناممکن سا ہے۔

بادشاہ وقت کی مخالفت اور دربار میں طلبی

یہ عذر امام صاحب نے پیش کیے۔ اس کے بعد کسی کی ہمت نہ پڑی کہ آپ سے پھر وہاں کی نظامت کے لیے کہہ سکتا ــــــ یہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ اس زمانے میں مذہب حنفیہ عروج پر تھا ــــــ اس مذہب کے خلاف، کوئی شخص زبان نہیں نکال سکتا تھا چنانچہ کچھ لوگوں نے سلطان شہر سے جاکر امام علیہ الرحمۃ کی شکایت کی ــــــ سلطان شہر امام اعظم کا مُرید تھا ــــــ اس نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو طلب کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ وہاں پہنچے۔

بادشاہ آپ کی شکل و صورت اور رُعب و جلال سے اِنتہائی متاثر ہُوا۔ تعظیم کے لیے کھڑا ہوگیا ــــــ اور اپنی مسند پر جگہ دی۔

کچھ باتیں ہُوئیں، آخر میں آپ کھڑے ہُوئے اور ایک عالمانہ تقریر فرمائی، جس کے اثرات سے تمام اراکینِ دربار اِنتہائی متاثر ہوئے اور انگشت بدنداں رہ گئے ــــــ

آخر میں ــــــ امام رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے، کہ مجھے دو باتیں اور عرض کرنا ہیں :

(اقتباس) ایک یہ کہ باشندگانِ طوس سلطنت کی بدانتظامیوں سے اس قدر تباہ حال ہوگئے ہیں کہ اب تابِ ضبط باقی نہیں۔ قحط اور سردی کے باعث رہی سہی برداشت بھی ختم ہوگئی۔

اے بادشاہ! ان پر رحم کر، خُدا تجھ پر رحم کرے گا۔ افسوس مسلمانانِ طوس کی گردنیں مصائب اور تکالیف سے ٹوٹی جا رہی ہیں، لیکن تیرے گھوڑے ابھی جواہرات کے ہار حمائل کیے ہیں۔

دوسرے یہ کہ :

میں نے بارہ سال سے گوشہ نشینی کا عہد کر لیا ہے۔ لیکن "فخر الملک (وزیر سلطنت) کے اصرار کے باعث میں یہاں آنے پر مجبور ہو گیا ـــــ لیکن یہ وہ زمانہ ہے، کہ کوئی شخص سچی بات بھی زبان پر نہیں لا سکتا۔ میں اسی لیے شاہی دربار میں آنا نہ چاہتا تھا ـــــ بہر حال فخر الملک کی ضد پر چلا آیا ـــــ اُنھوں نے کہا کہ بادشاہِ وقت عادل ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گی تو میں ذمہ دار ہوں ـــــ اِس لیے یہاں تک چلا آیا ـــــ

اِس کے بعد امام رحمۃُ اللہ علیہ نے فرمایا:

میرے متعلق دُنیا والے مشہور کر رہے ہیں، کہ میں امام ابُوحنیفہ کے خلاف لکھتا ہوں، اور کہتا ہُوں، اِن کے احکامات پر نکتہ چینی کرتا ہُوں۔ اُن پر طعن و تشنہ کرتا ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ غلط ہے، اور میری تصدیق کے لیے اگر چاہو، تو میری مصنّفہ کتاب "احیاء العلوم" دیکھ سکتے ہو، کہ میں نے امام ابُوحنیفہ کو "فقیہہ زمانہ" تسلیم کیا ہے۔

یہ فرما کر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بیٹھ گئے ـــــ دربار پر سکوت طاری۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر جانور بیٹھے ہیں۔ بادشاہ انگشت بدنداں رہ گیا اور انتہائی متاثر ہوا۔ دستِ ادب جوڑ کر عرض کی، کہ آپ کو نظامتِ اعلیٰ کا عہدہ قبول کرنا ہی ہو گا ـــــ میں تمام علمائے وقت کو حکم دے دوں گا کہ وہ سب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل شریعت کے متعلق معلومات کیا کریں ـــــ

امام صاحب رحمۃُ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ سُنا اور بادشاہ سے رُخصت طلب کی۔ بادشاہ نے بعزّت و احترام رخصت کیا۔ آپ عازمِ طوس ہوئے۔ جب وہاں کے باشندوں کو معلوم ہوا، تو پورا شہر استقبال کے لیے شہر پناہ پر جمع ہو گیا۔ صدقہ اُتارا گیا، زر و جواہر نثار کیے گئے۔

مخالفین کی سرگرمیاں اب تک مخالفین ریشہ دوانیاں کر رہے تھے ـــــ مختلف قسم کے سوالات کرتے تھے۔ چنانچہ کسی نے پُوچھا کہ آپ کس کے مقلّد ہیں؟

آپ نے فرمایا کہ میں کسی شخص کا مقلّد نہیں۔ عقلیات میں صرف عقل سے کام لیتا ہوں اور منقولات میں قرآنِ پاک سے ـــــ

یہ مسکت جواب سُن کر لوگوں کے چہرے فق ہو گئے ـــــ لیکن اس کے بعد بھی لوگوں نے مشکوٰۃ الانوار اور کتاب کیمیائے سعادت پر اعتراضات کی بھرمار کی۔

آپ نے انتہائی مُدلّل جواب دیئے، وہ تمام جوابات آپ کے مکتوبات میں شامل ہیں۔

امام صاحب رحمۃُ اللہ علیہ کا ایک خط

ایک بار پھر موید الملک نے بغداد کی نظامت اعلیٰ کے لیے بڑا اصرار کیا اور خط لکھا کہ ضرور تشریف لائیے۔
امام صاحب رحمۃُ اللہ علیہ نے جواب دیا، اِس زمانے میں آپ دُنیا سے قطعی طور پر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نقل خط

الحمد للہ رب العالمین والسلام علیٰ محمد و آلہ و عترتہ اجمعین، خواجہ و ملجا جہاں پناہ متنع اللہ المسلمین بطول بھاءہ ــــــــ

خدمت میں عرض ہے ــــ کہ آپ مجھ کمزور و ناتواں کو دار السلام بغداد کے معمورے میں حاضری کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ میری عزت افزائی اور آپ کی محبت کا باعث ہے۔ مجھ بندۂ حقیر کے لیے بھی ضروری ہے کہ چند سطور لکھ کر جواب سے مطلع کر دُوں ــــــ

میرے عزیز دوست!

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ طوس اور بغداد دونوں خُدا کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ اصل مرکز وہ ہے اور آدمی یہاں اور وہاں دونوں ہی جگہ سے وہاں پہنچ سکتا ہے۔ البتہ اِنسانی ترقی کے منازل اور حیوانیت کے جذبات ہیں کہ میں آستان کا اہل رہوں۔

لہٰذا عرض ہے کہ اب دُنیائے فانی سے طرف جاودانی جانے کا وقت ہے۔ بغداد آنے کی بھلا مُہلت کہاں؟

میرے دوست! فرض کرو! کہ میں بغداد آ بھی جاؤں اور میرے آتے آتے قضائے الٰہی گھات لگائے میرے پیچھے پیچھے آ پہنچے اور کہے کہ اب اُس لافانی مدرسے کی طرف رجُوع کر!

میرے دوست! میں دیکھ رہا ہُوں کہ اب وُہ دن بالکل قریب ہے اور یہ سمجھ کر میری طرف سے مطمئن ہو جانا چاہیئے، کہ وہاں آنا ناممکن سا ہے۔

فقط۔ والسلام والاکرام

تصنیفات

امام صاحب کی تصنیفات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ مولانا شبلی نے اپنی کتاب "الغزالی" میں تصنیفات غزالی کو مجمل طور پر اٹھہتر (۷۸) لکھا ہے ــــ اُنھوں نے بحساب حروف تہجی ان کُتب کو اجمالاً بیان کیا ہے۔

لیکن مشہور تصنیفات حسب ذیل ہیں:

فقہ: تعلیقہ فی فروع المذہب۔ بیان القولین۔ وجیز۔ وسیط۔ بسیط۔ خلاصۃ الرسول۔ اختصار المختصر،

غایۃ الغور ۔ مجموعہ فتاوے ۔

اصُول فِقہ : تحصین الماخذ ۔ مفصل الخلاف فی اصول القیاس ۔ ماخذ فی الخلافیات ۔
شفاء العلل ۔

منطق : معیار العلم ۔ محک النظر ۔ میزان العمل ۔

فلسفہ : مقاصد الفلاسفہ ——

عِلمِ کلام : تہافتہ الفلاسفہ ۔ منقذ ۔ الجام العوام ۔ اقتصاد ۔ مستظہری ۔ فضائح الاباحتہ ۔ حقیقت الرُوح
الرسالتہ القدسیہ ۔ تفرقہ بین الاسلام والزندقہ ۔ مواہب الباطنیہ ۔ القول الجمیل فی ردّ علیٰ من غیر الانجیل
قسطاس المستقیم ۔

علم اخلاق اور تصوّف : احیاء العلوم ۔ کیمیائے سعادت ۔ المقصد الاقصیٰ ۔ اخلاق الابرار ۔ جواہر القرآن ، جواہر القدس فی قضیتہ النفس ۔ مشکوٰۃ الانوار ۔ منہاج العابدین ۔ معراج السالکین ۔ فصیحتہ الملوک ۔ ایہا الولد ۔ ہدایۃ الہدایہ
مشکوٰۃ الانوار فی لطائف الاخبار ۔

ان تصنیفات میں بعض ایسی کتب ہیں جو ممالکِ اسلامیہ میں ناپید ہوگئی ہیں ۔ اُن کے چند نسخے صرف یورپ کے کتب خانوں میں اب تک محفوظ ہیں ۔

شاعری

مولانا شبلی نے مجمع الفصحا اور روضات الجنات سے دو چار رباعیات نقل کی ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلجوقی دور میں شعراء زیادہ تر موجید قصائد لکھا کرتے ۔ لیکن قصیدے سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ لہٰذا قطعات اور رباعیات پر ہی اکتفا کی ۔

چند رُباعیات انھوں نے نقل کی ہیں ، جو یہاں بھی پیش کی جاتی ہیں :

رُباعی

اے کان بقا در چہ بقائے کہ نہی — در جائے نہ کدام جائے کہ نہی
اے ذات از ذات تو بہت مستغنی — آخر تو کجائی ! و کجائے کہ نہی

رُباعی دیگر

کس را پس پردہ قضا را نہ شُد — وز سرِّ قدر ہیچ کس آگاہ نہ شُد
ہر کس ز سر قیاس چیزے گُفتند — معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شُد

رُباعی دیگر

با جامہ نمازے بسرے خم کردیم — وز آب خرابات تیمّم کردیم
شاید کہ دریں میکدہ ہا دریا بینم — آں یار کہ در صومعہ ہا گم کردیم

قطعہ

گفتم ولا تو چندیں برخویشتن بپیچی — بایک جلیب محرم ایں راز درمیاں نہی
گفتا کہ ہم جلیبے فرمودہ است بامن — گر مہرداری صد مہر برزباں نہی

عام حالاتِ زندگی

امام رحمۃ اللہ علیہ کی صرف چوّن[۵۴] سال کی زندگی میں یہ کارہائے نمایاں دُنیا کے لیے حقیقتاً ایک عجیب سبق ہیں۔ اس عرصے میں تحصیل علم، گوشہ نشینی، صحرا نوردی اور تصنیفات و تالیفات اور اس کے علاوہ مناظرے اور مباحثے۔ شاگردوں کی بہتات۔ اہل و عیال کی خبرگیری۔ درس و تدریس کے مشاغل۔ مختلف مقامات کے سفر۔ اور ساتھ ہی ساتھ اِتنی تصانیف، اِنسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔

بقول مولانا شبلی مرحوم کے ——— (اقتباس)

تصنیفات کے لحاظ سے امام صاحب کی زندگی نہایت حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے صرف چوّن برس کی عمر پائی۔ تقریباً بیس برس کی عمر سے تصنیف و تالیف کا مشغلہ شروع کیا۔ دس گیارہ برس صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں گزارے۔ ساتھ ہی ساتھ درس و تدریس کا شغل بھی قائم رہا۔ اور کبھی کسی زمانے میں آپ کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی۔ فقر و تصوّف کے مشغلے جُداگانہ۔ دُور دُور سے جو فتاویٰ آتے تھے، اُن کے جوابات دینا الگ ——— بایں ہمہ سینکڑوں کُتب تصنیف کیں۔ جن میں بعض بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں اور گوناگوں مضامین سے پُر ہیں۔ اور ہر تصنیف اپنے مضمون میں بے نظیر ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشند خُدائے بخشندہ

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے "نفحات الانس" میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ——— کہ ——— (اقتباس)

لقب زین العابدین، کنیت ابو حامد ہے ——— ابتدائی تعلیمات طوس میں حاصل کیں۔ اس کے بعد نیشاپور تشریف لے گئے ——— اور وہاں متعدد علوم حاصل کئے ——— پھر نظام الملک سے ملاقات

اور تعلقات میں وسعت ہوگئی۔ نظام الملک کے یہاں علماء، وفضلا کا جمع رہنا، ان لوگوں سے خوب خوب مناظرے کیے اور ہمیشہ میدان آپ کے ہاتھ رہا۔ ۴۸۴ھ میں نظامت اعلیٰ کا عہدہ ملا، تو بغداد تشریف لے گئے ـــــ اہلِ بغداد آپ کے علم سے مرعوب ہوئے، یہاں تک کہ آپ کا سکہ وہاں کے عوام کے دلوں پر چلنے لگا ـــــ ہر وقت انبوہ کثیر گھیرے رہتا۔ اِس دُنیا سے ایک دم تنفر پیدا ہوگیا اور کنارہ کشی اختیار فرما کر گوشۂ خلوت اختیار کیا۔

۴۸۸ھ میں حج سے واپس ہوکر شام میں کافی عرصے تک قیام فرمایا ـــــ وہاں سے بیت المقدس تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں وہاں قیام فرما کر مصر گئے اور اسکندریہ میں رہے ـــــ وہاں سے پھر، شام، کو واپس ہوکر کافی مدت تک وہاں قیام پذیر ہوتے۔ آخر میں پھر اپنے وطن طوس واپس تشریف لائے، اور دُنیا کی گوناگوں اور رنگارنگی سے قطعی کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اِسی زمانے میں احیاء العلوم، جواہر القرآن۔ تفسیر یاقوت التاویل (جو چالیس جلدوں پر مشتمل ہے) مشکوٰۃ الانوار اور دیگر مشہور کتب تصنیف فرمائیں ـــــ تصنیف وتالیف سے دل اُچاٹ ہوا تو پھر نیشا پور تشریف لائے، اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے ـــــ ایک بار پھر طبیعت اُچاٹ ہو گئی اور طوس واپس آگئے۔ یہاں آکر ایک خانقاہ اور ایک دارالعلوم کی بُنیاد ڈالی، اور پھر صرف اوراد و وظائف اور گوشہ نشینی نیز تصوف کی تدریس میں عمر گذار دی۔ یہاں تک کہ چودہ جمادی الآخر ۵۰۵ھ کو عالمِ جاودانی کی طرف پرواز فرما گئے۔

خزینۃ الاصفیاء میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے یہ واقعہ بھی درج ہے ـــــ کہ:

شیخ محمد صادق شیبانی نے اپنی کتاب "مناقب غوثیہ" میں تذکرہ کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شبِ معراج، حضرت موسیٰؑ سے جس وقت ملاقات ہوئی، تو حضرت موسیٰؑ نے عرض کی، کہ اے خاتم المرسلین! آپ کا ارشاد ہے ـــــ کہ میری اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کا مرتبہ رکھتے ہیں ـــــ میری خواہش ہے کہ اُن میں سے کسی ایک عالم کو دیکھ سکوں۔

اُس وقت امام غزالیؒ کی رُوح وہاں موجود تھی ـــــ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے اس رُوح کو پیش کیا گیا۔ آپ نے اِس رُوح سے نام دریافت کیا، جواب ملا محمد ابن غزالی ـــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے تم سے صرف تمہارا نام دریافت کیا تھا۔ تم کو ابنیت کے بتانے کی کیوں ضرورت سمجھی؟ امام صاحب کی رُوح نے جواب میں کہا۔ کہ آپ سے بھی تو طور پر

عصا کے لیے صرف یہ دریافت کیا گیا تھا کہ یہ کیا ہے، لیکن آپ نے اس کے متعلق تمام تفاصیل بتانا شروع کر دیں کہ میں اس عصا سے فلاں فلاں کام لیتا ہوں ــــــ اور یہ عصا میری فلاں فلاں مواقع پر مدد کرتا ہے ــــــ حالانکہ آپ کا جواب صرف لفظ ــــــ عصا فرما دینا ہی کافی ہو جاتا۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں! بات تو صحیح کہتے ہو، لیکن وہ تمام جوابات میرے منہ سے بے ساختہ نکل گئے۔ امام رحمۃ اللہ علیہ کی روح نے فوراً جواب دیا کہ ــ بس اسی طرح میرے باپ کا نام بھی بے ساختہ زبان سے نکل گیا ــــ اور ہو سکتا تھا کہ آپ بعد میں میرے باپ کا نام دریافت فرماتے، لہٰذا میں نے پہلے ہی شامل کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ اس جواب پر خاموش ہو گئے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب کو گستاخی سمجھا اور اپنے عصا سے تنبیہ کی کہ چپ رہو۔ چنانچہ اس عصا کی چوٹ کا نشان امام رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کے بعد اُن کے جسم پر دیکھا گیا ــــ بلکہ بعض مورخین لکھتے ہیں ــــ کہ امام صاحب اس چوٹ اور تنبیہ کی وجہ سے لنگڑے ہو گئے تھے۔

یوں تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کا سلسلہ بہت ہی وسیع تھا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ڈیڑھ سو سے کم شاگرد آپ کی زیر تربیت نہ رہتے ہیں ــــ بلکہ امام الحرمین کے انتقال کے بعد شاگردوں کی تعداد سینکڑوں سے لے کر ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی، بلکہ ایک زمانے میں آپ کے درس میں تقریباً تین سو مدرسین اور سینکڑوں رؤسا و امراء نیز اراکین سلطنت تک درس میں شریک ہوتے تھے اور آپ کے مواعظ کو نقل کر لیا کرتے تھے۔

عموماً دُنیا میں ایسے بزرگوں کو اسی قسم کے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دنیادار لوگ برگزیدہ بندوں سے حسد اور بغض کرتے رہے۔ ان لوگوں کو ہر قسم کی تکالیف پہنچائیں۔ ہر طرح رنج اور صعوبات اُٹھا کر کسی نہ کسی طرح وہ اس دنیا میں رہے، اور اپنے حاسدوں کا شکوہ تک نہ کیا۔ اسی قسم کے لوگوں میں امام صاحب بھی تھے جنھوں نے اپنی زندگی صرف خدا اور اس کے عرفان کے حاصل کرنے میں صرف کی۔ دُنیا کی تکالیف سے بادشاہِ وقت کی شان و شوکت سے کبھی مرعوب نہ ہوئے، اور جو بات کہنا ہوئی، برسرِ عام کہہ دینے میں کبھی نہ جھجکتے ــــ اُن کو اپنی زندگی کی کوئی پروا نہ تھی۔ اُنھوں نے ظاہری حالات کو اپنی بنیاد قرار نہیں دیا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اوائل عمر ہی سے آخری دم تک اشاعتِ اسلام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ شاہی دربار میں اگر خلافِ مرضی کوئی بات پیش آجاتی تو بھی مسکت جواب دے دیا کرتے۔ ہمیشہ، مال و متاع، جاہ و حشم اُن کی نگاہوں میں حقیر تھے ــــ ریشمی لباس اور زر و جواہر ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔

کوئی علم ایسا باقی نہ تھا جس کے حصول میں کوئی کمی رہ گئی ہو، جو آپ کی تصنیفات کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے

لیکن دُنیا والے ہمیشہ بغض وعناد کی آگ میں جلتے ہی رہے — اُن کو اپنے کام سے کام تھا۔ دُنیا والوں کی ریشہ دوانیوں کی پروا نہ تھی — انھوں نے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیا تھا۔ وہ اسی پر گامزن تھے، لوگ کچھ بھی کہتے رہیں، اُن کو اس کی پروا نہ تھی۔

وفات

دُنیاداری کو چھوڑ کر جو آدمی گوشۂ تنہائی اختیار کر لے، اس کو اس عالم کی نیرنگیوں سے کیا مطلب؟ کیا تعلق؟ وہ دُنیا سے سیر تھے۔ خدا کے دیدار اور اس کی مُلاقات کا اشتیاق تھا۔ ان کا ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کی یاد میں صرف ہو رہا تھا۔ موت کو ہر وقت یاد کرتے۔ فرشتۂ اجل کو خود بُلاتے، اس لیے کہ وہ دُنیا میں جس مقصد سے آتے تھے۔ وہ سب کچھ پُورا ہو گیا تھا — چنانچہ ———

ایک دن —— جبکہ ۱۴ جمادی الآخر ۵۰۵ھ کی صبح صادق نے اپنا گریبان چاک کیا، امام غزالیؒ اُٹھے — وضو کیا — ملک الموت سامنے آتے دکھائی دیئے — آپ نے پیش قدمی کی — سرِ تسلیم خم کر دیا — عرض کی — اس کا حکم بسر و چشم مانوں گا۔ اس کے بعد کفنی اپنے ہاتھوں سے پہنی — اور ملک الموت سے گویا ہوئے، کہ ہاں اب رُوح قبض کر لے — ملک الموت نے رُوح قبض کی۔ اب جسد خاکی یہاں رہ گیا تھا، رُوح عالمِ جاودانی کو پرواز کر چکی تھی۔ عالمِ اسلام میں ہلچل مچ گئی — طوس میں ماتمی صفیں بچھائی گئیں — شعراء نے مرثیے لکھے —— وہ دن بھی اتفاق سے پیر کا دن تھا، جو وصال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دن ہے۔

تاریخ ولادت : لفظ "مجتہد [۴۵۰] اور بحر العلوم" سے برآمد ہوتی ہے۔

تاریخ وفات : محب مجتبیٰ سے ۵۰۵ھ نکلتی ہے۔

تذکرۃ الشعراء میں تاریخ وفات یوں لکھی ہے :

نصیب حجۃ الاسلام ازیں سرائے سپنج — حیات پنجہ و چار [۴۵۰] و ممات پانصد و پنج [۵۰۵]

"مخبر الصادقین" میں مولانا مظہر الحق صاحب مرحوم کی لکھی ہوئی تاریخ وفات حسبِ ذیل ہے :

آں محمد امام غزالی — صاحبِ کشف و رُتبہ عالی
گرچہ او بود شافعی مذہب — لیک می داشت وسعت مشرب
روز آدینہ و چہاردہم! — بود تاریخ از جماد دوم
زیں حضیض جہاں بعلیین — رفت آں قدوۂ زمان و زمین
سال نقارا او تو اے خوشخو! — "جاوداں شاہباز عدن" بگو
سال نقلش باختلاف بداں — شد رقم "بادشاہ ملک جناں" [۵۰۵]

نائب نقوی — نفظ

———

دیباچہ

آسمانوں اور اس پر چمکتے ہوئے لاتعداد ستاروں، دُنیا کے تمام درختوں کے پتّوں، بیابانوں کی ریت اور اس کائنات کے مابین جتنے ذرّات ہیں، ان تمام چیزوں سے کہیں زیادہ اس پروردگار عالم کی حمد و ستائش ہے کہ وحدت و یگانگی جس کی صفت ہے اور بزرگی و کبریائی اس کی خصوصیت۔ وہ عالم و عالمیان میں بزرگ، اعلیٰ اور بلند مرتبہ رکھنے والا ہے۔ اس کی عزت و بلندی کی انتہا ہماری عقول سے بالاتر ہے۔ اس کی معرفت حقیقی میں انکساری اور عاجزی کا اظہار ہی سچائی اور بزرگی کے ہم معنی ہے، اور اس کی حمد کرنے سے اپنے کو قاصر سمجھنا ہی فرشتگان اولوالعزم کے لیے انتہائی حمد و ثنا کے برابر ہے۔ اس کے نور کی پہلی جھلک پاکر ہی اس کی محبت میں کھو جانا عقلمندی کی دلیل ہے اس کے نور کی تحقیق و تلاش میں انگشت بدنداں رہ جانا ہی سالکان راہ حقیقت کی اعلیٰ ترین پہچان ہے۔ لیکن اس کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا بھی بے عقلی کی نشانی ہے، اور اس کے اثبات میں ہزاروں دلیلیں سوچنا بھی اس کی مثال اور تشبیہہ دینے کے برابر ہے۔

معرفت الٰہی کی نورانی شعاعوں کے مقابل آنکھیں چُندھیا جانا ہی معرفت حقیقی کے برابر ہے۔ مبادا کوئی شخص ایسا نہ ہو کہ اس کی عظمت و بندگی میں چون و چرا کرنے لگے، کہ وہ کیوں کر ہوا، یا کیسے ظہور میں آیا۔ اس کے صنائع و بدائع کی خوبیوں سے واقفیت ہونا ہر ذی رُوح کے لیے لازمی ہے، کہ یہ سب چیزیں اس کی بنائی ہوئی ہیں۔ ضروری ہے کہ ہر آدمی سمجھے کہ دُنیا کی تمام موجودات اس کے بنائے ہوئے ہیں۔ تمام عجائب و غرائب کی معرفت ہمارا فرض ہے۔ دُنیا میں ہر چیز اسی کے لیے ہے، اور اسی کے سبب سے ہے۔ بلکہ ہر چیز وہ[1] ہی وہ ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی ہر شئے علاوہ اس کے فانی ہے۔ اس دُنیا کا وجود اس کی ذات کا ایک پرتو ہے۔

اس کے بعد درُود ہو، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ جو تمام پیغمبران اولوالعزم و انبیا و مرسلین اور مومنین کے رہنما ہیں۔ اور اس ستر خداوندی کے جاننے والے ہیں۔ وہ درگاہ خداوندی میں برگزیدہ حیثیت کے مالک ہیں اور اُن اہلبیت اطہار اور صحابہ کرام پر سلام ہو۔ جن میں کا ہر فرد اُمّت کا امام ہے، اور شریعت اسلام کے لیے مشعل راہ ہے۔

غرض و غایت تخلیق انسان

اے محبّ سمجھ لے! کہ اس پروردگار عالم نے انسان کو لہو و لعب کے لیے پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کی تخلیق کا سبب اپنے آپ کو پہچوانا ہے۔ انسان جو ابدی ہے، اگرچہ ازلی نہیں، یعنی انسان ہمیشہ سے نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ

---

[1] ہمہ اوست، صوفیائے کرام کا مقولہ ہے ؎

رہنے والا ہے - اگرچہ اس کا ظاہری جسم مٹی کا ڈھیر ہے۔ لیکن اِس کی رُوح خدائی نُور کا پرتو ہے - اس کی حقیقت پہلے پہل چوپاؤں اور شیاطین سے ملی جُلی تھی - لیکن وہ محنت اور عبادت خدا کی کسوٹی پر کسی جانے کے بعد ان آلائش سے پاک ہو کر قربت درگاہ پروردگار نصیب ہُوئی ہے - اسفل السافلین سے اعلیٰ علّیین تک تمام مراتب اور منازل طے کرنا اسی کا کام ہے -

سب کے نیچے کا درجہ اسفل السافلین کا اِنسانوں کے لئے چوپاؤں کی مثل ہے ، جو شیاطین کی عادات اختیار کرلے -

اعلیٰ ترین وہ اعلیٰ علّیین کا درجہ ہے ، کہ جو معرفتِ الٰہی حاصل کرکے فرشتگان و مقربین بارگاہِ ایزدی کی برابری حاصل کرلے - مثلاً نفسانی خواہشات ، غصّے اور غلبے سے پرہیز کرنے لگے ، یہ دونوں اس کے قبضے میں آجائیں ، اور اِنسان ان پر قابُو یافتہ ہو جائے - جب ان مراتب کو آدمی حاصل کرلے پھر مقربان بارگاہِ ایزدی کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے - یہ تقرب کا درجہ ہی انسان کی انتہائی تکمیل ہے - جب "انسان" خداوندِ عالم کے نورُ سے محظُوظ ہونے لگتا ہے تو اس کی معرفت سے اس کو کسی درجے پر بھی پہنچ کر صبر نہیں آتا ، بلکہ اس کی آخری منازل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور وہاں پہنچ کر خواہشاتِ دُنیا اور آلائشِ ظاہری اس کی نظر میں ہیچ اور ذلیل معلوم ہونے لگتی ہیں -

چونکہ ابتدائے آفرینش میں انسان ایک ناقص شئے تھی ، لیکن کسی نقص یا کمی کو دُور کرکے صحیح راستے پر چلا دینا ناممکنات سے نہیں ہے ، اِس میں صرف محنت و ریاضت کی ضرورت ہے -

جس طرح کیمیا تانبے اور پیتل کو سونا بنا دیتی ہے اور کیمیا کا حصول بہت دُشوار ہے ، اسی طرح اِنسان کو کیمیا کی طرح آلائشِ دُنیا سے پاک ہو کر ملائکہ کی صف میں پہنچ جانا دُشوار ضرور ہے ، لیکن اس میں انتہائی محنت اور ریاضتِ نفس کی ضرورت ہے - کہ اس صفائی کی بدولت آدمی فرشتگان اولوالعزم کی صفوف میں جا کھڑا ہوتا ہے -

مقصد تصنیف کتاب

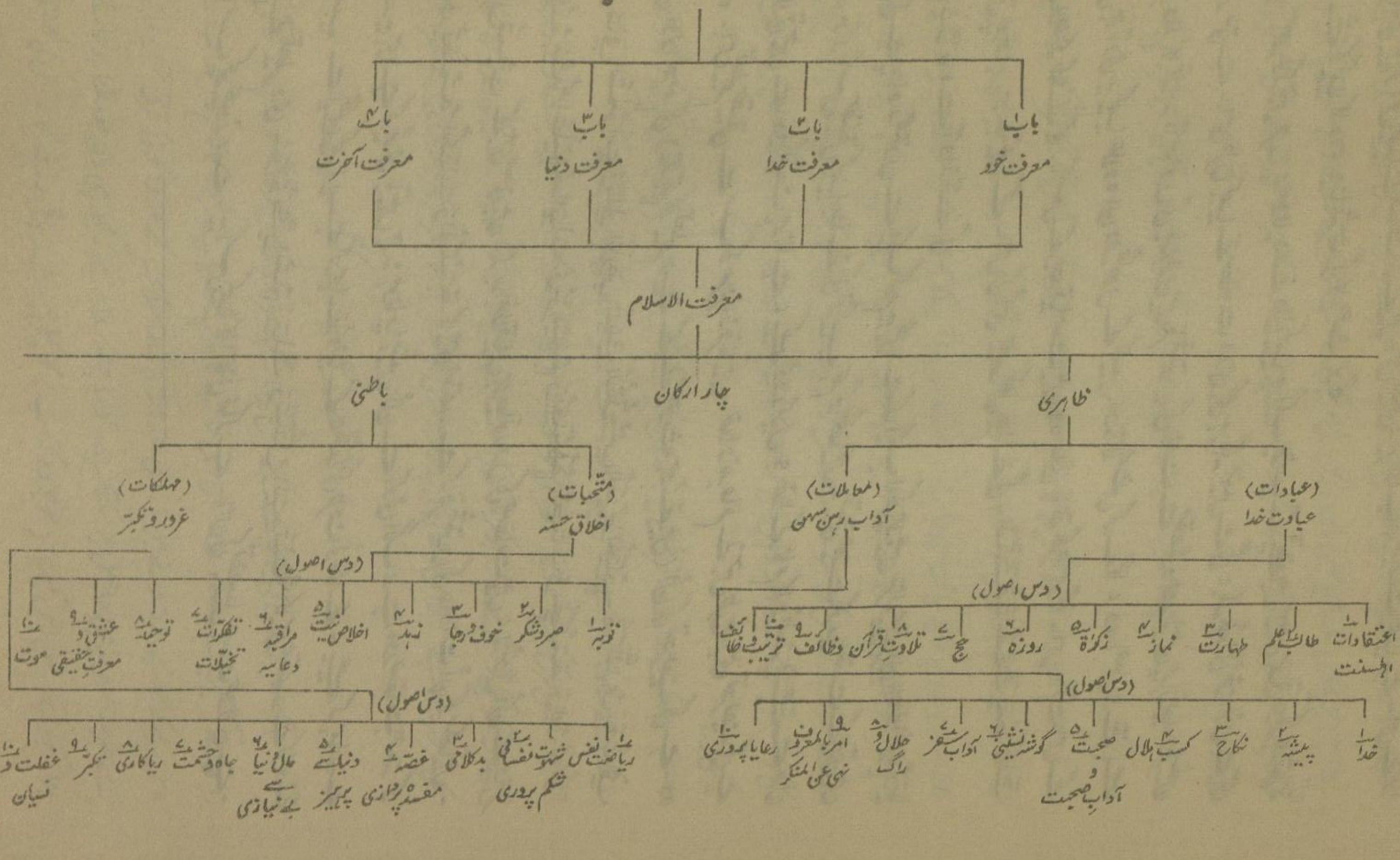
اس کتاب کی تصنیف سے اِس کیمیا کے اجزاء کا حاصل کرنا مقصُود ہے جو حقیقی کیمیائے سعادت ہے - اِسی لیے "کیمیائے سعادت" ہی اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے - کیمیا کا نام اس کتاب سے کافی نسبت رکھتا ہے اس لیے کہ تانبے اور سونے میں زردی اور وزن کے اختلاف کے علاوہ کوئی فرق نہیں - اِس دنیا میں اس ظاہری کیمیا سے صرف روپیہ ہی حاصل ہو سکتا ہے - دُنیا چند روزہ ہے - کچھ ہی دن بعد فنا ہو جائے گی - دُنیا کی کیمیا تم کو مالدار بنا سکتی ہے - لیکن اس کیمیا (موجودہ کتاب) کا پھل ہمیشہ باقی رہے گا - اس کی نعمتوں سے اِنسان ہمیشہ فیض

پاتا رہے گا اور کسی دُنیاوی مَیل کو اِس کیمیا کے صاف کرنے میں دخل نہیں ۔ یہ کتاب درحقیقت کیمیا ہے ۔ اس کے سوا کسی دوسری دُنیاوی شئے کو کیمیا کا درجہ دینا شرمندگی کا باعث ہوگا ۔

اے دوستو ! سمجھ لو کہ جس طرح پر سونا بنانے والی کیمیا ہر ایک بڑھیا کے قبضے میں نہیں ہوتی ، بلکہ بادشاہوں کے خزانوں میں زیادہ تر ملتی ہے ۔ اسی طرح کیمیائے سعادت ابدی بھی ہر جگہ نہیں ملے گی ، بلکہ خُدائی خزانوں سے ہی پا سکتے ہو ، اور خداوندِ عالم کا خزانہ آسمانوں کی بلندیوں میں فرشتوں کی ذات سے مقصود اور زمین پر انبیاء و مرسلین کے قلوبِ مطمئنہ ۔ پس جو آدمی یہ کیمیا علاوہ ان دو جگہوں کے کہیں اور تلاش کرے گا ، وہ اصل راستے سے بھٹک جائے گا ، اور دھوکہ کھائے گا ۔ اس کے بعد قیامت میں وہ خالی ہاتھ کھڑا ہوگا ۔ اس وقت اس کے کھوٹے سکّے تمام مخلوق پر ظاہر ہو جائیں گے ۔ اس کی اُلٹی سمجھ کھل جائے گی ۔ فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ اسے آواز آئے گی ۔

الرحم الراحمین کی بے پناہ رحمتوں سے ایک کرم یہ بھی ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبران اولوالعزم دُنیا میں ودیعت فرمائے ، تاکہ اس حقیقی کیمیا بنانے کی ترکیب ہم کو سکھائیں ۔ حقیقی محبت کو ریاضت کے برتن میں رکھنا بتائیں اور بد اخلاقی جس سے دل کثیف ہوتا ہے ، کیسے دُور کریں ؟ خدا کے نام کا وظیفہ پڑھنے سے دل کیسے صاف ہوتا ہے ۔ اِس تعلیم حقیقی سے سب کو سرفراز فرمائیں ۔ خداوندِ عالم نے جس طرح اپنی تعریف کی ہے اسی طرح اپنے پیغمبران اولوالعزم کی (جو ہم کو تعلیم دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں) اُن کی تعریف کی ہے ۔ وہ فرماتا ہے ۔ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ کے یہی معنی ہیں ، کہ بد اخلاقیاں جو جانوروں کی صفات ہیں ، رسول اُن سے پرہیز کرنے کی تعلیم دے اور يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کا یہی مقصد ہے کہ فرشتوں کی عادات اُن کو سکھائیں ۔ اور اس کیمیا کا مقصد یہ ہی ہے کہ بُری باتیں جو نہ ہونا چاہئیں اُن سے آدمی الگ رہے اور صفاتِ حسنہ کو حاصل کرنا سیکھے اور سب سے اچھی کیمیا یہ ہے کہ بجائے دُنیا کے ، خُدا کی طرف لَو لگائے ۔ جیسے کہ ہمارے رسولؐ کو خداوندِ عالم نے تعلیم دی ۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا کا یہی مقصد ہے کہ سوائے خدا کے اِنسان دنیا کا سب کچھ چھوڑ دے ۔ یہ اس کیمیا کا اجمالی خاکہ ہے ۔ اِس کی تفصیل بہت طوالانی ہے ۔

شجرہ
موضوعاتِ کتاب



موضوعِ کتاب

اِس کتاب میں حسبِ ذیل چار موضوعات پر بحث کی گئی ہے، اور ہر موضوع کے چار رُکن ہیں۔ ہر رُکن کی دس فصلیں ہیں۔

موضوعات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

باب اوّل : اِنسان کو اپنی معرفت

باب دوم : معرفتِ پروردگار

باب سوم : معرفتِ دنیا

باب چہارم : معرفتِ قیامت و آخرت

ان چاروں حقائق کی معرفت کا نام ہی حقیقی اِسلام ہے۔ معرفتِ اِسلام (تکمیلِ مسلمانی) کے چار ارکان ہیں۔ دو ظاہری ۔ دو باطنی

۱۔ ظاہر: پہلا رکن : احکامِ خداوندی کی بجاآوری، جس کو عبادت کہا جاتا ہے۔

دوسرا رکن : اپنی حرکات و سکنات اور کسب کا خیال رکھنا، جس کو معاملات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ باطن : پہلا رکن : غرور و تکبر۔ غلبۂ نفس، نیز کنجوسی سے پرہیز کرنا اور انھیں اخلاق کو راہِ دین کے عقبات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا رکن : اخلاقِ حمیدہ مثلاً صبر، شکر، محبت، رجا، توکل علی اللہ وغیرہ۔ ان اِخلاقیات کو منجیات کہتے ہیں۔

پہلا رکن : جس میں عبادت کا بیان ہے۔ اس کی دس اصلیں ہیں۔ اصلِ ۱ اہلِ سنّت کے اعتقاد کے بیان میں اصلِ ۲ طلبِ علم کے بیان میں اصلِ ۳ طہارت کے بیان میں اصلِ ۴ نماز کے متعلق اصلِ ۵ زکوٰۃ کے متعلق۔ اصلِ ۶ روزے کے بیان میں اصلِ ۷ حج کے بیان میں اصلِ ۸ قرآن مجید کی تلاوت اصلِ ۹ ادعیہ و وظائف کے بیان میں اصلِ ۱۰ وظیفوں کی ترتیب کے بیان میں۔

دوسرا رکن : آدابِ رہن سہن۔ اس کی بھی دس اصلیں ہیں:

اصلِ ۱ طعام کے متعلق اصلِ ۲ آدابِ نکاح وغیرہ اصلِ ۳ سوداگری و پیشہ وغیرہ اصلِ ۴ کسبِ حلال کے متعلق اصلِ ۵ آدابِ صحبت۔ اصلِ ۶ گوشہ نشینی اصلِ ۷ سفر کے متعلق اصلِ ۸ حال اور راگ کے متعلق اصلِ ۹ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اصلِ ۱۰ رعایا پروری اور ملوکیت کے بیان میں۔

تیسرا رکن : مہلکات کے متعلق - اسس کی بھی دس اصلیں ہیں :

اصل ۱ ریاضت نفس اصل ۲ پیٹ اور شہوت فرج وغیرہ کے متعلق اصل ۳ بات کی ہوس زبان کی خرابی کے متعلق اصل ۴ غصہ - مفسدہ پردازی اور کینہ پروری - اصل ۵ محبت دنیا سے بچنے کے متعلق اصل ۶ محبت مال سے پرہیز کرنا اصل ۷ جاہ و حشمت کے متعلق اصل ۸ ریاکاری، نفاق، نیز عبادات کے متعلق اصل ۹ تکبر و غرور و نخوت کے بیان میں - اصل ۱۰ غرور و غفلت کے پرہیز کرنے کے بیان میں -

چوتھا رکن : منجیات کے بیان میں - اس کی بھی دس اصلیں ہیں :

اصل ۱ توبہ کے متعلق اصل ۲ شکر و صبر کے بیان میں اصل ۳ خوف و رجا کے بیان میں اصل ۴ درویشی اور زہد کے متعلق اصل ۵ اخلاص نیت اور صدق و سچائی کے متعلق اصل ۶ مراقبے اور محاسبے کے بیان میں اصل ۷ تفکرات کے بیان میں اصل ۸ توحید ایزدی باری اور توکل کے متعلق اصل ۹ محبت الٰہیہ کے متعلق اصل ۱۰ موت کے یاد رکھنے اور موت سے متعلق امور کے بیان میں -

کیمیائے سعادت کے ارکان کی فہرست یہی ہے جو اوپر لکھے گئے ، اور ہم اس کتاب میں چار موضوعات اور اُن کے چالیس اصول کی تفصیل کے ساتھ شرح کریں گے ، اور کوشش کریں گے کہ آسان عبارت میں سمجھا سکیں تاکہ کتاب عام فہم رہے اور اگر اس کتاب کے علاوہ کوئی شخص کسی بات کی تحقیق کرنا چاہے تو عربی کتب کا مطالعہ کرے - مثلاً احیاء العلوم ، جواہر القرآن یا اور دیگر تصانیف جو اس سے متعلق ہیں - اس کتاب کی تصنیف کی غرض صرف یہی ہے کہ عوام اس علم کو آسانی سے سمجھ سکیں - بعض لوگوں نے یہ فرمائش کی کہ یہ علم فارسی زبان میں بھی لکھا جائے تاکہ مطلب ہماری سمجھ میں آسکے - دعا ہے کہ خداوند عالم میری اور اُن کی نیت خالص رکھے - اور آپس کے دلوں میں میل نہ پیدا ہو - توفیق خداوندی ہماری مددگار ہو - ہماری زبان سے جو الفاظ نکلیں اسی پر عمل بھی کریں جس بات پر عمل نہ ہو وہ بیکار رہے - اور عمل نہ کرنا ، قیامت میں موجب عذاب ہے ، نعوذ باللہ منہا -

آغاز کتاب

مسلمان ہونے کی تکمیل کے عنوان میں -

تکملہ مسلمانی کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے -

باب ۱

دربیانِ معرفتِ خود

اے دوست سمجھ لے! کہ اپنے نفس کو پہچاننا معرفتِ الٰہی کی نشانی ہے اور اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ' اور اسی واسطے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے یعنی ہم اپنی نشانیاں دنیا میں اور انسانوں کی ذات میں ہی دکھاتے ہیں تاکہ ہماری حقیقت کی جھلک اُن کو معلوم ہو سکے۔ دُنیا کی چیزوں میں کوئی شئے اتنی قریب نہیں ہے جتنا کہ تُو خود۔ پس اگر تو خود ہی کو نہیں پہچانتا، تو دوسری چیزوں کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔ اور اگر تیرا یہ دعویٰ ہے کہ اپنے کو پہچانتا ہے، تو یہ بھی تیری کم عقلی کا ثبوت ہے، کیوں کہ ایسی معرفت خدا کی معرفت تک تُجھ کو نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے کہ تیری طرح دعویٰ رکھنے والے تو جانور بھی ہیں۔ جس طرح تُو اپنے جسم کے تمام اعضا کو سمجھتا ہے۔ اور اس کے علاوہ تجھے اپنے اصل جوہر کی خبر تک نہیں، کہ وہ کیا ہے، تو صرف اتنا جانتا ہے کہ جب تیرے پیٹ میں بھُوک لگے تو کھانا کھا لے، اور پیاس لگے تو پانی پی لے۔ جب تجھے غصہ آئے تو کسی سے لڑ پڑے جب شہوت پریشان کرے تو نکاح کر لے۔ جانور بھی انھیں باتوں کے عادی ہیں۔ پس تو سمجھ اور سوچ کہ تیری حقیقت کیا ہے، تو کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا اور اس دُنیا میں کس مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ تیرے لیے کس کام میں نیکی اور بھلائی ہے، اور کس میں بُرائی اور بدبختی۔ اور وہ تمام صفات جو تیرے جسم میں پوشیدہ ہیں ان میں کچھ جانوروں کے سے ہیں، کچھ درندوں کے سے اور بعض اُن میں سے شیاطین کے عادات بھی ہیں اور کچھ فرشتوں کی بھی خصوصیات ہیں۔ اب تو یہ سوچ کہ مندرجہ بالا چیزوں میں سے تو کون ہے کیا ہے جس کا تو حامل ہے اور کون کونسی چیزیں تجھ میں عارضی طور پر آگئی ہیں۔ کیونکہ جب تک تو اپنی حقیقت کو نہ سمجھے گا راستہ نہ پائے گا اور ان میں سے ہر چیز کے لیے الگ الگ غذائیں مقرر ہیں اور الگ الگ نیکیاں متعین کر دی گئی ہیں۔ جانوروں کی عادت صرف کھانا، سونا اور مجامعت کرنا ہے۔ اگر تو بھی صرف ایسا ہی ہے تو شب و روز اسی میں کوشش کرتے رہو۔ تاکہ تیرے اعضا اور شہوت کا انتظام صحیح رہے۔ درندوں کی عادتیں لڑنا، مار کر کھا جانا غیض و غضب سے کام لینا ہے۔ شیطانوں کی خصلت شرارت پھیلانا، عیاری و مکاری کرنا ہے۔ اگر تو وہ عادتیں رکھتا ہے تو ویسا ہی بن جا تاکہ اسی سے حظ حاصل کر سکے اور اسی میں طاق ہو جائے۔ اسی طرح فرشتوں کا مقصد معرفتِ الٰہی ہے اور اُن کو درندوں اور چوپایوں کی صفات سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا اگر تیری سرشت فرشتوں جیسی ہے تو خدا کی معرفت کی

کوشش کر، تاکہ معرفت حاصل کر کے خواہشاتِ نفسانی سے چھٹکارا پا سکے اور خداوندِ عالم کی طرف رجوع ہو تاکہ درندوں اور اللہ والوں کے درمیان جو فرق ہے، اس کا اندازہ کر سکے کہ وہ صفاتِ حسنہ اور بدعنوانی کے عادات کس نے پیدا کیے۔ کیا ان کی آفرینش اس لیے ہوئی کہ تو اُن کا مقیّد ہو کر رہے اور وہ تجھ سے اپنی خدمت لے سکیں۔ یا تو خود اس لیے بنایا گیا ہے کہ اخلاقِ حسنہ یا عاداتِ ناشائستہ تیری اسیر ہو جائے، اور عاقبت کا سفر جو دُنیا میں رہ کر گزار رہا ہے اس کو سنوارے۔

پس کچھ تو چاہیئے کہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت دے۔ اور ان کو زیر کر کے نیکی کا راستہ اختیار کرے۔ خاصانِ خدا نے اس کا نام الہیت رکھا ہے۔ عوام اسی کو بہشت کہتے ہیں اور یہ تمام رموز تیرے سمجھنے کے لیے ہیں تاکہ تجھے اپنی ماہیت اور حقیقت کی معرفت ہو سکے۔ جس نے ان چیزوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کی، وہ گویا کہ شرمندہ اور عاجز رہا اور دین کی معرفت سے قاصر ——————

دلیل ۱: اے اشرف المخلوقات اگر تُو اپنی معرفت چاہتا ہے، تو پہلے سمجھ لے کہ تجھ کو دو چیزوں سے بنایا گیا ہے۔ اوّل یہ جسم جس کا ڈھانچہ تجھ کو نظر آتا ہے۔ دوم وہ نفس (رُوح) جس کا تعلق دل سے ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے حقیقی آنکھ ہونا ضروری ہے۔ رُوح کو ہماری ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، اور اسی لیے انسان کی حقیقت اور ماہیت باطن سے متعلق ہے۔ اور علاوہ دل اور جان کے جسم کے تمام اعضا اس کے ماتحت ہیں حقیقت کا نام دل ہے اور دل سے جو بات لکھی جائے وہ حقیقت سے مراد ہو گی۔ اس کو رُوح اور نفس سے بھی کبھی کبھی مُراد لیتے ہیں اس سے ہمارا مقصد اس ظاہری دل کے چھوٹے سے لوتھڑے سے مراد نہ ہو گا، جو انسان کے سینے کی بائیں جانب ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ ہماری نگاہ میں اس کی کوئی وُقعت نہیں۔ یہ مزغۂ گوشت تو ہر جانور کے جسم میں موجود ہے لیکن وُہ دل جس سے ہم حقیقتِ انسان مُراد لیتے ہیں، اُس کو ہماری یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، اور جو چیزیں ہم اپنی ظاہری آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، اُن کو عالمِ شہادت کہتے ہیں۔ وہ اسی دُنیا سے متعلق ہیں، مگر دل کی اصل اس ظاہری دُنیا سے تعلق نہیں رکھتی، وہ اِس دُنیا میں ایک مُسافر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ظاہری مزغۂ گوشت اس کی سواری اور ہتھیار کی طرح ہے جن سے وُہ کام لیتا ہے۔ نیز یہ تمام اعضاءِ جسم اس کا لشکر ہے اور وہ دل ان پر حکومت کرتا ہے۔ دل میں خداوندِ عالم کی معرفت اور اس کی قدرت کا پہچاننے والا ہے۔ ہر تکلیف اس کے لیے عبادت ہوتی ہے۔ ثواب و عذاب بھی اسی سے متعلق ہیں۔ اور حقیقی نیکی اور بدبختی بھی وہ ہی برداشت کرتا ہے جسم ہر حال میں اس کا تابع ہے۔ پس دل کے حقائق کا جاننا خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔ اس کی معرفت کی کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔ دِل سچّا موتی ہے اور فرشتگانِ آسمان کی جنس سے ہے۔ اس کی ماہیت خُدا کے نُور سے متعلق ہے، وہ اسی کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے اور اسی کی طرف واپس ہو جائے گا۔ اِس دُنیا میں صرف مُسافرانہ

حیثیت یا تجارت اور کاشتکاری کی بنا پر بھی گیا ہے (تجارت اور کاشتکاری کے متعلق آئندہ مفصل میں بیان کیا جائے گا)۔

دلیل ۲: اے مسلمان جب تک تُو دِل کی حقیقت کو نہ پہچانے گا، اس کی ہستی سمجھ میں نہ آسکے گی۔ اوّل اس کی ...... معرفت حاصل کر، کہ وُہ کیا چیز ہے اور اس کے تمام حصّوں کو سمجھ کہ ان کا اصل (دل) سے کیا تعلق ہے۔ بعد میں اس کی اچھائیوں پر نظر کر، کہ خدا کی معرفت کے درجات کیسے طے کرتا ہے۔ اپنی نیکیوں کو کس طرح پہچانتا ہے۔ ان تمام جزوی چیزوں کا بیان آگے آئے گا، لیکن دل کا وجود چونکہ ہر انسان کو معلوم ہے۔ لیکن اِس وجود سے مراد ہمارا یہ ظاہری جسم کا ڈھانچہ ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دل تو ہر مردہ جسم کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ہماری مراد اس کی اصل ماہیت اور حقیقت سے ہے۔ آسان طریقہ اس کے سمجھنے کا یہ ہے کہ اگر انسان کے ظاہری جسم میں وہ حقیقی ماہیت نہ ہوتی" تو وہ مُردہ ہو جاتا ہے۔ یا یُوں سمجھ لو کہ اگر کوئی انسان آنکھیں بند کر کے یہ سوچ لے کہ میرا جسم اس وقت نہیں ہے۔ یا زمین و آسمان اور موجودات عالم جن کو وہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہے، سب کو فراموش کر دے، تو وہ اپنے اس ظاہری وجود کو سمجھ سکے گا کہ صرف آنکھیں بند کرنے سے وہ سب چیزیں اس کے سامنے سے رُوپوش ہو گئیں۔ اسی طرح اگر انسان کچھ زیادہ غور کرنے کی کوشش کرے تو آخرت کے حقائق کی بھی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قیاس کرنا چاہیئے کہ اگر اس کا یہ ظاہری جسم چھین لیا جائے تو دل کا قائم رہنا اور حقیقت کا فنا نہ ہونا لازمی ہوگا۔

دلیل ۳: دراصل دل کی حقیقت کی معرفت اور حقائق بیان کرنے کی شرع اِسلام نے اجازت ہی نہیں دی۔ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي اور اس سے زیادہ بیان کرنے کی اِجازت نہیں کہ رُوح وہ حقیقت ہے جو امر الٰہی سے متعلق ہے۔ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ دُنیا کے امور الگ ہیں اور خدائی کام علیحدہ پس جس چیز میں کمی بیشی پائی جائے، اس کو عالم خلق کہتے ہیں۔ اس واسطے کہ خلق کے لُغوی معنی ہی "اندازے" کے ہیں۔ چونکہ انسان کے دل کے لیے کوئی کمی اور زیادتی نہیں ہے، اور وہ قابلِ تقسیم چیز نہیں ہے۔ اگر اس کے اجزاء ہو سکتے تو اس کا علم بھی محدُود ہوتا، اور اس میں کمی بیشی واقع ہوتی رہتی۔ اور ایک ہی وقت میں جہل و علم دونوں چیزیں جمع بھی ہو سکتی تھیں۔ مگر یہ چیز ناممکن ہے۔ چونکہ آپس میں ضد ہیں، پھر بھی اگرچہ رُوح ایک جزو لا یتجزیٰ ہے۔ اور مقدار یا تعداد کو اس میں دخل نہیں ہے۔ لیکن خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ خلق کی ہوئی چیز میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ روح بھی عالم خلق سے متعلق ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے رُوح کو عالم امر سے کہا جاتا ہے، اور عالم امر کی چیزوں کے لیے ناپ تول کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو لوگ رُوح کو قدیم سمجھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں لیکن جنھوں نے عرض سمجھا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ عرض چیزوں کو قیام نہیں ہوتا

اور وہ کسی دوسری چیز کے تابع ہوتی ہیں۔ پس رُوح عرض نہیں ہو سکتی اور رُوح کو جسم سے بھی لگاؤ نہیں کیوں کہ جسم کے اجزا ہو سکتے ہیں، لیکن رُوح ایک جوہر ہے جو ٹکڑے نہیں ہو سکتی اور وہ روح جس کو ہم دل سے تعبیر کرتے ہیں، وُہ خدا کا مرتبہ ہے اور وہ چوپاؤں یا درندوں کے جسم میں نہیں ہوتی اور وہ رُوح نہ جسم ہے نہ عرض، بلکہ فرشتوں کی جنس سے ہی متعلق ہے۔ اِس کی ماہیت کو جاننا مشکل ہے۔ اس کے متعلق بحث کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ حدیہ ہے کہ دینِ خداوندی کے ابتدائی مدارج طے کرنے والوں کو اس کی معرفت کی کوشش کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اول مجاہدہ نفس ضروری ہے اور جب اس میں ریاضت کرے گا، تو معرفت رُوح خود بخود حاصل ہوتی جائے گی، اور یہ معرفت حقیقی اُن ہدایات میں سے ہے، جس کے لئے پروردگارِ عالم نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور جس کسی نے معرفت کی ریاضت کے منازل کو طے نہ کیا ہو۔ اس کو رُوح کے حقائق پر دلائل سوچنے یا بیان کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اس معرفت کے حاصل کرنے سے پہلے بھی دل کے تمام اجزاء اور لشکر کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس سپہ سالار نے لشکر کو نہ سمجھا وہ جہاد کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

دلیل ۴ : اے مسلمانو! تمھارا جسم دل کی حکومت کا ماتحت ہے۔ اور اس حکومت میں بہت سے لشکر ہیں۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔ اسی کے معنی ہیں۔ دِل کو آخرت کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کا کام سعادت کے راستوں کی تحقیق ہے۔ اور اسی سعادت کا نام معرفت خداوندی ہے، اور خدا کی معرفت اس کی صفات کو پہچاننے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ تمام چیزیں عالمِ حیات سے متعلق ہیں اور عجائبات دنیا کی معرفت جو اس کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور حواس کا برقرار رہنا جسم سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا معرفت اس کی مقبوضہ چیز ہے اور حواس ایک جال کی طرح ہیں اور انسان کا بدن دل کے لیے ایک سواری کی مانند ہے جو اس کے مال کو سنبھالتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ دل کی معرفت کے لیے جسم کی حاجت ہوئی۔ اور یہ جسم عناصر اربعہ سے بنایا گیا ہے۔ اسی لیے یہ نازک اور کمزور ہے۔ جس میں باطنی طور سے بھوک اور پیاس اور ظاہری طریقے پر پانی آگ نیز اپنے دُشمنوں کے درندوں کے خوف سے بنا ہوا ہے اور باطنی طور پر اس کو بھوک اور پیاس کی حاجت ہوتی ہے۔ اس سبب سے اس کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ پہلا ظاہر حصہ جیسے ہاتھ، پاؤں، مُنہ، دانت، معدہ۔ دوسرا باطنی حصہ جس کو کھانے پینے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس طرح اس کے باہری دُشمنوں کی روک تھام کے لیے بھی دو حصے بنائے گئے ہیں۔ پہلا ہاتھ پیر جو سلاح کی مثال ہیں۔ اور دوسرا خواہشاتِ نفسانی اور غیض و غضب وغیرہ۔ چونکہ اِن سب باتوں کو دیکھنے یا محسوس کرنے کے لیے کسی ایک سبب کی ضرورت تھی۔ اس لیے پانچ حواس ظاہری (حواسِ خمسہ) بنائے گئے چھونا، چکھنا، سُونگھنا، دیکھنا، سُننا۔ اسی طرح پانچ حواس باطنی

کی تشکیل عمل میں آئی، جو حسب ذیل ہیں:

قوّتِ تحفّظ ۔ تخیّل، تفکّر، توہم اور قوتِ تذکر، جن کا مرکز دماغ ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک قوّت کے لیے ایک کام بنا دیا گیا ہے۔ اگر ان پانچوں قوا میں سے کسی ایک کا نظام خراب ہو جائے۔ تو نظام جسم و عقل کا کام جن سے دین و دُنیا بنتی ہیں، بگڑ جائے گا۔ یہ سب ظاہر و باطن کے قوا دراصل دل ہی کے غلام ہیں اور جب یہ زبان کو چلنے کا حکم دیتا ہے، تو وہ بولتی ہے۔ اسی طرح ہاتھ اسی کے حکم سے پکڑتا ہے۔ پیر اُسی کے حکم کے ماتحت چلتے ہیں۔ آنکھ دیکھنے کا کام کرتی ہے، اور قوتِ فکر و تخیّل سوچنے سمجھنے کا۔ ان تمام چیزوں کو دل کا فرمانبردار بنایا گیا ہے۔ تاکہ اپنے ظاہری جسم کی حفاظت کریں، تاکہ دل (جو بادشاہ ہے) معرفتِ خداوندی کے لیے دُنیا سے اپنا توشہ حاصل کر کے درجہ کمال کو پہنچ سکے اور اپنی سعادت کی بُنیاد ڈال سکے۔ یہ پُورا لشکر دل کی اطاعت میں سربسجود رہتا ہے، جو قہراً یا جبراً نہیں ہے۔ بلکہ برضا و رغبت دل کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اور خداوندِ عالم کی معرفت کے منازل اس طرح طے ہوتے ہیں۔

دلیل ۵ : دوستو! دل کے لشکر کی تفصیل تو بہت طولانی ہے۔ اصل مقصد صرف ایک مثال کے ذریعہ سمجھا دینا کافی ہوگا۔ لہٰذا معلوم ہونا چاہیئے کہ جسم ایک شہر ہے اور اعضاء اس شہر کے کام کرنے والے نوکر ہیں اور خواہشات اس کے حاکم، اور قوتِ غلبہ کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب کا بادشاہ دل ہے، جس کا وزیر عقل کو بنایا گیا ہے۔ ہر بادشاہ کو اپنے تمام عملے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تاکہ ملک کا انتظام صحیح طرح چل سکے۔ لیکن قوتِ شہوانی جو باہری جزوں پر عامل ہے وہ عقل کی مخالفت کرتی ہے اور ہمیشہ چاہتی ہے کہ مملکت کے سب خزانے کو خراج کے بہانے سے لے لے۔ اسی طرح قوتِ غیض و غضب انسان کو مار دھاڑ پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن بادشاہ اپنے وزیر عقل کے مشورے کے ماتحت اس کی گوشمالی کرتا رہتا ہے اور وزیر کے خلاف (خواہشِ نفس) کی نہیں سُنتا، اور کوتوال کو اُس کی تنبیہہ کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی کوتوال (قوتِ غضب) کی بھی ڈانٹ ڈپٹ ہوتی رہتی ہے، تاکہ وہ بھی اپنی حد سے آگے نہ بڑھے۔ بادشاہ کے اس عمل سے نظام حکومت صحیح طور سے چلتا ہے۔ اور اگر دل (بادشاہ) اپنے وزیر (عقل) کے مشوروں پر عملدرآمد کرتا رہے اور قوتِ غضب اور خواہشاتِ نفسانی کو عقل کا محکوم رکھے، اور عقل پر خواہشات کا غلبہ نہ ہونے پائے تو نظام بدن صحیح راستے پر گامزن رہ سکتا ہے۔ اور یہ راستہ درگاہِ ایزدی تک پہنچنے کا ہے۔ اگر بادشاہ (دل) اپنے وزیر (عقل) کو شہوانی خواہشات کے سپرد کر دے تو حکومت تہ و بالا ہو جائے اور بادشاہ اپنی بدبختی میں گھر کر ہلاک ہو جائے۔

دلیل ۶ : اے ایمان والے! اُوپر جو کچھ بتایا گیا وہ تُو نے سمجھا یا نہیں؟ کو قوا رغضب اور شہوت کی کھانے پینے نیز بدن کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں خواہشات جسمِ انسان کے محکوم ہیں۔ کھانا پینا جسم کی

خوراک ہے اور جسم کو حواسِ خمسہ کی حفاظت کے لیے ساخت کیا گیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بدن حواس کا غلام ہے اور حواس کو عقل کا مددگار بنایا ہے، تاکہ وہ (حواس) دُنیا کے عجائب و غرائب کو پہچانیں۔ تو معلوم ہوا کہ حواسِ خمسہ عقل کے ماتحت ہیں اور عقل کو دل کا ماتحت بنایا ہے، تاکہ وہ دِل کے لیے شمع کا کام کرے۔ اور دل عقل کی روشنی میں خُدا کے نوُر کو پہچان سکے، جو دل کے لیے بہشت ہے۔ اور خُدا نے اپنے نور کے نظاروں کے لیے ہی ودیعت کیا ہے۔ لہٰذا دِل جب اُس کی طرف رجُوع ہوتا ہے تو خُدا کی مشیت میں کھو جاتا ہے۔ اس متعلق پروردگارِ عالم فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ٥ یعنی میں نے کسی چیز کو نہیں خلق کیا۔ لیکن اپنی عبادت کے لیے۔ پس دل کو اس لیے بنایا گیا، اور اس کو یہ تمام لشکر اور کارکنانِ سلطنت کا مالک قرار دے دیا گیا۔ اس ظاہری جسم کو دل کی سواری کے لیے بنایا کہ دل اس کے ذریعے سے سفر کر کے اعلیٰ علیین تک پہنچ کر قربتِ خداوندی حاصل کر سکے۔ اگر اس کی خواہش ہے کہ شکر نعمتِ خداوندی ادا کرے اور بندگی بجا لائے، تو اپنے تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہو، اور خدا ہی کو اپنا مرکز بنالے۔ قبلہ و مقصد تصوّر کرلے اور آخرت اپنا جائے قیام سمجھ لے۔ دُنیا کو منزل تصوّر کرلے۔ جسم کو اپنی عارضی سواری، ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضاء کو ماتحت، عقل کو وزیر اور قوّتِ شہوانی کو مال کا محافظ، قوّتِ غضب کو کوتوال اور حواس خمسہ کو اُن کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے مقرر کر کے ہر ایک کا نظام بالکل متناسب کر دے، تاکہ ہر جگہ کی صحیح صحیح اطلاعات اس کو مل سکیں اور قوّتِ تخیل جو دماغ کی بالائی منزل میں جاگزیں ہے، اُن سب کا محافظ بنا دے تاکہ تمام ارکانِ سلطنت اپنی اطلاعات اس تک پہنچاتے رہیں، اور قوّتِ تحفّظ جو دماغ کے پچھلے حصّے میں جاگزیں ہے، اس کو محافظِ دفتر بنا دے، تاکہ جو خبریں افسران سے اس تک پہنچیں، اُن کو بحفاظت رکھے اور پیشی کے وقت وزیرِ عقل کے سامنے پیش کرے اور وزیرِ عقل یہ تمام اطلاعات جو پورے ملک سے اس کو پہنچی ہیں۔ اُن سب کے مُطابق بادشاہ کے حرکات و سکنات کی تدابیر اختیار کرتا رہے اور اگر وزیرِ عقل سمجھے کہ کارکنانِ سلطنت میں سے کوئی ارکان باغی ہوگیا ہے تو اُن کی سرکوبی کر کے راہِ درست پر لائے۔ اور اُن قوا، مخالف کے مقابلے میں جہاد کر کے اُن کو راہِ راست پر لانے کی سعی کرنے لیکن اُن کو قتل کرنے کا حکم نہ دیں۔ کیونکہ بغیر ان سب قوا (وزراء) کے حکومت برقرار نہیں رہ سکتی۔ ان کی درستی کی تدابیر عمل میں لاتا رہے، تاکہ وہ نیکی کے راستے پر آجائیں اور جس منزل (معرفت) تک اُن کو پہنچنا ہے۔ اس کی کوشش کریں، ڈاکو نہ بنیں۔ جب ایسا ہوگا، کوئی راستے سے نہ بھٹکے گا اور نیکیاں اس کا ساتھ نہ چھوڑیں گی خدا کی نعمتوں کا حق ادا ہو جائے گا اور وقت آنے پر درگاہِ خداوندی سے اس کا صلہ ملے گا۔ اگر اس کی مخالفت ہوگی تو بداعمالی کے سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔

دلیل ۷: عزیزم اِنسان کے دل سے جو لشکر متعلق کر دیا گیا ہے۔ اس کا تعلق لشکر کے ہر جزو سے ہے

اور ہر لشکر کے جز کے ماتحت اِنسان میں ایک عادت اور صفت ودیعت کی گئی ہے ۔ اُن میں سے بعض تو اخلاقِ بد ہیں، جو اِنسان کے لیے مُوجبِ ہلاکت ہوتے ہیں اور بعض نیک ہیں، جو درجۂ سعادت تک پہنچانے میں ممد و مددگار ہوتے ہیں ۔ اگر ان کی تفصیل تو طولانی ہے، لیکن اِس وقت صرف چار قسمیں بتائی جاتی ہیں ۔

اوّل چوپاؤں کی عادات، دوّم درندوں کے عادات، سوّم شیاطین کے عادات ۔ چہارم فرشتوں کے اخلاق ——— یہ سب اِنسان کی فطرت میں شامل ہیں ۔

تفصیل: چوپاؤں کی عادات اِنسان میں طمع اور خواہشِ شہوت کی بنا پر آجاتی ہے، جیسے کھانا پینا اور جماع کرنا اور غصّے کی کیفیت غالب ہونے پر آدمی کُتّے اور شیر کی حرکتیں کرتا ہے ۔ جیسے مارنا، قتل و غارتگری کرنا ۔ لڑنا جھگڑنا وغیرہ اور شیاطین کی عادات کے ماتحت مکر و حیلہ، فساد اور مفسدہ پردازی کرتا ہے اور جب اِنسان میں فرشتوں کے اخلاق کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس سے معرفت اللہ نیز بُرے کاموں سے پرہیز کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔

دراصل آدمی کا خمیر چار چیزوں سے مرکب ہے جن میں کُتّوں، سُور، شیطانوں اور فرشتوں کی عادات سب شامل ہیں ۔ کُتّا اپنی ظاہری شکل و صُورت یا گوشت پوست کی وجہ سے بُرا نہیں ہے، بلکہ عادات کے لحاظ سے بُرا ہے ۔ سوّر اپنی بدشکلی کی وجہ سے مکروہ نہیں ہے، بلکہ گندگی اور خباثت و پلیدگی کی وجہ سے بُرا سمجھا جاتا ہے ۔ کُتّے اور سُور کی روح کا حقیقی تجزیہ ہے جو اِنسان میں بھی شامل ہیں، اور اسی طرح شیطانوں کی اصلیت ہے اور فرشتوں کی اخلاقِ حسنہ ——— اِنسان کے لیے خدا نے فرمایا ہے کہ عقل کے نورُ سے بنایا گیا ہے، جو فرشتوں کے خمیر سے بنایا گیا ہے اسی طرح شیطان کے مکر و فریب کی حقیقت ہے کہ اس سے اِنسان رُسوا ہوتا ہے ۔ جیسا کہ رسُولِ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ ایک شیطان ہے اور میرے لیے بھی ہے، لیکن خداوندِ عالم نے مجھے اس پر فتح بخشی ہے اور شیطان مجھ سے مغلوب ہو گیا ہے ۔ مجھے بدی پر آمادہ نہیں کر سکتا، اور اِنسان کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ حرص و ہوس کے سُور اور غیظ و غضب کے کُتّے کو اپنی عقل پر حاکم نہ بننے دے، تاکہ بغیر سمجھے بُوجھے یہ قوا کوئی کام نہ کر سکیں ۔ جو آدمی اس حکم پر عمل کرے گا، اُس کو ان صفات سے نیکی ہی ملے گی، جو اس کی نیکی کے ثمرہ ہوں گے اور اگر اس کے خلاف کرے گا، اور اُن کا محکوم بن جائے گا تو بداخلاقی آ جائے گی ۔ جو اُس کی تیرہ بختی کے باعث ہوں گے اور اگر اس کو اس کی یہ بدبختی کی صحیح کیفیت بیداری یا خواب میں دکھائی جائے تو وہ اپنے کو کتّوں اور سور کے آگے دست بستہ کھڑا پائے گا ۔ اس کی آسان مثال یہ ہے کہ کسی مسلمان کو ایک کافر کے سپرد کر دیا جائے تو وہ اس کا کیا حال کرے گا ۔ اسی طرح اگر کسی فرشتے کو کسی کتّے یا سُور کے سپرد کر دیا جائے تو اس کا حال اس سے بھی بدتر ہو گا ۔ اگر آدمی انصاف کی نظر سے دیکھیں اور بہ نظرِ غور دیکھیں کہ وہ دن رات میں زیادہ تر اوقات میں حرص و ہوس کے غلام رہتے ہیں ۔ ان لوگوں کا حال کچھ ایسا ہے کہ آج بظاہر شکلِ اِنسانی میں

ہیں۔ لیکن کل میدانِ حشر میں یہ اصل بھید کھل جائے گا۔ جب اُن کے ظاہر جسم پر باطنی جسم عیاں ہوگا جس پر حرص و ہوس غالب ہے۔ دیکھنے والے اُسے سُور اور کتوں کی شکل میں دیکھیں گے اور جن لوگوں پر غصّے کی حالت غالب ہے۔ وہ بھیڑیئے کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ اس لیے جو آدمی خواب میں بھیڑیا دیکھتا ہے اس کی تعبیر قہر و ظالم ہی ہے۔ اور سُور دیکھے تو اُس کی تعبیر "انسان پلید" ہی ہے۔ چونکہ خواب اور نیند موت ہی کا ایک نقشہ ہے۔ جب عالمِ وجود سے وہ عالمِ خواب میں گیا اور صورت سیرت پر غالب آگئی تو ہر آدمی اپنے حقیقی کردار کے مطابق نظر آنے لگا۔ یہ ایک بہت بڑا راز ہے۔ ہماری اس کتاب میں اس کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔

دلیل ۸ : اے اسلام والو! جب تم کو باطن کے چاروں بادشاہوں کے متعلق بتا دیا گیا۔ اب تم اپنے جسم اور اس کی حرکات و سکنات کا اندازہ کرو کہ وہ کس کی فرمانبرداری کر رہے ہیں۔ یقین کرنا چاہیئے کہ تم سے جو حرکت صادر ہوگی۔ اس کے ماتحت تم میں ایک صفت بھی آجائے گی، اور وہ کچھ دنوں بعد تیری عادت بن جائے گی اور یہ عاداتِ حسنہ ہی اخلاق کہلاتے ہیں۔ اخلاق بھی انھیں چاروں حکمرانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر تو خواہشاتِ نفسانی کا مطیع ہے تو مفسدہ پردازی، بغض و عناد، ریشہ دوانیاں اور حسد وغیرہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر اس خراب عادت کو اپنا مطیع بنالے گا، تو تجھ میں نیکی کے صفات آجائیں گے۔ اس طرح اگر غصّے کی عادت کا مطیع ہوگا تو تجھ میں نڈر پن، کھرا پن اور نجاست کے صفات آجائیں گے۔ اگر کتوں والی صفات کو تو اپنا محکوم بنالے گا، تو انھیں عادات کے برعکس تجھ میں صبر و بردباری، شجاعت و بہادری پیدا ہوگی، اور اگر تو شیطانوں کی صفات کا حامل بن جائے گا۔ جو کتوں اور سور کی عادات سکھاتے ہیں۔ تو تجھ میں مکر و فریب اور تمام دوسرے افعالِ بد پیدا ہو جائیں گے۔ اگر ان شیاطین کی پیروی سے پرہیز کرے گا تو اور عقل سے کام لے گا تو معرفتِ الٰہیہ کی اچھی صلاحیتیں پیدا ہوں گی، اور جب یہ تمام اخلاقِ حسنہ تجھ میں آجائیں گے، تو تیرے بعد دُنیا والے تجھ کو اچھے نام سے یاد کریں گے اور یہی سعادت کا باعث ہوں گے جو نیکی کا بیج ہیں۔

ایسے افعال جن سے عادات بد پیدا ہوتی ہے، انھیں کو گناہ کہا جاتا ہے اور اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے والے افعال کو "عبادت" کہتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ کسی آدمی کے افعال مندرجہ بالا دو صورتوں سے الگ نہ ہوں گے۔ آدمی کا دل ایک آئینہ ہے جس پر بد اخلاقیوں سے زنگ چڑھ جاتا ہے اور وہ آئینہ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے، اور وہ نورِ خداوندی سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح نیک عادات آدمی کے آئینۂ دل کو جگمگا دیتے ہیں جس سے خدائی معرفت کے منازل طے ہو سکتے ہیں۔ اس کے متعلق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا (ہر بدی کے بعد نیکی کی طرف مائل ہوتا کہ بدی دُھل جائے) اور میدانِ حشر میں انسان کا دل یا تو سیاہ ہوگا یا نورانی۔ فَلَا يَنْجُو اِلَّا مَنْ اَتَى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔ آدمی کا دل آفرینش میں لوہے کی طرح ہے جس سے آئینہ

بھی بن سکتا ہے اور زنگ آلود لوہا بھی۔ اگر اس کو آئینہ بنایا گیا تو انوار روشن ہو جائیں گے اور اگر زنگ آلود ہی رہا تو گناہوں میں آلودہ ہو گیا۔ خداوند عالم نے فرمایا ہے کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

دلیل ۹ : تیرا خیال ہو سکتا ہے کہ جب انسان میں جانوروں کی صفات بھی شامل ہیں تو انسان کی حقیقت فرشتوں کی سی کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ تمام صفات بالکل عارض ہیں۔ یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ انسان کو فرشتوں کی عادات حاصل کرنے کے لیے کیوں کر پیدا کیا گیا ہے۔ یا دوسری صفات بد کے حصول کے لیے۔ لہٰذا سمجھ لے کہ انسان دوسرے جانوروں کے مقابل میں شریف اور عقلمند بنایا گیا ہے۔ اس میں سمجھنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور خداوند عالم کا مقصد آفرینش عالم بھی درجہ کمال ہی ہے۔ اسی لیے اس نے ہر چیز کو بنایا ہے۔ جس کی آسان مثال یہ ہے کہ گھوڑا گدھے سے افضل ہے۔ گدھے کو بار برداری کا کام سپرد ہے اور گھوڑا میدانِ جنگ میں جہاد کرنے کا مددگار ہوتا ہے۔ اگر گھوڑا اپنے اصل مرتبے سے گر جائے گا، تو بجائے سواری کے بار برداری کا کام لیا جائے گا۔ اور وہ اپنی اصل حقیقت سے گر کر گدھے کی ماہیت پر آ جائے گا اور یہ ہی اُس کی پستی کا سبب ہے۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ انسان کو صرف سونے، کھانے اور جماع کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لیکن یہی صفات جانوروں میں بھی ہیں۔ مثلاً اونٹ آدمی سے زیادہ کھاتا ہے۔ چڑیا انسان سے زیادہ جماع کرنے کی خواہاں ہے تو پھر انسان اور جانور میں کیا فرق ہوا۔ لیکن انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو ہر ذی رُوح سے ممتاز ہونا چاہیئے اور اس کو عقل کا وہ جوہر عطا کیا گیا ہے۔ جس سے خدا کی معرفت حاصل کر سکے۔ اپنے خواہشات کو روک سکے۔ بس یہ ہی صفات فرشتوں کی سی ہیں، جن کی بنا پر وہ درندوں اور چوپاؤں سے اعلیٰ ہے اور یہ تمام دُنیا کی چیزیں اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اس نے ان تمام چیزوں کو مسخر کر لیا ہے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔

پس دراصل انسان وُہی ہے جو درجہ کمال پر پہنچ جائے۔ باقی دوسری صفات محض عارضی ہیں جو انسان کی فرمانبرداری کے لیے بنائی گئی ہیں۔ جب انسان کی رُوح نکل جاتی ہے تو یہ سب عارض صفات ختم ہو جاتی ہیں اور اس میں وہ جوہر رُوح رہ جاتا ہے، جس میں نور ہے اور وُہ فرشتوں کی صفات کا حامل ہے۔ وہ خدا کی معرفت سے واقف ہوتا ہے۔ یہ نور ہی فرشتوں اور انسانوں کا ساتھی اور ممد ہے۔ جس کی وجہ سے خدا کی بارگاہ میں ان کو باریابی حاصل رہتی ہے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ۔

انسانوں کی عادات کے ساتھ ایک چیز تاریک بھی ہوتی ہے، جو اس کو بُری حرکات کی طرف لے جاتی ہے اور غصہ اور غضب کی کیفیات پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ صفت صرف اس دنیا سے متعلق ہے اور مرنے کے بعد یہ سب صفات بد دُنیا میں ہی رہ جاتی ہیں۔ چونکہ موجودہ دُنیا اس اعلیٰ صفات کی دُنیا سے نیچے ہے۔ لہٰذا یہ عادات

بھی اپنے مرکز کی طرف واپس ہو جاتی ہیں اور ان کا سر نیچا ہی رہتا ہے وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ کے یہی معنی ہیں اور جو ایسا ہو گا اس کا حشر شیطان کے ساتھ سجین میں ہو گا۔ اور سجین کے معنی ہر ایک آدمی کو نہیں معلوم۔ اسی واسطے خداوند عالم نے فرمایا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ٥

دلیل نمبر۱ دل کی گوناگوں حالتوں کی کوئی حد تعین نہیں کی جا سکتی۔ اس کی بزرگی کی وجہ یہ بھی ہے جس کو لوگ نہیں جانتے۔ اس کی بزرگی کے دو سبب ہیں اوّل علم، دوسرے قدرت۔

علم کی بزرگی کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک ظاہری سبب جس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ دوسرا حقیقی (پوشیدہ) جو عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کو ہر انسان نہیں سمجھ سکتا۔ جو بزرگی ظاہری ہے وہ تمام علوم اور صنائع کی سکھانے والی صفت ہے۔ اس کے ذریعہ انسان تمام صنعتوں کو سیکھتا ہے اور پڑھتا ہے اور اس کو اخذ کرتا ہے، جیسے علم حساب و ہندسہ، نجوم، طب، علم شرع وغیرہ اس کے باوجود دل ایک لاتیجزی چیز ہے۔ جس میں دنیا کے تمام علوم سما سکتے ہیں، بلکہ پورے جہان کا علم اس میں اس طرح آجاتا ہے۔ جیسے کسی دریا میں ایک قطرہ۔ ایک لمحے میں اس کا قوتِ تخیل زمین سے آسمان اور مشرقین سے مغربین تک پہنچ جاتی ہے۔ اگرچہ وہ خود زمین پر رہتا ہے، لیکن تمام سماوات کی گردش کرتا ہے۔ اس کی وسعت سمجھتا ہے اور ہر سیارے کی وسعت کو سمجھتا ہے اور یہاں تک بتاتا ہے کہ کونسا ستارہ کس سے کتنا فاصلہ رکھتا ہے۔ وہ مچھلی کو دریاؤں سے اور پرندوں کو آسمانوں کی بلندیوں سے نیچے لاتا ہے۔ کہیں طاقتور جانوروں کو جیسے گھوڑا، اونٹ اور ہاتھی کو اپنا مسخر کر لیتا ہے۔ دنیا کے تمام عجائب و غرائب علوم اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ ان تمام علوم کو اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعہ سیکھتا اور سمجھتا ہے اور جاننا چاہیئے کہ یہ حواسِ خمسہ انسان کے دل سے ہی متعلق ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جس طرح محسوسات کی دنیا میں جسم کے لیے حواسِ خمسہ ہیں۔ اسی طرح عالمِ ملکوت (روحانی دنیا) میں دل کے لیے ایک دروازہ ہے۔ لیکن بہت سے آدمی اس ظاہری جسم ہی کو جانتے ہیں اور ہر علم و صنعت کے پڑھنے اور سیکھنے کا ذریعہ حواس خمسہ ہی کو سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ خود بہت کم مقدار میں ہیں، بلکہ بے اصل ہیں اور فانی ہیں۔ دل کے اور بھی متعدد دروازے ہیں جو علوم حاصل کرنے کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے دو ثبوت ہیں۔

ایک عالمِ خواب جس میں حواسِ ظاہری بالکل بے پا ہو جاتے ہیں اور دل کے دروازے کشادہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انسان عالمِ روحانی (ملکوت) کی سیر کرتا ہے اور مستقبل کی بہت سی چیزیں اس کو نظر آجاتی ہیں۔ یا تو وہ صاف طور پر ان کو دیکھ لیتا ہے یا مثالی طور پر۔ ایسی مثالی چیزوں کے لیے تعبیر مانگنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ بیداری کے وقت لوحِ محفوظ کی اشیاء نظر نہیں آتیں، بلکہ خواب ہی میں نظر آتی ہیں۔ خواب کی حقیقت بتانا اس کتاب میں مناسب نہیں۔

لیکن اتنا سمجھ لینا ضروری ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ دِل ایک آئینہ ہے اور لوحِ محفوظ بھی ایک آئینے کی طرح ہے، جس میں تمام عالمِ موجودات کی اشیاء کا عکس موجود ہے۔ اسی طرح دل کا آئینہ ہے۔ اب اگر عکس والے آئینے کو صاف آئینے کے سامنے رکھ دیا جائے تو وُہ تمام تصاویر اس میں خود بخود نظر آنے لگیں گی۔ لہٰذا جب دل کا آئینہ کثافتِ دُنیا اور آلائشِ عالم سے پاک ہو تو وُہ لوحِ محفوظ سے متعلق ہوگا اور عالمِ ملوکیت کی تمام اشیاءَ اس میں نظر آنے لگیں گی۔ دل جب تک عالمِ جسمانیؔ (محسوسات) کی طرف متوجّہ رہتا ہے۔ عالمِ ملکوت اس کے سامنے سے پوشیدہ رہتا ہے، اور اس کو وہاں کی چیزیں نظر نہیں آتیں۔ چونکہ عالمِ خواب میں اِنسان جسمانی دُنیا سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ اِس لیے عالمِ ملکوت کو دیکھتا ہے۔ اگرچہ خواب میں حواس الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن تخیّل اپنی جگہ قائم رہتا ہے، اِس لیے وہ اس وقت جو کچھ دیکھتا ہے۔ خیالی دُنیا میں دیکھتا ہے اور وہ پردے میں ضرور رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے صاف صاف حال نہیں معلوم کر سکتا ہے۔ اس وقت اس کو کہا جاتا ہے۔ فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ اور وہ جواب دیتا ہے رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ۔ دوسرا ثبوت اس کا یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی آدمی ایسا نہیں کہ جس کی عقلی دلائل اور امورِ نیک دل میں نہ پیدا ہوتے ہوں جس کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ الہام دل میں پیدا ہوتے ہیں اور حواس ظاہری کے ذریعہ نہیں پیدا ہوتے۔ انسان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ باتیں اس کے ذہن میں کیسے پیدا ہوئیں۔ لہٰذا معلوم ہُوا کہ تمام علوم محسوسات کی دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔ اِس سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ دل اس عالمِ محسوسات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ عالمِ روحانی یا عالمِ ملکوت سے تعلق رکھتا ہے۔ جو علوم موجودہ عالم کے لیے بنائے گئے ہیں، وہ یقیناً عالمِ روحانی کو نہیں دیکھ سکتے، جب تک وہ اس عالمِ جسمانی سے معرفت حاصل کر کے حقائق و معارف کی طرف گامزن نہ ہوں۔

دلیل ۱۱ : اے دوست یہ نہ سمجھ کہ عالمِ روحانی کی طرف دل کا دروازہ قبل از موت نہیں کھلتا۔ یہ غلط خیال ہے، بلکہ اگر عالمِ بیداری میں کوئی شخص عبادت کرے اور اپنے دل کو خواہشاتِ نفسانی اور اخلاقِ شنیعہ سے بچائے۔ تنہائی اختیار کرے۔ ظاہری آنکھیں دُنیا کی طرف سے بند کرے اور حواسِ ظاہری کو یک دم معطّل کر دے۔ اس کے بعد اپنے دل کو معرفتِ الٰہیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اور بجائے زبان کے دل اللہ کا نام جپتا رہے اور اسی محویت کے عالم میں اپنے کو کھو دے۔ دُنیا کی ہر شئے سے بے نیاز ہو جائے۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد اِنسان کے دل کا دروازہ بیداری کے عالم میں بھی کھل جاتا ہے، اور جو دوسرے خواب کے عالم میں دیکھتے ہیں۔ وہ عالمِ بیداری میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ فرشتوں کے ارواح اس کو نظر آنے لگتے ہیں۔ وُہ انبیاء کو بھی دیکھتا ہے، اُن سے فیوض حاصل کرتا ہے۔ ملائکہ زمین و آسمان اس کو نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جب کسی کے لیے

یہ راستے کُشادہ ہوجاتے ہیں۔ اس کو عجائبات نظر آنے لگتے ہیں، جو صفات کی حدود سے بالاتر ہیں۔ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے زُوِیَتْ لِیَ الْاَرْضُ فَاَرَیْتُ مَشَارِقَھَا وَ مَغَارِبَھَا اور حق تعالیٰ نے ارشاد کیا ہے وَکَذٰلِکَ نُرِیْ اِبْرَاھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بلکہ انبیاء علیہم السّلام کے علُوم ایسے ہی درجات پر تھے تعلیم کسبی یا حواسِ خمسہ کے ذریعہ حاصل کئے ہُوئے نہ تھے۔ یہ سب کچھ مجاہدے کے ذریعہ حاصل کیا ہوا تھا جیسا کہ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًاo یعنی دُنیا کی ہر شئے سے قطع تعلق کرلے۔ اور اپنی ہر شئے اُسی کے حوالے کردے۔ دُنیا کی تدابیر اختیار نہ کرے۔ اس لیے کہ تمام کاموں کا بنانے والا وہ ہے۔

جب تُو نے اپنا وکیل خدا کو گردان لیا تو مخلوقِ دُنیا سے بے نیاز ہوجا۔ اور یہی تعلیم مجاہدے اور معرفت کی ہے، تاکہ تیرا دل محسوسات کے مشاغل، دُنیا کی خواہشات اور عداوت خلق اللہ سے پاک ہوجائے۔ یہی مسلک صوفیائے کرام اور شرعِ اسلام کا ہے۔ اِسی علم معرفت کا حصول علماء کے طریقہ کار پر ہے۔ اگرچہ راستہ بڑا طولانی ہے۔ لیکن خدا کے عطا کردہ علم سے تعلق رکھتا، جو انبیاء علیہم السّلام کو بخشش کیا گیا ہے، بہت آسان اور مختصر ہے۔ بہت سے انسانوں کو اس راستے کی معرفت عقلی دلائل اور تجربات کی بنا پر ہوئی ہے۔ لیکن اگر تجھ کو یہ سب باتیں ذوق اور تعلیم سے حاصل نہیں ہوسکیں تو تُو اِس سے منکر نہ ہو۔ اس پر ایمان لے آ! تاکہ ان تینوں درجات سے محروم نہ ہوسکے اور کافر نہ ہوجائے۔ یہ مرتبہ بھی دل کے عجائبات میں شامل ہے اور اس سے انسان کی بزرگی کا پتہ چلتا ہے۔

دلیل ۱۲ : اے دوست! یہ نہ سمجھ، کہ یہ سب درجات صرف پیغمبروں کے لیے ہی ہیں بلکہ ہر انسان میں ان کے حاصل کرنے کی قابلیت اور اہلیت موجود ہے جس طرح ہر لوہے میں آئینہ بننے کی خصوصیات موجود ہیں جس میں دُنیا کی ہر صُورت نظر آسکتی ہے، لیکن زنگ نے اُس کو بیکار بنا رکھا ہے۔ اسی طرح آلائش دنیا میں جو دل ملوّث ہوگیا اور خواہشات نفسانی غالب آگئیں اس میں حقائق کے پہچاننے کی اہلیت نہیں رہتی۔

ہر انسان میں یہ تمام اہلیتیں موجود ہونے کی خبر خداوندِ عالم نے دی ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰیo اور جس طرح کسی عقلمند سے سوال کیا جائے کہ دو ایک کے مقابل میں زیادہ نہیں ہیں۔ تو وہ جواب دے گا کہ ہاں! ہیں۔ اگرچہ لوگوں سے اس نے سُنا بھی نہ ہو، اور نہ کبھی اب سے پہلے زبان سے کہا ہو۔ لیکن سب کے دل اسی بات کو مانتے ہُوئے ہیں۔ جس طرح یہ بدیہیات انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ اسی طرح معرفت خدا بھی انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ خُدا خود فرماتا ہے۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا اور فرمایا وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا عقل تو بات سے یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ یہ درجات کسی خاص پیغمبر کے لیے ہی مخصوص نہیں۔ کیونکہ پیغمبر بھی ہماری طرح آدمی ہیں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ جس شخص پر یہ

راستہ کشادہ کر دیا جائے یا عالم و عالمیان کی اصلاح کے طریق کار خداوندِ عالم کی طرف سے اس کو ودیعت کر دیئے جائیں اور دُنیا والوں کو اس کی طرف آنے کی تلقین کرے۔ یہ تمام صفات اس میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جو کچھ خُدا نے اُس کو تعلیم دی ہے اسی کا نام شریعت ہے اور جو شخص ان صفات کا حامل ہے وہ پیغمبر ہوتا ہے اس کے حالات کو معجزات کہا جاتا ہے اور اگر وہ لوگوں کو اپنی طرف بُلا کر معرفت خدا کی تلقین نہ کرے وہ ولی ہوتا ہے۔ اس کے حالات کو کرامت کہا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص اس حالت کا حامل ہو وہ لوگوں کو ہدایت ضرور کرے، بلکہ ہر بات بھی منجانب اللہ ہوتی ہے کہ اس کے سپرد ہدایت کا کام کیا گیا ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ اس وقت شریعت کو سب لوگ جاننے والے موجود ہوں، یا پھر اس وجہ سے کہ اس شخص میں تبلیغ کرنے کی تمام صفات نہ پائی جاتی ہوں۔ پس چاہیئے کہ اولیاء اللہ کی ولایت و کرامت پر یقین محکم رکھے اور اس کا ایمان اس پر ہو کہ سب کام مجاہدے سے متعلق ہیں۔ اجتہاد کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس لیے کہ ضروری نہیں ہے کہ کھیتی کرنے کے بعد وہی شخص غلہ بھی کاٹے، یا جو گھر سے چلے وہ اپنی منزل پر بھی پہنچ جائے، اور جو شخص کسی تلاش میں سرگرداں ہو وہ اس کو پالے، اور جو کام جتنا وسیع یا اہم ہوتا ہے اس کے شرائط بھی اُتنے ہی اہم ہوتے ہیں۔ نیز اُن کا حصول بھی اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ مقامات ہی انسانی معرفت کی اعلیٰ دلیل ہیں۔ ان کا حصول بغیر جہادِ نفس یا تکمیل انسانیت کے ناممکن ہے۔ اور اگر یہ دونوں چیزیں حاصل ہو بھی جائیں پھر بھی پروردگارِ عالم کی مرضی اس میں شامل ہے کہ آیا ہدایت اور تبلیغ کا کام اس کے سپرد کرنا نہیں چاہتا۔ تو بھی وہ اس سعادت کو نہیں پہنچ سکتا۔ علم ظاہر میں امامت کا درجہ حاصل کر لینا۔ نیز دوسرے تمام کاموں میں بھی اسی کو اختیار رہے۔

دلیل ۱۳: انسان کے جوہر، بزرگی، معرفت) اب غالباً کچھ ضرور سمجھ گیا ہوگا، یہ اور سمجھ لے کہ قادر ہونے کے لحاظ سے بھی وہ فوقیت رکھتا ہے اور یہ صفت بھی فرشتوں کی صفات میں سے ایک ہے۔ دوسرے جانداروں کو یہ صفت حاصل نہیں ہوئی جس طرح عالمِ اجسام فرشتوں کا محکوم ہے۔ جب وہ چاہتے ہیں تو بارش ہوتی ہے اور موسمِ بہار میں ہوائیں چلتی ہیں اور رحم مادر میں حیوان کی شکل اور زمین کی تہ میں نباتات کی شکل بناتے ہیں، اس کو آراستہ کرتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے مختلف فرشتوں کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ نیز ایسے آدمیوں کو جنھیں فرشتوں کا دل دیا گیا ہے۔ انھیں بھی یہ اختیارات حاصل ہیں اور بہت سے عالمِ اجسام ان کے تحت میں ہیں۔ وہ صرف دل کا مطیع ہے، جس کی آسان مثال یہ ہے کہ ہماری اُنگلی میں دل نہیں ہے اور علم اور ارادے کا تعلق بھی اُنگلی سے نہیں ہے، لیکن دل جب اس کو حکم دیتا ہے تب وہ ویسے ہی حرکت کرنے لگتی ہے۔ اور جب دل میں غصے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو تمام اعضا جسمانی سے پسینہ جاری ہو جاتا ہے یہ بارش ہے اور جب دل میں شہوت پیدا ہوتی ہو تو آلۂ شہوت

میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد کھانے کی یا اس چیز کو اپنانے کی خواہش ہوتی ہے۔ جب کھانے کی قوت پیدا ہوتی ہے تو زبان اس کی مدافعت کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ لعاب دہن کے ذریعہ طعام کو تر کر دیتی ہے، تاکہ کھایا جا سکے اور جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے، تن پر دل کی بادشاہت ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بعض دل جو معرفت کے منازل طے کر چکتے ہیں اور ملائکہ کی عادات سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اس کی عادت شہر پر پڑے تو وہ اس کا مطیع ہو جاتے اور اگر وہ کسی بیمار کے لیے دُعا کرے یا تندرست آدمی کے لیے سوچے تو وہ ویسا ہی ہو جائے۔ اگر وہ کسی کو اپنی طرف رجوع کرنا چاہے تو اس کے دل میں خود بخود وہ جذبہ پیدا ہو جائے اگر وہ چاہیں کہ بارش ہو تو بارش ہونے لگے۔ یہ تمام باتیں اولیاء اللہ کے لیے ممکن ہیں۔ اور تجربات ان کی شاہد ہیں جس کو ہم نظر لگنا یا جادو کہتے ہیں۔ وہ بھی اسی قسم سے ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں میں انسان کے نفس کے اجزا کی تاثیریں ملی ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی نفسی حاسد ہے۔ اور وہ کسی جاندار موت کا خواہشمند ہے، تو وہ اس کی خواہش کے مطابق مرجاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا ہے۔ اَلْعَیْنُ تُدْخِلُ الرَّجُلَ الْقَبْرَ وَالْجَمَلَ الْقِدْرَ (نظرِ بد آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو دیگ میں ڈال دیتی ہے) یہ باتیں بھی دل کے عجائباتِ قدرت میں سے ہیں۔ اگر یہ باتیں کسی ولی یا پیغمبر سے سرزد ہوں تو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ اور اگر ولی سے ظاہر ہوں تو کرامت کہلاتی ہے اور ان خاصیت رکھنے والے انسان کو نبی یا ولی کہتے ہیں۔ اگر بُرے کام سرزد ہوں تو اس کو جادوگر کہیں گے۔ کرامات اور معجزات انسان کے دل کی قدرت کے نمونہ ہیں۔ اگر اُن میں ایک بیّن تفاوت ہے، جس کو بیان کرنا اس کتاب میں مناسب نہیں۔

دلیل ۱۴: جو کچھ اب تک تجھ کو بتایا گیا سب نبوت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ سب باتیں سمجھانے بجھانے سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ لہٰذا سمجھنا چاہیئے کہ نبوت اور ولایت انسان کے دل کی بلندیوں اور معرفتوں کے درجاتِ حسنہ میں سے ایک درجہ ہے اور ان درجات کا ماحصل تین خاصیتوں پر مبنی ہے۔ اوّل یہ کہ عوام کو وہ چیزیں جو ظاہری دُنیا سے متعلق نہیں ہیں، خواب میں نظر آتی ہیں۔ لیکن ولی یا پیغمبر ان سب چیزوں کو ہر وقت مشاہدہ کرتا ہے۔ دوئم یہ کہ عوام کا نفس اپنے جسم کے علاوہ دوسروں کے جسم پر بھی اثر نہیں کرتا لیکن پیغمبر یا ولی کا نفس اور اُن کے ارادے دوسروں کے اعضا کو بھی اتنا ہی متاثر کرتے ہیں۔ لیکن وہ سب نیکیوں کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ سوئم یہ کہ عوام کو علوم ظاہر و باطن کے سیکھنے اور پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن متذکرہ بالا درجات کے حامل کو ہماری طرح پڑھنے اور رٹنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ اپنی باطنی معرفت سے سب کچھ سیکھ لیتا ہے۔

جس طرح یہ ممکن ہے کہ صاف دل آدمی علوم کو خود بخود سیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ انتہائی عقل کو

پہنچا ہوا آدمی اور صفائی قلب رکھنے والا انسان اوپر بیان کئے ہوئے آدمی سے کہیں زیادہ جان جاتا ہے۔ اور اسی کو علمِ لدنی کہا جاتا ہے۔ خداوندِ عالم نے اس کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا اور جو آدمی ان تینوں خوبیوں کا حامل ہوتا ہے اس کا شمار پیغمبرانِ اولوالعزم میں ہے۔ اور جس شخص کو ان خصوصیات میں سے کوئی ایک خصوصیت حاصل ہے، اس کا شمار بھی اسی صف میں ہوگا، لیکن ایک دوسرے میں نمایاں فرق ہے یہ کہ کسی میں تینوں صفات تھوڑے ہوتے ہیں۔ اور کسی میں متوسط اور بعض میں بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں اور یہی درجۂ کمال ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حاصل ہے۔ جب خداوندِ عالم نے خواہش کی کہ نبوت کا کام کسی کو سونپے، تاکہ وہ اس کی فرمانبرداری کریں اور اس سے سعادت حاصل کریں، تو مندرجہ بالا صفات میں سے قدرے لوگوں کو ودیعت کیا۔ پہلی صفت سے خواب دکھایا۔ دوسری صفت سے عقول کو نور دیا اور تیسری سے ان کے دلوں کو معرفت عطا کی۔ چونکہ انسان کے لیے اپنی جنس کے علاوہ کسی پر ایمان لانے کا امکان نہیں جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ہم میں کسی چیز کی کوئی جنس موجود نہیں ہے۔ تو اس کی صورت جسمانی ہمارے ذہن نشین ہونا ناممکن ہے اور خداوندِ عالم کی معرفت اعلیٰ کو نہ پہنچنے کا سبب یہ بھی ہے کہ خدا کو اپنے وجود کی بنا پر ہم نے پہچانا ہے۔ نہ کہ اس کی ذاتی معرفت حاصل ہے۔ اس مسئلے کی بحث بہت طویل ہے۔ اس کو ہم نے کتاب "معانی اسماء اللہ" میں نہایت بسط کے ساتھ لکھا ہے۔

پیغمبروں اور رسولوں کے مندرجہ بالا صفات کے علاوہ بھی دوسری صفات کا ہونا ممکن ہو سکتا ہے، جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے اور ان چیزوں کا گمان بھی ہم کو نہ ہوا جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ بعض امور خدا نے صرف اپنے لیے ہی رکھ لیے ہیں، ان سے کوئی بشر واقف نہیں اور اس لیے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اعلیٰ کو بھی رسول کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یا ایسا آدمی جو ولی اللہ ہو، پس پیغمبر کی خصوصیت کو پیغمبر ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ علم ہی نہیں دیا گیا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر ہم کو خود سونے کی صفت معلوم نہ ہوتی، اور کوئی شخص ہم سے کہتا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور وہ نہ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے، نہ حرکت کرتا ہے اور نہ اس کو کل کا حال معلوم ہے۔ باوجودیکہ اس میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ تو ہم خواب (نیند) پر کس طرح یقین نہ کرتے کیونکہ آدمی اپنی عقل کی وجہ سے بغیر کسی چیز کو دیکھے ہوئے اس پر کلی اعتماد نہیں کرتا۔ اسی لیے خدا نے فرمایا ہے بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ اور فرمایا وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ اس پر حیران نہیں ہونا چاہیئے کہ پیغمبرانِ اولوالعزم میں ایسی کچھ صفات موجود ہیں جن کو بشر نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی آسان مثال یہ ہے کہ جو آدمی فنِ شعر سے مذاق نہیں رکھتا اس کو محفلِ سماع سے بھی دلچسپی نہ ہوگی۔ اور اس سماع یا شعر کے معنی سمجھانے سے اس کی سمجھ میں آنا ہی ناممکن ہے۔ اسی طرح اندھا

آدمی رنگ کی لذت کو محسوس نہیں کر سکتا۔ پروردگار عالم کی قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ نبوت کے درجات سے زیادہ بھی کچھ اوراکات اور معارف و حقائق کی تخلیق کرے، جس کی کسی کو خبر نہ ہو۔

دلیل ۱۵ : اب تک جو کچھ بتایا گیا۔ اس سے انسان کی بزرگی کے متعلق بہت کچھ سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اسی سے صوفیائے کرام کے مراتب کا بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ کون سا راستہ ہے۔ صوفیوں کا قول ہے کہ علوم ظاہری حقیقی معرفت کے راستوں کو نہیں پہچان سکے۔ لیکن تو اس سے منکر بھی ہے۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے۔ اس لیے جو علوم محسوسات سے متعلق ہیں، جب تک تو اُن کو مدِ نظر رکھے گا یہ حجاب تیری آنکھوں کے سامنے رہیں گے۔ اس طرح سمجھ کہ دل ایک حوض ہے اور "حواسِ خمسہ" اس کی پانچ نہریں ہیں جن سے اس حوض میں پانی آتا ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے دل کا حوض صاف و شفاف پانی سے (معرفت الٰہیہ) لبریز ہو جائے، تو اب تک جو کثافتِ دُنیا کا پانی اور میل اس میں جمع ہو گیا ہے۔ اس کو یک لخت نکال دے اور اُن حواسِ خمسہ کی نہروں کے راستے بند کر دے تاکہ دُنیوی آلائش کا پانی اس میں داخل نہ ہو، اور اس کے بعد دل کی گہرائیوں سے معرفت کا پانی اُبھے۔ اس کے بعد تیری آنکھوں سے یہ حجاب ظاہری ہٹ جائیں گے۔ بس یہی طریقہ ہے معرفت الٰہیہ کے حاصل کرنے کا۔ جب تک دل کو باہری دُنیا کے علوم سے پاک نہ کرے گا، اس وقت تک یہ حجاب باقی رہیں گے، لیکن اس میں ایک دوسری بات بھی سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ کہ اگر عالم اپنے دل کو علوم ظاہری میں مشغول نہ رکھے اور صرف معرفتِ خدا میں ہی اپنا علم صرف کرے، تو یہ سب حجاب خود بخود اُٹھ جائیں گے۔ حجاب کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مثلاً کسی اہل سنت کے عقائد پڑھے اور سیکھے، اور اس کے تمام دلائل اور براہین بھی سمجھ سکے، اور اُن عقائد پر اتنا پختہ ہو گیا، کہ دوسرے عقائد اس کی نگاہ میں ہی نہ رہے۔ اور اس کے بعد اگر کوئی بات اس کے دل میں پیدا بھی ہو جائے تو اس کو وہ غلط ہی سمجھ لے، اور طے کرلے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یا سُن رہا ہوں وہ بالکل غلط ہے، تو وہ اپنے عقیدے پر اتنا راسخ ہو جائے گا کہ دوسری چیزیں اس پر اثر نہ کر سکیں گی۔ پس ناممکن ہے کہ ایسے آدمی کو کسی دوسری بات کی کوئی حقیقت معلوم ہو۔ چونکہ جو عقائد عوام کو سکھائے اور پڑھائے جاتے ہیں، وہ حقیقت نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت کا عکس ہیں

اصل معرفت تو اس کا نام ہے کہ وہ تمام حقائق اس طرح کشادہ ہو جائیں، جیسے ہڈی سے گوشت اور اسی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جو آدمی اپنے عقائد کے متعلق گفتگو کرنا یا مناظرہ و مباحثہ کرنا سیکھتا ہے۔ اس پر یہ حقائق روشن نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یا جانتا ہوں صرف وہی درست ہے۔ لیکن دراصل اس کا یہ یقین ہی اس کے حجاب کا باعث ہوتا ہے اور چونکہ وہ آگے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، لہٰذا ان درجات معرفت سے محروم رہتا ہے۔ جو آدمی اس خیال کو چھوڑ دیتا ہے، اس کا علم ان حجابات کی وجہ سے معرفت کے درجے سے محروم نہیں ہوتا، بلکہ اس کو کشف حاصل ہوتا ہے اور اس کے درجات میں کمال پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے درجات

کم علم والوں کے مقابلے میں بے خوف اور ٹھوس ہو جاتے ہیں - کیوں کہ جہلا تو عمر بھر ایک اعتقادات باطلہ اور فاسدہ میں مبتلا رہتے ہیں - لیکن اگر ذرا سا شبہہ اس کو پیدا ہو جائے تو اس کے عقیدے میں فرق آجاتا ہے لیکن عالم ان تمام خطرات سے محفوظ رہتا ہے - پس معلوم ہوا کہ علم ایک حجاب ہے اور اگر تو کسی معرفت والے انسان سے اس کے متعلق سُنے تو اس سے انکار نہیں کرنا چاہیئے - لیکن مناظرہ و مباحثہ کرنے والے لوگ جن کی اس زمانے میں بہتات ہے - ان کی باتوں پر ہرگز یقین نہیں کرنا چاہیئے - کیونکہ وہ خود اس معرفت سے لاعلم ہیں اور اُنھوں نے چند ایسے صوفیوں کی باتیں سُن رکھی ہیں، جو دن بھر اپنے کو دھوئے لیکن پھر ناپاک رہے اور اپنی جائے نماز کو سجائے لیکن نماز اس کی بے کار ہو - وہ گدڑی پہنے رہے مگر دل میں ریشمی لباسوں کی محبت ہو، وہ لوگ علم اور علماء دونوں کی مذمت کرتے ہوں - اس قسم کے لوگ تو واجب القتل ہیں، کیوں کہ ایسے لوگ ہی مخلوقِ خدا، رسُول اور خدا سب کے دُشمن ہیں - خدا اور اس کے رسُول تو علماء کی تعریف کرتے ہیں اور تمام دُنیا کو علم کی دعوت دیتے ہیں لیکن ایسے صُوفی جو نہ حال جانتے ہیں اور نہ عالم ہی ہیں، بھلا یہ باتیں کیسے جائز ہو سکتی ہیں ؟ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے کہ جس نے سُنا کیمیا سونے سے قیمتی ہوتی ہے، کیوں کہ اس سے بے شمار سونا بنا سکتے ہیں اور جب اس کو سونے کا خزانہ دیا جائے تو اس کو کیمیا کی خواہش کے ماتحت ہاتھ نہیں لگاتا - اگرچہ اس نے کیمیا کو بھی نہیں دیکھا - ایسا شخص بدبخت اور بھوکا رہتا ہے اور صرف اس کو اپنی بات کی ریچ میں کہ جو کچھ کہہ چکا ہے (سونے سے کیمیا بہتر ہے) خوش رہتا ہے اسی پر ڈینگیں الاپتا ہے -

پس جاننا چاہیے کہ انبیاء اور اولیا کی مثال کیمیا کی سی ہے اور علماء کے علم کی مثال زر کی سی ہے اور چونکہ صاحبِ کیمیا صاحبِ زر سے افضل ہے، مگر یہاں ایک بات اور سمجھنے کے قابل ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس صرف اتنا ہی کیمیا ہے جو سو دینار سے زیادہ قیمتی سونا نہیں بنا سکتا، ایسے آدمی کو اس سے افضل نہیں کہا جا سکتا جو ایک ہزار دینار کا اول سے ہی مالک ہے - عام طور سے کیمیا کے متعلق سیکڑوں روایات مشہور ہیں ؛ اور کیمیا بنانے کے شوقین بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں - لیکن حقیقت میں ایسے لوگ کہیں شاذ ہی پائے جاتے ہیں اور بہت سے آدمی کیمیا کی تلاش میں صرف فریب ہی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں - بس اسی طرح یہ ظاہری صوفیائے کرام ہیں جن میں باطنی معرفت لاپتہ ہے - اور اگر ہے بھی تو شمہ برابر - ایک آدھ میں کوئی معرفت کے درجات کو پہنچتا ہے - پس ایسے آدمی کو جو شمہ برابر پا جائے - ایک عالم کے مقابل میں اس کی کوئی وُقعت نہیں - دیکھا گیا ہے کہ بعض صُوفیوں پر پہلے پہل حال کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کے بعد ہی ختم ہو جاتی ہے اور بجائے کمال کے زوال کی طرف اتر آتے ہیں - بعض ایسے ہیں کہ صرف تصورات ہی اُن پر طاری ہوتے ہیں، لیکن حقیقت ان میں بالکل نہیں ہوتی، لیکن وہ اپنے ضمیر کو سمجھا لیتے ہیں، اور اس کو صحیح ہی سمجھتے ہیں - جس طرح خواب کی حالت میں پریشان خیالات اور حال کی کیفیات

طاری ہوں، اسی طرح اس میں بھی یہی صورتیں پیش آتی ہیں۔ لیکن علما پر ایسے صوفیوں کو ضرور فضیلت ہوتی ہے، جو جو علمِ معرفت کے درجاتِ اعلیٰ بغیر سیکھے اور پڑھے حاصل کر چکا ہو، جن کو علما سیکھنے اور پڑھنے سے حاصل کرتے ہیں یہ درجہ بہت اعلیٰ ہے اور بہت نایاب۔ پس تم کو چاہیئے کہ علمِ تصوف کی حقیقت اور فضیلت پر ایمان رکھو، اور اس دنیا کے ظاہری صوفیوں کی وجہ سے حقیقی صوفیائے کرام کی طرف سے توجہ ہٹا لو، جو علما و فضلا پر طعن و تشنیع کرتے ہیں وہ صرف اپنی جہالت کی وجہ سے علما کو برا کہتے ہیں۔

دلیل ۱۶: اِن باتوں کے بعد شاید تجھ کو خیال پیدا ہو کہ اِنسان کی سعادتیں اللہ کی معرفت میں ہی ہیں۔ اس کے متعلق اتنا جان لینا کافی ہو گا کہ دنیا کی ہر چیز اپنی طبیعت کے مطابق ہر چیز کو پسند کرتی ہے، جس چیز میں اس کو آرام ملے وہ اس سے لذت حاصل کرتی ہے اور ہر چیز کو اسی بات میں لذت حاصل ہوتی ہے جس کے لیے وہ بنائی گئی ہے۔ مثلاً شہوت کی لذت اس کے پورا ہونے پر ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور غصہ اس وقت کم ہوتا ہے، جب وہ اپنے دشمن سے بدلہ اتار لے۔ آنکھ کو اس وقت لطف آتا ہے جب وہ حسین چہرے اور خوبصورت چیزیں دیکھ لے۔ کانوں کی لذت اس میں ہے کہ وہ بہترین نغمے اور گیت سنے۔ انھیں چیزوں کی طرح دل کی لذت ان چیزوں میں ہے جن کے لیے دل بنایا گیا ہے۔ وہ اپنے جسم کے تمام کاموں کی حقیقتوں کو خوب پہچانتا ہے۔ چونکہ آدمی کے دل کی خاصیت یہ ہی ہے۔ یہاں ایک بات ضروری یہ ہے کہ حواسِ خمسہ اور قوتِ شہوت اور غضب کے ذریعے محسوسات کو پہچاننا اِنسان کی طرح حیوانات میں بھی موجود ہے۔ لہٰذا اِن خواہشات کے ذریعہ جو چیز اِنسان کا دل جانتا ہے، وہ حیوانات ہی کی طرح ہے۔ مثلاً کوئی شخص شطرنج کھیلنا جانتا ہے اور اس کو منع کر دیا جائے کہ دوسرے کو نہ سکھا تو اس کو شطرنج سکھانے کی اور بھی خواہش پیدا ہو گی اور اس میں خوشی کا جذبہ پیدا ہو گا کہ وہ اپنی فضیلت ظاہر کر سکے کہ وہ ایک کھیل اتنا اچھا جانتا ہے۔ یہ پہلے بتایا گیا ہے کہ دل کی لذت کاموں کی معرفت ہی میں ہے لہٰذا سمجھ لینا چاہیئے کہ دل کو جتنے اچھے کاموں کی معرفت ہو گی، اتنی ہی اس کو لذت حاصل ہو گی۔ جس طرح کوئی آدمی وزیر کے بھیدوں سے واقفیت پانے کے بعد اس پر خوش ہو کہ بادشاہ کے راز اس کو معلوم ہو گئے اور جیسے کسی شخص کو علمِ ہندسہ کے ذریعہ آسمانوں اور ستاروں کی مقدار اور تعداد معلوم ہو جائے، جتنی مسرت اس کو ہو گی۔ اس سے کہیں زیادہ اس شخص کی ہو گی جو آسمانوں کے علوم سے اس شخص کی نسبت کہیں زیادہ جانتا ہو اور ہر اس آدمی کی مسرت کی منزلیں اتنی ہی بڑھتی جائیں گی جتنی اس کی دلچسپی کے ماتحت معرفت بڑھتی جائے۔

دلیل ۱۷: دنیا میں کوئی وجود خداوندِ عالم سے زیادہ اشرف نہیں، کیوں کہ موجوداتِ عالم کا شرف اسی کی وجہ سے ہے۔ دنیا کی ہر چیز اسی کی بنائی ہوئی ہے اور عجائباتِ عالم اسی کی کاریگری کا نمونہ ہیں۔ پس کوئی معرفت، معرفتِ خداوندی سے زیادہ لذیذ نہیں ہونی چاہیئے۔ اور کوئی نظارہ خدا کی جناب کے نظارے سے دلکش

کی نگاہوں میں خوشنما نہیں ہونا چاہیئے۔ چونکہ وہ اپنی ماہیت کے مطابق اس بات کا متمنّی ہے اور خدا نے اس کو اس وجہ سے ودیعت کیا ہے۔ اگر کوئی دل ایسا ہو کہ جس میں معرفتِ خداوندی کا جذبہ نہ ہو، وہ بیمار آدمی کی مثل ہے۔ جس کو روٹی کے بجائے مٹی کی خواہش ہو اور بعد علاج کرنے کے بھی اس کی یہ خواہش تبدیل نہ ہو سکے تو اس سے زیادہ بدبختی نہیں۔ وہ گویا کہ ہلاک ہوگیا۔ پس اس طرح جو دل خدا کی معرفت کی خواہش نہ کرے ایسا ہی بیمار ہے اور اگر وہ اپنا علاج کرنے سے قاصر ہو، تو وہ بدبخت ہے اور ہلاکت کے قریب ہے۔

جب موت قریب ہوتی ہے، تو انسان کے دل سے وہ خواہشات دُور ہو جاتی ہیں جو اس کے جسم سے متعلّق ہیں اور جو تکالیف ان کے حصول میں انسان اُٹھاتا رہتا ہے ان کا احساس بھی فنا ہو جاتا ہے لیکن معرفت اللہ کی لذات جو دل سے متعلّق ہیں، وہ موت کے وقت دوچند ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ دل ہماری ظاہری موت سے ہلاک نہیں ہوتا، اور معرفت حقّہ، اس وقت بھی برقرار رہتی ہے۔ بلکہ موت کے وقت معرفت کا نُور اور بڑھ جاتا ہے۔ اِس میں لذت اِس لیے بڑھ جاتی ہے کہ دوسری دُنیاوی خواہشات یکدم ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے متعلّق تفصیلی بحث "محبّت کے باب میں" کتاب کے آخر میں آئے گی۔

دلیل ۱۸ : دل کی معرفت اور درجات کے متعلّق جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس کتاب کے لیے کافی ہے۔ اس سے زیادہ اگر تفصیل چاہتے ہیں تو ہماری دوسری کتاب "عجائب القلوب" میں دیکھئے، بلکہ ان دونوں کُتب سے بھی آدمی کو اپنی معرفت پُوری طرح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ تفصیل صرف چند صفات کے ماتحت بیان کی گئی ہے جو ایک رکن ہے۔

آدمی کا دوسرا رکن اس کا جسم ہے۔ اِس کی پیدائش میں بھی لاتعداد عجائبات مضمر ہیں اور جسم کے ہر عضو میں ظاہر اور باطنی بے شمار نکات موجود ہیں۔ ہر ایک میں عجیب حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ انسان کے جسم میں ہزاروں رگیں ہیں اور ہر رگ میں بے شمار خصوصیات ہیں۔ اُن کی شکلیں الگ الگ ہیں، اور سب کو الگ الگ کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن انسان ان چیزوں سے غافل ہے۔ عوام صرف اِتنا جانتے ہیں کہ ہاتھ صرف پکڑنے کے لیے بنایا گیا ہے، پاؤں چلنے اور زبان بولنے کے لیے۔

پہلے آنکھ کے متعلّق سمجھو کہ اِس کو دس مختلف پردوں کے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کم و بیش ہو جائے، تو بینائی میں بھی کمی پیدا ہو جائے گی۔ آدمی کو نہیں معلوم کہ آنکھ کا ہر پردہ کا ہے کے لیے بنایا ہے اور آدمی اُن سب پردوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ آنکھ کی مقدار بھی تو دیکھتا ہے۔ اس کی تفاصیل بہت سی کتابوں میں لوگوں نے لکھی ہیں۔ اگر تو اس کے متعلّق نہیں جانتا تو کوئی تعجب نہیں۔ چونکہ تجھ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ جسم کے اندرونی اعضاء جیسے تلی، جگر، گُردہ اور پتّا وغیرہ کس لیے بنائے گئے ہیں۔

پس سمجھ لینا چاہیئے کہ جگر اس لیے ہے کہ معدہ جو کچھ کھائے وہ سب ایک ہی قسم کا سُرخ خون بنا دے تا کہ وہ ہفت اندام کے لائق بن جائے۔ جب جگر خُون کو پختہ بنا دیتا ہے، جس کی تلچھٹ سودا بن کر الگ ہو جاتی ہے۔ تلّی اسی لیے بنائی گئی ہے کہ وہ سودا جو تلچھٹ بنا ہوا جگر میں پڑا ہے، اس کو وہاں سے نکال لے۔ اس سودا پر جو زرد رنگ کی جھاگ نظر آتے ہیں وہ صفرا کہلاتے ہیں، اس کے بعد پتّا اپنا کام کرتا ہے وہ یہ کہ اس صفرا کو وہاں سے الگ کر لیتا ہے اور جب خُون بالکل صاف ہو کر رگوں میں جاتا ہے تو اِس میں پتلا پن آ جاتا ہے اور اس کا جمود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی اور خون الگ الگ ہو جائیں اور خُون بغیر صفرا اور سودا کے جسم کی گردش کرے۔ اگر پتّے میں کوئی نقص واقع ہو جائے تو صفرا خون سے الگ نہیں ہوتا۔ اور اس کے باعث سودائی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر گُردے میں کوئی کمی واقع ہو جائے تو پانی خُون سے الگ نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے استسقا کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جسم کے تمام اعضا کو کسی نہ کسی سبب سے بنایا گیا ہے تا کہ بغیر اُن کے جسم میں کوئی بیماری پیدا نہ ہو جائے۔ اِنسان کا بدن اِتنے اختصار کے باوجود بھی ایک پوری دُنیا کی مثال رکھتا ہے اور جو کچھ دنیا میں بنایا گیا ہے، وہ سب اِنسان کے بدن میں موجود ہے۔ مثلاً ہڈّیاں پہاڑ کی طرح ہیں۔ جسم سے جو پسینہ نکلتا ہے وہ بارش ہے۔ اور ہمارے بال درختوں کی مانند ہیں۔ دماغ آسمان ہے اور حواس خمسہ اس کے ستارے ہیں تفصیل تو اس کی بہت طولانی ہے، چونکہ تمام موجودات کی مثالیں کہاں تک بیان کی جائیں گی۔ مثلاً سؤر، کُتّا، بھیڑیا، چارپائے، دیو اور پریاں وغیرہ۔ اس کی طرف پہلے بھی کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان تمام چیزوں کی مماثل اِنسان کے بدن میں بھی پائے جاتے ہیں، بلکہ جو اعضا اس میں جو جو کام کرتے ہیں، اُن کی مثال بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً معدے میں غذا کو ہضم کرنے والی قوّت کو باورچی کہا جا سکتا ہے اور جو قوّت غذا کو صفائی کے بعد جگر میں پہنچاتی ہے، اس کو صاف کر کے خون کے رنگ میں رنگتی ہے۔ وہ رنگریز ہے اور وہ قوّت جو مرد کے فوتوں میں اس غذا کو سفید بنا کر منی کر دیتی ہے اور عورت کے پستانوں میں اس کو دُودھ بنا دیتی ہے، وہ دھوبی ہے اور جو قوّت غذا کو جگر سے دوسرے اعضا میں پہنچاتی ہے وہ بندھانی ہے اور وہ قوّت جو گردے سے پانی کو لے کر جگر کو دیتی ہے اور جگر سے مثانے کو پہنچاتی ہے، وہ سقّے کی طرح ہے اور وہ چیز جو مفاسد کو باہر نکالتی ہے وہ حلال خو ہے، اور وہ قوّت جو بدن میں صفرا وغیرہ پیدا کرتی ہے وہ مفسد ہے۔ جو قوّتِ صفرا اور دیگر بیماریوں کو دُور کرتی ہے، وہ حاکم عادل کی طرح ہے۔ اس کی تفصیل بھی بہت طولانی ہے۔ اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ تو صرف اتنا سمجھ لے کہ تیرے جسم میں مختلف قسم کی طاقتیں تیری خدمت کرتی ہیں۔ مگر تو غافل ہے۔ اُن کے متعلق تو سمجھتا ہی نہیں، اور اس خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔ میں نے ان سب قوتوں کو تیری خدمت کے لیے ودیعت کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے، کہ اگر تیرا کوئی دوست اپنے نوکر کو تیری خدمت

کے لیے صرف ایک دن کے لیے تیرے سپرد کر دے تو تو اس کا کتنا شکر گزار ہوگا۔ لیکن ذات باری تعالیٰ نے ہزاروں نوکر تیرے لیے بنائے، جو عمر بھر تیری خدمت کرتے ہیں، مگر تو اس قادرِ مطلق کو یاد نہیں کرتا۔

اعضا کے فوائد اور جسم کی ساخت اور ترکیب کے علم کو علم تشریح کہتے ہیں۔ یہ بہت مشکل اور اس کی کمی ہے۔ دنیا والے اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ وہ صرف اس لیے کہ حکمت میں استاد بن جائیں۔ حالانکہ علم طب خود اس کے مقابلے میں نہایت مختصر ہے۔ اگرچہ یہ علم دین سے متعلق نہیں ہے۔ لیکن اس کے جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ جو لوگ اس علم کو خداوند عالم کے عجائب و غرائب پہچاننے کے لیے پڑھتے اور سیکھتے ہیں اُن کو تین صفات خدا کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان کے ڈھانچے اور اعضا کو بنانے والا ایسا قادر ہے کہ دنیا کی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، وہ ایک قطرے سے انسان بنا سکتا ہے، اور جو ان تمام باتوں پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ موت کے بعد بھی جسم میں روح ڈال سکتا ہے۔ دوم یہ کہ وہ ایسا عالم اعلیٰ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کا علم اس کو ہے۔ اور یہ تمام عجائبات عالم بغیر اس کے علم کمال کے ناممکن ہیں۔ سوم یہ کہ اس کی رحمت بے کراں اپنے بندوں پر بغیر کسی حساب کے ہے۔ اس مخلوق کے لیے ہر چیز پیدا کی نیز جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ بھی۔ مثلاً دل، دماغ، جگر جو دوسری چیزوں کے مقابلے میں حیوانات میں مابہ الامتیاز ہے اور وہ چیزیں بھی دیں جن کی ضرورت نہ تھی اور بغیر اُن کے بھی زندگی گزر سکتی تھی۔ لیکن اُن چیزوں کی حاجت ضرور تھی۔ ہاتھ، پیر، زبان، آنکھ، ناک، کان وغیرہ، اور وہ بھی چیزیں عطا کی گئیں جن کی نہ حاجت تھی نہ ضرورت تھی، بلکہ صرف زینت انسان کا باعث تھیں جیسے بالوں کی سیاہی، لبوں کی سرخی، بھوؤں کا پیچ و خم، پلکوں کی ہمواری وغیرہ اور یہ تمام بخششیں صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ دوسری مخلوق کو بھی عطا کی گئی ہیں۔ بلکہ مچھر، مکھی اور بھڑ وغیرہ کو بھی جن چیزوں کی ضرورت تھی دی گئیں۔ اور ان کے بعد بھی مختلف رنگوں سے ان کے اجسام کو سجایا۔ پس انسان کی آفرینش کا مطالعہ کرنا معرفت خدا کی سیڑھی ہے، اور اسی وجہ سے حکمت کا علم بھی ایک اچھا علم ہے۔ وہ اس لیے نہیں کہ اس کی ضرورت ہے، بلکہ ایسا ہے کہ جتنا تو اچھے اچھے اشعار اور ان کی کیفیاتِ مذاق کو سمجھے گا۔ شاعر کا درجہ اتنا ہی تیرے دل میں بلند ہوگا۔ ویسے ہی خدا کی بنائی چیزوں کا جتنا مطالعہ وسیع ہوگا، اتنا ہی اس کی معرفت تجھ کو زیادہ ہوگی۔ حالانکہ علمِ طب، معرفت نفس تک ہی پہنچاتا ہے، لیکن دل کا علم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ کیوں کہ یہ علم بدن سے متعلق ہے، اور جسم ایک مرکب ہے۔ دل ایک سوار کی مانند ہے اور پیدا کرنے کا مقصد سوار ہی ہے، نہ کہ سواری۔ کیونکہ مرکب (جسم) سوار کے لیے ہے۔ نہ کہ سوار (دل) مرکب کے لیے۔ یہ سب کچھ تجھ کو بتایا گیا۔ وہ اس لیے تھا کہ تو یہ سمجھ لے کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ تیرا قریب کوئی نہیں۔ لہٰذا اپنے کو پہچاننے کی کوشش کر، لیکن تو بجائے اپنی معرفت کے دوسری چیزوں کی

معرفت کا دعویٰ کرتا ہے، حالانکہ یہ دعویٰ لاطائل ہے، اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی مفلس یہ کہنے لگے کہ تمام شہر کے مفلسوں کو میں ہی رزق دیتا ہوں۔

دلیل ۱۹: اب تک جو کچھ بیان کیا گیا، اس سے دل کی عظمت تجھ کو معلوم ہو گئی ہو گی۔ اب سمجھ لے کہ دل تیرے پاس ایک ایسا گوہر ہے جو تجھے نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر اس کی تلاش نہ کرے گا، تو وہ قیمتی گوہر کھو دے گا، اور جب کھو جائے گا تو وہ تیرے لیے نقصانِ عظیم کا باعث ہو گا۔ لہٰذا اب اپنے دل کی تلاش میں لگ جا اور دنیاوی مشاغل سے اس کو الگ کر لے، تاکہ تجھ کو عزت و بزرگی حاصل ہو سکے۔ جس کے بعد روحانی خوشی کمال لازوال، قدرت بے نیازی، معرفت حقیقی، نیز جمال باکمال کے مدارج پر پہنچ سکے۔ اس دنیا میں شرافت کا اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ حقیقی بزرگی اور عزت کی قابلیت و لیاقت حاصل کی جائے، ورنہ اس سے زیادہ کمزور اور بیمار کوئی نہیں کہ اس میں بیماری، بھوک، پیاس، رنج و تکلیف میں مبتلا رہے۔

جاننا چاہیئے کہ جن چیزوں سے دل کو آرام و استراحت محسوس ہوتا ہے۔ دراصل وہی اس کے لیے مضرت رساں ہیں، بلکہ دنیاوی تکالیف میں ہی حقیقی خوشی پوشیدہ ہے جو آدمی بزرگی اور عزت کے درجے کو حاصل کر لیتا ہے، وہ اس کے علم و ارادے کے سبب ہے۔ اگر انسان کے علم کو سمجھا جائے تو وہ ہی انتہائی جہالت کی نشانی ہے۔

اس کو اس طرح سمجھ! کہ اگر اس کے دماغ کی کوئی ایک رگ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو وہ دیوانہ ہو جائے گا۔ اور اس کو اس کے متعلق خبر نہیں کہ کیوں ہے۔ اگر اس کا علاج اس کے سامنے ہی کیا جائے تو بھی اس کو خبر نہیں ہوتی کہ یہ میرا علاج ہے۔ اس طرح اگر انسان کی قدرت و طاقت کا اندازہ کیا جائے تو اس سے زیادہ کمزور کوئی چیز نہیں۔ وہ دراصل ایک مکھی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر خدا اس پر ایک مچھر ہی کو مسلط کر دے تو وہ ہی آدمی کو ہلاک کر دینے کے لیے کافی ہو گا۔ اگر آدمی کے بھڑ کاٹ لیتی ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آدمی کی ہمت اور قوت کا اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک ثمہ برابر چاندی کے کھو جانے سے وہ بے چین ہو جاتا ہے، اور اگر بھوک میں اس کو روٹی نہ ملے تو غشی کے عالم میں گر پڑتا ہے۔ بھلا اس سے زیادہ کیا چیز خبیث ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد اگر انسان کی خوبصورتی اور حسن پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نجاست کے ایک ڈھیر پر سفید کپڑا کس دیا گیا ہے۔ اگر اس کو دو دن صاف نہ کرے تو وہ ایسی گندگی سے بھر جاتا ہے کہ وہ خود اپنے سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس کے بدن سے بدبو آنے لگتی ہے۔ آدمی سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز گندی ہو گی؟ اس کے جسم کے اندر ہر وقت گندگی چھپی رہتی ہے، اور وہ اس کو لیے گھومتا ہے۔ دونوں وقت صبح و شام نہا کر یا دھو کر اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک بار شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ صوفیوں کے ایک گروہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ایسے

مقام پر پہنچے کہ جہاں سنڈاس کو صاف کیا جا رہا تھا۔ راستہ نجاست کی وجہ سے خراب تھا۔ سب صوفی وہاں رُک گئے اور ناکوں پر اُنگلیاں رکھ کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ لیکن شیخ رحمۃ اللہ علیہ وہاں کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ۔ اے لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ میرے جسم کی نجاست مجھ سے اِس وقت کیا کہہ رہی ہے۔ دریافت کیا، کیا؟ تو جواب دیا، وہ کہتی ہے کہ کل میں بازار میں تھی، یعنی دُکان پر مٹھائی اور میوہ جات کی شکل میں آراستہ تھی۔ لوگ روپیہ خرچ کر کے مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے، اور میں صرف ایک رات تمھارے پیٹ میں رہ کر اس حالت کو پہنچ گئی۔ اب تو میرا فرض ہے کہ میں تم سے پرہیز کروں۔ جبکہ تُم لوگ مجھ سے بھاگ رہے ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اس دنیا میں نہایت عاجز اور بیکس ہے۔ کل قیامت کے میدان میں اس کی پوچھ گچھ ہوگی۔ تو اگر اس وقت تو کیمیائے سعادت کو اپنے دل کے گوہر میں محفوظ رکھے گا، تو چارپاؤں کے درجے سے فرشتوں کے مراتب پر پہنچ جائے گا۔ اگر اِس دُنیا کی خواہشات میں رہ جائے گا، تو کل میدانِ محشر میں سُور اور کُتّے تجھ سے اچھے حال میں ہوں گے، کیونکہ وہ خاک ہو کر زمین میں مل جائیں گے اور تو عذاب میں مبتلا رہے گا۔ پس اِنسان کو چاہیئے کہ اگر وہ اپنی بزرگی خلقت کو پہچانے تو اپنے نفس کی گندگی اور عجز پر بھی خیال کرے۔ کیونکہ یہ طریقہ بھی خدا کی معرفت کا ایک رتبہ ہے۔

پس اِنسان کو اپنے پہچاننے کے لیے اِتنا ہی کافی ہے کیونکہ اِس کتاب میں اِس سے زیادہ بیان کرنا ناممکن ہے۔

باب ۲

پروردگارِ عالم کی معرفت

اے مسلمان ! اوّل یہ سمجھ، کہ پیغمبروں کی کتابوں میں لکھا ہے اور اللہ کی طرف سے اُن کو یہ پیغام ملا ہے۔ اَعْرِفْ نَفْسَکَ تَعْرِفْ رَبَّکَ ۝ نیز اقوالِ صحابہ کرام اور احادیث رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم اس کی گواہ ہیں۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ اِس سے ثابت ہوا کہ اِنسان کا دل ایک آئینہ ہے۔ اِنسان جتنا اِس میں تحقیق اور غور سے دیکھے گا۔ معرفتِ الٰہی اس کو حاصل ہوگی۔ بہت سے آدمی ایسے ہیں، جو دل کے آئینے میں صرف اپنے کو دیکھتے ہیں۔ لیکن خدا کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے اوّل اپنے دل کی معرفت ضروری ہے۔ چونکہ وہ معرفتِ خدا کا آئینہ ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔

اُن میں ایک تو بہت مشکل ہے، جس کو سمجھنے سے عوام قاصر ہیں، نہ اُن کا نفس ہی اس کی معرفت کا متحمّل ہو سکتا ہے اور اگر اس کو بیان بھی کیا تو بیکار ہے۔

دوسرا طریقہ، جس کو سب سمجھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اِنسان اپنے وجود سے خدا کو پہچانے، اور اپنی صفات کے پہچاننے سے خدا کی صفات کی معرفت کرے، اور اپنے تصرفات کو جو اسے اپنے جسم پر ہیں۔ اِس کے ذریعہ خدا کو سمجھے کہ اس کے تصرفات کتنے وسیع ہوں گے کہ اس نے ہمارے ماتحت جب اتنی چیزیں بنائی ہیں، اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

اوّل، اِنسان اپنے وجود (ہست) کو سمجھے اور خیال کرے کہ اب سے چند سال پہلے اس کا وجود بھی نہ تھا۔ جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝

اور وہ چیز جس سے اِنسان اپنی اصل ہستی کو پہچانتا ہے کہ وہ درحقیقت ایک نجس قطرہ ہے، جس میں نہ عقل و ادراک ہے، نہ اعضاء جسمانی اور نہ حواسِ خمسہ، یہاں تک کہ ہڈی اور مزغہ۔ گوشت تک کا وجود نہیں، بلکہ صرف سفید پانی کا ایک قطرہ تھا اور اِس قطرے میں اگر یہ تمام عجائبات رونما ہوئے۔ وہ کیا خود اس کے خود ہی بنائے ہوئے تھے، یا کسی دوسرے کے۔ باوجودیکہ اِنسان اشرف المخلوقات ہے، لیکن ایک بال کو پیدا کرنے کی قوت و طاقت نہیں رکھتا، اور چہ جائے کہ اس وقت جبکہ وہ صرف ایک قطرۂ آب تھا۔ اس وقت وہ کیسے اپنے کو پیدا

کر سکتا تھا - لہٰذا اِنسان کو چاہیئے کہ اپنی ہستی سے خُدا کی ہستی کو پہچانے - جب اِنسان اپنے ظاہر و باطن کے حقائق کو دیکھے گا (جس کے متعلق پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے) تو اپنے پروردگارِ حقیقی کی معرفت حقّہ کو ضرور پہچان لے گا کہ میرا پیدا کرنے والا وُہ قادرِ مطلق ہے، اور وہ ہی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

اِس سے زیادہ اور کیا قدرت ہوگی ؟ کہ اُس نے ایک قطرۂ نجس و ناچیز سے کتنی اعلیٰ و ارفع اور عجیب و غریب ہستی پیدا کر دی - اِنسان جب اپنے اندرونی اور بیرونی اعضا جیسے ہاتھ، پیر، آنکھ، کان، ناک، جگر، تلی، پتّا وغیرہ کو دیکھتا ہے، تو اُس کی قدرت کے مظاہرے سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔

اُس کو اس وقت اپنے پروردگار کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ کتنا قدرت والا ہے - ہر چیز پر قادر ہے، اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ ایسے قادر اور عالم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی - اگر دُنیا کے تمام عاقل لوگوں کو جمع کر کے ان کو ہزاروں برس کی عمریں دے دی جائیں، تاکہ وہ غور کریں اور اپنے موجودہ اعضاء سے بہتر یا برابر ہی کوئی ایک عضو بنالیں، تو وہ قطعی قاصر ہوں گے، اور ہرگز نہ کر سکیں گے - مثلاً دانت -

کہ سامنے والے چار دانت انسان کے مُنہ میں صرف کاٹنے کے لیے بنائے گئے ہیں جو تیز ہوتے ہیں۔ اور اس کے برابر اِدھر اُدھر کی ڈاڑھیں غذا اور دیگر اشیاء کو پیسنے اور باریک کرنے کے لیے موٹی بنائی گئی ہیں اور دانتوں کے درمیان میں غذا کو پکڑنے کے لیے زبان ہے تاکہ اس کو باہر سے لے کر پیسنے والی چکّی (دانتوں) کے سپرد کر دے، اور زبان کے بعد حلق اِس کو خمیر کرتا ہے اور تری پہنچا کر گلے کے نیچے اُتارتا ہے - یہ جو کچھ شکل بنا دی گئی ہے، اس سے اچھی شکل اس کام کے لیے دنیا کا کوئی عقلمند نہیں بنا سکتا۔

اس طرح ہاتھ کی پانچ اُنگلیاں ہیں - چار اُنگلیاں برابر ایک ہی قسم کی کچھ چھوٹی بڑی بنائی گئی ہیں اور اُن سے ذرا نیچا اور فاصلے پر کچھ چھوٹا انگوٹھا بنایا گیا ہے - جو سب اُنگلیوں پر پھر سکتا ہے - اِس کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے کہ اس کو آدمی چاہے تو اس کو پیالے کی صُورت بنالے اور چاہے تو مکمّل بند کر لے، اور گھونسا بنا کر ہتھیار کی جگہ استعمال کرے - اور چاہے سب اُنگلیاں کھول کر طباق کی شکل بنالے، اور اگر تمام دُنیا کے عقلمند چاہیں کہ اُنگلیوں کی موجودہ وضع کے علاوہ کوئی ایسی یا اس سے اچھی شکل بنا کر یہ سب کام اس وقت بھی اِن سے لے سکیں تو ناممکن ہے - مثلاً یہ اُنگلیاں ایک ہی صف میں ہوں، یا دو ایک جانب اور تین دوسری طرف یا بجائے پانچ کے چھ اُنگلیاں ہوں یا چار ہوں - اس طرح اگر دو گروہوں سے زیادہ بنالیں، یا کم کر دیں اور ان سب کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں، وہ سب ناقص ہوں گے - کامل صرف یہ ہی ایک موجودہ طریقہ ہے جو اللہ نے بنا دیا ہے - اس کے معنی یہ ہُوئے کہ اللہ کا علم تمام مخلوق سے زیادہ ہے، وہ ہر شئے کا جاننے والا ہے، اور

انسان کے تمام اعضاء میں اس کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔

پس ان حکمتوں کی معرفت جس کو جتنی زیادہ ہوگی وُہ اتنی معرفت حاصل کر سکے گا۔ خدا کی بزرگی کا اتنا ہی قائل ہوتا چلا جائے گا۔ اِس طرح اِنسان اپنے حاجات کو سوچے تو اوّل اس کو اپنے تمام اعضاء کی ضرورت محسُوس ہوگی، اور پھر اس کو رہنے کے لیے مکان اور پہننے کے لیے لباس کی ضرورت محسوس کرے گا۔ اِسی طرح سردی، گرمی اور ہواؤں کی بھی ضرورت ہوگی۔ تاکہ وہ اس کے کھانے کی اشیاء کو استعمال کے قابل بنائیں، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری صنعتوں کی حاجت ہوگی، اور صنائع کے بنانے کے لیے اس کے اوزاروں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً لوہا، سیسہ، تانبا اور پیتل وغیرہ، اور ان کے آلات بنانے کے لیے اس کی تدابیر سیکھنے کی بھی ضرورت ہے، اور ان سب ضروریات کے احساس کے بعد انسان اس درجے پر پہنچے گا کہ اس کائنات کی تکمیل کا اندازہ ہو سکے کہ اس میں کیا کیا ضرورت ہوتی ہے —— چیزیں خدا نہ بناتا تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیسے وجود میں آئیں گی۔ یہ تمام مخلوقات و موجودات صرف اِسی پروردگار کا کرشمۂ قدرت ہیں۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اولیائے کرام کی زندگی اسی صفت سے وابستہ ہے اور ان کا وجود خداوندِ عالم کی رحمت ہے۔ سب مخلوقات پر، جیسا کہ اُس نے خود فرمایا ہے کہ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ۔ اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے لیے فرمایا کہ خدا کی محبت ہم پر اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جو ماں کو اپنے دُودھ پلانے والے بچے سے ہوتی ہے۔

پس جب آدمی نے اپنے وجود سے خدا کی معرفت حاصل کر لی اور اپنے اعضا اور بناوٹ کی تفاصیل سے اس کی قدرت کو پہچان لیا۔ اس کی حکمتوں اور اپنے اعضا کی نفع بخش ساخت سے اس کے کمال کو سمجھ لیا۔ اور جن چیزوں کی ہماری زندگی کے لیے ضرورت تھی، اور ہمارے جسم کی زینت کے باعث ہو سکتے تھے، وہ سب ہم میں جمع ہونے سے قدرت اللہ ہم کو معلوم ہو گئی —— اس کی رحمت کو ہم نے اپنے وجود سے جان لیا۔

پس یہی طریقہ معرفت نفس اور معرفت خداوندی کا آئینہ ہے۔

دلیل ۲ : جاننا چاہیئے کہ جس طرح آدمی نے اپنی صفات کے ذریعہ خُدا کی صفات کو پہچانا اور اپنی معرفت سے اس کی معرفت حاصل کی۔ اس طرح اس تنزیہہ اور تقدس سے سمجھے۔ خدا کے لیے تقدیس و تنزیہ کا مقصد یہ ہے کہ جتنی چیزیں ہمارے تصورات میں آتی ہیں وہ سب سے اعلیٰ وارفع ہیں۔

اگرچہ وہ ہر جگہ پر قابض اور متصرف ہے، لیکن وہ کسی جگہ سے نسبت نہیں رکھتا، وہ ہر چیز سے منزّہ ہے انسان اس تقدیس اور تنزیہ کی مثال اپنے بدن سے ہی سمجھ سکتا ہے کہ اس کی جان کی اصل جو "دل" ہے وہ تمام

دوسری چیزوں سے منزہ ہے، جو خیال و قیاس میں آسکتی ہیں۔ کیونکہ دل کے لیے بھی چھوٹائی اور بڑائی نہیں اور نہ وہ ٹکڑے ہونے کے قابل ہے۔ اور جب وہ اجزا ہوئے یا کمی بیشی سے بلند ہے تو اس کو کسی ایک رنگ، کا ہونا لازمی ہے۔ اور جس چیز کا کوئی رنگ ہوگا، یا مقدار ہوگی، وہ خیال سے بالاتر ہوگی۔ خیال میں وہ ہی چیز آسکتی ہے جسے آنکھ دیکھ چکی ہو، یا اس کی شبیہہ کبھی آنکھوں سے گزر چکی ہو، اور سوائے رنگ، یا شکل کے آنکھیں کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتیں، اور نہ خیال ہی اس کا تصور کر سکتا ہے۔ جب ہماری طبیعت یہ چاہے کہ فلاں چیز کیسی ہے، یا کیا ہے؟ تو گویا اس چیز کی تعداد، مقدار ہوگی، اور جس چیز کی مقدار نہ ہو اس کی حقیقت کو معلوم کرنا لاطائل ہے۔

پس اگر تو کسی ایسی چیز کی تحقیق کرنا چاہے، جس میں چون و چرا کی گنجائش نہ ہو، تو اپنی حقیقت کو دیکھ! تیری حقیقت خداوندِ عالم کی معرفت کی سیڑھی ہے، جو مقدار یا کمی بیشی کے لائق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر تجھ سے دریافت کیا جائے کہ رُوح کیا چیز ہے؟ تو اس کا صرف یہی جواب ہے کہ اس میں دلائل کو دخل نہیں ہے۔

لہٰذا جب تو اس مرتبے کو پہنچ گیا، تو گویا تو ان صفات کا حامل ہو گیا۔ جہاں خدا کی ذات کے متعلق تو کہہ سکتا ہے کہ وہ دلائل سے منزّا اور مبرا ہے، اور وہ ہی ذات سب سے زیادہ پاک اور افضل ترین ہے۔

لوگوں کو تعجب ہے کہ کوئی وجود بھی بغیر کسی دلیل کے کیسے ہو سکتا ہے، لیکن وہ اپنی ماہیت پر بھی غور نہیں کرتے، کہ وہ خود بھی بغیر کسی ثبوت کے موجود ہیں، اگر آدمی اپنے جسم کی اندرونی چیزوں پر غور کرے تو اس میں بھی اس کو بہت سی چیزیں بے چون و چرا ملیں گی۔ مثلاً تیرے کسی عضو میں درد ہو، یا کسی کے عشق میں مبتلا ہو، پھر ذرا سوچے کہ اس کی چونی و چگونی کہاں ہوگی، اور جب ان چیزوں کے لیے رنگ اور شکل نہیں ہے تو اس کے لیے یہ سوال بھی ناممکن ہے۔ وہ کیوں کر ہیں اور کیسے ہیں؟ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آواز یا ذائقے یا بو کی حقیقت دریافت کرے۔ کہ یہ سب چیزیں کیا ہیں۔ تو اس کا جواب ابھی نہیں ہو سکتا۔ دراصل اس کا سبب یہ ہے کہ چون و چرا خیال اور تصور پر مبنی ہے، جو آنکھ کی روشنی سے حاصل ہوتا ہے اور تخیل آنکھ کے ذریعہ ہر چیز کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور آواز جو کان کے ماتحت ہے۔ اس سے کان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح آواز دیکھنے سے بے تعلق ہے۔ پس اسی طرح جو چیزیں صرف دل کی قوت سے حاصل ہوتی ہیں اور عقل سے پہچانی جاتی ہیں۔ وہ تمام حسیات سے پاک ہے۔ ثبوت اور دلائل کی ضرورت محسوسات میں پیش آتی ہے۔ یہ طولانی بحث کا محتاج ہے۔ اس کی تفصیل معقولات کی کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔ موجودہ کتاب میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں یہاں صرف اتنا بتانا ہے کہ انسان اپنی بے چونی و چگونی سے خدائی بے چونی و چگونی کی معرفت حاصل کرے، اور یقین کرلے کہ جس طرح اس کی رُوح موجود ہے اور تمام اعضا کی بادشاہی کرتا ہے۔ ان تمام اعضا کے لیے

دلائل کی ضرورت ہے، وہ سب اسی رُوح کے قبضے اور تصرف میں ہیں، لیکن وہ (رُوح) بذاتِ خود بغیر کسی دلیل کے پہچانی جاتی ہے۔

بس معلوم ہوا کہ اس دُنیا کا شہنشاہِ حقیقی (پروردگارِ عالم) بھی بے چون وچرا مانا جاتا ہے اور تمام محسوساتِ عالم جو اس کے فرمانبردار اور مطیع ہیں، اور محسوسات سے متعلق ہیں، وہ سب اس کی مملکت میں ہیں۔

دوسری دلیل خداوندِ عالم کے منزّا ہونے کی یہ ہے کہ اس کو کسی ایک جگہ سے منسوب نہیں کر سکتے۔ جس طرح رُوح کو کسی خاص عضوِ بدن سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نہیں بتا سکتے کہ ہماری روح ہاتھوں میں ہے، پیروں میں ہے یا سر میں۔ ہم اپنے بدن کے تمام اعضا الگ الگ کر سکتے ہیں، لیکن ہماری رُوح (جان) کے مختلف حصّے ناممکن ہیں۔ چونکہ وہ جزو لایتجزیٰ ہے، اور جسم قابلِ تقسیم ہے۔ باوجود اس کے بھی رُوح کو جسم کے کسی عضو سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ حالانکہ رُوح جسم کے ہر ہر عضو میں سرایت کی ہوئی ہے اور وہ جسم کے تمام اعضا پر حکومت کرتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جس طرح روح کے لیے تقدیس ہے، اسی طرح اس خدائے لایزال کے لیے بھی، اس کے لیے اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اور اگر رُوح پر جزوی طور سے بحث کی جائے تو یہ بات بالکل صاف طور پر سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن اس کی ہمیں اجازت نہیں۔ یہ سب حالات اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ سے ثابت ہوتے ہیں۔

دلیل ۲ اے اِنسان، جب تجھ کو معلوم ہو گیا کہ خدا کی ذات پاک تمام دلائل سے بالاتر ہے اور اس کی تقدیس وتنزیہ کے متعلق تجھ کو یقین ہو گیا، کہ وہ کسی خاص جگہ یا مکان سے منسوب نہیں ہے۔ اور یہ بھی تجھ کو بتا دیا گیا کہ انسان کا نفس ہی معرفت الٰہیہ کی کنجی ہے اس کے بعد ایک بات اور بھی بتانا باقی ہے۔ اور وہ یہ ——— کہ ———

پروردگارِ عالم اپنی دُنیا پر کس طرح حکومت کرتا ہے۔ فرشتوں کے لیے احکامات کس طرح صادر ہوتے ہیں اور وہ اس کا حکم کیسے بجالاتے ہیں۔ آسمان اور ستاروں کو کس طرح گردش میں لاتا ہے۔ زمین والوں کے کاموں کو آسمان سے کس طرح متعلق کیا ہے۔ اہلِ زمین کے رزق کو آسمان سے کیا نسبت ہے۔ اور اس کائنات کا نظام کس طرح چل رہا ہے۔ ان باتوں کی معرفت نہایت عظیم الشان مرتبہ رکھتی ہے ——— اس کو معرفتِ افعال کہتے ہیں۔ اور جو معرفت کے درجات پہلے بیان کیے گئے ان کو معرفت ذات یا معرفت صفات کہا جاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ معرفت افعال کی کنجی بھی معرفت نفس ہی کی طرح ہے۔ اگر انسان یہ نہیں جانتا کہ دل جسم کی سلطنت پر کس طرح بادشاہی کر رہا ہے تو تیرے لیے یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ پروردگارِ عالم اس وسیع عالم پر کس طرح حکومت کر رہا ہے۔ اوّل اپنے کو پہچان۔ مثلاً جب تو چاہتا ہے کہ

بسم اللہ کسی کاغذ پر لکھے ، اس کے متعلق اوّل مثلاً جب تو چاہتا ہے کہ تیری توجہ اس طرف مبذول ہوتی ہے ۔ پھر تو ارادہ کرتا ہے اس کے بعد تیرے دل میں جنبش پیدا ہوتی ہے ، لیکن وہ ظاہری حرکت دل میں ظاہر نہیں ہوتی ، جو تیرے سینے میں ایک مزغہ گوشت کی طرح ہے ، بلکہ اس کی وہ شئے لطیف ایک ارادے کے ساتھ دماغ کی طرف عود کرتی ہے ۔ جس کو حکماء نے رُوح سے منسوب کیا ہے جو تمام حس و حرکت کی مالک ہے ، لیکن حیوانوں کی رُوح میں اور اس رُوح میں بیّن اختلاف ہے ، جس رُوح کو ہم یہاں دل سے تعبیر کرتے ہیں وہ حیوانوں (چوپاؤں) میں نہیں ہوتی ۔ اِس رُوح کے لیے فنا بھی نہیں ہے ، کیونکہ وہ خداوندِ عالم کی معرفت کی کنجی ہے چنانچہ یہ رُوح جس وقت دماغ کی طرف عود کرتی ہے ۔ اس وقت دماغ کے اوپری خزانے میں جو قوّتِ فکر ہے وہاں بسم اللہ کی شکل و صُورت میں جاتی ہے اور اس کے بعد وہ شکل دماغ کے دوسرے اعصاب میں پھیلتی چلی جاتی ہے اور وہ سب اعصاب اپنے اپنے محکوم اعضا کی طرف تقسیم کر دیتے ہیں اور وہ رگوں اور پٹھوں کے ذریعہ اُنگلیوں تک پہنچ کر اُنگلیوں کے سرے لکھنے کا کام شروع کر دیتے ہیں اور بسم اللہ کی اصل شکل دماغ اور آنکھوں کی توجہ کے ساتھ صفحہ قرطاس پر پیدا ہو جاتی ہے ۔ پس جیسے تجھ میں پہلے پہل لکھنے کی رغبت کا تصور ہُوا ۔ اس طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ دُنیا کے تمام کام خداوندِ عالم کی صفات میں سے ایک صفت کا نتیجہ ہیں ، جس کو ہم اِرادہ کہتے ہیں ۔

جس طرح اِس ارادے کا اثر انسان کے دل میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور دل کے ذریعہ دوسرے اعضاء تک پہنچتا ہے ۔ اِس طرح خدا کے اِرادے اوّل عرش پر ظہور میں آتے ہیں ، اور وہاں سے دوسری جگہوں کو تقسیم ہوتے ہیں ، اور جس طرح تیرا دل اُن ارادوں کو جسم کی رگوں کے ذریعہ دوسرے اعضا تک پہنچا ہے ، جس کو روح کہا جاتا ہے ۔ اس طرح خداوندِ عالم کے لیے بھی ایک جوہر لطیف تصوّر کرنا چاہیئے جو اُن اثرات کو عرش سے کرسی تک نیچے کی طرف پرواز کراتا ہے ۔ اِس جوہر لطیف کو فرشتہ کہتے ہیں اور اسی کا نام روح القدس ہے اور جس طرح اِرادے کا اثر دماغ کو جاتا ہے جو اس کے ماتحت ہے ، اسی طرح خدا کے ارادے کا اثر اوّل عرش کو ملا ۔ اس سے کرسی کو اور اس کے بعد بتدریج اور چیزوں کو "بسم اللہ" کی مثال کے ماتحت جو میرا مقصد ہے ۔ تیسرا فعل دماغ کے خزانے میں پرورش پاتا ہے اور وہ فعل اس کے ماتحت ظہور پذیر ہوتا ہے ویسے ہی ہر شکل جو دُنیا میں ظاہر ہوتی ہے پہلے پہل اس کا نقش لوحِ محفوظ میں ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح وہ قوّت لطیف جو دماغ میں ہے اور انسانی اعصاب کو حرکت میں لاتی ہے اور وہ اعصاب دوسرے اعضاء کو حرکت میں لاتے ہیں ۔ جس کے بعد اُنگلیاں چلتی ہیں اور قلم اُنگلیوں کے ذریعہ حرکت کرنے لگتا ہے ۔ اس طرح وہ جواہرات لطیفہ جو عرش و کرسی پر منقوش ہیں ، وہ آسمانوں اور سیاروں کو حرکت میں لاتے ہیں اور جس طرح دماغ کی قوّتِ جسیم

کے رگ اور پٹھوں کو ہلاتی ہے۔ اسی طرح وہ جواہرِ لطیفہ (جن کو ہم فرشتہ کہتے ہیں) ستاروں اور اُن کی نورانی شعاعوں کے ذریعے اس دنیا (عالمِ سفلی) تمام چیزوں کی اصل (اُمہاتِ عالمِ سفلی) کو حرکت میں لاتے ہیں جو عناصرِ اربعہ کہلاتے ہیں یعنی گرمی، سردی، خشکی اور تری۔ اس کے بعد یوں سمجھو کہ جس طرح قلم سیاہی کو کاغذ پر پھیلاتا ہے اور اس سے نقوش بسم اللہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ حرارت ٹھنڈک، تری اور خشکی ان مرکبات کے جوہرِ اصل کو حرکت دیتی ہے اور جس طرح کاغذ جس پر قلم چل رہا ہے، اس روشنائی کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ اسی طرح عناصرِ اربعہ کی تری ان جوہروں کو شکل میں متشکل ہونے کی قابلیت پیدا کر دیتی ہے، اور قوتِ یبوست اس کی حفاظت کرتی ہے تاکہ وہ نقوش بگڑ نہ جائیں۔ اگر تری (رطوبت) نہ ہو تو وہ شکل ہی نہ بن سکے۔ اور اگر خشکی (مٹی) نہ ہو تو وہ شکل محفوظ نہ رہ سکے، اور جیسے قلم اپنی حرکت کے ذریعے اپنے کام کو انجام تک پہنچاتا ہے، اور "بسم اللہ" کی شکل کو دل کے خزانوں سے دماغ تک پہنچا کر اعضاءِ جسمانی کی طرف عود کرتا ہے، اور اس کے ذریعہ وہ شکل صفحہ قرطاس پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح گرمی اور ٹھنڈک مرکبات کی اصلوں کو فرشتوں کی امداد سے حرکت میں لاتی ہے، تو حیوانات و نباتات کی وہ شکل جو لوحِ محفوظ پر بنی ہوئی ہے۔ دنیا میں بنتی ہے اور جس طرح انسان کے کاموں کے اثرات دل سے نکل کر دوسرے اعضا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح عالمِ جسمانی کے کاروبار کی شروع اوّل عرش پر ہوتی ہے۔ اور جس طرح ان خاصیتوں کو قبول کرنے والا تیرا دل ہے اور باقی اعضا تمام خاصیتوں کو بعد میں قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ دنیا کے کام بھی ظہور میں آتے ہیں۔

اب یوں سمجھ لے! کہ جیسے تو دل میں رہنے والا ہے ـــ چونکہ تمام اشیا، عرش کے بعد بنائی گئیں، جس کی وجہ سے ہم لوگ خدا کو عرش کا مکیں تصور کرتے ہیں اور جس طرح تو اپنے دل پر غالب آگیا، جس کے بعد دل کا کام بالکل درست ہو گیا، اور دنیا کے تمام کام اس کی وجہ سے صحیح ہونے لگے۔ اسی طرح جب خدا نے عرش کو بنایا اور اس پر وہ قابض و متصرف ہو گیا۔ عرش اس کا مغلوب ہو گیا۔ تو تمام عالم و علمیان کی تدابیر صحیح طور پر عمل میں آگئیں اور ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۝ اسی سے مراد ہے اور یہ سب کچھ درست ہے حقیقی نگاہیں رکھنے والے سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ اس کو بالکل حقیقت سمجھ! کہ بادشاہ کی اصل کو بادشاہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ہم کو ہمارے جسم کی سلطنت پر وہ قابض اور حکمران نہ بناتا، اور اپنی بادشاہت سے ایک شمہ برابر ہم کو عطا نہ کر دیتا، تو ہم اس کو ہرگز نہ پہچان سکتے۔ پس اس بادشاہِ حقیقی کا شکر ادا کر! کہ جس نے تجھ کو پیدا کیا اور ساتھ ہی ساتھ خود مختاری بھی عنایت کی، اور اپنی ہی بادشاہت کا ایک نقش تجھ کو دے دیا۔ تیرے دل کو عرش بنایا اور روحِ حیوانی سے جس کا منبع دل ہے اسرافیل بنایا اور تیرے دماغ کو کرسی اور تیرے تخیلات کو لوحِ محفوظ کی جگہ عنایت فرمائی۔ حواسِ خمسہ کو تیرا کام کرنے والا فرشتہ بنا دیا۔ تیرے

دماغ کے جو اعصاب کام کر رہے ہے۔ اس کو آسمان کے گنبد کی شکل عطا کی تیری اُنگلیوں اور قلم وسیاہی کے ذریعے اِن تمام فرمانبرداروں (اعضائے جسمانی کے طبائع) کو محکوم کر دیا۔ نیز دل بغیر کسی دلیل کے بنایا۔ اس کو تیرے تمام اعصاب کا مالک قرار دیا۔ اور اس کارخانہ سلطنت کی تکمیل کے بعد تجھ کو حکم دیا کہ اپنے نفس اور مملکت سے خبردار رہو اور غفلت نہ کر، تاکہ تو بھی اپنے پیدا کرنے والے سے غافل نہ رہ سکے۔

دلیل ۳ : بس اے اِنسان، اِس پورے باب میں جو تجھ کو تیرے بادشاہت اور اس حقیقی بادشاہ کی سلطنت کا مقابلہ کر کے بتایا گیا۔ یہ اُن عظیم الشان علوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو نفوس انسانی کے علوم اور اس کے حقائق نیز قوار۔ اور اعضاء جسمانی کا آپس میں تعلق، اس کے صفات۔ دل سے ان سب چیزوں کا لگاؤ اور اس کے مختلف کام اور مقاصد ہیں۔

یہ علم بہت طولانی اور دقیق ہے۔ اس کی تفصیل تو اس کتاب میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح اس بادشاہِ حقیقی یعنی پروردگار عالم کی وسیع ترین بادشاہت، فرشتوں سے اس کا ربط وضبط، فرشتوں کی آپسی تعلقات، عرش وکرسی کا اُن فرشتوں سے لگاؤ وغیرہ۔ یہ بھی بہت دقیق علم ہے، اور اس کی بحث بھی بہت طولانی ہے۔ اس علم کا مقصد صرف یہ ہی ہے کہ سمجھدار آدمی اس خدا پر اعتقادِ کلّی رکھے اس کی عظمت وبزرگی کو پہچانے۔ احمق آدمی اس علم کو سمجھ بھی نہ سکے گا۔ اور نہ ہی اس کو خبر ہوگی کہ وہ غفلت کی زندگی گذارتا رہا۔ اور اتنا بے خبر تھا کہ اِس بادشاہ عالم وعالمیاں کے علوم وجمال کی معرفت سے محروم رہا۔ اس خدا کا جمال تو کون پہچان سکے گا۔ اتنا جو کچھ بتایا گیا وہ بھی صرف اِس لیے ہے کہ انسان خود کو پہچان سکے، کہ وہ کیا ہے؟

دلیل ۴ : نجومی اور علمِ طبیعی کے جاننے والے لوگ دُنیا کے تمام کاروبار کو صرف طبائع اور سیاروں سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ہیں جیسے ایک چیونٹی جو ایک کاغذ پر رینگتی ہے اور سمجھتی ہے کہ میری رفتار سے کاغذ سیاہ ہو رہا ہے۔ اس پر نقوش بن رہے ہیں یا وہ قلم کی نب کو دیکھتی ہے اور خوش ہو کر کہتی ہے کہ میں نے تمام مقاصد کو پہچان لیا، اور حقائق سے بہرہ یاب ہوگئی۔ کیونکہ یہ سب نقوش قلم سے ہی بنتے ہیں۔ ایسی ہی مثال عالم علوم طبیعی کی بھی ہے جو درجات آخر کے محرّک کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا۔

اس کے بعد دوسری چیونٹی کا درجہ ہے جو پہلی کے مقابل میں ذرا بڑی آنکھ رکھتی ہے۔ اس کی آنکھ ذرا تیز ہے، وہ کہتی ہے کہ تو نے غلط سمجھا۔ دراصل وہ قلم جو کاغذ پر سیاہی بکھیر رہا ہے، کسی اور کے قبضے میں ہے۔ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ دراصل انگلی سے یہ نقوش صفحہ قرطاس پر ابھر رہے ہیں۔ قلم سے نہیں اس لیے قلم اُنگلی کا محکوم ہے۔ اُنگلی اس کو جس طرح چلانا چاہتی ہے۔ اسی طرح وہ چلتا ہے۔ یہ مثال نجومیوں کی ہے۔ کہ اُس نے اپنی تحقیقی نگاہیں دُنیا پر زیادہ ڈالی ہیں بہ نسبت اس آدمی کے جو علمِ طبیعیات کا ماہر ہے۔ وہ

سمجھا کہ انسان کی طبائع اور مقدرات سیاروں کی گردش کے ماتحت ہیں، لیکن اس نے یہ خیال نہ کیا کہ ستارے فرشتوں کے احکام پر چلتے ہیں، اور اسی طرح اِس کے اوپر جو حاکم ہیں اُن کو بھی خیال نہ کر سکا اور جو فرق نجومی اور طبیعی میں ہے۔ اسی طرح ان لوگوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ جو عالم ارواح کی معرفت کی کوشش کرتے ہیں۔

بہت سے آدمی عالم جسمانی سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ صرف صورت جسمیہ جو اُن کو ہر وقت نظر آتی ہے اس کو دیکھتے ہیں، یہ انسان کا پہلا درجہ ہے اور وہ اس پر رہ جاتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ عالم ارواح کی مثال عالمِ انوار میں ہے، اِس کے منازل طے کرنا بہت دشوار ہیں، اُن میں بعض تو ستاروں کی منزلت رکھتے ہیں، بعض اُن میں چاند اور سُورج کی طرح ہیں، اور یہ مدارج صرف انہیں لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں جن کو خداوند عالم ملکوت السمٰوات کا مظاہرہ کرا دے) جیسا کہ اس نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور کہا ابراہیم علیہ السلام نے اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اور اس واسطے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِلّٰهِ سَبْعِيْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِّنْ نُّوْرٍ لَوْ كَشَفَهَا لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ كُلَّ مَنْ اَدْرَكَ بَصَرُهٗ ان سب چیزوں کا تفصیلی بیان کتاب مشکوٰۃ الانوار اور صفات الاسرار میں کیا گیا ہے وہاں سے مل سکتی ہے۔

اصل مقصد یہ ہے کہ تو دیکھ لے کہ "طبیعی" جس نے سب چیزوں کو برودت اور حرارت کے سپرد کر دیا ہے وہ بلند ہے، کیونکہ گرم و سرد اسباب الٰہی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ہی علمِ طب کہتا ہے۔ لیکن اس طبیب بے چارے کی کم علمی کا باعث ہے، اور وہ اِس کے سمجھنے کی پہلی سیڑھی پر کھڑا رہ گیا۔ اِن دونوں ماہیتوں کو ہی جوہر سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں اس پست طبقے کی چیزیں ہیں، جیسے کسی نوکر کو جوتوں کے پاس بٹھا دیا جائے۔

لیکن نجومیوں کا خیال ہے کہ اگر یہ سب سیارے نہ ہوتے تو دن رات میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ وہ سیاروں کو اسباب الٰہی سے تصوّر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ روشنی اور اندھیرا، گرمی اور سردی اسی سے متعلق ہیں۔ گرمی اِس لیے ہوتی ہے کہ سُورج وسط آسمان پر آ جاتا ہے اور سردی اِس لیے کہ سُورج وسط سے ذرا ہٹ جاتا ہے، لیکن اس خدا سے کیا چیز بعید ہے کہ اُس نے زہرہ ہی کو گرم تر بنایا ہو اور زحل کو سرد خشک یہ مسئلہ اگر اس طرح سمجھا جائے تو اس سے ایمان متزلزل نہیں ہوتا، مگر نجومی ستاروں کو اصل اور دُنیا کے باقی سب کاموں اور تبدل تغیر کو اس کا محکوم قرار دے کر غلطی کی وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ

مسخر وہ چیز ہے جس سے کام لیا جاتا ہے۔ اور سیارگان عالم کارگذار ہیں، نہ کہ خود مختار۔ اس مسئلے کو یوں سمجھو کہ جس طرح ہمارے تمام اعضاء تحریک دماغ کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ سیارے بھی فرشتوں کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا درجہ صرف دوسروں تک کام کے حکم سُنا دینے کا ہے۔ وہ اس کی آخری منزل پر البتہ پہنچ چکے ہیں، لیکن وہ چاروں طبائع (عناصر اربعہ) کی طرح نہیں ہیں، جیسے ہاتھ کی تحریک سے قلم چلتا ہے۔

دلیل ۵ : بہت سے مختلف الخیال لوگ اپنے اپنے ثبوت دیتے ہیں، اور وہ سب کسی نہ کسی وجہ سے دُرست ہیں، لیکن ہر آدمی سطحی نظر سے ہر چیز کو جان کر اس کے متعلق دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس کا عالم ہوں، وہ ایک ایسے اندھے کی مثل ہے، جو صرف سُنتا ہے کہ ہاتھی آیا ہے، وہ اس کو دیکھتے ہیں اور اس کے اوپر ہاتھ پھیر کر پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اندھوں کا ہاتھ ہاتھی کے کانوں پر پڑتا ہے۔ بعض اس کے پیروں ہی پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ کوئی دانتوں کو ہی محسوس کرتا ہے، اور جب یہ سب اندھے دوسرے ہم جنسوں سے اس کی شکل بیان کرتے ہیں، تو ہر آدمی اپنے ہاتھ کو جہاں جہاں مس کیا ہے، اس سے کہتا ہے اور اس کے لیے دلائل بھی دیتا ہے کہ ہاتھی صرف ایک ستون کی طرح ہے یا گرز ہے۔ یا کانوں کو مس کرنے والا اس کو کمبل کی مثال دیتا ہے، وہ سب ہی ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن وائے ہو اُن کی عقول پر کہ انھوں نے کل ہاتھی کا جائزہ لیے بغیر ہی اپنی رائے ظاہر کر دی۔

پس اسی طرح نجومی اور طبیعی کا حال ہے کہ اس نے خدا کے مقرّر کردہ کچھ حاکموں کو دیکھا اور صرف ایک ہی حاکم کی قدرت دیکھ کر کہنے لگی هٰذَا رَبِّی یعنی یہ ہی کرتا دھرتا ہے، اور اس کے بعد اگر خدا کی طرف سے کسی کو ہدایت ہوئی اور اس نے اس ابتدائی چیز کی حقیقت کو پہچانا۔ اس کے نقائص اس کی سمجھ میں آئے تو اُس نے پھر کہہ دیا کہ میں جس کو خدا سمجھتا تھا وہ دراصل خود کسی کا محکوم تھا۔ اور جو محکوم ہے وہ فرمانبردار کیسے ہو سکتا ہے؛ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ یعنی محکوموں سے مجھے محبت نہیں۔

دلیل ۶ : ستارے اُن کی طبائع، بروج اور آسمان یہ سب بارہ قسموں پر منقسم ہیں۔ اُن سب کے بعد عرش اعظم ہے۔ ان تمام موجودات کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ایک خاص حجرے میں وزیرِ اعلیٰ مکیں ہو اور اس کے چاروں طرف بارہ دری بنی ہوئی ہو۔ اُن سب میں ایک ایک نائب بیٹھا ہو، اور سات (سیارے بروج) اُن کے چاروں طرف دورہ کر رہے ہوں، وہ سب وزیرِ اعظم کے نائبوں کے احکامات پاکر اپنے ماتحتوں کو جو اُن سے ذرا فاصلے پر کھڑے ان کے احکامات کے منتظر ہوں (جن کو ہم عناصر اربعہ کہتے ہیں) جس کو جو سزا ملی ہو، نیکی یا بدی کی وہ حکم بجالائیں۔

اس کے بعد اس کی آسان مثال اس طرح سمجھ لو! کہ عرش اعظم ایک حجرہ ہے۔ جس میں وزیرِ اعلیٰ (مقرب ترین ملائک)

رونق ہے ۔ اوپر سیاروں والا آسمان (رواق) ہے ۔ بارہ برج اس کے دروازے ہیں ۔ اس کے نائب دوسرے فرشتے ہیں ۔ اُن میں ہر ایک کے لیے الگ الگ کام متعین ہیں ، اور سات سیارے سواروں کی مثل ہیں ، اور اُن سے ذرا فاصلے پر عناصر اربعہ سواروں کی طرح اُن کے احکامات کے منتظر ہیں ۔ اُن سواروں کے علاوہ چار پیادے بھی ہیں ، جن کو طبائع (خشکی ، نرمی ، ٹھنڈک ، گرمی) ۔ کہا جاتا ہے ، اُن پیادوں کے ہاتھ میں چار کمانیں ہیں ، جو اصل میں اِنسان کے عِلاج کے لیے مقرّر ہیں ۔ مثلاً اگر کوئی شخص دُنیا سے بیزار ہو جائے اور نعمت ہائے عالم سے کنارہ کشی کر لے اور تفکرات اس کو گھیر لیں ۔ اس وقت طبیب اپنا مشورہ دے گا کہ اس کو مالیخولیا ہے اور اس کا علاج افتیمون جو شاندہ ہے طبیعی کہے گا — کہ اس بیماری کا اصل سبب اس کے دماغ کی خشکی ہے اور خشکی کا سبب سرد ہوائیں ہیں ۔ جب تک موسم بہار نہ آئے گا ، ہواؤں میں رطوبت پیدا نہ ہو گی ۔ تب تک یہ اچھا نہ ہو سکے گا ۔ نجومی اپنی رائے دے گا کہ یہ سودائی ہے ۔ جو عطارد کے اثرات سے پیدا ہوتا ہے ۔ جو مرّیخ کی صحبت کے اثر سے اس میں پیدا ہو گئی ہے اور جب تک عطارد ، مرّیخ کے منحوس اثرات سے الگ ہو کر سعدین کے بروج میں نہ آئے گا ، مریض کا اچھا ہونا محال ہے ۔

ان تینوں نے باتیں اپنی جگہ پر صحیح صحیح کیں ۔ اِس لیے کہ سب کے علوم اپنی جگہ پہ دُرست ہیں ۔ ذَالِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ لیکن اللہ کی درگاہ سے اِس مریض کے لیے عطارد اور مرّیخ کو مقرر کیا جاتا ہے کہ ہوا چاروں پیادوں میں سے ایک پیادہ) اس کے دماغ میں خشکی کے اثرات پیدا کرے ۔ اور اس کے ذریعہ دُنیا سے وہ بد دل ہو کر خدا کی طرف رجوع ہو جائے ۔ لذّتِ دنیوی سے متنفر ہو جائے ۔ اور زبانیت کے کوڑوں سے اس کو خوف پیدا کرا کر خدا کی طرف رجوع کیا جائے ۔

اب سمجھو ، کہ اس حقیقت کو مندرجہ بالا تینوں شخصیتوں میں سے کسی نے نہ سمجھا ۔ اِس کو پہچاننے والے صرف انبیاء و مرسلین ہیں ۔ وہ خداوندِ عالم کے علومِ ربّانی اور ہر راز سے واقف ہیں کہ کیا کام کیوں کیا گیا ہے ۔ وُہ جانتے ہیں کہ کس کے حکم سے یہ چیزیں ہلتی ہیں ۔ اس کا حکم مخلوق کو کیوں ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتا ہے ۔ دماغ میں خیالات کس طرح بدلتے ہیں ؟ ہر آدمی نے اپنی جگہ سچ کہا ، مگر اصل حقیقت کی معرفت کی کمی تھی ۔ مان لو ، کہ ایک دیہاتی کسی شاہی دربار میں جائے اور اس دربار کی رونق ، فوج کی کثرت ، وزراء کے زرق برق لباس کو دیکھ کر بادشاہ کو دیکھنے کا دعویٰ کرے ، تو اس کا خیال صحیح ہوگا ۔ کیونکہ اس نے رنگا رنگی دربار سے بادشاہ کو سمجھنے کی کوشش کی ، لیکن دراصل وہ بات بالکل الٹی تھی ۔ دیہاتی نے دربارِ شاہی کے ٹھاٹھ دیکھ کر جس غلام یا وزیر کو بادشاہ کہا ۔ وہ صرف بادشاہ کی غلامی کا نتیجہ تھا ، نہ کہ بادشاہ ۔ اسی طرح خداوندِ عالم بغیر کسی بیماری کے تیرے کو اپنے دربار میں بُلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ بیماری یا سودا نہیں ہے ، بلکہ میری مہربانی کے اثرات ہیں جس کے ذریعہ

اپنے خاص بندوں کو اپنی طرف بُلاتے ہیں۔ اِنَّ الْبَلَآءَ مُوَکَّلٌ بِالْاَنْبِیَآءِ ثُمَّ الْاَوْلِیَآءِ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔ بلائیں مقرر کی گئی ہیں۔ پہلے انبیاء پر پھر اولیاء پر اس کے بعد بزرگانِ دین پر اور اسی طرح اُن کے بعد اُن سے نیچے طبقے پر مرضت ولم تعدنی یعنی میں مریض ہوا اور تُونے میری عیادت نہ کی۔ یہ انھیں لوگوں کے متعلق فرمایا ہے اور اس سے پہلی مثال میں بادشاہی کے لیے اپنے جسم کی معرفت سے حاصل کر سکتا ہے اور اسی کی وجہ سے معرفتِ نفس میں پہلا عنوان مقرر کیا گیا ہے۔

دلیل ہے: سُبحان اللہ والحمد للہ ولآ اِلٰہ اِلا اللہ واللہ اکبر کے معنی تجھ کو سمجھ لینے چاہئیں اگرچہ یہ چار کلمے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ لیکن معرفت الٰہی کو پہنچانے والے ہیں۔ جب تُونے اپنے تنزیہ سے خدا کے منزّہ ہونے کی معرفت حاصل کر لی، تو سُبحان اللہ کے معنی تیری سمجھ میں آجانا چاہیئے اور جب تو نے بدن پر اپنی حکومت کے ذریعہ خدا کی حکومت اور بادشاہی کو پہچانا۔ یعنی یہ تمام اسباب و ذرائع صرف اسی خدا کی وجہ سے ہیں جس کی مثال دی جا چکی ہے، کہ جیسے ہاتھ میں قلم تو الحمد کے معنی تجھ کو سمجھ جانا چاہئیں کہ جب نعمت دینے والا وہ ہے تو شکر اور حمد بھی اسی کے لیے ہے اور اسی دلیل سے تو نے اس کی تنہا خود مختاری کو سمجھ لیا۔ بس لَا اِلٰہ اِلا اللہ کا مطلب یہ ہی ہے، اب آگے چل کر اللہ اکبر کے معنی سمجھنا ہیں۔

پس جاننا چاہیئے، تُونے اب تک جو کچھ بھی اس کی معرفت حاصل کی وہ اس کی اصل کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اس کی ذات تو تیری سمجھ سے کہیں بالا و برتر ہے۔ وہ تیرے قیاس میں نہیں آسکتا۔ اس کی بزرگی کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں۔ یہ تمام موجودات اس کے وجود کا نور ہیں۔ اور جس طرح آفتاب کی روشنی (نور) اس سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے، بلکہ وہ نُور اس میں شامل ہے، لیکن ذات پروردگار کا نور موجوداتِ عالم کے نور سے کہیں بزرگ ہے۔ لہٰذا اللہ اکبر کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں، کہ وہ اللہ ہمارے قیاسات سے بلند ہے، برتر ہے۔ اس کی بزرگی ہماری سمجھ اور عقل میں ہرگز نہیں آسکتی۔ یہ موجوداتِ عالم اس کے نُور کے شائبے کی طرح ہیں، جس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی بچہ یہ دریافت کرے کہ بادشاہی کیا ہے؟ اور اس سے کیا مزہ آتا ہے، تو ہم اس کو گیند بلّے کے کھیل کی مثل دے سکتے ہیں کہ اس میں جو لطف آتا ہے، وہ ہی لطف بادشاہی میں ہے کیونکہ بچہ گیند بلّے کی لذت کے علاوہ کسی دوسری لذت سے ناواقف ہے اور جس لذت سے وہ قطعی ناواقف ہے اسی کی مثال دینا اس کے سامنے عبث ہے، وہ اسی کو سمجھ سکتا ہے جس کے متعلق اس کو معلومات ہے، اور ظاہر ہے اگرچہ سلطنت و حکومت کی لذت کو چوگان بازی سے کوئی نسبت نہیں ہے، اس کی مثال تو صرف لذت اور شادی ہی سے دی جا سکتی ہے۔ چونکہ وہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ہم پلّہ ہیں۔ پس بچے کے لیے چوگان بازی کی مثال ہی مناسب ہے اور تجھے سمجھنا چاہیئے کہ معرفت الٰہیہ کے متعلق آگے جو بیان کیا جائے گا وہ صرف

کنائے اور مثالیں ہی ہوں گی ۔ اس کی اصل حقیقت اور معرفت سوائے اُس کے اور کوئی نہیں جان سکتا ۔

دلیل ۸ : معرفت خدا کی تفصیل تو بہت طویل ہے ۔ اس کتاب میں اس کے متعلق کہاں تک بیان کیا جا سکتا ہے ۔ لہٰذا جتنا تجھ کو بتا دیا گیا اس کو کافی سمجھ! تو اس کی معرفت کی جستجو کر! کیوں کہ خدا کی معرفت اور بندگی وعبادت میں ہی بندے کی سعادت مضمر ہے اور سعادت بندگی خدا کی معرفت میں پوشیدہ ہے ۔ اس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے ۔ عبادت میں آدمی کی سعادت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی مرے گا تو وہ خدا سے ہی سروکار رکھے گا ۔ الیہ المرجع والمصیر جس آدمی کو جس کے ساتھ رہتا ہو ، اس کی بھلائی اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ اس کو دوست رکھے ، اور جتنا وہ اس سے محبت کرے گا اتنا ہی سعادت اس کو حاصل ہوگی ۔ چونکہ لذت اور راحت دوست کے دیکھنے سے بڑھتی ہے ۔ اور خدا کی محبت اس کے ذکر اور اس کی معرفت سے بڑھتی ہے اور جو شخص جس کو جتنا دوست رکھتا ہے ۔ اتنا ہی زیادہ وہ اس کا ذکر کرتا ہے اور یہی سبب تھا کہ جناب داؤدؑ کو وحی نازل ہوئی ۔ انا بدك اللازم فالزم بدك یعنی میں تیرا چارہ ساز ہوں ، تیرے تمام کام میری طرف ہیں ، تو مجھ سے غافل نہ ہو ۔

خداوندِ عالم کا ذکر زیادہ سے زیادہ عبادت کرنے میں ہے ، اور زیادتی عبادت خواہشات دنیا چھوڑ دینے سے حاصل ہوتی ہے ، اور خواہشات اس وقت کم ہو سکتی ہے ۔ جب گناہوں سے پرہیز کیا جائے ۔ پس معلوم ہوا کہ گناہوں سے بچنا دل کی فراغت کا سبب ہے اور اس کی اطاعت اس کے ذکر کے غالب ہونے کا سبب ہے ۔ جب یہ دونوں صفات یکجا ہو جائیں تو وہ درجہ سعادت کا ہے ۔ جو نجات کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ یقیناً مومن ہی نجات پاتے ہیں ۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ۝ اور چونکہ تمام اعمال عبادت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے ۔ اُن میں بعض تو عبادت میں ہیں اور بعض نہیں ، اور چونکہ تمام خواہشات سے الگ رہنا بھی ناممکن سا ہی ہے ، اور نہ اس کے لیے حکم دیا گیا ہے ۔ مثلاً کھانا نہ کھایا جائے ۔ اگر نہ کھائے گا تو موت واقع ہو جائے گی ۔ اگر مباشرت سے پرہیز کرے گا ۔ تو نسل قطع ہو جائے گی ۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بعض خواہشات ایسی ہیں جو چھوڑی جا سکتی ہیں اور بعض کا چھوڑنا ناممکن ہے ۔ پس اس کی کوئی صورت ہونی چاہیئے کہ اُن دونوں کا فرق معلوم ہو جائے ، جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل اور خواہش کے ذریعہ کوئی حد مقرر کر لے اور غور و فکر کے بعد اس کو اختیار کرے ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان حدود کو کسی دوسرے سے مقرر کرا لے ۔ پہلی صورت تو مشکل ہے کہ انسان خود اپنے متعلق حدود مقرر کر سکے ۔ کیونکہ خواہشات اس پر غالب آجاتی ہیں ، جن کے بعد وہ صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے

جس میں اس کو منفعت نظر آئے وہ اس کو اچھا سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا دوسری صورت ہی اختیار کرنا بہتر ہے۔ لیکن ہر آدمی ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے لیے حدود مقرّر کردے۔ اس کے لیے نہایت ہوشمند اور دُور اندیش آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ صرف انبیاء علیہم السّلام ہیں، جن کے اقوال اور احکاماتِ شریعت کہلاتے ہیں۔ لہٰذا شریعت کی متابعت کرنا ہی ضروری ہوا۔ اسی کے احکامات کی پابندی سعادت کی راہ دکھاتی ہے، اور صحیح بندگی اسی کو کہتے ہیں جو آدمی شرعی حدود کے ماتحت نہ کرے گا، وہ گویا کہ اپنے ہاتھوں خود ہلاک ہوجائے گا۔ اسی لیے اس پروردگارِ عالم نے فرمایا ہے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَه، یعنی جو آدمی اپنی حدود سے متجاوز ہوا اُس نے اپنے نفس کے ساتھ ظلم کیا۔

دلیل ۹ : جو لوگ اباحت و زندقہ میں (کفر و شرک) میں شامل ہیں، یعنی پاک کو ناپاک سمجھتے ہیں اور اس کے احکام سے منحرف ہوگئے ہیں، اُن کی جہالت کی سات وجہیں ہیں :

اوّل یہ کہ وہ لوگ خدا پر حقیقی طور پر ایمان نہیں لائے، وہ لوگ خدا کو دلیل اور ثبوت کے ساتھ تلاش کرنا چاہتے ہیں اور جب اُن کو اس کے متعلق کافی و وافی ثبوت فراہم نہیں ہوتے تو وہ اس کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں اور اپنی عقول کو نجوم و علم طبیعی کی طرف متوجّہ کرتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب خود بخود پیدا ہوگئے ہیں۔ اُن میں کوئی تدبیر یا حکمت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود ہی ہمیشہ سے اسی طرح چلے آرہے ہیں۔ یا اُن کی طبعی حالت ہی ایسی ہے، کہ وُہ خود بخود بنتی چلی جارہی ہیں، لیکن طبعی علوم کے جاننے والے خود اپنے سے بھی بے خبر ہیں، وہ دوسری چیزوں کی ماہیّت اور حقیقت کو کیا سمجھیں گے؟ وہ تو ایسا ہے کہ کوئی آدمی نہایت خوشخط لکھا ہوا کسی کاغذ پر دیکھے اور سوچ لے کر نقوش خود بخود کھنچ گئے ہیں۔ کسی کی قدرت یا ارادوں کو کوئی دخل نہیں۔ یا یہ تحریر ہمیشہ سے ایسی ہی لکھی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ارادہ اور قوت سے اِس کا کوئی تعلق نہیں، جس شخص کی آنکھیں اِتنی بند ہوں تو گویا وہ قعرِ مذلّت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔

علم طبیعیات اور نجوم کے جاننے والوں کے متعلق پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اس وقت اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

دوئم یہ سبب ہے کہ ایسے لوگ قیامت اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ سمجھتے ہیں کہ انسان بھی گھاس اور پودوں کی مثل ہے، یا ایسا حیوان ہے، جو قبضِ رُوح کے بعد قطعی فنا ہوجاتا ہے اور اس کے بعد اس کے لیے کوئی ثواب۔ عذاب یا حساب کتاب نہیں۔ اس کی وجہ ان کے اپنے معرفتِ نفس کی کمی ہے۔ وہ اپنے کو چوپاؤں کی طرح سمجھتا ہے، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا اصل جوہر وہ رُوح ہے جو لافانی ہے۔ اس کی موت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رُوح کو جسم سے نکال لیا جائے۔ اس کے متعلق تفصیلی بیان چوتھے عنوان میں آئے گا۔

سوم یہ سبب ہے کہ بعض لوگ خدا پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر بھی، لیکن اُن کے ایمان کمزور ہیں۔ وہ شریعت کے معنی نہیں سمجھتے، اُن کا مقولہ ہے کہ خدا کو ہماری عبادت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ہمارے گناہوں سے کوئی تکلیف ہوتی ہے، چونکہ وہ ہمارا مالک ہے اور ہماری عبادت کی اُسے کوئی حاجت نہیں۔ گناہ وثواب دونوں اس کے لیے برابر ہیں۔ حالانکہ وہ اندھے قرآن مجید میں نہیں پڑھتے کہ اُس نے حکم دیا ہے۔ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ○ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ○ معلوم ہوا کہ وہ شخص شریعت کے احکام کو خدا کی خوشنودی ہی کا سبب سمجھتا ہے اور اپنے لیے مفید خیال نہیں کرتا۔ وہ ایسے بیمار کی مثل ہے کہ بدپرہیزیاں کرتا رہے اور حکیم سے کہہ دے کہ آپ اپنا نسخہ دیں۔ اگرچہ حکیم کو اس کے پرہیز سے بظاہر کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن بیمار یقیناً مر جائے گا۔ وہ حکیم کی خواہش نہ ہوگی بلکہ بیمار کی بدپرہیزی ہی اس کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔ حکیم نے تو اس کی بیماری دُور کرنے کے راستے بتائے، مگر اس نے اُن باتوں پر عمل نہ کر کے حکیم کا کوئی نقصان نہ کیا بلکہ خود ہلاک ہو گیا۔ اسی طرح وہ حکیم مطلق بھی ہے جس نے تم کو شریعت کے ذریعہ صحیح راستے بتا دیئے۔ اب اگر تم ان پر عمل نہ کرو گے تو تمھارے دل کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔ جیسے دوا اور پرہیز دونوں مل کر جسم ظاہر کی بیماری کو دُور کرتے ہیں۔ اسی طرح اطاعت وبندگی خدا، نیز دنیا کے گناہوں سے پرہیز کرنا تمھاری نجات کا سبب ہوگا وَمَا يَنْجُوْا اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔

چہارم اس گروہ کی جہالت یہ ہے کہ وہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شرع دل کی شہوت کو اور غصہ وریا سے پاک ہو جاتا ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ اِنسان کو انھیں چیزوں (عناصر اربعہ) سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی آسان مثال یہ ہے کہ اگر کوئی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل کرنا چاہے تو وہ ناممکن ہے۔ وہ بیوقوف لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ غصہ اور شہوت کو قطعی روکنے کے لیے شرع نے حکم نہیں دیا ہے۔ بلکہ اعتدال کے درجے پر لانے کا حکم ہے تاکہ یہ دونوں شریعت اور تمھاری عقل پر غالب نہ آجائیں، اور سرکشی نہ کرنے لگیں، وہ اِعتدال پر رہ کر شریعت کے احکامات کو فراموش نہ کر دیں۔ گناہ کبیرہ سے پرہیز کریں تاکہ گناہانِ صغیرہ اُن کو بخش دیئے جائیں، یہی ایک طریقہ ہے کہ اِنسان غصے اور شہوت پر قابو پا سکتا ہے۔ بہت سے آدمیوں نے کہا ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی بھی یہی ہے کہ آدمی کو غصہ اور شہوت کا مغلوب نہیں ہونا چاہیے۔ جب کہ تم بیویاں بھی رکھتے ہو۔ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ میں بھی تمھاری طرح آدمی ہوں اور اُغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ مجھے بھی بشر کی طرح غصہ آتا ہے۔ خُدا نے اِس کے لیے فرمایا وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ ○ غصہ پی جانے والے کس کی تعریف ہے۔ اس کی تعریف نہیں ہے، جس کو غصہ ہی نہ آئے۔

پنجم سبب جہالت کا یہ ہے، وہ لوگ خداوندِ عالم کی صفات سے بے بہرہ ہو کر عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی

رحمت اور کرم ہمارے تمام گناہوں سے افضل ہے۔ ہم چاہے کتنی ہی بدی کریں، وہ ہم کو معاف کر دے گا۔ حالانکہ خداوندِ عالم جتنا کریم و رحیم ہے، اُتنا ہی منتقمِ حقیقی بھی۔ وہ سزا میں بھی اُتنا ہی سخت ہے۔ وہ ان پر نظر نہیں رکھتے جو بغیر بیماری کے بھی فاقہ کرتے ہیں۔ یہ نظام مقرر کر دیا گیا ہے کہ جب تک تجارت یا زراعت نہ کروگے۔ پیسہ نہ ملے گا۔ اسی طرح جب تک کوشش نہ کروگے، علم نہ ملے گا۔ اس قسم کے لوگ طلبِ دُنیا میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ خدا پر بھروسہ نہیں کرتے، کہ وہ ہی تجارت و زراعت میں فائدہ بخشنے والا ہے۔ باوجود اس کے کہ خداوندِ عالم نے روزی دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔ آخرت کے تمام کا عمل سے متعلق کر دیتے ہیں اور فرما دیا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کیوں کہ یہ لوگ اس کے کرم پر ایمان نہیں رکھتے اور رزق حاصل کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا آخرت کے متعلق اُن کی یہ تمام باتیں زبانی ہی تصور کی جاتی ہیں۔ یہ سب شیطانی باتیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے

ششم۔ یہ سبب ہے کہ بعض لوگ اپنے کو اُن مرتبوں پر پہنچا ہوا سمجھتے ہیں کہ وہ گناہوں کی حقیقت کو کچھ نہیں سمجھتے، اور ہمارا دین کسی نجاست سے بھی ناپاک نہیں ہو سکتا۔ انھیں میں سے بعض لوگ اتنے مغرور اور متکبر ہوتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اُن کے خلاف کوئی بات کہے جس سے اُن کے خیال کو ٹھیس لگتی ہو تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کے دُشمن ہو جاتے ہیں، اور جس چیز کی وہ خواہش کریں، چاہے وہ ایک لقمہ ہی کیوں نہ ہو اور وُہ اُن کو نہ ملے تو تمام دُنیا کو وہ تاریک سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ بھی ظرفِ اعلیٰ کے حامل نہیں ہوتے، کہ اُن گناہوں سے خوف نہ کھائیں، تو یہ دعویٰ تو لاطائل ہی ہوا، اور اگر کوئی شخص اسی پر ہی مغرور ہو کہ غصّہ، شہوت اور تمام بُرے اخلاق اس میں آ ہی نہیں سکتے۔ وہ لوگ بھی انبیاء و مرسلین کا درجہ نہیں رکھتے۔ کیوں کہ انبیاء تو اپنے گناہوں پر روتے تھے اور استغفار کرتے تھے۔ خدا کی درگاہ میں معذرت کرتے تھے، اور بڑے بڑے صحابہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ پھر یہ بے وقوف کیسے سمجھا کہ وہ شیطانی وسوسوں میں نہیں پڑا، اور وہ انبیاء و رسل سے بھی اشرف ہو گیا۔ اور اگر یہ کہنے لگے کہ انبیاء میں بھی یہی صفت پائی جاتی تھی کہ اُن پر بھی گناہوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا، اور ان کی توبہ و استغفار صرف لوگوں کے دکھانے کے لیے ہوتی تھی، تو یہ بیوقوف بھی انھیں کی طرح دُوسروں کو دکھانے کے لیے توبہ کیوں نہیں کرتا؟ حالانکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو آدمی اس کی اس حالت کو دیکھ کر عمل کرتا ہے وہ تباہی میں پڑ جاتا ہے، اور اگر وہ یہ جواب دے کہ دوسروں کی تباہی اس کی ذات پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ تو ہمارے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم پر لوگوں کی تباہی سے کیا اثر پڑتا تھا، کہ انتہائی تقویٰ و پرہیزگاری کے درجات کو حاصل کرنے کے لیے مصائب برداشت کرتے تھے، اور ایک خرمہ جو صدقے کا تھا اپنے مُنہ سے نکال کر پھینک دیا۔ اگر

وہ کھا لیتے تو لوگوں کو کیا نقصان پہنچتا۔ بلکہ اگر وہ ایسا عمل کرتے تو لوگ اس کو کھانا ثواب سمجھنے لگتے۔ اگر اس خرمے کے کھانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچتا تھا، تو کیا شراب کے چھلکتے ہوئے جام اُن جہلا کے لیے نقصان رساں نہیں۔ اس کا مرتبہ تو رسول سے بڑھ کر تو نہیں؟ اور اگر شراب کے سو جاموں کی برابر میں ایک خرما کی وہ سمجھتا ہے تو وہ بیوقوف اپنے کو باسمجھ کہہ رہا ہے کہ شراب کے سو جام بھی اس پہ اثر نہ کریں گے اور نعوذ باللہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کوزہ آب خیال کرتا ہے، کہ ایک دانہ خرما اُن پر اثر کر جاتا۔ یہ وقت اس گدھے کے لیے ایسا ہے کہ شیطان اس کی مونچھوں پر تاؤ دے اور دُنیا بھر کے بیوقوف مل کر اِس کا مذاق اُڑائیں اس لیے کہ عقلمندوں کو اِن باتوں سے کوئی دریغ یا افسوس نہ ہوگا۔

درحقیقت بزرگانِ دین وہ ہی کہے جا سکتے ہیں، جو یہ سمجھ لیں کہ وہ شخص جو خواہشات کو اپنا مطیع بنائے گا، وہ ہی اِنسان ہے، ورنہ حیوان کے برابر ہے۔ پس جاننا چاہیئے کہ انسان کا نفس فریبی اور مکّار ہے۔ اس کے تمام دعوے بے دلیل ہیں، وہ ڈینگیں ہانکتا ہے کہ بلند و بالا ہوں۔ پس آدمی کو لازم ہے کہ اس کا ثبوت مانگے اور سوائے شرعی دلائل کے اس کی بکواس پہ دھیان نہ دے۔ اگر اس کے دلائل شریعت کے ماتحت ہوں تو وہ سچا ہے اور اگر اس میں عقلی گدے لگائے تو وہ شیطان کا مُرید ہے۔ اور یہ دعویٰ لاطائل ہے اور آخر تک اِس سے ثبوت مانگتے رہنا چاہیئے۔ ورنہ وہ اپنے خیالات کی پختگی میں مغرور ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔

جاننا چاہیئے کہ نفس کو شریعت کے تابع ہونا، اِسلام کا درجہ اوّلین ہے۔

ہفتم سبب یہ ہے کہ لوگوں میں غفلت اور شہوت کے غالب آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ لوگ مُردار کو حلال سمجھتے ہیں وہ کافروں کے برابر ہیں۔ مُنہ سے وہ چکنی چپڑی باتیں بناتے ہیں اور صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں، اور بعض لوگوں کو یہ باتیں پسند آتی ہیں۔ کیونکہ ان کے دل شہوت پرستی اور لغویات کی طرف مائل ہوتے ہیں، جو اِن کو آمادہ بہ فساد کرتی ہے، وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اس کی وجہ سے قہرِ الٰہی بھی نازل ہو سکتا ہے، وہ ان باتوں میں اپنی بزرگی سمجھتا ہے اور ایک نیا پن اور تہمت تصوّر کرتا ہے۔ حالانکہ تہمت کے معنی نہیں جانتا۔ اور نہ حدیث نبوی کا قائل ہے، پس ایسا آدمی شہوت پرست کہلاتا ہے۔ وہ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتا۔ کیوں کہ وہ اپنے افعال پر مطمئن ہوتا ہے۔ اور عام طور پر یہ لوگ ان میں سے ہیں جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ایسے لوگوں کو تلوار کے ذریعے راہِ راست پر لانا چاہیئے، نہ دلائل اور براہین کے ذریعے۔

اہلِ اباحت و زندقہ کے متعلق صرف اِتنا ہی بتا دینا یہاں کافی ہوگا کہ اس کا سبب نفس کی گندگی اور اس

کی معرفت نہ ہونا ہے۔نیز خداوندِ عالم کی اور اس کی شریعت سے منحرف ہونا۔اگر انسان کے یہ کام اس کی طبیعت کے مُطابق ہوں تو پھر یہ عادات اِس سے دُور ہونا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اسے لوگ کھُلم کھلا اباحت اِختیار کرتے ہیں، اور حیرانی ظاہر کرتے ہیں۔اگر اُن سے حیرانی کا سبب دریافت کیا جائے تو اُس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کو نہ تلاشِ حق ہوتی ہے اور نہ اپنے کاموں میں شکوک کی گنجائش۔اُن لوگوں کی مثال اس بیمار کی سی ہے کہ جو حکیم سے اپنی بیماری نہ بتائے، صرف عِلاج کرنے کو کہے، تو بھلا ایسے مریض کا کیا عِلاج ہو سکتا ہے۔

اُن لوگوں کے لیے ہمارا یہ جواب کافی ہوگا، کہ تم جتنا چاہو تلاش میں حیران رہو، لیکن یہ یقین رکھو کہ تُم خدا کے بندے ہو۔تمہارا پروردگار وہ عالم و قادرِ مطلق ہے، جو سب کچھ کر سکتا ہے اور ان باتوں کو انھیں دلائل کے ذریعہ سلجھانا چاہیئے، جواب تک بیان کی گئی ہیں۔

باب ۳

معرفت دُنیا کے متعلّق

اے انسان سمجھنا چاہیے کہ یہ فانی دُنیا اس دُنیائے دین کے راستے کی ایک منزل ہے، اور وہاں تک پہنچنے کے لیے صرف ایک رہ گزر کی طرح ہے۔ یہ دُنیا ایک صحرا کے کنارے پر ایسا بازار ہے، جہاں سے مُسافرانِ راہِ دین اپنے لیے توشۂ آخرت خرید سکتے ہیں۔

دُنیا اور آخرت کی دو صورتیں الگ الگ ہیں۔

موت سے پہلے اور انسان سے نزدیک ترین چیز کا نام دُنیا ہے۔

موت کے بعد اور موجودہ انسانی جسم سے دُور جو چیز ہے، وُہ آخرت کہلاتی ہے۔

چونکہ آدمی کو ایک ناقص اور سادہ جسم دیا گیا ہے، لیکن اس میں کسب کمال کی قوتیں ودیعت کر دی گئی ہیں تاکہ وہ فرشتوں کی طرح اپنے کو بنا کر خدا کی بارگاہ کے قابل ہو جائے۔ وہاں جا کر اس کے نور کی شعاعوں سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ بس یہ ہی اس کی سعادت کی منتہی منزل ہے، اور اسی کو ہم بہشت کہتے ہیں۔ انسان کو اسی لیے خلق کیا گیا ہے۔ جب تک وہ تحقیق نہ کرے گا اور آنکھیں نہ کھولے گا معرفت اللہ حاصل نہ ہو سکے گی، اور معرفت اس کے جمال سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ خداوندِ عالم کے جمال کی سیڑھی اس کے پیدا کردہ عجائب وغرائب کی معرفت حاصل کرنا ہے، اور خدا کی معرفت انسان کے حواس سے حاصل ہوتی ہے اور چونکہ یہ حواسِ خمسہ، نیز موجودہ ڈھانچہ بنائے وجود میں میسّر آ سکتے تھے۔ پس اس کو یہ جسم خاکی دے کر اس دُنیا میں بھیجا گیا، تاکہ یہاں وہ سب چیزوں کی معرفت حاصل کرے، اور اُن چیزوں کی معرفت سے معرفت نفس ہو سکے اور معرفتِ نفس ہی معرفت خدا کی کنجی ہے معلوم ہونا چاہیئے کہ دُنیا کی معرفت حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جب تک یہ حواس مجتمع ہیں انسان کو زندہ کہا جاتا ہے، اور جب یہ حواس منتشر ہو جاتے ہیں، وہ ہی موت کہلاتی ہے۔ اس وقت آدمی کے صفات ذاتی ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ پس انسان کی خلقت صرف معرفت الٰہیہ ہی کی غرض ہے، جو اوپر بیان کی گئی۔

دلیل ۱: (حاجاتِ بدن)

آدمی کو دُنیا میں دو چیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے:

اوّل یہ کہ وہ ایسے عمل نہ کرے جن سے دل ہلاکت و تباہی کی طرف جائے اور ایسے ہی راستے اختیار کرے
دوسرے یہ کہ اپنے ظاہری جسم کو ایسی چیزوں سے بچائے جو اس کے لیے مضرت رساں ہوں اور ویسی ہی راہیں اختیار کرے ۔

دل کی غذا معرفتِ الٰہیہ اور محبتِ خداوندی ہے ۔ چونکہ ہر چیز کی غذا اس کی ماہیت اور مناسبت کے مطابق ہوتی ہے ۔ انسان کی خاصیت اور ماہیت کا بیان آچکا ہے ۔ جاننا چاہیئے کہ دل کا ہلاک ہوجانا صرف محبت ماسوا اللہ کے علاوہ دوسری محبت ہی ہو سکتا ہے ۔ بدن کی حفاظت کرنا اپنے دل کی حفاظت کے لیے ضروری ہے ۔ کیوں کہ بدن فانی اور دل باقی ۔ اور بدن دل کے لیے وہ ہی درجہ رکھتا ہے ، جو حاجی کے لیے حج کے راستے کا اونٹ ۔ یہ ظاہر ہے کہ حاجی اونٹ کے لیے نہیں ہوتا ، بلکہ اونٹ حاجی کے سبب ہوتا ہے پس حاجی کو ضروری ہے کہ جب تک وہ کعبۃ اللہ تک نہ پہنچے تب تک اونٹ کی حفاظت کے لیے اس کو بقدر ضرورت غذا اور پانی وغیرہ بہم پہنچاتا رہے ۔ لیکن اگر تمام دن وہ اونٹ کو کھانا کھلانے اور آراستہ کرنے میں صرف کر دے گا ۔ تو اپنے قافلے سے بچھڑ جائے گا اور وہ اس کی ہلاکت کا موجب ہوگا

اسی طرح اگر آدمی دن رات اپنے جسم کی حفاظت میں صرف کر دے گا ۔ تو وہ سعادتِ خداوندی سے محروم رہ جائے گا ۔ بدن کے لیے صرف تین حاجات ضروری ہیں ۔ کھانا ۔ پہننا ۔ رہنا ۔ کھانے کے لیے غذا ۔ پہننے کے لیے کپڑا ، اور رہنے کے لیے مکان کی ضرورت ہے ، تاکہ وہ اپنی زندگی معرفتِ نفس و معرفتِ الٰہی میں صرف کر سکے ۔ آدمی کو اپنے بدن کے لیے ان تین حاجتوں کے علاوہ کوئی اور حاجت نہیں ہے ۔ دُنیا اس اصول پر گامزن ہے ۔ اسی طرح دل کی غذا معرفت ہے ، وہ جتنی بھی ہو اچھا ہی اچھا ہے ۔ بدن کی غذا کھانا ہے ۔ لیکن اگر کھانا پیٹ سے زیادہ کھایا جائے تو موجب ہلاکت یا بیماری ہوگا ۔

خداوندِ عالم نے حاجات کو اپنے بندوں پر اس لیے مقرر کیا ہے ، تاکہ وہ غذا ، لباس اور مکان کے لیے تگ و دو کرے ، اور اس کا جسم جو رُوح کی سواری ہے ، ہلاکت سے بچ سکے ، لیکن خواہشات اپنی حد تک محدود نہیں رہتیں ، وہ ہمیشہ زیادہ ہوتی جاتی ہیں ۔ لہٰذا عقل کو اسی لیے بنایا گیا ہے کہ وہ خواہشات کو اعتدال سے بڑھنے اور گھٹنے سے روکے رہے ۔ اور شریعت کو پیغمبروں کے ذریعے اِس لیے بھیجا کہ خواہشات کی حدُود متعیّن کر دیئے جائیں ۔ چنانچہ بچے میں پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے خواہش ہی پیدا ہوتی ہے ۔ کیونکہ اوّل اسی کی ضرورت تھی اور عقل کو بعد میں سنوارا گیا ۔ اور چونکہ خواہش نے پہلی جگہ پائی ہے ، اور وہ اِس بچے کے جسم پر غالب آچکی ہے ۔ لہٰذا عقل کے تسلط کے بعد وہ خواہشات اس سے برسرِ پیکار رہتی ہے ۔ وہ چاہتی ہے کہ آدمی کو ہر وقت حاجات کا طالب رکھے ۔ اِسی لیے آدمی اپنی خواہشات کے مقابل میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور وہ نہیں سمجھتا کہ اس

کو کھانا، پہننا اور مکان کس غرض و غایت سے چاہئیں، اور خود وہ کس لیے آیا ہے اور دل کی غذا کو جو آخرت کے لیے ہی ہے بھلا دیتا ہے۔ اب تُو نے اس دُنیا کے حقائق اور بلندیوں کو سمجھ لیا۔ اس کے بعد دُنیا کی شاخیں اور لوازمات بھی سمجھ لے!

دلیل ۲ : (انسانی مشاغل اور ضروریاتِ زندگی)

دُنیا کی تفصیل پر غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ دُنیا تین چیزوں سے مراد لی جاتی ہے۔

اوّل، وہ اشیاء جو زمین پر پیدا کی گئی ہیں، جیسے نباتات، معدنیات اور حیوانات۔ کیونکہ زمین کی اصل غرض و غایت صرف یہاں انسان کا رہنا اور اس پر کھیتی کرنا ہے۔ معدنیات مثلاً تانبا، پیتل، لوہا وغیرہ اوزاروں کے واسطے ہے۔ حیوانات سواری کرنے اور آدمی کے کھانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ لیکن آدمی نے اپنے جسم اور دل کو صرف اسی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ وُہ اپنے دل کو انھیں چیزوں کی آرائش میں صرف کرتا ہے۔ لہٰذا ان غلط مصروفیتوں کی وجہ سے دل میں کچھ ایسے عیوب آ گئے ہیں، جو آدمی کی ہلاکت کا باعث ہیں۔ جیسے بغض و عناد حسد و کینہ وغیرہ چونکہ جسمِ انسانی انھیں کی خواہشات میں مشغول رہتا ہے، جس کی وجہ سے دل اپنی حالت کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی طاقتوں کو کاروبارِ دنیوی میں صرف کرنے لگتا ہے۔

پہلے تم کو بتایا گیا کہ دُنیا کی اصل حاجات طعام۔ لباس اور گھر ہیں۔ لہٰذا آدمی کے لیے جو شغل ضروری ہیں وہ بھی تین ہیں۔ زرگری۔ پارچہ بافی اور معماری۔ ان تینوں کی الگ الگ شاخیں ہیں۔ بعض ان چیزوں میں ان کے مددگار ہیں جیسے دُھنیا روئی اور سوت کاتنے والا دونوں جولاہے کے مددگار ہیں، اور آخری منزل اس میں درزی کی ہے جو جولاہے کے کام کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ ان سب کاریگروں کو ان کاموں کے لیے اوزاروں کی ضرورت ہے تو اوزار بنانے والے مثلاً لوہار، بڑھئی وغیرہ بنے اور سب ایک دوسرے کے حاجت مند ہوئے۔ کیوں کہ ہر ہنرمند آدمی اپنے پورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں قاصر ہے۔ اس لیے ان سب کو ایک جگہ کر کے ایک دوسرے کو باہم مددگار بنا دیا۔ درزی، جولاہے اور لوہار کو مدد دیتا ہے اور لوہار اُن دونوں کو۔

پس ان سب کے درمیان ایک رابطہ قائم ہوا اور اُن میں سے ہر ایک اپنے حقوق حاصل کرنے پر مُصر ہوا یہاں تک کہ آپس میں ضد کا مادہ پیدا ہو کر دُشمنی کی صورت اختیار کر لیا۔ اس وجہ سے تین چیزیں اور پیدا ہوئیں۔

اوّل سلطنت و سیاست۔ دوم حکومت و قضا۔ سوم فقر، تاکہ ان تینوں چیزوں کے ذریعہ قوانین و سیاست و حکومت کو سمجھ سکیں۔

یہ تینوں چیزیں پیشے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ پیشہ وروں کی طرح ان کا تعلق صرف ہاتھ سے نہیں ہوتا اور انھیں وجوہات کی بنا پر دُنیا کے مشاغل اتنے بڑھ گئے اور آپس میں تنازع پیدا ہونے لگے، کہ آدمی نے اپنے کو

اسی میں کھو دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ان تمام فروعات کی اصل صرف وہ ہی تین چیزیں ہیں جو حاجات کے عنوان سے بتائی گئی ہیں۔ طعام[1] ۔ لباس[2] اور گھر[3] ۔ یہ تینوں چیزیں بدن کے لیے ہیں اور بدن دل کے لیے تاکہ وہ اس سے کام لے سکے، اور دل خدا کی معرفت کے واسطے بنایا گیا ہے۔ پس وہ لوگ ایسے ہی ہیں، جیسے وہ حاجی جو دن رات اونٹ کی خدمت میں لگا رہا۔ اور حج کرنا جو اصل مقصد ہے، اس نے وہ بھلا دیا۔ پس دُنیا کی حقیقت اُتنی ہی ہے، جو بیان کی گئی۔ جو آدمی اِس دُنیا میں رہ کر عاقبت کا خیال بُھلا دے اور نیکیوں کے راستوں کو دل سے بُھلا دے۔ دُنیا کے مشاغل میں اپنی حاجات خصوصیہ سے زیادہ مصروف رہے۔ اس دنیا کو نہیں پہچانا۔ اور اِس جہالت کی اصل وجہ یہ ہے، جو ہمارے رسُول مقبُول صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائی ہے کہ دُنیا ہاروت و ماروت سے زیادہ جادُوگر ہے۔ لہٰذا اِس سے بچو۔ پس اِس دُنیا سے بچنے کے لیے اس کے مکر و فریب کو سمجھنا ضروری ہے۔ لہٰذا ایسی مثالیں اس کے متعلق دی جاتیں کہ اس کے عیوب ظاہر ہوسکیں۔ لہٰذا اب تُم کو مثالوں کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے۔

دلیل ۳ (بے ثباتی دُنیا ، مثالوں کے ذریعہ)

مثال ۱: دُنیا کا سب سے پہلا جادُو یہ ہے کہ وہ تیرے ساتھ دوستی اور محبت اس طرح جتاتی ہے کہ تو اِس کا بندہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ دُنیا تجھ سے ہمیشہ بھاگتی ہے۔ لیکن تو اس سے بے خبر ہے۔ یہ دُنیا ایسی ہی ہے جیسے سایہ جو آہستہ آہستہ نامعلوم طریقے پر چل رہا ہے، لیکن تو سمجھتا ہے کہ سایہ اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ (تیری عمر) برابر گھٹ رہی ہے (دُنیا تجھ سے بھاگ رہی ہے) لیکن تو عالمِ بیہوشی میں ہے۔

مثال ۲: اِس دُنیا کا دوسرا جادُو یہ ہے، کہ وہ اپنے کو تیرا دوست کہتی ہے تاکہ تو اس پر گرویدہ ہو جائے۔ وُہ تجھ سے کہتی ہے کہ میں تیری ہی ہوں، حالانکہ یک لخت تجھے چھوڑ کر کسی دوسرے کے پاس چلی جاتی ہے۔ اس دُنیا کی مثال اس فاحشہ اور مفسدہ عورت کی سی ہے، جو مردوں کو اپنے حسُن کے جال میں پھانستی ہے تاکہ اُن کو اپنا عاشق بنالے اور اس بہانے اُن کو گھر لے جا کر ہلاک کر دے۔ جناب عیسیٰ علیہ السّلام نے مکاشفے کے عالم میں دُنیا کو ایک "بڑھیا" عورت کی طرح دیکھا۔ آپ نے دریافت کیا تُو نے کتنے شوہر کیے ؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ مَیں نے سب کو ہلاک کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تعجّب ہے۔ اُن کی حماقت پر کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ تو نے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور پھر تیرے مطیع ہو گئے۔ اُنھوں نے عبرت حاصل نہ کی۔ اَللّٰھُمَّ اَعْصِمْنَا مِنْ سِحْرِھَا (یعنی اے خدا ہمیں دنیا کے جادُو سے بچا)

مثال ۳: اپنے بظاہر بڑی حسن و خوبی سے آراستہ کیے رہتی ہے۔ اگرچہ اسی میں مصائب اور محنتیں پوشیدہ

ہیں، تاکہ جہلا اس کی ظاہری آراستگی پر دل دے بیٹھیں ۔ اس دُنیا کی مثال اس بدشکل عورت کی سی ہے جس نے اپنے بدشکل چہرے پر نقاب ڈال لی ہو اور جسم پر بہترین کپڑے پہن رکھے ہوں۔ اس کو جو مرد دُور سے دیکھے وہ عاشق ہو جائے، لیکن جب اس کا چہرہ دیکھے تو شرمندہ اور ذلیل ہونا پڑے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ میدان حشر میں دُنیا ایک بدشکل بڑھیا کی طرح ہوگی۔ جس کی آنکھیں سبز، اور دانت باہر کو نکلے ہوئے ہوں گے جب لوگ اس کو دیکھیں گے تو خدا سے پناہ مانگیں گے اور دریافت کریں گے کہ یہ کون ذلیل عورت ہے؟ ہاتف غیبی جواب دے گا کہ یہ وُہی دُنیا ہے جہاں تُم آپس میں بغض و عناد کرتے تھے۔ ظلم و تشدد سے دوسروں کا خون چُوستے تھے، اور جس پر تم عاشق تھے۔ اس کے بعد دُنیا کو دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ وہاں سے دُنیا پکارے گی کہ اے میرے دوستو! اب تُم کہاں ہو؟ پس پروردگارِ عالم حکم دے گا کہ اس کے دوستوں کو بھی اسی کے ساتھ جہنّم میں پھینک دیا جائے۔ نعوذ باللہ منہا۔

مثال ۴ اگر کوئی حساب لگائے کہ ازل سے اب تک کتنا زمانہ بیت گیا۔ جبکہ دُنیا کا وجود نہ تھا۔ اور اب کتنا زمانہ باقی ہے۔ جب یہ فنا ہو جائے گی۔ درحقیقت چند ہی دن ازل اور ابد کے درمیان ہیں، یُوں سمجھ لینا چاہیئے کہ دُنیا اس مسافر کی طرح ہے، جس کی ابتداء اس کا گہوارہ ہے، اور آخری منزل اس کی قبر اور اس کی زندگی وہ منازل ہیں۔ اس کی زندگی کا ہر سال ایک منزل ہے۔ ہر ماہ اس کا ایک فرسنگ فرض کر لو۔ اور ہر دن ایک میل کی طرح اور اس کی ہر سانس ایک قدم، جو ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ راستہ طے کرتا ہے۔ کوئی صرف ایک ہی فرسنگ جا کر راستہ ختم کر دیتا ہے، اور کوئی اس سے کم یا زیادہ، لیکن انسان اس غفلت میں خاموش بیٹھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ اپنے مقاصد کی اس طرح کوشش کرتا ہے کہ دس سال تک اس کو کوئی تکلیف نہ ہو، حالانکہ ہو سکتا ہے کہ دس ہی دن میں مٹی کا ڈھیر بن جائے۔

مثال ۵ لذّاتِ دنیوی کی خواہش میں آدمی کی مثال بالکل ایسی ہی ہے، جس کی وجہ سے میدانِ قیامت میں ذلت و رُسوائی اٹھانا پڑے گی۔ جیسے کوئی لذیذ کھانا کھائیں اور اس سے معدہ سڑ جائے اور پھر قے ہو جائے اس کے بعد وہ اپنے معدے، نفس اور بے حسی کو دیکھ کر شرمندہ ہو۔ اپنے دل میں سوچے کہ لذّت غذا تو قے کے ساتھ نکل گئی، لیکن شرمندگی ہنوز باقی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ کھانا جتنا لذیذ اور قیمتی ہوگا، اتنا ہی اس کا ہضم ہونا بھی دُشوار ہوگا۔ ایسے ہی دُنیا کی لذّت آدمی کے دل میں جتنی زیادہ ہوگی۔ اتنی ہی میدانِ حشر میں اسے شرمندگی ہوگی، اور اس کی ایک جھلک جانکنی کے عالم میں نظر آجاتی ہے۔ جس شخص کے پاس دنیا میں مال، کنیزیں، غلام زیادہ ہوں گے۔ اتنا ہی مشکل سے اس کا دم نکلے گا۔ چونکہ غربا کی نسبت ان تمام دنیوی چیزوں سے الگ ہونے کا صدمہ اس کو زیادہ ہوتا ہے، لیکن یہ رنج و عذاب موت کے بعد ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ تکالیف اور بڑھتی ہیں۔ چونکہ

اُن کی دوستی و محبت اس شخص کے دل کی صفت ہو جاتی ہے اور دل مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے، وُہ فنا نہیں ہوتا۔

مثال ۶۔ دُنیا کے کاروبار جو آدمی کو صبح و شام لگے رہتے ہیں، وہ بظاہر اس کو بہت مختصر اور آسان معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ ایک ہی موسم میں ہزار کام نکل آتے ہیں، اور اس کی عمر انھیں کاموں کو انجام دینے میں ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دُنیا کے طالب کی مثال اس شخص سے دی ہے جو سمندر کا پانی جتنا زیادہ پیتا جائے اُتنی ہی اس کی خواہش بڑھتی جائے، یہاں تک کہ وہ پیتے پیتے ہلاک ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی پیاس باقی رہتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس طرح آدمی پانی میں اُترے اور وہ تر نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح دُنیا داری میں مشغول ہو کر دُنیا کی حرص میں آلودہ ہونا ناممکن ہے۔

مثال ۷۔ اِس دُنیا میں ہر شخص کی مثال اس میزبان کی سی ہے، جو اپنا مکان مہمانوں کی میزبانی کے لیے ہر وقت آراستہ و پیراستہ رکھے، اور ایک کے بعد دوسرے کا منتظر رہے۔ سونے کے برتنوں چاندی کے پیالوں اور اگر و لوبان کی خوشبوؤں سے مہمان نوازی کرے، تاکہ اُن کے دماغ اس کی خوشبو سے فائدہ حاصل کر کے دوسروں کے لیے چھوڑ جائیں۔ اگر مہمان اپنے اس میزبان کی عادات سے واقف ہوتا ہے، وہ اُن معطر فضاؤں سے حظ اُٹھاتا ہے اور اس کے آرائش و زیبائش کے سامان کو وہیں چھوڑ دیتا ہے، اور جو مہمان ناسمجھ اور بیوقوف ہوتے ہیں وہ اس زیبائش کو صرف اپنا ہی مال سمجھ کر لے جانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب رخصت ہوتے وقت وہ تمام اسبابِ دنیوی اس سے چھین لیا جاتا ہے تو اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ پس سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دنیا بھی ایک مہمان خانہ ہے۔ یہاں جو مہمان آئے (ہر آدمی) وہ ہر چیز کو اپنانے کی کوشش نہ کرے۔

مثال ۸۔ ان لوگوں کا حال جو یہاں آکر دنیوی کاموں میں منہمک ہو جاتے ہیں، بالکل ایسا ہی ہے کہ کچھ لوگ جو ایک کشتی پر سوار ہوں اور کسی جزیرے پر پہنچ کر رفع حاجات کے لیے کشتی سے اُتریں اور علاوہ طہارت و حوائجِ ضروریہ دوسرے مشاغل میں مُبتلا ہو جائیں۔ بادبان اُن کو ہدایت کردے کہ صرف طہارت کر کے کشتی میں واپس آجانا، لیکن وہ وہاں اپنی ذاتی "مشغولیات" میں لگ جائیں۔ چند ہی آدمی ایسے نکلیں کہ بادبان کے حکم کے مُطابق حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو کر صرف طہارت کریں اور کشتی پر واپس آجائیں، اور کشتی کی بہترین جگھوں پر قبضہ کرلیں۔ بخلاف اُن کے وہ لوگ جزیرے کے منقش در و دیوار کی محبت میں آغشتہ ہو کر کشتی کو بھُول جائیں یہاں تک کہ جب وہ واپس آئیں تو کشتی میں اچھی اور آرام دہ نشستیں گھر گئی ہوں، اور اُن کو تکلیف دہ جگھوں پر بیٹھنا پڑے۔

انھیں میں کے بعض لوگ صرف جزیرے کے عجائبات دیکھنے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ خوشنما اور قیمتی جواہرات اور پتھر بھی سمیٹ لائیں، مگر کشتی میں اتنی جگہ نہ پائیں کہ وہ آرائش دنیوی بھی وہاں رکھ سکیں۔ مجبوراً وہ تمام قیمتی پتھر اپنی گردنوں میں حمائل کر لیں اور چند دن بعد جب انھیں کھولا جائے تو وہ زنگ آلود ہو گئے ہوں۔ ان سے تعفّن آنے لگے۔ اس کے بعد ان کو پھینکنے کی جگہ بھی نہ ملے۔ پھر شرمندہ ہو کر ظلمات کا بوجھ ان کو اپنی گردن پر ہی سنبھالنا پڑے۔ اسی میں کچھ لوگ ایسے بھی رہ گئے کہ جو جزیرے کے خوشنما در و دیوار اور باغیچوں کے سبزہ زار کو دیکھ کر اتنے محو ہو گئے کہ انھیں کشتی یاد ہی نہ رہی، اور ساحل سمندر سے روانہ ہو گئی۔ وہ لوگ سمندر کے ساحل سے اتنا دُور رہے کہ بادبان کی منادی کو بھی نہ سُن سکے۔ وہ وہاں اتنے مشغول ہوئے کہ پھر بھوک کی برداشت نہ ہونے پر ہلاک ہو گئے اور بعض کو وہاں کے درندوں نے اپنا لقمہ بنا لیا۔

پہلی مثال مومنین کی ہے، جھنوں نے اس دُنیا میں صرف حوائج ضروریہ سے فراغت پا کر طہارت کی۔ دوسری مثال اُن کفار کی ہے جنھوں نے خدا اور روزِ قیامت اور خود کو بھلا دیا۔ اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (یعنی دوست رکھا دُنیا کو آخرت کے مقابلے میں) درمیان کے دونوں گروہ وہ گناہگار ہیں جنھوں نے آخرت کی حفاظت میں کوشش تو کی مگر دُنیا کو نہ چھوڑا۔ اِس میں سے کچھ لوگوں نے دُنیا سے نفع حاصل کیا۔ یعنی یہاں عیش و آرام کی زندگی گذاری، لیکن کچھ لوگ ایسے ہوئے کہ وہ یہاں تعیش کی زندگی گذارنے کے باوجود کچھ ایسے گناہ ساتھ لے گئے جو اُن کے جی کا جنجال ہو گئے۔

دلیل ۴ (علم و عمل)

دُنیا سے متعلق جو مذموم باتیں بتائی گئیں، اس سے یہ تصور نہیں ہونا چاہیئے کہ دُنیا کی ہر چیز بُری ہے بلکہ یاد رکھو کہ دُنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں، جن کا وجود تو ہے، مگر وہ یہاں سے متعلق نہیں ہیں جیسے علم اور اس پر عمل یہ دنیا میں موجود ہیں۔ مگر دُنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ آخرت میں بھی اس کے ساتھ رہیگا اس میں دونوں کی الگ الگ صُورتیں ہیں۔

علم[1] تو انسان کے ساتھ ساتھ وہاں بھی جائے گا، جس طرح اِس دنیا میں اس کے سینے میں پوشیدہ ہے۔
لیکن —— عمل[2] کے عکوس ہی وہاں رہ جائیں گے، جن کے اثرات باقی رہیں گے اور ان اثرات کی دو قسمیں ہیں۔
پہلی قسم وہ ہے، جو صفائی قلب اور لذاتِ دنیوی کے ترک سے حاصل ہوتی ہے۔
دوسری قسم وہ ہے، جو خداوندِ عالم کے ذکر اور اس کی عبادت کی زیادتی سے حاصل ہوتی ہے اور یہ چیزیں سب باقی رہنے والی ہیں۔ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ علم اور خدا کی درگاہ میں بندگی ظاہر کرنا تمام صفاتِ حسنہ سے اعلیٰ ہے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر صفت بھی دُنیا سے تعلق نہیں رکھتی۔ اگرچہ دُنیا میں اس کا وجود ہے

لہٰذا لذاتِ دنیوی سب ہی بُری نہیں ہیں، بلکہ وُہ لذات جو حاصل ہونے کے بعد فنا ہو جائیں وُہ بُری نہیں ہوتیں
اِن لذات کی بھی دو اقسام ہیں۔

اوّل وہ لذات جو دُنیا سے متعلق ہیں۔ لیکن موت کے بعد اُن کا وجود نہیں رہتا، لیکن آخرت کے لیے وہ مددگار ثابت ہوتی ہیں جیسے نکاح۔ غذا۔ مکان۔ لیکن جو اعتدال پر ہو اور آخرت کے لیے ضروری ہو۔ یعنی یہ سب اسباب صرف اِتنی ہی حد تک رہیں کہ آخرت کے لیے انسان اپنا سامان اکٹھا کر سکے۔ اگر ایسا ہے تو یہ چیزیں دُنیا سے متعلق ہوں گی۔

دوسری وُہ لذات ہیں، جن سے دُنیا میں آخرت کی پروا نہ رہے۔ اور صرف دُنیا ہی کی زیبائش مدِنظر رہ جائے اور وہ سب اسبابِ دنیوی عالم ارواح سے نفرت دلانے والے ہوں۔ ہمارے رسُول مقبُول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسی لیے فرمایا ہے کہ الدنیا ملعونۃ وملعون مافیھا الا ذکر اللہ وما والاہ اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب لعنت کے قابل ہیں، لیکن سوائے خداوندِ عالم کے ذکر کے، یا اُس کی معرفت میں جو اشیاء مددگار ہوں۔

اب تک جو کچھ دُنیا کے متعلق بیان کیا گیا، وہ کافی ہے۔ باقی باتیں "ارکانِ معاملہ کی بشری" جسے "عقباتِ راہِ دین" کہتے ہیں، اِس کے ذیل میں بتایا جائے گا۔ اِنشاء اللہ۔

بابؑ

آخرت کی معرفت کے متعلق

دُنیا کا کوئی آدمی بھی بغیر موت کی حقیقت کے پہچانے ہُوئے، معرفت آخرت حاصل نہیں کر سکتا اور موت کی حقیقت زندگی کی حقیقت کے بعد پہچانی جا سکتی ہے۔ اسی طرح زندگی کے حقائق کی معرفت حاصل کرنے سے پہلے معرفت رُوح ضروری ہے، اور روح کی معرفت اپنے نفس کو پہچاننے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آدمی دو مرکبات سے بنایا گیا ہے۔ ایک روح، دوسرا جسم ظاہری۔ روح سوار کی کی طرح ہے اور جسم اس کی سواری ہے۔

رُوح کے لیے بدن کے ساتھ ایک واسطہ ہوگا، جو دوزخ اور بہشت میں مستوجب سزا و جزا ہوگا۔ علاوہ اس کے بھی رُوح کے لیے اس کا ایک "ذاتی" قالب ہے۔ جو موجودہ بدن کے علاوہ بھی سزا و جزا پائے گا۔ چونکہ لذت بدن کے واسطے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ وہ براہِ راست اس لذت سے حظ پاتی ہے۔ اسی کا نام بہشت رُوحانی ہے۔ اور رُوح کو جو تکالیف بغیر بدن کے حاصل ہوتی ہیں۔ اس کو آتش روحانی کہا جاتا ہے۔ وہ جنت و دوزخ جس میں تمہارا بدن جائے گا، وہ صورت ظاہری ہی سے متعلق ہے۔ اور وہ جنت میں اگر جائے گا تو دُودھ کی بہتی ہوئی نہریں، حور اِن جنت پائے گا، اور اگر جہنم میں جائے گا تو سانپ اور بچھو کی مصیبتیں ہیں۔ ان دونوں چیزوں کے متعلق قرآن اور احادیث میں برابر ذکر کیا گیا ہے، وہ ہر ایک آدمی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے متعلق ہم نے اپنی کتاب "احیاء العلوم" کے باب "ذکر الموت" میں بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف اسی پر اکتفا کر رہے ہیں، تاکہ موت کی حقیقت کو واضح طور پر لکھ سکیں اور دوزخ و جنت کی روحانی حالت کو بیان کر سکیں، کیوں کہ ہر آدمی اُن سے واقف نہیں ہے اور یہ جو کہا گیا ہے۔

یہ رُوحانی بہشت کے متعلق ہی ہے۔ اِس کے حقائق دل کی اس حقیقت سے معلوم ہو سکتے ہیں جو عالمِ ملکوت سے متعلق ہیں، اور جس آدمی کا دل ان حقائق سے تھوڑا سا بھی متعلق ہے، وہ اس سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور آخرت کی سزا و جزا پر دل سے یقین رکھتا ہے، نہ کہ صرف سُننے کی وجہ سے — بلکہ اس نے اپنے مشاہدات سے سمجھ لیا ہے اور یقین کر لیا ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی حکیم کسی کی نبض دیکھ کر اس کی بیماری کو پہچان لے۔ اس کے لیے بھی دو علاج ہیں۔ دوا اور پرہیز کرنا۔ جسم کی صحت اور تندرستی کا نام سعادت ہے، اور بدپرہیزی کرنا، شقاوت و ظلم

کے مانند۔ اسی طرح وہ آدمی جس کا دل حقائق کو دیکھ سکتا ہے۔ یعنی اس کا دل رُوح کی اچھائی اور بُرائی کو اپنے مشاہدات سے سمجھ لیتا ہے۔ اور یہ ہی سمجھ لینا عبادت و معرفت کہلاتی ہے جو رُوح کی سعادت کا سبب ہوتی ہے۔ ایسے ہی

تقلید اور علم ذاتی جہالت اور گناہ روح کے لیے عذاب کا باعث ہیں۔ ان چیزوں کا جاننا بھی ایک بلند پایہ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سے آدمی اگرچہ علما کی صف میں شمار ہوتے ہیں، لیکن اس سے لاعلم ہیں، بلکہ ان باتوں کے منکر بھی ہیں۔ وہ لوگ سوائے جسمانی جنّت و دوزخ کے کچھ نہیں جانتے اور صرف تقلید کے قائل ہوتے ہیں۔ ہم نے اِس مسئلے میں نہایت تدقیق و تحقیق اور مستند کتب سے کام لیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، وہ پاک باطن اور سمجھدار، نیز غیر متعصب آدمی کے سمجھنے کے لیے کافی ہوگا، تاکہ وہ اس کو پڑھ کر ان باتوں کو سمجھ لے اور آخرت کی معرفت اس پر روشن ہو جائے۔ کیونکہ اس سلسلے میں بہت سے آدمیوں کا ایمان ضعیف ہے۔

دلیل ۱ اے دوست اگر تُو موت کے حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے، تو سمجھ لے۔

کہ اِنسان کے واسطے دو روحیں بنائی گئی ہیں :

ارواحِ اِنسانی پہلی وہ روح جو حیوانات (عوام جانداروں) کی طرح ہے۔ اسے روح حیوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری وہ روح جس کا تعلق ملائکہ سے ہے، اسے رُوحِ اِنسانی کہتے ہیں۔

رُوحِ حیوانی کا تعلق دل سے ہے، جو تیرے سینے میں ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ یہ روح حیوان کے باطن سے متعلق ہے، جو ایک معتدل مزاج میں "بخار" (دھوئیں کی طرح) دل کی حرکت کے ذریعہ جسم کی رگوں میں پھیلتی ہے جس کے بعد اِنسان میں حرکت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بخارات جب دماغ کی طرف عود کرتے ہیں تو اس کی حرارت (گرمی) کم ہو جاتی ہے۔ اور وہ معتدل ہو جاتی ہے اور اس اعتدال کے بعد آنکھوں میں دیکھنے کی اور کانوں میں سُننے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اور حواس بھی اسی سے بنتے ہیں۔

اس کی آسان مثال ایک چراغ کی سی ہے کہ جب گھر میں روشن کرو تو در و دیوار جگمگانے لگتے ہیں۔ پس اسی طرح اس روح کے ذریعہ حواسِ خمسہ معرفتِ الٰہی کے انوار سے محفوظ ہونے لگتے ہیں۔ اور اگر کسی رگ

رُوح کی تمثیلات میں کوئی گرہ پیدا ہو جائے تو وہ ہی فالج کے اثرات کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد حکیم اس گرہ کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

روح حیوانی کی دوسری مثال ایک آگ کے چراغ کی سی ہے۔ اس کا جسم فتیلے کی طرح ہے، جس کی غذا تیل کی سی ہے۔ اب سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر چراغ کا تیل ختم ہو جائے گا، تو چراغ بُجھ جائے گا۔ اسی طرح اگر انسانی جسم میں غذا نہ رہے گی، تو روح کے تمام کاموں کا اعتدال بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر چراغ میں تیل زیادہ ہو، اور فتیلہ اس تیل کو زیادہ کھینچنے لگے، تو چراغ بھڑکنے لگتا ہے

وہ بھی اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کا دل جب زیادہ ضعیف ہو جاتا ہے تو دل کی حرکت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

اور اگر جلتے ہوئے چراغ کو چاہے اس میں بتی اور تیل سب کچھ موجود ہو، اپنے ہاتھ سے پھینک دو، تو وُہ بجھ جائے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تیز باد مخالف کو وہ برداشت نہ کر سکا۔ اسی طرح انسان بھی اگر زیادہ زخمی ہو جائے، تو اُس کی روح بھی برداشت نہ کرنے کی وجہ سے قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔

حقیقتِ رُوح رُوح خداوندِ عالم کے حکم کے مُطابق فرشتگانِ الٰہی کے انوارِ لطیفہ سے اعتدال کے ساتھ لطافت کو قبول کر لیتی ہے، اور اس کے بعد اگر کسی وقت عناصرِ اربعہ کے اعتدال میں فرق پڑتا ہے، پھر رُوح سردی یا خشکی کی زیادتی و کمی کو قبول نہیں کر سکتی۔ اس کو آسانی کے ساتھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے آئینہ جب تک صاف و شفاف ہے، اس میں ہر چیز کی شکل ہو بہو نظر آتی ہے، لیکن زنگ لگنے کے بعد اس میں کچھ نہیں دیکھا جا سکتا۔ در اصل وہ صورتیں اپنی جگہ پر موجود ہیں، لیکن اُن صورتوں کو ظاہر کرنے کی اہلیت اس آئینے میں نہیں رہی۔

عناصرِ اربعہ پس اسی طرح اس رُوحِ حیوانی میں جب تک عناصرِ اربعہ کا اعتدال باقی رہتا ہے۔ وہ صورت جسمیہ میں باقی رہتی ہے، اور جہاں کسی جز کی کمی یا زیادتی ہُوئی، وہ اس سے الگ ہو جاتی ہے اور یہی حیوان کی موت کا باعث ہوتا ہے۔

مرگ حیوانی کا اصل مقصد یہی ہے۔ اس معتدل مزاجی کو دُور کرنے والا خدا کی طرف سے مقررہ ایک فرشتہ ہے، جس کو ہم "ملک الموت" کے نام سے پکارتے ہیں، لیکن اس کی اصل معرفت بہت مشکل ہے۔

اِنسان (اشرف المخلوقات) کی موت علاوہ اس طریقے کے دوسری طرح بھی واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان میں ایک حیوانی روح کے علاوہ دوسری روح جس کو "رُوحِ انسانی" کہا جاتا ہے موجود ہے، اور ہم اسی کو اصطلاح میں "دل" کہتے ہیں۔ اس کے متعلق پہلے ہی ہم تم کو بتا چکے ہیں۔

روح اور جسم کا باہمی تعلق "دل" حیوانی روح کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہونے والی چیز نہیں۔ وہ ایک صاف شفاف ایسی روح ہے۔ جس میں خداوندِ عالم کی معرفت پیدا ہوتی ہے اور چونکہ "دل" جزو لا یتجزیٰ (ناقابلِ تقسیم) ہے۔ اور ذاتِ باری کی معرفت بھی ناقابلِ تقسیم ہے۔ معرفتِ الٰہیہ خود بھی ناقابلِ تقسیم ہے۔ لہٰذا وہ ایسی ہی چیز دل میں سما سکتی ہے جو خود بھی ناقابلِ تقسیم ہو۔

اس کو اس طرح سمجھ لو، کہ چراغ کے تین اجزا ہوتے ہیں۔ بتّی۔ لَو۔ روشنی۔ ان تینوں چیزوں میں بتّی چونکہ صاف صورت جسمیہ ہی رکھتی ہے۔ لہٰذا مان لو کہ یہ انسان کا جسم ہے۔ لَو روح حیوانی اور روشنی رُوحِ انسانی اور

ظاہر ہے کو یہ نسبت روشنی کے نور کے کہیں زیادہ صاف و شفاف ہے، لیکن اس مثال کا دوسرا رُخ بالکل برعکس ہے۔

وہ یہ کہ لو تابع ہے بتی کی اور روشنی تابع ہے لو کی۔ اگر لو کو بجھا دیا جائے تو روشنی ختم ہو جائے گی، مگر رُوحِ انسانی، روحِ حیوانی کی تابع نہیں ہے۔ بلکہ اس کا برعکس ہے مقصد یہ ہے کہ رُوحِ حیوانی فنا ہونے سے رُوحِ انسانی فنا نہیں ہوتی۔

اس کی سب سے اچھی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نورِ جو چراغ کی روشنی سے کہیں زیادہ لطیف ہے۔ اور چراغ کی روشنی اس اصل نور کی مطیع ہے۔ لہٰذا اصل میں چراغ کی روشنی اس حقیقی نور کی تابع ہوگی۔ یہ مثال پہلی مثال سے بہتر ہے۔

اب دوسرا رُخ اگر دیکھو تو رُوحِ حیوانی، رُوحِ انسانی کی سواری ہے، جو اپنے تمام کام روحِ حیوانی سے لیتی ہے، لیکن جب روحِ حیوانی فنا ہو جاتی ہے یعنی انسان مر جاتا ہے، تب گویا کہ رُوحِ انسانی کا وجود تو باقی رہتا ہے۔ لیکن وہ بغیر ہتھیار اور سواری کے رہ جاتی ہے۔ یہ ہتھیار روحِ انسانی کو صرف معرفتِ الٰہیہ کے حصول کے لیے بخشا گیا ہے۔ اگر معرفتِ حق انسان نے اپنے جسمِ ظاہری کے ذریعے حاصل کر لی ہے۔ تو جسمِ انسانی کا فنا ہو جانا، روحِ انسانی کی فلاح کا باعث ہے، چونکہ اس نے اپنا حقیقی مقصد حاصل کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ موت انسان کے لیے ایسا تحفہ ہے۔ جیسے شکار کرنے کے بعد جال فنا ہو جائے اور اس جال کے کھو جانے سے اصل مقصد کی تکمیل میں کمی واقع نہ ہو۔

اور اگر بدنصیبی سے شکار حاصل ہونے سے یعنی معرفتِ حقیقی حاصل ہونے سے پہلے ہی وہ جال یعنی انسانی جسم ضائع ہو گیا، تو یہ انسان کے لیے انتہائی بدنصیبی اور افسوس کا مقام ہے۔

دلیل ۲: جاننا چاہیئے، کہ اگر کسی آدمی کے ہاتھ پیر یا کوئی عضو جسم مفلوج ہو جائے، تو آدمی اپنی جگہ آدمی ہی رہتا ہے، کیونکہ وہ اعضا مفلوج اس کے محکوم ہیں، اور اس کے لیے ہتھیار کی طرح ہیں۔ اُن کا استعمال کرنا اس کے اختیارات میں ہے۔ اسی طرح انسان کا پیٹ، پیٹھ اور جسم کے تمام اعضاء اگر ایک لخت شل ہو جائیں اور وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے، لیکن صرف رُوح باقی رہ جائے۔ پس بالکل اسی طرح جسمِ ظاہری، یعنی روحِ حیوانی اور رُوحِ انسانی کا فرق ہے، کہ روحِ حیوانی ختم ہو جاتی ہے، لیکن روحِ انسانی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

اگر ہاتھ تیری اطاعت نہ کریں (شل ہو جائیں) وہ ایک صفت کے ماتحت ہوگا۔ اسی کو قدرت اور طاقت سے تعبیر کریں گے، اور وہ صفت نور ہے۔ جو طاقت روحِ حیوانی سے ہاتھ کو ملتی ہے۔ اگر وہ طاقت روحِ حیوانی سے ہاتھ کو نہیں پہنچتی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے درمیان میں کوئی رکاوٹ حائل ہے۔ اسی طرح

تمام اعضاءِ جسم روحِ حیوانی سے متعلق ہیں، وہ سب اسی کے حکم سے کام کرتے ہیں۔ اور جب رُوحِ حیوانی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، تو اُس کو ہم موت کہتے ہیں۔ حالانکہ اصل روحِ انسانی زندہ رہتی ہے۔

لہٰذا تیرا یہ جسمِ ظاہر تیری حقیقت کیونکر ہو سکتا ہے؟ اگر ذرا سا غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کہ یہ جسمِ ظاہری جو بچپن میں تھا۔ وہ اب غذاؤں کے ذریعے بالکل بدل چکا ہے اور دن رات اس میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تو بالکل وہی ہے جو بچپن میں تھا۔ تیری حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تیرا وجود، تیرے جسم کی وجہ سے نہیں ہے۔ تیرا جسمِ ظاہری اگر ختم ہو جائے تو بھی تو اپنی جگہ پر زندہ رہے گا۔ اس کے بعد اتنا سمجھا دینا اور ضروری ہے کہ

اِنسان دو صفتوں سے متصف ہے۔ ایک میں اس کا جسمِ ظاہری شریک ہے۔ جیسے بھوک، پیاس، سونا اور جاگنا۔ یہ چیزیں مادہ اور جسم دونوں سے مل کر بنتی ہیں، اور ان دونوں کے تفرقے سے فنا ہو جاتی ہے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ اس میں یہ جسمِ ظاہر شریک نہیں جیسے معرفتِ الٰہیہ اور اس کے نور کو سمجھنا یہ تیری ذاتی صفت ہے جو ظاہری جسم کی موت سے پہلے اور بعد "ہر وقت" میرے ساتھ رہے گی۔

"باقیات الصالحات" کا مقصد یہی ہے۔ اب اگر معرفتِ الٰہیہ تجھ کو حاصل نہیں ہوئی یعنی تو جاہل ہی رہا تو یہ بھی تیری صفت ہوگی۔ اور پہلے کی طرح جہالت کی صفت بھی تیرے ساتھ موت کے بعد رہے گی، جو تیری رُوح کے لیے اندھا ہونے کی دلیل ہوگی۔ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا (یعنی جو اس دنیا میں اندھا ہے، وُہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا) جب تک ان دونوں روحوں کے متعلق مکمل معلومات تجھ کو نہ ہوگی اس وقت تک موت کی حقیقت تیری سمجھ میں نہ آ سکے گی۔

دلیل ۳:۔ یُوں سمجھنا چاہیئے کہ روحِ حیوانی "عالمِ سفلی سے تعلق رکھتی ہے، جو خلطوں (خُون، بلغم، سودا صفرا) کے بخارات سے مل کر بنتی ہے۔ ان چاروں خلطوں کی اصل عناصرِ اربعہ (آب، آتش، خاک، ہوا) ہیں جن کے مزاج کا اختلاف گرمی، سردی، خشکی اور تری منحصر ہے۔

علمِ طب کا مقصد صرف ان سب چیزوں کو اعتدال پر رکھنا ہے، تاکہ روحِ حیوانی، رُوحِ انسانی کی متابعت میں کوئی کمی نہ کرے۔

روحِ انسانی اس عالمِ ظاہری سے تعلق نہیں رکھتی۔ اِس کا تعلق عالمِ علوی سے ہے، جو فرشتگانِ مقربین کا اصل جوہر ہے۔ اس روح کا موجودہ عالمِ ظاہری میں آنا صرف عارضی ہے اور اس کو یہاں صرف اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ آخرت کے لیے اس دنیا سے اپنے لیے سامان اکٹھا کر لے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (یعنی ہم نے حکم دیا کہ یہاں سے

اتر جاؤ - پس اگر تم میری ہدایت سُن کر فرمانبرداری کروگے تو تمھارے لیے کوئی خطرہ نہیں اور کوئی تکلیف نہ ہوگی
دوسری جگہ فرماتا ہے - اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ مِنْ رُّوْحِیْ - اس آیۂ کریمہ میں
دونوں روحوں کے الگ الگ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے -

ایک رُوح کو مٹی سے متعلق کیا، اور اس کے معتدل ہونے کو سَوَّیْتُهٗ کا اشارہ کیا - یعنی میں نے اس کو بنایا، اور یہی اس کا اعتدال تھا - اس کے بعد ارشاد ہو نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ اس کو اپنے سے نسبت دی -

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے سفید کپڑے کو اس لیے جلا دیا جائے، تاکہ آگ کو قبول کرنے کے لائق ہو جائے - جس طرح رُوح حیوانی سفلی سے متعلق ہے اور علمِ طب میں اس کی وضاحت موجود ہے - اس کے مزاج کو اعتدال پر رکھنے کے لیے علاج مقرر ہیں، تاکہ بیماریوں سے نجات مل سکے - اسی طرح رُوح انسانی علوی ہے، جو دل کی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے - اس کے لیے بھی اعتدال کے درجات بنا دیئے گئے ہیں

رُوحِ انسانی کو معتدل رکھنے کے لیے شریعت اسلام نے علم اخلاق اور ریاضت کو بنایا ہے، تاکہ اس کی مدد سے روحِ انسانی اعتدال پر رہ سکے - اس کے متعلق "ارکانِ مسلمانی" میں تفصیل کی جائے گی -

نتیجہ یہ نکلا کہ رُوح کی حقیقت کی معرفت کے بغیر آخرت کی معرفت ناممکن ہے، جس طرح اپنی معرفت کے بغیر خداوندِ عالم کی معرفت ناممکن ہے - لہٰذا معلوم ہوا کہ ــــ

اپنی معرفت خدا کی معرفت کی کنجی ہے - اور ارواح کی معرفت آخرت کی معرفت کی کنجی ہے ــــ	معرفتِ خود معرفت خدا کا زینہ ہے

اور اصل دینِ الٰہی یہی ہے، کہ خدا اور آخرت پر ایمانِ کامل رکھا جائے

اس لیے ان دونوں چیزوں کو سمجھنا مقدم سمجھا، لیکن خداوندِ عالم کے اوصاف کے رازوں میں سے ایک راز نہیں بتایا گیا، چونکہ اس کے اظہار کی ممانعت کر دی گئی ہے اور ہر آدمی اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا - لیکن اللہ اور آخرت کی معرفت اس ایک راز پر موقوف -

لہٰذا کوشش کرنا چاہیے، کہ اپنی ریاضت اور عبادت خدا کے ذریعہ اس راز کو سمجھ سکے اور اگر تجھ کو وہ صفت بتائی بھی گئی، تو تُو اس کا منکر ہو جائے گا، جیسا کہ لوگوں نے سُنا اور اس راز پر یقین نہ کیا - دراصل اس صفت کے سننے کی طاقت اُن لوگوں میں نہ تھی جس کی وجہ سے انھوں نے انکار کر دیا -

انھوں نے دلیل دی کہ یہ عقلاً ناممکن ہے، حالانکہ ان کی یہ دلیل پاک اور معقول نہیں، بلکہ اُن کی جہالت کا

سبب ہے۔

لہٰذا وہ بات اِنسان کے لیے کیسے سمجھ میں آسکتی ہے، جو خداوند عالم نے اپنے متعلق نہ قرآن میں صاف طور پر ذکر کی ہے اور نہ ہمارے رسُولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی حدیث میں صراحتاً ارشاد فرمایا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ عوام اس راز کو سنتے ہیں، تو فوراً انکار کر دیتے ہیں۔ خداوندِ عالم نے اپنے انبیاء و رسل کو ہدایت کر دی ہے کہ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ یعنی آدمیوں سے اُن کی عقل کے مُطابق ہی بات کریں بعض انبیاً علیہم السلام کو وحی ہوئی ہے کہ ہمارے اُن صفات کو بیان نہ کیا جائے، جن کو سُن کر وہ سمجھ نہ پائیں، اور سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے وہ انکار کر بیٹھیں، اور یہ اُن لوگوں کا انکار ان کے لیے مضرت رساں ہوگا۔

دلیل ۴ :

حقیقتِ اِنسان | پچھلی دلیلوں سے تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اِنسان کی جان کی حقیقت اس کی اپنی ہی ذات سے قائم ہے، اور وہ اپنی ذاتی صفات کی بناء پر کسی قالب یا جسم سے بے نیاز ہے، اور اس موت کے معنی اس اِنسان کی حقیقت کا فنا ہو جانا نہیں ہے، بلکہ وہ دراصل اس روحِ حیوانی سے اس کا تصرف ختم ہو جانا ہے۔

اے مسلمان سمجھ لے! کہ حشر اور اعادت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی فنا کے بعد بھی اس کو وجود میں لایا جائے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو جسم ظاہری عطا کیا جائے گا۔ اس طرح کہ پھر ایک بار ظاہری قالب رُوحِ انسانی کے تصرفات کو قبول کرے گی، جیسے کہ پہلے تھا، اور یہ بات نہایت آسان ہوگی۔ کیونکہ پہلی بار تو رُوح اور جسم دونوں کا بنانا تھا۔ لیکن اس بار رُوح تو موجود ہے۔ بلکہ جسم کے اعضاء بھی موجود ہیں۔ لہٰذا اُن کو آپس میں مجتمع کرنا آسان ہے۔ بہ نسبت پیدا کرنے کے۔

مگر جس جگہ حقیقت ہے، وہاں آسانی کو خدا کے فضل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، کیونکہ جہاں دشواری نہ ہوگی وہاں آسانی بھی نہ ہوگی۔ دراصل اِنسان کو دوبارہ جسم ظاہری دینے کا یہ مقصد نہیں کہ وہ ہی پہلا جیسا جسم اس کو دوبارہ بھی دیا جائے گا۔ کیونکہ جسم سواری کی مثل ہے، اگرچہ گھوڑا دوسرا ہے، لیکن سوار (روح) تو وہی ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ غذا کے ذریعہ انسان کے تمام اعضاء رفتہ رفتہ بدلتے رہتے ہیں، لیکن وہ انسان بذاتِ خود وہ ہی رہتا ہے۔

جن لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قیامت میں یہی ہمارا موجودہ ڈھانچہ ہم کو دیا جائے گا۔ اُن پر لوگوں نے ایسے اعتراضات کیے، جن کا جواب تو انھوں نے دیا، لیکن وہ شافی نہ تھا۔ اُن سے دریافت کیا گیا کہ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کو کھا جائے، اور دونوں کے اجزاء باہم مل کر ایک ہو جائیں، تو وہ اجزاء حشر میں کس کو ملیں گے؟ اسی طرح اگر کسی آدمی کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، اور پھر وہ آدمی خداوند عالم کی عبادت کرے اور عبادت کا ثواب

اس کو ملے تو اس کا کاٹا ہوا عضو اس وقت اس کے ساتھ ہو گا یا نہیں - اور اگر وہ عضو اس وقت اس کے ساتھ نہ ہو گا، تو وہ بغیر اپنے اس عضو کے جنت میں کیسے داخل ہو گا؟ اور اگر وہ عضو اس کو مل جائے گا، تو وہ عضو دوسرے اعضا کا شریک کس طرح ہو سکتا ہے؟ جبکہ عبادت اور ریاضت کے وقت وہ اُن کا شریک نہ تھا۔

لوگ اس قسم کے پوچ اعتراضات کرتے ہیں، اور جواب دینے والے لوگ نہایت تکلف کے ساتھ نامکمل جواب دیتے ہیں - للذا جب تو نے دوبارہ زندہ ہونے کی حقیقت کو سمجھ لیا، تو تجھے اُن معترضین سے خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے، چونکہ تو اپنے سابقہ قالب کا محتاج نہیں -

یہ تمام اعتراضات اِس غلط فہمی کا نتیجہ ہیں کہ لوگ تمہارے نورؔ اور حقیقت کو اسی قالب میں تصور کرتے ہیں - گویا کہ وہ ثبوت دیتے ہیں کہ اگر تم بعینہ اسی صورت و شکل میں نہ ہو گے - تو گویا کہ "تو" نہ ہوا - بلکہ وہ کوئی دوسری چیز ہو گی، اور اسی وجہ سے وہ لوگ اس بحث میں پڑ گئے، حالانکہ اس حقیقت کو وہ سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کی دلیل کمزور رہی۔

دلیل ۵ دوستو! اگر تم فقہا اور متکلمین کے اس مذہب کے پیرو ہو؟ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان موت کے بعد قطعی طور پر فنا ہو جاتا ہے - اور دوبارہ پھر اس کو بعد موت کے وجود میں لایا جاتا ہے۔

اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا آدمی اندھا ہے - وہ نہ مقلد ہے، اور نہ خود ہی حقیقت بین نگاہوں سے دیکھتا ہے - اگر وہ اہلِ بصیرت میں سے ہوتا، تو سیدھی سادھی بات سمجھ میں آجانی چاہیئے کہ جسمانی موت روح سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور اگر مقلد ہوتا تو قرآن مجید اور احادیث نبوی پر ایمان لاتا کہ انسان کی روح جسمانی موت کے بعد بھی زندہ و باقی رہتی ہے۔

روح کے سات درجات | یاد رکھو کہ جسمانی موت کے بعد روح کے لیے دو طبقے مقرر ہیں - ارواح اشقیا (بد) ارواح صالحین (نیک) ارواح صالحین کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے - وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ - فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ
یعنی وہ لوگ جو میری راہ میں مارے گئے، وہ مُردہ نہیں ہیں - بلکہ زندہ ہیں، اور میری بارگاہ سے جو خلعت فاخرہ اِن کو عنایت ہوئے ہیں، وہ سب اُن سے خوش ہیں اور ہمیشہ وہ میری جناب سے روزی پاتے ہیں۔

جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے کفّار کو قتل کا حکم دیا، تو ایک ایک کا نام لے کر آواز دی کہ اے فلاں ابنِ فلاں آگاہ ہو! کہ خداوند عالم نے کفّار و مشرکین کے متعلق جو وعدہ کیا تھا، وہ میں نے پورا پایا اور تم بھی بتاؤ کہ تمہارے متعلق اس کا جو حکم تھا، کہ مرنے کے بعد عذاب میں مبتلا کیے جاؤ گے، وہ بھی تم نے سچ پایا، یا نہیں؟ تو حاضرین نے جواب دیا، اے ہمارے رسول! یہ سب مُردہ ہیں، یہ باتیں کیسے کر سکیں گے۔

اِس وقت جواب دیا رسُولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، کہ یہ سب لوگ تم سے کہیں زیادہ سُننے کی اہلیت رکھتے ہیں، مگر جواب دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

مُردوں کو دُنیا کی ہر چیز کا علم ہے

اگر مُردوں کے احکامات کی تحقیق قرآن و حدیث میں کی جائے، تو معلوم ہوگا کہ وہ سب اِس دُنیا سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کے بعد اس کو یقین آجائے گا، کہ شریعت کے مُطابق مرنے والے قطعی طور پر فنا نہیں ہوجاتے، بلکہ اُن لوگوں کے متعلق یہ ہے کہ اُن کی صفت تبدیل ہوجاتی ہے۔ صورت جسمیہ بدل جاتی ہے۔

قبر ایک غار ہے، دوزخ کے گڑھوں میں سے، یا ایک بہشت کے چمنستان کا ہرا بھرا باغ ہے یقین جانو! کہ موت سے اِنسان میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ سوائے حواس و حرکات اور قوتِ تفکرات کے، جو اعضاء اور دماغ سے متعلق ہیں۔

اِنسان وہاں قطعی تنہا ہوگا۔ یعنی ان تمام حواس خمسہ و صورت جسمیہ سے مبرّا ہوگا۔ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کوئی جولاہا کسی گھوڑے کا سوار ہو اور وہ گھوڑا مر جائے، تو وہ جولاہا فقیہہ نہیں ہوسکے گا۔ اور اگر اندھا ہو تو آنکھوں میں روشنی واپس نہ آجائے گی۔ صرف اتنا ہی اس میں فرق آجائے گا کہ وہ سوار سے پیادہ ہوجائے۔

پس جاننا چاہیئے کہ تیرا قالب سواری ہے۔ اور تو اس پر سوار ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر کوئی تصوّف کے مسائل میں ڈُوب کر معرفت حقہ حاصل کرے تو وہ اپنے کو بھی اس دنیا میں بھلا دیتا ہے اور اپنے وجود سے بھی اتنا غافل ہوجاتا ہے کہ اس کو آخرت کے حالات نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی رُوح حیوانی اپنے اصل پر ہی باقی رہتی ہے، لیکن وہ رُوح انسانی سے اتنی عاجز ہوجاتی ہے کہ خُدا کا خوف اس پر غالب آجاتا ہے، اور وہ موجودہ دنیا میں بھی رہتے ہوئے دنیا سے بے تعلق رہتا ہے اور جو امور و رموز دوسروں کو بعد موت کے نظر آتے ہیں، اس کو زندگی ہی میں نظر آنے لگتے ہیں، اور جب وہ عالمِ محسوسات کی طرف عود کرتے ہیں، تو اس کو ان باتوں سے کوئی کوئی بات تو یاد رہ جاتی ہے اور باقی کو بھلا دیتا ہے۔

اسی طرح اگر جنت کے حقائق اس پر روشن کیے جائیں، تو خوشی ہوتی ہے۔ اور جہنم کی حقیقت معلوم ہونے سے رنج و تکلیف کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ اگر ان تمام باتوں میں کوئی بات یاد رہ جائے تو وہ اس بات کے متعلق دوسروں کو آگاہ بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی تصوّر ان کے ذہن میں پوری طرح موجود ہے، تو وہ تصورات اور تخیلات بھی لوگوں تک پہنچاتے ہیں، جس طرح ہمارے رسُولؐ نے حالتِ نماز میں ہاتھ بڑھایا اور فرمایا کہ مجھ کو اس وقت خوشہ انگور دکھایا گیا تھا۔ لیکن جس کی مثال 'خوشہ انگور' سے دی گئی، وہ دراصل خوشہ انگور نہیں تھا، بلکہ وہ ایک تصوّر ہے۔

اور اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے، تو اصل "خوشہ انگور" بھی لا سکتے تھے۔ لیکن اس عمل کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ نہ مجھ کو اس کے جاننے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلے میں علماء کے مختلف خیالات ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ وہ اس "خوشۂ انگور" کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھا، یا جس کو حضورؐ نے بیان فرمایا، اس کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور سمجھنا چاہتا ہے، لیکن بعض علماء کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ بڑھانا نماز کو فاسد نہیں کرتا، اور اسی بات میں محو ہو کر اپنے علوم معرفت کو اوّل و آخر سمجھ لیا۔ وہ لوگ معارف و حقائق کی تحقیق سے قاصر ہیں اور اپنے کو تعطل میں ڈال رہے ہیں۔ شریعت کو اس سے قطعی انکار ہے۔

ارواح انسانی و حیوانی درحقیقت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے متعلق جو اطلاع ہم کو دی ہے، وہ جبرئیل علیہ السلام سے سُنی ہوئی ہے۔ جیسے کہ ہر حدیث کے متعلق ہم جانتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہشت کو دیکھا، حالانکہ حقیقی بہشت کو اس دنیا میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ مگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس موجودہ دُنیا سے وہاں تشریف لے گئے، اس وقت آنحضرتؐ یہاں نہیں تھے۔ حضورؐ کی غیبت بھی ایک قسم کی معراج تھی۔

غائب ہونے کی دو قسمیں ہیں: ایک روح حیوانی کا غائب ہونا

دوسرے روح حیوانی کا طاقت ور ہو جانا

اور جس طرح ایک پستے کے چھلکے میں دنیا کے ساتوں آسمان اور ساتوں زمین نہیں سما سکتیں، اسی طرح بہشت کا ایک ذرّہ بھی اس دُنیا میں نہیں سما سکتا، اور جیسے قوتِ سماع، آنکھوں کی طرح اس دُنیا کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح اس دنیا کی تمام حسیات، بہشت کے ذرّات سے معزول ہیں۔ چونکہ اُس دنیا کے ذرات یہاں سے جداگانہ ہیں۔

دلیل ۶

عذابِ قبر اب تجھ کو عذابِ قبر کی حقیقت معلوم ہو جانا چاہیئے۔ عذابِ قبر دو قسموں سے متعلق ہے۔

(۱) روحانی

(۲) جسمانی — جسمانی کو تو ہر آدمی جانتا ہے۔ لیکن عذاب روحانی کو سمجھنا مشکل ہے۔

عذاب روحانی کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں، جو اپنی معرفت حاصل کئے ہوئے ہیں، اور موت کے بعد روح کی بقا کے قائل ہیں۔ اور موت کو صرف ہاتھ پیر نیز دوسرے اعضا کو فنا سمجھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ حواس خمسہ لے لینے کے معنی موت کے ہیں۔ یعنی اس کے پاس اس دنیا میں حواس سے متعلق جتنی چیزیں ہیں مثلاً اہل و عیال دولت و

مال، مکان اور غلام یہ سب کچھ اس سے چھین لیے جاتے ہیں۔ پس اگر وہ ان تمام چیزوں کی علیحدگی سے اس کو انتہائی تکلیف پہنچے گی، اور یہی گویا کہ اس کے لیے عذاب ہے۔ اور اگر وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھا اور صرف خداوندِ عالم کے ذکر سے محبت تھی، تو گویا کہ موت کے بعد وہ اپنے محبوب کے پاس پہنچ گیا، اور وہ تمام چیزیں جن سے اس کو تکلیف پہنچتی تھی، نجات پا گیا۔ پس اس کا نام سعادت ہے۔

اس کے بعد غور کرنا چاہیے کہ جس نے اپنے کو پہچان لیا، کہ وہ باقی رہے گا، لہٰذا اگر وہ مال دُنیا کو محبوب سمجھتا رہا ہے جو موت کے بعد اس سے چھوٹ جانے والا ہے، تو گویا کہ اس کو اپنے مال و اسباب دنیوی کے چھوٹنے کا قلق ہوگا، اور وہ قلق اس کے لیے عذاب ہی ہے۔ اور اگر وہ خداوندِ عالم کی محبت کو ہی مال دنیا سمجھتا ہے، تو مرنے کے بعد یہ محبت اسی کے ساتھ رہے گی۔ اور اس محبوب چیز کے ساتھ رہنے سے وہ خوش ہوگا۔ پس یہی اس کا ثواب ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اَحْبِبْ مَا اَحْبَبْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهٗ یعنی ہر وہ چیز جو تجھ کو پسند ہے۔ اس کو محبوب نہ رکھ! تو بے شک ان سب چیزوں سے جدا ہو جانے والا ہے

جس وقت کوئی شخص یہ یقین کر لے، کہ صرف خدا ہی اس کا محبوب ہے اور عالمِ اسباب کی تمام چیزیں اس کی دُشمن ہیں، تو وہ یقین کے درجے پر پہنچ جائے گا کہ دنیا کی تمام آلائشیں اس کے لیے تکلیف دہ ہیں، اور وہ موت کے بعد ہی نجات پا سکتا ہے۔ لہٰذا جب انسان اس درجے پر پہنچ گیا، تو عذابِ قبر سے بھی باخبر ہوگیا اور یہ بھی طے کر لیا کہ دُنیا پرہیزگاروں کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اُن لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے اپنا سب کچھ دُنیا کو دے دیا۔ اور یہ حدیث اس کے متعلق ہے اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَجَنَّةُ الْكَافِرِيْنَ۔ یعنی دُنیا مومنوں کے لیے جیل خانہ ہے اور کافروں کے لیے جنت ہے۔

دلیل ۷

عذاب کے درجات عذابِ قبر کے متعلق جو تم نے سمجھ لیا کہ وہ دُنیا سے محبت کرنے والے لوگوں کے واسطے ہے۔ اُس عذاب کے کئی درجات ہیں۔ ان لوگوں میں بعض پر زیادہ عذاب نازل ہوتا ہے اور بعض پر کم۔ جتنی جتنی جس کو خواہشِ دنیا ہے، اتنا اتنا اس پر عذاب ہے۔

عذاب کے مدارج اس آدمی پر عذاب کم ہوگا، جو صرف ایک چیز سے محبت کرے گا۔ بہ نسبت اس آدمی کے جو آلائشِ دنیا میں زیادہ سے زیادہ مبتلا ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ مثلاً کسی سے کہا جائے کہ تیرا ایک گھوڑا چوری چلا گیا، تو اس کو کم تکلیف ہوگی، بجائے اس کے کہ اس سے کہا جائے کہ تیرے دس گھوڑے چوری ہوگئے اسی طرح اگر اس کا تمام مالِ دُنیا اس سے چھین لیا جائے تو زیادہ رنج ہوگا بہ مقابلے اس کے کہ اس کا آدھا مال چھینا جائے اور اگر اس شخص کے مال کے ساتھ اس کے اہل و عیال کو بھی چھین لیا جائے، اور ملک بدر بھی کر دیا جائے

تو اس کے رنج کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور یہ ہی درجہ موت کا ہے کہ دنیا کی ایک ایک چیز آدمی سے چھین لی جاتی ہے اور اس کو انتہائی تکلیف ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ "عذاب" دنیا کی آلائش پر منحصر ہے۔ مثلاً جس آدمی کو دنیوی اسباب میں مدد پہنچائیں، اور وہ صرف دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے، جیسا کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے۔ ذَالِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ۔ یہ عذاب اُن لوگوں پر اس لیے ہے کہ انھوں نے دُنیا کو آخرت سے زیادہ دوست رکھا۔ لہٰذا اُن پر سخت عذاب نازل کیا گیا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا، کہ آیا تم جانتے ہو کہ اس آیت کو خداوندِ عالم نے کن معنوں میں فرمایا ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ یعنی جس نے مجھے بھلایا اس کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہے تو صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کفار پر قبر میں اس طرح عذاب ہوتا ہے کہ اس پر ننانوے اژدہے مسلّط ہوتے ہیں۔ ہر اژدہے کے نو نو سر ہوتے ہیں، وہ اس کو ہر وقت کاٹتے اور چاٹتے رہتے ہیں اور پھنکارے مارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ قیامت نہ آجائے۔

تمثیلات عذاب اہلِ بصیرت، اُن اژدہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن ظاہری آنکھوں والے کہتے ہیں کہ اگر وہ اژدہے قبر میں ہوتے تو ہم کو نظر آتے۔ ان بیوقوفوں کو سمجھنا چاہیئے کہ آدمی کے جسم کے اندر ہی اژدہا موجود ہے، وہ باہر سے نظر آنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ اژدہے موت سے پہلے بھی ہر آدمی کے جسم کے اندر رہتے ہیں، لیکن انسان سے بے خبر رہتا ہے۔ اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان میں جو کفر اور بداخلاقیوں کی جو صفات بھری ہوئی ہیں، وہ اژدھے انھیں کا مرکب ہیں۔ اور اُن کے جسم اس دُنیا کی محبت کا نمونہ ہے۔ انسان کی بداخلاقیوں سے بنے۔ مثلاً، حسد، کینہ، ریاکاری، کبر و نخوت، حرص، مکر و فریب، عداوت اور جاہ و حشمت دُنیا کی دوستی۔ یہ سب اِس اژدہے کے سروں کی طرح ہیں۔

اِن اژدہوں کی حقیقت اور سروں کی زیادتی، حقیقی نگاہوں سے دیکھی اور پہچانی جاسکتی ہے، اور ان کی تعداد نبوت کی روشنی سے معلوم ہوسکتی ہے، جو اخلاقِ مذمومہ کی تعداد کے برابر ہیں، اُن کی گنتی تو ہم کو معلوم نہیں پس یہ اژدہے اُن کافروں کے جسم کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ خدا اور رسول سے ناواقف ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس نے اپنے کو جان بوجھ کر بھی دُنیا کے حوالے کر دیا ہے۔ جیسا کہ خداوندِ عالم نے فرمایا ہے ذَالِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (یعنی یہ غصہ اس لیے ہے کہ اُن لوگوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی) اور فرمایا اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِیْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا یعنی تم لوگوں نے اس کی نعمتوں کو اپنی زندگی میں ضائع کر کے مزے اُڑائے۔

اگر یہ اژدہے بقول لوگوں کے اس کے جسم کے باہر ہوتے اور نظر آتے، تو اس کا فر کو اس سے آرام بھی ملتا

اس لیے کہ کسی نہ کسی وقت وہ اس سے الگ ضرور ہو جایا کرتے، اور اس وقت اس کو آرام ملتا، لیکن اب چونکہ اس کی جان کے اندر ہیں۔ لہٰذا وہ اس کی عین صفات بن گئے ہیں۔ لہٰذا وہ کافر ان سے کسی وقت نجات نہیں پا سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی آدمی اپنی خوبصورت کنیز کو کسی کے ہاتھ فروخت کرے اور اس پر دل و جان سے عاشق بھی ہو جائے۔ یہ عشق بالکل اسی کنیز کی طرح ہے جو اس کے دل میں چھپا ہوا تھا کہ جب تک اس اژدہے نے اس کو تکلیف نہ پہنچائی، اس کو خبر نہ ہوئی۔ اسی طرح یہ ننانوے اژدہے اس کے جسم میں تھے۔ لیکن وہ ان سے باخبر نہ تھا۔ یہاں تک اُنھوں نے اس کو کاٹنا شروع کیا۔ جیسا کہ کنیز اپنی مالک کی آغوش میں رہنے کے وقت تک اس کے دل کو آرام پہنچاتی رہی اور اس کو کنیز کی جدائی کا احساس بھی نہ ہوا، اور جب اس نے اس کو فروخت کیا تو اس کنیز کی جدائی اس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اگر اس کو کنیز کا عشق نہ ہوتا تو جدائی بھی شاق نہ ہوتی۔ بعینہٖ اسی طرح دنیا کی دوستی اور محبت جو زندگی بھر اس کی راحت کا سبب بنی رہی وہ موت کے بعد تکلیف کا موجب بن گئی۔

جاہ و ثروت کا عشق اسی اژدہے کی مثل ہے، جو کاٹتا ہے اور مال کا عشق سانپ کی طرح کاٹتا ہے اور گھر بار کا عشق بچھو کی طرح ہے —— اس کی آسان مثال یہ ہے کہ کنیز کا فراق جب ناقابلِ برداشت ہو جائے، تو اس کا مالک دریا میں ڈوب کر جان دینا گوارا کرے یا آگ میں جل کر تباہ ہو جاتا۔ اسی طرح وہ لوگ جو محبتِ دنیا میں مُبتلا ہیں، وہ قبر کے بچھوؤں کے عوض ایسے سانپ اور بچھو ہوتے ہیں، جن کو دنیا میں ہم دیکھ سکتے۔ کہ یہ کاٹتے ہیں اور زخم لگاتے ہیں، لیکن ظاہری آنکھیں اُن کو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔

پس جاننا چاہیئے کہ ہر آدمی اپنے عذاب کے اسباب یہاں سے مُہیّا کر کے وہاں لے جاتا ہے، جو اس کے جسم کے اندر پوشیدہ رہتے ہیں۔ اسی لیے حدیث رسول ہے اِنّما ھی اعمالکم تردّ الیکم یعنی تمھارے اعمال ہی دوبارہ تمھارے سامنے لائے جاتے ہیں۔ اور اسی کے متعلق پروردگارِ عالم ارشاد فرماتا ہے کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّھَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ یعنی اگر تم عین الیقین کے مرتبے پر پہنچ جاتے تو یہاں بھی دوزخ کو سمجھ لیتے اور اسی لیے فرمایا کہ اِنَّ جَھَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْکٰفِرِیْنَ یعنی دوزخ کافروں کو محیط ہے یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ محیط ہوگی۔

دلیل ۸

عالمِ ظاہر و باطن کے تاثرات اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ اُن اژدہوں کو تو ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ اژدہے جسم کے اندر پوشیدہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے متعلق ظاہری شرع کا حوالہ بھی دے تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اژدہے بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کو مُردہ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں موجودہ عالم میں ان

کو دیکھنے سے قاصر ہیں اس طرح اس دنیا کی چیزیں ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتیں اور یہ اژدہے مُردوں کو ایسے ہی نظر آتے ہیں جیسے انھوں نے اُن اژدہوں کو اس دنیا میں دیکھا تھا۔ یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ آدمی جس طرح خواب میں سانپ کو کاٹتے ہوئے دیکھے، مگر اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے آدمی سانپ کو محسوس نہیں کر سکتے۔ حالانکہ سونے والا سانپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور سانپ کے کاٹنے سے وہ تکلیف بھی محسوس کر رہا ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کے لیے سانپ کا تصور تک نہیں ہوتا اور نہ اس کی تکلیف اِس سبب سے کچھ ہی کم ہوتی ہے کہ برابر بیٹھے ہوئے آدمی اس سانپ کو نہیں دیکھ رہے، اور سونے والا خواب میں دیکھتا ہے کہ سانپ نے اس کو کاٹا، اور بیداری کے بعد اس کی تعبیر دشمن کی فتح یابی دیتا ہے۔ اور وہ تعبیر خود اپنے لیے روحانی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔

اسی طرح اس دنیا کو ایک سانپ تصوّر کرلو، اور اس کے کاٹنے سے خوابیدہ آدمی پر اپنے دُشمن کی فتحیابی کے جو خراب اثرات مترتب ہوتے ہیں، اور وہ اس وقت یہ کہتا ہے کہ کاش سانپ مجھے کاٹ ہی لیتا۔ مگر دشمن تو فتح نہ پاتا۔ کیونکہ سانپ کے کاٹنے کا رنج دشمن کی فتح یابی سے کہیں کم ہے۔

اب سمجھنے کے لیے یہ مسئلہ آسان ہوگیا، کہ خواب دیکھنے والے پر جو اثرات ہوئے، وہ صرف خیالی ہی نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ حقیقت ہوں گے۔ اس کے برعکس سمجھنا غلطی ہوگی۔ کیونکہ ہر موجود چیز ہی کا وجود ہوتا ہے۔ معدوم چیز موجود نہیں ہو سکتی۔ آدمی جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے، وہ اس کے لیے موجود ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسرے آدمی اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

جو چیز تیرے لیے موجود نہیں وہ تجھ کو نظر نہیں آتی۔ اگرچہ باقی سب لوگ اس چیز کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔
اسی طرح ایک مُردہ اور خوابیدہ آدمی میں فرق ہے کہ سونے والے آدمی کی وہ تکلیف بیداری سے رفع ہوجاتی ہے۔ چونکہ وہ جلدی سے بیدار ہوجاتا ہے۔ مگر مُردے کی تکلیف رفع نہیں ہوتی، چونکہ وہ بیدار نہیں ہوتا۔ اور خوابیدہ آدمی کی تکالیف کو لوگ صرف خیال ہی تصور کر لیتے ہیں، لیکن موت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کو خیالی تصور کرنا ہی ناممکن ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ رنج و عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اس عالمِ محسوسات میں اس کو ثبات ہے۔
لیکن شریعت محمدیؐ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ قبر کے سانپ اور بچھوؤں کو عالم کے لوگ چشم ظاہر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر کوئی آدمی اس عالم موجود سے دُور ہوجائے، یعنی سو جائے، اور اُس معذب مردے کی تکالیف اس کو دکھائی جائیں، تو اس کو وہ سانپ اور بچھو نظر آئیں گے، مگر ظاہر میں نہیں۔

لیکن وہ تمام سانپ اور بچھو انبیاء علیہم السلام کو بیداری میں بھی نظر آتے ہیں۔ کیونکہ عوام جن چیزوں کو کبھی کبھی خواب میں دیکھتے ہیں، ان کو ہر وقت وہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ عالم محسوسات کے تمام پردے اُن کی آنکھوں کے سامنے

حجاب نہیں ہوتے۔

یہ بات تفصیل کے ساتھ اس لیے بتانا پڑی کہ بعض بیوقوف اِس قسم کی باتیں خواب ہیں، بعض اوقات قبروں میں دیکھتے ہیں۔ لیکن ظاہری آنکھوں سے جب صاف صاف نظر نہیں آتیں تو عذابِ قبر سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہ انکار کرنا اُن کی جہالت اور عدمِ علم کی دلیل ہوتا ہے۔ کہ وہ اس عالم کے متعلق قطعی لاعلم ہیں۔

دلیل ۹

عذابِ قبر کیوں ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص یہ ثبوت پیش کرے کہ عذابِ قبر اس دنیا کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ دُنیا میں کوئی بشر ایسا نہیں کہ جو اپنے اہل وعیال اور مال ومنال سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ لہٰذا ہر آدمی عذابِ قبر میں مبتلا ہوگا، اور اس کے بعد کوئی متنفس اس سے نہ بچ سکے گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بعض ایسے لوگ جو اِس دُنیا سے سیر ہو چکے ہوں اور دنیوی خوشیاں ان کو مسرور کر چکی ہوں اب اُن کے دل میں کوئی حسرتِ دُنیا باقی نہ رہ گئی ہو، اور وہ موت کے خواہشمند ہوں، یا بعض وہ درویش جو مُسلمان ہوں، وہ مندرجہ بالا خصُوصیات کے حامل ہوں۔ ان کی بھی مختلف صورتیں ہوں گی۔ دنیا کے مال دار دو قسموں کے ہوتے ہیں۔

اوّل وہ لوگ جو مالدار ہیں اور مال و دولت سے محبت بھی رکھتے ہیں، لیکن خداوندِ عالم کی محبت اس دُنیا کے مال کی محبت پر حاوی ہے تو ان پر عذابِ قبر نازل نہ ہوگا۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص سے دی جاسکتی ہے کہ وہ آدمی جو شہر میں ایک خوب صورت مکان کا مالک ہو اور اس سے محبت بھی رکھتا ہو، لیکن اس کو اپنے بادشاہ اور اس کے محل اور سلطنت کی اپنے اس مکان سے زیادہ محبت ہو، اور اس کو شہر بدر ہو جانے کے لیے حکم شاہی ملے، تو اس کو سلطنت اور حکومت کے حکم کی فرمانبرداری کی خوشی ہو، اپنے آراستہ و پیراستہ مکان کے چھوڑنے کا صدمہ نہ ہو۔ اس پر اپنے بادشاہ کی محبت غالب ہو۔

اسی طرح ہمارے انبیاء علیہم السّلام اور اولیائے کرام نیز متقی و پرہیزگار مسلمان، اگرچہ ان کے دلوں میں اپنے گھر بار اور اہل وعیال کی محبت ہوتی ہے، لیکن خداوندِ عالم کے احکام اور اس کی معرفت کے مقابل میں یہ تمام دنیوی چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں، اور یہ لذّت موت کے وقت خصوصاً پیدا ہو جاتی ہے۔

پس وہ لوگ عذابِ قبر سے محفوظ رہتے ہیں، اور جو اس کے برخلاف دنیا اور ظاہری مال ومنال کو دوست رکھتے ہیں۔ وہ عذابِ قبر سے رہائی نہیں پاتے۔ اسی لئے خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۔ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا (یعنی اور یہ لوگ ایک زمانے تک عذاب میں مبتلا رہیں گے، یہاں تک کہ یہ عرصہ دراز ہو جائے گا۔ اور وہ لذّاتِ دنیاوی قطعاً ان سے فراموش ہو جائیں گی

اس وقت پروردگارِ عالم کی محبت جو اُن کے دلوں میں چھپ گئی تھی، ظاہر ہوگئی۔

اُن لوگوں کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی ایک گھر کو دوسرے گھر سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، یا ایک شہر کو دوسرے شہر سے۔ یا ایک عورت کو دوسری عورت سے۔ اور اس کو جب زیادہ محبت والی شے سے جُدا کیا جائے، اور وہ کم محبت والی جگہ یا چیز کے پاس جائے، تو اس کو وہ چیز جس سے اس کو زیادہ محبت تھی، عرصۂ دراز تک یاد رہے گی، لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کو بھلا دے گا، اور موجودہ شے سے محبت بڑھ جائے گی جو اس کے سینے میں حقیقت اور فطرت نے ودیعت فرمائی ہے اور وہ محبت ہے پروردگارِ عالم کی۔

اسی طرح جو خداوندِ عالم کو قطعی دوست نہیں رکھتا۔ وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا۔ کیونکہ وہ جس چیز سے (دُنیا) سے انتہائی محبت کرتا تھا، اور وہ اس سے چھین لی گئی۔ لہٰذا اس کو دنیا سے علیحدگی بہت رنجیدہ رکھے گی۔ اور وہ اس رنج و تکلیف سے کبھی نجات نہ پائے گا۔

(کافر کے دائمی عذاب کی ایک مثال یہ بھی ہے، جو اوپر بیان کی گئی)

اس کے بعد یہ بھی سمجھ لو! کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں خداوندِ عالم کی محبت رکھتا ہوں، یا دُنیا سے زیادہ اس کو دوست رکھتا ہوں۔ اور بظاہر دنیا میں ہر شخص کا یہی ایمان ہے، مگر اس کی ایک کسوٹی مقرر کر دی گئی ہے۔ جس کے ذریعے خداوندِ عالم کی محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کبھی کسی آدمی کا نفس یا خواہشات کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ کریں، جس کو خداوندِ عالم نے منع کیا ہے، تو اس وقت وہ اپنے دل کا جائزہ لے۔ اگر وہ خداوندِ عالم کے احکام کی طرف اپنے کو مائل پاتا ہے۔ تو وہ یقیناً خداوندِ عالم کا محبِّ صادق ہے۔ جس طرح ایک آدمی دو آدمیوں سے محبت کرتا ہے، لیکن ایک کی محبت دوسرے سے زیادہ ہوتی ہے اور ان دونوں کے مابین اختلاف ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنا جائزہ لے کہ وہ اس وقت کس کا ساتھ دیتا ہے۔ پس اس وقت جس کا ساتھ دے، اسی سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے۔ اور علاوہ اس کی زبانی باتیں بنانا لاحاصل ہیں، اور یہ دعویٰ دوستی محض دروغ گوئی پر مبنی ہوگا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمیشہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے پڑھنے والے عذابِ الٰہی سے اپنے کو بچاتے ہیں۔ لیکن وقت پڑنے پر معاملات دین کے مقابل میں دُنیا کو ترجیح دیتے ہیں، اور جب ایسا ہوتا ہے، تو خداوندِ عالم اُن سے فرماتا ہے کہ تم جھوٹے ہو! ایسے معاملات کے ساتھ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہنا جھوٹ ہے۔

اس جملہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اہلِ بصیرت اپنی حقیقی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کون آدمی عذابِ قبر سے نجات پائے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ بہت سے آدمی اس عذابِ الٰہی سے نجات نہ پا سکیں گے، مگر عذاب کی مُدت اور سختی کی زیادتی اور کمی ضرور ہوگی۔ جس طرح دُنیا سے محبت کرنے والے کے متعلق بیان اوپر کیا گیا۔

دلیل ۱۰

ایک خیال اور بھی تم کو پیدا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بیوقوفوں اور مغروروں کا گروہ کہتا ہے کہ اگر عذابِ قبر بھی ہے، تو ہم اس سے محفوظ ہیں۔ کیونکہ ہمیں اس وقت اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دنیا کا وجود و عدم ہمارے لیے برابر ہے، لیکن جب تک وہ لوگ اپنے کو کسوٹی پر نہ کس لیں، اُن کا یہ دعویٰ باطل ہوگا۔

دنیوی محبت ہی عذابِ قبر کا باعث ہوتی ہے

اگر کسی شخص کی پوری پونجی چور چرالے جائیں، اور جو عزت و شہرت اس کی اس وقت ہو، وہ چوری کے بعد قطعاً ختم ہو جائے۔ اس کے دوست اور مرید اس سے مُنہ پھیر لیں اور اس کے مُنہ پر اس کو بُرا بھلا کہیں۔ لیکن اس کے دل پر قطعی میل نہ آئے۔ یہاں تک کہ وہ یہ سمجھ لے کہ یہ مال میرا نہ تھا، بلکہ کسی دوسرے کا تھا۔ اور نہ اس پر اپنی ظاہری عزت کے کم ہونے کا اثر ہو، تو اس وقت گویا کہ وہ اپنے معاملات اور محبت خداوندی میں سچا ہے۔ اور اس کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ دنیا عدم اور وجود اس کے لیے برابر ہے، لیکن اس کا مال چوری ہونے سے پہلے یا اس کے مریدین کی بے رخی سے قبل اس کے تمام دعویٰ باطل اور جھوٹے ہی سمجھے جائیں گے۔

پس آدمی کو چاہیئے کہ مال اور عزت و شہرت دنیوی سے الگ رہے، اور اپنے آزمائش کے ترازو میں تولے۔ اس کے بعد اپنے پر اعتماد کرے۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں، جن کو بظاہر بقول ان کے ہی "عورت" یا کنیز سے کوئی تعلق نہیں، لیکن جب وہ عورت کو طلاق دے دیتے ہیں یا کنیز کو فروخت کر دیتے ہیں، اُس وقت اُن کے عشق کی آگ جواب تک پوشیدہ تھی، ایک دم بھڑک اُٹھتی ہے۔ پھر وہ اس آگ میں جلتے ہیں۔

لہٰذا جو آدمی چاہتا ہے کہ عذابِ قبر سے نجات پا جائے۔ اس کے لیے دنیا کی ہر چیز سے متنفر رہنا ضروری شرط ہے، لیکن بقدرِ ضرورت وہ دُنیا کے کاموں میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ جیسے طہارت کے لیے پاخانے کی حاجت ہوتی ہے اور وہ ایسی حالت میں بیٹھا رہنا اچھا نہ سمجھ کر جلدی فراغت کی کوشش کرے۔

پس چاہیئے کہ غذا بھی صرف اسی لیے ہو کہ معدے کو حسبِ ضرورت بھر دے۔ اور یہ دونوں باتیں دنیا میں خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے زندہ رہنے کو ضروری ہیں۔ اسی طرح دنیا کے دوسرے کام بھی انجام دے۔

اگر دل دنیوی تعلقات سے خالی نہ کیا جا سکے تو عبادتِ خدا میں زیادہ سے زیادہ مصروف رہنا چاہتا۔ اور ذکرِ الٰہی کو اپنے پر غالب رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اگر نفس منع کرے تو اس سے حمیت اور دلیل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہی شریعت کے راستے پر چلنے کا راستہ ہے۔ اپنے خواہشات نفسانی پر احکاماتِ الٰہی کو ترجیح دینا چاہیئے۔ اس کے بعد اگر آدمی کا نفس اس کی تابعداری کرنے لگے تو گویا کہ وہ عذابِ قبر سے محفوظ رہے گا۔ اور اگر نفس

اس سے سرکشی کرے گا، تو وہ اپنے کو قبر کے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ خداوندِ عالم اس کو معاف کرے۔

دلیل ۱۱

دوزخ رُوحانی اب روحانی دوزخ کے حقیقی معنی بھی سمجھا دینا ضروری ہیں۔

روحانی سے یہ مُراد ہے کہ وہ صرف رُوح کے لیے ہو، اور جسم سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بھڑکائی ہُوئی وہ آگ ہے، جو دِلوں پر ظاہر ہوگی۔ پس یہی دوزخ روحانی ہے، جس کی آگ دل پر غلبہ رکھے گی۔

اور وہ آگ جو بدن میں لگتی ہے، وہ دوزخ جسمانی ہوتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ دوزخ روحانی میں تین قسم کی آگ ہوگی۔

اوّل، خواہشاتِ دُنیا سے جُدائی کی آگ۔

دوم، رُسوائی اور شرمندگی کی آگ۔

سوم، جمال خداوندی سے محروم اور مایوس ہونے کی آگ۔

اِن تینوں آگوں کا تعلق جان اور دل سے ہی ہوگا، جسم سے نہیں۔ ان آگوں کی تفصیل بیان کرنا ضروری ہے۔ جو ہم اس ظاہری دُنیا سے ساتھ لے جاتے ہیں، اور اس کو ایک مثال کے ذریعے تم کو سمجھاتے ہیں، تاکہ اچھی طرح سمجھ سکو۔

قسم اوّل: پہلے دُنیا کی خواہشات سے جُدائی اور ہجر کی آگ ہے۔ اس کے متعلق سب کچھ عذاب قبر کے بیان میں واضح کر دیا گیا ہے۔

آدمی جب تک اپنے معشوق کے ساتھ ہے، تو اس کے لیے بہشت ہے اور اس سے علیحدگی دوزخ ہے۔ پس دنیا کا عاشق دنیا میں گویا کہ جنت میں رہتا ہے اَلدُّنْیَا جَنَّۃُ الْکَافِرِ۔ یعنی دُنیا کافر کے لیے جنت ہے۔ اور آخرت اس کے لیے دوزخ ہے۔ کیونکہ اس کا محبوب اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ پس ایک ہی چیز لذت کا سبب بھی ہے اور تکلیف کا بھی۔

اِس کی دو مختلف صُورتیں ہیں۔

پہلی یہ کہ اس آگ کی مثال ایسی ہے، جیسے تمام روئے زمین پر ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے، اور وہ حسین و خوبصورت کنیزوں، غلاموں اور عورتوں کے ساتھ باغ و چمن کی سیر میں جس وقت مشغول ہو اور یکایک اس کا دشمن وہاں پہنچ کر اس کو گرفتار کر لے۔ اور اس کے بعد اسی کی رعایا کے سامنے کتوں کی محافظت اس کے سپرد کر دے، اور خود اس کی کنیزوں اور عورتوں پر متصرف ہو جائے۔ اپنے غلاموں کو بھی اس غلام بادشاہ سے کام لینے کا

حکم دے دے - اس کے خزانے کے بہترین اور خوبصورت چیزیں دوسروں کو تقسیم کرا دے

اِن تصورات کے ماتحت سوچو! کہ اِس بادشاہ کا کیا حال ہوگا؟ اپنی سلطنت، غلاموں اور کنیزوں سے چھوٹ جانے کی ایک آگ اس کے سینے میں سلگتی رہے گی - اس وقت، وہ سوچے گا کہ اس کو ایک دم قتل کر دیا جائے یا اتنی سخت ایذا پہنچائی جائے، جس سے وہ ہلاک ہو جائے۔

یہ آگ اتنی ہی زیادہ ہوگی جتنا وہ مالِ دُنیا اور سلطنت سے لگاؤ رکھتا ہوگا - اور جس قدر اس کی سلطنت پُر بہار اور زرخیز ہوگی اتنا ہی اس کی محبت کی آگ کے شعلے بلند ہوں گے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی میں جو آدمی جتنا کامیاب ہوتا ہے اور جتنی بھی زیادہ اس کو موافق آئی ہے اتنی ہی محبت اور عشق اس سے بڑھا ہوتا ہے اور اِس دُنیا کے چھوٹنے کا رنج بھی اتنا ہی ہوگا - اور اس کی محبت کی آگ اتنا ہی اس کو پریشان کرے گی۔

رُوحانی کیفیّات اُس آگ کا مقابلہ اِس دُنیا کی آگ نہیں کر سکتی - چونکہ دُنیا میں جو تکالیف یا رنج انسان کو ہوتے ہیں، وہ جلد زائل ہو جاتے ہیں - اور اس کا دل دُنیا کے تمام دوسرے کاموں میں بٹا رہتا ہے۔ دُنیا کی مشغولیات اِس رنج اور تکالیف کے لیے حجاب بن جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن تکالیف کا عذاب ہر وقت دل میں جاگزیں نہیں رہتا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے خواب دیکھنے والا آدمی بیداری کے بعد تو بہت، رنجیدہ ہوتا ہے - اس لیے کہ صبح کو آنکھ کھلتے ہی آلائشِ دُنیا سے اس کا دل پاک ہوتا، جیسے صبح اُٹھتے ہی کوئی اچھی آواز آدمی کے کان میں پڑے تو کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے، لیکن جُوں جُوں دُنیا کے کاموں میں پڑتا جاتا ہے، دل کی صفائی کم ہوتی جاتی ہے - لہٰذا بیداری کے بعد خواب کے اثرات بھی کم ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح اِس دُنیا میں مشغولیات میں پھنس کر اُس آگ سے نجات پاتا رہتا ہے، مگر وہ آگ تو بالکل دوسرے قسم کی ہے - اسی کو اس ظاہری آگ جیسا خیال نہ کرنا چاہیئے اس آگ کو تو ستر مرتبہ پانی سے دھو کر اِس دُنیا میں بھیجا گیا ہے۔

دوسری آگ وہ ہے، جو انسان کو ندامت اور شرمندگی و رسوائی کی وجہ سے ذہنی تکالیف اُٹھانا پڑتی ہیں۔ اس کو یُوں سمجھنا چاہیئے، جیسے کوئی بادشاہ کسی کمین اور ذلیل طبیعت آدمی کو اپنا ولی عہد بنا دے - اور اپنے محلات میں آنے جانے کی اجازت دے دے اور خزانوں کی کنجیاں بھی اس کے حوالے کر دے سلطنت کے تمام کاموں میں اس کا اعتبار کرے - اور وہ کمین طبیعت آدمی پوری طرح قابُو یافتہ ہونے کے بعد سرکشی کرنے لگے تمام محلات اور خزانوں پر اپنا تصرف کر کے بادشاہ کے سامنے ظاہری وفادار ہی بنا رہے - یہاں تک کہ جب وہ بادشاہی حرم میں فساد اور کمینہ پن کر رہا ہو، اس وقت وہ خود ہی دیکھے کہ بادشاہ بیٹھا کسی سوراخ سے اس کی

حرکات دیکھ رہا ہو، اور اس کو یقین ہو جائے کہ بادشاہ اس کی یہ کمینی حرکات دیکھتا اور سمجھتا ہے۔

بادشاہ کی نظر اندازی صرف اسی لیے ہو، اور وہ اس کو ڈھیل دے رہا ہے، تاکہ اس کی سفلی عادات اور بڑھیں یہاں تک، کہ اس کے بعد آخر میں ایک دم اُس کو قتل کرا دیا جائے

اسی حالت میں اس کی جو رُسوائی و شرمندگی ہوگی، اس سے اس کا جسم کیسے متاثر نہ ہوگا۔ اس وقت اس کی یہ خواہش ہوگی کہ کسی طرح زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں، اور اس شرمندگی سے نجات مل سکے۔

اِنسان، ایسے ہی جو کام اس دنیا میں اپنی عادات کے ماتحت کرتا ہے، اُن کو بظاہر وہ اچھا ہی سمجھ کر کرتا ہے۔ لیکن درپردہ اُن کی حقیقت بُری اور بدنام کُن ہوتی ہے۔ ایسے کاموں کی حقیقت جب اِنسان پر روزِ قیامت ظاہر ہوگی، تو اُس آتشِ ندامت سے وہ جلتا رہے گا۔ مثلاً غیبت کرنے والا آدمی ایسا ہی ہے جیسا کہ آج ایک آدمی اپنے ہی بھائی کے گوشت کو مُرغ کے گوشت کی طرح مزے لے کر کھا رہا ہے۔ اور کل جب غور کرے گا اور اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے بھائی کا گوشت کھا رہا ہے۔ اس وقت اس کی شرمندگی کے متعلق اندازہ کرنا چاہیئے، کہ اس کے قلب میں جو آگ لگے گی وہ کیسی ہوگی۔ یہ ہی غیبت کی اصل و حقیقت ہے۔ آج یہ رُوح اِنسان کی نظروں سے چھُپی ہوتی ہے اور یہ روزِ محشر ظاہر ہو جائے گی۔

جو آدمی مُردار گوشت کھاتے ہوئے اپنے کو خواب میں دیکھتا ہے، اس کی تعبیر بھی یہ ہی ہے کہ وہ شخص غیبت کرنے والا ہے، جس طرح تو آج کسی دیوار پر پتھر پھینکے اور اس کے بعد تجھ کو یہ معلوم ہو کہ وہ پتھر تیرے گھر میں ہی گرے ہیں۔ اور اُنھوں نے تیرے ہی لختِ جگر کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے، اور اس کے بعد جب تو گھر میں جائے تو اس کی تصدیق بھی ہو جائے، پھر تیرے سینے میں جو آگ لگے گی، اس کا اندازہ کر کہ کیا ہوگا؟ اور کتنی شرمندگی ہوگی؟ پس مسلمان سے حسد کرنا اور اس سے بغض و عناد رکھنا ایسا ہی ہے، جو اوپر بیان کیا گیا۔

حسد کی حقیقت یہ ہے، جیسے کسی دُشمن کو تو نقصان پہنچانا چاہیئے۔ لیکن اس کو تو کوئی گزند نہ پہنچ سکے، مگر خواہ مخواہ تیرا دین خراب ہو جائے۔ اِنسان کی تمام عبادات، جو اس کی آنکھوں کا نور ہیں، وہ اس کے حساب میں لکھی جاتی ہیں جن سے وہ حسد کرتا ہے، اور حاسد کی فہرست خالی رہ جاتی ہے۔ لیکن اِنسان کی عبادات روزِ حشر اس کی اولاد کی آنکھوں سے زیادہ اس کے لیے مفید ہوں گی۔ چونکہ بنسبت اس کی اولاد کے اس کی عبادات اس کے لیے کہیں زیادہ سعادت و نیکی کا باعث ہیں۔

معلوم ہونا چاہیئے، کہ قیامت کے دن آدمیوں کے اشکال اُن کی حقیقتوں کو ظاہر کریں گے اور اُنھوں نے یہاں جو کچھ کیا ہے، ویسی ہی صُورتوں میں وہاں ظاہر کیے جائیں گے۔ اس وقت اُن کو رُسوائی و شرمندگی ہوگی۔

عالم خواب چونکہ نیند (خواب) ہماری موجودہ دُنیا سے قریب تر ہے اور خواب میں ہمارے تمام کام حقیقی معنوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک شخص ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے خواب میں اپنے ہاتھ میں انگشتری پہنے دیکھی ہے۔ جس سے میں مردوں کے مُنہ اور عورتوں کے فرج پر مہریں لگا رہا ہوں۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تو موذن بنا ہے اور نماز صبح کے لیے رمضان میں مخلوق کو جگانے کے واسطے اذان دیتا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا، صحیح فرمایا آپ نے۔

مندرجہ بالا مثال سے سمجھنا چاہیئے کہ اس نیکی کی حقیقت کو خواب میں کس طرح دکھایا گیا ہے۔ چونکہ نماز کی آواز رمضان میں ذکر اور عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس کی اصل و حقیقت، کھانے اور مباشرت کرنے سے منع کرنے کے مترادف ہے۔

تعجب تو اس پر ہے کہ انسان کو خواب میں قیامت کے حالات نظر بھی آجاتے ہیں، لیکن اس کو خبر نہیں ہوتی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ روزِ حشر دُنیا کو ایک بڑھیا عورت کی شکل میں انسانوں کے سامنے لایا جائے گا، تو لوگ کہیں گے۔ نعوذ باللہ من ذالک (یعنی ہم خدا سے پناہ مانگتے ہیں) اور آپس میں کہیں گے کہ یہ دنیا وہ ہی ہے، جس کے پیچھے ہم ایک دوسرے کو ہلاک کر دیا کرتے تھے اور وہ ندامت و شرمندگی سے اپنے لیے خواہش کریں گے کہ ہم کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ اس کی شرمندگی سے نجات مل سکے۔

مندرجہ بالا تینوں قسم کی رُسوائیوں کے مثال کے متعلق ایک قصہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک شہزادے کی جب شادی ہوئی اور اُس نے شبِ عروسی میں دُلہن کے پاس جانے کا ارادہ کر کے خوب شراب پی، اور انتہائی مدہوشی کے عالم میں حجلہ عروسی میں جانے کے لیے نکلا۔ نشے کی وجہ سے راستہ بھول کر باہر نکل گیا۔ چلتے چلتے ایک مکان میں روشنی دیکھی، سمجھا کہ یہی حجلہ عروسی ہے۔ چنانچہ اندر پہنچا، وہاں سفید سفید چادریں اوڑھے ہوئے کچھ لوگوں کو لیٹے ہوئے دیکھا، اور آوازیں دینا شروع کیں، لیکن جب کوئی جواب نہ ملا۔ ایک چادر کا کونا ہٹا کر دیکھا اور طے کر دیا کہ یہی میری دُلہن ہے۔ اُس کے پاس بیٹھ گیا اور چادر اُتار دی۔ اس کی خوشبوؤں سے دماغ معطر ہو گیا، اور اسی عالم مدہوشی میں مباشرت شروع کی۔ اپنی زبان کو اس کے مُنہ میں دے دیا۔ کچھ نمی جب محسوس ہوئی تو سمجھا کہ میری دلجوئی کرتی ہے۔ اسی طرح جب صبح ہوئی اور عالم ہوش میں آیا، تو دیکھا وہ مکان آتش پرستوں کا قبرستان ہے اور وہ لاش ایک بدشکل بڑھیا کی ہے، جو اسی وقت دفن کی گئی تھی۔ وہ خوشبوئیں کافور کی تھیں اور اس کے منہ کی نمی، اس عورت کی نجاست تھی۔ اس کے بعد جب اپنے کو دیکھا تو اپنے اعضاء کو نجاست سے بھرا ہوا پایا۔ اس کو اپنا مُنہ کڑوا محسوس ہونے لگا، تو اس کی شرمندگی اِس درجہ کو پہنچ گئی کہ اُس نے چاہا کہ خودکشی کر لے۔ وہ کانپنے لگا کہ کہیں بادشاہ اور اس کا لشکر اس کو ایسی حالت میں نہ دیکھ لے، ابھی کھڑا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے بادشاہ مع

فوج کے اس کی تلاش کے لیے آ رہے تھے۔ جب اس نے ان کو دیکھا تو شرمندگی و ندامت میں اس نے چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں، اور کسی طرح اس ندامت و رسوائی سے نجات مل سکے۔

تمثیل عذاب اس مثال کے بعد سمجھ میں آجانا چاہیئے کہ گناہ گار قیامت کے دن اپنے لیے ایسا ہی سوچیں گے خواہشاتِ دنیوی کے اثرات جو ان کے اوپر ہوں گے، وہ شہزادے کے دہن اور اعضاء کی نجاست کی طرح ہوں گے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ اس دُنیا کی سختیاں یہاں سے کہیں زیادہ ہیں۔ بلکہ ہم اس کی مثال بھی نہیں دے سکتے۔ یہ حکایت صرف اس کا ہلکا سا نمونہ ہے، جو دل و جان میں سلگی ہوتی ہے، اور انسان اس سے بے خبر ہے۔ پس اس کا ذلت و رسوائی شرمندگی ہے۔

تیسرے قسم کی آگ —— وہ آگ ہے، جو خداوندِ عالم کی معرفت سے محروم رہے اور سعادت و نیکی کے حصول سے مایوس ہو جائے۔ اس کی بُنیاد انسان کی جہالت اور ناسمجھی ہے، جو وہ اس دنیا سے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ کیوں کہ ایسا آدمی نہ تو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور نہ معرفت خدا کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے دل کا آئینہ کثیف ہی چلا جاتا ہے۔ وہ اِس میں نہ خدا کا نور دیکھ سکتا ہے، بلکہ وہ دُنیا کی آلائشوں سے اتنا زنگ آلود ہوتا ہے کہ اس میں اسی دنیا کی چیزیں بس نظر آتی ہیں، اور ان کی وجہ سے وہ اندھا ہو جاتا ہے ——

اِس آگ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی چند ہمراہوں کے ساتھ اندھیری رات میں ایسی جگہ جائے جہاں لاتعداد سنگریزے پڑے ہوں، مگر اُن کا رنگ تو نہ پہچان سکے، اور تیرے ساتھی تجھ سے کہیں کہ جتنے چاہے تو اس میں سے لے لے۔ ہم نے سُنا ہے کہ یہ رنگ میں بہت سفید ہیں۔ وہ سب ان سنگریزوں کو اٹھا لیں، اور تُو یہ سوچ کر ایک بھی نہ لے کہ بغیر جانے بوجھے اور سمجھے کسی چیز کو لینا اور خواہ مخواہ کا بوجھ اُٹھانا بیوقوفی ہے —— اس وقت تیرے تمام ساتھی سنگریزوں کا بوجھ لیے ہوئے چل رہے ہوں، مگر تو خالی ہاتھ اُن کے ساتھ واپس چلا آئے، بلکہ اُن کا مذاق اُڑاتے، اُن کو بیوقوف سمجھے اور کہے کہ بغیر سمجھے سوچے بوجھ کا لادنا تم ہی لوگوں کی بیوقوفی ہے۔ میں کتنا عقلمند ہوں کہ آرام کے ساتھ چلا جا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ جب روشنی میں پہنچیں، تو معلوم ہو کہ وہ سب یاقوت اور نیلم ہیں، اور ان کا ہر دانہ لاکھوں روپیہ کا قیمتی ہے۔ اس کے بعد تیرے ساتھی، اس کا افسوس کریں کہ اور زیادہ کیوں نہ اُٹھا لیے۔ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا؟ تیرے سینے میں افسوس کی آگ شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھے گی۔ تیرے ساتھی اُن یاقوتوں کو فروخت کر کے زمین کی بادشاہی لے لیں۔ اور اپنی خوشی سے جہاں چاہیں رہیں اور جیسا چاہیں کھائیں۔ تو ننگا اور بھوکا ہو اور وہ سب تجھ کو غلام بنا لیں، تو اُن سے کہتا رہے کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دو —— وہ فرماتا ہے۔ اَفِیضُوا عَلَیْنَا

مِنَ السَّمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ ۔ قَالُوْٓا اِنَّ اللهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِيْنَ ۔ وہ جواب دیں گے کہ کل تو تم ہم پر ہنستے تھے ۔ آج ہم تیرا مذاق اُڑاتے ہیں ۔ اِنْ تَسْخَرُوْا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (یہ مثال جنت کی نعمتوں اور خداوندِ عالم کی معرفت سے محرومی کی حسرت سے متعلق تھی ۔ وہ سنگریزے عبادات کے جواہرات ہیں اور وہ "تاریکی" یہ دُنیا ہے ۔ جس آدمی نے عبادات کے جواہرات کو اِس دُنیا سے نہ لیا اور سوچا کہ آخرت کے لیے اس وقت کیوں مصیبت اُٹھائی جائے ۔ ایسے لوگ روزِ حشر فریاد کریں گے اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ ۔ وہ قیامت میں کیوں نہ حسرتوں میں مبتلا ہوں گے ۔ جبکہ وہاں معرفت اور عبادات والوں کو گوناگوں سعادتیں حاصل ہوں گی ۔ جن کی ایک ساعت کے مقابلے میں دُنیا کی تمام نعمتیں بھی ہیچ ہوں گی ۔ یہاں تک ہی نہیں ، بلکہ دوزخ سے جس آدمی کو سب سے آخر میں نکالا جائے گا ۔ اس کو بھی نعماتِ خداوندی اس افراط سے دی جائیں گی ، جو لذاتِ دنیوی سے دس گنا زیادہ ہوں گی ۔ یہ مثال دنیوی حساب کے ماتحت نہیں دی گئی ۔ بلکہ روحانی نعمتوں سے اِس کی مشابہت کرنا چاہیئے ۔ وہ لذاتِ رُوحانی ایسی ہوں گی ، جیسے ایک موتی دس اشرفیوں کے برابر ہے ۔ حالانکہ وہ وزن میں دس اشرفیوں سے کہیں کم ہوتا ہے ، بلکہ حقیقی مالیت اِس موتی کی دس اشرفیوں کے برابر ہوتی ہے ۔

دلیل ۱۲

ان تینوں آتشوں کو پہچاننے کے بعد معلوم ہونا چاہیئے کہ آتشِ جسمانی سے وہ آگ کہیں زیادہ سخت اور تیز ہے ۔ کیونکہ جسم کو اس وقت تکلیف ہوتی ہے ۔ جب کہ اس کے اثرات اس کی رُوح میں پہنچتے ہیں ۔ جب کوئی تکلیف جسم کو ہوتی ہے ، وہ رُوح تک پہنچنے کے بعد زیادہ ہو جاتی ہے اور جب رُوح سے وہ باہر نکلتی ہے تو اس کے اثرات بھی کہیں زیادہ ہوں گے ، چہ جائیکہ وہ آگ جو رُوح میں ہی اول لگتی ہو ۔

تکالیف ظاہری سے رُوح بھی متاثر ہوتی ہے

دراصل ان تمام تکالیف کا سبب خواہش کے خلاف چیزوں کا غلبہ ہے ۔ چونکہ بدن کا مقتضائے طبیعت یہ ہے کہ اس کی ترکیب اس کے ساتھ رہے ، اور تمام اعضا بھی یکجا جمع رہیں ۔ جس وقت زخم کی وجہ سے جسم کا ایک عضو دوسرے عضو سے الگ ہوتا ہے ، اور یہ عمل جسم کی رُوح کے مخالف ہے ۔ لہٰذا اس کو تکلیف پہنچتی ہے ، اور تمام اعضاء میں آگ لگ جاتی ہے ۔ جس کے بعد جسم کے ہر عضو کو تکلیف ہوتی ہے ، جس سے آگ کی تکلیف اور زیادہ ہو جاتی ہے ۔

اسی طرح جو چیزیں مقتضائے دل کے خلاف ہوتی ہیں ، جب اس کے خلاف کوئی دوسری چیز وہاں آ جاتی ہے ، تو اس کی تکلیف کی وجہ سے جسمانی اعضاء کو کہیں زیادہ تکلیف ہوتی ہے اور چونکہ دل کی حقیقت خداوندِ عالم کی معرفت کا حاصل کرنا ہے ۔ لہٰذا جب اس کے خلاف دنیوی وسوسے اس میں پیدا ہو جاتے تو اس وقت اس کے درد اور تکالیف کی کوئی انتہا نہیں رہتی ۔ اگر لوگوں کے دل اس دنیائے ظاہری میں بیمار

نہ ہوتے تو موت سے پہلے بھی اپنے اندھاپن کی تکلیف کو سمجھ سکتے۔ جس طرح ہاتھ پیر سُن ہو جاتے ہیں، اور آگ لگنے سے بھی ان کو خبر نہیں ہوتی۔ لیکن جس وقت "سُن" ختم ہو جاتا ہے، تو کوئی چیز اگر اس سے مَس ہو جائے تب بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ پس اسی طرح لوگوں کے دل دُنیا میں سُن اور بیمار ہو جاتے ہیں، اور وہ آگ اُس کی رُوح کی حقیقت سے یک لخت باہر آجاتی ہے، وہ آگ دل میں ہی لگی ہوتی ہے۔ کسی دوسری جگہ سے نہیں پیدا ہوتی۔ اس آگ کو انسان موت کے بعد بھی اپنے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ چونکہ اسے اس وقت علم الیقین نہ تھا جس کی وجہ سے اس وقت وہ اس کو نہ دیکھ سکا، اور اب چونکہ اس نے یقین کے ساتھ دیکھا تو اس کو آگ سمجھا کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ کے یہی معنیٰ ہیں، اور شریعت نے جنت و دوزخ کی شرح صاف صاف کر دی ہے۔ اس لیے اس کو سب جانتے ہیں۔ لیکن روحانی دوزخ اور بہشت کو جس کے سامنے کہا جاتا ہے۔ وہ اس کا یقین نہیں کرتا، اور نہ اُس کی اذیت کا ہی احساس ہوتا ہے۔

جس طرح کسی لڑکے کو پڑھنے کی ہدایت یہ کہہ کر کی جاتی ہے کہ اس کے بعد تجھ کو باپ کی ولایت اور مال ملے گا، ورنہ تو اس سے محروم کر دیا جائے گا۔ وہ لڑکا اس بات سے کوئی اثر نہ لے گا۔ لیکن اگر اس سے یہ کہا جائے کہ اگر تو نہ پڑھے گا تو تیرا ماسٹر تجھ کو سزا دے گا، کیونکہ وہ سزا سے اچھی طرح واقف ہے۔ لہٰذا وہ پڑھے گا، اور جس طرح لڑکے کے نہ پڑھنے پر سزا دینا حق بجانب ہے۔ اسی طرح لڑکے کا نالائق ہونا، اس کے باپ کی ولایت سے محروم ہونا بھی حق بجانب ہے۔ لہٰذا معلوم ہونا چاہیئے کہ اس طرح دوزخ جسمانی بھی حق ہے اور خداوندِ عالم کی طرف سے قبر میں نازل ہونا بھی ضروری ہے اور جس طرح گوشمالی بمقابلہ ریاست و امارت کی محرومی کے کچھ بھی سزا نہیں۔ پس اسی طرح دوزخ جسمانی بھی دوزخ روحانی کے مقابلے میں ہیچ ہے

دلیل ۱۳

عالمِ ارواح اور صُورتِ جسمیہ اگر تم کو بتائے ہُوئے ان دلائل میں کوئی چون و چرا ہو، اور تیرے خیال میں علما کے اقوال کے مُطابق ہماری تفصیلات غلط معلوم ہوں اور تیرا عقیدہ ہو کہ یہ تمام باتیں تقلید ہی سے متعلق ہیں، حقیقت اور کتب کے دلائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں —— تو

معلوم ہونا چاہیئے! کہ ہم اس کے متعلق پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ انھوں نے آخرت کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے، درست ہے، لیکن ان علما نے عالمِ محسوسات سے آگے عالمِ روحانیات کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی، غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ عوام اس کو سمجھ نہ سکیں گے، اور جو جسمانیات سے متعلق ہیں، وہ صاحبِ شرع کی تقلید کے بغیر کچھ سمجھ نہیں سکتے۔

اس بات کا تعلق حقیقت روح کی معرفت" کی دوسری قسم سے ہے، اور اس کا سمجھنا حقیقت باطنہ

کے مشاہدات سے تعلق رکھتا ہے ۔ اِس کی حقیقت کو وہ ہی سمجھ سکتا ہے جو اس عالم جسمانیات میں وجود میں آچکا ہے ۔

قواءِ اِنسانی | اِس حقیقت کی پہلی کڑی عالم محسوسات ہے ۔ دوسری عالمِ تخیلات ۔ تیسری موہومات اور چوتھی منزل عالمِ معقولات ۔

عالمِ معقولات میں داخل ہو کر ہی اِنسانی عقول اپنے حقائق سے باخبر ہوتی ہیں ۔ اِس کے آگے انسان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ مندرجہ بالا چاروں منازل تم کو ایک مثال کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہیں ۔

مثلاً ـــــ اِنسان جس وقت تک عالمِ محسوسات میں رہتا ، وہ ایک پروانے کی مثل ہے ، جو شمع پر سوچے سمجھے گر پڑتا ہے ، یہ اِس لیے ہے کہ اس میں قوّتِ حافظہ اور قوّتِ فکر موجود نہیں ہے ، صرف قوّت بینائی ہے اور روشنی کو پسند کرتا ہے ۔ اور شمع سے جلنے کی جو تکلیف اسے ہوتی ہے وہ کچھ ہی دیر بعد اس کو فراموش کر دیتا ہے ۔ اور متعدد بار ایسا ہونے میں ایک ، بار وہ جان دے دیتا ہے ۔ اگر قوّتِ حافظہ و تفکر اس میں ہوتی تو ایک بار تکلیف اٹھانے کے بعد دوبارہ اس کے قریب نہ جاتا ۔ جس طرح دوسرے حیوانات ایک بار لکڑی سے پٹنے کے بعد اُس سے ڈرنے لگتے ہیں ۔ چونکہ ان میں یاد رکھنے کی قوّت موجود رہتی ہے ـــــ پس عالمِ محسوسات اِنسان کی پہلی منزل ہے ۔

دوسری منزل عالمِ تخیلات بنائی جا چکی ہے ، آدمی جب اِس منزل پر رہتا ہے ۔ اس وقت تک وہ بہائم (درندوں) کے درجے پر ہی رہتا ہے ۔ کیونکہ جب تک ایک بار تکلیف کا تجربہ نہیں ہو جاتا ، اس وقت تک اس کی سمجھ میں نہیں آتا ، اور جب تکلیف اٹھا لیتا ہے تو پھر اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا ۔

تیسری منزل عالم موہومات ـــــ اور جب آدمی اس منزل پر پہنچتا ہے تو وہ گھوڑے اور بکری کی طرح ہے کو اس کو کوڑے کی چوٹ کا پہلے سے احساس ہوتا ہے ۔ جیسے گھوڑا ، شیر اگرچہ نہ دیکھے ، پھر بھی اس کو پہلی بار دیکھنے سے ڈرے ، اور اس طرح بکری بھیڑیے سے ۔ اگرچہ ہاتھی ، گائے اور اونٹ شیر سے جسامت کہیں زیادہ ہیں ، مگر ان چیزوں سے وہ نہیں ڈرتے ۔ یہ وہ قوّتِ ادراک ہے جو خدا کی طرف سے اُن کو ودیعت کی گئی ہے ۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے دُشمن کو پہچان لیتے ہیں ۔ لیکن ان تینوں منازل کے بعد بھی ان کو مستقبل کے متعلق قطعی خبر نہیں ہوتی ، کہ اس وقت کے بعد کیا ہوگا ؟ چونکہ وہ چوتھی منزل ہے ، جس کو منزل معقولات بتایا گیا ہے ۔

جب اِنسان اِس درجے پر پہنچتا ہے ، تو "بہائم" کے حدود سے نکل جاتا ہے ـــــ اور یہ ہی اِنسانیت کی پہلی منزل ہے ۔ جہاں اِنسان وہم و خیال سے بالاتر اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے ۔ جس سے وہ مستقبل میں آنے والی بلاؤں سے اپنے کو محفوظ کر لیتا ہے ۔ اِس کے بعد ہی وہ اصل جوہر اور حقیقت کو صورتِ جسیمہ سے جدا کر لیتا

ہے۔ اس کو ہر چیز کی حقیقت اور اس میں مشتمل جو اشیاء ہیں، ان کو بھی سمجھ لیتا ہے

جو چیزیں ہم کو یہاں نظر آتی ہیں، وہ لا محدود تو نہیں ہیں۔ کیونکہ جو چیز دیکھی جا سکتی ہے وہ صورت جسمیہ ہی ہوتی ہے۔ اور صورت جسمیہ کی کوئی نہ کوئی آخری انتہا ضرور ہوتی ہے۔

عالم محسوسات میں انسان کا قوتِ حافظہ اور فکر زمین پر چلنے کی طرح ہے، جیسے ہر آدمی چلنے پھرنے کی قوت رکھتا ہے۔ لیکن عالم معقولات میں آدمی کا چلنا پھرنا صرف حقائق دنیا و آخرت کی تحقیق و تدقیق کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ پانی پر چلنے کے مماثل ہے اور منزل موہومات میں سوچنا کشتی کے سوار کی مثل ہے۔ جس کا مرتبہ پانی اور خاک کے درمیان ہے۔

منزل معقولات کے آگے بھی ایک منزل ہے، جو انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام و صوفیائے عظام کی منزل ہے، اس کی مثال ہوا پر چلنے کی ہے۔ اسی بات کے متعلق لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا جناب عیسیٰ علیہ السلام پانی پر چلتے تھے، تو حضور نے جواب دیا کہ ہاں! ولو ازداد یقیناً لمشیٰ فی الھوا (یعنی اگر وہ علم الیقین کے اعلیٰ مراتب زیادہ جانتے تو ہوا پر چلتے) آدمی کے سفر کی منزلیں اس کے عالم ادراک سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جب وہ آخری منزل پر پہنچتا ہے، جو فرشتوں کا درجہ ہے، جو انسان کی معرفت کی آخری کڑی ہے۔

یہ سب باتیں انسان کی ذاتی جدوجہد سے تعلق رکھتی ہیں، کہ یا وہ اعلیٰ علیین پر پہنچ جائے یا اسفل السافلین میں گر جائے۔ اس کے متعلق بھی خداوند عالم نے اپنے کلام پاک میں جا بجا خطرات سے ہوشیار کیا ہے۔

لیکن محاورات کے درجات میں اُن کے لاتغیر ہونے کی وجہ سے کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ بالکل خطرے سے الگ ہیں۔ جس طرح فرشتے اعلیٰ علیین پر ہی ہیں اور اُن کو تنزل ہی نہیں ہے۔ خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ وَمَامِنَّا اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (یعنی ہر فرشتے کا درجہ متعین کر دیا گیا ہے)۔

اسی طرح چوپاؤں کے لیے اسفل السافلین کا درجہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اُن کے لیے ترقی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ مگر انسان ان دونوں کے مابین ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ہی خطرۂ عظیم ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ انسان ترقی کر کے فرشتوں کے درجات پر پہنچ جائے۔ یا تنزل کر کے اسفل السافلین میں مل جائے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ معرفت الٰہیہ کی امانت کا بوجھ یہی ہے، کہ اس نے اس خطرناک منزل کو منظور کر لیا۔ انسان کے علاوہ دوسری کوئی جاندار چیز اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتی۔ یہ مثالیں اس بات کے جواب میں دی گئیں۔ جس کے متعلق لوگ علماء کی تقلید کا حوالہ دیتے ہیں۔

اس دنیا میں بہت سے آدمی مقیم ہیں۔ مسافر تو کوئی کوئی نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یا تو کوئی آدمی مقیم ہی ہوگا

اور یا مسافر۔ یہ دونوں صفات کا یکجا جمع ہونا ناممکن ہیں۔

لہٰذا جو آدمی منزلِ محسوسات اور منزلِ تخیلات کو ہی اپنا مسکن بنالیتا ہے، اس پر رُوح اور حقیقت کی معرفت عیاں نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ روحانی نہیں بن سکتا، وہ کاموں کی اصل معرفت سے آگاہ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے کتب میں اس کی تفاصیل بیان نہیں کی گئیں۔

ہم بھی آخرت کی معرفت کے متعلق اتنا ہی بتائیں گے، چونکہ عوام میں اس سے زیادہ سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ بہت سے آدمی تو مندرجہ بالا تفصیلات کو سمجھنے سے بھی قاصر ہوں گے۔

دلیل ۱۴

اِنسان کی خودُ اختیاری ایسے بیوقوف بھی بہت سے ملیں گے کہ جو اپنی ذاتی سمجھ سے ہی تمام کاموں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ وہ شریعت ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ سب آخرت کے متعلق شکوک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے، تو اُن کو یہ سب خرافات نظر آتی ہیں۔ اور آخرت سے انکار ہی کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ اُن کا ظاہری انکار، باطنی بن جاتا ہے۔ شیطان ان کو اور تقویت پہنچاتا ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ دوزخ محض ایک دھمکی ہے۔ اسی طرح جنت کا تصور بھی شعبدہ ہے۔ ایسے یقین کے بعد ہی وہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شریعت کی پیروی کرنے والوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ فقیر منش اور صوفی ہیں تو ایسے آدمی کسی دلیل کے ذریعہ اُن باتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

پھر بھی ان کو سمجھانا اور راہِ راست پر لانا ہمارا فرض ہے، ایک سطحی سی بات، ہے کہ اگر کسی آدمی کو یقین بھی ہو گیا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر (نعوذ باللہ) غلطی پر تھے۔ لیکن تو سمجھ! کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے مقابلے میں تو، تُو ایک تنہا ہے۔ تو بھی تو غلطی کر سکتا ہے کہ شاید آخرت کی حقیقت کو تو ہی نہ سمجھ سکا ہو۔ خدا کے عذاب کو نہ پہچان سکا ہو، اور اس محسوسات کی دنیا کے ذریعہ روحانیت، کے عالم کو نہ سمجھ سکا ہو، اور اگر تو اتنا ہی ضدی ہے کہ کسی طرح اپنے علاوہ دوسرے کو سچا نہیں سمجھتا۔ اور کہتا ہے کہ میں روح کی حقیقت اس طرح نہیں سمجھتا، جیسے ایک سے دو زیادہ ہوتے میں مجھ کو یقین کامل ہے، تو مجبوری ہے۔ ایسا آدمی تو دیوانہ ہے۔ وہ تو ایسے گروہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کے متعلق خداوندِ عالم کا ارشاد ہے۔ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا٥ (یعنی اے رسول اگر اُن لوگوں کو تم ہدایت کرو گے بھی، تو وہ ہرگز قبول نہ کریں گے)

اور اگر وہ یہ دلیل دے کہ ان باتوں کے ناممکن ہونے کے متعلق مجھے یقین نہیں، اور یہ باتیں ممکنات سے ہیں مگر بعید از قیاس ضرور ہیں، اور اپنی صرف قیاس آرائی پر عمر بھر کے لیے دُنیا کے آرام و آسائش کو چھوڑ کر تقویٰ و پرہیزگاری کو کیوں مول لے لوں۔ اس سے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تُو نے اتنا مان لیا۔ تو عقلاً تجھ کو

شریعت پر چلنا چاہیئے۔ کیوں کہ اگر کسی چیز میں کوئی خطرہ عقلمند آدمی سمجھتا ہے۔ تو اس سے پرہیز کرنے لگتا ہے" جیسے اگر کوئی آدمی تجھ سے کہہ دے کہ کھانے میں سانپ نے منہ ڈال دیا ہے، تو تو اُس کھانے کو ہرگز نہ کھائے گا چاہے تجھ کو کہنے والے پر یہ یقین ہو کہ یہ مجھے کھانے سے روکنا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں تو صرف گمان اور قیاس پر کھانا نہ کھائے گا۔ اور بھوک کی تکلیف کو ہلاکت کے امکانات سے برداشت کرنا آسان سمجھے گا۔

اسی طرح جب تو بیمار ہو، اور کوئی آدمی ایک روپیہ کے عوض تعویذ دینے کو کہے، اور تجھ کو یقین ہو کہ اس کا تعویذ بیکار ہے، اور میرا روپیہ دینا بالکل بے سود ہوگا، لیکن اس کے باوجود بھی تو اس کو روپیہ دے دے گا اس لیے کہ روپیہ کے صرف ہونے سے تجھ کو وُہ تکلیف نہ پہنچے گی جو بیماری کے دُور ہونے سے آرام ملے گا۔

اسی طرح اگر کوئی نجومی تجھ سے کہہ دے کہ چاند جب فلاں مقام پر پہنچ جائے تو فلاں دوا کھا لینا، تجھ کو آرام ہو جائے گا، اور وُہ دوا کڑوی بھی ہو اور تجھے یقین بھی ہو کہ یہ دوا مفید نہ ہو گی، لیکن تیرا وہم و گمان تجھ کو اس طرف ضرور رجوع کر دے گا، کہ بیماری کے دفع ہونے سے آرام تجھ کو ملے گا۔ اس کے مقابلہ میں وہ کڑوی دوا برداشت کرنا اچھا ہے، اور تو اس کو استعمال میں لے آئے گا۔

لہٰذا عقلمند آدمی کے لیے ان طبیبوں، حکیموں اور نجومیوں کے قول کے مقابلے میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا حکم زیادہ قابلِ قبول ہوگا۔ جب وہ اُن کے کہنے سے صرف گمان اور بعید از قیاس گمان پر تکلیف اٹھاتا ہے۔ تو کیوں نہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے حکم پر چلنے کے لئے تکلیف برداشت کر لے۔

اگر کوئی آدمی حساب کرے کہ دُنیا کب سے ہے؟ اور ابد کی انتہا کب ہے؟ مگر ابد کی اِنتہا لامعلوم ہے۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ شریعت کی پیروی بمقابلہ اس عظیم الشّان خطرے کے معمولی ہے۔ جیسے تو خوف کھاتا ہے۔ کہ اگر انبیاء علیہم السلام نے سچ ہی کہا ہے۔ تو میں ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہوں گا، اور میری چند روزہ زندگی مفید نہ ہو گی اور اُن کے قول میں سچائی کے امکانات ہوں، تو تُو کیا کرے گا؟

ابد کی اِنتہا کے معنی یہ ہیں، کہ اگر تمام دُنیا کو چینیہ کے دانوں کے اندر بھر دیا جائے اور کسی پرندے سے کہا جائے کہ ایک ایک ہزار سال کی مُدت کے بعد ایک ایک دانہ اس میں سے چُن لے اور وہ سب دانے ختم ہو جائیں، لیکن اس کے بعد بھی 'ابد' کی حدود میں سے کچھ کم نہ ہو، تو اتنی طوالی اور نامعلوم مُدت کے لیے عذاب ربّانی خواہ وہ جسمانی ہو۔ روحانی ہو یا حیاتی کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے؟ کون عقلمند ایسا ہوگا کہ امکاناتِ ظاہری پر غور کرنے کے بعد اس حقیقت کے امکانات کو غور نہ کرے گا۔ چاہے اس میں تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔ لوگ تجارت کے لیے کشتی میں سوار ہوتے ہیں، اور صرف نفع کے امکان کی خاطر سمندر کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔

اسی طرح اگر کسی بیوقوف کو آخرت کا گمان ہی ہے، تو کم از کم اس طولانی مدت کے لیے عذاب میں مبتلا ہونے کے خوف سے ہی شریعت پر عمل کرے۔ اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ایک ملحد سے مناظرہ کیا اور فرمایا کہ اگر تیرا قول صحیح ہے کہ خدا نہیں ہے، تو میں بھی بچ گیا، اور تو بھی۔ اور اگر بقول میرے خدا موجود ہے تو میں نجات پاؤں گا، اور تو قہرِ الٰہی میں پھنس جائے گا، اور ہمیشہ عذابِ خداوندی میں مبتلا رہے گا۔

امیر المومنین نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ کو (نعوذ باللہ) اس کے وجود میں کوئی شک تھا، بلکہ آنحضرت نے اُس منکر کی عقل کے مُطابق جواب دیا تھا، کیونکہ آپ یقین کر چکے تھے، کہ خدا کی معرفت اس کے لیے ناممکن ہے۔

اس مثال سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اِس دُنیا میں جو آدمی زادِ آخرت جمع کرنے کے علاوہ خواہشاتِ نفسانی میں مشغول ہے۔ وہ بیوقوف ہے۔ اور خواہشاتِ دنیوی کی زیادتی اور غلبہ اس آخرت کی طرف سے غفلت کا سبب ہے، جو اس کو سوچنے سے روکتی ہیں۔ وہ آدمی جو آخرت پر یقین کامل رکھتا ہے اور وہ آدمی گمان غالب رکھتا ہے تیسرے وہ شخص جو گمان ضعیف ہی رکھتا ہے۔ اُن سب پر واجب ہے کہ اس خطرۂ عظیم سے بچیں، اور اپنے دامن کو عذاب کی آگ سے بچانے کی کوشش کریں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

پس مسلمانی کا عنوان ختم ہو گیا، اور اس کے ذیل میں جو چیزیں تھیں (مثلاً معرفتِ حق، معرفتِ دُنیا، معرفت آخرت) وہ بھی سمجھا دی گئیں۔ اب ارکانِ مسلمانی بیان کیے جائیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حصّہ دوم

ارکان حقائق اِسلام

رکن اوّل

عبادات

اے مسلمان! جب تو اسلام کے حقائق سے اچھی طرح واقف ہوگیا اور اپنی نیز خداوند عالم کی معرفت حاصل کرلی۔ ساتھ ہی ساتھ دنیا و آخرت کے متعلق بھی سب کچھ سمجھ لیا۔

تو اب ارکان اِسلام کو سمجھ! سابقہ تفصیلات سے تجھے بتایا گیا ہے کہ انسانی سعادت، معرفتِ خدا سے حاصل ہوتی ہے، جو عبادت کے ذریعہ مل سکتی ہے۔

ارکان عبادات عبادت کی بُنیاد یں سابقہ چار عنوانات پر مبنی ہیں۔ اِس کے بعد خُداوندِ عالم کی صحیح بندگی حسبِ ذیل چار ارکان کے ذریعہ حاصل ہو سکے گی، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

اوّل، رکن عبادات: اِنسان اپنے کو ظاہری عبادات میں مشغول رکھے۔

دوم، رکن معاملات: یہ اِنسان مشاغلِ دنیا میں باادب و باخرد رہے۔

سوم، رکن مہلکات: اِنسان مخرب اخلاق حرکات سے پرہیز کرتا رہے۔

چہارم، رکن منجیات: اِنسان خوش اخلاقیوں کا اپنے دل کو عادی بنائے۔

تفصیل

رکن اوّل — (عبادات کے بیان میں)

رکن اوّل کے حسبِ ذیل دس اصول ہیں:

اوّل، اہل سنّت کے اعتقادات کا درست کرنا۔ دوم، طلب علم۔ سوم طہارت۔ چہارم نماز۔ پنجم زکوٰۃ ششم روزہ۔ ہفتم حج۔ ہشتم تلاوتِ قرآن۔ نہم ذکرِ خُدا، عبادت خدا۔ دہم ترتیب اورادِ وظائف و اوقاتِ عبادت کا ملحوظ رکھنا۔

پہلا اصول
دربیان اعتقاداتِ اہلِ سنّت والجماعت

معلوم ہونا چاہیے ! کہ ہر مسلمان کے لیے یا جو آدمی اسلام لائے ، اس کے لیے کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" زبان پر جاری کرنا ، اِس پر دل سے یقین کرنا اور اس کے معنی سمجھنا ضروری ہیں اور جس وقت کلمے پر یقین کامل ہو جائے ۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے ، پس وہ اصل مسلمان ہے ۔

اہلِ سنّت کے اعتقادات لیکن کلمے کے متعلق دلائل اور ثبوت کا بھی جاننا ضروری نہیں ہے ۔ چونکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دلائل کے ثبوت فراہم کرنے ، شبہات اور جوابات کی تلاش کے لیے منع فرمایا ہے —— بلکہ اس پر یقین کامل کرنا ہی "عین اسلام" فرمایا ہے ۔ عوام الناس کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے ۔

لیکن کچھ آدمی ایسے بھی ضروری ہیں جو بحث و دلائل سے بھی ثابت کر سکیں ، اور اگر کوئی غیر مسلم عوام کو کلمہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" سے بہکانا چاہے ، تو اس کے مقابل میں دلائل دے سکیں ۔ اور علمِ منطق (علم کلام) کے ذریعہ عوام الناس کی رہنمائی کر سکیں ۔ اس صفت کو ہی "علم کلام" کہا جاتا ہے ۔ علم کلام کے جاننے والے ہر شہر میں دو ہی کافی ہیں ، جن کو ہم لوگ فرض کفایہ کہتے ہیں ۔

عوام النّاس صرف اعتقادات سے اپنے مذہب پر پختہ ہوتے ہیں ، لیکن اُن کی پشت پناہی کے لیے "علم کلام" کے جاننے والے بھی ضروری ہیں ، جو اُن کے نگہبان ہوں ۔

مگر معرفت الٰہیہ کی حقیقت کا راستہ جُدا گانہ ہے ۔ وہ چیز متکلّم (یعنی علم کلام کا عالم) یا صرف عقیدے پر چلنے والوں سے الگ ہے ۔ "معرفت" کا آغاز ریاضت و مجاہدۂ نفس سے ہوتا ہے ، جو آدمی مجاہدہ نفس نہ کرے گا درجہ معرفت الٰہیہ تک نہیں پہنچ سکے گا ۔ ایسے آدمی کو معرفت کا دعویٰ کرنا مناسب نہیں کیونکہ ایسا کرنے میں اس دعویٰ سے جو اپنے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے ، اس سے زیادہ نقصان ہے ۔

ایسا آدمی بالکل اس شخص کی طرح ہے ، جو پرہیز کرنے سے پہلے دوا کھائے ، لیکن اُس کو ہلاکت کا بھی خطرہ لاحق ہو ، کیونکہ وہ دوا اس شخص کے پیٹ میں پہنچتے ہی فاسد بن جاتی ہے ، اور اُس کے وہم کی وجہ سے بجائے فائدے کے نقصان ہونے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ جس کی وجہ سے شفا کے بجائے بیماری اور بھی طول پکڑ جاتی ہے ۔

ہم نے مسلمان کے عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا ، وہ معرفت الٰہیہ کی حقیقت کا ایک نمونہ ہے ۔ اب جو آدمی اس کا اہل ہوگا ، وہ تلاش کرے گا اور اس کو ملے گا بھی ۔ "اہل" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی دنیا سے الگ رہے گا ، اور اس کو دنیا کے مشاغل سے دلچسپی نہ ہوگی ۔ اہل وہ آدمی ہے جس نے عمر بھر سوائے

خدا کی عبادت کے کسی دوسری چیز سے دل نہ لگایا ہو۔ معرفت حق اِنتہائی مشکل ہے۔ لیکن یہ تمام دُنیا کے لیے غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور وہ ہیں " اعتقادات اہل سنّت والجماعت " جس کے متعلق ہم بیان کرتے ہیں، تاکہ ہر آدمی ان اعتقادات پر گامزن ہوکر " سعادت " کے مرتبے پر پہنچ سکے، جو اس کی بُنیاد اور جڑ ہے۔

اِعتقادات کا بیان

کوئی شئے بغیر کسی جہت کے پیدا نہیں ہوتی اے مسلمان تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تو ایک مخلوق ہے اور تیرا پیدا کرنے والا کوئی ایک ضرور ہے۔ اسی پروردگار نے اِس دُنیا کو، اور جو کچھ اس دنیا میں ہے سب کو پیدا کیا ہے، وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، وہ یکتا ہے۔ اس کی مثل کوئی دوسرا نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ ازل سے لے کر ابد تک اِس ہستی کا وجود یقینی ہے نیستی کا اس کے لیے کوئی امکان نہیں۔ اس ذات کی ہستی (موجودگی) صرف اسی کی اپنی ذات سے ہے۔ اس کو کسی سبب و علت کی ضرورت نہیں۔ دُنیا کے تمام موجودات کا وجود اسی کی ذات کے باعث ہے۔

تنزیہ وہ بذات خود نہ جوہر (اصل) ہے، اور نہ عرض (فروع) وہ کسی وجود میں نہیں سماتا، نہ کسی چیز کی مشابہت ہی رکھتا ہے اور نہ دنیا کے موجودات اس کی مثل ہیں۔ اس کی شکل (جس کو ہم دیکھ سکیں) کوئی نہیں ہے۔ نہ اس کی ذات میں ہم کو چون و چرا کرنے کا حق ہے۔

جوہر و عرض ہمارے توہمات و تخیلات میں جو کچھ آتا ہے یا آسکتا ہے، وہ اُن سب سے بالاتر ہے۔ کیونکہ تخیّلات اور توہّمات بھی اسی کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔

خوردی و بزرگی، کمی و بیشی کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ کیونکہ یہ صفات بھی صُورت جسمیہ سے تعلّق رکھتی ہیں جن سے اس کا وجود پاک ہے۔ وہ نہ کسی جگہ پر ہے، نہ اس کے لیے کوئی جگہ متعیّن ہے۔ وہ ذات جگہ یا مکان سے منزّا ہے۔

اس دُنیا میں جو کچھ ہے وہ عرش کے ماتحت ہے، اور عرشِ اعلیٰ اس کی مرضی و اِرادے کا مسخر ہے وہ عرش سے کہیں اعلیٰ تر ہے۔ ایسے نہیں جیسے کوئی جسم کسی جسم پر رکھ دیا جائے۔ کیونکہ وہ جسم نہیں اور نہ " عرش " اس کو اُٹھائے ہوئے ہے، بلکہ عرش صرف اس کے احکام کے مُطابق ایک جگہ قائم ہے۔

اس ذات کی صفت آج بھی وہی ہے، جو عرش کو بنانے سے پہلے تھی، اور آئندہ بھی ابدالآباد تک ایسی ہی رہے گی۔ کیونکہ گردش و انقلابات عالم کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں۔

ذاتِ باری تعالیٰ اگر گردشش و انقلاب میں نقصان کی صفت ہوگی، تو وہ خدائی کے قابل نہ ہوتا، اور اگر انقلاباتِ زمانہ ترقی و صفاتِ حسنہ کے باعث ہوں گے، تو اس کی مثال ایسی ہو جائے گی۔ جیسے کوئی چیز اوّل ناقص تھی، اب بعد میں کامل ہوا۔ یہ صفت بھی مخلوق میں ہوتی ہے، خالق کے لیے نہیں۔

باوجود ان تمام صفات کے وہ مخلوقات و موجوداتِ عالم سے پاک ہے۔

اس کی ذات موجودہ (اس) دُنیا میں بے چون وچرا جاننے اور سمجھ لینے والی ہے۔ اور اُس دُنیا (قیامت کے بعد) دیکھنے والی ہوگی۔ اس دُنیا میں بغیر کسی قیمت و دلیل کے ہم اس کو جانتے ہیں۔ اور اُس دنیا میں (بعد قیامت) بے حجت و دلیل و چون چرا (اس کو) دیکھیں گے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ کا دیدار موجودہ دُنیا کے دیدار کی طرح نہیں ہے۔

قدرتِ الٰہیّہ

طاقتِ الٰہی باوجودیکہ وہ کسی چیز کی مشابہت نہیں رکھتا، لیکن تمام موجودات پر قادر ہے اور اس کی طاقت درجہ کمال پر ہے۔ اس کے لیے کسی عاجزی، نقصان یا کمزوری و ضعف کو دخل نہیں، بلکہ اُس نے جو چاہا کیا، اور جب جو چاہے گا کرے گا۔ ساتوں زمین و آسمان، عرش و کرسی، لوح و قلم، جو کچھ بھی ہیں۔ سب اس کی قدرت کے مسخّر ہیں، اور سوائے اس کے کسی چیز کا دُنیا کی کسی چیز پر تصرّف نہیں۔ نہ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی مددگار رہے۔

علمِ الٰہی

وُہ دانا ہے، موجودات میں ہر چیز کا عالم ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ عرشِ اعلیٰ سے تحت الثریٰ تک "ہر چیز" کو وہ جانتا ہے۔ دُنیا کے تمام امور اسی کے ارادے اور قدرت سے عمل میں آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بیابانوں کے ذرّات، سرسبز درختوں کے پتّے، فضائے بسیط کے ذرّات اور دلوں کے وسوسے، اس کے علم میں ایسے ہی ہیں، جیسے ہمارے لیے نو آسمانوں کے اعداد و شمار۔

اِرادات الٰہیّہ

دُنیا کی ہر چیز اسی کے اِرادے اور قوّت کے ماتحت ہے۔ تمام موجوداتِ عالم خواہ وہ کم ہو یا زیادہ چھوٹی ہو یا بڑی، بزرگ ہو یا خورد، یہاں تک کہ خیر و شر، عبادت و گناہ، کفر و ایمان، نفع و نقصان، کمی، زیادتی، رنج و راحت، بیمار و تندرستی۔ یہ سب اسی کے قبضۂ قدرت اور مشیّت و حکم کے تابع ہیں۔

اگر تمام دُنیا کے موجودات نیز فرشتے اور شیطان یکجا جمع ہو جائیں، اور چاہیں کہ دُنیا کا ایک ذرے کو بغیر اس کی مشیّت کے حرکت دے دیں، یا اس کی کمی و بیشی کی کوشش کریں، تو ناممکن ہے بغیر اس کے

ارادے کے کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی - اسی طرح اگر کوئی چیز وہ پیدا کرنا چاہے، تو کوئی اُس کو روک نہیں سکتا۔ دُنیا میں اب تک جو کچھ تھا یا جو کچھ ہوگا۔ سب اُسی کے ارادے اور قوّت کے ماتحت تھا اور ہوگا۔

سماعت و بصارتِ الٰہیّہ

وہ قادرِ مطلق جس طرح ہر چیز کا عالم ہے، اسی طرح ہر چیز کو دیکھتا اور ہر آواز کو سُنتا ہے - نزدیکی و دُوری اس کے لیے برابر ہیں - تاریکی و روشنی اس کے لیے یکساں ہیں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں چیونٹی کے پیر کی چاپ سُنتا ہے، اور تحت الثریٰ میں رہنے والے کیڑوں کو دیکھتا ہے - اس کی قوّتِ سماع کو کانوں کی حاجت نہیں۔ اُس کے سُننے کے لیے قوّتِ سماع کی ضرورت نہیں، جیسے اس کے لیے ادراک و تفکرات کی حاجت نہیں ایسے ہی اس کو کسی چیز کے خلق کرنے کے لیے کسی آلے کی ضرورت نہیں۔

قادر الکلامی

اس کے احکامات موجوداتِ عالم کے لیے واجب التعمیل ہیں، جس چیز کی اس نے خبر دی ہے۔ وہ صحیح ہے، وہ اپنے وعدوں کا سچّا ہے۔ فرمان، وعدے، اور احکامات یہ سب اس کا کلام ہیں۔ جس طرح وہ زندہ ہے، قوّتِ سماع پر قادر ہے اور دوسری صفات کا حامل ہے - اسی طرح وہ قادر الکلام ہے۔ اُس نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے ایک بے زبان درخت کے ذریعہ گفتگو کی - اس کو بات کرنے میں زبان اور دہن کی ضرورت نہیں - جس طرح ہم کو بولنے، اور کلام کرنے کے لیے آواز - حروف، زبان اور دہن کی ضرورت ہے - اس کا کلام اِن ظاہری وجوہات کا محتاج نہیں - قرآن شریف - انجیل - توریت اور زبور اسی کا کلام ہیں - اِس کا کلام اس کی صفاتِ ذاتی سے متعلق ہے - اور اس کی تمام صفات "قدیم" ہیں - اور جس طرح اس کی ذات قدیم ہے اور ہم اس کے وجود کا ازل سے لے کر ابد تک یقین کرتے ہیں - اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ سے اِس کی ذات سے وابستہ ہے اور رہے گا - قرآن شریف میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں، وہ مخلوق ہے اسی ذات کی -

افعالِ الٰہیّہ

جس طرح دُنیا کی ہر چیز اسی کی بنائی ہوئی ہے، اور اُس نے جو کچھ بنایا ہے، اس سے بہتر کوئی چیز نہیں بن سکتی - اگر تمام دُنیا کے عقلا یکجا جمع ہو کر سوچیں کہ موجودہ دُنیا سے کوئی اور اچھی دنیا بنالیں، یا اس میں کوئی کمی بیشی کرلیں، تو یہ قطعی ناممکن ہے، اور اگر یہ ہی خیال کریں کہ عالمِ موجودہ سے کوئی اور اچھی دنیا ہوتی، تو بھی یہ اُن کی عقول کا قصور ہے - وہ اِس کی مصالح اور حکمت سے غافل ہیں - بلکہ وہ لوگ اُس اندھے کی مثل ہیں جو کسی ایسے مکان میں جائے، جہاں ہر چیز آراستہ و پیراستہ ہو، اور اندھے پن کی وجہ سے کسی چیز پر گر پڑنے کے بعد کہے کہ یہ چیز بے قرینے رکھی ہے - حالانکہ وہ خود صحیح راستہ اندھا ہو جانے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا۔

پس جو کچھ اُس نے خلق کیا - عدل و انصاف اور حکمت و عقلمندی سے بنایا ہے - وہ ہر چیز اپنی جگہ مناسب ہے - اگر اس دنیا کو کچھ اور اچھی طرح بنا سکتا تھا - اور اُس نے نہ بنایا، تو یہ تو اس کی کم علمی کا باعث ہے، اور یا بخل و کنجوسی کا - لیکن یہ دونوں باتیں اس کی ذات پاک کے لیے محال قطعی ہیں - لہٰذا اس نے دنیا میں رنج و تکلیف امارت و غربت، تندرستی و بیماری، جہالت و عجز، جو کچھ پیدا کیا، وہ سب اس کے عدل کی دلیل ہیں -

ظلم کا اس کی طرف امکان ہی نہیں، کیونکہ ظلم کی تعریف یہ ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرے لیکن دُنیا کی ہر چیز اس کی خود ملکیت میں ہے - کیونکہ اس کے ساتھ اس دُنیا کا کوئی دوسرا مالک ہونا بھی محال ہے، اور جو کچھ اس دُنیا میں تھا، ہے اور ہوگا، سب کا سب اس کا ہے، وہ سب کا مالک و فادر ہے۔ اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں -

آخرت

عالمِ ارواح و عالمِ اجسام اس پروردگارِ عالم نے اس دُنیا کو دو قسموں پر پیدا کیا ہے - پہلی عالم اجسام (موجودہ دُنیا) دوسری عالم ارواح -

عالم اجسام (موجودہ دنیا) کو انسانوں کی رُوح کی منزل قرار دیا، تاکہ اس دنیا سے آخرت کے لیے توشہ لے لیں، اور ہر انسان کے لیے ایک مُدت مقرر کر دی - اسی مُدت کے آخر کو ہم لوگ موت کہتے ہیں تاکہ اس میں کمی و بیشی ہم نہ کر سکیں - جب موت کا وقت آتا ہے جسم سے رُوح الگ ہو جاتی ہے -

قیامت میں جو حساب کا دن ہے، رُوح کو جسم دے دیا جائے گا، اور وہ اپنے نامہ اعمال کو دیکھے گا - اس وقت اس کو دنیا کے تمام کردار یاد دِلائے جائیں گے، تب گناہوں اور نیکیوں کی صحیح جانچ کر سکے گا -

قیامت میں وہ میزان جو اعمال کی مقدار بتائے گی، وہ موجودہ ترازو جیسی نہ ہوگی جس کو ہم تم یہاں استعمال کرتے ہیں -

میدانِ حشر اِس کے بعد سب کو پُل صراط پر سے گزرنے کے لیے حکم صادر ہوگا - وہ پُل صراط بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوگی - پس جو آدمی اس دُنیا میں "صراط مستقیم" پر رہا ہوگا، وہ اِس پُلصراط سے بھی بآسانی گزُر جائے گا، اور جو اس دنیا میں غلط راستوں پر بھٹکتا رہا ہوگا، وہ پُل صراط کو بھی پار نہ کر سکے گا اور دوزخ میں گر جائے گا - اس صراط پر آدمیوں کو ٹھہرا کر نامۂ اعمال دیکھے جائیں گے - صدق کی حقیقت کی تعریف اس وقت دریافت کی جائے گی - اس وقت منافقوں گنہگاروں کو شرمندگی ہوگی - اور انھیں میں سے کچھ گروہ کو بے حساب جنت ملے گی - کچھ لوگوں کو حساب کتاب دینے میں آسانی ہوگی - اور کچھ کے ساتھ سختی کی جائے گی -

تمام حساب کتاب کے بعد کفّار کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور وہ ہرگز مُعاف نہ کئے جائیں گے۔ فرمانبردار مسلمانوں کو جنت میں جگہ دی جائے گی۔ اُن میں سے جو گُناہگار ہوں گے، لیکن انبیاء و مرسلین ان کی شفاعت کریں گے، اُن کو معاف کر دیا جائے گا، جن کی شفاعت نہ ہوگی، اُن کو جہنّم میں بھیج دیا جائے گا۔ مگر اُس کے گناہوں کے مُطابق ہی عذاب ہوگا۔ اور اس عذاب کی مدت کے بعد جنّت ملے گی۔

پیغمبران و انبیاء ؑ

اِنسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے

خداوندِ عالم نے آدمی کے اعمال کو ہی اس کی شقاوت اور سعادت کا موجب بنایا ہے آدمی کو خبر نہیں، کہ اس کے کون سے اعمال باعثِ سعادت ہیں، اور کون سے باعثِ شقاوت۔ اس لیے خداوندِ عالم نے پیغمبروں کو ودیعت فرمایا کہ جن لوگوں کے لیے ازل میں "سعادت" کا حکم ہو چکا ہے، اُن کو اِس راز سے آگاہ کر دیں اور اپنا پیغامِ ہدایت دے کر دنیا میں بھیجا، تاکہ نیکی و بدی کا راستہ مخلوق کو بتا دیں اور خدا پر حجّت باقی نہ رہے۔

سب سے آخر میں ہمارے رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ودیعت فرمایا، اور آپ کو نبوّت کے وہ اعلیٰ مراتب بخش دیئے۔ جس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا۔ اس لیے آپ کو خاتم النّبیین کہا گیا۔ کہ اب کوئی پیغمبر یا نبی نہ ہوگا۔ ہمارے رسول کے لیے تمام جنّات و اِنسان کو پیروی کا حکم دیا گیا، اور آپ کو تمام انبیاء کا حاکم قرار دیا۔ اور آپ کے اصحاب اور یاروں کو دوسرے پیغمبروں کے یاروں اور اصحاب پر فضیلت بخشی صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔

دوسرا اصول

"باب العلم"

حدیث

ارشادِ نبوی ہے کہ "طلبِ علم" تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔

حصولِ علم کے لیے علماء کی مختلف رائیں

علمائے اِسلام اس کے متعلق مختلف رائیں رکھتے ہیں کہ وہ علم کون سا علم ہے۔ متکلمین کہتے ہیں کہ یہ ارشادِ نبوی "علم کلام" کے متعلق ہے۔ کیونکہ معرفتِ حقّہ کا زینہ یہی ہے۔

فقہا کا قول ہے کہ ارشادِ نبوی کی مراد "علم فِقہ" سے ہے۔ چونکہ اس کے ذریعہ "حلال و حرام" میں تمیز ہوتی ہے

محدثین کا کہنا ہے کہ وہ علم "قرآن و حدیث کا علم ہے، جو اصل علوم شرعیہ" ہے۔

صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ وہ علم "حالاتِ دل" سے تعلق رکھنے والا علم ہے۔ اس کی وجہ بھی بتاتے ہیں کہ چونکہ معرفتِ الٰہیہ دل ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

ان میں کا ہر آدمی اس پر بحث کرتا ہے اور دلائل دیتا ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ علم کوئی ایک مخصوص علم

نہیں ہے، بلکہ مندرجہ بالا سب ہی علم واجب ہیں۔ لیکن اس میں کچھ فرق و تفریق سے اصل شکل نکل سکتی ہے۔
مثال کے طور پر جب کوئی کافر مسلمان ہو، یا کوئی لڑکا بلوغ کی حدود میں آئے تو اس وقت یہ تمام علوم سیکھنے اس پر واجب نہیں ہوتے، بلکہ اس وقت تو صرف اس پر کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہی جاننا واجب ہے اور اس کے معنی سمجھ لینا۔ اور اس کی بنیاد وہ ہی ہے۔ جو اعتقادات اہلِ سنت کے ماتحت بیان کیا گیا ہے۔ کلمے، اس کو جاننے کا مقصد، اس کی دلیلیں بھی جاننا ضروری نہیں ہیں۔ صرف اُن عقائد کو حُسن کر یقین کرنا، اور اُن کو باور کر لینا کافی ہوگا۔ اس کے لیے تفصیل جاننا بھی غیر ضروری ہے۔ لیکن خداوندِ عالم کی تمام صفات نیز پیغمبرِ خدا کی صفتیں اور قیامت، بہشت، دوزخ، حشر و نشر۔ ان سب پر عقیدہ راسخ ہونا ضروری ہے۔ اور ان تمام چیزوں کا مالک حقیقی خدا ہے۔ اسی نے یہ تمام احکامات ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچائے ہیں۔ یہ باتیں جاننا ان پر عقیدہ رکھنا کافی ہے۔ پس اس عقیدے میں پختہ ہوگا، تو مرنے کے بعد درجہ سعادت حاصل کرے گا، اور اگر پھر گناہوں میں آلودہ رہے گا، تو عذاب ہوگا۔ جب یہ پہلا عقیدہ خوب اچھی طرح سمجھ لے۔ تب اس پر دو قسم کے علوم اپنے لیے فرض سمجھنا چاہیئے۔ اُن میں سے ایک وہ جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا اعمال سے۔ یعنی اعضائے جسمانی سے۔ بعد الذکر علم بھی دو قسموں پر منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا وہ جو کرنے کے لائق ہے اور دوسرا ناقابلِ عمل۔ پہلا جو کرنے کے قابل ہے وہ علم ہے۔ جیسے کوئی آدمی صبح کے وقت مسلمان ہو، اس کو نمازِ ظہر کے وقت طہارت اور ترکیب نماز سیکھنا واجب ہے۔ صرف اس مقدار کے لحاظ سے جتنا کہ اس وقت اس کے فرض کو ادا کر سکے۔

علم کی ضرورت نیز ان دونوں علوم میں سے جو علم سنت ہے۔ اس کا سیکھنا بھی سنت ہے، واجب نہیں ہے۔ اسی طرح مغربین کی نماز کے وقت تک اس کی ترکیب نماز سیکھ لینا واجب ہے۔ جس سے وہ سمجھ لے کہ مغرب کی نماز میں تین رکعات ہی فرض ہیں۔ اس کے بعد ماہِ رمضان جب آئے تو اس کے فرائض کو سمجھ لے کہ روزے میں نیت کرنا، طلوعِ آفتاب سے غروب آفتاب تک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہے۔

اسی طرح اگر سونے کے صرف بیس دینار اس کے پاس ہیں تو "زکوٰۃ" کا علم اس پر فرض نہیں ہے، لیکن ایک سال اگر گزر جائے تو فرض ہو جاتا ہے۔ آخر میں علم حج کا نمبر آتا ہے۔ چونکہ وہ تمام عمر کے کسی حصے میں واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر حج کے وقت ہی اس کے ارکان جان لے تو درست ہوگا۔

جو کام مسلمان کو جس وقت در پیش ہو۔ اسی وقت اس کے ارکان جان لینا ضروری ہوتے ہیں۔ مثلاً نکاح کے وقت عورت کے حقوق سمجھ لینا ضروری ہیں۔ اسی طرح حالتِ حیض میں عورت سے مباشرت کرنا اچھا نہیں۔ اس کے بعد بھی طہارت کے وقت تک بھی درست نہیں۔ اسی طرح دوسری اور باتیں، جو اس سے متعلق ہوں۔

اگر پیشہ ور ہے، تو اس پیشے کے متعلق جاننا ضروری ہے اور اگر سوداگر ہے تو بیع و شرا کے مسائل کو جاننا ضروری ہے، تاکہ بیع باطل سے پرہیز کر سکے۔ اسی واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، دُرّے لگا کر دوکانداروں کو علم سوداگری سیکھنے کو بھیجا کرتے تھے اور کہتے تھے، کہ جو آدمی شرا و بیع سے ناواقف ہے۔ اس کو بازار میں بیٹھنا درست نہیں۔ یعنی تجارت نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ لاعلمی میں حرام پیسہ کھائے گا، جس کی اس کو خبر بھی نہ ہوگی۔

اسی طرح یہ "پیشہ ور" آدمی کے لیے علم کا حصول ضروری ہے۔ جیسے "حجام" اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اوّل جانے کہ آدمی کی کونسی چیز کاٹنے کے لائق ہے۔ اور کون سا دانت اکھاڑنے کے قابل اور آدمی کے زخموں کو کون سی دوا کس مقدار میں مفید ہوگی۔

یہ تمام علوم اس کے کام اور عقل کے مطابق واجب ہیں حجام کے لیے "بزاز" کا علم ضروری نہیں۔ اسی طرح بزاز کو "حجام" کا علم سیکھنے کی ضرورت نہیں۔

یہ مثال تو علوم کے متعلق دی گئی تھی۔ اسی طرح جو کام نہ کرنے والے ہیں اُن کا علم بھی ضروری ہے، وہ بھی پہلے کی طرح ہر آدمی کے حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی ریشمی لباس پہننے کے لائق ہے یا ایسی جگہ ہے جہاں لوگ شراب پیتے ہیں یا سوّر کا گوشت کھاتے ہیں، یا کسی ایسی جگہ پر ہے، جو کسی سے غضب کی ہوئی ہے یا مالِ حرام اس کے پاس ہے تو علما پر واجب ہے کہ اس آدمی کو اس کے متعلق سب کچھ بتا دیں، تاکہ وہ ان میں حرام و حلال کی تمیز کر سکے۔ اگر وہ آدمی ایسی جگہ ہو، جہاں عورتوں سے زیادہ خلط ملط رکھے، تو محرم اور نامحرم کی شناخت ضروری ہے تاکہ یہ سمجھ لے کہ کس کو دیکھنا اور کس کو نہ دیکھنا چاہیئے۔ یہ علم بھی آدمی کے حالات کے مطابق علیحدہ علیحدہ ہے۔ جو آدمی جس کام سے متعلق ہو، اسی کے متعلق سیکھنا چاہیئے۔ اس طرح مثلاً عورتوں کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ جانیں کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا جائز نہیں ہے، اس کا سمجھنا صرف مرد کے لیے ضروری ہے وہ بھی وہ آدمی جو کسی عورت کو طلاق دینا چاہتا ہے۔

جو امور "دل" سے متعلق ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

اوّل وہ امور جو دل کے حالات سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

دوم وہ امور جو اعتقادات سے متعلق ہیں۔

علم ہر جہت سے ضروری ہے

جن امور کا تعلق دل سے ہے، اُن کا جاننا بھی ہر حال میں ضروری ہے۔ جیسے کینہ، حسد، کبر، بغض یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ کسی دوسرے پر بدگمانی بھی ناجائز ہے۔ ایسی باتوں کا جاننا ہر مسلمان کے لیے واجب ہے۔ چونکہ کوئی متنفس ان باتوں سے خالی نہیں۔ لہٰذا اُن کا جاننا اور اُن سے پرہیز کرنے کے طریقوں کو جاننا، دونوں ضروری ہیں۔ چونکہ یہ بیماری عام ہے ـــ اور بغیر سمجھے اور جانے

اس کا دور ہونا ناممکن ہے۔
علمِ بیع و شرا، اجارہ و رہن وغیرہ جس کو علمِ فقہ کہتے ہیں - اس علم کا جاننا فرضِ کفایہ ہے، جو آدمی ایسے کاروبار کرتا ہے۔ اس کے لیے اس کے متعلق علوم سیکھنا فرضِ عین ہیں - باقی کے لیے نہیں۔
دوسری قسم جو اُوپر بتائی گئی ہے، وہ اعتقادات سے متعلق ہے، وہ یہ ہے اگر کسی کے اعتقاد میں کوئی شک پیدا ہو جائے تو اس کو اپنا شک رفع کر لینا ضروری ہے۔ اور اگر کسی واجب اعتقاد میں کوئی شک پیدا ہو گیا ہے، یا ایسا شک جو مذہباً ناجائز ہے، لہٰذا ایسے موقع پر ضروری ہے کہ یہ علم ہر آدمی پر لازم ہے۔
چونکہ کوئی مسلمان "علم" کی جنس سے مستغنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا، اور علم کی بھی ایک قسم نہیں ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ہر قسم کا علم ہر آدمی کے لیے واجب نہیں ہے، بلکہ ہر آدمی کے حالات و واقعات کے ماتحت بدلتا رہتا ہے۔ نہ کوئی انسان احتیاجِ علم سے مبرّا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہمارے رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ طلبِ علم تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ مقصد اس حکم کا یہ ہے کہ جس آدمی کو اس کے حالات کے مطابق جس علم کی ضرورت ہو اس کا جاننا اس کے لیے ضروری ہے۔

دلیل ۱

فقہ کا جاننا ہر طرح ضروری ہے

دوستو! جب تم کو معلوم ہو گیا، کہ انسان کے لیے علم واجب و لازمی ہے تاکہ وہ اپنے معاملات اور پیشوں میں مدد لے سکے۔ لہٰذا عوام کو اپنے پیشوں کے لیے ہر وقت خطرات ہونا ضروری ہیں، کہ وہ کوئی بُرا کام لاعلمی میں کر بیٹھے، اور باز پُرس کے وقت کہے کہ میں اس کی اچھائی، بُرائی سے ناواقف تھا۔ تو یہ عذر اس کا ناقابلِ سماعت ہوگا۔ مثلاً کوئی آدمی حیض کی حالت میں یا بعد اس کے قبل غسل کے عورت کے ساتھ مباشرت کرے اور بعد میں کہے کہ میں اس کے نیک و بد سے بے خبر تھا، تو اُس کا عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ یا کوئی عورت صبح سے پہلے پاک ہو جائے اور وہ مغربین کی نماز قضا نہ کرے۔ اس لیے کہ وہ اس سے لاعلم ہو، یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے، اور اس کو یہ معلوم ہو کہ حالتِ حیض میں طلاق حرام ہے تو یہ عذر اُن لوگوں کے ناقابلِ سماعت ہی قرار پائیں گے۔ اس وقت اس سے کہا جائے گا کہ جب تجھ کو معلوم ہے کہ طلبِ علم فرض ہے، تو طلبِ علم میں کیوں کوتاہی برتی، ہاں، البتہ اگر کوئی ایسا ناقابلِ قیاس واقعہ کسی پر پیش آ جائے، جس کی خبر ہی اس کو نہ ہو تو اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

دلیل ۲

مسلمانو! جب تم کو معلوم ہو گیا کہ عوام کسی وقت بھی خطرے سے خالی نہیں ہیں۔ لہٰذا یاد رکھو کہ دُنیا کا کوئی کام یا پیشہ "علم" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ انسان جو بھی پیشہ کرتا ہے، وہ طلبِ دُنیا ہی کے مماثل ہے۔

اور علم دُنیا میں ایک پیشہ ہی ہے، بلکہ بہت سے پیشوں سے برتر ہے۔ کیونکہ "طلب علم" چار حالتوں کے اندر ہی ہوتا ہے۔

اوّل، اگر انسان اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے مالدار ہے اور دنیوی پیشوں سے مستغنی ہے، تو "علم" اس کے مال کا محافظ ہوگا اور دُنیا میں عزت کا باعث۔

دوم، اگر کوئی آدمی علم حاصل کرتا ہے اور اس کو "وظیفہ روزی" کسی بیت المال یا دوسرے مُسلمانوں سے ملتا ہے، جو اُس کو پیٹ بھرنے میں کام آتا ہے، اور اس کو حرام طریقوں سے بچائے، یا بادشاہ ظالم کے طلب کرنے سے بھی نجات دلائے، تو ایسے آدمی کے لیے "طلب علم" دین و دنیا دونوں جگہ بہترین چیز ہوگی۔

سوم، اگر کسی آدمی کے پاس مال دُنیا نہیں ہے، لیکن قناعت کرتا ہے، اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے فقر کی قدر کرتا ہے اور جانتا ہے کہ درویش امراء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے، تو ایسے آدمی کے لیے علم دنیا میں باعثِ آسائش اور دین میں باعثِ سعادت ہوگا۔

چہارم، اگر کوئی آدمی صرف دُنیا کمانے کے لیے علم حاصل کرتا ہے اور بادشاہ وقت بھی باہر ہو، جس کی روزی حرام سے حاصل کی ہوتی ہو، یا ایسے لوگوں سے حاصل کیا گیا ہو جو ریاکار ہوں۔ دوسرے تمام ذرائع بھی مسدود ہیں، تو ایسے شخص کو چاہیئے کہ ضروری علم سیکھنے کے بعد کسی ہنر یا پیشہ میں پڑ جائے، ورنہ وہ شیطان ہوگا، اور دوسرے لوگوں کو بھی تباہ کرے گا۔ اور اگر کوئی قابل اس کو حیلہ دفریب سے کسب کرتا ہوا دیکھے اور اس کی پیروی بھی کرنے لگے، تو وہ بجائے اصلاح و درستی کے فساد کا باعث ہوگا۔ لہٰذا ایسے عقلمند آدمیوں سے دُنیا پاک ہی ہو جائے تو بہتر ہے، اور آدمی کے لیے مناسب بھی یہی ہے کہ دنیا کے کاموں کے ذریعہ ہی دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اگر کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ "علم" دنیا کے مشاغل سے اس کو کنارہ کش کر دے گا جیسا کہ بعض لوگوں کا مقولہ ہے۔ ماتعلمنا العلم بغیر اللہ فابی العلم ان یکون الا للہ (یعنی ہم نے خدا کے لیے کسب علم نہیں کیا۔ بلکہ علم نے خود ہم کو خدا کی طرف رجوع کر دیا) اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کتاب خدا وسنت رسولؐ "آخرت" وحقائق شریعت کا علم تھا، جو ان کو خدا کی طرف لے گیا۔ یہاں ہم کو جائزہ لینا چاہیے کہ مندرجہ بالا باتیں اُن کے ذہنوں میں موجود تھیں۔ وہ لوگ حرص دنیا کو اچھا نہ سمجھتے تھے، اور بزرگان دین کو دیکھتے تھے کہ دُنیا سے کنارہ کش ہیں اور اُن کے ضمیر کی آواز یہ تھی کہ اُن علماء کی پیروی کریں۔ جب وہ جانتے تھے کہ "علم" کی خصوصیات اُن پر اثر کریں گی، ان کی خواہشات سے علم متاثر نہ ہوگا

لاحاصل علوم کا حصول بیکار ہے

لیکن علوم موجودہ مثلاً قصے، کہانیاں، ناول اور خلاف مذہب دوسرے علوم وغیرہ۔ اس زمانے میں معلمین بھی دنیا کے علم کے جال بچھائے ہوئے ہیں، اُن لوگوں کی صحبت اور حصول علم

دنیا والوں کو صحیح راستے سے برگشتہ نہیں کرسکتا۔ لیس الخبر کالمعاینۃ (یعنی سُنا ہوا دیکھے ہوئے کے برابر نہیں ہوسکتا) لہٰذا غور کرنا چاہیئے کہ ایسے علماء دُنیا دار علماء ہیں یا ان کا آخرت سے بھی کوئی تعلق ہوسکتا ہے دنیا والوں کو ایسے علماء کے دیکھنے سے نفع پہنچتا ہے یا نقصان؟

البتہ اگر اُن میں کوئی ایسا ہو، جو علمائے سابقہ کا مقلد ہو اور پرہیزگار و متقی بھی، اور وہ بھی درس و تدریس دیتا ہو، جو غرور دُنیا سے کنارہ کرنا سکھائے۔ ایسے عالموں سے پڑھنا تو کجا، ان کی صحبت بھی باعثِ ثواب دارین ہے۔ اگر کوئی نفع بخش علم حاصل کرے، تو ان کاموں سے اچھا ہوگا۔

مفید علم وہی ہے، جس کے پڑھنے کے بعد دُنیا آنکھوں میں مفید ہوجائے۔ آخرت سزا و جزا سے خبردار ہوجائے، اور جس علم سے ان کی جہالت و حماقت کا اندازہ ہو، جو دنیا میں مشغول اور آخرت سے غفلت میں ہیں اور غرور و حسد، حرص و ریا اور دُنیا کی محبت سے کنارہ کشی کا چسکہ پیدا ہوجائے۔

یہ دُنیوی علم حریصوں کے لیے ایسا فائدہ مند ہے، جیسے پیاسے کے لیے پانی اور بیمار کے لیے دَوا اور دنیا کے بندے کا علوم فقہ و کلام و اَدب وغیرہ میں مشغول ہونا ایسا ہے، جیسے کوئی مریض کسی ایسی چیز کا استعمال کرے جو اس کے مرض کے لیے اور زیادتی کا سبب ہو، کیوں کہ عموماً یہ علوم حسد، ریا، غرور، عداوت، خودی اور طلب جاہ و حشم کے بیج بوتے ہیں، جتنا ان علوم کو زیادہ حاصل کرے گا۔ یہ بُرے اوصاف اتنے ہی دل میں زیادہ جگہ پائیں گے، یہاں تک کہ اگر ایسے لوگوں سے میل جول بھی رکھے گا، جو فقیہہ ہونے کے مُدعی ہیں اور خلاف شرع حصول علم میں مشغول ہیں، تو ایسے آدمی کے لیے توبہ کرنی بھی دُشوار ہوجاتی ہے۔

تیسرا اصول

"باب الطہارت"

خداوند عالم فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ (یعنی خداوندِ عالم پاک لوگوں کو دوست رکھتا ہے) رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الطُّہور شطر بالایمان (یعنی پاک رہنا آدھا ہے) ایک اور ارشاد نبوی ہے بنی الدین علی النظافۃ (یعنی دین کی بُنیادیں پاکی پر رکھی ہوئی ہیں)

طہارت دل
مدارج طہارت

یہ خیال نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ تمام پاکیزگیاں جسم اور کپڑوں کو ظاہری طور پر پاک کرنے کے متعلق ہیں، اس کی چار قسمیں ہیں۔

طہارت کی پہلی قسم یہ ہے کہ ماسوا اللہ دنیا کی ہر چیز سے دل کو پاک ہونا چاہیے۔ باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْہُمْ (یعنی جب انسان کا دل خدا کے علاوہ ہر چیز سے خالی ہوگا تو اسی کی طرف رجوع ہوگا)۔ اور یہی لا الٰہ الا اللہ کی تحقیق ہے۔ ان درجات پر صرف صدیق فائض ہیں۔ خداوندِ عالم کے علاوہ ہر چیز سے

دل کو پاک کر لینا آدھا ایمان ہے، اور دل جب تک ماسوی اللہ سے پاک نہیں ہوتا۔ خدا کا ذکر معرفتِ حقیقی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔

طہارت کا دوسرا درجہ یہ ہے۔ اپنے ظاہری دل کو اخلاقِ بد مثلاً حرص، کبر، ریاکاری، عداوت و غرور وغیرہ سے الگ رکھنا، تاکہ بجائے ان عاداتِ بد کے اخلاقِ حسنہ مثلاً قناعت، توبہ، صبر و تحمل، محبت و رجا پیدا ہو جائے۔ یہ درجہ متقیوں کا ہے اور بُرے اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کرنا، گویا کہ آدھا ایمان ہے۔

طہارت کا تیسرا نمبر یہ ہے کہ اپنے اعضائے ظاہری کو گناہوں سے بچایا جائے۔ مثلاً غیبت، جھوٹ، حرام خوری، خیانت و بغض نیز نامحرم عورتوں کو دیکھنا، بلکہ کارہائے دنیا میں احکام خداوندی پر عمل کرنا۔ یہ پارساؤں کا درجہ ہے۔ اعضائے جسم کو حرام کاموں سے محفوظ رکھنا "آدھا ایمان" ہے۔

طہارت ظاہری | طہارت کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے ظاہری بدن اور کپڑوں کو نجاست سے بچائے تاکہ تمام اعضائے ظاہری اور کپڑے عبادت خداوندی کے قابل رہ سکیں۔ یہ مسلمان کی طہارت کا درجہ ہے مسلمان اور کافر میں صرف نماز ہی تمیز پیدا کرتی ہے، یہ پاکیزگی بھی نصف ایمان ہے۔

طہارت دین کا ستون ہے | طہارت چونکہ ہر حیثیت سے نصف اوّل ایمان ہے۔ اس کے متعلق رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا بُنِیَ الدِّینُ عَلَی النَّظَافَۃِ (یعنی طہارت دین کی بنیاد ہے) اور ہم سب لوگ جو ظاہری جسم اور کپڑوں کی طہارت میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ طہارت کا آخری درجہ ہے۔ یہ بہت آسان بھی ہے اور نفس بھی اس سے آرام ہی پاتا ہے۔ چونکہ صفائی نفس کو بھی بھلی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے لوگ بھی ظاہری صفائی ہی کو مدِ نظر رکھتے ہیں، بلکہ انسان کی پاکیزگی اور صفائی کا اندازہ بھی ظاہری پاکیزگی سے کرتے ہیں۔ لہٰذا لوگ اس کو آسان سمجھ کر کر لیتے ہیں، لیکن درحقیقت صفائی و طہارت قلب گناہوں کی آلائش سے الگ رہنا ہے۔ جسم کی ظاہری پاکیزگی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ عوام کی نگاہیں دل کو نہیں دیکھتیں، چونکہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس کو ان سطحی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ لہٰذا دُنیا والے پاکیزگی نفس و دل کی پروا بھی نہیں کرتے۔

طہارت ظاہری کے متعلّق دلیل

طہارتِ ظاہری | طہارت ظاہری اگرچہ ہمارے بتائے ہُوئے درجات میں سب سے آخری درجہ ہے۔ لیکن اس کی فضیلت و بزرگی سب سے زیادہ اور عظیم ترین ہے۔ بشرطیکہ آدمی آداب طہارت کو قائم رکھے۔ وسوسوں اور بدگمانیوں کو دل میں جگہ نہ دے۔ کیونکہ جب انسان وسوسوں اور اسراف کی حدود تک پہنچ جاتا ہے تو یہ ظاہری طہارت مکروہ ہو جاتی ہے، اور طہارت کرنے والا بھی گنہگار ہوتا ہے۔

وہ ظاہری احتیاط تو عام طور پر صُوفیوں کا طریقہ ہے کہ اپنے پاجاموں کے پائنچوں کو اوپر چڑھانا یا پگڑی باندھنا۔ پانی کے پاک ہونے کا یقین کرنا۔ اپنے لوٹے میں کسی کا ہاتھ نہ ڈالنے دینا۔ یہ باتیں بُری نہیں ہیں۔

فقہا کے لیے مناسب نہیں کہ صُوفیوں کی ان باتوں پر اعتراض کریں۔ نہ صُوفیوں کے شایانِ شان ہے۔ فقہا کی ہر بات پر معترض ہوں۔ یہ سب احتیاطیں اچھی ہی ہیں۔ لیکن ان کے لیے بھی کچھ شرائط مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

شرائط طہارت | پہلی شرط یہ ہے کہ ظاہری احتیاط برتنے میں جو وقت صرف ہو، وہ کسی اچھے کام کے کرنے سے محروم نہ کر دے۔

مثلاً اگر کسی آدمی میں علم سیکھنے کی طاقت ہے یا کسی ایسے شغل میں مشغول ہو سکتا ہے، جو معرفت خدا کا باعث ہو سکے یا مثلاً اپنے اہل و عیال کے لیے رزق کمانے میں وقت صرف کرتا ہے تاکہ غیروں کا دستِ نگر نہ رہے، اور ان مشغلوں کی وجہ سے ظاہری طہارت میں اپنا وقت صرف نہ کر سکے، تو اس کو چاہیئے بجائے طہارت کے ان کاموں میں وقت صرف کرے۔ اور یہی سبب تھا کہ صحابہ کرامؓ طہارت کی ان احتیاطوں میں مشغول نہ ہوئے بلکہ اس سے زیادہ ضروری کام، مثلاً جہاد اور کسبِ علم میں وقت لگاتے تھے۔ زمین پر نماز پڑھتے تھے بیٹھتے اور چلتے پھرتے تھے اور کھانا کھانے کے بعد اپنے ہاتھوں کو پیروں کے تلووں پر ملتے تھے۔ گھوڑے اور اونٹ کے پسینے سے نہ بچتے تھے، بہ نسبت جسم کی طہارت کے دل کی طہارت کا زیادہ خیال کرتے تھے۔

اگر کوئی آدمی مندرجہ بالا صفات کا حامل ہے، تو صُوفیوں کو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ ہاں البتہ اگر کوئی خود سستی و کاہلی کی وجہ سے آدابِ طہارت نہ بجالا سکے، تو اس کو دوسروں پر اعتراض کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ کیونکہ ایک کام کا بالکل نہ کرنا، کرنے سے بہتر ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان تکبّر و ریاکاری سے پرہیز کرے۔ ایسا آدمی جو رعونت اور ریاکاری کا عادی ہے، وہ گویا کہ دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے کہ میں طاہر و پاک ہوں، اور یہ بات ایک وقت میں اس کے لیے فخر کا باعث ہو جاتی ہے، اور یہ عادت ایک زمانے کے بعد اتنی خطرناک ہو جاتی ہے کہ وہ زمین پر ننگے پیر نہیں رکھتا اور دوسرے کے برتن اور لوٹے کو چھوتا نہیں۔ وہ اس لیے کہ لوگ مجھے ایسا کرتے دیکھ کر ذلیل سمجھنے لگیں گے۔

ایسے آدمی کا علاج یہ ہے کہ وُہ اپنے کو آزمائے، ننگے پیر چلے اور نیک راستوں کو اختیار کرے۔ اس آزمائش میں اگر اس کا نفس اس سے منع کرے، تو گویا کہ وہ ضرور "ریاکاری" ہے۔ ایسی حالت میں اس کو اپنے نفس کے خلاف ضرور ننگے پیر چلنا چاہیئے۔ اور زمین پر نماز ادا کرنا چاہیئے۔ ایسی احتیاط سے پرہیز کرے، چونکہ اس میں "ریا" شامل ہے، اور ریاکاری حرام ہے، اور جس وقت بغیر احتیاط کے چھوڑے ہوئے بھی ریاکاری سے نجات نہ مل سکے، تو اس پر اس وقت واجب ہو جاتا ہے کہ ریاکاری سے بچنے کے لیے احتیاط کو قطعی چھوڑ دے۔

تیسری شرط یہ ہے، کہ بعض اوقات تمام احتیاطوں کو چھوڑ دے اور اپنے اوپر واجب نہ سمجھے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحتِ وقت کی بنا پر ایک مشرک کے برتن سے بھی طہارت فرمائی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عورت کے برتن سے طہارت کی اور متعدد بار زمین پر نماز پڑھی حتیٰ کہ جو آدمی سونے کے لیے کوئی بستر وغیرہ نہ بچھاتا تھا۔ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ لہٰذا جو آدمی آپ کی سیرت کو چھوڑے گا نفس اس کا اس سے زیر نہ ہوگا۔

احتیاط سے نہ بچنا بھی اس کی دلیل ہے، کہ احتیاط کے نفس نے احتیاط کرنے میں کچھ عزت حاصل کر لی ہے جس کا چھوڑنا اس کے لیے دشوار ہو رہا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے، کہ ایسی احتیاط، جس سے کسی مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہو، نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ دل شکنی حرام ہے۔ ترکِ احتیاط حرام نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی سلام کے بعد معانقہ کرنا چاہے اور اس کے جسم میں پسینہ ہو، تو اس سے اس وقت بچنا قطعی ناجائز ہے۔ اِس لیے کہ اخلاقِ حسنہ اور مسلمانوں سے قربت رکھنا ہزاروں احتیاطوں سے افضل تر ہے۔

اگر کوئی آدمی کسی احتیاط والے کے سجادے پر پیر رکھ دے، یا اس کے لوٹے سے طہارت کرے، یا اس کے پیالے میں پانی پی لے، تو اس کو منع نہ کرنا چاہیے، اور نہ اس سے اظہارِ نفرت ہی کرنا اچھا ہے۔

ایک بار جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے آبِ زمزم طلب فرمایا، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ کہ اے ہمارے رسول! بہت سے آدمیوں نے اس میں ہاتھ پیر دھوئے ہیں، جس کی وجہ سے پانی گندہ ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر توقف فرمائیں، تاکہ میں خاص ڈول منگا کر پانی کھینچوں۔ حضورؐ نے جواب دیا، کہ اس احتیاط سے مسلمانوں کے ہاتھوں کی برکت کہیں زیادہ ہے۔ بہت سے "خواندہ جاہل" اس نکتے کو نہیں سمجھتے اور اپنے کو غیر محتاط لوگوں سے بچاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ لوگ رنجیدہ ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ لوگ اپنے ماں باپ اور دیگر اعزا سے لڑ بیٹھتے ہیں۔ یہ عمل بھی ان کا حرام ہے۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتیاط کرنے والے لوگ متکبر اور مغرور ہو جاتے ہیں، اور لوگوں پر احسان جتاتے ہیں۔ کہ ہم محتاط ہیں۔ وہ لوگ دوسروں سے نفرت کو اچھا سمجھتے ہیں، تاکہ اس کو تکلیف پہنچا کر اپنی طہارت پر اکڑیں، اور اس پر فخر کریں۔

وہ لوگ صحابہ کرام کے راستے پر نہیں چلتے۔ اگر کوئی آدمی "پتھر" سے استنجا کرتا ہے، تو اس کو بھی گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں بداخلاقی کی دلیل ہیں، اور دل کی نجاست کا سبب۔

بتایا جا چکا ہے کہ دل کو خباثت سے پاک رکھنا چاہیئے۔ چونکہ ان باتوں سے خباثت پیدا ہوتی ہے اور خباثت ہلاکت کا باعث ہے۔ لیکن احتیاط برتنا کسی طریقے پر بھی ہلاکت کا باعث نہیں ہو سکتا۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ کھانے پینے اور باتیں کرنے میں بھی احتیاط برتتا ہے، یا اس کی وہ عادت میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی آدمی بغیر بھوک کے کھانا کھائے، اور جب تک ہاتھ منہ نہ دھولے نماز نہ پڑھے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ اگر اس نے کسی نجس چیز کو کھایا، تو کیوں کھایا اور اگر پاک چیز کھائی تو اس کے بعد طہارت کی کیا ضرورت پیش آتی ہے

اسی طرح بعض لوگ جس کپڑے پر بیٹھتے ہیں، اس پر نماز ادا نہیں کرتا۔ لیکن دوسروں کے گھر کا کھایا ہوا کھانا کھالیتا ہے۔ حالانکہ کھانے میں ہر قسم کی زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنا ضروری ہے۔ اکثر لوگ بازاری کھانا کھاتے ہیں، مگر ان کے کپڑوں پر نماز نہیں پڑھتے۔ یہ باتیں بھی احتیاط اور طہارت کے آداب کے خلاف ہیں۔

چھٹی شرط یہ ہے، کہ جن باتوں کو شرع اسلام نے منع کر دیا ہے، اُن سے احتیاط کرے۔

طہارت کے قواعد تین بار سے زیادہ نجاست کی طہارت کرے۔ حالانکہ چوتھی بار منع ہے۔ یا اگر دوسرے مسلمان اس کا انتظار کر رہے ہوں اور وہ طہارت میں دیر لگاتا رہے۔ اسی طرح طہارت میں پانی زیادہ خرچ کرنا بھی بُرا ہے۔ فضیلت کے وقت نماز نہ پڑھنا، یا اگر امام ہے، تو اہل جماعت کو اپنا انتظار دکھانا بھی اچھا نہیں کسی مسلمان سے وعدہ خلافی کرنا، یا وعدہ خلافی کی وجہ سے کسی مسلمان کا روزگار خطرے میں پڑ جائے، جس سے اس کے اہل و عیال کو نقصان پہنچے۔ ایسے کاموں میں احتیاط اچھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح لوگوں سے بچنے کے لیے اپنا مصلّی زیادہ بڑا بچھائے۔ تاکہ دوسرے اس سے دُور رہ سکیں۔ ایسی حالت کو تین باتوں کی وجہ سے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

پہلی تو یہ کہ اس نے دوسرے مسلمانوں کا حصہ غصب کر کے اپنا مصلّی بڑا بچھایا۔ حالانکہ اس کا حصہ صرف اتنا ہی تھا کہ وہ بکفایت سجدہ کر سکے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بڑا مصلّی بچھانے کے بعد دوسرے آدمی برابر کھڑے ہو کر نماز نہیں ادا کر سکتے، حالانکہ سنت یہ ہے کہ دوش بدوش نماز پڑھیں۔

سوم یہ ہے کہ اس حرکت میں نفرت و غرور پایا جاتا ہے، جس طرح کتے اور نجاست سے نفرت کرتے اور بچتے ہیں۔ اور یہ بات اچھی نہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے امور منع ہیں، جو لوگ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی کر جاتے ہیں اور ان کو منکرات و منہیات نہیں سمجھتے۔

طہارت باطنی

جب تم نے سمجھ لیا، کہ طہارت باطنی و ظاہری دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، تو اب طہارت باطنی

کی قسمیں بھی بتائی جاتی ہیں۔

طہارت باطنی کی تین قسمیں ہیں :

باطنی طہارت | اوّل — گناہوں سے اعضائے جسم کو پاک رکھنا۔

دوم — اخلاقِ بد سے دل کو الگ رکھنا۔

سوم — خُدا کے علاوہ دُنیا میں کسی چیز سے دل نہ لگانا۔

اسی طرح طہارتِ ظاہری بھی تین قسموں پر منقسم ہے :

اوّل — نجاسات سے طہارت

دوم — (حدث) ناپاکی اور جنابت سے طہارت

سوم — جسم میں بڑھنے والی چیزوں سے الگ رہنا، جیسے بال، ناخن اور میل وغیرہ۔

اب ہم ظاہری و باطنی طہارتوں کی تفصیل بیان کریں گے جو اوپر لکھی گئی ہیں۔

اوّل طہارتِ ظاہری کی تینوں اقسام سمجھاتے ہیں :

پہلی قسم

نجاسات ظاہری سے طہارت کے طریقے

خداوندِ عالم نے جو چیزیں جمادات سے بنائی ہیں، اُن میں علاوہ شراب کے سب پاک ہیں، شراب چاہے تھوڑی ہو یا بہت، وہ بہرحال نجس ہے۔ اسی طرح تمام جانور علاوہ سؤر اور کتّے کے پاک ہیں، لیکن مرنے کے بعد ہر جانور نجس ہو جاتا ہے۔ اس میں بعض جانور ایسے بھی ہیں جو مرنے کے بعد نجس نہیں ہوتے۔ مثلاً انسان، مچھلی اور ٹڈی، یا وہ جانور جن کے جسم سے خون نہیں نکلتا، اُن میں مکھی، بچھو اور بھڑ وغیرہ یا وہ کیڑے جو کھانے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو جانور کے کھانے کے بعد متغیر ہو گئی ہو، نجس ہوتی ہے۔ لیکن وہ دراصل "جوہر" کے متعلق ہی ہے۔ مثلاً منی یا انڈا اور ریشم کے اندر کا کیڑا، اور وہ چیزیں جو متغیر نہ ہوں مثلاً پسینہ یا آنسو، یہ پاک ہیں۔

جو چیزیں ناپاک ہیں، اُن سے نماز درست نہیں، لیکن اس کی بھی شرائط ہیں۔ اُن میں پانچ قسم کی نجاستیں مُعاف ہیں۔

پہلے وہ پیشاب کا اثر جو تین استنجوں کے ڈھیلوں کے بعد بھی رہ جائے، بشرطیکہ وہ قطرات زیادہ نہ پھیل جائیں۔

دوم، راستے کی وہ کیچڑ، جس میں یقینی طور پر بھی نجاست شامل ہو کہ باوجود اپنے کو محفوظ رکھنے کے بھی

لگ گئی ہو، مگر وہ کیچڑ اتنی نہ ہونا چاہیئے کہ آدمی کیچڑ میں گر کر لت پت ہو جائے، یا کوئی جانور اس کے کپڑے خراب کر دے۔ اگر یہ باتیں کبھی کبھی ہی پیش آئی ہیں، لیکن یہ نجاست پاک قرار نہیں دی گئی۔

سوم۔ وہ گندگی جو بچنے کے باوجود بھی آدمی کے موزے پر لگ گئی ہو۔ ایسے وقت زمین پر موزے کو رگڑ کر نماز ادا کر سکتا ہے۔

چہارم۔ پسوؤں کا خون جو کپڑوں پر لگ جائے، ہر حالت میں معاف ہے۔

پنجم۔ وہ پانی جو پھوڑوں اور پھنسیوں سے سرخی مائل نکلے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کے جسم کے اندر وہ موجود ہے۔ اسی طرح خارش کے دانوں سے جو پانی نکلے، وہ بھی معاف ہے۔ لیکن اگر کسی پھوڑے سے پیپ خون نکلے تو اس کا دھونا ضروری ہے، اور اگر اس کو دھونے کے بعد بھی اثرات باقی رہ جائیں تو معاف ہو جانے کی امید ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے فصد کھلوائی ہو یا کوئی زخم ہو گیا ہو، تو اس کی صفائی واجب ہے اور اگر صفائی کے بعد بھی اس کا اثر رہ جائے، نیز بالکل صفائی میں اس کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو، تو نماز قضا کر دی جائے، کیونکہ ایسے واقعات شاذ و نادر پیش آتے ہیں۔

تفصیلات

ناقابلِ منتقل جگہ پانی سے ایک بار دھونے کے بعد پاک ہو جاتی ہے، لیکن اگر عین نجاست ہے تو اس کو اتنا دھونا چاہیئے کہ بالکل نجاست کا نام نہ رہ سکے، لیکن نجاست کو کھرچنے کے بعد بھی اگر اس کا رنگ یا بُو باقی رہ جائے، تو وہ پاک ہی ہو گی۔

پانی ہر قسم کا پاک ہے، سوائے حسبِ ذیل چار قسم کے پانی کے۔

پہلے، وہ پانی جس سے وضو وغیرہ کیا گیا ہو، وہ پانی خود تو پاک ہے، لیکن دوسری چیزوں کو پاک نہیں کرتا

دوسرے۔ وہ پانی جس سے نجاست دھوئی گئی ہو، وہ پانی نہ خود ہی پاک ہے اور نہ دوسری چیز کو پاک کر سکتا ہے، لیکن اگر اس کا رنگ "بو" اور مزہ نہ بدلے، تو البتہ پاک ہی ہو گا۔

سوم، وہ پانی جس کا وزن ڈھائی سو من سے کم ہو، اور اس میں نجاست جا پڑے، چاہے اس کا رنگ بھی متغیر نہ ہوا ہو، نجس ہو گا۔

لیکن امام شافعی رحمتہ اللہ کے قول کے مطابق اگر پانی کا وزن مندرجہ بالا مقدار سے کم ہے، لیکن نجاست کے مل جانے سے اس کا رنگ و بُو تبدیل نہ ہوا ہو، تو وہ پاک ہے۔

چہارم، وہ پانی جس کا رنگ و بو بے مزہ، کسی پاک چیز کے مل جانے کی وجہ سے تبدیل ہو جائے جیسے زعفران صابون یا آٹا وغیرہ۔ یہ پانی بذاتِ خود تو پاک ہو گا، لیکن کسی دوسری چیز کو پاک کرنے کی اہلیت اس میں نہ ہو گی۔

لیکن اگر زیادہ تغیر نہ ہوا ہو، تو پاک بھی کر سکتا ہے۔

دوسری قسم

طہارت حدث کے بیان میں

اس کے لیے پانچ باتوں کا سمجھنا ضروری ہے۔

اوّل۔ آداب قضائے حاجت (پاخانہ پیشاب کی حاجت رفع کرنے کا اچھا طریقہ)

دوم۔ آداب استنجا (استنجا کرنے کا اچھا طریقہ)

سوم۔ آدابِ وضو

چہارم۔ آدابِ غسل

پنجم۔ آدابِ تیمم

آداب قضائے حاجت اگر جنگل ہو تو ایسی جگہ تلاش کرے، جہاں لوگوں کی نظریں نہ پڑیں، یا کسی دیوار وغیرہ کی پشت پر بیٹھے۔ لیکن بیٹھنے سے پہلے ازار بند نہ کھولے۔ چاند یا سورج کی طرف مُنہ کر کے نہ بیٹھے نیز کعبے کی طرف مُنہ یا پیٹھ بھی نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن اگر پاخانے میں یہ سب باتیں ہوں بھی تو کوئی حرج نہیں۔ مگر اچھا یہی ہے، قبلہ کی طرف پیٹھ یا مُنہ نہ ہو۔ جہاں آدمی زیادہ آتے جاتے ہوں، وہاں پاخانہ کرنا اچھا نہیں۔ پانی جہاں بہت سا جمع ہو، پھل دار درخت کے نیچے، کسی سوراخ میں، سخت زمین پر یا ہوا کے رُخ پر پیشاب نہ کرے بغیر کسی معقول وجہ کے کھڑا ہو کر پیشاب کرنا بھی اچھا نہیں ہے۔ اسی طرح وضو یا نہانے کی جگہ پر پیشاب نہ کرنا چاہیئے۔ پاخانے کے وقت بائیں پیر پر زور دے کر بیٹھنا اچھا ہے۔ جب پاخانے میں داخل ہو تو بایاں پیر اوّل رکھے۔ واپسی کے وقت داہنا پیر اوّل باہر نکالے۔ ایسی چیز پاخانہ کرتے وقت ساتھ نہ ہونا چاہیئے۔ جس پر خدا کا نام لکھا ہو۔ جس وقت پاخانے میں داخل ہو، تو حسبِ ذیل دُعا پڑھے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الرِّجْسِ النَّجِسِ الْخَبِیْثِ الْمُخْبِثِ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت یہ پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَبْقٰی فِیْ جَسَدِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ

دوم۔ **آداب استنجا** پاخانے سے پہلے پتھر یا مٹّی کے تین ڈھیلے اپنے پاس رکھ لے، اور فراغت کے بعد ایک ڈھیلے کو بائیں ہاتھ میں لے کر پاخانے کے مقام کے قریب خشک جگہ پر رکھ کر نجاست کی طرف کھینچے۔ اس طرح نجاست کو صاف کرے، اس طرح کہ دوسری جگہ نجاست نہ لگنے پائے۔ اسی طرح تینوں ڈھیلوں کو استعمال میں لائے۔ اگر تینوں ڈھیلوں سے بھی پاک نہ ہو سکے تو اور ڈھیلے کام میں لائے۔ یہاں تک کہ پاک ہو جائے۔ لیکن وہ تعداد کے لحاظ سے طاق ہی رہیں۔

آخر میں ایک ڈھیلا داہنے ہاتھ میں لے کر بائیں ہاتھ سے عضوِ تناسل پکڑے، اور اس کا منہ بند جگہ تین بار ڈھیلے سے مس کرے۔ یا کھڑا ہو کر کسی دیوار پر تین دفعہ یہی کر کے بائیں ہاتھ سے ہلاتا بھی رہے۔ اس وقت داہنے ہاتھ کو کام میں نہ لائے۔ صرف پاک ہونے کے لیے یہ طریقہ کافی ہوگا۔ مگر بہتر یہ ہے کہ ڈھیلوں اور پانی دونوں سے حسبِ ضرورت استنجا کرے۔ اگر پانی سے صاف کرنا ہے تو نجاست کی اس جگہ سے دوسری جگہ بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے پانی ڈالے اور بائیں ہاتھ سے اتنا ملے کہ نجاست کا کوئی اثر محسوس نہ رہے۔

لیکن نجاست دُور ہونے کے بعد اِتنا پانی نہ بہائے کہ اس کا اثر اندرونی حصے میں پہنچ سکے۔ اس لیے کہ وہ اندرونی جسم کا حصّہ نجس ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے زیادہ وہم کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈھیلے کے استعمال کے وقت تین مرتبہ عضو کے نیچے لے جا کر ہر بار جھٹکے۔ تین بار قدم رکھے اور کھنکھارتا رہے۔ اِس سے زیادہ کوشش کرنا وہم ہے۔ اگر اس کے بعد بھی اگر تری محسوس ہو تو اپنی میانی پر پانی ڈال لے، اور اس کی تری ہی کو پانی تصور کرے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اِس وہم کو دُور کرنے کے لیے یہی حکم دیا ہے۔

استنجے سے فراغت کے بعد ہاتھ کو دیوار یا زمین پر مل کر دھو ڈالے، تاکہ بُو باقی نہ رہ سکے۔ استنجے کے وقت یہ پڑھے اللّٰھُمَّ طَھِّرْ قلبی من النّفاق وحصّن فرجی من الفواحش (یعنی اے خدا! میرے دل سے نفاق کو نکال دے، اور میری شرمگاہ کو محفوظ رکھ)

سوم

آداب وضو استنجے سے فراغت کے بعد مسواک کرنا سنّت ہے۔ مسواک داہنی طرف سے شروع کرنا چاہیے۔ اوّل اوپر کے دانتوں میں بعد میں نیچے۔ اسی طرح اندر کی طرف بھی۔ دانتوں کے بعد تالو اور زبان میں مسواک کرنا چاہیے۔ اس کو بہت ضروری سمجھنا چاہیے۔ اس کے متعلق رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ہے کہ بغیر مسواک کیے ستر نمازیں پڑھنے سے افضل مسواک کرنے کے بعد ایک نماز پڑھنا ہے۔ مسواک کرتے وقت یہ نیت رہنی چاہیے، کہ عبادت خدا کے لیے یہ میرا عمل ہے۔

اگر وضو ٹوٹ جائے، تو اسی وقت دوبارہ وضو کرے، کیونکہ یہ سنّت رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ لیکن ہر وُضو کے ساتھ مسواک بھی کرے، اور بغیر منہ صاف کیے سونے کی وجہ سے منہ میں بدبُو پیدا ہو جائے، تو بھی مسواک مسواک کرنا سنّت ہے اور جس وقت مسواک سے فارغ ہو تو قبلہ رو ہو کر یہ دعا پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَّحْضُرُوْنَ۔

طریقہ وضو (دُعا کے بعد) تین دفعہ اپنے ہاتھ دھوئے اور کہتا جائے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْيُمْنَ وَالْبَرَكَةَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشُّوْمِ وَالْهَلَكَةِ۔ ساتھ ہی ساتھ نماز کی یا پاک ہونے اور نجاست کے ادا کرنے کی نیت ہونا چاہیے نیز یہ نیت ہاتھ دھونے سے لے کر منہ دھونے تک دل میں رہنا چاہیے، پھر تین دفعہ کلیاں کرے اور غرارہ بھی کرے۔

لیکن روزے میں غرارہ نہ کرنا چاہیے - اس کے بعد پڑھے اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَتِلَاوَتِ کِتَابِکَ - اس کے بعد تین بار ناک میں پانی ڈالے اور کہے اَللّٰھُمَّ اَرِحْنِیْ رَاحَةَ الْجَنَّةِ وَاَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ - اس کے بعد تین دفعہ مُنہ دھوئے اور کہے اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِیْ بِنُوْرِکَ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہُ اَوْلِیَآئِکَ منہ اس طرح دھونا چاہیے داڑھی مونچھوں کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے - اگر داڑھی کے بال زیادہ ہوں یا اس میں میل بھرا ہو تو اس پر پانی بہائے اور انگلیوں سے داڑھی کے بالوں میں خلال کرے - اسی کو تخلیل کہتے ہیں -

معلوم ہونا چاہیے کہ چہرے کے سامنے کا حصہ "ٹھڈی" سے شروع ہوتا ہے اور کانوں کے سرے سے لے کر پیشانی کے اوپر سر کے بالوں کی جڑوں تک "چہرہ" کہلاتا ہے -

آخر میں اپنی انگلیوں کو آنکھوں کے کونے میں اس طرح ملے کہ آنکھوں کا "باہری سرمہ" اگر لگا رہ گیا ہے تو صاف ہو جائے - پھر تین بار داہنے ہاتھ کو کہنی تک دھوئے - اس کے متعلق حکم ہے کہ جتنا بازوؤں تک زیادہ دھوئے گا - بہتر ہے داہنا ہاتھ دھوتے وقت یہ دُعا پڑھے - اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ کِتَابِیْ بِیَمِیْنِیْ وَحَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا - اس کے بعد اس طرح بائیں ہاتھ کو، اگر ہاتھ میں انگشتری پہنے ہو، تو اس کو گھمائے تاکہ اس کے اندر بھی جلد میں پانی پہنچ سکے - اس وقت یہ دُعا پڑھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ اَنْ تُعْطِیَنِیْ کِتَابِیْ بِشِمَالِیْ اَوْمِنْ وَّرَآءِ ظَھْرِیْ - اس کے بعد دونوں ہاتھوں کو پانی سے تر کر کے انگلیوں کے سروں کو آپس میں ملا کر سر کے اگلے حصے پر رکھے، اور رگڑتے ہوئے گدی تک لے آئے - اس طرح کہ بالوں کے دونوں رخ تر ہو جائیں -
اسی طرح تین مرتبہ عمل کرے، لیکن اس کی احتیاط کرنی چاہیے کہ ہر ہر بال تر ہو جائیں، اور یہ دُعا پڑھتا رہے - اَللّٰھُمَّ غَشِّنِیْ بِرَحْمَتِکَ وَاَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَکَاتِکَ وَاَظِلَّنِیْ تَحْتَ عَرْشِکَ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّکَ - پھر کانوں کا مسح اس طرح کرے کہ ——— تین بار کانوں کے سوراخوں میں پھیرے، اور انگوٹھوں کو کانوں کی پشت پر پھیرے اور کہے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ پھر گردن کا مسح کرے اور پڑھے - اَللّٰھُمَّ فُکَّ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ السَّلَاسِلِ وَالْاَغْلَالِ -

آخر میں داہنے پیر کو آدھی پنڈلی تک دھوئے - اور پیر کی انگلیوں میں اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے ہر طرف کے حصے میں پانی کو مس کر دے (خلال کرے) داہنے پیر کو دھوتے وقت حسب ذیل دعا پڑھے - اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْ قَدَمِیْ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ تَزِلُّ الْاَقْدَامُ فِی النَّارِ پھر بائیں پیر کو داہنے کی طرح دھوئے اور وہی عمل کرے جو پہلے کر چکا ہے - اس وقت یہ دُعا پڑھے - اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ تَزِلَّ قَدَمِیْ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ تَزِلُّ اَقْدَامُ الْمُنَافِقِیْنَ - اس کے بعد وضو ختم ہو جاتا ہے - پھر یہ دُعا پڑھے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ - اَللّٰہُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَہِّرِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنْ عِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ - اگر کوئی آدمی عربی نہ پڑھا ہو تو اس کو کوشش کرنا چاہیے کہ ان دُعاؤں کے معنی معلوم کرلے۔ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ جو آدمی طہارت کرتے وقت خداوندِ عالم کا ذکر زبان پر جاری کرتا ہے، اس کے اعضائے بدن کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور اگر طہارت کے وقت خدا کو یاد نہیں کرتا تو صرف وہ ہی جگہ پاک ہوتی ہے، جس کی طہارت کر رہا ہو۔

ہر نماز کے لیے تازہ وضو کی ضرورت ہے۔ حالانکہ سابقہ وضو ٹوٹا ہوا بھی نہ ہو۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی طہارت کرتا ہے، خداوندِ عالم اس کا ایمان تازہ کرتا ہے اور جس وقت طہارت سے فارغ ہو جائے، تو سوچنا چاہیے کہ عام لوگوں کے دیکھنے کی جگہ یہ اعضائے ظاہری ہیں۔ ان کو میں نے پاک کرلیا۔ لیکن خداوندِ عالم کے دیکھنے کی چیز "دل" ہے۔ لہٰذا اس کو بھی گناہوں سے پاک کیا جائے اور اگر دل کو پاک نہ کرے گا، تو وہ ایسا ہی ہوگا کہ کوئی آدمی "بادشاہ" کو مہمان بلائے اور دروازے کو خوب سجا دے، لیکن جہاں بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ ہو، وہ ہی گندی اور خراب ہو۔

فصل اوّل
مکروہاتِ وضو

جن چیزوں سے وضو مکروہ ہو جاتا ہے

معلوم ہونا چاہیے کہ وضو میں چھ چیزیں مکروہ ہیں:-
(۱) باتیں کرنا (۲) مُنہ پر ہاتھ مارنا (۳) ہاتھوں کو جھٹکنا (۴) دھوپ کے گرم پانی سے وضو کرنا (۵) پانی زیادہ بہانا (۶) تین دفعہ سے زیادہ ترتیب وضو میں اعضاء کو دھونا۔

وضو کے بعد چہرے کو کپڑے سے صاف کرنا، اس لیے کہ گرد نہ جمنے پائے یا چہرے کا صاف نہ کرنا کہ وضو کے اثرات دیر تک قائم رہ سکیں۔ ان دونوں صورتوں میں چہرہ خشک کرلینے کی اجازت ہے۔ بلکہ فضیلت بھی ہے۔ بہ نسبت آفتابے کے برتن سے وضو کرنا زیادہ اچھا ہے۔

فصل دوم
آدابِ غسل

صحبت کرنے، سوتے یا جاگتے میں منی کے خارج ہونے سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

ترکیب غسل واجب: غسل جنابت کی نیت کرکے تمام بدن کو اس طرح دھوئے کہ ہر موئے بدن تک پانی پہنچ جائے۔

سُنت یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر اوّل تین بار ہاتھ دھوئے۔ بعد ازاں جس جگہ نجاست لگی ہو۔

اس کو اچھی طرح دھو کر پاک کرلے۔ اس کے بعد اُوپر بتائی ترکیب کے ماتحت وضو کر کے غسل کرے۔

غسل سے فراغت کے بعد پیر دھوئے۔ پھر داہنی طرف شانے سے نیچے تک پورے جسم پر پانی ڈالے۔ اسی طرح بائیں حصے پر بھی۔ پھر تین بار سر پر پانی ڈالے اور جسم کے ہر حصے پر جہاں تک ہو سکے ہاتھوں سے ملے جو جگہیں آپس میں ملی ہوئی ہوں ان کے اندر تک پانی پہنچائے۔ اس وقت اپنے ہاتھوں کو شرمگاہ پر زیادہ پھیرنے سے پرہیز کرے۔

آداب تیمّم

تیمّم کے فرائض پانی نہ ملے۔ پانی صرف اتنا ہو کہ خود یا اپنے ساتھی ہی پی سکیں۔ پانی لانے کے راستے میں خونخوار درندہ ہو، جس سے جان کا خوف ہو۔ پانی کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو، یا وہ زیادہ قیمت میں فروخت کر رہا ہو۔ کوئی بیماری یا زخم ہو، جس کو پانی نقصان دے، یا بیماری طول پکڑنے کا ہی اندیشہ ہو۔ ایسی حالتوں میں تیمّم کرنا چاہیئے۔

تیمّم کا طریقہ نماز کا وقت جب قریب ہو، تو ایسی جگہ تلاش کرے، جہاں پاک مٹّی مل سکے۔ اوّل نماز کے مباح ہونے کی نیّت کرے۔ اس کے بعد ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر دونوں ہاتھ یکجا کر کے اس طرح مٹّی پر مارے کہ اس مٹّی سے غبار اُڑے، اور تمام چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مٹّی اس کے بالوں کو لگ جائے۔

اگر ہاتھ میں انگشتری ہو تو اس کو نکال کر دوبارہ دونوں ہاتھوں کو ایک ساتھ مٹّی پر مارے (لیکن انگلیاں کشادہ ہی رہنا چاہئیں) اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں کا پچھلا حصہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے اگلے حصے پر رکھے اور ساتھ ہی ساتھ بائیں ہاتھ کی انگلیاں داہنے ہاتھ کی کلائی کی پشت پر کہنی تک پھیرے۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ کی ہتھیلی داہنے ہاتھ کی کلائی کے اوپر پھیرے۔ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا، داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کی پُشت پر پھیرے اس کے بعد اسی طرح داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر پھیرے۔ پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ایک دوسری کے ساتھ ملے اور انگلیوں کو ایک دوسری کے اندر سے گزارے اور ملے۔

اِس کے متعلق مٹّی پر ایک ہی ضرب کافی ہوتی ہے۔ اور اگر مٹّی ہاتھوں میں زیادہ نہ لگ سکی ہو، تو دوسری ضرب بھی لگا سکتا ہے تاکہ تیمّم کی مٹّی ہاتھ اور کہنیوں میں لگ سکے۔

ھدایت :- ایک تیمّم سے ایک ہی نماز واجب ادا ہو سکتی ہے۔ دوسری واجب نماز کے لیے دوبارہ تیمّم ضروری ہے، لیکن ایک تیمّم سے نماز سنّت چاہے جتنی ادا کر سکتا ہے۔

قسم سوم

طہارت نجاساتِ بدن

بدن کے فضلات کی طہارت دو قسم پر مبنی ہے۔

اوّل اس میل کی طہارت جو سر اور داڑھی میں لگا ہو۔ ایسا میل کنگھی، پانی، مٹی یا گرم پانی ہی سے صاف ہوتا ہے۔ یہ چیزیں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سفر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

میل کی گندگی سے پرہیز کرنا اور صاف رہنا سنّت ہے۔ آنکھوں کے کونے کے میل کو وُضو کے وقت صاف کر دینا ضروری ہے۔

دوم کانوں کا میل بھی نہانے کے بعد اُنگلیوں سے صاف کر دینا چاہیئے۔ اسی طرح دانتوں کا میل مسواک اور غرارے سے صاف کر دینا چاہیئے۔ ناک کا میل بھی انگلیوں کے ذریعہ نکال دینا چاہیے۔ انگلیوں کے درمیان (گھائیوں) میں جو میل جمع ہو جاتا ہے، اس کو مل کر صاف کر دینا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح پَیر کے تلوؤں اور ناخنوں کے اندر کے میل کی صفائی ضروری ہے۔

جسم کے ہر حصّے کا میل صاف کرنا سنّتِ رسُولؐ ہے، لیکن اگر ایسی جگہ میل جمع ہو جہاں کھال تک پانی پہنچ سکتا ہے تو اس میل سے طہارت ہو جاتی ہے، لیکن اگر ناخنوں کے اندر زیادہ میل یا مٹی بھر جائے گی تو یقیناً پانی ناخنوں کی کھال تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ اس میل کو گرم پانی سے صاف کرنا سنّت ہے۔

آدابِ حمام

حمام میں نہانے کے طریقے نہاتے وقت حمام جانے والے کے لیے دس باتیں سنت اور چار واجب ہیں۔

واجبات میں سے دو تو حمام جانے والے کی شرمگاہ سے متعلّق ہیں۔

پہلے یہ کہ وہ ناف سے زانوں تک دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرے اور کسی کے ہاتھ کو مس نہ ہونے دے۔ کیونکہ ہاتھ لگنا دیکھنے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔

دوم یہ کہ اپنی آنکھوں کو بھی دوسروں کو عریاں دیکھنے سے بھی بچائے۔ اگر کوئی اپنی شرمگاہ کو ننگا کر دے تو اس کو روکنا چاہیئے، اگر نہ روکے گا تو گنہگار ہوگا، اور گنہگاری کی حالت میں حمام سے باہر آئے گا۔

بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ "حمام" میں آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے۔ اُن کا یہ عمل صرف پرہیز کی بناء پر تھا۔

اِسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے۔ اوّل تو انھیں حمام میں جانا ہی منع ہے۔ لیکن مجبوری میں وہ ایسا کر سکتی ہیں۔

ترکیب حمام

پہلے نیت کرے کہ برائے پاک ہونے اور دُور ہونے حدث کے سنّت کو بجالاتا ہوں، تاکہ نماز پڑھنے کے لائق ہو جاؤں۔ اس نیت یا حمام میں جانا لوگوں پر ظاہر ہونا مقصود نہیں ہے۔

نہانے سے پہلے حمام کی اُجرت ادا کر دینا چاہیئے تاکہ صاحبِ حمام کے دل میں کسی قسم کی کراہت پیدا نہ ہو اور وہ بخوشی نہلائے، اور وہ اُجرت کی مقدار سے خوش ہو جائے۔

حمام میں داخل ہونے کا طریقہ حمام میں داخل ہونے وقت پہلے بایاں پیر اندر داخل کرے اور پڑھے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الرِّجْسِ النَّجَسِ الْخَبِیْثِ الْمُخْبِثِ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

چونکہ وہ جگہ شیطانی رہی ہے کوشش کرے کہ ایسے وقت پہنچے، جب کہ حمام خالی ملے۔ حمام میں جو جگہ گرم ہو ایک دم وہاں نہ جانا چاہیئے، یہاں تک کہ اچھی طرح پسینہ آجائے۔

حمام میں داخلے کے بعد فوراً اپنے جسم کو ظاہر کرلے اور فوراً نہانے کی کوشش کرے کہ پانی کم ہی خرچ ہو تاکہ حمام والے کو ناگوار نہ گزرے۔ جس وقت حمام خانے میں داخل ہو، تو سلام نہ کرے۔ مصافحہ کرنے میں البتہ کوئی مضائقہ نہیں۔

اگر دوسرا سلام کرے تو جواب دے "عافاک اللہ" زیادہ بیکار باتیں نہ بنانا چاہئیں۔

قرآن شریف آہستہ پڑھنا چاہیئے۔

شیطان سے پناہ مانگنے کے لیے باآواز بلند لاحول پڑھنا چاہیئے۔

سُورج غروب ہوتے وقت یا مغرب وعشاء کی نماز کے درمیانی وقت میں حمام جانا منع ہے۔ یہ وقت شیطان کے اِنتشار کا ہے۔

جس وقت حمام میں پہنچکر گرمی محسوس ہو تو دوزخ کی آگ کو یاد کرنا چاہیئے۔

حمام میں ایک گھنٹے سے زیادہ نہ رہنا چاہیئے۔ اس وقت خیال کرے کہ دوزخ کی آگ میں انتہائی مدّت تک کیسے رہ سکے گا؟

سمجھدار آدمی وہ ہے جو دُنیا کی موجودات کو دیکھ کر آخرت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ مثلاً

تاریکی دنیا کو دیکھ کر "قبر" کا اندھیرا یاد کرے۔

سانپ کو دیکھ کر قبر کے اژدھوں کا خیال کرے۔

بدہئیت اشکال کو دیکھ کر منکر نکیر اور رسانانِ دوزخ کا تصوّر کرے۔

ڈراؤنی آوازوں کو سن کر نفخ سور (جو قیامت میں پھونکا جائے گا) کو یاد کرے۔

عزت و ذلت کے مقابلے میں دوزخ و جنت کے مابین تفاوت کرے۔

یہ تمام باتیں شریعت میں سنت ہیں طبیبوں کا خیال ہے کہ مہینے میں کم از کم ایک بار "چونا"[1] استعمال کر لینا چاہیئے۔ اسی طرح حمام سے باہر نکلتے وقت اپنے پیروں پر ٹھنڈا پانی ڈال لینا چاہیے۔ اس عمل سے نقرس کی بیماری قریب نہیں آتی۔ نیز یہ عمل دردِ سر کے لیے بھی مفید ہے۔

ٹھنڈا پانی سر پر ڈالنا مضر ہے۔ گرمی کے زمانے میں نہانے کے بعد سو رہنا اچھا ہے۔

فضلاتِ بدن

جسم سے نجاسات و فضلات دُور کرنا بھی نفاست و طہارت کی ایک قسم ہے۔

فضلات بدن سے پرہیز سات قسم پر مبنی ہے۔

اوّل ۔ سر کا منڈوانا بہتر ہے۔ اس سے سر میں تیل جمع نہیں ہوتا۔ لیکن اہلِ سادات کے لیے بالوں کا رکھنا اچھا ہے۔ سر کے کچھ بال منڈوا دینا یا فوجیوں کی طرح بالوں کو بکھیرے رکھنا مکروہ ہے۔

دوم ۔ مونچھوں کا لب کے برابر رکھنا سنت ہے۔ زیادہ بڑھا دینا منع ہے۔

سوم ۔ بغلوں کے بالوں کو زیادہ سے زیادہ چالیس روز میں اکھاڑ دینا (اگر عادت اکھاڑنے کی ہو) چاہیے۔ ورنہ مونڈ دینا چاہیئے۔

چہارم ۔ شرمگاہ سے بالوں کو بھی زیادہ سے زیادہ چالیس روز میں صاف کرنا ضروری ہے۔

پنجم ۔ ناخن کاٹنا، تاکہ میل جمع نہ ہو سکے۔ لیکن ناخنوں کے اندر میل جمع ہونے سے طہارت باطل نہیں ہوتی۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے بڑھے ہوئے ناخنوں میں میل جمع دیکھا، تو انھیں کاٹنے کے لیے حکم دیا، لیکن نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ناخن جب بڑھ جاتے ہیں تو شیطان کو رہنے کی جگہ مل جاتی ہے۔

ناخن کاٹنے میں بڑی انگلی سے ابتدا کرنا چاہیئے۔ پیروں سے پہلے ہاتھوں کے ناخن کاٹنا اچھا ہے اور اوّل داہنے ہاتھ کے ناخن کاٹنا چاہئیں۔ چونکہ ہمارے ہاتھ میں انگشت شہادت سب میں افضل ہے۔ لہٰذا اس انگلی کے ناخن اوّل کاٹنا اچھا ہے اور اگر دونوں ہاتھوں کو ملا کر ایک دائرہ بنا لیا جائے۔ تو علی الترتیب چھنگلیا سے کاٹنا چاہئیں۔ اوّل داہنے ہاتھ کے بعد میں بائیں کے۔

ششم ۔ ولادت کے وقت "ناف" کاٹنا۔

---

[1] اس زمانے میں جسم کے اندرونی بال چونے کے ذریعے صاف کیے جاتے تھے۔ لہٰذا یہاں چونہ ہی لکھا گیا ہے، لیکن اب استرہ استعمال ہوتا ہے

ہفتم - مرد اور عورت کا ختنہ کرنا

آداب ریش

داڑھی کے بیان میں

اگر "داڑھی ایک مشت سے زیادہ ہو جائے، تو اس کو تراش دینا اچھا ہے۔ حد سے زیادہ رکھنا بھی اچھا نہیں — ابنِ عمر رضی اللہ عنہ، اور اُن کے تابعین نے ایسا کیا ہے۔

لیکن ایک گروہ داڑھی کو زیادہ بڑھانا ہی اچھا سمجھتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ داڑھی کے لیے دس چیزیں مکروہ قرار دی گئی ہیں۔

۱ - سیاہ خضاب لگانا - حدیث میں وارد ہوا ہے کہ "سیاہ خضاب" دوزخی اور کفّار کا خضاب ہے۔ سیاہ خضاب سب سے پہلے فرعون نے لگایا تھا - ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخری زمانے کے لوگ سیاہ خضاب استعمال کریں گے، لیکن وہ بہشت میں نہ جا سکیں گے۔

حدیث میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ بدترین بوڑھا وہ ہے، جو اپنے جوان کی مثل بنانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح بہترین جوان وہ ہے، جو اپنے کو بوڑھوں کی مثل بنانے کی کوشش کرے۔ خضاب کے منع کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ بُری خواہشات کا سبب بنتا ہے۔

۲ - داڑھی کو گندھک لگا کر سفید کرنا، تاکہ لوگ بزرگ سمجھ کر اس کی تعظیم و تکریم کریں۔ یہ عملی قطعی بیوقوفی کی علامت ہے۔ کیونکہ بزرگی و عزّت عقل اور علم پر مبنی ہے، نہ کہ بڑھاپے اور جوانی پر۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں، کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی، تو اس وقت حضورؐ کی ریش اقدس میں بیس بالوں سے زیادہ سفید نہ تھے۔

۳ - غازیانِ دین کے لیے سُرخ و زرد خضاب سنّت ہے، تاکہ کفّار اُن سے ڈریں۔ اسی وجہ سے بعض علماء خضاب لگاتے ہیں، لیکن اگر اس کی غرض و غایت یہ نہ ہو تو ناجائز ہے۔

۴ - داڑھی کے سفید بالوں کو اکھاڑنا اور ننگ و عار سمجھنا - ایسا ہی ہے جیسا کہ خدا کی بخشش کو ننگ و عار سمجھنا۔

۵ - ہوس اور خواہش کے ماتحت جوانی میں بالوں کا اکھاڑنا، تاکہ شکل بغیر ریش معلوم ہو، یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ یہ خداوندِ عالم کی تسبیح ہے - سُبحَانَ مَنْ زَیَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحٰی وَزَیَّنَ النِّسَآءَ بِالذَّوَائِبِ (یعنی پاک ہے اس کی ذات جس نے مردوں کو داڑھی اور عورتوں کو بال عنایت فرمائے)۔

۶ - کبوتر کی دم کی طرح داڑھی تراشنا اچھا نہیں، تاکہ وہ اُن کی نگاہوں میں اچھا معلوم ہو، اور عورتیں

رغبت کی نگاہ سے دیکھیں

۷ - سر کے بالوں کو داڑھی سے زیادہ بڑھانا۔ یا سر کے بالوں کو کانوں سے نیچے لٹکانا قطعی پرہیزگاروں کے خلاف ہے۔

۸ - داڑھی کی سفیدی و سیاہی کو حیرت سے دیکھنا۔ چونکہ خداوندِ عالم اس آدمی کو دوست نہیں رکھتا، جو اپنے کو حیران کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

۹ - داڑھی میں کنگھی کرنا ثواب ہے، لیکن اس کی غرض و غایت سنگھار ہو تو ناجائز۔

۱۰ - اپنے کو متقی جتلانے کے لیے داڑھی کے بالوں کو اُلجھا ہوا رکھنا، تاکہ لوگ اس کو بے نیاز سمجھنے لگیں۔

چوتھا اصول

باب الصلوٰۃ

نمازِ پنجگانہ پہلے اس باب کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ نماز "دینِ اسلام" کا ستون اور بنیاد ہے۔ نیز دیگر تمام عبادات سے بہتر ہے، جو آدمی پنجگانہ نماز، پابندیٔ وقت و فرائضِ شریعت کے مطابق ادا کرے گا۔ خداوندِ عالم نے اس کو اپنی حمایت میں لینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اگر آدمی گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کرتا رہے، تو گناہانِ صغیرہ اس کی نماز کے سبب بخش دیے جائیں گے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پنجگانہ نماز ایک صاف و شفاف نہر کی مثل ہے۔ جو کسی مکان کے آگے بہہ رہی ہو، اور اس کا مکیں پانچوں وقت اس میں نہاتا ہو، تو کیا ممکن ہے کہ انسان پانچ بار نہائے اور اس کے جسم پر میل کا کوئی امکان باقی رہ جائے، تو صحابہؓ نے جواب دیا کہ حضور کا ارشاد درست ہے تب ارشاد ہوا کہ اسی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ پنجگانہ نماز آدمی کے گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح نہر کا پانی آدمی کا میل صاف کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے جس نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس نے اپنا دین کھو دیا۔ لوگوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ دنیا میں افضل ترین عمل کیا ہے تو جواب دیا کہ وقت پر نماز ادا کرنا۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ نماز جنت کی کنجی ہے۔ خداوندِ عالم نے اپنی توحید کے بعد "بندوں پر" نماز کو فرض ترین قرار دیا ہے۔ اگر اس کے نزدیک نماز سے بہتر کوئی اور عمل ہوتا، تو اپنے فرشتوں کو اسی عمل میں مشغول رکھتا معلوم ہونا چاہیے، کہ فرشتے ہمہ وقت نماز میں مشغول رہتے ہیں۔ اُن میں ایک گروہ ہر وقت رکوع میں مشغول رہتا ہے اور ایک قعود میں - اسی طرح ایک حالت سجود میں ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ جس آدمی نے ارادتاً نماز چھوڑی، وہ قریب اس بات کے ہے کہ اس کے ایمان میں خلل آجائے اور کافر ہو جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی آدمی کا پانی جنگل میں گر جائے اور وہ پیاس سے ہلاک ہو جائے۔ یا نزدیک ہلاکت

کے ہو جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق ہی بازپرس کی جائے گی۔

اگر ارکانِ نماز ہر طرح پورے ہوں گے تو درگاہ ایزدی میں مقبول ہو گی۔ بقیہ اعمال جس طرح آدمی کرتا ہے من وعن قبول بارگاہ ہو جائیں گے۔ لیکن اگر نماز میں کوئی نقص ہو گا۔ تو باقی اعمال کے ساتھ اس کے منہ پر مار دیئے جائیں گے۔

ہمارے رسولِ مقبولؐ کا حکم ہے کہ جو آدمی طہارت صحیح کرتا ہے۔ نماز وقت پر ادا کر سکتا ہے۔ رکوع و سجود صحیح بجالاتا ہے۔ حالتِ نماز میں عاجزی برتتا ہے۔ پس اس کی نماز عرش تک روشن و منور چلی جاتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ خداوندِ عالم تجھ کو امان میں رکھے، جیسا کہ تو نے مجھے حکم کے مُطابق ادا کیا۔

جو آدمی نماز وقت پر ادا نہیں کرتا، یا ارکانِ نماز خضوع و خشوع کے ساتھ نہیں بجالاتا، اس کی نماز بارگاہِ ایزدی تک سیاہ ہو کر جاتی ہے اور کہتی ہے کہ جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا اسی طرح خدا تجھ کو سزا دے۔ اور اسی طرح کہتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ گودڑ میں لپیٹ کر اس کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔

ارشادِ نبوی ہے کہ سب سے بڑا چور نماز کا چور ہے، جو بے نمازی ہے۔

ارکانِ ظاہری

ترکیب و آدابِ نماز

ادائیگی نماز کے طریقے معلوم ہونا چاہیئے کہ نماز کے ارکان ظاہری انسان کے جسم کی مثل ہیں۔ اسی طرح اس کا باطن بھی ہے، جو انسان کی رُوح کی مثل ہے۔

پہلے نماز کے ظاہری ارکان لکھے جاتے ہیں:

اپنے بدن اور کپڑوں کو بخوبی طاہر کرنے کے بعد اپنے ستر کو ڈھانپ لے اور پاک جگہ پر قبلہ رُخ اس طرح کھڑا ہو کر سیدھی رہے۔ دونوں پیروں کے درمیان کم از کم چار اُنگل کا فاصلہ رکھے، سر کو ذرا جھکا رکھے۔ نگاہوں کو سجدہ گاہ کے اوپر جمائے رکھے۔

بتائے ہوئے طریقوں پر جب کھڑا ہو جائے تو قل اعوذ برب الناس پڑھے تاکہ شیطان دور ہو جائے۔ اگر اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے بھی ہوں تو باآواز بلند بانگ صلوٰۃ کہے اور اگر نہ ہوں تو تکبیر کہے۔ نماز کی نیت کو دل میں رکھے رہنا ایسے مثلاً ظہر کی نماز واجب ادا کرتا ہوں اور جب اُن الفاظ کے نقوش دل میں اُبھر آئیں تو اس وقت کانوں تک دونوں ہاتھ اس طرح لے جائے کہ اُنگلیوں کے سرے کانوں سے لگ جائیں، اور انگوٹھوں کے سرے کانوں کی لَو کے برابر ہوں۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کندھوں کے برابر ہوں۔ جب ہاتھ اس طرح کانوں تک پہنچ جائیں، تو "اللہ اکبر" کہے۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ سینے کے نیچے اس طرح باندھ لے کہ داہنا ہاتھ اوپر ہو، اور داہنے ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی اور انگشت شہادت بائیں ہاتھ کی کلائی کی پشت پر رکھا جائے۔ باقی

انگلیوں سے بائیں کلائی کو پکڑے۔

(ہدایت) تکبیر کہنے کے بعد ہاتھوں کو سیدھا نہ چھوڑنا چاہیے، بلکہ ہاتھوں کو فوراً باندھ لینا چاہیئے۔ اس کے بعد ہاتھوں کو اِدھر اُدھر نہ لے جائے۔ تکبیر زیادہ زور دے کر نہ کہنا چاہیئے، کہ اللہ کہنے میں بجائے پیش کے واو پیدا ہو جائے، یا اکبر کہنے میں الف کی آواز نکلے، جیسے اکبر کے بجائے "اکبار" زبان سے نکل جائے بلکہ جس طرح عام اوقات میں "اللہ اکبر" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نماز میں ادا کرنا چاہیے۔ ہاتھ باندھنے کے بعد کہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَّالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا۔ اس کے بعد اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ پڑھے اور اس کے بعد کہے سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اس کے بعد الحمد پڑھے۔ تشدیدوں کو بخوبی ادا کرنا چاہیئے۔ حروف کی ادائیگی میں اس طرح زور نہ دے کہ بگڑ جائیں۔ حتّٰی کہ 'ض' اور 'ظ' کی قرأت میں فرق ہو جائے لیکن اگر فرق نہ ہو سکے تو بھی نماز ہو جاتی ہے سورہ حمد ختم ہونے پر نامعلوم وقفے کے بعد 'آمین' کہے۔ پھر کوئی دوسری صورت پڑھے۔ اس کے متعلق اختیار ہے کہ جہاں تک چاہے پڑھے۔

ہدایت:- اگر نماز جماعت نہ پڑھ رہا ہو تو صبح کی پوری نماز مغرب اور عشاء کی دو پہلی رکعات پکار کر پڑھے۔

اس کے بعد تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے۔ یہ تکبیر بھی اتنی جلدی نہ کہے کہ سورت کا آخری حرف تکبیر سے مل جائے۔ اس تکبیر کے کہتے وقت بھی پہلے کی طرح کانوں تک ہاتھوں کو اُٹھائے۔

بعد ازاں رکوع میں اس طرح جھک کر کھڑا ہو کہ دونوں ہتھیلیاں دونوں زانوؤں پر رکھے۔ انگلیاں قبلہ رُخ ہونا چاہئیں۔ ایک زانو کو دوسرے سے الگ رکھے پشت اور سر سیدھا ہونا چاہیئے۔ ایسے جیسے "ل" کی شکل۔ دونوں بازوؤں کو پہلوؤں سے الگ رکھے، لیکن "عورت" اپنے بازوؤں کو پہلو سے ملائے رکھے۔ اس طرح جھکنے کے بعد تین بار سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ کہے، اور اگر امام نہ ہو تو سات بار پڑھے۔ دس بار تک پڑھنا افضل ہے۔ اس کے بعد رکوع سے اُٹھ کر سیدھا کھڑا ہو جائے اور کہے رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مِلْاءَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمِلْاءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدَہٗ۔

قنوت صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا چاہیے، اور تکبیر کہہ کر سجدے میں چلا جائے

سجدے کا طریقہ: جو عضو زمین سے زیادہ قریب ہو، اوّل اُسے ہی زمین پر رکھنا چاہیئے۔ پہلے گھٹنے پھر ہاتھ بعد میں پیشانی اور ناک دونوں ہاتھوں کو کاندھوں کے برابر زمین پر رکھے۔ اُنگلیاں کھلی ہونا چاہئیں۔ کلائیاں اور کہنیاں زمین سے ٹیکنا نہیں چاہئیں۔ پہلو، بازو، ران اور پیٹ سب بھیلے ہوتے ہونے چاہئیں، لیکن عورت

کو اس عمل کے خلاف ہر عضو کو سمیٹ کر رکھنا چاہیئے۔

دعائے سجدہ : مندرجہ بالا طریقے پر سجدے میں جھک کر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ تین بار کہے۔ اگر امام نہ ہو، تو زیادہ مرتبہ کہنا اچھا ہے۔ اس کے بعد تکبیر کہہ کر سجدے سے سر اٹھالے۔

سجدے سے اُٹھ کر بائیں پیر پر بیٹھے، اور دونوں ہاتھ دونوں رانوں پر رکھ کر کہے رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَاعْفُ عَنِّیْ وَعَافِنِیْ اس کے بعد پھر سجدے میں چلا جائے اور پہلے کی طرح تکبیر کہہ کر اُٹھ کھڑا ہو جائے اور پہلے کی طرح دوسری رکعت ادا کرے، مگر اعوذ باللہ کو الحمد سے پڑھے۔ دوسری رکعت کے سجدے سے فراغت کے بعد بائیں پیر پر تشہد کے لیے بیٹھے، جس طرح سجدوں کے درمیان بیٹھا تھا لیکن بائیں ہاتھ کی اُنگلیوں کو بند کر لے، لیکن انگشت شہادت کھلی ہی رہنا چاہیے۔ جب کلمہ شہادت پڑھے تو اِلَّا اللہ کہتے وقت اُنگلی سے اِشارہ کرے، لیکن لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہتے وقت کوئی اِشارہ نہ کرے۔ انگوٹھا بھی کھلا چھوڑ دینا بُرا نہیں اسی طرح دوسرا تشہد بھی پڑھے۔

بیٹھنے کا طریقہ | بیٹھنے کے وقت پیر کو نیچے سے باہر کی طرف نکال دے اور بائیں چوتڑ کو زمین پر رکھے۔

تشہد | پہلے تشہد میں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کہنے کے بعد کھڑا ہو جائے اور دوسرا تشہد اور دیگر ادعیہ معروف پڑھے۔

سلام | تشہد کے بعد چہرے کو داہنی طرف پھیرتے ہوئے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ کہے۔ اس کے بعد بائیں طرف پھیرتے ہوئے بھی سلام پڑھے۔ داہنے بائیں چہرہ صرف اتنا پھیرنا چاہیے کہ پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی صرف ایک ہی طرف کا چہرہ دیکھ سکیں۔

ختم نماز | دونوں سلاموں کے پھیرتے وقت ختم نماز کی نیت دل میں ہونا چاہیے۔ بعد ختم سلام حاضرین اور فرشتگان پر سلام کی نیت بھی ہونا چاہیے۔

مکروہاتِ نماز

نماز میں جو چیزیں مکروہ قرار دی گئی ہیں | کچھ باتیں ایسی بھی ہیں، جن سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً

الف ۔ بھوک اور پیاس کی زیادتی ہیں۔

ب ۔ قضائے حاجت اور تقاضائے بول کے وقت۔

س ۔ ہر ایسے شغل کے وقت جو نماز کے خضوع و خشوع میں فرق پیدا کر دے۔

ان کے علاوہ بھی غلط ارکان اَدا کرنے کی وجہ سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً

ا ۔ قعود میں دونوں پیروں کو ایک دوسرے سے قطعی ہلا دینا۔

۲ - ایک پیر کا اپنی جگہ سے اُٹھا لینا -

۳ - سجدے کے وقت پیروں کے سروں پر بیٹھنا ، نیز دونوں چوتڑوں پر بیٹھنا -

۴ - دونوں رانوں کا سینے سے ملا کر (اُکڑوں) بیٹھنا -

۵ - ہاتھ کا کپڑے کے نیچے رکھنا -

۶ - سجدے کے وقت کپڑے کا ہاتھ سے اِدھر اُدھر کرنا -

۷ - کپڑے پر کمر بند باندھنا -

۸ - ہاتھوں کو کھول دینا -

۹ - ہر طرف دیکھنا - اُنگلیوں کو چھوڑنا - ہر طرف کھجلانا - جمائی لینا - داڑھی کے بالوں کو چھونا -

۱۰ - سجدے کے لیے کنکریوں کو ہٹانا -

۱۱ - سجدے کی جگہ کی خاک پھونک کے ذریعہ اُڑانا -

۱۲ - اُنگلیوں کو آپس میں ملنا -

۱۳ - پیٹھ کا ٹیڑھا کرنا -

یہ تمام باتیں نماز کو مکروہ کرتی ہیں -

ارکانِ نماز واجب

ھدایت : نماز میں آنکھ ، ہاتھ اور جسم کے تمام اعضا مؤدب ہونا ضروری ہیں ، تاکہ نماز کے ارکان پوری طرح ادا ہو سکیں ، اور آخرت کے لیے توشہ بن سکے - نماز کے جن ارکان کے متعلق لکھا گیا ہے - ان میں سے چودہ فرض ہیں - (۱) نیت (۲) تکبیر (۳) قیام (۴) الحمد پڑھنا (۵) رکوع کرنا اور اس کے بعد (۶) قدرے توقف کرنا (۷) رکوع سے اُٹھنا اور (۸) پھر توقف کرنا (۹) سجدے کرنا اور درمیان میں قدرے ٹھہرنا (۱۰-۱۱) تحیات پڑھنا (۱۲) رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا (۱۳) سلام پھیرنا - اگر یہ تمام ارکان ادا کیے ہیں ، تو نماز درست ہوتی ہے -

ارکانِ نماز

آدابِ باطنی

آدابِ باطن جو انسان کے دل سے متعلق ہیں	اُوپر "ارکانِ نماز" جو بیان کیے گئے ، وہ سب ظاہری ارکان تھے - اب ہم حقیقی ارکان بیان کرتے ہیں ، جو نماز کی رُوح ہیں - معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا میں ہر چیز کے لیے دو

پہلو ہیں - ایک حقیقی ، دوسرے ظاہری -

نماز کے بھی دو پہلو ہیں ، ظاہری بدن کے ذریعے ، ارکان بتائے جا چکے - اب وہ ارکان ہیں جو تمھارے

دل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اگر نماز میں روحانی لگاؤ نہ ہو تو ایک ایسا ہی ہے جیسے مُردہ جسم ۔ اسی طرح اگر روحانی ارکان پر نماز ادا کی جائے ۔ لیکن مندرجہ بالا ظاہری ارکان ادا نہ کیے جائیں تو بھی ایسا ہے ، جیسے آدمی کی آنکھیں کھلی ہوں اور ناک و کان غائب ہوں ۔

نماز میں خضوع و خشوع ضروری و لازمی ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ جس وقت سے نماز شروع کرے اور جب تک ختم کرے ، حضوری قلب سے کام لے ، کیونکہ نماز کا اصل مقصد خداوندِ عالم کی طرف دل سے "لَو" لگانا ہے ۔ اس وقت گویا کہ تو درگاہِ خداوندی میں کھڑا ہے ۔ لٰہذا تیرے دل میں اس کا ڈر اور تعظیم ہونا ضروری ہے خداوندِ عالم اسی کے لیے ارشاد فرماتا ہے ۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (یعنی مجھے یاد کرنے کے لئے نماز پڑھو اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دُنیا میں بہت سے نمازی ایسے ہیں جنھیں نماز پڑھنے سے تکلیف ہوتی ہے ۔ کیونکہ اُن کا جسم تو نماز میں مشغول رہتا ہے ، مگر دل دنیوی آلائشوں میں ہی گھرا رہتا ہے ۔ اُن میں بہت سے ایسے ہیں کہ جن کی نماز کا کچھ ہی حصّہ اُن کے اعمال میں لکھا جاتا ہے ، وہ اس لیے کہ نماز وہ ہی بارگاہِ ایزدی

خضوع و خشوع

میں مستجاب ہوتی ہے ۔ جس میں خضوع خشوع ہو ۔ لٰہذا نماز کا وہ ہی حصّہ نمازی کے اعمال میں لکھا جائے گا ، جتنا اس نے خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کیا ہے ۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ نماز اس طرح ادا کرو ، جس طرح کوئی کسی کو رخصت کرتا ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ نماز کے وقت اپنی ذاتی خواہشات کو قطعی نکال دو ۔ بلکہ سوائے تصوّرِ خداوندی کے کوئی دوسرا خیال ذہن میں نہ ہونا چاہیئے ۔ ایک بار حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا کہ نماز کے وقت ہم آپس میں ایک دوسرے کو قطعی بھول جاتے ہیں ، کہ کون ہیں ؟ یہاں تک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے وقت مجھے نہ پہچانتے تھے ، اور نہ میں انھیں ۔ کیونکہ اس وقت خداوندِ عالم کی عظمت و بزرگی اور اس کی بارگاہ کا خوف اس قدر طاری ہوجاتا ہے کہ دوسری چیز کا خیال ہی نہیں آتا ۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جس نمازی کا خضوع خشوع نہ ہو ، خداوندِ عالم اس کی طرف دیکھتا تک نہیں ۔ حضرت خلیل اللہ جب مشغولِ نماز ہوتے تھے ، تو اُن کے دل کا جوش دو میل سے ظاہر ہوجاتا تھا ۔ جب حضور نماز میں مشغول ہوتے ، تو اتنا جوش ہوتا تھا جیسے کسی دیگ میں پانی اُبل رہا ہوتا ہے اور اس سے آواز آتی ہے ۔

حضرت علی رض کا طریقہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ ، جس وقت نماز میں مشغول ہوتے ، تو آپ کا دل لرز جاتا ۔ اور چہرے کا رنگ متغیر ہوجاتا ، اور فرماتے کہ اب امانت خداوندی اٹھانے کا وقت آگیا ہے ، جس کا بوجھ ہفت آسمان و زمین نہ اٹھا سکے ۔ جناب سفیان سوری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ بغیر خضوع و خشوع نماز بیکار ہوتی ہے ۔ جناب حسن بصری کا ارشاد ہے کہ بغیر حضورِ قلب نماز عذاب کی نزدیکی کا باعث ہے ۔ جناب معاذ ابنِ جبل رضی اللہ عنہ ، کا ارشاد ہے کہ جو آدمی نماز میں قصداً اپنے داہنے ، بائیں دیکھے ۔ اس کی نماز قبول بارگاہ

نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق حضرت ابُو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ و دیگر متعدد علماء کا خیال ہے کہ اگر صرف پہلی تکبیر میں حضورِ قلب ہو تو پوری نماز ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ فتویٰ صرف ضرورتاً ہی دیا گیا ہے۔ وہ غالباً اس لیے کہ دنیا میں ہر آدمی پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور صرف تکبیر اوّل کے وقت خضوع و خشوع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نمازی شمشیر شریعت سے محفوظ ہو گیا۔ مگر اعمال نمازی میں صرف نماز کا وہ حصہ جو حضورِ قلب سے ادا کیا گیا ہے، وہ ہی درج ہوگا۔

اتنا ضرور ہے کہ وہ آدمی جس نے تکبیر اوّل خضوع و خشوع میں ادا کی ہو، وہ اس آدمی سے بہتر ہے، جو بالکل بے نمازی ہو۔ لیکن ایسے آدمی کے لیے زیادہ خطرہ ہے، جو بہ نسبت اس آدمی کے جو قطعی بے نمازی ہے اس کے متعلق جناب حسن بصری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ایسی نماز جو بے توجہی سے پڑھی جائے۔ عذاب سے زیادہ نزدیک ہے، بلکہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے، کہ جو آدمی نماز میں خیالات فاسدہ سے پرہیز نہ کر سکتا ہو، اس کی نماز بالکل بیکار رہے۔ بلکہ وہ آدمی بارگاہِ ایزدی سے زیادہ دُور ہو جاتا ہے۔

نمازِ حقیقی لہٰذا معلوم ہوا کہ حقیقی نماز وہ ہی ہے، جس میں شروع سے آخر تک خضوع و خشوع اور حضورِ قلب رہا ہو، اور جس نماز میں صرف تکبیر اوّل کے وقت حضورِ قلب رہا ہو، اس میں ایک ہی رمق کے برابر جان ہوتی ہے، اور وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی ایک لمحے کے لیے مسلمان ہو جائے۔

اعمالِ نماز

رُوحانیت و حقیقت

معلوم ہونا چاہیے کہ نماز کی طرف بلانے والی پہلی چیز اذان ہے۔ پس جب اذان کی آواز کان میں آئے دل سے اس طرف متوجہ ہو، کاروبارِ دنیوی چھوڑ دے۔ چونکہ ہمارے اسلاف کا یہ ہی طریقہ تھا۔ مثلاً اگر کوئی لوہار ہوتا، اور ہتھوڑا اُٹھائے ہوتا، تو اذان کی آواز سُن کر فوراً چھوڑ دیتا۔ اگر موچی ہوتا، تو وہ اپنا کام چھوڑ دیتا۔ آوازِ اذان سے قیامت کی ندا کا تصور ہونا چاہیے۔ اور سمجھنا چاہیے کہ جو آدمی اذان سُن کر جلدی کرے گا بروزِ قیامت اس کے لیے وہ آواز بشارت ہوگی۔ اپنے دل کو اس وقت تول! اگر وہ آوازِ اذان سُن کر اس طرف متوجہ ہوتا ہے، تو ندائے قیامت کے وقت بھی خوش ہو کر متوجہ ہوگا۔

طہارت بر بنائے خلوص

(خلوصِ دل)

ظاہری طہارت جسم کی طہارت ہے، جو تیرے اُوپر غلاف کی شکل چڑھا ہوا ہے۔ لیکن دل کی طہارت خلوصِ نیت ہے، جو توبہ اور اخلاص سے ہوتی ہے۔ چونکہ دل ہی کے ذریعے معرفت خداوندی ہوتی ہے۔ اور نماز بھی

دل میں تعلق رکھتی ہے، اور جسم ظاہری حرف ظاہری نماز ادا کرتا ہے۔

طہارت ظاہری

(جسم ظاہر کو ڈھانپنا)

سترِ عورت سترِ عورت کے معنی یہ ہیں، کہ جو اعضائے بدن اخلاقاً پوشیدہ رکھنے چاہئیں۔ اُن کو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھا جائے، لیکن اس کی حقیقت یہ ہے کہ تیرے باطنی خیالات اچھے ہونا چاہئیں۔ اور خدا سے اُن کو پوشیدہ رکھنا چاہیئے، لیکن ظاہر ہے کہ کوئی چیز خداوندِ عالم سے پوشیدہ رکھنا ناممکن ہے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ خیالاتِ بد کو اپنے باطن سے دُور رکھا جائے، باطن کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے، اور آئندہ کے لیے قسم کرے کہ کسی گناہ کے نزدیک نہ جائے۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ (یعنی گناہوں سے توبہ کرنا، ایسا ہی ہے، جیسے کبھی گناہ ہی نہیں کیا) مقصد یہ ہے کہ توبہ سے گناہ نیست و نابُود ہو جاتے ہیں۔ اگر تو توبہ نہیں کر سکتا، تو اپنے گناہوں پر شرم کر اور خوف و خجالت ظاہر کر۔ اور اسی حالت سے خُدا کی حضوری میں حاضر ہو، جیسے کوئی قصور وار غلام اپنے مالک کے سامنے شرمسار آتا ہے۔ اور اپنی غلطیوں کی وجہ سے سر نہیں اُٹھا سکتا۔

قبلہ رُو ہونا

قبلے کی طرف مُنہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ظاہری چہرے کو قبلے کی طرف کر لیا جائے۔ درحقیقت اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے دل کے چہرے کو دنیوی مشاغل سے پھیر کر خداوندِ عالم کی طرف متوجہ کر لے تاکہ تیرا ظاہر و باطن ایک ہی جیسا ہو جائے۔

جس طرح ظاہری قبلہ ہے، اسی طرح باطنی قبلہ بھی ہے۔ جو ذات خداوند عالم ہے۔ لہٰذا دنیوی باتوں کو اس وقت دل میں جگہ دینا ایسا ہی ہوگا۔ جیسے خُدا سے روگردانی کی گئی اور جس طرح منہ کو نماز کے وقت اِدھر اُدھر کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح دل کے اِدھر اُدھر ہونے سے نماز کا مقصد حقیقی فوت ہو جاتا ہے۔ حدیث رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو۔ اس کا جسم اور دل سب کچھ خدا کی طرف رجوع ہو۔ اس کے بعد جب وہ نماز سے فارغ ہوتا ہے، تو اتنا ہی بے گناہ اور طاہر ہو جاتا ہے کہ جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو۔ اِس پر ایمان رکھنا چاہیے، کہ جس طرح ظاہری قبلے سے روگردانی میں نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دل کو خدا کے علاوہ کسی دوسری طرف رجوع کرنے سے اصل نماز نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمارا ظاہر باطن کا ایک خلاف ہے۔ لہٰذا بمقابلہ باطن کے ظاہری غلاف کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے بعد سمجھ میں آجانا چاہیئے کہ نماز کے لیے خضوع و خشوع ضروری ہے۔

قیامِ باطن

نماز کے وقت کھڑے ہونے میں رُوحانیت کی ضرورت

ظاہری قیام تو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تو اس طرح کھڑا ہو، جیسے کوئی غلام آقا کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہوتا ہے

قیامِ حقیقی یہ ہے کہ انسان کا دل (باطن) تمام حرکات باطن سے مبرّا ہو کر یک سوئی اختیار کر لے۔ خدا کی بارگاہ میں عاجزی اور درماندگی کے ساتھ عبادت (نماز) کے لیے تیار ہو۔ اس وقت قیامت کے دن کا تصور کرے، کہ وہ اس دن خدا کے سامنے اسی طرح کھڑا ہو گا جس وقت اس کے رازہائے درون پردہ آشکارا کر دیئے جائیں گے۔ پس اسی طرح اپنا ایمان ہونا چاہیے۔ کہ خدا کو ہمارا ہر بھید ہر وقت معلوم ہے۔ وہ ہماری تمام حرکات سے باخبر ہے۔ لہٰذا ہم کیوں نہ اپنے دل سے وسوسہ دنیا کو نکال دیں۔

قاعدہ ہے کہ اگر کوئی متقی انسان کسی کے طریقہ نماز کو دیکھے کہ کس طرح نماز ادا کرتا ہے، تو وہ آدمی کتنے ادب اور قاعدے کے اندر "نماز" کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ اور ظاہری خلوص کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے اس متقی و پرہیزگار ظاہری ممتحن کا لحاظ کرتا ہے۔ اور نماز کے ارکان ظاہر اچھی طرح ادا کرتا ہے۔

لیکن افسوس کہ وہ ممتحنِ حقیقی جو ہر وقت ہم کو دیکھ رہا ہے، اس کی پروا نہیں کی جاتی۔ ہیہات کہ ایک وہ انسان جو قطعی بے بس ہے اس کے قبضۂ قدرت میں دنیا کا کچھ بھی نہیں، اس سے ڈرتا ہے، لیکن وہ مالکِ السمٰوات جو دنیا کی ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی مطلق پروا نہیں۔ اس کو قطعی نگاہ میں نہیں لاتا۔

ایک بار حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کہ خداوندِ عالم سے کس طرح شرم کرنا چاہیے۔ تو جواب دیا کہ جس طرح تو اپنے گھر کے صالح متقی اور بزرگ آدمی سے شرم و حیا کرتا ہے۔

متعدد صحابہ کرام جب نماز میں کھڑے ہوتے تو اُن کے قیام میں اتنا خضوع ہوتا کہ پرندے بھی اُن سے نہ بھاگتے، اُن کو وہ پتھر سمجھ کر بیٹھ جاتے۔

پس جس کسی کے دل میں خداوندِ عالم کی عظمت و بزرگی موجود ہے، اور وہ اس کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے تو اس کا ہر عضو حالتِ نماز میں خشوع و خضوع میں آجاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں کسی کو داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھتے تھے، تو فرماتے تھے۔ کہ اگر اس کے دل میں خوفِ خدا ہوتا تو اس کا ہاتھ بھی دل کی طرح ساکت رہتا۔

رکوع و سجود باطنی

رکوع و سجود بظاہر انکساری کے لیے ہے لیکن حقیقتاً اس لیے ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں

صدق دل سے عاجزی کا اظہار کرے۔ عقلاً ہر آدمی جانتا ہے کہ انسان کا سب سے باعزت عضو چہرہ ہے۔ اور خاک سے زیادہ ذلیل چیز دُنیا میں اور کوئی نہیں۔ لہٰذا جب آدمی اپنا بہترین عضو (پیشانی) خاک پر رکھ دے گا، تو اس سے زیادہ عاجزی کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان مٹی کا بنایا ہوا ہے اور یہ فنا کے بعد پھر مٹی ہی میں مل جائے گا۔ دراصل یہ ایک رُوحانی عاجزی کی دلیل ہے۔ ظاہری پیشانی مٹی پر جھکانے سے کوئی فائدہ نہیں، اور اگر صدقِ دل سے سجدہ نہیں کیا، تو ظاہری نماز رہ گئی، وہ لاحاصل ہے۔

ذکر نماز اور قرأت

نماز کے ہر رکن اور ہر دُعا و سُورت کے معانی جاننا ضروری ہیں

ہم جو کلمہ بھی نماز میں ادا کرتے ہیں۔ اس کی اصل و حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ دُنیا کا کوئی عمل بیکار ہے جب تک اس کو دل سے نہ کیا جائے۔ مثلاً اللہ اکبر کے معنی ہیں کہ ذات باری تعالیٰ بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ اگر تکبیر کہنے والے کو اس کے معنی معلوم نہیں تو وُہ جاہل کہا جائے گا۔ اگر وہ معنی جانتا ہے، لیکن صدقِ دل سے خدا کو بزرگ و برتر نہیں مانتا، تو اس کو جھوٹا کہا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کے علاوہ کسی دوسری چیز کو وہ برتر مانتا ہے، اور جس چیز کو وہ برتر جانتا ہے، وہ ہی اس کی معبُود ہوگی، اور وہ آدمی اس کی عبادت کرے گا۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ۔ اور جب وَجَّهْتُ وَجْهِيَ کہا، تو مطلب یہ ہوا کہ میں نے اپنے چہرے کو خلوص کے ساتھ تمام عالم سے پھیر کر خُدا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور اگر اس کا دل اس وقت کسی دوسری طرف رجوع ہوا تو اس کا مندرجہ بالا جملہ کہنا قطعی غلط ہوگا۔ اور جب خداوندِ عالم کی عبادت میں پہلا ہی جملہ ریا و ظاہر داری سے بھرا ہوا ہے، تو پوری نماز بیکار ہوگئی۔ اس کے بعد جب حَنِيفًا مُسْلِمًا کہا، تو گویا کہ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے متعلق حدیث نبوی ہے کہ حقیقی مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور عمل سے "الحمد" نکلے۔ تو خُدا کی نعمتوں کا شکر اس کے دل میں موجیں مارتا ہو۔ چونکہ یہ شکر کا کلمہ ہے، اور شکر دل ہی سے ہوتا ہے اور جس وقت إِيَّاكَ نَعْبُدُ زبان سے ادا کرے، تو خلوص نیت تازہ ہو، اسی طرح جب "اِهْدِنَا" کہے تو اس کے دل میں عاجزی ہو اور تضرع۔ کیونکہ وہ اس وقت خداوندِ عالم سے ہدایت کا خواستگار ہے۔

اسی طرح تسبیح و تہلیل اور قرأت کے ہر کلمے پر عمل کرنا ضروری ہے اور اس کا سمجھنا بھی۔ اس کی بحث بہت طولانی ہے۔ صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ اگر نماز کے حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے، تو ویسا بنے۔ ورنہ ظاہری نماز پر ہی قناعت کرے۔

خضُوع و خشوع قلب

نماز میں رُوحانیت کو کتنا دخل ہے

اِنسان دو ہی صُورتوں میں نماز میں غفلت برتتا ہے۔ اوّل ظاہری دوسرے

باطنی اوّل ظاہری وجوہات ۔ مثلاً ایسی جگہ نماز پڑھی جائے جہاں اس کی نماز میں دوسروں کی آوازیں یا صورتیں حائل ہوتی ہیں، اور دل اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا ایسی جگہ نماز پڑھنے کی کوشش کرے ۔ جہاں تنہائی ہو، اگر تاریک جگہ مل جائے تو زیادہ اچھا ہے ۔ یا آنکھ بند کر کے نماز پڑھے ۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ، نماز کے وقت قرآن شریف، تلوار اور دیگر اشیاء الگ کر دیا کرتے تھے، تاکہ دل اُن کی طرف مشغول نہ ہوں ۔

دوسرے وجوہات باطنی، وہ دل و دماغ کی پراگندگی اور پریشانی کے باعث ہوتے ہیں ۔ اُس کا علاج تقریباً ناممکن سا ہے ۔ غفلت باطنی کی بھی دو وجوہ ہو سکتی ہیں ۔

اوّل یہ کہ دل کسی کام میں مشغول ہو، اور نماز کے وقت بھی وہ ہی کام یاد آجائے ۔ لہٰذا کوشش کرنی چاہیئے کہ اوّل وہ کام ختم کر لیا جائے ۔ اس کے بعد یکسوئی حاصل کر کے نماز ادا کی جائے ۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کھانے اور نماز کا ایک ہی وقت ہو، تو اوّل کھانے سے فراغت کر لے یا کوئی دوسرا کام کرنا ہو تو اوّل اس کو نبٹا لے، بعد میں نماز پڑھے ۔

نماز میں وسوسے پیدا نہ ہونا چاہئیں دوسری قسم ایسے کاموں کا اندیشہ ہے، جو اتنی دیر میں ختم نہ ہو سکیں ۔ یا وہ دنیوی وسوسے جو ہر وقت انسان کے دماغ میں گھومتے رہتے ہوں، اور ایک زمانے کے بعد وہ عادت میں داخل ہو گئے ہوں ۔ اُن کا علاج یہ ہے کہ نماز کے بعد وظائف اور تلاوت کلام اللہ کرے، اور اس کے معانی کو سمجھنے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرے تاکہ وسوسہ دنیوی اتنی دیر دماغ سے دُور رہیں، اور رفتہ رفتہ اس کا عادی ہو جائے ۔

توہمات اگر دنیوی کاموں کی خواہشات کا غلبہ زیادہ نہیں ہے، تو تلاوت کلام اللہ اس پر ضرور اثر انداز ہو گی ۔ یہ بھی قاعدہ ہے کہ اگر ایک طرف سے زیادہ سے زیادہ دھیان دوسری طرف رکھا جائے تو اُس کی خواہش رفتہ رفتہ کم ہو جاتی ہے ۔ گویا کہ یہ اُس کام کے لیے ایک مسہل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ علاوہ اس کے اور کوئی دوسرا طریقہ چھوڑنے کا نہیں ہے اور اگر اس طرح بھی وہ عادات نہ چھوڑ سکا، تو پھر لاعلاج ہے اس کی نماز ہمیشہ نفسانی خواہشات کے توہمات سے ملی جلی رہے گی ۔ اس آدمی کی مثال ایسے شخص کی سی ہے کہ درخت کے نیچے بیٹھ کر جانوروں کی آواز نہ سُننا چاہے، اور لکڑی سے اُن کو درخت پر سے اُڑائے، لیکن وُہ فوراً ہی پھر آ کر بیٹھ جائیں ۔ لہٰذا اگر وُہ ان سے نجات چاہتا ہے، تو اس کو چاہیے کہ اس درخت کی بُنیادوں کو اُکھیڑ دے ۔ جب تک دل سے وہ تمام وسوسے نہ نکال دے گا ۔ یہ خیالات اس کے ضمیر میں باقی رہیں گے ۔

فعل آنحضرتؐ ایک بار جناب رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص بہت عمدہ کپڑا لایا اور تحفۃً پیش کیا ۔ حضورؐ نے پہن کر نماز ادا کی، اور نماز کے درمیان اُن بیلوں بوٹوں پر نظر پڑی، تو نماز کے بعد اُس

کپڑے کو اُتار دیا، اور اس کو واپس کر کے پُرانے کپڑے پہن لیے۔ اسی طرح حضورؐ کی نعلین میں ایک نیا تسمہ لگایا گیا تھا۔ جب نماز میں حضورؐ کی نظر اس پر پڑی تو اس کو اچھا معلوم ہونے کی وجہ سے نکلوا دیا۔ ایک بار حضورؐ نے نئی نعلین بنوائیں اور آپ کو اچھی معلوم ہوئیں، تو آپؐ نے سجدہ ادا فرمایا اور درگاہ باری میں عرض کی۔ کہ پروردگارا! میرے اس عمل سے عاجز بندوں میں شمار کر! اور دُشمن قرار نہ دے۔ مسجد سے باہر تشریف لا کر سائل کو عطا کر دیں۔

تمثیل | ایک بار حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، اپنے باغ میں نماز ادا کر رہے تھے، کہ آپ کی نظر ایک اُڑتے ہوئے خوبصورت جانور پر پڑی، کہ وہ درختوں سے نکلنا چاہتا ہے، مگر راستہ نہیں ملتا۔ آپ یہ سوچتے ہوئے نماز کی رکعت کا شمار بھُول گئے، تو درگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اپنی کمزوری دل کو بیان کیا۔ اور اس کے کفارے میں اپنا باغ بطور صدقہ دے دیا۔ اسی طرح بہت سے برگزیدہ لوگوں نے کیا ہے۔ جب تک نماز سے پہلے حضورِ قلب اور ذکر خدا زبان اور دل پر نہ ہوگا۔ نماز میں یک سوئی نہ ہوگی۔ لہٰذا اُن وسوسوں کو دل سے نکال دینا پہلے ضروری ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اپنے دل کو دُنیا سے آزاد کر لے۔ یہ بات قناعت پر منحصر ہے، اور دل کی فراغت پر۔ عبادت کے وقت جب تک قناعت اور دریا دلی نہ ہوگی۔ صداقت اور سچائی پیدا نہ ہو سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نماز میں پیدا ہو جائے۔ لہٰذا چاہیے کہ دل کو حاضر رکھنے کی کوشش کرے اور نفل زیادہ پڑھے۔ یہاں تک کہ چار رکعتوں کی مثل دل قابو میں آسکے اور نوافل فرائض کا زینہ بن جائے۔

نماز باجماعت

حدیث | رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ایک نماز باجماعت ستائیس افراد نمازوں کے برابر ہے اور جو آدمی عشار کی نماز باجماعت پڑھتا ہے، اس کو نصف رات کی عبادت کا ثواب ملتا ہے اور صبح کی نماز باجماعت کا ثواب پوری رات کی عبادت کے برابر ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ جو آدمی چالیس روز برابر نماز باجماعت ادا کرے، اور پہلی تکبیر قضا نہ کرے، تو اس کو نفاق اور دوزخ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات ملتی ہے قاعدہ تھا کہ اگر کسی کی تکبیر اوّل قضا ہو جاتی تھی، تو تین دن تک اس کا افسوس رہتا تھا اور لوگوں سے ذکر کیا کرتے تھے۔

سعید بن مسیّب سے روایت ہے کہ بیس سال سے متواتر اذان سے پہلے میں مسجد میں ہوتا ہوں بعض علمار کا خیال ہے کہ بغیر سبب فرادا نماز پڑھنا اچھا نہیں۔ اس لیے اُن کے خیال میں جماعت ضروری ہے۔

امامت کے فضائل

امامت کی خوبیاں | اس کے ساتھ ساتھ امامت اور اقتدا سے متعلق ارکان کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ لوگوں کی رضامندی اور خوشی ضروری ہے۔ اگر لوگ پیچھے نماز پڑھنے سے پرہیز کریں تو امامت

سے پرہیز کرے۔

دوم یہ کہ اگر لوگ امامت کے لیے کسی کو پسند کریں تو وہ ضرور نماز پڑھائے۔ اگر کوئی خاص عذر نہ ہو کیونکہ امامت اذان کہنے سے کہیں زیادہ مرتبہ رکھتی ہے۔

سوم یہ کہ امامت سے پہلے کپڑوں اور جسم کی طہارت کا خیال رکھے۔

چہارم یہ کہ اوقات نماز کا خیال رکھے۔ فضیلت کے وقت نماز پڑھائے۔ جماعت میں زیادہ آدمیوں کا انتظار نہ کرے۔ کیونکہ فضیلت کے وقت نماز پڑھنا، امامت سے زیادہ افضل ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جب دو بھی ہو جاتے تھے تو تیسرے کا انتظار نہ کرتے تھے۔

فعلِ رسولؐ | ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں زیادہ دیر سے تشریف لائے تو صحابہ کرام نے عبدالرحمٰن بن عوف کو امامت سپرد کر دی۔ ایک رکعت کے بعد حضور تشریف لائے، جب نماز ختم ہو گئی تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے اچھا کیا، ایسا ہی کرنا چاہیے۔

پنجم۔ امامت صرف خلوص رکھنے والے بندے کے لیے مناسب ہے۔ اس کی مزدوری کوئی نہ لی جانا چاہیے۔

جب تک صفوف صحیح نہ ہو جائیں، تکبیر نہ کہنا چاہیے۔ تکبیر بلند آواز سے کہنا چاہیے۔ اس کے بعد امامت کی نیت کرے، تاکہ ثواب ملے۔ اگر نیت امامت نہ کرے گا تو بھی نماز درست ہو جائے گی، لیکن امامت کا ثواب نہ ملے گا۔

نمازِ جہری | نماز جہری (نماز صبح، مغرب وعشاء) بلند آواز سے پڑھے۔ اس میں تین دفعہ بجا لائے۔

پہلا اس وقت جبکہ تکبیر کہہ کر اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ۔ الخ پڑھے۔ اور مقتدی سُورۂ فاتحہ پڑھنے میں مشغول ہوں۔

دوسرا اس وقت جبکہ سُورۂ الحمد ختم کرے، تو دوسرا سورہ پڑھنے میں تھوڑا سا وقفہ دے، تاکہ اگر کسی نے سورۂ الحمد ختم نہ کی ہو تو ختم کر سکے۔ اسی طرح جب پوری سورہ ختم کرلے تو اتنا نامعلوم وقفہ ہونا چاہیے کہ سورت کے آخری حرف سے تکبیر مل نہ جائے۔

مقتدی سوائے سورہ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھے۔ لیکن وہ لوگ جو امام سے دُور ہوں اور اُس کی آواز اُن تک نہ پہنچ سکے۔ رکوع وسجود ہلکا ہی بجا لائے، تین بار سے زیادہ تسبیح نہ کہے۔

مقتدی کے فرائض | انس رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ حضور سے کسی کی نماز فاضل وکامل نہ تھی۔ وہ اس لیے کہ مقتدیوں میں سب تقریباً جوان ہی تھے۔

مقتدی کو چاہیے کہ امام کے بعد حرکت کرے اس کے ساتھ یا پہلے نہیں۔ مثلاً جب امام سجدے میں

پیشانی رکھ دے، تب رکھے اور اسی طرح رکوع میں۔ کیونکہ مقتدی امام کا تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی عمداً ایسا کرے گا تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

سلام پھیرنے کے بعد مندرجہ ذیل دُعا پڑھنے کے علاوہ وہاں بیٹھا نہ رہے اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ وَاِلَيْكَ يَرْجِعُ السَّلَامُ وَاَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ اس کے بعد فوراً اُٹھ کھڑا ہو، اور مقتدیوں کی طرف مُنہ کرکے یہ دُعا کرے۔ مقتدی امام سے پہلے نہ اُٹھیں، کیونکہ یہ مکروہ ہے۔

فضیلت نماز جمعہ

فضائلِ نمازِ جمعہ جمعہ کا دن اِنتہائی بابرکت دن ہے۔ مومنین کے لیے یہ دن عید کے دن کی مثل ہے۔ حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس آدمی نے بلا کسی وجہ کے متواتر تین جمعہ ناغہ کر دیئے، اس نے گویا کہ اسلام کو پسِ پشت ڈال دیا اور اُس کا دل زنگ آلُود ہوگیا۔

حدیث حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ہر جمعہ کو خداوندِ عالم چھ لاکھ گناہگاروں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے۔ زوال آفتاب کے وقت نماز نہیں پڑھنا چاہیے، چونکہ یہ وقت دوزخ میں آگ بھڑکانے کا ہے لیکن جمعہ کو اس وقت نماز پڑھنا اچھا ہے، کیونکہ اُس دن دوزخ کو بھڑکایا نہیں جاتا، اور حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو آدمی جمعہ کو مرتا ہے وہ گویا کہ شہید ہے۔ عذابِ قبر سے وہ نجات پائے گا۔

شرائطِ جمعہ

ویسے تو اور نمازوں کی طرح نماز جمعہ کے بھی وُہی شرائط ہیں۔ مگر علاوہ اُن کے چھ شرائط اور مخصوص ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں :

پہلی شرط یہ ہے کہ وقت

دوسری شرط یہ ہے کہ نمازِ جمعہ جنگل یا خیمے میں ادا نہ کرنا چاہیئے، بلکہ ایسی جگہ ہونی چاہیئے جہاں کم ازکم چالیس آزاد اور بالغ مرد موجود ہوں۔ اگر اس صورت میں مسجد کے علاوہ بھی کہیں ہو تو دُرست ہے

سوم یہ کہ کم ازکم چالیس بالغ مرد ہونا ضروری ہیں۔ اگر اس تعداد سے کم آدمی خطبے یا نماز دونوں میں ہونگے تو نماز درست نہ ہوگی۔

چہارم یہ کہ نمازِ جمعہ فرداً فرداً نہیں ہوتی، چاہے آخری رکعت میں ہی شریک ہو سکے، تو بھی نماز ہو جاتی ہے۔ اگر دوسری رکعت میں تنہا ہے اور رکوع میں نماز پائے تو اقتدا لازم ہے، مگر نیت نماز ظہر کی کرنا

چاہیے۔

پنجم یہ کہ نمازِ جمعہ ایک شہر میں ایک ہی ہو سکتی ہے، ایک سے زیادہ جگہوں پر نہیں۔ ہاں البتہ اگر ایک مسجد میں لوگ نہ سما سکیں تو دوسری مسجد میں ہو سکتی ہے۔ اور اگر ایک مسجد میں تمام مسلمان بخوبی آسکیں اور اس کے باوجود بھی متعدد مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھیں تو نمازِ جمعہ صرف اسی مسجد کی صحیح ہو گی، جہاں سب سے پہلے تکبیر ہوتی ہے۔

ششم یہ کہ دو خطبے نماز سے پہلے پڑھنا چاہئیں اور ان دونوں کے درمیان بیٹھنا بھی ضروری ہے پہلے خطبے میں چار باتیں فرض ہیں، پہلے تحمید یعنی حمد خداوندِ عالم، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا۔ آپس میں ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ اُوصِیکُم بِتَقوَی اللہِ۔ قرآن مجید کی صرف ایک ہی آیت اس وقت پڑھنا کافی ہے۔

دوسرے خطبے میں بھی چار چیزیں فرض کی گئی ہیں۔ صرف قرآن مجید کی آیت کی جگہ دعا کرنا ضروری ہے۔

نمازِ جمعہ کب چھوڑ سکتے ہیں نمازِ جمعہ عورتوں، غلاموں، بچوں اور مسافرت کے عالم میں واجب نہیں، اور حسبِ ذیل سبب اگر ہوں تو بھی چھوڑ دینا مناسب ہے، لیکن جب تمام آدمی نمازِ جمعہ پڑھ چکیں، تو وہ ظہر کی نماز ادا کرے۔ مثلاً کپڑے کیچڑ میں بھر جائیں۔ بارش ہو رہی ہو، بیمار ہو یا تیمار داری میں مشغول ہو۔

آدابِ جمعہ

جمعہ کے لیے دس سُنتیں اور آداب مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

۱۔ کہ جمعرات کے دن سے ہی صدق دل سے سفید کپڑوں کی تیاری شروع کر دے، اور اس دن سویرے سے اپنے کاموں کو چھوڑ دے تاکہ جمعہ کو سویرے ہی مسجد میں آسکے پنجشنبہ کے دن اس وقت تسبیح و استغفار میں نماز کے وقت مشغول رہے۔ کیونکہ وہ فضیلت رکھتا ہے، اور جمعہ کی برکت کے برابر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دن عورت سے صحبت کرنا سنّت ہے۔ تاکہ جمعہ کا دن دونوں کے لیے غسل کا سبب بن جائے۔

۲۔ یہ کہ صبح کو جلد غسل کی کوشش کرے، لیکن اگر اسی وقت نماز کے لیے مسجد جانا ہو۔ ورنہ دیر کرنا ہی اچھا ہے۔ جمعہ کے دن غسل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے، یہاں تک کہ بعض علماء نے غسل جمعہ کو واجب قرار دیا ہے۔ مدینے میں اگر کوئی کسی سے سخت کلامی کرتا تو اس سے کہتے کہ —— تو اس سے زیادہ بُرا ہے جو جمعہ کو غسل نہیں کرتا۔

اگر غسل جنابت بھی جمعہ کو کرنا ہے، تو بھی بہتر یہ ہے کہ نیت غسل جمعہ کی کرے۔ اور اگر ایک غسل میں دونوں نیتیں کرلے تو بھی درست ہو گا۔ غسل جمعہ کی نیت میں وہ نیت شامل ہو گی اور فضیلت بھی اسی میں

ہے۔

۳ - یہ کہ جمعہ کے دن آراستہ ہو کر مسجد میں آئے۔ اسی طرح سر کے بال مونچھیں اور ناخن بنوا کر آئے۔ اور اگر ان کاموں سے پہلے فارغ ہو گیا ہے تو اچھا ہے۔ آراستگی کا مطلب سفید کپڑوں سے ہے۔ کیوں کہ خداوندِ عالم سفید کپڑوں کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ جمعہ کے دن نماز کی تعظیم کے خیال سے عطر لگانا اچھا ہے۔

۴ - یہ کہ صبح سویرے ہی جامع مسجد میں جانا چاہیے۔ زمانۂ سلف کے لوگ اندھیرے میں چراغ لے کر مسجد میں جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہجوم کی وجہ سے اس وقت چلنا دشوار ہوتا تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ایک دن جامع مسجد پہنچے تو وہاں تین آدمی پہلے سے موجود تھے، تو اپنے پر غصہ ہوئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے اسی عمل کو ترک کیا گیا ہے، جو بدعت کہلاتی۔ یہودی و نصرانی تو ہفتہ و اتوار کو اپنے اپنے معبدوں میں جاتے ہیں۔ لیکن مسلمان جمعہ کو نہیں جاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ جو آدمی جمعہ کو پہلی بار مسجد میں آتا ہے، اس کو ایک اونٹ کی قربانی کا ثواب ملتا ہے، اور جو دوسری بار آتا ہے، اس کو گائے ذبح کرنے کا ثواب ملتا ہے، اور جس کا نمبر تیسرا ہوتا ہے۔ اس کے لیے بکری کے ذبح کرنے کا ثواب ہے، اور چوتھی بار داخل ہونے والے آدمی کو مرغی کے ذبیحہ کا ثواب ملتا ہے، اور جو پانچویں نمبر پہ ہے، اس کو ایک انڈے کا ثواب ہوتا ہے — اور جو آدمی سب کے بعد آئے گا اس کے لیے صرف نماز کا ثواب ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

جس وقت خطیب اور امام اپنے مکان سے خطبہ و نماز کے لیے نکلتا ہے تو کاتبینِ قدرت اپنا قلم دوات رکھ کر اس کا خطبہ سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

۵ - اگر دیر سے مسجد میں داخل ہو، تو لوگوں کے سروں پہ پیر رکھتا ہوا پھاند پھاند کر نہ جائے۔ حدیث میں ایسے آدمی کے لیے وارد ہوا ہے کہ بروزِ قیامت اس کا پل بنا کر اس کے اوپر سے لوگ گزریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا، تو نماز سے فراغت کے بعد اس سے فرمایا کہ تو لوگوں پہ سے پھاندتا ہوا آگے پہنچا، تیری نماز مثل نہ ہونے ہی کے ہے۔ البتہ اگر صفِ اوّل خالی ہے تو وہاں پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ دوسری صف والوں نے پہلی صف کو خالی چھوڑ دیا۔ یہ بات اچھی نہ کی۔

۶ - نماز میں مشغول ہونے والے آدمی کے سامنے سے نہ گزرے، اور دیوار اور ستون کے قریب بیٹھنا چاہیے تاکہ کوئی دوسرا آدمی اس کے سامنے سے نہ گزرے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آدمی خاک ہو کر ہوا میں اڑ جائے، تو اس آدمی سے بہتر ہے جو کسی نمازی کے آگے سے گزرتا ہے۔

۷ - صفِ اوّل میں بیٹھنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر خالی نہ ہو تو جو صف نزدیک ہو اسی میں شریک ہو جائے۔

(تنبیہ) پہلی صف میں اگر فوجی یا ریشمی لباس میں ملبوس بیٹھے ہوں یا خود خطیب سیاہ ریشمی لباس میں ہو، یا اس کی تلوار میں سونا لگا ہو یا کوئی اور ظاہری برائی ہو، تو پہلی صف سے دور ہی بیٹھنا مناسب ہے۔

۸ - جب خطیب خطبے کے لیے باہر آئے، تو آپس میں گفتگو نہ کرو، اور خطبہ سننے میں مشغول ہو جاؤ۔ اگر کوئی یہ حرکت کرے، تو اس کو بھی اشارے سے منع کر دو۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ خطبے کے وقت خاموش رہو یا خطبہ سُن کے الفاظ کہنا بھی بے ہودہ بات ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نماز اس کی کیسے ہو سکے گی، جس نے درمیان میں بے ہودہ فعل کیا ہو۔ اگر اتنی دور ہو کہ خطبے کی آواز نہ آسکے تو خاموش بیٹھا رہے۔ نماز تحیۃ المسجد کے علاوہ کوئی نماز پڑھنا اچھا نہیں۔

۹ - بعد فراغت نماز سات بار سورہ الحمد اور سات بار سورہ قل ہو اللہ اور سات بار معوذتین پڑھے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اس عمل سے دوسرے آنے والے جمعہ تک شیطان قریب نہیں آتا۔ اور یہ دُعا پڑھے اَللّٰهُمَّ يَا غَنِيُّ يَا حَمِيْدُ، يَا مُبْدِئُ يَا مُعِيْدُ يَا رَحِيْمُ يَا وَدُوْدُ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ روایت ہے کہ جو آدمی اس دُعا کو اپنا ورد بنائے گا، خداوند عالم غیب کے خزانے سے اس کو رزق دے گا۔ اس کے بعد چھ رکعت نماز سنّت پڑھے، کیونکہ رسُول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم چھ رکعت ہی پڑھا کرتے تھے۔

۱۰ - نماز جمعہ کے بعد اس وقت تک مسجد میں ہی رہے جب تک دوسری نماز ادا کرلے، اور اگر مغرب کی نماز تک مسجد میں ہی قیام کرے تو افضل ترین ہے۔ حدیث میں ہے کہ اس کا ثواب عمرے اور حج کے برابر ہے۔ اگر مسجد میں نہ بیٹھ سکے تو گھر جا کر بھی ذکرِ خدا سے بے خبر نہ رہے، تاکہ جمعہ کی برکات سے مستفیض ہوتا رہے۔

آدابِ روزِ جمعہ

یومِ جمعہ کے آداب جمعہ کے دن سات کام ایسے ہیں، جن کے سمجھنے اور کرنے میں فضیلت ہے۔

اوّل یہ کہ صبح کے وقت سے ہی اہل علم کی صحبت میں رہے۔ بیکار لوگوں سے بچنے کی کوشش کرے۔ ایسے ایسے اہلِ علم ہونا چاہئیں جو رغبت دنیا کو کم کرنے کی ہدایت دیں۔ ورنہ وہ لوگ اہلِ علم نہیں کہلائیں گے۔ اُن کی صحبت بھی بیکار ہے۔

دوم یہ کہ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ جمعہ کے دن ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ اس وقت جو طلب کرے ملے گا، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ ساعت سعید طلوع آفتاب کے وقت ہے، یا زوال آفتاب کے

وقت یا غروب آفتاب کے وقت یا بانگِ نماز کے وقت یا خطبے کے وقت، یا نماز کے وقت یا نمازِ عصر کے وقت۔ دراصل اس ساعت کا وقت شبِ قدر کی طرح معلوم نہیں۔ لہٰذا چاہیئے کہ پورے دن اس ساعت کا خیال رکھ کر اطاعت و بندگی خدا اور دُعا میں صرف کرے۔

سوم، جمعہ کو زیادہ سے زیادہ درُود پڑھے۔ اس لیے کہ جناب رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی جمعہ کو اسّی بار درُود بھیجے گا، اس کے اسّی سال کے گناہ مُعاف کر دیئے جائیں گے۔ لوگوں نے حضورؐ سے درُود کے متعلق دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تَکُوْنُ لَکَ رِضًا وَّلِحَقِّہٖ اَدَاءً وَّاَعْطِہِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَالْمُقَامَ الْمَحْمُوْدَنِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ وَاجْزِہٖ عَنَّا مَا ھُوَ اَھْلُہٗ وَاجْزِہٖ اَفْضَلَ مَاجَزَیْتَ نَبِیًّا عَنْ اُمَّتِہٖ وَصَلِّ عَلٰی جَمِیْعِ اِخْوَانِہٖ مِنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصّٰلِحِیْنَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

روایت ہے کہ جو آدمی جمعہ کے دن یہ درُود سات بار پڑھے گا بغیر شک و شبہ کے رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کی شفاعت فرمائیں گے اور اگر صرف اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ پڑھے تب بھی کافی ہے۔

چہارم بروزِ جمعہ تلاوت کلامِ پاک زیادہ سے زیادہ کرے، اور سورۂ کہف کے متعلق خصُوصاً روایت میں فضیلت بیان کی گئی ہے۔ نیز زمانہ سابقہ کے علماء بھی سورۂ کہف کی تلاوت کیا کرتے تھے، وہ بزرگانِ دین بروزِ جمعہ ہزار بار درود پڑھتے تھے، اور ہزار بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ پڑھا کرتے تھے۔

پنجم۔ اس دن زیادہ سے زیادہ نمازیں پڑھے۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی جامع مسجد میں داخل ہوتے ہی چار رکعت نماز پڑھے گا اور ہر رکعت میں چار بار الحمد اور پچاس بار قل ھو اللہ پڑھے گا؛ وہ مرنے سے پہلے جنت میں اپنی جگہ دیکھ لے گا۔ جمعہ کے دن چار رکعت نماز پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔ جس میں سُورۂ انعام اور سورۂ کہف، سُورۂ طٰہٰ، سورۂ یٰسین پڑھنا چاہییں۔ ورنہ سورۂ سجدہ، سورۂ لقمان، سورۂ دخان، اور سورۂ ملک پڑھے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن نمازِ تسبیح کو ناغہ نہ کرتے تھے۔ جو مشہور نماز ہے اسی نماز کا پڑھنا افضل ہے۔ وقتِ زوال تک یہ نماز پڑھے، اس کے بعد تسبیح اور استغفار میں مشغول رہے۔

ششم یہ کہ جمعہ کے دن صدقہ دینا بڑی فضیلت کا باعث ہے۔ اگر زیادہ مقدور نہ ہو تو قدرے ہی سہی لیکن خطبے کے وقت اگر کوئی چیز طلب مانگے تو اس سے منع کر دے، کیونکہ خطبے کے وقت صدقہ دینا مکروہ ہے۔

ہفتم۔ ہفتے بھر میں جمعہ کا دن صرف آخرت کے کاموں کے لیے چھوڑ دے۔ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے۔

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ انس رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں۔ کہ اس کا مقصد خرید و فروخت نہیں ہے، بلکہ طلب علم، بھائیوں سے ملنا جلنا، بیماروں کی عیادت کرنا اور تشییع جنازہ ہے، یا اسی قسم کی دوسری باتیں مُراد ہیں۔

مسئلہ نماز کے متعلق تمام پہلو بتا دیئے گئے، اور باقی چھوٹی چھوٹی باتیں بوقتِ ضرورت دریافت کر لینی چاہئیں، کیونکہ اس کتاب میں بالتفصیل بیان نہیں کیا جا سکتا۔

نیّت نماز

نماز کی نیت میں اکثر وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ خرابی اس شخص کی نیت میں ہوتی ہے جس کا دماغی توازن ٹھیک نہ ہو، اور دیوانا ہو۔ یا شریعت کے احکامات سے ناواقف ہو، اور نیت کے معنی سے نابلد ہو۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ نیت اس خلوص سے مراد ہے کہ انسان اپنے دل میں لے کہ عبادت خدا کا مخصوص ارادہ کر کے کھڑا ہو جیسے تجھ سے کوئی آدمی یہ کہے کہ فلاں بزرگ یا عالم آ رہا ہے۔ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاؤ، تو تم اس وقت کھڑے ہونے میں زبان سے یہ نہ کہو گے کہ میں فلاں عالم اور بزرگ کی تعظیم کے لیے اس شخص کی ہدایت کے موجب کھڑا ہوتا ہوں۔ بلکہ یہ نیت صرف تمہارے ذہن اور دل میں ہی ہوگی، اور جو کچھ زبان سے ادا کیا جاتا ہے، وہ حدیثِ نفس ہوتی ہے، نہ کہ نیت۔

نیت وہ ارادہ خلوص ہے، جس کے ماتحت تم ایک دم کھڑے ہو گئے، لیکن نیت کے لیے حکم شریعت سمجھ لینا ضروری ہے۔

مثلاً نمازِ ظہر یا نمازِ عصر یا کسی نماز کے لیے تمہارا دل قطعی طور پر جان لے کہ فلاں نماز پڑھ رہے ہو تو تکبیر کہو، اور اگر یہ سمجھنے میں کچھ شبہہ ہو، تو دل میں اس کا قصد کر لو، یہ اس کی ضرورت ہے کہ نمازِ ظہر یا عصر کا نام اور رکعتوں کی تعداد یہ سب کچھ یک لخت ذہن میں جمع ہو جائیں۔ پھر بھی جو کچھ دل میں بیک وقت ہو، وہ مجتمع ہو جانا کافی ہے۔ اور یہ ہی نیت ہے۔

اگر کوئی آدمی تم سے یہ کہے کہ نمازِ ظہر یا عصر تم نے پڑھی ہے تو تم اس کو ہاں میں جواب دو گے۔ اور تمہارا ہاں کہنا ہی اُن تمام باتوں کا جواب ہوگا۔ جو ارکان تم نے اس نماز میں ادا کیے ہیں۔ پس جاننا چاہیئے کہ اس شخص کو بتانے کے لیے جو الفاظ تم نے استعمال کیئے وہ ہی اپنے دل کی نیت کے لیے کافی ہے اور اس کے بعد "اللہ اکبر" کہنا۔ اس نیت کے متعلق "ہاں" کہنے کا مترادف ہوگا۔ اس کے علاوہ نیت میں کدو کاوش کرنا دماغی پراگندگی کا باعث ہوگا۔

آدمی کو چاہیے کہ آسان ترین چیزوں کو اختیار کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو نماز اور نیت صحیح ہوگی۔ اس لیے کہ

نیت نماز بھی دوسرے کاموں کی نیت اور ارادے کی مثل ہے۔ یہی سبب تھا کہ رسُول مقبوُل صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں نیت کے معاملے میں کبھی شبہہ بھی پیدا نہ ہوتا تھا، کیونکہ وہ نیت کو آسان سمجھتے تھے اور خلوص دل پر مبنی سمجھتے تھے۔ جو لوگ اس میں اُلجھتے ہیں وہ جاہلوں کی مثل ہیں۔

پانچواں اصُول

بابُ الزکوٰۃ

(احکاماتِ زکوٰۃ)

اصول اسلام ادائے زکوٰۃ "اِسلام" کا ایک رُکن ہے حضورؐ کا ارشاد ہے۔ پانچ اصول پر مبنی ہے۔

اوّل - کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ۔

دوم - نماز

سوم - زکوٰۃ

چہارم - روزہ

پنجم - حج

ارشادِ نبوی ہے کہ جو مالدار زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اُن پر قیامت کے دن کچھ چار پاؤں کو مسلط کیا جائے گا تاکہ وہ اس شخص کو اپنے پیروں سے روند دیں اور جب وہ جانور اس پر سے گذر جائیں گے، تو پھر اسی طرح دوبارہ روندنا شروع کریں گے، اور متواتر اسی طرح عمل ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ تمام حسابات قیامت ختم ہو جائیں۔ یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ لہٰذا زکوٰۃ کے احکامات مالداروں کے جاننے کے لیے ضروری ہیں۔

شرائط اور اقسامِ زکوٰۃ

اقسام زکوٰۃ زکوٰۃ چھ قسم کی واجب ہے۔ اوّل چار پاؤں کی زکوٰۃ، جس میں اونٹ، بکری اور گائے شامل ہیں۔ لیکن گدھے، گھوڑے اور دیگر جانوروں کی زکوٰۃ نہیں ہے۔

شرائط زکوٰۃ زکوٰۃ کی ادائیگی چار شرائط کے ماتحت واجب ہو جاتی ہے۔

شرطِ اوّل یہ کہ حیوانات چراگاہوں میں چرنے کے لیے جاتے ہوں تاکہ اُن پر زیادہ اخراجات نہ آئیں۔ اگر گھر میں ہی گھاس دانا دیا جاتا ہے اور سال بھر میں مقدار زکوٰۃ کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ نہ دی جائے گی۔

شرطِ دوم۔ ایک سال کے اندر اگر مالک کی ملکیت سے نکل جائیں گے تو زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس سال میں بچے بھی پیدا ہوئے ہیں، تو اُن پر اصل کے مطابق زکوٰۃ واجب ہے۔

سوم - کسی خاص مال کی وجہ سے آدمی مالدار ہو جائے، لیکن اس کو چور لے جائیں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ یا کوئی آدمی اپنی جائداد کے مطابق مقروض بھی ہے تو بھی زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کھویا ہوا مال یا مویشی دوبارہ مل جائیں گے تو سابقہ اور موجودہ دونوں اوقات کی زکوٰۃ دینا ہوگی۔

چہارم - اگر بقدر کفایت ہی مال رکھتا ہے اور اسی مال کی وجہ سے مالداری کے تحت آتا ہے، اور زکوٰۃ کے دینے کے بعد اس کے مال میں کمی ہو جاتی ہے تو جب تک اس کے پاس پانچ اونٹ ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ پانچ اونٹوں پہ ایک بکری واجب ہوگی۔ اس بکری کی عمر ایک سال سے کم نہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح بیس تک، ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر بکرا زکوٰۃ میں دینا ہے، تو اس کی عمر دو سال سے کم نہ ہونا چاہیے۔

پچیس اونٹوں پر ایک اونٹنی زکوٰۃ دینا چاہیے۔ بکری کی طرح اونٹنی کی عمر ایک سال اور اونٹ کی عمر دو سال ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح پینتیس اونٹوں تک ایک ہی اونٹنی یا اونٹ زکوٰۃ دیا جائے گا۔ ۳۶ اونٹوں سے لے کر ۶۰ اونٹوں تک تین سال کی اونٹنی زکوٰۃ دے۔ اور اس کے بعد چھتّر اونٹوں سے زیادہ پہ دو اونٹنیاں۔ دو، دو سال کی۔ اس کے بعد ۹۱ سے ایک سو بیس تک تین تین سال کی۔ اس کے بعد تین اونٹنیاں دو، دو سال کی۔ اسی طرح علی الترتیب جتنی زیادہ ہوتی جائیں، تو ہر پچاس پہ تین سال کی اور ہر چالیس پہ دو سال کی اونٹنی بڑھاتا جائے۔

گائے اور بیل اگر تیس ہو جائیں تو ان پہ زکوٰۃ ہے۔ اس پہ ایک سال کا بچھڑا واجب ہوتا ہے۔ اگر چالیس ہو جائیں تو دو سال کا۔ اس کے بعد ساٹھ اور اس سے زیادہ پہ ایک ایک سال کے دو۔ اس کے بعد علی الترتیب ہر چالیس پر مزید دو سال کا بچھڑا، اور زائد تیس پہ ایک سال کا بڑھاتا چلا جائے۔

بکری کے لیے حکم یہ ہے۔ ہر چالیس تک ایک اور چالیس سے زائد ایک سو اکیس تک دو۔ اسی طرح دو سو ایک (۲۰۱) تک تین۔ اور چار سو تک ۴ بکریاں اور اس کے بعد علی الترتیب ہر سو پہ ایک بکری بڑھاتا چلا جائے۔ بکری کے متعلق حکم ہے۔ کہ ایک سال سے کم کی نہ ہونا چاہیے۔ اور بکرا دو سال کا۔ اگر دو آدمی ایک ہی گلّے کے حصّے دار ہوں، تو دونوں کے لیے زکوٰۃ کے واسطے ایک ہی حکم ہے۔ اور اگر دونوں شرکاء کی بکریاں چالیس سے کم ہوں تو آدھی آدھی بکری دونوں کو زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ اسی طرح اگر دونوں کی ملکیت میں ایک سو بیس (۱۲۰) بکریاں ہیں، تو ایک ایک بکری زکوٰۃ میں دینا کافی ہے۔

قسم دوم - غلّے کی زکوٰۃ جس کے پاس آٹھ سو من گیہوں، جَو، خرما، منقّیٰ، مونگ، چنا یا چاول کی قسم سے موجود ہو۔ اس میں سے دسواں حصّہ زکوٰۃ دینا واجب ہے۔

ایسی چیزیں جو غذا میں شامل نہ ہوں مثلاً روئی اور اس میں میوہ جات بھی شامل ہیں تو دسواں حصہ واجب نہیں۔ صرف چار من گیہوں یا چار سو من جو میں مندرجہ بالا مقدار کا حکم نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ ایک ہی جنس کی مقرر کردہ مقدار پر واجب ہوتی ہے۔

اگر کھیت کی سنچائی نل کے پانی سے نہ کی گئی ہو، بلکہ بارش کے پانی سے کھیت اُگا یا گیا ہو، تو بھی دسواں حصہ واجب نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ میں انگور یا تازہ خرمے دینا بھی اچھا نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کی جگہ منقہ اور چھوارے دینا چاہئیں۔ لیکن اگر انگور سوکھ کر منقیٰ ہونے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں، تو انگور ہی دیئے جا سکتے ہیں۔

جس وقت انگور یا گیہوں پک جائے، تو جب تک غریبوں کی ضروریات کا اندازہ نہ کرلے ہرگز اپنے خرچ میں نہ لائے۔

قسم سوم۔ چاندی اور سونے کی زکوٰۃ | دو سو درہم جو ہمارے سکّہ رائج الوقت کے دو سو روپیہ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے پانچ روپے بطورِ زکوٰۃ دینا چاہئیں، اور اگر سونے کے سکّے ہیں تو صرف آدھا سکّہ واجب ہے۔

روپیہ میں دسواں حصہ، اور اس میں دسویں حصّے کا چوتھائی حصہ دینا چاہیئے۔ یعنی دو سو درہم میں صرف پانچ درہم۔ اسی طرح دیناروں میں۔ بیس کا دسواں حصہ دو دینار، اور دو دینار کا چوتھا حصہ آدھا دینار۔

سونے چاندی کے برتنوں نیز مرصّع تلواروں اور سازوں یا ناجائز چیزوں پہ زکوٰۃ واجب ہے۔

زیورات[1] جو استعمال کیے جائیں، اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں، لیکن جو زیورات، سونا وغیرہ لوگوں کے پاس امانت میں ہو، اس پر زکوٰۃ ہے۔

چہارم۔ تجارت کے مال پر | اگر بیس روپے کی کوئی شئے خریدے، اس پہ ایک سال کے بعد بیس ہی دینا نقد زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ مزید اس میں منافع اگر ہُوا ہے، تو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر روپیہ سے خریدا ہوا مال ہے، تو اسی حساب سے زکوٰۃ نکال دے۔ اور اگر نقد دے کر نہیں خریدا تو بقدر قیمت موجودہ زکوٰۃ ادا کرے۔

اگر کسی کے پاس مال ہے اور اس میں سے کچھ روپیہ سے بغرضِ تجارت کچھ چیزیں خریدتا ہے اور نیت بھی سالم ہے، تو پہلے سال میں اس پہ زکوٰۃ نہ ہوگی۔ لیکن اگر نقد رکھا ہے۔ تو زکوٰۃ دینا بقدرِ نصاب ہوگا۔ اگر سال کے درمیان میں ارادہ تجارت کا ترک کردے تو زکوٰۃ نہ ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فطرہ

پنجم۔ فطرۂ عید | جو سامانِ عید کے استعمال کے لیے ہو، کپڑوں کے علاوہ اور اشیاء موجودہ سے زیادہ استطاعت

---

[1] مذہب حنفیہ میں زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے ؎

بھی رکھتا ہو، تو اس پر تین سیر آدھ پاؤ فطرہ (زکوٰۃ) دینا واجب ہے۔ وہ وہی چیز ہونا چاہیے جو خود اُس نے کھائی ہو۔ اگر اس نے کئی قسم کی غذائیں استعمال کی ہوں، تو اُن میں سب سے اچھی غذا دینا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق گیہوں کے بدلے آٹا بھی نہ دینا چاہیے۔

نیز گھر میں جن جن لوگوں کا وہ کفیل ہے، اُن سب کا فطرہ دینا اس پر واجب ہے۔ جیسے بیوی، بچّے، اماں باپ اور نوکر وغیرہ۔ اگر نوکر دو آدمیوں کا مشترک ہے تو اس کا فطرہ دونوں پر واجب ہوگا، اور اگر نوکر کافر ہے تو اس کا فطرہ واجب نہیں۔ اگر بیوی اپنا صدقہ خود دے دے، تو بھی روا ہے۔ اگر شوہر خود دے دے تو بھی کوئی بُرائی نہیں۔

ہدایت :- زکوٰۃ کے متعلق اتنا ہی جاننا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ علماء وقت سے دریافت کرنا چاہیے۔

تفصیل
اَدائیگی زکوٰۃ کے متعلق

زکوٰۃ کب واجب ہوتی ہے | زکوٰۃ دیتے وقت حسبِ ذیل پانچ باتوں کا خیال رکھے :

اوّل - زکوٰۃ دیتے وقت نیت کرے، کہ واجب زکوٰۃ دیتا ہوں، اور اگر کسی کے ذریعہ سے دے، تو بھی نیت کرے، اور اس کو بھی نیت کرنے کی ہدایت کر دے۔ جب کسی بچّے کی طرف سے دے تب بھی نیت کر لینا چاہیے۔

دوم - ختم سال پر جب زکوٰۃ واجب ہو تو ادائیگی میں جلدی کرے۔ کیونکہ بلا عذر تاخیر اچھی نہیں۔ فطرہ عید کے دن دے دینا لازمی ہے۔ رمضان میں بھی جلدی کرنا چاہیے۔ لیکن قبل رمضان کی زکوٰۃ نہ دینا چاہیے۔

مال کی زکوٰۃ نکالنے میں ہمیشہ جلدی ہی مناسب ہے۔ بشرطیکہ ضرورت مند آدمی جس کو زکوٰۃ دینا ہے وہ زندہ رہے۔ اور اگر وہ مر جائے، یا کافر یا مالدار ہو جائے، تو دوبارہ زکوٰۃ دینا چاہیے۔

سوم - ہر چیز کی زکوٰۃ اسی میں سے دے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ چیز قطعی ناجائز ہے کہ چاندی کے بدلے سونا، یا گیہوں کے بدلے جَو دیئے جائیں۔

چہارم - صدقہ اس جگہ دینا زیادہ مناسب ہے۔ جہاں مال زیادہ ہو، اس لیے کہ اس جگہ ضرورت مند لوگ زیادہ آتے ہیں اور اگر دوسری جگہ دے گا تو زکوٰۃ قبول نہ ہوگی۔

پنجم - زکوٰۃ آٹھ گروہوں پر تقسیم کرنا چاہیے، لیکن ہر گروہ میں کم از کم تین آدمی شامل ہوں۔ اُن سب کی تعداد چوبیس ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ایک درہم بھی اُن سب گروہوں کے ہر ہر آدمی کو برابر بانٹ دے۔ آج کل تین گروہ تقریباً نایاب ہی ہیں۔ غازی - مؤلفہ - عامل زکوٰۃ - عام طور سے فقراء، مساکین، اور

قرضدار بھی زکوٰۃ کے خواہش مند ملتے ہیں۔

امام شافعیؒ کا قول | آپ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ پندرہ آدمیوں سے کم میں ہرگز تقسیم نہ کرے۔ کسی چیز کے بدلے میں دوسری چیز نہ دے۔ عموماً ان دونوں مسائل میں لوگ امام ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں، اُمید ہے کہ وہ ماخوذ نہ ہوں گے۔

زکوٰۃ کے مستحقین

زکوٰۃ کن لوگوں کو دینا چاہیئے | وہ آدمی زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو، نہ کمانے کی اس میں اہلیت ہو۔ اگر کسی کے پاس ایک دن کے لیے کھانے کو ہے، تو وہ فقیر نہیں۔ اور اگر اس کے پاس ایک وقت کا کھانے کو ہے۔ یا کپڑے بھی پورے جسم پر نہیں ہیں، تو وہ ضرور مستحق ہوگا۔ اگر وہ کسی اوزار سے کام کر سکے تو بھی فقیروں کی صف میں آئے گا۔

طالب علم اگر کسبِ مال کی وجہ سے طلب علم سے قاصر ہو جائے، تو وہ مستحق زکوٰۃ ہوگا، مگر ایسے طالبعلم بہت کم ملیں گے۔ لڑکے زیادہ ہوں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ عیال دار آدمی ہی کو زکوٰۃ دی جائے۔

۲۔ مسکین جس کا خرچ آمدنی سے زائد ہو، چاہے مکان اور کپڑے اس کے پاس ہوں۔ لیکن اگر سال بھر کا خرچ اس کے پاس نہ ہو، تو اس کو اتنا دے دینا چاہیئے۔ کہ وہ پورے سال کھا پی سکے۔ چاہے اس کے پاس سامان ضروری بھی موجود ہو۔ چونکہ ایک سال کی روزی اس کے پاس نہیں لہٰذا مسکین ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ چیزیں ہوں تو مسکین نہیں ہوگا۔

۳۔ وہ لوگ جو زکوٰۃ جمع کر کے مستحقین کو پہنچاتے ہیں، بلکہ اُن کا حق زکوٰۃ ہی سے نکال دینا چاہیے۔

۴۔ وہ لوگ جو عزّت دار ہیں، مگر بظاہر مانگ نہیں سکتے۔ اگر ان کے پاس مال ہوگا۔ تو اسلام کی اشاعت میں کوشش کریں گے۔ اُن لوگوں کو مولفۃ القلوب کہتے ہیں۔

۵۔ وہ غلام یا لونڈی جو اپنے مالک سے اپنے کو خود ہی مول لے کر اپنی قیمت رفتہ رفتہ ادا کردیں۔ وہ بھی مستحقین زکوٰۃ ہیں۔

۶۔ وہ لوگ جو دین کے کام کی وجہ سے غریب یا مقروض ہو گئے ہوں، اُنھوں نے کسی فتنہ یا شر کو دبانے کے لیے قرضہ لیا ہو۔

۷۔ وہ غازی لوگ جن کو حکومت کے خزانے سے کچھ نہ ملتا ہو۔ چاہے وہ خود مالدار ہوں، لیکن سفر کے اخراجات زکوٰۃ سے دینا چاہئیں۔

آٹھویں وہ لوگ جو سفر کرنا چاہتے ہوں، لیکن راہ خدا میں چاہے وہ عالمِ غربت میں ہوں یا گھر سے

سفر کرنا چاہیں، اُن کے لیے تحقیق کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر بعد میں معلوم ہو جائے کہ اُس نے دین کے کاموں کے لیے سفر نہیں کیا تھا، تو اُس سے زکوٰۃ واپس لے لینی چاہیے، لیکن متعدد لوگوں سے تحقیق کے بعد۔

زکوٰۃ کے باطنی اصول

نماز کی حقیقی و ظاہری صورتوں کی طرح زکوٰۃ کی بھی ظاہری و حقیقی صورت ہے۔

زکوٰۃ کے حقائق کو اگر نہ سمجھا جائے گا تو یہ عمل بالکل بیکار ہے۔ اس میں تین راز ہیں:

اوّل یہ کہ خداوندِ عالم سے دلی محبت ہونا چاہیے، اور جس کو خدا سے لگاؤ نہیں، وہ مومن نہیں، بلکہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ خدا سے محبت ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ دنیا کا کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ جس کا یہ دعویٰ نہ ہو کہ وہ خدا سے زیادہ دنیا کی کسی چیز کو چاہتا ہے۔ اس محبت اور خلوص کے امتحان کے لیے ایک کسوٹی مقرر کر دی گئی۔ تاکہ ہر آدمی اپنے کو اس پر کس کر دیکھ لے۔ لہٰذا ہر آدمی کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ترین چیز مال ہے۔ اس کو راہِ خدا میں زیادہ سے زیادہ لٹائے۔ اگر وہ سچا ہے تو ایسا کرے گا، ورنہ اس کے دعوے لاحاصل ہیں۔

جو لوگ مال کو خدا پر ترجیح نہیں دیتے، وہ تین قسم پر منقسم ہیں۔

پہلا طبقہ صدیقین کا ہے کہ اُن کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب کا سب خدا کی راہ میں دے دیا۔ اُن کے نزدیک زکوٰۃ کے قواعد و ضوابط کے ماتحت سو درہم میں سے پانچ درہم دینا کنجوسی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہو، وہ خدا کی راہ میں دے دیں۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ نے اپنا تمام مال راہِ خدا میں لٹا دیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اپنے اہل و عیال کے لیے کیا رکھا۔ تو عرض کیا کہ اپنا خدا اور اس کا رسولؐ۔ اسی گروہ میں سے بعض آدمی، وہ ہیں جنھوں نے

اپنا آدھا مال خدا کی راہ میں دیا۔ اُن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ ہیں کہ اپنا آدھا مال بارگاہِ نبوی میں لے کر حاضر ہوئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ جتنا مال لایا ہوں، اتنا ہی چھوڑ آیا ہوں۔ تو ارشاد ہوا بَیْنَکُمَا بَیْنَ کَلِمَتَیْکُمَا تفاوت" (یعنی تم دونوں کے درجات میں بھی وہی فرق ہے جتنا تمھاری باتوں میں)۔

دوسرا طبقہ وہ ہے، جو نیک انسان ہیں، اور یکبارگی اپنا مال خدا کی راہ میں نہیں دے سکتے۔ اور نہ اُن میں اُس کی اہلیت ہی ہے۔ مگر ضرورت مندوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں، اور حاجت مندوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ وہ لوگ صرف زکوٰۃ کی مقدار کا ہی خیال نہیں کرتے، بلکہ جو ضرورت مند آتا ہے اس کو اپنا عزیز سمجھ کر شفقت سے پیش آتے ہیں۔

تیسرا طبقہ وہ لوگ ہیں، جو صرف مقدارِ زکوٰۃ ہی تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دینے کی نیت نہیں ہے وُہ صرف خدا کا حکم خندہ پیشانی سے بجالاتے ہیں، اور نہ زکوٰۃ لینے والوں پر احسان جتاتے ہیں۔ یہ آخری درجہ ہے۔

ھدایت :- جن لوگوں کو خداوندِ عالم نے زکوٰۃ دینے کی مقدار کے مطابق مال دیا ہے، اور وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ یعنی دوسو درہم میں سے دس درہم نہیں دے پاتے۔ وُہ خدا کی دوستی سے محروم ہیں۔ وہ بخیل کہلاتا ہے۔

دُوسری باطنی خوبی :

کنجوسی کے غلط اصول سے بچنا۔ کیونکہ بخل دل کو نجس کرتا ہے اور نجاست قربِ خدا سے روکتی ہے۔ لہٰذا جب تک خدا کی راہ میں مال نہ دیا جائے بخل نہیں جا سکتا۔ اور جب تک بخل نہ جائے گا۔ نجاست کم نہ ہوگی۔ اور اگر نجاست کم نہ ہوگی تو خدا سے قربت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

ہاں سمجھنا چاہیے کہ زکوٰۃ وہ پانی ہے، جو نجاست کو دھوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ اور صدقہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اولاد پر (سادات) پر حرام ہے۔ اُن کی پاکیزگی کو دوسروں کے مال کے میل سے دُور رکھنا چاہیے۔

تیسری خوبی :

خُداوندِ عالم کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا۔ کیونکہ مال مومن کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔ وہ اِس کے لیے دُنیا اور آخرت میں آسائش کا سبب ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج بدن کا شکریہ ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ دینا مال کا شکریہ ادا کرنا ہے۔

لہٰذا جب اپنے کو نعمتِ مال سے بھرپور دیکھے، اور دوسروں کو ضرورت مند دیکھے، تو یہ سوچ، کہ یہ بھی میری طرح اللہ کا بندہ ہے۔ اس وقت خداوندِ عالم کا شکر بجالا، کہ اس نے تجھ کو مال دیا۔ اور دوسرے کو تیرا دست نگر بنایا۔ تو تجھ کو اس پر مہربان ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ خداوندِ عالم تیری آزمائش کر رہا ہو۔ اور اگر تو پورا نہ اُترا تو کہیں وہ ہی خدا تجھ کو اس جیسا اور اس کو تجھ جیسا نہ بنا دے۔

لہٰذا ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی باطنی خوبیوں کو سمجھے۔

آداب زکوٰۃ

اگر آدمی اپنی عبادات کے حقیقی پہلو کو سمجھنا چاہیے، اور اس کے ثواب کو دوگنا حاصل کرنا چاہیے۔ تو اس کے لیے حسبِ ذیل سات طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں۔

پہلا طریقہ : زکوٰۃ کی ادائیگی میں عجلت سے کام لے۔ اور واجب ہونے سے قبل ہی ادا کر دیا کرے اِس سے

آدمی کو فوائد پہنچتے ہیں۔

پہلا یہ کہ عبادت کے اثرات اس کے دل میں ہوتے ہیں۔ اگر اُس نے واجب ہونے کے وقت کے بعد دیا، تو گویا کہ مجبوراً دیا، اور اگر اس وقت نہ دے سکا، تو عذاب میں مبتلا ہوا۔ اور اس کے بعد دیا تو خوف اور ڈر کی وجہ سے دیا۔ ایسا آدمی اچھا نہیں کہ جو خوف کے باعث کوئی کام کرے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ضرورت مندوں کو ایک دم بغیر کسی اُمید کے ملے گا تو زیادہ خوشی ہو گی اور بغیر اُمید کے ملنے سے وہ زیادہ دُعا کریں گے، اور اُن کی دعا تیرے حق میں تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ صدقہ دینے سے آفاتِ دنیوی ٹل جاتی ہیں۔ تو جتنے جلدی صدقہ دیا، آفات تجھ سے دُور رہیں گی۔ معلوم ہونا چاہیے، کہ اگر آدمی کا دل خیر و برکت کی طرف مائل ہوتا ہے، تو وہ غنیمت ہے۔ اس پر خدا کی رحمت نازل ہے، ہو سکتا تھا کہ شیطان مسلط ہو جاتا فَاِنَّ قَلْبَ الْمُؤْمِنِ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (یعنی مومن کا دل خداوندِ عالم کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہے)۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک پرہیزگار متقی بزرگ کو طہارت کرتے وقت خیال آیا کہ اپنا کرتا کسی کو راہِ خُدا میں دے دیں۔ اُنھوں نے اپنے مُرید کو بُلا کر اپنا کُرتہ اس کو دے دیا۔ اس نے جواب دیا۔ اے میرے بزرگ باہر نکلنے کا انتظار کیوں نہ کیا، تو فرمایا ہو سکتا تھا کہ میں جب تک یہاں سے آتا، تو میرا خیال بدل جاتا، اور میں اس ثواب سے محروم ہو جاتا۔

دوسرا طریقہ :- اگر ایک ہی مرتبہ اکٹھا زکوٰۃ دینے کا ارادہ ہے، تو محرّم کے مہینے میں دے۔ اس لیے کہ یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے۔ یا ماہِ رمضان میں ادا کرے۔ کیونکہ صدقہ دینے میں وقت اور زمانے کو کافی دخل ہے جتنے اچھے وقت میں زکوٰۃ دے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

ہمارے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم سب سے زیادہ سخی تھے۔ آپ کے پاس جو کچھ ہوتا تھا راہِ خدا میں دے دیا کرتے تھے۔ خصوصاً رمضان میں اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے۔

تیسرا طریقہ :- جہاں تک ہو سکے زکوٰۃ پوشیدہ طور پر دے۔ ظاہر نہ کرے تاکہ ظاہر داری سے محفوظ ہو کر خلوصِ نیت پر مبنی رہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ صدقہ خداوندِ عالم کے غصّے کو ٹھنڈا کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بروزِ قیامت سات قسم کے لوگ عرش کے سایے میں ہوں گے۔ پہلے امامِ عادل۔ دوسرے داہنے ہاتھ سے صدقہ دینے والے ایسے لوگ جن کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

تصوّر کرنا چاہیئے، امام عادل کے درجات کا۔ حدیث میں ہے کہ جو لوگ چھپ کر صدقہ دیتے ہیں۔ اُن

کے اعمالِ باطنی ہی میں شمار ہوتا ہے ، اور جو ظاہر کر کے دیتے ہیں ، اُن کے اعمالِ ظاہری میں شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی لوگوں سے اپنے صدقہ دینے کے متعلق خود کہتا ہے ، تو اس کا یہ عمل صرف "ریا کاری" میں لکھا جاتا ہے۔

یہ ہی باعث تھا کہ پرانے لوگ انتہائی پوشیدہ طریقوں پر صدقہ دیا کرتے تھے۔ بعض لوگ تو نابینا لوگوں کو صدقہ دیتے تھے اور اس سے صرف یہ مقصد ہوتا تھا کہ اس کو دینے والے کا نشان نہ معلوم ہو سکے۔ اسی طرح بعض آدمی سوتے ہوئے آدمیوں کی چادر میں باندھ دیا کرتے تھے تاکہ اُن کا پتہ نہ چل سکے۔ کہ یہ صدقہ کس نے دیا۔ بعض بزرگانِ دین درویشوں کے راستے میں ڈال دیا کرتے۔ بعضوں کا قاعدہ تھا کہ کسی کی معرفت صدقہ بھجواتے تھے۔ یہ سب باتیں خلوص پر مبنی ہوتی تھیں کہ کسی کو صدقہ دینے والے کا نام نہ معلوم ہو سکے۔ اور خلوص میں کمی نہ آئے۔ حالانکہ ظاہر میں صدقہ دینا اس پہلو سے اچھا ہے کہ اس میں کنجوسی کے امکانات نہیں رہتے۔ لیکن ریا کاری بڑھتی ہے اور ریا کاری آدمی کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔

کنجوسی ایک بچھو کی مثل ہے اور ریا کاری سانپ کی مثل۔ جو بچھو سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر بچھو کو مار کر سانپ کو کھلا دیا جائے ، تو اس کی طاقت اور زیادہ ہوگی۔ نتیجے میں ایک "ریا کاری کی مصیبت سے نکل کر اس سے زیادہ سخت مصیبت مول لے لیتا ہے۔

ان باتوں کے نقوش مرنے کے بعد بالکل سانپ اور بچھو کے کاٹے ہوئے زخموں کی طرح ہوں گے ، جیسا کہ اسلامی اصول کی بحث میں لکھا جا چکا ہے۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکے چھپ کر ہی صدقہ دینا اچھا ہے۔

چوتھا طریقہ :- اگر آدمی اپنے نفس پر اتنا بھروسا رکھتا ہے کہ ظاہری طور پر صدقہ دینے میں اس کے خلوص میں کوئی کمی نہیں آسکے گی۔ بلکہ اس کے دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی صدقہ دیں گے تو ایسے آدمی کو کھُلم کھُلا ہی صدقہ دینا چاہیے۔ ایسا آدمی دنیوی تعریف کو نگاہ میں نہیں لاتا۔ بلکہ احکامِ خداوندی کو بجا لانے میں خلوص برتتا ہے۔

پانچواں طریقہ :- صدقہ دے کر لوگوں کو نہ جتانا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کو ظاہر کرنے سے ثواب جاتا رہتا ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (یعنی صدقے کو لوگوں پر ظاہر کر کے اس کے ثواب کو ضائع نہ کرو۔ اور درویشوں کے دلوں کو ایذا نہ پہنچاؤ) ان کے ساتھ سختی اور بدکلامی سے پیش نہ آؤ۔ جب وہ تم سے سوال کریں۔ یہ جہالت کے باعث لوگ کرتے ہوں اور اُن میں یہ دو وجوہ کی بنا پر بری عادت ہوتی ہے۔

پہلے یہ کہ وہ نہیں سمجھتا کہ وہ ایک درہم دے کر جنت میں جگہ حاصل کرے گا۔ یا اس کو اپنی تنگ دلی

کی وجہ سے ایک درہم دینے میں تکلیف پہنچتی ہے کہ وہ درشت کلامی کرتا ہے اور اگر وہ زکوٰۃ دینے پر ایمان کامل نہیں رکھتا، تو کیوں دیتا ہے۔ دوسری حماقت اور جہالت یہ ہے کہ وہ اپنے کو سائل سے افضل تصور کرتا ہے۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتا کہ درویش اس سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔ خدا کے نزدیک اس کا درجہ مالدار سے افضل ہے۔ اس کی افضلیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ مالدار آدمی کو "مال" کی محبت میں مبتلا کر دیا گیا ہے، اور اس کو حاجات کی بر آری کے لیے مقید کر دیا ہے، کہ وہ غریبوں اور مسکینوں کو دے۔ ایک پہلو اس کا یہ بھی ہوا کہ رئیس آدمی کو فقیر کے لیے بیگاری مقرر کیا ہے کہ وہ اس کا ہمیشہ خیال رکھے، اور اسی طرح آخرت میں پانچ برس تک جنت میں جانے کا منتظر رہے۔

چھٹا حکم یہ ہے کہ کسی پر احسان نہ جتائے، چونکہ یہ جہالت کی علامت ہے جس وقت رئیس آدمی کے دل میں احسان کا وسوسہ ہوتا ہے، تو ساتھ ہی ساتھ خوشامد کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ جتنی اس کی خدمت کرے گا، اتنا ہی وہ خوش ہو کر اس کو بخشش کرے گا۔ اور اگر وہ کسی وقت لا اعتنائی برتتا ہے تو رئیس آدمی سمجھتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ یہ نیکیاں کیں، اور یہ میری خدمت سے منہ موڑتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اگر دیکھا جائے تو اس تنگدست اور غریب آدمی نے اس کے مال کو قبول کر کے اس کے ساتھ نیکی کی کہ اس کا صدقہ قبول کر کے اس کو ثواب کا مستحق قرار دے دیا، اور دوزخ کی آگ سے اس کو رہائی دلا دی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر فصد کھولنے والا کسی کی مفت فصد کھول دے، تو وہ اس کا مرہونِ منت ہوگا، کہ اس نے اس کے جسم سے خونِ فاسد نکال دیا۔ اسی طرح زکوٰۃ کا مال جو اس کو گناہوں کی طرف لے جاتا۔ درویش نے اس سے لے کر اُن گناہوں سے نجات دلا دی۔ لہٰذا ہر امیر آدمی کو اس درویش کا مرہونِ منت ہونا چاہیئے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صدقہ اول خداوندِ عالم کے ہاتھ میں جاتا ہے اور پھر درویش کے ہاتھ میں آتا ہے۔ لہٰذا وہ فقیر نائبِ حق ہوا۔ تو رئیس کو اس کا ممنون ہونا چاہیئے، نہ کہ اس پر احسان جتائے۔

اِن تینوں حقیقتوں کو جب آدمی سمجھ لے گا، تو احسان جتانے کی حقیقت سے بھی آگاہ ہو جائے گا۔ پرانے بزرگوں نے احسان سے پرہیز کرنے میں مبالغہ تک کیا ہے۔ وہ لوگ فقیروں کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے، اور صدقہ دیتے وقت کہتے تھے کہ ہم سے قبول کر لیا جائے۔

بعض بزرگوں نے فقیروں کو صدقہ دینے میں اپنے ہاتھ نیچے رکھے ہیں تاکہ لینے والوں کے ہاتھ اوپر رہیں اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی (یعنی اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے) نہ ہے نصیب! کہ درویشوں کو کچھ دے سکے۔ ام المومنین حضرت عائشہ اور جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہما جب کسی درویش کو کچھ بھیجا کرتی تھیں، تو کہا کرتی تھیں کہ درویش کی دُعا کے الفاظ یاد رکھنا، تاکہ ہم بھی اس کے لیے دُعا کریں، اور

ہمارا یہ صدقہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے رہے۔ وہ درویش سے دُعا کی تمنا بھی نہ کرتی تھیں۔ کیونکہ دُعا کس احسان کے بدلے میں دی جاتی ہے۔ حالانکہ درویش خود احسان کرتا ہے۔ کہ اس نے صدقہ قبول کر لیا۔

ساتواں طریقہ۔ آدمی کے پاس جو حلال ترین اور اچھا مال ہو وہ صدقے میں دینا چاہیے اور جس مال میں کسی شبہے کی بھی گنجائش ہوگی، وہ قربتِ خداوندی حاصل نہ کر سکے گا۔ کیونکہ وہ سوائے پاک چیز کے دوسری چیز کو قبول نہیں کرتا۔ جیسا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ۔ جو چیز تم کو ملے اور تم اس کو کراہت سے قبول کرو۔ اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ اگر کوئی آدمی گھر کی خراب چیزیں مہمان کو پیش کرتا ہے تو وہ مہمان کی بے عزتی ہے۔ اسی طرح خدا کی بارگاہ میں بُری چیز کس طرح پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے نام پر بُری چیزیں دینے کے معنی یہ ہیں کہ کراہت کے ساتھ دی گئیں، اور اس صدقے کے قبول ہونے میں خدشہ ہے۔

زکوٰۃ دینے کے لیے مساکین کی تلاش

یوں تو کسی کو بھی صدقہ دے دیا جائے، تو آدمی اپنے فرض سے ادا ہو جاتا ہے، لیکن آخرت اگر خریدنا چاہتا ہے، تو کسی کوشش اور تلاش میں دقیقہ فروگذاشت نہ ہونا چاہیے۔ زکوٰۃ جتنی جائز جگہ صرف کی جائے گی، اتنا ہی ثواب بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ حسب ذیل پانچ قسم کے فقیروں میں سے کسی کو تلاش کر کے زکوٰۃ دے۔

اوّل۔ پارسا یا متقی درویش تلاش کرنا چاہیے۔ ارشاد نبوی ہے کہ اَطْعِمُوْا طَعَامَکُمُ الْاَتْقِیَاءَ (کھانا متقیوں کو دینا بہتر ہے) اس لیے کہ اگر پرہیزگاروں کو کھانا دیا جائے گا تو وہ کھا کر عبادت کریں گے، اور اس عبادت میں گویا کہ دینے والے کا حصہ بھی شامل ہے۔ چونکہ اس عابد کی اس صدقہ دینے والے نے مدد کی ہے۔

روایت ہے کہ ایک امیر آدمی سوائے صوفیائے کرام کے کسی کو صدقہ نہ دیتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ صوفیوں کو سوائے خدا کے کسی کا خیال نہیں رہتا۔ لیکن جب ان کو ضرورت ہوگی۔ تو خدا کی طرف سے اُن کا خیال ہٹ کر دوسری طرف جائے گا۔ لہٰذا میں ان کے خیالات کو خدا کی طرف لے جانے میں مدد دینا چاہتا ہوں۔ یہ اُن لوگوں سے بہتر ہیں جو دنیا طلبی میں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اس واقعہ کی اطلاع لوگوں نے حضرت جنیدؒ کو دی، تو آپ نے فرمایا کہ وہ آدمی بقالی کرتا تھا، اور درویشوں کو جو کچھ دیتا تھا۔ اس کی قیمت نہ لیتا تھا چنانچہ وہ آدمی غریب ہو گیا۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ نے اسی کو پھر اتنا ہی مال دے دیا اور دُعا کی کہ اب تو غریب

نہ ہوگا۔

دوم - اہل علم کو دینا چاہیے۔ بہتر ہے کہ طالب علم کو دیا جائے، تاکہ اُس کو اُس مال کے ذریعہ علم حاصل کرنے میں آسانی ہوسکے اور اس کے حصول علم میں دینے والا شریک ہوجائے۔

سوم - ایسا آدمی جو اپنی غربت کو چھپاتے ہو، اور بظاہر اپنی عزت بنائے رکھے۔ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے باوجود غربت کے بردباری سے کام لیا ہے) وہ آدمی جو بھیک مانگتے پھرتے ہیں اُن سے یہ لوگ بہتر ہیں۔

چہارم - اُن لوگوں کو زکوٰۃ دینا چاہیے، جو اہل وعیال رکھتے ہوں یا بیمار ہوں۔ چونکہ جتنے زیادہ ضرورتمند یا غمزدہ آدمی کو مال دیا جائے گا، اس کی تکلیف کی کمی میں اتنی ہی اس کو آسائش ہوگی، اور اس کے مطابق دینے والے کو ثواب بھی ملے گا۔

پنجم - وہ رشتہ دار جو غریب ہوں، اُن کو صدقہ دینا۔ صلہ رحم اور صدقہ دونوں چیزوں کا ثواب رکھتا ہے۔ جو آدمی صرف خوشنودی خدا کے لیے کسی سے میل جول رکھتا ہے، وہ بھی عزیزوں ہی کی مثل ہے۔ جن آدمیوں میں یہ صفات موجود ہوں، اُن کو صدقہ دینا زیادہ افضلیت رکھتا ہے۔ اور جب وہ دعائیں دیں گے، تو ان کی دعائیں کارگر ہوں گی۔

تنبیہہ | مال زکوٰۃ کا فر اور سید دونوں کو دینا ناجائز ہے۔ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ زکوٰۃ مال کے میل کی طرح ہے۔ لہٰذا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد (سیدوں) کو دینا منع ہے۔ چونکہ مال کا میل اُن کو دینا گناہ ہے۔ اسی طرح کفار کو بھی مسلمان کے مال کا میل نہ دیا جائے چونکہ وہ اس کے لائق نہیں ہوتے۔

زکوٰۃ کھانے کے آداب

زکوٰۃ لینے والے آدمی کو بھی پانچ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

اوّل یہ کہ خداوندِ عالم نے بعض بندوں کو غریب اور بعض کو مالدار بنایا ہے۔ جن لوگوں پر اس کی مہربانی تھی۔ اُن کو دنیوی جھگڑوں سے آزاد کر دیا۔ دنیا کے کمانے اور مال جمع کرنے کی تفکرات مالداروں کے ذمّہ کردیں۔ اُن کو حکم دیا، کہ وہ غریبوں کو اور اپنے عزیز ضرورت مندوں کو اُن کی ضروریات کے مطابق دیا کریں تاکہ وہ لوگ خدا کی عبادت میں مشغول رہیں۔ اور جب کوئی پریشانی ہو، تو اُمراء اُن کو رزق دیا کریں، تاکہ اُن کی دُعائیں امیروں کے گناہوں کا کفّارہ بن کر معاف کرادیں۔

درویش کو چاہیے کہ اتنا لے، جتنا کہ وہ کفایت سے خرچ کرسکے، اور خدا کی عبادت کرسکے۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی بادشاہ اپنے محبوب نوکروں کو ہر وقت اپنے سامنے رکھتا ہے اور اس کے سامنے سے ہٹ

کر وہ کوئی دوسرا کام کر سکیں۔ اور تاجروں کو ان کی خدمت کے لیے تعینات کر دیا ہے، جو ان کو خراج دیتے ہیں اور جیسے بادشاہ اپنے محبوں کی خدمت عوام سے لیتا ہے۔ اسی طرح خداوندِ عالم بھی اپنے خاص بندوں کی خدمت امیروں سے لیتا ہے۔ اسی لیے فرماتا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (یعنی ہم نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) لہٰذا درویشوں کو چاہیے کہ وہ اسی نیت سے زکوٰۃ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دینے والا، لینے والے سے افضل نہیں ہے، بشرطیکہ لینے والا اس لیے لے کہ وہ عبادتِ خدا میں مشغول رہے گا۔

دوم۔ درویش جو کچھ لے وہ یہ سمجھ کر لے کہ وہ خدا کی عبادت کے لیے لیتا ہے۔ اور رئیسوں کو خداوندِ عالم کا فرمانبردار سمجھ کر لے، کہ وہی اپنے حکم سے یہ اس کو دلاتا ہے۔ اس نے ان رؤسا پر ایک موکل مقرر کر دیا ہے اور اُن کا ایمان ہے جو خدا کا عنایت کردہ ہے۔ چونکہ اُن لوگوں کی نجات صدقے میں ہی مضمر ہے۔ اور اگر ایمان کا جذبہ اس میں نہ ہوتا تو ایک پیسہ بھی کسی کو خیرات نہ کرتا۔

پس تعریف اسی خدا کے لیے ہے جو اُن سے صدقہ دلاتا ہے۔ فَاِنَّ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ (یعنی جس نے آدمی کا احسان نہ مانا، اس نے خُدا کا بھی شکر ادا نہ کیا۔

خداوندِ عالم اپنے بندوں کی بھی تعریف کرتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ خود ہی اُن اعمالِ حسنہ کا خالق ہے اور اُن کا شکریہ بجالاتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّہٗ اَوَّابٌ (یعنی توبہ کرنے والا بندہ کتنا اچھا ہے) ایک جگہ یہ فرمایا، کہ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (یعنی بے شک وہ نبی سچا تھا)

یہ مثالیں صرف اس لیے دی گئی ہیں کہ خداوندِ عالم جس کو نیکی کا واسطہ بناتا ہے، اُس کو عزت بھی دیتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ طُوْبٰی لِمَنْ خَلَقْتُہٗ لِلْخَیْرِ وَیَسَّرْتُ الْخَیْرَ عَلٰی یَدَیْہِ (یعنی اس کے لیے خوشی کا باعث ہے، جس کو میں نے نیکی کے لیے پیدا کیا، اس کے بزرگوں کی عزت کرنا چاہیے) اس کا نام شکریہ ادا کرنا ہے۔ دینے والے کے لیے بھی واجب ہے کہ درویش کے حق میں یہ دعا کرے، طَہَّرَ اللّٰہُ قَلْبَکَ فِیْ قُلُوْبِ الْاَبْرَارِ وَزَکّٰی عَمَلَکَ فِیْ عَمَلِ الْاَخْیَارِ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی رُوْحِکَ فِیْ اَرْوَاحِ الشُّہَدَآءِ (یعنی خداوندِ عالم تیرے دل کو پاک کر دے نیکیوں کے واسطے اور تیرے عملوں کو نیکوں کے اعمال کے ساتھ، اور رحمت نازل ہو، تیری روح پر شہیدوں کی طرح۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو آدمی تمہارے ساتھ نیکی کرے تُم اس کے ساتھ نیکی کرو۔ اور اگر تم نیکی کرنے کے لائق نہیں ہو، تو اتنا ہی کرو کہ اس کے حق میں اتنی دُعا کرو کہ نیکی کا بدلہ اس سے چکا سکو۔

بہترین طریقہ شکریہ ہے کہ صدقے کو عیب نہ سمجھے اور اس کو چھپائے۔ تھوڑے کو ذلیل نہ سمجھے ——

اسی طرح دینے والے کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ چاہے کتنا ہی دے، مگر اس کو حقیر سمجھے۔

سوم، یہ کہ حرام مال صدقے میں نہ لے، نہ سودی اور ظلم کا مال ہی لینا جائز ہے۔

چہارم، یہ کہ اتنا ہی لے جتنا اس کی ضرورت پوری کر دے، اور اگر زادِ راہ کے لیے لینا ہو تو بھی صرف سے زیادہ نہ لے، اور اگر قرض ادا کرنے کے لیے لیتا ہو، تو بھی اتنا ہی لے۔ اسی طرح عیال کی پرورش کے لیے جتنا ضرورت ہو، اتنا ہی لے۔ اس لیے کہ ضرورت سے زیادہ ایک پیسہ بھی لینا حرام اور ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر گھر میں کپڑا اور دوہرا اسباب زیادہ ہو، تو بھی زکوٰۃ نہ لینا چاہیے۔

پنجم۔ اگر زکوٰۃ دہندہ اہلِ علم سے تعلق نہ رکھتا ہو، تو اس سے یہ دریافت کر لے کہ یہ زکوٰۃ کس مد کی ہے آیا قرضدار کی ہے یا مسکین کے لیے؟ اگر وہ صفت اپنے میں پائے تو اس کو لے لے، ورنہ نہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا آٹھواں اگر دینے والا دے، کسی ایک ہی آدمی کو دے، تو بھی نہ لینا چاہیے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ زیادہ سے زیادہ آدمی کو پہنچنا ضروری ہے۔

صدقہ دینے کی فضیلت

فضائلِ صدقہ حدیث نبوی کے مطابق صدقہ ضرور دینا چاہیئے۔ چاہے وہ کم سے کم مقدار میں کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ ضرورت مند کے لیے بہت کچھ ہوگا اور تمھارے گناہوں کو اسی طرح دھو دے گا۔ جس طرح پانی آگ کو دفع کر دیتا ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اگر کچھ بھی دینے سے قاصر ہو، تو کم از کم خوش طبعی ہی سے کام لو۔ فقیر کو جھڑکو نہیں۔

جو آدمی مال حلال سے صدقہ نکالتا ہے، تو خداوندِ عالم اسی طرح تم پر مہربان ہوگا، جس طرح تم لوگ اپنے پالے ہوئے جانوروں پر مہربان رہتے ہو۔ حدیث میں ہے کہ میدانِ قیامت میں ہر آدمی اپنے صدقے کے سائے ہی میں کھڑا ہوگا۔ چاہے مخلوق کا کوئی بھی گنہگار ہو۔ صدقہ آنے والے مصائب کو روک دیتا ہے۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ دینا زیادہ اچھا ہے؟ تو فرمایا آنحضرتؐ نے کہ جب کہ آدمی مالدار ہو اور صحت مند ہو، نہ کہ اس وقت جبکہ دم نکل رہا ہو۔ کیونکہ اس وقت تو وہ مجبوراً دے گا، بخوشی نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بار فرمایا کہ جو آدمی ایک بار سائل کو واپس کرتا ہے۔ سات روز تک فرشتے اس کے یہاں نہیں آتے ہیں۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ اپنے ہاتھ سے ہی دیا کرتے تھے۔ اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی کسی کو کپڑا دینا۔ خداوندِ عالم اس کو اس وقت تک، اپنی حفاظت میں رکھتا ہے۔ جب تک وہ کپڑا استعمال میں رہتا ہے۔

واقعہ اُمّ المومنین | حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پچاس ہزار درہم صدقے میں دیئے، لیکن اپنے پیراہن میں پیوند ہی لگے رہنے دیئے۔ مسعود رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں، ایک شخص نے ستر سال متواتر عبادت میں گزارے، مگر اس سے ایک گناہ کبیرہ سرزد ہوا، اور اس کی تمام عبادات ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد اس نے ایک درویش کو ایک روٹی کا ٹکڑا دے دیا، تو بارگاہِ ایزدی سے وہ گناہ معاف کردیا گیا۔

ایک بار لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی، کہ جب تو کوئی گناہ کرے تو صدقہ دے دے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ، انتہائی فراخدلی اور شکر کے ساتھ صدقہ دیتے تھے۔ وہ خداوندِ عالم کا حکم یاد کرتے۔ کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (یعنی جب تک تم اپنی عزیز ترین چیز خدا کی راہ میں نہ دوگے اس وقت تک نیکی کے راستے پر نہ آسکو گے) خداوندِ عالم گواہ ہے کہ میں اس کا شکر ادا کرنے کو بہت دوست رکھتا ہوں۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صدقہ اسی وقت قبول ہوتا ہے جب دینے والا ثواب کو حاصل کرنے کا اتنا ہی متمنی ہو جتنا صدقہ لینے والا صدقے کا۔

جناب حسن بصری نے ایک بردہ فروش کے پاس ایک حسین کنیز دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو دو درہم میں فروخت کردے۔ تو اس نے منع کیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ خداوندِ عالم ایک حور دو درہم صدقہ دینے کے بدلے میں عنایت کرتا ہے، جو اس کنیز سے کہیں بہتر ہے۔

چھٹا اصول

(باب الصوم)

روزے کے بیان میں

روزہ بھی ارکانِ اسلام کا ایک رکن ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ میں ایک نیکی کے بدلے میں دس سے لے کر سات سو گنا تک بخشتا ہوں، لیکن روزہ اُن نیکیوں میں بڑی خصوصیت رکھتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (یعنی وہ لوگ جو اپنی مرضی سے صبر کرتے ہیں، اُن کو لاتعداد اجر ملتا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر کرنا، آدھا ایمان کا درجہ رکھتا ہے اور روزہ آدھے صبر کی منزلت رکھتا ہے۔ روزہ دار کے منہ کی بُو خدا کے نزدیک مشک و عنبر سے کہیں بہتر ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری وجہ سے کھانا پینا اور مباشرت کو ترک کیا، تو میں بھی اس کا بدلہ اس کو دوں گا۔ حدیث میں ہے کہ روزہ دار کا سونا بھی عبادت ہے، اور اس کا ہر سانس بہ منزلہ تسبیح کے ہے۔ اس کی تمام دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اور فرمایا کہ جب رمضان شریف قریب آتا ہے تو بہشت کے دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے اور دوزخ کے

دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔نیک آدمیوں کے لئے حکم ہوتا ہے کہ یہ وقت تمھارا ہے ، اور بُروں کے لیے لعنت ہوتی ہے ۔

روزے کو خداوندِ عالم نے اپنے سے متعلق کہا ہے ۔ اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ (یعنی روزہ میرے واسطے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا) اگرچہ سب ہی عبادتیں خدا کے لیے ہوتی ہیں ، مگر روزے کو خصوصاً اپنا بتایا ہے ، جس طرح کعبے کو اپنا گھر ہی کہا ہے ۔

روزہ خصوصاً دو وجوہ سے خُدا کی طرف منسُوب کیا گیا ہے :

پہلے یہ کہ روزے کا دار و مدار صرف ترکِ خواہشات ولذّات پر ہے ۔ یہ صرف روحانی حقیقتوں پر مبنی ہوتا ہے ۔

دوسرے یہ کہ روزہ خواہشاتِ نفسانی کو تباہ کرتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی شیطانی لشکر میں سے ہیں ۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ انسان کے جسم میں شیطان خون کی طرح دوڑتا ہے ۔ لہٰذا بھوک کے ذریعہ اس کے زور کو کم کرو ۔ (اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ) روزہ اس کی سپر ہے ۔

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بہشت کا دروازہ کھٹکھٹایا کرو ۔ لوگوں نے اس کا ذریعہ دریافت کیا ۔ تو جواب دیا کہ بھوک کے ذریعہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ روزہ عبادت کا ایک دروازہ ہے ۔ اس کی فضیلتیں صرف اس بناء پر ہیں کہ دُنیا کے تمام گناہ اور خواہشات کو روزے کی بُھوک روکتی ہے ۔

فرائضِ روزہ

روزے کے دس فرائض ہیں :

پہلا : یہ معلوم کرو کہ چاند اُنتیس کا ہے یا تیس کا ۔ اس کے لیے صرف ایک گواہ عادل کا کہنا مان لینا چاہیئے ۔ لیکن عید کے چاند کے لیے دو عادلین کی ضرورت ہوتی ہے ۔

جو آدمی کسی کو سچّا جانتا ہو ، اور وہ اس سے چاند کی تصدیق کر دے تو روزہ واجب ہے ۔ چاہے حاکمِ وقت اس کے قول کی تردید کر دے ، اور اگر اپنی جائے قیام سے سولہ میل دُور پر چاند دیکھا گیا ہے تو روزہ فرض نہ ہوگا ۔ اور اگر راستہ سولہ میل سے کم ہوگا ، تو روزہ واجب ہے ۔

دوم ۔ ہر رات کو یہ سوچ کر نیت کرے کہ یہ روزہ واجب رمضان کا ہے اور واجب ہے ۔ پس جو آدمی یہ یاد رکھے گا ، گویا کہ وہ نیت کرتا ہے ۔ لیکن اگر اس کو شک ہے اور اسی حالت میں مشکوک ہی روزہ رمضان کی نیت کرے گا ، تو یہ نیت ٹھیک نہیں ہے ۔ چاہے رمضان کا روزہ واجب ابھی رکھتا ہو ۔ اوّل اپنا شک دُور کر لینا ضروری ہے ۔ رات کو بعد سحر یہ نیت دُرست ہوگی ۔ چاہے اس وقت تک اس کو رمضان میں یا عید میں شک

ہو، اور اگر آدمی کہیں اندھیرے میں اور اپنے وثوق کی بِنا پر ہی نیت روزہ کرتا ہے تو اس کا روزہ ہو جائے گا۔

اور اگر رات کو سونے سے پہلے نیت کر چکا ہے۔ اور اس کے بعد بھی کچھ کھالے تو بھی روزہ نہیں جاتا اور اگر عورت کو یہ خیال ہو کہ حیض بند ہو جائے گا اور وہ نیت کرلے اور دن میں حیض بند بھی ہو جائے تو اس کا روزہ ہو جائے گا۔

سوم۔ باہری کوئی چیز جسم کے اندر نہ جانی چاہیے۔ مگر فصد کھلوانا۔ حجامت۔ سُرمہ، یا کان میں دوائی ڈالنا، اور روئی کا پھایا ذکر میں رکھنا کوئی نقصان کا باعث نہیں ہوتا۔

باطنی جگہوں سے پیٹ۔ معدہ اور مثانہ وغیرہ مراد ہیں۔ اگر غیر ارادی طور سے کوئی شے ان کے اندر چلی جائے جیسے گرد و غبار۔ مکھی یا کلی کا پانی، تو اس سے روزہ باقی رہتا ہے۔ لیکن عمداً زیادہ دیر تک کلی نہ کرے اور غرارے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

اگر بھول کر کچھ کھالیا ہے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر یہ نہ معلوم ہو کہ سحر کا وقت ختم ہوگیا، یا روزے کے افطار کے وقت سے پہلے کھالے، تو روزے کی قضا واجب ہے۔

چہارم۔ بیوی کے ساتھ روزے کی حالت میں جماع کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اگر روزہ یاد نہ رہے اور یہ عمل کرلے، تو باقی رہتا ہے، یا رات کو مباشرت کر کے علی الصباح غسل کرلے تو کوئی قباحت نہیں۔

پنجم۔ کسی طرح بھی بحالتِ روزہ منی نکالنے خواہ وہ انزال کی صورت میں یا جماع کی صورت میں جائز نہیں۔

ششم۔ خود بخود اگر قے ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن ارادۃً کرنا منع ہے۔ بلغم کھانسی کی وجہ سے نگل جائے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کو نگل لینا منع ہے۔

روزے کے یہ سنتیں بھی ہیں :

سحری دیر کر کے کھانا۔ پانی یا کھجور سے افطار روزہ میں جلدی کرنا۔ بعد زوال آفتاب مسواک کرنا۔ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ تلاوت قرآن شریف زیادہ سے زیادہ کرنا۔ مسجد میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا خصوصاً رمضان کی آخری دس راتیں بہت مبارک ہیں۔ انھیں میں سے ایک شبِ قدر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان راتوں کو عبادت زیادہ کرتے تھے۔ اہل عبادت سے بھی غفلت نہ کرتے تھے۔

شبِ قدر رمضان کی اکیسویں تیئیسویں پچیسویں یا ستائیسویں راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔ زیادہ تر روایات ستائیس کے متعلق ہیں۔ افضل یہی ہے کہ اس پورے عشرے میں اعتکاف کرے۔ لیکن اعتکاف کی حالت میں سوائے حوائج ضروریہ کے یا جتنی دیر وضو کرے، مسجد سے باہر نہ نکلے۔

اگر عبادت - طہارت - نماز جنازہ یا شہادت کے لیے مسجد سے باہر آئے گا تو اعتکاف نہ ٹوٹے گا۔ جب مسجد سے باہر آئے اور حاجاتِ ضروریہ سے فارغ ہو کر مسجد میں واپس ہو تو دوبارہ سے اعتکاف کی نیت کرے۔

روزے کے باطنی رموز اور مدارج

روزہ | باطنی طور سے روزہ تین مدارج پر تقسیم کیا گیا ہے :

اوّل - عوام الناس کا روزہ رکھنا۔

دوم - خواص کے لیے۔

سوم - مخصوص بندگانِ خدا کا روزہ رکھنا۔

تفصیل

عوام کے لیے روزے میں صرف یہ تخصیص ہے کہ وہ کھانے پینے اور جماع کرنے سے پرہیز کریں۔ یہ سب سے نیچا رتبہ ہے۔

لیکن مخصوص ترین بندوں کا روزہ بلند ترین مراتب رکھتا ہے۔ وہ لوگ اپنے دل کو بجز ذات خداوندی کسی طرف ملتفت نہیں کرتے۔

اس سلسلے میں اگرچہ دُنیاوی مقاصد کو سوچنا یا تدبیر کرنا اچھا ہے۔ مخصوص ترین روزہ اس سے بھی ٹوٹ جاتا ہے بعض علماء اس کے قائل ہیں، کہ اگر روزے کی حالت میں افطار کے وقت کے سامان کی تیاری کرے تو بھی روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ چونکہ رزق اس نے اپنے ذمّہ لیا ہے۔ اور اس تیاری میں اس کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن یہ مراتب صرف انبیاء اور صدیقین کو ہی حاصل ہیں۔

دوسری قسم جو خواص کی بتائی گئی۔ وہ یہ ہے اکہ عوام الناس کی خصوصیات کے علاوہ دنیوی ناشائستہ ہنگاموں سے بھی بچا رہے۔ اس روزے کی تکمیل کے لیے چھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اوّل، یہ کہ روزے میں اس طرف نگاہ نہ کرے جو شہوت کا باعث ہو، یا وہ چیزیں جو خدا کی یاد میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ تیر بھی شیطان کے زہر آلود تیروں میں سے ایک ہے۔ جو آدمی ان سے پرہیز کرتا ہے، اس کے دل میں خلوص پیدا ہوتا ہے، اور وہ اس میں ایک کیف و سرور حاصل کرتا ہے۔

حضرت انسؓ کے قول کے مطابق پانچ چیزوں سے روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ دروغ - غیبت - نکتہ چینی - جھوٹی قسمیں - کسی پر شہوت و خواہش کی نظر ڈالنا۔

دوم - یاوہ گوئی سے بچنا اور خدا کی عبادت و تلاوتِ قرآنِ مجید کرنا - یکبار باتوں سے پرہیز کرنا بعض علماؒ کے نزدیک غیبت اور جھوٹ بولنا بھی عوام النّاس کے روزے کو باطل کر دیتا ہے ۔

حدیث میں وارد ہوا کہ زمانۂ نبوت میں ہی دو عورتوں نے روزہ رکھا ، اور پیاس کی زیادتی کی وجہ سے قریب بمرگ ہوگئیں ، تو حضورؐ سے روزہ کھولنے کی اجازت مانگی - حضورؐ نے ایک پیالہ دیا ، کہ اس میں قے کر دیں ، تو دونوں کے مُنہ سے خون کے ٹکڑے نکلے - تو حکم ہوا کہ دونوں نے حلال روزی سے روزے رکھے لیکن کسی کی غیبت کرنے نے ان کا روزہ توڑ دیا ، اور یہ خون کے ٹکڑے - ان لوگوں کا گوشت ہے ، جو انھوں نے کھایا ہے -

سوم - بے ہُودہ باتوں کا سُننا بھی ناجائز ہے - اس لیے کہ جو عمل خود کرنا اچھا نہیں ، اس کو دیکھنا اور سننا بھی اچھا نہیں - وہ دونوں برابر کے ماخوذ ہیں -

چہارم - جسم کے تمام اعضاء کو حرکاتِ ناشائستہ سے بچائیے ، جو آدمی روزے کی حالت میں ایسا کرتا ہے وہ ایسے بیمار کی طرح ہے ، جو زہر کھا لیتا ہے اور میووں کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے - اسی طرح گناہ بھی زہر ہے حضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے بھی ہیں جن کو روزے میں سوائے بھوک اور پیاس کے کوئی ثواب نہیں ملتا -

پنجم - روزے کے افطار کے وقت ناجائز یا شبہہ چیزوں کا استعمال نہ کرے - اگر حلال ہی ہو ، تو بھی اس وقت زیادہ نہ کھانا چاہیے - کیونکہ ایک ہی وقت میں دن و رات کی مقدار کھا جانا نفس کشی کے خلاف ہے اور روزے کا مقصد نفس کو مارنا ہے سنّت تو یہ ہے کہ دن کو زیادہ نہ سوئے ، تاکہ بھوک اور پیاس کے اثرات سے آشنا ہو سکے - شام کو تھوڑا بہت کھا کر سو رہے ، تاکہ تہجّد کے وقت اُٹھ سکے - حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بھرا ہوا معدہ خدا کے نزدیک ایک بھرے ہُوئے برتن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا -

ششم - روزہ دار افطار کے بعد بھی یہ دُعا کرتا رہے کہ روزہ قبول ہو جائے - حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے عید کے دن کچھ لوگوں کو ہنستے ہوئے دیکھا ، جو کھیل میں مشغول تھے ، تو آپ نے فرمایا کہ خداوندِ عالم نے رمضان کو عبادت کی بُنیاد قرار دیا ہے - اس میں بعض لوگ تو پورے اُترتے ہیں اور بعض پیچھے رہ جاتے ہیں - لیکن تم لوگوں پر تعجب ہے کہ تم ہنس رہے ہو ! اگر تم لوگوں کی نظروں سے پردے ہٹا دیئے جائیں تو تُم میں جن لوگوں کی عبادات مقبول بارگاہ ہوگئی ہیں ، وہ مسرور ہوں گے ، اور جن کی نہیں ہوئیں وہ روئیں گے - لیکن اس لہو و لعب میں کوئی مشغول نہ ہوگا - معلوم ہوا کہ جو لوگ روزہ صرف کھانے پینے سے پرہیز کرنے ہی کو سمجھتے ہیں - اُن کی ایک ہیجانی کیفیت ہوتی ہے -

اصل روزہ دار وہ ہے، جو روزے میں فرشتوں کی سیرت بنائے۔ چونکہ فرشتے تمام خواہشاتِ دنیوی سے مبرا ہیں۔ اور یہ تمام خواہشات بالکل چارپاؤں کی سی ہیں۔ لہٰذا خواہشات رکھنے والے روزہ دار چارپاؤں کی طرح ہیں، اور جو لوگ خواہشات کو اپنا تابع بنا لیتے ہیں وہ فرشتوں کے ہمسر ہیں۔ وہ لوگ روحانی طور پر فرشتوں کے قریب ہوتے ہیں جسمانی طور پر نہیں۔ بالکل اسی طرح اس صفت کے لوگ خدا کے نزدیک ہوتے ہیں۔

جو آدمی کھانے پینے کے سامان میں مشغول رہتا ہے، اور افطار کے وقت پیٹ بھر کھانا کھا لیتا ہے اس کی وجہ سے شہوی خواہشات بھی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ایسی خواہشات میں روزے کی اصل حقیقت اور روحانی لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔

قضا۔ کفّارہ۔ اِمساک و فدیہ

قضا واجب روزہ چھوڑ دینے سے قضا اور کفّارہ واجب ہوتا ہے۔ اس کفارے اور قضا کی مختلف صورتیں ہیں۔ جن لوگوں پر روزہ واجب ہے وہ (مکلّف) کہلاتے ہیں۔ اگر وہ بغیر کسی عذر کے روزہ چھوڑ دیں، اس پر قضا واجب ہے۔ اسی طرح بیمار، حاملہ، یا حالتِ حیض میں روزے کی قضا واجب ہے۔ دیوانگی یا بلوغیت سے پہلے قضا نہیں ہوتی۔

کفّارہ روزے کی حالت میں جماع کرنے یا کسی بھی طریقے سے منی کے نکالنے سے روزہ کا کفارہ دینا پڑتا ہے۔

کفّارہ : ۱۔ دو ماہ تک روزے رکھے، یا

۲۔ لونڈی یا غلام آزاد کرے، یا

۳۔ ساٹھ مُد گیہوں کسی غریب کو صدقہ کرے۔ اس کی مقدار آج کل تقریباً تیس سیر کے برابر ہوتی ہے۔

امساک امساک کے اصل معنی ہیں، دن میں فاقے کے ساتھ برائیوں سے پرہیز کرنا۔ اگر بغیر کسی عذر کے دن میں روزہ کھول لیا جائے یا کسی عذر کے بغیر روزہ نہ رکھا جائے، تو امساک واجب ہوتا ہے۔

لیکن اگر عورت دن میں کسی وقت حیض سے فارغ ہو جائے، یا مسافروں میں کہیں قیام کر لے یا بیماروں میں صحت یاب ہو جائے تو امساک واجب نہیں ہوتا۔

اگر صرف کسی ایک آدمی نے کسی سے چاند نظر آنے کی شہادت دے دی ہے، اور اس کے کہنے کی بنا پر اس آدمی نے روزہ توڑ دیا ہے، تو اس پر روزہ واجب ہوگا اور وہ باقی تمام دن مثل دوسرے

روزہ داروں کے رہے۔

جو آدمی دن کو سفر شروع کرے، اس کو روزہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔
اسی طرح اگر روزے افطار سے پہلے اپنے جائے مقام یا کسی شہر میں پہنچ کر قیام کرے تو بھی وقت افطار سے پہلے افطار نہ کرے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اگر مسافر اتنی طاقت رکھتا ہے کہ عالم مسافرت میں روزہ رکھ سکے، تو اس کے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے، بہ نسبت نہ رکھنے کے۔

فدیہ ایک مد اناج کسی غریب کو دینا۔

دودھ پلانے والی یا حاملہ عورت پر واجب ہے لیکن روزے کی قضا بھی ضروری ہے۔ جو عورت اپنے بچے کی موت کے ڈر سے روزہ قبل از وقت افطار کرلے، اس پر فدیہ نہیں ہوتا۔ جو آدمی اپنی ہلاکت یا کوئی بوڑھا اپنے ضعف کے باعث، روزہ نہ رکھ سکے، تو اس پر بجائے روزے کی قضا کے فدیہ واجب ہے۔ جو آدمی قضا روزے دوسرا رمضان آنے سے پہلے پہلے نہ رکھے، اس پر فدیہ اور روزوں کی قضا دونوں واجب ہیں۔

ثواب روزۂ سنّت سال کے تمام متبرک دنوں میں روزے رکھنا سُنّت ہے۔ جیسے عرفہ۔ عاشورہ، اور ذی الحجّہ سے نو دن پہلے۔ شعبان سے دس دن پہلے حدیث میں وارد ہوا ہے کہ رمضان کے واجب روزوں کے کے بعد محرّم میں روزے رکھنا سب سے افضل ہیں۔ اور پورے محرّم کے روزے رکھنا سنّت قرار دیئے گئے ہیں۔ خصوصاً پہلے عشرۂ محرّم میں روزے رکھنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ حدیث میں ہے کہ محرّم میں ایک روزہ رکھنا کسی دوسرے مہینے کے تیس روزوں سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ اسی طرح رمضان کا ایک روزہ محرّم کے تیس روزوں سے زیادہ افضل ہے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو آدمی محرم کے جمعرات جمعہ اور ہفتے کو روزہ رکھتا ہے۔ اس کو سات سو برس کی عبادت کا ثواب ملتا ہے۔ یہ بھی حدیث میں ہے کہ ماہ ذوالحجّہ کے مہینے کے پہلے عشرے سے زیادہ خداوند عالم کو کوئی دوسرا مہینہ عزیز نہیں۔ چونکہ یہ حج کے دن ہیں اس عشرے میں ایک روزہ ایک سال کے روزوں کا ثواب رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ رسُول اللہؐ سے دریافت کیا گیا کہ کیا جہاد سے بھی زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ نہیں، لیکن اس آدمی کو جہاد سے زیادہ ثواب ملے گا جس کا گھوڑا مارا گیا ہو۔

بعض صحابہؓ نے رجب کے پورے مہینے میں روزے رکھنا مکروہ قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ روزہ کا تواتر رمضان کے مقابل ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ شعبان کی پندرہ کے بعد سے رمضان کے چاند تک کوئی

روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ نیز شعبان کے آخر میں رمضان کے استقبال کے خیال سے روزہ رکھنا بھی مکروہ ہے۔ لیکن علاوہ اس کی دوسری نیت سے رکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔

اسی طرح ہر ماہ کی تیرھویں، چودھویں، پندرھویں تاریخوں میں روزے رکھنا افضل ہے۔ ان دنوں میں چاند پورا ہوتا ہے، اور ان دنوں کو ایام بیض کہا جاتا ہے۔ سال میں ہفتہ۔ اتوار، جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھنا چاہیے سال میں پانچ تاریخوں میں روزے نہ رکھنا اچھا ہے۔ ذی الحجہ کی گیارہ۔ بارہ اور تیرہ (ایام تشریق) عید الفطر عید الضحیٰ۔ لیکن ان سنت روزوں میں اگر کوئی آدمی روزہ افطار کر دے، تو اس کو منع نہیں کرنا چاہیے، یہ مکروہ ہے۔ صوم داؤد کے مطابق ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن روزہ رکھے۔ اگر تواتر کے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ عبداللہ ابن عمر بن عاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ رکھنے کا بہتر طریقہ دریافت کیا تو حضور نے حکم دیا کہ صوم داؤدی کا طریقہ پھر دریافت کیا کہ اس سے بہتر طریقہ اور بھی ہو سکتا ہے؟ تو فرمایا آپ نے کہ اس سے افضل کوئی طریقہ نہیں ہے۔

اگر اس طرح روزے نہ رکھ سکے تو ہر جمعرات اور اتوار کو روزہ رکھے۔ روزے کا اصل مقصد صرف نفس کشی ہے۔ اور صفائی دل، جب آدمی اس رتبے کو پہنچ جائے تو اپنے دل پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ کبھی روزہ رہے اور کبھی افطار کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ لوگوں کو ہوتا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے، اور کبھی یہ بھی ہوتا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے۔ آپ کے روزہ رکھنے کی کوئی متعین مدت یا وقت نہ تھا۔ بعض علماء نے ایام تشریق اور عیدین کے علاوہ روزوں کی افطار کو مکروہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ روزے کی عادت نہ رہنے سے دل گناہوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔

ساتواں اصول

(باب الحج)

آداب حج کے بیان میں

حج بھی ارکان واجب میں سے ایک رکن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس آدمی نے حج نہ کیا وہ یہودی یا نصرانی کی طرح مرا۔ اور فرمایا کہ جس آدمی نے حج کیا اور اس کے بعد گناہوں سے بچا رہا۔ وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہے، جس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو۔ یہ بھی فرمایا کہ بعض گناہوں

کی معافی صرف عرفات میں کھڑے ہونے سے ہی ہوتی ہے۔

شیطان عرفے کے دن غمناک ذلیل اور شرمندہ ہوتا ہے، اتنا کسی دن نہیں ہوتا، کیونکہ اُس دن خداوندِ عالم زیادہ سے زیادہ گناہ بخشتا ہے۔ جو آدمی حج کے راستے میں مر جاتا ہے، اس کو ہمیشہ ہمیشہ ایک حج کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ جو آدمی مکّے یا مدینے میں مرتا ہے، حساب و کتاب قیامت کے دن اس کے لیے معاف ہے۔

حضور ؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں کہ آدمی عرفات میں کھڑے ہو کر بھی اپنے کو گناہگار خیال کرے۔ ایک صاحب جن کا نام علی بن موفق تھا، فرمایا کہ میں ایک بار حج میں شریک ہوا تو عرفے کی رات کو دو فرشتوں کو خواب میں دیکھا، کہ سبز لباس پہنے آئے ہیں۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ ان میں کتنے حاجی ہیں، اور کتنوں کا حج قبول ہوا، تو دُوسرے نے جواب دیا کہ نہیں، تو پہلے فرشتے نے کہا کہ یہ سب چھ لاکھ آدمی ہیں۔ لیکن حج صرف چھ آدمیوں کا مقبول ہوا ہے۔ وہ بزرگ خواب سے بیدار ہو گئے۔ اور سوچا کہ میں اُن چھ آدمیوں میں ہرگز شامل نہیں ہو سکوں گا۔ اسی فکر میں مشعر الحرام میں جا کر سو گیا۔ پھر انھیں فرشتوں کو خواب میں دیکھا کہ وہ ہی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نے دوسرے سے دریافت کیا، کہ آج خُدا نے حکم دیا ہے کہ صرف ان چھ آدمیوں کی وجہ سے سب چھ لاکھ آدمیوں کو معاف کر دیا ہے۔ آپ خواب سے بیدار ہوئے اور خوش ہو کر خدا کا شکر بجا لائے۔

حدیث رسولؐ میں وارد ہوا ہے، کہ ہر سال چھ لاکھ آدمی حج کیا کریں گے اور اگر کسی سال کم ہوں گے تو فرشتوں سے اس کمی کو خُداوندِ عالم خود پورا کرے گا۔ قیامت کے دن خانہ کعبہ ایک آراستہ عروس کی طرح ہوگا اور حاجی اُس کے چاروں طرف طواف کریں گے، اور جس وقت خانہ کعبہ جنّت میں داخل ہوگا تو تمام حاجی بھی جنّت میں ساتھ ساتھ داخل ہوں گے۔

شرائطِ حج

اوقاتِ حج حج کے اوقات شوال، ذیقعد اور ذی الحجہ کے مہینے کے پہلے نو دن ہیں۔ پس جو آدمی وقت پر حج کرے گا، اس کا حج دُرست ہوگا۔ روزِ عید کی صبح سے احرام بندی دُرست ہے۔ اگر اس سے پہلے کی ہے تو وہ عمرہ کہلاتا ہے۔ بالغ اور عاقل کے لیے حج دُرست ہے۔ شیر خوار اور ناسمجھ بچّے کے لیے اس کا ولی احرام باندھے اور عرفات میں لے جائے، اور وہ ہی طواف کرے گا۔

حج حقیقی مسلمان کے لیے ہی دُرست ہے اور اس کے لیے پانچ ضروری شرائط ہیں:

شرائطِ حج
۱- مسلمان ہونا۔
۲- آزاد ہونا۔

۳ - بالغ ہونا۔

۴ - عاقل وسمجھدار ہونا۔

۵ - وقت پر احرام باندھنا

اسی طرح اگر نابالغ احرام باندھے اور عرفات میں کھڑے ہونے سے پہلے بالغ ہو جائے یا غلام آزاد ہو جائے تو حج درست ہو جائے گا۔ اسی طرح عمرہ ادا کرنے کی بھی یہی شرائط ہیں۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ عمرہ سال بھر میں کسی وقت بھی ادا ہو سکتا ہے۔

نیابتِ حج | کسی دوسرے کی طرف سے حج کرنے کی یہ شرط ہے کہ پہلے فرائضِ اسلامی ادا کرے۔ اگر ادائیگی فرائض سے پہلے نیابت کرے گا تو ادا کرنے والے کا حج ادا ہوگا۔ دوسرے کی طرف سے نہ ہو سکے گا۔

پہلے حج اسلام کرنا ضروری ہے۔ پھر قضا، پھر نذر اس کے بعد نیابت ہوتی ہے چاہے نیت کچھ کرے۔

واجباتِ حج | مسلمان ہونا۔ بالغ وعاقل ہونا۔ حج کی استطاعت رکھنا۔ استطاعت کی دو قسمیں ہیں:

اوّل یہ کہ آدمی تندرست ہو اور خود حج کرے۔ دوسرے یہ کہ مفلوج یا اتنا بیمار ہو کہ خود حج نہ کر سکے۔

پہلی شرط کے ماتحت تین باتیں ہیں: اوّل تندرستی۔ دوم راستے کا پُرامن ہونا۔ سوم اتنا پیسہ ہو کہ اخراجات حج کے علاوہ اہل وعیال کا کفیل ہو سکے، اور سواری کا کرایہ بخوبی ادا کر سکتا ہو۔ چونکہ پیدل چلنا ضروری نہیں ہے۔ دوسری استطاعت کے ماتحت بیمار یا مفلوج ہونا۔

اگر ایسا مفلوج یا بیمار ہے کہ خود نہ جا سکتا ہو اور اتنا پیسہ ہو کہ حج کے شرائط پورے ہوں تو کسی دوسرے کو حج کرنے بھیجے۔ بہتر ہے کہ اپنے بیٹے ہی کو بھیجے، اور وہ بلا اُجرت باپ، دادوں کی طرف سے حج ادا کرے۔ اور اگر بیٹا، باپ کی طرف سے کسی کو پیسہ دے کر حج کرانا چاہے تو درست نہ ہوگا اور اگر کوئی غیر آدمی اس کی طرف سے حج کرنے کے لیے مُفت تیار ہو، تو بھی اس کا احسان مند ہونا ضروری نہیں۔

لیکن جب استطاعت ہو جائے، تو حتی الوسع جلدی کرے، اور اگر دیر کرے گا تو بھی کوئی حرج نہ ہوگا۔ اگر زیادہ تاخیر کی اور بغیر حج ادا کیے مر گیا تو البتہ گنہگار ہوگا۔ ایسی صورت میں اس کے پیسے سے حج کرانا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ اس پر قضا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ دوسرے شہروں میں ایسے لوگوں پر جو باوجودِ استطاعت کے حج نہ کریں، جزیہ عائد کر دوں۔

ارکانِ حج

ارکانِ حج : یعنی جن کے بغیر حج درست نہیں، وہ پانچ ہیں :

احرام باندھنا ۔طواف کرنا ۔ سعی کرنا ۔ عرفات میں کھڑا ہونا ۔ سب کے ایک ہی طرح بال ترشوانا ۔
جن واجبات کے ترک کرنے سے حج باطل نہیں ہوتا، وہ چھ ہیں :
اوّل میقات میں احرام باندھنا واجب ہے۔ لیکن اگر بلا احرام گزر گیا ہے تو ایک بکرا حلال کرنا واجب ہے۔
دوّم ۔ سنگریزے مارنا ۔ سوّم غروب آفتاب تک عرفات میں ٹھیرنا ۔ چہارم مزدلفہ میں رات کو رہنا ۔
پنجم منیٰ میں قیام کرنا ۔ ششم ۔ وداعی طواف کرنا ۔
دوسرے قول کے مطابق پہلے چار واجبات ترک کرنے سے بکرا حلال کرنا واجب نہیں بلکہ سنّت ہے ۔

ادائیگی حج | حج ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں : افراد ۔ قران ۔ تمتع ۔

ان میں افراد افضل ترین ہے ۔ مثلاً پہلے تنہا حج کرلے اور ارکان حج کے بعد باہر آکر عمرے کا احرام باندھ کر احرام بجالائے ۔ لیکن جعرانہ میں عمرے کا احرام باندھنا تنعیم سے زیادہ افضل ہے ۔ اسی طرح تنعیم میں احرام باندھنا، حدیبیہ سے زیادہ افضل ہے ۔ ان تینوں جگہوں پر باندھنا سنّت ہے ۔

دوسرے قران یہ ہے کہ حج اور عمرے کی نیت یکجا کرے اور کہے کہ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ بِحَجَّۃٍ وَّعُمْرَۃٍ تاکہ دونوں ارکان کا احرام یکبار ہوجائے ۔ اس نیت کے بعد جب اعمال حج بجالائے گا تو دونوں کا ثواب ملے گا ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا غسل کرنے میں وضو بھی خود بخود ہوجاتا ہے ۔ ایسا کرنے والے پر ایک بکرا حلال کرنا ضروری ہے، مگر باشندگانِ مکّہ پر واجب نہیں ۔ کیونکہ ان کے لیے "میقات" مکّہ ہی ہے ۔ اور وہ مکّے ہی میں احرام باندھے گا ۔

جو آدمی قران کرے اور عرفات پر قیام سے پہلے طواف و سعی بھی کرے تو سعی حج اور عمرہ میں شمار کی جائے گی ۔ لیکن عرفات کے طواف کے بعد اس کا اعادہ کیا جائے ۔ کیونکہ طواف کی شرط یہ ہے کہ عرفات پر ٹھیرنے کے بعد ہونا چاہیے ۔

تمتع سے یہ مقصد ہے کہ میقات پہنچنے پر عمرے کا احرام باندھے، اور مکّہ معظمہ میں تحلّل کرے (احرام سے باہر آنا) تاکہ حالتِ احرام میں نہ رہے، اور اس کے بعد حج کے وقت مکّے میں حج کا احرام باندھے ۔ اس طرح بھی ایک بکرا واجب ہے، اور اگر بکرا حلال نہ کرسکے تو تین دن عید الضحیٰ سے پہلے روزے رکھے ۔ وہ چاہے متواتر رکھے یا بغیر ترتیب، اور وطن پہنچ کر سات روزے رکھے ۔

اس طرح اگر قران میں بکرا حلال نہ کرسکے، تو بھی اسی طرح دس روزے رکھے ۔
تمتع کی قربانی اس شخص پر ہوتی ہے جس نے عمرے کا احرام شوال یا ذیقعد یا ذالحجہ کے عشرے میں کیا ہو اور حج کا احرام اپنے میقات سے نہ باندھا ہو، اور اگر وہ مکّہ معظمہ کا باشندہ ہے، یا مسافر ہے اور حج کے زمانے

میں میقات کو گیا ہے، یا اتنی ہی مسافت کوئی دوسری طے کی ہو، تو اس پر بکرا واجب نہیں ہے۔
ممنوعاتِ حج چھ ہیں: لباس کا پہننا۔ احرام میں کپڑے اور موزے پہننا منع ہیں۔ اس وقت نعلین اور تہبند ہونا چاہیے، اور اگر نعلین ممکن نہ ہوں تو کفش پہنے۔ اسی طرح اگر تہبند نہ ہو تو شلوار اور پاجامہ پہن سکتا ہے تہبند سے سات عضوِ جسم ڈھانپنا ضروری ہیں۔ لیکن سر کھلا رہنا چاہیے۔

عورت کو اپنا لباس ہی پہننا چاہیے، جو وہ ہر وقت استعمال کرتی ہے۔ اگر کسی محمل یا سائبان کے اندر ہو تو خیر، ورنہ منہ نہ ڈھانکنا چاہیے۔

دوم، اگر خوشبو استعمال کرے گا یا لباس پہنے گا، تو ایک بکرا واجب ہے۔

سوم، اگر بال منڈوائے گا یا ناخن کٹوائے گا، تو ایک بکرا واجب ہے۔ لیکن حمام میں جانا، فصد کھلوانا، اور بالوں کو اس طرح کھول دینا کہ وہ اکھڑ نہ جائیں یہ درست ہے۔

چہارم، جماع کرنا، اگر کرے گا، تو ایک اونٹ یا سات بکرے حلال کرنا واجب ہے۔ اور اس کا حج فاسد ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں قضا بھی واجب ہوگی۔ لیکن اگر پہلے تحلّل کے بعد جماع کیا ہے، تو ایک اونٹ واجب ہوگا، اور ایسی صورت میں حج بھی باطل نہ ہوگا۔

پنجم، عورت کے ساتھ مساس کرنا۔ بوسہ لینا اور جو باتیں طہارت میں نقص پیدا کریں، ان سب میں ایک بکرا واجب ہوتا ہے۔

حالتِ احرام میں نکاح کرنا بھی جائز نہیں

ششم، شکار کرنا۔ لیکن دریائی شکار کرنا جائز ہے۔ اگر خشکی میں شکار کرے گا، تو یا تو وہی جانور یا اس کے مشابہ دوسرا کوئی جانور حلال کرنا واجب ہوگا۔

کیفیاتِ حج

تمام ارکانِ حج کو علی الترتیب اوّل سے آخر تک جاننا ضروری ہے، اور اس کے فرائض و سنتیں سب کچھ جاننا چاہئیں۔ جو آدمی عبادت کرتا ہے، اُس کے لیے واجب اور سنت ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے جو آدمی مقربین کے مراتب پر پہنچتا ہے اس کے لیے سنتیں اور نوافل سب ایک ہی مرتبہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے کہ فرائض کی ادائیگی بندوں کو میرے قریب لاتی ہے اور مجھ سے محبت کرنے والا بندہ میرا تقرب حاصل کرنے کے لیے سنتوں اور نوافل کو کبھی فروگزاشت نہ کرے گا۔ یہاں تک کہ اس کے تمام اعضاء میرے نہ بن جائیں، وہ سب میرا ہو جائے۔ اس کا عمل میرے لیے ہو جائے۔ لہٰذا تمام سنتوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہر عبادت

کے آداب کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

ضروریاتِ حج

اوّل - سامانِ سفر : جب آدمی حج کا ارادہ کرے تو ظلم سے باز آئے، اور بارگاہِ خداوندی میں توبہ کرے۔ اپنا قرضہ ادا کرے۔ نیز اپنے اہل و عیال کا نان نفقہ بھی دے دے۔ وصیت نامہ لکھ دے۔ خرچ سفر کسب حلال سے حاصل کرے۔ مشتبہ مال ساتھ نہ لے۔ کیونکہ ایسے مال سے حج قبول نہ ہوگا۔ زادِ راہ اتنا لے کہ مسکینوں اور ضرورت مندوں کو دے سکے۔ گھر سے چلنے سے پہلے صدقہ دے دے۔ اچھی سواری پر یا اچھے جانور پر سفر کرے۔ ساتھ میں جو کچھ قابلِ محصول سامان ہو، محصول والوں کو دکھا دے۔ پرہیزگار و عبادت گزار ہمراہیوں کے ساتھ سفر کرے۔ دوستوں کو وداع کی خبر دے کہ دعائے خیر کا طالب ہو۔ اس وقت ہر ایک سے یہ کہے اِسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِیْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَخَوَاتِیْمَ عَمَلِكَ (یعنی تیرا دین، تیری امانت، تیرا انجام، اور تیرے اعمال خدا کے سپرد کرتا ہوں) تو اس وقت وہ لوگ اس کو یہ جواب دیں فِیْ حِفْظِ اللّٰهِ وَكَنَفِهٖ زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰی وَجَنَّبَكَ الرَّدٰی وَغَفَرَ ذَنْبَكَ وَوَجَّهَكَ لِلْخَیْرِ اَیْنَمَا تَوَجَّهْتَ (یعنی خداوند عالم تجھ کو اپنی حفاظت میں نیکی کا راستہ دکھلائے اور ہلاکت سے بچائے، تو جس طرف متوجہ ہو، نیکی کی طرف ہو) جس وقت گھر سے باہر نکلے، تو دو رکعت نماز سنّت اس طرح پڑھے کہ پہلی رکعت میں بعد الحمد کے قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھے، اور دوسری رکعت میں بعد الحمد کے سُورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھے۔ نماز ختم کر کے یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَاَنْتَ الْخَلِیْفَةُ فِی الْاَهْلِ وَالْوَلَدِ وَالْمَالِ اِحْفَظْنَا وَاِیَّاهُمْ مِنْ كُلِّ اٰفَةٍ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ فِیْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰی وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی (اے خدا! تو حفاظت کر میری سفر میں اور میرے گھر والوں، اولاد اور مال کو محفوظ رکھ، اور تمام آفات سے بچا! اور اے خدا میں اس سفر میں تیری ہی اطاعت کروں گا، اور پرہیزگاری سے کام لوں گا۔ میں معافی مانگتا ہوں تجھ سے اور ہر وہ کام کروں گا، جس سے تو خوش ہوگا) اور جب گھر سے باہر قدم نکالے تو کہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اَللّٰهُمَّ بِكَ انْتَشَرْتُ وَعَلَیْكَ تَوَكَّلْتُ وَبِكَ اعْتَصَمْتُ وَاِلَیْكَ تَوَجَّهْتُ اَللّٰهُمَّ زَوِّدْنِیَ التَّقْوٰی وَاغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَوَجِّهْنِیْ لِلْخَیْرِ اَیْنَمَا تَوَجَّهْتُ (یعنی شروع کرتا ہوں میں اپنا کام (سفر) خدا کے نام پر اور سوائے خدا کے کوئی چیز طاقت ور نہیں ہے اور اے خدا صرف تیرے بھروسے پر سفر کرتا ہوں (گھر چھوڑتا ہوں) اور تیری رسّی کو مضبوط پکڑے ہوئے ہوں۔ اے خدا تو مجھے پرہیزگاری کا راستہ دکھا۔ میرے گناہوں کو بخش دے۔ میرے تمام توجّہ اور ارادے تیری خوشنودی کے لیے ہوں) اس کے بعد جب سفر کی سواری پر سوار ہونے لگے تو پڑھے۔ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ

مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ - (یعنی شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے (اپنا سفر) جو بہت بڑا اور پاک ہے جس نے ہر چیز کو مسخر کر دیا ہے، اور ہم کوئی قدرت نہیں رکھتے لیکن ہم خدا کی طرف پھرنے والے ہیں) تمام سفر میں تلاوتِ کلامُ اللہ کرتا رہے اور اس کے ذکر میں مشغول رہے۔ جب بلندی سے گزرے تو یہ پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الشَّرَفُ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ وَلَكَ الْحَمْدُ عَلٰى كُلِّ حَالٍ (یعنی اے خدا بزرگی صرف تیرے واسطے ہی ہے، تیرا ہر حال میں شکر ہے) اگر راستے میں کچھ خطرہ ہو تو آیۃ الکرسی - شَهِدَ اللّٰهُ - سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ - سورہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور سورۃ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ کا وِرد کرے۔

مکّہ معظّمہ اور احرام باندھنے کے آداب

جس وقت میقات میں پہنچے اور قافلہ احرام باندھے، تو پہلے غسل سنّت کرے اور بال ناخن ترشوائے سِلے ہوئے کپڑوں کو اتار دے۔ سفید چادر اوڑھ لے تہبند باندھ لے۔ نیّت احرام سے پہلے خوشبو بھی استعمال کرے، اور جب جانے کا قصد کرے، تو راستے کی جانب منہ کر کے ہاتھ اٹھا کر نیّت حج کرے اور خلوص نیّت کے ساتھ یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ (اے خدا میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ اور نہیں ہے تیرا کوئی شریک، میں حاضر ہوں۔ یقیناً تمام تر تعریف اور نعمتیں تیرے لیے ہیں اور نہیں ہے کوئی تیرا شریک) اسی طرح ہر جگہ جہاں جہاں قافلہ اکٹھا ہوتا رہے یہی دعا پڑھتا رہے۔ اس کے بعد جب مکّے کے قریب پہنچے تو غسل سنّت بجا لائے۔

حج میں نو وجہوں کی بنا پر غسل کو سنّت قرار دیا ہے۔ احرام۔ دخولِ مکّہ۔ طوافِ زیارت۔ وقوفِ عرفہ مقامِ مزدلفہ۔ پتھر پھینکنے کے لیے تین بار غسل۔ اسی طرح تین غسل جمروں میں، لیکن طواف وداع اور جمرۃ العقبیٰ میں پتھر پھینکنے کے لیے غسل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب غسل کر کے مکّے میں داخل ہو، اور بیت اللہ پر نگاہ پڑے تو اگرچہ شہر میں ہی کیوں نہ ہو، یہ دعا پڑھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ وَدَارُكَ دَارُ السَّلَامِ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ اَللّٰهُمَّ هٰذَا بَيْتُكَ عَظَّمْتَهٗ وَشَرَّفْتَهٗ وَكَرَّمْتَهٗ، اَللّٰهُمَّ فَزِدْهُ تَعْظِيْمًا وَزِدْهُ تَشْرِيْفًا وَتَكْرِيْمًا وَزِدْهُ مَهَابَةً وَزِدْ مَنْ حَجَّهٗ بِرًّا وَّكَرَامَةً۔ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَاَدْخِلْنِيْ جَنَّتَكَ وَاَعِذْنِيْ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ (یعنی سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں ہے، وہ بزرگ ہے۔ اور تجھ پر سلام ہو۔ تیرا گھر سلامتی کا گھر ہے اور اے بزرگ و برتر ہستی تو بابرکت ہے۔ اور اے خدا تو نے اپنے اس گھر کو بزرگی و اشرفیت و کرامت بخشی، اور اے اللہ تو اس کی عزّت و منزلت کو اور بڑھا اور اے خدا جس نے تیرا حج ادا کیا اس شخص کی نیکی و بزرگی کو بڑھا۔ اور اے خدا میرے لیے اپنی بخشش و کرم کے دروازوں کو کھول دے۔ مجھے اپنی

جنّت میں جگہ عنایت کر، اور پناہ میں رکھ! مجھے مردود شیطان سے)

اس کے بعد بنی شیبہ کے دروازے سے مسجد میں داخل ہو، اور حجرِ اسود کا رُخ کرے، وہاں پہنچ کر بوسہ دے۔ اگر وہاں ہجوم کی زیادتی کی وجہ سے بوسہ نہ دے سکے تو اس طرف ہاتھ اُٹھا کر یہ دُعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اَمَانَتِیْ اَدَّیْتُھَا وَمِیْثَاقِیْ تَعَاھَدْتُہٗ اَشْھَدْ لِیْ بِالْمُوَافَاۃِ (یعنی اے پالنے والے میں اپنی امانت سے ادا ہوا، اور عہد سے بری۔ تُو میرے حق کے ادا کرنے کا گواہ رہنا۔ اس کے بعد طواف کعبہ میں مشغول ہو جائے۔

آدابِ طوافِ کعبہ

نماز کی طرح طواف میں بھی کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ستر عورت بھی ضروری ہے جلواف کی حالت میں آپس میں باتیں کرنا مباح ہیں۔

سنّتِ اضطباع یہ ہے کہ تہبند کا درمیانی حصّہ داہنے ہاتھ کے نیچے کی طرف کر کے دونوں کناروں کو بائیں کندھے پر ڈالے، اور کعبۃ اللہ کی طرف پہلو کر کے حجرِ اسود سے طواف شروع کرے۔ یہ سُنّت ہے اس کو پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔

طریقہ طواف طواف کے شروع کے وقت بیت اللہ سے تین قدم سے زیادہ فاصلہ نہ ہو، تاکہ پیر فرش اور پردے سے مس نہ کر سکیں۔ ابتدائے طواف کے وقت یہ دُعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اِیْمَانًا وَّتَصْدِیْقًا بِکِتَابِکَ وَوَفَاءً بِعَھْدِکَ وَاتِّبَاعًا لِسُنَّۃِ نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (اے پروردگار یہ میرا طواف کعبہ تجھ پر ایمان رکھنے اور تیری کتاب کی تصدیق اور تیرے فرمان کی بجا آوری اور تیرے رسول کی سُنّت کی بجا آوری ہے) اس کے بعد جب بیت اللہ کے دروازے پر پہنچے، تو پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا الْبَیْتُ بَیْتُکَ وَھٰذَا الْحَرَمُ حَرَمُکَ وَھٰذَا الْاَمْنُ اَمْنُکَ وَھٰذَا الْمَقَامُ الْعَائِذُ بِکَ مِنَ النَّارِ (اے خُدا یہ گھر تیرا گھر ہے اور یہ حرم تیرا حرم ہے، یہ جائے امن تیری ہے، اور یہ اس کے لیے ہے، جو تجھ سے اور تیری آگ سے پناہ لینا چاہتا ہے) جس وقت رکنِ عراقی پر پہنچے تو یہ دُعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّکِّ وَالشِّرْکِ وَالْکُفْرِ وَالنِّفَاقِ وَالشِّقَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ (اے خدا میں شک، شرک اور کفر ونفاق سے پناہ مانگتا ہوں اور اخلاقِ بد اور نگاہِ بد سے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے پناہ مانگتا ہوں) اور جب پرنالے کے نیچے پہنچے تو یہ پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اَظِلَّنِیْ تَحْتَ عَرْشِکَ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّ عَرْشِکَ اَللّٰھُمَّ اسْقِنِیْ بِکَاْسِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَرْبَۃً لَا اَظْمَاُ بَعْدَھَا اَبَدًا (اے پروردگار تو مجھے اس دن جب کہ سوائے عرش کے کوئی سایہ نہ ہوگا، پناہ دینا، اور اے خدا مجھے وہ پیمانۂ محمدی عطا کر کہ جس کے

پینے کے بعد میں کبھی پیاسا نہ ہوں)

جب رکن شامی پر پہنچے تو یہ پڑھے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّ سَعْیًا مَّشْکُوْرًا وَّ ذَنْبًا مَّغْفُوْرًا وَّتِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ یَا عَزِیْزُ یَا غَفُوْرُ اِغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ (یعنی اے خدا تو میرے حج کو قبول فرما! اور میری کوشش کو قبول کر، میرے گناہوں کو بخش دے۔ وہ سوداگری عطا کر جو فاسد نہ ہو۔

جب رکن یمانی پر پہنچے، تو پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْکُفْرِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْفَقْرِ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخِزْیِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (یعنی اے اللہ میں کفر، غربت، عذابِ قبر، فتنۂ حیات وموت اور رسوائی دنیا وآخرت سے پناہ مانگتا ہوں)

جب حجرِ اسود کے درمیان پہنچنے لگے، تو پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا بِرَحْمَتِکَ عَذَابَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ (یعنی اے خدا تو مجھے دنیا میں نیکی کا راستہ دکھا! اور اپنی رحمت سے عذابِ قبر اور دوزخ سے بچا)

اسی طرح سات مرتبہ طواف بجالائے، اور ہر مرتبہ یہی دعائیں پڑھے۔ ہر مرتبہ طواف کرنے کو "شوط" کہتے ہیں۔ پہلے تین شوط میں جلدی کرے۔ اگر خانہ کعبہ کے پاس زیادہ ہجوم ہو تو دور سے طواف کرے، تاکہ جلدی جلدی چل سکے۔

بعد والے "چار شوط" میں آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش کرے اور ہر مرتبہ حجرِ آسود کو بوسہ دے کر رکنِ یمانی پر ہاتھ پھیرے۔ اگر ہجوم کی وجہ سے بوسہ نہ دے سکے اور ہاتھ سے مس نہ کر سکے، تو دور سے ہی اشارہ کرے۔

جب ساتوں شوط ختم ہو جائیں تو بیت اللہ اور حجرِ اسود کے درمیان پیٹ، سینہ اور داہنا رخسار بیت اللہ کی دیوار سے مس کر کے کھڑا ہو۔ اور دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھ کر دیوار پر رکھے یا کعبے کے آستانے پر رکھے۔ (اس جگہ کو ملتزم کہتے ہیں) اس جگہ دعا قبول ہوتی ہے۔ وہاں یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ یَا رَبَّ الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ اَعْتِقْ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِ وَاَعِذْنِیْ مِنْ کُلِّ سُوْءٍ وَّقَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِکْ لِیْ فِیْمَا اٰتَیْتَنِیْ (یعنی اے بزرگ وبرتر گھر کے مالک! میری گردن دوزخ کے عذاب سے بچا! مجھے گناہوں سے محفوظ رکھ! اور اپنے عطا کردہ رزق پر قناعت کی طاقت بخش! اپنی بخششوں پر قناعت کی طاقت دے!)

اس کے بعد درود پڑھے، اور استغفار کر کے حاجات طلب کرے۔ اس کے بعد بالکل سامنے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز بجالائے۔ اس نماز کو "رکعت طواف" کہتے ہیں۔ نماز کی پہلی رکعت میں بعد "سورۃ الحمد"

سُورہ قُلْ یٰاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ - دوسری رکعت میں بعد سورۂ الحمد سُورہ قُلْ ھُوَ اللّٰہ پڑھے، پھر دُعا مانگے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ جب تک ساتوں شوط پورے نہ کرے گا، پورا طواف ختم نہ ہوگا، اور ساتوں مرتبہ بھی دو رکعت نماز پڑھے۔ اس کے بعد حجر اسود کو جاکر بوسہ دے اور ختم کرکے سعی میں مشغول ہو جائے۔

آدابِ سعی

طواف سے فراغت کے بعد "کوہِ صفا" پر اتنی بلندی تک جائے کہ بیت اللہ نظر آنے لگے۔ اور کعبے کی طرف منہ کرکے یہ پڑھے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ وَصَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَاَعَزَّ جُنْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ (یعنی نہیں ہے کوئی پروردگار سوائے اس خدائے لاشریک کے۔ تمام دُنیا اس کی ہے، اور سب حمد اس کے واسطے ہے۔ وہ ہی زندگی دیتا ہے، وہ ہی مارتا ہے، وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے قبضے میں سب بھلائیاں ہیں۔ اور نہیں ہے کوئی پروردگار مگر خدائے یکتا کہ جس کا وعدہ سچا ہے۔ اُس نے اپنے بندوں کی مدد کی ہے۔ اور اپنے لشکر کو عزت بخشی ہے، اور شکست دی ہے بُرے لشکروں کو۔ اور کوئی پروردگار نہیں سوائے اس خدائے یکتا کے۔ اگرچہ کافر جانتے ہیں اس کے بتلائے ہوئے دین کو مگر مانتے نہیں ہیں)

اس کے بعد دُعا کرے اور حاجات طلب کرے۔ اس کے بعد وہاں سے اتر آئے۔ پھر "سعی" میں مشغول ہو جائے، اس طرح کہ پہلے "مروہ" تک آہستہ آہستہ چلے اور پڑھے۔ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ - اَللّٰہُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (یعنی اے پالنے والے! تُو رحم کر اور معاف کر دے، اس سے جو کچھ تو جانتا ہے۔ یقیناً تو بڑی عزت والا ہے۔ اور اے پالنے والے! تُو ہم کو دُنیا و آخرت میں نیکی کا راستہ عطا کر! اور عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھ)

اس کے بعد میل سبز تک (جو گوشۂ مسجد پر ہے) آہستہ آہستہ جائے، وہاں پہنچ کر چھ گز تک تیزی سے چلے۔ یہاں تک کہ دوسرے میل تک پہنچ جائے اور وہاں سے کوہ مروہ تک آہستہ آہستہ جائے۔ پھر وہاں سے اوپر چڑھے، اور کوہ صفا کی طرف منہ کرے، اور مندرجہ بالا دعائیں پہلے کی طرح پڑھے، یہ عمل ایک بار کرے لیکن کوہ صفا پر اگر جائے گا تو دو بار ہوگا۔ اسی طرح ساتوں مرتبہ عمل کرے۔

اس سے فراغت پاکر "طواف قدوم" اور طواف سعی کرے۔ یہ عمل حج میں سنت ہے۔

وہ طواف رکن حج ہے۔ وہ وقوف عرفات کے بعد ہوگا۔ اور طہارت کرنا سعی میں سُنّت ہے۔ اور طواف میں واجب ہوگی۔ سعی صرف اس قدر کافی ہے۔ کیونکہ عرفات کے وقوف کے بعد سعی کرنا اچھا نہیں ہے۔ لیکن طواف بعد میں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ وہ طواف سنّت ہے۔

آداب عرفات

آداب وقوف عرفہ

خاص عرفے کے دن اگر عرفات میں پہنچے، تو قدوم کا طواف نہ کرے۔ ترویہ (ذالحجہ کی آٹھویں تاریخ) کو مٰنا میں رہے، اور دوسرے دن عرفات کو جائیں۔ وقوف کا وقت زوال کے بعد (عرفے کے دن) سے شروع ہوکر عید کی صبح صادق تک رہتا ہے۔ لیکن بعد اس کے حج نہ ہوگا۔

عرفے کے دن غسل کرے۔ ظہر و عصر کی نماز اکٹھا پڑھے اور دُعا کرے۔ اس دن روزہ نہ رکھے۔ اس دن دُعائیں مقبول بارگاہِ ایزدی ہوتی ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا وِرد کرتا رہے۔ زوال کے وقت سے شام تک تضرع و زاری، توبہ استغفار کرتا رہے۔ اس دن کے وِرد کی ادعیہ طویل ہونے کی وجہ سے یہاں نہیں لکھی جا رہیں۔ "احیاء العلوم" میں سب لکھی گئی ہیں۔ دعا ماثورہ میں جو جو یاد ہوں، سب پڑھے۔ اگر زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر ہی پڑھے۔ اگر اپنے ہمراہی دُعا پڑھیں تو آمین کہے۔ اس کے غروب آفتاب سے قبل عرفات سے باہر نکل آئے۔

آداب بقیہ اعمالِ حج

عرفات سے فراغت پاکر مزدلفہ جاکر غسل کرے۔ کیونکہ مزدلفہ حرم ہی میں ہے۔ اس دن نماز مغرب میں دیر کرنا چاہیئے، بلکہ نماز عشاء کے ساتھ ایک اذان اور دو اقامت سے نمازیں ادا کرے۔ اگر ممکن ہو تو رات کو مزدلفہ ہی میں رہ کر شب بیداری کرے۔ اس رات میں برکاتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے، اور مزدلفہ میں رات گزارنا عبادت ہے۔ اگر وہاں قیام نہ کرسکے تو ایک بکرا ذبح کرے۔ وہیں سے ستر سنگریزے" منا میں پھینکنے کے لیے جمع کرلے۔ رات بھر وہاں رہنے کے بعد صبح کاذب ہی میں منا جائے۔ وہاں پہنچ کر اوّل وقت نماز صبح ادا کرے۔ وہاں سے بڑھ کر "مشعر الحرام" میں صبح کی روشنی تک دُعا مانگتا رہے۔ اس کے بعد وادیٔ محسّر جائے اگر کسی سواری پر ہو تو، یا پیدل ہو تو جلدی جانے کی کوشش کرے اور جلدی اس کو طے کرے، یہ سُنّت ہے عید کی صبح کو اللہ اکبر اور لبّیک لبّیک، اس وقت تک، کہتا رہے، جب تک "جمرات" کو نہ پہنچ جائے وہاں سے نکلتا ہوا اس بلندی پر پہنچے جہاں کے لیے وہاں خاص ہدایات ہیں۔ اس جگہ کا نام "جمرۃ العقبیٰ" ہے۔ سورج اوپر آجانے کے بعد سات پتھر جمرے کی طرف پھینکے۔ اس وقت منہ قبلے کی طرف ہونا ہی اچھا

ہے۔ پتھر پھینکتے وقت اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتا رہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دُعا بھی پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ تَصْدِیْقاً بِکِتَابِكَ وَاتِّبَاعاً لِسُنَّۃِ نَبِیِّكَ (یعنی اے میرے پالنے والے یہ میرا پتھروں کا پھینکنا تیری کتاب (قرآن) کی تصدیق اور تیرے رسولؐ کی سنّت پر عمل کرنا ہے۔ پتھر پھینکنے کے بعد تکبیر کہنا بند کر دے۔ تشریق کی صبح تک، نماز صبح کے بعد تکبیر پڑھتا رہے۔

ایامِ تشریق عید الضحےٰ سے ۱۳ر ذالحجہ تک ہوتے ہیں۔ یہ دن گزار کر پھر اپنی جگہ واپس آجائے۔ اگر استطاعت ہو تو قربانی کرے۔ اس دن بال ترشوائے۔ بال کٹوانے اور پتھّر پھینکنے کے بعد ایک تحلّل حاصل ہو جاتا ہے۔ اس وقت ممنوعات احرام مباح ہو جاتے ہیں، سوائے عورت سے مجامعت اور شکار کرنے کے۔ اس کے بعد مکّے میں جا کر "طوافِ رکن" بجالائے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ عید کی آدھی رات گزرنے پر طواف کا وقت شروع ہوتا ہے، لیکن عید کرنا فضیلت رکھتا ہے۔ اس طواف کے دیر کرنے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ ہاں البتہ ایسی حالت میں دوسرا تحلّل حاصل نہ ہو سکے گا، اور مباشرت حرام ہی رہے گی۔

حج کا آخری رکن اس وقت ختم ہوگا، جب قدوم طواف کے طریقے پر ہی یہ طواف بھی کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد البتہ شکار اور جماع دونوں جائز ہیں۔

طواف اور سعی اگر سعی پہلے کر چکا ہے تو پھر طواف نہ کرے، بلکہ طواف کے بعد سعی کرنا چاہیے۔ ان تمام ارکان کے بعد حج ختم ہو جاتا ہے، اور حالتِ احرام بھی ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن تشریق میں سنگ اندازی اور منیٰ میں رات گذارنا احرام کے بعد ہی ہونا چاہیے طواف سے فراغت کے بعد منا میں دوبارہ جائے، اور رات کو قیام کرے۔ یہ عمل واجب ہے۔ نیز دوسرے روز سنگ اندازی سے پہلے غسل کر لے۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے عرفات کی طرف جمرے میں سات پتّھر پھینکے اور دُعا مانگتا رہے۔ اس کے بعد درمیان کے جمرے میں سات ہی پتّھر پھینکے اس وقت بھی دُعا مانگتا رہے۔ آخر میں سات "جمرۃ العقبہ" کی طرف پھینکے۔ اس کے بعد منا میں شب باشی کرے۔ اس کے بعد عید کے تیسرے دن بھی اتنے ہی پتّھر (اکیّس) اسی ترتیب سے پھینکے۔ اگر غروب آفتاب تک وہاں ٹھیر گیا تو رات کا قیام بھی ضروری ہوگا۔ ورنہ اسی وقت مکّے کو چلا جائے۔ آخری دن بھی پہلے کی طرح اکیّس پتّھر پھینکے۔ حج کے متعلّق جو کچھ بیان کیا گیا وہ کافی ہے۔

آداب عمرہ

عمرہ سال میں ہر وقت ادا ہو سکتا ہے۔

اگر حج کسی وجہ سے نہ کر سکتا ہو، اور عمرہ ہی بجا لانا چاہتا ہو، تو اوّل غسل کرے۔ اور جامہ احرام پہن کر

مکّے سے باہر نکلے اور جعرانہ اور حدیبیہ اور تنعیم جو میقات عمرہ کہلاتے ہیں، وہاں تک جائے۔ وہاں پہنچ کر عمرے کی نیت کرے اور کہے لَبَّیْکَ بِعُمْرَۃٍ۔ اس کے بعد حضرت عائشہ کی مسجد میں جائے۔ وہاں دو رکعت نماز پڑھ کر پھر مکّے واپس آئے۔ راستے میں لبّیک کا وِرد کرتا رہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی لبیک کہنا بند کر دے۔

اس کے بعد حج کے قاعدے کی طرح طواف سعی کرے۔ آخر میں بال ترشوا دے۔ عمرے کے ارکان یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ اہلِ مکّہ کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ عمرہ کریں۔ اور اگر تمام ارکان نہ بجا لا سکتے ہیں تو طواف ہی کریں، اور اگر طواف بھی نہ کر سکیں، تو کعبۃ اللہ کی زیارت ہی کرتے رہا کریں۔ کعبے کے اندر دو ستونوں کے درمیان نماز ادا کرنا چاہیے۔

آدابِ کعبہ ننگے پیر، نہایت ادب کے ساتھ اندر داخل ہونا چاہیے۔ آبِ زمزم خوب پینا چاہیے جس نیت سے آدمی پیئے گا شفا ہوگی۔ پانی پیتے وقت یہ پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ شِفَاءً مِّنْ کُلِّ سُقْمٍ وَّارْزُقْنِی الْاِخْلَاصَ وَالْیَقِیْنَ وَالْمُعَافَاۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ (یعنی اے خدا اس پانی سے ہر مرض کو دور کر دے مجھ کو خلوص اور یقین عطا کر اور روزی بخش، دنیا و آخرت میں تندرستی عطا کر!)

طوافِ وداع

واپسی کے وقت طواف جب کعبۃ اللہ سے واپسی کا ارادہ ہو تو اوّل سامانِ سفر تیار کر لے پھر کعبۃ اللہ کا سات بار طواف وداعی بجا لائے، اور دو رکعت نماز طواف پڑھے۔ اس طواف میں جلدی کرنا ضروری نہیں ہے۔ بعد میں ملتزم کو جائے اور دعا کرے۔ واپسی میں الٹا واپس ہو۔ کعبے کی طرف پیٹھ نہ کرے۔ یہاں تک، کہ مسجد سے باہر نکل آئے۔

زیارت مدینہ منوّرہ

حج سے فراغت پا کر مدینہ منوّرہ جائے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے، جو آدمی میری قبر پہ آئے گا، گویا کہ اس نے میری زیارت کی۔ اگر کوئی آدمی صرف میری زیارت ہی کی غرض سے مدینہ آئے گا تو خدا کے نزدیک میں اس کی شفاعت کا ضامن ہوں گا۔ راستے میں زیادہ سے زیادہ درود پڑھتا رہے، یہاں تک کہ مدینے کی دیواریں جب نظر پڑیں، تو پڑھے اَللّٰھُمَّ ھٰذَا حَرَمُ رَسُوْلِکَ فَاجْعَلْہُ لِیْ وِقَایَۃً مِّنَ النَّارِ وَاَمَانًا مِّنَ الْعَذَابِ وَسُوْٓءِ الْحِسَابِ۔ (یعنی اے خدا یہ تیرے رسولؐ کی جائے رہائش ہے، اس کو میرے لیے جائے امن بنا! اور مجھے دوزخ اور حساب کتاب کی برائیوں سے نجات دے) اوّل غسل کرے خوشبوئیں استعمال کرے اور اچھے صاف و پاکیزہ کپڑے پہن کر اندر انتہائی عجز کے ساتھ حرم میں داخل ہو اور پڑھے۔ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ

مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۔ (یعنی اے پروردگار! جو طریقہ تجھے داخل ہونے کا پسند ہو اس طرح مجھے داخل کر، اور جو طریقہ تجھ کو ناپسند ہو اس سے مجھے بچا اور تو ہی مجھ کو نیک راستے پر چلا، اس لیے کہ تو مددگار رہے)

اس کے بعد مسجد نبوی میں جائے اور ممبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو رکعت نماز ادا کرے۔ نماز کے وقت داہنا شانہ ممبر کے عمود کے برابر ہونا چاہیے۔ نماز سے فراغت کے بعد مشہد مقدس کی طرف منہ کر کے اور پشت قبلے کی طرف کر کے یہ زیارت پڑھے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا صَفِیَّ اللّٰہِ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا سَیِّدَ وُلْدِ اٰدَمَ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا سَیِّدَ الْمُرْسَلِیْنَ وَخَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ وَرَسُوْلَ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ وَعَلٰی اٰلِكَ وَاَصْحَابِكَ الطَّاهِرِیْنَ وَاَزْوَاجِكَ الطَّاهِرَاتِ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ جَزَاكَ اللّٰہُ عَنَّا اَفْضَلَ مَا جَزٰی نَبِیًّا عَنْ اُمَّتِہٖ وَصَلّٰی عَلَیْكَ مَا ذَكَرَكَ الذَّاكِرُوْنَ وَغَفَلَ عَنْكَ الْغَافِلُوْنَ ۔

دیوار پر ہاتھ رکھنا اور بوسہ دینا ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی دوسرے آدمی نے حضرت کی خدمت میں اپنا سلام پہنچانے کی حاجت کی ہے تو یہ پڑھے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مِنْ فُلَانٍ ۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ مِنْ فُلَانٍ ۔ اس کے بعد تھوڑی دور آگے جا کر حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما پر سلام کرے اور پڑھے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمَا یَا وَزِیْرَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَالْمُعَاوِنَیْنِ لَہٗ عَلَی الْقِیَامِ بِالدِّیْنِ مَا دَامَ حَیًّا وَالْقَائِمَیْنِ بَعْدَہٗ فِیْ اُمَّتِہٖ بِاُمُوْرِ الدِّیْنِ یَتَّبِعَانِ فِیْ ذٰلِكَ اٰثَارَہٗ وَیَعْمَلَانِ بِسُنَّتِہٖ فَجَزَاكُمَا اللّٰہُ خَیْرَ مَا جَزٰی وَزِیْرَیْ نَبِیٍّ عَلٰی دِیْنِہٖ ۔ اس کے بعد وہاں کھڑے ہو کر دعا مانگے۔ اس کے بعد بقیع کے قبرستان جائے اور وہاں صحابہ کرام اور بزرگان دین کی زیارت کرے۔ آخر میں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرے، اور مدینے سے واپس ہو۔

اسرار و رموز باطنی

ظاہری آداب حج تم کو بتائے جا چکے ہیں یسب تم کو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی حج کے بھی حقیقی رموز بتائے جاتے ہیں۔

حج کا تصور حقیقی حج کا مقصد اصل خداوند عالم اور آخرت کی یاد رکھنا ہے۔

تخلیق انسان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خدا کو پہچانے، اور اپنے نفس و جسم کو اس کے حوالے کر دے جیسا کہ اسلام کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے۔ اس کے خلاف خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا برا ہے۔ آدمی جب تک خواہشات نفسانی کو نہیں روکتا اس وقت تک اس کا کوئی فعل شریعت اسلام کے ماتحت نہیں آتا وہ خدا کا بندہ کہلانے کا مستحق نہیں۔ اس لیے کہ بندگی کا شرف تو خدا کی متابعت میں ہی حاصل ہوتا ہے۔

اسی لیے ہماری اُمّت سے پہلے کی اُمتوں کو ریاضت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس وقت تو یہاں تک ہوتا کہ بعض لوگ دُنیا کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں پر جا کر اطاعت میں زندگی گزار دیا کرتے۔ ایک گروہ نے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا، کہ ہم کو ریاضت اور رہبانیت کا حکم کیوں نہیں دیا گیا۔ تو حضورؐ نے جواب دیا کہ اس رہبانیت کے بدلے میں میری اُمّت کو جہاد اور حج کا حکم دیا گیا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں مجاہدہ نفس اور عبرت دونوں حاصل ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ خداوندِ عالم نے کعبے کو اپنا گھر بنایا۔ اور بادشاہوں کے محلّوں کی طرح اس کو بھی مزیّن و آراستہ کیا۔ وہاں کی سرزمین اور درختوں کو عزّت بخشی۔ یہاں تک کہ وہاں شکار کرنے کو بھی حرام قرار دے دیا۔ اسی طرح عرفات کے میدان کو بادشاہوں کی قیام گاہ کی طرح بنایا، تاکہ تمام دُنیا کے لوگ وہاں آکر جمع ہوں۔ یہ تو پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اس کی ذات کو نہ کسی مکان کی ضرورت ہے۔ لیکن کعبے کو صرف اپنی طرف اس لیے منسُوب کیا گیا کہ انسان کو اپنے دوست کی ہر چیز مرغوب ہوتی ہے، لہٰذا جو چیز خدا سے منسُوب ہے، ہم اسی سے محبت کریں، اور اپنے وطن اور اعزا و اقربا کو چھوڑ کر تکالیفِ سفر برداشت کرتے ہوئے اپنے محبوبِ حقیقی اور مالک کی بارگاہ تک پہنچ سکیں اور یہ تمام ہمارے اعمالِ عبادت مقرّر کر دیے، جو بظاہر ہماری عقول سے برتر ہیں

حج کے احکامات عقلاً روا ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ جو باتیں عقل میں آتی ہیں، نفس بھی اُن کو ضرور قبول کرتا ہے۔ مثلاً سنگریزوں کا پھینکنا۔ صفا مروہ میں دوڑنا اور اسی قسم کے تمام اعمال و ارکانِ حج۔

اس کو آسانی کے ساتھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے زکوٰۃ دینا، محتاجوں اور غریبوں کی امداد ہے نماز ایک طریقہ عجز ہے۔ بارگاہِ ایزدی کے سامنے روزہ طریقہ نفس کشی ہے، جو شیطانی وسوسوں سے نجات دلاتا ہے۔

انتہائی بندگی کی دلیل اپنے مالک و معبود کے ہر حکم کو بے چون و چرا تعمیل کا نام ہے اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ ارکانِ حج اور تمام ارکان دینی صرف حکم معبود کا بغیر سوچے سمجھے اتباع کرنا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خاص طور پر حج کے موقع پر فرمایا کرتے تھے۔ لَبَّیْکَ حَجَّۃً حَقًّا تَعَبُّدًا وَّ رِقًّا۔ فرمانبرداری اور بندگی صرف یہی ہے۔ جو لوگ ارکانِ حج میں تاویلیں تلاش کرتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ ہم صرف خدا کے احکام کو آنکھیں بند کر کے مان لیں، اور جو حکم ہے اسی پر عمل کریں تاکہ ہماری بندگی کا ثبوت مل سکے۔ شرعی احکامات میں عقول و طبائع کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بہترین غلام وہ ہے جو مالک کا ہر حکم بغیر کچھ سوچے ایک دم بجا لائے۔ اسی طرح اس پروردگار کا حکم ہمارے لیے کسی عقل و دلیل کی ضرورت نہیں رکھتا۔ ہمیں تو اس کے احکامات کے مقابلے میں ایسا ہونا چاہیے کہ دُنیا میں سوائے اس کے حکم کے اور ہر چیز

کو ہیچ سمجھیں۔

حج کے لیے گھر سے سفر کرنا بالکل سفر آخرت کی طرح ہے۔ یہ سفر کعبۃ اللہ کے لیے ظاہری طور پر کہا جاتا ہے اور سفرِ آخرت، صرف باری تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ ہمیں اس سفر کے ساتھ آخرت کو یاد رکھنا چاہیئے۔

حج کے لیے جانے وقت اپنے اعزو اقربا۔ کو اسی طرح رخصت کرے جس طرح موت کے وقت سب کو رخصت کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح سفرِ حج کے لیے آدمی تمام آسائش و آرام کی چیزیں جمع کرتا ہے۔ اسی طرح سفرِ آخرت کے لیے بھی اس دنیا میں نیک عمل کرے، تاکہ وہاں کا خطرناک اور بھیانک سفر بآسانی طے کر سکے۔ جس طرح سفرِ حج میں جلدی خراب ہو جانے والی چیزیں ساتھ نہیں لے جاتا، اسی طرح سفرِ آخرت کا توشہ بھی ایسا ہی ہو۔ کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ آدمی کے ساتھ رہ سکے۔ اسی طرح جب سفرِ حج کے لیے سواری پر سوار ہو تو اپنے جنازے کو یاد کرے۔ کیونکہ سفرِ آخرت میں وہ ہی اس کی سواری ہو۔ ہو سکتا ہے کہ سواری سے اترنے سے پہلے ہی جنازہ تیار ہو اور اور سفرِ حج کا انجام یہ ہو جائے۔ جس وقت احرام کے کپڑے پہنے تو اپنا کفن یاد کرے۔ جب راستے کی تکالیف پڑیں، تو قبر میں نکیرین کے سوال و جواب کو سوچے۔ کیونکہ قبر سے قیامت تک کا سفر انتہائی ہیبت ناک ہوتا ہے اور قبر کے سوال و جواب کو ایسا ہی سمجھے جیسے سفرِ حج میں کسی نہ کسی رہبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب حج میں لَبَّيْكَ کہے تو سمجھے کہ یہ خداوندِ عالم کی آواز پر کہہ رہا ہے قیامت کے دن اس کو اسی طرح آواز دی جائیگی۔ حضرت علی ابن امام حسین رضی اللہ عنہ، کا چہرہ احرام کے وقت، زرد ہو جاتا تھا اور بدن میں لرزہ ہو جانے کی وجہ سے لَبَّيْكَ منہ سے نہ نکل سکتا تھا۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ لبیک، کیوں نہیں کہتے؟ تو فرمایا کہ ڈرتا ہوں کہ کہیں لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ میں جواب نہ ملے۔ یہ فرما کر بے ہوش ہو گئے۔ احمد بن ابی الحواری جو ابو سلیمانی دارانی کے مرید تھے۔ اُن سے روایت ہے کہ ابو سلیمان نے اس وقت لبیک نہیں کہا۔ جب ایک میل تک کا راستہ طے کیا تو یک لخت بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ہوش میں آنے پر فرمایا کہ جناب موسیٰ کو وحی ہوتی تھی، کہ اپنی اُمت سے کہہ دو! کہ مجھے یاد نہ کرے۔ کیونکہ جو مجھے یاد کرتا ہے۔ میں اُسے یاد کرتا ہوں، لیکن ظالم پر لعنت کرتا ہوں، اور فرمایا کہ جو آدمی نیک، کمائی سے حج نہیں کرتا اور لبیک، کہتا ہے، اس کو بارگاہِ ایزدی سے جواب ملتا ہے لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ حَتّٰى تَرُدَّ مَا فِيْ يَدَيْكَ (یعنی ہم کو تیرا لبیک اور سعدیک کہنا پسند نہیں، جب تک تو اپنی ملکیت (بُرے مال) کو اپنے سے الگ نہ کر دے)

طواف اور سعی کی مثال ایسی ہے جیسے حاجت مند بادشاہوں کے دربار میں اپنی حاجتیں بیان کرنے کے لیے موقع تلاش کرتے ہوئے چاروں طرف گھومتے پھرتے ہیں۔ ادھر سے ہر کسی سفارش کرنے والے کی تلاش کرتے ہیں۔ اُن کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے، کہ بادشاہ کسی طرح اُن کو دیکھ لے اور اُن کی حاجتیں پوری کر دے۔

اسی طرح صفا اور مروہ کی مثال اور جلوخانہ سلطانی کی مانند ہے۔ عرفات میں اپنی اپنی زبانوں میں دعائیں مانگنا اور ہجوم، میدان قیامت کی طرح ہے کہ وہاں بھی تمام عالم جمع ہوگا۔ اس وقت نفسا نفسی کا عالم ہوگا، کہ کون بخشا جائے اور کون بارگاہِ ایزدی سے ٹھکرا دیا جائے۔

سنگریزے پھینکنے سے ایک تو اظہار بندگی مقصود ہوتا ہے اور دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تصور بھی مقصود ہے کہ اسی موقع پر شیطان آپ کے سامنے آیا تھا اور آپ نے اس پر پتھر مارے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ اس واقعہ سے تم کو یہ خیال ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے تو شیطان آیا تھا۔ اس لیے انھوں نے پتھر مارے تھے۔ یہ سوچنا اچھا نہیں ہے۔ ہمارے لیے صرف وہ تمام احکامات واجب ہیں جو ہمیں دیئے گئے ہیں، اور اپنی عقل و جسمانی حرکات کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تجھے پتھر پھینکتے وقت تصور ہونا چاہیے کہ شیطان تیرے سامنے ہے اور تو اس کو مار رہا ہے۔

حج کے حقیقی رموز و نکات اتنا ہی سمجھا دینا کافی ہیں تاکہ تو ان پر صدق دل سے عمل کر کے ثواب دارین حاصل کرے۔ اور تیرے ظاہری ارکان باطن میں بھی یکسانیت حاصل کر سکیں۔

آٹھواں اصول

باب القرآن

در بیان تلاوت کلام اللہ

اے مسلمانو! قرآن مجید کی تلاوت کرنا تمام عبادات سے افضل ہے خصوصاً نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ بہترین عبادت میری امت کے لیے تلاوت کلام اللہ ہے۔ اگر کسی مسلمان نے یہ سوچا کہ میرے قرآن کے مقابلے میں فلاں کو کوئی اچھی چیز ملی ہے تو گویا کہ اس نے قرآن کی تذلیل کی۔ اس کو خداوند عالم نے خود عزت بخشی ہے۔ اس کا حکم ہے کہ اگر قرآن مجید کو چمڑے کے جزدان میں رکھا جائے تو آگ اس کے قریب نہ جائیگی۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ میدان قیامت میں قرآن شریف، آدمی کا بہترین ضامن ہوگا۔ خداوندِ عالم کا حکم ہے کہ جو آدمی دعائیں مانگنے کے بجائے صرف تلاوتِ قرآن کرتا ہے، اس کو شکر گذار بندوں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ آدمیوں کے دلوں کو لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے۔ تو دریافت کیا کہ وہ کس طرح چھوٹتا ہے۔ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا، کہ موت کو یاد کرنے اور تلاوت کلام اللہ کرنے سے، اور ارشاد ہوا کہ جب میں دنیا سے جاؤں گا، تو تم لوگوں میں دو واعظ چھوڑوں گا، جو تم کو راہ راست پر لاتے رہیں گے۔ ایک خاموش واعظ اور دوسرا گویا۔ واعظ گویا قرآن شریف ہے، اور واعظ خاموش موت ہے۔ ابن مسعود کا مقولہ ہے کہ تلاوت کلام اللہ

میں ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ہیں۔ اِس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ الٓمّ ایک حرف ہے بلکہ الف، لام اور میم تین حرف ہیں۔ امام احمد حنبلؒ کا قول ہے کہ میں نے خداوندِ عالم کو خواب میں دیکھا، اور عرض کی کہ اے پالنے والے! تیرے تقرب کے لیے کیا چیز افضل ہے؟ تو جواب ملا کہ تلاوت کلام اللہ۔ میں نے عرض کی کہ اگر اس کے معنی سمجھ میں نہ آسکیں تو فرمایا کہ معنی سمجھنے کی شرط نہیں ہے۔

تلاوت ظاہری کا بیان

اے مُسلمانو! قرآن پڑھو، اِس کی عزّت کرو، اپنے کو بُرے کرداروں سے بچاؤ۔ ہر وقت اَدب سے رہو، ورنہ قرآن مجید تمھارا مخالف ہوجائے گا۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حُکم ہے کہ امّت کے منافقین میں زیادہ تر قرآن خواں ہوں گے۔ ابو سلیمان دارانی کے قول کے مُطابق دوزخ کے فرشتے قرآن خواں بدوں کو بُت پرستوں سے پہلے جہنّم میں جھونکیں گے۔

توریت میں ہے کہ اے بندے! تجھے شرم آنی چاہیے، اگر تو کسی عزیز کا خط بھی پاتا ہے تو ایک جگہ بیٹھ کر اسے غور سے پڑھتا ہے، لیکن یہ قرآن جو میرا پیغام ہے۔ اس طرف التفات نہیں کرتا، اور نہ پڑھتا اور اگر پڑھتا بھی ہے تو اس کی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، کہ تم لوگوں سے پہلے کی امّت قرآن مجید کو پیغامِ خداوندی سمجھتی تھی رات کو اس کے احکامات پر غور کرتے اور دن کو عمل میں لاتے، لیکن تُم لوگ اس کو صرف صحیح و دُرست پڑھنے کی کوشش کرتے ہو، لیکن اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن شریف کو پڑھ کر اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہر چیز سیکھنے اور یاد کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ بے عمل آدمی کی مثال اس غلام کی سی ہے کہ اس کے مالک کا خط اس کو اس انتہائی محبّت اور غور و خوض سے صحیح صحیح پڑھے۔ لیکن اس کے احکامات کو پورا کرنے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرے۔ ایسا غلام تو اپنے آقا کا دشمن ہے۔

آداب تلاوت ظاہری

کلام اللہ کی تلاوت کے طریقے تلاوت کے وقت چھ چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

پہلے یہ کہ وضو کر کے قبلہ رُخ ہو کر انتہائی تعظیم کے ساتھ تلاوت کرے۔ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی نماز میں کھڑا ہو کر قرآن پڑھتا ہے، اس کو ہر حرف کے بدلے میں سو نیکیاں ملتی ہیں۔ اور اگر بیٹھ کر پڑھے تو ہر حرف کے بدلے میں پچاس نیکیاں ملتی ہیں، اور اگر با وُضو ہو کر بعد نماز تلاوت کرے تو پچیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اور بغیر وضو کے تلاوت میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ رات کے وقت خصوصاً

زیادہ فضیلت ہے۔ کیونکہ اس وقت آدمی کو زیادہ یکسوئی ہوتی ہے۔
دوسرے یہ کہ تلاوت میں جلدی ختم کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ سمجھ کر پڑھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی تین دن سے پہلے قرآن مجید ختم کر لیتا ہے۔ وہ اس کے فقہی رموز سے ناواقف رہتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں سورہ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ اور سورۃ اَلْقَارِعَۃُ کو آہستہ پڑھنا اچھا سمجھتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ سورۃ بقرا اور سورۃ عمران جلدی سے پڑھ کر ختم کر دوں۔ حضرت عائشہ رض جس کو جلدی قرآن پڑھتے ہوئے دیکھتی تھیں تو فرماتی تھیں کہ یہ آدمی نہ قرآن پڑھ رہا ہے اور نہ خاموش ہے۔ اگر کوئی آدمی عربی نہیں جانتا تو اس کے لیے بھی غور سے پڑھنا افضلیت رکھتا ہے۔ تیسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تلاوت کرنے میں روئے اور اگر رونا نہ آئے تو کوشش ہی کرے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ سورہ سُبحان الذی میں سجدہ کرتے وقت روؤ! ورنہ سجدہ کرنے میں دیر کرو۔ اگر آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں تو دل سے رونا چاہیے حضورؐ کا ارشاد ہے، کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت رنجیدہ رہو۔ کیونکہ یہ غم کے لیے نازل ہوا ہے جو آدمی اس کے احکامات پر غور کرتا ہے اور اپنے کو اس کے سوچنے میں عاجز سمجھتا ہے۔ یہ ہی علامت غم ہے بشرطیکہ وہ سمجھ دار بھی ہو۔

چوتھے یہ کہ، آیت غضب کے وقت خدا سے پناہ مانگے، اور آیت رحمت کی تلاوت کے وقت طالب رحمت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہی عمل تھا حضورؐ آیت تنزیہ کے وقت تسبیح فرماتے، اور جب تلاوت قرآن شروع کرتے تو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھتے، اور جب ختم فرماتے تو یہ پڑھتے اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْاٰنِ وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً۔ اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْہُ مَانَسِیْتُ وَعَلِّمْنِیْ مِنْہُ مَا جَھِلْتُ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَہٗ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَاَطْرَافَ النَّھَارِ وَاجْعَلْہُ حُجَّۃً لِّیْ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اور جس وقت آیت سجدہ پر پہنچتے، تو اول تکبیر فرماتے، اس کے بعد سجدہ فرماتے۔

سجدہ سجدہ کرتے وقت آداب طہارت نماز کی طرح بجالائے، صرف تکبیر کہہ کر بغیر تشہد و سلام کے سجدہ کافی ہوتا ہے۔

پانچویں یہ کہ صرف دکھاوے کے لیے تلاوت باآواز بلند نہ کرے، یا کسی کی نماز خراب ہونے کا خطرہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے کہ پوشیدہ طور پر صدقہ دینے میں جو ثواب ہے، وہ ہی ثواب تلاوت کلام پاک میں ہے اور اگر مندرجہ بالا وجوہ نہ ہوں تو البتہ زور سے پڑھے، تاکہ دوسرے لوگ سنیں اور آگاہی حاصل کر سکیں۔ خود کو بھی زیادہ سے زیادہ معرفت ہو سکے، اور نیند کا غلبہ نہ ہو سکے۔ دوسرے سوتے ہوئے لوگ بھی بیدار ہو جائیں۔

اگر یہ تمام نیتیں تلاوت کے وقت ہوں تو سب کا الگ الگ ثواب ملتا ہے۔

قرآن شریف کو دیکھ کر پڑھنے میں زیادہ ثواب ملتا ہے، کیونکہ اس طرح آنکھ بھی اسی طرف مشغول رہتی ہے۔ ایک قرآن دیکھ کر پڑھنے میں سات قرآن بغیر دیکھے پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک فقیہہ آدمی حاضر ہوا، تو آپ کو سجدے میں پایا۔ آپ کے آگے قرآن شریف رکھا ہوا تھا، تو آپ نے اس سے فرمایا کہ فقہ نے تم لوگوں کو قرآن شریف جیسی نعمت سے باز رکھا ہے۔ میں عشاء کی نماز کے بعد صبح تک تلاوت کرتا ہوں۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف تشریف لے گئے تو آپ نے اُن کو نماز میں آہستہ آہستہ قرآن پڑھتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ آہستہ کیوں پڑھتے ہو، تو فرمایا کہ جس کے لیے میں پڑھ رہا ہوں وہ سُن رہا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ زور سے پڑھ رہے تھے، تو فرمایا کہ باآواز بلند کیوں پڑھتے ہو؟ تو جواب دیا کہ سوتے ہوئے لوگوں کو بیدار کرتا ہوں اور شیطان کو اپنے پاس سے بھگاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں نے اچھا کیا۔ کیونکہ تمام اعمال نیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ نیت جب نیک ہو تو دونوں کو ثواب ملے گا۔

چھٹے یہ کہ۔ قرأت اور خوش الحانی سے پڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ حضورؐ نے ابوحذیفہؓ کو خوش الحانی سے تلاوت کرتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِیْ مِثْلَہٗ (یعنی خداوند عالم کا شکر ہے کہ اس قسم کے لوگ میری اُمت میں ہیں) جتنا خوش الحانی سے تلاوت کرے گا، اتنا ہی اس میں زیادہ اثر پیدا ہوگا۔ صرف خوش الحانی سے ہی پڑھنا چاہیے۔ قوالوں اور گانے والوں کی طرح زیادہ الحان کرنا مکروہ ہے۔

تلاوتِ باطنی

آداب | باطنی آداب بھی چھ ہیں:

پہلے یہ کہ کلام کی عظمت و عزت کو سمجھے کہ یہ اُس خدا کا کلام ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جو الفاظ زبان سے ادا ہو رہے ہیں، یہ بھی اسی سے وابستہ ہیں، جیسے لفظ آگ زبان سے تو کہنا آسان ہے، لیکن اس کو برداشت کرنے کی طاقت آدمی میں نہیں۔ اس طرح اس کے حروف کی طاقت اور اصلیت معلوم ہو جائے، تو تمام زمین و آسمان بھی برداشت نہ کرسکیں گے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰہِ (یعنی کہ اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتا تو وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور ڈرتا۔

یوں سمجھنا چاہیے کہ جمال و صفات الٰہیہ کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے، کیونکہ دلوں میں اس کے سمونے کی

طاقت نہ تھی۔ لہٰذا حروف کے ذریعہ اُن تک پہنچایا گیا۔ اس کو آسانی سے سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہوگی۔ جیسے کوئی چوپایہ آدمی کی زبان نہیں سمجھ پاتا۔ لیکن اس سے ایسی آوازوں میں کہا جاتا ہے کہ خوب سمجھ لیتا ہے مثلاً بظاہر بیل کو یہ حکم نہیں دیا جاتا، کہ وہ مٹی کو اُگنے کے لائق بنا دے، لیکن خود اس کو اسی لیے چلایا جاتا ہے کہ زمین میں ہل چلے اور اس سے مٹی نرم ہو کر پانی کو قبول کرلے اور غلہ اُگنے کی طاقت پیدا ہو جائے۔

بہت سے آدمی قرآن کو صرف ظاہری آوازوں اور حروف سے زیادہ نہیں سمجھتے، بلکہ ایک گروہ تو بالکل آواز اور حروف کا مجموعہ سمجھتا ہے، یہ اُن لوگوں کی کج فہمی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے لفظ آتش صرف تین لفظوں الف، تے اور شین سے مل کر بنتا ہے۔ لیکن دراصل وہ جلا دینے والی چیز ہے اور کاغذ اس کی تابش کو برداشت نہیں کرسکتا۔ بظاہر یہ حروف "آتش" کاغذ پر لکھے جاتے ہیں، اور کوئی اثر نہیں کرتے۔ اسی طرح جسم کی رُوح ہے جسم الفاظ ظاہر کی طرح ہیں، اور الفاظ کے معنی رُوح کی طرح۔ اور جسم چونکہ صرف رُوح کی وجہ سے افضلیت رکھتا ہے۔ اسی طرح آتش کے حروف بھی اپنے مطلب کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ظاہری الفاظ کو اصل و حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسرے یہ کہ تلاوت سے پہلے اپنے دل کو ہمہ تن متوجہ کرلے، کہ وہ اس کا کلام پڑھ رہا ہے، جو دنیا و ما فیہا کا مالک ہے۔ خداوندِ عالم خود فرماتا ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ جس طرح قرآن کے ظاہری اوراق کو بغیر وضو ہاتھ لگانے کی ممانعت ہے، اسی طرح اس کی حقیقت کو خوش اطواری اور خلوص دلی کی ضرورت ہے۔ جس وقت عکرمی رضی اللہ عنہ قرآن شریف کو کھولتے تھے، تو بے ہوشی کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی اور کہتے تھے کہ یہ میرے پروردگار کا کلام ہے، جس وقت تک اس کی عظمت دل میں نہ ہوگی۔ قرآن کی حقیقت کا عرفان ناممکن ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دنیا پر غور کرے کہ عرش و کرسی، زمین و آسمان درخت و ذرات سب چیزیں جس نے بنائی ہیں اس کی حقیقت و ماہیت کیا ہوگی؟ اس کے بعد اس کے کلام کی حقیقت پر غور کرے۔

تیسرے یہ کہ دل کو قطعی طور سے اس طرف ملتفت کرے۔ نفسانی خواہشات اور دنیوی محبت سے دل کو پراگندہ نہ کرے۔ ایسی حالت میں تلاوت نہ کرنے ہی کے برابر ہے۔ ایسا آدمی بالکل اس کی طرح ہے جو چمن میں جا کر وہاں کی رونق سے محظوظ نہ ہو۔ یہ کلام بھی مومنین اور خدا رسیدہ بندوں کے لیے چمنستان ہی ہے۔ اگر اس پر نظر حقیقت سے غور کرے گا، تو خود بخود اس کا دل دوسری طرف متوجہ نہ ہوگا۔ قرآن کے معنی کو نہ سمجھنا بڑی بدنصیبی ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے دل و دماغ کو پراگندگی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ اس کے حقائق کو سمجھ سکے۔

چوتھے یہ کہ قرآن کے ہر کلمے اور الفاظ پر غور کرے تاکہ مطلب سمجھ میں آجائے۔ اگر پہلی بار سمجھ میں نہ آئے

تو پھر پڑھے۔ اگر اس کی تلاوت سے محظوظ ہو رہا ہو تو پھر پڑھے۔ یہ عمل زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ بغیر سمجھے اور محظوظ ہوئے زیادہ سے زیادہ پڑھتا چلا جائے۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار نماز میں بیس بار تک یہ جملے فرماتے تھے۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ الآيَة اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حضرت سعد بن جبیر نے ایک پوری رات اس آیت کو پڑھتے پڑھتے ختم کر دی - وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ اگر کوئی آدمی ایک آیت کو پڑھ کر پچھلی پر غور کرتا ہے تو بیکار ہے۔

تمثیل عامر ابن عبداللہ وسوسے آنے کی وجہ سے شکایت کیا کرتے تھے، تو لوگوں نے کہا کہ وہ دنیاداری کی باتیں ہوں گی، تو جواب دیا کہ اگر میرے منہ پر چھری ماردیں، تو مجھے تکلیف نہ ہو، بہ نسبت اس کے کہ میں نماز کے وقت دنیا کی باتیں سوچوں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ خدا کے سامنے میدان قیامت میں کس طرح کھڑا ہو سکوں گا؟ اور کس طرح وہاں سے واپس ہوں گا۔ وہ ان باتوں کو بھی وسوسے ہی سے متعلق کرتے تھے۔ لہٰذا ہر آدمی کو چاہیئے کہ کلمہ پڑھتے وقت صرف اس کو سمجھنے کی طرف دھیان دے۔ کہ کس لفظ کے کیا معنی اور مطلب ہے۔ جب اس کے افعال کو پڑھے، تو اس کے عجائب و غرائب دماغ میں ہوں، کہ خدا کی کیا عظمت ہو سکتی ہے یہاں تک کہ ہر چیز میں خدا نظر آنے لگے۔ ہر چیز کو اسی نظریہ سے دیکھے اور سمجھے جس وقت یہ آیت پڑھے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ تو نطفے کے عجائبات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ ایک قطرہ آب سے کیا عجیب و غریب چیزیں پیدا ہوتی ہیں جیسے ہاتھ پیر، گوشت پوست اور جسم کے دوسرے تمام اعضاء۔ اس کے ان چیزوں کی تخلیق کے متعلق سوچے۔

حقائق کلام اللہ کلام اللہ کی ایک ایک حقیقت کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اتنی باتیں بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف سمجھا دینا تھا، کہ وہ زیادہ سے زیادہ کوشش کریں کہ اس کو سمجھ سکیں۔

معلوم ہونا چاہیے! کہ تین قسم کے آدمی قرآن کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اوّل، وہ لوگ جو تفسیر سے ناواقف ہیں، یا عربی پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔

دوم، وہ جو بدعت کے عادی ہوں، اور گناہ کبیرہ پر اصرار کرتے ہوں ایسے لوگوں کے دل تاریک ہو جاتے ہیں۔

سوم، وہ جو علم کلام پڑھ کر صرف بحث کرنا جان گئے ہوں، اور دل کی گہرائیوں سے جو آوازیں ان کو سنائی دیتی ہوں، ان کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ ایسے لوگ ان ظاہری مباحثوں کے اعتقادات سے نہیں ہٹ سکتے۔

پانچویں یہ کہ تلاوت کے وقت اس کا دل آیات کی حقیقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یعنی آیہ رحمت کے وقت دُعا کرے اور آیت غضب پڑھتے وقت خوفِ خدا سے لرزنے لگے، اور جب خدا کی شان رحمت کی آیات تلاوت کرے تو خاکساری کا جذبہ پیدا ہو۔ اگر کفار کے متعلق پڑھے، جو لوگ دوسروں کو اس میں شریک

یا اس کا بیٹا کہتے ہیں، تو اپنی آواز کو آہستہ کرے۔ اُن لوگوں پر نفرین کا جذبہ طاری ہو۔ ان باتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ جس قسم کی آیت تلاوت کرے اپنے دل کی خصوصیات کو بھی ویسا ہی کر لے۔

چھٹے یہ کہ اگر قرآن شریف کی تلاوت سُن رہا ہے تو یہ ہی تصور ہونا چاہیے کہ وہ خداوند عالم سے ہی سُن رہا ہے۔ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ میں قرآن شریف کی تلاوت تو کرتا تھا، لیکن اس سے محظوظ نہ ہوتا تھا میں نے اس کے بعد سوچا کہ میں حضرت جبرئیل سے سُن رہا ہوں، تو میری لذت بڑھ گئی۔ اور اب تو میں یہ سوچ کر پڑھتا ہوں، جیسے خداوند عالم سے سُن رہا ہوں، تو میں ایسے محظوظ ہوتا ہوں کہ کبھی نہ ہوا تھا۔

نواں اصول

باب الذکر

در بیان ذکر خداوند عالم

اے مسلمانو! معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری تمام عبادات کا اصل مقصد و مرجع صرف خداوندِ عالم کو یاد کرنا ہی ہے۔ اسی لیے نمازِ اسلام کا ستون ہے، اور اس سے صرف یادِ خدا مقصود ہوتی ہے، جیسا کہ خود فرمایا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔

قرآن مجید کا پڑھنا افضل ترین عبادت ہے۔ چونکہ وہ خدا کا کلام ہے اور اس کے پڑھنے سے اس کی عظمت تازہ ہوتی ہے۔ اسی طرح روزے کا اصل مقصد خواہشات کا سدِ باب ہے۔ کیونکہ جب صفائی قلب آجاتی ہے تو خدا کی محبت بڑھ جاتی ہے۔

حج کا اصل مقصد صرف اس کی طرف رجوع کرنا، اور اس کے حضور میں حاضر ہونے کی طرف متوجہ ہونا ہے پس معلوم ہوا کہ تمام عبادات صرف ذکرِ الٰہی کے لیے ہیں، اور ہمارا کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عین اس کا ذکر ہے۔ باقی تمام عبادات اسی کے ذیل میں ہیں۔ اس کو یاد کرنا ہی تیری عبادتوں کا پھل ہے۔ وہ خود فرماتا ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (یعنی تم مجھے یاد کرو تاکہ میں تم کو یاد کروں) اس کی یاد ہمیشہ اور ہر وقت دل میں رہنا چاہیے۔ ہماری بھلائی اور نیکی اس میں ہے۔ وہ فرماتا ہے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (اگر فلاح کی امید رکھتے ہو تو زیادہ سے زیادہ اس کو یاد کرو) زیادہ سے زیادہ اس کو یاد رکھنا چاہیے۔ وہ فرماتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ خداوندِ عالم خود اُن لوگوں کی تعریف فرما رہا ہے، جو ہر وقت کھڑے بیٹھے لیٹے اس کو یاد کرتے ہیں۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (یعنی خدا کا ذکر خوف اور ڈر کے ساتھ کرو اور صبح و شام پوشیدہ طور پر، بلکہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہ رہو۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے دریافت کیا، کہ دنیا میں کون سا کام افضل ترین ہے۔ فرمایا کہ جس وقت میں اور تم ذکرِ خدا کر رہے ہوں۔ اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں تم کو کیوں نہ آگاہ کر دوں اس کام سے جو دنیا میں افضل ترین ہے، اور صدقے سے بہتر و برتر ہے۔ آگاہ ہو کہ جہاد کرنا دشمنانِ خدا سے افضل ہے۔ چاہے وہ تم کو شہید کریں، یا تم ان کو قتل کرو۔ صحابہ نے سوال کیا کہ وہ کون سا فعل ہے؟ تو فرمایا کہ ذکرِ حق تعالیٰ۔ اور فرمایا کہ جو آدمی میرا ذکر دعا سے زیادہ کرے، اس کو میں زیادہ بخشتا ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ غافلوں کے لیے ذکرِ حق تعالیٰ بالکل ایسا ہے، جیسے زندہ لوگوں میں کسی مردے کو شامل کر دیا جائے۔ یا سبزے میں کوئی خشک گھاس شامل ہو، یا وہ آدمی جو جہاد سے منہ پھیر کر بھاگ آئے۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ بہشت والوں کے سوائے اس کے اور کوئی افسوس نہ ہوگا۔ جو وقت دنیا میں انھوں نے بغیر ذکرِ الٰہی کے گزارا ہو۔

ذکرِ خداوندی کی حقیقت و معرفت

ذکر کے چار درجات ہیں :

پہلے یہ کہ ذکرِ خدا صرف زبان پر جاری ہو، دل سے نہ ہو۔ اس کا کچھ اثر تو ہو، مگر بہت کم۔ بہرحال یہ بھی غنیمت ہے۔ چونکہ خرافات لکھنے سے یہ بھی بہتر ہے کہ ذکرِ خدا زبان سے ہی کہا جائے۔

دوسرے یہ کہ دل سے اس کا ذکر کریں، لیکن ذہن میں اس کی اصلیت جاگزیں نہ ہو، اگر ایسا ہے تو ذہن کو آمادہ کیا جائے۔ اگر کوشش نہ کی جائے گی تو رہا سہا بھی جاتا رہے گا، اور دل پھر نفسانی باتوں کی طرف واپس ہو سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ، ذکرِ خدا دل کے اندر جاگزیں ہو گیا ہو، ایسا کہ کسی دوسرے کام کے لیے بمشکل دل کو آمادہ کیا جائے۔ یہ مرتبہ انتہائی عظیم ہے۔

چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ ذکر سے بڑھ کر اس کا خود غلبہ ہو جائے۔ وہ آدمی جس کا ذکر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص سے کہیں زیادہ بلند و افضل ہے، جو خود اس میں محو ہو جائے۔ چاہے وہ ذکر کسی زبان میں بھی ہو۔ یہ درجۂ ذکر سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔

عینِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ دل میں بجائے کسی لفظی ذکر کے وہ حقیقی ذکر والی چیز ہمہ تن اتر آئے، اس وقت وہ عینِ ذکر ہو جائے گا۔ یہ درجہ انتہائی محبت کا آخری درجہ ہے، جو عشق کہلاتا ہے۔ عاشق ہمیشہ معشوق کی ذات کو یاد کرتا ہے۔ صرف ذکر کرنا اس کو کافی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد بھی ایک درجہ آتا ہے، وہ یہ ہے کہ معشوق کے تصوّرات اور کمالِ محبت میں اس کے نام اور ذکر کو بھول کر اس کی اصل میں سمو جاتا ہے۔ یہ درجہ استغراق ہے۔ اسی طرح عاشقِ حقیقی دنیا و مافیہا کو فراموش کر کے خداوندِ عالم ہی کو ہر چیز اور ہر جگہ میں دیکھنے

لگتا ہے، اور ہمہ اوست کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ابتدا ہے تصوف کی۔ اس کی آخری منزل فنا ہے کہ جو کچھ ہے سوائے اس کے فنا ہے اور وہ اپنے کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ یہ انتہائی منزل ہے۔ معرفت حق تعالیٰ کی، کہ آدمی اس محبت میں اپنے کو بھی فراموش کر دے۔

اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے بہت سی دُنیائیں ایسی بھی ہیں، جن کی حقیقت ہم کو نہیں معلوم لیکن خُدا نے بنائی ہیں اور اسی کو معلوم ہیں۔ لہٰذا وہ دُنیا جو موجود تو ہے، لیکن ہم کو اس کی خبر نہیں۔ یعنی ہم اس کو غیر موجود ہی تصور کرتے ہیں۔ بس یہی اس کا مرتبہ ہے کہ وہ عارف موجود ہے، لیکن اپنے کو غیر موجود سمجھتا ہے۔ صرف خدا کے وجود ہی کو مانتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جس طرح عام آدمی آسمان اور زمین کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتا اور یقین کرتا ہے کہ سوائے موجودہ دُنیا کے اور دوسری دنیا کا وجود ہی نہیں۔ اسی طرح عاشق حقیقی کو سوائے خدا کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

مراتب اس مقام اعلیٰ پر پہنچنے کے بعد خدا اور اُس کے درمیانی حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ جُدائی تو اس کو محسوس ہوتی ہے جو اپنے کو اور خدا کو دو چیزیں سمجھتا ہو۔ وہ عارفِ حقیقی اپنے حال سے بھی بے خبر ہوتا ہے۔ اس کو سوائے ذات باری کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد اس کو جدائی کی تمیز ہی نہیں رہتی۔ یہ وحدانیت کی ابتداء ہے۔ اور اس کی آخری منزل پر پہنچکر فرشتگان و مقربین اور انبیاء رسل نظر آنے لگتے ہیں اور بارگاہِ ایزدی کی مخصوص چیزوں کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ جاتے ہیں۔ بڑی بڑی عظیم ترین اشیاء کو دیکھنے لگتا ہے جن کو لکھنا بھی ناممکن ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے کو دیکھتا ہے تو اس پہلی بے خودی کا حِس بھی اس کو ہوتا ہے، لیکن اس بے خودی میں ہی رہنا اچھا سمجھتا ہے۔ یہ دنیا اور اس کی مشغولیات اور یہاں کے رہنے والوں کی مشغولیات اس کو بہت بُری معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ بظاہر ہم جیسا ہی ہوتا ہے، لیکن اس کی روح ہم میں نہیں ہوتی، بلکہ وہ ہم لوگوں کے کاموں کو دیکھ کر متعجب ہوتا ہے اور ترحم کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ وُہ جانتا ہے کہ ہم لوگ کس نعمت سے محروم ہیں۔ حالانکہ دنیا کے غافل لوگ اس کو دیکھ کر ہنستے ہیں کہ وہ ہم جیسا کیوں نہیں ہے؟ بلکہ جنونی اور سودائی سمجھنے لگتے ہیں۔

پھر بھی اگر کوئی آدمی اس مرتبے کو نہ پہنچ سکے اور دُنیا کے تمام پردے اس کی آنکھوں سے نہ ہٹ جائیں، لیکن ذکر خداوندی سے ہمہ تن محظوظ ہوتا ہو تو بھی یہ "کیمیائے سعادت" ہے۔ کیونکہ ذکر حق کا غالب ہونا اس کے لیے بہ نسبت دنیا کے تمام کاموں کے خدا کی محبت کو زیادہ کر دے گا، اور اصل سعادت کے یہی معنی ہیں۔ وہ موت کے وقت سے نہ گھبرائے گا۔ بلکہ خدا کے تقرّب کی اور خواہش کرے گا۔ اس کے متعلق عنوان مسلمانی، میں وضاحت کر دی گئی ہے۔

لہٰذا اگر کسی شخص پر وہ حالت طاری نہیں ہوتی جو صوفیائے کرام پر ہوتی ہے، تو اس کو چاہیے ذکر خداوندی کو نہ چھوڑے، کیونکہ سعادت صرف اسی مرتبے پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ جب اس کا دل نور الٰہی سے جگمگا رہا ہے۔ تو یہ ہی کمال سعادت ہے، اور اس دنیا میں اگر اس نے کچھ چیزیں نہیں دیکھی ہیں تو مرنے کے بعد سب کچھ نظر آجائیں گی۔ اس کو چاہیے کہ مراقبہ میں مشغول رہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ جو آدمی بہشت کی سیر کا متمنی ہے، اس کو چاہیے کہ خداوند عالم کے ذکر میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہے۔ ذکر حق کی تعریف یہ ہے کہ اوامر و نواہی جب در پیش ہوں تو گناہوں سے پرہیز کرے اور خدا کو یاد کرے۔ اس کے احکامات کی تعمیل کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو صرف زبانی ذکر ہوگا جو حقیقت سے بعید ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فضائل عبادات

فضیلت کلمہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی کی ہر نیکی روزِ محشر ترازو میں تولی جائے گی۔ سوائے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے، کیونکہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ تمام زمینوں، آسمانوں اور جو کچھ ان سب میں موجود ہے، سب سے زیادہ وزنی ہے، اور فرمایا کہ دل سے اگر کلمہ پڑھا جائے تو انتہائی گنہگار آدمی بھی بخش دیا جاتا ہے اور فرمایا کہ جو آدمی سو بار پورا کلمہ پڑھے تو اس کو دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جو شخص یہ کلمہ پڑھے گا۔ اسے اتنا ثواب ملے گا کہ اس نے فرزندانِ اسمٰعیل علیہ السلام میں سے چار غلاموں کو آزاد کیا۔

حمد و تسبیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو آدمی دن کو سو بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ پڑھتا ہے اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، چاہے وہ دریا کے پانی کی طرح ہوں۔ ارشاد نبوی ہے کہ بعد نماز اگر تینتیس تینتیس بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَر اور سُبْحَانَ اللّٰہِ پڑھے گا اور آخر میں سویں مرتبہ یہ کلمہ پڑھے گا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ تو حق سبحانہٗ تعالیٰ اس کے تمام گناہ بخش دے گا۔

روایت ہے کہ ایک آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ دنیا نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور تنگدستی و غریبی نے گھیر لیا ہے، تو فرمایا کہ کیا تو صلوٰۃ ملائکہ اور تسبیح خلق کو نہیں جانتا؟ جو روزی حاصل ہونے کا اصل سبب ہیں۔ اس نے دریافت کیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ نماز صبح سے پہلے سو بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ، سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ۔ دنیا مجبوراً تیری طرف متوجہ ہوگی۔ خداوند عالم ایک فرشتے کو پیدا کرے گا، جس کی عبادت ہمیشہ تیرے نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ کلمات باقیات الصالحات ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ

اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ - یہ بھی فرمایا کہ یہ کلمات میں پڑھتا ہوں، اور آسمانوں کے نیچے جتنی بھی چیزیں ہیں سب سے زیادہ دوست رکھتا ہوں - خداوندِ عالم ان چاروں کلموں کو انتہائی پسند کرتا ہے، اور ارشاد ہوا کہ دو کلمے بظاہر بہت سُبک ہیں، لیکن حقیقتاً بہت وزنی ہیں - خُدا ان کو بہت محبوب رکھتا ہے - سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ -

فقراء مدینہ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ تمام عبادات دنیوی تو امرا کے حصّے میں آجاتی ہیں - چونکہ جو عبادت ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں - لیکن وہ صدقہ دینے کی وجہ سے ہم سے اشرف ہیں، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ تمھاری عبادات صدقے کا درجہ رکھتی ہیں - اور ہر امر بالمعروف ونہی عن المنکر بھی صدقے کی طرح ہے اور اسی طرح تم جب اپنی اولاد کو کھانا دیتے ہو وہ بھی صدقہ ہے - معلوم ہونا چاہیے کہ تسبیح کرنے کی فضیلت فقیر کے لیے اس وجہ سے افضل ہے کہ اس کا دل دنیا کی تاریکیوں سے آلودہ نہیں ہوتا - بلکہ صفائی قلب ہوتی ہے اس کا ایک کلمہ اس بیج کی طرح ہے جو زمین سے جلدی اُگے اور زیادہ سے زیادہ پھل دے، اور وہ عبادت جو خواہشاتِ دنیا سے بھری ہوئی ہوتی ہے، وہ ایسے بیج کی طرح ہے، جو شور زمین میں بویا جائے اور اثر کم ہو۔

درود شریف ایک دن جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے تو آپ کے چہرے پر خوشی کے اثرات نمایاں تھے، تو آپؐ نے فرمایا کہ جبریل یہ پیغام لاتے ہیں - خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے کہ تیری اُمّت سے جو آدمی ایک بار تجھ پر دُرود بھیجے گا، میں اس پر دس بار دُرود بھیجوں گا - جو تجھ پر ایک بار سلام بھیجے گا میں اس پر دس بار سلام بھیجوں گا - آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ پر دُرود بھیجتا ہے - فرشتے اس پر دُرود بھیجتے ہیں - چاہے وہ کم ہو یا زیادہ - مجھ سے قریب ترین وہ شخص ہے جو جتنا زیادہ میرے اوپر دُرود بھیجے اور جو آدمی ایک بار دُرود پڑھتا ہے، اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اور دس گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور جو آدمی کچھ لکھتا ہے اور اس میں مجھ پر دُرود بھی لکھتا ہے، تو فرشتے اس کے لیے مغفرت کے طالب ہوتے ہیں - جب تک اس کتاب میں میرا نام باقی رہتا ہے۔

استغفار

ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ کلام اللہ میں دو آیتیں ایسی ہیں، جن کو آدمی پڑھ کر استغفار کرے تو اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں - وہ دونوں آیتیں یہ ہیں: وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ اور دوسری آیت یہ ہے وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا - خداوندِ عالم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ فرمایا - اسی لیے حضورؐ یہ زیادہ پڑھا کرتے تھے - سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ

إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ -

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی زیادہ استغفار کرتا ہے، خداوندِ عالم اس سے خوش رہتا ہے غم و آلام سے اس کو نجات دیتا ہے۔ اس کو وہاں سے روزی ملتی ہے، جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں ایک دن ستر بار استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا سوچنا چاہیے کہ ہم کو کسی وقت بھی استغفار سے غافل ہونا نہ چاہیئے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی سونے کے وقت تین بار پڑھے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ تو فرشتے اس کے تمام گناہ بخش دیتے ہیں، چاہے وہ دنیا کے درختوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہوں، اور جو آدمی خلوصِ دل سے وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے اور استغفار کرے، اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں

آدابِ دُعا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ "دُعا" تمام عبادات میں مغز (دماغ) کا درجہ رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عبادت سے خدا کی درگاہ میں اپنی بندگی کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے اور بندگی کا اظہار عاجزی سے ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تضرع و زاری جتنی زیادہ ہو گی اتنی ہی عاجزی کی دلیل ہو گی۔ دُعا میں آٹھ آداب کا خصوصاً خیال رکھا جائے۔

اوّل۔ دُعا مانگنے کے اوقات اچھے ہونے چاہئیں۔ مثلاً عرفے کا دن۔ رمضان شریف۔ روزِ جمعہ صبح کے وقت۔ نیم شب۔

دوم۔ غازیوں کے جہاد کرنے کے وقت۔ بارش کے وقت۔ نماز فریضہ کے وقت۔ روزے میں یا اس وقت جب آدمی زیادہ مایوس ہو۔

سوم۔ دُعا کے وقت دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرے اور بعد دُعا کے مُنہ پر ملے۔ حدیث میں ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی بخشش سے یقین ہے کہ جو ہاتھ اس کی طرف اُٹھے گا وہ خالی ہاتھ نہ آئے گا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ دُعا تین حالتوں میں خالی نہیں رہتی۔ اس کا گناہ معاف ہو جاتا۔ کچھ نہ کچھ اسی وقت مل جاتا ہے۔ یا مستقبل میں ملتا ہے۔

چہارم۔ دُعا مانگتے وقت مقبولیت دُعا کے لیے یقین کامل رکھنا چاہیے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جب دُعا کرو تو یقین رکھو کہ ضرور قبول ہو گی۔

پنجم۔ یہ کہ اس شخص کی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے، جو خضوع و خشوع اور خلوصِ نیت سے مانگتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی شکوک کے ساتھ دُعا مانگے گا، اس کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔

ششم۔ یہ کہ دُعا میں عاجزی ہونا چاہیے۔ اور بار بار مانگنا چاہیے۔ نہ اس کا اظہار کہ میں اتنی دُعا مانگتا

ہوں، مگر قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ اس کی مصلحت ہے کہ کب قبول کرے، اور جب دعا قبول ہو جائے تو یہ دعا پڑھنا سنت ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ اور اگر مستجاب ہونے میں دیر ہو تو یہ پڑھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ۔

ہفتم۔ یہ کہ دعا مانگنے سے پہلے درود اور تسبیح پڑھ لے۔ کیونکہ حضور دعا سے پہلے یہ پڑھا کرتے تھے۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَلِیِّ الْاَعْلَی الْوَھَّابِ۔ آپ کا ارشاد ہے کہ مانگنے سے پہلے مجھ پر درود بھیجنے سے دعا قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی ذات پاک سے یہ بات بعید ہے کہ درود کو قبول کرے اور دعا کو رد کر دے۔

ہشتم۔ یہ کہ دعا سے پہلے توبہ کرے اور ظلم کو دل سے نکال دے۔ کیونکہ بہت سی دعائیں کدورت دل کی وجہ سے رد ہو جاتی ہیں۔ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے وقت جب قحط پڑا تو تین بار جناب موسیٰ علیہ السلام مع اپنی امت کے دعا کے لیے گئے، لیکن قبول نہ ہوئی، اور وحی ہوئی کہ تم میں ایک فیل خور انسان ہے۔ اس کی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوتی، تو آپ نے عرض کی وہ کون ہے؟ تو ارشاد باری ہوا کہ میں خود فیل خوری کو منع کرتا ہوں۔ تو اسی بات کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں؟ پس آپ نے تمام امت سے کہا کہ تم سب فیل خوری سے توبہ کرو۔ چنانچہ سب نے توبہ کی۔ پھر دعا مانگی، مگر قبول نہ ہوئی، چنانچہ اس وقت نبی پر وحی ہوئی کہ تم لوگ حرام خوری اور ظلم کرنے کے عادی ہو اور دعا مانگتے ہو۔ میرا غصہ تمھاری ان حرکات سے اور زیادہ ہوتا ہے۔ تم لوگ دور ہو جاؤ۔

متفرق ادعیہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی ادعیہ ماثورہ فرمائی ہیں، جن کا بعد نماز اور مختلف اوقات میں پڑھنا سنت ہے۔ اُن ادعیہ کو زیادہ تر احیاء العلوم میں نقل کر دیا ہے۔ ان میں چند بلند پایہ ادعیہ کتاب "ہدایۃ الہدایہ" میں نقل کیا ہے۔ اگر ان کا ورد کرنا ہو، تو اس میں سے یاد کرو۔ ان کو یہاں نقل کرنے سے کتاب طویل ہو جائے گی۔ ان میں بہت سی تو لوگوں کو یاد بھی ہیں، لیکن بعض ادعیہ جو اہم ترین حالت میں پڑھی جائیں اور وہ سنت بھی ہیں، ان کو یہاں نقل کر رہا ہوں، تاکہ ان کو سمجھ کر یاد کر لیں۔ لیکن تضرع وزاری ہر دعا میں ضروری ہے

گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھے بِسْمِ اللّٰہِ رَبِّ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْہَلَ اَوْ یُجْہَلَ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَالتُّکْلَانُ عَلَی اللّٰہِ جب مسجد میں داخل ہو تو یہ پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلِّمْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ اور دائیں پاؤں کو پہلے مسجد میں داخل کرے۔ اور جب کسی ایسی محفل میں بیٹھے جہاں پراگندہ باتیں ہوتی ہوں تو یہ دعا پڑھنا ان کا کفارہ ہے۔ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ

اِلَیْكَ عَمِلْتُ سُوْءً وَظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ اور جب بازار جائے تو یہ دعا پڑھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَهُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِهِ الْخَیْرُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، اور جب نیا کپڑا پہنے تو یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ اَنْتَ كَسَوْتَنِیْ هٰذَا الثَّوْبَ فَلَكَ الْحَمْدُ اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِهٖ وَخَیْرِ مَا صُنِعَ لَهٗ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهٗ اور جب نیا چاند دیکھے تو یہ کہے اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ اور جب کسی کی موت کی خبر سنے تو یہ پڑھے سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ اور جب صدقہ دے تو یہ پڑھے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اور جب نقصان ہو تو یہ پڑھے۔ عَسٰی رَبُّنَا اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَا اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ اور جب کسی کام کی ابتداء کرے تو یہ پڑھے رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا اور جب آسمان کی طرف دیکھے تو یہ کہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا اور بادل گرجنے کی آواز سنے تو یہ کہے سُبْحَانَ مَنْ یُّسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ اور جب بجلی گرے تو یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ اور جب بارش ہو تو یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ سُقْیًا هَنِیْئًا وَّصَیِّبًا نَافِعًا وَاجْعَلْهُ سَبَبَ رَحْمَتِكَ وَلَا تَجْعَلْهُ سَبَبَ عَذَابِكَ اور جب غصہ کی حالت میں ہو تو یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ وَاَذْهِبْ غَیْظَ قَلْبِیْ وَاَجِرْنِیْ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ اور ڈر اور خوف کی حالت میں یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ وَنَدْرَءُ بِكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ اور جب کسی جگہ درد ہو تو وہاں ہاتھ رکھ کر تین بار یہ کہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اور سات بار یہ پڑھے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ اور جب کوئی رنج وغم پہنچے تو یہ پڑھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ اور جب کسی کام کے کرنے سے عاجز ہو تو یہ پڑھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ نَافِذٌ فِیَّ قَضَآؤُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ وَاَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ وَاَعْطَیْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجَلَاءَ غَمِّیْ وَذِهَابَ حُزْنِیْ وَهَمِّیْ اور جب آئینہ دیکھے تو یہ پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَاَحْسَنَ خَلْقِیْ وَصَوَّرَنِیْ فَاَحْسَنَ صُوْرَتِیْ اور جب کسی غلام کو مول لے تو اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر یہ کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَهٗ وَخَیْرَ مَا جُبِلَ عَلَیْهِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَشَرِّ مَا جُبِلَ عَلَیْهِ اور جب سونے لگے تو یہ پڑھے رَبِّ بِاسْمِكَ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِاسْمِكَ اَرْفَعُهٗ هٰذِهٖ نَفْسِیْ اَنْتَ تَتَوَفّٰهَا لَكَ مَحْیَاهَا وَمَمَاتُهَا اِنْ اَمْسَكْتَهَا

فَاغْفِرْ لَهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصّٰلِحِیْنَ اور جب بیدار ہو تو یہ کہے ۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ ۔ اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْکُ لِلّٰہِ وَالْعَظْمَۃُ وَالسُّلْطَانُ لِلّٰہِ وَالْعِزَّۃُ وَالْقُدْرَۃُ لِلّٰہِ ۔ اَصْبَحْنَا عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ وَکَلِمَۃِ الْاِخْلَاصِ وَدِیْنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمِلَّۃِ اَبِیْنَا اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔

دسواں اصول

باب الوظائف

ترتیب اوراد و وظائف

مسلمانی کے عنوان کے ماتحت لکھا جا چکا ہے کہ انسان دُنیا میں صرف آخرت کے لیے یہاں سے صرف کچھ کمانے کے لیے آیا ہے ۔ ورنہ دنیا سے اس کا کچھ تعلق نہیں ۔ اس کی رُوح علوی ہے ۔ وہ جہاں سے آئی ہے وہیں واپس چلی جائے گی ۔ اس کا دُنیا میں آنا ایسی تجارت ہے ، جس کا ہر وقت خیال نہ رکھا گیا تو ہلاکت میں ڈال دے گا ۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ ۔ اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی جس کے پاس ٹھنڈی چیزیں فروخت کرنے کے لیے ہوں اور گرمی کے زمانے میں فروخت کرے اور کہے کہ اے لوگو! مجھ پر رحم کرو ، میرا مال اسی طرح آدمی کی عمر ہر وقت پگھلتی رہتی ہے ۔ (گذرتی رہتی ہے) وہ چند ایسے سانس ہیں ، جن کا علم ذات باری کے علاوہ کسی کو نہیں ۔ لہٰذا جو آدمی ان سانسوں کی حفاظت کرتا ہے ، وہ ان سے موتی حاصل کر لیتا ہے ، اور (جو آدمی لاپروا ہے وہ سب کچھ کھو دیتا ہے ۔ ان موتیوں کو حاصل کرنے کے لیے ہی اوراد و وظائف مقرر کیے گئے ہیں ۔ جو لوگ اُن کا وِرد رکھتے اُن پر دُنیا سے واپس جا کر خدا کی محبت غالب رہتی ہے ۔ چونکہ خدا کی اطاعت اور اس کا فکر ہی سعادت کا بیج ہے ۔ ترکِ دنیا اور ترکِ خواہشاتِ نفسانی اس لیے ہے کہ ان سے نجات ملنے کے بعد فراغت حاصل ہوتی ہے اور اطاعت خداوندی میں جی لگتا ہے ۔

ذکرِ دوامی ذکر دوام کے دو طریقے ہیں :

ایک تو یہ کہ اللہ اللہ نہ دل سے کہے اور نہ ظاہری زبان سے ۔ کیوں کہ دِل سے کہنا بھی نفس کے ماتحت میں آجائے گا ، بلکہ اس کے مشاہدات میں غرق رہنا اور اس سے کسی وقت غافل نہ ہونا چاہیے ۔ لیکن یہ عمل ہر آدمی کے بس کا نہیں ہوتا ، کہ ہر وقت اپنے دل کو ایک ہی طرح پر قائم رکھ سکے ۔ لہٰذا اس کے لیے مختلف اوراد متعیّن کر دیے ہیں ، تاکہ اُن میں بعض کو منہ کے ذریعے پڑھ کر ادا کیا جائے ۔ جیسے تلاوت قرآن کرنا ۔

اور تسبیح پڑھنا۔ اور بعض اوراد دل سے متعلق ہیں۔ جیسے تصورات خداوندی میں مشغول و مستغرق رہنا۔
دونوں طریقے اگر بدلتے رہیں، تو کوئی کسل نہ ہوگا، بلکہ خوشی حاصل ہوگی۔
دوسرے وہ اوقات جو دُنیا کے کسب کے لیے صرف کیے جاتے ہیں، اُن میں بھی آپس میں فرق ہوتا ہے۔
لیکن اگر انسان تمام اوقات کو خدا کے لیے صرف نہ کر سکے، تو زیادہ سے زیادہ حصّہ ہی صرف کرے تاکہ نیکیاں اور عاقبت کے کام دُنیا داری کے مقابلے میں زیادہ رہیں۔ عموماً انسان دنیا سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اور دین کے لیے وقت صرف کرنا خلافِ طبیعت سا ہے۔ ظاہری باتوں اور دُعائیں کوئی اثر نہیں کرتیں۔ اُن میں اخلاص کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اوراد کی کثرت رہے، اس میں سے ایک آدھ ہی خلوص کے ساتھ اگر ادا ہوگیا تو دین کا پلّہ بھاری ہو جائے گا۔

آدمی کو اپنے وقت کا زیادہ تر حصّہ دین کے کاموں ہی میں صرف کرنا چاہیے۔ دنیا کے کام اس کے تحت میں ہونا چاہئیں۔ خداوندِ عالم نے اسی لیے ارشاد فرمایا ہے۔ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى اور فرمایا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا اور فرمایا كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ۔ ان تمام آیاتِ قرآنی میں یہی حکم ہے کہ اپنا وقت زیادہ سے زیادہ خدا کی عبادت میں بسر کرو، اور یہ بات دن رات الگ الگ کرنے کے بغیر حاصل نہ ہوگی۔ لہٰذا اس کا بیان تفصیل کے ساتھ کر دینا ضروری ہے۔

اوراد

دن کے اوقات میں

معلوم ہونا چاہیے کہ دن کے لیے پانچ اوراد مقرر ہیں :

پہلا۔ صبح صادق سے طلوعِ آفتاب تک، اور یہ وقت زیادہ افضلیت رکھتا ہے۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے صبح کے وقت کی قسم کی ہے۔ وہ فرماتا ہے وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور سورۃ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ بھی اس کی عظمت میں ہے۔ لہٰذا ان نفوس کی حفاظت ضروری ہے۔ خواب سے بیدار ہو تو یہ پڑھو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔

اس کے بعد کپڑے پہن کر احکامِ خدا کی نیت کرے اور پاخانے جائے۔ بائیں پیر کو اوّل داخل کرے۔ اس کے بعد مسواک کر کے وضو کرے۔ اس کے بعد وہ تمام ادعیہ جو پہلے لکھی جا چکی ہے اُن کا ورد کرے۔

صبح کی سُنّتیں پھر صبح کی سُنّتیں گھر میں ادا کرے۔ اس کے بعد ادائے نمازِ فجر کے لیے مسجد کا رُخ کرے۔ سُنّتِ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم ہے مسجد جانے سے قبل وہ دعا جو ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، کے حوالے سے

"بدایۃ الہدایہ" میں لکھی ہے، یاد کرکے پڑھے۔

اس کے بعد مسجد میں جائے۔ مسجد میں داخلے کے وقت داہنا پیر اوّل رکھنا چاہیے۔ داخلے کے وقت وہ دُعا جو لکھی جاچکی ہے پڑھے۔ اور پہلی صف میں بیٹھنے کی کوشش کرے۔ صبح کی سُنّتیں اگر گھر میں پڑھ لی ہیں، تو نماز تحیۃ المسجد ادا کرے۔ اس کے بعد جماعت کے شروع ہوتے تک توبہ و استغفار میں مشغول رہے۔ نمازِ صبح سے فراغت پاکر طلوعِ آفتاب تک مسجد ہی میں بیٹھا رہے۔ کیونکہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کو بہت پسند کرتے تھے۔

طلوعِ آفتاب تک چار اعمال میں مشغول رہنا اچھا ہے:

دُعا کرنا۔ تسبیح و استغفار۔ تلاوت قرآنِ پاک۔ تفکّر خدا۔

نماز میں سلام پھیرتے وقت اس دُعا سے ابتدا کرنا چاہیے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ وَاِلَیْكَ یَرْجِعُ السَّلَامُ حَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَالسَّلَامِ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ یَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ اس کے بعد ادعیہ ماثورہ کا ورد کرے۔ جس وقت ادعیہ سے فارغ ہوجائے، تو تسبیح کرے، اور ہر ایک کو علی التواتر سو یا ستر یا کم از کم دس بار پڑھے۔ اس لیے کہ جب دس بار دس چیزیں پڑھے گا تو سب مل کر سو ہو جائیں گے۔ اس سے کم نہ پڑھنا چاہیے۔ احادیث میں دس بار پڑھنے کے متعلق بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس وقت طوالت کی وجہ سے نہیں لکھی گئیں۔

پہلا وظیفہ یہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ دوم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ سوم سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَكْبَرُ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ چہارم سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ پنجم سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَّبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰٓئِكَۃِ وَالرُّوْحِ ششم اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَسْئَلُہُ التَّوْبَۃَ ہفتم یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ لَاتَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَاْنِیْ كُلَّہٗ ہشتم اَللّٰھُمَّ لَامَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ نہم اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ دہم بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اِسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

ان دس وظائف کو دس بار پڑھے۔ ان میں ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ اور سب میں

[illegible] فجر [illegible] دو رکعت نماز سنّت کے علاوہ دوسری نمازیں منع ہیں ⁂

الگ الگ ثواب ملتا ہے ۔ بعد ان کے تلاوت کلام اللہ میں مشغول ہونا چاہیئے ۔ اگر قرآن شریف نہ پڑھ سکتا ہو، تو قوارع قرآن یعنی آیۃ الکرسی ہی پڑھے ۔ وَاٰمَنَ الرَّسُوْلُ وَشَهِدَ اللّٰهُ وَقُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ اس کے بعد سورۂ حدید اور سورۂ حشر کو پڑھ لے ۔ بزتریہ ہے کہ مسبعات عشر پڑھے ۔ یہ کلام اللہ اور دعا دونوں کا ثواب رکھتی ہے ۔ اور جناب خضر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حالتِ کشف میں بتائی تھی ۔ وہ حسب ذیل دس ہیں ۔ سورۂ الحمد ۔ سورۂ قل ہو اللہ ۔ سورۂ قل اعوذ برب الناس ۔ سورۂ قل اعوذ برب الفلق ۔ سورۂ قل یا ایہا الکافرون اور آیۃ الکرسی ۔ یہ چھ قرآن مجید میں سے ہیں، اور چار ادعیہ سے ہیں ——— سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ دوم اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَسَلِّمْ ۔ سوم اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ چہارم اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَافْعَلْ بِیْ وَبِهِمْ عَاجِلًا وَّاٰجِلًا فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ مَآ اَنْتَ لَهٗ اَهْلٌ وَلَا تَفْعَلْ بِنَا يَا مَوْلٰنَا مَا نَحْنُ لَهٗ اَهْلٌ اِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔

اس کی فضیلت میں ایک بڑا قصہ ہے، جس کو "احیاء العلوم" میں لکھ دیا گیا ہے ۔ اس سے فراغت پاکر تفکر میں مشغول ہو جائے ۔ وہ تفکر موت کو یاد کرنے کا ہونا چاہیے ۔ اور یہ سوچے کہ ہو سکتا ہے کہ میری زندگی میں ایک دن سے زیادہ باقی نہ رہا ہو ۔ اس سے یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ دنیوی لالچ جس کی وجہ سے انسان مال و زر جمع کرنے کی ہوس کرتا ہے ۔ اس سے بچنے لگتا ہے، اور اگر آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ محض ایک سال یا ایک ماہ یا ایک دن میں مر جاؤں گا، تو مال دنیا کی تمنا اور محبت قطعی طور سے جاتی نہ رہے گی ۔ خداوند عالم اسی لیے ارشاد فرماتا ہے ۔ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۔ جب انسان آخرت کو سوچتا ہے تو وہیں کی فکر بھی ہوتی ہے ۔ لہٰذا ہر آدمی کو چاہیے کہ یہ سوچے کہ آج اس نے کتنی نیکیاں کمائیں، اور کتنے گناہوں سے بچ سکا ۔ اور پچھلے زمانے میں کتنے گناہ کر چکا ہے، جس کی توبہ ضروری ہے ۔ ہر انسان کے لیے فکر ضروری ہے اگر کسی آدمی کو کشف ہو سکے، تو عجائباتِ عالم اور جمالِ الٰہی کی حقیقت کو سمجھے، اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش دنیا کی تمام عبادات سے افضل ہے ۔ کیونکہ قدرتِ الٰہی اس فکر سے دل پر غالب ہوتی ہے، اور قدرت کے اثرات جب تک دل پر نقش نہ ہوں اس وقت تک محبت میں اضافہ نہیں ہوتا ۔ اور کمال سعادت محبت میں ہے، لیکن ہر آدمی کو یہ فضیلت نہیں ہو سکتی ۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر غور کرے اور وہ مصائب و آلام یا گندی بیماریاں جو دوسروں کو دی ہیں اور وہ آدمی اُن سے محفوظ رہے ۔ تو اس کا شکر ادا کرے ۔ خدا کا شکر بجا لانا آدمی پر واجب ہے، اور اس کا شکر صرف زبان سے ادا نہ کرے ۔ بلکہ اس کے احکامات کی تعمیل کرے ۔ اور گناہوں سے پرہیز کرے ۔ دن میں ایک بار یہ بھی سوچنا چاہیئے، کہ صبح ہونے سے طلوع آفتاب تک سوائے نماز فجر واجب و

سنّت دوسری اور کوئی نماز دُرست نہیں ہوتی - اس وقت ذکر اور ادعیہ کا پڑھنا کافی ہوتا ہے۔

دوسرے ورد کا وقت چاشت تک ہے، وہ یہ کہ مسجد میں بیٹھا رہنے کی کوشش کرے، یہاں تک کہ آفتاب ایک نیزے پر آجائے - اس وقت تک تسبیح میں مشغول رہے - تاکہ وقت کراہت نماز نکل جائے۔ پھر دو رکعت نماز ادا کرے۔

جب دن کا چوتھا حصہ گزر جائے تو نماز چاشت کا ادا کرنا افضل ہے - اس وقت چار رکعت پڑھے یا چھ یا آٹھ - جتنا بھی پڑھ سکے اس کے متعلق روایات موجود ہیں۔

آفتاب بلند ہونے کے بعد دو رکعت نماز پڑھ کر نیک کاموں میں مشغول ہو جائے، جو حق النّاس کہلاتے ہیں - مثلاً بیماروں کی تیمارداری - تشییع جنازہ - مسلمانوں کی ضرورتوں کا پورا کرنا - علماء کی محفل میں شرکت۔

تیسرا ورد، چاشت سے شروع ہو کر نماز ظہر تک ہے - یہ ورد چار صورتوں میں کیا جا سکتا ہے - جو حسب ذیل طریقوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ تحصیل علم کرے - اگر وہ بہ سہولت کر سکتا ہے، لیکن علم وُہ ہی حاصل کرنا چاہیے جو آخرت کے لیے ممد و مددگار ثابت ہو سکے - اگر ایسا ہے تو بعد فراغت نماز فجر ہی تحصیل علم میں مشغول ہو جانا چاہیے۔

علومِ جنگ، و داستان - تذکرہ جات وغیرہ سے پرہیز کرے - چونکہ یہ دنیا کی حرص میں مبتلا کرتے ہیں - مفید علوم کی فہرست "جواہر قرآن" اور "احیاء العلوم" میں تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے - اس کو پڑھنا چاہیے۔

دوسری صورت یہ ہے، اگر علم حاصل نہ کر سکے، تو تسبیح و عبادت میں مشغول ہو جائے - یہ درجہ عابدین میں شمار ہوتا ہے خصوصاً وہ اوراد جو دل کو مسخر کر لیں، نہایت افضل و برتر ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر دونوں مندرجہ بالا صورتیں نہ کر سکے تو علماء و فضلا اور صوفیائے کرام کی خدمت میں وقت صرف کرے - یہ نوافل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے چونکہ اس میں مسلمانوں کی ایک طرح سے خدمت کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اُن علماء و فقہا کی دُعائیں بھی حاصل ہوتی ہیں، جو بارگاہِ ایزدی میں مؤثر ہیں۔

چوتھی صُورت یہ ہے، کہ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لیے کسب معاش میں مشغول ہو، لیکن لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے - حرص دُنیا کو دل میں جگہ نہ دے - جتنا کما سکے اس پر قناعت کرے - ان صفات کے حامل ہونے کے بعد درجہ عبّاد اور اصحاب الیمین کے درجہ کو پہنچ سکے گا - اگرچہ مقربین میں شمار نہ ہو سکے گا۔

اگر ان چاروں عبادات کے علاوہ کسی دوسرے کام میں مشغولیت ہوگی، تو وہ شیطان کا مطیع ہوگا۔

چوتھا ورد — وقتِ زوال سے عصر کی نماز تک کا وقت ہے۔ پہلے قیلولہ کرے، لیکن زیادہ نہ سوئے اور اُٹھتے ہی فوراً طہارت سے فارغ ہوکر مسجد جاکر اذان سُنے اور نماز تحیۃ المسجد ادا کرے۔ نماز واجب سے پہلے چار رکعت نماز پڑھے۔ نماز پڑھنے میں جلدی نہ کرے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان چار رکعت کو طول دے کر ادا فرماتے تھے۔ اور ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت اجابت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ جو آدمی یہ چار رکعت نماز پڑھتا ہے، اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں، اور رات تک اس کے لیے دُعا کرتے ہیں۔

بعد میں نماز واجب باجماعت ادا کرے۔ اس کے بعد دو رکعت نماز سنّت ادا کرے۔ پھر دوسری نماز کے وقت تک نیک اعمال کا ذکر کرتا رہے۔ کسی دنیوی کام میں مشغول نہ ہو۔

پانچواں ورد۔ نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کا ہے۔ عصر کی نماز کے وقت مسجد میں آئے۔ اوّل چار رکعت نماز ادا کرے۔ ارشاد نبوی ہے، کہ عصر سے پہلے جو آدمی چار رکعت نماز پڑھتا ہے، اس پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اوپر بتائے ہوئے فریضوں میں وقت گزارے۔ نماز عصر سے پہلے مسجد میں آئے اور استغفار میں مشغول ہو۔ یہ وقت بھی صبح کی فضیلت رکھتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا۔ اس وقت وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى و مُعَوَّذَتَيْنِ پڑھے۔ غروب آفتاب کے وقت استغفار کا ورد کرے۔ تمام اوراد اور مشاغل کے اوقات مقرر کرلینا چاہئیں۔ ورنہ تضیع اوقات ہوتی ہے، اور سوچنے میں وقت ضائع ہوتا ہے۔

وظائفِ شب

رات کے وظائف	رات کے بھی تین ورد ہیں :

پہلا ورد، نماز سے مغرب سے نماز عشاء تک کا وقت ہے۔ ان نمازوں کے درمیان سونا اچھا نہیں۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (یعنی ان لوگوں کے پہلو نماز سے خالی ہوتے ہیں مقصد یہ ہے کہ سوتے نہیں ہیں) لہٰذا چاہیے کہ نماز عشا تک نماز اور اوراد و وظائف میں وقت گزارے۔ بعض بزرگانِ دین نے اس عمل کو روزوں سے زیادہ بہتر کہا ہے۔ اس وقت کھانا بھی نہیں کھانا چاہیے۔

پس جب وتر سے خالی ہوجائے، تو لہو لعب سے وقت خراب نہ کرے، بلکہ اچھے کاموں میں وقت گزارے۔

دوسرا ورد، اگر سونا عبادت میں شامل نہیں، لیکن اگر عبادات سے فارغ ہوگیا ہے تو سونا عبادت میں شامل ہے۔ سنّت یہ ہے کہ قبلے کی طرف مُنہ کرکے سوئے اور داہنی طرف کروٹ لے کر سوئے۔ خواب کو موت

متصور کرے، اور بیداری کو روزِ قیامت۔ ممکن ہے کہ سونے میں رُوح قبض کر لی جائے اور پھر واپس نہ ہو، لہٰذا چاہیے، کہ نیکیاں کرے اور سونے سے پہلے وُضو کرلے، اور توبہ کرے کہ بیدار ہوں گا تو گناہوں سے پرہیز کروں گا وصیت نامہ لکھ کر سرہانے رکھ لے تکلف کے ساتھ نہ سوئے، کیوں کہ یہ تمام اوراد کے چوبیس گھنٹوں میں سے تیسرا حصّہ ہے۔

نرم بستر نہ بچھائے، کیونکہ زیادہ سونا زندگی کو بیکار کرتا ہے۔ رات دن میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہ سونا چاہیے۔ اگر ایسا کرے گا تو گویا کہ عمر کا تیسرا حصّہ خواب میں ہی گزر جائے گا۔

سوتے وقت پانی اور مسواک قریب میں رکھ لے، تاکہ رات یا صبح کی نماز کے وقت تلاش کی ضرورت نہ پڑے۔ اور جب سونے لگے، تو نمازِ شب یا نمازِ صبح کے وقت اٹھنے کا خیال کر کے سوئے۔ کیونکہ یہ بھی باعثِ ثواب ہے۔ چاہے اس وقت نماز غالب ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جب بستر پہ لیٹے تو یہ پڑھے بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتُ جَنْبِي وَبِاسْمِكَ اَرْفَعُهٗ ساتھ ہی ساتھ آیۃ الکرسی، اٰمَنَ الرَّسُوْلُ، معوذتین اور سورہ تبارک کا ورد کرلے۔ اس کے متعلق بیان دعوات میں لکھ دیا گیا ہے، تاکہ ذکرِ خدا کرتے کرتے سو جائے۔ جو آدمی یہ عمل کرتا ہے فرشتے اس کی رُوح کو عرش کی سیر کرنے لے جاتے ہیں، اور سونے کے وقت تک نماز گزاروں میں محسوب کرتے ہیں۔

تیسرا ورد یہ ہے، کہ تہجد (نمازِ شب) کے لیے بیدار ہو۔ اس نماز کا پڑھنا بہت سی نمازوں سے افضل ہے۔ کیونکہ وہ وقت انتہائی سکونِ قلب کا ہوتا ہے۔ رحمت کے دریچے کھلے ہوتے ہیں۔ نمازِ شب کے متعلق تمام احادیث "احیاء العلوم" میں نقل کر دی گئی ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے، کہ دن اور رات میں کوئی وقت ضائع نہ کرے۔ ایک رات ہی نہیں بلکہ تمام عمر یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر یہ دشوار ہو تو روز سوچے کہ آج ہی یہ عمل کر لوں، کہ آج کی رات ہو سکتا ہے کہ آخری ہو۔ اور کل مر جاؤں۔ اگر یہ تمام اعمال کرنے سے روزانہ مجبور ہو جائے، تو سمجھے کہ میں سفر میں ہوں، اور جلدی جلدی دنیا کی زندگی کو اپنے وطنِ آخرت جانے کی تیاری میں طے کرے۔ انسان کی دنیوی عمر آخرت کی عمر کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ اگر ایک آدمی دس برس عیش اٹھانے کے لیے ایک سال تکلیف اٹھائے تو کیا قباحت ہے؟ اسی طرح ہزاروں برس کی عمر آخرت گزارنے کے لیے چند سال یہاں تکلیف برداشت کرے تو کیا حرج ہوگا۔

رکنِ عبادات ختم ہوا، اب رُکنِ معاملات شروع کیا جائے گا۔

حصّہ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسرا رُکن

معاملاتِ دُنیا

معاملات کے بھی دس اصول مقرّر کیے گئے ہیں، جو پہلے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ حسبِ ذیل ہیں :
آدابِ طعام ۔ آدابِ نکاح ۔ آدابِ تجارت ۔ آدابِ کسب حلال ۔ آدابِ صحبت ۔ آدابِ گوشہ نشینی ۔ آدابِ سفر ۔ آدابِ سماع ۔ آدابِ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ۔ آدابِ سلطنت وبادشاہت ۔

پہلا اصُول

آداب طعام

کھانے کے آداب اور طریقے

معلوم ہونا چاہیے کہ عبادت کرنے کے لیے اسباب مُہیّا کرنا بھی عبادت میں شامل ہے جو چیز عبادت کے لیے ممد ہوتی ہے وہ بھی عبادت ہوتی ہے ۔ دین کو غذا کی ضرورت ہے ۔ اور سالکانِ راہِ خدا کا مقصد دیدارِ خداوندی ہے ۔ اور دیدارِ خداوندی بغیر علم وعمل کے ناممکن ہے اور علم وعمل بغیر تندرستی وصحت کے ناممکن ہے ۔ اور تندرستی وصحت کھانے ہی کے ذریعے برقرار رہ سکتی ہے ۔ لہذا معلوم ہوا کہ کھانا بھی عبادت میں شامل ہے ۔ خداوند عالم فرماتا ہے کُلُوا مِنَ طَیِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۔ (نیک اور پاک کسب سے روٹی کھاؤ اور نیک اعمال کرو) ہم کو اسی آیت میں خداوند عالم نے کھانے کے متعلّق حکم دیا ہے ۔

لہٰذا جو آدمی کھانا صرف اس لیے کھاتا ہے، کہ دین خداوندی کی ترویج دے اور عبادت خدا میں وقت گزارے، اس کا کھانا بھی عبادت میں داخل ہے ۔ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے، کہ مومن کا ہر کام ثواب ہوتا ہے، چاہے وہ اپنے اہل وعیال کے لیے کسب کیوں نہ کرے ۔ اصل مقصد اس کا یہ ہے کہ مومن کا کسب کرنا بھی راہِ خدا پر چلنے کے لیے ہوتا ہے ۔

خدا کی راہ میں کھانے پینے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں بدنیّتی نہ کرے ۔ کسب حلال کھائے اور ضرورت سے زیادہ نہ کھائے ۔

کھانے کے آداب کھانا کھانے کے لیے بھی بہت سے امور سنّت ہیں۔ اُن میں بعض سے اوّل بعض درمیان میں اور بعض بعد فراغت ادا کرنا چاہئیں۔

کھانا کھانے سے پہلے کے آداب چونکہ کھانا کھانا آخرت کی تیاری کا سبب ہے۔ لہٰذا اِس میں بھی صفائی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اوّل مُنہ ہاتھ دھوئے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ جو آدمی کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتا ہے، وہ فقر سے محفوظ رہتا ہے۔

دوم یہ کہ کھانا دستر خوان پر رکھ کر کھائے، خوان پر نہیں۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم دستر خوان پر ہی کھانا تناول فرماتے تھے۔ خوان پر کھانا بھی منع تو نہیں ہے، لیکن سنّت یہی ہے۔

سوم۔ داہنے زانو کو اُٹھائے رکھے۔ بائیں پنڈلی پر زور دے کر بیٹھے۔ تکیہ لگا کر نہ کھائے۔ حضوؐر کا ارشاد ہے کہ میں تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔ کیونکہ میں ایک بندہ ہوں اور بندوں ہی کی طرح بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔

چہارم۔ کھانے سے پہلے یہ نیت ہونا چاہیے کہ یہ کھانا میرا عبادت کے لیے ہے، پیٹ بھرنے کے لیے نہیں ہے، اور تھوڑا کھانے کا اِرادہ کرے۔ کیوں کہ جب پیٹ بھر کر کھانا عبادت کا منافی ہے۔ ابنِ شیبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میری عمر اسّی برس ہے، لیکن آج تک میں نے پیٹ بھرنے کے لیے کھانا نہیں کھایا۔ ہمارے رسُول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے، کہ صرف اتنا کھانا کہ آدمی سیدھا رہ سکے کافی ہے، اور اگر اس پر صبر نہیں کر سکتا تو تہائی پیٹ کھانا کھائے، اور ایک تہائی پانی پی لے اور باقی ایک تہائی حصہ سانس کے آنے جانے کے لیے خالی چھوڑ دے۔

پنجم۔ کھانے سے پہلے جو چیزیں سُنّت ہیں، اُن میں سب سے زیادہ فضیلت بھوک کی زیادتی کو ہے۔ لہٰذا بھُوک سے پہلے کھانا نہ کھائے۔ یہ مذموم بھی ہے اور مکروہ بھی طبّی حیثیت سے بھی بھوک کے وقت کھانا۔ اور کھانے سے بھُوکا اٹھ جانا بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

ششم۔ یہ کہ اگر روٹی ہی صرف ہو اور ترکاری نہ ہو تو روٹی کی عزّت اور احترام یہ ہے کہ رُوکھی کھالے اور موجود کھانے پر قناعت کرے۔ لذیذ کھانوں کو نہ ڈھونڈے۔ نماز سے پہلے کھانا کھانا اچھا ہے۔

ہفتم۔ یہ کہ تنہا کھانا نہ کھائے، بلکہ کبھی نہ کسی کے ساتھ کھائے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کبھی تنہا کھانا تناول نہ فرماتے تھے۔ کھانے میں جتنے ہاتھ زیادہ پڑیں گے اتنا ہی باعثِ برکت ہوگا۔

کھانے کے درمیان کے آداب

پہلے بسم اللہ پڑھے، اور بعد میں الحمد پڑھے۔ بلکہ ہر لقمے میں بسم اللہ کہے۔ اور زور سے کہنے میں افضلیت ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی دیکھا دیکھی کہیں۔ داہنے ہاتھ سے کھانا شروع کرے۔ کھانا نمک سے شروع کرے اور آخر میں

بھی نمک کھائے، تاکہ حرص وطمع نہ رہے۔ لقمہ چھوٹا کھائے، اور خوب چبا کر نگلے۔ جب تک پہلا لقمہ نہ نگل لے دوسرا نہ اُٹھائے۔ کسی کے کھانے میں عیب نہ نکالے۔ یہ سنّت ہے۔ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کبھی نقص نہ نکالتے اگر اچھا ہوتا تو کھاتے، ورنہ خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ کھانا اپنے آگے ہی سے کھاتے، مگر میوہ پلیٹ کے اِدھر اُدھر کے حصوں سے لے کر کھانا بُرا نہیں۔ کیونکہ وہ قسم قسم کا ہوتا ہے۔ سالن یا ترکاری میں بھگوئے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کو پلیٹ کے درمیان سے نہ کھائے۔ روٹی بیچ سے توڑ کر نہ کھانا چاہیے۔ گوشت روٹی کو چھری سے کھانا ممنوع ہے، جو چیزیں کھانے کی نہ ہوں وہ روٹی پر نہ رکھے۔ اگر نوالہ ہاتھ سے گر جائے، تو اس کو اٹھا کر کھالے۔ کھانے کے بعد روٹی سے ہاتھ صاف نہ کرے۔ پہلے اُنگلیوں کو مُنہ سے چاٹ لے۔ یہ عمل باعثِ برکت ہوتا ہے۔ گرم کھانے کو ہوا کے ذریعہ ٹھنڈا نہ کرے، بلکہ صبر کر کے بیٹھا رہے۔ اگر کوئی پھل استعمال کرے تو طاق۔ مثلاً تین۔ پانچ۔ سات۔ گیارہ۔ کیوں کہ اللہ بھی طاق ہے۔ اور طاق کی نسبت اس سے ہے۔ پھلوں کی گٹھلیوں کو اسی پلیٹ میں نہ ڈالے۔ اور نہ ہاتھ میں لیے رہے، بلکہ کسی دوسری پلیٹ میں جمع کر دے۔ کھانا کھانے میں زیادہ زیادہ پانی نہ پینا چاہیے۔

کھانے کے بعد کے آداب

پیٹ اچھی طرح بھرنے سے پہلے کھانا ختم کر دے اور اوّل اُنگلیاں مُنہ سے صاف کرلے۔ پھر رومال سے صاف کرے۔ روٹی کے ٹکڑے اگر گر گئے ہیں تو اُن کو اُٹھائے اور جمع کرلے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ یہ عمل کرنے والے آدمی کے رزق میں کشادگی ہوتی ہے۔ اس کی اولاد نیک چلن اُٹھتی ہے۔ برتن میں جو ترکاری لگی ہوئی ہو، اس کو اُنگلیوں سے چاٹ لے۔ حدیث میں ہے کہ برتن اس کے لیے دُعا کرتا ہے۔ اس کے بعد خلال کرے جو خلال میں لگ کر باہر آجائے اس کو پھینک دے اور جو دانتوں سے نکل کر مُنہ میں رہ جائے اُسے کھالے اگر کھانے کے بعد برتن کو چاٹا اور دھو کر اس کا پانی پی لیا تو ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ کھانا ختم کر کے یہ دعا پڑھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا وَاٰوَانَا وَھُوَ سَیِّدُنَا وَمَوْلٰنَا۔ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ وَلِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ اگر کسب حلال کھایا ہے تو شکر بجالائے۔ اور اگر کوئی شک ہو تو رنج کا اظہار رو کر کرے۔ کھانے کے بعد اشنان (ایک قسم کی مٹّی ہوتی ہے) کو بائیں ہاتھ میں لے اور اوّل داہنے ہاتھ کی اُنگلیوں کے سروں کو دھو کر صاف کرلے۔ پھر وہ مٹّی ہاتھ کو مل کر دھوئے۔ اس کے بعد منہ صاف کرلے۔

پانی پینے کا طریقہ

پانی پیتے وقت اوّل بسم اللہ پڑھ لے اور گلاس کو داہنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ پیے۔ کھڑے ہو کر یا لیٹ کر پینا ممنوع ہے۔ اوّل گلاس کو دیکھ لے کہ پانی میں کچھ ملا ہوا تو نہیں ہے۔ اگر پیتے میں ڈکار آجائے

تو اپنے سانس کو گلاس کے پانی سے بچائے۔ ایک سانس پانی اگر نہ پیا ہے، تو تین بار کر کے پیے۔ اور ہر بار بسم اللہ پڑھے۔ اور پینے کے بعد الحمد کہے۔ گلاس کو غور کر لے کہ وہ ٹوٹا ہوا تو نہیں ہے۔ یا ٹپک تو نہیں رہا۔ پانی پی لینے کے بعد یہ دُعا پڑھے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَہٗ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِہٖ وَلَمْ یَجْعَلْہُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا۔

آپس میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا طریقہ

اُوپر کے طریقے تنہا کھانے کے لیے بتائے گئے ہیں۔ لیکن دوسروں کے ساتھ کھانا کھانے میں سات آداب اور بھی ہیں۔ جن کا خیال رکھے۔

پہلے۔ اگر تمہارا شریک، علم یا عمر یا زہد و پرہیزگاری میں تم سے برتر ہے، تو پہلے اس کو شروع کرنے دے اور اگر خود دوسروں کے مقابل میں یہ اوصاف رکھتا ہو، تو خود شروع کرے۔

دوسرے یہ کہ، خاموشی سے کھانا نہ کھائے، یہ عادت اہلِ عجم کی ہے، لیکن کھانے میں صرف نیک اور شریعت کے مطابق باتیں کرے۔

سوم۔ اپنے شریک کا لحاظ رکھے، کہ اچھے کھانے اس کو کھانے دے۔ اور اگر تکلّف کر رہا ہے تو اس کی تین بار تک تعظیم کرے۔ اس سے زیادہ ممنوع ہے۔ کھانے میں قسم نہ دے۔ کھانا چونکہ مشترک ہے لہٰذا اس کا خیال رکھے، کہ شریک بھوکا نہ رہ جائے۔

چہارم۔ اس کا لحاظ رکھے کہ شریک کو بار بار تعظیم کی ضرورت نہ پڑے، بلکہ حسبِ معمول کھائے اور کم کھانا بھی ریا میں داخل ہے۔ تنہا کھانا کھانے میں ادب ضروری ہے، تاکہ شرکاء کے ساتھ کھانے میں بھی مؤدب رہ سکے۔ اگر دوسروں کی تعظیم کی وجہ سے زیادہ کھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ایک بار ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے درویشوں کو کھانا کھلایا اور بعد میں خرما کے لیے فرمایا کہ جو آدمی ایک خرمہ زیادہ کھائے گا، اس کو ایک خرمے کے عوض میں ایک درہم دیا جائے گا۔ کھانے کے بعد آپ گٹھلیوں کو گن کر درہم دیا کرتے۔

پنجم۔ یہ کہ دوسروں کے لقموں کی طرف نگاہ نہ کرے۔ بلکہ نیچی نگاہوں کے ساتھ کھاتے اور اگر دوسروں کے مقابلے میں باعزت آدمی ہے، تو جلدی کھانے سے فارغ نہ ہو۔ اگر چھوٹے پیٹ کا آدمی بھی ہو تو پہلے آہستہ آہستہ کھائے، تاکہ دوسروں کے ساتھ آخر میں جلدی کھا سکے۔ اور اگر یہ عمل نہ کر سکے تو معافی مانگ لے، تاکہ دوسروں کو شرمندگی نہ ہو۔

ششم۔ ہاتھ کو برتن پر نہ جھٹکے۔ مُنہ کو برتن کے بالکل قریب نہ جھکائے۔ کہ منہ کا جھوٹا برتن میں گر جائے اگر مُنہ سے کوئی چیز نکالتا ہو، تو اوّل منہ پھیر لے۔ چکنے لقمے کو سرکے میں نہ ڈبوئے۔ لقمے کو دانت سے کاٹ کر برتن میں نہ ڈالے۔ کیونکہ دوسروں کو ان حرکات سے نفرت ہوتی ہے۔ کھانے میں مکروہ اور گھناؤنی باتیں نہ کرے۔

ہفتم۔ ہاتھ طشت یا سلیپچی میں دھوتے وقت سب کے سامنے اس میں کلّی نہ کرے۔ اپنے بزرگ اور عالموں کو اوّل جگہ دے، اگر دوسرے اس کو سبقت دیں، تو اصرار نہ کرے۔ طشت کو اوّل داہنی طرف گھمائے اور ہاتھوں کو دُھلے ہوئے پانی کو یکجا جمع کر کے یکجا ہی پھینکے۔ الگ الگ پانی پھینکنا اہلِ عجم کی عادات میں تھا۔ سب کا ساتھ ساتھ ہاتھ دھونا بہت اچھا ہے۔ ہاتھ دُھلوانے والے آدمی کو بیٹھ کر دھلانا اچھا ہے۔ کلّی کے پانی کو زور سے طشت میں نہ ڈالے۔ اِس سے چھینٹیں اُڑنے کا اندیشہ ہے۔ یہ تمام آداب احادیث اور روایات سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان آداب سے حیوانیت اور انسانیت میں فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ حیوان بغیر کسی لحاظ کے جس طرح چاہتے ہیں کھاتے ہیں۔ وہ اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ لیکن انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے لہٰذا اس کو ہر بات میں تمیز اور لیاقت سے کام لینا چاہیے۔

دوستوں وغیرہ کے ساتھ کھانا کھانے کی فضیلتیں

معلوم ہونا چاہیے کہ دوستوں کی دعوت کرنا، صدقے کے ثواب سے کہیں بہتر و برتر ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، کہ آخرت میں تین چیزوں کا حساب نہ ہوگا۔

ایک وہ کھانا جو سحر کے وقت ماہِ رمضان میں کھایا جاتا ہے۔

دوسرے وہ افطاری، جو روزہ کے افطار کے وقت کھائی جاتی ہے۔

تیسرے وہ کھانا، جو دوستوں کو کھلایا جائے۔ اور اُن کے ساتھ کھایا جائے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ دسترخوان پر کھانے کے لیے بیٹھو تو دیر کرو۔ کیونکہ اتنی دیر کی عمر کا حساب نہ ہوگا۔ حسن بصری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں، کہ آدمی جو کچھ کھاتا ہے اور اپنے ماں باپ کو کھلاتا ہے، اس کا حساب کتاب ہوگا، مگر دوستوں کو کھلانے کا حساب نہ ہوگا۔

بزرگانِ دین میں سے ایک کی عادت یہ تھی، کہ دوستوں اور اعزا کے سامنے قسم ہا قسم کے کھانے رکھتے اور حدیث کا حوالہ دیتے کہ جو کھانا دوستوں کے آگے سے بچے گا اس کا حساب نہ ہوگا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ کہ ایک غلام آزاد کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک صاع کھانا کسی دوست کو کھلائے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ خداوندِ عالم بروزِ قیامت ندا دے گا کہ اے بندے میں بھوکا رہا اور تو نے مجھے کھانا نہ دیا۔ تو بندے دریافت کریں گے کہ بار الٰہ تو دنیا و دیں پر قابض ہے، تو کیسے بھوکا رہ سکتا ہے؟ تو ندا آئے گی کہ تیرا بھائی بھوکا تھا، تو نے اس کو کھانا نہ دیا۔ مثل اس کے ہے کہ مجھ ہی کو بھوکا رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو آدمی کسی دوست کو سیراب کرے، اس کو راہِ دوزخ میں سے سات خندقیں اس پانی سے ٹھنڈی کر دے گا اور ہر خندق کا راستہ ایک دوسرے سے پانچسو سال کا ہوگا۔ خَیْرُکُمْ مَنْ اَطْعَمَ الطَّعَامَ۔ (یعنی تم

میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے، جو کھانا کھلائے)

آداب ملاقات

اس کے لیے چار آداب مقرّر کیے گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ کھانے کے وقت کسی کے گھر نہ جائے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ جو آدمی بغیر بلائے، کسی کا کھانا کھائے گا، وہ حرام ہے۔ لیکن اگر اتّفاقی طور پر کہیں پہنچ گیا ہے۔ اور اس پر بھی مالک خانہ ظاہری تواضع کر رہا ہے، تو بھی نہ کھانا چاہیے۔ لیکن اگر سچّی تواضع کرے تو کھانے میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ لیکن اگر حقیقی دوست کے ہاں بغیر بلائے بھی چلا جائے اور کھانا کھالے تو یہ امر سنّت ہے۔

ایک بار رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، بھوک کے وقت حضرت ابو ایّوب انصاری کے یہاں تشریف لے گئے اور اُن سے کھانا مانگا، اور تناول فرمایا۔ یہ عمل نیکی کا باعث ہوتا ہے۔

بزرگانِ دین میں سے ایک صاحب راغب گزرے ہیں، جن کے تین سو ساٹھ دوست تھے اور وہ ہر دوست کے یہاں ایک دن رہا کرتے تھے۔ ایک بزرگ کے تیس دوست تھے۔ دوسرے صاحب کے سات دوست تھے، اور یہ ایک دوسرے دوست کے یہاں ایک ایک دن رہتے۔ ان لوگوں کا وہاں رہنا باعثِ خیر و برکت تھا۔ اگر دینی و حقیقی دوستی ہو، تو اس کی غیبت میں بھی اس کے یہاں کھانا کھا لینا چاہیے۔ ایک بار حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم بریدہ کے یہاں تشریف لے گئے اور وہ گھر پر نہ تھے۔ لیکن حضورؐ نے کھانا تناول فرمایا۔ حضرت محمد بن واسع علیہ الرحمۃ ایک بار مع اپنے مریدوں کے حضرت حسن بصری کے یہاں گئے اور وہاں جو کچھ مل گیا کھالیا۔ جب حسن بصری آئے تو یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اسی طرح حضرت سفیان ثوری کے گھر جاکر کچھ لوگوں نے کھا جب وہ آئے تو اُن لوگوں نے فرمایا کہ آپ لوگوں نے مجھے اسلاف کے زمانے کی یاد دِلا دی۔

دوسرے، اگر کوئی آدمی آئے تو جو کچھ موجود ہو وہ ہی کھلادے۔ لیکن اگر نہ ہو، تو قرض نہ مانگے، یا اگر ضرورت سے زیادہ کھانا نہ ہو تو بھی، اس کو کھلانے کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو دعوت کے لیے مدعو کیا۔ امیر المومنین نے فرمایا کہ میں تین شرائط پر تمھارے یہاں آنے پر تیار ہوں۔ پہلے یہ کہ بازار سے کوئی چیز نہ لاؤ گے۔ دوسرے یہ کہ جو کچھ گھر میں ہو وہ واپس نہ لے جانا۔ تیسرے یہ کہ گھر والوں کے لیے پیٹ بھر کھانا اوّل رکھ دو۔ حضرت فضیل علیہ الرحمۃ کا مقولہ ہے کہ لوگ آپس میں تکلّف کرنے کی وجہ سے غیریت برتنے لگتے ہیں۔ اگر تکلّف نہ ہو، تو ہر آدمی ایک دوسرے سے انتہائی بیباکی اور خلوص سے ملے گا۔ ایک بار وہ کسی کے ساتھ کھا رہے تھے۔ تو اس شخص نے کہا کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں، تو اس طرح کھانا نہیں کھاتا۔ لہٰذا تکلّف ختم کر دیا جائے۔ ورنہ آپس میں بیٹھ کر کھانا نہ کھایا جائے۔

حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول تھا، کہ تکلف نہ کرو۔ اور جو موجود ہے کھالو! صحابہ کرام روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور کھجوریں ایک دوسرے کے سامنے لے جاتے تھے، اور کہتے تھے، کہ سب سے بڑا گنہگار وہ ہے جو ماحضر کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے دوسرے کو نہ کھلائے یا دوسرے کا خود نہ کھائے۔

تمثیل حضرت یونس علیہ السلام ٹکڑے اور ترکاری دوستوں کو کھلاتے، اور فرماتے کہ خداوندِ عالم اگر تکلف کرنے والوں پر لعنت نہ کرتا، تو میں تکلف کیا کرتا۔ کچھ لوگ آپس میں لڑتے ہوئے حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس فیصلے کے لیے پہنچے۔ آپ گھر میں موجود نہ تھے، لیکن ایک نہایت حسین عورت وہاں موجود تھی۔ ان لوگوں نے سوچا کہ پیغمبر اس حسینہ کے ساتھ عیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈھونڈھتے ہوئے جنگل میں پہنچے، تو دیکھا کہ روٹی کھا رہے ہیں۔ حضرت زکریاؑ نے ان لوگوں کی تعظیم نہ کی۔ جب آپ کھانے سے فارغ ہو کر کھڑے ہوئے تو ننگے پیر تھے۔ اُن لوگوں کو ان تمام باتوں سے بڑا تعجب ہوا۔ اُن لوگوں نے اِن باتوں کا سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ خوبصورت عورت کی وجہ سے دین محفوظ رہتا ہے۔ تاکہ میں کسی دوسری حسین عورت کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کروں۔ اور میرا تعظیم نہ کرنا اس لیے تھا، کہ مجھے شام تک مزدوری کرنا ہے اور اگر پیٹ بھر کھانا نہ کھاتا تو اچھی طرح شام تک مزدوری نہ کر سکتا، اور ننگے پیر اس لیے ہوں کہ اس زمین کے مالکان میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ تو اگر میں جوتا پہنتا تو ہو سکتا تھا کہ میرے جوتے کی لگی ہوئی مٹی کسی دوسری زمین میں لگ کر اس کو متاثر کر دیتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تکلف سے صدق اور حقیقت کہیں بہتر ہے۔

تیسرے یہ کہ تحکم سے اگر میزبان کو تکلیف ہوتی ہے تو حکم نہ دے۔ اور اگر مہمان کو دو چیزوں میں کسی ایک کا اختیار دے دیا جائے تو آسان چیز عمل میں لائے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی عمل کیا ہے۔

واقعہ ایک آدمی حضرت سلمانؓ کا مہمان ہوا۔ آپ نے اس کے آگے ایک جَو کی روٹی اور نمک رکھ دیا۔ تو اُس نے کہا کہ اس کے ساتھ اگر ترکاری ہوتی تو بہتر تھا۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ آفتابہ رکھ کر کھالیں۔ پس جب وہ مہمان کھا چکا تو اُس نے کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ قَنَّعَنَا بِمَا رَزَقَنَا (یعنی شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے قناعت کا سبق دیا) تو حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ اگر تو قانع ہوتا، تو آفتابے کی ضرورت نہ پڑتی، لیکن اگر یہ اطمینان ہو کہ میزبان اس کی فرمائش سے خوش ہوگا، تو فرمائش کرے۔ ایک بار حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بغدادی زعفرانی کے یہاں تشریف لے گئے۔ زعفرانی روزانہ خود امام صاحب کے لیے کھانے لکھ کر باورچی خانے کے داروغہ کو دیتا تھا۔ ایک دن امام صاحب نے خود ایک کھانا اس میں بڑھا دیا۔ جب زعفرانی نے کنیز کے ہاتھ میں دیکھا تو بہت خوش ہوا، اور اس کے شکر میں کنیز کو آزاد کر دیا۔

چوتھے یہ کہ میزبان مہمانوں کی حسب منشاء کھانا کھلائے۔ یہ بھی خیر و برکت کا باعث ہے۔ رسول خدا

صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنے بھائیوں کی آرزو پُوری کرتا ہے۔ ہزاروں نیکیاں اس کے اعمال میں لکھی جاتی ہیں، اور ہزاروں گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، اور تینوں بہشتوں میں اس کو جگہ ملتی ہے۔ البتہ مہمان سے یہ پوچھنا کہ یہ چیز لائیں یا نہ لائیں، قبیح ہے۔ پس جو موجود ہے، وہ سب لائے، اور اگر وہ نہ کھائے تو واپس لے جائے۔

فضائل و برکاتِ میزبان

میزبانی کے فضائل اب تک اِس مہمان کے متعلق بتایا گیا، جو اتفاقاً آجائے، تو اس کے ساتھ یہ نیک برتاؤ کرنا چاہئیں، لیکن اگر تو خود کسی کو مہمان بُلائے تو جو جتنا اچھا کھانا پیش کر سکے کر! اس میں کوئی کمی نہ کرنا چاہیے۔ عرب کے لوگوں کا دستور ہے کہ وہ سفر میں ایک دوسرے کے یہاں جاتے ہیں، اور مہمان ٹھہرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مہمان نواز نہیں ہے، وہ نیک کام نہیں کرتا۔ یہ بھی حکم دیا کہ اگر مہمان آئے تو تکلف نہ کرو۔ کیونکہ یہ عمل اس کے لیے دشمنی کا باعث ہوگا۔ لیکن اگر کوئی غریب مہمان آجائے، تو اس کے لیے قرض لے کر کھلانا بھی اچھا ہے۔ لیکن خلوص کے دوستوں کے ساتھ تکلف کرنا خلوص کو ختم کر دینے کے مترادف ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلام ابو رافع رضی اللہ عنہ، کا قول ہے کہ حضوؐر نے ایک بار مجھے حکم دیا کہ فلاں یہودی سے آٹا قرض لے آ۔ چونکہ مہمان آیا ہوا ہے اور رجب کے ماہ کا وعدہ کر لینا۔ میں یہودی کے پاس گیا، تو اُس نے بغیر کسی چیز کے رہن رکھے آٹا دینے سے قطعی انکار کر دیا۔ میں نے واپس آکر حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا۔ تو حضوؐر نے فرمایا کہ واللہ میں زمین و آسمان میں امین ہوں اگر وہ قرض دے دیتا تو میں ضرور ادا کر دیتا۔ اب میری زرہ لے کر اس کے پاس رہن رکھ دے۔ چنانچہ میں زرہ رہن رکھ کر آٹا لے آیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام مہمان کی تلاش میں گھر سے دُور تک نکل جاتے۔ جب تک کوئی مہمان نہ مل جاتا، آپ کھانا نہ کھاتے۔ اسی وجہ سے اُن کے مزارِ مقدس پر یہ رسم باقی ہے اور روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں مہمان ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کئی گاؤں اسی کے لیے وقف کر دیئے ہیں۔

آدابِ دعوت و قبولِ دعوت

میزبان کو چاہیے کہ صالحین کے علاوہ دوسروں کو مدعو نہ کرے۔ کیونکہ فاسقین اور غیر صالح لوگوں کو بُلا کر کھلانا، اُن کی مدد اور اعانت کا باعث ہوگا۔ جو فسق و فجور پھیلائیں گے۔ اور اس میں گویا کہ تو بھی شامل ہو جائے گا۔

تونگروں کو کھانا نہ کھلاؤ، بلکہ غریبوں کو کھلاؤ۔ حضُور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے، کہ بدترین ”ولیمہ

وہ ہے جو درویشوں کو نہ کھلایا جائے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا، کہ تم لوگ دعوت دینے میں تکلیف کرتے ہو اور ایسے آدمی بلاتے ہو، جو نہ آئیں۔ اور جن کو آنا چاہیے، اُن کو نہیں بلاتے۔ اپنے اعزہ و اقرباء کو ضرور بلانا چاہیے دعوت دینے میں فخر اور ڈینگیں نہ ہانکے۔ بلکہ سنّت پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے آدمی کو مدعو ہی نہ کرے جو تیری دعوت کو رد کر دے۔ کیونکہ یہ بات تیری دل شکنی کا باعث ہو گی۔ اور جو آدمی بکراہت آئے اس کو بھی نہ بلائے، اس لیے کہ وہ تیرا کھانا بکراہت کھائے گا، اور یہ گناہ ہے۔

آداب قبولِ دعوت پہلے، دعوت کھانے میں امیر و غریب کی تخصیص نہ کرے۔ بلکہ غریب کے یہاں ضرور جا کر کھائے۔ کیونکہ حضورؐ مساکین کے یہاں جا کر ضرور دعوت کھاتے تھے —— ایک بار امام حسینؑ علیہ السلام راستے سے گزر رہے تھے کہ لوگوں نے کہا یا ابنِ رسول اللہ ہمارے شریک ہو جائیے! تو آپ سواری سے اُتر گئے۔ اُن لوگوں کے پاس روٹی کے سوکھے ٹکڑے تھے۔ آپ نے اُتر کر کھائے اور فرمایا کہ خداوندِ عالم مغرور آدمی کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر اُن لوگوں سے فرمایا کہ اب کل تم لوگوں کو میرے پاس دعوت ہے۔ چنانچہ آپ نے اُن لوگوں کے لیے بہترین کھانے تیار کرائے۔ اور خود بھی انہیں کے ساتھ کھائے۔

دوم۔ اگر یہ سمجھے کہ میزبان صرف ظاہری طور پر ہی اس کو بلانا چاہتا ہے، تو کوئی بہانہ کر کے دعوت قبول نہ کرے۔ بلکہ ایسے شخص کے پاس جانا چاہیے، جہاں میزبان اس کا احسان جانتا ہو۔ اسی طرح اگر یہ سمجھے کہ میزبان کے یہاں خلافِ شریعت کھانے کی چیزیں بھی ہیں مثلاً اطلس کا فرش۔ چاندی کی انگیٹھی —— تصاویرِ جانوراں۔ راگ و نغمہ وغیرہ، یا فحش کلامی و مسخرا پن کا اندیشہ ہے یا جوان عورتیں مردوں کو دیکھتی ہیں تو ایسی جگہ نہ جائے، کیونکہ یہ بھی خلافِ شریعت ہے۔ یا اگر میزبان کا مقصد دعوت صرف شیخی مارنا ہی ہو، یا وہ ظالم و فاسق و فاجر یا بدعتی ہو، تو بھی دعوت کو رد کر دے۔

سوم — راستے کی دوری کی وجہ سے دعوت میں جانے سے پرہیز نہ کرے، بلکہ جتنا راستہ ہو بخوشی طے کرے توریت میں حکم ہے کہ بیمار کی عیادت کے لیے ایک میل جاؤ، اور تشییع جنازہ میں دو میل۔ مہمان کے تین میل تک اور دینی بھائی کے لیے چار میل تک جانا چاہیے۔

چہارم۔ روزے کی وجہ سے رد دعوت نہ کرے، بلکہ وہاں جائے اور خوشبوؤں وغیرہ کے سونگھنے سے میزبان کو خوش کرے۔ لیکن اگر وہ اس پر بھی ناراض ہو تو روزہ (اگر سنّت یا نفلی ہو تو) توڑ ڈالے۔ کیوں کہ مسلمان کے دل کو توڑنے سے یہ بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے آدمی سے ناراض ہوئے ہیں جو میزبان نوازی کو مدِ نظر نہ رکھ کر روزہ برقرار رکھے اور فرمایا کہ تیرا بھائی تو تیری وجہ سے تکلیف اُٹھائے اور تو روزہ رکھے۔

پنجم۔ صرف پیٹ بھرنے کے لیے دعوت قبول نہ کرے۔ کیونکہ یہ عمل حیوانوں جیسا ہے۔ بلکہ اس کو سنّت

سمجھ کر عمل میں لائے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، جو آدمی دعوت قبول نہ کرے وہ میرا اور خدا کا گنہگار ہے ۔ اسی لیے بعض علماء کا قول ہے کہ دعوت کا قبول کرنا واجب ہے ۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ مومن کی عزت خدا کی عزت کے برابر ہے اور میزبان سے ملنے کی نیت دل میں ہونا چاہیئے ۔ اس وقت اپنے کو غیبت سے بچائے، تاکہ لوگ نہ آنے والوں پر نکتہ چینی نہ کریں ۔

شرائطِ دعوت

دعوت میں شرکت کے لیے چھ میں سے ایک نیت ہونا چاہیے ۔ ان میں سے ہر ایک نیت میں ثواب ملتا ہے ۔ اور نیتوں کی وجہ سے مباح چیزیں قربِ خداوندی حاصل کر لیتی ہیں ۔ بزرگانِ دین کی کوشش رہی ہے کہ ان کا ہر حرکت و سکون دین کے ساتھ نسبت رکھنے والا ہو، تاکہ ان کا کوئی لمحہ عبادت سے خالی نہ جائے ۔

میزبان کو زیادہ انتظار نہ دکھائے ۔ اچھی جگہ بیٹھنے کی کوشش کرے، بلکہ میزبان جہاں بٹھائے وہاں بیٹھے اور اگر لوگ اس کو صدر کی جگہ دینا چاہیں، تو اظہارِ انکساری کرے ۔ ایسی جگہ بیٹھنے سے پرہیز کرے، جہاں عورتوں کا قرب ہو۔ جہاں سے کھانا لایا جائے اس طرف نہ دیکھے ۔ پاس بیٹھنے والوں کی مزاج پرسی کرنا ضروری ہے۔ اگر خلافِ شریعت کوئی چیز دیکھے تو اس کو روک دے ۔ اور اگر نہ روک سکے، تو وہاں سے خود جلد آئے ۔ حضرت امام حنبل رح کہتے ہیں کہ چاندی کی سرمہ دانی بھی اگر وہاں دیکھے تو بھی وہاں سے جلد آئے ۔

آدابِ شب باشیٔ مہمان

مہمان کو جائے طہارت اور قبلہ کا رُخ بتا دے ۔ کھانا کھلانے میں جلدی کرے، تاکہ وہ انتظار میں بھوکا نہ رہے، لیکن اگر ایک مہمان رہ گیا ہو، باقی آجائیں، تو تنہا ایک کے لیے سب کو منتظر نہ رکھے ۔ لیکن اگر کوئی غریب نہ آیا ہو اور اس کی طرف سے شکستہ دلی کا خطرہ ہو تو اس کا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔ حاتم اصم کہتے ہیں کہ جلدی کرنا شیطانی عادت ہے ۔ مگر پانچ باتوں کا جلدی کرنا اچھا ہے ۔

طعامِ مسلمان، تجہیز و تکفین ۔ نکاحِ دختر ۔ ادائیگی قرض ۔ گناہوں سے توبہ ۔ دعوت ولیمہ میں بھی جلدی کرنا سنت ہے۔

دوم ۔ یہ کہ میوہ جات اوّل پیش کرے ۔ اور آخر کار ترکاری دسترخوان میں رہے ۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دسترخوان پر اگر سبزی ہوتی ہے تو فرشتے آتے ہیں ۔ لذیذ کھانے اوّل کھلائے، تاکہ وہ زیادہ کھایا جائے ۔ بعض لوگ ثقیل غذائیں اوّل کھلاتے ہیں، تاکہ مہمان زیادہ کھالے، لیکن یہ بات اچھی نہیں ۔ اور اگر رنگا رنگ کھانے ایک دعوت میں یکبارگی رکھ دیئے جائیں، تو اُن کو دیر تک رکھا رہنے دے، تاکہ سب لوگ خوب سیر ہو سکیں ۔ لیکن اس نیت سے اگر اُٹھالے کہ جو کچھ بچا ہے وہ حساب کتاب میں شامل نہ ہوگا تو کوئی قباحت نہیں ۔

حکایت | ایک بار ابراہیم ادہم نے حضرت سفیان کے آگے قسم ہا قسم کے کھانے رکھے تو آپ نے فرمایا کہ تجھ کو خوف نہیں آتا کہ یہ سب اسراف ہے۔ تو ابراہیم نے جواب دیا کہ طعام میں اسراف نہیں ہوتا۔ گھر والوں کا حصہ اوّل الگ رکھ لینا چاہیے۔ تاکہ وہ اس طرف نیت نہ لگائیں۔ اگر کوئی چیز دستر خوان پر باقی نہ بچے گی تو وہ مہمان کا شکوہ کریں گے۔ اور یہ بُری بات ہے۔ مہمان کو چاہیے کہ اپنے ساتھ کھانا باندھ کر ساتھ نہ لے جائے، جیسا کہ بعض درویشوں کی عادت ہوتی ہے۔ لیکن اگر میزبان بخوشی اجازت دے دے تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اپنے ساتھی کا خیال رکھے۔ کہ اس نے کھا لیا ہے، ورنہ حرام ہے۔ اور اگر ساتھ کھانے والا یہ چیز چھوڑ دے تو بھی حرام ہے۔

ضیافت خانے سے باہر آنے کا بیان

بغیر اجازت میزبان باہر نہ نکلے، اور میزبان کو چاہیے کہ دروازے تک پہنچا دے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہی حکم ہے۔ مہمان سے انتہائی خندہ پیشانی سے گفتگو کرے۔ اس طرح اگر میزبان کوئی خطا کرے تو اس کو معاف کر دے، بلکہ نظر انداز کر دے۔ کیونکہ اخلاقِ حسنہ بہت سے عبادات سے افضل ہے۔

حکایت | ایک شخص نے کچھ لوگوں کی دعوت کی۔ اُس کے بیٹے نے بغیر اس کی اطلاع کے حضرت جُنید رحمۃ اللہ کو مدعو کر لیا۔ جب آپ اُس کے دروازے پر پہنچے، تو اس نے داخل ہونے سے روکا۔ لڑکے نے پھر بلایا لیکن باپ نے پھر نہ آنے دیا۔ آپ واپس آ گئے۔ اسی طرح متواتر چار بار آئے اور واپس ہوئے۔ اس عمل سے اُن کا مقصد اس لڑکے کو خوش کرنا تھا اور واپس اس لیے چلے گئے کہ لڑکے کا باپ خوش ہو۔ آپ ہر اقرار و انکار کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے۔ لہٰذا خُود کو تکلیف نہ ہوتی تھی۔

دُوسرا اصول

(بابُ النکاح)

نکاح کی ضرورت | جس طرح دین کی بقا کے لیے کھانے کی ضرورت ہے کہ بغیر کھانے کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اور انسان کی زندگی دین کے بقا کے لیے ضروری ہے، اسی طرح نسل انسانی کے بڑھنے کے لئے نکاح کی ضرورت ہے۔ ورنہ نسلِ انسانی منقطع ہو جائے گی، جو بغیر نکاح کے ناممکن ہے۔

معلوم ہوا کہ نکاح وجود انسانی کے لیے ضروری ہے اور کھانا انسان کی بقا کے لیے لازم ہے۔ خداوند عالم نے نکاح کو محض نسل انسانی کے بڑھانے کے لیے واجب قرار دیا ہے۔ قُوّتِ شہوانی کو دُور کرنے کے لیے نہیں، بلکہ قوّتِ شہوانی کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ آدمی نکاح کرنے کی ضرورت کو محسوس کرے، تاکہ دین پر چلنے

والے پیدا ہوں اور وہ ترویج دین میں سعی کریں ۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (کہ ہم نے انسان اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لیے بنایا ہے) جتنی جتنی اُمت بڑھتی ہے ۔ دین حق پر چلنے والے بندے پیدا ہوتے ہیں ۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ نِکاح کرو تاکہ تمھاری نسل بڑھے ۔ اور میں دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں اپنی امت کی فراوانی پر فخر کر سکوں ۔ میں اس بچے پر بھی فخر کروں گا جو اپنی ماں کے پیٹ سے اسقاط ہو جائے گا ۔ اولاد بڑھانے کی کوشش کرنے والے آدمی کو بہت ثواب ملتا ہے ۔ اسی وجہ سے باپ کا حق بہت ہے ، اور استاد کا اس سے زیادہ ہے ۔ چونکہ باپ آدمی کی ولادت کا سبب ہے ۔ لیکن اُستاد دین کے راستے کو اس کے سامنے اُجاگر کرتا ہے ۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ نکاح کرنا نوافل عبادات سے برتر ہے ۔ لہٰذا جب معلوم ہوا کہ نکاح کرنا بھی دین کا ایک رکن ہے ، تو اس کے طریقے اور آداب کا سمجھنا ضروری ہے ۔

آداب نِکاح کی تفصیل تین باب پر منقسم کی گئی ہے ۔ بابِ اوّل نکاح کے فوائد و نقصانات ۔ بابِ دوم آداب نکاح ۔ بابِ سوم ۔ زندگی و رہن سہن کے آداب ۔

باب اوّل

نِکاح کے فوائد و نقصانات

فوائد نکاح | نِکاح کے پانچ فوائد ہیں :

پہلا اولاد ۔ اولاد کے پیدا ہونے سے چار قسم کا ثواب حاصل ہوتا ہے ۔

اولاد سے پہلا ثواب یہ ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنے دین کی بقا کے لیے انسان پیدا کیا ہے ، اور اس کو نسلِ انسانی کی بقا مقصود ہے ، تو اس میں کیوں نہ کوشش کرے گا ۔ نیز جو آدمی خدا کی حکمت کو پہچانے گا ، وہ انسان کی آفرینش کے مراتب کو بھی ملحوظ رکھے گا ۔ کہ وہ بقاء انسانی اس کو کتنی محبوب ہے ۔ وہ سمجھے گا کہ خداوندِ عالم نے عورت کا رحم (بچہ دانی) کو پیدا کیا ۔ اور آلہ مباشرت بنایا ۔ مرد کی پُشت اور عورت کے سینے میں اولاد کا جوہر عطا کیا ۔ شہوت کو عورت اور مردوں پر مسلط کر دیا ، تاکہ اُن کے اتصال سے بچہ بنے اور پرورش پائے ۔ اس کو کون نہیں جانتا کہ اگر کوئی آدمی اِس تخم کو ضائع کر دے ، تو وہ فطرت سے روگردانی کے مترادف ہوگا ۔ صحابہ سلف اس بات سے متنفر ہوتے تھے کہ وہ بغیر بیوی کے مر جائیں ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بیویاں طاعون کی وبا میں انتقال کر گئیں ، حتیٰ کہ اُن کو بھی طاعون نے گھیر لیا ۔ تو کہا کہ مرنے سے پہلے نکاح کر دو کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بغیر بیوی کے (رنڈوا) مر جاؤں ۔

دوم ۔ نکاح کرنے سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے کہ اُن حضرت کی اُمت

میں اضافہ ہو ۔ کیونکہ حضورؐ اس کی وجہ سے فخر کریں گے ۔ اسی لیے بانجھ عورت کے ساتھ نکاح کرنے کو منع کیا گیا ہے ۔ اور فرمایا ہے کہ بانجھ عورت سے بہتر کھجور کی چٹائی ہے ۔ جو گھر میں بیٹھنے کے کام آتی ہے ۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ خوبصورت بانجھ عورت سے بچے دینے والی بدشکل عورت بہتر ہے ۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ نکاح قوّتِ شہوانی کو دُور کرنے کے لیے نہیں ہوتا ، بلکہ اولاد کے لیئے کیا جاتا ہے ۔ کیونکہ خوب صورت عورت مرد کی خواہشِ نفس کو اُبھارنے کے لیے بہ نسبت بدصورت کے اچھی ہوتی ہے اور اس کے متعلق یہ حکم ہے کہ اگر بانجھ ہے ، تو بدصورت عورت سے بدتر ہے ۔

سوم ۔ اولاد سے دعائیں ملتی ہیں ۔ حدیث میں وارد ہوا ہے ، کہ وہ نیکیاں جن کا ثواب ہمیشہ ہمیشہ ملتا ہے ۔ ان میں ایک اولاد بھی ہے ، کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی دعائیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں ، وہ باپ کو پہنچتی رہتی ہیں ۔ حدیث میں ہے کہ اُن دعاؤں کو نورانی جگھوں پر رکھا جاتا ہے ۔ اور مُردوں کو دکھایا جاتا ہے ، اور وہ اس کے سبب آرام پاتے ہیں ۔

چہارم ۔ اگر بیٹا ماں باپ کے سامنے مرجائے تو وہ قیامت کے دن اپنے والدین کا شفیع ہوگا حضورؐ کا فرمان ہے کہ روزِ قیامت بچّے سے جب جنّت میں جانے کو کہا جائے گا تو وہ مچل کر کہے گا کہ میں بغیر ماں باپ کے داخل نہ ہوں گا ۔ حضورؐ نے اس وقت کسی کا کپڑا کھینچ کر فرمایا کہ اس طرح وہ بچہ اپنے ماں باپ کو کھینچتا ہوا جنّت میں داخل ہو جائے گا ۔ حدیث میں ہے کہ تمام بچّے بہشت کے دروازے پر کھڑے ہو کر چلائیں گے ، اور ماں باپ سے ملنے کی استدعا کریں گے ۔ اس کے بعد اُن کو اجازت مل جائے گی کہ سب بچّے اپنے ماں باپ کو پہچان کر جنّت میں لے جائیں ۔

روایت : روایت ہے کہ ایک بزرگ نکاح کرنے پر راضی نہ ہوتے تھے ۔ انھوں نے روزِ قیامت کو خواب میں دیکھا ، کہ لوگ پیاسے ہیں اور بچّوں کے ہاتھوں میں کٹورے ہیں اور پانی پلا رہے ہیں ۔ ان بزرگ نے بھی پانی مانگا ، لیکن ہر بچے نے اُن سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ تمھارے کوئی اولاد نہیں کہ جو تم کو پانی پلائے وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے اور نکاح کر لیا ۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نکاح سے آدمی اپنی شہوی خواہش کو شیطان کے بھڑکانے سے روکتا ہے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا قول ہے کہ جو آدمی نکاح کرتا ہے ۔ وہ آدھے دین کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے ، اور جو نہیں کرتا تو اس کی طرف یہ خدشہ ہے کہ نگاہِ بد سے پرہیز نہ کرے ۔ اگرچہ مباشرت نہ کرے ۔ آدمی کو چاہیئے کہ نکاح بغرضِ اولاد کرے نہ کہ بغرضِ نفسانی خواہشات ۔ خداوندِ عالم کی عطا کردہ چیزوں کو کام میں لانا عین ثواب ہے ۔ اُس نے شہوت کو اِس لیے تخلیق کیا ہے ، تاکہ وہ نکاح کی ضرورت کو سمجھے ۔ اس کے علاوہ بھی اس میں

ایک وہ کیفیت دے دی ہے، جو کیفیات آخرت کو سمجھنے کے لیے ایک نمونہ ہے۔ مثلاً آگ سے آخرت کے عذاب کی تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ مباشرت کا لطف اور آگ کی تکلیف آخرت کی تکلیف و آرام سے کہیں کم ہے۔ لیکن خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کو نہ پہچان سکتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر عورت کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے، جس آدمی کو کوئی عورت راستے میں اچھی معلوم ہو، اس کو چاہیے کہ گھر جائے اور اپنی بیوی سے صحبت کرے۔ کیونکہ اس لحاظ سے تمام عورتیں ایک سی ہیں۔

تیسرا فائدہ نکاح میں یہ ہے، کہ عورتوں سے محبت ہوتی ہے اور اُن کے پاس بیٹھنے اور اُن سے مزاح کرنے سے دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس آرام کے بعد عبادت کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ عبادت کرنے سے آدمی ملول ہو جاتا ہے، اور یہ خوشی اس آسائش کو پھر واپس لاتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ آسائش ایک دم اپنے سے جُدا نہ کرو۔ کیونکہ اس سے دل اندھا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے مکاشفات ہوئے کہ آپ کا جسم لرز جاتا، تو آپؐ حضرت عائشہ پر ہاتھ رکھ کر فرماتے کَلِّمِیْنِیْ یَا عَائِشَہ (یعنی اے عائشہ! مجھ سے باتیں کرو) آنحضرتؐ کا اصل مقصد اس سے اپنے کو قوت پہنچانا ہوتا تھا، تاکہ وحی کے بوجھ کو برداشت کر سکیں۔ جب آپؐ پر پھر کمزوری آتی تو پھر وہ ہی عمل فرماتے۔ اور فرماتے اَرِحْنَا یَا بِلَالُ (یعنی اے بلال مجھے راحت و آرام پہنچاؤ) یہاں تک کہ نماز میں مشغول ہو جاتے اور اچھی اچھی خوشبوؤں سے طاقت دیتے۔ اس لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ اَلطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَقُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (یعنی تمھاری دنیا میں تین چیزوں کو میرا محبوب قرار دیا ہے۔ خوشبو۔ عورت اور میری آنکھوں کی روشنی۔ روشنی آنکھوں کی نماز سے ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ نماز سے رُوحانی مُسرّت ہوتی ہے اور خوشبو اور عورت سے جسمانی، تاکہ ان دونوں چیزوں سے نماز میں قوت حاصل ہو سکے۔ اسی وجہ سے مال دُنیا کے جمع کرنے سے حضورؐ نے منع فرما دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے دریافت کیا کہ دنیا کے علاوہ کس چیز کو اختیار کیا جائے تو ارشاد ہوا لِیَتَّخِذْ اَحَدُکُمْ لِسَانًا ذَاکِرًا وَقَلْبًا شَاکِرًا وَزَوْجَۃً مُّؤْمِنَۃً (یعنی تمھاری زبان خدا کا ذکر کرنے والی ہو اور قلب شکرِ خدا بجالاتا ہو اور عورت تمھارے پاس پارسا ہو۔ یہاں عورت کو ذکر و شکر کے ہم پلہ فرمایا۔

چوتھا فائدہ نکاح میں یہ ہے کہ عورت گھر کے کام کاج میں مرد کی بہت مدد و مددگار ہوتی ہے۔ اگر مرد گھر کے کاموں میں مشغول رہے تو کسبِ معاش اور کسب علم و عبادت میں کمی واقع ہوگی۔ اسی لیے ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ نیک عورت دنیا سے نہیں ہے، بلکہ وہ دین سے متعلق ہے کہ تجھ کو دینی مشغلوں میں مدد دیتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا قول ہے کہ ایمان کے بعد زنِ نیک سے بہتر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

پانچواں فائدہ: یہ ہے کہ عورتوں کے اخلاق پر صبر کرنا۔ اُن کی ضروریات کو بہم پہنچانا، اور شریعت کے اصُول پر اُن کو قائم رکھنا بغیر کوشش بلیغ کے ناممکن ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ عورت کو نان ونفقہ دینا صدقہ سے زیادہ افضل ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ اہل وعیال کو کسبِ حلال سے پرورش کرنا نیکوں اور بہادروں کا کام ہے ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جہاد میں مشغول تھے۔ ان سے دریافت کیا کہ جہاد سے بہتر اور کیا کام ہے تو جواب دیا کہ عیال وار آدمی کا اُن کو صحیح رکھنا اور خدمت کرنا۔ اور اگر لڑکے رات کو برہنہ ہو جائیں تو ان کو کپڑا اوڑھانا۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام حنبل میں تین فضائل مجھ سے زیادہ ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اہل وعیال کے لیے کسبِ حلال کرتے ہیں اور میں صرف اپنے لیے۔ حدیث میں ہے کہ گناہوں میں سے ایک گناہ ایسا بھی ہے کہ سوائے اہل وعیال کی کفالت کے اس کا بدل کوئی نہیں۔

روایت: روایت ہے کہ کسی بزرگ کی بیوی کا انتقال ہو گیا، اور باوجود اصرار کے انھوں نے عقدِ ثانی نہ کیا۔ ایک دن خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اور گروہ اندر گروہ برابر چلے جا رہے ہیں اُن میں سے ایک آدمی نے انھیں بزرگ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ وہ بدبخت آدمی ہے۔ دوسرے نے بھی یہی کہا۔ تیسرے نے اس پر ہاں کی اور چوتھے نے بھی حامی بھری۔ بزرگ چاہتے تھے کہ کسی سے اپنی شومیِ قسمت کی وجہ دریافت کریں، لیکن وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ اتفاقاً ایک بچہ بھی جا رہا تھا، اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اتنا سنتا ہوں کہ تم نے اسی ہفتے میں کوئی ایسا کام کیا ہے کہ اب مجاہدین سے تمہارا نام الگ کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے برابر مجاہدین کی فہرست میں تھے۔ بزرگ کی آنکھ کھلی اور اسی دن عقد کر لیا۔

مندرجہ بالا فوائد کی بنا پر مسلمانوں کو چاہیے کہ نکاح میں دیر نہ کریں۔

نکاح کے نقصانات تین ہیں۔ اوّل یہ کہ کسبِ حلال نہ کر سکے اور بہ سبب عیال حرام کمائی میں مبتلا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اور اس کا پورا خاندان ادبارِ خدا کا موجب قرار پائے۔ اس کے بعد اس کی نیکیاں نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ہر آدمی کی نیکیاں ایک پہاڑ کے برابر ہوں گی۔ لیکن جب اس کا حساب ہوگا، تو اس سے دریافت کریں گے کہ تو نے اہل وعیال کو کیسی کمائی سے پرورش کیا۔ اگر کسبِ حرام سے کیا ہے تو اُن کی تمام نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔ اور منادی ندا دے گا کہ یہ وہ شخص ہے کہ اس کی اولاد نے اس کی تمام نیکیاں ختم کر دیں، اور یہ اب گنہگاروں کی طرح مجرم ہے۔

حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت بچے اپنے مورث کو مجرم گردانیں گے، اور بارگاہِ قاضی الحاجات میں عرض

کریں گے کہ ہمارا انتقام اس سے لیا جائے۔ اس لیے کہ اُس نے ہم کو نادانستہ حرام کمائی کھلا کر گنہگار کیا اور جو ہمارے حقوق۔ اس پر واجب تھے، ان کو پورا نہ کیا کہ آج ہم نعمت علم سے محروم ہیں پس جس آدمی کے پاس کسب حلال کے ذرائع نہ ہوں اس کو نکاح نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر بدکاری کا خیال پیدا ہو جائے تو کر لینا چاہیے۔

دوم یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق نہ بجالا سکے۔ اگرچہ وہ ہر قسم کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ بشریت سے بالاتر عادت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی اہل و عیال کی پرورش سے بھاگتا ہے، وہ ایک بھاگے ہوئے غلام کی طرح ہے، اور اس کی عبادات مقبول نہیں ہوتیں۔ جب تک کہ پھر ان کے پاس واپس نہ آئے۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ اپنے نفس کو مارے اور جب تک وہ نفس کشی نہ کر سکے کسی دوسرے کے نفس کا بار نہ اٹھائے۔

حضرت بشیر خانی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نکاح کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب دیا کہ اس آیت سے خوف کھاتا ہوں وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (یعنی عورتوں کو بھی مردوں پر اُن کے برابر کے حقوق ہیں)

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے جب نکاح کی خواہش نہیں، تو کیوں نکاح کروں؟ اور عورت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کیوں کروں؟

سوم یہ کہ اہل و عیال کے پیٹ پالنے کی وجہ سے عبادات میں فرق پڑ جائے، جو چیز خدا کی عبادت سے روکتی ہے وہ موجب ہلاکت ہوتی ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (یعنی اے مسلمانو! اپنے اہل و عیال کی وجہ سے ذکر خدا سے کوتاہی نہ کرو) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عیالداری کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اسی طرح اگر آدمی نہ رہ سکے تو بہتر ہے کہ نکاح نہ کرے۔ لیکن اگر حرام کاری کا شائبہ ہے تو ضرور نکاح کرے۔ اس کے برخلاف اگر نفس کشی کر سکتا ہے، اور اس کے ساتھ عبادت خدا میں بھی فرق نہ آئے۔ تو نکاح کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب دوم

آداب عقد و صفات منکوحہ

زوجہ میں کیا صفات ہونا چاہئیں اور عقد کے آداب کا بیان

نکاح کی پانچ شرائط ہیں:

پہلے ولی ہونا۔ اگر عورت کا کوئی سرپرست نہ ہو تو بادشاہ وقت اس کا ولی بن سکتا ہے۔

دوسرے لڑکی کی رضامندی۔ لیکن اگر لڑکی کا باپ یا دادا کسی کے ساتھ عقد کرنا چاہے تو اس کی رضامندی

کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی اس کو سمجھا دینا ضروری ہے۔ لیکن اگر وہ اس پر خاموش رہے، تو یہ شریعت کے لحاظ سے اس کی رضامندی ہوگی۔

تیسرے یہ کہ کم از کم دو گواہان عادل موجود ہوں، جن کے متعلق یہ نہ معلوم ہو کہ وہ گناہِ کبیرہ کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ دو پر ہی اکتفا کی جائے، بلکہ اگر بہت سے آدمی ہوں تو اچھا ہے۔

چوتھے یہ کہ ناکح خود یا اس کا وکیل ایجاب و قبول کے الفاظ بہ صراحت ادا کرے۔ فارسی۔ اردو یا عربی کسی زبان میں بھی ہو، سنّت یہ ہے کہ ولی نکاح کا خطبہ ختم ہونے پر یہ الفاظ ادا کرے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں نے فلاں عورت کو تیرے عقد میں بالعوض اتنے ..... مہر کے دیا۔ شوہر خود جواب دے بِسْمِ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ میں نے فلاں عورت کو اپنے نکاح میں بالعوض .... اتنے مہر کے قبول کیا۔

اچھا یہ ہوگا کہ لڑکی کو قبل عقد دیکھ کر پسند کرلے۔ کیونکہ اس سے آئندہ کی زندگی پر اچھا اثر پڑتا ہے نکاح کرنے کی غرض صرف نفس پرستی نہ ہونا چاہیے، بلکہ اولاد کا پیدا کرنا ہونا چاہیے۔

پانچویں۔ وہ عورت جس سے نکاح جائز ہو۔ وہ خرابیاں تقریباً بیس ہیں، جن کی وجہ سے نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ وہ عورت جو کسی کے عقد میں ہو، یا کسی کی عدت میں ہو۔ مرتد ہو۔ بت پرست یا کافرہ ہو (خدا و رسول پر ایمان نہ رکھتی ہو) نامحرموں کے ساتھ بیٹھنا جائز سمجھتی ہو۔ نماز نہ پڑھنے کو جائز سمجھتی ہو۔ نصرانی یا یہودی ہو، لیکن بعثت رسول کے بعد یہ مذہب اس نے یا اس کے آباؤ اجداد نے اختیار کیا ہو۔ لونڈی ہو اور مرد مہر دینے کی دوسری عورت کو طاقت بھی رکھتا ہو۔ زنا سے خوف نہ کرتی ہو کوئی غیر مرد اس پر متصرف ہو۔ وہ بلحاظ کل ہو یا جزوی طور پر۔ مرد کی محرم ہو۔ دودھ شریک ہونے کی وجہ سے اس پر حرام ہو۔ قرابت قریبہ رکھتی ہو۔ مثلاً وہ مرد اس لڑکی کی ماں یا دادی سے نکاح یا تعلقات رکھ چکا ہو یا خود وہ عورت اس مرد کے بیٹے یا باپ کے نکاح میں رہی ہو۔ مرد کے پاس چار عورتیں پہلے سے موجود ہوں۔ منکوحہ کی پھوپھی۔ خالہ، بہن۔ اس مرد کے نکاح میں پہلے سے موجود ہو۔ (نوٹ) ایک ساتھ دو بہنیں۔ خالہ بھانجی۔ پھوپھی بھتیجی نکاح میں نہیں آسکتیں۔ اگر ایک عورت اور مرد کا یہ رشتہ ہو تو بھی ناجائز ہوگا۔ تین طلاقیں دینے یا تین بار فروخت کرنے کے بعد پھر اس سے نکاح ناجائز ہوگا۔ بشرطیکہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے۔ یا پہلے سے ان میں لعان واقع ہوا ہو۔ آپس میں شرعی نقطۂ نظر سے محرم ہوں۔ عمرہ یا حج کا احرام ساتھ باندھا ہو۔ کمسن اور یتیم ہو۔ اس لیے کہ بلوغیت سے پہلے اس سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔

پس مندرجہ بالا چیزیں نکاح کے لیے ناجائز اور اُن کے خلاف ہوں تو نکاح جائز ہوگا۔

عورت میں نکاح سے پہلے حسب ذیل آٹھ باتیں دیکھ لینا سنّت ہیں:

پہلے پارسا ہونا - اگر عورت نیک ہے تو اپنے شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے گی - اگر عورت اپنے بدن کو کسی دوسرے مرد کے حوالے کر دے گی اور شوہر خاموش رہے گا تو یہ اس کی حمیت میں ٹھیس پہنچانے والا امر ہے وہ آخرت اور دنیا دونوں میں شرمندہ ہوگا - اگر طلاق دینے سے دلبستگی بڑھے اور طلاق وجہ تکلیف ہو جائے عورت کا خوبصورت یا بد ہونا ایک وبالِ جان ہوتا ہے - ایسی عورت کو طلاق دینا ہی اچھا ہے ۔

واقعہ | ایک شخص نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی عورت کے بد ہونے کی شکایت کی تو جواب میں فرمایا کہ اس کو طلاق دے دے - تو اس نے کہا کہ مجھے اس سے عشق ہے، تو ارشاد ہوا کہ طلاق نہ دو، ورنہ اور فساد میں مبتلا ہو گے ۔

حدیث میں ہے کہ جو آدمی صرف حسن و مال کی وجہ سے عقد کرتا ہے وہ دونوں سے محروم رہتا ہے اور جو آدمی محض دین کی وجہ سے کرتا ہے وہ دونوں چیزوں کو حاصل کرتا ہے ۔

دوسری سنّت یہ ہے کہ عورت کے عادات اچھے ہوں - زبان دراز نہ ہو، ورنہ آپس کے تعلقات خراب رہیں گے - جس سے دین میں خلل آئے گا ۔

تیسری سنّت یہ ہے کہ عورت حسین ہو - اِس سے محبت بڑھتی ہے اور نکاح سے پہلے دیکھ لینا اسی لیے سنّت قرار دیا ہے ۔

حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ انصار کی عورتوں میں ایک بات قابلِ نفرت ہے، جو آدمی اُن سے نکاح کرنا چاہے، اوّل اُن کو دیکھ لے ۔

روایت ہے، کہ بغیر دیکھے نکاح کرنے سے بعد میں شرمندگی ہوتی ہے ۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کے مُطابق نکاح حسن و مال کے لیے نہ کرنا چاہیے، بلکہ دین کی خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے - اس میں صرف غرض دنیا ہی نہ ہو، بلکہ جمال کا خواہاں بھی دین کے لیے ہی ہو - اگر کسی آدمی کا مقصد سُنّت پر عمل کرنا ہے، اور اس کے بعد خوبصورتی کو قطعی نظر انداز کر دے تو یہ انتہائی ثواب کی بات ہے ۔

جناب احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی بیوی یک چشم تھیں - لیکن آپ نے اُن کی بہن کو پسند نہ کیا - کیوں کہ اُن کی یک چشم بیوی عقل میں بہت تیز تھیں ۔

مہر | چوتھی یہ کہ مہر کم از کم ہونا چاہیے - حدیث میں ہے کہ وہ عورت بہت اچھی ہے، جس کا مہر بہت کم ہو اور حسین ہو - زیادہ مہر باندھنا مکروہ ہے - حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بعض عورتوں کا نکاح صرف دس درہم مہر کے عوض کرایا تھا اور اپنی بیٹیوں کا مہر چار سو درہم سے زائد نہیں بندھوایا ۔

پانچویں - بانجھ عورت نہ ہو - رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ گھر میں کھجور کی خشک چٹائی کا ہونا

بہتر ہے بہ نسبت بانجھ عورت کے۔

چھٹے۔ کنواری عورت کے ساتھ نکاح کرنا اچھا ہے۔ کیونکہ بیوہ عورت عموماً اپنے پہلے شوہر کو یاد کرتی رہتی ہے۔

حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ، نے ایک بیوہ عورت سے نکاح کیا، تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کنواری عورت کے ساتھ نکاح کیوں نہیں کیا؟ تاکہ تو اس کے ساتھ، اور وہ تیرے ساتھ کھیلتی۔

ساتویں۔ حسب ونسب میں اچھی ہو، تاکہ اصلاح دین بھی کر سکے۔ کم نسل عورت بد اخلاق ہوتی ہے اور اولاد بھی ویسی ہی اُٹھتی ہے۔

آٹھویں۔ اپنے عزیزوں میں نہ ہو۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ قریبی عزیز عورت سے اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی عزیز عورت کے سامنے شہوت کم ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا عورتوں کی صفات و بُرائیاں تم کو سمجھا دی گئیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ولی اپنی لڑکی کا نکاح بدخو، بدشکل یا ایسا آدمی جو اس کا نان ونفقہ ادا نہ کر سکے، نہ کرے۔ اور اگر مرد لڑکی کا کفو نہ ہو تو بھی نکاح درست نہیں۔ اسی طرح فاسق کے ساتھ نکاح ناجائز ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی فاسق و فاجر کے ساتھ لڑکی کا نکاح کرتا ہے" وہ قطع رحم کرتا ہے۔ نکاح مثل غلامی کے ہے۔ لہٰذا لڑکی کو کسی کی غلامی میں دینے سے پہلے آگا پیچھا سوچ لو۔

باب سوم

آداب زندگی بعد از نکاح

نکاح کے بعد رہن سہن کا طریقہ جب نکاح کے متعلق معلوم ہو گیا کہ اصول دین میں شامل ہے" تو انسان کو چاہیے، کہ ہر بات میں آداب دین کا خیال رکھے۔

ولیمہ، سنت، مؤکدہ ہے۔ عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب نکاح کیا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا، اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ (یعنی دعوت ولیمہ کرو، چاہے ایک ہی بکرا حلال کر سکو) اور جس آدمی کو ایک بکرے کی بھی استطاعت نہ ہو، اس کے پاس جو ہو وہ دوستوں کو کھلا دے۔ وہ ہی ولیمہ ہوگا۔ حضورؐ نے جب صفیہؓ سے نکاح کیا تو ستو اور خرمے ولیمے میں کھلائے۔ پس حسب مقدرت ولیمہ کرے۔ نکاح سے تین دن کے اندر ولیمہ کر دینا اچھا ہے اور اگر اس سے دیر ہو جائے، تو ایک ہفتے کے اندر ضرور کر دے۔ تماشوں سے نکاح کا اعلان کرنا سُنت ہے ربیعہ فرماتی ہیں کہ جب مجھے دُلہن بنایا گیا۔ تو دوسرے دن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اس وقت کنیزیں ڈھول بجا رہی تھیں۔ جب حضورؐ کو دیکھا تو نعت میں اشعار پڑھنے شروع کیے تو حضورؐ نے

حکم دیا کہ وہی گاؤ جو پہلے گا رہی تھیں۔ حضورؐ نے نعت کے اشعار دف کے ساتھ پڑھنے کی اجازت نہیں دی حالانکہ حضورؐ کی نعت ایک نیک عمل ہے، لیکن اس کو فضولیات کے ساتھ پڑھنا درست نہیں۔

دوم یہ کہ، مرد کو عورت کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا چاہیے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ انھیں رنج ہی نہ دیا جائے، بلکہ اُن کی ناممکن باتیں اور ناشکر گذاریاں برداشت کی جائیں۔

حدیث حدیث شریف میں ہے کہ عورت کو ضعیف اور نازک خلق کیا گیا ہے۔ اُن کی نزاکت اور کمزوری کا بہترین علاج خاموشی ہے، اور ان کو پوشیدہ کرنے کے لیے گھروں کی چار دیواری رکھنا چاہیے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اپنی بیوی کی بدکلامی پر صبر کرے گا، اس کو حضرت ایوب علیہ السلام کا ثواب حاصل ہوگا۔

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت تین جملے آہستہ آہستہ فرما رہے تھے:

اوّل یہ کہ نماز کو پابندی سے پڑھو۔

دوم یہ تھا کہ غلام اور کنیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

سوم یہ کہ عورتوں سے ڈرتے رہو، کہ وہ تمھارے ماتحت ہیں۔ ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عورت نے کہا کہ اگر ایسا ہے، تو حفصہ کے لیے افسوس ہے کہ وہ خاکساری نہ کرے، تو اپنی بیٹی سے کہا کہ خبردار! حضور کو جواب نہ دیا کرو، اور حضرت عائشہ رضؓ کی مثل نہ بنو، اس لیے کہ وہ آنحضرتؐ کو بہت عزیز ہیں، اُن کی ناز برداری کرتے ہیں۔ ایک دن ایک بیوی نے غصّے کی حالت میں حضورؐ کے سینے پر ہاتھ مار دیا، تو اُن کی والدہ نے اُن سے کہا کہ تُم نے حضورؐ کے ساتھ یہ حرکت کیوں کی؟ تو حضورؐ نے ارشاد کیا کہ یہ اس سے بھی زیادہ کرتی ہیں اور میں برداشت کر لیتا ہوں۔ معاف کر دو، اور فرمایا خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ (یعنی تم میں اپنی بیوی کے ساتھ خوش گوار رہنے والا سب سے اچھا ہے) اور میں تم سب میں اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا رہتا ہوں۔

تیسرے یہ کہ اپنی عورت کے ساتھ تکلّف نہ کرے، بلکہ ان سے بے تکلف رہے۔ کوئی آدمی اپنی بیوی سے اتنی خوش مزاجی سے پیش نہیں آتا، جتنا آنحضرتؐ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ دوڑا کرتے تھے، اور مقابلہ کرتے تھے۔ ایک بار حضورؐ آگے نکل گئے۔ دوبارہ حضرت عائشہ رضؓ آگے نکل گئیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اب ہم تُم دونوں برابر ہو گئے۔

واقعہ آنحضرتؐ ایک دن آنحضرتؐ نے دیکھا کہ حبشی باہر تماشا کر رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔ آپؐ نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا کہ تماشا دیکھوگی؟ تو جواب دیا کہ ہاں! آپ حضورؐ کے قریب آگئیں، اور حضورؐ کے

شانے پر ٹھوڑی رکھ کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ آنحضرتؐ نے کچھ دیر بعد فرمایا کہ اے عائشہ! بس کرو، لیکن وہ خاموش رہیں۔ اس طرح تین بار آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا اور جب حضرت عائشہؓ وہاں سے ہٹیں۔

(نوٹ) یہ واقعات آیۂ پردہ کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔ اس وقت نامحرم کو دیکھنے کی اجازت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اپنی بیوی کے ساتھ بچوں کی طرح رہتے۔ حالانکہ باہری زندگی میں آپ انتہائی مردانہ اور عقلمند تھے۔

بزرگوں کا ارشاد ہے کہ گھر میں آنے وقت بہت خوش رہنا چاہیے۔ اور جب باہر نکلو، تو خاموش جاؤ۔ گھر میں جو کچھ حاضر ہو اسے کھالو۔

مرد عورتوں سے افضل ہیں چہارم، عورت سے اتنا بے تکلف بھی نہ ہونا چاہیے کہ وہ سر پر چڑھ جائے۔ برے کاموں میں اس کو مدد نہ دو۔ بلکہ خلافِ شریعت کام کرنے سے روکو، ورنہ اس کا سبب تم خود بھی بنوگے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (مرد عورتوں سے برتر ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تَعِسَ عَبْدُ الزَّوْجَۃِ (یعنی عورت کی غلامی بدبختی کی دلیل ہے)

بعض لوگوں کا مقولہ ہے کہ عورتوں سے مشورہ کرو، اور جو کچھ وہ کہیں اس کے خلاف کرو۔ عورت ایک سرکش نفس کی طرح ہے۔ اگر اس کو ڈھیل دوگے، تو حد سے تجاوز کر جائے گی۔ اس کے بعد اس کا قابو میں آنا مشکل ہوگا۔ عورتیں عقل کی کمزور ہوتی ہیں۔ لہٰذا کبھی اُن باتوں کو برداشت کرلو اور کبھی سیاست سے کام لو موقع و محل کے مطابق عمل کرے، لیکن پھر بھی صبر و تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ حدیث میں ہے کہ عورت پسلی کی ہڈی کی طرح ہے۔ اگر اس کو زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو ٹوٹ جائے گی۔

پنجم یہ کہ حمیت و غیرت کے مقابلے میں اعتدال پر رہے، اور شر انگیز باتوں سے پرہیز کی ہدایت کرتا رہے۔ حتی الامکان کوٹھے یا بازار میں نہ جانے دے، تاکہ نامحرموں کی نگاہیں نہ پڑیں۔ نہ وہ خود نامحرموں کو دیکھ سکے۔ کیونکہ تمام آفات نگاہ سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ان باتوں کو نگاہ رکھنا چاہیے۔ بلاوجہ بدگمانی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ زیادہ بُرا بھلا بھی نہ کہے، اور نہ زیادہ پردہ غیرت پر مجبور کرے۔ اس کی باطنی عادات میں زیادہ دخل نہ دے۔

واقعہ ایک بار آنحضرتؐ سفر سے شام کو تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ آج کوئی آدمی ایک دم گھر میں داخل نہ ہو، بلکہ صبح کے وقت تک انتظار کرے۔ دو آدمیوں نے آنحضرتؐ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور گھر میں چلے گئے، تو اپنے گھروں میں غیروں کو دیکھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا ارشاد ہے کہ عورت کو زیادہ محفوظ رکھنے کی کوشش کرو محفوظ رکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نامحرم کی نگاہیں اس پر نہ پڑیں۔

جناب فاطمہؓ کا ارشاد آنحضرتؐ نے ایک بار جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا سے دریافت فرمایا کہ عورتوں کے لیے

کیا چیز اچھی ہے۔ تو آپ نے جواب دیا، کہ نہ وہ کسی مرد کو دیکھیں۔ اور نہ مرد ان کی طرف دیکھے۔ آنحضرتؐ اس جواب سے بہت مسرور ہوئے اور گلے لگا کر فرمایا کہ بُضْعَةٌ مِّنِّیْ (یعنی تو میرا پارۂ جگر ہے)

پردے کی سختی حضرت معاذؓ نے ایک بار اپنی بیوی کو ایک سوراخ سے جھانکتے ہوئے دیکھا، تو اس کو مارا پھر دیکھا کہ سیب کا ایک ٹکڑا اُس نے خود کھایا اور ایک غلام کو دیا، تو اس عمل پر بھی مارا۔

پردہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ عورتوں کو اچھے کپڑے نہ پہناؤ، تاکہ وہ باہر جانے کی آرزو ہی نہ کریں۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں عورتوں کو برقعہ پہن کر مسجد تک آنے کی اجازت تھی، اور پچھلی صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کیا کرتی تھیں۔ لیکن صحابہؓ نے اپنے دَور میں عورتوں کو باہر آنے سے قطعی روک دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ اگر آنحضرتؐ اس زمانے کی عورتوں کا کردار دیکھتے، تو مسجد تک آنے کی بھی اجازت نہ دیتے۔ آج کل عورتوں کو مسجد یا کسی جلسے میں شرکت کی بھی اجازت نہ ہونا چاہیے۔ لیکن بڑھیا کو پرانی چادر پہن کر باہر جانے کی اجازت ہے۔

عملِ آنحضرتؐ ایک بار ایک اندھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو حضرت عائشہؓ اور دوسری عورتیں وہاں پر کھڑی رہیں، تو حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ کھڑی کیوں رہیں؟ تو عرض کیا کہ یہ تو اندھا ہے۔ اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم تو اندھی نہیں ہو۔ وہ تم کو نہیں دیکھ سکتا تو تم تو اس کو دیکھ سکتی ہو۔ (یہ واقعہ آیۂ پردہ کے بعد کا ہے)

چھٹے یہ کہ، بیوی کا نان و نفقہ صدقہ دینے سے افضل ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ایک دینار جہاد میں خرچ کرنا، ایک دینار میں غلام خرید کر آزاد کرنا۔ ایک دینار غریب کو دینا، اور ایک دینار سے اہل و عیال کا پیٹ پالنا اُن سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ تنہا خوری کی عادت نہ ڈالے، اور اگر کسی غذا کو خود نہ خرید سکتا ہو تو اس کی گھر میں تعریف بھی نہ کرے۔

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ہفتے عشرے میں ایک بار مٹھائی ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ مٹھائی سے مہر و وفا میں اضافہ ہوتا ہے۔

جب کوئی دوسرا مہمان نہ ہو تو اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھاؤ، اس لیے کہ ملائکہ اس وقت اُن دونوں پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

نان و نفقہ بیوی کو حلال کمائی سے دے۔ حرام مال اہل و عیال پر صرف کرنے سے بڑا ظلم اور خیانت کوئی نہیں۔

ساتویں یہ کہ، نماز، طہارت، اور حیض کے متعلق ضروری مسائل عورت کو بتا دے۔ اگر وہ خود نہ سکھائے گا اور عورت کسی دوسرے سے دریافت کرے گی، تو بے پردگی کا خود وہ باعث بنے گا۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (یعنی خود اور اہل و عیال کو دوزخ سے محفوظ رکھو) مسئلہ) بلکہ یہاں تک بتا دینا چاہیے

کہ ماہواری خون غروب آفتاب سے پہلے بند ہو جائے تو عصر کی نماز قضا کرنا چاہیے۔ چونکہ بہت سی عورتیں اس کو نہیں جانتیں۔

ہشتم۔ اگر دو بیویاں ہوں، تو اُن میں عدل ضروری ہے۔ اگر ایک بیوی کی طرف زیادہ رجوع ہوگا، تو روزِ قیامت ایک حصّہ جسم ٹیڑھا ہو جائے گا۔ اُن کو روپیہ دینے میں برابری کرے، لیکن محبت اور جماع میں برابری نہیں، کیونکہ یہ بس کی بات نہیں۔

آنحضرتؐ سب بیویوں کے پاس ایک ایک رات رہتے تھے، لیکن حضرت عائشہ کو سب سے زیادہ چاہتے اور پیار کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اے پالنے والے، جو بات میرے اختیار میں ہے وہ کرتا ہوں۔ کیا کروں میرا دل بے قابو ہے۔

اگر کسی عورت کے دل بھر جائے اور سے مجامعت کو دل نہ چاہے، تو اس کو فوراً طلاق دے دے۔ آنحضرتؐ نے حضرت سودہؓ کو بڑھاپے کی وجہ سے طلاق دینا چاہا تو آپ نے کہا کہ مجھے طلاق نہ دیجیے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کی بیویوں میں "روزِ قیامت" میرا بھی شمار ہو، تو آپؐ نے انھیں طلاق نہ دی۔ انھوں نے اپنی رات حضرت عائشہؓ کو دے دی۔ اس کے بعد سے آنحضرتؐ دو راتیں حضرت عائشہ کے ساتھ بسر کرتے باقی دوسری بیویوں کے ساتھ ایک ایک۔

نہم یہ کہ جب عورت شوہر کی نافرمانی کرے، تو اس کی نرمی و محبت کے ساتھ سمجھائے۔ اگر پھر بھی راضی نہ ہو تو سختی کرے اور سونے کے وقت اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اگر پھر بھی صحیح نہ ہو تو تین راتوں تک الگ رہے پھر بھی اثر نہ ہو تو مارے، لیکن اتنا نہیں کہ اس کو کوئی زخم آجائے، یا کوئی عضو ٹوٹ جائے۔ چہرے پر بھی مارنا منع ہے۔ اگر بیوی حکم شریعت کے خلاف کرے تو ایک ماہ تک اس سے ناراضگی کا اظہار کرتا رہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ بھی اپنی بیویوں سے ایک ماہ تک ناراض رہے تھے۔

مباشرت دہم۔ مباشرت کے وقت قبلے کی طرف منہ نہ کرے۔ اور پہلے پیار کی باتوں اور بوسوں سے اس کو خوش کرے۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ مرد کو عورت پر درندگی سے نہ گرنا چاہیے۔ بلکہ مباشرت سے پہلے اس کو تیار کرلے۔ وہ ایک قاصد کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی کہ وہ کیا ہے۔ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس وقت یہ کہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اگر قُلْ ھُوَ اللّٰہُ پڑھے تو زیادہ اچھا ہے اور پھر کہے اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مِمَّا رَزَقْتَنَا۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی یہ دعا پڑھے۔ شیطان سے اس کی اولاد محفوظ رہتی ہے۔ اور انزال کے وقت اس آیت کی طرف دھیان دے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّصِھْرًا (یعنی تمام تعریف اس خدا کے لیے ہے جو انسان کو قطرے سے پیدا

کرتا ہے، اور پھر نسب بخشتا ہے، اور سسرال والا بناتا ہے۔

جس وقت انزال ہونے لگے، تو بیوی کے انزال کا بھی خیال رکھے، تاکہ وہ بھی منزل ہوسکے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ تین چیزیں آدمی کی عاجزی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اگر کسی شخص کو دیکھے کہ وہ اس کو دوست رکھتا ہے، تو اس کا نام نہ پوچھے۔ دوّم یہ کہ اگر بھائی اپنی عزّت کرے اور عزّت کرنے پر فخر نہ کرے۔ سوم، یہ کہ بوس وکنار کے بغیر ایک دم جماع کرنے لگے۔ اور اپنی حاجت پوری ہونے کے بعد بیوی کی حاجت کی پروا نہ کرے۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت ابوہریرہ و امیر معاویہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ چاند کی پہلی، پندرھویں، آخر رات کو مباشرت نہ کرے، یہ مکروہ ہے۔ حیض کی حالت میں بھی نہ کرے۔ اس حالت میں عورت کے پاس برہنہ سونا اچھا نہیں۔ اسی طرح قبل غسل حیض بھی مباشرت درست نہیں ہے۔

جب ایک بار مباشرت کر چکے اور فوراً دوبارہ بھی کرنا چاہے تو اوّل عضو کو دھولے۔ اور اس کے بعد اگر سونا چاہے یا کوئی چیز کھانا چاہے تو اوّل وضو کرلے، اگرچہ وہ جنب اس وقت بھی رہے گا۔ لیکن وضو کرلینا سنّت ہے۔ غسل سے پہلے بال اور ناخن نہ کٹوائے، تاکہ وہ نجاست میں اس سے الگ نہ ہوں۔ اچھا یہ ہے کہ منی کو رحم تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ اور اگر نہ ہو، اور اگر منی باہر نکالے گا، تو حرام تو نہ ہوگا۔ ایک بار آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ عزل کرو۔ (یعنی انزال کے وقت عضو کو باہر نکال لو) اگر تقدیر میں ہوگا، تو اولاد ہوگی۔ کچھ عرصے بعد وہ آدمی پھر آیا اور عرض کی کہ فرزند تولد ہوا ہے۔ حضرت جابرؓ کا قول ہے کہ کُنَّا نَعۡزِلُ وَالۡقُرۡاٰنُ یَنۡزِلُ مَاعَزَلَ یعنی ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہوتا تھا، لیکن اس کے متعلّق کبھی ممانعت نہ کی گئی۔

گیارھویں یہ کہ اولاد پیدا ہو تو داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہے۔ حدیث میں ہے کہ اسی عمل سے بچّہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ جہاں تک ہوسکے نام اچھا رکھے۔ ناموں میں عبدالرحمٰن اور عبداللہ بہتر ہوتے ہیں۔ اگر اسقاط ہو جائے تو بھی نام رکھنا سنّت ہے۔

عقیقہ | عقیقہ سنّت مؤکّدہ ہے۔ لڑکی کے لیے ایک بکرا، اور لڑکے کے لیے دو بکرے ذبح کرے۔ اگر ایک ہی کرسکے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ عقیقے کے بکرے کی ہڈی توڑنا درست نہیں۔

بچہ پیدا ہونے پر پہلے اس کے مُنہ میں میٹھی چیز ڈالے۔ ساتویں دن بال منڈوا دے، اور جتنے بال ہوں اس کے برابر چاندی صدقے میں دے دے۔ لڑکی پیدا ہونے پر کراہت کا اظہار نہ کرے۔ اسی طرح لڑکے کی پیدائش پر زیادہ اظہارِ خوشی نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ آدمی کو غیب کا حال معلوم نہیں، کہ نیکی لڑکی میں ہے یا لڑکے میں۔ لڑکی زیادہ مبارک ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس آدمی کے تین لڑکیاں یا تین بہنیں ہوں اور وہ اُن کو کماکر کھلائے تو اس کی اس محبت کے عوض خداوندِ عالم اس پر رحم کرتا ہے۔ کسی نے کہا اگر ایک ہو تو آنحضرتؐ نے پھر اثبات میں

جواب دیا۔ اس کے بعد دریافت کیا، اگر ایک ہی ہو، تو جواب دیا، تب بھی ایسا ہی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر ایک بیٹی ہے تو وہ رنجیدہ ہے، اگر دو ہیں، تو وہ گراں بار ہے۔ اور جس کے تین لڑکیاں ہوں، اس کی مدد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ وہ میرے ساتھ جنت میں جائے گا۔ جیسے دو انگلیاں ایک دوسرے سے نزدیک ہوتی ہیں۔ اور ارشاد ہوا، کہ اگر میوہ بازار سے خرید کر لے جائے تو پہلے لڑکی کو دے بعد میں لڑکے کو۔ تو یہ صدقے سے زیادہ ثواب ہوگا۔ خداوندِ عالم اس سے بہت خوش ہے، جو اپنی لڑکی کو خوش رکھتا ہے۔

بارھویں، یہ کہ جہاں تک ہو سکے بیوی کو طلاق نہ دے۔ کیونکہ یہ باعثِ رنج و تکلیف ہے اور خداوندِ عالم تکلیف کو اچھا نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر بحالتِ مجبوری طلاق دی جائے تو بھی ایک طلاق سے زیادہ نہ دے کیونکہ یکبارگی تین طلاقیں دینا مکروہ ہیں۔

حالتِ حیض میں طلاق دینا حرام ہے، اور صحبت کرنے کے بعد بھی طلاق حرام ہے، اور اگر مہربانی کی وجہ سے طلاق دے تو کوئی حرج نہیں۔ غصہ و حقارت کی وجہ سے بھی طلاق نہ دے۔ اور اگر طلاق دے، تو عورت کو خوش کرنے والی چیزیں دے۔ اس کے رازوں کو کسی دوسرے سے نہ کہے۔ اگر لوگ سبب طلاق دریافت کریں، تو منع کر دے، اور بعد طلاق دریافت کریں تو کہہ دے کہ غیر عورتوں کی باتیں مجھے بتانے کا کیا حق ہے۔

مرد کے حقوق عورت پر

زن و شوہر کے باہمی حقوق

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ عورت کے حقوق تھے، جو مرد پر واجب ہیں۔ لیکن مرد کے حقوق بھی عورت پر واجب ہیں۔ وہ بھی بہت عظیم رتبہ رکھتے ہیں۔

عورت مرد کے غلام کی حیثیت رکھتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو عورت کو اس کے شوہر پر سجدہ کرنے کا حکم دیا جاتا۔ منجملہ اور حقوق کے ایک حق یہ بھی ہے کہ گھر میں بیٹھے، اور بلا اجازت گھر سے باہر نہ جائے۔ یہاں تک کوٹھے پر بھی نہ جائے۔ پڑوسیوں سے زیادہ نہ ملے جلے۔ ہر ملنے والے سے اپنے شوہر کی اچھائی بیان کرے۔ مباشرت میں جو حرکات آپس میں ہوں، وہ کسی سے نہ کہے۔ ہر کام میں شوہر کی رضامندی کو ملحوظ رکھے۔ اس کے مال میں خیانت نہ کرے۔ ملائمت سے پیش آئے۔ اگر اس کا دوست کوئی دروازے پر آواز دے، تو اس کا جواب اس طرح دے کہ پکارنے والے کو یہ نہ معلوم ہو کہ بیوی بول رہی ہے۔ شوہر کے دوستوں سے پردہ کرے تاکہ وہ اس کو پہچان نہ سکیں۔ رزق جو موجود ہو اس پر قناعت کرے حرص نہ کرے۔ شوہر کے حقوق اپنے تمام اعزا سے زیادہ سمجھے۔ اپنے کو پاک و صاف رکھے، جو کام کر سکتی ہو اس میں کوتاہی نہ کرے۔ اس کے سامنے اپنے حسن کی تعریف نہ کرے۔ اس کے احسانات کو مانے، یہ نہ کہے کہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟ ہر وقت خرید و فروخت کی باتیں نہ کرے۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ میں نے

دوزخ کی طرف دیکھا ۔ تو عورتیں زیادہ نظر آئیں ، تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب شوہر کی ناشکری کرتی تھیں اور اس پر لعن طعن کیا کرتی تھیں ۔

تیسرا اصول

آداب تجارت

یہ دُنیا زادِ آخرت ہے ، اور دُنیا میں رہنا بغیر کھائے پیے ناممکن ہے ۔ تو یہاں رہ کر کمانا ضروری اور لازمی ہے ۔ لہٰذا کمانے کے صحیح طریقوں کو جاننا ضروری ہے ۔ جو آدمی اپنے کو فقط دُنیا کا بنالے گا ، وہ بدبخت ہے اور آخرت کو یاد کرنے والا آدمی نیک بخت ہوگا ۔ لیکن دونوں کو مدِنظر رکھنے والا آدمی ہی اعتدال پہ ہے مگر دنیاداری کا مقصد زادِ آخرت کو اکٹھا کرنا ہی ہونا چاہیے ۔

کمانے کے آداب کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ وہ حسبِ ذیل ہیں ۔

پہلا باب ، کمانے کی فضیلت و ثواب ہیں ۔ دوسرا ، آپس کے معاملات کی درستی و سچائی ۔ تیسرا معاملاتِ تجارت میں عدل سے کام لینا ۔ چوتھا باب ، تجارت میں احسان اور نیکی سے پیش آنا ۔ پانچواں باب دنیوی تجارت پر دین کے معاملات کو ترجیح دینا ۔

پہلا باب

باب التجارت

دربیان فضیلت و ثواب تجارت

معلوم ہونا چاہیے کہ اپنے اہل و عیال کی پرورش کے لیے اور دوسروں کی احتیاج سے بچانے کے لیے کمانا بھی جہاد کی طرح ہے ۔ یہ بہت سی عبادات سے افضل ہے ۔ آنحضرتؐ کے سامنے ایک آدمی صبح کے وقت گزرا اور ایک دُکان میں داخل ہوا ، تو صحابہ نے عرض کی کہ افسوس یہ اگر اتنے سویرے اطاعت خدا کے لیے اٹھا ہوتا تو کیا اچھا تھا ۔ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا ، کہ افسوس نہ کرو ۔ یہ اگر اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے پیشِ نظر جارہا ہے ، تو وہ بھی عبادت خداوندی ہے ۔ اور اگر مالداری کا خیال ہے ، تو شیطانی کام ہے ۔ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو آدمی کسبِ حلال اس لیے کرتا ہے کہ دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے ۔ تو قیامت کے دن اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ سچا سوداگر بروزِ قیامت صدیقوں اور شہداء کے ساتھ شمار کیا جائے گا اور ارشاد ہوا کہ خداوندِ عالم پیشہ ور مومنوں کو دوست رکھتا ہے اور سب سے زیادہ حلال روزی پیشہ وری کی ہے ۔ لیکن نیکیوں پر عمل کرے ۔ حضورؐ کا حکم ہے کہ تجارت کرو ۔ اس لیے کہ اس میں سے

نو حصے رزق تجارت میں ہے۔ جو آدمی کسی کا سوال سننا چاہتا ہے، اس پر ستر دروازے فقر کے کھول دیئے جاتے ہیں۔

واقعہ | حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ تو کیا کام کرتا ہے؟ اُس نے کہا عبادت! تو آپ نے دریافت کیا کہ پھر روٹی کیسے ملتی ہے؟ تو اس نے کہا کہ میرا بھائی مجھ کو روٹی دیتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تیرا بھائی تجھ سے زیادہ عبادت کرتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ بغیر محنت کے خدا سے روٹی نہ مانگو۔ کیوں کہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برستے۔ لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ کسب نہ چھوڑنا، جو آدمی دنیا والوں کا دوست ہوتا ہے، اس کا دین تنگ ہو جاتا ہے اور عقل ضعیف اور محبت کم ہو جاتی ہے۔ دُنیا والے اس کو بے عزت سمجھنے لگتے ہیں۔

لوگوں نے ایک بزرگ سے سوال کیا، کہ زیادہ درجہ عابد کا ہے یا اس سوداگر کا جو امین ہے۔ اُن بزرگ نے امین سوداگر کے متعلق فرمایا۔ کیونکہ وہ جہاد کر رہا ہے۔ وہ سوداگر شیطان کا فریب نہیں کھاتا۔

واقعہ | حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسب حلال کرتے میں بازار میں مجھے موت آجائے تو میں بہترین موت سمجھتا ہوں۔

واقعہ | لوگوں نے حضرت امام حنبل علیہ الرحمۃ سے ایک عابد کے لیے دریافت کیا جو مسجد میں بیٹھا عبادت کرتا ہے اور خدا سے روٹی مانگتا ہے، تو فرمایا کہ یہ شریعت کے احکامات سے جاہل ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم نے میری روزی میرے نیزے کے نیچے پوشیدہ کی ہے۔ جتنی کوشش کروں گا ملے گی۔

حضرت اوزاعی نے ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا۔ جبکہ وہ ایک بوجھ لکڑی کا لادے ہوئے جارہے تھے کہ یہ محنت اب کب تک کریں گے۔ آپ کے مسلمان بھائی آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ تو جواب دیا کہ تو خاموش رہ۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی کسبِ حلال کے ذلت کو برداشت کرے گا۔ اس کے لیے بہشت واجب ہے۔

اگر کوئی کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنِ اجْمَعَ الْمَالَ وَکُنْ مِنَ التَّاجِرِیْنَ وَلٰکِنْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِنَ السَّاجِدِیْنَ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (یعنی مجھے مال جمع کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی، بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت و تسبیح کر! اور ساجدین میں سے ہو، اور یہ دلیل اس بات کی ہے کہ کسبِ حلال عبادت سے افضل و بہتر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے، کہ اگر آدمی کے پاس گزارے کے لیے مال موجود ہے، اس کے لیے عبادت ہی افضل

ہے اور اگر کفایت سے زیادہ کسب کیا جائے گا تو عبادت نہ رہے گی، بلکہ وہ دنیاداری ہو جائے گی اور وہ گناہِ کبیرہ ہے اور اگر کسی کے پاس مال جمع نہیں، بلکہ گذر اوقات ہی بآسانی ہو سکتی ہے، تو بھی نہ کمانا ہی اچھا۔ یہ چار قسم کے آدمیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اوّل وہ آدمی جو علوم شرعیہ کا کسب کر رہا ہو، اور دین کو اس سے فائدہ پہنچے۔

دوم وہ آدمی جو اوقات یا خدمتِ خلق یا عہدۂ قضا پر فائز ہو۔

سوم وہ شخص جو صوفیوں کی طرح مکاشفات کا حامل ہو۔

چہارم وہ آدمی جو کسی خانقاہ میں ظاہری عبادات میں مشغول ہو۔

ایسے لوگوں کو کسب کرنا ضروری نہیں، بلکہ اچھا ہے۔ لیکن ان کی روزی کے دوسرے لوگ کفیل بھی ہوں اور دستِ سوال اٹھائے بغیر لوگ اُن کو روزی پہنچا دیں۔

بزرگوں میں سے ایک صاحب کے تین سو ساٹھ مُرید تھے۔ وہ ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے اور سال بھر کے ہر دن میں ایک کے یہاں مہمان ہوتے۔ اسی طرح ایک صاحب کے تیس مُرید تھے وہ مہینے میں ایک ایک دن ہر ایک یہاں مہمان رہتے اور مستقل عبادت میں مشغول رہتے۔

لیکن اگر زمانہ ایسا ہو کہ بغیر دستِ سوال دراز کیے کوئی آدمی نہ دے، اور مانگنے میں ذلّت ہو تو کسبِ معاش کرنا بہتر ہے، اور کسی سے سوال کرنا خواہشاتِ نفسانی میں داخل ہے، لیکن اگر واقعی ضرورت ہے یا کسبِ علم کے لیے مانگ رہا ہے تاکہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے، تو جائز ہے۔ اور اگر طلب طاقت میں اس کی ذلت ہوتی ہے، تو بھی ہمارے خیال میں ایسے آدمی کو نہ کمانا ہی اچھا ہے۔ لیکن اگر ایک آدمی کمانے کے وقت بھی خدا کو نہیں بھولتا۔ اس کے لیے بہتر ہوگا، کیونکہ تمام عبادات خدا کے ذکر میں ہی مضمر ہیں، اور کمانے وقت بھی خدا کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا باب
علمِ تجارت

اقسامِ تجارت یہ بحث بہت طوالی ہے۔ اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ دوسری کتب میں کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اِس کتاب میں مختصر طور سے سمجھا دینا کافی ہوگا، تاکہ سمجھ سکے، اور اگر کوئی مشکل پڑے، تو علماء سے دریافت کر لے۔ اگر یہ علوم کوئی نہیں جانتا تو وہ سود خواروں میں شامل ہوتا ہے۔ اس کو دریافت کر لینا ضروری ہے علمِ کسب چھ طریقوں پر منقسم کیا گیا ہے۔

بیعؔ۔ ربٰواؔ۔ سلمؔ۔ اجارہؔ۔ قراضؔ۔ شرکتؔ۔ ان کی تعریف اور شرائط لکھی جاتی ہیں۔

۱- بیع

علمِ بیع کا سیکھنا ہر آدمی پر فرض ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، بازار جاکر دوکانداروں کو دُرّوں کی سزا دیتے، اور کہتے کہ کوئی آدمی بغیر مسائل فقہ کے جانتے ہوئے دوکانداری نہ کرے ورنہ وہ دانستہ سود خواری میں مبتلا ہوگا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ارکانِ بیع تین ہیں :

۱- عاقد — خرید و فروخت کرنے والا۔

۲- معقود علیہ — سامانِ تجارت۔

۳- بیع

عاقد پہلا عاقد، اس کے قیود یہ ہیں، کہ حسبِ ذیل پانچ اشخاص کے ساتھ معاملت نہ کرے۔

اوّل نابالغ۔ دوم پاگل۔ سوم لونڈی و غلام۔ چہارم نابینا۔ پنجم حرام خور۔

نابالغ لڑکے سے بیع و شرا امام شافعیؒ کے نزدیک منع ہے، خواہ اس کا ولی اجازت ہی کیوں نہ دے دے۔ یہی حکم پاگل کے لیے ہے۔ اگر اُن سے خرید و فروخت کرے گا اور وہ کم و زیادہ ہوگی، تو اس شخص پر تاوان واجب ہوگا، لیکن نابالغ اور پاگل پر کوئی تاوان نہ ہوگا۔

لونڈی اور غلام کے ساتھ بیع و شرا بغیر اجازت آقا باطل ہے۔ لہٰذا جب تک، اُن کے مالک سے گفتگو طے نہ کرلیں، کوئی چیز نہ خریدیں، اور نہ فروخت کریں۔ اگر بلا اجازت لیں گے تو لینے والوں پر تاوان ہوگا، تا وقتیکہ وہ آزاد نہ ہو جائیں۔ اُن سے تاوان نہ لیا جائے گا۔ اسی طرح نابینا سے بھی معاملات کرنا منع ہے۔ لیکن اگر وہ کسی بینا کو اپنا وکیل مقرر کردے تو بیع و شرا ٹھیک ہوگی۔ اگر اس طرح اندھا کوئی چیز لے گا تو اس پر تاوان پڑے گا۔ اس لیے کہ وہ مکلف ہے۔

حرام خور سے بھی بیع و شرا باطل ہوتی ہے، جیسے مشرک۔ چور۔ سود خوار۔ جھوٹا۔ راشی اور شراب فروش اسی طرح گویّے اور ڈاکو سے بھی باطل ہے۔ لیکن اگر یہ تحقیق ہو جائے یہ مال انھیں کا ہے تو جائز ہوگی اور اگر مال شک و شبہ والا ہے، تو تحقیق کرے۔

نوٹ : اگر اس میں زیادہ حصّہ حلال کا ہے، تو معاملت کرلے، لیکن شبہات اس میں بھی ہیں، اور اگر مال حرام زیادہ ہے تو بھی ذاتی طور پر حرام نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ شبہ تقریباً حرام ہی کا ہے اور اس میں خطرہ ہے۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ اگرچہ معاملت جائز ہے۔ لیکن قرآن مجید کا لین دین ان سے جائز نہیں۔ اُن کے ہاتھ فروخت کرنے والا گنہگار ہوگا۔

اگر زندیق ہے تو بھی لین دین ناجائز ہے۔ اُن کا مال اور خون جائز ہے، بلکہ یہ لوگ دُنیا کی کسی شئے کے

مالک نہیں۔ ان کا نکاح بھی ناجائز ہے۔ ان لوگوں کے لیے بھی وہی احکامات ہیں جو مرتدین کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

زندیق زندیق وہ ہے جو شراب پیئے۔ عورتوں کے ساتھ صحبت رکھے اور نماز اُن سات شبہات میں سے جو باب عنوان مسلمانی میں لکھے ہیں، ظاہر کرے وہ زندیق کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ نکاح اور کسی قسم کی بیع وشرا حرام ہے۔

مالِ نجس کی تشریح بیع کا دوسرا رکن مال ہے (سامانِ تجارت) اس کے لیے چھ شرائط ہیں۔

پہلے یہ دیکھے کہ وہ مال نجس تو نہیں ہے۔ مثلاً

کُتا۔ گوہ۔ ہاتھی کی ہڈیاں۔ شراب۔ گوشت۔ مُردار۔ روغن مردار وغیرہ۔ ان چیزوں کی بیع حرام ہے۔

لیکن اگر تیل بذاتِ خود پاک ہے، لیکن کوئی نجاست اس میں مل گئی ہے تو ناجائز ہوگا۔ اسی طرح نجس کپڑے کی فروخت ناجائز ہے، لیکن نافہ مشک، اور کرمِ ابریشم کی کھال کی فروخت جائز ہوگی۔

کن چیزوں کی تجارت جائز ہے دوسرے یہ کہ ایسا مال ہو، جس میں کچھ فائدے کی اُمید ہو، لیکن چوہے، سانپ، بچھو اور دوسرے زمین کے کیڑوں کی بیع ناجائز ہے۔ شعبدہ بازی جو سانپ والے کرتے ہیں، اس کے متعلق شرع میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔

گیہوں، یا کسی بھی اتنی کم مقدار والی چیز جن کی بیع ناجائز ہے جس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے۔

بلی، چیتا، شیر، بھیڑیا اور ایسے وہ درندے جن کی کھال چمڑے کے لیے فروخت کی جائے، جائز ہے طوطے۔ مور اور خوبصورت پرندوں کی بیع جائز ہے۔ بربط وچنگ ورباب کی بیع ناجائز ہے۔

ایسے کھلونے جو انسانوں کی شکل کے بنائے جائیں، یا حیوانوں کی شکل کے ہوں، اُن کی بیع ناجائز ہے۔ بلکہ اُن کو دیکھ کر توڑ دینا چاہیے۔ لیکن درخت اور دوسرے پودوں کی شکل کے کھلونوں کی بیع جائز ہے۔

جس پلیٹ یا کپڑے پر کوئی شکل بنی ہوئی ہو، اس کی بیع تو جائز ہے، لیکن اس کپڑے کا تکیہ یا فرش بنانا ناجائز ہوگا

تیسرے یہ کہ مال فروخت کنندہ کی ذاتی ملکیت ہو۔ اگر کوئی بغیر اجازت مال فروخت کرے گا تو بیع ناجائز ہے، چاہے وہ مال باپ بیٹے یا شوہر ہی کا کیوں نہ ہو، اور اگر مال فروخت ہونے کے بعد بھی اجازت دیں تو بھی بیع باطل ہوگی۔

چوتھے فروخت کرنے والی چیز اپنے قبضے میں ہو تاکہ اس کی قیمت لے کر خریدنے والے کے سپرد کر سکے۔

بھاگے ہوئے غلام۔ پانی کی مچھلی۔ ہوا کے پرندے۔ پیٹ کا بچہ اور گھوڑے کا نطفہ جو ابھی اُس کی پیٹھ میں ہوں۔ اسی طرح وہ دودھ جو تھنوں میں ہو، یا جو بال جسم پر ہوں، ان کی بیع ناجائز ہے۔ کیونکہ اُن چیزوں کا خریدار کے سپرد کرنے پر قادر نہیں، اور وہ دودھ جو تھنوں میں ہے اور وہ بال جو جسم پر ہیں سودا ہونے وقت سے لے کر جب تک اس کے سپرد کیے جائیں گے۔ کچھ نہ کچھ ان میں اضافہ ہو جائے گا۔

اصول تجارت وہ شے جو رہن رکھی ہوئی ہے، اس کی فروخت بغیر اجازت مالک ناجائز ہوگی۔ ایسی کنیز جو بچہ کی ماں ہو گئی ہو، یا اُمید ہو، اس کی بیع بھی ناجائز ہوگی۔ اسی طرح اگر لڑکا کنیز کا چھوٹا ہے تو اُسے بھی فروخت نہ کرنا چاہیے۔ چونکہ کسی بچے کو ماں سے جدا کرنا گناہ ہے۔

پانچویں یہ کہ عین مال کی صحیح مقدار معلوم ہو۔ یعنی ایک گلے میں سے فلاں بکرا، یا تھانوں میں سے فلاں تھان کا کپڑا بغیر تخصیص مال کے بیع ناجائز ہوگی۔ یہ مال کا "عین" حصہ کہلاتا ہے۔

اگر زمین فروخت کرے اور صرف اتنا کہے کہ اس قطعہ زمین میں سے دس گز کا قطعہ جدھر سے تو چاہے لے لے۔ تو بھی درست نہیں۔ یہ مقدار کہلاتی ہے۔ لہٰذا اس کی بھی تخصیص ضروری ہے۔

جہاں مال کو خریدنے والا اپنی آنکھ سے نہ دیکھے وہاں مقدار بتائی جائے۔ مثلاً فروخت کرنے والا یہ کہے کہ جتنے میں جتنا کپڑا فلاں نے تجھ کو دیا ہے۔ اتنے میں ہی فلاں کپڑا میں دوں گا۔ یہ مقدار کا مقرر نہ ہونا ہے اور یہ باطل ہے۔ اسی طرح سونا چاندی کی مقدار معلوم ہونا ضروری ہے۔

اگر گیہوں ایک ہتھیلی بھر سونے یا چاندی کے برابر فروخت کرے اور خریدنے والا دونوں چیزیں دیکھ رہا ہو، تو جائز ہوگا۔ مال کی صفت کا جاننا یہ ہے کہ نہ دیکھی ہوئی چیز کو اول دیکھ لے یا بہت دنوں پہلے کی دیکھی ہوئی چیز اگر بڑھنے گھٹنے والی ہے، تو بھی اس کو دیکھ لے۔ بغیر دیکھے اس کی بیع باطل ہوگی۔

وہ ریشمی کپڑا جو ٹاٹ کے اندر ہو یا وہ گیہوں جو ابھی خوشہ گندم میں ہو، اس کی بیع ناجائز ہے۔

کنیز اور غلام کے بال اور ہاتھ پاؤں دیکھ لے۔ اگر کوئی چیز دیکھنے میں رہ گئی اور بعد میں ناپسند ہوئی، تو بیع باطل ہے۔

مکان خریدنے میں اگر کوئی ایک کمرہ دیکھنے سے رہ گیا ہے، تو بھی بیع باطل ہے۔

پھل۔ مثلاً اخروٹ۔ بادام۔ باقلا۔ انار وغیرہ کی بیع جائز ہے۔ اسی طرح مُرغی کے انڈے کی۔ وقت ضرورت وہ میوہ جو دوسرے پھلوں کے اندر ہوں وہ بھی فروخت کر سکتے ہیں۔

فقاع کی بیع ناجائز ہے، کیونکہ وہ چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر اجازت لے کر اُن کا کھا لینا جائز ہے۔

چھٹے وہ چیز جو قبضے میں نہ آئے، اس کی بیع اچھی نہیں۔ اول اس کو قبضے میں کرلے اور اس کے بعد فروخت کرے۔

تیسرا رکن (عقد) عقد اس کو کہتے ہیں، کہ فروخت کرنے والا اپنی زبان سے یہ لفظ ادا کرے کہ یہ چیز میرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں۔ خریدنے والے کو یہ خیال کرنا کہ میں نے اس کو خریدا۔ اس کو "قابہ" کہتے ہیں۔ لہٰذا خرید و فروخت کے وقت دونوں کے لیے ضروری ہے کہ اس مفہوم کے الفاظ ادا کریں کہ یہ چیز فروخت کی گئی اور خریدی گئی۔ ورنہ بیع و شرا ناجائز ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے اجازت کی ضرورت کو جائز سمجھیں۔ کیونکہ فی زمانہ اس کا رواج ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مقولہ ہے، اور علمائے شافعیہ کے بعض علماء نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ شافعی مذہب والے غالباً تین وجوہ کی بنا پر اس کے لیے فتویٰ دیتے ہیں۔

پہلے یہ کہ اس کی حاجت عام طور پر ہے۔ دوسرے یہ کہ غالباً صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی یہ عادت تھی اگر لفظ "بیع" بھی استعمال کیا جاتا تو اُن کے لیے دقت ہوتی، اور وہ اس کے متعلق ضرور لکھتے۔

سوم یہ کہ جب عادت پڑ جاتی ہے، تو قول و فعل ہم پلّہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ہدیے کے متعلق ہے، کہ لوگ جو کچھ آنحضرتؐ کی خدمت میں لے جاتے تھے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اور اس زمانے میں بھی ایسا ہی ہے اور جہاں عادت کی وجہ سے اجازت ملکیت صرف نیت پر موقوف ہوتی ہے۔ تو اس میں قیمت اور عوض کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ صرف نیت پر ہے۔ نیت کا وجود میں ہونا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن "ہدیے" میں عادت کی وجہ سے کم و بیش کے لیے کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔ اس طرح اگر قیمتی چیز فروخت کی جاتی ہے تو لفظ "بیع" استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی چیزوں کے فروخت کے وقت مثلاً کنیز۔ غلام۔ زمین، مکان۔ حیوان یا قیمتی کپڑا وغیرہ، تو یہ عادات اسلاف کے منافی ہے، اور ملکیت نہ ہو سکے گی، لیکن کم قیمت اشیاء کے لیے عادت کی وجہ سے اجازت کی ضرورت تو ہے۔ مگر لفظ بیع کی ضرورت نہیں۔ مگر اُن اشیاء کی قیمتوں میں ہر ایک کے مدارج ہوتے ہیں، جن کو سمجھ لینا ضروری ہے، کہ آیا کون چیز کس درجہ کی ہے۔ لیکن اس کا اندازہ بہت مشکل ہے چونکہ فہرست طولانی ہو جائے گی، لہٰذا احتیاطاً ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ جس سے ایک معیار بن سکے۔ مثلاً ایک گدھا بھرا ہوا گندم کا خریدا اور اس سے لفظ "بیع و شرا" ادا نہ ہوا، تو ملکیت اس پر صادق نہ آئے گی۔ لیکن اس گندم کا کھانا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے پاس پہنچ جانے کی وجہ سے تصرف جائز ہو جاتا ہے چاہے ملکیت نہ ہو، اور اسی گندم میں سے کسی مہمان کو کھانا کھلائے تو بھی جائز ہو گا۔ کیونکہ اصل مالک کا اس گیہوں کے ڈھیر کو اس آدمی کے حوالے کر دینا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس پر حلال ہونا پسند کر چکا ہے۔ لیکن صراحتاً نہ کیا، کہ یہ گندم اپنے مہمان کو کھلا دیتا۔ تو ایسے وقت میں تاوان دینا ضروری ہوتا ہے۔

لہٰذا لفظ بیع کے استعمال نہ کرنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ گندم اس کی ملکیت میں اس طرح نہیں ہوا کہ وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، بلکہ خریدار کے استعمال سے پہلے اگر مالک چاہے تو اس کو واپس لے سکتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ بیع اس طرح جائز ہے کہ اس میں کوئی درمیانی شرط نہ لگائی جائے۔ مثلاً لکڑیاں خرید کر یہ نہ کہا جائے کہ یہ گھر بھی پہنچانا پڑیں گی۔ یا گندم خریدنے میں یہ شرط لگائے کہ اس کا آٹا پیسنا بھی شرط ہے یا اس شئے کے خریدنے کے بدلے میں کوئی اور شئے قرض مانگے۔ اِس طرح "بیع" ناجائز ہو گی۔

بیع میں حسبِ ذیل چھ شرائط جائز ہیں۔

پہلی یہ کہ اس چیز کے عوض میں فلاں شئے میرے پاس رہن رکھ لو۔
دوسری، ضمانت میں کسی گواہ کا طالب ہو۔
تیسری، قیمت نقد لے۔
چوتھے، یہ کہ لین دین میں تین دن کے اندر واپسی کی شرط کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔
پانچویں یہ کہ عرصۂ دراز کے لیے قرض نہ دے۔
چھٹے یہ کہ غلام اس شرط پر خرید رہا ہو، کہ وہ کسی مزدوری کے عوض وہ قرضہ ادا کر دے۔
مندرجہ بالا شرائط "بیع" کو باطل نہیں کرتیں۔

دوسرا طریقہ

"ربوا"

ربوا | ربوا کھانا، غلّہ اور نقد تینوں صورتوں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن نقدی کی صورت میں "قرض" ناجائز ہے مثلاً سونا، چاندی۔ اگر خریدے تو فوری لین دین نقد ہونا چاہیے، ورنہ بیع باطل ہوگی۔

یا سونا چاندی کی کوئی شئے کے عوض سونا چاندی ہی خریدے، تو اس میں منافع لینا ناجائز ہے۔ اسی طرح ثابت سکّے کو مختلف سکوں کے عوض نہ فروخت کرے۔ یہ بھی ناجائز ہے۔ کہ کھوٹے سکّے کے عوض اچھے سکّے کم دیئے جائیں، بلکہ کھرا کھوٹا یا ٹوٹا پھوٹا سکہ سب برابر دینا چاہیے۔ لیکن اگر کسی نے پہلے اچھے دینار کے بدلے میں خریدا ہے، اور بعد میں اسی کھرے سکّے کو ٹوٹے ہوئے سکّے سے اس شخص سے بدلنا چاہے یا خریدنا چاہے تو جائز ہوگا۔

آمیزش کا سونا (ہربوہ) خالص سونے کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں۔ سونے چاندی کی چیزیں، یا ان کا کھرا نہ ہونا اگر علم میں ہے، تو سب اسی حکم کے ماتحت آئیں گی۔ اسی طرح موتیوں کے ہار میں اگر سونا ہے، تو اس کو سونے کی قیمت کے مطابق فروخت نہ کرے۔

ریشمی سنہرے کپڑے کو سونے کی قیمت پر فروخت نہ کرے، لیکن اس کو جلا کر سونا نکال لیں، پھر حسب مقدار فروخت کر سکتے ہیں۔

دو قسم کا اناج بھی ایک دوسرے کے عوض میں فروخت نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر فوری طور پر قبضہ مل جائے یہاں تک ممنوع ہے کہ اگر گیہوں کے بدلے گیہوں ہی فروخت کرے، اور ناپ تول کر بھی فروخت کرے، تو بھی جائز نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ نانبائی کو روٹی کے عوض آٹا۔ تیلی کو تیل کے بدلے تلی اور قصائی کو گوشت کے بدلے بکرا دینا

جائز نہیں، لیکن اگر بیع کی نیت نہیں کی ہے، بلکہ صرف روٹی بدلے میں لینے کی نیت کی ہے تو جائز ہے۔ مگر یہ روٹی اس کی ملکیت خاص میں نہ ہوگی۔ اس کو فروخت نہ کر سکے گا۔ اسی طرح نانبائی اس کا آٹا یا گندم فروخت نہ کر سکے گا، بلکہ طرفین ایک دوسرے سے جب چاہیں لے سکتے ہیں۔ اس میں اگر ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔ تو بھی حدود شرع میں نہیں آتا، لیکن اگر بغیر کسی ایسی نیت کے جس میں کوئی شرط لین دین ہو تو وہ معاف کر دینا جائز ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ بیع کرتے وقت یہ نیت نہ ہو کہ اس کے بدلے میں نانبائی روٹی بخش کر دے گا۔ یا نانبائی کے دل میں یہ نیت نہ ہو کہ یہ شخص آٹا یا گندم اس مقدار میں یا غیر معینہ مقدار میں مجھے اس کے بدلے میں معاف کر دیگا۔ بلکہ یہ معافی خلوص دل سے ہونا چاہیے۔ اس کے بعد جائز ہوتی ہے۔

یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ جو اشیاء اناج کی بنائی ہوتی ہیں، ان کو بھی کسی اناج کے عوض فروخت نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً گیہوں کے بدلے میں آٹا۔ خمیر یا روٹی۔ اسی طرح انگور کے بدلے سرکہ یا شہد۔ اور دودھ کے بدلے پنیر یا مکھن۔ بلکہ کھجور کو کھجور کے عوض اور انگور کو انگور کے بدلے۔ اس وقت تک نہیں فروخت کرنا چاہیے۔ جب تک انگور منقہ نہ ہو جائے اور کھجور چھوہارا نہ ہو جائے۔

اس کے متعلق مفصل طور پر لکھنا بہت طولانی ہوگا۔ بس اتنا ہی جاننا کافی ہے۔ لیکن اگر بیع و شرا کے کسی مسئلہ کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، بلکہ اپنے علماء وقت سے دریافت کر لینا ضروری ہے۔

تیسرا طریقہ
سَلَم

سَلَم سَلَم میں دس چیزوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ، گندم۔ سونا، چاندی یا کپڑا جو کچھ بھی فروخت کر رہا ہے۔ اس کی مقدار اور تعداد کے لیے خریدار کو پوری طور پر اپنی زبان اور طریقوں کے مطابق واضح کر دے، تاکہ وہ بھی اچھی طرح سمجھ لے اور پھر قبول کرے تو سلم جائز ہوگی۔

اور اگر "سلم" کے بدلے میں وہ یہ کہے کہ ان صفات کی اشیاء خرید کی ہیں تو بھی جائز ہوگا۔

دوم یہ کہ، بے حساب نہ دے۔ بلکہ تعداد و مقدار معلوم ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اگر واپسی کا سوال پیدا ہو، تو اس وقت کوئی شک نہ پیدا ہو سکے۔

سوم یہ کہ، راس المال عقد مجلس بلده کے حوالے کر دے۔

چہارم یہ کہ، اگر کوئی چیز مفرد ہو جیسے روئی۔ ریشم۔ گوشت یا حیوان وغیرہ سلم میں دے تو جائز ہے۔ لیکن وہ چیزیں جو مرکب ہیں مثلاً تیر۔ خضاب۔ موزہ۔ جوتا وغیرہ، اس میں سلم جائز نہیں ہوتا۔ لیکن روئی میں سلم جائز

ہوتا ہے۔ چاہے اس میں نمک اور پانی شامل ہے اس لیے کہ اس کی مقدار کا معلوم نہ ہونا جائز ہے۔

پنجم یہ کہ، وقت کا تعین بھی جائز ہے جیسے نوروز کے دن تک یا جمادی تک۔ لیکن جمادی سے جمادی الاول کا مہینہ شمار کیا جائے گا۔ وہ تعین وقت جائز نہیں، جس میں صحیح وقت نہ معلوم ہو جیسے گیہوں کے پک جانے پر اس کے بعد اگر کسی خاص وجہ سے وہ وقت نکل جائے، تو آپس میں ایک دوسرے کو مہلت دے اور لے سکتے ہیں۔

ششم یہ کہ، اس وقت جائز ہے، کہ وعدے کے وقت موجود ہو۔ یا اگر ایسا بھی ہے کہ انگور کا سلم دینا ہے، اور وہ اس وقت پک جاتا ہے، جب کا وعدہ کیا ہے، تو جائز ہو گا، لیکن اگر وقت موعودہ تک نہ چک سکے تو پہلے کی طرح مہلت دے سکتا ہے۔ یا فسخ کر کے مال واپس لے لے۔

ہفتم یہ کہ شہر، جگہ اور وقت طے کر لے، تاکہ وقت پر اسی جگہ حوالے کر سکے۔

ہشتم۔ کسی جگہ یا چیز کو مخصوص نہ کرے، کہ اس درخت کا انگور یا اس زمین کا گندم۔

نہم۔ نایاب چیز میں سلم نہ دے۔ جیسے خوبصورت کنیز اور غلام۔ سُچے اور اچھے جواہرات وغیرہ۔

دہم۔ اگر راس المال میں اناج ہو، تو سلم میں اناج نہ دے۔ جیسے گیہوں، جَو اور باجرہ وغیرہ۔

چوتھا طریقہ

اجارہ

اجارہ یہ دو ارکان پر مشتمل ہے۔ مزدوری۔ منافع

پہلا رکن: اس میں مزدوری کی مقدار کا تعین ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی کو تعمیر کے بدلے کرائے پر دے دے تو ناجائز ہے۔ اسی طرح پسنہاری کو اُجرت میں بھوسی دینا۔ یا قصاب کو ذبح کے عوض کھال دینا ناجائز ہے۔ مزدوری سے حاصل کی ہوئی کمائی میں سے بھی اُجرت دینا اچھا نہیں۔ اگر کوئی آدمی ایک دینار ماہانہ پر دُکان کرایہ پر دے، لیکن اس میں مدت شامل نہ ہو کہ کب تک؟ تو ناجائز ہے۔

دوسرا رکن: منافع۔ اوّل وہ کام نیک ہو۔ اور اس کی محنت کا اندازہ بھی اور کسی دوسرے سے کام لینے کی اس میں ضرورت نہ پڑے۔ منافع (اجارہ) اس میں جائز ہے۔ اس میں پانچ شرائط ضروری ہیں۔

پہلا طریقہ یہ کہ اس کام میں قدر و قیمت اور محنت دونوں شامل ہوں۔ مثلاً اناج کو اجارے پر اس لیے لے کہ اپنی دکان کو بھر کر آراستہ کرے گا۔ یا سیب لے کر اس کی خوشبو ہی سُونگھے تو ناجائز ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے گیہوں کا صرف ایک دانہ فروخت کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی بہت اچھا فروخت کرنے والا ہے اور اس سے یہ طے کر لیا جائے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے یا آواز کے ذریعے فروخت کر دے تو اجارہ بھی ناجائز ہے۔

اُس کی مزدوری بھی قطعی ناجائز ہوگی، کیونکہ اس میں اس کو کوئی محنت کرنا نہیں پڑتی، بلکہ آڑھتی یا دلال کو مزدوری اس وقت جائز ہوگی، جب وہ اس مال کے فروخت کرنے میں محنت کرے۔

اگر فیصدی کمیشن طے کر لیا جائے تو بھی ناجائز ہے۔ چونکہ یہ کمیشن مال کی فروخت پر ملے گا نہ کہ محنت و مشقت کے مُطابق۔

آڑھتیے یا کمیشن ایجنٹ دو طریقوں سے اجارہ لے سکتے ہیں۔

اوّل یہ کہ جو کچھ اسے دیا جائے وہ بخوشی قبول کر لے، یا اپنی محنت کے مطابق طلب کر لے، اور اجارہ اس مال کی قیمت کے مطابق ہی مانگے۔

دوم یہ کہ، اوّل ایک دام طے کر لے کہ اس مال کو فروخت کر کے اتنے روپے اجارے میں لوں گا۔ کمیشن فی صدی نہ طے کرے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مال میں اس کے منافع پر اجارہ طے ہونا چاہیئے عین اس مال پر نہ ہونا چاہیئے جیسے کسی گائے کو اس لیے چارہ اور گھاس کھلانے پر لے کہ اس کا آدھا دُودھ خود لے گا۔ یا درخت لے کہ اس کے پھل کھائے گا۔ ایسے اجارے باطل ہوں گے۔ کیونکہ اُن چیزوں کی صحیح تعداد یا مقدار معلوم نہیں ہوگی۔

اسی طرح اگر کسی عورت کو دودھ پلانے پر رکھے، کیونکہ اس سے اپنے بچّے کی پرورش ہی مقصود ہوتی ہے۔ اور اس کا دُودھ درزی کے دھاگے اور سوئی کی طرح اس کی ملکیت میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ درست و جائز ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے، کہ ایسا کام اس آدمی سے لے کر وہ اس کو بآسانی کر سکے۔ مثلاً اگر کسی ضعیف یا کمزور آدمی سے سخت کام لیا کہ وہ نہ کر سکے۔ یا کسی نجس عورت سے مسجد کی صفائی کرائی گئی، تو یہ ناجائز ہے۔ اگر کسی بچے کے کان میں مُندہ ڈالنے کے لیے سوراخ چھدوائے تو شریعت کے خلاف ہے۔ اس کی اُجرت بھی حرام ہوگی۔ جو لوگ اپنے بدن پر نقش و نگار مشین اور روشنائی کے ذریعے کھدواتے ہیں یہ بھی ناجائز ہے۔ وہ کلاہ دوز یا درزی جو مردوں کے لیے ریشمی ٹوپی یا لباس سیتے ہیں، اس کی مزدوری جائز نہیں۔ جادُوگری اور شعبدہ بازی کی اُجرت بھی حرام ہے۔ شعبدہ بازی کرنا، دیکھنا اور سیکھنا حرام ہے —— حسبِ ذیل اُجرات یا انعام دینا حرام ہے شعبدہ باز۔ مسخرہ۔ گویا۔ مطرب۔ نوحہ خواں۔ ہجوگو شاعر۔ قاضی یا جج۔ گواہ جو عدالت میں گواہی دے۔ ان سب کو اُجرت دینا یا لینا ناجائز ہے۔ لیکن اگر قاضی کو عرضی نویسی یا سیاہ نویسی کی اُجرت دی جائے تو جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ دوسرے عرائض نویسوں کو اس کام سے نہ روکتے ہوں۔ قاضی اگر دوسروں سے لکھوائے اور تم سے زیادہ اُجرت مانگے تو اچھا نہیں۔ لیکن اگر اپنے ہاتھ سے لکھے تو جتنی قیمت طے کرے جائز ہوگی اور اگر کوئی حاکم عزّت و مرتبے کی وجہ سے ہو تو اس کو مزدوری نہ لینا چاہیے۔

مجسٹریٹ کے وکیل کو اُجرت لینا اس شرط پر جائز ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی کی وکالت نہ کرے جس کے متعلق بے ایمانی یا غضب کا شبہہ بھی ہو۔ لیکن اگر وہ لاعلم ہے تو موکّل کی طرف سے وکالت کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی بات کا اس کو یقین ہو جائے کہ موکل غلط کہہ رہا ہے، تو خاموشی اختیار کرے۔ اور اس کی طرف سے بحث نہ کرے۔

اگر کوئی ثالث بنایا جائے، تو ایک آدمی سے اُجرت نہ لے۔ ورنہ ایمانداری سے فیصلہ نہ کر سکے گا۔ لیکن اگر ایک آدمی کی طرف سے کوئی محنت کرے تو اُجرت جائز ہوگی، لیکن جھوٹ اور فریب نہ کرے۔ اور نہ آپس میں کسی کو دبائے کہ وہ دب کر فریق دوم سے صلح پر مجبور ہو جائے۔ ایسی ثالثی سے صلح ناجائز ہوگی اور اس قسم کی ثالثی کی اُجرت حرام ہوگی۔

اگر ثالث کو یہ یقین ہو جائے کہ حق ایک طرف ہے تو اس کو سمجھا بجھا کر یا حیلے حوالے سے اس کو اس کے حق سے دست بردار کرنے کو کہے تو بھی ناجائز ہوگا۔ اور اگر یہ دیکھے کہ حقدار آدمی کو دھمکایا جائے گا، تو اس کے حیلے سے دھمکانا جائز ہے، تاکہ وہ ظلم سے باز آجائے۔ یہ جائز ہے، جو ایماندار آدمی یہ جانتا ہو کہ اس کا ہر لفظ گرفت کیا جایا کرے گا۔ یعنی اس نے کیوں کہا اور کیسے کہا۔ اچھا کہا یا بُرا، تو وہ آدمی وکالت نہیں کر سکتا۔

رؤسا و امراء کے کاموں کی اُجرت لینا جائز ہے۔ لیکن درحقیقت اس کام میں محنت کی ہو۔ صرف عزت و حرمت کے عوض اُجرت لینا ناجائز ہے۔ جتنا کام کرے اتنا ہی صاحبِ کام سے بیان کرے۔ زیادہ بڑھا کر نہ کہے۔ اگر کسی ظالم یا حرام فعل کے لیے گواہی دے گا یا سچی باتوں کو چھپائے گا، یا کسی حرام کام کے لیے گفتگو کرے گا تو ناجائز ہوگا۔

یہ تمام احکامات اجارہ (اُجرت کے لیے ضروری ہیں) اس کی مخالفت یا لاعلمی سے لینے اور دینے والے دونوں ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بات پیش آجائے تو علمائے وقت سے استفسار کرے۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ جس پر جو کام خود واجب ہے، اس کو قائم مقامی سپرد کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً کسی بہادر کو جہاد کے لیے اپنا نائب بنا دے، تو جب وہ غازی جہاد میں پہنچے گا، تو خود اس پر بھی وہ جہاد واجب ہو جائے گا۔

کسی آدمی کو اپنی طرف سے روزہ، نماز کی اُجرت دے کر پڑھوانا ناجائز ہے۔ لیکن حج کی نیابت اس وقت جائز ہے، جبکہ آدمی خود معذور ہو اور اچھا ہونے کی امید بھی نہ ہو۔ قرآن مجید یا کسب علم دین کے لئے کسی کو اُجرت، بخشش یا وظیفہ دینا اچھا ہے۔ قبر کھودنے غسل میت اور جنازہ اٹھانے کی اجرت کا لین دین دونوں جائز ہیں۔ اگرچہ یہ فرض کفایہ ہے۔

نماز پڑھانے۔ تراویح پڑھانے یا اذان دینے کی اُجرت لینے کے لیے آپس میں اختلاف ہے۔ لیکن اس میں اُجرت لینا حرام نہیں ہے۔ لیکن وہ اُجرت اس خیال سے لی جائے کہ امام نماز کے وقت کی پابندی کرتا ہے

بلکہ نماز اور اذان کے بدلے میں نہ ہوگی۔ پھر بھی اس کی مزدوری مکروہ ضرور ہے۔

پانچواں طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی جانور کرائے پر دے، تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ شخص کتنی دیر اور کتنی دور تک سواری کرے گا، یا سامان لادے گا۔ لیکن اگر کوئی خاص کرایہ مقرر ہے، تو کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح زمین کے متعلق کہہ دینا چاہیے، کہ اس میں کون سا غلہ بوئے گا، لیکن اس کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ اگر کوئی کرایہ اس کا ہمیشہ سے مقررہ چلا آتا ہے، تو لے سکتا ہے۔ اسی طرح تمام اُجرتوں کراؤں کے متعلق نگاہ رکھنا چاہیے، تاکہ بعد میں کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو، لیکن اس کے بعد بھی اگر اُجرت کے لیے احکامات نہ معلوم ہوں تو ہرگز نہ کرے ورنہ لاعلمی میں گناہگار ہوگا۔

پانچواں طریقہ

قراض

یہ تین ارکان پر مشتمل ہے۔ پہلے سرمایہ (نقدی) مثلاً سونا چاندی یا سکہ رائج الوقت۔ لیکن چاندی کے ورق اور کپڑا اور سامان اس کے تحت نہیں آتا۔ اس کا وزن بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔ کام شروع ہونے سے پہلے عامل (کام کرنے والا) کے سپرد کر دینا ضروری ہے۔ مالک اس کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

دوسرے اس کا منافع۔ اس کی صحیح مقدار معلوم ہونا چاہیے اور طے کر لینا چاہیے۔ مثلاً آدھا۔ تہائی یا چوتھائی۔ لیکن منافع میں یہ طے کرنا کہ دس روپے میرے ہیں یا اتنے کا میں شریک ہوں، تو یہ جائز نہیں۔

قراض | تیسرے عمل۔ یعنی صرف تجارتی معاملات میں قراض ہونا چاہیے۔ پیشہ اور ہنر میں نہیں۔ اگر نانبائی کو روٹی پکانے کے لیے آٹا دے اور اس کے منافع کے دو حصے کرنا چاہے، تو جائز نہیں۔ یا تیلی سے تیل نکلوائے اور منافع میں تیل دینا چاہے، تو یہ بھی جائز نہ ہوگا۔ اگر تجارت میں یہ طے کرلے کہ یہ چیز سوائے اس آدمی کے اور کسی کے ہاتھ فروخت نہ کرے گا، یا نہ خریدے گا تو یہ شرط بھی ناجائز ہوگی۔ تنگ دلی اور تنگ ظرفی بھی معاملات میں اچھی نہیں ہوتی۔

عقدِ قراض کی تعریف یہ ہے کہ مالک اپنے حصے دار (کام کرنے والے) سے کہے کہ میں نے اتنا مال تجارت کے لیے تجھ کو دیا، تاکہ اس کا منافع آدھا آدھا یا تہائی یا چوتھائی آپس میں تقسیم کرلیں اور عامل یعنی کام کرنے والا کہے کہ مجھے اس حصے کے ماتحت معاہدہ قبول ہے۔ جب یہ عقد ہو جائے تو عامل مالک کا خرید و فروخت میں وکیل ہوگا۔ اور الگ جب چاہے تو فسخ کر سکتا ہے اور فسخ کے وقت اگر نقد سرمایہ ہو تو معاہدہ کے ماتحت روپیہ تقسیم کرلیں، اور اگر سامانِ تجارت ہو تو مالک کو دے دیا جائے۔ اس کے فروخت کرنے کی ذمہ داری کا کام

کمانے والے حصے دار پر نہ ہوگی۔ اگر عامل اس وقت فروخت کرنے پر اصرار بھی کرے تو مالک فروخت نہ کرے۔ لیکن اگر عامل کسی خریدار کو منافع کے ساتھ مال خریدنے پر ڈھونڈ لے، تو فروخت کر دیا جائے اور مال پر جس وقت منافع ہو تو عامل کو چاہیے کہ اصل سرمائے سے زیادہ کی قیمت کا مال فروخت نہ کرے، اور جب اصل لگایا ہوا سرمایہ حاصل ہو جائے تو باقی مال بقدر معاہدہ آپس میں تقسیم کر لیں اور جو مال باقی بچے، وہ عامل فروخت نہ کرے۔ تجارتی مال میں ایک سال پر قیمت کا اندازہ لگا لینا چاہیے تاکہ اس میں سے زکوٰۃ نکال دی جائے۔ عامل کے حصے کی زکوٰۃ عامل پر ہوگی، اور مالک کے حصے کی اس پر۔ درمیان معاہدہ عامل بغیر مالک کی اجازت سفر نہ کرے اگر کرے گا تو اس کے خرچ کا وہ ذمہ دار ہوگا۔ اور اگر اس کی اجازت سے جا رہا ہے، تو منجملہ تمام اخراجات کے زادِ راہ بھی مالک کے ذمہ ہوگا۔ اور درمیان سفر میں اگر اس نے اپنے استعمال کے لیے خرید لی ہیں، تو وہ سب اسی سرمایہ تجارت میں شامل ہوں گی۔

چھٹا طریقہ

شراکت

شراکت مشترک تجارت میں مال بھی مشترک ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا آپس میں چاہیے کہ ایک دوسرے اس پر تصرف کر سکیں۔ اگر دونوں برابر کے شریک ہیں، تو منافع میں بھی برابر ہی کے شریک ہوں گے اور اگر مال یا روپیہ میں کسی کا کم و بیش ہے تو اسی حساب سے منافع بھی مابین طے کر لیا جائے۔ یہ معاہدہ واپس لینا درست نہیں۔ اگر مال کے ایک شریک کو زیادہ محنت کرنا پڑے تو زیادہ منافع کا مستحق اپنے کو نہ گردانے۔ اس لیے کہ یہ حصے دار آپس میں برابر کے ہیں۔

شراکت تین قسم کی اور بھی ہوتی ہے، لیکن وہ سب ممنوع ہیں۔

پہلے وہ شرکت جو مزدوروں اور کاریگروں کے درمیان ہو، کہ جو کچھ حاصل ہو آپس میں تقسیم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ہر آدمی کی مزدوری اس کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے۔

دوسرے وہ شرکت کہ اپنا مال جو کچھ ہو وہ دوسرے کو دے دیں اور یہ طے کر لیں کہ اس میں نفع و نقصان کے آپس میں شریک ہیں۔

تیسرے وہ شرکت ممنوع ہے، جو ایک حصہ دار صاحبِ مال ہو اور دوسرا صاحبِ عزت۔ صاحبِ مال اپنا مال اس کے کہنے پر فروخت کرے، اور اس کا نفع آپس میں تقسیم کر لیں۔

صرف اتنا ہی علمِ تجارت میں جان لینا کافی ہے، اور اس کے علاوہ اگر کوئی شاذ و نادر بات دریافت کرنا

ہو تو عالمِ وقت سے دریافت کرے۔ اگر اس کو لاعلمی سے پوچھنے کی کوشش نہ کرے گا، تو خلاف شریعت اسلام ہے۔ اور وہ لاعلمی کی وجہ سے اپنے گناہوں سے بے خبر رہے گا، اور اس کی لاعلمی قابلِ معافی نہیں ہے۔

باب سوم

معاملات میں عدل و انصاف

اب تک معاملاتِ دُنیا کے ظاہری احکامات شرعِ اسلام آپ کو بتائے گئے، جیسا فتویٰ بظاہر ہم سے لیا جائے گا، وہ ہم ظاہری باتوں کو دیکھتے ہوئے دیں گے۔ لیکن اگر فتویٰ لینے والا باتیں جھوٹی بتلا رہا ہے، تو وہ گنہگار ہے کہ اس نے مُسلمانوں کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کیا۔ یہ دھوکہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک عام اور دوسرا خاص۔

عام کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل احتکار اس کو کہتے ہیں، کہ جو غلہ یا جنس اس لیے خرید کر جمع کرلے کہ گراں ہونے پر فروخت کرے گا، اس کو محتکر کہتے ہیں۔ وہ ملعون ہوتا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اس خیال سے چالیس دن غلہ اپنے پاس جمع رکھے، خداوندِ عالم اس سے ناراض ہوتا ہے اور اگر اس کے کفارے میں اسی قدر غلہ صدقے میں دے دے تو بھی پورا نہیں ہوتا اور اگر وہ غلہ وقت کی قیمتوں پر کہیں باہر جا کر فروخت کرے تو صدقہ دینے کا ثواب ملتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی ابنِ ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ جو آدمی چالیس دن منافع کی زیادتی کے خیال سے غلہ جمع رکھے، اس کا دل گناہوں سے سیاہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو ایک شخص "محتکر" کے متعلق مخبری کی، تو حکم دیا کہ اس کے اناج کو آگ لگا دو۔

روایت میں ہے کہ بزرگ نے اپنے نوکر کو غلہ فروخت کرنے کے لیے دوسرے شہر میں بھیجا۔ وہ جب وہاں پہنچا تو غلے کی ارزانی کی وجہ سے ایک ہفتے بعد اچھے منافع سے فروخت کیا اور اپنے مالک کو پورا واقعہ لکھ دیا۔ مالک نے اس کو لکھا کہ میں نے تجھ کو اسی لیے وہاں بھیجا تھا کہ غلہ کو سستے کے وقت فروخت کر دے تاکہ ثواب ملے۔ تو نے یہ گناہ کیا۔ اب اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس تمام غلے کو خیرات کر دے۔ اور پھر بھی ڈرتا ہوں کہ تو اور میں گناہ سے نجات نہ پائیں گے۔

مسئلہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ "حقوق عباد" کو مارنا ہے۔ اس لیے کہ غلہ جب مہنگا فروخت کیا جائے گا، تو ضرورت کی وجہ سے لوگ مجبوراً خریدیں گے اور وہ ایسا ہے کہ جیسے پانی کسی پر روک دیا جائے۔ اور لوگ پیاس کی وجہ سے زیادہ پانی خرید کر پئیں۔ خریدنے والوں کو تو وہ مہنگا غلہ خریدنا مباح ہوگا، لیکن فروخت کرنے والا گنہگار ہے۔ کہ اس نے سستا خرید کر جمع کر لیا اور دوسروں کو اذیت پہنچائی۔

لیکن کسان کے لیے یہ حکم صادر نہ ہوگا، وہ جب چاہے فروخت کر سکتا ہے، لیکن تاخیر نہ کرنا اس کے لیے

اچھا ہی ہوگا۔ لیکن بدل اس کی نیت بھی یہ ہونا چاہیے کہ گرانی کے وقت یہ غلہ فروخت کروں گا۔

دوسری چیزیں مثلاً دوائیں وغیرہ ہیں، اور اُن کو ہر آدمی کی ضرورت ہر وقت نہیں پڑتی۔ اُن میں احتکار کو منع نہیں کیا گیا، لیکن اناج میں احتکار حرام ہوگا، اور جو اشیاء روزانہ عوام کے استعمال میں آتی ہیں۔ مثلاً گوشت۔ ترکاری۔ گھی۔ تیل وغیرہ میں علماء کی مختلف رائے ہیں، لیکن میری رائے میں اس میں کراہت ضرور ہے۔

بلکہ اناج اگر بازار میں بآسانی ملتا ہے، تو اس کا جمع کرنا بھی ناجائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس عمل سے مخلوق کو نقصان نہیں ہوتا۔ بعض علماء ہر صورت میں مخلّے کو جمع کرنے کے مخالف ہیں۔ مگر صحیح یہی ہے کہ مکروہ ہے۔ کیونکہ بہرحال اس میں گرانی کے انتظار کی وجہ سے لوگوں کی تکلیف کا خیال ہے اور یہ بُرا ہے۔

بعض دو قسم کی تجارت کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ کھانے کے فروخت کرنے میں کمی طعام کا انتظار۔ دوسرے کفن کے فروخت میں لوگوں کی موت کا انتظار کرنا۔

اسی طرح دو پیشوں کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ پہلا قصائی، کہ اس سے دل سخت ہوتا ہے۔ دوسرے سناری کا پیشہ کہ اس سے دُنیا کی آرائش کا سبب بنتا ہے۔

سکّہ کھوٹا دینے کا گناہ مخنکر کی دوسری قسم یہ ہے کہ عوام الناس کو نقصان پہنچائے۔ مثلاً کھوٹا روپیہ، پیسہ۔ بدرے۔ اور لینے والا شناخت نہ کر سکے تو وہ گنہگار ہوتا ہے اور یا وہ خود بھی کسی دوسرے کو دھوکہ دیکر وہ سکّہ دے۔ پھر اسی طرح وہ تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو۔ اسی طرح جب تک یہ سکّہ چلتا رہے گا، اس کا گناہ پہلے آدمی کی گردن پر ہوگا۔

ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک سکّہ کھوٹا کسی کو دینا، سو سکّوں کی چوری سے زیادہ ہے۔ اس لیے کہ چوری کا گناہ اسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن کھوٹے سکّہ کا لینا دینا نہ معلوم کب تک جاری رہے اور اس کا گناہ عذابِ قبر میں شامل ہو جائے۔

سونے چاندی کے کھوٹے سکّے میں چار چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اگر کوئی سکّہ کھوٹا آجائے تو کنوئیں میں ڈال دے کھوٹا سکّہ کسی کو آگاہ کر کے بھی نہ دینا چاہیے۔

۲۔ سکّے کو دیکھنے اور پرکھنے کو سیکھ لے، تاکہ اچھا سکّہ لے، اور اگر خود نہ جانتا، تو دوسروں کو بھی کھوٹا سکّہ دے دے گا۔ اور اگر لاعلمی میں بھی کسی کو کھوٹا سکّہ دے دیگا تب بھی گنہگار ہوگا۔ اس لیے کہ کسب علم کے ماتحت یہ علم بھی ضروری ہوتا ہے۔

۳۔ کہ اگر کھوٹا سکّہ اس حدیث شریف کے ماتحت ہے۔ رَحِمَ اللّٰہُ اِمْرَءًا السَّھَلَ الْقَضَآءِ وَسَھَلَ الْاِقْتِضَآءِ تو اچھا ہے، لیکن لینے لینے کے وقت اس کو کنوئیں میں ڈال دینے کی نیت ہونا چاہیے۔ اگر دینے

والا یہ بتا دے کہ یہ اچھا نہیں ہے تب بھی نہ لے تو بہتر ہے۔

۴۔ اگر سکہ سونا چاندی کا بالکل نہ ہو تو کنوئیں میں پھینک دینا چاہیے۔ لیکن اگر وہ مخلوط ہے، مگر ٹیکسالی نہیں ہے تو اس کو کوئیں میں نہ پھینکنا چاہیے، بلکہ اس کو دیتے وقت آگاہ کر دے، یا کسی ایسے آدمی کو دے، جس پر اعتماد کلی ہو کہ یہ کسی کو دھوکا نہ دے گا، اور اگر کوئی شبہہ ہے تو اس کو نہ دے، وہ ایسا ہے کہ کسی شراب بنانے والے آدمی کے پاس انگور رکھ دیئے جائیں، یا کسی ایسے آدمی کو ہتھیار دے دیئے جائیں کہ وہ چوری کرنے کے لیے ان کو استعمال کرے گا۔

(نوٹ) بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ معاملات لین دین میں امانت سے کام لینے والا آدمی عابد سے زیادہ بہتر ہے۔

معاملات خاص دوسری قسم

ہر وہ معاملہ جس سے کسی کو نقصان پہنچے، وہ ظلم کہلاتا ہے۔ اور وہ حرام ہے۔ مختصر یہ کہ جو کام تم خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے، وہ دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرو، اور اگر کرو گے تو ایمان میں کمی کا باعث ہے۔ وہ چار حالتوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ کسی چیز کو مبالغے کے ساتھ بیان نہ کرو۔ کیونکہ یہ دھوکہ ہے، اور اگر خریدار اس چیز سے واقف ہے تو بالکل بتلانے کی ضرورت نہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ہر آدمی سے ہر بات کے لیے سوال ہوگا۔ اور اگر غلط بات کہی ہے، تو اس کو معاف نہ کیا جائے گا۔ جھوٹی قسمیں کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اگر کسی چھوٹی سی چیز کے لیے بھی خدا کی قسم کھائی، تو بھی بے ادبی ہے۔

(مسئلہ) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ سوداگروں پر حیف ہے لَا وَاللّٰہِ وَبَلٰی وَاللّٰہِ اور اگر کوئی آدمی اپنا مال خدا کو درمیان میں دے کر فروخت کرے گا تو بروز قیامت اس کی طرف متوجہ ہوگا۔

(حدیث) روایت ہے کہ حضرت یونس بن عبید ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ وہ کبھی اپنے ریشم کی تعریف نہ کرتے تھے۔ ایک دن اپنا ریشم نکال رہے تھے کہ ایک شاگرد نے خدا سے ریشمی کپڑے کی دعا کی، تو آپ ناراض ہوئے اور اس کو فروخت نہ کیا، اس خوف سے کہ یہ جملہ میرے مال کی تعریف میں ہے۔

۲۔ اگر تیرے مال میں کسی قسم کا نقص ہے تو وہ گاہک کو صراحتاً بتادے، ورنہ دغابازی ہے، اور اگر اندھیرے میں دکھائے گا یا اوّل نمونہ اچھا دکھا کر مال دوسرا دے گا، تو بھی بے ایمانی ہے۔

(واقعہ) ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک گیہوں کی دکان کی طرف تشریف لے جارہے تھے حضورؐ نے اس ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈالا تو وہ بھیگے ہوئے تھے، تو اس نے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ حضورؐ بھیگے ہوئے گیہوں ہیں، تو حضورؐ نے ارشاد کیا کہ ان کو باہر کیوں نہیں نکالا؟ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا (یعنی بے ایمان

آدمی ہم سے نہیں ہے)

ایک آدمی نے اپنا اونٹ تین سو روپیہ میں فروخت کیا۔ اس کے پیر میں کچھ نقص تھا۔ اس وقت ایک صحابی پاس ہی کھڑے تھے۔ جب آپ کو اس کا نقص معلوم ہوا، تو خریدار کے پاس دوڑے اور وہ نقص اس کو جتائے اس نے واپس آ کر وہ اونٹ واپس کر دیا۔ سوداگر نے آپ سے شکایت کی، تو فرمایا کہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو آدمی مال کا نقص بتائے بغیر فروخت کر دے وہ بے ایمان ہے۔ اور جس کو یہ نقص معلوم ہو، اس کو بھی بتا دینا چاہیے حضُورؐ نے ہم سے وعدہ لیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو راہِ راست پر لائیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی تجارت اچھی نہیں۔ اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ

۱۔ خراب مال ہی نہ خریدے، اور اگر خریدے تو اس کے عیوب کو پیشِ نظر رکھ لے، اور اگر وہ خود دھوکہ کھا گیا ہے تو اپنے آپ نقصان برداشت کر لے۔ دوسرے خریدار کو وہ مال نہ دے۔ اس لیے کہ وہ خود جھوٹے اور بے ایمان پر لعنت کرتا ہے۔ اگر خود ویسا ہی کرے گا، تو اپنے اوپر لعنت کا وہ خود سبب بنے گا۔

(واقعہ) ایک آدمی پانی میں دُودھ ملا کر فروخت کرتا تھا۔ ایک بار سیلاب آیا اور اس کی گائے بھینس سیلاب میں بہہ گئیں۔ اس کے بیٹے نے اس سے کہا کہ یہ پانی وہ تھا، جو ہم دُودھ میں ملاتے تھے۔ وہ اتنا جمع ہو گیا تھا کہ اکٹھا ہو کر سیلاب بن گیا۔

(حدیث) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جب کسی تجارت میں بے ایمانی کا خیال ہوتا ہے، تو برکت اُٹھ جاتی ہے۔

برکت اُسے کہتے ہیں، کہ آدمی کے مال سے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ اور خود اسے بھی زیادہ سے زیادہ منافع ہو۔ بعض آدمیوں کے پاس مال تو بہت ہوتا ہے، مگر وہ مال کی زیادتی ہی اس کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ لیکن اس کو خبر نہیں ہوتی، کہ یہ تباہی بے برکتی کی وجہ سے تھی۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ برکت طلب کرے، اور برکت ایمانداری سے آتی ہے۔ جو آدمی امانت دار مشہور ہو جاتا ہے، اس کے پاس لوگ زیادہ آتے ہیں۔ اور جب زیادہ آئیں گے تو منافع بھی زیادہ ہوگا۔ یہ ہی برکت کا باعث ہے۔

اسی طرح جو آدمی بے ایمان اور خیانت دار ہے، اس سے لوگ پرہیز کریں گے۔ اور اس کا مال جب کم فروخت ہوگا تو منافع بھی کم ہوگا، اور جب منافع کم ہوگا تو یہی بے برکتی کی علامت ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ ہر کام آخرت کو یاد کر کے کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو بے ایمانی سے باز رہے گا۔

حضُورؐ کا ارشاد ہے کہ مخلوق لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے کی وجہ سے خداوندِ عالم کے غضب سے محفوظ ہے۔ اور جو لوگ دُنیا کو دین پر مقدم رکھتے ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں، تو خدا ان سے کہتا ہے، تُم جھوٹے ہو!

پیشے اور ہنر کے متعلق واقعہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح تجارت میں دغا بازی کرنا حرام ہے اسی طرح پیشے اور ہنر میں بھی ناجائز ہے۔ اگر کرے بھی تو اس کو لوگوں سے چھپائے۔

کسی نے حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ سے دریافت کیا کہ رفو کرنے کا پیشہ کیسا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ صرف اپنے لیے رفو کر سکتا ہے۔ مزدوری کے لیے اچھا نہیں۔ جو آدمی دھوکہ دینے کے لیے رفوگری کرے وہ گنہگار ہوتا ہے، اس کی مزدوری حرام ہے۔

تیسرے مقدار، تول اور تعداد میں بے ایمانی نہ کرے۔ خداوند عالم فرماتا ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (یعنی اُن لوگوں پر افسوس ہے جو کم تولتے ہیں) اور لینے میں تو زیادہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

عمل آنحضرتؐ کا واقعہ بیوقوف وہ آدمی ہے، جو ذرا سی چیز کے عوض بہشت کو فروخت کر دیتا ہے۔ اور تھوڑے سے مال کے عوض نیکی کو فروخت کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی کوئی چیز خرید فرماتے تو دوکاندار کو حکم دیتے کہ سچ بول اور پورا تول!

بزرگوں نے کہا ہے کہ جو آدمی لیتے وقت، دوسری ترازو سے تولتا ہے، اور دیتے وقت دوسری سے۔ اور جو آدمی کپڑا خریدتے وقت، ذرا ڈھیل دے کر ناپتا ہے اور فروخت کے وقت ذرا کھینچ کر۔ اور وہ قصاب جو بیکار ہڈی کا گوشت کے ساتھ تولتا ہے، اور جو آدمی غلے میں مٹی ملا کر فروخت کرتا ہے، وہ سب حرام فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جو آدمی اپنے لیے کوئی بات پسند نہ کرے، وہ دوسرے سے بھی نہ کہے۔ یہ بھی ایک قسم کے لین دین میں آتا ہے۔ اپنے کو کسی سے بلند نہ سمجھے۔ یہ بات بظاہر بہت مشکل ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (یعنی متقی آدمیوں کا گذر دوزخ پر سے جلد ہو جائے گا)

چوتھے، مال کے بھاؤ کو نہ چھپائے، جو عام بھاؤ ہے۔ آنحضرت نے اس کے لیے خاص طور پر منع فرمایا ہے، کہ اگر کوئی قافلہ شہر میں داخل ہو کر کسی دوکاندار سے مال خریدے، لیکن اگر وہ بازار کا بھاؤ اس خیال سے نہ بتائیں کہ اس سے سستا لے لیں گے، تو اس وقت دوکاندار کو اختیار ہے کہ وہ اپنا مال فروخت نہ کرے اور اگر کوئی آدمی سستا مال خرید کر کہیں سے لائے اور کوئی دوکاندار اس سے یہ کہہ کر مال مانگے کہ جب مہنگا ہو گا تو فروخت کر دوں گا۔ اس کے لیے بھی آنحضرتؐ نے منع فرمایا ہے۔ کسی شخص نے ظاہری طور پر گراں مال خریدا تاکہ دوسرے لوگ اس کو سچا سمجھ کر گراں قیمت پر ہی خریدیں، یہ بھی منع ہے۔ اور جب کسی نے مال والے سے اس طرح دھوکے میں آ کر مال خرید لیا ہے اور بعد میں اس کو معلوم ہو گیا ہے تو اس کو اختیار ہے، کہ وہ خریدا ہوا مال، واپس کر دے۔ بعض، آدمی آپس میں کئی مل کر اپنے ہی مال کی قیمت لگا کر بڑھا دیتے ہیں، یہ قطعی ناجائز ہے۔

اور اگر کوئی سیدھا آدمی بھاؤ کی لاعلمی کی بِنا پر اپنا مال سستا فروخت کر رہا ہو تو اس سے نہ خریدنا چاہیے۔ اگر کسی دوکاندار نے بازار سے زیادہ پر مال خریدا ہے اور اس کو اِس نرخ سے فروخت کر رہا ہے، تو یہ اچھا نہیں۔ حالانکہ بعض علماء اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

حکایت | ایک سوداگر بصرے میں تھا، اُس کے ملازم نے اس کو لکھا کہ اس سال شکر کافی گراں ہو جائے گی۔ لہٰذا جلد از جلد زیادہ سے زیادہ خرید لی جائے۔ سوداگر نے خرید کر لی، اور مہنگا ہونے پر فروخت کی تو تیس ہزار درہم کا منافع ہوا۔ لیکن پھر سوچا کہ میں نے ایک مسلمان کو دھوکا دیا اور شکر کی گرانی کے لیے اس کو نہ بتایا۔ لہٰذا اپنے منافع کا سب روپیہ لے کر اس سوداگر کے پاس پہنچا اور کہا کہ یہ تمھارا روپیہ ہے۔ سوداگر نے حیران ہو کر دریافت کیا۔ تب اس نے پورا قصہ بیان کر دیا۔ سوداگر یہ سُن کر خوش ہوا اور اس کو سب روپیہ معاف کر دیا۔ جب واپس ہوا تو سوچا ہو سکتا ہے کہ اس نے لحاظ کی وجہ سے روپیہ لینے سے انکار کیا ہو۔ چنانچہ دوبارہ پھر گیا اور اِنتہائی اصرار کر کے روپیہ دے دیا۔

پس سوداگر کو چاہیے کہ اپنے مال کی قیمت صحیح اور ٹھیک بتا دے، اور اگر اس میں کوئی نقص ہو تو وہ بھی بتا دے، اور اگر اس نے اتفاقاً وہ مال مہنگا ہی خریدا ہے، تو یہ بھی بتا دے۔ اگر کسی مال کی قیمت دس دینار بتا کر دے، اور وہ دس دینار میں نقد فروخت نہ ہو سکے، تو یہ بھی درست نہیں۔ اگر کوئی مال سستے کے وقت کا خریدا ہوا رکھا ہو، تو گاہک کو اس کی پچھلی قیمت سے بھی آگاہ کر دے۔ اس کی تفصیلات بہت ہیں اور سوداگر زیادہ تر اس مسئلے میں خائن ہوتے ہیں۔ اور اس مسئلے میں اپنے کو بے ایمان نہیں سمجھتے۔ لیکن اُن کو یہ معیار بنا لینا چاہیے کہ جو خود نہ پسند کریں اس کی دوسرے سے بھی اُمید نہ کریں۔

جو آدمی اس سے مال خرید رہا ہے وہ اس پر اعتماد کر کے خریدتا ہے اور اس سے زیادہ قیمت پر مال فروخت کرنا دغابازی ہوگا۔

چوتھا باب

تجارت میں اِحسان اور نیکی سے پیش آنا

خداوند عالم نے جس طرح عدل کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح احسان اور نیکی کرنے کا حکم دیا ہے، وہ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (یعنی خداوندِ عالم عدل واحسان کا حکم دیتا ہے) پچھلے باب میں ہم نے عدل کے متعلق سب کچھ لکھ دیا ہے، تاکہ آدمی ظلم سے بچا رہے۔ اب ہم احسان کے متعلق لکھتے ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (یعنی خداوندعالم کی رحمتیں احسان کرنے والوں کے قریب ہیں) جو آدمی عدل کرتا ہے، وہ دین میں اپنے لیے جگہ بناتا ہے۔ لیکن احسان میں اپنا فائدہ بھی ہے عقلمند آدمی وہ ہے

جو آخرت کے لیے ہر بات میں فائدہ سوچے ۔ اِحسان ایک وہ نیکی ہے جو تجارتی معاملات میں مفید ہوتی ہے ۔

اِحسان کے چھ درجات ہیں :

ا ۔ زیادہ منافع کو اچھا نہ سمجھے ، چاہے خریدار ضرورت کی شدّت کی بنا پر راضی بھی ہو جائے ۔ حضرت سقطی رحمۃ اللہ علیہ سوداگری کیا کرتے تھے ، اور پانچ فی صدی سے زیادہ نفع نہ لیتے تھے ۔ ایک بار آپ نے ساٹھ روپے کے بادام خریدے ، اور بعد میں باداموں کی قیمت چڑھ گئی ۔ ایک ایجنٹ نے آپ سے بادام لیے ، تو آپ نے اس سے تریسٹھ روپیہ میں فروخت کرنے کا حکم دیا ۔ اس نے کہا کہ آج کل تو ان کی قیمت نوّے روپیہ ہے ، تو آپ نے فرمایا کہ میں پانچ فیصدی سے زیادہ منافع نہ لوں گا ۔ ایجنٹ نے کہا کہ میں بھی آپ کا مال کم قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہتا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے کم قیمت پر لیے نہیں اور آپ نے زیادہ قیمت پر دیئے نہیں ۔

محمد بن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگوں میں سے گزرے ہیں ۔ آپ کپڑے کی دکان کیا کرتے تھے ۔ کچھ کپڑا پانچ روپیہ قیمت کا تھا اور کچھ دس روپیہ تھان کا ۔ ایک بار آپ کے ایک شاگرد نے پانچ روپیہ تھان کو دس روپیہ میں فروخت کر دیا ۔ آپ کو واپسی پر جب واقعہ معلوم ہوا ، تو اعرابی کو تلاش کیا اور اس سے کہا ۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے بخوشی اس قیمت پر خریدا ہے ۔ تو آپ نے جواب دیا کہ جو بات میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ کسی دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کروں گا ۔ اب یا تو وہ پانچ روپیہ واپس لے ، یا کپڑا دس روپیہ کی قیمت کا مجھ سے لے لے ۔ اعرابی نے پانچ روپیہ واپس لے لیے ، اور آپ کے جانے کے بعد لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون بزرگ ہیں ، تو لوگوں نے نام بتایا ۔ کہ سُبحان اللہ ! یہ وہ شخص ہے کہ اگر بارش کے لیے دُعا کرتے وقت ان کا نام لے دیا جائے تو بارش ہونے لگے ۔ بزرگانِ دین کے شوقین تھے ، اور کم منافع پر تجارت کیا کرتے تھے

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کوفے کے بازار کے دوکانداروں سے فرماتے ، کہ کم منافع کے گاہکوں کو واپس نہ کرو ۔ ورنہ زیادہ منافع نہ ہوگا ۔ لوگوں نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ، سے دریافت کیا کہ آپ کی امارت کا کیا سبب ہے ، تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے کم از کم منافع کے گاہک کو بھی واپس نہیں کیا ۔ اور اگر کوئی صرف ایک جانور ہی لینے آیا تو بھی فروخت کر دیا ۔ ایک بار ایک ہزار اونٹ بغیر کسی منافع کے فروخت کر دیے ۔ سوائے اُن ایک ہزار رسیوں کے جن میں وہ بندھے ہوئے تھے ، کوئی منافع نہیں لیا وہ رسیاں ایک ایک روپیہ پر فروخت کیں ، اور اس کی قیمت سے چارے کا خرچ جو میں نے اپنے پاس سے صرف کیا تھا نکل آیا ۔ اور منافع بھی ہُوا ۔

دوسرے یہ کہ غریبوں سے سامانِ تجارت گراں خریدے تاکہ اُن کو منافع ہو ۔ بیواؤں سے سُوت خریدنا اور بچوں سے میوہ خریدنا صدقے سے زیادہ افضل ہے ، جو آدمی یہ عمل کرتا ہے ۔ آنحضرتؐ اس کے لیے دُعا فرماتے

ہیں حضورؐ کا ارشاد ہے۔ رَحِمَ اللّٰہُ اِمْرَءً اَسْہَلَ الْبَیْعَ وَسَہْلَ الشِّرٰیِ (یعنی خداوند عالم اس پر رحم کرتا ہے، جو خرید و فروخت کو آسان کر دیتا ہے) رو سار سے مال خریدنا یا اُن کے ہاتھ فروخت کرنا کوئی ثواب نہیں رکھتا، بلکہ اُن سے ضد کر کے سستا مال خریدنا اچھا ہے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، سستا خریدنے کی کوشش کرتے، تو لوگوں نے عرض کی، یا حضرت! آپ روزانہ کتنی ہزار درہم خیرات کرتے ہیں اور سودا خریدنے میں اتنی جانچ پڑتال کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہم جو کچھ دیتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں دیتے ہیں۔ اور اس کے لیے جو بھی دیں وہ کم ہے۔ لیکن تجارت میں نرخ سے زیادہ پیسہ دینا عقل و دماغ کی کمزوری ہے۔

تیسرے۔ قیمت لینے میں۔ اس میں تین احسانات ہیں۔

ایکؔ کم کرنا۔ دوسراؔ ٹوٹا اور کھوٹا روپیہ لینا۔ سوؔم مہلت دینا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو آدمی آپس میں لین دین کو آسان کرتا ہے، خداوند عالم ہر کام آسان کر دیتا ہے۔ درویش کو قیمت دینے سے زیادہ کوئی کام احسان نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس قیمت نہیں ہے، تو ضرور مہلت دینا چاہیے۔ یہ احسان میں داخل نہیں، بلکہ عدل ہو گا۔ لیکن اگر خریدار غریب ہے اور اپنی کوئی چیز ارزانی کی وجہ سے فروخت کرنے سے قاصر ہے، تو اس کو قیمت میں مہلت دینا احسان میں داخل ہے۔ اور صدقہ عظیم المرتبت ہو گا —— آنحضرتؐ کا ارشاد ہے، کہ روزِ قیامت ایک ایسا آدمی بارگاہِ خداوندی میں پیش کیا جائے گا، کہ جس نے عمر بھر کوئی نیکی نہ کی ہو گی۔ اس سے خطاب ہو گا کہ تُو نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی۔ تو جواب دے گا کہ ہاں! مگر میں نے اپنے پسماندگان کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ میرے قرضخواہوں کو اگر وہ ادائیگی سے معذور ہوں تو تنگ نہ کرنا، اور مہلت دینا۔ پس ندا آئے گی کہ آج تو ہمارا مقروض ہے، تو کیوں نہ ہم بھی تجھ کو مہلت دیں۔ اس کے بعد اس کو بخش دیا جائے گا۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو آدمی کسی کو قرضِ حسنہ دیتا ہے، اور جتنے دنوں کی اس کو مہلت دیتا ہے۔ پس اس کو صدقے کا ثواب ملتا ہے اور وعدے کے بعد کا وقت جو مہلت میں چھوڑتا ہے۔ اس کا اتنا ثواب ہے کہ گویا اس نے اپنی وہ پوری رقم قرضے میں دے دی۔

ایک بزرگ قرض دے کر واپس لینا پسند نہ کرتے تھے، تاکہ وہ ثواب صدقے میں لکھا جائے۔ تو سرورِ کائناتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقے کا ایک روپیہ دس روپیہ کے برابر ہے، اور قرضِ حسنہ کا ایک روپیہ اٹھارہ روپوں کے برابر ہے، کہ قرض حاجت مند ہی لیتا ہے اور صدقہ ہو سکتا ہے، کہ غیر مستحق آدمی کو دے دیا جائے۔

چوتھے - قرض کی اَدائیگی - چاہیے کہ تقاضے سے پہلے قرضہ ادا کر دے ۔ قرضہ میں کھرا سکّہ دینا چاہئے اور اپنے ہاتھ سے ادا کرنا چاہیے - حدیث میں ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے ، جو قرضہ بآسانی ادا کرتا ہے ۔ اور جو آدمی قرض اچھی نیت سے لیتا ہے ، تو اس پر چند فرشتے مقرر کر دیئے جاتے ہیں ، تاکہ اس کی اَدائیگی کی دُعا کرتے رہیں ۔ اگر قرضدار کے پاس روپیہ ہو اور بغیر رضامندی قرضخواہ دیر کرے گا ، تو وہ ظالم اور گنہگار ہوتا ہے ۔ چاہے وہ روزے دار ہو ، نماز میں مشغول ہو یا جواب میں وہ اتنی دیر لعنت میں گرفتار رہے گا ۔ اور یہ گناہ اس کے سوتے میں بھی اس کے ساتھ رہے گا ۔ اور اگر اس کے پاس نقدی موجود نہ ہو تو اپنی کوئی شئے فروخت کر کے ادا کر دے ۔ یا قرضخواہ کو کھوٹا سکّہ دے ، جس کو وہ لینے سے جھجکے تو بھی گنہگار ہو گا ، اور جب تک وہ بخوشی اس کو معاف نہ کر دے وہ گنہگار ہی رہے گا ۔ یہ معمولی گناہ نہیں ہے ، بلکہ گناہِ کبیرہ ہے ۔

پانچواں یہ کہ ، اگر کسی سے تجارت کرے اور وہ اس تجارت سے شرمندہ ہو تو معاملہ ختم کر دے ۔ آنحضرتؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے ، کہ جو آدمی بیع کو ختم کر دے اور یہ سوچ لے کہ میں نے بیع کی بھی نہ تھی ، تو خداوندِ عالم اس کو بے گناہوں میں شمار کرتا ہے ۔

یہ امر واجب تو نہیں ہے ، لیکن احسان اور ثواب میں داخل ہے ۔

چھٹے یہ کہ اگر کوئی چیز کم تعداد میں ہو اور غرباء کے ہاتھ قرض تقسیم کرے کہ جب ان کے پاس ہو گا ، قیمت لے گا ۔ یا اگر وہ غربت میں ہی مر جائے گا تو معاف کر دوں گا تو یہ عین ثواب ہے ۔

دین کی کسوٹی دراصل دُنیا ہی ہے ۔ اگر کسی آدمی نے ایک روپیہ جو مشتبہ ہے ، نہ لیا تو وہ دین میں داخل ہے ۔

باب پنجم

تجارت میں دین کا خیال رکھنا

جو آدمی تجارت میں دین کو بھلا دیتا ہے ، وہ بدبخت ہے ۔ وہ ایسا ہی ہے ، جیسے کوئی سونے کا پیالہ لے لے ۔ دُنیا بالکل مٹّی کے پیالے کی طرح ہے ، جو جلد ٹوٹنے والا ہے ، اور سونے کا پیالہ آخرت ہے ، جو دیرپا خوبصورت اور غیر فانی ہے ۔ تجارت دُنیا کو زادِ آخرت بھی بنانا اچھا نہیں ، بلکہ آدمی کی نیت دوزخ سے نجات حاصل کرنا ہو ۔ کیونکہ اس کا سرمایہ حیات دین اور آخرت ہی ہے ۔ ہمہ تن تجارت یا زراعت ہی میں منہمک ہونا اچھا نہیں ۔ تجارت دُنیا میں سات احتیاطیں برتنا ضروری ہیں ، جو دین کا راستہ دکھاتی ہیں ۔

اوّل یہ کہ بازار سودا خریدنے اس نیت سے جائے کہ دل میں طمع دنیا نہ ہو ، بلکہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی نیک پرورش اور بے نیازیِ دنیا ہو ، اور مال سے فراغت حاصل کر کے خدا کی عبادت میں مشغول ہوں ——— امانت داری اگر دل میں ہو گی ، تو نقصان اُٹھائے گا ۔

دوم یہ سمجھے، کہ اگر دُنیا میں سینکڑوں اس کے کاموں میں مشغول نہ ہوں تو ایک دن بھی زندگی گزارنا دوبھر ہو جائے گی۔ جیسے نانبائی۔ کسان۔ جولاہا۔ لوہار اور دوسرے پیشہ ور لوگ۔ یہ سب اہلِ ہنر اس کے لیے کام کرتے ہیں اور یہ قرینِ انصاف نہیں، کہ اتنے آدمی اس کے کام میں لگے رہیں، اور اس کو نفع پہنچائیں۔ لیکن وہ کسی کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہو۔

یہ نیت کرکے جائے کہ مسلمانوں کی فلاح کے لیے ہر کام کروں گا، جیسا کہ دوسرے مسلمان مجھے فائدہ پہنچاتے ہیں۔

تمام پیشے فرضِ کفایہ ہیں، مگر سُناری اور نقاشی وغیرہ زیبائشِ دُنیا کے باعث ہیں۔ لہٰذا ان پیشوں کا نہ کرنا ہی بہتر ہے، لیکن مباح ہے۔ مردوں کے لیے ریشمی لباس بنانا اور سونے کے زیورات بنانا ناجائز ہیں۔ اناج فروخت کرنا۔ کفن بیچنا اور قصابی و زرگری و ندافی کا کام بھی اسلاف نے مکروہ گردانا ہے۔ اس لیے کہ پیشہ ور اپنے کو سود خواری سے بمشکل بچا سکتے ہیں۔ اسی طرح جراحی، کہ زخم کا علاج صرف اُمید پر کیا جاتا ہے۔ خاکروبی اور چمڑہ پکانے کے کام کو بھی مذموم قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں کپڑے پاک نہیں رہ سکتے اور آدمی ذلیل طبیعت بھی ہو جاتا ہے۔ ساربانی اور سائیسی بھی اسی مد میں آتی ہے۔ دلالی بھی مذموم ہے۔

سب سے بہترین تجارت بزازی ہے اور سب سے بہترین پیشہ مشکیزہ وغیرہ سینے کا کام ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر جنت میں تجارت ہوتی تو بزاز کی تجارت ہوتی، اور اگر دوزخ میں ہوتی، تو صرافی ہوتی۔

چار پیشے ذلیل خیال کیے جاتے ہیں۔ کپڑا بُننا۔ نان فروشی۔ سوت کاتنا اور معلّمی۔

معلّمی اس لیے کہ اس میں لڑکوں اور عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ کم عقل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی صحبت بھی کم عقل بنا دے گی۔

تیسرے یہ کہ بازارِ آخرت پر بازارِ دنیا کو ترجیح نہ دے۔ بازارِ آخرت مساجد ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (یعنی خبردار ایسی تجارت نہ کرو کہ خدا کو بھول جاؤ) کیونکہ اس سے تم نقصان میں رہو گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ اے تجارت کرنے والے دُنیا کا پہلا حصّہ آخرت کے کاموں میں صرف کر اور بعد کا دنیا کے کاموں کے لیے۔ بزرگانِ دین ہمیشہ صبح سے شام تک آخرت کے کاموں میں مسجدوں اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، یا علمی محافل سرگرم رہتیں۔ ہریسہ اور بھنی ہوئی سیریاں ذمّی لوگ بیچا کرتے جبکہ یہ لوگ مسجدوں میں جمع ہوتے۔

(حدیث) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ خداوندِ عالم اس شخص کو گناہ معاف کر دے جس نے روزے میں صبح و شام نیک عمل کیے۔ جب صبح و شام کے فرشتے اکٹھا ہوتے ہیں۔ تو خداوندِ عالم دریافت کرتا ہے کہ تم نے میرے بندوں

کو کیا کرتے دیکھا؟ فرشتے جواب دیتے ہیں، کہ وہ تیری عبادت کرتے تھے۔ تو ندا آتی ہے کہ میں تم کو گواہ کر کے وعدہ کرتا ہوں کہ اُن کے سب گناہ بخش دیئے۔

پس چاہیے کہ جس وقت آذان کی آواز کان میں پڑے تو فوراً کارِ دُنیا چھوڑ کر مسجد کی طرف بھاگو۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ لوہار اگر ہتھوڑا اُٹھا چکا ہو تو لوہے پر نہ مارے اور رکھ دے۔ اگر موچی چمڑے میں سوا ڈال چکا ہے، تو اس کو اسی طرح چھوڑ کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائے۔

چوتھے۔ بازار میں بھی خداوند عالم کی عبادت اور اس کا نام لینا نہ بھولے، تاکہ جو وقت گزرے وہ اچھا گزرے غفلت شعاروں کو اطاعت خدا کی تلقین دینا اور زیادہ باعثِ ثواب ہے۔

(حدیث) رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جاہلوں میں خدا کا ذکر ایسا ہی ہے، جیسے سُوکھے پتوں میں درخت کا سبز پتہ۔ اور زندوں میں۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ بازار کے جاتے وقت یہ دُعا پڑھو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ تمہارے اعمال میں نیکیاں ہزاروں کی تعداد میں لکھی جائیں گی۔

(واقعہ نصیحت) ایک دن حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بہت سے اطاعت شعار آدمی بازار میں بھی ایسے ہیں، جو صوفیوں کو کان پکڑ کر اٹھا دیں اور ان کی جگہ خود لے لیں۔ میں بازار کے ایسے آدمی سے بھی واقف ہوں، جو روزانہ تین سو رکعت نماز اور تیس ہزار تسبیح کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی دین کے لیے روزی کمانا چاہتا ہے، اس میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ورنہ نہیں۔

پانچویں یہ کہ، تجارت کے لیے بیکار لمبا سفر نہ کرے۔ بازار میں زیادہ ٹھہرنے کی کوشش نہ کرے۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ شیطان کا ایک بیٹا جس کا نام زلنبور ہے، وہ ہر وقت بازار میں لوگوں کو بے ایمانی اور مکر و فریب کی طرف رجوع کراتا رہتا ہے۔

(حدیث) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دُنیا میں سب سے بدترین جگہ بازار ہے۔ اور سب سے بدترین شخص وُہ ہے جو سب سے پہلے آتا ہے اور سب سے آخر میں واپس ہوتا ہے۔ لہٰذا دُکانداروں کو چاہیے کہ صبح اُٹھ کر اوّل عبادت خدا بجا لائیں اور دوپہر کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر دُکان جا کر کھولے۔ اور جس وقت اپنی فراغت کے موجب نفع کما لے تو دُکان بند کر دے، اور عبادت خدا میں مشغول ہو جائے۔

(واقعہ نصیحت) امام ابوحنیفہ کے استاد حضرت حماد بن سلمہ برقعوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ جب دو حصے نفع حاصل کر لیتے تو گھر واپس آجاتے۔ ایک دن ابراہیم بن بشار نے ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آج میں مٹی فروخت کرنے جا رہا ہوں۔ تو فرمایا تم روزی کی تلاش میں جاؤ۔ مگر موت تم کو ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ تم کو

نہ چھوڑے گی۔ اور تم اپنی خواہش کے پیچھے پڑے رہو گے۔ غالباً تم نے کسی حریص کو محروم اور سست کو مالدار نہیں دیکھا ہوگا۔ ابنِ بشار نے جواب دیا کہ میری کمائی میں صرف ایک درہم میرے پاس ہے۔ وہ بھی ایک شخص پر قرض ہے۔ ابراہیم ادہم نے فرمایا کہ افسوس کہ تمھارے پاس ایک درہم ہو اور پھر بھی تجارت کرو۔ پہلے زمانے کے لوگ سو دن سے زیادہ بازار میں نہ جاتے تھے، اور جو جاتے، تو نماز ظہر سے پہلے واپس آجاتے۔ اور جب خرچ کے موجب کما لیتے، تو مسجد میں جاکر عبادت کرتے۔

چھٹے یہ کہ شبہہ والی تجارت سے بچا رہے اور اگر کسی کام میں کراہت ہو تو بھی نہ کرے۔ ظالموں سے کبھی سودا نہ کرے۔ کیوں کہ اگر وہ قرضخواہ ہی مر گیا، تو تجھ کو اس کی موت کا افسوس ہوگا، اور ظالم کی موت پر افسوس کرنا گناہ ہے اور اگر ظالم سے تجارت کرے گا، تو اس کے ظلم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ مختصر یہ ہے کہ نیک آدمی سے خرید و فروخت کرو۔ پہلے زمانے میں لوگ اچھے آدمیوں کو ڈھونڈ کر معاملات کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آجائے کہ تجارت کرنا ہی اچھا نہ ہو۔ یہ زمانہ سلف کے لوگوں کا قول تھا۔ غالباً ہمارے زمانے کے متعلق ہی اُنھوں نے پیشین گوئی کی ہو۔ لوگ بے ایمانی اور دغا بازی میں دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ناقص علم والوں کا مقولہ ہے کہ دُنیا کا ہر مال ایک رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ جس میں احتیاط ناممکن ہو گئی ہے اور وہ سب حرام ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس کے متعلق تفصیل "حرام و حلال" کے باب میں بیان کریں گے۔

ساتویں یہ کہ، تجارت کے لین دین میں حسابات دُرست رکھے، اور ایمانداری پر قائم رکھے۔ اس لیے کہ بروزِ قیامت سب لوگوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر کے حساب ہوگا۔

(واقعہ) ایک بزرگ نے ایک تاجر کو خواب میں دیکھا، تو اس سے دریافت کیا کہ تیرے ساتھ کیا عمل کیا گیا۔ اس نے جواب دیا کہ پچاس ہزار صحیفے مجھے عنایت ہوئے، تو میں نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ یہ کس کے ہیں۔ وہاں سے جواب ملا کہ تُو نے پچاس ہزار آدمیوں سے معاملت کی ہے۔ ان سب کے عوض ایک کتاب مجھے ملی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے فعل کا مواخذہ ادا کرے گا۔ اور جب تک اس سے ادائیگی نہ ہوگی، بخشش نہ ہوگی۔

تجارت کرنے میں پہلے لوگ ہمیشہ دین و شریعت کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ لیکن اب لوگوں نے اس کو فراموش کر دیا ہے۔ پس جو آدمی اُن احکاماتِ سنّت میں سے ایک پر بھی عمل کرے گا وہ ثواب دارین حاصل کرے گا۔

(حدیث) حدیث شریف میں ہے کہ رسُولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج کل جتنی احتیاط تم لوگ برتتے ہو، ایک زمانے اگر اس کے مقابلے میں دسواں حصّہ بھی کی جائے گی تو بھی اس کے برابر ہوگی۔ تو صحابہ کرام نے وجہ دریافت کی حضورؐ نے جواب دیا کہ تمھارے سامنے خدا کی راہ بتانے والے لوگ

موجود ہیں، لیکن وہ بیکس ہوں گے۔ لہٰذا ہم کو ناامید نہ ہونا چاہیے، بلکہ حتی الامکان کوشش کرے کہ کوئی پیشہ حرام کا حاصل نہ کر سکے۔ اگر آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہے، تو یقیناً نیک کام کرے گا، اور نیکیاں درویشی میں مضمر ہیں۔ اور وہ فقر کتنا اچھا ہے، جس میں آدھی بادشاہت پوشیدہ ہو۔ مالِ دُنیا جمع کرنے میں سوائے نقصان کے کچھ نہیں۔ اس لیے کہ اگر مال جمع کیا اور مر گیا تو سب ضائع ہوا۔ اور مالِ آخرت جمع کر کے مرا تو سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا۔

چوتھا اصول

حلال و حرام

(حدیث) ہمارے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ (یعنی مسلمانوں کے لیے حلال مال کمانا فرض ہے، اور جب تک حلال مال اور حرام میں تمیز نہ ہوگی اس وقت تک اس کو کیسے پہچان پائے گا۔ لہٰذا اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کی تفصیل تو ہم نے "احیاء العلوم" میں بیان کر دی ہے۔ اگر تفصیلات پڑھنا ہیں، تو اس کو پڑھو۔

اس کتاب میں حلال و حرام کو چار باب کے ماتحت بیان کرتے ہیں:

پہلا باب، کسبِ حلال کی فضیلت۔ دوسرا باب، حلال و حرام کے مدارج۔ تیسرا باب، حلال و حرام میں تمیز کرنا۔ چوتھا باب، بادشاہ سے وظیفہ لینا اور وہاں حاضری دینا۔

پہلا باب

کسبِ حلال کی فضیلتیں

خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (یعنی اے رسول نیک کام کرو اور حلال روزی کھاؤ) ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسبِ حلال تمام مسلمانوں پر واجب ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ جو آدمی حلال روزی کھاتا ہے، اس کا دل نور سے معمور ہوتا ہے اور حکمت و عقلمندی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔

روایت میں ہے، دوستیِ دنیا سے کنارہ کرنے لگتا ہے۔ ایک بار حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضورؐ سے اپنے متعلق دُعا فرمانے کے لیے عرض کی، کہ میری دُعائیں مقبول ہونے لگیں۔ آپؐ نے حکم دیا کہ کسبِ حلال کرو، تو دُعائیں مقبول ہوں گی، اور ارشاد ہوا کہ بہت آدمی حرام روزی کھاتے ہیں اور پھر بھی دُعا کرتے ہیں، ان کی دُعائیں کیسے قبول ہو سکتی ہیں۔ بیت المقدس میں ایک فرشتہ روز منادی کرتا ہے کہ جو آدمی حرام روزی کھاتا ہے اس

کے فرائض اور سنتیں کوئی بھی مقبول نہیں ہوتیں۔ حدیث میں ہے کہ کوئی کپڑا اگر خریدا جائے اور اس میں ایک پیسہ بھی حرام کا ہو، تو جب تک وہ استعمال کرے گا، اس وقت تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی اور یہ بھی ہے کہ حرام روزی سے بنا ہوا خون آگ میں جلنا زیادہ اچھا ہے۔ جو آدمی مال کے متعلق یہ سوچتا کہ کیسے کماؤں، تو خدا بھی دوزخ میں ڈالتے وقت اس کے ساتھ رحم نہ کرے گا۔

(حدیث) آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ عبادت کے دس حصے ہیں، جس میں نو حصے کسب حلال میں شامل ہیں ارشاد گرامی ہے، کہ جو آدمی دن بھر کسب حلال کر کے گھر واپس جاتا ہے، رات میں اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں: خداوند عالم فرماتا ہے۔ کہ حرام روزی سے پرہیز کرنے والوں سے حساب کرنے میں مجھے شرم آتی ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ سود کا ایک پیسہ تیس بار زنا کرنے سے زیادہ برا ہے۔ کہ حرام روزی کھانے والے کا صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ مال جمع کرے تو دوزخ تک اس کا ساتھ دے گا۔

(واقعات نصیحت) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک غلام کا شربت کا گلاس پیا۔ اور بعد میں معلوم ہوا، کہ یہ کسب حرام سے تھا۔ آپ نے انگلی ڈال کر قے کر دی، اور دعا کی کہ اے خدا! تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ اگر میرے جسم میں کوئی قطرہ رہ گیا ہے تو بخش دے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں، کہ اگر اتنی نمازیں پڑھے کہ تمہاری پیٹھ ٹیڑھی ہو جائے اور اتنے روزے رکھے کہ بال سے زیادہ دبلا ہو جائے، تو بھی کوئی ثواب نہیں، اگر کسب حرام کھاتا ہے۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو آدمی حرام مال سے صدقہ دیتا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ نجس کپڑا پیشاب سے پاک کرنے کی کوشش کرے۔

یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں، کہ اطاعت خدا کا خزانہ ہے۔ اس کی چابی دعا ہے۔ اور اس کے دندانے کسب حلال ہے۔

حضرت سہل تستری فرماتے ہیں کہ ایمان کی حقیقتیں چار چیزوں کے علاوہ حاصل نہیں ہو سکتیں۔

پہلے، یہ کہ تمام فرائض شریعت اسلام کے ماتحت ادا کرے۔

دوسرے یہ کہ روزی حلال پرہیزگار بن کر کھائے۔

تیسرے یہ کہ ظاہر و باطن کے گناہوں کو ترک کر دے۔

چوتھے، یہ کہ تا زندگی انھیں باتوں پر عمل کرے۔

ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ایک وہ درہم جس میں شبہہ ہے مالک کو واپس کر دینا، ہزار درہم صدقہ دینے سے زیادہ افضل ہے۔

حضرت سہل تستری فرماتے ہیں کہ جو آدمی حرام روٹی کھاتا ہے، اس کے اعضاء بھی مصائب میں اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور جو نیک روٹی کھاتا ہے۔ اس کے اعضا اس کو دعا دیتے ہیں۔

اس کے متعلق بہت سے احکام ہیں۔ اہل ورع و زہد نے اس میں بہت احتیاطیں کی ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہب ابن الورد ہوئے ہیں کہ وہ یقین سے پہلے کبھی کوئی چیز نہ کھاتے۔ ایک دن اُن کی والدۂ گرامی نے دودھ کا پیالہ دیا، تو دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ کس سے خریدا، کتنے میں خریدا، اور اس بکری نے جس کا یہ دودھ ہے، چارہ کہاں سے کھایا۔ اور وہ دودھ نہ پیا۔ آپ کی والدہ نے کہا، کہ پی لے، خدا تجھ پر رحمت کرے گا۔ تو جواب دیا کہ چاہے رحمت کرے مگر نہ پیوں گا۔ اگر پیوں گا، تو ساتھ ہی گناہ بھی ہوگا۔

حضرت بشر اس قسم کی احتیاط کم کرتے تھے۔ لوگوں نے اُن سے وجہ روزی کے لیے دریافت کیا، تو جواب دیا کہ جہاں سے اور لوگ کھاتے ہیں۔

لیکن اُن لوگوں میں فرق ہے، جو کھاتے بھی ہیں اور ہنستے اور روتے بھی ہیں۔ اس لیے کہ کم کھانے سے اس کی فضیلت یا گناہ کم و بیش نہیں ہوتا۔

دوسرا باب

پرہیزگاری کے مدارج

(مسئلہ) حلال و حرام سب ایک قسم کے نہیں ہوتے، بلکہ وہ الگ الگ درجات رکھتے ہیں۔ اُن میں بعض تو صرف حلال ہیں، اور بعض پاک بھی ہیں۔ اور بعض حلال اور پاک ترین ہیں۔ اسی طرح حرام کے بھی درجات ہیں۔ بعض حرام بعض حرام ترین اور بعض کم حرام۔ جیسے کسی بیمار کو کم گرمی کم نقصان دیتی ہو، اور زیادہ گرمی زیادہ حرام سے پرہیزگاری کے پانچ درجات ہیں۔

پہلا درجہ۔ پرہیز عدول کہلاتا ہے، کہ جو شریعت میں حرام قرار دے دی گئی ہے۔ اس سے پرہیز کریں۔ جو آدمی پرہیز چھوڑ دیتا ہے، اس کو فاسق اور گنہگار کہتے ہیں۔ اس کے بھی الگ الگ مراتب ہیں:

اگر کوئی آدمی کسی شخص سے غلط طریقے پر اس کی رضامندی کے باوجود مال حاصل کرے گا تو وہ حرام ہے، اور جو زبردستی (غاصبانہ) لے لے۔ وہ حرام تر ہے۔ اور یتیم یا بیوہ یا غریب کا مال لینا حرام ترین ہے۔ اور سود کھانا اس سے بھی زیادہ گناہ عظیم ترین ہے۔

اگر حرام کے سب ہی طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن حرام تر چیزوں کا گناہ زیادہ ہے۔ حرام و حلال کی تفصیلات وہ آدمی زیادہ جان سکتا ہے جو فقہ پڑھا ہوگا۔ اور فقہ کا پڑھنا ہر آدمی کے لیے ضروری ہے۔ البتہ وہ لوگ جو مالِ غنیمت یا جزیہ کا مال کھاتے ہوں، اُن کو فقہ کی ضرورت چنداں نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ضرورت کے لحاظ

کے مطابق ضرور پڑھ لینا چاہیئے۔ جس آدمی کی آمدنی کا ذریعہ بیع ہے، وہ بیع کے شرائط پڑھ لے۔ اسی طرح جو پیشہ کرتا ہو، اس کے متعلق وہ ضرور پڑھ لے۔

دُوسرا درجہ صالحین کا ہے۔ وہ روزی یہ ہے کہ جس کو مفتی حرام نہ کہے، لیکن شبہہ ہو۔ اس سے پرہیز ہی اچھا ہے۔ شبہہ کی تین قسمیں ہیں۔ اُن میں بعض تو وہ مال ہوگا، کہ جس[۱] سے پرہیز واجب ہوگا۔ اور[۲] بعض سے پرہیز کرنا اچھا ہے۔ اور[۳] بعض سے پرہیز کرنا درست ہے۔ یہ آخری درجہ ہے، جس سے کوئی فائدہ نہیں، جیسے شکار کا گوشت اس لیے نہ کھایا جائے، کہ شاید یہ کسی کی ملکیت ہو۔ مثلاً وہ جانور جو کسی کے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا ہو۔ یا زخم خوردہ جانور جو شکاری کی زد سے بھاگ آیا ہو۔ یا اس کا مالک فوت ہو گیا ہو۔ اور اس کا اسے حق پہنچتا ہو، بغیر کسی دلیل کے یہ بالکل وہم ہے اور بیکار ہی سا ہے۔

تیسرا درجہ وہ ہے، جس پر متقی فائز ہیں، کہ اس میں کسی شبہہ کی گنجائش ہی نہ ہو، بلکہ قطعی حلال ہو، لیکن اس کے استعمال سے کسی شبہہ کا تصور ہو جائے، تو وہ بھی پرہیز کرنے کے لائق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی اس وقت درجہ اتقا کو نہیں پہنچتا، جب تک کہ وہ کسی چیز کو صرف اس تصور سے استعمال نہیں کرتا کہ وہ شاید اس کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ ہم نے حلال کے دس مراتب کو حرام میں مبتلا ہونے کے شکوک کی وجہ سے قطعی چھوڑ دیا۔ اسی وجہ سے اگر کسی کے سو درہم کسی کے قرض ہوتے، تو وہ ننانوے ہی لیتا، تاکہ شبہہ کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

علی بن معبد کہتے ہیں کہ میں نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ وہاں ایک بار خط لکھ کر مٹی سے جذب کرنا چاہا، لیکن خیال ہوا کہ دیوار کی مٹی میری ملکیت میں نہیں ہے، پھر کیسے خشک کروں، لیکن پھر اس کو ناچیز سمجھتے ہوئے ذرا سی مٹی اس خط پر ڈال لی۔ ایک دن اس کے بعد خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ جو لوگ دیوار کی پشت و خاک کی قدر نہیں کرتے ان کو قیامت ہی کے دن پتہ چلے گا۔

لہٰذا متقی کے درجات رکھنے والے لوگ اس سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عادت کل بڑھ نہ جائے اور درجہ اتقا سے گر نہ جائیں۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بچپن میں ایک خرمہ صدقے کا منہ میں رکھ لیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کخ کخ القھا (یعنی پھینک دو! پھینک دو!!) فرمایا۔

(نصائح) ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے مال غنیمت کی ایک مشک پیش کی گئی، تو انھوں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور فرمایا کہ تمام مسلمانوں کا حق ہے۔

ایک بزرگ ایک بیمار کے سرہانے بیٹھے تھے۔ جب بیمار مر گیا، تو آپ نے چراغ گل کر دیا اور فرمایا کہ اس کا

تیل اب اس کے وارث کا حق ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالِ غنیمت کا مُشک گھر میں فروخت کرنے کے لیے رکھ دیا تھا، تاکہ اس کی قیمت مُسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک بار جب گھر میں آئے تو اپنی بیوی کی چادر سے بُوئے مشک سُونگھی، تو دریافت کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ مشک تولنے میں ہاتھوں کو لگ گیا، اور وہ میں نے اپنی چادر پر لگایا۔ آپ نے وہ چادر اُتاری اور اس کو اس وقت دھوتے رہے جب تک اس میں سے مُشک کی بُو بالکل نہ جاتی رہی۔ حالانکہ اتنا معاف تھا، لیکن اُن کو اپنی بیوی کا سمجھانا مقصُود تھا، تاکہ وہ آئندہ کسی دوسری چیز کی طرف راغب نہ ہوں۔

(مسئلہ) ایک بار امام احمد بن حنبلؒ سے لوگوں نے دریافت کیا، کہ اگر مسجد میں کوئی شخص بادشاہ کے مال سے کوئی خوشبو جلائے تو کیا حکم ہے۔ جواب دیا کہ وہاں سے ہٹ جاؤ، اس لیے کہ وہ بذاتِ خود حرام ہے۔

اُن لوگوں نے پھر دریافت کیا، کہ اگر حدیث کا ورق کہیں اُٹھائیں تو بغیر مالک کی اجازت اس کا نقل کرنا دُرست ہوگا۔ تو آپ نے اس کو بھی منع کر دیا۔

(واقعہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی آپ کو بہت پیاری تھیں۔ آپ جب تختِ حکومت پر متمکن ہوئے، تو اس بیوی کو طلاق دے دی، صرف اس ڈر سے کہ کبھی یہ کوئی سفارش کرے اور مجھے اس کی بات ماننا پڑے۔

(مسئلہ) کارِ دُنیا کے لیے ہر کام ممنوع ہے، چاہے مباح ہو۔ کیوں کہ یہی عادت اس کو دوسری طرف لے جاتی ہے۔ بلکہ مسئلہ یہاں تک ہے کہ حلال کمائی کی روٹی بھی اگر آدمی پیٹ بھر کر کھاتا ہے، تو بھی وہ اتقا کے درجے سے گر جاتا ہے۔ چونکہ جب سیر ہوگا تو خواہشاتِ نفسانی اُبھریں گی، اور وہ نفسانی خواہشات کے ماتحت افعالِ بد کا مرتکب ہوگا۔

اہلِ دُنیا کے باغات اور مکانات نیز اور دوسری ملکیتوں کی طرف دیکھنا بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ اس سے بھی آدمی کی دُنیا کی تمنا زیادہ ہوتی ہے، اور حرام کی طرف رغبت ہوتی ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ تمام گناہ دنیا کی محبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے اصل مقصد اپنے دل کو دنیا کے مباح کاموں میں پھنسا دینا ہے، جو نتیجے میں دنیاداری میں مبتلا کر دینے والا ہوتا ہے، اور جب وہ نوبت آئے گی تو آدمی گناہ ضرور کرے گا، اور اس کے بعد خدا کا ذکر دل سے بُھلا دے گا۔ لہٰذا معلوم ہوا، کہ دُنیا کی محبت تمام ظلم اور گناہوں کی بُنیاد ہے۔

ایک بار سفیان ثوری کچھ لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ ایک رئیس کا مکان راستے میں پڑا۔ تو آپ کے ساتھی اس کے مکان کی طرف دیکھنے لگے۔ آپ نے اُن کو منع کیا، اور فرمایا کہ تم لوگ ان کے دیکھنے سے ان کے اِس گناہ

میں شامل ہوتے ہو، اور اس کی ہمت بڑھتی ہے۔

حضرت امام احمد حنبل رحمۃُ اللہ علیہ سے لوگوں نے دیوار اور زمین پر کہگل کرنے کے لیے دریافت کیا، تو جواب دیا کہ زمین پر تو کرو، اس لیے کہ خاک نہ اُڑ سکے۔ لیکن دیوار پر کرنا آرائش کا باعث ہوگا۔ وُہ مکروہ ہے۔

(مثال) چوتھا درجہ، صدیقوں کا پرہیز کرنا۔ وہ لوگ ایسے کاموں سے بھی پرہیز کرتے ہیں، جو دُنیا کی طرف لے جائیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ بادشاہ کی بنائی ہوئی نہر سے پانی نہ پیا کرتے تھے بعض لوگ ایسے تھے کہ جو اس باغ کے انگور نہ کھاتے تھے جس باغ کو بادشاہ کی نہر سے پانی دیا جاتا تھا۔

(مسئلہ) حضرت امام حنبل کے نزدیک مسجد کے اندر خیاطی کرنا مکروہ سمجھتے تھے اور قبرستان کے گنبد کے اندر بھی کسب کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

ایک بزرگ کے جُوتے کا تسمہ ایک بار ٹوٹ گیا۔ اس وقت اتّفاق سے شاہی غلام مشعلیں لیے ہوئے گزر رہے تھے، لیکن آپ نے اُن کی روشنی میں اس کو دُرست کرنا اچھا نہ سمجھا۔

(مثال) ایک بار ایک عورت سُوت کات رہی تھی۔ شاہی مشعل بردار اس طرف سے نکلا، تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

حضرت ذوالنون علیہ الرحمۃ ایک بار قید ہو گئے، تو آپ نے شاہی کھانا نہ کھایا۔ ایک عورت جو آپ کو بہت چاہتی تھی، اس نے اپنی حلال کمائی آپ کو کھانا کھلانا چاہا، لیکن آپ نے منع کر دیا۔ وہ عورت خفا ہوئی اور کہا کہ وہ کھانا میری حلال کمائی کا تھا۔ آپ نے اس سے کیوں پرہیز کیا؟ تو جواب دیا کہ وہ کھانا ظالم کے طباق میں رکھ کر لایا گیا تھا، اور مجھ تک پہنچانے میں ایک ظالم سے مدد لی گئی تھی۔ لہٰذا وہ میرے لیے حرام ہو گیا۔

وہ آدمی جو زنا کرتا ہے، اس کی طاقت کا سبب اس کی نہ ناکاری نہیں ہوگی بلکہ ایسی صورت میں وہ کھانا حرام اس لیے ہوگا کہ وہ کھانا حرام سے حاصل ہوا سمجھا جائے گا۔

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں جنگل سے گذر رہا تھا، مجھے بھُوک معلوم ہوئی، نہر کے کنارے کی سبزی کو چاہا کہ کھالوں۔ ہاتف کی ندا آئی کہ جو قوت تجھ کو یہاں تک لاتی ہے۔ اس کو سمجھ! میں شرمندہ ہوا اور توبہ کی۔

صدیقوں کے مراتب یہ ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے جن میں ذرا سا بھی شک ہوتا، پرہیز کرتے۔ لیکن آجکل کے لوگ پاک پانی بھی ڈھونڈتے ہیں، وہ لوگ ننگے پیر تلاش میں نکل جاتے ہیں اور جہاں ایک کرپانی مل جاتا طہارت کر لیتے، مگر یہ ظاہری طہارت ہے۔ اس میں لالچ اور ظاہرداری پائی جاتی ہے، باطنی طہارت نہیں اس

سے کہیں بالاتر ہیں۔
پانچواں درجہ ۔ مقربین و موحدین کا مرتبہ ہے۔ وہ لوگ کھانا، پینا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا اور اپنے تمام کام سوائے خدا کے نہیں کرتے۔ ماسوا اللہ کام سب کچھ ان کے لیے حرام ہیں۔ یہ پورا گروہ ایک ہی مسلک پر گامزن ہے۔ اور دراصل موحد یہ ہی ہیں۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار دوا پی۔ اُن کی بیوی نے کہا کہ دوا کے بعد ذرا ٹہلنا چاہیئے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تیس سال سے اب تک سوائے خدا کے کام کے میں نے ایک حرکت بھی نہیں کی۔

یہ لوگ سوائے دین کے کبھی حرکت بھی نہ کرتے تھے۔ اگر کھاتے تو اس لیے کہ عبادت خدا کے لیے کھڑے ہو سکیں۔ اگر بولتے تو صرف خدا کے لیے۔ علاوہ اس کے سب کچھ اُن کے نزدیک حرام ہے۔

اِن مدارج پر پہنچکر آدمی موحد اور مقرب بارگاہِ ایزدی ہوتا ہے۔ ان کو سمجھو اور دیکھو، تاکہ اپنے نقائص کو سمجھ سکو۔ اگر عدل چاہتے ہو تو ایسے ہی عمل کرو، تاکہ فاسق نہ بن سکو۔ بظاہر تم کو شریعت کی باتیں بھونڈی اور بھدی معلوم ہوتی ہیں، اور شریعت کے احکام میں اپنا دخل دیتا ہے۔ شریعت کی ظاہری باتوں میں چون وچرا کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ بدترین مخلوق وہ آدمی ہے جس کا جسم صرف نعمتوں سے بنا رہے۔ وہ گوناگوں لباس پہنتا ہے اور بہترین قسم کے کھانے کھاتا ہے، اور عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ خدا ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

باب سوم

حلال و حرام کا فرق

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دُنیا کا ہر مال ناجائز ہے۔ یا مال دنیا کا زیادہ تر حصہ حرام ہے۔ اس مسئلے میں تین قسم کی باتیں الگ کہتے ہیں۔

(حلال وحرام کا فرق) پہلا گروہ محتاط اور زاہدین کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ دُنیا میں صرف گھاس اور پودے کھانے چاہئیں
دوسرا گروہ وُہ ہے، جن پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے، وہ دنیا کی ہر چیز کھاتے ہیں اور اچھا سمجھتے ہیں۔
تیسرا گروہ وُہ ہے، جو اعتدال پسند کرتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے کہ حسبِ ضرورت سب چیزیں کھانا جائز ہیں۔
لیکن ہمارے خیال میں یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں، بلکہ حرام "حرام" ہے اور حلال "حلال"۔ دونوں قطعی الگ الگ چیزیں ہیں
(حدیث) رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی مال دُنیا کو زیادہ تر حرام سمجھتا ہے، وہ غلط کہتا ہے زیادہ حرام ہونا اور زیادہ تر حرام ہونے میں فرق ہے۔ جیسے بیمار اور مسافر دونوں الگ الگ ہیں۔ لشکری انسان بہت ہیں، لیکن بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اسی طرح ظالم دُنیا میں بہت ہیں۔ لیکن مظلوم بہت زیادہ ہیں۔ زیادہ اور بہت

زیادہ کا فرق بالتفصیل "احیاء العلوم" میں لکھ دیا گیا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اُن چیزوں کو حلال کر دیا گیا ہے، جو چیزیں خدا کے نزدیک اچھی ہیں۔ اور جو بُری ہیں اُن کو منع کر دیا گیا ہے۔ ہم لوگ اس کے متعلق نہیں سمجھ سکتے، کہ اس کی حقیقت کیا ہے اس لیے اِس بحث میں پڑ جاتے ہیں۔

ایک بار رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک کے برتن سے طہارت فرمائی، اور اگر پیاس ہوتی تو وہ پی بھی لیتے، لیکن جو چیز بذاتِ خود نجس ہے۔ اس کا کھانا پینا حرام ہے، اور یہ طے ہے کہ مشرک اور یہودی کا ہاتھ نجس ہے، کیونکہ وہ مُردار کھاتے ہیں، اور شراب بھی پیتے ہیں۔ لیکن اُن کو اس مشرک کی پلیدی کا علم نہ تھا۔ اس لیے اس کو پاک سمجھتے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم جہاں جاتے، وہاں سے کھانا خریدتے، اور تجارت کرتے، باوجودیکہ اس وقت شراب خوار، مُرتد، مشرک سب موجود تھے۔ لیکن مال دُنیا سے کنارہ کش نہ ہوئے، لیکن ہر چیز کو برابر بھی نہ سمجھا اور بقدرِ ضرورت سب کاموں کو کیا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ دُنیا میں آپس میں معاملات کرنے والے چھ قسم کی آدمی ہیں:

پہلے وہ آدمی جس کے متعلق تمُ کو علم ہی نہ ہو، کہ وہ نیک ہے یا بُرا۔ مثلاً تم کسی غیر شہر میں جاؤ، تو تمُ وہاں ہر آدمی سے کھانا لے کر کھا سکتے ہو اور تجارت بھی کر سکتے ہو۔ کیونکہ اس وقت جو چیز اس کے پاس ہے۔ تمھارے خیال میں وہ اسی کی ملکیت میں ہے، اور بغیر کسی دلیل یا معلومات کے کوئی چیز اس میں مانع نہیں ہوتی۔ لہٰذا تمُ اس سے معاملت کر سکتے ہو۔ لیکن اگر اس شخص کے لیے معلومات فراہم پہنچا لو، تو یہ پرہیزگاری کی دلیل ہے۔ لیکن واجب نہیں۔

دوسرا وہ آدمی، کہ اس کے نیک ہونے کے متعلق تم کو علم ہو، اس کا کھانا کھا لینا جائز ہے۔ اس سے پرہیز کرنا اچھا نہیں۔ اگر تم توقف کرو گے اور اس آدمی کو رنج پہنچے گا، تو یہ گناہ ہو گا۔

تیسرا آدمی وہ ہے، جس کے متعلق تم کو علم ہو، کہ وہ بُرا ہے، اس کا مال سب یا زیادہ تر مال غصبی یا حرام کا ہے۔ تو اس آدمی سے پرہیز کرنا لازمی ہے، لیکن اس آدمی کے بھی مال کا وہ حصّہ جس پر تو یقین کرلے کہ وہ جائز ہے اور غصبی نہیں ہے۔ اس کو خرید لینا جائز ہو گا۔

چوتھا وہ آدمی کہ جس کے مال کا زیادہ تر حصّہ حلال کا ہے، لیکن تمام حرام سے بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ جیسے کوئی دہقان کہ بادشاہ کی طرف سے حاکم بھی ہو یا تجارت پیشہ ہو، تو اس سے لین دین جائز ہو گا، لیکن پرہیز کرنا بہتر بہتر ہے۔

عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ، کے مقرّر کردہ وکیل نے ایک بار بصرے سے لکھا کہ میں انھیں لوگوں سے معاملت

زیادہ ترکرتا ہوں جو بادشاہوں سے لین دین کرتے ہیں۔ آپ نے اُس کو جواب دیا کہ وہ لوگ سوائے بادشاہوں کے مخلوق سے کوئی تجارت نہیں کرتے، تو اُن سے معاملت نہ کرو۔

پانچواں قسم کا آدمی وہ ہے، کوئی آدمی ظالم ہو، مگر اس کی شکل وصُورت۔ حرکات وسکنات اور بات چیت سے اندازہ نہ ہوسکے کہ یہ آدمی کس قسم کا ہے۔ بظاہر وہ نیکوں کی صورت بنائے ہو، لیکن اس سے تجارت کرنے کے لیے پوچھ گچھ ضروری ہے کہ مال وہ کہاں سے لاتا ہے۔

چھٹا وہ آدمی کہ ظلم کی کوئی علامت ظاہری نہ نظر آئے، لیکن فسق وفجور کے متعلق اس میں شابہہ پایا جائے۔ مثلاً وہ زرتار کپڑے پہن رہا ہو، یا نامحرم عورتوں کو تکتا ہو، تو ان باتوں سے اس کا مال حرام نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اتنا شبہ ضرور ہے کہ شاید حرام مال بھی اس کے پاس ہو تو اس سے معاملت کرسکتا ہے۔ اسی طرح جیسے نجس کپڑوں سے نماز ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر آدمی کو ان کی نجاست کی خبر نہ ہو، اور اگر بعد نماز اس کو اپنی نجاست معلوم ہو، تو بعض علماء کے نزدیک، اس نماز کی قضا نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عین نماز میں اپنی نعلین اتار دیں، اور نماز اسی طرح جاری رکھی۔ اور فرمایا کہ درمیان نماز میں جبرئیلؑ نے مجھے اطلاع دی کہ نعلین نجس ہیں۔ لیکن جس موقع پر ہم نے اس واقع کا ذکر کیا ہے، وہاں پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ واجب نہیں ہے۔ اتنا دریافت کرلینا ضروری ہے کہ مال کہاں سے آیا ہے، مگر اس مالکِ مال کا دل میلا ہونے کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ اور اگر اس کا خدشہ ہے تو یہ سوال کرنا حرام ہے۔ اس لیے کہ زہد احتیاط ہوتی ہے اور کسی کو رنج پہنچانا بمنزلہ حرام کے ہے۔ اس وقت مناسب یہ ہے کہ کسی بہانے سے اس کو ٹال دے، اور پھر بھی اگر وہ آدمی مُصِر ہو تو کرلے، اور اگر اس وقت کسی دوسرے سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی اور اہلِ معاملہ نے سُن لیا، تو بھی حرام ہوگیا۔ یہ سب غیبت اور رنج میں شامل ہو جائے گا اور سب حرام ہی ہوگا۔ ایک حرام فعل صرف احتیاط کرنے کے لیے ہونا اچھا نہیں۔

رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سے ہدیہ یا تحفہ لیتے یا دعوت میں تشریف لے جاتے، تو کبھی دریافت نہ کرتے۔ جب حضُور مدینے تشریف لے گئے تو جو آدمی آپ کے پاس کچھ لاتا اس سے دریافت فرماتے کہ یہ ہدیہ ہے یا تُحفہ؟ وہ اس لیے کہ اس سوال سے مخاطب رنجیدہ نہیں ہوسکتا تھا۔

اگر کوئی دوکاندار بادشاہ کا مال فروخت کرتا ہے، اور تم جانتے ہو، کہ یہاں زیادہ تر مال حرام ہی فروخت ہوتا ہے تو نہ خریدو۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ اس میں زیادہ تر مال جائز ہے، تو خرید سکتے ہو۔ پھر بھی تقویٰ و پرہیزگاری کے ماتحت اگر اس کے متعلق پوچھ گچھ کرلوگے تو اچھا ہے۔

چوتھا باب

حکومت کی طرف سے وظیفہ و روزینہ

(مسئلہ ملازمت۔ تنخواہ و وظیفہ) معلوم ہونا چاہیے کہ حکومتِ وقت اگر مسلمانوں سے خراج کے طور پر مال لیتی ہے تو وہ ناجائز ہے۔ حکومت کے پاس تین قسم کا مال جائز ہوتا ہے۔

اوّل ۔ مالِ غنیمت

دوم ۔ جُرمانہ، لیکن وہ شریعت کے گنہگاروں سے وصول کیا ہوا ہو۔

سوم ۔ وہ مرنے والا جس کا کوئی وارث نہ ہو۔

اس قسم کا مال صرف مسلمانوں کا حصّہ ہے، لیکن موجودہ زمانے میں مال حلال ہی کم نظر آتا ہے اور زیادہ تر آج کل خراج کا روپیہ جرمانوں کے ذریعے عدالتوں میں وصول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق پہلے تحقیق کر لینا ضروری ہے کہ یہ مال جزیہ لاوارث یا مالِ غنیمت میں سے ہے۔

بادشاہ کے لیے روا ہے کہ وہ ملک کی زمین پر کھیتی کرائے اور اس سے جزیہ وصول کرے، لیکن اگر زمین پر مفت کام لیا گیا ہے، تو وہ حرام تو نہیں ہے، لیکن اس میں شبہہ ضرور ہے۔

(مسئلہ) اگر بُرے لوگوں کے خطّے میں زمین خریدے گا، تو ملکیت میں ضرور آ جائے گی، لیکن اگر اس کی قیمت حرام پیسے سے ادا کی ہے، تو اس میں شبہہ ہے۔

اگر کوئی آدمی بادشاہ کی ذاتی آمدنی سے وظیفہ پاتا ہے، تو وہ جائز ہے، اور اگر وہ کسی کے ترکے یا کسی دوسرے طریقے سے حاصل کیا ہوا ہے، تو ناجائز ہے لیکن قاضی، مفتی، متولی، طبیب یا ہر وہ آدمی جو مسلمانوں کے عوام کو فائدہ پہنچانے والا ہو۔ اس طرح علمِ دین حاصل کرنے والے طالب علم اور لاچار و مجبور لوگ وغیرہ لے سکتے ہیں۔

عالموں اور دوسرے آدمیوں کے لیے اس وقت وظیفہ یا تنخواہ جائز ہوگی کہ وہ عوام کے ساتھ کسی معاملے میں کوئی خاص رعایت نہ برتیں۔ اُن کو ظلم اور سختی پر آمادہ نہ کریں، بلکہ ان سے ربط و ضبط قائم نہ کریں۔ اور اگر کریں تو حدودِ شرع کے اندر۔ اس کی تفصیل لکھی جاتی ہے۔

تفصیلات ۱۔ حاکم اور بادشاہ کی رعایا کے ساتھ تین طریقوں سے معاملت ہوتی ہے۔

اوّل یہ کہ رعایا بادشاہ یا حاکم کے پاس نہ جائے، بلکہ بادشاہ ان کی طرف متوجہ ہو۔

دوسرے یہ کہ رعایا بادشاہوں کے سامنے جا کر سلامی دیں یہ ناجائز ہے، لیکن ضرورت کے وقت جانا دُرست ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ظالم اور جابر بادشاہوں اور حاکموں کی علامات بیان فرمائی ہیں کہ جو آدمی ان سے پرہیز کرے گا وہ نیک ہے، ورنہ نہیں، اور میرے بعد ظالم بادشاہوں کی حکومتیں ہوں گی، جو لوگ اُن کی طرف

رجوع ہوں گے۔ وہ میری اُمت میں سے نہ ہوں گے، اور اُن لوگوں کے لیے جنت نہیں ہے۔ خداوندعالم کے نزدیک بدترین علماء وہ ہیں، جو امراء و رؤسا کے پاس جاتے ہیں اور بہترین امراء و رؤساء وہ ہیں جو علماء کے پاس آتے ہیں۔ علماء پیغمبروں کے امین ہیں، لیکن اگر وہ لوگ امانت میں خیانت نہ کریں اور بادشاہوں سے خلط ملط نہ کریں۔

حضرت ابُوذرغفاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلمہ سے فرمایا کہ بادشاہوں کی قربت سے دُور رہو۔ کیوں کہ اُن کی قربت سے جتنا تُم کو فائدہ ہوگا، دین سے اتنا ہی تُم دور ہوتے ہو اور دوزخ کا ایک حصّہ صرف اُن علماء کے لیے بتایا گیا ہے، جس میں صرف وہ علماء ہوں گے جو بادشاہ کی مصاحبت کرتے ہیں۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علماء کا اُمراء سے دوستی رکھنا نفاق کے برابر ہے۔

ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آدمی دین دار بادشاہ کے پاس جاتا ہے اور بے دین ہوکر واپس آتا ہے۔ تو لوگوں نے دریافت کیا کہ کس طرح؟ تو کہا کہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق خدا کے حکم کے خلاف کام کرتا ہے۔

فضیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے مصاحب زیادہ نقصان رساں ہیں بہ نسبت حواریوں کے۔

محمد بن سلمیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ وہ مکھی جو نجاست پر بیٹھی ہے، بہتر ہے اس عالم سے جو بادشاہ کی صحبت میں بیٹھا ہو۔

(ہدایت) یہ تمام ہدایتیں اور سختیاں اس لیے ہیں کہ بادشاہ کے پاس بیٹھ کر آدمی گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے زیادہ تر بادشاہوں کے دربار خدا کے مغضوب ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہاں جانے سے پرہیز کرنا چاہیے، اور اگر بادشاہ کہیں خیمہ لگاتے ہوں تو بھی حرام ہے۔ اُن کے فرش پر پیر رکھنا حرام ہے اور اگر کہیں بغیر خیمہ و فرش بادشاہ ٹھہرا ہوا ہے تو اس کے آگے سرِتسلیم خم کرنا ظلم و تشدّد کو بڑھانے کا رادف ہوتا ہے، جو قطعی حرام ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، کہ جو آدمی کسی مالدار کے سامنے اس کے مال کی وجہ سے انکساری کرتا ہے۔ اس کے دین کا ایک حصّہ ختم ہوجاتا ہے۔ چاہے وہ مالدار ظالم بھی نہ ہو۔ اس کو سوائے اسلام کے اور کوئی عمل جائز نہیں۔ اسی طرح عالم باعمل اور بادشاہ عادل کے علاوہ کسی کے آگے سر جھکانا، یا اس کے ہاتھ چومنا جائز نہیں۔ بعض بزرگانِ دین تو ظالموں کے سلام کے جواب کو بھی منع کرتے ہیں، تاکہ جواب سلام نہ پاکر وہ شرمندہ ہوں، لیکن گناہ یہ ہوگا کہ کسی ظالم کو درازی عمر کی دُعا دی جائے۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی ظالم کو درازی عمر کی دعا دیتا ہے، وہ گویا کہ ظالم اور نافرمان آدمی کو دنیا میں رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اِس کے لیے کوئی دعا درست نہیں صرف یہ کہہ دینا چاہیے اَصْلَحَكَ اللّٰهُ وَوَفَّقَكَ اللّٰهُ لِلْخَيْرَاتِ وَطَوَّلَ اللّٰهُ عُمْرَكَ فِي طَاعَتِهِ (یعنی خداوندِ عالم تجھے نیک کاموں کی توفیق دے

اور اس کی اطاعت کے لیے تیری عمر دراز ہو) آدمی دعا و سلام سے فراغت پاکر دوبارہ ملنے کی خواہش کرتا ہے اگر وہ صرف ظاہرداری کر رہا ہے، تو اس نے جھوٹ بولا جو گناہ ہے اور اگر وہ واقعی اس ملنا چاہتا ہے تو ایک ظالم سے ملنا احکامِ خدا کے خلاف ہے۔ اور اشتیاقِ ملاقات کے بعد عموماً اس کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے ہیں، یہ عمل بھی جھوٹا ہوگا۔

کم از کم ان باتوں سے اتنا گناہ ضرور کیا کہ اپنی باتوں سے ظالم کا دل بڑھایا، جو ناجائز ہے۔

اور اگر ملاقات کا سلسلہ زیادہ جاری رہا تو اب ظالم جو کچھ کہے گا۔ اس پر اگر زبان سے نہیں تو کم از کم سر کو اثبات میں ہلانا ضروری ہے۔ یہ سب گناہ ہے۔ سب سے پہلا گناہ تو یہ ہوگا کہ ظالم کے مکان میں ریشمی فرش و فروش اور اس کے جسم پر زرق برق لباس دیکھتا ہے۔ اس کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی دیکھتا ہے۔ اس کی زبان سے فحش کلامی بھی سنتا ہے، اور خاموشی اختیار کرتا ہے، جو ناجائز ہے، لیکن اگر وہاں جانا آنا ضروری ہے۔ لیکن بے ضرورت بھی جاتا ہے، تو ناجائز ہے۔

حقیقی معصیت جب عائد ہوتی ہے کہ بُری باتوں کو دیکھ کر اس کی طرف رغبت کرے، اور اس کی تواضع اور مہربانی سے خوش ہو۔ اس کے مال کو دیکھ کر محبت دنیا زیادہ ہو۔ یہ بڑا گناہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یامعشر المہاجرین (یعنی دنیا والوں کے پاس نہ جاؤ) کیونکہ خدا کے دیے ہوئے پر صبر نہ کروگے اور تم کو غصہ آئے گا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ دنیا والوں کے مال کو نہ دیکھو۔ کیونکہ ان کے مال کی زیادتی تمھارے دین کو متزلزل کر دے گی۔

ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی مصاحبت سے پرہیز کرو اور صرف دو صورتوں میں ان کے پاس جاسکتے ہو۔

اوّل یہ کہ بادشاہ کا خوف ہے کہ اگر حکم عدولی کی تو نقصان پہنچے گا یا حشمت حکومت جاتی رہے گی۔

دوسرے کسی مسلمان کے لیے داد و انصاف لینے کے لیے جانا چاہیے۔

ان دو صورتوں میں امرا و عمال و بادشاہانِ وقت کے پاس جانا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کی خوشامد نہ کرے۔ جھوٹ نہ بولے نصیحت میں کوئی کمی نہ کرے۔ اگر اس کا خوف ہو، تو نرمی سے ہی کہے۔ اگر پھر بھی سفارش قبول ہونے کا خطرہ ہو تو بھی تعریف اور جھوٹ سے پرہیز ہی کرے۔ بعض آدمی مکاری سے کہتے ہیں کہ ہم سفارش کرنے جاتے ہیں، اور دوسروں کے ذریعہ اس حاجت کے بر آنے سے رنجیدہ ہوتے ہیں، تو گویا کہ وہ صرف ظاہری عزت حاصل کرنے کے لیے جانا چاہتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ بادشاہ خود اس کے پاس آئے، اس میں یہ چاہیے کہ جب بادشاہ سلام کرے تو جواب دے۔ اس وقت تعظیم کے لیے کھڑا ہونا اچھا ہوگا۔ کیونکہ بادشاہ کا علماء کے پاس آنا عزتِ علم کی نشانی ہے۔

اور وہ بادشاہ اس کی وجہ سے عزت کا مستحق ہوگا۔ لیکن اگر وہ دنیا کو حقیر سمجھتے ہوئے تعظیم نہ کرے تو روا ہے۔ بشرطیکہ اسے کوئی خوف نہ ہو، اور جب بادشاہ بیٹھ جائے تو تین قسم کے نصائح کرے۔

پہلے یہ کہ بادشاہ اگر کوئی فعل حرام نادانستہ ہو کر کر رہا ہے، تو اس پر ظاہر کر دے۔

دوسرے یہ کہ دیدہ و دانستہ ظلم و جور کر رہا ہو تو اس کو ازروئے شریعت ڈرائے، کہ یہ کام حرام ہے۔

تیسرے یہ کہ عام رعایا کی بہبودی اور فلاح کے امور اس کو بتائے۔ اگر بادشاہ اُن کی طرف سے بے خبر ہے۔

اسی طرح جو آدمی بادشاہ بن گیا ہو، اس پر بھی تینوں نصائح ضروری ہیں۔ اگر عالم باعمل ہے، تو اس کی نصیحت میں ضرور اثر ہوگا، اور اگر نہیں ہے تو خاموشی اختیار کرے۔ اس لیے کہ اس کی ہنسی اڑائی جائے گی اور لاحاصل ہوگا۔

(واقعہ) مقاتل بن صالح کا قول ہے، کہ میں حماد بن سلمہ کے پاس تھا، ان کے گھر میں ایک لوٹا، ایک بوریا اور ایک قرآن کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی نے دروازے سے آواز دی، تو دریافت کیا۔ باہر سے جواب آیا کہ خلیفۂ وقت محمد بن سلیمان۔ آپ نے اس کو بلا لیا۔ وہ آ کر بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے حضرت حماد سے کہا کہ آپ کو دیکھ کر میرے جسم میں خوف پیدا ہو جاتا ہے، تو انھوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ایسے عالم سے ہر آدمی ڈرتا ہے، جو علم صرف خدا کے لیے حاصل کرتا ہے۔ اور اگر طلب علم کا مقصد دنیا ہوتا ہے، تو وہ سب سے ڈرتا ہے۔ خلیفہ نے چار ہزار درہم دیئے، اور کہا کہ انھیں کسی کام میں صرف کر دیا جائے۔ تو آپ نے منع کر دیا۔ اس نے کہا، کہ ان کو مستحقین میں تقسیم کر دیجئے۔ تو کہا کہ اگر میں صحیح صحیح تقسیم بھی کر دیتا، اور بعد میں لوگوں نے اعتراض کیا تو میں یہ بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ نے وہ درہم واپس کر دیئے۔

تفصیل ۲ پس معلوم ہونا چاہیے کہ علماء دین کا بادشاہوں کے ساتھ یہ سلوک تھا۔

ایک بار جب ہشام مدینے پہنچا تو اس نے کہا کہ صحابہ میں سے کسی سے مجھ کو ملاؤ۔ تو لوگوں نے کہا سب وفات پا چکے ہیں۔ پھر تابعین سے ہی ملا دو۔ تو لوگ حضرت طاؤس علیہ الرحمۃ کو اس کے پاس لے گئے۔ آپ جب اندر پہنچے، تو جوتا اُتار کر السلام علیکم فرمایا۔ اور پوچھا کیسے ہوا ہے ہشام؟ وہ اس پر خفا ہوا اور آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ بڑے علماء میں سے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم ہیں، یہ عمل نہ کرنا چاہیے، تو اس نے کہا کہ اے طاؤس! تم نے یہ کیا گستاخی کی؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے کیا کیا؟ اس پر وہ اور غضب ناک ہوا اس نے کہا کہ آپ نے چار آداب شاہی کیوں نہ ادا کیے۔

اوّل یہ کہ تم نے فرش کے کنارے پر جوتا اتارا، جو تہذیب کے خلاف تھا۔

دوم تم نے مجھے امیر المومنین نہیں کہا۔

سوم یہ کہ میرا نام لیا، اور خلیفہ نہیں کہا۔

چہارم یہ کہ تم بغیر اجازت بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ کو بوسہ نہ دیا۔

حضرت طاؤس علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ میرا جوتا اتارنا تیری عزت کی کمی کا باعث نہ تھا۔ میں خدا کے سامنے دن میں پانچ بار جوتا اُتار کر جاتا ہوں۔

دوسری بات میں نے امیر المومنین اس لیے نہیں کہا کہ تیری حکومت سے تمام عوام خوش نہیں۔ لہٰذا جھوٹ کیسے بولوں۔

تیسرے تجھ کو کنیت سے نہیں پکارا، اس کی وجہ یہ تھی کہ خداوند عالم اپنے دوستوں کو نام لے کر پکارتا ہے۔ اور دشمنوں کو کنیت کے ساتھ۔

چوتھے یہ کہ تیرے ہاتھ کو بوسہ نہیں دیا۔ وہ اس لیے کہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے، کہ کسی کے ہاتھ کو بوسہ دینا جائز نہیں سوائے شہوت کے وقت عورت کے ہاتھ کو۔ یا محبت میں بیٹے کے ہاتھ کو۔

اور تیرے سامنے بیٹھ جانا اس لیے تھا کہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ دوزخی آدمی وہ ہے، جو خود بیٹھا ہو اور سامنے آدمی اس کے کھڑا ہو۔ ہشام کو یہ سب باتیں بہت پسند آئیں اور عرض کیا کہ مجھے اور نصائح کیجیے۔

(نصیحت) آپ نے فرمایا کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سنا ہے کہ دوزخ میں پہاڑوں کی برابر سانپ ہیں اور اونٹوں کے برابر بچھو ہیں۔ وہ دنیا کے ایسے امراء کے منتظر رہتے ہیں، جو اپنے غریبوں کے ساتھ عدل سے پیش نہیں آتے، یہ کہہ کر آپ تشریف لے گئے۔

سلیمان ابن عبدالملک اپنی حکومت کے زمانے میں مدینہ منورہ آیا اور ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ جو علماء وقت میں سب سے بڑے عالم تھے، اُن کو بُلا کر دریافت کیا کہ موت سے ڈرنے کی وجہ بتائیے! آپ نے جواب دیا کہ چونکہ تم دنیا کو آباد کر رہے ہو اور آخرت کو ویران، تو ظاہر ہے کہ جو آدمی ویرانے کی طرف جائے گا کیسے خوش ہو گا؛ اس کے بعد خلیفہ نے دریافت کیا، کہ دنیا والے خدا کے سامنے کیسے جائیں گے؟ تو جواب دیا کہ نیک اس طرح جیسے کوئی آدمی سفر سے واپس ہو کر اپنے عزیزوں سے خوشی خوشی ملتا ہے، اور بد لوگ اس طرح پکڑ کر بلائے جائیں گے جیسے کوئی چور غلام گرفتار ہو کر مالک کے سامنے آتا ہے۔ خلیفہ نے کہا کتنا اچھا ہوتا کہ میں اپنے متعلق سمجھ لیتا کہ میرا کیا حال ہو گا، تو فرمایا کہ قرآن شریف میں دیکھ تو معلوم ہو جائے گا۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ (یعنی یقیناً نیک آدمی بہشت میں جائیں گے اور بد دوزخ میں) پھر خلیفہ نے دریافت کیا کہ رحمت خدا کس پر ہو گی۔ تو جواب دیا کہ نیک کام کرنے والوں کے ساتھ۔

پس معلوم ہونا چاہیے کہ علمائے دین بادشاہوں کے ساتھ اس طرح عمل کرتے تھے۔ وہ ہر وقت یہ چاہتے تھے کہ شریعت اسلام کے ماتحت لوگوں کو راہ راست پر لائیں۔

بہرحال ظالموں کا پرکھنا اولیٰ ہے، مگر ان کے ساتھ دوستی نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح ظالموں کے دوستوں سے بھی کنارہ کشی اچھی ہے۔ اور اگر اس کے لیے ترکِ دنیا کی ضرورت پڑے تو گوشہ نشینی اختیار کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تک کہ علماء نیک راستے پر چلتے رہیں گے۔ میری اُمت صحیح راستے پر چلتی رہے گی۔

اس پوری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ رعیت بادشاہوں کی وجہ سے گمراہ ہوتی ہے۔ اور بادشاہ علماء کی وجہ سے اس لیے کہ وہ بادشاہ کے سامنے نصیحت کرنے سے ڈرتے ہیں۔

تفصیل ۳ اگر کوئی بادشاہ کسی عالم کے پاس تقسیم کرنے کے لیے کوئی مال بھیجے اور عالم کو اس کے مالک کی خبر ہو تو وہ بادشاہ کو واپس کر دے اور اس کو اس کے مالک کے پاس واپس کرنے کی ہدایت کر دے، اور اگر مالک کے متعلق معلوم نہ ہو تو بھی بعض علماء اس مال کی تقسیم کو جائز قرار نہیں دیتے۔

(مسئلہ) لیکن میرے خیال میں وہ مال بادشاہوں سے لے کر غرباء کو تقسیم کر دینا چاہیے تاکہ بادشاہ اس پر غلط تصرف نہ کر سکے۔ اور اس سے غریبوں کا بھلا ہو جائے۔ اس کے لیے تین شرائط ملحوظ رکھنا چاہئیں۔

(شرائط) پہلے یہ کہ، بادشاہ کو اس مال کے قبول کرنے پر حلال ہونے کا تصور نہ ہو جائے، ورنہ وہ حرام مال لینے میں اور دلیر ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کو پہلے راستے کی ہدایت کر دی جائے۔

دوسرے یہ کہ، عالم کی طرف سے لوگوں کو یہ گمان نہ ہو کہ وہ تقسیم نہیں کرتا ہے اور خود اسی طرح لینے لگیں اور تقسیم نہ کریں۔ بعض لوگ امام شافعیؒ کے متعلق یہ خیال فاسد رکھتے ہیں کہ وہ خلفاء کا مال لیتے تھے۔ لیکن اُن کو اُس کی خبر نہیں کہ غرباء کو تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

تیسرے یہ کہ مال بھیجنے کی وجہ سے ظالم کی محبت پیدا نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس کی محبت سے اس کے رنج اور موت سے غمگین ہوگا۔ اور یہ گناہ ہے یا اس کی جاہ و ثروت خوش ہوگا، یہ بھی گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم کسی ظالم کو یہ توفیق نہ ہو سکے، کہ میرے ساتھ نیکی کرے، کیونکہ مجھے اس کے اس عمل سے اس کی طرف توجہ ہو گی، اور اس کے بعد اس سے محبت ہو سکتی ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ اُن لوگوں سے محبت نہ کرو جو ظلم کرتے ہیں۔

(مثال) ایک بار حضرت وہب اور حضرت طاؤس، حجاج بن یوسف کے بھائی کے پاس گئے اور نصیحت کی۔ اس وقت سردی بہت تھی، اس نے حکم دیا، کہ حضرت طاؤس کو چادر اوڑھا دی جائے۔ آپ برابر ہلتے رہے اور نصائح کرتے رہے۔ یہاں تک کہ چادر نیچے گر گئی وہ ناراض ہوا۔ جب باہر آئے تو حضرت وہب نے کہا، کہ اگر آپ چادر لے کر کسی غریب کو دے دیتے تو اچھا ہوتا۔ حضرت طاؤس نے جواب دیا کہ مجھے اس بات کا خیال تھا کہ کسی

درویش کو مال امیر دے کر خوش بھی کروں اور لوگ میری تماشی کرنے لگیں کہ مال دوسروں سے لے لیں اور تقسیم نہ کریں، بلکہ اپنے پاس رکھ لیں۔

(مثال) ایک بار ایک خلیفہ نے حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دس دینار بھیجے کہ اُن کو تقسیم کر دیا جائے آپ نے تقسیم کر دیا۔ حضرت واسع رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ خلیفہ کی وقعت آپ کی نگاہوں میں ہوئی؟ آپ نے جواب دیا، ہاں! تو حضرت واسعؒ نے فرمایا کہ اس مال کی بدبختی میں تمہارے ہاتھ بھی رنگے گئے۔

بصرے کے ایک عالم نے خلیفہ سے مال صدقہ لے کر تقسیم کر دیا۔ تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تو اس کی دوستی اور محبت سے نہیں ڈرتا۔ تو جواب دیا کہ اگر کوئی آدمی مجھے جنت میں لے جائے اور پھر گناہ کرے تو بھی میں اس کو اپنا دشمن سمجھوں گا، اور وہ آپس میں دوستی کرانے والا بھی دشمن ہی ہوگا، جس نے میرا ہاتھ اس شخص سے پہچانوایا تھا۔

(مسئلہ) لہٰذا معلوم ہونا چاہیئے کہ جب آدمی اس مرتبے پر پہنچ جائے، تو بادشاہوں کا مال لے اور تقسیم کر دے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پانچواں اصُول

حق الناس کی ادائیگی

آپس کے ایک دوسرے کے حقُوق ادا کرنا یہ دُنیا خدا کے یہاں کی ایک منزل ہے، اور ہر آدمی یہاں مُسافروں کی طرح رہتا ہے۔ لہٰذا آپس میں یگانگت اور محبت سے رہنا چاہیے۔ اور ایک دوسرے کے حقُوق کا ہر طرح خیال رکھنا چاہیے۔

ان حقوق کو تین بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(ابواب) باب اول۔ خداوند عالم کے سبب سے جو بھائی چارہ لوگوں میں قائم ہو جائے۔

باب دوم۔ آپس میں دوستوں کے حقُوق۔

باب سوم۔ مُسلمانوں اور اپنے اعزا اپنے دوستوں کے حقوق اور رحم کا برتاؤ۔

باب اوّل

وہ تعلقات جو صرف خدا کے لیے قائم کیے گئے ہیں

باب اوّل دینی تعلّقات کے متعلق دُنیا کی بزرگ ترین عبادت خدا کے لیے کسی سے دوستی و محبت کرنا ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ خداوند عالم جب کسی پر رحم کرتا ہے، تو اس کو دوست عطا کرتا ہے تاکہ اگر وہ خدا کو بھول جائے، تو اس کو یاد دلائے، اور اگر خدا کی یاد ہو تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار رہیں۔

اور کوئی دو ایمان والے جب بھی آپس میں ملتے ہیں تو ان کے ایمان میں اور ترقی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ آپس

ہیں دینی بھائی ہوتے ہیں، ان کے لیے جنت میں ایک عالی شان مرتبہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ادریس علیہ الرحمۃ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں تم کو صرف خدا کی وجہ سے دوست رکھتا ہوں، تو جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سُنا ہے کہ بروزِ قیامت عرش عظیم کے نیچے خاص طور سے ان لوگوں کو خداوند عالم اپنی پناہ میں بٹھائے گا، جو اس کے لیے آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہوں گے۔ ان لوگوں پر کوئی خوف نہ ہوگا، تو لوگوں نے حضور سے دریافت کیا کہ وہ کیسے ہوں گے؟ تو آنحضرتؐ نے جواب دیا، کہ جو آدمی خدا کے لیے کسی کو دوست بناتے ہیں۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ دو دینی بھائیوں میں خدا کو زیادہ پیارا وہ ہے، جو ان میں زیادہ محبت کرتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ میری محبت ان لوگوں کے لیے ہے، جو دینی بھائی سے ملنے کے لیے آتا ہے، اور میرے لیے دوستی و محبت کرتا ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روزِ حشر خداوند عالم ندا دے گا، کہ وہ لوگ کہاں ہیں، جو میرے لیے لوگوں کو دوست بناتے تھے۔ آج میں اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دوں گا۔ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سات قسم کے آدمی جوارِ رحمت میں جگہ پائیں گے۔

امام ؑ عادل۔ جوان ؑ صالح و عبادت گزار۔ جو مسجد ؑ سے باہر بھی مسجد کا خیال دل میں رکھے۔ وہ ؑ لوگ، جو آپس میں خداوند عالم کے لیے دوستی کریں۔ اسی کے لیے آپس میں جمع ہوں اور اسی کے لیے الگ ہوں۔ تنہائی ؑ میں جو عبادت خدا کرتا ہو۔ وہ ؑ آدمی جس کو کوئی حسین عورت اپنی طرف بلائے اور وہ خدا کے خوف کی وجہ سے اس کی طرف راغب نہ ہو۔ وہ ؑ آدمی جو اتنا چھپا کر صدقہ دے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

(تمثیل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی خدا کی محبت میں کسی بھائی سے ملنے جاتا ہے، اس کو فرشتے مبارک باد دیتے ہیں۔ اور ارشاد ہوا، کہ ایک بار آدمی اپنے کسی دوست کے پاس جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں ایک فرشتے نے اس سے کہا تو کہاں جاتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ دوست سے ملنے کے لیے۔ فرشتے نے کہا کہ وہ تیرا کون ہے، کیا تیرا اس سے کام اٹکا ہوا ہے، یا کوئی تیرا عزیز ہے، تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں اس سے صرف خدا کے لیے ملتا ہوں۔ اور اسی کی وجہ سے اس سے محبت رکھتا ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ مجھے خدا کی طرف سے تیری طرف بھیجا گیا ہے۔ اور یہ پیغام لایا ہوں کہ خدا تجھ کو جنت میں جگہ دینے کا ضامن ہے۔ وہ تجھ کو دوست رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ ایمان کے لیے سب سے بڑی سند یہ ہے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی دونوں خدا کے لیے ہو۔ ایک نبی پر وحی نازل ہوئی، کہ تم اپنے زہد و اتقا سے جلدی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی، کہ دنیا کی آفات سے دور ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ تمھاری فانی ریاضت ہے، لیکن میری محبت وہ ہے کہ تم میرے

دوستوں سے دوستی کرو - اور میرے دشمنوں سے دشمنی -

حضرت عیسیٰ کو خداوند عالم کا حکم ہوا، کہ اگر تم تمام دنیا کی عبادت کرلو، لیکن میرے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ محبت و دشمنی نہ ہوگی تو سب بیکار ہے - آپ نے فرمایا کہ گنہگاروں سے دشمنی کرنا خدا کی محبت کی دلیل ہے - اور ان پر غلبہ حاصل کرنا خدا کے قرب کا باعث ہوتا ہے - لوگوں نے دریافت کیا کہ یا حضرت! کن لوگوں کی صحبت اچھی ہے، تو جواب میں ارشاد ہوا کہ جو لوگ خدا کی محبت کی طرف تم کو متوجہ کریں -

حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ تم دنیا سے الگ رہ کر میری عبادت کر رہے ہو - یہ کیوں؟ تو عرض کی بار الٰہا! تیری محبت کی وجہ سے دنیا اور دنیا والوں سے گھبراتا ہوں - ان سب سے مجھے نفرت ہوگئی ہے - تو ندا آئی کہ اے داؤد میرے دوستوں سے محبت کرو اور دشمنوں سے نفرت -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک فرشتہ جس کا آدھا جسم آگ کا بنا ہوا ہے اور آدھا برف کا - وہ بارگاہ باری تعالیٰ میں عرض کرتا ہے، کہ جس طرح تو نے آگ اور برف میں محبت پیدا کی اسی طرح بندوں کے دل میں محبت پیدا کر -

حدیث میں ہے، کہ خداوند عالم سے محبت کرنے والوں کے لیے بہشت میں جواہرات کے بیش قیمت ستون بنائے جائیں گے، جن میں ہر ایک کے اوپر ستر ہزار دریچے ہوں گے - اور وہ لوگ اہل جنت کو وہاں سے دیکھا کریں گے - اُن کے چہروں کا نور اہل بہشت پر پڑے گا - جس طرح آفتاب سے دنیا روشن ہوتی ہے، اہل بہشت اُن کے دیکھنے کو آئیں گے - اُن کی پیشانیوں پر لکھا ہوگا - اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِي اللهِ (یعنی یہ لوگ خدا کے لیے محبت کرنے والے ہیں)

ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے وقت عرض کیا کہ خداوندا! تو گواہ ہے، کہ اگر میں گناہ کرتا تھا تو تیرے بندوں سے محبت کرتا تھا - میرے اس عمل کو میرے گناہوں کا کفارہ بنا دے -

حضرت مجاہد فرماتے ہیں، کہ خدا کی راہ میں دوستی کرنے والے لوگوں کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں، کہ جس طرح درختوں کے پتے -

محبّت و دوستی

برائے خدا

دنیا میں ایک، دوسرے سے جتنی اور جس قسم کی اتفاق یا حالات کی بناء پر محبت ہو جائے، تو اُس کو اللہ کی طرف سے محبت نہیں ہوتی - اگر کوئی آدمی کسی سے خوبصورتی یا اچھی باتوں کی وجہ سے محبت کرتا ہے - تو یہ خدا کی وجہ سے نہیں ہے - اور اگر اپنی عزت یا مال کی فراوانی کے باعث محبت کرتا ہے تو بھی بیکار ہے - کیوں کہ ایسی محبت صرف ان لوگوں کو ہوتی ہے، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے -

خدا کی دوستی کی پہلی شرط، ایمان کی تکمیل ہے - اس کے دو درجات ہیں :
پہلا یہ کہ کسی آدمی سے کوئی دینی غرض حاصل کرنا چاہیے - مثلاً اُستاد کو حصولِ علم کے لیے دوست رکھنا - لیکن وہ علم آخرت، ہونا ضروری ہے -
اسی طرح اپنے شاگرد سے اس لیے محبت کرنا کہ وہ حصولِ علم کے بعد خدا کی معرفت، حاصل کرے گا -
اگر کسی کو اس لیے صدقہ دے کہ وہ ایسے حاجت مندوں کو جو ایمان والے ہیں کھلاوے کہ وہ عبادت میں مشغول ہونے کا باعث بن جائے، تو یہ دوستی خدا کے لیے ہوگی -
اگر کوئی آدمی اپنی بیوی سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ وہ اس کو بُرائیوں سے بچاتی ہے یا اولاد پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے، یہ دوستی بھی اچھی ہے - اس کو جو آرزو دیتا ہے، وہ بمنزلہ دوستی کے ہے -
دوسرا درجہ یہ ہے کہ دوستی صرف خدا کی وجہ سے اس لیے ہو کہ وہ خدا کا فرمانبردار بندہ ہے - اس کے علاوہ اس سے کوئی غرض مقصود نہ ہو - یہ دوستی خدا کی راہ میں ہوگی - اور اس کا درجہ بہت بلند ہے - بلکہ یہ دوستی عشق کا مرتبہ رکھتی ہے - جس طرح کوئی عاشق اپنے معشوق کے کوچے سے بھی محبت کرتا ہے - اور معشوق کے ہر متعلق آدمی سے محبت کرتا ہے معلوم ہونا چاہیے کہ جس کا ایمان اتنا مضبوط ہو جائے، وہ عشق کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے اور وہ آدمی دنیا کی ہر شئے کو خدا کی بنائی ہوئی سمجھ کر محبت کرتا ہے - اس لیے جناب سرورِ کائنات کے پاس اگر کوئی نیا میوہ آتا، تو اس کو بڑے احترام سے لیتے اور فرماتے کہ اس کا کارخانہ خدا کے نزدیک ہے -
خداوند عالم کی دوستی و محبت دو طرح کی ہوتی ہے -
پہلی وہ محبت، جو نعمت دنیا و آخرت کے لیے ہو -
دوسری، وہ جو صرف خداوند عالم کے لیے ہو - اس میں کسی دوسری چیز کا شائبہ ہی نہ ہو - یہ محبت بڑی عظیم الشان محبت ہے - اس کی تفصیلات آگے چل کر رکن چہارم میں باب صحبت میں بیان کی جائیں گی - اس محبت میں جتنا ایمان بڑھتا جائے گا، اتنا ہی خلوص زیادہ ہوتا رہے گا - یہ محبت صرف بزرگوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے - اگر یہ محبت صرف خلوص کی بناء پر نہ ہوتی، تو انبیاء علیہم السلام کی محبت، ہم لوگوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوتی -
جو آدمی عقلمندوں صوفیوں، نیک لوگوں اور سیدوں سے محبت کرتا ہے، وہ خدا کے لیے ہوتی ہے، لیکن دوستی کا معیار مال کے خرچ کرنے سے معلوم ہوتا ہے - کوئی آدمی اتنا خدا رسیدہ ہے کہ اپنا تمام مال و اسباب یکبارگی راہِ خدا میں لٹا دیتا ہے - جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور کوئی نصف دیتا ہے، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور کوئی اس سے بھی کم دیتا ہے - لیکن کسی مومن کا دل محبت خدا سے خالی نہیں ہوتا، یہ بات دوسری ہے کہ ضعیف ہو -

راہِ خدا میں دشمنی

جو آدمی خدا کے مطیع بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور اس کے دشمنوں مثلاً کفار، ظالم اور فاسقوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ جو خدا کو دوست رکھتا ہے، وہ اس کو دوست رکھتا ہے، جو خدا کو دشمن سمجھتا ہے، وہ اس کو دشمن سمجھتا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی فاسق ہے، لیکن مسلمان ہو، تو اس کو دشمن سمجھے اس لیے کہ وہ فاسق ہے، اور دوست رکھے اس کے لیے وہ مسلمان ہے۔ اس کی دوستی و دشمنی دونوں اس طرح ہوں جیسے کوئی آدمی کسی کے دو بیٹوں میں سے ایک کو انعام دے اور ایک کو نہ دے، تو وہ ایک کے سبب اس کو دوست رکھے گا اور دوسرے کو دشمن۔ یہ بات مشکل نہیں ہے۔

اگر کسی آدمی کے تین بیٹے ہیں۔ ایک عقلمند و فرماں بردار۔ دوسرا بیوقوف و فرماں بردار۔ تیسرا بیوقوف نافرماں بردار۔ اُن میں سے وہ ایک کو دوست رکھتا ہے اور دوسرے کی تذلیل کرتا ہے۔ تیسرے سے محبت بھی کرتا ہے اور دشمنی بھی۔

مختصر یہ ہے کہ جو آدمی خدا کا نافرمان ہے تو تُو بھی اس سے محبت نہ کر۔ اور اتنی اس سے دشمنی رکھ جتنا وہ خدا کا دشمن ہے اور اپنی دوستی و دشمنی ہر معاملے میں اس پر ظاہر کرتے رہو۔ یہاں تک کہ اس کے گناہ پر اس کو سخت و سُست کہے۔ اسی طرح جتنا جتنا وہ خدا کا دشمن ہو، اتنا ہی تیری دشمنی اس سے بڑھتی رہے۔ اسی طرح تیری دوستی بھی کم زور و زیادہ ہوتی رہے، لیکن اگر کوئی آدمی تیرا ذاتی حیثیت سے مخالف ہو، تو اس سے دشمنی نہ کر، بلکہ اس کو معاف کر دے۔ اس لیے کہ اس میں ثواب ہوتا ہے۔ علمائے سابقہ کا عمل اس کے متعلق مختلف رہا ہے۔ بعض نے شرعی نقطہ نظر سے اس میں زیادہ سختی برتی ہے۔ امام احمد بن حنبل اسی گروہ میں ہیں۔ آپ حارث محوسی سے ناراض ہو گئے۔ اس نے ایک کتاب علم منطق کی تصنیف کی تھی، اور اس میں فرقہ معتزلہ کی مخالفت تھی۔ تو آپ نے اس سے کہا کہ تو نے اول اس کی مخالفت کی ہے اور اس مخالفت کے جوابات بعد میں دیے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی اُن مخالف نکتوں کو پڑھ کر ہی فرقے کا مخالف ہو جائے۔

یحییٰ ابن معین نے آپ سے کہا کہ میں اور تو کسی سے کوئی چیز نہیں لیتا، لیکن اگر بادشاہ کوئی تحفہ مجھے دے تو لے لوں؟ تو امام اس پر بہت خفا ہوئے اور اس سے ترکِ گفتگو کر لیا۔ یہاں تک کہ اس نے یہ کہہ کر معافی مانگی کہ میں ہنسی میں کہہ رہا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ کسبِ حلال کھانا دین میں داخل ہے، لیکن دین سے مذاق کرنا اچھا نہیں بعض علمائے دین نے سب قسم کے لوگوں کو مہربانی و عافیت کی نگاہوں سے دیکھنا پسند کیا ہے۔ ایسا آدمی جو صرف توحید پر نظر رکھتا ہے، اس کے نظریات عجیب ہیں۔ وہ سب کو خدا کے قبضۂ قدرت میں سمجھتا ہے اور سب سے

محبت و مہربانی سے پیش آتا ہے، یہ بڑا بلند مرتبہ ہے، اور بعض احمق قسم کے لوگ اس میں دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

بعض لوگ مہربانی ہی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اور توحید میں ہی سب کو دیکھتے ہیں۔ دراصل توحید کے معارف کی پہچان یہ ہے کہ اگر اس کا مال چھین لیں، اس کو سب و شتم کریں، ذلیل کریں اور اس کو ماریں، تب بھی وہ بآسانی برداشت کر لے، اور غصہ نہ آئے اور سب کو بندۂ اخد بیث سمجھ کر محبت سے کام آئے۔

جس طرح سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا دندانِ مبارک شہید ہوا، لیکن آپ فرماتے رہے، کہ اے پروردگار اور رحیم! میری قوم کو ہدایت دے، اس لیے کہ وہ لاعلمی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور اگر کوئی آدمی اپنی ذات کے لیے لڑائی لڑ پڑے، اور خدا کے لیے خاموش رہے تو یہ نفاق اور بیوقوفی ہے یہ توحید نہیں کہ وہ فسق و فجور کو دشمن نہیں سمجھتا۔ اس کو توحید سے کوئی لگاؤ نہیں۔

تفصیلات خداوند عالم کی مخالفت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اسی طرح مخالفین کے ساتھ جس طرح پیش آنا چاہیے۔ اس کے بھی الگ الگ درجات ہیں۔

درجہ اوّل، کفارِ عرب: اُن کے ساتھ دشمنی فرض ہے، اور ان کو یا تو قتل کر دیا جائے یا قید کر لیا جائے۔

درجہ دوم: مذموم لوگ: ان کے ساتھ بھی دشمنی واجب ہے۔ اُن کو ہمیشہ ذلیل سمجھنا چاہیے۔ اُن کی ترقیوں میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہیے۔ اُن کے ساتھ دوستی رکھنا تقریباً حرام ہی ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (یعنی قیامت اور خدا پر ایمان لانے والے اس کے دشمنوں کے ساتھ دوستی نہ کریں۔ ان کو عزت دینا اور مسلمانوں کا حکمران بنا دینا مسلمانوں کی بے عزتی کرنے کے مترادف ہے، جو گناہِ کبیرہ میں داخل ہے۔

درجہ سوم، بدعتی: ان کے ساتھ بھی دوستی نہ کرنا چاہیے، بلکہ اُن کے ساتھ دشمنی کی جائے اور لوگوں کو اُن کا مخالف بنایا جائے، تاکہ نفرت پیدا ہو، ان کو سلام نہ کرو۔ نہ ان کے سلام کا جواب دو۔ کیوں کہ اُن کے پاس جاؤ گے، تو اُن کے فساد سے متاثر ہو گے۔

درجہ چہارم، وہ گناہ جو لوگوں کے لیے باعثِ تکلیف ہو جائے: جیسے ظلم کرنا، جھوٹی گواہی دینا۔ یک طرفہ فیصلہ دے دینا۔ ہجو گوئی کرنے والے۔ ان لوگوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اور ان سے دوستی سخت مکروہ ہے، مگر شرعِ اسلام کے نزدیک حرام نہ ہوگا۔

درجہ پنجم، ان لوگوں کا ہے، جو لوگ بذاتِ خود گناہانِ کبیرہ و صغیرہ کرتے ہیں اور ان کے گناہوں سے کسی دوسرے پر اثر نہیں پڑتا۔ ان لوگوں کو نصیحت کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ قبول نہ کریں، تو ان سے الگ رہنا ہی اچھا ہے۔ ایسے آدمیوں کے سلام کا جواب دینا چاہیے، لیکن ان پر لعنت کرنا روا نہیں۔

ایک آدمی نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں شراب پی، تو ایک صحابی نے اُس پر لعنت کی۔ حضورؐ نے اُن کو منع کیا کہ اس کے لیے شیطان کافی ہے، تم اس کے شیطان کے مددگار نہ بنو۔

باب دوم
شرائط و حقوق دوستی

(دوستی کے شرائط) ہر آدمی سے دوستی رکھنا اچھا نہیں۔ جس آدمی میں حسب ذیل فضائل پائے جائیں، اس سے دوستی رکھے۔

پہلے یہ کہ عاقل ہو، اس لیے کہ بیوقوف سے دوستی رکھنا نتیجے میں نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر نادان دوست کوئی فائدہ بھی پہنچانا چاہتا ہے، تو بھی اپنی بیوقوفی سے نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے چہرے پر نگاہ کرنا بھی اچھا نہیں دراصل بیوقوف وہ ہے، جو امور کے نتائج کو نہ سوچے، اور اگر سمجھایا جائے تو بھی نہ سمجھے۔

دوسرے وہ آدمی نیک خُلق (اچھی عادت والا) ہو۔ بد اخلاق آدمی سے نیکی کی اُمید رکھنا خیال خام ہے جس وقت اس کی وہ رگ زور کرے گی وہ تم کو نقصان پہنچا دے گا۔

تیسرے وہ آدمی جو صلاحیت دوستی رکھتا ہو۔ اگر کوئی آدمی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، اور گناہوں پر اکڑتا ہے، وہ خدا سے نہیں ڈرتا، اور ایسا آدمی یقیناً بداعتماد ہوتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (یعنی ایسے آدمی کی اطاعت نہ کرو، جو غافل ہے، اور اپنی خواہشات کا تابع ہے) اور اگر بدعتی ہے، تو اس کی صحبت تم کو بھی بدعتی بنا دے گی۔ بعض بدعتی لوگوں کا مقولہ ہے، کہ فاسق و فاجر کو گناہوں سے نہ روکو۔ کیونکہ ہم اس کے حاکم نہیں ہیں، اور نہ ہم کو مخلوقِ خدا سے دشمنی کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات اباحت و زندقہ کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے بھی دوستی نہ کرو۔ ان کی یہ بات نہ سختی پر مشتمل ہے نہ نرمی پر۔ شیطان اس کے دل کو آہستہ آہستہ اس عقیدے کی طرف پوری طرح لے آئے گا، اور وہ اباحت و زندقہ میں گرفتار ہو جائے گا۔

حضرت امام جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پانچ قسم کے آدمیوں سے پرہیز کرو۔

۱- جھوٹوں سے، کیوں کہ وہ ہمیشہ دھوکا دے گا۔

۲- بیوقوف سے، کہ نادان دوست بجائے فائدے کے نقصان پہنچائے گا۔

۳- بخیل سے، کہ عین وقت پر تیرا ساتھ چھوڑ دے گا۔

۴- بدطینت سے، کہ تیری ضرورت کے وقت تجھ سے کنارہ کرے گا۔

۵- فاسق و فاجر سے کہ وہ ایک لقمے کے بدلے تجھ کو فروخت کر دے گا، تو لوگوں نے دریافت کیا،

کہ لقمے سے کیا مطلب ہے؟ تو فرمایا کہ حرص۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میں خوش خُو فاسق کو اچھا سمجھتا ہوں، بدطینت قاری سے۔ الہٰذا ایسی صحبت سے یہ تمام خصائل جمع ہو جائیں گے۔ اور اگر محبت کرنا ہے تو نیک اخلاق آدمی کی صحبت اختیار کرو۔ اور اگر دین حاصل کرنا ہے، تو عالم تلاش کرو۔ اور اگر دنیا مقصد ہے تو سخی کو ڈھونڈو۔ ان میں سب کے لیے ایک شرط بھی ہے۔

اِنسان تین قسموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں پہلا تو غذا کی طرح ہے، جس سے پرہیز کرنا ناممکن ہے۔ دوسرا دوا کی مثل کہ وقتِ ضرورت کام میں آنا لازمی ہے۔

تیسرا وہ گروہ ہے، جو محض علت (مرض) کی طرح لگے ہیں۔ کہ ان کی کسی وقت بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُن سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسے آدمیوں کی صحبت اختیار کرو، کہ ان کو تم سے اور تم کو اُن سے فائدہ پہنچے۔

حقوقِ صحبت

(معیارِ دوستی) اگر کسی سے دوستی کا عہد و پیمان ہو گیا تو وہ بالکل نکاح کی طرح ہے۔ اس کے حقوق تجھ پر، اور تیرے اس پر واجب ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے، کہ دو بھائیوں یا دوستوں کی مثال دو ہاتھوں کی سی ہے، جو ایک دوسرے کو برابر سے دھوتے ہیں۔

دوستوں کے حقوق کی دو قسمیں ہیں:

پہلی، مال، دوست کا بہترین درجہ یہ ہے، کہ دوست کو مقدم رکھے، اور اُن کے حق میں ایثار کرے۔ خداوند عالم فرماتا ہے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (یعنی وہ لوگ خود تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ چاہے حاجت مند ہی کیوں نہ ہوں)

دوسری، کہ اس کو بالکل اپنی طرح سمجھے۔

تیسرا درجہ یہ ہے، کہ دوست کو اپنے غلام کی طرح سمجھے، اور اپنی ضرورت سے زیادہ جو چیز ہو وہ اس کے حوالے کر دے، اور اگر وہ تجھ سے سوال کرے گا، تو دوستی کی حدود میں نہیں رہتا۔

(تمثیل) عتبہ بن غلام کا ایک دوست ان کے پاس چار ہزار درہم لینے آیا، تو انھوں نے دو ہزار دینا چاہے۔ دوست نے روگردانی کی، اور کہنے لگا، تمھیں شرم نہیں آتی ہے کہ دوستی حقیقی کا دعویٰ کرتے ہو اور پیسے کو دوست رکھتے ہو۔

(دوست کی اہمیت) ایک خلیفہ وقت سے صوفیوں کی بدائیاں کی گئیں۔ چنانچہ قتل کا حکم ہو گیا۔ حضرت

ابوالحسن نوری سب سے آگے بڑھے، تاکہ وہ سب سے پہلے قتل کیے جائیں۔ خلیفہ اُن سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اوّل تم آگے کیوں بڑھے؟ تو جواب دیا کہ یہ میرے دینی بھائی ہیں۔ کچھ پہلے جان دینا ایثار کا مرتبہ رکھتا ہے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ ایسے ایثار کرنے والے لوگ واجب القتل نہیں ہوتے۔ چنانچہ سب کو چھوڑ دیا گیا۔

فتح موصلی اپنے ایک دوست کے یہاں گئے، لیکن وہ اس وقت مکان پر موجود نہ تھے۔ اس کی کنیز سے اس کا صندوقچہ منگایا، اور کھول کر حسبِ ضرورت اس میں سے لے لیا۔ جب دوست واپس آئے، تو کنیز نے واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کنیز کے اس عمل سے مسرور ہو کر آزاد کر دیا۔

ایک شخص نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں آپ سے بھائی چارہ چاہتا ہوں، تو آپ نے بھائی چارے کی اہمیت دریافت کی کہ تجھ کو اپنی بھائی ہونے کے حقوق معلوم ہیں؟ تو اس نے منع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تیرا کوئی مال مجھ سے الگ نہ رہے گا۔ اور تیرے سونے چاندی میں ہیں برابر کا شریک ہوں گا، تو اس شخص نے منع کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی چارہ تیرے بس کی بات نہیں ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ کسی نے ایک صحابی کو سری بھنوا کر بھیجی، تو انھوں نے کہا کہ مجھ سے زیادہ میرا فلاں دوست اس کا مستحق ہے چنانچہ اس نے اپنے دوسرے دوست کے لیے کہہ دیا۔ نتیجے میں سری کئی جگہ گئی۔ اور آخر میں پھر پہلے صحابی کے پاس آگئی۔

مسروق و خثیمہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے، انھوں نے ایک، دوسرے کا قرضہ ادا کر دیا۔ اور دونوں کو خبر تک نہ ہوئی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ سو درہم صدقہ دینے سے بہتر بیس دوست کے حق میں خرچ کرنا زیادہ اچھے ہیں۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگل سے دو مسواکیں توڑیں، اُن میں ایک سیدھی تھی اور ایک ٹیڑھی۔ حضورؐ نے سیدھی مسواک اپنے صحابی کو عنایت فرما دی۔ صحابی نے عرض کی کہ یہ سیدھی مسواک حضورؐ کے لیے لائق ہے۔ تو ارشاد ہوا کہ قیامت کے دن اس سے سوال کیا جائے گا۔ جس نے کچھ دیر بھی کسی کی مصاحبت کی ہے، کہ تو نے اس کا حق ادا کیا؟ یا اس کے حق کو ضائع کر دیا۔ دراصل یہ حضور کا اشارہ ایثار کی طرف ہے۔

دوسری قسم، دوستوں کی مدد کرنا ہے۔ کہ قبل اس کے سوال کے اس کی مدد کرے۔ اسلاف کا یہ طریقہ رہا ہے کہ دوستوں کے گھر جا کر روزانہ اُن کی خیریت اور کھانے وغیرہ کے متعلق بالتفصیل دریافت کرتے کہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ان کی مدد کرتے وقت خود ان کے ممنون ہوتے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے اہل و عیا[illegible]

کیوں کہ یہ مجھے دین کی یاد دیں اور اہل و عیال دنیا کی۔
(دوستی کے متعلق تمثیلات) ایک بزرگ نے اپنے دوست کے مرنے کے بعد چالیس سال تک اس کے اہل و عیال کی کفالت کی۔
تیسری قسم۔ آدمی ہمیشہ دوستوں کے لیے خوش کلامی سے کام لے۔ اُن کے عیوب کو چھپائے اور اگر کوئی غیبت کرے، تو نہ سنے، جیسا کہ وہ خود اپنے دوست سے امید رکھتا ہے۔ چرب زبانی نہ کرے۔ کیوں کہ اس سے اس کو رنج ہوگا، اور اگر کوئی تعریف کرے تو دوست سے اس کا ذکر کر دے۔ اگر دوست کوئی قصور کرے تو اس کی شکایت نہ کرے اور اس وقت اپنا گناہ یاد کرے کہ وہ اس گناہ سے خدا سے توبہ کرتا ہے، تاکہ اس قصور پہ دوست کو لعن طعن نہ کر سکے۔ اور اگر اس دنیا میں کسی ایسے آدمی کی تلاش ہے کہ وہ بالکل بے خطا ہو، تو اس کے لیے ناممکن ہے۔
(حدیث) حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ مومن ہمیشہ عذر کر لیتا ہے، اور منافق عیوب بینی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ اس دوست سے پرہیز کرو جو تمھاری بُرائی دیکھے تو اس کو اچھالے اور نیکی دیکھے تو چھُپائے، اور ایسے گناہ سے جو معاف کرنے کے لائق ہے اور آدمی معافی مانگے تو معاف کر دے، اور بدگمانی نہ کرے، اس لیے کہ بدگمانی جرم ہے۔
(حدیث) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم نے چار چیزیں مومن پر حرام کی ہیں۔ مالؔ۔ خونؔ۔ غیبتؔ۔ بدگمانیؔ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے لوگو! جو آدمی اپنے بھائی کو سوتے میں ننگا کر دے۔ اس کو تم کیسا سمجھتے ہو؟ تو جواب دیا، کہ یا حضرت! کوئی آدمی اپنے بھائی کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے، تو فرمایا کہ تم لوگ اپنے دوستوں اور بھائیوں کے عیوب، کو اچھالتے ہو۔ یہ اسی عمل کے مترادف ہے۔
(تمثیلات) بزرگوں کا قول ہے کہ اگر کسی سے دوستی کرنا چاہے تو اس پر غصہ کر لے، اور اس کے بعد کسی شخص کو اس کے پاس بھیجے، اگر وہ آدمی تمھارے فرستادہ سے تمھاری عیب چینی کرے، تو اس سے پرہیز کرو، ورنہ اس کو دوست بنا لو۔
دوستی اس آدمی سے کرنا چاہیئے، جو تمھارے حال سے واقف ہو اور اتنا کہ جتنا خدا واقف ہے اور وہ تمھارے بھیدوں کو اتنا ہی چھپائے جتنا کہ خداوند عالم ستار العیوب ہے۔
ایک شخص نے اپنے دوست سے اپنا ایک بھید کہا۔ اس کے کئی دن بعد اس سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ میں تمھاری وہ بات بھول گیا۔
بزرگوں کا قول ہے کہ جو آدمی تم سے مندرجہ ذیل چار وقتوں میں روگردانی کرے وہ دوستی کے لائق نہیں خوشی کے وقت۔ غصہ کے وقت۔ حرص و طمع کے وقت۔ ہوس و خواہشات کے وقت۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تجھ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا مقرب بنایا ہے تو تو اُن کے ساتھ ہر معاملے میں پانچ باتوں کی احتیاط برتنا۔ پہلے اُن کا کوئی راز کسی سے نہ کہنا۔ دوسرے اُن کے سامنے غیبت سے پرہیز کرنا۔ تیسرے کبھی اُن سے جھوٹ نہ بولنا۔ چوتھے حکم کی عدم تعمیل نہ کرنا۔ پانچویں خیانت سے کام نہ لینا۔

دنیا میں سب سے زیادہ دوست کو ناراض کرنے والی چیز اس سے مباحثہ اور اس کے خیالات سے اختلاف کرنا ہے۔ اس لیے کہ اس سے اس کی اہانت ہوتی ہے، جو اس کو تیرا دشمن بنا دے گی۔

(حدیث) سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے دوست کی مخالفت نہ کرو۔ اس سے وعدہ خلافی نہ کرو۔ بزرگوں کا قول ہے کہ جب، تو اپنے دوست سے کہیں جانے کو کہے اور وہ تجھ سے "کہاں جانے کو" دریافت کرے تو وہ آدمی دوستی کے لائق نہیں ہے۔

(مثال) ابو سلیمان دارانی نے فرمایا، کہ میرا ایک دوست جس سے میں ہر چیز لے لیا کرتا تھا، لیکن ایک دن ایک چیز اس سے مانگی اور اس نے اس کے متعلق مجھ سے دریافت کیا کہ کتنی چاہیے؛ اس دن سے میرے دل میں اس کی وہ عظمت نہ رہی۔

(تنبیہ) دوستی اور محبت ہر بات میں موافقت سے ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ زبان سے محبت و دوستی کا اظہار کیا جائے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کسی کو دوست سمجھو، اس کا اظہار اس سے کر دو، تاکہ اس کو بھی تمھاری محبت ہو جائے۔ اور اس طرح دونوں میں محبت دن دونی ہوتی ہے۔ دوست کو چاہیے کہ اپنے دوست کے حالات مفصل طور پر معلوم کرے اور اُن سے خبردار رہے۔ ہر حال میں اس کا شریکِ کار رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دوستی تین باتوں سے مستحکم ہوتی ہے۔

پہلے، دوست کو اچھے نام سے پکارے، اور بلائے۔

دوسرے، کوشش کرے کہ اوّل خود سلام کرے۔

تیسرے، اوّل اس کو بیٹھنے دے، بعد میں خود بیٹھے

اِن کے علاوہ اس کی غیبت میں ہمیشہ اس کی تعریف کرے۔ اس کے ہر عمل کا شکریہ ادا کرے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ جو آدمی دوست کا شکر گزار نہیں ہوتا، تو گویا اس نے نیک کام پر شکر ادا نہ کیا۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے دو بیلوں کو جو ایک ہی جگہ بندھے ہوئے تھے، دیکھا۔ ایک بیل کھڑا ہوا، تو

دوسرا بھی کھڑا ہوگیا۔ تو آپ نے فرمایا، کاش کہ آدمی بھی ایسے ہی ایک دوسرے کے دوست ہوتے۔

پانچویں قسم یہ ہے، کہ علم دین سکھانے میں کوتاہی نہ کرے۔ دوست کو جہاں تک ہوسکے سکھائے، تاکہ وہ نیک راستے پر آجائے۔ دوست کو اگر نصیحت کرنا ہو تو تنہائی میں کرے۔ ورنہ باعثِ دشمنی ہو جاتا ہے اور نرمی سے پیش آئے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن، مومن کا آئینہ دار ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے عیوب کو سمجھ سکیں۔ اگر کوئی دوست تنہائی میں تجھ کو گناہوں سے تنبیہ کرے تو اس پر ناراض نہ ہو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ جو آدمی میرے عیوب مجھ کو بتائے خداوند عالم اس پر اپنی رحمت نازل کرے۔ ایک بار حضرت سلمان آپ کے پاس آئے، تو فرمایا کہ سچ بتاؤ تم نے مجھ میں کیا برائی دیکھی۔ حضرت سلمان نے کہا کہ مجھے معاف کرنا، تو فرمایا، کہ تم ضرور کہو! تو کہا کہ میں نے سُنا ہے، کہ آپ کے دسترخوان پر دو قسم کا کھانا ہوتا ہے، اور دو قمیضیں استعمال کرتے ہیں۔ ایک دن کو دوسری رات کو۔ تو آپ نے فرمایا یہ دونوں غلط ہیں، اور کوئی بتاؤ! تو انھوں نے کہا، بس۔

حضرت حذیفہ مرعش نے حضرت یوسف اسباط کو خط میں لکھا، کہ میں نے سُنا ہے کہ تم نے اپنا دین دو سکوں میں فروخت کر دیا۔ جب تم نے ایک شے مالک سے خرید لی اور قیمت جو اس نے بتائی تم نے اس میں کمی کرالی اور وہ کمی صرف تمھاری ذات کو دیکھ کر کر دی کہ تم متقی اور پرہیز گار رہتے، لہٰذا اس بات کو چھوڑ دو۔

مجھے اس شخص سے ڈر لگتا ہے کہ جو علم قرآن حاصل کرے اور دنیا کی محبت بھی اس کے دل سے نہ جائے وہ گویا کہ کلام خدا کا مضحکہ اُڑاتا ہے۔ خداوند عالم نے جھوٹوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے (کہ جھوٹے ناصحوں کو دوست نہیں رکھتے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مغرور ہیں، اور اپنے عیوب کو نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر تو ان کی عیب بینی کرے تو تنہائی میں کر۔ البتہ اگر تیرا ذاتی قصور وار ہے، تو اس کو نظر انداز کر دو۔ لیکن اگر وہ قاطع دوستی ہو جائے، تو تنہائی میں اس کو ڈانٹ دے۔

دوست کی دوستی سے اپنے کو مہذب اور با اخلاق بنانا مقصود ہونا چاہیے حضرت ابوبکر کتانی علیہ الرحمۃ کا قول ہے، کہ ایک آدمی میرے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن مجھے اس کی باتیں ناگوار گزرتی تھیں۔ میں نے ایک چیز اس کو صرف اس غرض سے دے دی۔ کہ میری گرانی دُور ہو جائے۔ مگر میرا وہ تکدر اس سے بھی دور نہ ہوا۔ میں اس کو گھر لے گیا اور کہا کہ وہ میرے مُنہ پر کھڑا ہو جائے، لیکن اس نے منع کر دیا، لیکن میں پھر بھی مُصر ہوا۔ یہاں تک کہ وہ پیر کے تلووں کو میرے چہرے پر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میرا تکدر دور ہوگیا۔

حضرت ابو علی رباطی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ایک بار میں عبد اللہ رازی کے ساتھ سفر کو گیا تو عبد اللہ رازی نے مجھ سے کہا کہ راستے میں تم میرے بزرگ بنو گے یا میں تمھارا۔ میں نے ان سے کہا، کہ تم۔ انھوں نے کہا کہ میرے ہر حکم

کی پیروی کرنا ہوگی ۔ میں نے مان لیا ۔ انھوں نے ایک، توبڑہ مانگا ۔ میں نے دے دیا ۔ چنانچہ اس میں زادِ راہ رکھ کر سفر کو چل دیئے ۔ میں نے ہر چند وہ سامان اُن سے مانگا ۔ لیکن انھوں نے مجھ کو نہ دیا ۔ اور آخر میں کہنے لگے میں تمھارا سردار ہوں ، میرے حکم کی تعمیل کرو ، اور خاموش چلے چلو ! اثنائے سفر میں ہی ایک رات کو بارش ہوئی ، تو رات بھر میرے اوپر کمبل تانے رہے ۔ اور اگر میں کوئی اعتراض کرتا ، تو پھر اپنی سرداری کو جتاتے ۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کاش میں نے اُن کو اپنا سردار نہ بنایا ہوتا ۔

چھٹی قسم ۔ دوست کی تقصیر اور گناہ کو معاف کر دینے میں ہے ۔ اگر تیرا دوست تیرا کوئی قصور کرے تو ستر بار اس سے تو ہی معافی مانگ ! اور اگر تیرا نفس مخالفت کرے ۔ تو تو اپنے کو بد خصلت سمجھ ! اور سوچ کہ تیرے دوست نے تجھ سے اتنی بار معافی مانگی ، مگر تو نے معاف نہ کیا ، اور اگر کوئی دینی گناہ کیا ہے ، تو اس کو نہایت نرمی سے سمجھا دے ، تاکہ وہ دوبارہ نہ کرے ، اور اگر وہ اس گناہ پر اصرار نہ کرے تو اس سے انجان بن جا ۔ صحابہ اس مسئلے میں مختلف آراء رکھتے ہیں ۔

(مسئلہ) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی کو تُو نے خدا کے لیے دوست بنایا تھا اور وہ اسی کا گناہ کرتا ہے ، تو اسی کے لیے اس سے کنارہ کش ہو جاؤ !

حضرت ابودردا ، اور ایک جماعت دوستی کو قطع کرنے کی طرف نہیں ہے ، کیونکہ اس طرح اس کے توبہ کر لینے کی اُمید ہوتی ہے ۔

حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ تمھارا دوست گناہ کرتا ہے ، تو اس کو نہ چھوڑو ، ہو سکتا ہے کہ کل تائب ہو جائے ۔

(حدیث) حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ عالم سے قطع تعلق نہ کرو ، ہو سکتا ہے کہ وہ کل کو اپنے گناہوں سے باز آجائے ۔

(قصہ) دو بزرگانِ دین آپس میں بڑی دوستی رکھتے تھے ۔ ان میں سے ایک کسی پر عاشق ہو گئے اور اپنے دوست سے کہنے لگے کہ میں مرضِ عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں ، اچھا ہے ، کہ تم میری دوستی کو چھوڑ دو ! تو انھوں نے کہا کہ نعوذ باللہ میں ایک گناہ کی وجہ سے تم سے تعلق ختم نہیں کر سکتا ، اور قسم کی کہ جب تک خدا میرے دوست کو راہِ نجات نہ دکھائے گا ، میں کھانا نہ کھاؤں گا ۔ اور چالیس دن تک اس نے کھانا نہ کھایا پھر اپنے دوست سے دریافت کیا ، مگر اب بھی وہ ہی جواب ملا ۔ پھر انھوں نے اسی حال پر صبر کیا ۔ وہ بھوک کی وجہ سے انتہائی کمزور ہو گئے ۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ دوست آئے اور کہا کہ خدا کا احسان ہے کہ اس نے مجھے عشق سے نجات دلائی ۔ اس کے بعد انہوں نے کھانا کھا لیا ۔

(قصہ) ایک آدمی سے لوگوں نے کہا کہ تمہارا بھائی دین سے بھٹک گیا ہے۔ تم اس سے کنارہ کشی کیوں نہیں اختیار کرتے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کو آج کل ایک مشیر کی ضرورت ہے۔ چوں کہ وہ صحیح الدماغ نہیں رہا۔ بھلا ایسی صورت میں اس کو کیسے چھوڑ دوں۔ بلکہ اسے مفت میں سمجھانا اور راہِ راست پر لانا میرا فرض ہے۔

بنی اسرائیل میں دو دوست پہاڑ پر عبادتِ خدا میں مشغول رہتے۔ اتفاق سے اُن میں سے ایک شہر میں آیا اور ایک آوارہ عورت پر عاشق ہوگیا اور پھر پہاڑ پر واپس نہ گیا۔ کئی دن انتظار کے بعد دوسرا دوست اس کی تلاش میں آیا اور جب لوگوں سے اس کا ماجرا سُنا تو اس کے پاس جاکر سلام کیا۔ اس نے کہا میں تجھ کو نہیں جانتا اس شخص نے جواب دیا، کہ میں بھی سب سے پہلے تجھ کو نہیں جانتا تھا۔ اور وہیں رہا۔ اس کے اس عمل سے اُسے کچھ اطمینان ہوا، کہ میں ابھی تک اس کی نظروں میں ذلیل نہیں ہوا ہوں چنانچہ وہ توبہ کرکے اس کے ساتھ پہاڑ پر چلا گیا۔

(قصہ) لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت ابوذر علیہ الرحمۃ کا یہ طریقہ اچھا ہے، اور حضرت ابوالدرداء کا طریقہ فقیہانہ ہے چونکہ گناہوں کے زمانے میں ایک رفیق کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس کو سمجھا کر راہِ راست پر لائے۔ تو ایسے میں بھلا اس کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ (یعنی اگر تمھارے قریب والے لوگ گناہوں میں مبتلا ہوں تو ان کے اعمال سے بیزاری ظاہر کرو، اُن کی ذات سے نہیں)

لوگوں نے حضرت ابوالدرداء سے دریافت کیا، کہ آپ اپنے بھائی سے بیزار کیوں نہیں ہوئے، وہ بھی تو گنہگار ہیں۔ تو آپ نے کہا کہ میں اس کے گناہوں کا دشمن ہوں، اس کی ذات کا نہیں۔ لیکن اگر اوّل سے معلوم ہوجائے کہ یہ آدمی گنہگار ہے، تو اس سے دوستی نہ کرے۔ دوستی نہ کرنا خیانت نہیں ہوتا، بلکہ دوستی کو قطع کر دینا خیانت میں داخل ہے۔ وہ گویا کہ اس صحیح راستے کو چھوڑ دیتا ہے، جو اس کو دوستی سے حاصل ہوتا۔ اس مسئلے میں یہاں تک تمام علماء کو اتفاق ہے۔

اگر وہ تیرا ذاتی قصور کرے تو معاف کر دے۔ چاہے تو اس کی معافی کو جھوٹا ہی سمجھ رہا ہو، لیکن اس کو معاف کر دینا چاہیے۔

(حدیث) جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ اگر دوست معافی مانگے اور معاف نہ کرے تو یہ گناہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی مسلمان راستے میں مسلمانوں سے خراج وصول کرے اور فرمایا کہ مومن کی پہچان ظاہر ہے، کہ اس کو جلدی غصہ آئے اور جلد ہی خوش ہوجائے۔

ساتویں قسم یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو دعائے خیر دیتا رہے۔ اس کی زندگی میں بھی اور بعد مرنے کے بھی۔ کیونکہ یہ دعا اس کی اپنے لیے باعثِ برکت ہوتی ہے۔

(حدیث) جنابِ سرورِ کائناتؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اپنے دوست کے لیے اس کے پیچھے دُعا کرتا ہے، تو فرشتہ اس سے کہتا ہے، کہ یہ دُعا تیری ذات کے لیے قبول ہو رہی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ خداوند عالم اس شخص کی دعا جو اپنے دوستوں کے لیے کرتا ہے، پہلے خود اس کے حق میں قبول کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ جو دُعا دوستوں کے پیچھے اُن کے لیے کی جائے، وُہ ضرور قبول ہوتی ہے۔

دوست وہ ہے، جو تیری موت کے بعد تیرے لیے دُعا کرے اور اس کو ہر وقت یہ خیال ہو کہ وہاں تجھ پر کیا بیتی؟

(عملِ سرورِ کائناتؐ) حضورِ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے، کہ مُردہ قبر میں اسی طرح ہے کہ جیسے پانی میں آدمی ڈُوب رہا ہو، اور ہاتھ پیر مارتا رہے۔ بالکل اسی طرح وہ مُردہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کی دُعاؤں کا منتظر رہتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ زندہ کی دُعاؤں کو ایک نورانی طباق میں آراستہ کر کے مُردے کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ فلاں شخص کی طرف سے تمھارا ہدیہ ہے۔ وہ اس وقت اسی طرح خوش ہوتا ہے، جیسے زندہ کسی کا تحفہ لے کر۔

(عملِ سرورِ کائناتؐ) ایک بُڑھیا جنابِ سرورِ کائناتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہُوئی۔ تو حضورؐ نے اس کی بہت تعظیم کی صحابہ کو اس عمل پر بڑا تعجب ہوا۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ عورت جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں آتی تھی۔ لہٰذا اس سے اسی شفقت سے اب بھی پیش آتا ہوں۔

دوسری قسم: دوستی اور محبت کے حقوق کی وفا ہے، کہ جب کسی آدمی سے دوستی ہو تو اس کے ملنے والوں اور اعزا و اقربا، حتیٰ کہ اس کے نوکروں سے بھی ملائمت اور مہربانی سے پیش آئے، اور جو آدمی اس پر احسان کرے، اس کا اثر دل سے قبول کرے، اور اگر کسی وقت کسی بڑے مرتبے پر پہنچ جائے تو اپنے پہلے دن نہ بھُولے۔ دوستوں سے غرور نہ کرے، اور وفا کے معنی یہ ہی ہیں، کہ دوستی کو کسی وقت قطع نہ کرے۔ شیطان اس کام کو انتہائی اہم سمجھتا ہے۔ کہ دو دوستوں کو الگ کر دے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَنْزَغُ بَیْنَہُمْ (یعنی بیشک شیطان ان میں فتنہ و فساد پیدا کرتا ہے) حضرت یوسف علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطَانُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ (یعنی اس کے بعد شیطان نے فساد برپا کیا، میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان) وفا اس کا نام ہے، اگر کوئی آدمی دوست کی طرف سے چڑھائے تو بدظن نہ ہو بلکہ چڑھانے والے کو جھوٹا سمجھے۔

نویں قسم یہ ہے، کہ دوست سے کسی قسم کا کوئی تکلف نہ کرے، اور اس کے ساتھ بالکل گھر کی طرح رہے اور اگر تکلف ہوگا تو دوستی نامکمل ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بدترین دوست وہ ہے جس کو تجھ سے معذرت کرنے میں تکلف ہو۔ حضرت جنید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں نے بہت دوست دیکھے، مگر ایسا نہیں دیکھا کہ کوئی دوست اپنے دوست کی دقت اور خوف کا سبب بن گیا ہو، لیکن اگر وہ عیب دار ہو۔ بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ اہلِ دنیا کے ساتھ مؤدبانہ زندگی گزارو! اہلِ آخرت کے ساتھ تعلیم کے ذریعہ اہلِ معرفت کے ساتھ اس طرح کہ جیسے تمہارا دل چاہے۔

غیر صوفی آپس میں اس شرط پر ایک جگہ رہتے تھے، کہ اگر اُن میں سے ایک آدمی کوئی بھی عمل کرے تو دوسرا اس کی وجہ نہ پوچھے۔ مختصر یہ ہے۔ کہ خدا کے لیے دوستی کرنا، آپس میں یگانگت کے مترادف ہے اور یگانگت میں تکلف کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

دسویں قسم یہ ہے، کہ دوستوں کے مقابل میں اپنے کو حقیر سمجھے، اور ان سے کسی چیز کی توقع نہ رکھے۔ ان کے تمام حقوق کا ہر وقت خیال رکھے۔

ایک آدمی نے حضرت جنید علیہ الرحمۃ سے کہا، کہ آج کل دوست نہیں ملتے، اور بار بار یہی کہتا رہا، تو آپ نے جواب دیا، کہ اگر تو اپنی خدمت گذاری کے لیے دوست کا متلاشی ہے، تو البتہ تجھ کو نہ ملے گا۔ اور اگر تو کسی کی خدمت چاہتا ہے، تو البتہ بہت سے مل جائیں گے۔

بزرگانِ دین کا قول ہے، کہ دوستوں پر اپنے کو فوقیت دینے والا آدمی گنہگار ہوتا ہے، اور وہ دوست اس کے حق میں گناہ گار ہوتے ہیں۔ اور دوستوں سے کم تر سمجھنے والا خود بھی راحت پاتا ہے، اور اس کے دوست بھی ابو معاویہ الاسود رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے، کہ میرے دوست سب مجھ سے افضل و برتر ہیں۔

باب سوم

حق الناس ادا کرنا

دوستوں، عزیزوں کے حقوق اور مروّت کا برتاؤ

معلوم ہونا چاہیے کہ ہر آدمی کے اوپر اس کے دوستوں عزیزوں، اور ملنے والوں کے حقوق مختلف طور پر عائد ہوتے ہیں۔ جس طرح وہ قرابت یا محبت بدلتی رہے گی ویسے ویسے وہ حقوق بھی بدلتے رہیں گے۔

انسان کے لیے سب سے زیادہ عزیز ترین خدا ہے، لہٰذا اس کے حقوق سب سے زیادہ ہیں، جن کی تفصیلات لکھ دی گئی ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے ساتھ دینی بھائی چارہ ہو، اُن کے حقوق کے درجات کو روابط و ضوابط کے ماتحت اس طرح تقسیم کر دیا گیا ہے۔

پہلے جو بات اپنے لیے ناپسند ہو، وہ کسی دوسرے مسلمان کے لیے پسند نہ کرو۔

(حدیث حقوق) رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے، کہ مسلمان آپس میں ایک جسم کے مختلف اعضا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن میں سے کسی عضو کو بھی تکلیف ہوگی، تو سب کو تکلیف پہنچنا ضروری ہے۔ لہٰذا آپس میں مراعات و محبّت کرنا اپنے کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اگر کوئی آدمی دوزخ سے ڈرتا ہے تو موت کے وقت کلمہ لاالٰہ الاّ اللہ زبان پر جاری رکھے۔

ایک بار جناب موسیٰ علیہ السّلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی، کہ بارِ الٰہا! تیرے نزدیک عادل ترین کون ہے۔ جواب آیا کہ جو اپنے میں خود انصاف کرے۔

دوم: مسلمان اس کے بُرے برتاؤ سے محفُوظ رہیں۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے صحابہ سے فرمایا، کہ مسلمان وہ ہے، جس کے عمل سے مسلمانوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ صحابہ نے عرض کی، کہ مومن کا کیا درجہ ہے؟ تو حکم ہوا کہ جو مسلمانوں کے لیے سلامتی کا باعث ہو۔ پھر عرض کی، کہ مہاجر کی کیا تعریف ہے، تو حکم ہوا کہ کارہائے بد سے پرہیز کرنے والا۔ کسی مسلمان کے لیے ایسا اشارہ کرنا بھی برا ہے، جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچا سکے۔

حضرت مجاہد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ دوزخی سب کے سب خارش میں مبتلا ہوں گے اور اتنا کھجائیں گے کہ ہڈیاں نکل آئیں گی۔ اس وقت فرشتہ ندا دے گا کہ تم نے مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی ہے۔ اس لیے اس سزا میں گرفتار ہو۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے، کہ میں نے بہشت میں ایک آدمی کو ہر جگہ آزادی کے ساتھ پھرتا ہوا دیکھا، معلوم کیا، تو اس نے ایک درخت کو ایسی جگہ سے کاٹ دیا تھا، جہاں مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی تھی۔

سوم: کسی کے ساتھ تکبر و غرور سے پیش نہ آئے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم نے مجھے عاجزی اور انکساری کی تعلیم دی۔ اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے، کہ تم جس کو حقیر سمجھتے ہو، وہ خدا کا دوست ہو۔ کیونکہ خداوند عالم کے محبّ چھپے ہوئے ہوتے ہیں، تاکہ ان سے کوئی آدمی تعرّض نہ کر سکے۔

چہارم: کسی کی چغل خوری نہ سُنے۔ اس لیے کہ چغل خور فاسق ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ کوئی چُغل خور جنّت میں نہ جا سکے گا۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی تیرے سامنے دوسرے کو بُرا کہہ رہا ہے، وُہ تجھ کو دوسروں کے سامنے بُرا کہہ سکتا ہے۔ ایسے آدمی سے پرہیز ہی بہتر ہے۔

پنجم: یہ کہ کسی دوست سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے حضورؐ کا حکم ہے کہ تین دن سے زیادہ

کسی دوست سے ترک کلامی کرنا حلال میں داخل نہیں ہے۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ جناب یوسف کو خداوند عالم نے صرف اس لیے معاف کر دیا، کہ انھوں نے اپنے بھائیوں کی غلطی معاف کر دی۔

ششم: یہ کہ اپنے دوست کے ساتھ نیکی کرے، چاہے وہ سلوک کا اہل نہ ہو، تو تُو اپنی اچھی عادت کیوں چھوڑتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومنیت کے بعد دوستی کا درجہ ہے۔ چاہے دوست کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ جو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ باتیں کرنے کے لیے پکڑ لیتا۔ تو حضورؐ کبھی نہ الگ کرتے، اور اس کی طرف بڑی محبت سے متوجہ ہوتے۔ جب تک وہ اپنی پوری بات کہہ کر مطمئن نہ ہو جاتا۔

ھفتم: یہ کہ، بزرگوں کی عزت کرے، اور بچوں پر نظرِ رحم رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی بزرگوں کی عزت نہیں کرتا، اور نہ بچوں پر شفقت ہوتا ہے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اور سفید بالوں والے آدمیوں کی تعظیم، خدا کی تکریم کے برابر ہے۔ جو آدمی جوانی میں اپنے بزرگوں کی عزت کرے گا۔ خداوند عالم بڑھاپے میں اس وقت کے جوانوں سے اس کی عزت کرائے گا۔ اور اس کی عمر میں درازی ہو گی۔ تاکہ وہ اپنا بدلہ دنیا ہی میں دیکھ لے۔ آنحضرتؐ بچوں کو اپنی سواری کے آگے پیچھے بٹھا لیتے، تو بچے آپس میں فخر کرتے کہ ہم کو آگے بٹھایا، تم کو پیچھے۔

ایک بار نوزائیدہ بچے کو آنحضرتؐ کی خدمت میں لائے، اور اس کا نام تجویز کرنے کے لیے استدعا کی۔ حضورؐ نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ بچہ اس وقت پیشاب کرنے والا تھا، تو اُن لوگوں نے بچے کو حضورؐ کی گود سے لے لینا چاہا۔ مگر سرکار نے اس کو پیشاب کرنے دیا۔ اور اس کے باپ کی رنجیدگی کی وجہ سے اس نجاست کو اس کے سامنے نہ دھویا، اور بالکل چھوٹے بچے کے پیشاب کو بجائے دھونے کے اپنے کپڑے پر پانی چھڑک لیتے۔

آٹھواں: یہ کہ ہر مسلمان کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے اور سب کے سامنے خوش رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ کشادہ رو آسان گیر کو دوست رکھتا ہے اور فرمایا کہ جو نیک کام مغفرت کا موجب ہے وہ آسانی کشادہ پیشانی اور شیریں زبان ہے۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ ایک غریب عورت ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور عرض کی کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جہاں جی چاہے بیٹھ جا، اور وہاں بیٹھ کر اس کی تمام حاجتیں سُنیں۔

(وعدہ خلافی) نہم: یہ کہ مسلمانوں سے وعدہ خلافی نہ کرے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حسب ذیل تین افعال کا مرتکب منافق ہوتا ہے۔ چاہے وہ نماز بھی پڑھے۔ پہلے جھوٹا۔ دوسرا وعدہ خلاف۔ تیسرا خائن۔

دہم: یہ کہ ہر آدمی کی عزت اس کے درجے کے مطابق کرنا چاہیے، جس آدمی کو اچھے کپڑے اور سواری

پر دیکھے، تو اس کو سمجھے کہ وہ باوقار آدمی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ، ایک بار سفر میں تھیں، جب دستر خوان سامنے آیا، تو ایک فقیر آگیا، تو آپ نے باریک چپاتی اس کو دینے کے لیے حکم دیا۔ اتنے میں ایک سوار بھی آنکلا، تو اس سوار کو اپنے پاس بلوالیا۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، کہ آپ نے فقیر کو نظر انداز کر کے سوار کو کیوں بلایا؟ تو فرمایا کہ جس کو خدا نے عزت دی ہے، اس کی میں بھی عزت کرتی ہوں۔ درویش تو ایک روٹی میں خوش ہو جاتا ہے، اور اگر یہی سلوک اس سوار یا کسی امیر کے ساتھ کیا جائے تو حسبِ مراتب نہ ہوگا۔

(تمثیل) حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ کسی قوم کا بھی بڑا آدمی تمھارے پاس آئے تو اس کی تعظیم کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے لیے اپنی چادر بچھادی اور اس کو اس پر بٹھایا۔ ایک بزرگ عورت جس نے حضرت کو دودھ پلایا تھا، آپؐ کے پاس حاضر ہوئی۔ آپؐ نے اس کو اپنی چادر پر بٹھایا اور فرمایا کہ اے مہربان ماں! جو چاہے مانگ! اور مالِ غنیمت میں سے جو حصہ حضورؐ کو ملا تھا۔ اس کو عنایت فرما دیا۔ اور اس بڑھیا نے وہ سب مال حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

گیارھواں - اگر دو مسلمانوں میں لڑائی ہو، تو اُن میں صلح کرانے کی کوشش کرے۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ نماز۔ روزہ اور صدقے سے زیادہ بہتر مسلمانوں کے آپس میں صلح و دوستی کرانا ہے۔ ایک بار حضورؐ مسکرائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے سبب دریافت کیا، تو فرمایا، کہ روزِ قیامت، دو قسم کے آدمی بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہوں گے۔ اُن میں ایک اپنی داد چاہے گا۔ دوسرے کے مقابلے میں۔ تو ارشاد رب العزت ہوگا، کہ اس کا حق اس کو دیا جائے۔ دوسرا آدمی عرض کرے گا، کہ میری تمام نیکیاں لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ اب میرے پاس کچھ نہیں۔ تو خداوندِ عالم اس سے دریافت کرے گا، کہ اب تو اس سے کیا چاہتا ہے، تو وہ اپنے گناہوں کو اس کے سپرد کرنا چاہے گا، تو اس کے گناہ دوسرے آدمی کو دے دیئے جائیں گے، لیکن بدلہ پھر بھی اپنے مقام پر باقی رہے گا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمہائے مبارک سے آنسو گرے۔ اور ارشاد ہوا کہ اس دن ہر آدمی اپنی داد کا طالب ہوگا۔ اور اپنے گناہوں کو دوسروں پر لادنے کی کوشش کریگا۔ حکم رب العزت ہوگا، کہ تم کیا دیکھتے ہو۔ وہ شخص کہے گا، کہ میرے سامنے ایک مرصع شہر ہے جس میں جواہرات کے محلات تعمیر ہیں۔ اور عرض کرے گا کہ یہ کس کے لیے بنائے گئے ہیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے جواب آئے گا، کہ جو آدمی اس کی قیمت ادا کر دے۔ آدمی عرض کرے گا کہ اس کی قیمت کون دے سکتا ہے۔ ندا آئے گی، کہ تو! اس نے کہا کہ کیسے؟ جواب آئے گا، کہ اپنے بھائیوں کے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ وہ معاف کر دے گا، پھر وہ دونوں جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ خدا سے ڈرو، اور آپس میں صلح رکھو۔ اس لیے کہ خداوند عالم سب مسلمانوں کی بروزِ قیامت صلح کرائے گا۔

بارھویں - مسلمانوں کے عیوب کو چھپائے - حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ دُنیا میں جو آدمی لوگوں کے عیوب چھپاتا ہے، خداوند عالم آخرت میں اس کے عیوب کو نظر انداز کرے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی چور اور بدمعاش اور شرابی کو بھی پکڑتا ہوں تو خواہش ہوتی ہے کہ خداوند عالم اس کے گناہوں کو چھپاتے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اے مسلمانو! زبان سے ایمان لاؤ - اس لیے کہ ابھی تمھارے قلوب ایمان سے روشن نہیں ہوئے ہیں. لوگوں کی غیبت اور عیب بینی نہ کرو - ابن مسعود رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جب ایک آدمی چوری کرتا ہوا پکڑا گیا، اور اس کا ہاتھ کاٹنے کے لیے بارگاہِ نبوی میں پیش کیا گیا، تو آنحضرت اس وقت رنجیدہ ہوئے - لوگوں نے سبب دریافت کیا، تو ارشاد ہوا کہ جب خداوند عالم چاہتا ہے، کہ اپنے دوستوں کے گناہوں کو نظر انداز کرو - تو میں اس کی حکم عدولی کیسے کروں، اور کیوں نہ اس کے گناہ کو پوشیدہ رکھوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک رات کو شہر کا گشت کر رہے تھے - ایک گھر سے گانے کی آواز سنی - تو آپ چھت پر چڑھ گئے، اور دیکھا کہ وہ ایک عورت کے ساتھ شراب پی کر بدمستی میں مبتلا ہے - تو فرمایا کہ تو سمجھتا ہے کہ خداوند عالم تیرے گناہوں کو نہیں دیکھ رہا - اس نے کہا کہ امیرالمومنین! جلدی نہ کیجئے! میں ایک گناہ کر رہا ہوں، اور آپ تین گناہوں کے مرتکب ہوئے - خدا کا حکم ہے کہ کسی کے عیب تلاش نہ کرو، اور آپ ڈھونڈ رہے ہیں - خدا کا حکم ہے کہ گھروں کے اندر دروازوں سے داخل ہو، لیکن آپ چھت پر چڑھ کر آئے - خدا کا حکم ہے لَا تَدۡخُلُوۡا بُيُوۡتًا غَيۡرَ بُيُوۡتِكُمۡ حَتّٰى تَسۡتَاۡنِسُوۡا وَتُسَلِّمُوۡا عَلٰٓى اَهۡلِهَا (یعنی اپنے گھر کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہو) اور داخل ہونے پر اہل خانہ کو اوّل سلام کرو - آپ بلا اجازت آئے اور سلام بھی نہ کیا، تو آپ نے فرمایا، کہ اگر میں معاف کر دوں، تو توبہ کرے گا؟ اس نے وعدہ کیا، اور توبہ کر لی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ جو آدمی دوسروں کے عیبوں کو تلاش کرتا ہے - اس کے کانوں میں روزِ حشر سیسہ پلایا جائے گا۔

تیرھویں - کسی پر الزام نہ لگائے - تاکہ مسلمان گناہ سے پرہیز کریں - کیونکہ جو آدمی دوسرے کا گناہ بتاتا ہے خود بھی گنہگار ہوتا ہے - حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے، تو گویا کہ وہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا مرتکب ہوا۔

ایک بار آخر رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع جناب صفیہ رضی اللہ عنہا کے مسجد میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے - دو آدمی سامنے سے گزرے - حضورؐ نے ان کو بلا کر فرمایا کہ یہ میری حرم ہیں - اُنھوں نے کہا معاذ اللہ!

سرکار کی طرف سے کون بدگمان ہو سکتا ہے۔ تو حضورؐ نے کہا، کہ میں نے احتیاط برتی۔ اس لیے کہ شیطان ہر آدمی کی رگ رگ میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔

ایک بار ایک آدمی راستے میں اپنی عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دُرّے لگائے۔ اُس نے کہا، یہ میری بیوی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ تنہائی میں باتیں کیوں نہیں کرتا؟ کہ لوگ تجھ کو نہ دیکھ پائیں

چودھویں، یہ کہ حتی المقدور مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ مجھ سے حاجت بیان کرو، تاکہ پوری کردوں، اور حاجت روائی میں دیر اسی لیے کرتا ہوں کہ شاید تم میں کوئی آدمی یہ ثواب کمالے۔ اور خوش کلامی سے بہتر کوئی صدقہ نہیں ہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کس طرح؟ تو حضورؐ نے فرمایا، کہ اگر تمھاری وجہ سے کسی کی جان بچ جائے، یا فائدہ پہنچ جائے، یا وہ تکلیف سے بچ جائے۔

پندرھویں، یہ کہ جب کسی کو کسی کا مال غصب کرتے ہوئے دیکھے تو اس کی طرف سے اس کو روکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان پر کہیں اگر ظلم ہو رہا ہے اور اس کی مدد کی جائے تو خداوند عالم اس کی امداد کے وقت رد کرتا ہے، اور اگر اس کے خلاف کرے گا، تو خداوند عالم کی نگاہوں میں ذلیل ہوگا۔

سولھویں، اگر کسی مسلمان کو بُری صحبت میں دیکھے، تو اس وقت تک اس سے کوئی دوستی نہ کرے۔ لیکن فوراً سختی بھی نہ کرے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ، اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (یعنی لوگوں کی بُرائی کا مقابلہ رواداری اور اسلام کرنے سے کرو) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار ایک شخص نے بارگاہِ رسالت میں باریابی کی درخواست کی۔ اس کو حضورؐ نے بلا لیا، اور فرمایا کہ یہ اپنی قوم کا بدترین آدمی ہے۔ جب وہ اندر آیا تو حضورؐ اِس قدر مہربانی سے پیش آئے اور فرمایا کہ بدترین آدمی خداوند عالم کے نزدیک وہ شخص ہے کہ جس کی شرارت، کی وجہ سے لوگ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بدگو سے اگر تو اپنے کو محفوظ رکھے، تو یہ صدقے کی مثل ہے۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، کا قول ہے کہ بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ جن کے سامنے تو ہم ہنستے رہتے ہیں، لیکن دراصل ہمارا دل اس وقت ان پر لعنت کر رہا ہوتا ہے۔

سترھواں، یہ کہ زیادہ تر صحبت و دوستی درویشوں سے اختیار کرے۔ رؤسا سے پرہیز کرے۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ مُردوں کے پاس نہ بیٹھو۔ تو صحابہ نے دریافت کیا مُردے کون؟ حضورؐ نے جواب دیا، کہ رؤسا۔

(تمثیل) حضرت سلیمانؑ جب کسی مسکین کو دیکھتے، تو اس کے پاس بیٹھتے اور فرماتے، کہ مسکین، مسکین کے پاس

بیٹھا ہے۔ جناب عیسیٰؑ کو مسکین کا نام بہت پسند تھا۔ حضورؐ نے بارگاہِ ایزدی میں استدعا کی، کہ جب تک زندہ رہوں مسکین رہوں اور جب مروں تو مسکین موت، اور میرا حشر بھی مساکین کے ساتھ ہو۔

اٹھارھویں، مسلمانوں کا دل خوش کرنے کی کوشش کرے۔ اور ان کی حاجات کو پورا کرے۔ حدیث شریف ہے کہ مسلمانوں کی حاجت روائی خداوند عالم کی خدمت کے برابر ہوتی ہے۔ اور جو آدمی کسی مسلمان کے کسی کام سے بھی کہیں جائے، چاہے اس کا کام ہو یا نہ ہو، لیکن اس کو دو ماہ کے اعتکاف کا ثواب ملتا ہے۔ اور حکم ہے کہ اپنے مسلمان بھائی چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم مدد کرنا چاہیے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ ظالم کی مدد کیسے روا ہو سکتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ اس کو ظلم کرنے سے روکو۔ یہ ہی اس کی امداد ہے۔ دنیا میں دو بدترین خصلتیں ہیں۔

اوّل شرک۔ دوسرے لوگوں کو ستانا۔ اسی طرح دو نیک خصائل بھی ہیں۔ پہلے ایمان لانا۔ دوسرے مسلمانوں کو آرام پہنچانا۔

(واقعہ) حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ روتے کیوں ہیں؟ تو جواب دیا کہ ظالم مسلمانوں کے حال پر، کہ جب اُن سے اس کے متعلق استفسار کیا جائے گا، تو کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی روزانہ تین بار یہ پڑھے گا۔ اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ فَرِّجْ عَنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ اس شخص کا نام نیکوں میں لکھا جائے گا۔

اُنیسواں، کسی کے پاس جائے تو پہلے سلام کرے اور مصافحہ بجالائے حضورؐ کا حکم ہے کہ جو آدمی سلام نہ کرے، اس سے بات نہ کرو۔ ایک آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام نہ کیا۔ حضورؐ نے اس کو نکل جانے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ دوبارہ اندر داخل ہو کر پہلے سلام کرو۔

(تمثیل) حضرت انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب صحبت نبوی میں مجھے آٹھ سال گزر گئے، تو حکم ہوا کہ طہارت پوری طرح کرو اور اوّل سلام کیا کرو۔ اور جب گھر جاؤ تو بھی پہلے سلام کرو۔ اس سے نیکی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک شخص خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے السلام علیکم کہا، تو ارشاد ہوا کہ اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اس کے بعد دوسرے آدمی نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔ تو حکم ہوا کہ اس کو بیس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ تیسرا شخص آیا، اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا، تو ارشاد ہوا کہ اس کے حصے میں تیس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ جب دو عالم آپس میں مل کر سلام کرتے ہیں تو سو رحمتیں ان پر نازل ہوتی ہیں۔ جس میں ننانوے سلام کی پیش قدمی کرنے والے کو ملتی ہیں۔ بزرگانِ دین کے ہاتھ چومنا سنّت ہے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ سفر سے واپس آکر بوسہ دینا

اور ملنا سنت ہے۔ لیکن کسی کے استقبال میں بالکل کھڑا ہونا اچھا نہیں، اس لیے کہ حضورؐ اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن کسی کو کھڑا رکھے، وہ جہنمی ہے۔

بیسواں، یہ ہے کہ اگر کسی کو چھینک آئے، تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہو اور کسی سے یہ کہتے ہوئے سنو، تو یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنا چاہیے اور جب یہ کہہ رہا ہو تو خود یَغْفِرُ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ کہے۔

(چھینک) جس وقت حضورؐ کو چھینک آتی، تو آپ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتے اور کوشش کرتے کہ آہستگی سے چھینک آئے۔ اور اگر کسی کو پاخانے میں چھینک آئے تو دل میں "الحمد للہ" کا خیال کرے۔ حضرت ابراہیمؒ نخعی کے خیال میں اگر زبان سے بھی کہہ دے تو کوئی حرج نہیں۔

ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ، اگر تو میرے نزدیک ہی ہے، تو باہستگی کلام کروں، ورنہ دور سے۔ جواب ملا، کہ ہر یاد کرنے والے سے قریب ہوں۔ پھر عرض کی کہ اگر میں نجاست کی حالت میں تجھ کو یاد کروں گا، تو فعل قبیح ہوگا۔ تو جواب دیا کہ ہر حال میں مجھے یاد کر سکتے ہو۔

(عیادت بیمار) اکیسواں۔ دوستوں کے علاوہ جو لوگ صرف صورت شناسائی ہوں، اُن سے سلام و دعا ضرور کر لینا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بیمار کی عیادت کرنے والا آدمی جنتی ہوتا ہے۔ اور جب عیادت کو جائے تو اس کی نبض دیکھے یا پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کا حال دریافت کرے اور یہ پڑھے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اُعِیْذُکَ بِاللّٰہِ الْاَحَدِ الصَّمَدِ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ مِنْ شَرِّ مَا تَجِدُ (یعنی اُس خدا سے توبہ کرتا ہوں کہ نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور نہ اس سے کوئی جنا اور نہ کوئی اس کی برابری کرنے والا ہے)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، ایک بار بیمار ہوئے، تو حضور عیادت کو تشریف لے گئے اور چند بار یہ کلمات ادا فرمائے اَعُوْذُ بِعِزَّۃِ اللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا تَجِدُ (یعنی میں خدا سے اس گناہ کے لیے توبہ کرتا ہوں، جس کے متعلق مجھے معلوم ہے) یہ دعا سنت ہے۔ عیادت کے وقت کوئی شکایت نہ کرے۔

(بیمار کے فرائض) حدیث شریف میں ہے کہ جب بیمار کے پاس کوئی عیادت کے لیے آتا ہے اور وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے، تو خداوند عالم اس کو جنت میں جگہ دیتا ہے، اور دنیا میں اپنی رحمت نازل کرتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کے پیٹ میں درد ہو تو اپنی بیوی کے زرِ مہر سے کچھ لے کر شہد خریدے اور بارش کے پانی میں ملا کر پی لے۔ کیوں کہ بارش کا پانی، بیوی کا بخشا ہوا مہر، اور شہد تینوں چیزیں باعثِ صحت و ثواب ہیں۔

الغرض بیمار کو چاہیے کہ عیادت کرنے والے سے کوئی شکایت نہ کرے اور واویلا نہ کرے، وہ یقین کرے

کہ یہ بیماری میرے گناہوں کا کفارہ ہے۔ دوا اور حکیم و ڈاکٹر کے بجائے خدا پر بھروسہ رکھے۔
(آداب وعیادت) عیادت کے لیے جب بیمار کے پاس جائے، تو زیادہ دیر تک، نہ بیٹھے۔ زیادہ باتیں نہ کرے۔ اس کی صحت کی دُعا کرے۔ اپنی صورت رنجیدہ بنالے۔ مکان کے چاروں طرف کا نگاہوں سے جائزہ نہ لے۔ اگر غلام ہے، تو غلام نہ کہے، بلکہ بجائے اس کے سُبْحَانَ اللہ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہہ دے۔
(تشیع جنازہ) بائیسواں ؛ جنازے کے پیچھے پیچھے جائے۔ چاہیے وہ غیر ہی کا کیوں نہ ہو۔ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ تشیع جنازہ میں ایک قیراط ثواب میں ملتا ہے اور اگر وقت، دفن تک ساتھ رہے تو دو قیراط۔
(آداب تشیعِ جنازہ) خاموش رہے، ہنسے نہیں۔ عبرت خدا سے سبق حاصل کرے۔ اپنی موت یاد کرے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ جب جنازہ کے ساتھ جائے۔ تو یہ معلوم نہ ہو کہ کس کا جنازہ ہے۔ اس لیے کہ ہم میں سے ہر آدمی ایک سا غمگین ہو۔
کچھ لوگ ایک بار سوگ منارہے تھے، ایک بزرگ نے اُن سے کہا کہ اپنے متعلق سوچو! کیونکہ اس نے اس دنیا کے غم سے چھٹکارا پالیا۔ پہلا ملک الموت۔ دوسرا موت کے وقت کی سختی۔ تیسرا موت کا خوف۔ حدیث میں ہے کہ تین چیزیں انسان کے ساتھ اس دنیا سے جاتی ہیں۔ اہل وعیال۔ مال۔ اور اس کے اعمال۔ اہل اور مال تو قبر سے ہی واپس آجاتے۔ لیکن اعمال ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔
تئیسواں ؛ قبور کی زیارت کو جائے اور دُعا کرے۔ وہاں جاکر سوچے کہ یہ لوگ آگئے اب میری باری ہے۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قبر کو یاد کرنے والا آدمی کی قبر چمن کی طرح ہوگی۔ ربیع بن خثیم جن کی قبر طوس میں ہے۔ انھوں نے اپنے گھر میں ایک قبر کھود رکھی تھی۔ وہ جب ذرا سی غفلت کرتے، تو قبر میں سوتے اور فرماتے کہ یارب العالمین! مجھے دوبارہ دُنیا میں بھیج تاکہ اپنے گناہوں کی مُعافی چاہوں۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں۔ ایک بار قبر کے سرہانے جاکر رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بہت روئے میں نے استفسار کیا۔ جواب میں فرمایا کہ یہ میری والدۂ گرامی کی قبر مطہرہ ہے۔ تو میں نے زیارت اور دعا کی اجازت طلب کی۔ مگر دعا کی اجازت نہ ملی، تو میں آکر رویا۔
(تنبیہہ) مندرجہ بالا تفاصیل تمام مسلمانوں کے لیے بتائی گئی ہیں۔ اس میں کسی اپنے اور غیر کی تخصیص نہیں ہے۔

(حقوق ہمسایہ) معلوم ہونا چاہیے کہ پڑوسیوں کے حقوق ان سے زیادہ اہم ہیں۔
اگر ہمسایہ کافر ہے، تو اس کا ایک حق واجب ہے۔
اگر مسلمان ہے، تو دو حقوق ادا کرنا چاہئیں۔

(فعلِ آنحضرتؐ) ارشادِ نبوی ہے کہ مجھے حقوقِ ہمسائیگی میں اتنی نصائح فرمائی گئی ہیں، کہ میں سمجھ رہا تھا کہ اس کو میری وراثت میں سے بھی حصہ دار بنا دیا جائے گا۔ اگر کوئی آدمی قیامت پر ایمان رکھتا ہے تو ہمسائے کا خیال رکھے اور کسی مومن سے اپنے پڑوسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ قیامت کے دن سب سے پہلے پڑوسی دشمن خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ پڑوسی کے کتے کو مارنا بھی اس کو تکلیف پہنچانے کے برابر ہوتا ہے صحابہ نے عرض کی کہ ایک عورت روزانہ روزہ رکھتی ہے اور ہر رات نماز پڑھتی ہے، لیکن پڑوسیوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دوزخی ہے۔ اور ارشاد ہوا کہ چاروں طرف کے چالیس گھر پڑوس میں ہی شامل ہیں۔

حقوقِ ہمسایہ میں ضروری ہے کہ اس کے ساتھ نیکی کی جائے۔ روزِ قیامت غریب پڑوسی اپنے رئیس پڑوسیوں سے شکایت کریں گے کہ اس نے ہمارے حقوق ادا نہیں کیے۔

(قصہ) ایک بزرگ کے یہاں چوہے بہت تھے، لیکن وہ بلی صرف اس لیے نہ رکھتے تھے کہ وہ چوہے ان کے یہاں سے بھاگ کر پڑوسیوں کو نقصان پہنچائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تمہارا پڑوسی ضرورت مند ہے، تو اس کی ضرورت پوری کرو۔ اگر مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ اس کی خوشی میں خوشی کرو اور غم میں غمزدہ رہو۔ اپنے بچوں کو باہر نہ نکلنے دو، تاکہ اس کے بچے انھیں دیکھ کر غمزدہ نہ ہوں۔ اپنے گھر کے باورچی خانے کے دھوئیں سے اس کو رنج نہ پہنچاؤ۔ اس کو کھانا کھلاؤ۔ اپنے مکان سے اس کے مکان میں دیکھنے کی کوشش نہ کرے اگر وہ تیری دیوار کے اوپر کوئی کڑی، دھنی یا شہتیر رکھے یا اس کا پرنالہ تیری طرف ہو، یا وہ تیرے دروازے کے سامنے مٹی ڈال دے تو منع کر! اس کے عیوب کو چھپا۔ ایسا کوئی عمل نہ کر کہ اس کو کوئی تکلیف پہنچے۔ اس کی لونڈیوں کی طرف نہ دیکھ۔ اور آخر میں ارشاد ہوا کہ قسم ہے اس ذاتِ پروردگار کی کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ کہ اگر اس کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو حقِ ہمسائیگی ادا نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام باتیں مسلمانوں کے حقوق کے علاوہ بیان کی گئیں۔ ایک بار حضورؐ نے حضرت ابو ذر غفاری کو نصیحت فرمائی کہ سالن میں شوربا زیادہ کر لو اور ہمسائے کو اس میں سے ضرور بھیجو۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا کہ میرا پڑوسی میرے غلام کا شاکی ہے۔ اگر اس کو بغیر کسی ثبوت کے سزا دوں تو گناہ ہے۔ ورنہ میرا پڑوسی ناراض ہوگا۔ تو فرمایا کہ اس وقت تک ٹھیرے رہو، جب تک غلام کوئی قصور نہ کرے، اور جب وہ قصور کرے اور پڑوسی بھی شکایت کرے تو اس کو سزا دے۔ اس طرح دونوں حقوق مل جائیں گے۔

حقوق اعزا و اقارب

(حقوقِ اعزا) خداوند عالم نے اپنے کو رحمان فرمایا اور اپنے نام سے ہی "قرابت رحم" کا لفظ بنایا۔ جو آدمی اپنے عزیزوں سے تعلقات قائم رکھتا ہے، میں اس کے ساتھ ہوں، اور جو لڑائی لڑتا ہے۔ میں اس سے ناخوش ہوتا ہوں۔ اور اے رسول کہہ دو! اپنی امت سے اگر اپنے رزق میں زیادتی چاہتے ہو حقوق اعزا ادا کرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں —— صلح رحم کرنے والے فاسق و فاجر آدمی کے مال اور اہل و عیال میں برکت ہوتی ہے۔ اپنے قریبی عزیزوں (جو تیرے دشمن ہوں) کے ساتھ اعانت کرنا سب سے بڑا صدقہ ہے۔

(صلۂ رحم) صلۂ رحم یہ ہے، کہ اگر تیرے عزیز تجھ کو چھوڑ دیں، لیکن تو اُن کے ساتھ مراعات کر! اور ارشادِ نبوی ہے کہ سب سے بڑا ثواب اس میں ہے، کہ جو آدمی تجھ سے قطع تعلق کرے، تو اس سے مل اور جو آدمی تجھ کو محروم کرے، تو اس کے ساتھ بخشش کر، اور جو تجھ پر ظلم کرے تو اس پر رحم کر۔

حقوق والدین

(حقوق والدین) والدین کے حقوق دنیا میں سب سے زیادہ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ والدین کے حقوق یہاں تک ہیں کہ اگر وہ کسی کے غلام ہیں، تو اُن کو آزاد کرا دے۔ اور فرمایا کہ ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ سب سے زیادہ ہے اور جس کو اس کے ماں باپ نے عاق کر دیا ہے، وہ جنت میں نہ جا سکے گا۔

(تمثیل) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حکم ہوا، کہ جو آدمی میرے حکم کو مانتا ہے، اور ماں باپ سے سرکشی کرتا ہے، میں اس کو مطیعوں میں نہیں سمجھتا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر ماں باپ کے نام پر صدقہ دیتا ہے تو خود کو بھی اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔ جتنا ماں باپ کو۔ ایک شخص نے عرض کی کہ میرے ماں باپ مر گئے ہیں۔ اُن کے حقوق کس طرح ادا کروں؟ تو حکم ہوا کہ اُن کے لیے نماز پڑھ اور دُعا کر۔ اور جو وصیت کر گئے ہوں، اس پر عمل کر۔ اُن کے دوستوں کی عزت کر! اور ان کے قریبی لوگوں سے مراعات کر! یہ بھی ارشاد ہوا، کہ باپ کے مقابلے میں ماں کا حق دوگنا ہے۔

حقوق اولاد

(اولاد کے حقوق) ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نیکی کس کے ساتھ کرنا چاہیے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ۔ اس نے عرض کی کہ وہ فوت ہو چکے ہیں، تو فرمایا کہ اپنی اولاد کے ساتھ کیونکہ دونوں کے حقوق تجھ پر برابر ہیں۔ اور اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے اولاد کو عاق نہ کرنا چاہیے۔ خداوند عالم ایسے آدمی پر رحمت کرتا ہے، جو اپنے بیٹے کو نافرمان نہیں بنتا۔ حضورؐ کا حکم ہے، کہ جب بیٹا سات دن کا ہو جائے

(عقیقہ) تو عقیقہ کر دینا چاہیے، اس کا نام رکھو، اور اس کو پاک کرو۔ اور چھ سال کی عمر سے ادب و تہذیب سکھانے کی کوشش کرو۔ اور نو سال کی عمر میں اس کا بستر بھی الگ کر دو۔ سولہ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دو۔ اور پھر آگاہ کر دو، کہ میں نے تجھ کو پالا، پرورش کیا، علم و ادب سکھایا اور شادی کر دی۔ اب میں تجھ سے الگ ہوتا ہوں، اور تیری بُری حرکات سے ڈرتا ہوں۔

اولاد پر مساوی نظر رکھی جائے! چھوٹے بچوں کو بوسہ دینا اور پیار کرنا سنت ہے۔

(تمثیل آنحضرتؐ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، کو بہت پیار کرتے تھے، اور بوسے لیتے تھے۔ ایک بار قرعہ بن حابس نے عرض کیا کہ میرے دس بیٹے ہیں۔ لیکن میں نے آج تک کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ تو حکم ہوا کہ جو آدمی اپنی اولاد پر رحم نہیں کرتا، خداوند عالم اس پر رحم نہیں کرتا۔

(تمثیل) ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف رکھتے تھے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ زمین پر گر پڑے۔ آپؐ فوراً منبر سے اُترے اور ان کو اٹھا لیا، اور اس آیت کی تلاوت کی اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (یعنی اولاد اور مال تمھارے لیے فتنہ ہیں)

ایک بار حضورؐ نماز میں سجدہ کر رہے تھے، تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر آپؐ کی گردن پر رکھ دیا، تو حضورؐ سجدے میں اتنی دیر ٹھہرے رہے کہ جماعت والوں نے سمجھا کہ غالباً وحی نازل ہو رہی ہے بعد نماز حضورؐ نے فرمایا کہ حسین نے مجھے اونٹ بنا لیا تھا۔ مجھے گوارا نہ ہوا کہ اس کو تکلیف پہنچاؤں۔ بہر حال ماں باپ کے حقوق اولاد پر زیادہ ہیں، چونکہ اُن کی تعظیم بھی اُن پر فرض ہے اور خداوند عالم ماں باپ کی تعظیم کو اپنی تعظیم سمجھتا ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (یعنی فرمایا تیرے خدا نے کہ سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کرو، اور مراعات کرو اپنے والدین کے ساتھ)

والدین کے حقوق میں دو چیزیں واجب ہیں۔

پہلے یہ کہ اگر کسی مشتبہ کھانے (جس پر حرام کا یقین نہ ہو) اور والدین اس کے کھانے کا حکم دیں، تو کھا لینا چاہیے۔ اس لیے کہ نسبت اِس شبہ کے اُن کی خوشنودی زیادہ باعثِ ثواب ہے۔ اور اگر وہ سفر کا حکم دیں، تو سفر کرے، لیکن واجبات دین مثلاً نماز، روزہ اور سفر طلبِ علم۔ لیکن ایسی حالت میں کہ بغیر سفر کے یہ چیزیں حاصل نہ ہو سکیں۔ اس مسئلے میں زیادہ تر علماء متفق ہیں۔

(مسئلہ) ایک بار ایک آدمی نے آنحضرتؐ سے جہاد کی اجازت مانگی، تو حضورؐ نے حکم دیا کہ اپنی ماں کی خدمت کر، اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ ایک آدمی یمن سے جہاد کے لیے آیا اور اجازت مانگی، تو حکم دیا۔ کہ اول واپس جا کر اپنے ماں باپ سے اجازت لے آ۔ کیونکہ اطاعت والدین سے زیادہ سوائے توحید خداوندی

کے کوئی چیز افضل نہیں۔

(بڑے بھائی کے حقوق) بڑے بھائی کے حقوق بھی تقریباً باپ کے مثل ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ بڑے بھائی کے حقوق چھوٹے پر مثل باپ کے ہیں۔

غُلام اور نوکر کے حقُوق

فرمانِ آنحضرتؐ ہے کہ اپنے غلام اور نوکروں اور ماتحتوں کے حقوق کو ادا کرو اور خدا سے ڈرو! اُن کو وہ ہی کھانا کھلاؤ، جو خود کھاتے ہو۔ جو خود پہنتے ہو، انھیں بھی پہناؤ! جو کام وہ کر سکتے ہوں، وہ کراؤ۔ اگر ان کے اخراجات کو برداشت نہ کر سکو تو انھیں آزاد کر دو۔ ورنہ اُن پر تکلیف کا باعث بنو گے۔ اس لیے کہ وہ تمہارے غلام اور نوکر ہیں۔

(تمثیل) ایک آدمی نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ غلام اور نوکر کو کیسی خطائیں معاف کرنا چاہئیں، تو ارشاد ہوا کہ ستر۔ ایک بار قیس بن عاصم کی کنیز بکری کا بچہ بھون کر لا رہی تھی کہ وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ کے لڑکے کے اوپر گر گیا، اور وہ مر گیا، تو اُس کنیز کو آپ نے کوئی تنبیہہ نہ کی، بلکہ آزاد کر دیا۔ احنف بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے اُن سے غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ بردباری کرنا سیکھا ہے۔

عون بن اسد رحمۃ اللہ علیہ کے غلام جب نافرمانی کرتا، تو آپ اسے فرماتے کہ تو بھی اپنے مالک کی طرح نافرمان ہے جیسے میرا مالک، (یعنی میں) اپنے مالک کی نافرمانی کرتا ہوں۔

ابو مسعود انصاری ایک بار اپنے غلام کو مار رہے تھے حضور کا اس طرف سے گزر ہوا۔ ارشاد فرمایا کہ اے ابو مسعود! جس طرح تو اس پر قابو یافتہ ہے، اس سے کہیں زیادہ تمہارا خدا تم پہ ہے۔ اس پر سختی نہ کرو۔

نوکر اور غلام کا حق یہ ہے، کہ ان کو اچھے کپڑے پہناؤ! اور اس سے غرور و تکبر سے پیش نہ آؤ۔ جب اس کی خطا دیکھو تو سوچو، کہ ہم بھی کسی کا گناہ کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اگر نوکر کھانا پکائے تو اس کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤ! اور اگر نہ کھا سکے، تو اس کے منہ میں ایک لقمہ اپنے ہاتھ سے رکھ دے، اور کہے کہ اس کو کھاؤ۔

چھٹا اصُول

بابُ العاقبت

گوشہ نشینی و ترکِ دُنیا

اقوال و افعال علماء برائے گوشہ نشینی | اس کے متعلق علماء اسلام کے نظریات مختلف ہیں۔ حضرت سفیان ثوری، ابراہیم ادہم

داؤد طائیؒ۔ فضیل عیاض۔ ابراہیم خواص۔ یوسف اسباط۔ حذیفہ۔ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر متعدد علماء کے خیال میں دنیاداری سے بہتر گوشہ نشینی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں مل جل کر رہنا اچھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے فرمایا کہ گوشہ نشینی اختیار کرو، تو اپنا خیال رکھو۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گوشہ نشینی عبادت کے مترادف ہے۔ کسی آدمی نے داؤد طائیؒ سے نصیحت کرنے کے لیے عرض کی، تو انھوں نے فرمایا کہ دنیا سے الگ رہو، اور لوگوں سے پرہیز کر، جس طرح شیر سے ڈرتے ہیں۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توریت میں حکم ہے کہ جو آدمی قناعت کرتا ہے، وہ دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور جو گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے وہ سلامت رہتا ہے، اور جب اپنی خواہشات کو مغلوب کر لیا تو آزاد ہو جاتا ہے۔ حسد سے پرہیز کرے گا تو محبت میں اضافہ ہوگا، اور صبر کرنے میں مراد مل جاتی ہے۔

وہب ابن الوردؒ فرماتے ہیں کہ عقلمندی دس باتوں میں مضمر ہے۔ اُن میں نو عقلمندیاں خاموشی میں اور ایک، گوشہ نشینی میں پوشیدہ ہے۔ ربیع بن خثیم اور ابن ادہم کا قول ہے کہ علم حاصل کر اور دنیا سے گوشہ نشینی اختیار کرے۔ مالک بن انس پہلے پہلے ہر آدمی سے ملتے جلتے، لیکن آخر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

حضرت فضیل نے کہا کہ میں اس شخص سے بہت خوش ہوں، جو میرے پاس سے گزرے اور سلام نہ کرے۔ میری بیماری میں عیادت کو نہ آئے۔ صحابی سعد بن وقاص اور سعد بن زید رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ کے قریب، عقیق (ایک مقام ہے) میں رہتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت بھی لوگوں کے پاس نہ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پائی۔

ایک رئیس نے حاتم اصم سے دریافت کیا، کہ اگر کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ صرف اس کی تکلیف ہے، کہ تو مجھ کو دیکھتا ہے اور میں تجھ کو۔

پس معلوم ہونا چاہیے کہ عزلت و گوشہ نشینی کے متعلق تمام علماء مختلف الرائے ہیں جس طرح نکاح کے متعلق درحقیقت یہ چیزیں آدمی کے ذاتی افعال اور کردار پر موقوف ہیں۔ بعض کے حالات ایسے ہیں کہ ان کو گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہیے اور بعض کے لیے نہیں۔ اور اس کی تفصیل کے پڑھنے پر تم خود طے کر سکو گے، کہ تمھارے لیے کون سی چیز مناسب ہے۔

فوائد گوشہ نشینی

گوشہ نشینی میں چھ فائدے ہیں۔

(پہلا فائدہ) اوّل خدا کی عبادت اور اس کے خیال میں فارغ دلی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ذکر و فکر بڑی عبادت عظمیٰ ہے۔ یعنی جو آدمی گوشہ نشین ہے، وہ عجائبات عالم اور اس میں جو کچھ ہے، ان سب کو پہچانتا ہے

اور سوچتا ہے، بلکہ یہ اور اچھا ہے کہ ہمہ تن اسی کی عبادت میں مشغول ہو جائے تاکہ ماسوا اللہ کو بھلا سکے۔ اور اس کے خیال میں سوائے خدا کے کچھ نہ رہے۔ یہ سب کچھ گوشہ نشینی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی چیز میں دل لگانا، اس کی راہِ عبادت میں روڑا ہوگا۔ لہٰذا نہ لوگوں کے پاس بیٹھے گا، اور نہ کارِ دُنیا میں پھنس کر اس کو بھلائے گا۔

(دلیل) اگر اس ظاہری دنیا میں رہتے ہوئے عبادت کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام تھے۔ تو تُو گوشہ نشینی اختیار کر۔ اسی لیے ہمارے رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں گوشہ نشین ہوئے، اور نبوت کی معرفت اور مضبوط ہوگئی۔ اور بظاہر تو آپ ہم لوگوں میں تھے۔ لیکن دل خداوند عالم کی طرف تھا حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اگر میں کسی کو دُنیا میں دوست بناتا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ لیکن خدا کی محبت میں اب گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ حالانکہ ہر آدمی یہ سمجھتا تھا کہ حضورؐ کو مجھ سے محبت ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اولیاء کو بھی یہ معرفت حاصل ہو۔ چنانچہ حضرت سہل تستری فرماتے ہیں کہ تیس سال ہوئے کہ میں خدا سے باتیں کرتا ہوں، اور یہ قابلِ تعجب نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے ظاہری عشق میں ہی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض آدمی سب کے پاس بیٹھے ہوئے بھی اپنے معشوق کے تصورات میں مشغول رہتا ہے۔ لیکن اِس بات پر تکبّر کرنا اچھا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دنیاداری میں زیادہ رہ کر راندۂ درگاہ ہو جائے۔

(تمثیل) ایک ادیب سے کسی نے کہا کہ تنہائی میں صبر کرنا بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔ ادیب نے جواب دیا کہ کوئی تنہا نہیں ہے، بلکہ ہر شخص کے ساتھ خدا ہے اور جب میں اس سے راز و نیاز چاہتا ہوں، تو نماز پڑھتا ہوں۔ اور اگر گفتگو کرتا ہوں، تو تورات کی تلاوت کرتا ہوں۔

ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ گوشہ نشینی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

(دلیل) جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ یہاں ایک آدمی ہمیشہ ایک ستون کے پیچھے بیٹھا رہتا ہے۔ آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا تو لوگوں سے تعلقات کیوں نہیں پیدا کرتا کہ تنہا پڑا رہتا ہے اس نے جواب دیا کہ مجھے ایک اتنا کارِ عظیم پیش آگیا ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی ہی اچھی ہے، تو فرمایا کہ تو امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس جاکر بیٹھ! اس نے جواب دیا، کہ اس کارِ عظیم کی وجہ سے میں اُن سے بھی کنارہ اختیار کر چکا ہوں۔ تو آپ نے اس سے کام دریافت کیا، تو جواب دیا کہ میرے اوپر ہر وقت خداوند عالم کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اور میں ہر وقت گناہ میں مبتلا رہتا ہوں۔ اس کی رحمتوں کا شکر گذار ہوں، اور گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔ لہٰذا اس حالت میں بھلا میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ، یا کسی کے پاس بھی کیسے بیٹھوں؟ تو آپ نے فرمایا، کہ تیرے لیے ایک ہی جگہ بیٹھا رہنا اچھا ہے۔

حضرت ہرم بن حیانؒ ایک بار حضرت اویس قرنیؒ کے پاس گئے، تو انھوں نے سبب دریافت کیا۔ جواب دیا کہ آپ سے آرام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے تم پہلے آدمی ایسے ملے ہو، کہ خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے آرام حاصل کرنے کے آرزومند ہو۔

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ رات کی تاریکی سے میں خوش ہوتا ہوں۔ کہ خدا کی عبادت کا وقت ہے اور دن نکلنے پر رنج ہوتا ہے، کہ لوگ ملنے جلنے کی وجہ سے دنیا کی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

حضرت مالک دینارؒ فرماتے ہیں کہ جو آدمی دنیا والوں سے باتیں کرنے میں وقت خراب کرتا ہے، اور خدا سے دُعا نہیں کرتا، وہ اندھا ہے۔ اور اس کو معرفت نہیں، اور اس کی عمر بیکار ہے۔

(تمثیل) ایک بزرگ کا قول ہے کہ جس آدمی کو دُنیا والوں کی محبت ہے۔ وہ غریب ہے۔

(خلاصہ) لہٰذا ان باتوں سے جاننا چاہیے کہ اگر آدمی میں خداوند عالم کی معرفت کی طاقت اور اہلیت موجود ہے۔ تو دُنیا کے کاموں سے افضل ترین عمل ہے۔ کیونکہ عبادتِ خدا تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ اور جب کوئی یہاں سے وہاں جائے، تو اس کے دل پہ اسی کی محبت غالب رہے۔ محبتِ خداوند عالم کے ذکر سے پیدا ہوتی ہے اور محبت ثمرۂ معرفت ہے، اور معرفت عبادت کا نتیجہ، اور یہ تمام باتیں گوشہ نشینی سے حاصل ہوتی ہیں۔

دوسرا فائدہ۔ گوشہ نشینی کی وجہ سے آدمی بہت سے گناہ نہیں کر پاتا۔ کم ازکم چار گناہ ایسے ضرور ہیں، جو آپس میں میل جول رکھنے سے پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

(دنیاداری کے نقصانات) ۱۔ غیبت کرنا یا سُننا، جو شرع اسلام میں حرام ہے۔

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خلاف مرضی کرنا۔ اگر لوگوں سے سُن کر خاموش رہے تو گنہگار، اور اگر ان کو منع کرے تو دشمنی بڑھائے۔

۳۔ نفاق اور ریاکاری۔ اگر ہمنشینوں کی خاطر مدارات نہ کرے، تو اعتراض کریں گے۔ اگر کرے گا، تو ریاکاری ہے۔ اسی طرح دشمنوں سے اگر اچھی باتیں کرے، تو نفاق ہوگا۔ اس میں سب سے اچھا یہ ہے کہ آدمی جس کو دیکھے، اس سے محبت سے ملے، اگر نہ ملے گا، تو لوگ ناراض ہوں گے۔ اسی طرح میل جول ہر ملنے والے آدمی سے استفسار حال کرنا ہی پڑتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس کو اُن لوگوں کی خیریت کی کوئی احتیاج نہیں ہوتی تو یہ بھی نفاق میں شامل ہے۔

(تمثیل) حضرت ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب کسی سے کام پڑتا ہے، تو خواہ مخواہ اس کی خوشامد کرنی پڑتی ہے، اور یہ باعثِ ناراضگی خدا ہے۔

حضرت فضیل علیہ الرحمۃ کے پاس ایک آدمی آیا، اور عرض کی، کہ آپ کی زیارت سے مشرف ہونے حاضر ہوا ہوں۔

تو آپ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تو میری خوشامد کرتا ہے ۔ یہ منافقت کی دلیل ہے ۔

(دنیاداری) لہٰذا اگر آدمی خوشامد اور ان باتوں سے پرہیز کرے تو میل جول میں کوئی قباحت نہ ہوگی بزرگانِ دین کا مسلک یہی رہا ہے کہ آپس میں ملاقات کے بعد صرف دین کی باتیں کیا کرتے تھے ۔

(تمثیلات) حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار حامد لفاف سے مزاج پرسی کی تو جواب دیا کہ اچھا ہوں ۔ تو آپ نے فرمایا کہ سلامتی اور نیکی پل صراط پر بخیریت گزارنے میں ہے کہ جب تو جنت میں داخل ہو جائے ۔

لوگ حضرت عیسیٰ روح اللہ سے جب مزاج پرسی کرتے، تو جواب دیتے کہ مفید باتیں میرے بس سے باہر ہیں ۔ اُن کا مالک کوئی دوسرا ہے ۔ پس مجھ سے زیادہ کوئی آدمی کمزور نہیں ۔

اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مزاج پرسی کرنے والے آدمی کو جواب دیتے، کہ مجھے کیا خبر کہ شام کس طرح ہوگی؟ زندہ رہوں کہ مر جاؤں ۔

ایک حکیم سے اس کا حال دریافت کیا گیا، تو جواب دیا کہ زندہ ہوں، اور شیطان کی روٹی کھاتا ہوں، جو گناہوں میں قوت جمع کرتی ہے ۔

محمد بن واسع نے اپنی مزاج پرسی پر لوگوں کو جواب دیا، کہ جس آدمی کی آخرت کی منزل آ رہی ہو، وہ کیسا ہو سکتا ہے ۔

حامد لفاف رضی اللہ عنہ سے خیریت دریافت کی، تو فرمایا کہ مجھے صرف ایک دن خیریت سے رہنے کی تمنا ہے ۔ اس لیے کہ اس روز مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوگا ۔

ایک بزرگ سے موت کے وقت ان کا حال دریافت کیا، تو فرمایا کہ جس کے سفر کی منزل نہ معلوم ہو، اور سامانِ سفر ساتھ نہ ہو، اس کا کیا حال دریافت کرتے ہو ۔

حضرت سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آدمی سے حال دریافت کیا، تو جواب دیا کہ عیال دار آدمی جس پر پانچسو روپیہ بھی قرض ہو، اس کا کیا حال ہو سکتا ہے ۔ آپ نے اس کو ایک ہزار روپیہ دیا تاکہ قرضہ بھی ادا کر دے اور خرچ بھی کرے ۔ اس کے بعد کسی سے مزاج پرسی کا عہد کر لیا ۔ یہ اس لیے تھا کہ اگر ضرورت معلوم ہو جائے اور اس ضرورت میں مدد نہ کرے، تو منافق ہوگا ۔

بزرگانِ دین کا رویہ اس سلسلے میں عجیب تھا ۔ کہ ایک دوسرے کو سلام بھی نہ کرتے ۔ لیکن اگر کسی کو ضرورت ہوتی تو ہر طرح حاضر رہتے ۔ لیکن آج کل کے لوگوں کا عجیب طریقہ ہے کہ دوستوں کے اندرونی حالات کی بھی خبر ہوتی ہے، لیکن ایک پیسے کی ضرورت کو بھی پورا نہیں کر سکتے ۔ یہ ہی نفاق ہے ۔ لہٰذا ایسے آدمی سے تعلقات نہ رکھنا ہی اچھا ہے ۔ نہ تعلقات ہوں گے نہ ایک دوسرے کا حال معلوم ہوگا، اور نہ آپس میں نفاق پیدا ہوگا ۔

(سوسائٹی کے اثرات) چوتھا فائدہ گوشہ نشینی میں یہ ہے، کہ اگر تُو بُرے آدمی کی صحبت میں بیٹھے گا۔ تو اس کے عادات تجھ میں قطعی نامعلوم طریقوں پر سرایت کرتے رہیں گے، جن کا خود تجھے بھی احساس نہ ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ تو بھی اس جیسا ہو جائے گا۔ اگر فاسق کے پاس بیٹھ کر اس کے فسق و فجور کو برابر دیکھتا رہے گا۔ تو وہ ہر وقت نظر میں کھپ کر تجھ کو اپنا مانوس بنالے گا۔ اسی طرح اگر تُو کسی عالم کو ریشمی لباس پہنے ہوئے دیکھے تو تجھ کو اس ظاہری چیز کو تو تُو برا سمجھے گا، لیکن اگر وہ عالم ہر وقت کسی کی غیبت میں گرفتار رہتا ہے، تو وہ تجھ میں سرایت کر جائے گی۔ جو قطعی حرام ہے۔ مگر لوگ عادی ہونے کی وجہ سے اس کے مرتکب ہیں، اور اس کو گناہ نہیں سمجھتے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ عِنْدَ ذِکْرِ الصَّالِحِیْنَ تَتَنَزَّلُ الرَّحْمَۃُ (یعنی نیک لوگوں کے ذکر کے وقت خدا کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں) لہٰذا صالحین کا ذکر سننا چاہیے۔ دُنیا دار آدمی کا ذکر بھی اپنے دنیا دار بنا لیتا ہے۔ جو لعنت کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا دنیا دارں کی صحبت تم کو دُنیا دار بنا دے گی۔ لہٰذا اس سے بہتر ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بُرے آدمی کی صحبت ایک لوہار کی طرح ہے کہ اگر وہاں کپڑے نہ جلیں گے تو دھواں تو کم از کم لگے ہی گا۔ نیک آدمی کی صحبت بالکل عطار کی طرح ہے کہ چاہے وہ عطر نہ دے۔ لیکن اس کی خوشبو تو تُو سونگھ سکے گا۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ خدا رسیدہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا بہرحال غنیمت ہے۔ بہ نسبت دُنیا دارں کی صحبت کے۔ اور خدا رسیدہ آدمی کی ہی نوکری بھی بہتر ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے کہ جو دنیا دار ہیں، اُن سے الگ رہو خصوصاً ایسے علماء سے جو دنیا کے حریص ہوں، اُن کے افعال، اُن کے اقوال کے خلاف ہوں۔ وہ زہر قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ اسلام کی حرمت کو قطعی نظر انداز کر دیتے ہیں، اُن کی صحبت میں بیٹھ کر آدمی یہ کہنے لگتا ہے کہ اگر اسلام یا دین کی کوئی اصل ہوتی، تو یہ عالم وقت اس کی تعریف کرتا۔

(اہانت عالم) دُنیا کے بہت سے آدمی گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی عالم کو ایسے گناہوں میں مبتلا دیکھتے ہیں تو اُن پر دلیر ہو جاتے ہیں۔ اور خود بھی اس کے مرتکب ہونے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے عالم کی اہانت ناجائز قرار دی گئی ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں۔

پہلے تو غیبت میں اس کا بھی شمار ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کی حرکات سُن کر دُنیا والے گناہوں میں بہادر ہو جاتے ہیں۔ اس کی پیروی کرنے کو محبت سمجھتے ہیں۔ شیطان اُن کو اور اس کام کی تلقین کرتا ہے۔

عوام کے لیے دوسری شرط یہ ہے، کہ جب وہ عالم کی کوئی خطا دیکھیں، تو دو باتوں پر غور کریں۔

پہلے یہ اگر عالم کوئی غلطی کرتا ہے، تو یہ سمجھیں کہ شاید یہ اپنے علم کی وجہ سے معاف کر دیا جائے۔ چونکہ علم بھی باعث

شفاعت ہو سکتا ہے۔ لیکن غیر عالم کسی بات پر بھروسہ کر سکتا ہے ؟

دوسرے ایسے گناہ جو بالکل ظاہر ہیں۔ مثلاً زناکاری وغیرہ تو ان کے ازتکاب کے لیے کسی کے سمجھانے یا دیکھنے نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ ان کا گناہ اس قدر ظاہر ہے کہ کسی کو سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں لہٰذا اگر کوئی عالم زنا کرتا ہے، یا شراب پیتا ہے تو وہ ذلیل نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کسی عالم کا ناجائز روزی کھانا عموماً ناجائز روزی استعمال کرنے والے عالم محض نام کے ہوتے ہیں اور یا وہ علماء ایسی تاویلیں سمجھتے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہوں۔

لہٰذا علماء کے ہر گناہ کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے، اور خود اس گناہ سے بچنے کی کوشش ضروری ہے۔

مثلاً حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی کشتی میں سوراخ کر دیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انکار کر دیا۔ اس کی تفصیل قرآن شریف میں اسی لیے آئی ہے۔

زمانہ چونکہ اب نازک آگیا ہے، اور نیچ اونچ کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ لہٰذا آج کل گوشہ نشینی ہی مناسب ہے۔

گوشہ نشینی کا تیسرا فائدہ : آج کل کوئی جگہ مکر و فریب فتنہ و شر سے خالی نہیں۔ لہٰذا گوشہ نشین آدمی ان سب سے محفوظ رہتا ہے۔ ملنے جلنے میں دین کو خطرے کے امکانات زیادہ ہیں۔

عبداللہ بن ابن عاص سے روایت ہے، کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، کہ جب تو لوگوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نکلتا دیکھے، تو گھر میں خاموشی سے بیٹھ! اُن سے بھی کچھ نہ کہو! جو کچھ تجھ کو معلوم ہو، اس پر عمل کر! اور جس مسئلے کے متعلق تجھ کو معلوم نہ ہو، اس کو چھوڑ دے! عوام سے مطلب و مقصد نہ رکھ۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ دین ختم ہو جائے گا، اور لوگ اِدھر سے اُدھر پہاڑوں اور سوراخوں میں بھاگتے پھریں گے جس طرح لومڑی بھاگتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ کیسے ہوگا؟ ہم کو تو نکاح کرنے کا حکم ہے۔ تو ارشاد ہوا کہ اس زمانے کے ماں باپ ہی اپنی اولاد کی ہلاکت کے سبب ہوں گے، اور جس کے ماں باپ مر چکے ہوں گے، اُن کے اہل و عیال باعثِ عذاب بن جائیں گے اور اگر یہ بھی نہ ہوں گے تو اعزا و اقربا ہلاکت کا موجب بن جائیں گے۔ صحابہ نے پھر اس کی وجہ دریافت کی، تو ارشاد ہوا کہ فقر و غربت میں لوگ اس کو بے عزت سمجھیں گے اور ملامت کریں گے۔ ایسی چیز اس سے مانگیں گے، کہ اس کے پاس نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائے گا

اگرچہ یہ حدیث بظاہر دنیاداروں سے الگ رہنے کی ہدایت ہے۔ لیکن یہ بھی گوشہ نشینی ہی سکھاتی ہے اور یہ زمانہ بہت پہلے سے آچکا ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اب زمانہ ایسا آگیا ہے، کہ (لوگوں سے الگ رہنا حلال ہے)۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ جب تک لوگوں کے پاس بیٹھے گا، شرانگیز باتوں اور ان کے اعمال میں ضرور شرکت کرنا پڑے گی۔ للٰذا گوشہ نشینی میں اس سے نجات ملتی ہے اور ہر آدمی خوش ہی رہتا ہے۔

ایک بزرگ کا قاعدہ تھا، کہ یا تو کتاب بینی کرتے یا قبرستان جاکر تنہا بیٹھے رہتے۔ لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا، تو کہا کہ گوشہ نشینی سے بہتر کوئی چیز اچھی نہیں ہے، اور قبر سے زیادہ کوئی ناصح نہیں دیکھا اور کوئی آدمی کتاب سے اچھا ساتھی نہیں دیکھا۔

ایک بار ثابت بنانیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصریؒ کو خط لکھا، کہ آپ حج کو جارہے ہیں، میں بھی آپ کی ہمراہی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو جواب دیا معاف کیجئے، ہو سکتا ہے کہ جب ہم ایک دوسرے سے ملیں تو کوئی شئے باعثِ نزاع ہو جائے، اور آپ کے ساتھ شہر کی زندگی گزارنا پڑے۔

(تنبیہ) گوشہ نشینی میں یہ بھی فائدہ ہے، کہ آدمی کے دوستوں کی محبت برقرار رہتی ہے، اور آپس کی باطنی باتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔

فائدہ پنجم، یہ ہے کہ لوگ اس کے حرص سے اور وہ لوگوں کے حرص سے محفوظ رہتا ہے اور قوتِ طمع کم ہو جاتی ہے، جس سے سینکڑوں گناہوں سے آدمی بچ جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب آدمی دوسرے کے حالات کو دیکھے گا، تو اس سے کوئی نہ کوئی خواہش پیدا ہوگی، اور یہ خواہش بڑھ کر طمع ہو جائے گی۔ اور حرص و طمع ذلت و خواری میں مبتلا کر دے گی۔ اسی لیے خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ الآیہ (یعنی جن لوگوں کی آراستہ آنکھیں دنیا کی طرف ہیں، وہ ان کے لیے فتنہ ہیں)

(کاہل کی مذمت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ جو آدمی تم سے زیادہ امیر ہے۔ اس کی طرف نہ دیکھو۔ اس کے بعد جو نعمت خدا نے تم کو دی ہے اس کو تم حقیر سمجھنے لگو گے۔ اور اس کی تنگ، دو دو میں پریشان ہو کر اپنا دین بھی ہاتھ سے کھو بیٹھو گے! لیکن اگر کسی کے مال کو دیکھ کر حرص میں اضافہ نہیں ہوتا، تو یہ مجاہدۂ نفس میں داخل ہے، جو امر محال کی مثل ہے۔

فائدہ ششم یہ ہے کہ ایسے لوگ جو کاہل سست اور بیوقوف ہیں، ان کے دیکھنے سے بچتا ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کا دیکھنا بھی مکروہ ہے۔

حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا، کہ آپ کی آنکھ میں خرابی کیوں پیدا ہوئی؟ تو جواب دیا کہ کاہلوں کو دیکھنے سے۔ حکیم جالینوس کا قول ہے کہ رُوح کا بخار کاہلوں کی طرف دیکھنا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں، کہ جب میں کسی کاہل آدمی کے پاس بیٹھا، تو میرے جسم کا وہ حصہ جو اس کے قریب تھا، وزنی ہو گیا۔

لہٰذا ایسے آدمی کے دیکھنے سے، جس سے کراہت ہوتی ہو، اس کی غیبت کی جائے گی اور غیبت حرام ہے۔

لہٰذا ہر طرح گوشہ نشینی میں فائدہ ہے

گوشہ نشینی کے نقصانات

(گوشہ گیری کے نقصانات) دین و دنیا کے بعض مقاصد بغیر دُنیا میں رہے پورے نہیں ہو سکتے۔ اُن مقاصد نیک کا حاصل نہ ہونا باعث نقصان ہے۔ نقصانات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا نقصان یہ ہے کہ اگر آدمی خود عالم ہے، تو دوسروں کو علم سکھانے سے اور اگر ضرورت مند ہے تو علم حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے۔ اور وہ علوم جاننا ضروری ہیں۔ تو گوشہ نشینی نقصان دہ ہے۔ لیکن اگر وہ صرف دنیا کی ہنگامی کیفیات سے متنفّر ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتا ہے تو اچھا ہے۔

لیکن اگر وہ تمام علوم سیکھنے کی اہلیت و طاقت رکھتا ہے، اور بغیر حصول کے وہ گوشہ نشینی اختیار کرلے۔ اور تمام دن رات عبادات میں بسر کرے، تو اس کی عبادات بیکار ہیں۔ اور خدا کی معرفت میں وہ رکاوٹیں حائل ہوں گی۔ کہ اس کے ایمان کو متزلزل کر دیں گی۔ اور وہ سمجھ بھی نہ پائے گا۔ لہٰذا گوشہ نشینی بعد فراغت علم دینیہ ہونا چاہیے۔ قبل اس کے مثل اس آدمی کے ہے کہ وہ خود بیمار ہے اور اپنا علاج کرنا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی ہلاک ہو جائے گا

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں کہ جو آدمی حصول علم کرتا ہے اور دوسروں کو پڑھاتا ہے۔ فرشتے اس کو بزرگی کی حیثیت دیتے ہیں۔

(حصولِ علم کے شرائط) علوم گوشہ نشینی سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا علوم کا سیکھنا اچھا ہوا۔ مگر کسب حلال میں دینی جاذبیت ضروری ہے۔ ایسا علم سکھائے اور سیکھے جو دین کے لیے ہو، اور ان میں جو زیادہ ضروری ہو، وہ اوّل سکھائے اور سیکھے۔

مثلاً علم طہارت میں مختصراً ظاہری طہارت بتائے۔ اس کے بعد باطنی طہارت کے اوصاف بالتفصیل بتائے اور اُن پر کاربند ہونے کے لیے سختی سے حکم دے۔ اور ان سب طہارتوں کا اصل مقصد طہارت حقیقی بتا دے، کہ سوائے خدا کے دُنیا سے دل کو پاک کر لیا جائے۔ اور اس طہارت کی آخری منزل لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے، کہ سوائے اس کے اور کوئی پروردگار نہیں۔ اور جس شخص نے اپنی ذاتی خواہشات کو خدا سمجھ لیا ہے اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے مہلکات اور منجیات کے بیان میں اس کے حقائق کو پڑھ لے تاکہ خواہشاتِ دنیوی دل سے نکل جائیں۔ اُن کا سمجھنا ہر آدمی پر واجب ہے۔

اور اگر آدمی دُنیا کی آلودگیوں سے پرہیز اور حقیقت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے علم، نیز طہارت کے علوم کو چھوڑ کر علوم مجادلہ

علم منطق اور مناظرے وغیرہ کے علم کی خواہش کرے، تو یقیناً وہ اپنا ظاہری وقار چاہتا ہے۔ خدا اور دین خدا کے لیے کسبِ علم کا خواہشمند نہیں ہے۔ ایسے آدمی کو علم سکھانے سے پرہیز کرے۔ اس لیے جب وہ اس شیطان سے جو اس کو بہکا رہا ہے مناظرہ نہیں کرسکتا۔ اور اپنے نفس سے دوستی کر رہا ہے۔ اور ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ کی برابری کرنا چاہتا ہے۔ یا اُن سے مقابلہ و دشمنی چاہتا ہے، تو وہ شیطان کا پیرو ہے، اور بظاہر اس کا دشمن ہے اور غرور و تکبر، ریاکاری، ظاہر پرستی، نیز محبتِ دنیا اس کے دل میں جاگزیں ہے۔ یہ سب وہ حرام چیزیں ہیں جو اس کو ہلاک کردیں گی۔

(اجتہاد کے مراتب) لہٰذا اول آدمی کو اپنے نفس کا پاک کرنا ضروری ہے۔ نفس کی طہارت سے پہلے علوم نکاح و طلاق، تجارت و بیع میں دخل دینے لگے تو بُرا ہے، اور جن لوگوں کو وہ یہ مسئلے بتائے گا اور وہ غلطی کریں گے، تو اس مسئلے کے بتانے والے کو ایک ہی اجر ملے گا۔

حضورؐ کا ارشاد ہے، کہ جس آدمی نے ثواب حاصل کرنے کے لیے اجتہاد کیا، اس کو دو اجر ملیں گے اور اگر خطائے اجتہادی کی تو ایک۔ چاہے آدمی امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے مسائل سے متفق ہو۔ یا امام شافعیؒ کا راستہ اختیار کرے۔ اس سے زیادہ فائدہ نہ ہوسکے گا۔ اور اگر صفاتِ بد کو دل میں جگہ دے گا تو باعثِ ہلاکت ہوگا۔

اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ کسی بڑے شہر میں ایک دو مجتہدین سے زیادہ نہ نکلیں گے، کہ تعلیم دینیہ کے خواہشمند ہوں، لہٰذا معلّم کے لیے بھی گوشہ نشینی اچھی ہے۔

ایسے آدمی کی مثال جو صرف طلب دنیا کے لیے کسی کو علم سکھائے، ایسی ہے کہ کسی آدمی کو ڈکیتی اور غارتگری کے لیے تلوار دے دی جائے، اور اگر یہ خیال کرے کہ شاید کسی وقت یہ خدمتِ دین کرنے لگے۔ تو وہ ایسا ہے کہ شاید ڈاکو توبہ کرکے جہادِ اسلام کرنے کو تیار ہوجائے۔ اور اگر کوئی آدمی اس کا جواب یہ دے کہ تلوار کی مثال غلط دی گئی ہے۔ تلوار توبہ کی طرف نہیں بلاتی۔ علم تو یہ سکھاتا ہے، تو یہ بھی غلط ہوگا۔ اس لیے کہ علوم، فتویٰ، خصومت، معاملاتِ دنیا، نحو، لغت وغیرہ خدا کی طرف متوجہ نہیں کرتے۔ چونکہ اُن کا تعلق دین سے نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ہر علم غرور و تکبر اور تعصب کو پیدا کرتا ہے لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ (یعنی سُننے سے زیادہ دیکھنے پر یقین کرو)۔

لہٰذا اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن لوگوں کو دیکھ کہ جنھوں نے یہ علوم سیکھے، اور کیسے رہے؟ دراصل آخرت کی طرف توجہ دلانے والا علم علمِ تفسیر اور علمِ حدیث ہے۔ اور ان علوم کا بیان باب منجیات اور مہلکات میں ہوچکا ہے۔ لہٰذا ہر معلّم کو چاہیے کہ ان علوم کی تعلیم دے جو سیکھنے والے کے دل پہ اثر کرے۔ لیکن اگر انتہائی سنگ دل ہوں، اُن کو سکھا دینا چاہیے۔

(مسئلہ) مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ کسبِ علم کرے۔ اُن کے خلاف کرنا گناہ ہے۔ اگر کوئی آدمی علم تفسیر و حدیث پڑھتا ہے، لیکن طلبِ دنیا اس پر حاوی ہے تو کسبِ علم سے پرہیز کرے، چاہے دوسروں کو کتنا ہی فائدہ پہنچانے

کا خیال کیوں نہ ہو۔ ورنہ وہ اس کے لیے تاریکی کا باعث ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوندِ عالم اپنے دین کو ایسے لوگوں سے ترقی دلواتا ہے کہ اُن میں وہ خود کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ ایسے ہیں کہ جیسے چراغ کہ مکان اس کی شعاعوں سے نورانی ہوتا ہے، لیکن خود جلتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کی کتب کے سات کتب خانے دفن کر دیے اور حدیث کو نہ فرمایا۔ اور وجہ یہ بتائی کہ اگر خاموشی کی خواہش دل میں ہوتی، روایت کرتا۔

بزرگوں کا قول ہے کہ حدثنا کہنا دنیاداری ہے۔ جو شخص کہتا ہے اس کا اصل مقصد مسند نشینی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک شخص کو کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ یہ شخص اپنے کو مشہور کرنا چاہتا ہے۔ ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وعظ کہنے کی اجازت مانگی، تو آپ نے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ آپ مجھے نصیحت کرنے سے روکتے ہیں، تو فرمایا کہ ہاں! میں ڈرتا ہوں کہ تیرا غرور تجھ کو آسمان پر نہ پہنچا دے۔

رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا نے حضرت سفیان ثوری سے ایک دن کہا کہ اگر تم دنیا کو دوست نہ رکھتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ آپ نے دریافت کیا کہ دنیا کو دوست رکھنے کی مجھ میں کون سی علامت ہے؟ تو کہا کہ حدیثوں کو سمجھانے کا شوق ہے۔

(شاگردی) حضرت ابوسلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی آدمی تم سے کسبِ علم کی خواہش کرے، اور محبت کرے، تو اس سے بچو۔ اِس لیے کہ نہ اس کے پاس جمال ہے نہ کمال۔ وہ صرف ظاہری محبت اور کسبِ علم کے شائق ہیں، اور پیٹھ پیچھے بُرائی کرتے ہیں، جو نفاق اور مکاری کی دلیل ہے۔ ان کا مقصد صرف اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لیے تجھ کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ وہ تجھ کو بیوقوف بنا کر اپنی شہرت چاہتے ہیں۔ کہ تُو ان پر اپنا مال و جان نثار کر دے۔ اس کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اور جب اُن کا مقصد پورا ہو جائے تو تُو دیکھے گا۔ کہ وہ تیرے ہی اوپر کیسا وار کریں گے؛ اور اگر ان کی خلاف مرضی کام کرے گا، تو بھی وہ تیرے دشمن ہو جائیں گے۔

فی زمانہ کوئی شاگرد، کسی کی شاگردی، بغیر کسی فائدے کے قبول نہیں کرتا۔ پہلے تو اُن کی خواہش حصولِ مال ہوتی ہے اور اس زمانے کے بیچارے معلّم اپنے طالب علموں کے لیے دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اور اُن کا ہاتھ پھیلانا خالی جاتا ہے۔ پھر بھی وہ اُن کے لیے حصولِ مال کی فکر کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر اس قسم کی پریشانیوں سے نجات مل سکے تو گوشہ نشینی اس سے بہتر ہے۔

عوام کو چاہیے کہ جب کسی اُستاد کو پڑھاتے دیکھیں، تو یہ بدگمانی نہ کریں کہ اس کا مقصد حصولِ زر ہے بلکہ حصولِ عزّت خیال کرنا اچھا ہے۔ ایسے لوگ جو خود بدگمان ہوتے ہیں، وہ سب کے لیے ایسی ہی بدگمانیاں سوچتے ہیں۔ ہر آدمی دوسروں کو اپنے جیسا خیال کرتا ہے۔ لہٰذا علماء کو اپنا فریضہ سمجھ لینا چاہیے اور عوام بھی سمجھ لیں کہ محض

کسی بہانے کی بنار پر علمار کو بُرا نہ سمجھیں۔ کیونکہ کسی کی طرف سے خواہ مخواہ بدگمانی کرنا باعثِ تباہی ہوتا ہے

دوسرا نقصان گوشہ نشینی میں یہ ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچانے یا اُن سے حاصل کرنے سے محروم رہنا ہے۔ اس لیے کہ عیال دار آدمی کے لیے کسبِ مال عبادت ہے۔ اور کسب بغیر میل جول کے ناممکن ہے۔ لہٰذا ایسے آدمی کے لیے گوشہ نشینی ناجائز ہے، لیکن اگر اس کے اہل وعیال کے کھلانے کے لیے اس کے پاس ہے اور کمانے کی ضرورت نہیں، تو گوشہ نشینی ہی اختیار کرے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ کسی کو نفع پہنچانا صدقے کا درجہ رکھتا ہے، اور اگر گوشہ نشینی محض ظاہری ہے تو اس سے صدقہ دینا اور کسبِ مال کرنا افضل ہے۔ اگر آدمی کا دل خدا کی طرف رجوع ہو گیا ہے تو یہ سب سے اچھا ہے، کیونکہ اصل عبادت کا مقصد یہ ہی ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ دوسروں کی بداخلاقیاں اور مظالم برداشت کرنے میں جو مجاہدۂ نفس ہوگا۔ وہ گوشہ نشینی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر آدمی ریاضت میں کامل نہیں ہوا ہے، تو اس کے محروم نہ رہنے میں ہی فائدہ ہے، کیونکہ اچھی عادت کا ہونا تمام عبادات کی بنیاد ہے، جو بغیر میل جول کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ نیک عادت وہ ہے، جو لوگوں کی ایسی طلب پر جو اس کے لیے ناممکن ہے، صبر سے کام لے۔

صوفیائے کرام کے خدام اپنے غرور کو توڑنے کے لیے عوام سے ملتے جلتے ہیں اور صوفیوں کی خدمات سے اپنے نفس کو مارتے ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ درجہ ریاضت پر پہنچ جائیں۔ پہلے زمانے میں صوفیائے کرام کی خدمات اسی لیے لوگ انجام دیتے تھے۔

حالانکہ اب لوگوں کی عادات بدل گئی ہیں۔ لہٰذا جو آدمی ریاضت کے منازل حاصل کر چکا ہے، وہ گوشہ نشینی اختیار کرے۔ کیونکہ ریاضت نفس کو ہر حیثیت سے رنج و مصیبت کی برداشت کا پیدا ہونا نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ دوا کے استعمال سے صرف تلخی ہی کو مراد نہیں لے سکتے۔ بلکہ اس سے مرض کو ختم کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح ریاضت کے ذریعے محبتِ خدا کا حصول مقصود ہوتا ہے، جو ریاضت کی عادت کے بعد ملتی ہے۔ اسی طرح دوسروں کو ریاضت سکھانا علمِ دین میں شامل ہے، اور وہ گوشہ نشین رہ کر حاصل نہیں ہو سکتی۔

چوتھا نقصان یہ ہے کہ گوشہ نشینی میں وسوسے پیدا ہونا اور یادِ الٰہی دل سے منحرف ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اور یہ بات لوگوں کے ملنے جلنے سے جاتی رہتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ اگر مجھ کو اپنے دل کے اچاٹ ہونے کا خطرہ نہ ہو، تو صحبت دنیا ترک کر دوں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے فرمایا ہے کہ دل کسی کو راحت پہنچانے سے بھاگنا نہ چاہیے، کیونکہ جبر کرنے سے مسخ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے روزانہ ہر آدمی کو تھوڑی دیر کسی دوست کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے۔

تاکہ دل کو آرام مل سکے، لیکن اس دوست سے معاملات دین کے متعلق ہی گفتگو ہونا چاہیے۔ اہل دنیا کے پاس بیٹھنا مضر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی دوست کی صفت اختیار کرے تو اوّل سوچے وہ کس قسم کی صفت ہے؟

پانچواں نقصان یہ ہے کہ ثواب تشیع جنازہ، دعوت میں شرکت اور لوگوں سے تعزیت و مبارکباد میں ملتا ہے، تو گوشہ نشینی سے جاتا رہتا ہے۔ لیکن ان کاموں میں بہت رواسم دنیا جو اچھے نہیں ہیں شامل ہوگئے ہیں اگر کوئی آدمی اُن ہنگاموں سے محفوظ نہیں رہ سکتا تو گوشہ نشینی ہی بہتر ہے۔ بزرگان دین میں سے بہت سے آدمیوں نے ان چیزوں کو ترک کرنا ہی مناسب سمجھا ہے۔

چھٹا نقصان یہ ہے کہ حقوق الناس کو ادا کرنا ضروری ہے، جو گوشہ نشینی سے فوت ہو جاتا ہے۔ اس میں تکبر پیدا ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں سے نہ ملنا چاہے۔

(حکایت) بنی اسرائیل میں ایک حکیم نے تین سو ساٹھ کتب تصنیف کی تھیں۔ ایک دن اس کو اپنی خدمات کا خداوند عالم کی درگاہ میں گمان پیدا ہوا۔ چنانچہ نبی وقت کے پاس وحی نازل ہوئی کہ اس حکیم سے کہہ دو کہ اُس نے اُن کتب کی تصنیف سے چار عالم میں شہرت حاصل کی ہے، لیکن ہم کو پسند نہیں۔ یہ سُن کر وہ ڈرا اور گوشہ نشینی اختیار کی اور سوچا کہ اب شاید خوشنودی خدا حاصل کر سکوں۔ لیکن پھر وحی ہوئی کہ ہم اس کے اس عمل سے بھی ناخوش ہیں۔ چنانچہ اُس نے لوگوں سے میل جول شروع کر دیا۔ اس کے بعد وحی نازل ہوئی، کہ اب ہم خوش ہوئے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ بعض آدمی صرف تکبر و غرور کی وجہ سے گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں۔ کیوں کہ محافل میں ان کی عزت نہ کی جائے گی۔ یا اُن میں خصوصیات کی کمی ہے اور سوچتے ہیں کہ اُن سے لوگ بہرہ ور ہو جائیں گے! ایسے لوگ گوشہ نشینی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسی گوشہ نشینی منافقت ہے۔

(صحبت اور گوشہ نشینی) خداوند عالم کی راہ میں گوشہ نشینی اختیار کرنے کی دو علامتیں ہیں

پہلے یہ کہ خلوت میں کبھی بیکار نہ رہے۔ ہر وقت یا تو ذکر و فکر ہو یا عبادتِ خدا دوسرے لوگوں کو اپنی زیارت کے لیے بلانے کی خواہش نہ کرے۔

(موت کی خواہش) ایک بار ابوالحسن حاتمی، حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے اور اپنے غیر حاضر ہونے پر معافی مانگی، کہ میں حاضری سے کم مشرف ہوتا ہوں، تو فرمایا کہ عذر خواہی نہ کرو۔ اس لیے کہ لوگ جتنا دوسروں کے آنے سے خوش ہوتے ہیں میں نہ آنے سے۔ کیونکہ مجھے صرف ملک الموت کے آنے کا اشتیاق رہتا ہے۔

ایک امیر آدمی حضرت حاتم اصم کے پاس آکر کہنے لگا کہ آپ کو کسی چیز کی حاجت ہے؟ تو فرمایا کہ تم نہ آیا کرو اس خیال سے گوشہ نشین ہونا جہالت ہے، کہ لوگ اس کے پاس آیا کریں۔

گوشہ نشینی کا ادنیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ آدمی خلق کے لیے اپنے کو ضرورت مند نہ سمجھے۔ اور یہ سوچے کہ اگر وہ پہاڑ پر بھی گوشہ نشین ہوگا۔ تو بھی لوگ اس کے اس عمل کو نفاق سے تعبیر کریں گے۔ اور اگر شراب خانے میں جائے گا تو اس کا دوست اس کو دیکھ کر سوچے گا کہ یہ ملامت کے لیے آیا ہے۔ وہ جس حالت میں بھی ہوگا دو قسم کے لوگ اس کو خیال کریں گے۔ اچھا یا بُرا۔

لہٰذا دین کی طرف رغبت کرے، لوگوں کے کہنے کی پرواہ نہ ہونا چاہیے۔

(تمثیلات) حضرت سہل تستری نے ایک مرید سے کسی کام کی فرمائش کی۔ اس نے جواب دیا کہ لوگوں کی مُلامت اور لعن طعن سے ڈرتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے اپنے تمام مریدوں سے فرمایا کہ اس کام کی حقیقت کو بغیر دو باتوں کے کوئی نہیں پہچان سکتا۔

یا تو لوگ اس کی نظر میں اتنے حقیر ہو جائیں کہ وہ کسی کے کچھ کہنے کی پرواہ نہ کرے۔

یا اس کا نفس اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جائے کہ لوگوں کے طعن و طنز کی پرواہ نہ کرے۔

(نکتہ چینیوں سے بے نیازی) حضرت حسن بصری سے کچھ لوگوں نے کہا کہ بعض لوگ آپ کے وعظ میں نکتہ چینی تلاش کرنے کو آتے ہیں۔ تو فرمایا کہ میں اپنے نفس کو دیکھتا ہوں کہ وہ خداوند عالم کی محبت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اپنے لیے لوگوں سے تحسین و آفرین کہنے کا خواہش مند نہیں رہتا۔ اس لیے کہ وہ لوگ تو اپنے خدا پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی مجھے پرواہ نہیں۔

ان تمام دلائل سے تم نے گوشہ نشینی کے فوائد و نقصانات سمجھ لیے ہوں گے۔ لہٰذا اپنے نفس پر غور کرو۔ اور جو تمھارے لیے مناسب ہو اس پر عمل کرو۔

گوشہ نشینی کے آداب

(آداب گوشہ نشینی) گوشہ نشین کی یہ نیت ہونا چاہیے کہ وہ دنیا والوں کو اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھے گا اور خود لوگوں کی شر سے محفوظ رہے گا۔ خداوند عالم کی عبادت کے لیے گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ کسی وقت بھی بیکار نہ رہنا چاہیے، بلکہ ذرا ذکر و فکر اور عبادت الٰہی میں ہر وقت مصروف رہے۔ لوگوں کو اپنے پاس آنے سے روکے۔ بُری باتوں کو نہ سُنے۔ اس لیے کہ ہر بات آدمی کے سینے میں محفوظ رہتی ہے، اور تنہائی میں پھر یاد آتی ہے۔ نفسانی باتوں کو قطعی یاد نہ کرے، تاکہ خلوص قلب سے ذکر کر سکے۔ دنیاداروں کی باتیں نفس کو اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کھانے اور کپڑے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتنا چاہیے، ورنہ دنیاداری کی رغبت پیدا ہوگی۔ پڑوسی

اگر دکھ پہنچائیں تو صبر کرے ۔ کسی کے بُرا کہنے کی پروانہ کرے ۔ اگر لوگ منافق اور ظاہر پرستی کا خطاب دیں تو فکر نہ کرے ۔ یا مخلص بھی کہیں تو نہ اکڑے ۔ کیونکہ یہ باتیں ذکر خدا کے لیے مانع ہوتی ہیں ۔ اور جو گوشہ نشینی میں آخرت کی خدمت کے مانع ہوں گی ، اور گوشہ نشینی صرف آخرت کے کام میں مصروف رہنا ہے ۔

ساتواں اصُول

آداب سفر میں

(سفر ظاہر و باطن) سفر کی دو قسمیں ہیں ، ایک ظاہر ، دوسرا باطن (سفر آخرت) اولیاء اللہ اور بندگانِ خصوصی اسی سفر میں مشغول رہتے ہیں ۔ کہ اُن کے جسم ایک جگہ مقیم ہے اور دل عجائباتِ خداوندی سے بہرہ ور ہوتے ہیں ۔ ان کا سفر ساتوں آسمانوں اور زمینوں کا سفر کرنا ہے ۔ خاصانِ خدا اور عارفانِ حقیقی کو ہر بہشت کی ہر وقت سیر ہو سکتی ہے ۔ خداوند عالم اپنے بندوں کو اسی سفر کی طرف مخاطب فرماتا ہے اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ (یعنی کیا تم زمین و آسمان کے عجائبات اور جو کچھ خدا نے اس میں پیدا کیا ہے ، ان کو نہیں دیکھتے) جو آدمی معرفتِ الٰہیہ کا سفر نہ کر سکے وہ سفر ظاہری اختیار کرے ۔

مثلاً کعبے شریف کو حج کے لیے جائے ، تاکہ اس کی ظاہری زیارت سے مشرف اندوز ہو سکے ، لیکن سفر باطن کرنے والے لوگ گھر بیٹھے کعبے کی زیارت کرتے ہیں ، اس کا دل وہیں طواف کرتا ہے ۔ اپنی باتیں اس سے ظاہر کرتا ہے ۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

شیخ ابو سعید علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ ظاہری سفر کرنے والے بزدل لوگوں کے پیروں میں آبلے پڑتے ہیں اور باطنی سفر والوں کے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے چوتڑوں میں ۔

(ظاہری سفر کے آداب) آداب سفر ظاہر و باطن کو الگ الگ باب میں تقسیم کر دیا گیا ہے ، تاکہ آسانی سے سمجھ میں آ سکے ۔

باب اوّل ۔ نیت سفر اور اس کے آداب

باب دوم ۔ سفر کے متعلق آدمی کی معلومات

باب اوّل

آدابِ سفر

(سفر کی قسمیں) سفر کی پانچ قسمیں ہیں :

پہلے طالب علمی کے لیے سفر کرنا ۔ یہ واجبات میں داخل ہے ، اس لیے کہ طالب علم واجب ہے ۔

علم کے لیے سفر کرنے کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ علم شرعیات پڑھنے کے لیے

اس کی فضیلت یہ ہے، کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ جو آدمی علم دینیات سیکھنے کے لیے گھر سے سفر کرتا ہے، وہ جب تک باہر رہتا ہے راہ دین کے تمام ثواب اس کو ملتے رہتے ہیں۔ فرشتے اس کے لیے اپنے پروں کو بچھاتے رہتے ہیں۔

بزرگانِ ماسلف نے ایک بار ایک حدیث کی چھان بین کے لیے ایک طویل ترین سفر کیا ہے۔

شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اگر صرف کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سننے کے لیے شام سے یمن تک سفر کیا جائے تو ثوابِ دارین ملتا ہے۔

وہ تمام سفر جو زادِ آخرت کے حصول کے لیے ہونا چاہئیں۔

دوسری قسم، اپنی بری صفات کو پہچاننے اور اُن کو درست کرنے کے لیے سفر کیا جائے عموماً سفر کرنے والوں کو دنیوی حادثات پیش آنے سے اپنے نفس کی صحیح حالت معلوم ہو جاتی ہے، اور آفات زمانہ سے روشناس ہو کر وہ اپنے نفس کو دُرست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جو لوگ سفر نہیں کرتے اُن کو ایسی چیزوں سے واسطہ نہیں ہوتا وہ دنیوی کاموں میں بھی بہادر نہیں بنتا۔

حضرت بشر نے فرمایا ہے کہ علماء کو سفر کرنا چاہیے تاکہ دُنیا کے عجائبات سے لطف اندوز ہو کر خدا کی معرفت ہو۔

تیسری قسم، دُنیا کی عجائبات، جن میں مخلوقات، نباتات، جمادات سب شامل ہیں۔ ان کی سیر کرے تاکہ صانع حقیقی کے نورانی حقائق کو سمجھ سکے۔ کہ اس نے کیا کیا چیز پیدا کی ہے۔ وہ سب اس کی عبادت میں سربکف ہیں۔ اور اس کے وجود و وحدانیت کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ جب ان سے سبق حاصل کرے گا، تو اس کو ظاہری زمین پر طواف کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھ کر ہی تمام دُنیا کو دیکھتا ہے، کہ دن رات سب کے سب اس کے گرد گھوم رہے ہیں اور زبان بے زبانی سے کہہ رہے ہیں کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یعنی بہت سی خدا کی نشانیاں زمین پر ہیں حالانکہ دنیا والے ان کو نہیں سمجھ پاتے) بلکہ اگر آدمی صرف اپنی تخلیق کو ہی اچھی طرح سوچنے لگے تو وہ ہی قدرتِ خدا کا نمونہ ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ آنکھیں کھولو، تاکہ عجائبات دنیا دیکھ کر قدرتِ خدا نظر آئے، لیکن میں کہتا ہوں کہ آنکھیں بند کرو، تاکہ عجائباتِ فطرت تمہاری نگاہوں میں اُتر آئیں۔ ہماری دونوں کی باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

(منازل سفر) پہلی منزل آدمی کے لیے وہ ہی ہے، کہ ظاہری آنکھوں سے دُنیا کے عجائبات دیکھے۔ اور دوسری منزل حقیقی کو دل کی آنکھ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

عجائباتِ ظاہری کی ایک حد مقرر ہے۔ لیکن عجائباتِ باطنی لامتناہی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ حقائق سے متعلق ہوتے ہیں۔ جس کی حدود مقرر نہیں کیے جا سکتے۔

(برکاتِ سفر) ہر صورتِ جسمیہ کے لیے ایک رُوح مقرر کر دی گئی ہے۔ ظاہری جسم کے لیے آنکھ بنائی گئی۔ اسی طرح باطنی حقیقت کے لیے باطن آنکھ ہونا چاہیئے۔ صورتِ جسمیہ محدود چیز ہے۔ جس کی آسان مثال یہ ہے کہ زبان صرف ایک مزعۂ گوشت ہے، اور دل ایک خون کا سیاہ لوتھڑا ہے۔ ان دونوں کا مقابلہ کرنے سے اُن کی حقیقت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ جوہر اور جسم کیا چیزیں ہیں؟

اجزائے عالم اور کائنات کے ظاہری ذرات کو دیکھنے والے چشمِ ظاہری رکھتے ہیں، جن کا رُتبہ صرف جانوروں جیسا ہی ہے، لیکن بہت سی چیزیں ہماری ظاہری آنکھوں کے ذریعہ ہی چشمِ باطن کو سبق دیتی ہیں۔ لہٰذا اس نظریے کے ماتحت دنیا کا سفر کرنا اچھا ہے۔

دوسری منزلِ حقیقی جو دل کی آنکھوں کے ذریعہ سمجھی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے۔

کہ حج وغزوہ اور اولیاء و اصفیا علیہم السّلام کی زیارات سے مشرف ہونے کے لیے سفر اختیار کیا جائے، تاکہ اُن کے مزار پر بیٹھ کر اُن کے کردار، اُن کے اقوال اور اُن کے حقائق روشن ہو کر ہم کو دینِ الٰہیہ کی طرف رجوع کریں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے لَا تَشُدُّوا الرِّحَالَ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثِ مَسَاجِدَ (یعنی تم سفر نہ کرو، لیکن صرف تین مساجد کی زیارت کے لیے) یعنی مسجد مکّہ۔ مدینہ منورہ اور بیت المقدس۔ لہٰذا انبیاء علیہم السّلام کی زیارت کے لیے اس نیت سے جانا روا ہوگا۔

سفر کی تیسری قسم، یہ ہے کہ دُنیا کی آراستگی اور رونق و دلبستگی سے نفرت کرتے ہوئے سفر کیا جائے۔ یہ سفر واجب ہوگا۔ اس لیے کہ جب وہ راہِ دین میں جا سکتا ہے، تو دنیا کے ظاہری مال کو چھوڑنا اچھا ہی ہوگا۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے قَدْ نَجَا الْمُخِفُّوْنَ (ہلکے آدمی جن کے پاس مال و اسباب نہ ہو جلدی رہائی حاصل کرتے ہیں) عموماً وہ لوگ جو رئیس ہیں خدا کی یاد محو کر دیتے ہیں۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ جاہل آدمی بھی اس زمانے میں خطرات میں مبتلا ہیں چہ جائیکہ معرفتِ خدا رکھنے والے عالم ـــــ اور اب تو زمانہ ایسا ہے کہ جہاں دُنیا والے تم کو پہچان لیں، وہاں سے کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہیے، جہاں کوئی نہ جانتا ہو۔

(تمثیل سفر برائے عبادت) ایک بار ایک بزرگ اپنا سامان پیٹھ پر رکھے کسی ایسی جگہ جا رہے تھے کہ جہاں کھانے کی سب چیزیں سستی تھیں۔ آپ سے لوگوں نے کہا کہ یہ سفر دنیا کی ہوس کے لیے ہے تو جواب دیا کہ جہاں سامانِ معیشت سستا ہے، عبادتِ خدا میں زیادہ جی لگتا ہے۔

چوتھی قسم سفر کی یہ ہے کہ تجارت کے لیے کیا جائے۔ یہ سفر مباح ہے، اور اگر اہل وعیال کی فراخی کی نیت ہے تو یہ سفر بمنزلہ عبادت ہے۔

(سفر برائے تجارتِ دُنیا) لیکن اگر ظاہری شان وشوکت کا اضافہ مقصود ہے تو قطعی شیطان کی تابع ہوگی، اور ایسا حریص آدمی عمر بھر کماتا ہے اور پھر بھی حرص وہوس اس کو رنجیدہ کرتی رہتی ہیں۔ اور وہ ہمیشہ مال جمع کرتے کرتے مرجاتا ہے، یا کسی حادثے میں اس کا مال اس سے چھن جاتا ہے۔ ایسے آدمی کے مال پر اس کے وارثوں کو قابض ہوجانا چاہیے۔ اگر وہ مرتے وقت کوئی وصیت بھی کرے تو اس پر عمل نہ کرے، لیکن اس کا قرضہ ادا کر دینا چاہیے، ورنہ فعل حرام ہوگا۔

(سفر برائے سیر وتفریح) پانچویں قسم یہ ہے کہ سیر وتفریح کے لیے جائے، یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ بہتات نہ ہو، صرف نئے شہروں کی سیر وتفریح کے لیے نت نئے دن جانا، اور صرف تفریح کرنا۔ اس کے متعلق علمائے اسلام میں اختلاف ہے۔

بعض کے خیال میں ایسا سفر اپنے لیے باعثِ تکلیف ہوتا ہے، اور نہ ہونا چاہیے، لیکن میرے خیال میں دُرست ہوگا، حرام نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر آدمی بکفایت سیر کرسکتا ہے تو کوئی حرج نہیں خصوصاً یہ عادت کنجوسی سے بچاتی ہے۔

لیکن اگر فقیر بغیر کسی وجہ کے شہروں شہروں مارے مارے پھریں۔ وہ چونکہ سیر کی طاقت نہیں رکھتے اور کسی ایک جگہ بیٹھ کر عبادت نہیں کرسکتے، اُن کو صرف جہاں اچھا کھانا مل جائے، ٹھہر جاتے ہیں اور اگر کھانے کو نہ ملے، تو ناراض ہوتے ہیں، یا اگر اُن کو اچھا کھانا ملنے کی اطلاع ہی مل جائے۔ تو وہاں فوراً پہنچ جاتے ہیں، اور کسی اچھے مقصد کا بہانہ کر دیتے ہیں، تو یہ سفر حرام تو نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں مکروہ ضرور ہوگا۔

(ظاہری بھیک مانگنے والے) ایسے لوگ فسق وفجور کے مرتکب تو نہیں ہوتے لیکن بدعادت ضرور ہوتے ہیں۔ جو آدمی صوفیوں کا لباس پہن کر روٹی کھائے، وہ عاصی ہے اور اپنے کو ولی یا صوفی کہہ کر پیسہ لے، وہ بھی حرام ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ صرف فقیروں جیسا لباس اور پانچوں وقت کی نماز پڑھنے والا صوفی نہیں ہوجاتا۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو صرف خدا کے لیے جیتا ہے، اور اس کی معرفت کی حصول کے لیے کھاتا ہے، پیتا ہے، سفر کرتا ہے اور حصولِ معرفت کے بعد کوئی گناہ نہیں کرتا۔ یا اسلام کی خدمت میں اپنا تن، من، دھن لگا دیتا ہے، ورنہ اُن لوگوں کا یہ عمل محض اوباشانہ حرکات پر مشتمل ہوگا۔ اور ایسے آدمی جو ان ناشائستہ حرکات میں قوی ہوگئے ہیں۔ شریعتِ اسلام کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں، اور اُن کو گمان ہے کہ اب ہم کو دنیا کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ان لوگوں کا حال اس حوض کے پانی کی طرح ہوگیا ہے، جس کو کوئی گندہ پانی نجس نہیں کرسکتا۔ شریعت کو وہ لوگ صرف

مذاق سمجھتے ہوں اور بیکار گردانتے ہوں - ایسے گدڑی پوش کو قتل کرنا - ہندوستان اور روم میں ایک ہزار کافروں کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ انسان عموماً کُفر کے لفظ سے اجتناب کرتے ہیں، لیکن یہ آدمی اپنے کو مسلمان کہہ کر اسلام کو باطل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ آدمی شیطان کا سب سے بڑا مُرید ہے۔ اور ایسے لوگ زیادہ تر اس زمانے میں پائے جاتے ہیں۔

ظاہری آداب مسافرت

سفر کے آٹھ آداب ہیں:

پہلا یہ کہ ظلم کو دل سے نکال دے۔ اگر کسی کی امانت رکھی ہو، تو اس کو واپس کر دے۔ اگر کسی کا روزینہ واجب ہو، تو اس کو ادا کرے۔ کسب حلال سے سفر کرے اور اپنا پیسہ رکھ لے، کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مراعات کر سکے۔ نیک اور اچھی باتیں کرے۔ مالکوں اور ہم سفروں کے ساتھ سلوک نیک کرے۔ یہ سب باتیں نیک اخلاقی میں داخل ہیں۔

دوسرا یہ کہ ساتھی نیک تلاش کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا سفر کرنے کو منع فرمایا ہے۔ اور حکم ہے کہ اگر تم میں تین ہمراہی ہوں تو اُن میں سے ایک کو اپنا سردار مقرر کر دو، تاکہ ہر کام وہ تم میں سے ہر ایک کے سپرد کر دے۔ اور ہر آدمی اپنے کام کو فرض سمجھ کر بر وقت کرتا ہے۔ ورنہ سفر میں تکلیف ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے دُنیا کے کام دو خُداؤں کے سپُرد ہوتے، تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ ایسے آدمی کو اپنا سردار بناؤ جو تم میں خوش اخلاق اور تجربہ کار ہو۔

تیسرا یہ کہ جب اپنے عزیزوں کو رخصت کرے، تو پڑھے اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکَ وَاَمَانَتَکَ وَخَوَاتِیْمَ عَمَلِکَ (یعنی میں تیرا دین و اسلام، تیرا انجام خدا کو سونپتا ہوں) جب کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر کے وقت رخصت ہوتا، تو ارشاد فرماتے زَوَّدَکَ اللّٰہُ التَّقْوٰی وَغَفَرَ ذَنْبَکَ وَوَجَّہَ لَکَ الْخَیْرَ حَیْثُ مَا تَوَجَّھْتَ (یعنی خداوند عالم تجھ کو نیکی کی توفیق دے اور تیرے گناہ بخش دے، اور تو جہاں جائے وہاں تیری نیکی تیرے ساتھ ہو) لہٰذا یہ دُعا اس وقت پڑھنا چاہیے جب تم کسی اپنے دوست کو سفر پر جانے کے لیے رخصت کرو۔

(حکایت) ایک مرتبہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کے پاس صدقہ تقسیم کرتے وقت مع اپنے بیٹے کے حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ تیرا بیٹا تیرے بہت مشابہ ہے۔ اس نے عرض کی کہ اس کا قصّہ نہایت عجیب و غریب ہے، یہ جب بطن میں تھا، تو میں سفر کو گیا اور یہ دعا دے گیا، کہ جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے، اس کو خدا کے سپرد کیا چنانچہ جب واپس ہوا تو ایک رات کو باتیں کرنے میں دُور سے شعلہ بھڑکتا ہوا نظر پڑا۔ میں نے جا کر دیکھا تو میری اہلیہ کی قبر پر شمع روشن ہے، اور یہ بچہ وہاں کھیل رہا ہے۔ میرے کان میں آواز آئی کہ اس کو تو ہمارے سپرد کر گیا تھا۔ لہٰذا اپنی امانت لے جا، اور اگر اس کی ماں کو بھی سپرد کر جاتا تو وہ بھی بحفاظت تجھ تک پہنچا دی جاتی۔

(دو نمازیں برائے سفر) چوتھے، یہ کہ چلتے وقت دو نمازیں ادا کرے۔
پہلی نماز استخارہ جس کی دُعائیں اور طریقہ نماز دوسری کتب میں درج کر دیا گیا ہے۔
اور دوسری نماز گھر سے باہر نکلتے وقت چار رکعت پڑھے۔
حدیث شریف میں ہے کہ ایک آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا، کہ میں سفر کو جا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وصیت لکھ کر دے جاؤں۔ لہٰذا حکم دیجئے کہ کسی کو نائب بناؤں۔ حکم ہوا کہ بہترین نائب اس کی وہ چار رکعت نماز ہے، جو اس نے وقت سفر پڑھی ہے۔
(نماز سفر) طریقہ نماز سفر: اوّل سُورۃ الحمد، بعدہٗ سُورۃ قل ھو اللہ پڑھے اور یہ دُعا مانگے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَتَقَرَّبُ بِھِنَّ اِلَیْكَ فَاخْلُفْنِیْ بِھِنَّ فِیْٓ اَھْلِیْ وَمَالِیْ ھِیَ خَلِیْفَۃٌ فِیْٓ اَھْلِہٖ وَمَالِہٖ دَوْرَتْ حَوْلَ دَارِہٖ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلٰٓی اَھْلِہٖ (یعنی اے خدا میں اس نماز کے ذریعہ تیرا قرب چاہتا ہوں۔ پس اس نماز کو میرا نائب بنا دے، تاکہ یہ امین رہے، میرے اہل و عیال اور مال و منال کی) لہٰذا یہ رکعتیں اس کی غیبت میں اس کی ہر چیز کی حفاظت کرتی ہیں۔
(سفر کا مُبارک دن) پانچواں یہ کہ گھر سے نکلتے وقت کہے بِسْمِ اللّٰہِ بِاللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ اور سواری پر سوار ہوتے وقت یہ پڑھے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (یعنی وہ ذات پاک ہے جس نے ہمارے لیے یہ سواری عنایت کی، ہمارے قابو میں نہ تھی، اور بے شک ہم اپنے پروردگار کی طرف جانے ہیں۔
چھٹا یہ کہ جمعرات کے دن صبح کو سفر شروع کرنے کی کوشش کرے حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ سفر اور دعا کے لیے صبح کا وقت افضل ہے۔
آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دعا کی اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لِاُمَّتِیْ فِیْ بُکُوْرِھَا یَوْمَ السَّبْتِ اور فرمایا اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لِاُمَّتِیْ فِیْ بُکُوْرِھَا یَوْمَ الْخَمِیْسِ۔ سفر کے لیے ہفتے اور جمعرات کا دن مبارک ہوتا ہے۔
ساتواں یہ کہ حتی الامکان جانور پر وزن کم رکھے۔ صبح شام ایک گھنٹے کے لیے پیدل چلے تاکہ جانور کو بھی آرام مل جائے اور اپنے کو بھی بیٹھنے کا کسل نہ ہو۔
پہلے لوگوں میں بعض جب جانور کرائے پر لیتے تو مالک سے یہ طے کر لیتے کہ ہم جانور پر راستے میں اتریں گے نہیں، لیکن بعد میں بنظر صدقہ اُتر جاتے تھے۔ جس جانور کو خواہ مخواہ مارو گے یا پریشان کرو گے وہ قیامت کے دن دامن گیر ہوگا۔

(سواری کے آداب) حضرت ابوالدردا کا اونٹ مرا، تو فرمایا کہ خبردار، خدا سے میرا کوئی گلہ نہ کرنا، کیونکہ میں نے ہمیشہ تیری طاقت کے موجب کام لیا ہے۔ وزن کے مطابق مالک سے جانور کا کرایہ طے کرے۔ اور اس سے زیادہ وزن نہ لادے۔

ایک بار حضرت ابن المبارک ایک اونٹ پر سوار ہوئے، کسی نے ایک خط اُن کو کہیں دینے کے لیے دیا۔ آپ نے منع کر دیا کہ میرے معاہدے میں یہ خط شامل نہیں ہے۔ آپ نے فقہا کے کہنے کے مطابق اس کاغذ کے وزن کو بھی وزن سمجھا۔ اس وقت پرہیزگاری اور تقویٰ سے کام لیا۔

(سامانِ سفر) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کو تشریف لے جاتے، تو کنگھا، آئینہ، مسواک اور سُرمے دانی ضرور لے جاتے۔ بعض روایات میں ناخن گیر اور شیشے کے متعلق بھی ہے۔ صُوفیائے کرام رسّی اور بالٹی بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ پہلے لوگ استنجا کرتے وقت دورانِ سفر میں صرف پتھر پر اکتفا نہ کرتے، بلکہ پانی سے بھی طہارت کیا کرتے۔ اگرچہ حضر میں ان کی یہ عادت نہ تھی، لیکن ان کا سفر زیادہ تر حج یا جہاد کے لیے ہوتا۔ اس لیے وہ لوگ زیادہ سے زیادہ احتیاط برتتے۔

(دُعا واپسی سفر) آٹھواں ادب یہ ہے، کہ جب واپس آئے، اور وطن کی دیواریں نظر آنے لگیں تو یہ دُعا پڑھے اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لَنَا بِهَا قَرَارًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا۔

حضورؐ کا عمل یہی تھا اور یک لخت مکان میں داخل نہ ہوتے، بلکہ مسجد میں اوّل دو رکعت نماز شکر ادا کرتے پھر گھر میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھتے تَوْبًا تَوْبًا لِرَبِّنَا اَوْبًا لَا يُغَادِرُ عَلَيْنَا حَوْبًا (یعنی خدا سے توبہ کرتا ہوں ایسے حال میں کہ سفر سے واپس آؤں) گھر والوں کے لیے تحفے تحائف لانا سُنّتِ مؤکدہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کسی چیز کی مقدرت نہ رکھتا ہو تو کم از کم ایک پتھر ہی وہاں سے لے لے، تاکہ وہ سُنّت پوری کر سکے۔

اب آدابِ باطنی لکھے جاتے ہیں، آدابِ ظاہری ختم ہو گئے۔

باطنی آدابِ سفر

(آدابِ باطنی) اوّل یہ سوچنا چاہیے کہ بغیر اس سفر کے میرے دین میں کوئی تزلزل پیدا ہوتا ہے، تو سفر کرے اور اس کے بعد بھی اگر کوئی نقصان ہو تو راستے سے ہی واپس ہو جائے۔

نیّت کرے کہ بزرگانِ دین کی زیارت کو جائیں گے، اور نیک آدمیوں کی صحبت سے فیض یاب ہوں گے۔ کسی شہر میں دس دن سے زیادہ نہ رہے، لیکن اگر بزرگ کی خدمت مقصود ہو۔ اگر کسی بھائی سے ملنے جائے تو تین دن سے زیادہ نہ ٹھیرے، لیکن اگر وہ ٹھیرنے پر اصرار کرے تو کوئی قباحت نہیں۔ اور مُرشد کی زیارت کے

لیے صرف ایک دن رات قیام کرے۔ اگر کسی کے سلام کو جائے، تو اس کا دروازہ کھٹکھٹائے، اور جب وہ نکلے تو زیارت کرے۔ جس وقت وہ دریافت کرے، تو بات کرے۔ اگر اس سے کچھ دریافت کرنا ہو تو اجازت لے کر پوچھ لے۔ شہر کی رونق اور رنگا رنگی میں دلچسپیاں نہ لے۔ راستے میں خدا کی عبادت کرتا چلے۔ یا تلاوتِ کلام اللہ آہستگی سے کرتا رہے۔ اگر کوئی آدمی بات کرے تو جواب ضرور دینا چاہیے۔ اور گھر میں سب کچھ اللہ کا دیا ہے، تو سفر کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

باب دوم

اِبتدائے سفر کے آداب

شرعِ اسلام کی تمام چیزوں کا علم سفر سے پہلے ضروری ہے، چاہے اُن کی ضرورت پڑے یا نہ پڑے۔ علمِ قبلہ اور اوقاتِ نماز کو اچھی طرح سمجھ لے۔

(درمیانِ سفر میں آداب نماز و طہارت) حالت سفر میں طہارت دو طرح ہو سکتی ہے :

۱- مسح موزہ
۲- تیمم

اسی طرح نماز بھی دو طرح ادا کر سکتا ہے۔ پہلے یا تو قصر پڑھ لے۔ دوسرے نماز جمعہ یا سُنّت نماز کو جانور پر بیٹھے بیٹھے ادا کرے۔ یا اگر پیدل چل رہا ہے تو چلتے میں پڑھتا چلا جائے۔

لیکن روزے میں پہلے تو افطار کی اجازت ہے، ایسی صورت ہیں "طہارت" سات صورتوں پر مشتمل ہے :

(مسح موزہ کا بیان) پہلے مسح موزہ۔ طہارت کے بعد موزہ پہنے ہوئے ہونے کی حالت میں اگر "حدث" ہو
(مسئلہ) ..... جائے، تو اس وقت سے تین شب و روز تک موزے پر مسح کرتا رہے۔

اور اگر حضر میں ہو تو ایک شب و روز موزے پر مسح کرے۔

موزے پر مسح کرنے کے پانچ شرائط ہیں :

(موزے پر مسح کرنے کے شرائط) پہلی یہ کہ تکمیل طہارت کے بعد موزہ پہنے

(مسائل امام شافعیؒ) —— امام شافعی علیہ الرحمۃ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے، کہ پہلے پیر کی طہارت کے بعد قبل اس کے کہ دوسرے پیر کی طہارت کرے، موزے میں ڈال دے، تو اسے مسح نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ موزہ ایسا ہونا چاہیے، جس کو پہن کر کچھ دور چل بھی سکیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ ٹخنوں تک موزہ ثابت پہنے ہو۔

(مسئلہ۔امام شافعیؒ) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر موزہ پھٹا ہوا ہے، جس سے پیر نظر آرہا ہے، تو مسح درست نہ ہوگا۔

(مسئلہ - امام مالکؒ) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر اس موزے پر چاہے وہ پھٹا ہو مسح ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس کو پہن کر چند قدم چل سکتے ہوں۔

(امام غزالیؒ کی رائے مع توجیہہ) مصنف کتاب کی رائے میں امام شافعیؒ کا مسئلہ بہت پرانا ہے، وہ امام مالکؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے کہ موزے کا ہر وقت سِلنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور عموماً موزے جلدی ہی پھٹ جاتے ہیں۔

پانچواں مسئلہ یہ ہے، کہ پیر کی پشت پر تین انگلیوں سے مسح کرے، لیکن ایک انگلی سے بھی ہوسکتا ہے۔ ایک ہی بار مسح کرلینا کافی ہوتا ہے۔

اگر سفر کرنے سے پہلے مسح کرلیا ہے، تو ایک شب و روز کے لیے کافی ہے۔

موزہ پہننے سے پہلے اس کو جھٹکا دے دینا سنّت ہے۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موزہ پہننے کے بعد دوسرے کو جب جھٹکا دیا تو اس میں سے سانپ نکلا۔ لہٰذا احتیاطاً یہ عمل سُنّت قرار دے دیا گیا۔

دوسری ضرورت (تیمّم) بیان طہارت کے ذیل میں تیمّم کے متعلق سب کچھ بیان ہوچکا ہے، اس کو پڑھ کر عمل کیا جائے۔

(وجوبِ قصر) ضرورت سوم۔ نماز فریضہ کو قصر کرے، اور دوگانہ پڑھ لے۔ اس کے لیے چار مندرجہ ذیل شرائط مقرر کیے گئے ہیں:

۱۔ وقت پر قصر ادا کرے، اور اگر قضا ہوگئی ہو، تو قصر کی ضرورت نہیں رہتی۔

۲۔ قصر کی نیت سے ہی پڑھے، اور اگر درمیان میں نیت کے لیے شک پیدا ہوجائے تو پوری نماز ادا کرے۔

۳۔ اگر نماز باجماعت پڑھ رہا ہے تو بھی قصر کی ضرورت نہیں۔ اور اگر مسافرت میں امام بھی قصر کرے، تو وہ بھی قصر ہی کرے۔

۴۔ سفر مباح ہونا قصر کے لیے ضروری ہے۔ کسی بُرے ارادے سے سفر میں جانے سے قصر نہیں ہوتا۔ سفر کے متعلق اچھا اور بُرا پہلے بتایا جاچکا ہے۔ وہ سب سفر جو ناجائز ہیں، ان میں قصر نہ ہوگا۔

(قصر کے لیے معیّنہ سفر اور مُدّت) سفر اگر سولہ فرسخ سے کم ہے، جو آج کل کے تقریباً ایک میل سے زیادہ کا ایک فرسخ ہوتا ہے (صحیح ایک فرسخ بارہ ہزار قدم کا ہوتا ہے) تو قصر ضروری نہیں۔

اپنے شہر کے حدود سے نکل جانے کے بعد سے سفر شروع ہوتا ہے اور جائے قیام تک پہنچنے پر سفر ختم ہوتا ہے اگر وہ اپنا وطن نہیں ہے، تو تین دن یا اس سے زیادہ وہاں ٹھیرنے کا ارادہ ہو، جب قصر کرے۔

اگر ہر تین دن کے بعد روزانہ وہاں سے واپسی کی امید ہو، لیکن مشغولیت کی وجہ سے واپس نہ ہو سکے، تو قصر کرتا رہے۔ یہ مسئلہ قرینِ قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ صرف فرض نماز میں قصر کرنا درست ہے۔

سفر میں نماز قصر و سنّت کی ادائیگی کا طریقہ

چوتھی ضرورت: سفرنیک نیز اوپر بتائے ہوئے معیّنہ سفر میں دو نمازیں یکجا پڑھ سکتا ہے۔ مثلاً نماز ظہر کو ذرا تاخیر کر دے اور نماز عصر کے ساتھ پڑھے۔ یا عصر کی نماز ذرا پہلے پڑھے تاکہ ظہر کے ساتھ ادا کر سکے۔ مگر نماز کی ترتیب وہ ہی قائم رہے گی۔

سفر میں سنّتیں بھی ادا کرے تو اچھا ہے، تاکہ فضیلت حاصل ہو سکے۔ اور ایک ثواب ہاتھ سے نہ جائے۔ اگر سنّتیں سواری پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لے تو بھی کوئی قباحت نہیں۔ یا اگر پیدل سفر کر رہا ہے، تو چلتے میں پڑھتا چلا جائے۔ پہلے نماز ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں پڑھے، پھر نماز عصر سے پہلے کی چاروں رکعات۔

اس کے بعد اذان و تکبیر کہہ کر اوّل نماز ظہر، پھر نمازِ عصر ادا کرے۔ اگر تیمم میں ہے، تو نماز ظہر کے بعد نماز عصر کے لیے دوبارہ تیمم کرے۔

اگر عصر کی نماز پڑھنے کے بعد (چاہے عصر کا وقت باقی رہے) شہر میں پہنچے تو نماز دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

نماز عصر سے فراغت پا کر ظہر کی نماز کے بعد والی دو سنّت رکعتیں ادا کرے۔

اگر ظہر اور عصر کو ساتھ ہی پڑھنا ہے، تو یہی ترتیب ہے۔

اسی طرح مغرب و عشا کی نمازیں ادا کرے۔

بعض علماء کے نزدیک اوپر بتائے ہوئے فاصلے سے کم سفر میں بھی دونوں نمازیں ایک ساتھ پڑھ سکتا ہے۔

پانچویں ضرورت یہ ہے، کہ سنّت نماز گھوڑے کی پیٹھ پر چاہے وہ قبلہ رو ہو یا نہ ہو پڑھنا روا ہے، لیکن عمداً قبلے سے اس کا رُخ پھیر دینا روا نہیں۔ ایسی حالت میں رکوع، سجود بھی اشارۃً بجا لائے۔ صرف اتنا کہ رکوع کے وقت کچھ جُھک جائے، اور سجود کے لیے کچھ زیادہ، تاکہ اوپر گر نہ سکے۔ اگر کہیں مقیم ہو، تو تمام ارکان بجا لانا چاہئیں

چھٹی یہ کہ سنّت نماز کو پیادہ پا چلتے میں ادا کر سکتا ہے۔ تکبیر کے وقت تو منہ قبلے کی طرف کر لینا ضروری ہے۔ اور اس کے بعد جس سمت جا رہا ہے، چلتا جائے اور نماز ادا کرتا جائے۔ رکوع و سجود صرف اشاروں سے ادا کرے۔

تشہد کے وقت چلتے میں ہی التحیات پڑھتا چلا جائے۔ پاؤں کو نجاست پر رکھنے سے بچائے، لیکن اگر پوری

سڑک پر نجاست ہے تو مجبوری ہے۔ اگر کوئی آدمی کسی دشمن کے خوف یا سیلاب وطوفان کے ڈر سے یا درندے سے بھاگے، تو سواری پر بیٹھ کر نماز ادا کرسکتا ہے، یا صفوف جنگاہ میں ہو تب بھی ایسا کرسکتا ہے۔

لیکن ان نمازوں کی قضا واجب نہیں ہے۔

ساتویں یہ کہ چلنے سے پہلے اگر روزے کی نیت کرلی ہے تو اس کا افطار درست ہے، لیکن طلوع کے بعد گھر سے نکلنے پر افطار درست نہیں۔

اور اگر افطار کے بعد جائے قیام پر پہنچے تو اس کے لیے روزۂ واجب کو قضا کرنا درست ہے۔ اور اگر روزہ افطار نہ کیا ہو اور قبل وقت افطار جائے قیام پر پہنچ جائے، تو قبل از وقت افطار نہ کرے۔ ایسی صورت میں نماز کو بھی قصر کرنا بہ نسبت پوری نماز کے اولیٰ ہوگا۔ تاکہ اختلافی مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسی صورت میں پوری نماز درست ہے۔ اور روزہ نہ رکھنے سے روزہ رکھنا اچھا ہے۔ لیکن اگر اتنی طاقت نہ ہو تو نہ رکھنا افضل ہوگا۔

طولانی اور مختصر سفر میں قصر کا فرق

مندرجہ بالا سات فرائض میں سے تین تو طول طویل سفروں میں جائز ہیں۔ پہلے قصر نماز دوسرے قصر روزہ تیسرے تین دن رات برابر موزے پر مسح کرنا۔ باقی سات میں سے تین چھوٹے سفر میں بھی درست ہوں گی۔

۱۔ سواری پر یا پیادہ پا نماز سنت ادا کرنا۔

۲۔ نماز جمعہ نہ پڑھنا۔

۳۔ بعد قضائے نماز تیمم کرنا۔

(قبلے کو سمجھنے کا طریقہ) البتہ ایک فریضے میں، جو دو نمازوں کو یکجا پڑھنے کے متعلق ہے۔ علماء میں اختلاف ہے۔ لیکن بظاہر چھوٹے سفر میں یکجا نہ پڑھے، اور بہتر یہ ہے کہ علم سفر کے متعلق سفر سے پہلے کسی عالم سے تمام ہدایت حاصل کرلے، تاکہ درمیانِ سفر میں کوئی دقت نہ ہو۔ وقت نماز اور قبلے کے رُخ کے معلوم ہونے کا طریقہ بھی معلوم کر لینا چاہیے۔ اسی طرح نماز ظہر اور دیگر نمازوں کے اوقات کے متعلق بھی پوچھ گچھ کرلے۔ کہ فلاں وقت فلاں مقام پر پہنچوں گا تو قطب، کہاں، ہوگا۔

(مسئلہ) البتہ اگر سامنے پہاڑ آجائے، تو داہنی طرف قبلہ سمجھ کر نماز ادا کرے۔

(نوٹ) مسافر کو ان علوم کا جاننا ضروری ہے۔

آٹھواں اصُول

(بابُ السّماع)

آداب سماع

(آدابِ سماع) آداب وجد و سماع کو دو حصّوں پر منقسم کر دیا گیا ہے۔

پہلا باب، وہ سماع جو حرام ہے، یا حلال

دوسرا باب، آداب و اثرات سماع۔

باب اوّل

سماع و وجدِ مباح

(جوہرِ انسانی) جس طرح پتھر پتھر سے ٹکرا کر آگ پیدا کرتا ہے، اور پورے جنگل کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی کے دل میں بھی خدا کی طرف سے وجد و سماع کا جذبہ ودیعت کر دیا گیا ہے جس کو سُننے سے اس کے دل میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ وجد میں آنے لگتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم علوی سے جو جوہر انسان کے سینے میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس عالم علوی کو ہی عالمِ ارواح بھی کہتے ہیں۔ اور وہ عالم ارواح نظارہ گاہ 'حسن و جمال' ہوتی ہے۔ حسن و جمال کی حقیقت اور جوہر اس کے حُسن و عشق کے معیار کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی کا شائبہ خوش الحانی میں ظاہر ہوا ہے، جو دُنیا کے عجائبات میں داخل ہے اور اس کے ذریعہ دل میں ایک جذبہ معرفت و حق آگاہی پیدا ہوتا ہے۔

(قوتِ سماع کے اختراع کا سبب) آدمی بعض اوقات خود بھی اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتا۔ زیادہ تر 'وجدانی کیفیت' اُن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے، جو سادہ لوح ہیں، اور عشق و محبّت دنیاوی سے خالی ہیں۔ بلکہ خدا کی طرف لو لگائے ہیں۔ اس لیے کہ وہ عشق و محبّت ان کے لیے آگ اور پھکنی کا کام کرتی ہے۔

اگر آدمی میں عشقِ الٰہی موجود ہے تو سماع اس کے عشق کو اور فروغ دیتا ہے اور اگر خدا سے حقیقی محبت نہیں تو اس کے لیے انتہائی مضر ثابت ہوتا ہے، بلکہ حرام ہے۔

(سماع کے لیے علماء کی آراء) سماع کے متعلق علماء میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں لیکن وہ صرف ظاہر بینی سے کام لیتے ہیں۔

(مصنّف کتاب کی رائے) اُن لوگوں کا مقولہ ہے کہ آدمی صرف اپنے ہم جنس سے محبت کر سکتا ہے، لیکن سماع و وجد انسانی جنس نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لگاؤ ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا سماع محض کھیل اور بازی گری ہے۔

ہے۔ عشق اور محبّت صرف آدمیوں سے تعلّق رکھتا ہے۔ سماع میں عشقِ حقیقی نہیں۔ نہ خدا کی محبّت کے عجائبات نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن اُن سے اتنا دریافت کیا جائے کہ بندے اور خالق میں جو لگاؤ ہے اور جس محبّت کے لیے ہم کو حکم دیا گیا ہے، وہ کیا ہے؟ اگر وہ لوگ صرف اطاعت و فرمانبرداری ہی کو محبت سمجھتے ہیں۔ تو یہ غلطی ہے۔ اس کے متعلق تفاصیل تو منجیات میں بیان کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا، کہ

(سماعِ حقیقی) سماع کا تعلق براہِ راست دل سے ہونا چاہیے، جو چیز دل میں ہو، وہ ہی وجدانی کیفیات کے ساتھ ظاہر ہو، اور محبّت خدا اگر دل میں ہے، تو سماع کے ذریعہ وہ اور زیادہ بڑھتی رہے گی۔ حتیٰ کہ عشق کا مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر عشقِ حقیقی نہ ہو تو واقعی وہ لوگ سماع کو محض لہو و لعب خیال کرتے ہیں اور صرف لذّت ہی حاصل کرنا اُن کا مقصد ہوتا ہے۔ بہرحال یہ سماع اُن کے لیے بھی مباح ہوگا۔

(اقسامِ سماع) سماع کے تین اقسام ہیں:

پہلے، وہ لوگ جو صرف کھیل سمجھ کر یا دلچسپی کے لیے سُنتے ہیں، یہ لہو و لعب کا درجہ رکھتا ہے، اور منکر عشقِ حقیقی کا اشعار یہ ہی ہے، مگر حرام کا درجہ اس کو اس صورت میں بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ خود خوشی کا باعث نہیں ہوتا، بلکہ اس سے آدمی خوش ہوتا ہے اور دنیا میں بعض خوشیاں ایسی ہیں کہ شرعاً اُن کو منانا جائز ہے۔ مثلاً پرندوں کی چہچہاہٹ، عجائباتِ عالم کی رنگارنگی، سبزہ و گل کی شادابی یہ سب چیزیں ناجائز نہیں۔ اسی طرح خوش الحانی بھی کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا حرام کیسے ہو سکتی ہے۔

(حدیث) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، کہ ایک بار حبشی عید کے دن مسجد میں بازیگری کر رہے تھے، تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھ سے پُوچھا کہ تم دیکھو گی؟ چنانچہ میں دروازے میں اُن کے شانے پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر تماشہ دیکھتی رہی۔۔۔۔۔۔ الخ اس حدیث کو مکمل پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس حدیث کی غالباً پانچ وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔

(اسبابِ سماع) پہلا سبب یہ کہ لہو و لعب اور نظارہ بازی کبھی کبھی کر لینا جائز ہے۔ نیز وہ کھیل حبشی قوم کر رہی تھی، جن کے چہروں میں کوئی جاذبیت نہیں ہو سکتی۔

دوسرا سبب یہ ہے، کہ وہ بازی گری اور کھیل مسجدِ نبوی میں ہو رہا تھا۔ وہاں دیکھ لینے میں کوئی حرج نہ تھا۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے، حدیث ہے کہ جس وقت آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بازیگری دیکھنے کے لیے بُلایا، اس وقت حکم ہوا دُونَكُمْ يَا بَنِيْ اَرْفَدَةَ (یعنی اے بنی ارفدہ کھیل کود میں مشغول ہو) لہٰذا حرام نہیں ہو سکتا۔

چوتھے یہ کہ، حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہ! کیا تم دیکھنا چاہتی ہو۔ اس جملے سے معلوم ہوا کہ روزانہ کا معمول نہ تھا۔ بلکہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خود دریافت فرمایا، اور اُن کو رنجیدہ کرنا نہ چاہا۔ ہو سکتا ہے۔

کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت اس بازیگری سے محظوظ ہونا چاہتی ہوں اور حضورؐ اُن کو رنجیدہ کرنا نہ چاہتے تھے۔

پانچواں سبب یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ خود اُن کے ساتھ تشریف فرما رہے، باوجود اس کے کہ بازیگری کی نظارہ بازی کرنا حضورؐ کے اصول میں داخل نہ تھا، لیکن عورتوں اور بچوں کا دل خوش کرنے کے لیے اس قسم کے کام بُرے نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ جائز ہے۔

(بچوں کو گڑیاں کھیلنا مباح ہے) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کہ میں بچپن میں گڑیاں کھیلا کرتی تھی کہ حضورؐ تشریف لے آئے تو میری سہیلیاں بھاگ گئیں۔ حضورؐ نے اُن کو دوبارہ بُلوایا اور میرے پاس بٹھا دیا۔ ایک لڑکی سے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں، اس نے کہا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ فرمایا کہ یہ درمیان میں کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ اس کا گھوڑا ہے۔ پھر دریافت فرمایا کہ گھوڑے پر کیا ہے؟ تو عرض کی کہ اس کے بال ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنے ہنسے کہ آپؐ کے دانت مبارک نظر آنے لگے۔

یہ حدیث میں نے اس لیے نقل کی ہے کہ بچوں سے بزرگی جتانا اور اُن سے لیے دیے رہنا دین کے خلاف ہے۔ لیکن یہ دلیل اس کی نہیں ہو سکتی، کہ تصویریں بنانا (فن آرٹ) جائز ہے۔ اس لیے کہ بچوں کے کھلونے تو لکڑی یا کپڑے کے ہوتے ہیں اور ناتمام ہوتے ہیں۔

(روایت) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عید کے دن ایک بار میرے گھر میں لڑکیاں ڈھول بجا رہی تھیں، حضورؐ تشریف لائے، اور اس کو سُن کر آرام فرمانے لگے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، تشریف لے آئے، تو انھوں نے اُن لڑکیوں کو ڈانٹا۔ حضورؐ جب آرام سے بیدار ہوئے تو اُن سے منع کیا، کہ انھیں عید کے دن ڈھول بجانے سے نہ روکو۔ لہٰذا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا منع کرنا اور حضورؐ کا اُن کو روکنا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ڈھول بجانا اور گانا جائز ہے۔

خوشی کے اوقات میں سماع و رقص جائز ہے

سماع کی دوسری قسم یہ ہے کہ اگر کسی معشوق کے ساتھ اپنی وابستگی کے لیے یا کسی عورت کا خیال دل میں لیتے ہوئے اس لیے سُنے کہ اس کی شہوت اس سے زیادہ ہوگی، یا اس گانے میں صرف معشوق کے حسن و جمال ہی کا تذکرہ ہو، اور اس کے سننے سے اپنے معشوق کا تصور ہو تو یہ حرام ہوگا۔ اکثر لوگ اس قسم کی حرکات کرتے ہیں، لیکن اگر اپنی بیوی اور کنیز کے ساتھ سماع کرے تو کوئی حرج نہیں۔

تیسری قسم یہ ہے کہ دل میں نیک مقاصد لے کر سماع کیا جائے۔ وہ مقاصد چار قسم کے ہوتے ہیں۔

(مقاصد سماع) اوّل یہ کہ حاجیوں کے اشعار جو کعبۃ اللہ کی شان میں ہو، جن سے خدا کی محبت میں اضافہ ہو۔ حجاج کے لیے سماع جائز ہے۔ اسی طرح غازیوں اور مجاہدین میں عشقِ حقیقی کا اضافہ کرنے والا سرود جائز ہوگا۔ تاکہ جہاد کرنے میں جوش پیدا ہو سکے۔

دوسرا مقصد اپنے لیے نوحہ پڑھنا اور آہ وزاری کرنا جیسے جناب داؤد علیہ السلام نوحہ فرماتے تھے ۔ دلیل یہ ہے کہ اگر اپنے لیے نوحہ کرنا جائز نہیں، تو دوسروں کے لیے بھی نہیں۔ خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے کہ جو گزر گیا، اس پر افسوس نہ کرو۔ اسی طرح خدا کی دی ہوئی موت پر نوحہ نہ کرنا چاہیے، اور نوحہ گروں کو اُجرت دینا بھی جائز نہیں۔

تیسری قسم سماع کی یہ ہے، کہ اپنی خوشی کا اظہار سماع کے ذریعہ کیا جائے، لیکن وہ خوشی ناجائز نہ ہو جیسے شادی، عقیقہ اور ختنہ کے موقع پر یا سفر سے واپسی پر۔ تو یہ سب جائز ہے۔ ایک بار حضورؐ جب سفر سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ڈھول پیٹنا شروع کیا اور یہ اشعار پڑھے۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاع   وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَادَعَا لِلّٰهِ دَاع

(یعنی سلامتی کے ساتھ چودھویں رات کا چاند ہمارے لیے طلوع ہوا، تو ہم پر واجب ہے کہ ہم خدا سے دعائیں مانگیں) اسی طرح عید کے دن خوشی منانا جائز ہے۔ دو دوست اگر ساتھ بیٹھ کر سماع کے ذریعے دل خوش کریں تو بھی جائز ہے۔

چوتھی قسم سماع کی یہ ہے، کہ خداوندِعالم کا عشق حقیقی اور معرفت جاگزیں ہوگئی ہو، تو سماع واجب ہے۔ صُوفیوں اور اولیاء اللہ کا سماع صرف معرفت کو چار چاند لگانے کے لیے ہوتا تھا۔

(سماع حقیقی) آج کل سماع (قوالی) محض رسمی طور پر رہ گیا ہے۔ اس لیے کہ بعض بظاہر صوفی بنتے ہیں، لیکن دراصل کچھ نہیں ہے۔ سماع میں حقیقی صُوفیوں کو مکاشفاتِ خداوندی ہوتے ہیں، اور ان کو اسی وقت لطف آتا ہے جب وہ سماع میں مشغول ہوں۔ رُوحِ انسانی کو عالمِ انوار سے جو تعلق ہے، سماع اس کو حرکت میں لاتا ہے اُن کے تمام اعضائے ظاہری بے حس ہو جاتے ہیں اور یہی سماع دراصل سماع حقیقی ہے۔

علی حجاج شیخ ابوالقاسم کے مرید تھے۔ ایک بار انھوں نے سماع کی اجازت مانگی، تو فرمایا کہ اوّل تین دن بھوکا رہو اور اس کے بعد جب تیرے لیے لوگ بہترین کھانے پکائیں، تو بجائے اُن کے سماع میں مشغول ہو۔ ایسا مُرید جو حقائق سے ناواقف ہو اور دنیوی محبت اس کے دل میں باقی ہو، اس کو بھی سماع کی اجازت نہ دینا چاہیے۔ کیونکہ اس کا ایمان ابھی کمزور ہے۔ یہ مثال ایسی ہے جیسے کوئی ہجڑا (نامرد) مباشرت کی لذت سے ناواقف ہے۔

بعض لوگ صُوفیائے کرام کے وجد کو ظاہر پر مبنی رکھتے ہیں، وہ اس لیے کہ خود ہی ایمان سے بے خبر ہیں، تو اُن کو دوسروں کی خواہش حقیقی کیسے معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ انتہائی بیوقوف ہیں اور انھیں کے متعلق خداوندعالم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَا اِفْكٌ قَدِيْمٌ (یعنی اگر خود ہدایت پانے

کی اہلیت نہیں رکھتے تو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے)

تفصیل : جس طرح سماع جائز ہے، وہاں پانچ اسباب کی بنا پر ناجائز بھی ہو جاتا ہے

اوّل وہ سماع جو کسی عورت یا لونڈے کے ساتھ شہوت کو زیادہ کرنے کے لیے سُنے۔ چاہے خدا کی محبت ہو۔ لیکن قوتِ شہوانی اس کی ضرور بھڑکے گی۔ اس طرح اگر کوئی عورت پردے کے اندر سے ہی سُنے۔ لیکن فتنے اور زنا کا خطرہ ہو تو بھی ناجائز ہے۔ ورنہ جائز ہے۔ اس لیے کہ ایک بار حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے دو کنیزیں گا رہی تھیں۔ حضورؐ بھی سماعت فرما رہے تھے۔

لہٰذا اگر عورتوں کی آواز سے یا لونڈے کی آواز سے شہوت پیدا نہ ہو تو یہ سماع جائز ہوگا۔ اس کے متعلق ہر جگہ حالات کے ماتحت مسئلہ بدلتا رہے گا۔ کیونکہ ہر شخص کے حالات اور کردار جداگانہ ہیں۔ وہ آدمی جو شہوت کی وجہ سے سُنے اُس کے لیے ناجائز، اور جو خدا کے لیے سُنے تو جائز۔

دوسرے وہ سماع جو طبلہ، ستار اور چنگ، و رباب کے ساتھ ہو، وہ ناجائز ہے، اور بجانے کی ممانعت ہے۔ وہ اس لیے نہیں کہ یہ ساز بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا شوق انسان کو بار بار اس کی طرف لے جاتا ہے۔ جس طرح شراب کا عادی ہونے کے بعد آدمی بار بار شراب پینا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ حرام قرار دی گئی۔

مگر شاہین۔ ڈھول اور طبل بجانا، چاہے وہ جھانجھ کے ساتھ بجائے جائیں، جائز ہیں۔ اس لیے کہ اُن کے متعلق منع نہیں کیا گیا۔ یہ رود کی طرح نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دف بجایا گیا، تو کوئی اعتراض نہ فرمایا، بلکہ شادی کے وقت خود بھی حکم دیا ہے۔ اسی لیے حاجیوں اور غازیوں کا طبل بجانا رسم میں داخل ہے، لیکن ہجڑوں کا طبل بجانا ناجائز ہے کیونکہ وہ لوگ صرف پیشے کی بنا پر کرتے ہیں۔ اُن کا طبلہ لمبا ہوتا ہے۔ درمیانی حصہ پتلا اور آگے سے موٹا۔ مگر شاہین کسی قسم کا بھی بجانا حرام نہیں۔ اس لیے کہ عموماً گلہ بان اس کو جنگل میں تنہائی کے وقت بجاتے تھے۔

مسئلہ: شہنائی بجانا جائز ہے

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی دلیل یہ ہے، کہ ایک جگہ سے شہنائی کی آواز آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کان بند کر لیے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ جب شہنائی کا آواز آنا بند ہو جائے، تو مجھ کو بتاؤ — اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کو حضورؐ نے شہنائی سُننے کے لیے حکم دیا، اور آنحضرتؐ نے کان اس لیے بند کیے ہوں گے کہ اس وقت کوئی خاص عالم طاری ہوگا۔ اور اس وقت شاہین کی آواز خلل انداز ہو، اور کیونکہ سماع خدائی معرفت کے جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ لہٰذا سماع بہترین وجدانی کیفیات کا حامل ہوتا ہے، لیکن اگر انبیاء علیہم السلام پر کوئی وجدانی کیفیت طاری ہو تو اس وقت سماع اس حقیقی امر کے مانع ہوگا۔

لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت کان بند کرلینا، شہنائی کے حرام ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ہوتا، تو اس وقت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو بھی منع فرماتے۔

تیسرا سبب مانع سماع یہ ہے کہ اگر دینِ اسلام کی ہجو، یا اصحاب رضی اللہ عنہم کی ہجو کے اشعار، یا کسی عورت کی تعریف کے اشعار سننا روا نہیں ہے۔ اس لیے کہ عورت کی تعریف مردوں کے سامنے مناسب نہیں۔

لیکن ایسے اشعار جو صوفیوں پر وجدانی کیفیات طاری کردیتے ہوں، چاہے ان میں زلف اور خدوخال حسن و خوبصورتی ہی کیوں نہ ہو، حرام نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کو زلف کی سیاہی سے کفر کی ضلالت یاد آتی ہے اور معشوق کے چاند جیسے چہرے سے دین کی رونق کا خیال ہوتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زلفِ معشوق سے الوہیت سے متعلق نورانی ہستیوں کا تسلسل یاد آئے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں زلف کے ذکر سے عارفانِ حقیقی کا تسلسل سمجھتے ہیں ؎

گفتم بشمارم سرِ یک حلقۂ زلفش تا بو کہ بہ تفصیل سرِ جملہ برآرم
خندید بمن بر سرِ زلفیں کہ مشکیں یک پیچ بہ پیچید و غلط کرد شمارم

اِسی طرح صوفیائے کرام اُن اشعار کو بھی جو ظاہری حسن کی تعریف میں کہے جاتے ہیں، معرفتِ خدا کا ہی آئینہ سمجھ کر حال میں آتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر پڑھا جائے ؎

ہر کہ بہ خرابات نہ شد بے دین است زیرا کہ خرابات اصولِ دین است

(صوفیائے کرام کا راہِ طریقت) یعنی جو آدمی دُنیا کے خرابے میں خلط ملط نہ ہوا، وہ بے دین ہی رہا۔ اس لیے کہ خرابات کے بعد ہی وہ معمورات کو پہچاننے کی اہلیت پیدا ہوسکتی ہے۔ صوفیائے کرام اس شعر پر بھی وجد کرتے ہیں اور اُن کو نورِ خدا نظر آتا ہے۔

دراصل اُن کو خود بخود وجد ہوتا ہے۔ اشعار کے الفاظ اور اُن کے ظاہری معانی پر نہیں۔ اسی طرح شاہین کی آواز اگرچہ لایعنی ہوتی، لیکن وہ ان کے لیے ذریعہ وجدان ہوتی ہے۔ بعض لوگ عربی نہ جانتے ہوئے عربی اشعار پر وجد کرتے ہیں اور لوگ اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہ جس شعر کا مطلب سمجھ میں نہ آئے۔ اس پر وجد کیسے آسکتا ہے؟

اس کی آسان مثال یہ ہے کہ اونٹ عربی نہیں جانتا اور وہ "حدائ عرب" کی آواز پر منوں کا بوجھ لادے ہوئے وجدانی کیفیت سے سفر کرتا ہے اور جب منزل پر پہنچکر وجدانی کیفیت ختم ہوتی ہے تو بے ہوش ہوکر گر پڑتا ہے اور بعض اونٹ تو مر جاتے ہیں۔ اب یہ لوگ اونٹ سے دریافت کریں کہ وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ جب کہ عربی نہیں سمجھ سکتا۔

پس اس طرح صوفیائے کرام عربی اشعار پہ وجد کرتے ہیں، جیسے کسی نے کہا مَا زَارَنِي فِي النَّوْمِ اِلَّا خَيَالُكُمْ

(یعنی تمھارے تصورات کے علاوہ کسی نے حالتِ خواب میں میری زیارت نہیں کی) تو ایک صوفی کو وجد آیا، لوگوں نے اس سے دریافت کیا، تو کہنے لگا، کہ وہ کہتا ہے کہ مَا زَارَنِیْ غَیْرُہٗ (یعنی ہم لاچار ہیں) اور وہ سچ کہتا ہے کہ ہم مجبور ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اُن لوگوں کا وجد صرف ایک لفظ کو خدا کی طرف سمجھ کر شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کے قلوب پر صرف خدا کی معرفت ہی غالب ہوتی۔ اور وہ ہر لفظ، ہر بات اور ہر چیز میں اسی کی تعریف دیکھتے ہیں اور سُنتے ہیں۔

چوتھا سبب یہ ہے، کہ اگر سُننے والا جوان آدمی ہے، تو اغلب یہ ہے، کہ اس پر زلف اور خدوخال معشوق سے قوتِ نفسانی کا غلبہ ہوگا، اور وہ عورت کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے گا۔ آج کل بہت سے

ظاہری دُنیا دار صوفی واجبُ القتل ہیں

مرد اور عورتیں ایسے ملیں گے کہ اُنھوں نے صُوفیوں کے سے کپڑے پہن رکھے ہیں اور دنیاداری میں مشغول ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق ظاہری خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔ لہٰذا فلاں آدمی فلاں کے عشق میں مبتلا ہے، جو اس کی حقیقت کا راستہ دکھائیگا وہ لوگ بدمعاشی، آوارگی اور خرافات کو نیکی بتاتے ہیں۔ فسق و فجور اور امرد پرستی کو حقیقت کا راستہ بتاتے ہیں اور دلیلیں دیتے ہیں کہ فلاں پیر اور مُرشد کو فلاں لڑکے سے شغف تھا۔ حالانکہ اُن بزرگوں میں یہ باتیں اس نظر کے ماتحت ہرگز نہ تھیں۔ اور یہ امرد پرستی نہیں کہلائی جا سکتی۔ وہ لوگ اپنی بدتمیزیوں اور بدکرداریوں کو چھپانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کا گمان رکھنے والے لوگ فاسق و فاجر اور اباحتی ہیں۔ وہ لوگ واجب القتل ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ پیر اور صوفی لونڈوں کو تکتے ہیں، تو دراصل صُوفیائے کرام لڑکوں کو بھی اچھی نظر سے دیکھتے ہیں، جس طرح کوئی آدمی سُرخ سیب کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی پیر سے کوئی قصور سرزد ہو گیا ہے۔ اس لیے سب پیر ایک سے بے گناہ نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی گناہ کرتا ہے، تو وہ گناہ ثواب سے نہیں بدل جاتا۔

خداوند عالم نے حضرت داؤد علیہ السّلام کا واقعہ قرآن شریف میں صرف اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ کوئی آدمی غلطیوں سے خالی نہیں۔ چاہے وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو، اور جناب داؤد کی توبہ کرنے کو انسان اپنے لیے دلیل بنالے اور خدا سے توبہ کر کے گناہ سے محفوظ رہنے کی کوشش کرے۔

اس کے علاوہ ایک بدترین اور اعلیٰ درجہ بھی ہوتا ہے کہ بزرگ صوفیائے کرام کو حالتِ سماع میں انبیاء علیہم السّلام کی ارواح نظر آتی ہوں، اور وہ بظاہر ان حالات میں بھی دیکھتے ہوں۔ اس لیے کہ عالمِ مثال میں ان کے لیے وجود کا ہونا ضروری ہے اور عالمِ ارواح تک پہنچنے کے لیے یہ بُنیاد قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا ظاہری اشکال کی محبت بھی اسی حقیقی معرفت کی غایت ہوتی ہے۔

(حُسنِ انسانی میں فرشتوں کا حسن مضمر ہے) حضرت وحید جلبی رضی اللہ عنہ پورے عرب میں خوبصورت ترین انسان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے حسن میں حضرت جبرئیل کا حُسن دیکھتے۔

اسی طرح ہوسکتا ہے کہ مردِ حسین کو دیکھنے سے کشف حاصل ہونے لگے۔ اس لیے کہ وہ اس لڑکے کے حُسن میں حقیقی حُسن دیکھتا ہو۔ اور اگر وہ حالتِ کشف سے باہر ہونے کے بعد پھر اس چیز پر نظر کرے اور پھر اس پر کشف طاری ہوجائے اور جب جب اس کو دیکھے ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجائے تو اس کو لوگ اپنی طرح ہی تصوّر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ بزرگ صُوفی اُن کی اس بات کو سمجھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔

قصّہ مختصر — صُوفیائے کرام کے درجات اور اُن کے منازل انتہائی مشکل اور خطرناک ہیں۔ اِنسان کو ان کے متعلق بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اتنا جو کچھ بتایا گیا وہ اس لیے کہ ظاہر بین لوگ ان بزرگانِ دین کو اپنی نظر سے نہ دیکھیں۔ ورنہ وہ لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ بعض لوگ صرف شوق کی بنا پر سماع سُنتے ہیں۔ وہ مباح ضرور ہے۔ لیکن اُس کو اپنی عادت نہ بنا لینا چاہیے۔ نہ ہمیشہ کے لیے لت لگانی چاہیے۔ اس لیے کہ بعض گناہِ صغیرہ تواترِ ارتکاب سے گناہِ کبیرہ کی منزل پر آجاتے ہیں۔ اس طرح بعض باتیں تھوڑی تھوڑی۔ اگر بری بھی عمل میں آئیں، تو مباح ہوتی ہیں، ورنہ حرام ہوجاتی ہیں۔

(حکایت) ایک بار زنگیوں نے مسجد میں کرتب دکھائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہ فرمایا۔ اور اگر وہ مسجد کو بازی گاہ بنالیتے تو حضوؐر ضرور روک دیتے۔ اسی طرح حضوؐر نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بازیگری اور ڈھول وغیرہ کو منع نہ کیا۔ اگر ہمہ وقت اس کو دیکھا جائے گا اور اس کو دیکھنا اپنی عادت بنالے گا تو جائز نہ ہوگا۔

اسی طرح مزاح کبھی کبھی کرنا اچھا ہے، لیکن اگر اس کو اپنی عادت بنالے گا، تو مذاق اور مسخرا پن بن جائے گا، جو ناروا ہے۔

باب دوم

آثارِ سماع

سماع میں کس وقت وجد طاری ہوتا ہے

سماع، تین درجات پر منقسم ہے:

اوّل - اس کو سمجھنے کی قوّت و ارادت

دوم - کیفیّت وجدانی کا طاری ہونا

سوم - حال میں آنا (جھومنا اور حرکت کرنا)
ان سب کے متعلق بتانے کی ضرورت ہے تاکہ اصل درجات سے آگاہی ہو سکے اور حقیقت معلوم ہو جائے پہلا مقام سماع کو سننے اور سمجھنے کے متعلق ہے، جو آدمی صرف خوش طبعی یا کسی دنیوی معشوق کی وجہ سے سماع سنتا ہے، وہ گویا کہ اس قابل نہیں کہ معرفتِ حقیقی کے متعلق کوئی کلمہ سُن سکے۔

لیکن جس آدمی پر خداوندِ عالم کی معرفت کا غلبہ ہوتا ہے، اس کے دو مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ مُرید کا ہے کہ اس کو چھوٹے بڑے، اچھے بُرے، نیک و بد ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ ہجر و وصل، غیظ و غضب اور جس قسم کی بات سُنتا ہے، اسی قسم کی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہے اور اس کے حقیقی جذبات اُبھر آتے ہیں، اور باطن میں مختلف پہلو حالات کے ماتحت جگہ پاتے ہیں۔ اسی وقت سے اس کی راہیں بدلتی ہیں۔ اگر وہ صرف دنیا دار ہے، تو سماع سے دُنیاداری کے پہلو اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً کوئی ایسا تصور خداوند عالم کے لیے پیدا ہو جائے جو اس کے لیے محال ہو۔ مثلاً حسبِ ذیل ؎

زاوّل بمنت میل بداں میل کجا است و امروز ملول گشتن از بہر چراست

اگر کوئی مُرید پہلے پہلے خدا کی طرف مائل تھا اور اب توجہ کم ہو گئی ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ خدا کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ گئی، اس کی محبت میں کمی ہو گئی۔ لہٰذا خدا کے متعلق یہ سوچنا گناہ ہے اور حرام ہے۔ اس کی ذات میں کوئی تغیّر کا امکان ہی نہیں۔ اس کی طرف سے سب کو عطا ہوتی ہے اور کشادگی سے بخشش ہوتی ہے اب ہر آدمی کے نفس پر موقوف ہے، کہ اس عطا سے کتنا حاصل کر سکے۔ ایسا آدمی جو دیوار کی آڑ میں کھڑا ہے۔ سُورج کی نورانی شعاعیں اس کو کیسے فیضیاب کر سکتی ہیں؟ اور یہ قصور آفتاب کی روشنی کا نہ ہوگا بلکہ اس شخص کا ذاتی قصور ہے۔

حجابات صرف اِنسانوں کی غفلتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اور جو نقائص ہوں وہ انسان اپنے ہی میں سمجھے۔ اور وجود کے متعلق جو نُورانیت نظر آئے، اس کو خدا کی طرف سے سمجھنا چاہیے۔ کہ اگر وہ نورانیت اور نظارۂ جمال خداوندی تجھ کو نہ پہنچے گا، تو تیرے لیے کُفر کا باعث ہوگا۔ اور تُو اس کو اپنا قصور نہ کہے گا۔ اِس لیے معرفتِ خدا میں سماع کے لیے بڑے نازک درجات ہیں۔

(مُرید اور صُوفی کے مراتب) دوسرا درجہ اس کا ہے، جو آدمی مُریدی کے درجات کو طے کر چکا ہے اور فنا کے منازل میں پہنچ چکا ہو۔ ماسوا اللہ اس کو کچھ نظر نہ آئے۔ دُنیا اس کو نیستی نظر آئے۔ اور معرفت خدا ہی کو وحدت و زندگی سمجھے، تو ایسا آدمی جب سماع سنتا ہے تو اس کو اپنا وجود معلوم نہیں ہوتا۔ اپنے کو نیستی سمجھتا ہے۔ اور جسمانیت سے خارج ہو کر اس دنیا سے عالمِ بالا کی سیر کو چلا جاتا ہے۔ اس وقت اگر اس کو آگ میں بھی

ڈال دیا جائے تو اس کو خبر نہ ہو۔

جس طرح حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ وجد کے عالم میں گنے کے کٹے ہوئے کھیت میں دوڑتے چلے گئے اور آپ کے پیر وہاں کٹ گئے، لیکن قطعی احساس نہیں ہوا۔ یہ سماع اپنی آخری منزل پر ہے۔ اور مُریدوں کا سماع دُنیا و مافیہا دونوں سے متعلق ہوتا ہے۔ جس طرح مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ اس عینیتی سے انکار کرنا غلط ہے۔ اس لیے کہ اگر تو اس کو بعد مرنے کے نہیں دیکھتا، تو بھی وہ تجھ کو نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل وہ موجود نہیں ہوتا۔ جیسے تو اس وقت دیکھ رہا ہے اور یہ منزل معرفت ہے۔ جب اشیائے موجود کی معرفت سے بالاتر ہو گیا۔ تو گویا کہ وہ سب کچھ اس کے لیے نیست ہو گئیں۔ اور وہ خودی کو بھی بھول گیا۔ اب اس کو وہ اس مرتبے پر پہنچ جاتا ہے، کہ خدا ہی خدا ہر چیز (حقیقی اور ظاہری سماع و وجد) میں نظر آنے لگتا ہے۔ فانی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف بقا کے درجات سامنے آجاتے ہیں، اور وہ انا الحق کہنے لگتا ہے۔ لیکن یہاں اس نے لغزش کی ہے کہ خدا کو اپنے میں دیکھ کر بے اختیار یہ کہہ دیا ہے۔ بعض لوگوں نے اُن کی اس بات سے بھی اتفاق کیا ہے۔ اس کی مثال وہ لوگ یہ دیتے ہیں، کہ جس آدمی نے کبھی آئینے میں صورت نہ دیکھی ہو، اور وہ یک لخت دیکھ لے، تو گھبرا کر کہہ دے کہ یہ میں ہوں۔ اور اگر یہ کہنے لگے کہ آئینہ خود اس کی صُورت بن گیا ہے، تو اس کو اتحاد کہتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں خیالات اچھے نہیں۔ دراصل نہ آئینہ اس کی صُورت ہے اور نہ وہ آئینے کی صورت ہے۔ دونوں اعتقاد اصل سے دُور ہیں۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث اس چھوٹی سی کتاب میں نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کی تفصیلات پڑھنا ہیں، تو احیاء العلوم میں پڑھیں

(اقسام وجد) آثار سماع میں دوسرا درجہ یہ ہے کہ جب آدمی فہم و ادراک سے بالاتر ہوتا ہے تو حال حرکت شروع ہوتی ہے۔ جسے ہم لوگ وجد کہتے ہیں۔ وجد کے لغوی معنی کسی بات یا چیز کے پانے کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو آج تک ہم کو نہ ملی تھی، آج مل گئی۔ یہ بحث طلب مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ وجد کی ایک قسم نہیں، بلکہ کئی درجات ہیں۔ وہ اقسام یہاں بیان کرتے ہیں۔

پہلا مرتبہ: احوال (حرکت) یہ صفت جب اس پر غالب ہو جائے تو وہ مست و بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور یہ بے خبری کبھی تو صورت کے شوق میں ہوتی ہے اور کبھی کسی کے خوف سے اور کبھی عشق کی زیادتی کی وجہ سے، کبھی زیادتی طلب اور کبھی مسرت و رنج کے جذبات کے ماتحت۔ اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔

چنانچہ یہ آگ جب دماغ پر حاوی ہوتی ہے تو اس کی گرمی دماغ پر چھا کر سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ پھر وہ نہ کچھ دیکھتا نہ سنتا ہے اور وہ ایک مست کی طرح گھُومنے لگتا ہے۔

دوسرا مرتبہ، مکاشفہ ہے، جو صُوفیوں کی شل غفلت کے پردے آنکھوں سے اُٹھ جاتے ہیں۔ حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ ان میں بعض تو مثالی طور پر ہی آتے ہیں۔ یعنی اُن کا ایک تصوّر ہی سا نظر آتا ہے۔ اور بعض صاف طور پر صریحاً نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں سماع کا اثر زیادہ ہوتا ہے، اور آئینہ کی گرد کی طرح دل کا غبار صاف ہو جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کے بیان میں صرف قیاس آرائی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اس کے حقائق سے وہ ہی آدمی آگاہ ہو سکتا ہے، جو اس مقام تک پہنچ چکا ہو۔ اور ہر آدمی اپنی حیثیت کے مُطابق دوسروں کے علوم کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اور یہ قیاس آرائیاں علم کے مطابق ہوتی ہیں، ذوق کے ماتحت نہیں۔ لہٰذا اس کو مان لینا چاہیے۔ کیونکہ نہ ماننے میں نقصان۔ اور وہ آدمی بے وقوف ہے، کہ جو اپنے لیے یہ سمجھتا ہے کہ جو علم یا معرفت میرے پاس ہے وہ کہیں نہیں ہے، اور اس سے زیادہ گدھا وہ ہے کہ جو اپنے کو بادشاہوں سے اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہو، اور یہ خیال کرتا ہو کہ جو چیز میرے قبضے میں ہے، وہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

اس قسم کی غلط فہمیاں دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

بعض لوگ وجد اور حال میں ذرا تکلف برتتے ہیں، جو قطعی گناہ ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ قرآن مجید سُن کر روؤ! اور اگر آنسو نہ نکلیں تو کم از کم وہ صُورت ہی بنا لو۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی تکلفاً ہی وجد کر رہا ہو تو بھی اس کی یہ سعی باعثِ ثواب ہو سکتی ہے کہ وہ اس کی کوشش تو کر رہا ہے۔

(اعتراض) یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ گانا اور قوالی سُننے سے بہتر یہ تھا کہ صوفیائے کرام قرآن مجید سُنتے۔ اور اس پر وجد کرتے۔ قرآن مجید بہرحال گانے سے کہیں زیادہ اولیٰ تر ہوتا۔

(جواب) ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن شریف کے سننے سے اتنا زیادہ وجد طاری ہوتا ہے کہ بعض لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ بزرگانِ دین تلاوت قرآن کے بعد انتقال فرما گئے ہیں۔ یہاں اُن کے قصّے بیان کرنا مقصود نہیں ہیں۔ اُن کا ذکر بھی "احیاء العلوم" میں کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف وجوہ بیان کر دینا کافی ہوں گے۔

صوفیائے کرام کا قرآن مجید کی بجائے گانے سننے کے پانچ وجوہ ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ کلام اللہ میں تمام آیات عشق و محبت سے متعلق نہیں ہیں۔ کیونکہ اس میں اکثر کفار اور دُنیا کے اذکار بھی ہیں، اور چونکہ کلام اللہ تمام دُنیا کے مسائل کے لیے نازل ہوا ہے، اس میں میراث لین دین، قصّے۔ نیک و بد سب کچھ ہے، لہٰذا ایسی آیات جو مثلاً میراث کے متعلق ہیں، کسی کے عشق کی آگ کو بڑھا نہیں سکتیں۔ اور ایسا آدمی شاذ ہی ہوتا ہے کہ ہر لفظ ہر بات پر وجدانی کیفیت طاری ہو جائے

(سماع اور تلاوت کلام پاک میں فرق) دوسرا سبب یہ ہے کہ قرآن شریف تمام پڑھے ہوتے ہیں اور

ہر وہ چیز جو سُنی ہُوئی ہو، اس پر حالتِ وجد طاری نہیں ہوتی۔ لہٰذا گانا چونکہ نیا ہوتا ہے، لہٰذا اس سے وجد طاری ہو سکتا ہے، قرآن سے نہیں۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس وقت کوئی آیت نازل ہوتی اور عرب اس کو پہلی بار سُنتے تو وہ رونے لگتے تھے، اور وجدانی کیفیات طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ کبھی ہم بھی تمھاری طرح محسوس کرتے تھے، لیکن اب ہم قرآن کو سُننے کے عادی ہو گئے ہیں اور دل سخت ہو گئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجاج کو بہت جلد اُن کے گھروں کو واپس جانے کا حکم دے دیا کرتے۔ کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ یہاں کے زیادہ قیام سے کعبۃ اللہ کی عظمت دل سے کم ہو جائے گی معلوم ہوا کہ ہر نئی چیز زیادہ اثر رکھتی ہے۔ بہ نسبت پُرانی کے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ بعض دل علاوہ خوش الحانی اور نغموں کے نہیں پسیجتے۔ اور سیدھی سادھی بات ہے کہ بات کرنے میں وہ وجد طاری نہیں ہو سکتا۔ جو گانے میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید میں کوئی تصرف جائز نہیں، اس میں خوش الحانی اور گانا شامل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس میں وجد بھی نہ آسکے گا۔

چوتھا سبب یہ ہے، کہ الحان کو دوسری آوازوں کے ذریعہ مدد پہنچانا چاہیے مثلاً دف، شاہین اور طبل وغیرہ اور یہ سب اشیاء ہزل میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور کلام اللہ ان سب کی ضد ہے۔ اس کو اس قسم کی چیزوں سے محفوظ ہی رہنا چاہیے۔

(فعلِ آنحضرتؐ) ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ربیع بنت معوّذ کے مکان پر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اُن کی کنیز ڈھولک بجا رہی ہے اور گاتی ہے۔ جب حضورؐ کو دیکھا تو آپؐ کی شان میں اشعار گانے شروع کر دیئے تو حضورؐ نے منع فرمایا اور حکم دیا کہ جو گا رہی تھیں وہ ہی گاؤ۔ چونکہ حضورؐ کی ذات ان باتوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی عقل اور حالات کے مطابق اشعار کو سُن کر خوش ہوتا ہے، اور اگر اس کے خلاف مزاج ہو، تو اس کو بجائے حظ حاصل ہونے کے نفرت پیدا ہو گی۔ بلکہ بعض اوقات وہ ان کے سُننے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ خصوصاً قرآن مجید کو ایسی جگہ نہ پڑھنا چاہیے جہاں کسی کو اس کے پڑھنے سے دلچسپی نہ ہو۔ اس لیے کہ اس کی ہر آیت سے بہت سے آدمیوں کو دلچسپی نہ ہو گی، لیکن اگر شعر اپنے حسب حال نہ ہو تو صوفی اس کے مطلب کو اپنے حالات اور دلچسپی کے مطابق کر لیتا ہے۔ اس کو شاعر کے مطلب سے کوئی مقصد نہیں، لیکن کلام اللہ کے لیے یہ چیز ناممکن ہے۔ مشائخ کرام نے اپنے لیے اسی وجہ سے اس چیز کو انتخاب کیا تھا۔ اُن کے ان تمام مقاصد کے وہ ہی ماحصل ہو سکتے ہیں:

یا تو سامع خود ضعیف ہے اور اس کی معرفت میں کمی ہے یا قرآن مجید کی عظمت کا خیال کہ اس میں بیجا تصرف نہ کر سکیں۔

تیسرا مرتبہ سماع یہ ہے کہ صُوفی جھُومنے لگے، اور کپڑے پھاڑ دے۔ اگر بغیر کسی مطلب و مقصد کے صُوفی یہ حرکات کرتا ہے تو روا ہے، اور اگر قصداً اور عمداً یہ عمل کرتا ہے تو ناجائز ہو گا یہ نفاق اور حرام میں شامل ہے۔

حضرت ابوالقاسم نصیر آبادی کے قول کے مطابق سماع کی مشغولیت غیبت سے بدتر ہے۔

حضرت ابوعمر فرماتے ہیں کہ سماع میں مکر و فریب کرنے سے بہتر ہے کہ تیس برس تک آدمی غیبت میں رہے۔

(صُوفی کا بلند مرتبہ) صُوفی کامل وہ ہے، جو سماع کے بعد بھی ساکت بیٹھا رہے۔ اس کو قُوتِ ضبط ہوتی ہے اور اس کے اعضاء اور آواز اس کے قابُو میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ صفات بہت کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول جو اوپر لکھا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کی حقیقت یہی ہو، لہٰذا ہر صوفی کو چاہیے کہ وہ اپنے پر قابُو رکھنے کی کوشش کرے۔

حضرت جنیدؒ کی محفل میں ایک نوجوان جب گانا سُنتا، تو آپے سے باہر ہو کر چیخیں مارنے لگتا۔ آپ نے اس کو حکم دیا کہ اگر تم برداشت نہیں کر سکتے، تو یہاں سے چلے جاؤ۔ اس کے بعد اس نے اپنے پر بہت جبر کیا لیکن ایک دن وہ بے اختیار ہو کر چیخا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا۔

اگر کوئی آدمی قصداً رقص کرے یا رونے لگے، تو درست ہے، اس لیے کہ ایک بار مسجد میں حبشی ناچ رہے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اُن کو دیکھنے تشریف لے گئیں۔

حدیث آنحضرتؐ برائے حضرت علیؓ

اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے فرمایا کہ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ تو آپ رقص فرمانے لگے اور کئی بار پیر زمین پر مارا (یہ عرب والوں کی عادت تھی کہ بہت خوشی کے وقت جوش میں زمین پر پیر مارتے تھے)

ارشاد آنحضرتؐ برائے امام حسینؓ

اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم صورت و سیرت دونوں میں بالکل میری طرح ہو، تو آپ نے بھی رقص فرمایا۔

لہٰذا جو آدمی رقص کو بُرا سمجھتا ہے، وہ غلطی کرتا ہے، لیکن زیادہ بہتات نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کا شمار بازی میں ہو جائے گا۔ اور بازی حرام ہوتی ہے، اور جو آدمی معرفت کے لیے رقص کرے وہ مبارک ہے کپڑوں کو عمداً پھاڑنا بُرا ہے، اس لیے کہ اس سے کیف اور ضائع ہوتا ہے۔ ہاں اگر بے خبری کے عالم میں ایسا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔

آدابِ سماع

(شرائطِ سماع) سماع کے لیے تین آداب ہیں:

پہلے وقت کا لحاظ۔ کھانے پینے یا نماز کے وقت یا کسی دوسری مشغولیت کے وقت سماع لاحاصل ہے۔

دوسرے، جائے سماع کسی ظالم کا مکان ہو، یا عام راستے پر یا چوراہوں پر سماع باعثِ پریشانی و تکلیف ہوگا۔
تیسرے، سامعین سماع۔ اگر حاضرینِ مجلس مغرور و متکبر ہوں گے منکرِ سماع ہوں گے۔ یا سماع و وجد میں تکلف کرتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہ اس خیال سے مجلسِ سماع میں شریک ہوں کہ صرف صوفیائے کرام یا سماع کا مذاق اُڑائیں۔ اس کی عزت ان کی نگاہوں میں نہ ہو، یا عورتیں محفلِ سماع میں شریک ہوں، تو سماع بہتر نہیں۔
حضرت جنیدؒ اسی مسئلہ کے قائل ہیں، کہ وقت، جگہ اور حاضرین اچھے ہوں اور برمحل ہوں۔ اگر وہاں عورتیں ہوں گی، تو نوجوان آدمی کی خواہش بھڑکے گی۔
آداب : حاضرین کو انتہائی اَدب کے ساتھ نگاہیں نیچی کر کے بیٹھنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

- سوائے خدا کے اور کسی طرف دھیان نہ لگایا جائے۔
- اس بات کا خیال رکھیں کہ مکاشفہ ہونے والا ہے۔
- اپنی مرضی سے کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس طرف توجہ دینا ضروری ہے۔
- اگر کسی ایک کی پگڑی یا ٹوپی گر پڑے تو سب اپنی ٹوپیاں یا پگڑیاں اُتار لیں۔
- اگر ایک آدمی کھڑا ہو جائے، تو سب اس کے لیے تعظیماً کھڑے ہو جائیں۔

(نوٹ) اگر یہ افعال بدعت میں داخل ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ ہر بدعت نہ کی جائے۔
(بعض بدعتیں اچھی ہیں) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق تراویح میں جماعت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شروع کی تھی۔ یہ نیک بدعت ہے، اور اچھی ہے۔
(بدعت) بدعت وہ مذموم ہے، جو خلافِ شرع اسلام ہو، کسی قوم کے لوگوں کی عادات کے مطابق ان جیسا ہی بن جانا خوش اخلاقی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی بدعت مذموم نہ ہوگی۔
حضورؐ کا فرمان ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ اُس کی عادت کے مطابق برتاؤ کرو۔ یہ سُنّت ہے۔
پہلے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرتؐ کی تعظیم کو نہ اُٹھتے تھے۔ کیونکہ اس عمل سے حضورؐ کو کراہت ہوتی تھی۔ لیکن اگر کوئی آدمی اپنی تعظیم سے خوش ہو تو ضرور کرنا چاہیے۔ اس لیے عرب اور عجم کے اخلاق اور عادات جداگانہ ہیں۔

نواں اصُول

امر بالمعرُوف نہی عن المنکر

(امر بالمعرُوف و نہی عن المنکر کیا ہے) : امر بالمعروف کے معنی ہیں، وہ امور جن کو شرع اِسلام نے جائز دیا ہے۔

وہ کیے جائیں۔

نہی عن المنکر، وہ امور ہیں جن کے لیے نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اُن سے پرہیز کیا جائے۔
یہ اصول بھی اصولِ دین میں شامل ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔
ہم اس کی تفصیلات تین ابواب میں بتائیں گے۔

پہلا باب

وجوب امر بالمعروف ونہی عن المنکر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام میں واجب ہے، اور اس کو ترک کرنے والا گنہگار ہے۔ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے کہ اے مخلوق! تم میں سے ایک گروہ یہ عمل اختیار کرے، کہ دُنیا والوں کو نیکیوں کا راستہ دکھائیں اور بُرے کاموں سے پرہیز کی ہدایت کریں۔ اس آیت سے اس حکم کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔

(فرض کفایہ) : لیکن یہ فرض کفایہ ہے۔ لیکن اگر اس کو واجب بھی سمجھ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر نہ مانیں تو گناہ گار ہوں گے۔ اس لیے کہ اس کا ذکر احکامات روزہ و نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور دین داروں کی پہچان بتایا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے، کہ امر بالمعروف کرو، ورنہ تُم سے بدترین لوگ تُم پر حکومت کرنے لگیں گے۔

حضرت ابُوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس قوم کے لوگ گناہ کرتے ہیں، وہ قوم قہرِ خدا میں مبتلا ہوتی ہے۔
حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی ایسے آدمی کے سامنے گناہ کرو کہ وہ تُم سے ناراض ہو جائے، تو وہ شخص اس گناہ کی ذمہ داری سے بچ گیا۔ اور اگر وہ تمہارے گناہ کو دیکھتا رہا، تو وہ خود بھی اس میں شامل ہو گیا۔

صحابہ کرام سنّتِ رسُول اور کتابِ خدا پر عمل پیرا تھے، مگر اُن کے بعد ایک زمانہ ایسا ہوا کہ بندوں پر تو نیکی کی تلقین کرتے، لیکن اُن کے اعمال بُرے تھے۔ ایسے لوگوں سے جہاد کرنا چاہیئے، اور اگر قابو نہ پائیں تو زبانی ہی اُن کو روکنے کی کوشش کریں۔ اور اگر اس طرح بھی نہ کہہ سکیں، تو دل میں اُن سے نفرت کریں، ورنہ ایمان میں فرق آتا ہے۔

خداوندِ عالم نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ فلاں طبقے کو تباہ کر دے۔ اس نے عرض کی، کہ اس بستی میں ایک آدمی ایسا ہے کہ جو کبھی گناہ نہیں کرتا۔ تو حکم ہوا کہ وہ آدمی خود گنہگار ہے کہ دوسروں کو گناہوں میں مبتلا دیکھ کر خاموش رہتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ فرمایا کرتے کہ خداوندِ عالم نے ایک ایسی بستی کو مقہور

کیا۔ جہاں اٹھارہ ہزار آدمی پیغمبروں کی سی عادات کے موجود تھے، تو لوگوں نے وجہ دریافت کی حضور نے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ اُن کو منع نہ کیا کرتے تھے۔

کچھ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کہ شہدا میں کون افضل ہے۔ تو فرمایا کہ جو بادشاہ کو ہدایت کرنے میں قتل کیا جائے۔ حدیث میں ہے کہ خداوند عالم نے حضرت یوشع بن النون علیہ السلام پر وحی بھیجی، کہ میں تمھاری بستی کے ایک لاکھ آدمی جن میں ساٹھ ہزار نیک اور چالیس ہزار بد ہوں گے، تباہ کردوں گا۔ تو عرض کی کہ بارِ الٰہا! نیکوں کے معذّب ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ندا آئی کہ وہ لوگ گناہ کرتے دیکھ کر تنبیہہ نہیں کرتے۔ اور خاموش رہتے ہیں۔

دوسرا باب

ارکانِ احتساب

(احتساب اور ارکانِ احتساب) : احتساب (یعنی لین دین کا حساب وکتاب) کا جاننا ہر مُسلمان پر فرض ہے۔ اس لیے کہ ہر عمل کے لیے اس کے علم کا ہونا ضروری ہے۔

احتساب کو چار ارکان پر منقسم کیا گیا ہے۔

پہلا رکن، محتسب (نصیحت و وعظ کرنے والا۔ اچھے بُرے کو سمجھانے والا)
دوسرا رُکن، محسوب۔ جس شخص سے احتساب لیا جائے (جس آدمی کو نصیحت کی جائے)
تیسرا رُکن، وہ اشیاء جن میں احتساب کیا جائے (وہ گناہ جن سے روکا جائے)
چوتھا رُکن، احتساب کی معلُومات (علم نصائح)

رُکن اوّل

(شرائط محتسب)

(محتسب کے متعلق مسئلہ) شرطِ محتسب، مکلّف ہونا چاہیے (یعنی حدودِ شرع کے اندر کام کرنے والا) دین دار آدمی احتساب کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق علماء مختلف الرائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ محتسب کے لیے عادل ہونا ضروری ہے، اور بادشاہ کا اجازت نامہ بھی۔

لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر نیک آدمی ہی حساب کتاب کرے گا۔ اور اِس دُنیا میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں کہ جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ لہٰذا احتساب کرنے والا کون آئے گا؟

حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے کہ اگر گناہ سرزد ہی نہ ہوا ہو، اور ہم حساب کریں، تو ہم کو احتساب کی شکل تک نظر نہ آئے گی۔

حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے کہ آدمی اپنے کو اول پاک کرلے۔ اس کے بعد احتساب کرے۔ اس لیے کہ شیطان اس کو گمراہ کر رہا ہے، تا کہ احتساب کے دروازے بند ہو جائیں۔

احتساب دو طریقوں سے ہونا چاہیئے:

اوّل۔ نصائح اور وعظ کے ذریعہ۔ وہ اس طرح کہ جس چیز کی نصیحت کی جائے، وہ خود اول اپنے سے وہ عیوب پاک کردے، ورنہ اس سے لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوگا، بلکہ لوگ مذاق اڑائیں گے اور دراصل وہ خود ہی گنہگار ہوگا۔

آنحضرتؐ کا ارشادِ گرامی ہے کہ میں نے شبِ معراج ایک گروہ کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے کٹتے ہوئے دیکھا، تو دریافت کیا کہ ایسا کیوں ہے۔ جواب ملا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو دوسروں کو نصائح کرتے تھے لیکن خود فسق و فجور میں مبتلا تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک بار ندا آئی کہ اول خود راہِ راست اختیار کرو، بعد میں دوسروں کو راستہ دکھاؤ، ورنہ شرم کرنا چاہیے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بالجبر روکا جائے مثلاً شراب کو دیکھ کر اس برتن کو اوندھا دے چنگ و رباب اور سامانِ معیشت کو توڑ ڈالے۔ یہ عمل فاسقوں کے مقابل میں واجب ہے۔ کیونکہ آدمی پر دو امور لازم آتے ہیں

اوّل یہ کہ خود بُرے کام کو نہ کرے،

دوسرے یہ کہ دوسروں کو بُرے کاموں سے پرہیز کرنے کی نصیحت کرے۔

یہ دونوں امور الگ الگ ہیں۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو آدمی خود گناہ کرتا ہے، تو دوسروں کو منع کرنے کا اُسے کیا حق ہے۔ لیکن ان کو سمجھنا چاہیے، کہ ایک کام اگر آدمی خود نہیں کرتا، اور ایک یہ کہ دوسروں کو منع کرتا ہے۔ یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ جیسے ایک آدمی نماز پڑھتا ہے اور روزہ نہیں رکھتا۔ روزہ خود نہ رکھنے کا عذاب الگ ہے، لیکن نماز کا ثواب الگ ہے۔ اسی طرح کسی گناہ کو خود کرنے کا عذاب الگ ہوگا اور دوسروں کو منع کرنے کا ثواب الگ ہوگا۔ یا جیسے آدمی خود شراب پیتا ہے۔ مگر دوسروں کو روکتا ہے، تو اس کا ایک عمل باعثِ عذاب ہے اور نصائح کرنا باعثِ ثواب ضرور ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ اگر خود شراب پی لے گا تو منع کرنے کا وجوب اس پر سے ساقط ہو جائے گا۔

دوسری شرط محتسب کی یہ ہے، کہ بادشاہوں کے فرمان اور احکامات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ علمائے زمانہ پادشاہانِ مملکت کو نصائح کرنے سے نہ روکتے تھے۔ اگر ان کی تفاصیل بیان کی جائے، تو بہت طویل ہے۔ اس کی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے احتساب کے مدارج کا بتا دینا کافی ہوگا۔ احتساب کے چار درجات ہیں۔

(مدارج احتساب) پہلا درجہ : نصیحت کرنا۔ یعنی خدا کے عذاب سے ڈرانا۔ یہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس میں کسی کے حکم کی ضرورت نہیں، بلکہ بجائے خود عبادت عظیم میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو نہی عن المنکر سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرنا ضروری ہے۔

دوسرا درجہ : سخت کلامی سے سمجھانا، جیسے اے ظالم و فاسق۔ اے بیوقوف و نادان۔ کیا تجھ کو خدا اور رسول کا خوف نہیں۔ اس قسم کے الفاظ گنہگاروں کے لیے استعمال کرنے جائز ہیں، اور اس میں کسی کے فرمان کی ضرورت نہیں۔

تیسرا درجہ : سامانِ تعیش کو توڑ دینا، اور مشروبات ناجائز کو پھینک دینا، یہ بھی عبادت میں داخل ہے۔

چوتھا درجہ : محتسب کا یہ ہے کہ اگر فاسق و فاجر کی نصیحت سے مار پیٹ پر آمادہ ہو جائے، تو خود بھی مار پیٹ کے لیے تیار رہے۔ اور اگر ایسی صورت میں بادشاہ یا حاکم وقت نے اجازت نہ دی ہوگی۔ تو ناصح کا یہ عمل باعثِ فساد ہوگا۔ تو ایسا احتساب بغیر حاکمِ وقت کی اجازت کے نہ ہونا چاہیے۔

احتساب کے مدارج موقع و وقت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی بیٹا اپنے باپ کو نصیحت کرتے وقت نہایت نرمی سے کام لے۔ الفاظ ناشائستہ استعمال نہ کرے۔ چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ ناجائز سامان پھینک دے۔ اور اگر کسبِ حرام کی کچھ چیزیں اس کے پاس ہوں، تو اُن کو اُن کے مالک کے پاس پہنچا دے۔ یا تلف کر دے۔ چاہے باپ خفا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ باتیں اس پر واجب ہیں۔ چاہے باپ اس سے کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو جائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر باپ زیادہ خفا ہو تو ایسا نہ کرنا چاہیے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ باپ کی خفگی کے وقت خاموشی اختیار کرے۔

(نوٹ) غلام کو مالک سے۔ مرد کو عورت سے، بیوی کو شوہر سے اور رعیت کو بادشاہ سے احتساب کرنا چاہیے کیونکہ وہ سب ایک دوسرے کے حقوق رکھتے ہیں۔ اسی طرح شاگرد اپنے استاد سے محاسبہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کا دینی ولی ہے، بلکہ ان پر سب سے زیادہ واجب ہے۔ چونکہ وہ استاد جو بے عمل ہے وہ دین اور علم کو خراب کرتا ہے۔

دُوسرا رکن

سماع غیر شرعیہ

جس چیز کے متعلق نصائح کی جائیں

(احتساب کرنے والی باتیں) جو چیزیں بالکل ظاہری طور پر ناجائز ہوں، اُن کو فوراً روکنا چاہیے۔ اس کی چار

شرطیں ہیں ۔

(شرائط) پہلی شرط یہ ہے کہ اگر کام گناہ کبیرہ ہو، یا صرف بُرا ہی ہو۔ مثلاً کسی دیوانے یا ناسمجھ لڑکے کو کسی جانور کے ساتھ مجامعت کرتا دیکھے، تو اُسے روکے، حالانکہ یہ گناہ نہیں ہے۔ چونکہ وہ دونوں ہی حدود شرع میں نہیں آتے، لیکن چونکہ شرعی نکتے کے لحاظ سے یہ فعل بد ہے۔ لہٰذا روکنا ضروری ہے۔ اسی طرح کسی پاگل کو شراب پیتے دیکھے، تو منع کر دے۔

اور اگر کوئی سمجھدار آدمی گناہ کر رہا ہے، خواہ وہ گناہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو، اس سے احتساب کرنا ضروری ہے۔ مثلاً حمام میں شرمگاہ کو کھول کر عورتوں کو دکھانا، تنہائی میں اُن سے باتیں کرنا، سونے کی انگوٹھی اور ریشمی لباس پہننا، چاندی کے برتن استعمال کرنا یہ سب گناہانِ صغیرہ ہیں اور اُن کا احتساب ضروری ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی گناہ کر چکا ہو، یا گناہ کر رہا ہو، تو ایسی حالت میں اس کو نصائح کر کے رنجیدہ کرنا اچھا نہیں ہے۔ مثلاً شرعی حدود لگانا محتسب کا کام نہیں بلکہ وہ حاکمِ شرع کا کام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی شراب پینے کا اعادہ کرے، تو اس کو تکلیف نہ پہنچائے، بلکہ تنبیہہ کر دے۔ اور اگر وہ اس سے باز رہنے کا وعدہ کرے تو اس پر بدگمانی نہ کرنا چاہیے۔ اگر کوئی آدمی غیر عورت کے پاس تنہائی میں بیٹھا ہو، تو اس سے احتساب کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ تنہائی گناہ ہے۔ اگر کوئی آدمی شراب چھپا کر لے جا رہا ہو تو اس کا تجسس نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر شراب کی بُو آجائے اور یقین ہو جائے، تو اس کا پھینک دینا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی بربط چھپائے لیے جا رہا ہو، اور تم کو نظر آجائے، تو اس کو توڑ دینا چاہیے اور اگر یقین نہ ہو کہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے، تو نظر انداز کر دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ ساز کی آواز سُن کر کوٹھے کی طرف سے گھر میں آگئے اور دیکھا کہ ایک آدمی عورت کے ساتھ شراب خوری میں مشغول ہے (پورا واقعہ صحبت کے آداب میں لکھا جا چکا ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا)۔

ایک بار آپ نے منبرِ رسول پر بیٹھ کر لوگوں سے مشورہ کیا، کہ ایسے وقت میں جبکہ حاکمِ شرع خود کسی کو گناہ کرتے دیکھے۔ اس پر حدِ شرع کیسے لگائے۔ بعض نے جواب دیا دُرست ہے۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ خداوندِ عالم نے حدِ شرع اس وقت واجب کی ہے، جبکہ وہ گواہانِ عادل اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ صرف تمہارا تنہا دیکھنا کافی نہیں ہوگا۔ آپ کے نزدیک حاکمِ وقت کا علم اس کے عمل کے لیے تنہا دُرست نہیں، بلکہ چھُپا لینا درست ہے۔

(مسئلہ نکاح امام شافعی رح کے نزدیک) چوتھی شرط یہ ہے کہ کام کے گناہ کا یقین ہو۔ گمان ہونا کافی

نہیں - لہٰذا اگر کوئی حنفی بغیر ولی کے نکاح کر دے، یا اس کا مہر اور نان نفقہ لے لے، یا اسی قسم کے دوسرے کام کرے - شافعی مذہب میں ان کا روک دینا ضروری ہے -

اگر شافعی مذہب والا بغیر ولی حقیقی کے نکاح کر دے، یا خرمے کا شیرہ پیئے تو اس کو روک دینا چاہیئے، کیونکہ احکام امام کی مخالفت اچھی نہیں - بعض علماء کے نزدیک انھیں امور میں احتساب جائز ہے، جن کا حرام ہونا ہر مسلمان کے نزدیک طے ہو - صرف اجتہادی نظریے کے ماتحت نہ ہو -

(مسئلہ) یہ کہنا بھی درست نہیں، اس لیے کہ کسی امام یا مجتہد کے اقوال کے خلاف کرنا بھی حرام ہے اور یہ مسلمہ مسئلہ ہے -

مثلاً جو آدمی قبلے کے بارے میں اجتہاد کرے اور کوئی آدمی قبلے کے بتائے ہوئے رُخ کو پیٹھ کر کے نماز پڑھنے لگے، تو وہ گنہگار ہے - چاہے بعض لوگ اس کو ٹھیک کہنے لگیں -

(بدعتی کو احتساب کرنا) بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ جس امام کا چاہے مقلد ہو جائے، تو یہ قطعی غلط ہے - بلکہ ہر آدمی کو اپنے خیال کے مطابق عمل کرنا چاہیے - اگر کوئی آدمی صرف امام شافعیؒ کو افضل جانے، تو اُن کی مخالفت کرنا صرف خواہشات نفسانی کے ماتحت ہوگا - لیکن ایسے لوگ جو خداوند عالم کو جسمانی قرار دیتے ہیں یا اس کے دیدار کے قائل نہیں، ان لوگوں کو تنبیہہ کرنا ضروری ہے - چاہے مالکی اور حنفی المذہب لوگوں پر احتساب نہ بھی کریں - لیکن بدعتی مذہب والوں پر احتساب کرنا ضروری ہے -

مسائل فقہ میں مختلف نظریات کے قائل اگر ہیں، تو بھی تنبیہہ ضروری نہیں - لیکن بدعتی پر ضرور کی جائے - مگر جہاں اہلِ سنت زیادہ ہوں اور وہ کم ہوں - اور اگر ایسے موقع پر کسی جھگڑے کا اندیشہ ہو، تو بغیر بادشاہِ وقت کی اجازت کے نہ کرے -

تیسرا رُکن

جن پر احتساب کیا جائے

جو آدمی گناہ کر رہا ہو، لیکن اس کی بزرگی کی وجہ سے اس کو تنبیہہ نہ کی جا سکے، جیسے باپ پر بیٹا سختی کے ساتھ تنبیہہ نہیں کر سکتا، لیکن اگر وہ دیوانہ ہے تو اس کو روک سکتا ہے اور وہ احتساب کے حدود میں نہیں آتا -

اگر کسی مسلمان کا اناج کوئی جانور کھاتا ہو تو اس کو نقصان سمجھتے ہوئے ہلکا کر دیں - اگر کسی مسلمان کا مال ضائع ہو رہا ہے اور اس کی گواہی سے محفوظ ہو سکتا ہے اور بہ آسانی جا بھی سکتا ہے، تو گواہی واجب ہے - کیوں کہ فسق و فجور اور گناہ کے ارتکاب سے روکنے میں بہر حال تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے - اسی طرح اگر احتساب سے "شعائر اسلام" کا اظہار مقصود ہو، تو احتساب واجب ہوتا ہے - اور اس میں چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ

اُٹھانا پڑے۔ مثلاً کہیں شراب اتنی کثرت سے ہے کہ اس کو پھینکتے پھینکتے تھک جائے، تو بھی اس کو تکلیف اُٹھا کر پھینک دے۔ اور اگر کسی کے اناج کو بکریاں کھا رہی ہیں اور اُن کو ہلکانے میں تکلیف پہنچے تو تکلیف اُٹھانا ضروری نہیں۔

آدمی کو دوسرے کے حقوق کی حفاظت اسی طرح کرنا چاہیے جس طرح اپنے حقوق کی حفاظت ضروری ہے جیسے کسی کا حق دینا ضروری ہے، تو کسی دوسرے کے بدلے میں اس کو ضائع نہ کرنا چاہیے۔ لیکن دین اور اسلام کے لیے ہر قسم کی تکالیف اٹھانا ضروری ہے۔ صرف احتساب کے لیے تمام تکالیف گوارہ نہ کرنا چاہئیں۔

بلکہ اس کی چند شرائط ہیں، وہ یہ کہ اگر عاجز اور کمزور ہے، تو صرف دل سے انکار کرے یا اگر پٹنے کا اندیشہ ہے یا اس کے کہنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں:

(درجات احتساب) اوّل یہ کہ اگر احتساب کیا جائے، تو وہ لوگ اس کو ماریں گے۔ ایسی صورت میں احتساب ضروری نہیں، بلکہ مباح ہے۔ اگر احتساب کی خاطر تکلیف کو برداشت کرے گا تو ثواب ملے گا۔

(حدیث) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بادشاہ کی تنبیہہ و احتساب کی وجہ سے مارا جائے تو اس سے بڑا کوئی شہید نہیں۔

دوسرے یہ کہ احتساب میں کوئی خطرہ نہ ہو، تو احتساب نہ کرنا گناہ ہے۔

تیسرے یہ کہ احتساب سننے والے نہ اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ گناہوں سے باز آتے ہیں۔ تو پھر زبان سے احتساب کرتا رہے، شرعاً واجب ہوگا

چوتھے یہ کہ گناہ اس کے احتساب سے ختم ہو سکتا ہے، لیکن لوگ اس کو مارتے ہیں اور اذیت پہنچاتے ہیں، تو ایسی صورت میں بھی احتساب واجب نہ ہوگا۔

لیکن اگر وہ ظلم و ستم سہہ جائے تو ثواب ہے۔ اور اگر کوئی آدمی اس پر اعتراض کرے کہ خداوند عالم اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے لیے منع فرماتا ہے، تو بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، کہ "راہِ خدا میں" اپنا مال صرف کرو تاکہ ہلاکت سے محفوظ رہ سکو۔ حضرت براء بن العاذب فرماتے ہیں کہ موجب ہلاکت یہ ہے کہ آدمی گناہ کرتا رہے اور یہ شکایت کرے کہ خداوند عالم میرے گناہ نہیں بخشتا۔ یا نہ بخشے گا۔

(روایت) حضرت عبیدہؓ فرماتے ہیں کہ گناہوں کے بعد نیکی اور توبہ نہ کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ مسلمان اگر کسی انبوہِ کثیر پر جو کافروں کا ہو، حملہ کرے، اور اس میں مارا جائے تو ثواب سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے، کہ وہ بھی کافر کو اوّل مار دے۔ اور اس کی وجہ سے وہ کفار شکستہ دل ہو کر اپنے ارتکاب جرم کو چھوڑ دیں، اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی بہادری کا سکہ اُن کے دلوں پر بیٹھ جائے۔ مگر اندھے اور اپاہجوں کے لیے یہ عمل نامناسب

ہے۔ اگر احتساب سے فائدہ پہنچنے کی بجائے اپنی جان ہی کا خطرہ ہو تو نہ کرنا ہی اچھا ہے۔ اس لیے کہ بے فائدہ نقصان اُٹھانا قرینِ قیاس نہیں۔ ایسی صورت میں دو پہلو نکلتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ وہ بدگمانی اور بزدلی کی وجہ سے چاہیے۔

اور اگر دوسرے یہ کہ خوف ذات تو نہ ہو، بلکہ اہل وعیال کی فکر دامنگیر ہو۔

اور اگر ایسی صورت میں یقین ہے، تو نہ کرے۔ اور اگر صرف وہم ہے تو احتساب کرلے۔ صرف شکوک کی بنا پر واجب عمل واجب ہی رہتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر نقصان کا اندیشہ نہ ہو، تو احتساب واجب ہوگا۔

اور دوسری صورت میں (یعنی عزیز و اقارب اور اہل وعیال کا خطرہ ہے) متعدد وجوہ ہیں، اور اُن میں ہر وجہ کے لیے مختلف احکام صادر ہوں گے۔ اگر صرف اپنے لیے ڈر ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ مثلاً آئندہ کسی نقصان کا اندیشہ ہے۔ جیسے اگر استاد پر احتساب کرے گا تو وہ تعلیم دینے سے انکار کر دے گا یا حکیم علاج کرنے سے کوتاہی کرے گا۔ تو یہ خوف احتساب کے لیے مانع نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی اندیشہ نہیں۔ صرف مستقبل میں کچھ فائدے کی تحصیل نہ ہونے کا خیال ہے۔

لیکن اگر قطعاً ضرورت مند ہے، کہ خود بیمار ہے اور طبیب اس سے بدلہ لے لے گا۔ یا کوئی حاکم احتساب کرنے کے بعد اس کو الگ کر دے گا تو وقتی طور سے اُس معذوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے احکامات صادر ہو سکتے ہیں۔ پھر آدمی کو چاہیے کہ دین کو محفوظ کرنے میں کوشش کرے۔

دوسری وجہ یہ ہو کہ کسی مقبوضہ چیز کے نکل جانے کا خطرہ ہو۔ یا جان کا خطرہ ہو۔ یا یہ خطرہ ہو کہ مخالفین مکان گرا کر نقصان پہنچائیں گے تو بھی اس شخص پر احتساب واجب نہیں، لیکن اگر ظاہری شان و شوکت میں ٹھیس لگتی ہو تو احتساب ضرور کرے۔ ایسے امور میں اصول شرع کو افضل سمجھنا چاہیے۔ اگر صرف پیٹھ پیچھے بُرا بھلا کہے جانے کا خطرہ ہو تو بھی احتساب کرے۔ اور اگر اپنے احتساب سے اپنے عزیزوں کو ہی تکلیف کا اندیشہ ہو تو بھی احتساب کرے۔ کیونکہ بہ نسبت اپنے دوسروں کے لیے صبر کرنا افضل ہے۔

چوتھا رکن
عِلمِ احتساب کے بیان میں

(علمِ احتساب) احتساب کے آٹھ درجات ہیں۔ اوّل حالت و حقیقت کا معلوم ہونا۔ دوسرے اس آدمی کو بُرائی اور بدی سے روشناس کرنا۔ تیسرے اُس کو نصیحت کرنا۔ چوتھے سخت کلامی سے پیش آنا۔ پانچویں ہاتھ سے بُرے کاموں کو روکنا۔ چھٹے زخمی کرنے کا خوف دلانا۔ ساتویں، مار پیٹ کا احتساب کرنا۔ آٹھویں ہتھیار کے ذریعہ گناہوں کو روکنے کی دھمکی دینا، اور دوسرے مددگاروں کے ذریعے احتساب کرنا۔

(تفصیلِ علمِ احتساب) پہلا درجہ : گنہگار کے صحیح حالات کو جاننے کا ہے کہ کسی کے گناہوں کی جستجو نہ کرے۔ اگر کوئی بُری چیز پوشیدہ ہے تو اس کو ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرے، یا اس کے ساتھیوں سے دریافت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ احتساب اس وقت لازم ہے۔ جب عالم آشکارا کسی گناہ کو کرتے ہوئے دیکھ لے یا دو گواہانِ عادل تجھ کو آکر بتائیں، اس لیے کہ اُن کی گواہی بالکل درست ہوگی۔

جناب سلیمان کی انگوٹھی پر کندہ تھا کہ صرف سُنی ہوئی باتوں پر رُسوا کرنا زیادہ بُرا ہے۔ بہ نسبت ظاہری گناہوں کے چھپانے کے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ کام کی بُرائی ظاہر کرے، تاکہ اگر کوئی آدمی بے خبری کے عالم میں گناہ کرتا ہو تو وہ خبردار ہو جائے۔ جیسے کوئی جاہل آدمی نماز کے ارکان پُوری طرح ادا نہیں کرتا، یا اُس کے جوتے میں نجاست لگی ہو، اور وہ نجاست اس کے خیال میں نجاست نہ ہو، تو اس کو نرمی کے ساتھ سمجھاوے۔ بلکہ اوّل اس کو سمجھائے کہ کوئی آدمی ماں کے پیٹ سے تمام علوم سیکھ کر نہیں آتا۔ ہم نے بھی اسی طرح سیکھا ہے۔ اس کے بعد سمجھائے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ نصیحت سُننے والے کو خود گناہوں کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو انتہائی نرمی سے سمجھاوے۔ اگر کوئی کسی کی غیبت کرے تو اس طرح سمجھاوے کہ دُنیا میں کوئی آدمی عیب سے خالی نہیں۔ یا غیبت کے متعلق احکامِ خدا کو نقل کر دے۔ ایسے موقع پر ایک بڑی نازک بات یہ ہے، جس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن خدا کی توفیق جس کو ہوتی ہے، وہ ہی بچتا ہے۔ نصیحت کرنے میں دو قسم کی بزرگیاں پوشیدہ ہیں۔ پہلے یہ کہ ناصح کی بزرگی و برتری ظاہر ہوگی۔ چاہے وہ زبان سے کہے یا نہ کہے۔ یا اس کے علم و فضل سے اس کی فضلیت ظاہر ہوگی۔ خواہ مخواہ بعض علماء کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم شریعت کے تابع ہیں، لیکن درپردہ اُن کے جذباتِ جاہ وحشمت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور یہ اس شخص کے گناہ سے زیادہ بُرا ہے، جس کو وہ نصیحت کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں دوسروں کو نصیحت کرنے سے زیادہ خود توبہ کرے اور سوچتا رہے کہ میں بھی گناہگار ہوں۔ ایسے آدمی کے لیے نصیحت کرنا اچھا ہے۔ اور اگر ذہن میں یہ فتور پیدا ہو جائے کہ فلاں آدمی میری نصیحت سے توبہ کرے گا تو بُرا ہے۔

ایک بار حضرت داؤد طائی سے لوگوں نے دریافت کیا کہ بادشاہوں کو احتساب کرنے والے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جواب دیا کہ مجھے خوف ہے کہ اس کو کوڑے لگائے جائیں۔ اور اگر کوڑوں کی طاقت اس میں موجود ہے، تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ اور اگر اس کی بھی اس میں طاقت ہے، تو مجھے ڈر ہے کہ وہ سخت مصائب میں مبتلا ہونے والا ہے، جو غرور اور خود پسندی ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ سختی سے احتساب کرے۔ اس کے لیے دو آداب ہیں۔ اوّل جب تک نرمی سے

کام چل سکتا ہے، چلائے۔ اور اگر نہ چلے تو پھر سخت کلامی کرے۔ اس سے زیادہ تنبیہہ کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ وہ خود بیوقوف ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو گناہ کیوں کرتا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عقلمند آدمی اپنا احتساب خود کرتا ہے اور احمق اپنے نفس کی خواہشات میں ڈوبا رہتا ہے اور اپنی خواہشات پر اکڑتا ہے کہ خداوند عالم میرے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور سخت گوئی اس وقت مفید ہوتی ہے جب کہ یقین ہو کہ اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ اور اگر نہ ہو تو ترشروئی اور حقارت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی طرف سے مُنہ پھیرلے۔

پانچواں درجہ - ہاتھ سے بُرے کام کو ختم کرنا۔ اِس میں بھی دو آداب ہیں۔ ایک تو حتی الامکان اس کو ختم کرنے کے لیے تادیب کرے۔ مثلاً ریشمی لباس کو اتارنے کے لیے کہے۔ یا اور گناہوں سے بچنے کے لیے زبان سے کہے۔ مثلاً حالت جنابت میں مسجد سے باہر نکل جانے کے لیے کہے۔ اور اگر وہ نہ مانے، تو پھر دوسرا ادب یہ ہے کہ ہاتھ پکڑ کر اس کو باہر نکال دے۔ اسی طرح ساز کو توڑنا، یا شراب کو پھینکنا ہو اور اس کے بعد پٹنے کا خطرہ ہو، تو وہاں سے فوراً چلا آئے۔ اگر شراب پھینک سکتا ہے تو برتن کے توڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب اِسلام نے شراب کو حرام کیا تو اوّل اس کے برتنوں کے توڑنے کا بھی حکم ہوا۔ لیکن کچھ دنوں بعد برتن توڑنے کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ لہٰذا برتنوں کو بلا عذر توڑنے سے اس کا تاوان لازم ہوتا ہے۔

چھٹا درجہ یہ ہے کہ اس کو ڈرائے اور دھمکائے۔ یعنی شراب کے متعلق یہ کہے کہ اگر اس کو نہ پھینکو گے۔ تو تمھارا سر توڑ دیا جائے گا۔ اس کے بھی دو آداب مقرر ہیں۔ ایک یہ کہ تذلیل نہ کرے۔ اور کپڑوں کو پھاڑنے کا حکم نہ دے۔ یا گھر کھودنے کی دھمکی نہ دے۔ دوسرا یہ کہ تہدید کرنے میں قابلِ عمل بات کہنا درست ہے۔ گردن مارنے یا سُولی پر چڑھانے کے لیے نہ کہے۔ اور اگر اس کے اوپر خوف غالب ہونے کی وجہ سے مُبالغہ کرے تو روا ہے۔

ساتواں درجہ یہ ہے کہ لکڑی اور ہاتھ کے ذریعہ تہدید کی جائے۔ یہ بھی بوقت ضرورت اور حاجت کے مُطابق روا ہے۔ لیکن اگر وقتی طور سے مار کھانے پر آدمی گناہ سے پرہیز کرے اور ہمیشہ کے لیے توبہ نہ کرے، تو مارنا بے سود ہوگا۔

کسی کو حدود شروع کے ماتحت سزا دینے کو "حد" کہتے ہیں۔ اس میں ادب یہ ہے کہ ہاتھ سے مارنے پر اگر مان جائے، تو لکڑی سے نہ مارے۔ اور اگر کوئی آدمی عورت کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہو، اور تلوار کے دھمکانے سے خیال ہو کہ یہ ڈر کر اس گناہ کو چھوڑ دے گا، تو تلوار دکھائے اور اگر محتسب اور اس کے بیچ میں ندی ہو تو تیر کے ذریعے اوّل دھمکائے، اور نہ مانے تو اس کی ران یا پنڈلی پر تیر مار دے۔ نازک جگہ پر تیر نہ مارنا چاہیے۔

تاکہ وہ ہلاک نہ ہو جائے۔

آٹھواں درجہ یہ ہے کہ اگر تنہا کافی نہ ہو تو لوگوں کو معاونت کے لیے بلائے، اور اُس سے لڑے لیکن اگر گنہگار بھی آمادۂ پیکار نہ ہو، تو حاکمِ وقت کے حکم کے بغیر نہ لڑے۔ بعض علماء اس کو بھی جائز سمجھتے ہیں، کہ فاسقین کے ساتھ جنگ کرنا جائز ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ اگر محتسب مارا جائے گا تو شہید ہو گا۔

آدابِ محتسب

محتسب کے لیے تین عادات ضروری ہیں۔

پہلی، زہد و پرہیز گاری اور خوش طبعی کا علم۔ کوئی کام بغیر حاصل کئے نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر نہ پڑھے گا تو ان کی حقیقت کو نہ پہچانے گا۔ اگر پرہیز گاری سے ناواقف ہے، تو اس کا ہر کام خواہشاتِ نفسانی کے ماتحت ہو گا۔ اور اگر خوش طبعی نہ ہو گی تو ہر بات پر غصہ آئے گا، اور ایسی حالت میں وہ خدا کو بھول جائے گا۔ حد سے زیادہ تجاوز کر کے نفسانیت میں قدم بڑھائے گا، اور ایسی حالت میں وہ گناہگار ہو گا۔

ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک کافر کو زمین پر پٹک دیا۔ اُس نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا، تو آپ اُسے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، اور فرمایا کہ اگر اب میں اس کو قتل کرتا ہوں، تو وہ میری ذاتی خواہش کے بنا پر ہو گا، خدا کے لیے نہیں۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ محتسب کا اپنے علم میں کامل ہونا ضروری ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ اوّل خود نیک عمل کرو، بعد میں لوگوں کو تلقین کرو، لیکن یہ بات ادب میں داخل ہے۔ شرائط میں نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم خود عامل نہ ہوں، تو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کریں؟ تو حضورؐ نے حکم دیا کہ احتساب پھر بھی کرو۔

صبر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ جو آدمی رنج و مصیبت میں صبر نہ کرے گا۔ وہ محتسب نہ ہو گا، اور یہ بھی ضروری ہے کہ محتسب حریص نہ ہو۔ کیونکہ طمع کی زیادتی سے اس کا احتساب بیکار ہے۔

ایک بزرگ قصاب سے بلّی کے لیے چھیچھڑے لیا کرتے تھے۔ ایک دن قصاب کی بُری حرکت دیکھی تو اوّل بلّی کو اپنے سے الگ کیا اور بعد میں اس سے باز پُرس کی۔ اس نے کہا کہ اب میں دیکھوں گا کہ آپ مجھ سے چھیچھڑے نہ لیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بلّی کو اوّل نکال دیا ہے۔ اس کے بعد تجھ کو تہدید کی ہے۔

جو آدمی لوگوں کو رضامند رکھنا چاہے گا، وہ احتساب نہ کر سکے گا۔

(قصہ) ایک بار حضرت ابو مسلم خراسانی سے ایک بزرگ نے دریافت کیا، کہ اپنے وطن میں کیا حیثیت رکھتے ہو؟ تو جواب دیا کہ ٹھیک ہوں تو فرمایا کہ جو آدمی احتساب کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنی قوم میں ذلیل رہتا ہے۔

احتساب کی اصل یہ ہے کہ محتسب گنہگاروں سے الگ تھلگ رہے۔ مگر اس پر نظر محبّت کی رکھے اولاد کی طرح اس کو منع کرے۔ ایک بزرگ نے ماموں رشید سے سختی سے احتساب کیا، تو ماموں نے کہا اے جواں مرد! خُدا نے تجھ سے زیادہ اچھے آدمی کو مجھ سے زیادہ بُرے آدمی کے پاس احتساب کرنے کے لیے ودیعت کیا۔ تو دیکھ! کہ حضرت موسیٰؑ کو تو فرعون کے اُوپر مقرّر کیا۔ اور حکم دیا کہ اس سے نرمی سے بات کرو، شاید وہ تمھارا کہا مان لے۔

شرائط محتسب | ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور عرض کی کہ مجھے زنا کرنے کی اجازت دی جائے، پاس بیٹھنے والے سخت ناراض ہوئے اور مارنے کو دوڑے۔ حضوؐر نے سب کو روک دیا اور اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور فرمایا کہ کیا تو اپنی ماں کے ساتھ کسی کو زنا کرتے ہُوئے دیکھنا پسند کرے گا؟ اُس نے انکار کیا، تو فرمایا کہ اسی طرح دوسرے کو خیال کر! اسی طرح تو جب اپنی بیٹی کے ساتھ کسی کو فعل حرام کرتے ہُوئے نہیں دیکھ سکتا، ایسے ہی دوسروں سے بھی اُمید رکھ اور جس طرح تو اپنی بہن کے ساتھ یہ فعل پسند نہیں کرے گا، اسی طرح دوسرا بھی کیسے پسند کر سکتا ہے؟ اسی طرح حضوؐر نے اس کی تمام قرابت دار عورتوں کے لیے فرمایا۔ آخر میں آنحضرتؐ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا کہ خدا اس کے سینے کو پاک کرے، اور گناہوں سے محفوظ رکھے۔ وہ شخص فوراً توبہ کر کے چلا گیا اور پھر عمر بھر زنا نہ کیا۔

ہم کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کرنا چاہیئے۔

(واقعہ) ایک شخص ایک بار ایک عورت کو پکڑے ہُوئے چُھری دکھا رہا تھا۔ وہ فریاد کر رہی تھی، لیکن لوگ قریب جاتے ہُوئے ڈرتے تھے۔ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قریب گئے اور کندھے سے کندھا مِلا دیا۔ وہ شخص بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، اور بدن سے پسینہ جاری ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں نے اس سے سبب دریافت کیا، تو کہا کہ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کسی شخص نے میرے بالکل قریب آکر اتنا کہا کہ تیرا یہ عمل خدا دیکھ رہا ہے۔ میرے دل پر ایک خوف طاری ہو گیا اور پھر ہوش نہ رہا۔ تو اس کو بتایا کہ وہ حضرت بشر حافی تھے۔ تو کہا کہ اب اس شرمندگی کے بعد اُن کے سامنے جانے کی ہمّت نہیں ہوتی، اور اس کے بعد اس کو بخار آیا اور چند ہی دن میں مر گیا۔

حضرت فضیلؒ سے لوگوں نے کہا کہ سفیان، عینیہ بادشاہ سے خلعت لیتا ہے، تو فرمایا کہ بیت المال میں اس کا حق زیادہ ہے۔ اس کے بعد تنہائی میں غصّہ ہُوئے، اور ملامت فرمائی۔ سفیان نے عرض کی۔ اگرچہ میں خود صالح نہیں ہوں، لیکن صالحین کو دوست رکھتا ہوں۔

تیسرا باب

اِنسان کی عادات میں جو ممنوعات داخل ہوگئے ہیں

(منکرات کا بیان) دُنیا میں منکرات اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ لوگ اُن کی اصلاحات سے نا اُمید ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ وُہ خود گناہوں کو چھوڑنے پر قادر نہیں اور جن پر قادر بھی ہیں، اُن کو چھوڑنا نہیں چاہتے یہ یہاں کے دینداروں کا حال ہے۔ اب رہے اہلِ غفلت تو اُن کو اُن تمام بُری باتوں کا احساس ہی نہیں۔

لہٰذا صالحین اور علما جس پر قادر ہیں۔ اُس میں ان کا خاموش رہنا اچھا نہیں۔ ہم اُن منکرات کو جو عام طور پر مساجد۔ بازاروں۔ سڑکوں اور مکانوں میں ہوتے ہیں باجمال بیان کرتے ہیں، کیونکہ الگ الگ ان کو بتلانے سے بہت طول ہو جائے گا۔

حرمت مساجد

(رکوع و سجود) رکوع و سجود حسب الحکم بجالائیے۔

(تلاوت) تلاوتِ قرآن میں ایسی آواز پیدا نہ ہو، جس سے گانا معلوم ہونے لگے۔

(مؤذن) مؤذن اذان کے الفاظ میں زیادہ کھینچ تان نہ کرے۔

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کہتے وقت قبلے سے مُنہ پھیر لے۔

(احترامِ مسجد) خطیب مسجد کا ریشمی لباس پہننا یا سونے کی تلوار حمائل کرنا حرام ہے۔

ہنگامہ آرائی کرنے والے۔ پاگل، یا لڑکے مسجدوں میں نہ آنا چاہئیں۔

مسجدوں میں تعویذ فروخت کرنے یا عملیات کی دُکان لگانا منع ہے۔

اگر کوئی دیوانہ نقصان رساں نہ ہو، یا کوئی لڑکا گاہے گاہے مسجد میں کھیلنے کے لیے آئے تو جائز ہے۔ اس کی مثال حبشیوں کی گدکہ بازی اور گانے وغیرہ کی پہلے دی جا چکی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو دیکھنا جائز سمجھا۔

خیاطی یا کتابت وغیرہ اگر لوگوں کو اس میں اعتراض نہ ہو تو جائز ہے۔

مسجد کو دوکان نہ بنانا چاہیے مثلاً قبالہ نویسی یا دُنیا بھر کے قصّوں کے فیصلے مسجد میں نہ ہونے چاہئیں، لیکن کبھی کبھی ہوں تو اجازت ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی مسجد میں فیصلے فرماتے تھے۔

مسجد میں دھوبیوں کا کپڑے دھونا یا رنگنا منع ہے۔ رنگین طبیعت لوگوں کا سنگھار کرنا بھی منع ہے۔

گانا اور مسجع و مقفع عبارتوں کے قصّے سُنانا بھی روا نہیں حتّٰی کہ مسجد میں وعظ و پند بھی نیک ہونا چاہیے جوان عورتوں کا مردوں کے پاس بیٹھنا قطعی حرام ہے۔ اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں

کو مسجد میں جانے سے منع کیا ہے۔ حالانکہ آنحضرتؐ کے عہدِ مبارک میں مستورات مسجد نبوی میں آتی تھیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر رسولِ پاکؐ اس زمانے کی عورتوں کا حال دیکھتے تو ہرگز مسجد میں عورتوں کو اجازت نہ دیتے۔

مسجد میں دنیوی فیصلے اور حساب کتاب ذیدی کرنا بھی ناجائز ہے۔

ممنوعاتِ بازار

خرید و فروخت میں حسبِ ذیل چیزیں جائز نہیں

بازار اور تجارت کے لیے اوامر و نواہی

خریدار سے جھوٹ بول کر بازار کا بھاؤ چھپانا اچھا نہیں۔
باٹ ترازو اور ناپنے کا گز رائج الوقت کے خلاف نہ ہو۔

عید کے دن سامانِ راگ اور کھلونے (حیوانات کی شکلوں کے) فروخت کرنا منع ہے۔

لکڑی کی تلواریں اور ڈھالیں فروخت کرنا۔

دُھلا ہوا یا رفو کیا ہوا کپڑا، نئے کپڑوں میں رکھ کر فروخت کرنا۔

سونے چاندی کی انگیٹھیاں اور برتن فروخت کرنا۔

اور ایسی تمام چیزیں، جن سے گاہک کو دھوکہ کھا جانے کا امکان ہو۔

ان میں بعض چیزیں تو مکروہ ہیں اور بعض حرام ہیں۔ مثلاً لکڑی کی تلواریں اور ڈھالیں فروخت کرنا اور خریدنا حرام تو نہیں، لیکن چونکہ یہ کام زیادہ تر آتش پرستوں کا تھا، اس لیے اس کو منع کیا گیا ہے۔

(نوروز اور سدہ) نوروز کے لیے مٹھائیاں بنانا اور بازار سجانا اچھا نہیں، بلکہ اس کو اور ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ بعض علماء اس دن روزہ رکھنے کے قائل ہیں، تاکہ مٹھائی وغیرہ نہ کھا سکیں۔ اسی طرح سدہ کی رات کو آگ جلانا ممنوع ہے۔ بلکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ اس رات کو قطعی دل سے بھلا دینا چاہیے۔

علیٰ ہٰذا القیاس میرے خیال سے بھی ایسا کرنا درست ہوگا۔

(نوٹ) "سدہ" ایرانی مہینوں میں "بہمن" کے دسویں دن کا نام ہے۔ اور عید نوروز ایران کا سب سے بڑا تہوار ہے، جو وہاں ۲۱ مارچ کو منایا جاتا ہے۔

ممنوعاتِ راہ

راستوں میں کون سے کام بُرے ہیں

سڑکوں پر بیچ میں کھمبے گاڑ دینا، یا دُکان لگا دینا۔ درخت لگانا۔ عمارت کا چھجہ باہر کو نکالنا جانوروں کو بیچ سڑک پر باندھنا، جو کسی کے آنے جانے میں تکلیف پہنچائیں۔ اچھا نہیں۔ لیکن اگر ضرورت پڑ جائے، تو کر لینا چاہیئے۔

مثلاً اگر بوجھ لائیں تو بیچ سڑک سے اُٹھوا کر گھر میں ڈال دیں ۔لدے ہوئے گدھے کو تنگ گلیوں میں لانا منع ہے لیکن اگر کوئی دوسرا راستہ ہی نہ ہو، تو مجبوری ہے ۔

قصاب کو راستے میں جانور حلال کرنا منع ہے ۔

راستے میں خربوزوں اور کیلوں کے چھلکے پھینکنا بُرا ہے ۔

راستے میں پانی پھینکنا یا اگر ضرورتاً پھینکا گیا ہو تو لوگوں کی تکلیف کے خیال سے اس کی صفائی کرا دینا ضروری ہے ۔

بہت سے گھروں کے چونچے اور پرنالے جہاں شاہراہوں اور گلیوں میں آ کر ملتے ہوں، اس کا خیال سب لوگوں نیز میونسپلٹی کے ذمّہ داروں کو رکھنا ضروری ہے ۔

اگر کوئی کٹ کھنا کتا کسی کے یہاں ہو تو بھی بُرا ہے ۔لیکن اگر کُتا صرف راستہ ہی نجس کرتا ہے تو منع نہ کرنا چاہیے ۔اگر کُتّے کے سونے کی وجہ سے راستہ نکلنا دُشوار ہو، تو مالک کو چاہیے کہ اس کو وہاں نہ سونے دے ۔ اسی طرح مالک خود بھی کُتّوں کو لے کر بیچ بازار میں نہ بیٹھے ۔

ممنوعاتِ حمام

عورت کے لیے حمام میں جانے کا طریقہ

عورت کو ناف سے لے کر زانو تک حمام میں بھی ڈھکا رہنے دے ۔کسی کی موجودگی میں میل کی صفائی کے لیے بھی نہ کھولے، بلکہ کسی کے سامنے تہمد کے اندر بھی ہاتھ ڈالنا منع ہے ۔

حیوانات کی تصویریں حمام میں یا اُس کے دروازے پر بنانا منع ہے ۔ایسی حالت میں یا تو اُس کو مٹا دے یا خود وہاں جانے سے پرہیز کرے ۔

(مسئلہ) امام شافعیؒ کے نزدیک تھوڑے سے پانی میں ناپاک ہاتھ یا برتن کو ڈالنا منع ہے ۔ امام مالکؒ کے خیال میں دُرست ہے ۔

(نوٹ) مالکیوں پر بھی اعتراض نہ کرنا چاہیئے ۔اس لیے کہ زیادہ پانی بہانا بھی منکرات میں داخل ہے (منع کیا گیا ہے) اس کے متعلق تفصیلی بیان باب الطہارت میں آچکا ہے

ممنوعاتِ آدابِ مہمانی

مہمانی کے لیے جن چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے

جب کوئی مہمان آئے تو حسبِ ذیل چیزیں آرائشِ مہمانی اور استعمال میں نہ ہونا چاہئیں :

ریشمی فرش ۔ چاندی کے برتن ۔چاندی سونے کے گلاب ۔ پاش اور عطردان ۔تصویروں کے پردے ۔

جانوروں کی شکل کی بنی ہوئی انگیٹھی، اور جوان عورتوں کا مردوں کی محافل میں گانا قطعی منع ہے۔ اگر خود منع نہ کر سکے، تو ایسی محفل سے چلا آئے۔

امام احمد بن حنبل کو ایک دفعہ ایک محفل میں چاندی کی سُرمے دانی نظر پڑی۔ تو آپ وہاں سے واپس آ گئے۔ لہٰذا جس محفل میں لوگ ریشمی کپڑے پہنے بیٹھے ہوں، وہاں بیٹھنا بھی نہ چاہیے۔ اسی طرح سونے چاندی کی انگوٹھی بھی ناجائز ہے۔ اگر نادان اور نابالغ بچہ پہنے ہوئے ہو تو اس کے لیے مکروہ ہے، لیکن اس کو اوائل عمر ہی سے جب عادات ایسی پڑ جائیں گی، تو ہمیشہ وہ ہی کام کرے گا۔ مسخروں اور بھنڈوں کی محافل میں بیٹھنا بھی منع ہے۔ لہٰذا اسی طرح ایسے مدرسوں، خانقاہوں اور بارشاہی وغیرہ میں بھی ان چیزوں کی وجہ سے پرہیز کرے۔ یُوں تو اس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ البتہ تکیے پر اگر کوئی تصویر کڑھی ہو تو روا ہے۔

دسواں اصُول

(باب الحکومت)

بادشاہت اور حفظِ رعایا

بادشاہت دُنیا کے لیے خداوند عالم کی نیابت کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا اگر بادشاہ عدل و انصاف سے کام نہ لے گا، تو شیطان کی پیروی ہوگی۔ کیونکہ بادشاہوں کے ظلم و جور کے اثرات سب سے زیادہ رعایا پر پڑتے ہیں۔

بادشاہت علم و عمل سے ہوتی ہے۔ جو علم دخار ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ

(دُنیا فانی ہے) آدمی کو سمجھنا چاہیے کہ خداوند نے اس کو بادشاہ کس مقصد سے بنایا ہے۔ اس کی اصل جگہ کیا ہے۔ یہ دنیا محض چند روزہ ہے، یہاں وہ مسافر ہے۔ جس کی پہلی منزل شکم مادر ہے، اور آخری قبر۔ عمر کے دن، مہینے۔ سال ہر ایک منزلیں ہیں۔ جو جو منزل گزرتی ہے، وہ اپنا سفر ختم کرتا جاتا ہے لہٰذا ایسا آدمی جو اس دُنیا میں اپنا وقت خراب کرے، وہ بیکار ہے۔ ہوشیار آدمی اس دنیا میں آخرت کے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔ اور اپنی عمر میں صرف زندہ رہنے کے لیے چیزیں استعمال کرتا ہے۔ اور اگر حرص و طمع کرے گا۔ تو بہت بُرا ہے۔ وہ اپنی موت کے وقت سوچے گا کہ افسوس میں نے یہ تمام خزانے کیوں جمع کیے۔ یہ سب بیکار ہیں اور موت کے وقت کوئی چیز کام نہ آئے گی۔ موت کا وقت ایسے آدمی کے لیے تکلیف دہ ہوگا۔ اور یہ تصور بھی اس کو جب ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کا مال و اسباب نیک کمائی کا ہو گا تو عذابِ الٰہی کہیں زیادہ سخت ہوگا۔

لہٰذا آدمی کا ایمان ہونا چاہیے کہ دُنیا کی لذّات قطعی کدورتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اس کے عوض لازوال دولت آخرت کو ضائع نہ کرے اور صبر سے کام لے۔

(مثال) ایک مثال کے ذریعہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثلاً کسی عاشق سے کہا جائے کہ اگر تو ایک رات صبر کرے تو تیرا معشوق کل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تیرے پاس آجائے گا۔ اگر وہ اس ایک رات کو انتہائی تکالیف اُٹھا کر صبر کر لیتا ہے تو پھر آئندہ اس کو خوشی ہی خوشی ہے۔ بس ایسا ہی سمجھ لو کہ یہ عشقِ مجازی کی مثال ہے۔ اگر آخرت کا عیش و آرام ہوگا، وہ ہمارے تصورات سے کہیں بالاتر ہوگا۔

دنیا کی ایک رات یا عمر کے چند سال کا ابد کی لاتعداد مُدت سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اگر زمین و آسمان کو سرسوں جیسے دانے بھر دیں اور ایک چڑیا کو حکم دیں کہ ایک ایک دانہ کر کے اس کو کھالے تو وہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ آخرت کی مُدت ہے۔ اب سوچو! کہ دنیا میں انسان کو اگر قدرے مال ہاتھ آ بھی گیا تو مال آخرت کے مقابلے میں کیا ہو سکتا ہے۔

لہٰذا حاکم اور محکوم دونوں کو چاہیے کہ آخرت کا تصوّر سامنے رکھیں۔ اس کے بعد حکومت کریں، اور خداوندِ عالم کے احکامات کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد وہ اس کی نیابت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ خدا عدل کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا عدل کرے۔ دُنیا داری سے کام نہ لے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ عادل بادشاہ کو خداوند عالم اپنا دوست سمجھتا ہے اور ظالم حاکم کو دُشمن۔ اور اس کی جتنی رعایا نیک اعمال کرتی ہے، وہ سب اس بادشاہ کے اعمال میں لکھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک نماز ستر ہزار نمازوں کے برابر ہوتی ہے۔ خداوندِ عالم نے کتنا بڑا مرتبہ بادشاہ کو عنایت فرمایا ہے۔ کہ بادشاہت کے ساتھ سب کچھ دے دیا۔ اب اگر وہ اس کی نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ تو وہ اتنے سخت عذاب کا بھی مستحق ہوگا۔

عدل پادشاہی

(عدل شاہی کے اصول) پادشاہ کے لیے دس اصول پر کاربند رہنا ضروری ہے۔ ورنہ عدل قائم رہنا مشکل ہے۔

پہلا، یہ جب کسی مقدمے یا جھگڑے کا فیصلہ کرے، تو اپنے کو محکوم سمجھ کر کرے۔ اور سوچے کہ اگر میرے اوپر یہ فیصلہ صادر کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ لہٰذا جو بات خود اپنے لیے پسند نہ ہو، دوسروں کے لیے نہ سوچے ورنہ خیانت ہوگی۔

جنگِ بدر میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم خود سائے میں تشریف فرما تھے، اور صحابہ پر دھوپ تھی۔

جبرئیل امین فوراً نازل ہوئے، اور اس کی شکایت کی
حضورؐ کا قول ہے کہ اگر بخشش چاہتے ہو تو مرتے وقت کلمہ طیّبہ زبان پر جاری کرو، اور جو آدمی صبح اُٹھ کر سوائے خدا کے کسی دوسرے کو یاد کرتا ہے۔ وُہ خدا کا بندہ نہیں ہے اور اگر مسلمانوں کی خدمات سے غافل ہے، تو وہ مسلمان ہی نہیں۔

دُوسرا یہ ہے کہ اپنے دروازے پر زیادہ حاجت مندوں کو نہ کھڑا رہنے دے۔ اور جب تک ان کی ضرورتوں کو پُورا نہ کر دے۔ کسی کام میں مشغول نہ ہو، کیونکہ مسلمان کی ضرورت پورا کرنا نفل سے زیادہ افضل ہے۔
ایک دن خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز ظہر تک مُسلمانوں کی خدمت کرتے رہے اور اس کے بعد آرام کرنے لگے۔ آپ کے بیٹے نے عرض کیا، کہ آپ آرام میں ہیں، اگر کوئی حاجت مند دروازے پر رہ گیا ہو اور آپ کو اس وقت موت آجائے، تو کیا ہو گا۔ آپ اُٹھے اور باہر آگئے۔

تیسرا اصول یہ ہے، اچھا کھانا اور پہننے کی عادت نہ ڈالے اور قناعت کرے۔ عدل کے لیے قناعت ضروری ہے۔
حضرت عمرؓ نے حضرت سلمان فارسی سے دریافت کیا، کہ میری کون سی ناپسند بات تم نے سُنی؟ تو فرمایا کہ ایک کھانے میں دو قسم کا سالن کھاتے ہو۔ اور دو کپڑے الگ الگ استعمال کے تمھارے پاس ہیں۔ تو کہا کہ اس کے علاوہ؟ جواب دیا نہیں۔ تو فرمایا یہ دونوں غلط ہیں۔

چوتھا طریقہ یہ کہ نرمی سے پیش آئے۔ اور اگر کوئی دوسرا سختی کرے، تو اُس سے بھی نرمی کرے۔
حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو حاکم وقت رعایا کے حقوق بجالائے۔ اس کے لیے بادشاہت بہت اچھی ہے، ورنہ بہت بُری۔
ہشام نے ابو حازم سے ایک بار دریافت کیا کہ حکومت میں نجات کیسے ہوتی ہے تو جواب دیا کہ خراج حلال کرو، اور نیک راستے میں خرچ کرو۔ خلیفہ ہشام نے کہا کہ یہ کون کر سکے گا؟ تو فرمایا کہ وہ حاکم جو قبر کے عذاب سے ڈرتا ہو، اور بہشت کو دوست رکھتا ہو۔

پانچواں طریقہ یہ ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کو اصولِ شرع کے ماتحت خوش رکھے۔
ارشادِ نبوی ہے کہ سب سے بہتر حاکم وہ ہیں، جو محبوب رعایا ہو، اور وہ خود رعایا کو محبوب رکھتا ہو۔ اور بدترین حاکم وہ ہے، جو نہ خود رعایا سے خوش اور رعایا بھی اس کی دشمن ہو، وہ تم کو بُرا کہیں۔ اور تم اُن کو لیکن وہ یہ سمجھتا رہے کہ رعایا مجھ سے خوش ہے۔ حکومت کے لیے انتہائی قانع اور عادلوں کو مقرر کرنا چاہیئے تاکہ اصول اور سچائی کی تحقیق کر کے فیصلہ کر سکیں۔

چھٹا طریقہ یہ ہے کہ حاکمِ شرع اسلام کے خلاف کوئی کام نہ کرے اور خلاف شرع آدمی کی پیروی نہ کرے اور اگر وہ آدمی ناراض ہو جائے تو بھی پروا نہ کرے۔ اس لیے کہ اس کی ناراضگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی مجھ سے خفا ہے، تو میں متاثر نہیں ہوتا اور ضروری ہے، کہ اگر کسی ظالم کو سزا دی جائے گی، تو وہ ناخوش ہوگا۔ فریقین میں سے ہر ایک کو خوش کرنا مشکل ہے۔ وہ آدمی بے عقل ہے جو لوگوں کی رضامندی کو خدا کی خوشی پر ترجیح دیتا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ کو خط لکھا کہ مجھے کچھ نصائح کرو۔ تو جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جو آدمی خدا کی رضا کو مخلوق کی رضامندی سے بہتر مانتا ہے خدا اس سے بہت خوش رہتا ہے، ورنہ ناخوش ہوتا ہے، بلکہ مخلوق کو بھی اس سے ناخوش کر دیتا ہے۔

ساتواں اصول یہ ہے کہ حاکم حکومت کو ایک اہم اور پُرخطر کام تصور کرے۔ اپنے کو مخلوق کا کفیل سمجھے۔ جب اس کے حقوق ادا کرے گا تو خدا اس سے خوش ہوگا اور سعادت ابدی حاصل ہوگی ورنہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاف کعبہ پکڑ کر فرمایا کہ جب تک قریش میں تین باتیں باقی ہیں حکومت ان کے قبضے میں رہے گی۔ پہلے جو لوگ اُن سے محبت کریں، وہ محبت سے اس کو جواب دیں۔ دوسرے اگر عوام حکم اور انصاف کے طالب ہوں، تو عدل سے کام لیں۔ تیسرے جو وعدہ کرلیں اس کو پورا کریں۔

جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ ملعون ہیں اور اس کے فرائض اور سنت دونوں قبول بارگاہ ایزدی نہیں ہوتے اس کے بعد سوچنا چاہیے کہ عبادت کی قبولیت کا دارومدار جس چیز پر ہے۔ وہ کتنی اہم ترین ہوگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ غیر عادل حکمران پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ اور قیامت کے دن بھی خدا اُس پر نظر نہ کرے گا۔

پہلے جھوٹا بادشاہ یا حاکم۔ دوسرا بوڑھا زناکار۔ تیسرا مغرور فقیر۔

حضورؐ نے فرمایا کہ تم چاروں طرف کے ممالک فتح کروگے اور وہاں کے بادشاہ سوائے متقیوں کے سب دوزخ میں جائیں گے، جو حاکم عوام سے کام نہ لے گا، خدا اس پر جنت کو حرام قرار دیتا ہے اور جو آدمی گھر والوں کی طرح رعایا پہ حکمرانی کرے گا وہ دوزخی ہے۔ میری اُمت کے دو آدمی میری شفاعت حاصل نہ کرسکیں گے۔ ایک حاکم ظالم۔ دوسرے بدعتی، جو دین میں فساد برپا کرے۔ اور خداوندِ عالم پانچ آدمیوں سے خاموش رہتا ہے۔

پہلے وہ امیر جو اپنا حق لے کر رعایا کا خیال نہ کرے۔ دوسرے وہ روسا جو غریبوں اور امیروں کو یکساں نہ سمجھتے ہوں۔ تیسرے وہ آدمی جو مزدور کو پوری اُجرت نہ دے۔ چوتھے وہ شخص جو خدا کی عبادت کی طرف اپنی اولاد

متوجہ نہ کرے ۔ پانچویں ، وہ آدمی جو اپنی بیوی کا مہر ادا نہ کرے ، اگر وہ طلب کرے ۔

حضرت عمرؓ ایک روز ایک شخص نماز جنازہ پڑھانا چاہی ۔ دوسرا آدمی پیچھے سے آیا ، اور خود کھڑا ہو کر نماز پڑھائی ۔ بعد میں دفن کر دیا گیا ۔ تو اس کی قبر پہ بیٹھ کر کہنے لگا کہ خداوندا ! اگر تو اس پر عذاب نازل کرے ، تو یہ گنہگار تھا ۔ اور اگر رحمت نازل کرے ۔ تیری رحمت بڑا درجہ رکھتی ہے ، اور اے مرنے والے تو نہ کبھی امیر تھا ، نہ کاتب ، نہ عالم ، نہ حاکم یہ کہہ کر وہ شخص غائب ہو گیا ۔ اس کی تلاش کی گئی مگر کہیں نہ ملا تو فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام تھے ۔

حضورؐ کا قول ہے کہ امیروں اور امینوں پہ افسوس ہے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے روزِ قیامت اپنے بالوں میں لٹکے ہوں گے ، اور جس آدمی نے دس آدمیوں پر بھی حکومت کی ہے ، اس کو پابہ زنجیر میدانِ قیامت میں لایا جائے گا ، اور اگر نیکیاں کی ہیں تو چھوڑ دیا جائے گا ، ورنہ ایک زنجیر اور ڈال دی جائے گی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ، کا قول ہے کہ افسوس ہے اس شخص پر جو روزِ قیامت حاکمِ اعلیٰ کے سامنے پیش ہو گا اور اس نے اس دنیا میں ظلم کیے ہوں گے ۔ عدل سے کام نہ لیا ہو گا ۔ اپنے اعزا کی وجہ سے دوسروں کو نقصان پہنچایا ہو گا ۔ اثرات کے ماتحت احکامات بدلے ہوں گے ۔

حضورؐ فرماتے ہیں کہ خداوندِ عالم روزِ قیامت بادشاہانِ دنیا سے دریافت کرے گا کہ میں نے تم کو حاکم بنایا تھا ، اور تم نے اُن پر ظلم کیے ؟ تو جواب دیں گے کہ تیرے حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے تو حکم ہو گا کہ تم مجھ سے زیادہ سزا دینے کا حق رکھتے تھے ۔ اس کے بعد دوسروں سے دریافت کرے گا کہ تم لوگوں نے ظالمین کو کم سزا دی ، وہ رحم کا بہانہ کریں گے ۔ تو ندا آئے گی کہ تم مجھ سے زیادہ رحیم تھے ؟ اس کے بعد جن لوگوں نے احکاماتِ خدا میں کمی یا زیادتی سے کام لیا ہے ، اُن کو پکڑ لیا جائے گا اور دوزخ میں بھیج دیں گے ۔

حضرت حذیفہ نے فرمایا کہ میں کسی حاکم کو اچھا نہیں سمجھتا ، چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا ۔ تو لوگوں نے پوچھا کیوں ؟ جواب دیا کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ روزِ قیامت تمام بادشاہ عادل و ظالم خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور اُن کو پلصراط پہ کھڑا کر کے صراط کو حکم ہو گا کہ ان کو جھٹک دیا جائے ، جو ظالم اور راشی ہوں گے ۔ پُل صراط کے جھٹکے سے نیچے دوزخ میں گر پڑیں گے اور ستر برس تک وہ برابر گرتے رہیں گے اور اس کے بعد وہ دوزخ میں اپنے مقام پہ پہنچ جائیں گے ۔

حضرت داؤد لباس تبدیل کر کے گھر سے نکل جاتے اور لوگوں سے داؤد کی عادات کے متعلق دریافت کرتے ایک دن جبرئیل علیہ السلام انسانوں کے لباس میں ملے ، تو اُن سے بھی یہ ہی سوال کیا ۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ اگر داؤد کسب کرتا ہے ، تو اچھا ہے اور بیت المال سے کھاتا ہے تو نہیں ۔ آپ فوراً مسجد گئے اور دُعا کی کہ

کوئی ہُنر سکھا دیا جائے، تاکہ روزی کما کر کھاؤں، تو زرہ بنانے کا ہُنر سکھا دیا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، رات کو بھیس بدل کر رعایا کا حال دیکھتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ایک خارش والی بکری کو تیل ملے بغیر اگر فرات میں نہلا دیا جائے تو بھی مجھ سے سوال کیا جائے گا۔ میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں۔

باوجود اس احتیاط کے حضرت عبداللہ ابن عمر ابن العاص نے آپ کی وفات کے بارہ برس بعد خواب میں دیکھا کہ آپ اس طرح آئے ہیں جیسے کوئی نہانے کے بعد تہمد باندھ کر آتا ہے، تو دریافت کیا کہ آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہوا۔ فرمایا کہ بارہ برس سے اب تک حساب کتاب میں مشغول تھا۔ اور اگر اس کی رحمتیں شاملِ حال نہ ہوتیں، تو عذابِ الٰہی سے مقہور ہو جاتا۔

ایک بار حکیم بزرجمہر نے ایک شخص کو آپ کے پاس حالات معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ وہ مدینے آیا اور پوچھا کہ تمھارے بادشاہ کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے بادشاہ نہیں ہیں۔ ہمارے امیر ہیں اور ابھی باہر گئے ہیں۔ وہ قاصد تلاش کرنے نکلا۔ دیکھا کہ دھوپ میں آرام کر رہے ہیں۔ اور ایک درہ سر کے نیچے رکھا ہے۔ تمام جسم پسینے میں تر ہے، وہ خوف سے کانپ گیا، اور عرض کی کہ آپ عادل ہیں۔ اسی لیے اطمینان حاصل ہے۔ ہمارا بادشاہ ظالم ہے، اس لیے رعایا کو اس کا خوف ہے۔ اور اگر میں اس وقت اس کا قاصد نہ ہوتا تو ضرور اسلام لے آتا۔ اب پھر آؤں گا تو مسلمان ہوں گا۔ یہ کہا اور چلا گیا۔

مختصر یہ ہے کہ بادشاہت کے علوم کا جاننا بہت مشکل ہے۔ بادشاہوں کی سلامتی صالحین کی صحبت میں ہے، تاکہ ان کو عدل و انصاف کے راستے پر لگائیں، اور دغا بازوں کے پھندے سے وہ بچا رہے۔

آٹھواں اصول یہ ہے کہ ہمیشہ دیندار علماء کی صحبت میں بیٹھے۔ دُنیا دار علماء سے پرہیز کرے۔ وہ لوگ اس کی تعریف کر کے اس کو گمراہ کرتے رہیں گے۔ دین دار عالم وہ ہیں جسے حاکموں کی ہم نشینی کی پروا نہ ہو اور وہ عدل کو ہاتھ سے نہ دیں۔

ایک بار حضرت شفیق بلخی ہارون رشید کے یہاں گئے۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ کیا تم زاہد ہو؟ تو فرمایا کہ شفیق ہوں، زہد کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کہا کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیں! تو فرمایا کہ خداوندِ عالم نے تم کو حضرتِ صدیقؓ کا جانشین کیا ہے، وہ سچے تھے، خدا تم سے بھی سچائی کی اُمید ہی رکھتا ہے۔ تم حضرت فاروقؓ کے جانشین ہو، جس طرح وہ حق و باطل میں عدل سے کام لیتے تھے، خدا تم سے بھی یہ ہی چاہتا ہے۔ تم حضرت عثمانؓ کی جگہ لیے ہوئے ہو، جس طرح اُنھوں نے خدا سے بخشش طلب کی، تم بھی کرو۔ تم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی جگہ بیٹھے ہو۔ جس طرح وہ اُن سے علم و عدل کا خواستگار رہتا۔ تم

سے بھی ہے۔

خلیفہ نے مکرّر عرض کیا کہ اور کوئی نصیحت فرمائیں، تو حضرت شفیق نے ارشاد کیا کہ خداوند عالم نے ایک مکان کا نام دوزخ رکھا ہے، اس کا دربان تم کو بنایا ہے۔ اور تین چیزیں تمہاری سپردگی میں دی ہیں۔ اوّل خزانہ شاہی۔ دوسرے تلوار۔ تیسرے تازیانہ اور حکم ہے، کہ ان کے ذریعہ دوزخ سے عوام کو بچاؤ۔ جو محتاج تُم سے طلب کرے۔ اس کو خالی ہاتھ واپس نہ کرو۔ خدا کے نافرمان پر سختی کرو۔ اور کوڑے سے تنبیہ کرو۔ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے۔ تو اس کے دل کی اجازت سے تم بھی قاتل کو قتل کر دو۔ اب اگر تم سب سے پہلے دوزخ میں جاؤ گے، دوسرے تمہارے بعد جائیں گے۔

ہارون رشید نے اور وصیّت کے لیے عرض کیا، تو فرمایا کہ تم خود چشمے کی طرح ہو اور رعایا نہر کی مثل ہے، اگر چشمہ صاف اور شفاف ہے تو نہروں میں تیرگی ناممکن ہے۔

ایک بار ہارون رشید حضرت فضیل کے پاس حاضر ہوا جب دروازے پر پہنچا تو سنا کہ آپ قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ۝ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ہماری ہدایت کے لیے یہ آیت ہی کافی ہے۔ اور اس آیت کا ترجمہ بتایا کہ اعمالِ حسنہ کرنے والے لوگوں کے ساتھ بدوں کو رکھا جائے گا، جیسا کہ وُہ جانتے ہیں۔ اُن دونوں کی ظاہری موت اور زندگی برابر ہے۔ مگر ان کے احکامات نے اُن کو بُرا کر دیا۔ اس کے بعد دروازے پر آواز دی، تو حضرت فضیل نے اندر ہی سے جواب دے دیا۔ کہ میرے ساتھ ایسے آدمیوں کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ مصاحب نے جواب دیا کہ امیر المومنین کی اطاعت فرض ہے۔ یہ سُن کر حضرت فضیل نے دروازہ کھول دیا۔ رات اندھیری تھی اندر داخل ہوئے اور خلیفہ نے چاروں طرف ہاتھ سے ٹٹولنا شروع کیا۔ جب حضرت فضیل کے ہاتھ سے مس ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اتنا نرم و نازک ہاتھ اگر دوزخ میں جائے، تو افسوس ہے۔ اور اے خلیفہ وقت! قیامت کے دن حساب کتاب دینے پر تیار رہو۔ کیونکہ اس دن تمام مسلمانوں کا حساب تُم سے لیا جائے گا۔ خلیفہ یہ سُن کر بہت رویا۔ مصاحب نے کہا کہ اے فضیل! بس خاموش رہو۔ تُم نے خلیفہ کو مرنے کے قریب پہنچا دیا۔ تو حضرت فضیل نے فرمایا کہ تو ہامان ہے اور تم جیسے لوگوں نے ہی اس کو ہلاک کیا ہے۔ مجھ سے شکایت کرتے ہو۔ ہارون رشید نے مصاحب سے پوچھا کہ تجھ کو ہامان کا خطاب اس لیے دیا ہے کہ غالباً مجھے فرعون سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ہارون رشید نے ایک ہزار دینار پیش کرنے چاہے۔ اور عرض کی مال حلال سے ہیں اور میری ماں کا مہر ہے، تو حضرت فضیل نے جواب دیا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ اس سب

مال سے پرہیز کرو، اور اصل مالکوں کو واپس کر دو، نہ کہ یہ کہ تو مجھ ہی کو دے رہا ہے، یہ سُن کر خلیفہ واپس ہو گیا۔

خلیفہ عمر ابن عبدالعزیزؒ نے محمد ابن کعب القطبی سے عدل کی تعریف دریافت کی، تو فرمایا عدل یہ ہے کہ بڑوں سے بیٹوں کی طرح پیش آؤ۔ چھوٹوں سے باپ کی طرح۔ اور برابر والوں سے بھائیوں کی طرح۔ ہر مجرم کو اس کے گناہ کے بموجب سزا دو، اور غصّے میں نہ آؤ۔ ورنہ دوزخ تمھارا گھر ہو گا۔

ایک زاہد نے خلیفۂ وقت کو نصیحت کی کہ میں ایک بار چین میں تھا، وہاں کا بادشاہ بہرا ہو گیا، وہ بہت روتا تھا اور کہتا تھا کہ اب میں فریادیوں کی فریاد نہ سُن پاؤں گا۔ چنانچہ اس نے مُنادی کرا دی کہ جو فریادی ہو، وہ سُرخ لباس پہن کر نکلے۔ اس کے بعد جب وہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلتا اور جو آدمی سُرخ لباس پہنے ہوتا، اس کی فریاد کو پہنچتا۔ اور اے خلیفۂ وقت! وہ کافر تھا، مگر آپ مسلمان ہیں۔ تو آپ کو مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔

ابو قلابہ، خلیفہ عمر ابن عبدالعزیزؒ کے پاس آئے۔ خلیفہ نے اُن سے عرض کی کہ کچھ نصائح فرمائیں! تو فرمایا کہ حضرت آدم سے لے کر اب تک سوائے تیرے اور کوئی خلیفہ زندہ نہیں ہے۔ اس نے کہا اور کچھ؟ تو فرمایا کہ اب جو مرے گا وہ تُو ہی ہو گا۔ پھر عرض کی کہ اور فرمائیں! تو فرمایا کہ اگر خداوند عالم تیرے ساتھ ہے تو تجھے کسی کا خوف نہیں، اور اگر وہ تیرا نہیں، تو تیرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ خلیفہ نے عرض کی، بس بس یہ نصیحت میرے لیے کافی ہے۔

سلیمان عبدالملک جب تخت پر بیٹھا، عالمِ وقت ابو حازم کے پاس اس نے کسی کو بھیجا اور کہا کہ جس چیز سے آپ روزہ افطار کرتے ہیں وہ مجھے بھی بھیج دیجئے۔ انھوں نے گیہوں کی بُھنی ہوئی بھوسی اُس کو بھیج دی۔ خلیفہ اُس کو دیکھ کر بہت رویا اور بہت متاثر ہوا۔ اُس نے تین روزے رکھے اور برابر اسی بھوسی سے افطار کیا۔

ایک بار اُس نے اپنی بیوی سے مُباشرت کی اور عبدالعزیزؒ پیدا ہوئے، اور حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ اُسی کے بیٹے تھے، جو حضرت عمر فاروقؓ کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ یہ اسی بھوسے کی برکت تھی، جو عالمِ وقت نے سلیمان ابن عبدالملک کو بھیجا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ سے لوگوں نے تائب ہونے کا سبب پوچھا تو کہا کہ میں ایک بار غلام کو سزا دے رہا تھا، تو اس نے کہا کہ صبح حشر کو یاد کیجئے۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا، اور توبہ کی۔

ایک بزرگ نے ہارون رشید کو میدانِ عرفات میں ننگے پیر گرم پتھروں پر کھڑا ہوا یہ کہتا سُنا کہ اے پروردگار تو تُو ہے اور میں مَیں ہُوں۔ مَیں ہر وقت گناہ کرتا ہوں اور تو بخشتا ہے۔ میرے حال پر رحم کر۔ تو بزرگ نے لوگوں

سے کہا کہ اس سے سبق حاصل کرو۔

عمر بن عبدالعزیز نے حضرت حازم سے نصیحت کے لیے عرض کیا، تو فرمایا زمین پر سو، اور موت پر ہر وقت تیار رہو، جو بات تو ناممکن سمجھتا ہے۔ اس کو ممکن سمجھ۔ جو بات تو اچھی نہ معلوم ہو، اس سے پرہیز نہ کر، کیوں کہ موت سامنے ہے۔

لہٰذا بادشاہوں اور حاکموں کو ان باتوں سے نصائح حاصل کرنا چاہیے۔ اور عالم کو چاہیے کہ غلط راستوں سے حاکموں کو بچائے۔ اگر اُن کو حق کے راستے پر نہ لگائے گا۔ تو دُنیا کے تمام مظالم میں وہ برابر سا شریک ہوگا۔

نواں اصُول یہ ہے کہ حاکموں کو اپنے قائم مقاموں اور ماتحتوں کو بھی ہدایت کرنا چاہیے تاکہ وہ لوگ ظلم نہ کریں، ورنہ اس کا مظلمہ اس کی گردن پر ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے حضرت موسیٰ اشعری کو جو گورنر تھے، ایک حکم بھیجا کہ نیک رعایا حاکموں کی نیکی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بدبخت حاکموں کی رعایا بھی بدبخت ہوتی ہے۔ لوگوں سے زیادہ خندہ پیشانی سے کام نہ لیا۔ ورنہ تمھارے ماتحت بھی ایسا ہی کریں گے۔

توریت میں آیا ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے ماتحت سے کوئی ظلم ہو اور وہ خاموش رہے۔ تو گویا کہ وہ ظلم خود اس نے کیا ہے۔ اس سے زیادہ بدبخت کوئی حاکم نہیں، جو دُنیا کے عوض اپنے دین کو بھلا دے۔ محکوم سب کے سب ہی اپنے تمام بُرے کرداروں کو اچھے الفاظ میں بادشاہ کے سامنے پیش کرتے ہیں، تاکہ ان کی ترقی ہوسکے۔

غرض کہ جو بادشاہ یا حاکم اپنے خاندان والوں کو عادل نہ بنا سکے۔ وہ خود بھی عدل کے لائق نہ ہوگا۔ اوّل آدمی کو اپنے جسم میں عدل کرنا ضروری ہے۔ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کو دباتا ہے اور دین کی اطاعت میں ان کا جھکانا ہے۔

اکثر لوگ اپنی عقل اور دین پر غصّے کو غالب کر لیتے ہیں، اور خواہشاتِ غضبانی کو بدلے کے عوض حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ عقل وہ جوہر ہے جو ملائکہ سے حاصل کیا گیا ہے اور غصّہ شیطان کی نشانی ہے۔ تو گویا کہ جو آدمی غصّہ کو عقل پر غالب کرے گا، اس نے خدائی پر شیطان کو مسلط کر لیا۔ (معاذ اللہ)

اوّل آدمی کو اپنے اندر عدل کا جوہر پیدا کرنا ہے۔ اس کے بعد اپنے اہل وعیال پر۔ پھر خاص خاص لوگوں پر، اور آخر میں عوام پر۔ ورنہ عدل نہ ہوگا۔ اس لیے عدل کا تعلق عقل سے ہے، اور عقل کا کمال یہ ہے کہ دُنیا کی ہر چیز صحیح نظریے کے ماتحت دیکھے۔ صرف ظاہری حالات کا جائزہ نہ لے، اور اگر ظاہری حالات پر ہی حکم لگائے گا، تو وہ حیوانوں کی طرح رہتا ہے اور کھاتا پیتا ہے۔ مثلاً اگر اچھے لباس کا شوق ہے تو یہ

عورتوں کی عادات اس میں ہیں۔ اگر دشمنوں پر غصہ کرتا ہے تو یہ درندگی ہے۔ اور اگر دوسروں سے اطاعت اور خوشامد کا طالب ہے تو جاہل ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ خواہش صرف اپنے نفس کی ہوتی ہے اور پیٹ کی۔ اگر ایک دن مزدوری نہ دے گا تو پھر قریب نہ آئیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سب لوگ صرف اپنی خواہشات کے لیے اس کی خدمت کرتے ہیں۔ اور یہ ایک جال ہے، جو وہ خود بچھائے ہوئے ہیں اور تجھ سے اپنی بھی خدمت لے رہے ہیں۔

اگر وہ لوگ کسی وقت سُن لیں کہ تیری جگہ کوئی دوسرا حاکم آرہا ہے، تو وہ تجھ سے مخالفت کرنے لگیں گے۔ اور اِس سے خواہشِ قرابت اس کی خدمت کرتے ہیں۔ یہ دراصل خدمت نہیں ہے، بلکہ مذاق ہے عقلمند وہ آدمی ہے، جو ہر بات کی حقیقت پر غور کرے۔ اور اگر عقل نہیں تو عدل ناممکن ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایسے آدمیوں کا حال دوزخیوں کا سا ہے۔ اس لیے کہ دُنیا کی ہر چیز کا مخزن عقل ہے۔

دسواں اصول یہ ہے کہ حاکم پر غرور و تکبّر کا غلبہ نہ ہو، کیونکہ غرور کی وجہ سے غضباتی قوّت زیادہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس کو بدلہ لینے پر آمادہ کرتی ہے۔

غصہ عقل کے بالکل مخالف چیز ہے۔ اِس کا ذکر تفصیل کے ساتھ رکن ملکات میں کر دیا ہے۔

(غصّے کی خرابیاں) بردباری کو اپنا شعار بنا لینا چاہیے، چاہے کسی نے گناہ ہی کیا ہو، مگر عفو اور رحم کرنے والا انبیاء علیہم السّلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عادات میں داخل ہے، اور اگر غصّے کو عادت بنایا تو یہ ترکوں اور تمردوں اور درندوں کی عادات کے مطابق ہوگا۔

ابو جعفر خلیفہ نے ایک قاتل کے قتل کا حکم دیا۔ مُبارک بن فضالہ وہاں موجود تھے، اُنھوں نے کہا کہ اے خلیفہ! اوّل حدیث رسُول سُن لے! کہ قیامت کے دن مُنادی ندا کرے گا کہ جس میں اُٹھنے کی طاقت ہو وہ کھڑا ہو۔ چنانچہ جن لوگوں میں رحم اور عفو کا مادہ ہوگا، وہ کھڑے ہوں گے۔ خلیفہ نے کہا کہ اس کو رہا کر دیا جائے۔

زیادہ تر بادشاہوں کو غصّہ رعایا پر صرف لوگوں کے بھڑکانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے ماتحتوں کے بھڑکانے کے وقت یہ بات حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی آدمی سچّی بات تجھ سے آ کر کہے تو اُس کا شکریہ ادا کر! اور اگر جھوٹ بولے، تو زیادہ شکر گذار ہو کہ اس نے تیری نیکی کو بغیر تیری محنت کے بڑھا دیا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے ایک آدمی کی تعریف کی کہ وہ بہت بہادر اور جوانمرد ہے، تو فرمایا کہ وہ ہر ایک کو کشتی میں پچھاڑ دیتا ہے۔ حضُور نے فرمایا کہ درحقیقت بہادر وہ آدمی ہے کہ اپنے غصّے پر قابو پالے نہ کہ آدمیوں پر جو آدمی تین چیزوں کو مسخّر کرلے، وہ مومن کامل ہے۔ اوّل یہ کہ غصّے میں کسی غلط عمل کا اعادہ

نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ خوشی کے وقت خدا کو نہ بھولے۔ تیسرے جب مالک بنے تو اپنے حق کے مطابق حصّہ لے۔

تمثیل: حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے فرمایا کہ آدمی کی عادات اس کے غصّہ کے وقت معلوم ہوتی ہیں۔ نہ کسی کے دین کا اندازہ ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس کو آزما نہ لیا جائے۔

(تمثیلات فرزند آنحضرتؐ) امام زین العابدین ابنِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک مرتبہ مسجد تشریف لے جا رہے تھے۔ ایک شخص نے آپ کی شان میں گستاخی کی، تو ساتھیوں نے اس کو سزا دینا چاہی۔ اُن کو روک دیا، اور فرمایا کہ تیرے کہنے سے زیادہ مجھ میں بُرائیاں ہیں۔ اگر تیری کوئی حاجت ہو، تو پوری کر سکوں، اور اپنی قبا اُتار کر اس کو دے دی۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ وہ زور زور سے چلاتا چلا جاتا تھا، کہ میں گواہی دیتا ہوں، کہ یہ ہی فرزند پیغمبر ہیں۔

ایک بار آپ نے اپنے نوکر کو آواز دی، وہ نہ بولا۔ دوبارہ پھر پکارا، پھر نہ بولا۔ تو فرمایا کہ تو نے سُنا نہیں نوکر نے کہا کہ حضُور! میں نے سُنا، لیکن میں جانتا تھا کہ جواب نہ بھی دوں گا تو حضور سزا نہ دیں گے۔ آپ بہت مسرور ہوئے کہ میرے غلام مجھ سے بہت خوش اور بے خوف ہیں۔

ایک بار آپ کے غلام نے بکری کی ایک ٹانگ توڑ دی، تو آپ نے فرمایا کہ اد بے قصداً ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کی، تاکہ آپ کو غصّہ آئے، تو آپ نے فرمایا کہ میں غصّہ نہ کروں گا، بلکہ اب تو اس کا تابع رہے گا جس نے مجھ سے یہ حرکت کرائی ہے (شیطان نے) یہ فرما کر اس کو آزاد کر دیا۔

ایک شخص نے آپ کو بُرا کہا، اس سے فرمایا کہ میرے اور دوزخ کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ اگر اس خلیج کو میں بھی عبُور کر لوں تو مجھے بھی کسی کا ڈر نہ ہوگا، ورنہ تو جو کچھ کہتا ہے وہ سب صحیح ہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ بعض آدمی عفو گناہ کر کے عابد و زاہد کہلاتے ہیں، اور بعض جبّار اور دوزخ میں ایک دروازہ ایسا ہوگا جس سے صرف غصّے ور لوگ ہی داخل کئے جائیں گے۔

جناب موسیٰ علیہ السّلام سے ابلیس نے درخواست کی کہ آپ مجھ سے بچنے کے لیے ہر وقت مدد خدا سے طلب فرمائیں۔ جلد بازی سے پرہیز کرنا۔ اس لیے کہ جلد باز آدمی کو میں گیند بنا کر چاروں طرف گھماتا ہوں۔ دوسرے عورتوں سے پرہیز کرنا۔ اس لیے کہ اس سے بہتر کوئی جال مجھے آج تک نہیں ملا۔ تیسرے بخل سے پرہیز کیجئے! کیونکہ بخیل کی دین و دُنیا دونوں میرے قبضے میں رہتی ہے۔

(تمثیل آنحضرتؐ) ایک آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ کوئی ہدایت ایسی فرمائیں کہ میں جنّت میں جاؤں، تو فرمایا کہ غصّہ کی عادت کو چھوڑ دے۔ اس نے عرض کی اور کچھ تعلیم فرمائیں، تو حکم ہوا کہ کسی سے کوئی چیز نہ مانگ! پھر اس نے عرض کی کہ کچھ اور ہدایت کی جائے تو حکم ہوا کہ بعد نماز عصر ستر بار استغفا

پڑھا کر جنت میں جائے گا ۔ اس نے کہا میں نے اتنے گناہ نہیں کیے ، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تیرے بدلے تیرے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے گناہ بخشے جائیں گے ۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کو مال تقسیم کر رہے تھے ، ایک شخص نے کہا کہ یہ تقسیم "معاذاللہ" اچھی نہیں ۔ حضورؐ کو غصہ آیا ، اور فرمایا کہ خدا میرے بھائی موسیٰ پر رحم کرے ، لوگوں نے اس سے بھی زیادہ تکالیف اُن کو پہنچائی ہیں ۔

مندرجہ بالا تمثیلات اور نصائح بادشاہوں ، حاکموں اور اعمال کے لیے کافی ہیں ۔ اگر وہ واقعی مسلمان ہیں ، اور اگر اب بھی کوئی اثر نہ ہو ، تو ایمان کی اس شخص میں کمی ہے ۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا مسلمان حاکم ہوگا جو رشوت کھائے اور قیامت تک وہ رشوت کا روپیہ اس کے اعمال میں لکھا رہے ۔ پھر جب وہاں پہنچے تو اس سے لیا جائے ۔ حالانکہ اس روپیہ سے فائدہ دوسروں نے اُٹھایا ، اور وہ خواہ مخواہ ماخوذ ہوا ایسا شخص مسلمان ہی نہیں واللہ اعلم بالصواب ۔

نصف اوّل ختم شُد ٭

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چوتھا حصہ

تیسرا رکن

وُہ خواہشات جو آدمی کے لیے ہلاکت کا سبب ہوتی ہیں

مہلکات کو دس اصول پر منقسم کیا گیا ہے۔

اصولِ اوّل : نفسانی خواہشات اور بدعادات سے حفاظت کے متعلق۔

اصولِ دوم : شہوت نفسانی اور شر انگیزی سے محفوظ رہنا۔

اصولِ سوم : بدزبانی سے جو اثرات مترتب ہوتے ہیں، اُن سے پرہیز کرنا۔

اصولِ چہارم : قوتِ غضباتی اور حسد سے محفوظ رہنے کا طریقہ۔

اصولِ پنجم : محبتِ دُنیا ہی تمام گناہوں کی بنیاد ہے۔ اس سے کس طرح پرہیز کیا جائے۔

اصولِ ششم : محبتِ مالِ دنیوی اور بخل و کنجوسی سے محفوظ رہنا۔

اصولِ ہفتم : جاہ و حشمت دُنیوی اور اس کی تکالیف سے کس طرح پرہیز کیا جائے۔

اصولِ ہشتم : عباداتِ خداوندی میں، ریاکاری اور ظاہر پرستی نفاق کا سبب ہے۔ اس سے بچنے کی تدابیر۔

اصولِ نہم : تکبّر و نخوت بدترین اعمال ہیں۔ عجز و انکساری بہترین عمل ہے۔

اصولِ دہم : غرور اور غفلت شعاری کے متعلق۔

مندرجہ بالا عادات ہی مہلکات کا باعث ہوتی ہیں۔ جس آدمی نے اُن سے نجات پائی، وہ پاک نفس کہلاتا ہے۔ اور اس کے بعد ہی اس کے دل میں حقائق و معرفتِ خداوندی کا جلوہ نظر آسکتا ہے۔

پہلا اصول

بابُ الخُلق والنفس

بداخلاقی اور نفسانی خواہشات

اس کے متعلق بتانے سے پہلے اچھی عادات پر ایک صریحی نظر ڈال دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد دونوں کا مقابلہ ہوسکتا ہے کہ اچھی عادات کس طرح پیدا ہوسکتی ہیں اور خواہشات نفسانی اور بداخلاقیاں کس طرح ختم

کی جا سکتی ہیں۔
ساتھ ہی ساتھ پرورش اولاد کا بہترین طریقہ بھی بتائیں گے کہ اولاد کو کس طرح باادب اُٹھایا جائے۔ اِن تفاصیل کے بعد اصل ریاضت کے متعلق اِنسان کس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

نیک اخلاق کا ثواب

ناظرین! ہمارے رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاق کی دُرستی کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (یعنی مجھے اخلاق اور محاسن کے لیے تم لوگوں میں بھیجا گیا ہے) آپ نے فرمایا کہ بہترین چیز جو میزانِ عدالت کے لیے ہو سکتی ہے وہ اچھی عادات ہیں۔

(واقعہ) ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ دین کی کیا تعریف ہے؟ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ نیک عادات اس نے متعدد بار داہنے بائیں آکر یہی سوال کیا، اور حضورؐ نے متواتر یہ ہی جواب دیا۔

حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ دُنیا میں بہترین عمل کیا ہو سکتا ہے۔ جواب میں فرمایا۔ "کردارِ حسنہ"۔

ایک شخص نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ کوئی نصیحت فرمایئے۔ تو فرمایا کہ ہر بدی کے بعد نیکی کرو۔ تاکہ بدی کو بھلا دو، اور نیکی یاد رہے۔ اس نے عرض کیا اور کیا ہو سکتا ہے، تو فرمایا کہ لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملو۔ خداوند عالم جس آدمی کو اخلاق حسنہ عنایت کرتا ہے وہ جنّت میں جاتا ہے۔

صحابہ نے حضور سے عرض کی کہ فلاں عورت دن کو روزہ رکھتی ہے اور راتوں کو نمازوں میں مشغول رہتی ہے لیکن اس کی عادات بُری ہیں۔ ہمسائے اس سے رنجیدہ رہتے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ اخلاقِ بد اس کے تمام اعمال کو اس طرح خراب کر رہے ہیں، جیسے سرکہ شہد کو خراب کرتا ہے۔ وہ جنّت میں داخل نہیں ہو سکتی۔

(دُعائے آنحضرتؐ) حضورؐ دُعا میں فرماتے کہ خداوندا، تُو نے میری صُورت اچھی بنائی ہے تو سیرت بھی اچھی عطا کر۔ تندرستی، نیک عادات اور عافیت عطا کر! لوگوں نے دریافت کیا، دنیا میں سب سے اچھی چیز کیا ہے؟ تو فرمایا کہ اخلاقِ حسنہ! گناہ اِس سے اس طرح تباہ ہوتا ہے، جیسے دُھوپ سے برف پگھلتی ہے۔

(اقوال بزرگانِ دین) حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے روایت ہے، کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی اُمّت کے آدمیوں کو سجدے میں پڑا پایا۔ اس لیے کہ اس کے اور خدا کے درمیان ایک حجاب حائل تھا، اور جب اُن میں اخلاق حسنہ آگئے، تو وہ حجاب اُٹھ گیا۔ اچھے اخلاق والا آدمی چاہے عبادت کم ہی کیوں نہ کرے وہ روزہ دار اور عابد کے درجات پر قابض ہوتا ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خُلق دنیا کے لیے نمونہ تھا۔

ایک دن کچھ عورتیں آپ کے سامنے کھیل رہی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو وہ سب بھاگ گئیں۔ تو فرمایا کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو، اور حضورؐ سے نہیں۔ تو اُن عورتوں نے جواب دیا کہ آپ آنحضرتؐ کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں۔ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے ابنِ خطاب! پروردگار کی قسم شیطان تیرے راستے کو بھی نہیں چلتا۔

حضرت فضیل کا مقولہ ہے کہ میں فاسق خوش خو کی صحبت کو عالمِ بدخو سے اچھا سمجھتا ہوں۔ ایک مرتبہ ابن مبارکؒ ایک بدطینت آدمی کے ساتھ جا رہے تھے۔ جب وہ الگ ہو گیا تو روئے۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی، تو کہا کہ اس کی بدطینتی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

ابن کتانیؒ کا مقولہ ہے کہ بہترین صوفی وہ ہے، جو اچھی عادت کا حامل ہو۔ یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ بدخلق آدمی کی تمام عبادات بیکار ہیں، اور نیک عادت والے آدمی کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

حقائقِ اخلاقِ حسنہ

اخلاق کے متعلق علمائے اسلام میں ہر ایک نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور اپنے مشاہدات و تجربات سے کام لیا ہے، لیکن مکمل طور پر کسی نے اس کا جائزہ نہیں لیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اخلاقِ حسنہ کشادہ روئی سے پیدا ہوتے ہیں۔ کسی کا مقولہ ہے کہ تکالیف کو برداشت کرنے سے کسی کا نظریہ یہ ہے کہ کسی کے ظلم کا بدلہ نہ لینا خوش خلقی کا باعث ہے۔ ہزاروں فتاوے اس قسم کے مختلف علماء کے ملتے ہیں۔ دراصل میرے خیال میں اخلاقِ حسنہ کی یہ تعریف نہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں، جن کو الگ الگ بیان کرنا خوش خلقی کے معیار کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے۔

(تخلیقِ انسانی) تخلیقِ انسان دو چیزوں سے کی گئی ہے۔ ایک صورت جسمیہ جس کو ہم دیکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جوہر جو بظاہر نظر نہیں آ سکتی۔ ان دونوں میں اچھائی اور برائی دونوں ہی چیزیں پائی جاتی ہیں۔

(قوائے انسانی) جس طرح اچھی صورت، حسن خلق کو کہا جاتا ہے، اسی طرح باطنی عادات کو اخلاقِ حسنہ سے مراد لیتے ہیں۔ اور جب تک آدمی کے کل اعضا خوبصورت نہ ہوں، وہ خوب صورت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح جب تمام عادات اچھی نہ ہوں، خوش اخلاق نہ کہلائے گا۔ وہ قوا، باطنی کہلاتی ہیں۔ اور وہ چار ہیں۔ قوتِ[۱] علم۔ قوتِ[۲] خشم (دشمنی) قوتِ شہوت[۳]۔ قوتِ[۴] عدل و انصاف۔

دانائی اور عقلمندی یہ ہے کہ انسان میں قوتِ علم سب سے افضلیت رکھتی ہو۔ وہ اچھائی برائی، نیکی اور بدی میں فرق بنا سکتی ہو۔ اگر آدمی کو یہ کمال حاصل ہے تو وہ حکمت کے راستے اختیار کر سکتا ہے، جو نیکیوں کی بنیاد ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔

قوتِ غضبانی کی خوبی یہ ہے کہ وہ شریعت اور عقلمندیوں کی محکوم ہو کر رہے۔ اور سرکشی نہ کرے۔
قوتِ شہوت کی اچھائی یہ ہے کہ عدل کی طاقت اور شریعت و عقل کے تابع رہے۔ دین و مذہب کی مطیع و فرماں روا ہے۔

(تمثیل) غصّہ ایک شکاری کُتّے کی طرح ہے اور شہوت گھوڑے کی مثل ہے، اور عقل ایک شہسوار کی مثل ہے۔ گھوڑے کی فطرت ہے کہ وہ کبھی کبھی ہٹ کرنے لگتا ہے۔ اور کبھی انتہائی فرماں بردار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا گھوڑا اور کتا جب تک فرماں برداری نہ کریں شکاری اپنے شکار میں کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ اپنے کی ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے

(قوا کا اعتدال) قوتِ عدل کے یہ معنی ہیں کہ ان دونوں قوتوں کو دین اور عقل کے ماتحت رکھے کبھی شہوت کو غصّے پر غالب کرے، اور جب شہوت غالب ہو تو غصّے کو غالب کرلے۔

جب چاروں قوا، اس طرح اعتدال پر آجائیں گی، تو حسن اخلاق سے آراستہ ہو جائے گا۔ اور اگر اس میں بعض مکمّل ہوں گے اور بعض نامکمل تو اس طرح خوئے نیک بھی نامکمّل رہے گی۔ اس لیے کہ ان میں جو قوت بُری زائد ہوگی، وہ افعالِ بد کی مرتکب ہوگی۔ اور ہر قوت کی افراط و تفریط بُری ہے۔ یعنی حد سے زیادہ بڑھ جائے یا کم ہو جائے۔ زیادتی سے اگر قوتِ علم انتہائی بڑھ جائے گی اور طبیعت بدی کی طرف راغب ہوگی، انتہائی بدیاں سرزد ہوں گی۔ اگر "تفریط" یعنی کمی ہوگی، تو بیوقوف ہو جائے گا۔ لہٰذا دونوں کے بین بین ہونا چاہیئے تاکہ بردباری، شجاعت، حلم اور نیک عادات پیدا ہو سکیں۔

(شجاعت) شجاعت سے عفو قصور اور دلیری و بردباری پیدا ہوتی ہے، اور اگر انتہائی شجاعت ہوگی، تو پہلوانی اور غرور پیدا ہو جائے گا۔

(شہوت) اگر آدمی بہادری کی وجہ سے اپنے کو خطرات میں ڈالتا ہے، تو یہ بھی بُرا ہے۔ اسی طرح اگر قوتِ شہوت افراط پر ہوگی تو حرص و طمع بڑھ جائے گی، جس سے حسد، بے مروتی اور نجاست پیدا ہوگی۔ اور اگر یہ قوت کم ہوگی تو سُستی اور نامردی پیدا ہو جائے گی۔

(عفت) لیکن اگر اعتدال پر ہوگی، تو یہ سب چیزیں درمیانی اور اوسط درجے پر ہوں گی۔ اسی کو عفّت کہتے ہیں، جس سے شرم و حیا، قناعت و صبر پیدا ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ ان چاروں قوا کے دو پہلو ہیں۔ افراط و تفریط، وہ دونوں بُرے ہیں۔ بلکہ ان کو اوسط درجے پر رکھنا ہی مناسب ہے، جو انتہائی مشکل ہے، اور وہ ہی میزان ہے۔ پس اس میزان اور پل صراط پر چلنا ہی دُشوار ہے، جو اس پر سے صحیح صحیح گزرے گا، وہ اپنے مسکن تک پہنچ سکے گا۔

خداوندِ عالم نے افراط و تفریط دونوں سے منع کیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ۔ وہ لوگ اِس خیال میں اچھے ہیں جو اخراجات دنیا میں افراط و تفریط نہیں کرتے۔ بلکہ بین بین چلتے ہیں۔ خداوندِ عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا ہے وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ (یعنی اے رسُول کہ نہ اِتنا دو کہ سب کچھ دے دو، اور نہ اِتنا کم کہ کچھ نہ دو)

افراط و تفریط کی (مثال) معلوم ہوا کہ نیک خوئی ہر کام میں اعتدال سے پیدا ہوتی ہے، جیسے خوبصورت وُہ آدمی ہے جس کے جسم کے تمام اعضا متناسب ہوں۔ اِنسان اس لحاظ سے چار گروہوں سے متعلق ہیں۔

پہلا گروہ وہ ہے، جس کو یہ صفاتِ حسنہ بدرجہ کمال حاصل ہوں۔ وہ لوگ اخلاقِ حسنہ کے مجسّمہ ہونگے۔ اور مخلوق کو اُن سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اور یہ مرتبہ ہمارے رسُول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں جناب یوسفؑ اپنے زمانے کے انتہائی حسین تھے۔ لیکن آنحضرتؐ خوش خوئی میں اُن سے کہیں زیادہ حُسین و جمیل تھے۔

دُوسرا گروہ وُہ ہے، جس میں چاروں صفاتِ بد بدرجہ اتم بھری ہوں، وُہ انتہائی بداخلاق ہوں گے۔ ایسے آدمی کو اپنے پاس قطعی نہ بٹھانا چاہیئے، کیونکہ وہ شیطان ہے اور اس کی صفت بدی ہے کہ اخلاقِ بد اس میں انتہائی درجے پر ہیں۔

تیسرا گروہ اِن دونوں کا درمیانی درجہ ہے، بلکہ وہ بہ نسبت بد خوئی کے نیک خوئی کی طرف زیادہ رجُوع ہوتا ہے۔

چوتھے وہ لوگ جو درمیان ہوں، مگر بدی کی طرف زیادہ ملتفت ہوں۔ جس طرح حسن و خوبصورتی کے کمال میں بہت اچھائیاں ہوتی ہیں۔ بُرائیاں کم ہوتی ہیں۔ اسی طرح نیک اخلاق کی صُورت ہے۔

(خوش اخلاقی کی بُنیاد) لہٰذا ہر آدمی کا فرض ہے کہ وہ اگر درجہ کمال کو نہ پہنچ سکے، تو اُس کے نزدیک تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اگر تمام اخلاق نیک ہوں تو زیادہ تر افعال اچھے اور خوش طبع ہوں۔

اخلاق نیک کا اعلیٰ معیار یہی ہے۔ اس کے ہزاروں طریقے ہیں اور تعریفیں ہیں، لیکن اصول صرف چار ہی ہیں، جو اوپر بیان کیے گئے۔ قوّتِ علم۔ قوّتِ غضب۔ قوّتِ شہوت اور قوّتِ عدل۔ باقی سب چیزیں اس کے فروع ہیں۔

اخلاقِ حسنہ کے حصول کے طریقے

بعض علماء کا خیال ہے کہ آدمی جس طرح اپنی شکل وصورت کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اس کے اخلاقِ بد یا نیک تبدیل نہیں ہو سکتے۔ ان کے خیال میں اخلاق کا تغیر و تبدل ناممکن ہے۔

مگر یہ لوگ صحیح نہیں کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حَسِّنُوْا اَخْلَاقَکُمْ (یعنی نیک اخلاق بنو) لہٰذا ریاضت اور نصیحت رائیگاں نہیں جاسکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جانوروں تک پر نصائح اور تادیب کے اثرات ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ درندے بھی سدھائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تادیب دو قسم کی ہوسکتی ہے۔

ایک وہ عمل کہ جو انسان کے بس کا ہی نہیں۔ مثلاً چھوارہ بوکر آدمی سیب اُگانا چاہے تو ناممکن ہے۔ اسی طرح انسان کی طبائع سے قوار شہوت و غضب کو یک دم نکال دینا ناممکن ہے۔ لیکن وہ محنت و تادیب کے بعد حدِ اعتدال پر ضرور آسکتے ہیں، اور بعض اس مثال پر بھی پورے نہیں اُترتے۔ اس کی دو وجوہ ہوتی ہیں وہ آدمی یا تو عادتاً اتنا مغلوب الغضب ہوگیا ہوگا۔ کہ اب اس کی خرقِ عادت غصہ ہوگیا یا اس کی فطرت میں ہی گرمی زیادہ ہو۔

عموماً دنیا والے چار درجات کے ماتحت ہیں۔

پہلا یہ کہ آدمی نیک و بد کی تمیز ہی نہ کرسکتا ہو۔ اُسے اچھا بُرا کچھ معلوم ہی نہ ہو، تو ایسا آدمی سیکھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کو تعلیم و تربیت دینا ضروری ہوتا ہے، جس طرح بچوں کو ان کے ماں باپ تعلیم دیتے ہیں، اور انھیں پر یہ تعلیم واجب ہوتی ہے۔ خداوندِ عالم کا حکم ہے قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا۔ (یعنی اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ)

دُوسرا مرتبہ یہ ہے کہ آدمی شہوت اور غضب کا عادی ہوگیا ہو، لیکن اس کے اعتقادات ابھی اس طرف راسخ نہ ہو پائے ہوں۔ مگر شہوت و غضب کُوٹ کُوٹ کر اس میں بھر گئے ہوں، تو ایسے آدمی کا سدھارنا انتہائی مشکل ہے۔ اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اوّل اس کی عاداتِ بد کو چھڑایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ نیکیوں کی طرف اس کو رجُوع کرتے ہیں۔ اگر اسی درمیان میں خود اس کا رجحان اصلاح کی طرف آگیا، تو جلدی ہی نیک عادات کو اختیار کرلے گا۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ آدمی بدی اور شہوت و غضب کو دوست اور اچھا جانتا ہے، مگر وہ بُرائیوں اور اچھائیوں کی تمیز نہ کرسکتا ہو۔ اور وہ سب بدیاں اس کے خیال میں بھلائی ہی ہوں۔ ایسے آدمی کی بہت مشکل سے اِصلاح ہوسکتی ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ آدمی گناہ کرے اور یہ سب جانتے ہوئے کرے کہ گناہ کر رہا ہوں اور اس پر اکڑے

جس طرح عموماً بدمعاش لوگ اپنی چوریوں اور مار پیٹ کے قصّے سُناتے ہیں یا اتنی شراب پی ہے۔ ایسا آدمی سوائے خدا کی امداد کے کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا۔

عاداتِ بد کو کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟

اگر آدمی خود چاہتا ہے کہ بدی کو چھوڑ دے، تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ اس کا نفس جس بات کے کرنے کو اس سے کہے! وہ اس کے خلاف کرے۔ کیونکہ ہر چیز کو اس کے مخالف اشیاء ہی رد کر سکتی ہیں۔ جس طرح گرمی کی بیماری سرد دواؤں سے رفع ہوتی ہیں۔

لہٰذا غصّے کو دفع کرنے کے لیے بردباری کی ضرورت ہے۔ اِسی طرح غرور کا عِلاج اِنکساری اور عجز ہے۔

اب یُوں سمجھا جائے کہ

غُصّے کو بردباری سے دُور کیا جائے۔

تکبّر کو اِنکساری سے

بُخل کو سخاوت سے

شہوت کو صبر و قناعت سے

جو آدمی نیک خواہشات چاہتا ہے، وہ نیک کام کرتا ہے۔ شریعتِ اسلام کے نیک امور کا راز یہی ہے کہ دل کی نیک عادات کی طرف ملتفت کیا جائے۔ بُرے کاموں کو نفرت سے دیکھا جائے۔ یہ عادات رفتہ رفتہ فطرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس بات کو آسانی سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک بچّہ اوّل اوّل پڑھنے سے جی چراتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ تعلیم کا اس کو شوق پیدا ہوتا ہے، اور اسی طرح جو لوگ بُری عادتوں مثلاً جوا۔ شطرنج اور شراب خوری میں مشغول رہتے ہیں، وہ اسی کے عادی ہو جاتے ہیں۔

وہ دونوں صفات حال اپنی اپنی جگہ سخت ہوتے جاتے ہیں۔ اور چور باوجود کوڑوں کے بھی پھر چوری کرتا ہے، اور طالب علم بغیر کتاب کا مطالعہ کیے بیٹھ نہیں سکتا۔ اور ہر آدمی اپنے اوپر فخر کرتا ہے کہ میں ایسا ہوں۔ یہاں تک کہ ہیجڑے بھی اپنے اوپر فخر کرتے اور اکڑتے ہیں۔ یہ سب عادات پر منحصر ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں تک ہوتا ہے کہ خلافِ مزاج چیزیں بھی مزاج کے مُطابق ہو جاتی ہیں۔

خداوند عالم کی معرفت اور اطاعت یا قوت غضب و شہوت یہ سب کچھ طبیعت اور عادت پر منحصر ہیں جیسے فرشتے کی اُن کی فطرت صرف عبادت۔ معرفت اور اطاعت ہے۔ اِسی طرح اِنسان بھی، کہ وہ خلافِ اصُول کام کرتا ہے۔ دراصل اس کو یہ بیماری ہوتی ہے کہ خلافِ طبیعت کاموں میں لُطف آنے لگتا ہے۔ وہ آدمی

بیمار ہے، جو شریعتِ اسلام کے خلاف کام کرے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ اور فرمایا اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔ جس طرح جسم بیماری سے ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح روح بھی بیماری سے ہلاک ہو جاتی ہے، اور جسم کا بیمار جب تک حکیم کے بتائے ہوئے پرہیز کو نہیں کرتا، اس وقت تک صحت یاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح دل اور روح کا بیمار بھی نفس کی خواہشات کے خلاف کرنے کے سوائے اچھا نہیں ہوتا۔ وہ طبیبِ روحانی حاکمِ شریعت ہے۔ معلوم ہوا کہ جسم ظاہری اور روح باطنی دونوں کے علاج کا راستہ ایک ہی ہے۔

جیسے سردی کے لیے گرمی اور گرمی کے لیے سردی موافق نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب آدمی پر تکبر غالب ہو تو عاجزی و انکساری کرے اور اگر عاجزی و انکساری ذلت کے درجات تک گر گئی ہے، تو رکھ رکھاؤ اور ساکھ سے اچھا ہو سکتا ہے۔

اخلاقِ حسنہ کے اسباب

اچھی عادات کے تین سبب ہیں :

۱۔ فطری طور پر انسان خوش اخلاق ہو۔ یہ خدا کی دین ہے کہ وہ بعض لوگوں کو یہ جوہر عطا فرما دیتا ہے۔

۲۔ آدمی اپنے کو تکلیف اور جبر کر کے نیک کام کرے، اور خوش اخلاقی کی عادت ڈالے۔

۳۔ یہ کہ خوش اخلاق لوگوں کی صحبت اختیار کرے، تاکہ اس میں وہ صفات پیدا ہونے لگیں۔

جس آدمی کے ساتھ یہ تین سبب ہوں گے، وہ نیک ہوگا، اور درجۂ سعادت کے اعلیٰ منازل پر گامزن ہے، اور اگر کوئی آدمی ان تینوں درجات سے محروم ہے، تو وہ شقی اور ظالم ہے۔ اشقیاء کی صفات میں اور بھی درجات داخل ہیں، جو بعض لوگوں میں بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، اور بعض میں نہیں۔ لہٰذا ہر آدمی بقدرِ مدارج گنہگار ہے۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

تفصیلات

(تفصیلات) بحث : اگرچہ انسان کے اعمال اعضائے ظاہری سے متعلق ہیں، لیکن ان کا اصلی تعلق دل سے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دل ہی بارگاہِ خداوندی کی طرف مراجعت کرے گا، لہٰذا اس کو حقائق و معارف سے مرصع ہونا ضروری ہے، تاکہ بہشت کے مقابلے میں ہر حیثیت سے بلند و ارفع ہو۔ اگرچہ ظاہری حالات میں اعضائے ظاہری جسم کا سب سے بڑا حصہ ہیں۔ لیکن دونوں کے الگ الگ درجات ہیں۔ دل کا تعلق عالمِ ارواح سے ہے۔ اور جسم کا تعلق عالمِ ظاہر سے۔ مگر جو اعمال ہم یہاں کرتے ہیں، ان سب کا مرجع دل ہی ہے۔ لہٰذا ہر فعل سے دل کا تعلق نیکیوں کا ہے، اور جسم سے سختی و محنت کا اور جسم کو یہاں اسی محنت کے لیے

بھیجا گیا ہے۔

(درجہ اعتدال) تمثیل: اسی طرح اگر کوئی آدمی کتابت سیکھے، تو انگلیوں کی نشست اور رفتار کو پہلے تکلیف کے ساتھ سیکھے اور رفتہ رفتہ بہترین نقوش اس کے ذہن میں سما جائیں اور جب وہ دل پر گہرے اثرات ہو جائیں گے تو پھر وہ انگلیوں کو اپنے اشاروں پر چلائے گا۔ بس نیک افعال کا مرجع دل ہے۔ اول محنت کر کے دنیا میں افعال نیک کی عادت ڈالو، بعد میں دل خود ہدایت کرتا رہے گا، جو کام غفلت میں کیا جائے گا اور تن دہی اور ہوشمندی اس میں شامل نہ ہو گی وہ ہمیشہ غلط اور خراب ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دل اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

(تمثیل) ثبوت: جو بیماری سردی سے ہوتی ہے، اس میں گرم چیزوں کا بہ کثرت استعمال نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ گرم چیزوں کے بُرے اثرات کا بھی اندیشہ رہتا ہے، بلکہ اس کے لیے طبیب کی تجویز ایک میزان کی طرح ہے، اور مزاج کو سمجھ کر وہ بقدر اس کی احتیاج کے استعمال کراتا ہے۔

لہٰذا جب مزاج معتدل ہو جائے گا، تو طبیب علاج کرنا چھوڑ دے گا۔

اسی طرح اخلاقِ حسنہ و اخلاقِ شنیعہ اور درمیانی درجہ ان دونوں کا معتدل ہے۔ اگر بخیل کو سخی بنانا چاہیں اتنا کہ وہ مصرف ہو جائے، یہ بھی زیادہ ہو گا۔ اور اگر سخی کو ہاتھ کھینچنے کی اتنی تلقین کریں کہ وہ کنجوس ہو جائے یہ دونوں افراط و تفریط میں داخل ہیں، اس کا بہترین درجۂ اعتدال ہے۔ اگر آدمی میں ان نصائح کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے، تو سمجھ لیجیے کہ وہ میزانِ عدالت میں پورا اترا۔ ورنہ ابھی کوئی کمی باقی ہے۔ اس کے بعد اس کو پھر باہستگی اس راستے پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اور یہ تکلف اور تکلیف ہی اس کے لیے رہبری کریں گے۔

(حکم آنحضرتؐ) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ خداوندِ عالم کے احکامات پر بخوشی عمل کرو۔ ورنہ اس میں تکلیف برداشت کرو۔ کیوں کہ اس میں تکلیف اٹھانا ہی باعثِ برکت ہے۔

تکلف کے ساتھ سخاوت کرنا اور بخل کرنا دونوں افراط و تفریط میں داخل ہیں، بلکہ احکاماتِ شرعیہ کے ماتحت چلنا اعتدال ہے۔ جب شریعت پر عمل کرے گا، دنیا کے تنازعات ختم ہو جائیں گے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ (یعنی اے رسول اگر لوگ تم کو اپنا حاکم بنائیں گے اور ان کے دلوں میں کسی قسم کی تنگی نہ ہو گی اُس وقت وہ مومن ہو سکتے ہیں) اس میں ایک راز ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں اس پر مفصل بحث نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی مختصراً لکھا جائے۔

(نیکی اور سعادت کی اصل) انسان کو سعادت اس وقت حاصل ہوتی جب وہ فرشتوں کی صفات اختیار کرلے کیوں کہ وہ انھیں کا حصتہ ہے۔ دنیا میں چند دن کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس کا اصل معدن وہ ہی عالمِ ملکوتی ہے۔ اگر کوئی اجنبی اجناس اس کے ساتھ وہاں جائیں گی تو ان کی صحبت کے قابل نہ رہے گا۔ لہٰذا اُن کے پاس اُن جیسا ہو کر جائے۔

(تمثیلِ دُنیا داری) یہاں کنجوس آدمی مال جمع کر رہا ہے۔ خرّاچ آدمی زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ متکبّر اور لالچی انسان دوسروں کو اپنے آگے جُھکنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ لیکن فرشتگان و مقرّبین ان تمام اعمال سے مبرّا ہیں۔ اُن کو صرف عبادت سے غرض اور مطلب ہے۔ لہٰذا ہم کو بھی انھیں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ اور دُنیا کے جھگڑوں سے کوئی مطلب نہ رہے۔

اور ان تمام جھگڑوں اور دُنیا داری سے اگر الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں، تو اعتدال کی صورتیں اختیار کرے، تاکہ افراط و تفریط دونوں سے بچکر اپنی محافظت کر سکے۔ وسط اور اعتدال سے دونوں کے کام بنتے ہیں۔ دل کو خدا کی طرف لگائے رکھے۔ اور اعضاء کو بہ تکلیف دُنیا کے ساتھ۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری پیدائش اور ہمارے تمام افعال خدا کی طرف ہونا چاہییں۔ اسی کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں۔ سوائے اس کے اور ہمارے دل میں کوئی تمنّا نہ ہو۔ اور یہ ہی اخلاقِ حسنہ کہلاتے ہیں۔

ریاضت

(ریاضت) دُنیا میں سب سے مشکل کام ریاضت ہے، جہاں ہر آدمی ڈگمگا جاتا ہے، لیکن اگر آدمی خود حکیم کی حیثیت قائم کرے تو سب کام آسان ہو سکتے ہیں۔

وہ پہلے ہی سے ایسی مشکل دواؤں کا استعمال نہ کراوے کہ مریض کے لیے مشکل پڑ جائے، بلکہ رفتہ رفتہ اس کے مزاج کو اس پرہیز اور دوا کی طرف لائے۔

جس طرح ایک لڑکے کو اسکول جانے کے لیے اگر پہلے تنبیہہ کی جائے گی، تو وہ ہرگز نہ جائے گا، بلکہ اوّل اُس کو لالچ دیا جائے، اور وہ بھی بتدریج مثلاً پہلے اسے کھیل کود کی چیزیں دیں۔ پھر اچھے کپڑے پہنائیں اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اس کو بہترین ریشمی کپڑوں کی طرف سے متنفر کرنے کی کوشش کریں اور بڑا ہونے پر دُنیا داری کو اس کے دل سے نکالنے کی کوشش کریں، کہ یہ دُنیا چند روزہ عالمِ حقیقت میں دنیا سے کوئی چیز ساتھ جانے والی نہیں ہے۔ اور اگر اس پر ایک دم اس فلسفے کا بوجھ لاد دیا جائے گا تو وہ ہرگز قبول نہ کرے گا۔

اور اگر کوئی آدمی ابتدا میں ظاہری عبادت کرتا ہے تو بھی کرنے دے تاکہ اس کو عبادت کی عادات پڑیں

اور ایک وقت میں وہ خرق عادت بن جائے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے سانپ اور بچھو کہ وہ ریاکاری اور ظاہرداری کو نگل جاتے ہیں اور صداقت و سچائی باقی رہ جاتی ہے اور انسان آمیزش دنیا سے پاک ہو درگاہ ایزدی کے قابل ہو جاتا ہے۔

خواہشات نفسانی اور نواقص کی شناخت

نفس اور دل کے عیوب کو پہچان کر ان کی اصلاح

آدمی کو جس غرض سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اگر بجنسہٖ اس غرض و غایت سے یہاں چلتا رہے گا، تو ٹھیک ہے۔ مثلاً آنکھ دیکھنے کے لیے اور پیر چلنے کے لیے۔ اسی طرح دوسرے اعضا و جوارح۔

اس کے بعد دل کا نمبر آتا ہے کہ اس کو صرف عبادت الٰہی کے لیے پیدا کیا ہے، وہ اپنے حقائق کو پہچان کر اسی راستے پر گامزن ہو، یہ مانوسیت دو باتوں سے حاصل ہوتی ہے۔

پہلے ارادہ ہونا چاہیے۔ دوسرے قدرت و طاقت۔

ارادہ یہ کہ سوائے خداوند عالم کے اور کسی چیز سے محبت نہ رکھے۔ کیونکہ دل کی غذا محبت خدا ہے۔ جیسے جسم کے لیے دوسری غذاؤں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دل "محبت خدا" سے زندہ و آباد رہتا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ دنیا میں جو کچھ تمہارے پاس ہے، ماں، باپ، بہن، بھائی، مال اور اسباب۔ اور ان سب چیزوں کو اس کی راہ میں یا اس کے پیغمبروں کے حکم پر صرف کرنے اور جہاد کرنے سے زیادہ عزیز رکھتے ہو۔ تو ذرا اس کے حکم کا انتظار کرو، تاکہ اس کا حکم آئے اور تم دیکھ لو۔

قدرت یہ ہے کہ خدا کی محبت آدمی کے دل میں سرایت کر گئی ہو، اور اب اس کو ریاضت نفس کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ اس سے محفوظ ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ میری دونوں آنکھوں کی روشنی نماز سے ہے۔

اپنے عیوب کو پہچاننا ہی جزو ایمان ہے

پس جو آدمی اپنے میں یہ صفت نہ دیکھے وہ ناقص اور بیمار ہے۔ اس کو اپنے دل کے نقائص دور کرنا چاہئیں، ہو سکتا ہے کہ آدمی اپنی یہ کمزوریاں خود نہ پہچانتا ہو۔ عیوب کو پہچاننے کے چار طریقے ہیں۔

پہلے یہ کہ کسی مرشد یا پیر بزرگ کی صحبت حاصل کرے، اور اس کے اعمال سے اپنے عیوب کو سمجھ سکے۔ لیکن یہ کام بہت مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ کسی ایسے شخص کو اپنا دوست بنائے کہ اس کے منہ پر اس کے عیوب بتاتا رہے۔ اس کو اس کی نہ خوشامد ہو اور نہ حسد کرتا ہو۔ یہ بات بھی فی زمانہ بہت کم پائی جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ دشمن جو تمہارے متعلق کہے، اس کو ٹھنڈے دل سے سنو۔ عام طور پر دشمن عیوب تلاش کرتا

ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی صحیح عیب تم کو نظر آئے۔

چوتھے یہ کہ دوسروں کے عیوب اور برائیوں کو دیکھ کر اور سمجھ کر اپنے میں غور کرے۔ اور وہ برائیاں اگر پائے تو دُور کرنے کی کوشش کرے۔ حضرت عیسیٰؑ سے اُن کی اُمت کے لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ خوبیاں آپ کو کس نے سکھائیں؟ تو فرمایا کہ دوسروں کی برائیوں سے سیکھی ہیں۔ اپنے کو نیک سمجھنے والا آدمی سب سے زیادہ بیوقوف ہوتا ہے، جو آدمی اپنے آپ کو گنہگار تصور کرتا ہے، وہ عقلمند۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، کہ حضورؐ نے منافقوں کی پہچان تم کو بتائی ہے۔ تم اُن میں سے مجھ میں پاتے ہو؟

عیوب کی اِصلاح کیسے ہوسکتی ہے؟

اسی طرح ہر آدمی کو اپنے عیوب دیکھنا چاہئیں۔ بغیر اس کے وہ اپنی اِصلاح نہیں کرسکتا۔ عیوب کی اِصلاح کی بنیاد مخالفت خواہشات ہے۔ خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔

ایک بار جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد سے واپس آئے تو فرمایا کہ اب ہم بڑے جہاد کی طرف آئے ہیں۔ صحابہ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ جہادِ نفس سب سے بڑا جہاد ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اپنی تکالیف کو نفس کے قریب نہ آنے دو۔ اس کی خواہشات کو روکو۔ کیونکہ یہ ہی تمہارا دشمن ہے اور قیامت کے دن تم پر لعنت کرے گا، اور یہاں تک کہ تمام اعضائے جسم بھی ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔

حضرت ابراہیم خواص کا واقعہ ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار کوہِ بکالہ کی طرف جارہا تھا۔ راستے میں سے ایک انار توڑ کر کھایا، تو وہ کھٹا تھا۔ میں نے اس کو پھینک دیا۔ آگے بڑھا تو ایک آدمی کو دیکھا کہ زمین پر پڑا ہے اور اس پر بھڑیں لپٹی ہوئی کاٹ رہی ہیں۔ میں نے سلام کیا، اُنھوں نے جوابِ سلام دیا۔ میں نے عرض کی۔ آپ نے مجھے کیسے پہچانا، تو فرمایا کہ خدا کی معرفت کے بعد ہر چیز آسان ہوتی ہے۔ میں نے کہا، کہ آپ اِتنے مرتبے کے حامل ہیں اور زنبور کو الگ کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب دیا کہ اسی طرح، جس طرح تم نے انار کو بغیر اجازت کھایا، اور اس کی خواہش کو پورا کیا۔ اِس انار کی خواہش کا زخم آخرت کے لیے رہے گا۔ مگر ان بھڑوں کے زخم یہاں ختم ہوجائیں گے۔

اس کی مثال اس لیے دی گئی کہ اگرچہ انار حلال ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ اس کی خواہش کی جائے تو دُرست نہ ہوگی، اور اہلِ احتیاط اس سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ حرام اشیاء کی طرف بھی دل راغب نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے فرمایا کہ میں نے ستّر حلال اشیاء اس لیے استعمال نہ کیں کہ ان کی خواہش سے حرام چیزوں کی خواہش میں اضافہ نہ ہوجائے۔ دوسرے دنیا میں جب آدمی حلال روزی کے کھانے کا زیادہ

عادی ہوتا ہے، تو اُس کو اس میں زیادہ لُطف آنے لگتا ہے۔ اور نتیجے میں وہ دُنیا کی نعمتوں میں پھنس کر عیش و نشاط میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور موت سے بھلا دینے لگتا ہے غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد عبادات خُدا میں بھی لذت نہیں ملتی۔ اور ان مباح چیزوں کو بھی چھوڑنا گوارہ نہیں کرتا۔

لیکن اگر حلال چیزوں سے پرہیز کرنے لگے، تو دُنیا کی نعمتوں کی پروا نہیں کرتا، اور آخرت کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ رنج و تکلیف میں اس کی ایک تسبیح خوشی کی سو تسبیح کے برابر ہے۔

مثلاً "باز" جب پالتے ہیں تو اس کی آنکھوں کو بند کر دیتے ہیں۔ یا سی دیتے ہیں، تاکہ گھر کی چیزوں کا عادی نہ ہو جائے، اور گوشت کھلاتے ہیں تاکہ مالک کی محبت پیدا ہو اور اس کا تابعدار ہو جائے۔

اسی طرح نفسِ انسان بھی محبت و اطاعتِ خدا کو روکتا ہے۔ جب تک اس کی ہر خواہش کو نہ روکا جائے اطاعت میں سر نہیں جُھک سکتا۔ اگرچہ ابتداءً ہر کام مشکل ہے۔ لیکن اگر بچپن سے اس کو اس کا عادی کیا جائے جیسے بچے اوّل اوّل دُودھ چھڑانا مشکل ہے، لیکن اگر دُودھ چھُوٹنے کے بعد ماں کا دُودھ دیا جائے، تو نہیں پیتا۔

(طریقہ ریاضت) ہر آدمی کی ریاضت مخالفتِ نفس میں مضمر ہے، جس چیز کا غلبہ ہو اس کو ترک کر دو۔ عزتِ دُنیا کی اگر خواہش ہو تو عاجزی کرو! اور حرصِ مال ہو، تو نہ کرو۔ یہاں تک کہ جتنی چیزیں خدا کی محبت میں مانع ہوں وہ سب چھوڑ دینا چاہئیں، تاکہ موت کے وقت کسی چیز کو چھوڑنے کا رنج نہ ہو۔ صرف خُدا کی محبت اس کے ساتھ ہو گی، تو خدا اس کے ساتھ ہی رہے گا۔

حضرت داؤد سے خُدا نے فرمایا کہ میں تمھارا ساتھی ہوں، تم میرے ساتھ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جبرئیل نے مجھ پر وحی نازل کی کہ "اَحْبِبْ مَا اَحْبَبْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهٗ" (یعنی دُنیا کی جس چیز سے چاہے دوستی کرو، لیکن یہ سب تم سے الگ ہو جائیں گے)

اخلاقِ حسنہ

(حُسنِ اخلاق کی علامات) خداوندِ عالم نے مومنین کی علامات یہ فرمائی ہیں:

۱- قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الخ

۲- اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الخ

۳- وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

یہ مومنین کی صفات ہیں، جو اخلاقِ حسنہ کی علامات قرار دی جا سکتی ہیں۔ اور منافقین کے متعلق جو کچھ علامات بیان فرمائی گئی ہیں، وہ اخلاقِ بد کہلاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مومن کی نماز اور روزہ عبادات ہیں اور منافق کی نمازیں جانوروں کے کھانے کے مماثل ہے۔

حضرت عاصم فرماتے ہیں کہ مومن تفکر و عبرت میں محو ہوتا ہے، اور منافق حرص و تمنا میں۔ مومن سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا۔ منافق کو دنیا میں ہر چیز کا خوف رہتا ہے۔ مومن تمام دنیا والوں سے ناامید رہتا ہے۔ مگر خدا سے لو لگائے۔ اور منافق سوائے خدا کے دُنیا والوں سے حرص رکھتا ہے۔ مومن اپنا مال دین کے لیے خرچ کرتا ہے، اور منافق اپنے دین کو بھی دُنیا کے لیے فروخت کر دیتا ہے۔ مومن عبادت کرتا ہے اور روتا ہے۔ منافق گناہ کرتا ہے اور اُن پر خوش ہوتا ہے۔ مومن تنہائی پسند کرتا ہے اور منافق ہنگامہ آرائی۔ مومن عبادت کرتا ہے اور خوفِ خدا کرتا ہے کہ شاید اس کا صلہ نہ مل سکے۔ اور میری عبادت مقبول نہ ہو۔ منافق عبادت نہیں کرتا اور خدا سے طلب کی اُمید بھی کرتا ہے۔

بزرگانِ دین نے مومن کی حسبِ ذیل خصوصیات بتائی ہیں۔

خیر خواہ، شرم کرنے والا۔ کم بولنے والا۔ سچا، نیک کردار۔ عزت والا۔ قناعت کرنے والا۔ نرم دل غیبت کو حرام سمجھنے والا۔ طمع و حرص کا دشمن۔ شیریں زبان۔ اخلاق و عاداتِ حسنہ رکھنے والا۔ مومنین کی خوشنودی پر عمل کرنے والا، اور مومن کی خوشنودی میں خداوندِ عالم کی خوشیاں مضمر ہیں۔

(عمل آنحضرتؐ) بردبار آدمی ہی اچھی عادات کا حامل ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار نے انتہائی تکالیف پہنچائیں، مگر آنحضرتؐ نے اُن کے لیے رحم کی دُعا کی۔

(بردباری۔ حکایت) ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ ایک بار جنگل میں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک فوجی نے دریافت کیا، کہ آیا تو خدا کا بندہ ہے؟ جواب دیا، ہاں۔ اُس نے شہر کا راستہ دریافت کیا۔ آپ نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شہر ہے۔ اس نے کہا کہ میں شہر پوچھ رہا ہوں، جہاں انسانوں کی آبادی ہو۔ حضرت ابراہیم نے جواب دیا، ہاں، ہاں! سب سے بڑی آبادی یہاں ہے۔ اور سب سے گنجان اور بارونق شہر یہ ہی ہے۔ فوجی کو غصہ آ گیا اور لاٹھی اٹھا کر کھینچ ماری۔ حضرت ابراہیم ادھم زخمی ہو گئے، فوجی اُن کو شہر میں لایا۔ آپ کے متبعین نے جب دیکھا تو اس سے کہا کہ اے فوجی! تو نہیں جانتا کہ یہ حضرت ابراہیم ادھم ہیں۔ وہ گھوڑے سے اُترا اور پیروں پر سر رکھ کر کہنے لگا کہ آپ نے اپنے کو بندہ کیوں فرمایا۔ تو کہا کہ میں اس مالک کا (خدا کا) بندہ ہی ہوں۔ اس نے مُعافی چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے جس وقت لاٹھی ماری تھی، میں نے اُسی وقت تجھ کو معاف کر دیا تھا۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا، تو فرمایا، اس لیے کہ اس کو گناہ کا بدلہ ملے گا، اور مجھے اس کے معاف کر دینے سے ثواب۔

(روایت) حضرت ابو عثمان حیری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک شخص نے آزمائش کے لیے دعوت کی۔ جب آپ اُس کے دروازے پر پہنچے تو کہنے لگا کہ اب کھانے کو کچھ نہیں رہا۔ جب کچھ دُور نکل آئے، تو وہ پیچھے پیچھے گیا اور بُلایا، اور جب وہ پھر دروازے پر پہنچے تو پھر روک دیا۔ اسی طرح چند مرتبہ یہ عمل کرتا رہا۔ اور وہ واپس ہوتے رہے۔ آخر میں کہنے لگا، کہ اے بزرگ! میں آپ کا امتحان لے رہا تھا۔ آپ انتہائی بامروّت انسان ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ جو کچھ میں نے کیا کتوں کی عادت بھی یہی ہے کہ جب للکارو دو بھاگ جائیں گے اور جب بُلاؤ، تو آجائیں گے، یہ تو کوئی اونچا اخلاق نہیں ہے۔

(روایت) ایک بار ایک آدمی نے آپ کے اُوپر راکھ ڈال دی۔ آپ نے کپڑے جھاڑ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ لوگوں نے اس کا سبب پوچھا، تو فرمایا جو آدمی آگ کا مستحق ہو۔ راکھ اس کے لیے باعثِ شکر ہے۔

(روایت) حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کا رنگ مبارک کچھ سیاہی مائل تھا۔ نیشاپور میں آپ کے مکان کے قریب ایک حمام تھا۔ جب آپ وہاں تشریف لے جاتے تو لوگ اس کو خالی کر دیتے۔ ایک دن جب آپ تشریف لے گئے، تو حمام خالی کر دیا گیا۔ آپ داخل ہوئے۔ مالک حمام نے اس طرف نہ دیکھا اور ایک دہقانی حمام میں چلا گیا۔ اور آپ کو وہاں دیکھ کر سوچا، کہ یہ یہاں کے نوکر ہیں۔ آپ سے کہنے لگا کہ پانی اُٹھا لاؤ۔ آپ پانی لے آئے۔ پھر مٹی منگائی۔ اسی طرح اور کام لیے۔ آپ برابر کرتے رہے۔ جب مالک حمام نے اس کو آپ سے باتیں کرتے دیکھا، تو بہت خوفزدہ ہوا، اور حمام چھوڑ کر بھاگ گیا۔ جب آپ واپس تشریف لائے تو لوگوں نے یہ واقعہ بتایا کہ اس سے کہو، نہ بھاگے! اس لیے کہ یہ اس مالک کا قصور نہیں ہے۔

(روایت) عبداللہ درزی ایک بزرگ آدمی تھے۔ ایک کافر آپ سے کپڑے سلواتا تھا اور اُجرت میں کھوٹے دام دے جاتا تھا، اور آپ خاموشی سے لے لیا کرتے تھے۔ ایک بار خود دُکان پر موجود نہ تھے۔ اُس نے شاگرد کو کھوٹے دام دینا چاہے، اس نے انکار کر دیا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو اس سے فرمایا کہ وہ مجھ کو ہمیشہ کھوٹے سکّے دیتا ہے اور میں لیتا ہوں، اس لیے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو دھوکا نہ دے پائے۔

(روایت) حضرت اویس قرنی جب راستے سے گزرتے تو لوگ اُن پر پتھر پھینکتے۔ اُن سے فرماتے کہ بڑے پتھر نہ مارو، تاکہ میں نماز سے قاصر نہ ہو سکوں۔

(روایت) احنف بن قیس کو ایک شخص گالیاں دیتا ہوا پیچھے پیچھے جایا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ گھر کے قریب پہنچے، تو کہا کہ کچھ اور کہنا ہو وہ یہاں کہہ لے۔ اس لیے اگر میرے عزیز سُنیں گے تو تجھ سے انتقام لیں گے۔

(روایت) ایک عورت نے حضرت دینار رحمۃ اللہ علیہ کو ریاکار کہہ کر آواز دی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے صحیح کہا، لوگ مجھے پہچانتے ہی نہ تھے۔

یہ تمام واقعات "بہترین اخلاق" کا نمونہ ہیں، اور ان بلند ہستیوں کے ہیں، جو بلند اخلاق کے نمونہ تھے۔ اور دُنیاداری سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ خدا کے علاوہ کسی چیز پر نظر نہ کرتے تھے۔ اور جو آدمی اس کے خلاف ہو، وہ اپنے متعلق نیک ہونے کا خیال بھی نہ کرے۔

پرورش اولاد

اولاد ماں باپ کے لیے ایک امانت ہے۔ اس کا دل ایک موتی کی مثل ہے، جو دُنیا و مافیہا کی آلائش سے پاک ہے، اور موم کی طرح نرم ہے۔ اس کو جیسا چاہو، بنالو۔ اور ایک خالص زمین ہے، جو بیج چاہو بوؤ! ویسا ہی اُگے گا۔ اگر نیک عمل سکھاؤ گے تو نیک اُٹھے گا، اگر بُرے کام سکھاؤ گے تو بُرا۔

ماں باپ بھی اُستاد ہی کی مثل ہیں۔ اگر اس کو بُرے عمل سکھائیں گے تو ماخوذ ہوں گے، اور اس کے تمام کرداروں میں وہ حصے دار رہیں گے۔ خداوند عالم فرماتا ہے۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (اپنے نفس اور اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ)

دُنیا کی آگ کے مقابل میں دوزخ کی آگ سے بچانا کہیں افضل ہے اور اس کے طریقے یہ ہوسکتے ہیں۔

ادب اور اخلاق سکھانے کے طریقے

(تعلیم اخلاقِ حسنہ کا طریقہ) بُری صحبتوں سے بچانا چاہیے۔ اچھے اخلاق سکھانا چاہئیں۔ ادب اور تہذیب کی محفلوں میں بیٹھنے کی تلقین کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ تمام خوبیوں اور گناہوں کی بُنیاد "سوسائٹی" ہے۔ اچھے کپڑے پہننے کا عادی نہ بناؤ، کیونکہ وہ عادی ہو کر تمام عمر ویسے ہی کپڑے پہننے کی کوشش کریگا۔ یہ ابتداء آغوشِ مادر سے ہی شروع ہونا چاہیے۔

(دایا، شیرخواری) جو عورت بچے کو دُودھ پلائے، وہ نیک طبیعت حلال خور ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس کی عادات بھی اس کے دُودھ کی وجہ سے اس میں ضرور پیدا ہوں گی۔ اور اگر وہ حرام کمائی کھانے والی ہے تو اُس کا دُودھ بھی نجس اور حرام ہوگا۔ اور ایسے دُودھ سے جو بچہ پرورش پائے گا، تو وہ چیزیں اس میں ضرور آجائیں گی، جو بڑا ہو کر ظاہر ہوں گی۔

(باتیں کرنے کے زمانے میں) جب بچہ باتیں کرنا سیکھے تو سب سے پہلے اس کو لفظ "اللہ" سکھایا جائے۔

(عقل و شعور) جس وقت وہ بعض چیزوں سے شرمانے لگتا ہے، تو گویا اس میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہی بُرے کاموں سے روکنے والا جذبہ ہوتا ہے۔

(کھانے کا طریقہ) جب کھانا، کھانا سکھاؤ تو داہنے ہاتھ کی عادت ڈالو، اور پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہلوالو۔

جلدی جلدی کھانے کی عادت نہ پڑے، اور خوب چبا کر کھائے۔ ایک لُقمہ ختم ہو جائے تو دوسرا اُٹھائے۔ کبھی کبھی بُری غذا بھی کھلاؤ۔ تاکہ زمانے کے خشک و تر کا اندازہ ہو سکے۔

(صحبت) اچھے لڑکوں کی اس کے سامنے تعریف کرو، تاکہ اس کو اچھے کاموں کا شوق پیدا ہو۔ بہترین ریشمی لباس سے متنفر کرے، کہ یہ عورتوں اور طوائفوں کا پہناوا ہے۔

عیش و عشرت کے جو لوگ عادی ہیں، اُن کے پاس بیٹھنے سے روکو۔ ورنہ وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔

بُری صحبتوں سے بچاؤ، تاکہ وہ عادات بھی اس میں نہ آسکیں۔

(تعلیم) تعلیم میں سب سے پہلے "قرآن مجید" پڑھاؤ، اور ایسے لوگوں کی تعلیم دو جو نیک ہدایات دیں، اور سیرت صحابہ کی طرف متوجہ کریں۔

مدرّس بھی ایسا انتخاب کرو، جو عشق و محبت سے اس کو روشناس نہ ہونے دے۔ جو ادیب اشعار اور عورتوں کی معیت کے افسانے سُناتے اور یاد کراتے ہیں، وہ معلّم نہیں بلکہ شیطان ہیں، اور بُرائی کی بُنیادیں اس کی طبیعت میں رکھ رہا ہے۔

نیک افعال و عادات لوگوں اور بچوں کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرتا رہتا ہے۔

اگر وہ ایک بار غلطی کرے، تو نظر انداز کر دے، تاکہ وہ تنبیہہ کا عادی ہو کر "بے حیا" نہ ہو جائے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ وہ کوئی قصور چھپ کر کر رہا ہے، یا کرنے کے بعد خوف زدہ ہے۔

(ماں باپ کے الگ الگ فرائض) اور اگر بار بار قصور کرے، تو پوشیدہ طور پر سزا دو۔ تاکہ دوسرے اِس کے اغلاط سے بے خبر ہی رہیں، ورنہ اس میں باپ اور ماں کی بھی عزّت پر خوف آتا ہے۔ باپ کو اپنی عزّت کا خیال رکھنا چاہیے، اور ماں اس کو باپ سے ڈراتی رہے۔

(رہن سہن کے عادات) دن میں سونے کی عادت نہ پڑنے دو! ورنہ کاہلی اثر کرے گی۔

رات کو نرم گدوں پر نہ سلاؤ، تاکہ جفاکشی اور تکلیف برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے۔

تنگ دلی اور اُداسی کو دُور کرنے کے لیے کچھ دیر بچے کو کھیلنا بھی چاہیے۔ کھیل سے بچوں میں چستی اور پھرتی پیدا ہوتی ہے۔ تنگ دلی سے دل سخت اور سیاہ ہوتا ہے۔

فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے ہر آدمی کے ساتھ ملنے کی ہدایت کرتا رہے۔

ساتھیوں کے ساتھ غرور کرنے سے روکے، تاکہ وہ دوستوں سے فخر اور اکڑ نہ دکھائے۔ دوستوں سے بچائے

کچھ لینے کے کچھ دے دیا کرے۔ اس لیے کہ دوسروں سے لینا پست ہمتی سکھاتا ہے۔ نقد روپیہ پیسہ لینے کی قطعی تاکید کردے۔

بزرگوں کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھنا بُرا ہے۔

زیادہ باتیں نہ بنائے۔ اگر کوئی سوال کرے تو جواب دے۔ ورنہ خاموش بیٹھا رہے۔ قسمیں کھانا بُرا ہے اُستاد کے سزا دینے پر زیادہ چیخنا اچھا نہیں، اور نہ کسی کی سفارش کرائے، اس لیے کہ صبر کرنا بہترین عمل ہے، اور بے صبری عورتوں کا شیوہ ہے۔

(ابتدائے نماز وطہارت) سات سال کی عمر سے لڑکے کو آہستہ آہستہ نماز اور طہارت بتانا شروع کرے۔

دس سال کی عمر میں اس کی خطاؤں پر تادیب شروع کردے۔

جوانی میں جب قدم رکھے تو جوانی کے رموز سے کچھ کچھ آگاہ کردے۔ دُنیا کی بے ثباتی اور موت کا سبق پڑھائے۔ خدا کی خوشنودی کا عزم پیدا کردے۔ جنت و دوزخ کے حالات اور تصورات اس کے سامنے رکھ دے۔

اگر اس طرح بچے کی پرورش ہوگی تو یہ تمام باتیں اس کے دل پر نقش ہوجائیں گی، اور اگر غفلت برتے گا تو بچہ شروع ہی سے خراب اُٹھے گا۔

(تمثیلی روایت) حضرت سہل تستری کہتے ہیں کہ میں تین سال کا تھا کہ میرے ماموں نے مجھ سے کہا کہ بیٹے! جس نے تم کو پیدا کیا ہے، یاد کیا کرو۔ اور اُن کو نماز پڑھتے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیسے یاد کروں؟ تو انھوں نے کہا، کہ جب رات کو سوتے کے لیے لیٹو تو دل میں کہو، کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے ہر وقت دیکھتا ہے۔ میں نے کئی دن ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد انھوں نے حکم دیا کہ اب سات بار یہ ہی سوچا کرو۔ اس کے کئی دن بعد گیارہ مرتبہ کہنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ مجھے اِس تصوّر سے دلچسپی ہوگی۔

تقریباً ایک سال بعد میرے ماموں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ جو کچھ تم کو نصیحت کی ہے عمر بھر نہ بھولنا۔ یہاں تک کہ تم پر موت مسلط ہوجائے۔ اس نصیحت کا تصور تم کو آخرت میں مدد پہنچائے گا۔

کافی دنوں بعد کہنے لگے کہ جو آدمی خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس کو خدا ہر وقت دیکھتا ہے۔ لہٰذا اس کو چاہیے کہ گناہ نہ کرے۔

اس کے بعد ایک معلّم کو مقرّر کردیا، اور سات سال کی عمر میں "قرآن مجید" ختم کرلیا۔ اور دس برس کی

عمر میں روزہ رکھنے لگا۔ اُس وقت میں جَو کی روٹی کھاتا تھا۔ یہاں تک کہ بارہ برس کا ہوا۔
اس کے بعد ایک مسئلہ ذہن میں آیا اور عرض کی مجھے بصرہ بھیج دیا جائے، تاکہ اس مسئلے کو حل کر سکوں۔
چنانچہ میں وہاں گیا اور ایک عابد کا پتہ لگا کر اُن سے وہ مسئلہ حل کیا اور اپنے وطن واپس آ گیا۔
میں روز ایک سکّے کے جَو مول لیتا تھا اور اس کی روٹی سے روزہ افطار کرتا تھا۔ عادت ڈالتے ڈالتے میں نے پانچ دن کا روزہ رکھنا شروع کیا۔ پھر سات دن کا۔ اس کے بعد گیارہ دن۔ اور اسی طرح آخر میں پچیس دن تک روزہ رہتا۔ بیس سال اپنی عمر کے اسی طرح گزارے۔ میں اپنی جگہ فارغ رہا اور راتوں کو جاگتا رہا۔

اس حکایت سے تم کو سبق ملنا چاہیے کہ بچپن سے جس بات کے عادی ہو گے وہ ہمیشہ مفید رہے گی۔

اوائل عمر میں اصلاح کے طریقے

(معرفت خدا کی بُنیاد) جو آدمی خدا کی معرفت سے بہرہ اندوز نہ ہوا، وہ اس لیے کہ اس کے اصول اختیار نہ کر سکا، اور اصول اس لیے اختیار نہ کر سکا کہ اس نے ارادہ نہ کیا۔ اور ارادہ اس لیے نہ کیا کہ وہ سمجھ نہ سکا کہ معرفت کیا ہے؟ اور جو یہ نہ سمجھ سکا، اس کا ایمان نامکمل رہ گیا۔

جو لوگ دُنیا کو فانی سمجھتے ہیں اور آخرت کو باقی۔ اُن کے دل میں معرفت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اس حقیر دنیا کے عوض آخرت جیسی بہترین خیر لے لیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ یہ سب یقین پر مبنی ہے۔ اور آدمی کو یقین اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو بتانے والے نہیں ہوتے۔ لہٰذا دین کے مسئلے میں علماء ہی سب کچھ بتا سکتے ہیں، اور وہ ہی آدمی کی معرفت کی کڑی ہیں، لیکن یہ بات اِس زمانے میں ناپید ہے۔

اور جب ہمارے لیے راہرو اور کوئی دلیل نہیں تو راستہ کیسے سمجھ میں آئے۔ اسی لیے لوگ نیکیوں سے خالی ہیں۔ علماء کے گروہ دُنیا پرستی میں مشغول ہیں، پھر کیسے ہم کو ہدایت دیں کہ ہم آخرت کے راستے پر لگ سکیں دُنیا اور آخرت میں بعد المشرقین ہے۔ جب آدمی ایک طرف آتا ہے تو دوسری طرف سے ہٹ جائے گا۔ جو لوگ آخرت کی طرف جھکتے ہیں اُن کے متعلق خدا فرماتا ہے وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا لہٰذا اس کو سمجھو کہ یہ خدا کا قول ہے۔ سعی سے مطلب راہِ خدا پر چلنا ہے۔ راہِ خدا پر چلنے والوں کے لیے ابتدائی منازل اور شرائط ہیں، جو طے کرنا ضروری ہیں۔ اس کے بعد کچھ شرائط ہیں جو اعتصام تک پہنچاتے ہیں۔ پھر وہ قلعہ ہے، جس کے حصار سے پناہ لینا ضروری ہے۔

پہلی شرط: اپنے اور خدا کے درمیان کے حجابات کو اٹھا دے، تاکہ اس قوم میں تیرا شمار نہ ہو سکے۔

جس کے متعلق خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا۔

حجابات

(حجابات) حجابات چار ہیں : دنیوی مال - جاہ عزّت - تقلید و تعمیل - حجاب معصیت۔

پہلے دُنیا کا مال اپنے سے الگ کر دے۔ تاکہ تجھ کو راہِ معرفت پر چلنے میں آسانی ہو۔ مال اِتنا جائز ہے کہ جو تیری حاجت پوری کر دے۔ اور اگر بالکل پیسہ نہ ہو اور دوسرے حاجت پوری کر سکتے ہوں تو ایسا آدمی راہِ معرفت جلد طے کرے گا۔

دوسرا حجاب جاہ و حشمت دُنیا کا ہے۔ وہ اِس طرح اُٹھتا ہے کہ دُنیا کی ہنگامہ آرائیوں سے کہیں دُور نکل جائے، تاکہ دُنیا والے اس کو نہ پہچان سکیں۔ اگر لوگ پہچانیں گے تو یقیناً دنیا داری میں پھنسا رہیگا اور دُنیا کی محبت باقی رہے گی، اور جب تک دُنیا کی لذّات سے بہرہ اندوز ہوتا رہے گا۔ اس وقت تک خدا کی معرفت کی لذّت حاصل نہ ہو سکے گی۔

حجاب تقلید اُس وقت اٹھتا ہے کہ کسی دوسرے کی مذہبی بات سُن کر دل میں رکھ لے گا۔ چاہے اس نے دُشمنی کی وجہ سے سُنی ہو، لیکن ایسی باتوں کو جو مذہب کے خلاف ہوں دل سے نکال دے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی حقیقت دِل میں رکھے۔ اس کی تحقیق اور معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور اس کی معرفت اِس طرح ہوتی ہے کہ سوائے خدا کے اور کوئی اس کا معبود نہیں۔ یوں سمجھو، کہ جو آدمی حرص و ہوس کے بندے ہیں، ان کی معبود یہی ہے اور جب وہ اس حقیقت کو سمجھ لے، تو اس کے بعد مجاہدۂ نفس اور معرفت خداوندی کی تلاش میں مشغول ہو۔ مباحثات اور مناظروں میں معرفت تلاش نہ کرے۔

حجاب معصیت، سب سے بڑا گناہ ہے، جو آدمی گناہوں پر مُصر ہوتا ہے۔ اس کا دل گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔ تو نورِ حق کیسے نظر آسکتا ہے خصوصاً کسب حرام انسان کو قطعی تباہی کے راستے پر لگا دیتا ہے۔

اگر کوئی آدمی شریعتِ اسلام پر واقعی عمل کرنا چاہتا ہے، تو اوّل کسبِ حلال کرے، ورنہ ایسا ہی ہے کہ بغیر عربی پڑھے تفسیر قرآن کو پڑھنا چاہیے۔ جب کسبِ حلال کا عادی ہو گا تو گویا کہ طاہر ہو کر نماز کے لائق بن جائے گا۔ اور اس کے بعد اس کو "امام" کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے کہ دُنیا میں پیچیدگیاں اتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں کہ بغیر کسی پیر کے کام نہیں چل سکتا۔ جس طرح رحمانی کام دُنیا کو روشن کرتے ہیں۔ ویسے ہی ساتھ ساتھ شیطان لگا ہوا ہے، جو اپنے راستوں پر آدمی کو لگانا چاہتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ایک پیر یا ہادی کی ضرورت ہے۔ جب پیر منتخب کر لو، تو اپنے تمام کام کو اس پر چھوڑ دو۔ اس کے بعد اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرے اور یہ طے کر لے کہ پیر و مُرشد کے غلط احکام تیری حُسن و خوبی کے

مقابل میں بہتر ہیں اور اگر پیر تیری عقل سے بالاتر حکم دے، تو اس کو بھی فوراً تعمیل کر، جس طرح جنابِ موسیٰ اور جنابِ خضر کا واقعہ ہے۔ بہت سی باتیں دنیا میں پیر و مرشد ایسی جانتے ہیں کہ عوام کی عقول اُن تک نہیں پہنچ سکتیں۔

تمثیلی حکایت

پیر یا پیشوا کے مراتب حکایت

حکیم جالینوس کے زمانے میں ایک شخص کی اُنگلی میں درد ہوا۔ حکماء نے جب اپنے اپنے علاج کر لیے، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا تو وہ شخص جالینوس کے پاس پہنچا، اس نے اس کے شانے پر دوا باندھ دی۔ دوسرے حکماء نے اعتراض کیا اور جب وہ ٹھیک ہو گیا تو سب کو حیرت ہوئی۔ دراصل اس شخص کے پٹھے میں درد تھا۔ اور حکیم جالینوس اس مرض کو پہچان گیا تھا۔

لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ مُرید یا مُقلّد کسی پیر یا امام کے حکم کے بغیر کسی فعل میں تصرّف نہ کرے۔

خواجہ ابوعلی فارمدی خود کہا کرتے تھے کہ میں نے ایک خواب شیخ ابوالقاسم سے بیان کیا، تو وہ بہت غصہ ہوئے اور ایک ماہ تک مجھ سے بولنا بھی بند کر دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ ایک دن خود ہی فرمایا کہ تم نے خواب بیان کرنے میں ایک جگہ لفظ "کیوں" کہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم کو میری کس بات پر اعتراض ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھارے دل میں میری طرف سے لفظ "کیوں" کی گنجائش ہے۔ اگر نہ ہوتی تو زبان پر نہ آسکتا۔

دراصل پیر و مُرشد اپنے مرید اور مقلّد کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے تاکہ اس کے اوپر کی تمام آفات اپنے اوپر لے لے۔ پیر کے اس حصار (پناہ) کا انحصار چار دیواروں پر ہوتا ہے۔

۱۔ خلوت، جو مخلوقات کی رنگا رنگ محافل سے متنفّر کر کے آنکھوں اور کانوں کی راہیں مسدود کر دیتی ہیں

۲۔ خاموشی، دماغ کی پراگندگی اور انتشار سے محفوظ رکھتی ہے۔

۳۔ گرسنگی، شیطانی اوہام دماغ میں نہیں سما سکتے، اور یادِ خدا کی قوتیں بڑھ جاتی ہیں۔

۴۔ کم خوابی سے قلب روشن و منوّر ہوتا ہے، اور جلوہ احدیت نظر آنے لگتا ہے

بقول حضرت سہل تستری ابدالیت کی بُنیاد انھیں چار چیزوں پر مبنی ہوتی ہیں۔

جب آدمی ان دیواروں کو استوار کر لے، اس کے بعد راہِ دین اختیار کرے۔ دین کے راستے پر چلنے کا پہلا طریقہ یہ ہے، کہ اوّل اپنا راستہ صاف کرے، اور وہ بُری صفتوں کو دُور کرتا ہے، جیسے مالِ دُنیا کی ہوس غرور و تکبّر۔ ریاکاری و تماش بینی وغیرہ۔ ان سب سے الگ ہو کر دل کو صاف کرے۔ بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان میں صفاتِ بد نہیں ہوتیں، بلکہ ایک آدھ کمی رہ جاتی ہے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پیر کی ہدایت پر

عمل کر کے اپنے لیے صاف زمین ہموار کر لے۔ اس کے بعد اس میں نیکیوں کا بیج بوئے، وہ بیج "صبر" ہے۔ جب صبر کی شان آجائے گی، تو خدا ہی خدا نظر آنے لگے گا۔ اس کے بعد گوشۂ عبادت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہے یہاں تک کہ یہ آواز دل سے نکلنے لگے، اور زبان تھک جائے۔ کلمے کے حقائق روشن ہو جائیں۔ اور آخر میں یہ منزل آئے گی کہ "کلمے" کے الفاظ دل اور زبان سے کہنے کی ضرورت نہ پڑے گی، بلکہ اگر وہ نہ کہنا چاہے گا تو بھی یہ ہی آوازیں نکلتی رہیں گی۔

شبلیؒ نے اپنے ایک مرید سے کہا کہ اگر تو جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک میرے پاس آئے تو درمیان کے دنوں میں سوائے خدا کے اور کوئی وسواس دل میں لانا حرام ہے۔ یعنی سوائے خدا کے کسی کو کبھی یاد نہ کر! جب ان منازل سے فارغ ہو جائے تو خدا پر چھوڑ دے، دیکھ! کہ وہ کیا دکھاتا ہے۔ تیری یہ ریاضت رائیگاں نہ ہوگی۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ (یعنی جو آدمی میری عبادت کرنے میں مشغول رہتا ہے میں اس کو اور توفیق دیتا ہوں) اس منزل میں مختلف درجات پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض کو کلمہ کے حقائق میں توہمات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ بعضوں کو یہ بات نہیں ہوتی، بلکہ ارواحِ مقدسہ نظر آنے لگتی ہیں۔ عموماً خواب میں ایسا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی حالتِ بیداری میں بھی۔ آگے کے منازل اور زیادہ ہیں، لیکن اُن کو بیان کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس راہ کو طے کرنے والا سنی سنائی باتوں پر عمل نہ کرے، بلکہ خود کو جو حالات پیش آتے رہیں، اس سے سبق حاصل کرتا رہے، ورنہ حجابات باقی رہیں گے۔

ہمارے علوم بس یہاں آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ انھی باتیں تمھارے ایمان کے لیے کافی تھیں۔ بعض علماء تو انھیں مدارج سے منکر ہیں۔ اس لیے کہ ان منازل پر بھی وہ نہیں پہنچ پاتے، اور اسی لیے وہ مخالفت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم ؕ

دوسرا اصول

باب الشہوانیات

شہوت اور اُس کی اِصلاح

شہوانی خواہشات اور ان کی اصلاح کے طریقے

اِنسان کا معدہ ایک حوض کی مثل ہے، اور اس سے سات رگیں چاروں طرف کو پھیلی ہوئی نہروں کی طرح ہیں۔ معدہ خواہشاتِ نفسانی اور ظاہری دونوں کا مرکز ہے۔ اِنسان پر سب سے زیادہ اثرات خواہشات کے ہیں۔ جب آدمی کا پیٹ بھر جاتا ہے تو دُنیا یاد آتی ہے اور خواہشات کی بھرمار ہوتی ہے، نکاح کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ پیٹ کا بھرنا اور عورت کی خواہش کرنا مال کے باعث ہے۔ اگر مال نہ ہو تو نہ پیٹ بھرے گا اور نہ وہ خواہشات ہی پیدا ہوں گی، اور مال کا حصول عزت وجاہ چاہتا ہے، عزّت وحشم کی خواہشات "خلق اللہ" کے ساتھ دھوکہ کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اور جب مخلوق خدا کی خصوصیتیں دل میں پیدا ہوں گی تو "حسد"، عداوت، "تکبر"، کینہ و فساد پیدا ہو جائے گا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ معدہ ہی تمام گناہوں کی بنیاد ہے۔ یہ اگر خالی رہے گا تو خواہشات پیدا نہ ہوں گی اور انسان نیک راہوں کو اختیار کرے گا۔ موجودہ باب میں "صرف بھوک" اس کے اثرات اور فوائد، نیز کھانے کے متعلق درمیانی طریقے سمجھائیں گے، تاکہ انسان اس دنیا میں رہ کر ریاضت کر سکے، اور اگر شہوانیات کو قابو نہ کرے، تو اس پر کیا عذاب ہو سکتا ہے اور اس سے پرہیز میں کیسے کیسے ثواب ہیں۔

بھوک

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ بھوک اور پیاس کے ساتھ جہاد کرنا، کفّار کے مخالف جہاد کرنے کے برابر ہے۔ خداوند عالم کو انسان کی بھوک اور پیاس سے زیادہ کوئی چیز نہیں بھاتی۔ جس آدمی کا پیٹ بھرا ہوا ہے عالم ملکوتی کی طرف جانے کی راہیں اس کے لیے مسدود ہوتی ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے کہ فاضل ترین آدمی وہ ہے جو کم کھائے اور کم ہنسے، اور صرف تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا پہنے۔ تمام افعال کی بنیاد بھوک پر ہی ہے۔ پرانا کپڑا پہننا، آدھا پیٹ روٹی کھانا اور بقدر ضرورت کپڑا پہننا نبوت کا ایک جزو ہے۔

حدیث ہے، کہ کم کھانا پوری عبادت ہے۔ اور عبادت کرنا نصف۔ زیادہ کھانے والا خدا کا دشمن ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کم کھانے والے آدمی پر خداوندِ عالم فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے۔ زیادہ کھانے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ دل ایک کھیت کی طرح ہے۔ اگر اس میں پانی کی بھرمار کر دی جائے گی، تو کھیت گل سڑ جاتا ہے چند لقمے آدمی کے لیے کھانا زندگی کے لیے کافی ہیں۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ پیٹ کا تیسرا حصہ کھاؤ۔ اور ایک تہائی پانی پیو۔ اور ایک تہائی سانس آنے جانے کے لیے چھوڑ دو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ خدا کو یاد کرنے کے لئے بھوکے اور ننگے رہو۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ہے کہ شیطان آدمی کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ لہٰذا اس کو روکنے کے لیے کم کھاؤ اور پیاسے رہو۔ مومن صرف ایک آنتڑی کو کھانے سے بھرتا ہے، اور منافق اپنی سات انتڑیوں کو۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جنت کے شائق رہو، جب تک اس کا دروازہ تمہارے لیے نہ کھل جائے۔ میں نے پوچھا کس طرح؟ فرمایا بھوک اور پیاس کے ذریعے۔ اور فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے

کبھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا۔ کبھی کبھی تو مجھے حضورؐ پر رحم آتا، اور میں اُن کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہتی کہ اگر حضورؐ شکم سیر ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ تو فرماتے کہ پیغمبرانِ ماسلف کبھی پیٹ بھر کھانا نہ کھاتے تھے، میں ڈرتا ہوں کہ اُن کے مراتب مجھ سے بلند نہ ہو جائیں۔ سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اُن کے پاس پہنچ جاؤں۔ اور جب حضورؐ سے میری یہ باتیں ہوئی ہیں، تو حضورؐ ایک ہفتہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ ایک بار میں نے روٹی پکائی، اور والد ماجد کی خدمت میں لے جا کر عرض کی کہ تناول فرمائیں۔ تو پدر بزرگوار نے فرمایا کہ بیٹی! آج یہ روٹی تین دن کے بعد تمھارے باپ کے پیٹ میں جارہی ہے۔

ابو سلیمان دارانی کے خیال میں ایک لقمہ کم کھانا رات بھر کی عبادت سے اچھا ہے۔ حضرت فضیل اپنے "دل" سے مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام بھوک سے خوش ہوتے تھے۔ افسوس کہ تو بھوک کی کیوں خواہش کرتا ہے۔

حضرت کہمش رحؒ نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کی، کہ بھوک اور پیاس کے عادی ہونے کے مراتب تو نے اولیاء کو عطا کیے ہیں، مگر میں نے یہ مرتبہ کیسے پالیا؟

مالک دینار رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں ایسا مالدار آدمی جو دُنیا سے بے نیاز ہے، وہ سب سے زیادہ مطمئن ہے حضرت محمد واسع نے فرمایا کہ وہ آدمی مطمئن نہیں ہے، جو صبح شام بھوکا رہ کر بھی خوش رہے۔

حضرت سہل تستری نے فرمایا کہ بھوک اور پیاس سے زیادہ بزرگانِ دین کے نزدیک کوئی شے نہیں اور سیری سے زیادہ کے لیے کوئی چیز نقصان دہ نہیں۔

حضرت عبدالواحد بن زید نے فرمایا کہ خداوند عالم بھوکے کو دوست رکھتا ہے، اور کوئی آدمی زمین پر آسمان نہیں رہا، لیکن بھوکا اور کوئی پانی پر نہیں چل سکا۔ لیکن بھوکا۔

حدیث میں ہے کہ جناب موسیٰؑ نے جب چالیس دن تک خداوند عالم سے باتیں کی تھیں، تو آپ برابر بھوکے رہے

بھوک اور شکم سیری کا فرق

بھوک کے دس فوائد ہیں، اور سیری کے دس نقصانات:

پہلا یہ کہ بھوک سے آدمی کا دل صاف رہتا ہے، اور سیری آدمی کو کند ذہن اور اندھا کر دیتی ہے، جب پیٹ بھرا ہوتا ہے، تو ایک قسم کی گرمی دماغ کو چڑھتی ہے، جو خواہشات پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے تھوڑا کھانے کا حکم دیا ہے۔ بھوکے آدمی کی قوتِ تفکر بلند ہوتی ہے۔

حضرت شبلی رحؒ نے کہا ہے کہ میں جس روز بھوکا رہا، خدا کی حکمتیں دل میں روشن رہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سیر ہو کر کھانے میں معرفت حقہ ختم ہو جاتی ہے، اور جب بھوک معرفت کی کنجی ہے، تو جنت کا راستہ قرار پاتی ہے۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ اَدِیْمُوْا قَرْعَ بَابِ الْجَنَّةِ بِالْجُوْعِ۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بھوک سے ذکرِ خداوندی میں لطف آنے لگتا ہے، چونکہ دل کی تمام کثافتیں دور ہو جاتی ہیں، اور سیری میں آدمی سخت ہو جاتا ہے۔ اس وقت جو عبادت کی جائے وہ دل پر اثر نہ کرے گی۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ جو آدمی سیری کے بعد خداوند عالم کی عبادت میں خلوص پیدا کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔

فائدہ سوم یہ ہے، کہ بھوک سے عاجزی اور شکستگی پیدا ہوتی ہے، جس سے حقیقی دنیا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور سیری سے غفلت اور اکڑ پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کھائے تو سوچے کہ مجھے یہ ملتا تو کیا ہوتا ورنہ خدا کی معرفت ناممکن ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کے خزانے عطا کیے گئے، لیکن آپ نے قبول نہ کئے، اور عرض کی کہ ایک دن کی بھوک اور ایک دن کی سیری، اچھی ہے۔ اس لیے کہ میں بھوک میں صبر کرتا ہوں اور کھانے کے بعد شکر۔ یعنی دونوں درجات حاصل ہو جاتے ہیں۔

فائدہ چہارم یہ ہے کہ آدمی پیٹ بھرنے کے بعد مخلوق کی تکالیف کو بھلا دیتا ہے، اور بھوک میں ہر آدمی کی تکالیف کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

جناب یوسف علیہ السلام سے لوگوں نے عرض کی کہ آپ کے قبضے میں تمام دنیا کے خزانے ہیں پھر آپ بھوکے کیوں رہتے ہیں؟ تو فرمایا کہ سیر ہو کر کھانے میں بھوکوں کی تکلیف کا احساس نہ ہونے کا خطرہ ہے۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو فرمانبردار بنائے۔ فرمانبرداری وہ بغیر بھوک کے نہ کر سکے گا اور شقاوت یہ ہوگی کہ خود اس کا تابع ہو جائے۔

نفس ہمیشہ سرکشی پر آمادہ رہتا ہے، لہٰذا اس کی سرکشی کو ختم کرنے کا بہترین علاج بھوک ہے، جس طرح کسی حیوان کو بے عیب بنانے کے لیے بھوکا ہی رکھا جاتا ہے۔ بھوک نفس کے لیے کیمیا کا کام کرتی ہے۔ کیونکہ نفس سے ہی تمام خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور نفس صرف سیری کے وقت سرکش ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون فرماتے ہیں کہ میں نے جب بھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا، تو یا تو گناہ کا مرتکب ہوا، یا اس کی خواہشات میں مبتلا ہوا۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کی رحلت کے بعد سب سے پہلی "بدعت" پیٹ بھر کھانا کھانا ہے اگر قوم پیٹ بھر کر کھانا کھائے گی، تو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو جائے گی، اور گمراہی میں پڑ جائے گی۔

اگر بھوک کے دوسرے فائدوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کم از کم یہ فائدہ تو ظاہر ہے کہ بھوکے آدمی کی خواہش

جماع نہیں رہتی بلکہ باتیں کرنا بھی اس کے لیے دوبھر ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ جب آدمی پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا ہے، تو مستی سوار ہو جاتی ہے، اور جب عورت کو دیکھے گا تو اس کے ساتھ جماع کرنے کی خواہش ہوگی، اور جب جماع کی خواہش ہوگی تو اس عمل پر کس طرح پرہیز کر سکتا ہے۔

ایک حکیم کا قول کہ اگر آدمی سال بھر تک اپنی بھوک سے آدھی روٹی اور وہ بھی سوکھی موٹی کھائے تو اس کو بھر عورت کا خیال تک نہ آئے گا۔

چھٹا فائدہ۔ بھوکے کو نیند کم آتی ہے اور جاگنا عبادات کی بنیاد ہے خصوصاً رات کو کھانے کے بعد نیند کا غلبہ ضرور ہوتا ہے اور وہ سو جاتا ہے، تو اس کی عمر سونے میں ضائع ہوتی ہے۔

ایک پیر صاحب اپنے مُریدوں کو ہمیشہ کم کھانے کی تلقین کیا کرتے تھے کہ کم کھاؤ۔ زیادہ کھاؤ گے تو زیادہ سوؤ گے، اور زیادہ سوؤ گے تو روز قیامت حسرت و یاس میں منہ تکا کرو گے۔

تقریباً ستر پیر و مرشد اس امر پر متفق ہیں کہ پانی کی افراط نیند کے غلبے کا باعث ہوتی۔ اور نیند سے عمر کم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر پیٹ بھر کھانے کے بعد تہجد بھی پڑھو گے، تو وہ لذت حقیقی پیدا نہ ہو سکے گی۔ اور اگر سوئے گا تو احتلام بھی ہو سکتا ہے اور ایسی صورت میں رات کو نہانا ناممکن ہوگا۔ اور جب نہ نہائے گا تو تہجد کیسے پڑھے گا! اور جب حمام جائے گا تو ہو سکتا ہے کہ خرچ نہ ہو اور اگر خرچ بھی ہو تو عورتوں پر نظر بھی پڑ سکتی ہیں، اور عورتوں پر نظر ڈالنے سے بہت سے مصائب کا شکار ہو سکتا ہے۔

حضرت سلیمان فرماتے ہیں کہ احتلام (بدخوابی) ایک مستقل عذاب ہے، جو صرف پیٹ میں زیادہ غذا پہنچنے سے ہوتا ہے۔

ساتواں فائدہ یہ ہے کہ بھوک میں آدمی علم و عمل کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس حاجاتِ ضروریہ کے لیے بار بار نہیں جانا پڑتا اور وقت فضول خراب نہیں ہوتا۔

حضرت سری سقطی علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ میں نے حضرت علی جرجانی کو جَو کے ستو کھاتے دیکھ کر دریافت کیا کہ روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ تو کہا کہ اس ستو اور روٹی کے درمیان ستر تسبیحوں کا فاصلہ ہے۔ اور اسی لیے چالیس سال ہو گئے کہ روٹی نہیں کھائی۔

علاوہ اس کے روٹی نہ کھانے والوں کو روزہ بہت آسان ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت باوضو رہ کر مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے۔ راہروانِ دین کے نزدیک روٹی کھانا کہیں کمتر ہے بہ نسبت عبادات کے۔

ابو سلیمان دارانی کے قول کے مُطابق زیادہ کھانے والے آدمی میں چھ عیوب آجاتے ہیں:

پہلے یہ کہ عبادت کی حقیقت سے بہرہ ور نہیں ہو پاتا۔

دوسرے یہ کہ غبی ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے اچھی باتیں بھولنے لگتا ہے۔
تیسرے یہ کہ اپنی سیری کی وجہ سے دوسروں کی پرواہ نہیں کرتا۔
چوتھے۔ عبادات کو دل نہیں چاہتا۔
پانچویں۔ خواہشات میں اضافہ ہوتا ہے۔
چھٹے، حاجاتِ ضروریہ کی وجہ سے عبادات میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔
آٹھواں فائدہ بھوک کا یہ ہے کہ کم کھانے والا آدمی بیمار کم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے علاج کے اخراجات سے بچ جاتا ہے۔ تمام حکما و ڈاکٹروں کے نزدیک کم کھانے سے بیماریاں نزدیک نہیں آتیں۔ لہٰذا بھوک میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ حکماء کے نزدیک سُوکھا ہوا گوشت کھانا مُضر ہوتا ہے۔

نواں فائدہ یہ ہے کہ کم کھانے سے اخراجات کم ہوتے ہیں، اور جب اخراجات کم ہوں گے تو دُنیاداری بھی کم ہی کرنا پڑے گی اور زیادہ اخراجات میں اس کی تگ و دو کرنا پڑتی ہے اور زیادہ تگ و دَو میں بے ایمانی کے خدشات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا کم کھانا ہی گناہوں کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔

ایک حکیم کے نزدیک اپنی حاجات کو ترک کر دینا ہی پورا کرنے کے مرادف ہے۔ اور یہ تمام تکالیف سے زیادہ آسان ہے۔ دوسرے حکیم کا قول ہے کہ میں بجائے دوسرے لوگوں کے اپنے پیٹ سے ہی قرض لیتا ہوں اور وہ قرض صرف یہ ہے کہ اس کی خواہش کو دبا لیتا ہوں۔

حضرت ابراہیم ادھم لوگوں سے کچھ خریدنے کے لیے بھاؤ پوچھ رہے تھے، تو دکاندار نے نرخ گراں بتایا۔ آپ نے فرمایا کہ ان کا استعمال کم کر دو۔ خود بخود سستی ہو جائیں گی۔

دسواں فائدہ یہ ہے کہ آدمی جب اپنے پیٹ پر اچھی طرح قدرت رکھتا ہے، تو اس میں ایثار اور صدقہ دینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور لوگوں پر رحم کرنے لگتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ایسے آدمی کی طرف پڑی جس کا پیٹ بڑا تھا، تو فرمایا کہ جو کچھ تو نے اس میں بھرا خداوند عالم کی راہ میں دے دیتا تو اچھا ہوتا۔ واللہ اعلم

آداب مُریدی

مُرید کے لیے کھانے میں احتیاط

فرائض مُرید :

مُرید کے لیے کسبِ حلال کے بعد تین فرائض اور احتیاطیں ضروری ہیں :

پہلے یہ کہ خوراک کو ایک دم کم نہ کر دے، بتدریج کم کرنے میں تکلیف نہیں ہوتی، اور آدمی عادی ہو جاتا ہے مثلاً ایک لقمہ روزانہ کم کرتا جائے۔ اس طرح طبیعت کو گرانی نہ ہو گی۔ اس مقدار کی کمی و بیشی چار مراتب پر موقوف ہے :

پہلا مرتبہ وہ یہ ہے کہ جس پر صرف صدیقین ہی فائز ہیں، صرف زندہ رہنے کے لیے کھائے چنانچہ سہل تستری نے اسی درجے کو اختیار کیا۔

مقدار طعام کے مدارج آپ کا مقولہ ہے کہ عبادت کے لئے جتنی غذا کافی ہو سکے اس سے زیادہ نہ کھائے۔ اگر پیٹ بھرا ہوا آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھتا ہے، تو بھوکے آدمی کا بیٹھ کر نماز پڑھنا اس سے افضل ہے۔ اور اگر بھوک کی وجہ سے عبادت، عقل اور زندگی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ تو ضرور کھائیے۔ کیونکہ بغیر عقل کے عبادت ناممکن ہے اس طرح زندگی جو اصل چیز ہے اس کا بھی خطرہ ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کا کیا شعار رہا ہے؟ تو فرمایا کہ حسب ضرورت کھاتا تھا اور بعض راہب تو صرف ایک دانے پر قناعت کرتے تھے۔ اور اس کی عادت ڈال لی تھی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی آدھے مُد کی روٹی کھانے کا عادی بنے (اس مقدار سے آدمی کا پیٹ تقریباً ⅓ ہی بھر سکتا ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ثُلُثٌ لِلطَّعَامِ وَثُلُثٌ لِلشَّرَابِ وَثُلُثٌ لِلذِّكْرِ۔ ایک روایت میں ہے ثُلُثٌ لِلنَّفَسِ۔ حضور کا حکم یہ بھی ہے کہ چند لقموں پر ہی قناعت کرے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سات یا نو لقموں سے زیادہ استعمال نہ کرتے تھے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ایک مُد کی وزن کی روٹی کھائے اور یہ مقدار غالباً آدمی کے آدھے پیٹ کے لیے کافی ہوگی۔ چوتھا درجہ یہ ہے کہ ایک سیر پورا ہو جائے، اور وہ ایک مد سے زیادہ وزن ہوتا ہے، جو فضول خرچی کے حدود میں آ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۔

مگر یہ بات وقت اور مقصد کے لحاظ سے بدلتی رہے گی۔ پیٹ بھرنے سے پہلے دستر خوان چھوڑ دیا جائے۔

بعض لوگوں کے خیال مقدار طعام کے متعلق علماء کے ایک گروہ نے کھانے کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے لیکن یہ عمل ہے کہ بھوک سے پہلے کھانا نہ کھائیں، اور جب کھائیں تو بھوکے ہی دستر خوان سے اٹھیں۔ اور بھوک کا درجہ یہ مقرر کیا ہے کہ آدمی خشک روٹی بھی شوق سے کھانے لگے یا جیسی روٹی مل جائے فوراً کھانا شروع کر دے ——

اکثر صحابہ آدھے مُد سے زیادہ نہ کھاتے تھے۔

بعض لوگ ایک ہفتے میں صرف چار مُد کھانا کھاتے تھے۔ اور اگر خرمے استعمال کرتے تو ہفتے میں ۶ مُد کھا لیا کرتے۔ وہ اس لیے کہ دو کی وزن اس کی گٹھلی سے کم ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دن میں صرف ایک صاع (۴ مُد) کھانا کھاتے تھے۔ اور بعض لوگوں پر اعتراض کرتے کہ تم لوگ پیٹ بھر کھانا کھاتے ہو، حالانکہ حضورؐ کے زمانے میں کم کھاتے تھے۔ اور اب تم لوگ آٹا چھان کر کھاتے ہو اور باریک باریک چپاتیاں پکاتے ہو۔ دو قسم کے سالن تمہارے دستر خوان پر

ہوتے ہیں۔ تم لوگوں کا لباس دن رات کا الگ الگ مقرّر ہے۔ بعض لوگ ہفتے میں صرف ایک ہی مد خرمے کھایا کرتے تھے۔
حضرت سہل تستری کا قول ہے کہ اگر تمام دُنیا حرام ہو جائے تو بھی میری غذا حلال ہی ہوگی۔ اس کا مقصد صرف ضرورت سے زیادہ کھانے سے روکنا ہے، یہ نہیں ہے کہ جو بدکاروں کا قول ہے کہ جب کوئی چیز آدمی کے پاس آجائے تو وہ حلال ہو جاتی ہے۔

دوسری احتیاط مُرید کے لیے کھانے کے وقت کی ہے، جو تین مدارج پر منقسم ہے۔
پہلا درجہ یہ ہے کہ تین دن تک کچھ نہ کھائے۔ بعض لوگ تو ہفتے میں ایک بار کھاتے تھے اور بعض عشرے اور بعض بارہ دن میں ایک بار کھاتے تھے۔
ایک بزرگ نے اپنے کو چالیس دن میں ایک بار کھانے کا عادی بنا لیا تھا۔
حضرت اُبوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بعض مرتبہ تو چھ چھ دن نہ کھاتے تھے۔
روایت ہے کہ اگر چالیس دن تک آدمی کچھ نہ کھائے تو اس پر کچھ نہ کچھ ضرور مکاشفہ ہوگا۔ ایک صُوفی نے ایک راہب سے پُوچھا کہ تُم ہمارے رسُولؐ پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اُس نے کہا کہ چونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے چالیس دن تک کھانا نہ کھایا، اور تمھارے پیغمبر نے کبھی ایسا نہ کیا۔ تو صُوفی نے کہا کہ میں اُن کا غلام ہوں، اگر یہی شرط ہے، تو میں چالیس روز تک کچھ نہ کھاؤں گا۔ اس کے بعد ایمان لے آؤ گے۔ اس نے وعدہ کیا۔ چنانچہ اُن بزرگ نے مسلسل پچاس دن کھانا نہ کھایا۔ اور اس کے بعد بھی کہا کہ میں اور بھی صبر کی قوت رکھتا ہوں۔ چنانچہ راہب ایمان لے آیا۔ یہ وہ درجات ہیں کہ آدمی کو جب تک وہاں کی حقیقت نہ معلوم ہو۔ اس درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ اس کو اس دُنیائے ظاہری کی کچھ خبر نہیں رہتی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ دو، دو۔ تین تین دن تک بھوکا رہے۔
تیسرا درجہ یہ ہے کہ روزانہ ایک بار کھائے۔
اس کے بعد اگر دوبارہ کھاتا ہے تو اسراف کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بھوکا ہی نہیں رہتا۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو دن میں ہی تناول فرماتے، یا صرف رات میں۔ حضرت عائشہؓ کو حکم تھا، کہ دوبارہ خبردار ہرگز نہ کھانا۔

اگر ایک ہی بار کھانا ہو تو صبح کے وقت کھانا زیادہ اچھا ہے تاکہ رات تک پیٹ خالی ہو جائے اور نماز میں خضوع و خشوع رہے۔ اور اگر عبادت میں خطرے کا اندیشہ ہے، تو ایک روٹی رات میں اور ایک صبح کو کھالے۔
تیسری احتیاط مُرید کے لیے یہ ہے کہ سالن اور اچھے کھانوں سے احتیاط برتے۔ سب سے اچھی غذا گیہوں کا چھنا ہوا آٹا ہے، اور جو کا چھنا ہوا آٹا، متوسط لیکن جو کا بے چھنا آٹا ان دونوں سے نیچے کا ہے۔ اسی طرح

سالن میں بہترین چیز گوشت، اس کے بعد دالیں۔ پھر سرکہ اور نمک ہے۔ لہٰذا معرفت حاصل کرنے والے آدمی کو چاہیئے کہ ہر خواہش کی مخالفت کرے۔ یہ مقولہ اس گروہ کا ہے جو یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر نفس کی پیروی کرو گے تو غرور اور دُنیا کی ظلمات میں رہ کر موت سے گھبراؤ گے۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکے نفس کو اتنا دباؤ کہ دُنیا اس کے لئے تنگ ہو جائے۔

حدیث شریف میں ہے کہ شِرَارُ اُمَّتِی الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ مُخَّ الْحِنْطَۃِ (یعنی میری اُمت کے بدترین آدمی ہی آٹا چھان کر کھانے والے ہیں) لیکن اگر کبھی کبھی ایسا کرے تو حرج نہیں۔ آدمی کو عادی نہیں ہونا چاہیے۔

ارشاد نبوی ہے کہ میری اُمت کے بدترین آدمی وہ ہیں، جو نعمت دُنیا میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی مشغولیات صرف کھانے اور پہننے کی طرف ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر وحی نازل ہوئی، کہ اے موسیٰ تمہاری حقیقی جگہ قبر ہے۔ لہٰذا اپنے جسم کو خواہشات سے دُور رکھو — جن لوگوں کی تمام دنیوی خواہشات اور آرزوئیں بغیر کسی تکالیف کے پوری ہو جائیں۔ بزرگانِ دین نے اُن کو اچھا نہیں جانا ہے۔

کچھ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک گلاس میں شہد گھول کر پیش کیا تو جواب دیا کہ میں قیامت کو اس کا حساب دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت نافع سے روایت ہے کہ

ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک بار بیمار تھے، جی چاہا کہ مچھلی کھائیں۔ چنانچہ بمشکل تمام مچھلی تلاش کر کے منگائی گئی اور بھون کر سامنے پیش کی کہ ایک فقیر نے آ کر سوال کیا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ مچھلی اس فقیر کو دے دی جائے میں نے بہت اصرار کیا اور وہ ہر بار یہی حکم دیتے رہے کہ مچھلی اس کو دے دی جائے۔ چنانچہ مجبوراً دینا پڑی۔ جب فقیر وہاں سے چلا گیا تو میں پیچھے پیچھے گیا اور مچھلی کی قیمت فقیر کو دے کر واپس لایا۔ پھر پیش کی اور کہا کہ اس مچھلی کی قیمت فقیر کو دے دی گئی، تو کہا کہ مچھلی بھی اس کو دے دو۔ اس لیے کہ حضور کا فرمان ہے کہ جس چیز کو جی چاہے اس کو نہ کھاؤ۔ تو خداوندِ عالم بخشش کرتا ہے۔

مالک دینار رحمۃ اللہ علیہ نے دُودھ کی خواہش کے باوجود چالیس سال تک نہ پیا۔ ایک آدمی آپ کے پاس کھجوریں لایا، آپ نے لے کر کچھ دیر ہاتھ میں رکھیں۔ پھر واپس کر دیں اور فرمایا کہ میں چالیس سال پہلے اس کو نہ کھانے کا عہد کر چکا ہوں۔

احمد ابن ابوالخواری حضرت ابوسلیمان دارانی کے مُرید تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک دن مجھ سے نمک کے ساتھ روٹی کھانے کی خواہش کی۔ میں نے فوراً پیش کیا۔ آپ خدا سے رحم کے طالب ہوئے اور روٹی نہ کھائی، اس لیے کہ نفس کی خواہش کے خلاف کرنا تھا۔

مالک بن دینار کہتے ہیں کہ میں پچاس برس سے دُنیا سے الگ تھلگ رہتا ہوں، اور دُودھ کی برابر خواہش ہے، لیکن نہ پیا ہے اور نہ پیوں گا، یہاں تک کہ موت آجائے۔

حضرت عتبۃ العلام نے حضرت عبدالواحد بن زید سے کہا کہ ایک آدمی اپنے دل کا مرتبہ جو کچھ کہتا ہے، وہ بات میں اپنے میں نہیں پاتا۔ تو فرمایا کہ تم خرما اور گوشت کے عادی ہو، اور میں نانِ جویں کا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر اس کو ترک کردوں تو؟ تو فرمایا، ہاں! چنانچہ اس نے قطعی ترک کر دیا، اور روئے۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی، تو عبدالواحد بن زید رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ اس لیے روتے ہیں کہ اُن کا نفس خرمے کا شوقین ہے، لیکن اُن کا عزم اتنا راسخ ہے کہ وہ ہرگز نہ کھائیں گے۔

ابوبکر جلا سے روایت ہے کہ اُن کے شاگرد نے اُن سے کہا کہ ایک چیز کی اجازت دے دیجیے اور اس کے بدلے میں دس دن تک کچھ نہ کھاؤں گا۔ مگر انھوں نے دس دن تک کھانے کے لیے اجازت دی اور کہا کہ اس خواہش کو پورا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ تو برابر کھائے جا۔

حقیقتاً بزرگانِ دین کا راستہ تو یہ ہے، لیکن اگر اس مرتبے کو نہ پہنچ سکو تو کم از کم خواہشات سے دستبرداری حاصل کرلو، اتنی کہ ہمیشہ گوشت اور بالذت طعام نہ کھاؤ!

حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا کہ متواتر چالیس روز گوشت کھانے سے "دل" سخت ہو جاتا ہے۔ اور اگر قطعی نہ کھائے، تو بدخوئی آجاتی ہے۔

درجۂ اعتدال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی کہ ایک بار سرکے سے اور ایک بار سادی روٹی کھایا کرو! اور مستحب عمل یہ ہوگا کہ پیٹ جب بھرا ہو اس وقت سونے سے پرہیز کرے۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ کھانا صرف نماز اور ذکرِ خدا کے لیے کھاؤ، اور سونے سے دل سیاہ ہوتا ہے۔ بلکہ کھانے کے بعد چار رکعت نماز اور سو بار تسبیح پڑھا کرو۔ حضرت سفیان ثوری جب پیٹ بھر کھانا کھاتے تو رات بھر عبادت خدا میں مشغول رہتے۔ اور کہتے کہ حیوان سے کھانا کھلانے کے بعد زیادہ محنت لینا چاہیے۔ ایک مرشد نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی کہ لذیذ نہ کھاؤ اور اگر کھاؤ تو اُن کی تلاش نہ کرو۔ اور اگر تلاش بھی کرو تو اُن سے دلچسپی نہ ہونا چاہیے۔

گرسنگی کے اسرار

(پیر و مرید کے مدارج)

پیر و مُرید کے مختلف مدارج بھوک کا اصل مقصد نفس کو مارنا ہے، تاکہ وہ دب کر رہ سکے، اور جب تمھارا نفس دب جائے گا، تو دنیوی آلائشات سے لاپرواہ ہو جائے گا۔

پیر اپنے مرید کو ریاضت کے لیے ہدایت کرتا ہے۔ اور خود نہیں کرتا۔ کیونکہ ریاضت کا مقصد صرف بھوک

نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ معدے میں گرانی نہ ہو، اور زیادہ بھوک بھی نہ لگے ۔ اس لیے کہ دونوں چیزیں خواہشات میں داخل ہیں، اور ہر خواہش عبادت سے روکتی ہے، بلکہ صفات ملائکہ تو یہ ہیں کہ اُن کو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس ستاتی ہے۔

نفس پر جب تک اوائل عمری سے ہی جبر نہ کیا جائے ۔ اس وقت تک حدِ اعتدال میں نہیں آتا بعض بزرگانِ دین ہمیشہ اپنے پر بداعتماد رہے، اور ہمیشہ احتیاط کرتے رہے ۔ جو لوگ ان میں کامل تھے وہ حدِ اعتدال پر رہے ۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم یا تو اتنا روزہ رکھتے تھے کہ لوگ سوچتے تھے کہ اب کبھی نہ افطار فرمائیں گے اور کبھی روزہ نہ رکھتے تھے تو سمجھا جاتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے ۔

گھر میں اگر کوئی چیز مل جاتی تو کھا لیتے اور نہ ملتی تو فرماتے کہ میں روزہ رہوں گا ۔ شہد اور گوشت سے دلچسپی رکھتے تھے ۔

حضرت معروف کرخی کے پاس جو کوئی اچھے کھانے لے جاتا، تو آپ کھا لیتے، لیکن حضرت بشر حافی نہ کھاتے یہ دونوں بھائی بھائی تھے ۔ لوگوں نے حضرت معروف کرخی سے سبب پوچھا، تو فرمایا کہ میرے بھائی نے زہد کو اختیار کیا ہے اور میں معرفت کے اس درجہ پر ہوں کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے ۔ مجھے مہمان کی حیثیت سے جو ملتا ہے کھا لیتا ہوں، اور نہیں ملتا تو کوئی خواہش نہیں ۔ مجھے اب انکار اور اقرار کا اختیار نہیں رہا ہے بعض بیوقوف اس بات پر اعتراض بھی کرتے ہیں ۔

نفس کی مخالفت نہ رکھنے والا آدمی حضرت کرخیؒ کا مقلد بنتا ہے ——— سوائے دو قسم کے آدمیوں کے ریاضتِ نفس کوئی نہیں چھوڑتا ۔ پہلے صدیق جس نے اپنا مقصد صحیح صحیح حل کر لیا ہو۔

دوسرا بیوقوف جس کو اس کی ضرورت ہی نہیں ۔ اور وہ اپنے کو خواہ مخواہ ہی اس مرتبے کا مالک سمجھتا ہے ۔

حضرت معروف کرخی پر لوگ کبھی کبھی ہنستے ۔ لیکن آپ اس مرتبے پر پہنچ گئے تھے کہ کبھی غصّہ نہ آتا بلکہ سوچتے کہ یہ سب من جانبِ اللہ ہو رہا ہے ۔ لہٰذا احتیاطوں کی حدود سے باہر رہنا ایسے ہی آدمی کا کام ہے۔

حضرات بشر حافیؒ، سری سقطی اور مالک و دینار رحمۃ اللہ علیہم اس قسم کے بزرگوں سے تھے جو اپنے نفس سے مطمئن نہ رہے تھے اور اسی لیے برابر ریاضت میں مشغول رہے ۔

ترکِ خواہشاتِ دُنیا

خواہشاتِ دنیا کو ترک کرنا بھی ایک آفت ہے

آدمی خواہشات کو ترک کرنے سے دو مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔

پہلے یہ کہ انسان ترکِ خواہشات پر قادر نہیں ہوتا، اور دنیا سے ڈرتا ہے کہ اس کے اسرار سے کوئی آدمی واقف نہ ہو ۔ وہ سب خواہشات کو تنہائی میں پورا کرتا ہے ۔ یہ منافقت کی دلیل ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ عادت بڑھ کر غرور کا درجہ اختیار کرے اور وہ سوچے کہ اس میں لوگوں کا فائدہ ہے ۔ لہٰذا کیوں نہ میری

تقلید کریں، یہ قطعی فریب اور مکاری ہوگی۔

دوسرے وہ آدمی جو اپنی خواہشات کے عوض چیزیں لیتا تو ہے، لیکن خود استعمال نہیں کرتا۔ یہ صدق و سچائی کی اعلیٰ دلیل ہے اور انتہائی دُشوار منزل ہے، لیکن اخلاص نیت کا معیار جب پیدا ہوتا ہے کہ سب معاملات آسان ہوجائیں اور کسی کام میں دُشواری پیدا نہ ہونے پائے۔ اگر آدمی دُشواری محسوس کرے گا اس میں گویا کہ کوئی کمی ضرور ہے، اور اگر ریاکاری ہے تو وہ حق سے دُور لے جاتی ہے۔ جو آدمی کھانوں کی خواہشات کے ماتحت ریاکاری میں مبتلا ہے، وہ ایسا ہے کہ بارش سے حفاظت کرے اور پرنالے کے نیچے جاکر کھڑا ہوجائے۔ اور اگر نفس میں اس قسم کی ریاکاری آجائے تو چاہیے کہ لوگوں کے سامنے کچھ نہ کچھ کھائے تاکہ خواہش اور ریاکاری دونوں کا خاتمہ ہوسکے۔

خواہشاتِ جماع و بدکاری

زناکاری اور جماع کے گناہ

جماع کی خواہشات صرف اولاد پیدا کرنے کے لیے ودیعت کی گئی ہے۔ اس میں ایک لطف جنّت کا سا بھی مضمر کر دیا گیا ہے۔ اس خواہش کے مصائب بھی اتنے ہی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شیطان نے کہا کہ تنہا عورت کے پاس نہ بیٹھے۔ اس لیے کہ ایسے مواقع کا خصوصاً میں متلاشی رہتا ہوں تاکہ بدکاری پر دونوں کو آمادہ کردوں۔

حضرت سعید فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں پیغمبرانِ الوالعزم جتنے ودیعت ہوئے۔ اُن کو عورت کے معاملے میں شیطان بہکانے سے قاصر رہا۔ میں سب سے زیادہ اِس بات سے ڈرتا ہوں اور اسی لیے سوائے اپنے یا اپنی بیٹی کے گھر کے کہیں نہیں جاتا۔

اور خواہشات اور اعمال کی طرح اس میں بھی زیادتی کمی اور حدِ اعتدال ہے۔

زیادتی یہ ہے کہ آدمی خواہشات میں اپنا تن من دھن سب کچھ بغیر کسی آدمی کے شرم و لحاظ کے اسی میں لگادے۔

کمی یہ ہے کہ آدمی کو جماع کی قطعی خواہش ہی نہ ہو۔ یہ بھی نقصان دہ ہے۔

درجہ اعتدال یہ ہے کہ خواہش ہو، مگر دل کی مطیع رہے۔

بعض لوگ تو شہوت بڑھانے کے لیے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بھِڑ کے چھتے کو چھیڑ دیا جائے۔ لیکن اگر صرف اپنی بیوی کے لیے اگر استعمال کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنی بیویوں کا سہارا ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں نے جب اپنے میں ضعفِ شہوت دیکھا تو حضرت جبرئیل نے مجھے ہریسہ (کھچڑا) کھلایا۔ وہ اس لیے کہ آنحضرتؐ کی نو مخدرات تھیں اور اُن کی ضرورتوں کو پورا کرنا فرض تھا۔

شہوت کی ہی ایک قسم عشق ہے، جو زیادہ تر گناہوں کا سبب ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے احتیاط نہ کی جائے تو پھر قابو سے باہر ہو جائے گا۔ اس کی احتیاط اور بچت کا طریقہ یہ ہے کہ

نامحرمات عورتوں کو نہ دیکھے اگر کسی پر اتفاقاً نگاہ پڑ جائے تو دوبارہ احتیاط کرے۔ ورنہ پھر بہت مشکل ہوگا۔ نفس شہوت اس معاملے میں قطعی حیوانوں کی طرح ہے کہ پہلے پہلے تو اس کو جس طرح چاہو سدھا سکتے ہو اور اگر اس میں کوئی ہٹ پیدا ہو جائے گی۔ تو پھر قابو سے باہر ہو جائے گا۔ لہٰذا اپنی آنکھ کو محفوظ رکھو۔

حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ جناب داؤد علیہ السلام محض اپنی آنکھ کی وجہ سے مصائب میں مبتلا ہوئے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی کہ شیر اور چیتے کا پیچھا کر لینا لیکن عورت کا پیچھا نہ کرنا۔

لوگوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ زنا کی وجہ کیا ہوتی ہے تو فرمایا کہ آنکھ ———

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر "نگاہ" ہے۔ جو آدمی اپنی آنکھ کو خوفِ خدا سے محفوظ رکھتا ہے، اس کو ایمان مرحمت ہوتا ہے۔ اور میں اپنے مرنے کے بعد عورتوں سے زیادہ کوئی فتنہ نہ چھوڑوں گا۔ اور فرمایا کہ آنکھ اسی طرح زنا کرتی ہے، جیسے آدمی ——— دیکھنا، آنکھ کا زنا ہے۔ جو آدمی اپنی آنکھ کو محفوظ نہ کر سکے، شہوت کے لیے ریاضت کرنا اس کو ضروری ہے، اور اس کی تدبیر "روزہ" ہے۔ یا پھر عقد کرے اور اگر آدمی لونڈوں کو بُری نگاہوں سے دیکھے تو یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔

لیکن آنکھ کے ذریعہ رنگا رنگی عالم اور تر و تازہ پھولوں کو دیکھنا اور اس سے حظ حاصل کرنا بُرا نہیں۔ اور اگر اس سے شہوت پیدا ہو تو بُرا ہے۔ اور یہ لواطت کا پہلا زینہ ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر بھوکا شیر مجھ پر حملہ کرے تو میں اتنا خوفزدہ نہ ہوں گا جتنا مرد پرست کی وہ نگاہ جو لونڈے پر پڑتی ہے۔ ایک بزرگ نے اپنے مُریدوں سے کہا کہ ایک بار مجھ پر اتنی شہوت طاری ہوئی کہ تاب ضبط باقی نہ رہی، تو میں نے خداوندِ عالم کی درگاہ میں دُعا کی کہ اس آفت سے بچائے رکھے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص نے مجھ سے واقعہ دریافت کیا، میں نے اُن کو سب حال کہہ سنایا۔ اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو کچھ سکون محسوس ہوا۔ ایک سال گزرنے کے بعد میری پھر وہی حالت ہو گئی۔ اور پھر اسی شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہا ہے کہ تو شہوت سے خلاصی چاہتا ہے۔ میں نے کہا ہاں! اس نے کہا گردن جھکا دے۔ میں نے جھکا دی! اس نے میری گردن تلوار سے اُڑا دی۔ اس کے بعد بہت کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن پھر ایک سال بعد وہی کیفیت طاری ہو گئی اور پھر اسی شخص کو دیکھا، تو کہا کہ کب تک اس کو دُور کرنے کی دُعا کرتا رہے گا۔ اس لیے کہ خدا مرد سے یہ خواہش دُور کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد مجبوراً میں نے عقد کر لیا۔ اور جب مطمئن ہو سکا۔

زنا سے اجتناب کا ثواب

آدمی میں جس قدر شہوت ہوگی اور وہ اس کو جتنا مغلوب کرے گا، اتنا ہی اس کو ثواب ہوگا۔ شہوت سے بڑھ کر انسان پر کسی چیز کا غلبہ نہیں۔ بعض لوگ شہوت کو شرم سے بعض خوف سے اور بعض عجز و انکساری کی وجہ سے نہیں بجھاتے، کہ کہیں بدنام نہ ہو جائیں۔ اگر آدمی ان وجوہ کی بنا پر شہوت کو دبائے تو اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اس لیے کہ یہ دنیا کے لیے ہے، نہ کہ دین کے لیے۔

عجز بہر حال کیونکہ باعثِ نیکی ہے، چاہے وہ کسی وجہ سے بھی کیوں نہ ہو۔ بہر حال انسان گناہ سے محفوظ رہا ہے۔ اگر کوئی آدمی زنا کر سکتا ہو اور وہ صرف خدا کے خوف سے نہ کرے تو یہ بڑا ثواب ہے اور وہ ان سات آدمیوں میں محشور ہوگا جو روزِ قیامت سائے میں ہوں گے اور وہ مراتب میں جناب یوسف ؑ کا ہم پلہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ انھیں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔

سلیمان بن بشار انتہائی حسین آدمی تھے۔ ایک عورت نے اُن سے آکر التجا کی، انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا اور اسی رات جناب یُوسف علیہ السلام کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس عمل کے ارتکاب کا قصد کیا لیکن تو نے ارادہ بھی نہ کیا۔ اور یہ آیت اسی واقعہ سے متعلق ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا الخ

انھیں کا ایک دوسرا مقولہ ہے کہ ایک بار حج کو جا رہا تھا، جب مدینے کی چار دیواری سے نکل گیا، تو "ابوا" (ایک جگہ کا نام ہے) میں ٹھہرا۔ ایک عورت میرے پاس آئی جو انتہائی حسین تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا، میں نے سمجھا روٹی کی طالب ہے۔ تو میں نے اس کو دینا چاہا۔ اس نے کہا کہ میں یہ نہیں مانگتی، بلکہ ...... وہ چاہتی ہوں، جو سب عورتیں مردوں سے چاہا کرتی ہیں۔ میں سر جھکا کر اتنا رویا کہ وہ واپس چلی گئی۔ جب میرا دوست بازار سے واپس آیا اور مجھے روتا دیکھا تو معاملہ دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ گھر کی یاد میں رو رہا ہوں۔ اس کو یقین نہ آیا اور کہنے لگا کہ صحیح صحیح بات بتائیے! جب وہ مجھ سے مُصر ہو گیا تو سب کچھ کہنا پڑا۔ وہ بھی رو دیا۔ میں نے پُوچھا کہ تم کیوں روتے ہو؟ اس نے کہا کہ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ہرگز اس عورت کو خالی واپس نہ جانے دیتا۔ اس کے بعد جب ہم حج سے فارغ ہوئے، تو ایک حجرے میں بیٹھے تھے۔ میں سو گیا، تو خواب میں انتہائی حسین انسان کو دیکھا۔ میں نے نام دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا میں یوسف (پیغمبر) ہوں۔ میں نے عرض کی یُوسف صدیق (علیہ السلام) جواب ملا، ہاں! میں نے کہا کہ عزیز کی عورت کے ساتھ آپ کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ آنحضرت نے جواب دیا کہ ان عرب کے ساتھ تمھارا واقعہ بھی تو بہت عجیب پیش آیا ہے۔

(روایت) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک بار فرمایا کہ کسی زمانے میں تین آدمی ایک سفر کو گئے۔ جب رات ہوئی تو اپنی حفاظت کے لیے ایک غار کو جائے امن بنایا۔ اتفاقاً رات کو پہاڑ سے

ایک پتھر آکر اس غار کے راستے پر گرا - اب باہر جانے کا راستہ بھی بند ہو گیا - وہ لوگ اپنی جانوں سے نا اُمید ہو کر خدا کی درگاہ میں دُعا کرنے لگے - تینوں ساتھیوں میں سے ایک نے دُعا کی کہ بارِ الٰہا تو گواہ ہے کہ میں کبھی ماں باپ سے پہلے نہ خود کھاتا تھا اور نہ اپنے بچوں اور بیوی کو مقدم رکھتا تھا - ایک بار میں ذرا دیر سے گھر واپس ہوا اور وہ دُودھ کا پیالہ جو " اُن کے لیے " میں لے جایا کرتا تھا، اس دن بھی لے گیا تھا، لیکن وہ سو چکے تھے، میں اُن کے اُٹھنے کے انتظار میں سراہنے کھڑا ہو گیا - میرے بچوں نے ہر چند اصرار کیا، مگر میں نے اُن کی قطعاً پروا نہ کی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی -

اور اے پالنے والے! تجھے معلوم ہے کہ وہ سب عمل تیری رضا کے لیے تھا - اس کے بعد پتھر اس راستے سے ذرا ہٹ گیا، لیکن ابھی وہاں سے نکلنے کا راستہ نہ ہوا تھا -

اِس کے بعد دوسرے نے دُعا مانگی —— کہ پالنے والے تجھے معلوم ہے کہ میں اپنی چچا زاد بہن پر جان و دل سے عاشق تھا اور اس کے وصال کی تمام تر کوششیں کر رہا تھا - یہاں تک کہ قحط کی وجہ سے ایک دن اس کو ضرورت پڑی اور میں نے اپنی خواہشات کو دُور کرنے کے لیے اس کو ایک سو بیس دینار پیش کیے - لیکن جب ارادہ کیا تو اس نے کہا کہ اے برادرِ عم! تجھے خدا سے خوف نہیں کہ اس کی امانت کو بغیر اس کی اجازت کے لے رہا ہے —— بارِ الٰہا! اس کے اس جملے نے مجھ پر اثر کیا، اور میں خواہشات سے باز رہا - اور اے پروردگار! یہ سب کچھ تیری رضا جوئی کے لیے تھا —— وہ ابھی دُعا مانگ چکا تھا، کہ پتھر نے اور جنبش کی، لیکن اب بھی اُن لوگوں کے باہر نکلنے کا راستہ نہ تھا!

اس کے بعد تیسرے ساتھی نے دُعا کی، بارِ الٰہا! ایک بار جبکہ میں نے مزدوری کے لیے چند مزدور لگائے - اُن میں ایک مزدور بغیر مزدوری لیے چلا گیا - میں نے اس کی مزدوری کے پیسے تجارت میں لگائے اور اس میں بہت فائدہ ہوا - ایک زمانے کے بعد جب مزدور آیا تو میں نے اس کا تمام منافع جو اس وقت تک جمع کیا تھا اس کے سپرد کر دیا - اے پروردگار! تجھے علم ہے کہ وہ سب صرف تیری رضا کے ماتحت تھا، تو ہماری مدد فرما! ابھی دُعا ختم کر رہا تھا کہ پتھر کو جنبش ہوئی اور راستہ صاف ہو گیا -

(روایت) حضرت بکر بن عبداللہ مزنی سے روایت ہے کہ قصاب اپنے ہمسائے کی لڑکی پر عاشق تھا - ایک دن وہ کھیت میں جا رہی تھی، قصاب بھی وہاں پہنچا اور اس سے مباشرت چاہی - لڑکی نے جواب دیا، کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور ملنا بھی چاہتی ہوں، لیکن خدا کے قہر سے ڈرتی ہوں - قصاب کے دل میں اس کا ایک جملہ اثر کر گیا اور اس کو خوفِ خدا سے چھوڑ دیا - وہ واپس آ رہا تھا کہ پیاس نے غلبہ کیا - اور چاروں طرف پانی نہ ملنے سے جاں بلب ہو گیا - اس وقت اس طرف سے ایلچی خلیفۂ وقت کا گزر ہوا - اس نے قصاب سے دریافت کیا -

اور کہا کہ دعا کرو کہ جب تک ہم شہر میں پہنچیں ہم پر پیاس کی سختی نہ ہو۔ قصاب نے جواب دیا کہ میں عابد نہیں کہ میری دعا قبول ہو، بلکہ آپ دعا کیجیے میں آمین کہتا ہوں۔ یہاں تک کہ دعا میں مشغول ہوئے اور ابرِ رحمت نے اُس پر سایہ کیا۔ لیکن وہ ایلچی دھوپ میں ہی رہا، تو قصاب سے دریافت کرنے لگا۔ اے شخص! تو کہتا ہے کہ میں عابد نہیں ہوں سچ سچ بتا تو کون ہے؟ قصاب نے کہا کہ مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں معلوم، لیکن ایک توبہ اس کی ہے اور وہ واقعہ سُنا دیا۔ ایلچی نے کہا تو سچ کہتا ہے۔ خداوند عالم کے نزدیک توبہ کرنے والوں کے مراتب یہ ہی ہیں۔

نامحرم پر نگاہ ڈالنے کا گناہ

نامحرم یہ بات بہت مشکل ہے کہ آدمی جس کام کو چاہے وہ واقعی بھی نہ کر سکے، لیکن اگر شروع سے ہی اس کی احتیاط برتے گا تو شاید کامیاب ہو سکے اور اس کی ابتدا آنکھ سے کرنا چاہیے۔

حضرت علا ابن زیاد کا مقولہ ہے کہ عورتوں کی چادر کو نہ دیکھو، اور نہ ان کی خوشبو سونگھو۔ یہاں تک کہ اُن سے پیغام سلام بھی نہ ہونا چاہیے۔ ایسی جگہ نہ جاؤ جہاں غیر عورتیں تمھاری نظر پڑیں۔ اس لیے کہ جب حسین عورت کو دیکھو گے خواہشات میں اضافہ ضرور ہوگا۔

اسی طرح خوبصورت عورت کو مرد سے پرہیز کرنا لازمی۔ اگر قصداً نظر ڈالے گی تو حرام ہوگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو آدمی کسی سے عشق کرے اور اس پر قطعی اظہار نہ کرے، یہاں تک کہ اس کی یاد میں مر جائے، وہ آدمی شہید مرتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ اگر بغیر ارادے کے کبھی نظر پڑ گئی تو وہ حرام نہ ہوگی۔ اس کے بعد قصداً نہ دیکھنا چاہیے اور نہ اس کی تلاش کرنا ہی مقصود قرار دینا اچھا ہے۔

عورتوں اور مردوں کا یکجا جمع ہونا برابر ہے۔ اس سے زیادہ باعث فساد کوئی چیز نہیں۔ عورتیں یہ جو نقاب ڈالتی ہیں اور تکلف چادر اوڑھتی ہیں یہ بھی باعثِ فساد بن جاتی ہیں۔ بعض عورتیں تو صرف اپنی زینت بڑھانے کے لیے ایسا کرتی ہیں۔ لہٰذا ایسی عورت گنہگار ہے۔ نیز اس کے ماں باپ بھائی اور شوہر جو اس کو اس کی اجازت دیں وہ بھی اس گناہ میں شریک ہوں گے۔ کسی مرد کو عورتوں سے لین دین کرنا گناہ ہے۔ یا اُن کے کپڑوں کو مس کرنا یا اُن سے نامہ و پیام کرنا، یہ سب شہوت کو بڑھاتے ہیں۔ اور اگر کبھی بات کرنے کا اتفاق ہو جائے تو نہایت بے توجہی اور سختی سے بات کرنا چاہیے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ آنحضرتؐ کی ازواج کے لیے حکم ہے کہ غیروں سے نرم لہجے میں بات نہ کرو، اس لیے کہ اگر اُس کے دل میں کوئی کھوٹ ہے اور تمھاری طمع کرے گا، بلکہ عام باتیں کرو۔

جس عورت نے کوئی میوہ مُنہ سے کاٹ دیا ہو یا جس برتن میں پانی پیا ہو۔ اس کو استعمال نہ کرو۔ حکیمؒ فرماتے

کہ حضرت ابوایوب انصاری آنحضرتؐ کے پانی پینے کا گلاس مقدس سمجھ کر اس میں پانی پیتے تھے، اور ہاتھوں کو لگاتے تھے۔ لیکن عورت کا جھوٹا برتن استعمال کرنا بُرا ہے۔ اور اگر کسی لذت کی وجہ سے آدمی عورت کا جھوٹا کھائے تو یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ عورتوں کے استعمال کی چیزیں مردوں کو استعمال نہ کرنا قطعی ضروری ہے۔

عورت اور خوبصورت لڑکے کو بہ شوق دیکھنے کے لیے تم کو شیطان متوجہ کرتا ہے، تو تم اس کے کہنے کے خلاف کرو، تاکہ وہ رنجیدہ ہو کر تم سے دُور ہو جائے۔ اس لیے کہ عورت یا لڑکا حسین ہے اب بھی اس کو دیکھنا ناجائز ہے۔ اور اگر اس کا پیچھا کرے گا تو گویا کہ دین کو دُنیا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

عملِ آنحضرتؐ ایک بار راستے میں اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ایک عورت پر پڑ گئی۔ آپ وہیں سے گھر واپس ہوئے، اور اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت فرمائی اور غسل فرما کر باہر تشریف لائے۔ اور حکم دیا کہ جس آدمی کے سامنے عورت آجائے اور شیطان اس کو حرکت میں لائے تو وہ فوراً گھر جا کر اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرے۔ اس لیے کہ جو چیز غیر عورت کے پاس ہے وہ ہی تمھاری بیوی کے پاس بھی ہے۔ واللہ اعلم

تیسرا اصُول

بابُ الکلام

زبان اور گفتگو کے متعلق

زبان دیکھنے میں اگرچہ ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، لیکن درحقیقت دنیا کی ہر چیز اس کی محکوم ہے، بلکہ عدم کی تمام باتیں بھی اس کی تحت ہی ہیں۔ چونکہ عدم و وجود اسی کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہ عقل کی جگہ کام کرتی ہے اول ہر بات عقل میں آتی ہے اور زبان اس کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے اعضاء کو یہ مراتب حاصل نہیں ہیں۔ اس کی حکومت تمام جسمانی اعضا پر ہے۔ تمام اعضا کے اقتباسات دل میں جاگزیں ہوتے ہیں اور دل سے زبان پر آتے ہیں اور باہر سے تمام جذبات کو لے کر دل کو دیتی ہے اور جو کچھ وہ اثرات لے کر دل کے سپرد کرتی ہے۔ "دل" اس کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً رنج کے الفاظ زبان سے نکالے جائیں، تو دل رنجیدہ ہوتا ہے، اور "دل کے بخارات دماغ کی طرف جا کر آنسو پیدا کرتے ہیں، جو آنکھ کے ذریعہ باہر نکلنے لگتے ہیں۔

بیکار بولنا ہی دُنیا کی گمراہی کا سبب ہے اسی طرح جب لطف و خوشی کے الفاظ ادا کئے جائیں گے تو دل میں مسرت کا جذبہ پیدا ہو کر شہوت و مسرت کی اُمنگیں عود کرتی ہیں، اور اگر بُری باتیں زبان پر آئیں گی تو دل تاریک ہو جاتا ہے اور خدا کی معرفت کے متعلق اگر زبان سے الفاظ نکلیں گے تو دل منور ہوتا ہے۔ غرضیکہ زبان کے اثرات، دل پر کافی ہیں، یہاں تک کہ تمام اشیاء کی ہئیت کذائی زبان کے ماتحت اس میں نقش کر لیتی ہے۔ اسی لیے شاعر کے تخیلات اور

جھوٹے کا خواب کبھی سچا نہیں ہوتا۔

اور جس طرح جھوٹا آدمی سچا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح درگاہ ایزدی میں بھی اس کو کوئی چیز حقیقی معنی میں نظر نہیں آتی، اور سعادت سے محروم رہتا ہے۔ یوں سمجھو کہ جس طرح خراب آئینے میں صورت بُری اور ٹیڑھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح زبان کی بُرائیوں سے دل ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور وُہ دنیا میں گمراہ ہو کر سعادت ابدی حاصل نہیں کر پاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ دل اگر ٹیڑھا ہے تو ایمان صحیح نہیں ہوتا اور دل اس وقت تک راہِ راست پر نہیں آتا جبکہ زبان صحیح کام نہ کرے۔

لہٰذا زبان کو قابو میں رکھنا ایک ریاضت ہے اور دین کی خدمت پہلے اس اصول کے ماتحت خاموش رہنے کی فضیلتیں اور اس کے بعد زیادہ بک بک کرنے کے عیوب پر روشنی ڈالیں گے۔ جن سے ہجو، غیبت، نکتہ چینی اور جھوٹ پیدا ہوتے ہیں، اور ان باتوں کی وجہ سے انسان میں کون کون سے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کو قعرِ مذلت میں پھینک دیتے ہیں۔

خاموشی

جب کہ بتا دیا گیا کہ تمام گناہوں کا سرچشمہ صرف بیہودہ اور جا بے جا زبان چلانا ہے تو خاموشی سب سے بہتر ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ حتی الامکان زیادہ نہ بولے۔

ابدال کی پہچان یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ سوئے نہ کھائے اور نہ بولے خداوندِ عالم کا ارشاد ہے کہ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (یعنی سوائے اچھی صلاح یا صدقے کا حکم دینے کے پوشیدہ طور پر باتیں کرنا بُرا ہے) آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ خاموشی میں نجات ہے۔ خداوند عالم کہتا ہے کہ جس آدمی نے اپنے جسم کو پیٹ و مباشرت اور زبان کے شر سے بچایا۔ وہ سب گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت معاذؓ نے بارگاہِ نبوی سے دریافت کیا کہ سب سے افضل کونسا عمل ہے؟ تو حضورؐ نے زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچتے تھے اور اس کو ملتے تھے۔ میں نے سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ اس کی وجہ سے میں بہت سے گناہ کرتا ہوں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ انسان کے زیادہ گناہ اس کی زبان میں مضمر ہیں اور سب سے زیادہ نیکیاں خاموشی میں۔ اور جو آدمی خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ یا تو وہ خاموش رہے اور اگر بولے تو اچھی باتیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے بہشت میں جگہ پانے کا سبب دریافت کیا، تو فرمایا کہ باتیں زیادہ نہ کرو۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ایسا نہیں کر سکتے تو اچھی باتیں کرو!

حکم آنحضرت صلعم آنحضرت صلعم کا حکم یہ ہے کہ جب کسی وجیہہ اور خاموش مومن کو دیکھو تو اس کے پاس جاؤ! یقیناً اس میں کچھ خوبیاں ہوں گی۔

آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ زیادہ بولنے والا آدمی زیادہ تر جھوٹا ہی ہوتا ہے، اور زیادہ جھوٹا آدمی ہمیشہ گنہگار ہوتا ہے، اور زیادہ گنہگار دوزخی۔ اور اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق منہ میں پتھر رکھے رہتے تھے کہ زیادہ باتیں نہ کر سکیں۔ حضرت ابو مسعود کا مقولہ ہے کہ قید خانے میں خوش کلامی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

کچھ لوگ حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے باتیں کر رہے تھے اور حضرت احنف خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اُن سے کہا کہ آپ کیوں خاموش ہیں؟ جواب دیا کہ اگر سچ بولوں تو تم سے ڈر لگتا ہے، اور جھوٹ بولوں تو خدا سے۔

ربیع بن خثیم نے دنیا کے متعلق بیس برس تک باتیں کرنے سے پرہیز کیا۔

زبان کے گناہ لاتعداد ہیں۔ اسی لیے خاموشی میں نیکیاں بھی لاتعداد ہیں۔ زیادہ بولنا بظاہر تو اچھا لگتا ہے لیکن اس کے تلخ نتائج زیادہ بُرے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کیوں خاموشی اختیار کی جائے۔ خاموشی ان تمام آفات سے محفوظ رکھتی ہے اور خواہ مخواہ آدمی خدا کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ آدمی چار قسم کی باتیں کرتا ہے:

یا (۱) تو وہ باتیں جن میں فقط نقصان ہی نقصان ہو۔

یا (۲) وہ باتیں جن کے کرنے سے نقصان اور نفع دونوں مساوی ہوں۔

یا (۳) وہ باتیں جو فضول ہوں، نہ نقصان دہ ہوں نہ نفع بخش

چوتھے (۴) وہ باتیں جو فقط مفید ہی مفید ہوں۔

لہٰذا اوپر کی تین قسم کی باتیں کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اور آخری قسم کی باتیں خداوند عالم کے ارشاد کے مطابق ہیں۔ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ الآیہ آنحضرت صلعم کے ارشاد کے موجب اس کی حقیقت اس وقت تک سمجھ میں نہ آسکے گی جب تک زبان کے گناہوں کو نہ سمجھ لے۔ لہٰذا اوّل ان کا ذکر شرح و بسط کے ساتھ کر دیا جائے۔

زیادہ بولنا گناہ ہے

زبان کا پہلا گناہ بغیر کسی ضرورت کے کوئی بات کہی جائے، اور اس کے نہ کہنے میں دُنیا اور دین کی کسی چیز کا اندیشہ نہ ہو تو مندرجہ ذیل حدیث کے ماتحت اسلام کی اچھائی کے خلاف کرے گا۔ حدیث ہے کہ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ یعنی غیر ضروری باتوں کو ترک کر دینا اسلام کی خوبیوں میں داخل ہے) اس کی مثال دے کر ہم سمجھاتے ہیں۔

کہ مثلاً تم نے کہیں سفر کیا اور اپنے دوستوں میں اس کے ذرا ذرا سے گوشے اور ایک ایک نکتہ بیان کرو۔

زیادہ بولنا گناہ ہے

چاہے وہ سب صحیح ہی ہوں تو بھی بے فائدہ ہی ہے، اِس لیے کہ اس کے کہنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ اسی طرح بیکار بات دریافت کرنا بھی بُرا ہے۔ چاہے ثواب کی باتیں ہی دریافت کرنا ہو، مثلاً کسی سے دریافت کرو، کہ تمھارا روزہ ہے؟ اور اس کا درحقیقت روزہ نہیں ہے اور اس نے تم کو روزہ بتایا، تو اس کے جھوٹ میں تو بھی شامل ہو جائے گا۔ اسی طرح کسی سے سوال کرے کہ کہاں سے آرہے ہو، کیا کرکے آرہے ہو، اور مخاطب اصل معاملہ نہ بتانا چاہے تو وہ کچھ جھوٹ بولے گا، اس میں تو ضرور شامل ہوگا۔ چونکہ جھوٹ بذاتِ خود گناہ ہے۔ بہترین بات وہ ہے جس میں لگاوٹ کا کوئی شائبہ ہی نہ ہو۔

مروی ہے کہ لقمان حکیم ایک سال تک متواتر جناب داؤد کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتا رہا اور حضرت داؤد کو روزانہ زرہ بناتے ہوئے دیکھتے تھے، لیکن کبھی نہ دریافت کیا۔ چنانچہ انھوں نے زرہ مکمل کرکے ایک دن پہنی۔ اور خود ہی فرمایا کہ زرّہ لڑائی کا بہترین لباس ہے۔ لقمان نے سُنا اور سوچا کہ خاموشی بہترین حکمت کی دلیل ہے لیکن لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔

دراصل اس میں ایک حرص کا مادہ شامل ہے کہ آدمی خواہ مخواہ دوسروں کی بات میں مخل ہونا چاہتا ہے کہ اس کی خوشی سے اظہارِ عقیدت کر سکوں۔ لہٰذا اس کے لیے آدمی کو سوچنا چاہیے کہ ہر آدمی کے لیے موت نزدیک آرہی ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ عبادت میں مشغول رہے تاکہ اپنے وقت کو ضائع نہ کرے۔ یہ قاعدہ تو علمی ہے اور عملی علاج یہ ہوگا کہ آدمی مُنہ میں پتھر رکھ لے۔

حدیث ہے کہ ایک آدمی جنگِ احد میں شہید ہوا۔ لوگوں نے دیکھا کہ بھوک کی وجہ سے اس کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے چہرے کو صاف کرکے دعا دی کہ خُدا تجھ کو جنت مُبارک کرے۔ آنحضرتؐ نے اس سے فرمایا کہ تجھے کیا خبر؟ کہ اس نے ایسی چیز میں تعجیل برتی ہو جو اس کے کام کی نہ ہو۔ مقصد یہ ہوا کہ اس قسم کی چیزوں کا بھی وہاں حساب کیا جائے گا۔

خوش کلام آدمی وہ ہے جس سے وہاں کوئی حساب نہ لیا جائے گا۔

ایک دن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک بار بیٹھے بیٹھے حاضرین سے فرمایا کہ اس وقت سامنے ایک جنّتی آدمی آرہا ہے۔ حاضرین نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام تشریف لا رہے ہیں۔ لوگوں نے ارشادِ حضورؐ سے اُن کو مطلع کیا، اور اُن سے دریافت کیا کہ آپ میں ایسی کیا خوبی ہے؟ تو فرمایا کہ مجھے جس چیز سے کوئی مطلب نہ ہو، میں اس کے پیچھے کوئی تگ و دو نہیں کرتا، اور لوگوں کا بدخواہ نہیں ہوں۔

اگر ایک بات ایک ہی جملے میں کہی جا سکتی ہے، تو اس کو طول دینا فضول ہے اور وہ باعثِ وبال ہے۔ ایک صحابی رسولؐ نے فرمایا کہ بعض باتیں اتنی اچھی ہوتی ہیں کہ اُن کے جواب سے میری پیاس بُجھتی ہے اور بعض تلخ

باتیں ایسی ہیں کہ اُن کا جواب نہیں دیتا۔

مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ کوشش کرو کہ ہر بات میں خدا کا نام ہو جیسا کہ جانوروں سے کبھی کبھی کہہ دیتے ہو کہ خدا تجھے ایسا کر دے۔ یہ بات تمھارے لیے باعثِ ثواب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ زبان درازی سے زیادہ بُری چیز آدمی کے لیے کوئی نہیں۔

ہم لوگ دن بھر جو کچھ کرتے ہیں اور کہتے ہیں وہ سب حساب میں لکھا جاتا ہے۔ اگر کہیں فرشتے ہم سے اس حساب کتاب کی اُجرت لینے لگتے تو ہم فضول باتیں ہی نہ کرتے۔ لہٰذا اس کو سوچو اور کم بولو!

دوسری مصیبت یہ ہے کہ انسان باطل اور گناہوں کی باتیں کرے۔

باطل گفتگو یہ ہے کہ انسان بدعادت ہو۔

گناہ یہ ہے کہ فسق و فجور کی باتیں کرے اور سنے۔ یا لڑائی جھگڑوں کے قصے بیان کرے یا ایسی باتیں کرے کہ جن کو سن کر ہنسی آئے

یہ تمام باتیں پہلے گناہ کی طرح ہی ہیں ——————

حدیث ہے کہ بعض آدمی ایسی باتیں کرنے میں بہادر ہوتا ہے، جو اس کو دوزخ کے راستے پر لگا دیتی ہیں۔ اور بعض آدمی نیک باتیں انتہائی پیشانی سے کہتا ہے جو اس کو جنت کا راستہ دکھاتی ہیں۔

تیسری آفت یہ ہے کہ آدمی بات بات میں جھگڑا کرے۔ بعض آدمیوں میں ہر بات کی مخالفت کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے، یہ نادانی کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں دوسرے کو جاہل سمجھتا ہے اور اپنے کو لائق اس کی یہ بات دو صفات مذمومہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ ۱ تکبر۔ ۲ درندگی۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی خصومت اور مخالفت سے پرہیز کرتا ہے۔ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنتا ہے اور جو آدمی اچھی بات کہنے سے بھی احتیاط برتتا ہے۔ اس کو فردوس اعلیٰ میں جگہ ملتی ہے۔ اس کے ثواب کی وجہ یہ ہے کہ محال اور جھوٹ باتوں پر صبر کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا اس کو یہ درجہ عنایت ہوا ہے۔ اور ایمان کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب کہ آدمی دوسروں کی غلط باتوں کی بھی مخالفت ترک کر دے۔

یہ مخالفین صرف مذہبی ہی نہیں بلکہ ہر بات میں کوئی مخالفت نہیں ہونا چاہیے۔ آنحضرتؐ کا حکم ہے کہ کسی کی بات کی مخالفت کا کفارہ دو رکعت نماز سے ادا ہوتا ہے —— اس گناہ کے علاوہ دوسرے کی باتوں کی مخالفت سے اس کو رنج پہنچتا ہے اور رنج پہنچانا بُرا ہے۔ لہٰذا خاموشی ہی بہتر ہے۔

مذہبی مخالفتیں بھی جنگ و جدل کی مثل ہوتی ہیں۔ ہاں اگر محض نصیحتاً وہ بھی تنہائی میں، اگر مخاطب کی طرف سے مان جانے کی اُمید ہو، تو کوئی حرج نہیں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ قوم "جدل" میں پڑ کر گمراہی میں پڑ جاتی ہے۔

لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ علماء کے ساتھ مناظرہ اور مباحثہ نہ کرنا ورنہ وہ تیرے دشمن ہو جائیں گے۔
بُری باتوں اور گناہوں کو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ ضبط کرنا صبر کی دلیل ہے۔ اور صبر کرنا مجاہدہ کی منزلت رکھتا ہے۔
جب حضرت داؤد طائی نے گوشہ نشینی اختیار کی تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ باہر کیوں نہیں نکلتے، تو کہا کہ مجاہدے کے ذریعے مباحثے سے بچنا چاہتا ہوں۔ مناظرے میں اگر جاؤ تو سُنتے رہو مگر خاموش رہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس بات پر جب عمل کیا تو بہت سخت نظر آیا۔ اگر کسی جگہ مذہبی تعصب پھیلا ہوا ہو، اور وہاں کے سربرآوردہ لوگ، اپنے وقار کی خاطر مناظرے اور مباحثے کو صحیح قرار دے دیں تو اس کے دل میں حرص مسلط ہو جاتی ہے، اور پھر صبر کرنا محال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نفس کو لذت ملنے لگتی ہے۔
حضرت مالک بن انس سے روایت ہے کہ جدل کی تمام بزرگانِ دین نے مخالفت کی ہے اور اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر کوئی آدمی گمراہ ہوا ہے تو احادیث اور قرآن کے ذریعہ اس کو سمجھا دیا گیا ہے۔ فضولیات سے سب نے پرہیز کیا ہے۔
چوتھی تکلیف بیکار باتیں بنانے میں یہ ہے کہ عدالت میں مال دنیا کے متعلق کوئی مقدمہ پیش ہو سکے۔ یہ بھی بڑی سخت مصیبت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو بے علم آدمی کسی سے مقدمہ لڑتا اور جھگڑا کرتا ہے اس سے خداوند عالم اس وقت تک ناراض رہتا ہے، جب تک وہ خاموش نہ ہو جائے۔ دین کی مروت اور آرام کو بھی یہ چیز کم کر دیتی ہے۔
روایت ہے کہ کسی بزرگ آدمی نے مال دنیا کے لیے آج تک کبھی مقدمہ بازی نہیں کی۔ کیونکہ مقدمہ بازی میں صرف باتیں بنانا ہی کامیابی کی کنجی ہے اور نیک لوگ فضول گوئی سے پرہیز کرتے ہیں۔
اگر کوئی بات مجبوراً آ بھی جائے تو بالکل صحیح صحیح بات کہہ دے۔ اور دوسرے کو اپنے جھوٹ سے رنج پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ سخت کلامی اور جھوٹ دین کو ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں۔
پانچویں آفت فحش باتوں کا بکنا ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فحش کلام آدمی پر جنت حرام ہے اور روزِ قیامت اُن کے مُنہ سے نجاست نکلے گی، جس کے تعفن سے اہلِ دوزخ پناہ مانگنے لگیں گے، اور دریافت کریں گے؟ ان کو بتایا جائے گا کہ یہ خود بھی بدگوئی کرتے تھے اور دوسروں کی بدگوئی سنتے تھے۔
روایت ہے کہ بدگوئی کرنے والا آدمی روز قیامت کتے کی شکل میں اُٹھے گا۔ فحش کلامی کے زیادہ تر وہ لوگ عادی ہو جاتے ہیں جو مجامعت کے وقت مکروہ افعال کے عادی ہو جاتے ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دوسروں کے ماں باپ کو گالی دے کر اپنے ماں باپ کے لیے گالی

سُننا ایسا ہی ہے جیسے خود اپنے ماں باپ کو گالی دی۔

جماع کے وقت عورت سے انتہائی احتیاط کے ساتھ بات کرنا چاہیے تاکہ فحش کلامی کی حدود میں نہ آسکے۔ اگر کسی بُری بات کا ذکر کرنا مقصود ہو تو بھی مُنہ سے صاف صاف نام نہ لے۔ عورتوں کا نام بھی مُنہ سے نہ لینا چاہیئے۔ بلکہ عورت کے نام سے یاد کرے۔ اسی طرح بُری امراض کا نام بھی منہ سے نہ لینا چاہیے۔ جیسے بواسیر، سوزاک، برص اور جذام وغیرہ۔ یہ بھی ادبی لحاظ سے خلافِ ادب ہے۔

چھٹا گناہ یہ ہے کہ آدمی دوسرے پر لعنت کرے۔ لعنت کرنا انتہائی مذموم ہے۔ دُنیا کے کسی ذی رُوح پر لعنت بھیجنا بُرا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مومن کسی پر لعنت نہیں کرتا۔ ایک بار ایک عورت آپ کے ساتھ سفر میں تھی، اس نے ایک اونٹ پر لعنت کی تو اُونٹ کو قافلے سے باہر نکلوا دیا۔ اور فرمایا کہ یہ ملعون ہے۔ ایک زمانے سے وہ اونٹ آوارہ گردی کرتا رہا۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو وہ چیز کہتی ہے کہ لعنت اس پر ہے کہ جو ہم سے بھی زیادہ بُرا ہے۔

ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی پر لعنت کی۔ آنحضرتؐ نے سُنا تو فرمایا کہ اے ابوبکر! تم صدّیق ہو اور لعنت کرتے ہو۔ تم کو یہ مناسب نہیں۔ خدا کے گھر کی قسم تم صدّیق ہو اور یہی جملے بہ تکرار تین بار ارشاد ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے توبہ کی اور ایک غلام کو آزاد کر دیا۔

ایسے لوگوں کے علاوہ لعنت نہ کرنا چاہیے، جو انتہائی گُنہگار ہوں جیسے فاسقین، کافرین اور بدعتی لوگوں پر لعنت بھیجنی چاہیے۔ لیکن معتزلی اور کرامی پر لعنت بھیجنا باعثِ تنازعہ ہے۔ لہٰذا پرہیز ضروری ہے۔

جن لوگوں پر شریعتِ اسلام نے لعنت کی ہے۔ اُن پر حدیث کی رو سے لعنت کرنا صحیح ہے کسی کا نام لیکر لعنت کہنے سے ملعون آدمی کا بھلا ہوتا ہے۔ جیسے ابوجہل اور فرعون۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چند آدمیوں کا نام لے کر لعنت کی۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ کافر ہی مریں گے۔ یہودیوں پر لعنت بھیجنا اچھا نہیں، اس لیے کہ مسلمان ہونے کی امید تو مرتے وقت تک ہو سکتی ہے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر مسلمان، جس پر ہم رحمت کی دُعا کر رہے ہیں آئندہ چل کر مرتد ہو جائے تو؟۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم موجودہ حالت میں اس کے لیے دُعا کے طالب ہیں۔ اسی طرح کافر کو حالتِ کفر میں لعنت بھیجنا ہوگا۔ یہ دلیل قطعی غلط ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کے لیے رحمت کی دعا کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس کے اسلام کو قائم رکھنے کی دُعا کر رہے ہیں۔ تو کافر کی لعنت سے اس کی کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کافر پر لعنت

جائز نہیں ہوگی۔ اسی طرح کسی شقی اور لعین پر بھی۔

قاتلانِ حسینؓ پر لعنت بھیجنا جائز ہے یزید پر اس طرح لعنت کہہ سکتے ہیں کہ یہ کہیں کہ قاتلانِ امام حسین علیہ السلام پر لعنت ہو۔ لہٰذا اس پر نام لے کر لعنت نہ کرنا چاہیے۔

اگر وہ قاتل مرنے سے پہلے توبہ کرلے، تو لعنت بیکار ہے، جس طرح حضرت حمزہ کا قاتل مرنے سے پہلے مسلمان ہوگیا تھا، لہٰذا اس سے لعنت ساقط ہوگئی۔

یزید کے متعلق یہ بھی تحقیق نہیں کہ اسی نے امام حسین علیہ السلام کو شہید کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس نے حکم دیا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ راضی ضرور تھا، مگر حکم نہیں دیا تھا۔ لیکن کسی پر تہمت لگانا اچھا نہیں، بلکہ خود گناہ ہے۔ لہٰذا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ واقعی کس نے قتل کیا، کچھ کہنا بھی غلط ہوگا۔ اور اب تو چار سو برس گزر گئے (کتاب کی تصنیف کے وقت واقعہ کربلا کو چار سو برس گزرے تھے) اور اب تیرہ سو برس سے زیادہ۔ مترجم) تو اس واقعہ کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی آدمی اپنی عمر میں کبھی بھی شیطان پر لعنت کرے تو اس سے آخرت میں لعنت نہ کرنے کی وجہ نہ دریافت کی جائے گی اور لعنت کرنے میں پرسش کا خطرہ ہے کہ کیوں اور کس لیے کی گئی۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ روزِ قیامت میرے اعمال نامے میں یا تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہوگا یا لعنت۔ لیکن میں اس بات کو پسند کروں گا کہ لا الٰہ الا اللہ ہی نکلے۔

روایت ہے کہ کسی مومن پر لعنت کرنا، اس کے قتل کرنے کے برابر ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ نماز کے بعد تسبیح پڑھنا لعنت کرنے سے اچھا ہے۔ پھر کیسے ہم لعنت کو اچھا کہہ سکتے ہیں۔

لہٰذا جو آدمی کسی پر لعنت کرے اور اس کو روا بھی رکھے تو یہ غرور کے مترادف ہے۔ عموماً لوگ دشمنی اور تعصب میں لعنت کرتے ہیں۔

ساتواں عذاب یہ ہے کہ سماع کرے، لیکن ہم باب السماع میں لکھ چکے ہیں کہ یہ ناجائز نہیں ہے۔

دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اشعار پڑھے گئے اور سرکارؐ نے "حسان" (شاعر) سے کفار کی ہجو کرنے کی فرمائش کی۔ لیکن صرف جھوٹی ہجو، یا کسی مسلمان کی ہجو میں شعر کہنا اور پڑھنا ناجائز ہے۔ لیکن تشبیہہ اور استعارے کے لیے اگر کوئی لفظ استعمال کیا جائے تو حرج نہیں ہوگا۔ اس کو ہم جھوٹ کہہ سکتے ہیں حرام نہیں۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے اعتقاد پر اثر نہیں پڑتا اور ایسے اشعار "سرکار" کے سامنے پڑھے جاتے تھے۔

آٹھواں عذاب یہ ہے، کہ مزاح کیا جائے۔ "سرکار رسالت" نے مزاح کرنے سے ہر آدمی کو روکا ہے۔ لیکن گاہے گاہے مباح ہے۔ مگر عادی نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ مزاح سے آدمی ہنستا زیادہ ہے اور زیادہ ہنسنے

سے دل سیاہ ہو جاتا ہے

سرکارِ رسالت کا ارشاد ہے، کہ میں مزاح صرف حق کی باتوں کے متعلق کرتا ہوں۔ بعض لوگ صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے مزاح کرتے ہیں، لیکن یہ مذموم ہے۔ صرف مسکراہٹ روا ہو سکتی ہے اور ارشاد ہوا کہ اگر تم وہ سمجھ لو جو میں جانتا ہوں ہنسو گے کم اور روؤ گے زیادہ۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۔

حضرت عطائی سلمی رضی اللہ عنہ چالیس سال تک نہ ہنسے۔ وہب ابن الورد نے کچھ لوگوں کو عید الفطر کے دن ہنستے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ یہ شاکروں کا کام نہیں ہے۔ چاہے خداوند عالم ان لوگوں کو بخش دے اور اگر نہ بخشا، تو یہ لوگ نڈر ہوں گے۔ محمد بن واسع نے کہا ہے کہ بہشت میں لوگ روئیں گے تو لوگ متعجب ہوں گے۔ لوگوں نے کہا کہ متعجب کیوں ہوں گے۔ فرمایا کہ جو آدمی دنیا میں زیادہ ہنستا ہے وہ دوزخی ہے یہ اور بھی تعجب خیز بات ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک شخص نے اونٹ پر سے اتر کر سرکار سے کچھ سوال کرنا چاہا، وہ برابر اترنے کی کوشش کے باوجود نہ اتر سکا صحابہ اس پر برابر ہنستے رہے، یہاں تک کہ اونٹ نے اس کو پیٹھ پر سے پھینک دیا اور وہ مرگیا۔ سرکار رسالت مآب کو جب خبر ہوئی تو فرمایا کہ تم سب لوگ اس کے خون میں شریک ہو اس لیے کہ تم لوگ اس پر ہنس رہے تھے۔

حضرت عمر ابن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ آپس میں مزاح نہ کرو۔ کیونکہ مزاح کینہ پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا آپس میں بیٹھ کر قرآن شریف کی باتیں کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مزاح کرنے والا آدمی دوسروں کی نگاہ میں خوار ہو جاتا ہے ——
سرکار رسالتؐ نے اپنی عمر میں صرف چند بار مزاح کیا ہے۔

ایک بار سرکارؐ نے ایک بڑھیا سے فرمایا کہ بڑھیا بہشت میں نہ جائے گی۔

ایک بار ایک عورت نے سرکار سے آکر عرض کی کہ میرا خاوند آپ کو بلا رہا ہے، تو سرکارؐ نے فرمایا کہ تیرا شوہر وہ ہے جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔

ایک عورت نے سرکارؐ سے عرض کی کہ مجھے اونٹ پر بٹھا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اونٹ کے بچے پر بٹھاؤں گا۔ عورت نے کہا کہ سرکار! وہ مجھے گرا دے گا۔ تو فرمایا کہ ہر اونٹ، اونٹ کا بچہ ہے۔

ابو عمیر (حضرت طلحہ کا بڑا بیٹا) کا گرگریا کا بچہ مرگیا، وہ رونے لگا۔ سرکار نے جب روتے دیکھا تو فرمایا کہ اے ابو عمیر! نغیر کا کیا حال ہوا؟ (نغیر گرگریا کے بچے کو کہتے ہیں) اکثر سرکار اس قسم کا مزاح بچوں اور عورتوں سے کیا کرتے تھے۔ تاکہ وہ خوش رہیں۔ سرکار کی طبیعت اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ اس قسم کی تھی کہ ان کو خوش کیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دن دُودھ کی کھیر پکائی۔ حضرت سودہ وہاں تشریف لائی تھیں، اُن سے فرمایا کہ کھیر کھاؤ۔ اُنھوں نے منع کیا تو آپ نے اُن کے مُنہ پر کھیر مل دی۔ سرکار رسالتؐ بیچ میں تشریف رکھتے تھے، وہ درمیان سے ہٹ گئے، اور حضرت سودہ نے جناب عائشہ کے مُنہ پر کھیر مل دی۔ تب سرکار ہنس دیئے۔

ضحاک ابن سفیان مزاحاً حضرت عائشہ کے سامنے سرکار سے کہنے لگے کہ میری دو بیویاں ہیں اور دونوں ان سے خوبصورت ہیں اگر حکم ہو تو ایک کو طلاق دے دوں اور آپ عقد کرلیں۔ حضرت عائشہ نے دریافت کیا کہ تو خوبصورت ہے یا وہ۔ اس نے کہا ـــــ میں!

سرکار رسالتؐ حضرت عائشہ کے اس سوال پر ہنس دیئے۔ اس لیے کہ وہ بہت بدہیئت آدمی تھا (یہ واقعہ پردے کے حکم سے پہلے کا ہے)

خواط بن جبیر کو عورتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک روز مکے کے راستے میں کچھ عورتوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ سرکار رسالتؐ وہاں پہنچ گئے، اور خواط بہت شرمندہ ہوئے۔ سرکار نے دریافت کیا کہ یہاں کیا کر رہے ہو۔ عرض کی میرا اونٹ سرکش ہوگیا ہے۔ ان عورتوں سے نکیل کی رسّی تیار کراؤں گا۔ سرکار وہاں سے تشریف لے گئے۔ دوبارہ جب میں ملا تو فرمایا کہو! تمھارا سرکش اونٹ قابو میں آیا یا نہیں؟ میں چُپ چاپ سا ہو گیا۔ اس کے بعد سے سرکار جب کبھی مجھے ملتے، یہ ہی فرماتے۔ ایک دن گدھے پر سوار دونوں ٹانگیں ایک طرف کئے سرکار رسالتؐ تشریف لائے اور پھر وہی دریافت فرمایا، تو میں نے کہا کہ بقسم جب سے میں مسلمان ہوا ہوں، آج تک سرکشی نہیں کی تو سرکار نے فرمایا اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰھُمَّ اھدِ اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ۔

نعمان انصاری شراب بھی بہت پیتے اور مزاح بھی بہت کرتے۔ اور جب لوگ سرکار کی خدمت میں لاتے تو اُن پر لعن طعن پڑتا اور جُوتوں سے اُن کو مارتے۔ صحابہ نے کہا کہ اے لعنۃ اللہ علیہ کب تک مار کھائے گا؟ سرکار رسالتؐ نے حکم دیا۔ لعنت نہ کرو۔ یہ خدا اور اس کے رسُول سے محبت کرتا ہے۔ نعمان انصاری کی عادت تھی کہ مدینے میں پہلے پہل جو پھل آتا، سرکار کی خدمت میں اوّل پیش کرتے اور جب جنت مانگی جاتی تو سرکار کو بتادیتے کہ میں نے آپ کو دے دیا۔ سرکار اس کی قیمت ادا کردیتے۔ اگر ہم کبھی ادا نہ کرتے تو فرماتے میرے پاس قیمت نہیں ہے۔ تم لاتے ہی کیوں ہو؟ تو جواب دیتے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نیا پھل سب سے پہلے حضُور ہی تناول فرمائیں۔

تنبیہہ: سرکار رسالتؐ نے اپنی تمام عمر میں مزاح یہ ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ نہیں۔ اور اس مزاح سے کسی کو تکلیف پہنچنا ناممکن ہے۔ اس قسم کا مزاح کرلینا سنّت ہے۔ مگر آدمی کو عادی نہ ہونا چاہیے۔

نویں گناہ استہزا ہے (یعنی کسی آدمی کا مذاق اُڑانا اور اس کی باتوں پر ہنسنا اس کی نقلیں اتارنا) اس طرح کہ لوگ اس سے ہنسنے لگیں اور وہ آدمی رنجیدہ ہو ـــ یہ حرام ہے، خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی

اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ (یعنی کسی کی ہنسی نہ اُڑاؤ اور نہ کسی کو حقیر سمجھو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے برتر ہو)۔

سرکار رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی کے متعلق ایسا گناہ بیان کرے جس سے وہ آدمی پہلے توبہ کر چکا ہے تو وہ غیبت ہے، اور غیبت کرنے والا ہی اس گناہ میں ملوث ہو کر مرتا ہے۔ اگر کسی کے ریاح صادر ہو تو نہ ہنسو! اس لیے کہ ایسے فعل کے تم خود بھی مرتکب ہوتے ہو تو دوسرے پر ہنسنے سے کیا فائدہ؟

استہزا کرنے والوں کو جنّت میں بُلایا جائے گا اور جب وہ داخل ہو سکے۔ تو اندر داخل نہ ہو جائیں گے۔ اور جب وہاں سے واپس ہوں گے۔ دوسرے دروازے پر اُن کو بلایا جائے گا اور داخل ہونے لگیں گے تو روک دیا جائے گا۔ اسی طرح متعدد بار کیا جائے گا۔ آخر میں وہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ہمارا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔

لیکن اگر مسخرے پوچھا جائے، بشرطیکہ وہ بُرا نہ مانے تو حرام نہیں ہے۔ یہ مزاح کی ہی ایک قسم ہے۔ حرام اُس وقت ہے جب کوئی آدمی اس سے رنجیدہ ہو کر بُرا مانے۔

دسواں عذاب یہ ہے کہ کسی سے جھوٹا وعدہ کر لیا جائے۔

منافق

منافق کی شناخت سرکارِ رسالت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ منافقت کی نشانی تین چیزیں ہیں چاہے وہ نماز اور روزہ ادا کرتا ہو۔

اوّل ہر بات میں جھوٹ بولتا ہو۔

دوسرے وعدہ خلافی کرے۔

تیسرے امانت میں خیانت کرے۔

وعدہ آدمی کے اوپر قرض جیسا ہے، اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔ خداوند عالم نے جناب اسمٰعیل کو اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ سے یاد فرمایا ہے (یعنی وہ وعدے کے سچے تھے)

وعدہ خلافی روایت ہے کہ جناب اسماعیلؑ نے ایک بار کسی سے وعدہ کیا اور اس کے ایفا کے لیے تین دن تک وہاں کھڑے رہے۔

ایک آدمی نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کسی جگہ آنے کا وعدہ کیا۔ سرکار وہاں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ وہ تین دن میں واپس ہوا۔ تو سرکار نے فرمایا کہ میں تین دن سے متواتر تیرا منتظر کھڑا ہوں۔

ایک شخص سے سرکار نے ایک بار وعدہ فرمایا کہ تو جو مانگے گا دوں گا۔ وہ آدمی حاضر ہوا۔ اتفاق سے خیبر کا مالِ غنیمت اس وقت تقسیم ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس نے اسّی بکریاں مانگیں۔ چنانچہ عطا کیں اور فرمایا کہ تو نے بہت کم مانگا۔ اور اس عورت سے بھی کم مانگا کہ جس نے حضرت موسیٰ سے حضرت یوسف کی قبر بتانے کے

عوض اپنی جوانی مانگی اور بہشت میں اُن کی ہمراہی ـــــ یہ آدمی اس کے بعد عرب میں مثالوں کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ لوگ آپس میں کہتے تھے کہ یہ تو اسی بکریوں والے آدمی سے بھی گیا ہے۔

آدمی کوشش کرے کہ حتی وعدہ نہ کرے۔ اس لیے کہ سرکار رسالت کے وعدے صرف یہ ہوتے تھے کہ شاید میں کر سکوں۔ لیکن اگر وعدہ کر لے تو اس کو ضرور پورا کرے۔ علماء کرام کہتے ہیں کہ اگر تم کسی جگہ ملنے کا کسی سے وعدہ کر لو۔ تو ہر حال میں تم کو وہاں ہونا چاہیے۔ چاہے نماز کا وقت آجائے۔

کوئی چیز کسی آدمی کو دے کر واپس لینا وعدہ خلافی سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ سرکار رسالتؐ نے ایسے آدمی کو اس کُتے سے تشبیہہ دی ہے کہ خود ہی قے کرتا ہے اور خود ہی کھا جاتا ہے۔

جھوٹ بڑی لعنت ہے

گیارھواں قہر یہ ہے کہ آدمی جھوٹ بولے اور جھوٹی قسمیں کھائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جھوٹ ہی نفاق کی جڑ ہے۔ آدمی ایک ایک جھوٹ بولتا رہتا ہے اور خداوند عالم کے یہاں جھوٹوں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ جھوٹ رزق کو کم کرنے کا باعث ہے۔ جھوٹے تاجر نابکار ہوتے ہیں (جھوٹی قسمیں کھانے کی وجہ سے) وہ لوگ ہر بات میں جھوٹ بولنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ افسوس ایسے لوگوں پر، جو جھوٹ بولیں اور اپنی ہنسی اڑانے کا بھی خیال نہ کریں۔

اور فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دوسرے آدمی کے مُنہ سے سنسی کے ذریعہ حلق سے کچھ کھینچ رہا تھا وہ بار بار کبھی ایک طرف اپنا پلاس ڈالتا اور کچھ اس کے حلق سے نکال لیتا۔ پھر دوسری طرف ڈالتا اور نکال لیتا۔ میں نے حیران ہو کر دریافت کیا کہ اے مردِ خدا تو یہ کیا کر رہا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ شخص جھوٹا ہے، اس پر خدا کا قہر ہے اور تا قیامت اسی طرح عمل کیا جاتا رہے گا۔

عبداللہ بن جراد نے "سرکار" سے دریافت کیا کہ کیا مومن بھی گناہ کر سکتا ہے؟

فرمایا، ہاں! کر سکتا ہے۔ پھر عرض کی کہ مومن جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ تو سرکار رسالتؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (یعنی غیر مومن آدمی ہی جھوٹ بولنے کے عادی ہوتے ہیں)

عبداللہ بن عامر نے "سرکار" کے سامنے ایک لڑکے سے جو کھیلنے جا رہا تھا کہا کہ میں تجھے چیز دوں گا ـــــ سرکار رسالتؐ نے دریافت فرمایا، عبداللہ! کیا دو گے؟ عرض کیا، ایک خرما ـــ حکم ہوا، ہاں ٹھیک ہے، لیکن، اگر بچے کو یوں ہی بہلا دیتے تو جھوٹ کا مترادف ہوتا۔ اور اے عبداللہ سمجھ لے کہ دُنیا میں سب سے بڑا گناہ جو شرک کی منزل کے قریب ہی ہے۔ وہ ماں باپ کے حقوق کا ادا نہ کرنا ہے۔ سرکار یہ فرماتے فرماتے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی اَلَا وَ قَوْلَ الزُّوْرِ (یعنی تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ جھوٹ بولنا گناہِ کبیرہ ہے) اور جھوٹے آدمی کے منہ سے بُو آنے لگتی ہے۔ فرشتے تک اس سے دُور رہتے ہیں۔

لوگوں کا مقولہ ہے کہ اثنائے کلام میں "چھینک آجانا" سچائی کی دلیل ہوتی ہے۔ حدیث ہے کہ چھینک فرشتوں کی عادت ہے اور جمائی شیطانی —— مگر وہ بات جھوٹ ہوتی تو چھینک نہ آتی۔

حدیث ہے کہ دوسرے کا جھوٹ بیان کرنا بھی جھوٹ ہی میں شامل ہے۔ سرکار رسالت کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں جھوٹ اور خیانت کو چھوڑ دیں تو تمام خوبیاں پیدا ہو جانے کا امکان باقی رہے گا۔

ابن شبیب ایک دوست کو خط لکھتے ہیں کہنے لگے ایسا جھوٹا مقولہ یاد آگیا، اگر اس کو خط میں حوالہ کے طور پر لکھ دوں تو خط کی عبارت بہترین ہو جائے، لیکن وہ مقولہ جھوٹا ہونے کی وجہ سے نہ لکھا۔ اس وقت ندا آئی یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ۔

حضرت ابن سماک کا قول ہے کہ مجھے جھوٹ سے انتہائی نفرت ہے اور میں اسی لیے جھوٹ سے پرہیز کرتا ہوں اور یقین ہے کہ خداوندِ عالم اس کا اجر دے گا۔

جھوٹ

وجوہات اور بحث

جھوٹ کے متعلق تفصیلی بحث

جھوٹ دل کی شکل کو بالکل ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک اثر ہوتا ہے۔ اگر مصلحتاً جھوٹ بولے تو بھی اس کو مکروہ سمجھ کر بولے۔ اس وقت وہ حرام کی منزل میں نہیں آتا۔ کیوں کہ کراہت کے بعد اس کا دل اس سے متاثر نہ ہوگا۔ اگر کوئی مسلمان کسی کے ظلم سے تنگ آکر کہیں بھاگ جائے تو اس کے متعلق پتہ بتانا اچھا نہیں۔ ایسے وقت میں جھوٹ ہی بولنا مناسب ہے۔

کن اوقات میں جھوٹ بولنا روا ہے اور کہاں واجب ہے

سرکار رسالت نے تین اوقات میں اصل بات کو چھپانے کی اجازت دی ہے۔

پہلے لڑائی کے وقت —— صحیح بات کو چھپانا واجب ہو جاتا ہے۔

دوسرے جب دو مسلمانوں میں صلح کرانا مقصود ہو، تو جھوٹ بولے تاکہ شر ختم ہو سکے۔

تیسرے دو بیویاں رکھنے والا آدمی۔ دونوں میں ہر ایک سے کہہ سکتا ہے کہ میں تجھ ہی سے زیادہ محبت کرتا ہوں اس کے علاوہ اگر کوئی آدمی کسی کے یہاں چوری کے لیے اس کے مال کے متعلق یا کسی راز کے متعلق دریافت کرنا چاہے تو بھی چھپا لینا ضروری ہے۔ یا کسی کا عیب کوئی دریافت کرے تو جھوٹ بولو۔ شریعت نے عیب پوشی کا حکم دیا ہے۔

اگر بیوی کسی کام کا وعدہ لے تو آدمی اس سے اطاعت لینے کے لیے غلط وعدہ کر سکتا ہے۔ چاہے وہ اس وقت یہ سمجھتا ہو کہ میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکوں گا۔

مندرجہ بالا مقامات پر جھوٹ بولا جاسکتا ہے۔

تنبیہہ: جہاں تک ہوسکے جھوٹ نہ بولو، چاہے سچ بولنے میں کسی خدشے کا احتمال ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس وقت سوچنا چاہیے کہ کیا بات مناسب ہے۔ مثلاً میاں بیوی میں تنازعہ ہو رہا ہے، تو جھوٹ بول دو، بلکہ جھوٹ اچھا ہے اس لیے کہ سچ بولنا اس وقت جھگڑے کا باعث ہوگا۔

(نوٹ) اس کو بالکل ایسا سمجھا جائے کہ جس طرح جان کی حفاظت کے لیے کوئی حرام چیز کھالی جائے لیکن صرف اپنی شان و شوکت کو دوبالا کرنے کے لیے یا بے بات جھوٹ بولنا حرام ہے۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے سرکار کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کیا کہ میرا شوہر جو مراعات میری سوتن کو دیتا ہے، مجھے نہیں دیتا، لہٰذا میں اپنی سوتن کی طرف سے اس کو رنجیدہ کرسکتی ہوں (کوئی الزام رکھ کر)؟ سرکار نے فرمایا تو دو گناہوں کی مرتکب ہوگی، ایک خود کرے گی، دوسرے اپنے شوہر کو غلط فہمی میں مبتلا کردے گی۔

دوسرا طریقہ — لڑکے کو مدرسے جانے کی دلچسپی کے لیے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ فرشتے ہر جھوٹ لکھتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی "مباح" جھوٹ بولا ہو تو اس کا جواب دیکر مطمئن کرسکتے ہو۔

کسی مسئلے کے متعلق غلط احکامات لگانا ناجائز ہے۔ کیونکہ بعض اوقات صرف اپنی شان و شوکت کے لیے اس قسم کے مسائل گھڑ دیئے جاتے ہیں۔ بعض علماء کے خیال میں حدیث رسول جھوٹی گھڑ کر صرف اس لیے کہ کسی آدمی کو خیرات دینے پر تیار کیا جائے، مباح ہے — لیکن میرے خیال میں قطعاً ناجائز ہے۔ حدیث رسول ہے کہ میرے اوپر بہتان نہ رکھو، جو آدمی رکھتا ہے، وہ دوزخی ہے۔

بہرحال اگر شریعت کے اوپر خدانخواستہ کوئی آنچ آرہی ہے تو جھوٹ بول دینا جائز ہے، ورنہ جہاں تک ہوسکے جھوٹ سے پرہیز کرے۔

دوسری مثال

معاریض اگر کبھی بزرگانِ دین کو ایسا وقت ہوا، تو انھوں نے اس طرح جواب دیا ہے کہ پوچھنے والا یہ نہ سمجھ سکے کہ ہم کو جواب کیا ملا ہے اور پوچھنے والے کے اصل مقصد کو اس سے کہہ دینا اور جھوٹ بولنے والے کا اپنی طرف سے کوئی ایسا جملہ کہہ دینا کہ اس سے مخاطب مطمئن بھی ہوجائے، اس کو "معاریض" کہتے ہیں۔

(مثال) ایک بار مطرف علیہ الرحمۃ ایک امیر کے یہاں تشریف لے گئے۔ اس نے نہ آنے کی وجہ پوچھی فرمایا کہ جب سے امیر کے یہاں سے گیا، زمین سے پہلو اٹھانے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس نے سمجھا کہ بیمار ہوں گے۔ اگرچہ یہ جھوٹ نہ تھا، لیکن وہ بھی مطمئن ہوگیا۔

(تمثیلی واقعہ) حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کو جب کوئی آواز دیتا اور وہ نہ جانا چاہتے تو اپنی کنیز سے فرماتے کہ زمین پر ایک دائرہ کھینچ اور وہاں انگلی رکھ کر زور سے جواب دے کہ "یہاں نہیں ہیں ۔۔۔ یا کہو کہ مسجد میں تلاش کیا جائے۔

(تمثیل) حضرت معاذ رحمۃ اللہ علیہ ایک بار ذرا دیر سے گھر واپس آئے تو بیوی نے کہا کہ اتنی دیر تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیابت کی اور میرے لیے کوئی تحفہ نہ لائے ۔تو فرمایا میرے ساتھ برابر نگہبان لگا رہا۔ اس لیے نہ لاسکا۔ (یہ اشارہ دراصل خدا کی طرف تھا)

(تمثیل) ایک بار آپ کی بیوی حضرت عمر کے مکان پر تشریف لے گئیں ،اور عرض کی کہ "معاذ" کو سرکارِ دوعالم اور حضرت ابوبکر دونوں ہی امین سمجھا کرتے تھے ،لیکن آپ نے اُن کے ساتھ ایک محافظ مقرر کیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ کو بلایا اور واقعہ دریافت کیا۔ جب معلوم ہوا تو ہنسے اور کوئی تحفہ بیوی کے دینے کے لیے عنایت کیا۔

تنبیہ : معلوم ہونا چاہیے کہ بغیر ضرورت یہ بات بھی ناجائز ہے۔ اس لیے کہ بے ضرورت ایسی باتوں پر لوگ دھوکے میں مبتلا ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عقبہ سے روایت ہے کہ میں اپنے والد ماجد کے ساتھ ایک بار خلیفہ کے یہاں گیا۔ جب واپس آیا تو لوگوں نے میرے اچھے کپڑے دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ لباس خلیفہ نے آپ کو دیا ہے؟ میں نے صرف اتنا کہا کہ خدا خلیفہ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے باپ نے ایک بار مجھ سے نصیحت کی کہ بیٹا! نہ جھوٹ بولو، اور نہ ایسی بات کہو جو جھوٹ کے مماثل بھی ہو، لیکن خوش طبعی اور مزاح کے وقت مباح ہوجاتا ہے۔ جیسے سرکارِ رسالت کے متعلق کئی واقعات پیچھے لکھے جاچکے ہیں۔

لیکن اگر ذرا سا کوئی خدشہ ہو تو جھوٹ حرام ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ فلاں عورت تجھ سے محبت کرتی ہے۔ اگر مزاح کے طور پر کہہ دے تو جائز ہے۔ بہرحال اس وقت بھی درجہ مومنیت سے ضرور گرا دے گا۔ اس لیے کہ حدیث نبوی ہے کہ جو بات اپنے لیے پسند نہ ہو، دوسرے کو بھی نہ کہو۔ اور اس طرح یہ بھی ناجائز نہیں کہ کسی شخص کا صرف دل خوش رکھنے کے لیے اس سے کہا جائے کہ میں سینکڑوں بار تیرے گھر گیا اور تلاش کیا۔

بعض لوگ کھانے کی تعظیم کے وقت جواب دیتے ہیں کہ اس وقت حاجت نہیں، یہ اچھا نہیں ——— اگر اس وقت خواہش ہے تو یہ کہنا نامناسب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کی شب عروسی کی خوشی میں حاضرین عورتوں کو ایک ایک پیالہ دُودھ کا تقسیم کیا۔ عورتوں نے تکلف [illegible] بھوک اور جھوٹ دونوں ساتھ نہ رکھنا

چاہئیں۔ تو عرض کی، کیا یہ بھی جھوٹ میں شامل ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں!

حضرت مسیب رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں درد تھا (کوئی چیز آنکھ میں جا پڑی تھی) تو فرمایا کہ میں نے حکیم کو بتا دیا ہے کہ آنکھ کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کسی اچھے یا بُرے جھوٹ میں خداوند عالم کو گواہ بنانا بُرا ہے۔

(خواب کے متعلق) سرکارِ دو عالم کا حکم ہے کہ جو آدمی جھوٹی خواب کہتا ہے، اس سے قیامت کے دن "جو" کے دانے میں گرہ لگوائی جائے گی۔

غیبت بارھواں عذاب غیبت ہے۔ یہ سب سے زیادہ وبالِ جان ہے اور اس عذاب سے شاذ ہی کوئی آدمی خالی ہے۔ غیبت کرنے والے آدمی کے متعلق خداوند عالم نے اس شخص سے مثال دی ہے کہ جو اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھاتا ہے (پہلے بیان میں آچکا ہے)

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ غیبت زنا سے زیادہ بدتر ہے۔ زانی کی توبہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن غیبت کرنے والے کا گناہ معاف نہیں ہوتا۔ جب تک کہ جس کی غیبت کی جائے وہ معاف نہ کردے۔

واقعہ آنحضرتؐ درشبِ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شبِ معراج سرکارِ دو عالم نے کچھ لوگوں کو ناخنوں سے مُنہ پر سے گوشت کھُرچتے ہوئے دیکھا، تو دریافت کیا کہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ یہ سب غیبت کیا کرتے تھے (یہ روایت پہلے بھی بیان ہو چکی ہے۔ مترجم)

(تمثیل) ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلیمان بن جابر نے عرض کی کہ کوئی ایسی بتائیے! جو میری محافظ بن سکے، تو حکم ہوا کہ نیک کاموں کو حقیر نہ سمجھو۔ چاہے اتنا ہی کیوں نہ ہو کہ کوئی کسی پیاسے کو اپنے ڈول سے ایک گلاس پانی ہی پلا دے، اپنے بھائیوں سے کشادہ پیشانی اور خلوص سے ملو اور اُن کے پیچھے ان کی غیبت نہ کرو۔

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جو آدمی غیبت سے توبہ کر کے مرے گا، وہ سب سے آخر میں بہشت میں جائے گا۔ اور جو توبہ نہ کرے گا، وہ سب سے پہلے دوزخ میں جائے گا۔

حضرت جابرؓ ایک بار سرکارِ رسالتؐ کے ساتھ قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ سرکارؐ نے دو قبروں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ دونوں عذابِ الٰہی میں مُبتلا ہیں۔ ان میں ایک غیبت کی وجہ سے۔ دوسرا اس لیے کہ بغیر طہارت کے پیشاب کرتا تھا۔ اس کے بعد سرکارِ دو عالمؐ نے ایک درخت کی شاخ توڑ کر دونوں قبروں پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں گی، یہ لوگ عذاب میں مبتلا نہ رہیں گے۔

ایک شخص نے ایک بار زنا کیا، تو اس کو سرکارؐ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ صحابہ نے عرض کی کہ اس کو کتے کی طرح زمین پر بٹھایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کرنے والے اور سُننے والے دونوں کی مذمت فرمائی ہے۔

صحابہ کرام ہمیشہ ایک دوسرے پر محبت سے پیش آتے تھے۔ آپس میں غیبت نہ کرتے تھے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ عذاب قبر تین وجہوں سے ہوگا۔ اس کا ایک تہائی حصہ غیبت کی وجہ سے۔ ایک تہائی نکتہ چینی کرنے کی وجہ سے۔ ایک تہائی پیشاب سے کپڑوں کو نہ بچانے کی وجہ سے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کچھ لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے ایک کتے کی لاش دیکھ کر سب نے کہا کہ کس قدر تعفن ہے، تو آپ نے فرمایا، اس کے دانت کس قدر اچھے ہیں؟ یہ اس لیے کہ کسی کی بُرائی نہ کرو، بلکہ اس کے صفات بیان کرو۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسین رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو غیبت کرتے سُنا۔ آپ نے اس کو خاموش رہنے کی تلقین فرمائی، کہ یہ کتوں کی غذا ہے۔

غیبت کیا ہے؟ تفصیل | جو بات کسی کے سامنے نہ کہہ سکیں اور پیچھے کہیں وہ غیبت کہلاتی ہے۔ یا وہ سچ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بات جو غیبت کے لیے کہی جائے وہ غیبت ہے۔ اور اگر اس کے متعلق جھوٹ بول رہے ہیں تو بہتان کہلاتا ہے۔

غیبت کے متعلق چند مثالیں دے کر سمجھاتے ہیں:

امثلہ | مثلاً یہ کہا جائے کہ فلاں آدمی سیاہی مائل ہے، کالا ہے، لمبا ہے۔ یا اس کے حسب نسب کے متعلق کہا جائے کہ فلاں عیب ہے۔ یا اس کی عادات کے متعلق کہا جائے۔ فلاں آدمی مغرور و بدزبان ہے یا بزدل ہے۔ یا اس کے کردار کے متعلق کہا جائے کہ خیانت کرتا ہے یا بے نمازی ہے۔ قرآن غلط پڑھتا ہے۔ میلا اور گندہ رہتا ہے زکوٰۃ نہیں دیتا۔ حرام کھاتا ہے۔ طبیعت کا چھچھوڑا ہے وغیرہ وغیرہ۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ہر وہ بات جو کسی کے پیچھے کہی جائے۔ یا اس کے سامنے بھی کہی جائے مگر وہ شخص اس بات سے رنجیدہ ہو، وہ غیبت کہلاتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار سرکار کے سامنے کسی عورت کو کوتاہ قد کہا، تو فرمایا کہ تم نے غیبت کی ہے۔ اپنے مُنہ میں پانی ڈال کر کلی کرو۔ چنانچہ ایسا کیا اور دیکھا تو خون کا لوتھڑا سا نکلا۔

بعض علماء نقل گناہ یا غیبت کے نقل کرنے کو بُرا نہیں سمجھے لیکن ہمارے خیال میں کسی کو شرابی یا بے نمازی کہنا بھی غیبت میں داخل ہے۔ اس کے متعلق تمام اسباب آگے لکھے جائیں گے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ غیبت وہ ہے جس سے کراہت پیدا ہو، اور اوپر لکھی ہوئی باتوں کی کراہت پیدا ہوتی ہے۔ نیز جن باتوں کو کہنے سے کوئی فائدہ نہ ہو تو کہنا فضول ہے۔

بحث و تبصرہ: غیبت صرف زبان اور الفاظ کے ذریعہ ہی نہیں ہوتی، بلکہ اشارے کنایے سے بھی

غیبت ہوسکتی ہے، جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ حضرت عائشہ نے ایک عورت کے متعلق اشارے سے کہا کہ یہ کوتاہ قد ہے،
اسی طرح کسی کے متعلق لنگڑا کہ اس کے لنگڑا پن ظاہر کرنا یا اشاروں میں کچھ ظاہر کرنا۔ اگر کسی خاص شخص کی طرف اشارہ
کرکے کہا جائے، یہ سب غیبت ہے، لیکن اگر ایک عام بات کی جائے کہ فلاں عیب بُرا ہے تو غیبت نہ ہوگی، اور
اگر یہ جملہ کسی خاص مرد کی طرف لوگوں کی توجہ مرکوز کرا دے تو بھی ناجائز ہے۔ بعض سمجھدار آدمی غیبت کرتے ہیں اور
یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ حرام نہیں ہے۔ مثلاً اُن سے کسی شخص کے متعلق کچھ کہا جائے اور وہ اس کا جواب دیتے ہیں
کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس سے محفوظ ہیں۔ بعض لوگ اپنی مذمت کرتے ہیں اور اس میں دوسروں کی بُرائی کا بھی
اشارہ ہوتا ہے۔ یہ بھی غیبت ہے۔ کبھی کوئی آدمی کسی کا واقعہ کہتا ہے۔ تو جواب میں کہہ دیتے کہ توبہ توبہ! یہ بھی
غیبت ہے، بلکہ منافقت بھی شامل ہے۔ اس لیے کہ اس سے دوسروں پر اپنا زہد ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

ایک بار حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ صدیق رضی اللہ عنہم دونوں ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ایک نے
دوسرے سے کہا کہ فلاں آدمی بہت سوتا ہے۔ اس کے بعد کھانے کے لیے "روٹی" طلب کی، تو سرکار رسالتؐ نے
فرمایا، کہ تم نے روٹی تو کھا لی۔ جواب دیا کہ حضور! ابھی نہیں کھائی۔ فرمایا کہ تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا ہے
حضورؐ نے دونوں کو تنبیہہ دی۔ اس لیے کہ ایک اُن میں کہنے والا اور دوسرا سُننے والا تھا۔

(حدیث) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی غیبت سُنے اور اس کو معاف کر دے تو خداوند عالم
اس کی حاجت اور ضرورت کے وقت معاف کرے گا۔

تفصیل: غیبت کرنا جیسے زبان سے ناجائز ہے، اسی طرح دل سے بھی۔ دل کی غیبت یہ ہے کہ کسی شخص
پر بدگمانی کی جائے۔ سرکار رسالت کا ارشاد ہے کہ مسلمان کا خون، مسلمان کا مال اور مسلمان کی غیبت تینوں حرام ہیں
اگر بعید از قیاس گمان کسی کی طرف پیدا ہو، تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ اِنْ جَآءَكُمْ
فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (یعنی فاسقوں کی باتوں کو یقین نہ کرو) اور شیطان سے زیادہ کوئی فاسق نہیں۔

اگر اپنے دل میں ارادۃً کوئی خیال لاؤ تو یہ حرام ہوگا۔ اور اگر خود ہی خود پیدا ہو جائے، تو اس سے کراہت
ضرور کرے، تب گنہگار نہ ہوگا۔ سرکارِ دوعالمؐ فرماتے ہیں کہ مومن کو بھی بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن وہ اس کی کاوش
نہیں کرتا۔ لہٰذا گناہ سے بری رہتا ہے، اور جب تک اس میں کسی شبہ کی گنجائش دیکھتا رہتا ہے۔ اس کو اچھا ہی
سمجھتا ہے۔

اگر آدمی کسی کے عیب کو تلاش کرتا ہے، اور تحقیق کرنے لگتا ہے، تو جب تک پوری طرح معلومات مہیا نہیں
ہو جائیں۔ وہ شخص خواہ مخواہ بُرا معلوم ہوتا ہے۔

... اگر نفس ... ہو سکتا۔ اگر کسی کے متعلق کوئی عادل

اطلاع دے تو اس پر شک کرنا گناہ ہے ۔ اگرچہ فاسق کے لیے بھی گمانی اچھی چیز نہیں ہے ۔ اس وقت یہ سوچنا چاہیے کہ کہنے والے کے اطوار و عادات مجھ سے اس وقت پوشیدہ ہیں اسی طرح جس کے متعلق یہ کہہ رہا، میں کچھ نہیں جانتا — اور اگر یہ خیال ہو کہ یہ آپس کی دشمنی کی وجہ سے کہہ رہا ہے تو پھر کچھ رائے قائم نہ کرے اور اگر کہنے والا تمہارے خیال میں یقیناً عادل ہے تو اس کی بات کو متحقق خیال کرنا ہی اچھا ہوگا ۔ اور جس کے متعلق وہ کہتا ہے اس سے وہ میل جول رکھے، تاکہ شیطان تم کو نہ بھڑکائے اور وہ بدگمانی رفتہ رفتہ کم ہو سکے ۔ اور جب یہ سمجھ لے کہ یہ بے قصور تھا، تو بدگمانی کو ذہن سے نکال دے اور اس کو تنہائی میں سمجھا دے ۔ ایسے الفاظ میں سمجھانا اچھا ہے کہ اس کو رنج نہ ہو ۔ اس طرح اس کو دو ثواب ہوں گے ۔ پہلے کسی مسلمان کو نصیحت کرنے کا ۔ دوسرے کسی مسلمان کو رنج نہ پہنچانے کا ۔

غیبت

مثال : غیبت کی حرص کرنا بھی ایک بیماری ہے اور اس کو دور کرنا ضروری ہے ۔ اس کے دو طریقے ہیں ۔

پہلا علمی طریقہ : علم کے ذریعے دو طرح دور ہو سکتی ہے ۔ پہلے احادیث کو دیکھ کر سوچے کہ کون کون سی باتیں غیبت میں شامل ہیں ۔ اور اگر وہ عمل میں لائے گا، تو جس کی غیبت کرے گا اس کی نیکیاں اس کے اعمال میں لکھی جائیں گی، یہاں تک کہ اس کا اپنا نامہ اعمال خالی اور کورا رہ جائے گا ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ غیبت آدمی کے اعمال کو اس طرح تباہ کر دیتی ہے ۔ جیسے سوکھی لکڑی کو آگ جلا دیتی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک ہی نیکی ہو اور وہ ایک غیبت کے باعث ختم ہو جائے ۔ اور گناہوں کا پلہ بھاری ہو جائے ۔

دوسرے اس طرح کہ اپنے عیبوں کو سوچے، اور اگر کوئی عیب اپنے میں نہ دیکھ سکے، تو یہ اُس کا ذاتی قصور ہے، اس لیے کہ ہر آدمی اپنے عیوب کو سمجھنے سے قاصر ہے اور اپنا عیب نہ جاننا بھی ایک عیب ہے ۔ اور کوئی آدمی گناہ اور عیوب سے خالی نہیں ہے ۔ لہٰذا جب خود ہی عیب دار ہے اور حدود شرع سے باہر نکل گیا، تو دوسروں پر کیوں اعتراض کرے ۔ اگر کسی کے متعلق یہ سوچے کہ یہ عیب اس کی فطرت میں ہے، تو گویا کہ صانع قدرت پر بہتان رکھتا ہے ۔ اور یہ کہنا اس کے اختیار میں نہیں ۔ لہٰذا اس کو اس بات کا حق نہیں کہ کسی کو بُرا کہے اور عیبی بنائے ۔

سبب غیبت ذرا تفصیل کے ساتھ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ آخر اس شخص کی غیبت کیوں کی جاتی ہے؟ اس کی آٹھ وجوہات ہیں ۔ پہلے یہ کہ کسی پر غصہ آ جائے اور اس کی غیبت کریں ۔ لہٰذا سوچو! کسی کی وجہ سے اپنے کو گناہ گار کرنا کیسے روا ہے؟ کیونکہ یہ تو در پردہ اپنے سے ہی لڑنا ہے ۔

حدیث ہے کہ جو آدمی غصے کو نہ آنے دے گا، قیامت کے دن خداوند عالم کا اس کے لیے حکم ہوگا کہ جس حور

کو چاہے اپنے لیے منتخب کرلے۔

دوسرا سبب یہ ہے، دوسروں کو خوش کرنا چاہتا ہے، تاکہ اس کی ہمدردیاں اس کے ساتھ آجائیں۔ اس کا دفعیہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ اگر انسان ذرا سا غور کرلے کہ خداوند عالم کو ناراض کرکے وہ بندوں کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ کہاں تک جائز ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ بندوں کی ناخوشی سے خدا کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

تیسرا سبب یہ ہے، کہ کسی آدمی سے دنیا والے کسی گناہ کے عوض باز پرس کرتے ہیں، تو وہ اپنے کو بچانے کے لیے دوسروں کو ہر طرح پھانسنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس طرح اس کو یقین ہونا چاہیے کہ خدا کا مقہور ہوکر رہے گا۔ لہٰذا کسی خطا یا گناہ کے صرف اپنی صفائی پیش کرنا چاہیے نہ کہ دوسروں کو پھانسنے کی۔ یا بعض آدمی اس قسم کی مثالیں دیا کرتے ہیں کہ میں نے فلاں گناہ کیا ہے۔ تو فلاں فلاں آدمی بھی تو یہی گناہ کرتے ہیں۔ یہ بھی بیوقوفی کی علامت ہے اس لیے کہ کسی بُرے کام کی پیروی اپنا ذاتی قصور ہے۔ اور ایسا ہی ہے کہ اگر اس سے کہا جائے کہ آدمی کنوئیں میں گرنے کو کہے تو کیا وہ گرے گا؟ لہٰذا گناہوں میں پیروی کرنا بھی ایسا ہی ہے۔ لہٰذا ایک اصل گناہ تو پہلے سرزد ہوا، اور اس قسم کی باتیں کرکے دوسرا گناہ اور مول لینا ہے۔

چوتھی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض آدمی خود تو ثواب یا نیک کام کرتا نہیں، مگر اپنی بزرگی و بے ہمت ہونے کے لیے دوسروں کی نکتہ چینی کرتا ہے۔ مثلاً فلاں آدمی ایسا ہے اور ویسا ہے۔ اس سے مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں، دوسرا ایسا ہے۔

پانچویں وجہ حسد ہے، کہ دنیا والے عالموں سے محبت و خلوص رکھتے ہیں۔ مگر وہ اس سے جلتا ہے اور اس کے قصور تلاش کرتا ہے، تاکہ کسی طرح اس کو بے عزت کرکے خود عزت حاصل کرسکے۔ حالانکہ یہ اس کا جھگڑا اور حسد اپنے سے ہے۔ اور غیبت اور حسد دونوں کا عذاب اس کو دنیا و دین میں عذاب کا باعث ہوگا۔

چھٹا سبب مذاق کا اڑانا۔ بعض لوگ دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں اور دوسروں کا فضیحہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایک منٹ کے لیے سوچ لے کہ اگر اس کے یہ سب گناہ اس کی گردن پر روزِ قیامت لادے جائیں گے اور وہ گدھے کی طرح جہنم کی طرف بھگایا جائے گا، تو اس وقت اس کا کتنا مذاق اڑایا جاسکتا ہے۔

ساتواں سبب یہ ہوتا ہے، کہ دوسروں کے گناہوں سے خود افسوس کرتا ہے اور اپنا افسوس ظاہر کرنے کے لیے دوسروں سے اس گناہ کو بیان کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ یہ بھی غیبت ہے۔ اور شیطان اس کے غم سے خوش ہوتا ہے۔ اور یہ عمل شیطان ہی اس سے کرتا ہے۔

آٹھواں نقصان یہ ہے کہ کسی کے قصور یا گناہ پر غصہ آئے اور غصے میں لوگوں سے کہے۔ ایسی صورت میں وہ کسی حسد یا بغض، کسی بنا پر نہیں کہتا، لیکن غیبت ضرور رہے۔ ایسے موقع پر مناسب یہ ہے کہ غصہ تو کرے مگر

کسی شخص کا نام لے کہ فلاں شخص نے یہ گناہ کیا ہے۔

غیبت کے مواقع

غیبت کو جھوٹ کا ہم پلہ ہی سمجھنا چاہیے اور شرعاً قطعی حرام ہے۔ لیکن بعض مواقع پر مصلحتاً غیبت کرنا مباح ہو جاتا ہے۔ وہ مواقع ہیں، جہاں غیبت بمنزلہ مباح ہے۔

پہلا موقع جس وقت تم بادشاہ یا حاکم کی عدالت سے دادخواہی چاہتے ہو، لیکن اگر مظلوم ہو اور کسی سے ظلم کا بدلہ لینا ہے تو غیبت نہ کرنا چاہیے۔

ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ لوگوں نے حجاج کا گلہ کیا، تو فرمایا کہ خداوند عالم جس طرح لوگوں کا بدلہ حجاج سے لے گا، اسی طرح حجاج کا بدلہ تم جیسے غیبت کرنے والوں سے لے گا۔

دوسرا وہ موقع کہ جہاں شر اور جھگڑا تمھاری غیبت سے ختم ہو سکتا ہو۔ مثلاً ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان یا حضرت طلحہؓ کے سامنے سے گزرے اور اُن کو سلام کیا، مگر جواب نہ ملا تو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے دربار میں شکایت کی۔ انھوں نے باز پرس کی اور اس عمل کو غیبت قرار نہ دیا۔

تیسرے ایسے موقع پر کہ آدمی کوئی فتویٰ لے، تو کسی کا نام لکھے، لیکن ایسے مواقع پر صرف فلاں ابن فلاں لکھ دینا اچھا ہے۔ بہرحال اگر صحیح نام لکھ دیا جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، ہو سکتا ہے کہ حاکم وقت کو صحیح حالات کا اندازہ ناموں سے ہو سکے۔

ہندہ ایک بار سرکار رسالت کی خدمت میں آکر کہنے لگی کہ ابوسفیان میرے اور بچوں کے لیے اتنا خرچ نہیں دیتا کہ کفایت کر سکے۔ اگر حکم ہو تو اس سے کہے بغیر کچھ لے لیا کروں؟ جواب میں فرمایا حسب ضرورت لے سکتی ہو یہ غیبت نہیں ہے۔

چوتھے اس موقع پر، کہ اگر کوئی چور یا بدعتی آدمی کوئی چیز یا تمھاری لڑکی شادی کے لیے مانگتا ہو، تو اس کے شر سے بچنے کے لیے اس کی شکایت کر سکتے ہو، اور دوسرے مسلمان بھی اس سے پرہیز کر سکیں۔

تین آدمیوں کی غیبت حرام نہیں ہے۔ ایک ظالم بادشاہ یا خلیفہ وقت کی۔ دوسرے بدعتی۔ تیسرے وہ فاسق جو کھلم کھلا گناہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عیوب علی الاعلان کرتے ہیں اور بُرا سمجھ کر نہیں کرتے۔

پانچویں اس وقت جب کہ کوئی آدمی کسی ایسے نام سے مشہور ہو گیا ہو، جس سے وہ بُرا نہ مانتا ہو اور نام کے اصل معنی کسی عیب کے نکلتے ہوں، جیسے لنگڑا، پھر بھی اچھا ہے کہ اس کو اچھے نام سے منسوب کریں۔

چھٹے ان لوگوں کی غیبت مستحب ہے کہ جو عیوب پر مُصر ہوں، اور اُن کو بُرا نہ سمجھتے ہوں جیسے مخنث اور شرابی وغیرہ۔

کفارۂ غیبت

غیبت کرنے کا کفارہ | غیبت کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ معافی مانگے اور خدا سے توبہ کرے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بُرائی کرنے والا زندگی ہی میں معافی مانگ لے تاکہ آخرت میں کوئی بوجھ اس کی گردن پر نہ رہ جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قصہ بیان کیا جاچکا ہے کہ انھوں نے سرکارِ رسالتؐ کے سامنے ایک عورت کو زبان دراز کہا تھا اور آپ نے فوراً ٹوک دیا تھا۔

حدیث میں ہے کہ جب کسی کی غیبت کرو تو خدا سے توبہ کرو۔ بعض لوگ یہی کافی سمجھتے ہیں، لیکن یہ لوگ صحیح نہیں کہتے۔ اس لیے کہ متعدد احادیث میں غیبت کے متعلق یہ آیا ہے کہ جس کی غیبت کی جائے، وہی اگر معاف کرے تو معاف ہوتا ہے اور اگر وہ باوجود معافی کے بھی معاف نہیں کرتا تو ہوسکتا ہے کہ اس پر خداوندعالم رحم کرے۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک شخص نے غیبت کی۔ آپ نے اس کو کچھ خرمے بطورِ تحفہ بھیج دیے، اور کہلا بھیجا کہ میں نے سُنا ہے کہ تو نے اپنی عبادات بطور ہدیہ دے دی ہے۔ اس کے بدلے میں تجھ کو یہ بھیج رہا ہوں لیکن عذرخواہی بھی کر رہا ہوں کہ تیرا بدلہ پوری طرح نہیں چکا سکا۔

غیبت کرنے والے کو چاہیے کہ اصل بات کہہ دے کہ کیا غیبت کی ہے، ورنہ فضول باتوں میں معافی نہیں ہوتی۔

تیرھواں قہر کسی کی غمازی (چغل خوری) کرنا ہے۔ خداوندعالم فرماتا ہے هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ اور فرماتا ہے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ ایک جگہ ارشاد ہے حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ان تمام آیات میں چغل خوری کی مذمت فرمائی گئی ہے

(غماز) سرکارِ دوعالمؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں بدترین آدمی غماز ہے اور وہ جنت میں نہ جائے گا جب خداوندعالم نے جنت بنائی تو اس کو بولنے کا حکم دیا گیا۔ اس نے عرض کی کہ نیک بخت وہ ہوگا جو مجھ میں داخل ہوسکے گا۔ تو خداوندعالم نے جواب دیا کہ میں اپنی بزرگی کو درمیان دے کر وعدہ کرتا ہوں کہ آٹھ قسم کے گنہگاروں کو تیرے اندر داخل نہ ہونے دوں گا۔

شرابی[۱]۔ زناکار[۲]۔ چغل خور[۳]۔ دیوث[۴]۔ عوان[۵]۔ مخنث[۶]۔ قاطع رحم[۷]۔ وعدہ خلاف[۸]۔

مروی ہے کہ ایک بار قحط پڑا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کئی بار بارگاہِ ایزدی میں بارش کے لیے دعا کی۔ مگر بارش نہ ہوئی اور وحی ہوئی کہ اے موسیٰ! تمھاری دعا قبول نہ ہوگی۔ اس لیے کہ تم میں ایک آدمی چغل خور بھی ہے جناب موسیٰ نے عرض کی کہ وہ کون ہے تاکہ اس کو الگ کردوں۔ ارشادِ ربی ہوا کہ میں جس چیز کو بُرا سمجھتا ہوں وہ ہی کام خود کروں۔ جناب موسیٰؑ نے سب کو توبہ کہنے کی تلقین کی، چنانچہ سب نے غمازی سے توبہ کی اور پھر بارش

ہوئی۔ (یہ واقعہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے - مترجم)

ایک شخص نے ایک ایسے حکیم کی تلاش میں سات سو کوس کا سفر طے کیا، جو اس کو یہ بتا سکے کہ آسمان سے زیادہ بڑی زمین سے زیادہ وزنی پتھر سے زیادہ سخت، دریا سے زیادہ فراخ دل، یتیم سے زیادہ ذلیل اور طبقہ زمہریر سے زیادہ ٹھنڈی دنیا میں کون سی چیز ہے، تو حکیم نے جواب دیا کہ آسمان سے زیادہ "حق" کشادہ ہے۔ کسی بے گناہ پر الزام لگانا زمین سے زیادہ سخت ہے۔ قناعت کرنیوالا دریا سے زیادہ فراخ دل ہے۔ حسد آگ سے زیادہ گرم ہے۔ کافر کا دل پتھر سے زیادہ سخت ہے اور اپنوں پر رحم نہ کرنے والا آدمی کرۂ زمہریر سے زیادہ سرد ہے۔ اور جس چغلخور کے عیب کو لوگ جانتے ہوں۔ وہ یتیم سے زیادہ بے عزت ہے۔

تفصیلات

غیبت کی تفصیلات اور نقصانات

ایک کی بات دوسرے کو لگا دینا ہی چغل خوری نہیں ہے، بلکہ کسی کو تکلیف پہنچانا بھی غمازی میں داخل ہے۔ وہ خواہ عمل سے ہو، یا زبان سے یا کسی طرح بھی، یہ سب غمازی ہے۔

کسی آدمی کو رنج پہنچانا بھی غمازی ہے۔ اگر کوئی خیانت کرے تو اس کا ظاہر کر دینا غمازی میں داخل ہے اور اسی طرح ہر مسلمان کو نقصان پہنچانے والا مسئلہ بتا دینا ضروری ہے۔

اگر کوئی آدمی کسی کے متعلق تم سے کہے کہ اس نے تمہاری یہ برائی کی ہے تو تم کو کم از کم چھ باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اوّل تو اس کے کہنے پر یقین ہی نہ کرے، اس لیے کہ غمّاز اور چغل خور خود فاسق ہے اور اس کی بات پر عمل کرنے کے لیے خداوند عالم منع فرماتا ہے۔

دوسرے، کہنے والے آدمی کو فوراً رد کرے یہی "نہی عن المنکر" ہوتا ہے۔

تیسرے، اس کو خدا کا دشمن سمجھے۔

چوتھے یہ کہ جس کا حوالہ وہ دے رہا ہے اس کی طرف بدگمانی اچھی نہیں، اس لیے کہ بدگمانی حرام ہے۔

پانچویں یہ کہ عیب جوئی تلاش نہ کرو۔ یہ گناہ ہے۔

چھٹے یہ کہ جو بات تجھے خود اپنے لیے ناپسند ہو، وہ دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کر!

مندرجہ بالا امور ہر مسلمان پر واجب ہیں۔

کسی نے خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے سامنے غمازی کی، تو فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر تو اس میں جھوٹ بول رہا ہے تو اس آیت کا مصداق تو ہے۔ اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ، اور اگر سچ کہہ رہا ہے تو اس آیت کا مصداق ہے ھَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِیْمٍ۔ پھر اگر تو بخشش چاہتا ہے تو توبہ کر! میں معاف کر دوں گا۔ اس نے توبہ کی۔

ایک شخص نے ایک حکیم سے کسی کی شکایت کی حکیم نے جواب دیا کہ تو دیر میں کہہ رہا ہے، اور تو تین خطاؤں کا مرتکب ہوا۔ پہلے یہ کہ ایک مسلمان کے سامنے مجھے برا بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مجھے ایک فکر میں مبتلا کر دیا۔

تیسرے تو نے اپنے کو میرے سامنے چغل خور ٹھیرا دیا۔

سلیمان عبدالملک خلیفہ نے ایک شخص سے پوچھا کہ تو نے مجھے کچھ کہا ہے؟ اس نے کہا، کچھ نہیں!—— خلیفہ نے کہا کہ ایک عادل آدمی تیری شکایت کر گیا ہے، اس وقت امام زہری وہاں موجود تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ چغل خور عادل ہو ہی نہیں سکتا۔ خلیفہ نے کہا کہ صحیح فرمایا آپ نے، اور اس آدمی کو واپس کر دیا۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ جو آدمی کسی کے سامنے برائیاں بیان کیا کرتا ہے، وہ یقیناً تیری برائیاں بھی لوگوں کے سامنے کہتا ہوگا۔ ایسے آدمی کی صحبت سے بچنا چاہیے۔

(قولِ مصنف) ہمارے خیال میں اس کو دشمن سمجھنا چاہیے، کیونکہ اس کا یہ فعل غیبت، خیانت، حسد، نفاق اور فریب ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ ہر آدمی کی بعض باتیں اچھی ہوتی ہیں، لیکن غماز کی کوئی بات پسندیدہ نہیں ہوتی۔

سرکارِ دوعالم کا ارشاد ہے کہ غماز حلال زادہ نہیں ہوتا۔

مفسد اور غماز کی وجہ سے بعض اوقات تو خونریزی ہو جاتی ہے۔

ایک آدمی اپنا غلام فروخت کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس میں سوائے چغل خوری کے کوئی دوسرا عیب نہیں ہے۔ ایک شخص نے اس کو خرید لیا۔ ایک دن اس غلام نے اس کی بیوی سے کہا کہ آپ کے شوہر آپ سے محبت نہیں کرتے، اور وہ ایک کنیز خریدنے والے ہیں۔ لہٰذا جب وہ سو جائے تو استرے سے اس کے حلق کے چند بال کاٹ لو، اور میں اس پر ایک عمل پڑھ دوں گا، اس کے بعد وہ تمہارا مرید ہو جائے گا۔ دوسری طرف اپنے مالک سے کہا کہ آپ کی بیوی دوسرے کو چاہتی ہے اور تیرے کو قتل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے واقعہ پوچھا۔ غلام نے کہا کہ آپ آج ایسے بن جائیں کہ معلوم ہو کہ سو رہے ہیں۔ سب واقعہ خود ہی کھل جائے گا۔ چنانچہ اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھ بند کر لی۔ اس کی بیوی غلام کی ہدایت کے موجب استرہ لے کر آئی اور اس کی داڑھی پر ہاتھ ڈالا۔ مرد نے سمجھ لیا کہ یہ قتل کرنے آئی ہے۔ اس نے استرہ چھین کر اُسے قتل کر دیا، اور اس عورت کے عزیزوں نے شوہر کو ختم کر دیا—— سنا آپ نے چغل خوری کا نتیجہ؟

چودھواں قہر یہ ہے۔ دو دو ہمنوں کے درمیان لڑائی کرا دینا—— لیکن ایک کی برائی دوسرے کے سامنے کرنا اور ان میں ہر ایک کو اپنی دوستی کا یقین دلانا۔ یہ بات چغل خوری سے بھی زیادہ گناہ ہے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو آدمی اس دنیا میں دوزخی باتیں کرتا ہے اس کو آخرت میں دو

زبانیں دی جائیں گی۔ اور سب سے بدترین آدمی ہی دوزخی باتیں کرنے والا ہوتا ہے۔

جو آدمی دوستوں کے ساتھ دوستی رکھے، اُن لوگوں کو چاہیے کہ اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیں۔ اس کے کہنے پر خاموشی اختیار کریں اور اگر کوئی جواب دے تو معقول، ورنہ خیانت ہوگی۔ ایک کی بات دوسرے سے نہ کہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے عرض کی کہ ہم اُمرا، کے پاس اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، کہ اُن کا یہاں ذکر کرنا بھی مناسب نہیں، تو اُنھوں نے جواب دیا کہ آنحضرتؐ کے زمانے ایسی باتیں نفاق کا درجہ رکھتی تھیں۔

جو آدمی بے ضرورت امرار کے پاس ناگفتنی باتیں کریں وہ آدمی دو رُخی پالیسی رکھنے والا ہے۔ اور منافق ہے۔ لیکن اگر ضرورت کے وقت دو رُخی بات کہہ دے تو جائز ہے۔

پندرھواں عذاب یہ ہے کہ لوگوں کی تعریف کرنے میں مبالغہ کرنا۔ اس میں چھ نقصانات ہوتے ہیں۔ چار کہنے والے کو اور دو سننے والے کو (یعنی ممدوح جس کی تعریف کی جائے)

تعریف بے جا | پہلا نقصان یہ کہ حد سے زیادہ تعریف کرے اور اس میں جھوٹ بولنا پڑے —— حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص کسی کی تعریف میں مُبالغہ کرے گا۔ روز قیامت اس کی زبان اتنی لمبی ہوگی کہ چلنے میں اس کے پیروں کے نیچے آئے گی۔

دُوسرے یہ کہ تعریف کرے اور دل میں نفاق ہو۔ یعنی دل میں دُشمن سمجھے اور بظاہر تعریف کر رہا ہو۔

تیسرے یہ کہ بغیر تصدیق کے تعریف کرنے لگے۔ مثلاً فلاں آدمی بہت نیک اور مومن ہے۔

ایک آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کی تعریف کی تو فرمایا کہ مجھے افسوس ہے کہ تو نے اس کی گردن ماردی، اگر تعریف کرنا ہے، تو صرف یہ کہنا چاہیے کہ فلاں آدمی ایسا ہے۔ خداوند عالم خود اس کی اچھائی کا بدلہ دیگا۔ تم کو مبالغہ کرنے کی کیا ضرورت ہے

چوتھے یہ کہ کسی ظالم کی مدح کی جائے، اور وہ اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہو۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ ظالم آدمی کی تعریف کرنے والے سے خداوند عالم ناراض ہوتا ہے اور اس پر غصہ آتا ہے۔

دو وجوہ کی بناء پر ممدوح پر عذاب نازل ہوتا ہے۔

پہلے یہ کہ تعریف سُننے سے اس کے دل میں غرور پیدا ہو جائے۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ دُرّہ لیے بیٹھے تھے۔ ایک شخص نے جارو نامی آدمی کے لیے کہا کہ یہ "ربیعہ" کا سردار ہے۔ حضرت عمرؓ نے جارو کو دُرّے لگانا شروع کر دیے۔ اس نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس شخص نے تجھ کو "سردار" کہا۔ ہو سکتا ہے کہ تو مغرور ہو جائے، لہٰذا تیرا غرور ختم کرنا چاہتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ جب کسی آدمی کے علم کی توصیف کی جائے گی تو اس میں کاہلی پیدا ہو جائے گی اور اپنے کو پامال

آدمی سمجھنے لگے گا۔

ایک بار آنحضرتؐ کے سامنے کچھ لوگوں نے ایک آدمی کی تعریف کی، تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اس کی گردن ماردی۔ یعنی اس کی ترقی اور کوشش کو ختم کردیا۔ (یہ واقعہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ مترجم)

اور کسی شخص کی تعریف کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کے سامنے چاقو لے کر جائے۔

ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جب کسی کی تعریف کی جاتی ہے، تو شیطان اس کی شکل میں خوب خوش ہوتا ہے۔ اور اگر مومن کی تعریف کی جائے تو وہ اظہارِ عاجزی سے اور بھی دب جاتا ہے۔

تعریف کے محل و مواقع

مندرجہ ذیل چھ مواقع پر تعریف کرنا مباح ہے۔ مثلاً

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر مجھے پیغمبرؐ بنایا جاتا تو تم کو پیغمبری دی جاتی۔ اور اگر تمام دنیا کا ایمان اکٹھا کیا جائے تو ابوبکر کا ایمان زیادہ نکلے گا، لیکن اپنی تعریف خود کرنا بُرا ہے۔ خداوندِ عالم منع کرتا ہے وَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔

اگر کوئی آدمی رہبری میں اپنے متعلق کہے کہ میں یہ جانتا ہوں تو مباح ہے۔ یا ایسی تعریف جیسا کہ سرکارِ رسالتؐ نے اپنے متعلق فرمایا ہے کہ (میں اپنی سرداری پر فخر نہیں کرتا، بلکہ اس چیز پر فخر کرتا ہوں جس نے مجھ کو یہ عزت دی ہے (پیغمبری)) لہٰذا ہم کو حضورؐ کی تابعداری کرنا چاہیے۔

مذاکرات تعریف

تعریف سُن کر اکڑنا لوگوں کی تعریف کرنے سے اکڑنا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ کیا خبر؟ تمہارا کیا حشر ہو، اور دوزخ میں تمہارا مسکن قرار دیا جائے۔ دوزخی آدمی سے زیادہ اچھا کتا اور سور ہے۔ تعریف سنتے وقت خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ خداوندِ عالم نے میرے عیوب کو میرے مداح سے مخفی رکھا ہے۔ اوّل تو تعریف سُن کر اُس سے کراہت کرنا چاہیے۔

ایک آدمی کی کچھ لوگوں نے تعریف کی۔ تو اس نے خدا سے عرض کیا کہ بارِ الٰہا! تو گواہ رہنا کہ اس تعریف سے میں خوش نہیں ہوں، اور جس چیز کی وجہ سے یہ لوگ میری تعریف کر رہے ہیں، اس کو دراصل میں بُرا سمجھتا ہوں، حالانکہ یہ نہیں جانتے۔

حضرت کرم اللہ وجہہ کی کسی نے تعریف کی۔ تو آپ نے خداوندِ عالم کی درگاہ میں عرض کیا کہ تو ان کی تعریف سے مجھ سے مواخذہ نہ لینا۔

ایک شخص آپ کی تعریف صرف منافقانہ طور پر کیا کرتا تھا، تو فرمایا کہ تو جو کچھ زبان سے کہتا ہے میں اس سے بہت کم درجہ رکھتا ہوں اور جو کچھ میرے متعلق دل میں سمجھتا ہے، اس سے کہیں زیادہ!

چوتھا اصول

(باب الغضب والحسد)
غصّہ وحسد

غصّے کی حقیقت غصّہ قوتِ غضب کی نشانی ہے، جو آدمی کی آتشی قوت سے بنتا ہے۔ اور آگ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ شیطان خود دعویٰ کرتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے آگ سے بنایا اور آدمی کو مٹی سے۔ لہٰذا جب آدمی کو غصّہ آتا ہے تو شیطانی صفات اور میراث اس میں زیادہ آجاتی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سی چیز خداوند عالم کے غضب سے محفوظ رکھتی ہے۔ تو فرمایا غصّہ نہ کرنا۔ عرض کی کہ کوئی نیک راستہ بتائیے! تاکہ میرا انجام نیک ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ غصّے کو چھوڑ دے۔ اور اس کے اس قسم کے متعدد سوالات کیے اور سرکار رسالتؐ کی طرف سے یہ ہی جواب ملتا رہا۔

(حدیث) حدیث ہے کہ غصّہ آدمی کو ایسا بنا دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو۔ حضرت عیسیٰ نے یحییٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ غصّے کی خصلت کو ترک کر دو۔ فرمایا کہ میں بشر ہوں غصّہ آنا ضروری ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ حاں کی طرح نہ کرو۔ یہ تمام غصّوں کی بنیاد ہے۔

غصّے کو ضبط کرنا مسلمانو! غصّے کو قطعی ترک کر دینا تو ناممکن سا ہے، لیکن البتہ برداشت کی عادت ضرور ہونا چاہیے۔ خداوند عالم نے غصّے کو برداشت کرنے والوں کی خود تعریف کی ہے۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔

سرکارِ دوعالم کا فرمان ہے کہ جو آدمی غصّے کو برداشت کرتا ہے خدا اس کو بخشتا ہے، اور جو آدمی بدکلامی سے پرہیز کرتا ہے، خداوندِ عالم اس کے عیوب کو چھپاتا ہے۔ دوزخ میں ایک دروازے سے صرف غصّہ کرنیوالے لوگ جائیں گے اور خداوندِ عالم کے نزدیک غصّہ پینا تمام مشروبات سے افضل ہے۔ اس کا دل ایمان سے روشن کر دیا جاتا ہے۔

حضرت فضیل اور حضرت سفیان ثوری نیز دیگر اکابرین کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ غصّے کو برداشت کرنا اور حرص وہوا کے وقت صبر کرنا سب سے بڑی نیکی ہے۔

ایک آدمی نے خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز سے کوئی سخت کلامی کی۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اور نرمی اختیار کی، اور فرمایا کہ تیری خواہش تھی کہ مجھے غصّہ آجائے اور شیطان میرے اوپر مسلط ہو جائے۔ اور میں تیرے اوپر

غصہ کر کے قیامت کے دن تجھ کو جواب دوں۔

ایک نبی نے اپنی اُمت سے فرمایا کہ آیا تم میں کوئی شخص غصے کو برداشت کرنے کا وعدہ کر سکتا ہے۔ بس اسی کو میں اپنا جانشین بناؤں گا۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ نے دوبارہ بھی فرمایا۔ اس نے پھر جواب دیا۔ چنانچہ اس کو جانشین بنا دیا گیا۔ چنانچہ اس کو "ذوالکفل" کا لقب ملا۔ چنانچہ خود اپنی کفالت کی تھی

مباحثات

غصے کی اصل وحقیقت غصہ دراصل اس لیے تخلیق کیا گیا ہے کہ آدمی اپنے دشمن سے محفوظ رہ سکے۔ جس طرح خواہش اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ لہٰذا آدمی کو دونوں چیزوں میں زیادتی سے کام نہ لینا چاہیے، ورنہ آگ کی طرح اس کے شعلے بھڑک اٹھیں گے، اور اس کا دھواں دل و دماغ کو ماؤف کر دے گا۔ اس کے بعد قوتِ ادراک ختم ہو جائے گی اور عواقب و جوانب کو بغیر سوچے سمجھے آدمی بے راہ ہو کر طوفانی لہروں میں بہتا چلا جائے گا۔

اسی طرح یہ دونوں قوتیں اتنی کم بھی نہ ہوں کہ آدمی اپنے مقاصد کو کامیاب نہ بنا سکے اور کاہل و سُست بن جائے، اور اس میں عزت و حمیت بالکل جاتی رہے۔

سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اور صحابہ کے متعلق فرمایا أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔ یہ سب کچھ غصے کا سبب ہیں۔

غصے کی ضرورت افراط و تفریط لہٰذا غصہ اور خواہش دونوں عناصر انسان میں ہونا بھی ضروری ہیں، لیکن ان کی افراط و تفریط آدمی کو بگاڑ دیتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ شریعتِ اسلام کے خلاف عمل کرتے ہیں بعض تو غصے کو قطعی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن انسان کی زندگی کے لیے غصہ انتہائی ضروری ہے۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ بعض آدمی غصے کو قطعی طور پر چھپانے اور یہ محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ اس کو غصہ آرہا ہے!

غصے کے اسباب

غصے کے وجوہات فطری بات ہے کہ آدمی اپنی خواہش کے ماتحت ہر چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب چاہے وہ بزور لے یا بہ نرمی، یا اگر بے ضرورت چیز اس کے ہاتھ سے نکل جائے تو اس کو غصہ نہ آئے۔ اپنی ضرورت کو یہ چیز حاصل کرنا غصہ کہلاتا ہے۔ اب جتنی ضروریات بڑھتی جائیں گی طمع اور حرص میں اضافہ ہوگا، اتنا ہی غصہ بڑھتا رہے گا۔ اسی طرح اگر آدمی ریاضت کے بعد دنیا کی حرص کو چھوڑ چکا ہے تو اس کو غصہ نہ آئے گا۔ مثلاً کوئی آدمی اس سے کسی اونچی جگہ پر بیٹھنے کو کہے تو بیٹھ جائے گا اور نہ کہے تو اس کی پروا نہ کرے گا۔

زیادہ تر غصہ مالِ دنیا کے لیے پیدا ہوتا ہے یا بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی غصہ آنے لگتا ہے۔

مثلاً کسی سے کہیں کہ تجھ کو شطرنج اچھا کھیلنا نہیں آتا تو وہ لڑ بیٹھتا ہے، لیکن ایسے غصّے کو ذرا سا سمجھ دار آدمی تھوڑی سی ریاضت کے بعد برداشت کر سکتا ہے۔

جائز غصّہ اگر ضرورت شرعی کو پورا کرنے کے لیے غصّہ ہو تو وہ ناجائز نہیں ہے، بلکہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آدمی میں غصّہ ہونا چاہیے، لیکن اتنا نہ ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

آنحضرتؐ بھی غصّہ کرتے تھے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی ایک تم جیسا "آدمی" ہی ہوں۔ اور جس طرح تم غصّہ کرتے ہو، مجھے بھی غصّہ آتا ہے۔ اے خدا جب میں کسی پر لعنت کروں یا غصّہ کروں تو اس شخص پر اپنی رحمت نازل کر! تو عبداللہ ابنِ عمرو بن العاص نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! آپ جو کچھ فرماتے ہیں میں اس کو لکھ لیا کرتا ہوں، کیا غصّے کے کلمات بھی لکھ لیا کروں؟ ارشاد ہوا کہ خدا کی قسم میں غصّے کے وقت خلافِ شریعت بات نہیں کہتا ہوں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے غصّہ نہیں، بلکہ حکم ہوا کہ غصّہ خلافِ شریعت نہیں ہے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضؓ کو غصّہ آیا تو سرکارؐ نے فرمایا کہ شیطان آگیا۔ تو دریافت کیا کہ آپ غصّہ کرتے ہیں تب شیطان آتا ہے۔ فرمایا کہ آتا ہے، لیکن میرے قابو میں ہے اور میں اس پر غالب ہوں اور میں اس کو صرف اچھے کاموں کے لیے حکم دیتا ہوں۔

تفصیلات

غلبۂ وحدانیت بعض لوگوں پر وحدانیت کا جذبہ اتنا طاری ہوتا ہے کہ غصّے کی کیفیات دب جاتی ہیں اور اس کے بعد لوگ اس کو اگر پتھر بھی مارتے ہیں تو غصّہ نہیں آتا۔ لیکن یہ باطن غصّہ ضرور آتا ہے۔ اس کو پتھر پر غصّہ نہیں آتا، بلکہ مارنے والے پر آتا ہے۔ اس طرح اگر بادشاہ کے حکم سے کوئی عمل کیا جاتا ہے تو اس کو بادشاہ پر غصّہ آتا ہے۔ اس کے لکھے ہوئے پر نہیں، یا بادشاہ کے ماتحتوں پر نہیں آتا۔

اس طرح توحید کے غلبے کے بعد وہ ہر کام من جانب اللہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ آدمی کے ہاتھ کی حرکات۔ قدرت کے ماتحت ہیں، مگر قدرت ارادے اور خواہشات کے قیود میں ہے اور قوت ارادی انسان کے بس میں نہیں۔ خواہشات دے کر اس کو قادر کر دیا گیا ہے۔ کہ اب کرے یا نہ کرے۔ جبکہ خواہشات پیدا کر دی گئیں، اور ارادہ بھی اس طرف سے عطا ہو گیا، تو افعال کا صادر ہونا ضروری ہے۔

(مثال) جس طرح ایک موحد کا ذریعہ ایک بکری ہو اور وہ بکری مرجائے تو اس کو ضرور رنج ہوگا، لیکن غصّہ نہ آئے گا، اس لیے کہ یہ کام کسی آدمی کے ذریعہ عمل میں نہیں آیا۔

غصّے کی مثال حضرت سلمان کو ایک آدمی نے گالی دی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میری نیکیاں تیری گالی سے زیادہ ہیں تو مجھے کوئی غم نہیں، اور اگر تیرا کہنا میرے گناہوں سے زیادہ وزنی ہے تو واقعی میں اس سے زیادہ برا ہوں

(یہ روایت پہلے بھی بیان ہو چکی ہے۔ مترجم)

(تمثیل ۱) کسی آدمی نے ربیع بن خثیم کو گالی دی تو فرمایا کہ میرے اور خباثت کے بیچ میں ایک خلا ہے اگر اس کو طے کر لوں تو مجھے تیری گالی کی کوئی پروا نہیں۔ اور اگر طے نہ کر سکا، تو تیرے کہنے سے کہیں زیادہ ہوں۔ آپ وحدانیت میں اتنے کھوئے گئے تھے۔ کہ اس بات پر غصہ نہ آیا۔

" (۲) مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کو ایک آدمی نے ریاکار کہا۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے خوب پہچانا (یہ روایت پہلے بھی نقل ہوئی ہے۔ مترجم)

" (۳) حضرت شعبی کو ایک شخص نے کچھ کہا، تو فرمایا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو خدا میرے اوپر رحم کرے اور اگر غلط کہتا ہے تو تجھ پر رحم کرے۔

مندرجہ بالا امثلہ غصے کو ضبط کرنے والی ہیں۔ خداوند عالم غصہ ضبط کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی محبت آدمی پر غالب ہوگی وہ اس کام میں زیادہ محو رہے گا، جیسے کوئی آدمی کسی سے محبت کرتا ہے، تمام تکالیف برداشت کرنے میں اس کو لطف آئے گا۔ اسی طرح خداوند عالم سے محبت کرنے والے کسی کی پروا کیے بغیر اس کی طرف اپنے کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ہر آدمی کو چاہیے کہ کسی نہ کسی طرح غصے کو مغلوب کرے اور اگر بالکل نہ دبا سکے تو کم از کم اپنے قابو میں رکھے۔ تاکہ خلاف شریعت کوئی کام عمل میں نہ آسکے۔

غصہ کس طرح فرو ہو سکتا ہے | تفصیل: غصے کو مغلوب کرنا ہر آدمی کا فرض ہے۔ کیونکہ غصہ ہی عموماً گناہوں کا سبب ہوتا ہے۔ اس کا دفعیہ دو صورتوں سے ہو سکتا ہے۔

اوّل تو یہ کہ اس کو بالکل اپنی طبیعت سے نکال دے۔ یہ بالکل مسہل کی طرح ہے۔

دوسرا یہ کہ قلب اور دماغ کو خواہش غضب کے اوپر مسلّط کرے۔ بالکل جڑ نہ اکھاڑے یہ ایسا ہے جیسے سکنجبین مسہل اس طرح ہوتا ہے کہ غصے کی اصل بنیاد پر غور کرے کہ غصہ کیوں آتا ہے؟ اور اس کے بعد اس سے پرہیز کرے۔

غصے کے اسباب | غصے کے عموماً پانچ اسباب ہیں:

پہلا سبب غرور و تکبر۔ مغرور آدمی ذرا ذرا سی بات پر اکڑ جاتا ہے۔ لہٰذا آدمی اپنے غرور کو عاجزی سے بدلنے کی کوشش کرے، اور سوچے کہ میں بھی انھیں آدمیوں کی طرح ایک مخلوق ہوں۔ لہٰذا ان سے خوش اخلاقی اور عجز سے پیش آئے۔ بس یہی طریقہ تکبر کو ختم کرنے کا ہے۔

دوسرے آدمی میں عجب پیدا ہو جائے، یعنی آدمی اپنی بات اور افعال کو صحیح سمجھنے لگے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، وہ ٹھیک ہی ہے۔ ان دونوں افعال (کبر و عجب) کے متعلق آئندہ تھوڑا تھوڑا لکھا جائے گا۔

تیسرا سبب مزاح ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں آخر میں غصّہ آتا ہے۔ لہٰذا مزاح کو ترک کر دینا ہی مناسب ہے اور آخرت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بھی مزاح نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ مزاح کے ساتھ ساتھ مسخرا پن اور ہنسی مذاق سے بھی آدمی پرہیز کرے، تو اچھا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی عیب جوئی اور ملامت کرے۔ اس کا دفعیہ یہ ہے کہ آدمی اگر خود گناہ نہ کرتا ہو تو دوسروں کی عیب پر ہنسی مناسب نہیں، لیکن کوئی شخص ایسا نہیں کہ جو عیب نہ کرتا ہو۔ لہٰذا کسی کو ملامت کرنے اور نکتہ چینی کرنا بُرا ہے۔ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

پانچواں درجہ مال دُنیا کی طلب ہے۔ اور اس سے دُنیا کا کوئی آدمی خالی نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی غریب اور فقیر آدمی کا ایک نوالہ کوئی چھین لے تو اس کو غصّہ آجاتا ہے یا کسی حریص آدمی کا ایک پیسہ لے لے تو وہ غصّہ میں بے قابو ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر اس کو علم و تہذیب کی رو سے تبدیل کرنا چاہے تو اس کی اصل بُنیاد پر غور کرے کہ مال دُنیا کی بُنیاد صرف خرابیوں پر ہے۔ اس کو سمجھنے کے بعد علاج یہ ہے کہ اپنے سے بداخلاقیوں کو دُور کرے اور نیکوں کی صحبت اختیار کرے۔ بعض ناشناس لوگ قصّے بیان کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی بردباری اور صبر بیکار ہے۔ آدمی ایسا ہونا چاہیے کہ جیسے فلاں نے فلاں کو قتل کر کے تمام مال چھین لیا۔ ایسے لوگوں سے دُور رہے۔ اس لیے کہ ایسے وسوسے شیطانی ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ غصّہ جوانی اور مردانگی کی علامت ہے۔ لیکن غصّہ تو مرد، عورت، بچے اور بوڑھے سب کو آتا ہے۔ بلکہ سب سے بڑی بہادری یہ ہے کہ آدمی غصّے کو برداشت کرلے اور یہ صفات اولیاء اللہ میں ہیں۔ لہٰذا اگر نیکیاں چاہتا ہے تو اسی عادت پر عمل کر۔

غصّے کا دفعیہ

غصّے کو دُور کرنے کی تدابیر اوپر جو کچھ بیان کیا گیا، وہ سب غصّے کی خرابیاں اور اس کی اصلاح کے متعلق تھا۔ اگر آدمی ان خرابیوں کو پُورے طور پر دفع نہ کر سکے تو کم از کم اس کو اپنا مفتوح ضرور کرلے اور یہ منزل اس وقت ہوتی ہے جب آدمی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو اور صبر کی تلخیوں سے اس کو مفتوح کر چکا ہو۔

علم و عمل کی آراستگی اخلاقِ حسنہ پیدا کرتی ہے۔ جو بیان کیا جا چکا ہے۔ اس لیے کہ تیرا دل جتنی قدرت تیرے اوپر رکھتا ہے خداوند عالم "دل پر" اس سے کہیں زیادہ قادر ہے۔ لہٰذا اس کی مخالفت باعثِ گناہ ہے۔

اگر تم کو کسی پر غصّہ آئے گا تو خداوند عالم کے غصّے سے بروزِ قیامت کس طرح نجات حاصل ہو سکے گی۔

ایک بار سرکارِ رسالتؐ نے ایک غلام کو کسی کے پاس بھیجا۔ وہ کافی دیر کر کے وہاں سے واپس ہوا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر انتقام نہ لیا جاتا، تو میں تجھ کو سزا دیتا۔

آدمی کو چاہیے کہ دل کو صبر کی تلقین کرے کہ جو کام جس طرح عمل میں آیا وہ خدا کو یوں ہی کرنا تھا اور اگر شکایت کرے گا۔

تو وہ گویا کہ خدا سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔

اگر غصّہ دین کے خوف سے کم نہ ہو، تو اس طرف متوجّہ کرے کہ جس پر غصّہ کیا جائے گا، وہ آمادہ فساد ہوگا اور ظاہر ہے کہ دشمن کو حقیر نہ جاننا چاہیے، تو گویا کہ غصّہ اپنے ہی کو نقصان پہنچانے والا ثابت ہوا۔ غصّے میں آدمی کی شکل بالکل بھیڑیے کی سی ہوجاتی ہے۔ اگر آدمی غصّے کے وقت اپنی شکل دیکھے تو وہ ہرگز غصّہ نہ کرے گا۔

جب آدمی غصّے کو ضبط کرتا ہے تو عموماً نفسِ امّارہ اس سے کہتا ہے کہ یہ بزدلی کی دلیل ہے۔ اس وقت ضبط کرنا ہی بڑی بہادری ہے۔ یہ وہ عزّت ہے جو انبیا علیہم السّلام کا راستہ دکھاتی ہے اور انھیں کی تاسّی سے پیدا ہوتی ہے۔ آدمی سمجھ لے اگر اس وقت غصّے کو ضبط کرنا دنیا والوں کی نگاہ میں باعثِ توہین ہے، تو غصّہ کرنا آخرت میں باعثِ عذاب ہوگا۔

غصّے کو ضبط کرنے کا عملی علاج یہ ہے کہ زبان سے أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کہے اور کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے اور ٹھنڈے پانی سے وضو کرے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ غصّہ پانی سے ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ غصّے کے وقت خاک پر سجدے میں گر جائے۔ تاکہ یہ سمجھ لے کہ میں مشتِ خاک کا پُتلا ہوں۔

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصّہ آیا۔ آپ نے ناک میں پانی ڈالنے کے لیے منگایا اور فرمایا کہ غصّہ ناک میں پانی ڈالنے سے جاتا رہتا ہے۔ اس لیے یہ صفت شیطانی ہے۔

حضرت ابوذرؓ نے کسی کو غصّے میں ایک بار "کنیز کا بیٹا" کہہ دیا، تو سرکارِ رسالتؐ نے فرمایا کہ اے ابوذر! تو کسی سے بہتر اس وقت تک نہیں جب تک کہ تقویٰ اور پرہیزگاری سے کام نہ لے۔ حضرت ابوذر نے اس شخص سے معافی مانگی۔

حضرت عائشہؓ کو ایک بار غصّہ آیا تو سرکارِ دوعالم ان کی ناک پکڑ کر کہلواتے اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ وَاَذْهِبْ غَيْظَ قَلْبِيْ وَاَجِرْنِيْ مِنْ مُّضِلَّاتِ الْفِتَنِ (یعنی اے پالنے والے میرے نبی کے میرا گناہ بخش دے اور میرا غصّہ کم کردے۔ اور موجِ گمراہی سے بچا!) لہٰذا یہ کہنا غصّے کے وقت سنّت ہے۔

غصّے کی مختلف صورتیں اور اُن کے ضبط کرنے کا طریقہ

اگر کوئی شخص سختی اور غصّے سے پیش آئے تو خاموشی ہی اختیار کرنا سب سے اچھا ہے، لیکن قطعی خاموشی بھی نہ رہے اور ہر بات کا جواب بھی نہ دے۔

البتّہ گالی کے بدلے گالی دینا، غیبت کے بدلے میں غیبت کرنا گناہ ہے۔ اس سے عذابِ الٰہی کا مستوجب ہوتا ہے۔ لیکن اگر سچّی بات سختی سے کہی جائے تو کوئی حرج نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ اگر کوئی آدمی تیرا صحیح عیب ظاہر کرے، تو تو اس سے بدلہ نہ لے۔ اس لیے کہ یہ "احتساب" ہوگا، لیکن اس میں زنا اور گالی کے متعلق کچھ نہ ہونا چاہیے۔

سرکار دو عالمؐ کا ارشاد ہے کہ اَلْمُسْتَبَانُ مَاقَالَا فَعَلَی الْبَادِیْ حَتّٰی یَعْتَدِ الْمَظْلُوْمُ (یعنی جس شخص نے بُرائی کی ابتدا کی وہ آدمی ہی ماخوذ ہوگا) چاہے اس کا مخاطب حد سے زیادہ متجاوز کیوں نہ ہوجائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اب ازواج آنحضرت نے جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا سے جا کر عرض کی کہ آپ اپنے والد ماجد کی خدمت میں عرض کریں کہ وہ ہم میں اور حضرت عائشہ میں عدل کریں۔ جناب فاطمہ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں یہ پیغام دے دیا۔ تو فرمایا کہ جس کو میں دوست جانتا ہوں کیا تم اسے دوست نہیں جانتیں؟ تم کو چاہیے کہ عائشہ کو تم بھی دوست رکھو! کیونکہ میں اس کو بہت چاہتا ہوں۔ جناب فاطمہ واپس تشریف لائیں، اور یہ واقعہ سُنایا، تو سب نے کہا ہم مطمئن نہیں ہوئیں۔ تو حضرت زینب (ایک بی بی کا نام ہے) کو بھیجا گیا، جو میری برابری کی دعویٰ دار تھیں، اور میری برائیاں شروع کیں، لیکن میں خاموش بیٹھی رہی اور منتظر رہی کہ سرکار مجھے بھی جواب دینے کی اجازت دیں، یہاں تک کہ اجازت ملی اور میں نے جواب دینا شروع کیے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بولتے بولتے میرا حلق سُوکھ گیا، اور زینب مجھ سے عاجز ہوگئیں، تو سرکار نے فرمایا کہ اے زینب! یہ ابوبکر کی بیٹی ہے۔ تم اس سے نہ جیت سکوگی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جواب دینا منع نہیں ہے، لیکن اس میں جھوٹ کا شائبہ نہ ہو، جیسے درمیان گفتگو میں احمق! اور جاہل کہہ دیا جائے۔

لہٰذا آدمی کو اچھے الفاظ کے استعمال کی عادت ڈالنا چاہیے تاکہ غصّے میں بھی بداخلاقی سے پیش نہ آسکے اور اگر حد سے تجاوز کر جائے گا، تو جواب نہ دینا ہی اچھا ہے۔

ایک آدمی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بُرا بھلا کہا۔ کچھ دیر آپ خاموش رہے، لیکن پھر جواب دینا شروع کیا۔ تو سرکار رسالتؐ وہاں سے کھڑے ہوگئے۔ حضرت صدیق نے عرض کی کہ اے نبی اللہ! اب تک آپ جواب دے رہے ہیں، تو شیطان آگیا۔ لہٰذا شیطان کے پاس سے اُٹھ جانا اچھا ہے۔

سرکارِ دو عالمؐ کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم نے ہر آدمی کو مختلف طبائع دے کر ودیعت کیا ہے۔

ایک وہ آدمی جو غصّہ دیر میں کرتا ہے اور خوشی کا اظہار بھی دیر ہی سے کرتا ہے۔

ایک وہ آدمی جو جلدی غصّہ کرتا ہے، اور جلدی ہی راضی ہوتا ہے۔

مگر اُن دونوں میں وہ آدمی زیادہ بہتر ہے، جو غصّہ دیر میں کرے اور رضامندی جلدی ظاہر کردے۔

غصّے کو ضبط کرنے کی برکت

جو آدمی اپنی نیک عادت کی بناء پر غصّے کو ضبط کرتا ہے، وہ نیک ہے لیکن وہ آدمی جو کسی کمزوری یا مصلحت کی بناء پر غصّے کو ضبط کرے۔ اس کے دل میں کپٹ اور حسد جمع ہوتا رہتا ہے۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ مومن کینہ پرور نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ کینہ غصّے سے ہی پیدا ہوتا ہے اور اس کی آٹھ شاخیں ہیں:

اظہارِ نفرت کے طریقے پہلی وجہ یہ ہے کہ دشمن کی خوشی سے رنجیدہ ہوتا ہے اور اس کی تکلیف سے خوش۔

دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ بھی رہتا ہے اور اس کی تکلیف میں خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی خاموشی اختیار کرے، یہاں تک کہ سلام کا جواب بھی نہ دے۔

چوتھے اس کو ذلّت کی نگاہوں سے دیکھے۔

پانچویں یہ کہ اس کے عیوب اور راز جھوٹی شکلوں میں دوسروں سے کہنے لگتا ہے۔

چھٹے یہ کہ اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔

ساتویں صورت یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا نہیں کرتا۔

آٹھویں صورت یہ ہے کہ موقع ملنے پر اس سے بدلہ لیتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنا شریک کار بناتا ہے۔

چاہے کوئی کتنا ہی ایماندار ہو، مگر وہ دوسروں کے مظالم کا بدلہ دیتا ہے۔ نرمی سے پیش نہیں آتا۔ اس کے افعال سے بردباری نہیں کرتا۔ اس کے حق میں دعا نہیں کرتا لیکن یہ عادتیں اس کے ثواب کو کم کر دیتی ہیں۔

ایک مسطح نامی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عزیز قریب تھا، اس نے حضرت عائشہ رضؓ کے واقعہ افک میں جھوٹی قسم کھائی، تو خلیفۂ اوّل نے اس کا وظیفہ روک لیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ یہاں تک کہ ارشاد ہوا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (یعنی تم ایسی قسم نہ کھاؤ کہ جو شخص تم پر ظلم کرے اور تم نیکی نہ کرو۔ کیا تم اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے، کہ خداوند عالم تم کو دوست رکھے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا وظیفہ پھر شروع کر دیا اور فرمایا کہ میں خدا کی دوستی ضروری سمجھتا ہوں۔

جس آدمی کے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی ہوتی ہے وہ تین حالات کے علاوہ نہیں ہوتی۔

یا تو وہ اپنے نفس سے لڑے کہ اس کی بدی کے بعد بھی اس کے ساتھ نیکی کرے —— اگر ایسا ہے تو صدیقین کے درجات پر فائز ہے۔

یا نیکی نہ کر سکتا ہو، تو بُرائی بھی نہ کرے۔ متقی ایسا ہی کرتے ہیں۔

اور آخری درجہ فاسقین کا ہے کہ نہ خاموش رہتے ہیں نہ نیکی کرتے ہیں بلکہ اُن کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ بدی کرنے والوں کے ساتھ بھی نیکی سے پیش آئے۔ یہ ہی سبب تقربِ خداوندی ہے۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو اس کو معاف کر دے۔ اس میں بھی بڑی فضیلت ہے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں تین امور کے متعلق وعدہ کرتا ہوں اور عہد۔

کہ صدقہ دو، اس لیے کہ صدقے سے مال دنیا کم نہیں ہ

جو آدمی تمہارا گناہگار ہو، اس کو معاف کر دو۔ خ ... ے کا۔

جو آدمی کسی کا سوال رد کرتا ہے، وہ خدا کے نزدیک خود مفلس ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضورؐ کو کسی شخص سے بدلہ لیتے نہیں دیکھا لیکن جب آدمی حق اللہ غضب کرتا تو بہت غصہ

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو آنحضرتؐ نے نصیحت ... سے نہ ملنا چاہے۔ اس سے مل! اور جو ظلم کرے۔ اس پر رحم کر، اور جو تجھ سے کنجوسی کرے، اس کے ساتھ بخشش کر!

آنحضرتؐ نے غلافِ کعبہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ وہ "احد" ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنے بندوں سے کیے وعدے کو پورا کیا، اور شیطان کو اُن کے مقابلے میں شکست دی۔ تم لوگ اس کو سمجھتے ہو؟ سب نے عرض کیا، ہم جانتے ہیں۔ اور آپ کے کرم کے اُمیدوار ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم سے وہی کہتا ہوں، جو جناب یوسفؑ نے اپنے بھائیوں پر قابو حاصل کر کے کہا تھا۔ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اور سب کو بخش دیا ——— اس کے بعد فرمایا کہ روزِ قیامت خداوند عالم تمام لوگوں سے کہے گا کہ جن لوگوں کے حقوق مجھ پر ہوں، وہ طلب کریں۔ لہٰذا طلب کریں گے، اور جنت میں داخل ہوں گے اور وہ آپس کے قصور معاف کرنے والے ہوں گے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ غصّے سے صبر کرو۔ تاکہ غصّے پر قابو پالو اور جب تم کو غصہ نہ ہو، تو معاف کر دو۔

معاف کرنے کی خصوصیات خلیفہ ہشام رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک مجرم آیا اور اپنی بے گناہی میں عذر کرنے لگا۔ ہشام نے کہا کہ تو دلائل بے گناہی میرے سامنے دیتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا۔ خداوند عالم کے سامنے تو سب اپنے حقوق طلب کرتے ہیں، پھر میں تیرے سامنے عذر کیوں نہ کروں؟ تب ہشام نے اس کے تمام عُذر سُنے۔

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کو حج میں دیکھا کہ اس کا مال چوروں نے چُرا لیا تھا۔ وہ روتا تھا میں نے سبب گریہ پوچھا تو کہنے لگا کہ میں اپنے مال کی وجہ سے نہیں روتا۔ بلکہ اس چور کے لیے رو رہا ہوں کہ قیامت

کے دن جب وہ میرے سامنے ہوگا تو کن الفاظ میں معافی مانگے گا۔

(حدیث) سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا کہ جس آدمی میں نرمی ہے خدا اس کی بخشش کرتا ہے۔ اور جو سخت طبیعت ہے، وہ نہیں بخشا جاتا۔ اور جو آدمی لوگوں کا دوست ہے خدا اس کو دوست رکھتا ہے، اور سخت طبائع والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اے عائشہ! ہر کام میں اختیار کرو! نرمی سے ہر کام آسان ہوتا ہے، ورنہ خراب ہوجاتا ہے۔

حَسد

حسد غصّے سے ہی پیدا ہوتا ہے

غصّے سے کینہ اور کینے سے حسد پیدا ہوتا ہے اور "حسد" مہلکات میں سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح ختم کردیتا ہے، جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلا دیتی ہے (یہ حدیث بھی بیان ہوچکی ہے۔ مترجم)

اور فرمایا کہ دنیا کے سب آدمی تین کمزوریوں میں مبتلا ہیں:

بدگمانی۔ حسد۔ فال بد۔ للہٰذا اس سے بچنے کی تدابیر بتائی جاتی ہیں۔

بدگمانی، حسد اور بدفہمی سے بچنے کی تدابیر

اور اگر حسد پیدا ہوجائے تو زبان اور ہاتھ کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرو۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں وہ چیزیں پیدا ہورہی ہیں، جو اُن کو تباہی کے راستے پر لیے جارہی ہیں۔ اور انھیں باتوں نے پہلی اُمتوں کو تباہ کردیا ہے۔ اور اے مسلمانو! یاد رکھو کہ جب تک تم ایماندار نہ ہوگے اور ایک دوسرے کی محبت آپس میں نہ ہوگی، اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوسکوگے۔ اور یہ سب باتیں حسد اور عداوت کی بناء پر ہیں۔ للہٰذا جب ایک دوسرے کو دیکھو تو سلام کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے ایک شخص کو عرش کے نیچے دیکھا۔ بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ یہ کون شخص ہے؟ ندا آئی کہ اس نے کبھی حسد نہ کیا تھا۔ ماں باپ کی فرمانبرداری کرتا تھا اور کبھی کسی کی چغل خوری نہ کی تھی۔

حضرت زکریاؑ کا ارشاد ہے کہ حاسد میری ناشکری کرتا ہے، اور میں نے بندوں میں جس طرح تقسیم کو مناسب رکھا ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہے۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ چھ قسم کے آدمی دوزخ میں پھینک دیئے جائیں گے۔

دوزخی کی شناخت

۱۔ اُمراء و حکّام اپنے ظلم کی وجہ سے۔

۲۔ غُرباء اپنے تعصب کی وجہ سے۔

۳۔ مالدار غرور کی وجہ سے۔

۴۔ تجارت پیشہ بے ایمانی کی وجہ سے۔

۵ - گنوار اور جاہل نادانی اور لاعلمی کے سبب -

۶ - علماء اپنے حسد کے باعث -

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار سرکار رسالت نے فرمایا کہ اس وقت ایک وہ آدمی آئے گا جو اہلِ بہشت سے ہوگا۔ چنانچہ ایک شخص داہنے ہاتھ میں جوتا لیے ہوئے داخل ہوا، جس کی داڑھی سے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا۔ دوسرے روز پھر بھی واقعہ ہوا۔ اور تیسرے روز پھر وہی۔ چنانچہ وہاں عبداللہ ابنِ عمر بیٹھے تھے۔ وہ اس کے ساتھ گھر گئے اور کہا کہ میں تم سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تم اس مرتبے پر کیسے پہنچے، اور اس شخص کے یہاں تین دن قیام کیا۔ لیکن کوئی خاص بات نہ دیکھی۔ آخری دن اس نے کہا کہ میں حسد نہیں کرتا۔ تب عبداللہ نے فرمایا کہ بس یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے یہ مرتبہ عنایت فرمایا ہے۔

عون بن عبداللہ نے ایک بادشاہ کو غرور سے پرہیز کرنے کی نصیحت کی۔ اور فرمایا کہ سب سے پہلا گناہ ابلیس نے کبر ہی کیا تھا، اور حرص سے بھی دُور رہ! اس لیے کہ حرص نے ہی حضرت آدمؑ کو جنّت سے نکالا تھا، اور حسد سے پرہیز کر، کیونکہ سب سے پہلا خون جو بہایا گیا، وہ حضرت آدمؑ کے بیٹے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ جب خدا کا ذکر کیا جائے، یا نجوم کی باتیں کی جائیں تو خاموش بیٹھا رہو۔

بدکردار اور حاسد آدمی خود اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے بکر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی بادشاہ کو روز نصیحت کرتا تاکہ نیکوں کے ساتھ نیکی کرو۔ کیونکہ بدافعالی آدمی کے لیے اس کی بدافعالی بہت کچھ گناہ ہے۔ بادشاہ اس کو اس لیے دوست رکھتا تھا کہ آدمی نے اس شخص کی بادشاہ سے شکایت کیں۔ اور کہا کہ وہ آدمی مجھ کو گندہ دہن کہتا ہے۔ بادشاہ نے اس بات کی تصدیق چاہی تو کہا، کہ جب وہ آدمی یہاں آئے گا تو اپنے مُنہ پر بدبُو کی وجہ سے ہاتھ رکھ لے گا۔ اس کے بعد اس آدمی نے اس شخص کو جس کی شکایت پیش بادشاہ کی تھی، لہسن کھلایا، اس کے بعد جب وہ بادشاہ کے پاس گیا تو مُنہ پر لہسن کی بدبُو کی وجہ سے ہاتھ رکھ لیا۔ بادشاہ کو حاسد کی بات کا یقین آگیا۔ چنانچہ اس نے اپنے وزیر کو لکھا کہ اس آدمی کو قتل کر دو، اور اپنی مہر ثبت کر دی، اور لفافہ بند کر کے اسی شخص کے حوالے کر دیا، جس کی شکایت کی گئی تھی۔ وہ آدمی بادشاہ سے رخصت ہوا۔ باہر آیا تو حاسد نے دریافت کیا کہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ انعام اور خلعت کا حکم۔ حاسد نے اس سے وہ لفافہ لے لیا، اور خود اس وزیر کے پاس گیا۔ جب لفافہ کھولا گیا، تو اس میں قتل کا حکم تھا۔ وزیر نے کہا کہ اس میں تمہارے قتل کا حکم ہے۔ حاسد نے کہا کہ یہ حکم تو اس کے لیے ہے۔ آپ بادشاہ سے دوبارہ دریافت کریں۔ وزیر نے کہا کہ احکامات شاہی دوبارہ دریافت طلب نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کو قتل کر دیا گیا۔ وہ نیک مرد دوسرے دن حسبِ معمول پھر آیا۔ بادشاہ کو دیکھ کر تعجب ہوا [illegible] فت کیا کہ کل کا لفافہ کہاں گیا۔ اُس نے پورا واقعہ بتایا

بادشاہ نے کہا کہ تم اپنی ناک اور مُنہ پر ہاتھ رکھ کر کیوں آتے تھے۔ اس نے جواب دیا کہ کل اس شخص نے مجھے لہسن کھلا دیا تھا۔ مجھے خیال تھا کہ آپ کو اِس کی بُو بری نہ معلوم ہو۔ بادشاہ نے کہا تم صحیح کہتے ہو، کہ بدکردار کو اس کے اعمال خود سزا کے لیے کافی ہیں۔

(تمثیل) ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں کبھی حسد نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اگر وہ آدمی دُنیا سے محبّت کرتا ہے، اور دوزخی ہے تو میرے حسد کی ضرورت نہیں، اور اگر جنّتی ہے تو تمام نعمات میرے حسد کرنے کی وجہ سے اس پر بند نہیں ہو سکتیں، اور وہ ضرور جنّت میں جائے گا۔

(روایت) حضرت حسن بصری سے کسی نے دریافت کیا کہ مومن آدمی بھی حسد کر سکتا ہے؟ تو فرمایا کہ پسرانِ یعقوب کا قصّہ یاد کر!

مروی ہے کہ جو آدمی موت کا خواہش مند ہے، اس کو نہ حسد ہو سکتا ہے، نہ محبّتِ دُنیا اور نہ خوشی۔

حَسد کی بُنیادیں

غبطہ، مناسفہ اور رشک

کسی کو خداوند عالم کی دی ہوئی نعمتوں اور عزّت سے جلنا اور اس کا بُرا چاہنا حسد ہے۔ اور یہ حرام ہے۔ احادیث کی رو سے بھی اور عقلاً بھی اس لیے کہ نعمات خداوندی کی وہ شخص تذلیل کرتا ہے۔ اور جو چیزیں تجھے حاصل نہیں، دوسروں کے لیے بھی اپنی طرح زوال کا خواہشمند ہے۔ یہ ہی خباثت کی دلیل ہے، لیکن اگر تو بھی اس نعمت کو حاصل کرنا چاہے، تو یہ بُرا نہیں۔ اس کو غبطہ، مناسفہ اور رشک کہتے ہیں۔ اور اگر یہ آرزو دین کے معاملے میں ہو تو واجب ہے اور بڑا ثواب ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم خود فرماتا ہے کہ تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

حدیث ہے کہ "حسد" دو باتوں میں ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی آدمی کے پاس علم اور دولت دونوں ہوں اور وہ مال کو صحیح مصرف نہ کرتا ہو اور دوسرے آدمی کے پاس صرف علم ہو، اور وہ یہ خواہش کرے کہ اگر مال اس کے بجائے میرے پاس ہوتا تو میں قاعدے میں صرف کرتا، یہ دونوں گناہ ہیں۔ اور حسد کے مترادف ہیں۔ لیکن اگر کسی فاسق کی دولت جو اس کو فسق کے عوض حاصل ہوتی ہے کراہت کرنا اچھا ہے۔ دراصل یہ اس کے فسق و فجور کی بُنیادوں کو اُکھاڑنے کے مترادف ہوگا۔

رشک اچھی چیز ہے

اور اگر ظالم آدمی اپنے کردار سے باز آجائے، اور توبہ کرلے، تو اس سے بچنا یا کراہت کرنا دُرست نہیں۔ اس سلسلے میں اتنا بتا دینا ضروری ہے، کہ اگر کوئی آدمی کسی کے مال کے لیے یہ سوچے کہ میں بھی ایسا ہی ہوتا اور راہِ خدا میں نیک کام کر سکتا۔ یا اس نعمت کے نہ ہونے سے اس کے کردار پر اثر پڑا ہو، تو اس آدمی کی وہ خواہشات جاہر ہو سکتی ہیں، لیکن یہ خواہش [illegible] کہ اس [illegible] سے کراہیت کی بناء پر نہ ہونا چاہیے بلکہ صرف

اپنی فلاح و بہبودی کے لیے ہو تو جائز ہو گی۔

دفعیۂ حسد

حسد کو روکنے کی تدابیر دل کی بیماریوں میں حسد سب سے بڑی بیماری ہے۔ اور اس کا دفعیہ علم و عمل سے ہی ہو سکتا ہے۔ علم کے ذریعہ اس طرح کہ حاسد اوّل یہ سمجھ لے کہ اس کا حسد دنیا میں اپنی ہی ذات تک محدود رہتا ہے۔ محسود پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حاسد کے لیے دنیا میں یہ نقصان ہے کہ وہ محسود سے جلتا ہے اور غم و رنج میں مبتلا رہ کر اپنی ترقیاں مسدود کر لیتا ہے۔ اور اس سے زیادہ کیا بے عقلی ہو گی کہ جس تکلیف میں وہ دوسرے کو دیکھنا چاہتا ہے، خود ہر وقت مبتلا ہے۔ اور اس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا پاتا۔

خداوند عالم نے اس شخص کے حصّے میں وہ سب چیزیں لکھ دی ہیں، جن کا مٹانا کسی کے بس کا نہیں۔ اور تقدیر ازلی شے ہے اور وہ ہی ان نعمتوں کا سبب بنی۔ بعض لوگ اس کو خوش قسمتی کہتے ہیں۔

اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ انسان اس کو کسی حال میں بدل نہیں سکتا۔

حاسد کی مذمّت ایک نبی ایک عورت کی وجہ سے جب زیادہ پریشان ہوئے تو خدا کی درگاہ میں فریاد کی۔ ندا آئی کہ فِرَّ مِنْ قُدَّامِهَا حَتّٰى تَنْقَضِيَ اَيَّامُهَا (یعنی اس کے پاس سے ہٹ جاؤ، یہاں تک کہ اس کی تقدیر کا زمانہ ختم ہو جائے) اس کی معیاد روزی میں کوئی کمی ہونا ناممکن ہے۔

ایک نبی ایک مصیبت میں مبتلا ہوئے، اور خدا کی درگاہ میں گریہ وزاری کی۔ اُن پر وحی نازل ہوئی کہ روزِ ازل سے تیری قسمت میں یہ ہی لکھ دیا گیا ہے۔ اب تو چاہتا ہے کہ تقدیر کا لکھا مِٹا دیا جائے۔

اگر کوئی حاسد کسی کا بُرا چاہتا ہے تو وہ اپنا ہی بُرا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی آدمی کسی کافر کے مال سے حسد کرے گا تو بھی اس کے ایمان میں تزلزل پیدا ہو جائے گا۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ۔

محسود کی خوش قسمتی حسد ایک عذاب ہے۔ جو دُنیا و دین دونوں میں تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خدا کی نعمتوں کے مقابلے میں اظہارِ ناراضگی ہے۔ اور جو چیزیں خداوند عالم نے اس کو عنایت کی ہیں، اُن سے انکار کرتا ہے۔ جب کہ تو اس کے اسرار و رموز سے واقف نہیں کہ وہ کس لائق سمجھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اگر کسی مسلمان سے حسد کرتا ہے تو تو ابلیس کا شریکِ کار بنا۔ اس سے زیادہ کیا شامتِ اعمال ہو سکتی ہے۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ محسود کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خوش ہے اور حاسد خواہ مخواہ اس سے جل کر مرا جاتا ہے۔ ہر وقت اس کے غم میں مبتلا رہتا ہے۔

حاسد کبھی مظلوم نہیں بن سکتا، اور محسود اگر حاسد کو [illegible] تو وہ خوش ہوتا ہے، کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے

رُتبے پر قائم رہوں، اور حاسد ہمیشہ مجھ سے حسد ہی کرتا رہے۔ اور اگر حاسد زبان سے بھی حسد کے الفاظ کہے گا، تو اس کی تمام نیکیاں بھی محسود کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی، اور محسود کے تمام گناہ حاسد کو دے دیئے جائیں گے۔ جو لوگ علماء اور اولیاء سے خوش رہتے ہیں۔ اُن کا حشر بھی انھیں کے ساتھ ہوتا ہے۔ حاسد اپنے دشمن کی آنکھ پھوڑنے کے لیے پتھر مارنا چاہتا ہے، لیکن اس پتھر سے خود اس کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے۔ اسی طرح جتنی جتنی بار اس سے جلتا رہے گا اپنے کو قعرِ مذلّت میں ڈال دے گا۔ یہاں تک کہ شیطان بھی اس کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اور اگر حاسد زبان کے علاوہ بھی محسود کو ستانے کی کوشش کرے تو اور زیادہ ظلم ہو جائے گا۔ اگر انسان حسد کی حقیقت کو سمجھ لے، تو ہرگز اس قسم کی حرکات نہ کرے گا۔

علمی حیثیت سے حسد کا دفعیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب ذہن میں کسی طرف سے جلن کا مادّہ پیدا ہو۔ فوراً اس کی مخالفت کرے اور غرور و تکبّر کی بجائے عجز و انکساری شروع کر دے۔ جب انسان عجز سے کام لینا شروع کر دے گا۔ مثلاً مزدوری اور ہر نیک کام میں اپنی ہتک نہ سمجھے گا قطعی حسد قریب نہ آسکے گا۔ ہر آدمی کی اس کے پیچھے تعریف کرے۔ اس عمل سے دوسروں پر اس کی محبّت کے اثرات پیدا ہوں گے۔ دُشمنی کا عنصر ختم ہو جائے گا۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ آدمی جب اس جگہ آجاتا ہے تو اس کا ایک اندرونی جذبہ اُبھرتا ہے، جو کبھی یہ کہتا ہے کہ میں اُس کے سامنے عاجزی کیوں کروں؟ اس سے میری کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اور اس غلط جذبے کے ماتحت آدمی عجز کو چھوڑ کر تکبّر کے غلط راستوں پر لگ جاتا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شیطان اور رحمان کی راہِ عمل میں کیا فرق ہے اور خود یہ سوچ کر اپنا راستہ تیار کر لیں۔

ایک ذرا سی بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر آدمی سمجھ لے کہ دنیا چند روزہ ہے اور یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے تو بھی حسد کے قریب نہ آنے دے گا۔ ایسا آدمی تو دنیا کی ہر چیز کو بیگانہ سمجھتا ہے اور کسی چیز سے محبت نہیں کرتا سوائے اُن چیزوں کے جو آخرت کی زادِ راہ ہو سکیں۔

نتیجہ: لہٰذا اگر انسان مجاہدۂ نفس سے کام لے گا تو یقیناً دشمنوں کو دوست بنا سکتا ہے۔ ہر ایک کی محبّت تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ ہر آدمی کی محنت اور تکلیف کو اپنی تکلیف خیال کرے۔ ہر آدمی کے مال کو اپنا مال سمجھے۔ اپنی باتوں اور عمل سے اپنے دل کی آواز اس تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ یہ سب کام تیرے اختیارات میں ضرور ہیں۔ چاہے تو اپنی خلقی کیفیت کو تبدیل کر سکے یا نہیں۔ یہ ہی ایک بہترین طریقہ حسد سے دُور رہنے کا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک دل میں کسی سے رنج [illegible] کراہت [illegible] کرنا، اور اپنے اعمال و افعال سے بھی

ظاہر نہ کرنے سے گناہ لازم نہیں ہوتا۔ لیکن میرے خیال میں ضرور گنہگار ہے۔ اس لیے کہ حسد حرام ہے اور اس کا تعلّق دِل سے ہے۔

دراصل حسد سے وہ شخص قطعاً نجات پا سکتا ہے، جس کو خدا سے اور اس کے احکامات سے محبت ہو۔ آدمی کو سوچنا چاہیے کہ دُنیا میں سب اس کے بندے ہیں۔ ہر چیز اسی کی ہے، نہ تمھاری نہ میری۔ صرف ایک جلوہ ہے جس کو ہم چند نقش دے کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم اور وہ لوگ سب ہی فنا ہو جائیں گے ——— لیکن یہ صفات تقریباً معدوم ہیں۔

پانچواں اصُول

(بابُ المحبّت)

محبّتِ دُنیا کے اثرات

ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محبّتِ دُنیا فسادات کی جڑ ہے، اور ہمارے تمام گناہوں کا سرچشمہ۔ رنگا رنگیٔ عالم میں ہم کو غلط راستے پر لگا کر خُدا سے اور اس کے محبّوں سے اس کے احکامات سے اور اس کے صنائع بدائع سے محروم کر دیتی ہے۔

خداوند عالم سے سرکشی کی وجہ یہ ہے کہ عالم کی دلچسپیاں انسان کے دل میں پیدا ہو کر خدائی احکامات کو بھلا دیتی ہیں اور اس کے خاص رہبروں سے سرکشی پر آمادہ کرتی ہیں۔ اور خدا کے دُشمنوں کو اپنے عیش و طرب کی طرف کھینچ اور بھی زیادہ گمراہ کر دیتی ہے۔ ایک وقت وہ آتا ہے کہ انسان دُنیا دار ہو کر صرف اسی کا رہ جاتا ہے۔ پھر دُنیا اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی ہے۔ اور ایک آوارہ عورت کی طرح دوسرے کی آغوش کی زینت بن جاتی ہے اور محبت دُنیا کا طالب ہمیشہ اسی رنگا رنگی میں مبتلا رہ کر سر پھوڑتا ہے۔ اور آخری بار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ دُنیا فانی ہے۔ اس کی محبت فانی ہے۔ اس کی گوناگوں دلچسپیاں فانی ہیں اور اس کی ہر چیز فانی ہے۔

سرکار رسالت کا ارشاد ہے کہ دُنیا کا جادو ہاروت و ماروت سے بھی زیادہ زُود اثر ہے۔ اِس سے بچے رہو۔ ہم نے اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ تیسرے عنوان میں آفات دنیوی کے ماتحت ذکر کر دیا ہے۔ اب صرف احادیث کا حوالہ دیں گے اور آیاتِ قرآنی سے استدلال کریں گے۔ تاکہ آپ یہ سمجھ لیں کہ تمام پیغمبران اور کتب و صحیفہ جات خداوندی کا اصل مقصد یہ ہی تھا کہ دنیا والوں کو آخرت کا راستہ دکھایا جائے۔ اور دُنیا کے مصائب اور اس کی تکالیف سے وہ اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

یہ دُنیا
(احادیث کی روشنی میں)

احکامِ رسولؐ ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک بکری کی لاش کو دیکھ کر فرمانے لگے، کہ یہ مُردار کس قدر ذلیل و خوار ہے کہ اس کی طرف کوئی نظر تک نہیں کرتا، اور قسم ہے اس پروردگار کی کہ یہ دُنیا قطعاً ایسی ہی مُردار ہے اور ذلیل۔

اگر خدا اس دُنیا کو ایک مچھر کی طرح بھی سمجھتا تو بھی کوئی کافر اس دنیا میں کوئی دلچسپی نہ لے سکتا۔ اس دُنیا میں ہر چیز لعنت کے لائق ہے بسوائے اس کے کہ اس پروردگار کے لیے عبادت کرتی ہو۔

یہ دُنیا صرف گناہوں کا بازار ہے جو آدمی اس سے محبت کرے گا، آخرت کھوئے گا۔ اور جو آخرت سے محبت کرے گا۔ دُنیا کے مصائب برداشت کرے گا۔ لہٰذا عقلاً واجب ہے کہ فانی چیز کو چھوڑ کر ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

محبتِ دُنیا روایت ہے کہ حضرت ابوبکر کے پاس کچھ لوگ "شہد" پانی میں ملا کر لائے۔ آپ نے اس کو نہ پیا اور اتنے روئے کہ اور لوگ بھی رونے لگے۔ خاموش ہوئے، اور پھر گریہ کرنے لگے۔ لوگوں کو دریافت کرنے کی جراُت نہ ہو سکی۔ جب آنکھوں سے آنسو صاف کیئے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ اے خلیفۂ رسولؐ! کیا معاملہ ہے؟ خلیفۂ وقت نے فرمایا کہ میں ایک دن آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی نامعلوم شئے اپنے پاس سے ہٹا رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا، تو فرمایا کہ دنیا اپنی محبت میرے دل میں پیدا کرنا چاہتی ہے لیکن میں نفرت کرتا ہوں، اور اب دُنیا کہتی ہے کہ آپ مجھ سے نفرت کر رہے ہیں، لیکن آپ کے بعد کے لوگ میری طرف رجوع ہوں گے —— تو اے مسلمانو! میں آج دیکھ رہا ہوں کہ دُنیا میری طرف بھی آ رہی ہے۔

(احادیث) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے دُنیا کی تخلیق جب کی، تو اس کو حقارت کی وجہ سے دیکھا تک نہیں، اور جو آدمی مال دُنیا سے محبت کرتا ہے، وہ سب سے زیادہ بے عقل ہے۔ یہ دُنیا ہے مُفلسوں کا گھر ہے۔ اس کا مال جاہل ہی جمع کر سکتے ہیں۔ اور فقہ کو نہ جاننے والے لوگ ہی یہاں کے مال پر حسد کرتے ہیں۔ جو آدمی صبح کو اُٹھ کر خدا کو یاد نہ کرے، وہ اس سے نہیں ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہے۔

حقیقتِ دُنیا کا واقعہ ایسے لوگ چار خصلتوں کے حامل ہو سکتے ہیں۔ وہ[۱] لوگ ہمیشہ رنجیدہ رہتے ہوں۔ وہ[۲] شغل برابر کرتے رہتے ہوں، جن سے اُن کو فکر غالب رہے۔ تیسرے فقر و فاقے کے عادی ہوں۔ چوتھے دُنیا کی اُمیدیں لگائے بیٹھے رہیں۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں تجھ کو دنیا دکھاتا ہوں۔ چنانچہ آنحضرتؐ مجھے ایک کوڑی پر لے گئے، جہاں کچھ انسانی کھوپریاں، کچھ گندگی، کچھ جانوروں کی کھوپریاں اور ہڈیاں، اور کچھ پھٹے ہوئے کپڑے پڑے تھے [illegible] فرمانے لگے، دیکھ!

یہ ہے وہ دنیا جس پر لوگ جان دیتے ہیں۔ یہ وہ انسانی کھوپڑیاں ہیں جن میں حکومت کا سودا بھرا تھا اور یہ ہیں وہ ہڈیاں جن پر کبھی یہ سوار ہو کر لطف دنیا اٹھایا کرتے تھے۔ اور یہ ہیں وہ چیتھڑے جن کو وہ لباس فاخرہ سے تعبیر کر کے انتہائی فخر کے ساتھ زیب تن کرتے تھے۔ اور یہ ہیں وہ غذائیں جو ان کے دستر خوانوں کی زینت تھی۔ جہاں غریب اور اہل آخرت داخل نہ ہو سکتے تھے۔ آج اس طرف کوئی آتا تک نہیں۔ یہ ہے دنیا، اور دنیا پر فخر کرنے والے۔ اے ابوہریرہ! سبق لو! اگر چاہو، اور روؤ اگر رو سکو! ایک شخص وہاں کھڑا تھا وہ اس وقت رونے لگا۔

مراد دُنیا داری

آنحضرتؐ نے پھر فرمایا کہ جب سے دُنیا پیدا کی گئی، یہ آسمان و زمین کے درمیان معلق ہے، اور اس طرف خداوند عالم کبھی متوجہ نہیں ہوتا۔ روز قیامت دنیا خداوند عالم سے عرض کرے گی کہ جو بندے تیرے خیال میں سب سے کمتر ہوں، اُن کو مجھے دے دے۔ تو ندا آئی گی، تف ہے تیرے اوپر، جب آج تک میں نے تجھے بُرا سمجھا، تو میں آج کیسے تجھ کو اپنے بندے دے دوں۔ اس دن کچھ لوگوں کے پہاڑوں کی طرح گناہ ہوں گے اُن کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ وہ لوگ سب نمازی اور شب بیدار مگر دُنیا دار ہوں گے۔ اور فرمایا کہ تم میں کون اندھا ہے؟ اور وہ حقیقی بینائی کا طالب ہو، جو دُنیا دار ہے وہ حقیقی اندھا ہے اور جو آخرت اور خدا سے محبت کرتا ہے وہ حقیقی آنکھیں رکھنے والا ہے۔

ایک دن جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دولت کدہ سے جب صبح کو باہر تشریف لائے، اس دن نماز میں کافی ہجوم تھا۔ اِس لیے کہ مالِ غنیمت باہر سے آیا ہوا تھا۔ تو سرکارؐ نے فرمایا کہ آج تم سب نے سُنا ہو گا کہ مال بہت آیا ہوا ہے، تو سب نے عرض کی کہ جی ہاں! سرکار رسالتؐ نے فرمایا کہ آئندہ تمھاری خوشنودی ہی کے عمل کئے جائیں گے۔ مجھے تم لوگوں کے فقر کا خوف نہیں، بلکہ یہ ڈر ہے کہ خداوند عالم تم سے پہلے لوگوں کی طرح تم کو مالدار کرے اور تم انھیں کی طرح خدا سے منحرف ہو جاؤ، اور انھیں کی طرح تم سب ہلاک ہو جاؤ۔

محبت دُنیا کو ہر حیثیت اور ہر پہلو سے منع کیا گیا ہے۔

دُنیا کی ویرانی سے اپنی تعمیر ہوتی ہے

ایک دن ایک شخص اپنا اُونٹ لایا اور سرکارِ دو عالمؐ کی اُونٹنی (جو بہت تیز بھاگتی تھی) کے ساتھ بھگایا۔ اس کا اونٹ تیز نکلا۔ صحابہ کو اس کا رنج ہوا، تو سرکارؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک تم لوگ اپنی حقیقت کو نہ پہچانو گے، ہرگز تقرب خداوندی حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو حکم دیا کہ جس دُنیا کو میں نے خاک میں ملا دیا اس کو آباد کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔ اس میں صرف نجاست ہے۔ اس کی محبت میں صرف گناہ ہیں۔ اس کے ویرانوں میں تمھاری تعمیریں مضمر ہیں۔ اور یاد رکھو، کہ دنیا اور آخرت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ آپ سے لوگوں نے عرض کی کہ آپ ایک

گھر تعمیر فرمالیں، تو کیا قباحت ہے؟ تو فرمایا کہ میری امّت کے گھر میرے لیے بہت کافی ہیں۔

جن کو دُنیا میں تکالیف ہوتی ہیں قصرِ جنّت انھیں لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے

ایک دن آپ کو بارش کی تیزی، بجلی کی چمک اور بادل کی گرج نے کہیں راستے میں گھیر لیا۔ آپ ایک خیمے میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہاں سے نکلے اور غار میں پناہ لی۔ وہاں شیر پہلے سے پناہ لیے تھا۔ وہاں سے بھی باہر نکل آئے اور عرض کی، کہ بارِ الٰہا ہر آدمی کے لیے جائے محفوظ ہے، لیکن میرے لیے نہیں —— ندا آئی، عیسیٰ! حیران نہ ہو، تیرے لیے میری جنّت جائے پناہ ہے۔ یہاں کے محل تیرے رہنے کے لیے ہیں —— ہزاروں حوریں تیرے لیے مخلوق کر دی گئی ہیں۔ تو اطمینان رکھ! کہ تیری شادی کا جشن ہم منائیں گے۔ تمام حوریں اور مقربان و ملائکہ تیری بارات کی دُھوم دھام میں شریک ہوں گے۔

ایک بار مع اپنی اُمّت کے چند آدمیوں کے آپ کہیں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ لاشیں پڑی ہیں، تو فرمایا کہ یہ خدا کے مقہور ہیں، ورنہ ان کو زمین پر قبروں کی جگہ ملتی۔

چنانچہ رات کو ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے لوگو! آؤ اور دیکھو! ایک لاش سے آواز آئی، کہ اے عیسیٰ ہم آپ کی طرح رات کو سوئے اور صبح تک موت ہمارے سروں پر سوار ہو گئی۔ ہم لوگ دُنیا سے اسی طرح محبّت کرتے تھے جیسے کہ اپنی ماں سے محبّت کرتے ہیں۔ اور دُنیا کے عیش و تنعّم سے نہایت خوش ہوتے تھے۔ جناب عیسیٰؑ نے فرمایا کہ اور لاشیں جواب دینے سے کیوں قاصر ہیں؟ جواب ملا، کہ ان سب کے مُنہ میں آگ کی لگامیں لگا دی گئی ہیں۔ تب آپ نے اپنی اُمّت سے فرمایا، دیکھا دُنیا کی محبّت کرنے والوں کا نتیجہ؟ یاد رکھو کہ سُوکھی روٹی نمک سے کھانا، لباس فاخرہ کی بجائے ٹاٹ پہننا، اور نرم نرم گدوں کی جگہ پتھریلی زمین سونا اس دُنیا میں اچھا ہے۔

ترکِ دُنیا ایک بار حضرت سلیمانؑ ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔ ایک عابد نے دیکھا اور عرض کی یا حضرت! آپ کو کتنی بڑی سلطنت عطا کی گئی ہے، تو فرمایا کہ ایک یہ پوری سلطنت ایک تسبیح کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

(روایت) روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام نے جب گیہوں کھایا تو رفع حاجت کی ضرورت پڑی۔ ایک فرشتہ نازل ہوا، اس نے دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا میں اپنے پیٹ کا بوجھ کہیں رکھنا چاہتا ہوں۔ فرشتے نے کہا کہ صرف گیہوں ہی میں یہ تاثیر رکھی گئی ہے۔ اب بتائیے کہ کہاں یہ نجاست رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے زمین ہی مناسب ہے۔ آپ وہاں تشریف لے جائیں اور رکھ دیں۔

حضرت جبرئیلؑ نے جناب نوحؑ سے دریافت کیا کہ اتنی بڑی عمر میں آپ کو دُنیا کے متعلق کیا تجربہ ہوا، فرمایا کہ ایک دروازے سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل آیا (یعنی یہ دنیا دل لگانے کے لائق جگہ نہیں ہے)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ خداوند عالم کی دوستی کس چیز سے حاصل ہو سکتی ہے؟ فرمایا کہ دنیا کو دشمن سمجھو، خدا تم کو دوست رکھے گا۔

نوٹ: احادیث کے بعد اب آثار کی مثالیں دیں گے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ چھ چیزیں حاصل کرو: (۱) دوزخ سے نفرت کرو (۲) جنت کی خواہش کرو (۳) خدا کے احکامات کے کاربند رہو اور شیطان سے نفرت کرو (۴) نیکی کو حاصل کرو، بدی سے دور رہو (۵) دنیا کو پہچان کر نفرت کرو (۶) آخرت کو پہچانو اور محبت کرو۔

دنیا کی وقعت بزرگانِ دین کے خیال میں

ایک حکیم کا مقولہ ہے کہ جو دنیا تم کو دی گئی ہے، وہ پہلے بھی لوگوں کو عنایت کی گئی۔ اگر غور کرے گا تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں پورے کھانے کے اوقات کے اور باقی وقت تیرے لیے بیکار ہے۔ تو اتنے سے وقت کے لیے دنیا کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے؟ لہٰذا اس سے پرہیز کر! یہاں تک کہ مر جائے۔ دنیا حرص و ہوس ہے اور اس کا منافع دوزخ کی شکل میں ملتا ہے۔

حضرت حازم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ محبتِ دنیا کو کس طرح ترک کروں؟ فرمایا کہ کسب حلال کر! اور اچھی جگہ کمائی کو خرچ کر۔ محبت دنیا سے ہی فائدہ حاصل ہو گا۔ مقصد یہ ہے کہ جب وہ نیک جگہ خرچ کرے گا اور نیک کمائی ہو گی، تو خواہ مخواہ ترکِ دنیا ہو جائے گا۔

حضرت یحییٰ بن معاذ کا مقولہ ہے کہ دنیا شیطان کی ایک دکان ہے۔ اس سے سودا کرنا نقصان کا باعث ہے۔

حضرت ابو حازم کا قول ہے کہ دنیا سے پرہیز کرو! قیامت کے دن دنیا سے محبت رکھنے والوں کو مخاطب کر کے منادی ندا کرے گا کہ خدا نے جس چیز کو برا سمجھا تم اسی کو دوست سمجھتے تھے۔

لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ دنیا کو آخرت کے ہاتھ بیچ دے! اس سے دونوں چیزیں مل سکتی ہیں۔ اگر آخرت کو دنیا کے حوالے کر دیا تو دونوں کو کھو دے گا۔

حضرت ابو حازم کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی شے خوش ہونے والی نہیں ہے کہ جس کی اصل و حقیقت تکالیف سے خالی ہو، صرف خوشی کے لیے دنیا کو نہیں بنایا گیا۔

حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ دنیا دار آدمی مرنے کے بعد تین حسرتیں ساتھ لے جاتا ہے:

پہلی یہ کہ جمع کیا ہوا مال کھا نہ سکا۔

دوسری یہ کہ اس کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔

تیسری یہ کہ آخرت کو قطعی حاصل نہ کر سکا۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عقل[illegible]میں ہے کہ تین کام کرلے۔ دنیا سے دستبرداری۔

زندگی ہی قبر بنوانا ۔ خدا کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ دنیا میں صرف چھ کام ہیں ۔ کھانا ۔ پینا ۔ پہننا ۔ سونگھنا ۔ سوار ہونا ۔ نکاح کرنا کھانے میں سب سے اچھا شہد ہے کہ استعمال کرے ۔ وہ مکھی کے منہ سے نکلتا ہے ۔

پینے میں سب سے بہتر پانی ہے ، جو مخلوق میں سب کے لیے برابر ہے ۔

پہننے میں ریشم ، جو کیڑے کے منہ سے نکلتا ہے ۔

سونگھنے کی چیزوں میں مشک ، جو ہرن کا خون ہے ۔

سواری کے لیے گھوڑا ، کہ بہادر اسی پر بیٹھ کر جان دیتا ہے ۔

خواہشات میں سب سے بہتر نکاح ہے ، کہ عورت کے مکروفریب مرد کو معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن انسان بدترین خواہشات کو اس سے پورا کرنا چاہتا ہے ۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے کہ خداوندعالم نے تم کو ہمیشہ کے لیے پیدا کیا ہے ، لیکن فرق اتنا ہے کہ جگہ بدل دی جائے گی ، اور اس کے احکامات پر عمل نہ کرنے والے کافر ہیں ، مگر اس کی اطاعت اور ترک دنیا کو آسان سمجھنا بیوقوفی ہے ۔ پس اس کی اطاعت کرو ، چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو !

حقیقتِ دُنیا

(نوٹ) معرفت دُنیا کے متعلق پہلے بھی بحث کر چکے ہیں ۔ اب مذمت دنیا میں کچھ احادیث اور روایات نقل کر کے دلائل سے ثابت کریں گے ۔

دنیا داری خدا کے لیے ہونا چاہیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دُنیا اور اس میں جو کچھ ہے سب معلون ہے (لیکن اگر خدا کی محبت ہو)

اب وہ تمام چیزیں دیکھنا ہیں کہ جو خدا کے لیے ہیں ۔ اور علاوہ اس کے تمام چیزیں گناہ اور لعنت ہیں ۔

(مباحثہ) دُنیا کی تمام چیزوں کی تین اقسام ہیں :

پہلے یہ کہ آدمی کا ظاہر و باطن سب کچھ دنیا کے لیے ہو ۔ چاہے اس میں نیت کوئی بھی کیوں نہ ہو ؛ لیکن وہ بہ حال ظاہری دُنیا کا عیش و طرب ہے اور گناہوں کی طرف لے جاتا ہے ۔ جس کا نتیجہ غفلت اور انجام غرور و تکبر پر ختم ہوتا ہے ۔

دوسرے یہ کہ بظاہر وہ خدا کے لیے ہو ، لیکن بہ باطن اس میں دنیا کا پہلو نکلتا ہو ۔ اس میں سے تین وجوہ اور اسباب نکلتے ہیں ۔

پہلے تفکرات النسانی ۔ دوسرے ذکر خدا تیسرے خواہشات نفسانی کی مخالفت ۔

لہٰذا یہ تینوں باتیں صرف خداوند عالم کے لیے تو درست ہے۔ مثلاً تفکراتِ انسانی، علمِ دین کے حصول کی غرض سے باتیں (ذکر) صرف خداوند عالم کے لیے اور خواہشات دنیوی کا ترک خدا کی محبت کے لیے اور اگر دنیا داری اور ذاتی اغراض کی بنا پر ہوں گی تو گناہ ہے، چاہے بظاہر وہ خدا کے لیے بنتا ہو۔

تیسری قسم دُنیا کی وہ ظاہری چیزیں ہیں جو حظِّ نفس کے لیے ہیں، لیکن بہ باطن وہ بھی خدا کی عبادت کی غرض سے ہوں۔ جیسے کھانا، پینا، اُٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا۔ کسبِ حلال۔ نکاح وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب باتیں صرف خدا کے لیے ہونا چاہئیں، ورنہ دُنیا داری کی بنیاد رکھی جائے گی

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی دنیا میں اپنا مرتبہ بڑھانا چاہتا ہے، خدا اس سے ناراض رہتا ہے۔ اور اگر بے نیازی چاہتا ہے تو روزِ قیامت اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا۔

معلوم ہوا کہ دُنیا حظِّ نفس کا دوسرا نام ہے۔ اور آخرت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خداوند عالم اس کو ہوا و ہوس سے تعبیر کیا ہے۔ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔ دوسری جگہ تمام خواہشات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ فرماتا ہے کہ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (یہ سب چیزیں خواہشات دنیا ہیں) دوسری جگہ اور فرماتا ہے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ یعنی دنیا میں عورت، مال و دولت کھیتی اور جانور سب کو آراستہ کیا (اور یہی حیاتِ انسانی کی بنیاد ہیں) لیکن یہ سب چیزیں آخرت کے لیے ہونا چاہئیں، ورنہ دُنیا داری ہے۔

دنیا داری کے تین درجے مقرر کیے گئے ہیں۔ اوّل بقدرِ ضروریات تمام چیزیں استعمال کرنا۔ اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، جو آدمی جتنی مقدار اپنے لیے مقرر کر لے، وہ کافی ہے۔ لیکن ظاہر داری اور ریاکاری نہ ہونا چاہیے ورنہ دوزخ اس کی آخری منزل ہے، اور جس نے بقدرِ حاجت کم از کم خرچ کیا وہ نجات پا گیا۔

حاجت اور ضرورت کی تعریف

حاجت میں دونوں جانبیں شریک ہو سکتے ہیں۔ افراط اور تفریط حاجت کا درمیانی حصہ انتہائی علم کے بعد معلوم ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آدمی صرف حاجت سمجھ کر کوئی چیز اپنی ضرورت سے زیادہ حاصل کرے اور در اصل وہ گناہ میں ملوث ہو رہا ہو۔ بزرگانِ دین نے قناعت کی ہے۔ اس میں سب سے بڑا نمونہ ہمارے لیے حضرت اویس قرنیؒ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

آپ نے دُنیا کو اپنے اوپر اتنا مختصر کر لیا تھا کہ دیکھنے والے آپ کو "دیوانہ" کہتے تھے۔ سال سال بھر کسی کو نظر نہ آتے۔ اس لیے کہ صبح نماز کے وقت گھر سے نکل جاتے اور رات کو بعد نماز عشاء واپس آتے

زیادہ تر خرمے کی گُٹھلیاں کھایا کرتے اور اگر خرمے مل جاتے، تو اس کی گٹھلیاں خیرات کر دیتے۔ پُرانے کپڑے سی کر اُن کو پہنتے۔ اسی لیے سرکارِ دو عالمؐ نے بغیر دیکھے آپ کی تعریف کی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وصیت کی تھی۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے جمعہ پہ ایک قرنی سے دریافت کیا کہ تم اویس قرنی کو جانتے ہو، اس نے کہا ہاں! مگر آپ کے سامنے باتیں کرنے کے لائق ہی نہیں ہے، وہ پاگل ہے اور دیوانہ ہے، آپ رونے لگے۔ اور فرمایا کہ آنحضرتؐ کی وصیت تھی ——— میں اس لیے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ سے لوگ ایماندار ہو گئے۔ اور اس کے اعمال کی وجہ سے جنّت میں جگہ پائیں گے۔

چنانچہ حضرت ہرم ابن حیان رضی اللہ عنہ، جب کوفہ گئے تو اویس قرنی کو تلاش کیا، وہ نہر فرات کے کنارے بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کر کے مصافحہ کرنا چاہا، لیکن انھوں نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ میں نے مزاج پُرسی کی۔ میں ان کی حالت دیکھ کر رو دیا۔ وہ بھی رونے لگے اور فرمایا کہ خُدا تم پر رحم کرے تم کو میرا پتہ کس نے بتایا۔ مجھے اپنا نام ان کی زبان سے سُن کر بڑا تعجب ہوا۔ اور دریافت کیا کہ آپ کو میرا اور میرے باپ کا نام کس نے بتایا، اور مجھے کیسے پہچانا؛ فرمایا کہ مجھے اس نے خبر دی، جس کے احاطہ علم میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہے، اور میری رُوح تم کو پہچانتی ہے۔ کیونکہ مومنین کی ارواح آپس میں متعارف ہیں، چاہے کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ میں نے عرض کی کوئی حدیث فرمائیے! جواب میں فرمایا کہ میری رُوح میرے مولا پر فدا ہو۔ میں نے اُن کی زیارت ہی نہیں کی۔ اور نہ میں چاہتا ہوں کہ محدّث بن کر تم کو کچھ سُناؤں۔ مجھے ان باتوں کی طرف قطعی توجہ نہیں۔ تو میں نے قرآن مجید کی آیت کے سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ پس میرا ہاتھ پکڑ کر اوّل اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھا اور روکر فرمانے لگے کہ وہ مجھے حکم دیتا ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا لَاعِبِیْنَ۔ مَا خَلَقْنٰہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ یہ آیت پڑھی اور چیخ نکلی۔ مجھے خیال ہوا کہ بے ہوش ہو گئے۔ اور فرمانے لگے کہ اے ابن حیان! تیرا باپ مر گیا اور عنقریب تو بھی اس کے پاس جائے گا معلوم نہیں کہ تیری منزل کیا ہوگی۔ اور تو کیا۔ تیرے دادا حضرت آدمؑ مرے۔ حضرت حوّا کا انتقال ہوا۔ نوحؑ مر گئے۔ ابراہیمؑ جیسے خلیل رحلت کر گئے موسیٰ کلیم اللہ ختم ہو گئے۔ داؤدؑ سدھار گئے۔ اور ہمارے رُسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم رحلت فرما گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ مر گئے، اور میرے دوست عمرؓ بھی فوت ہو گئے۔

میں نے کہا کہ ابھی وہ زندہ ہیں۔ فرمایا کہ نہیں وہ مر گئے، اب میں اور تو بھی قریب بہ مرگ ہیں۔ اس کے بعد دُرود بھیجا اور فرمایا کہ سُن! کہ خدا کی راہ اور صالحین کا راستہ اختیار کر! جب اپنی قوم کی طرف جائے، تو اُن کو نصیحت کر! اُمّت کی موافقت سے مخالفت نہ کر [illegible] تو مجھے دیکھ سکے گا، اور نہ میں تجھ کو میرے

لیے دُعا کرنا۔ میں بھی تیرے لیے دُعا کروں گا۔ اور کھڑے ہو کر کہنے لگے تو اُس طرف جا! اور میرا راستہ ادھر ہے۔ میں نے چاہا کہ اُن کے ساتھ چند قدم جا سکوں۔ لیکن انھوں نے مجھے اجازت نہ دی، اور چلے گئے۔ میں اُن کو دیکھتا رہا۔ وہ ایک کوچے کے اندر داخل ہوئے اور پھر اُن کا پتہ نہ چل سکا۔

اے مسلمان! اللہ والے ایسے ہوتے ہیں، اور انبیا علیہم السّلام کا بتایا ہوا مسلک یہ ہے، اور ایسے لوگ محتاط کہلاتے ہیں۔ اس درجے پر پہنچنے کی کوشش کر۔ اور صرف زندہ رہنے کے لیے دُنیا کی چیزوں کو استعمال کر! تاکہ عذابِ قبر سے نجات پاسکے۔

(نوٹ) یہاں نفرت ومحبت دُنیا کے لیے اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہے۔ باقی حالات پیچھے بیان ہو چکے ہیں

چھٹا اصُول

بخل وسخاوت کی تدابیر

مال دُنیا کی محبت سے کس طرح پرہیز کیا جاسکتا ہے؟

دُنیا عجائبات کی آماجگاہ ہے، اور اس میں رنگا رنگ درخت ہیں ——— درختوں میں گوناگوں شاخیں ——— اور اُن شاخوں کو ہم مال، عزت، محل، مکان علم، صبر۔ زہد وغیرہ وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ عزت مال اور وقار حشمت بھی دُنیا کا ایک شعبہ ہے لیکن مال دنیا ان میں سب سے زیادہ موجب آفاتِ انسانی ہو سکتا ہے۔ خداوند عالم نے اس کو "عقبہ" سے موسوم کیا ہے۔ آدمی کی زندگی کا سہارا "مال" ہی ہے۔ اور دنیا کی تمام ضروریات اس کے ذریعے پوری ہوتی ہیں، اور اگر مال نہ ہو تو یہ سامانِ عیش فراہم نہ ہو سکے، اور سامانِ عیش نہ ہونے پر انسان سینکڑوں گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ ہی کفر کی بنیاد ہے۔ اگر مال کی آسائشیں فراہم ہوں تو آدمی تعیّش میں پڑ جاتا ہے، غریبوں کی پروا بھی نہیں کرتا۔

امیر دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک بُخل دوسرے سخاوت۔ یہ بُخل انتہائی بُری چیز ہے۔ سخی بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک اصراف، دوسری معتدل حالت۔ اصراف بُری چیز ہے، اور اعتدال اچھی۔

اِسی طرح فقیر بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حریص، دوسرا قانع۔ حریص بُرا ہوتا ہے اور قانع اچھا۔

حرص دو قسم کی ہوتی ہے، ایک بیٹھے بٹھائے لوگوں سے چاہنا۔ دوسرے اپنے ہاتھ پیر چلا کر کمانا۔

ان تمام صُورتوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کون چیز انسان اختیار کرے اور وہ آخرت میں کام آسکتی ہے۔ بہرحال یہ معلوم ہو گیا کہ مال انسان کے ہر شعبۂ زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اس سے فائدے اور نقصانات دونوں ہیں۔ لہٰذا ہم کو چاہیے کہ ا[illegible] نقصانات کو چھوڑ دیں۔

محبتِ مال

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ مقصد یہ ہے کہ اپنے مال اور اہل وعیال کو ذریعۂ غفلت خداوندی نہ بناؤ اس لیے کہ یہ نقصان اٹھانے والوں سے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مال کی محبت انسان کے دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتی ہے جیسے کوئی پودا پانی کی سیرابی سے اُگتا ہے۔ اور بھوکے بھیڑیے بکریوں کو اتنا تکلیف نہیں پہنچاتے جتنا حُبِّ مال انسان کے دل کو گمراہ کرتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی کہ آپ کی اُمّت میں بدترین آدمی کون ہے، فرمایا کہ مالدار۔ اور میرے بعد ایک قوم الوانِ نعمت میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ لوگ عیش وطرب کے عادی ہوں گے۔ لہٰذا تم کو حکم دیتا ہوں کہ ایسے لوگوں سے پرہیز کرنا۔ اُن کو سلام بھی کرنا گناہ سمجھنا۔ اُن کی موت اور خوشی میں شریک نہ ہونا۔ اُن کے آباؤ اجداد کی عزت نہ کرنا، ورنہ تم مسلمانوں کے زمرے سے نکل جاؤ گے۔ اور اسلام کی تباہی کا باعث ہوگے ہر آدمی مال کو اکٹھا کرتا ہے۔ حالانکہ یہ نہیں جانتا کہ وہ کھا کر برباد کرتا ہے، اور پہن کر تباہ کرتا ہے۔ مال کا بہترین مصرف صدقہ ہے، جو تا قیامِ قیامت باقی رہتا ہے۔

ایک شخص نے عرض کی کہ یا حضرت! میرے پاس سامانِ موت نہیں۔ فرمایا کہ تو مالدار ہے؟ عرض کی جی! حکم ہوا کہ اوّل اس مال کو خدا کی راہ میں دے دے! اس کے بعد خواہشِ موت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ تجھ کو موت ڈرانے والا تیرا مال ہی ہے۔

آدمی کے تین دوست ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مرتے وقت تک ساتھ رہتا ہے۔ ایک اعزا و اقربا، جو قبر تک ساتھ جاتے ہیں۔ ایک اعمال جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ دُنیا والے، مرنے والے کے پس ماندگان سے مال کو دریافت کرتے ہیں اور فرشتے اوّل یہ دریافت کرتے ہیں کہ اس نے قبل از مرگ کیا بھیجا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ پانی پر چل سکتے ہیں اور ہم نہیں۔ کیا سبب ہے؟ تو فرمایا کہ تم کو مال دنیا کی محبت ہے۔ میں اس کو مٹی کے برابر سمجھتا ہوں۔

بزرگانِ دین کے اقوال ایک شخص نے حضرت ابوالدرداء کو کوئی تکلیف پہنچائی۔ تو آپ نے اس کو درازیِ عمر اور فراخیِ مال کی دُعا دی، اور یہی دعا اس کے لیے باعثِ ضلالت ہو سکتی تھی۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ نے ایک روپیہ ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ جب تک تو میرے پاس ہے، کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

روایت ہے کہ جب سکہ پہلے پہل بنایا گیا تو [illegible] اٹھا کر کہا کہ جو مجھ سے محبت کرے گا، وہ مجھ

سے محبت کرے گا۔

حضرت یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ روپیہ پیسہ سانپ اور بچھوؤں کی طرح ہیں جب تک اس کی دوا نہ حاصل کرلے کبھی خواہش نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جائے گا۔

سلمہ بن عبدالملک خلیفہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت آئے۔ اور کہا کہ آپ کے تیرہ بیٹے ہیں اور ایک پیسہ بھی کسی کے لیے یافت نہیں چھوڑ رہے ہے خلیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے کسی کا مال نہ بیٹوں کو دیا اور نہ بیٹوں کا مال کسی دوسرے کو۔ میں بالکل مطمئن ہوں۔ اگر بیٹے لائق اٹھیں گے، تو خدا خود ان کی کفالت کرے گا، اور اگر نالائق ہوں گے تو مجھے قطعاً ان کی فکر نہیں۔ جو چاہے حشر ہو۔

حضرت یحییٰ بن معاذ کا قول ہے کہ مالدار آدمی کے لیے مرتے وقت بھی دو مصیبتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے اس کا مال چھنتا ہے۔ دوسرے اس سے اسی کے مال کا حساب کتاب لیا جاتا ہے۔

مذاکرات

اگرچہ مال کو بُرا ہی سمجھا گیا ہے، لیکن مال ہی وہ چیز ہے کہ خیر اور شر دونوں اسی سے عمل میں آتے ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اِلْوَصِيَّةَ الخ۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مال اچھے آدمی کے لیے اچھی شئے ہے، اور کنجوس کے لیے باعث نحوست کَادَ الْكُفْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا۔

ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض ناسمجھ لوگ دوسرے کے پاس مال کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ اس فاسق و فاجر کے پاس مال کی کوئی کمی نہیں، اور غریب بیچارے کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ اور یہ شیطان کے بہکانے کی وجہ سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آدمی کا ذاتی قصور ہے کہ وہ خدا کے متعلق یہ سب کچھ سوچتا ہے کہ وہ سب کو دے سکتا ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے، وہ رحیم بھی ہے اور سخی بھی۔ اس کے خزانوں میں نعمتوں کی کوئی کمی نہیں۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی غریب کو کچھ نہیں دیا۔ اور یہ سوچ کر وہ آسمان زمین اور دنیا کے وجود کو بُرا بھلا کہنے پر اتر آتا ہے۔ یہ سب شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا خدا کے ہاتھ میں ہے لہٰذا دنیا کے متعلق کچھ بھی کہنا کفر کے برابر ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا کو بُرا نہ کہو اس لیے کہ زمانہ ہی خدا ہے۔ اس لیے کہ تم جتنے کام زمانے پر امید رکھ کر کرتے ہو، وہ سب خدا کے کام کرتے ہو۔ دنیائی محنت کرنا یہ سب خدا کا کام ہے۔ اب ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زمانہ خدا ہے تو مفلس آدمی کافر ہوا۔ اس لیے کہ وہ محنت کرتا ہے، پھر وہ غریب کیوں ہے؟ لیکن وہ لوگ اتنی معرفت کے درجات حاصل کیے ہوئے نہیں ہوتے، لہٰذا مال اتنا ہی ہونا اچھا ہے جتنا خرچ کے لیے ضرورت ہو۔

دوسرے یہ کہ تمام بزرگوں نے آخرت ہی کو اپنا مرکز بنایا ہے۔ اور وہ تین نعمتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔
پہلی اپنے نفس سے تعلق رکھتی ہے، جس میں علم اور عادات وغیرہ شامل ہیں۔
دوسری بدن سے متعلق اس میں تندرستی اور سلامتی وغیرہ۔
تیسری بدن سے باہر کی ہے اور وہ مال ہے۔ وہ سب سے زیادہ بُری ہے اور مال میں بھی سونا چاندی وغیرہ، جس کو اگر ذرا سا غور کیا جائے، تو انسان اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ روٹی اور کپڑے کی ضرورت باقی رہ گئی۔ وہ بھی اس لیے کہ آدمی تندرست رہے اور اس کے حواس قائم رہ سکیں اور حواس عقل کو سالم رکھنے کے لیے ٹھیک ہونا ضروری ہیں، اور عقل اس لیے کہ وہ دل کے لیے چراغِ ہدایت بن سکے، تاکہ انسان الوہیت کے درجات کی معرفت کر سکے۔ اور خدا کی معرفت میں سعادت ہے
نتیجہ یہ ہوا کہ مال و دولت عقل و حواس سب کچھ خدا کے لیے ہیں۔ یہ تمام عالم اسی کی وجہ سے قائم ہیں۔ پس جو آدمی اس حقیقت کو سمجھ لے گا۔ دنیا کا مال بقدرِ ضرورت ہی طلب کرے گا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی جناب میں دُعا کی ہے کہ پالنے والے! تو آلِ محمدؐ کو بقدرِ کفایت رزق عطا فرما!
لہٰذا کوئی جاننے والا آدمی مال کو دوست نہیں رکھتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ روپے پیسے کا غلام اندھا ہے، اور جو آدمی جس کی محبت میں اندھا ہوتا ہے، وہ اس کا بندہ ہے اور اس کا مالک یعنی خدا وہ ہی ہوا۔ یعنی طلب مال کرنے والے کا خدا مال ہی ہوا۔
حضرت ابراہیمؑ نے دُعا کی تھی کہ مجھے اور میرے بیٹے کو بُتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ اور اصل بت سے مقصد آپ کا روپیہ پیسہ تھا۔ کیونکہ یہ دُنیا اسی مال کے پیچھے اندھی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مال کی محبت سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ بُت پرستی نہ کرنے کی دُعا کا اُن سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

مالِ دُنیا کے فوائد و نقصانات

مالِ دُنیا | مُسلمانو! اب تک تم کو یہ بتایا گیا کہ مال میں سانپ کا زہر اور تریاق دونوں کے جراثیم موجود ہیں لہٰذا اب ہم اس کی اچھائیاں اور بُرائیاں دونوں الگ الگ بتاتے ہیں، تاکہ تم اس کے فائدے اور نقصان دونوں کو سمجھ سکو۔

اقسامِ مالِ دُنیا | مال دُنیا میں دو طرح کے فائدے ہو سکتے ہیں۔ دنیوی فائدہ اور دینی فائدہ۔
یہاں دُنیا کا فائدہ بیان کرنا طول امل ہے، اس لیے اس سے ہر آدمی تقریباً واقف ہے۔ لہٰذا مال کا دینی فائدہ بتاتے ہیں۔

مالِ دنیا کے دینی فوائد | مالِ دُنیا میں دینی فوائد تین قسم کے ہوتے ہیں:
پہلے یہ کہ آدمی اپنے مال کو حج اور عبادات یا زکوٰۃ میں صرف کرے۔ ان چیزوں میں مال کا خرچ کرنا عین

عبادت ہے ۔ اور عبادت میں یہ بھی شامل ہے کہ آدمی کپڑا استعمال کرے اور روٹی کھائے تاکہ خدا کی عبادت کی طاقت پیدا ہو سکے ۔ لہٰذا بقدر زندگی مال کی حاجت کرنا اور جتنا مال حاصل ہو سکے اس کو عبادات الٰہیہ میں صرف کرنا، دین کے فوائد میں شامل ہے ۔ یہ عمل صرف نیات انسان کے ماتحت ہوتا ہے ۔ اگر اس سے مقصود صرف راہِ سعادت ہے، تو یہ انسان کے لیے زادِ راہ ہے ۔ اور اس کو وہ آدمی سمجھ سکتا ہے، جس کے دل میں خدا کی معرفت ہو وہ سمجھ سکے گا کہ مال کو کس طرح خرچ کیا جائے کہ دین میں اس سے مدد مل سکے ۔

دوسری قسم مال دنیا کے فائدے کی یہ ہے کہ مخلوقِ خدا پر تقسیم کرے، وہ چار صورتوں پر مشتمل ہے پہلے صدقہ ۔ اس سے فقراء و مساکین کی دعائیں شامل حال ہو کر رحمت خدا کا سبب بنتی ہیں ۔ لہٰذا جس کے پاس مال نہ ہوگا وہ اس نعمت سے محروم رہے گا ۔

دوسرے مروت ۔ اپنے دینی بھائیوں اور اعزا کے ساتھ مروت سے پیش آئے ۔ اُن کی ضروریات کو پورا کرے اور تمام رسُوماتِ دنیوی میں اُن کی مدد کرتا رہے ۔ اگر اپنے مالدار عزیزوں کے ساتھ بھی اس عمل سے پیش آئے گا تو کوئی قباحت نہیں ۔ یہ ہی سخاوت کہلاتی ہے ۔ (سخاوت کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے)

تیسرے مال کے ذریعہ اپنی عزت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے ۔ یعنی شعراء اور حریص آدمیوں کو اس لیے دے کہ وہ اس کو بدنام نہ کر پائیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صدقے سے لوگوں کے درمیان عزت محفوظ رہتی ہے اور صدقہ دینے والا خود بھی مخلص رہتا ہے کہ اس نے مال کے ذریعہ اپنے دشمنوں کا منہ بند کر دیا ہے، یہ عمل بھی بغیر مال کے ناممکن ہے ۔

چوتھے اپنے خدمتگاروں نوکروں اور غلاموں کو مال دے ۔ کیونکہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا ۔ اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے ۔ اور ہر آدمی کے کام اس دنیا میں جداگانہ ہیں ۔ لہٰذا جو آدمی تمھارے ہاتھ بٹاتے ہیں، اُن کو دینا اچھا ہے ۔ ورنہ دین کے کام کو تم تنہا اس دنیا داری کے جھگڑوں کے ساتھ کیسے انجام تک پہنچا سکتے ہو ۔ لہٰذا ایسا آدمی جو عبادتِ خدا میں مشغول ہو، خواہ وہ عبادت کیسی ہی نہ ہو ۔ اس کا نام دوسروں کو کرنا چاہیے اور اس مالدار آدمی کو ان لوگوں کے حقوق ادا کرنا اچھا ہے ۔

تیسری قسم مال دنیا کے فائدے کی یہ ہے کہ متعین و مقرر آدمیوں کو بخشش نہ کرے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ سرائے، کنواں، مسجد اور مدرسے کھولے، تاکہ مرنے کے بعد بھی ان چیزوں کا ثواب ملتا رہے ۔ انھیں چیزوں کے بنانے اور ترقی دینے میں اپنا مال وقف کر دے ۔ جب تک یہ چیزیں برقرار رہیں گی ۔ اس وقت تک اس کا ثواب اس مال والے کو ملتا رہے گا ۔ اور یہ ثواب بھی صرف مالدار کے حصے ہی میں آسکتا ہے ۔ دین کے فوائد مال دنیا

سے یہ بتائے گئے ، اور دنیا کے فوائد زیادہ تر سب کو معلوم ہیں کہ انسان دنیا میں مال کی وجہ سے ہی عزت پاتا ہے ، اور خلق سے بے نیاز ہوتا ہے ۔ اور وہ اپنے مال سے دوستوں میں اضافہ کر سکتا ہے ۔ مال کی وجہ سے اس پر حقارت کی نظریں نہیں پڑتیں ۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں ۔

نقصاناتِ مال

مال سے دینی نقصانات مال میں بہت سی دینی آفتیں شامل ہیں اور بعض دنیوی ۔ دینی آفات تین اقسام پر مشتمل ہیں —— پہلے دینی طور پر مال کی وجہ سے یہ نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ کہ آدمی فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ اور اس کی دلی خواہشات دنیا کی طرف ملتفت ہو جاتی ہیں ۔ اور جب اپنے مال کی وجہ سے آدمی فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا تو گناہگار رہا ۔ اور وہ ہی عذاب کا سبب ہوتا ہے ۔ لہٰذا ایسی صورت میں مال مصائب کا سبب ہے ، اور مفلس ان ہنگاموں سے دور رہتا ہے ۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ دینی کام تو سب بجا لاتا ہے ، لیکن عیش و عشرت اور دنیا داری میں بھی پڑا ہوا ہے ۔ ایسے آدمی تو کم ملیں گے کہ مال قبضے میں ہوتے ہوئے بھی جو کی روٹیاں کھائیں ۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے کو تکالیف میں مبتلا رکھتے تھے ۔

انسان کا بدن عیش و عشرت کی وجہ سے آرام کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر اپنی عادات بدلنے سے قاصر ہو گا ۔ ایک وقت وہ آتا ہے کہ آدمی دنیا ہی کو جنت سمجھتا ہے اور موت سے بھاگنے لگتا ہے

یہ بھی ناممکن ہے کہ آدمی کے پاس کسب حلال ہی آتا رہے ، لہٰذا ایسا بھی ہوتا ہے کہ عیش و عشرت کی وجہ سے وہ اس کو بھلا دیتا ہے اور طرح طرح سے مال حاصل کرنے کی تدابیر کرنے لگتا ہے ۔ اس کے بعد خوشامد پسندی خود پسندی آجاتی ہے ۔ اگر کہیں کسی مالدار کو بادشاہوں کا تقرب حاصل ہو گیا تو عوام کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ سب سے خوف کھانے لگتا ہے ۔ اور اگر اس کے ساتھ لوگ دشمنی کرتے ہیں تو اُن سے دشمنی پر خود بھی آمادہ ہو کر اُن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے ۔ یہ تمام عادات آجانے کے بعد انسان مستقل گناہوں کا عادی ہو جاتا ہے ، اور یہ سب چیزیں آدمی کو حسد ، گناہ ، غیبت اور رعونت و کبر میں مبتلا کر دیتی ہیں ۔

تیسری مصیبت یہ نازل ہوتی ہے ، اور اگر خدائی توفیق شاملِ حال نہ ہو تو کوئی اس سے بچ نہیں سکتا ۔ چاہے آدمی گناہ اور عیش و طرب دنیوی سے پرہیز کرے ۔ اور واقعی نیک بھی ہو ۔ حلال مال بھی حاصل کرتا ہو اور خدائی راہ میں صرف بھی کرتا ہو —— لیکن یہ تمام اعمال اگر دل سے کرتا بھی ہے اور خداوند عالم کی اطاعت میں سر نہیں جھکاتا ۔ اور صرف انھیں کاموں میں وقت گنوا دیتا ہے ، تو بھی بیکار ہے ۔ در اصل ان سب چیزوں کی اصل بنیاد خدا کی صحیح محبت ہے ۔ اور اپنے دل کو اس طرف اتنا مشغول رکھتا ہے کہ سوا اللہ کی حاجت باقی ہی نہ رہے ۔ اور اگر وہ لوگوں سے لگان اور خراج وصول کرنے میں وقت صرف کرتا ہے ۔ اپنے ساتھیوں کے

شر میں شریک ہوتا ہے، اور منافع کی چیزوں کا متلاشی رہتا ہے۔ تو یہ سب کچھ بیکار ہے۔ یہ سب چیزیں آدمی کے لیے اسی طرح ضروری ہیں، جس طرح کوئی آدمی دریا میں کود جائے اور خواہش یہ ہو کہ بھیگنے نہ پائے۔

مال کے نقصانات اور فائدے تم کو بتا دیئے گئے۔ عقلمند آدمی جب ان مسائل پر غور کرتا ہے، تو وہ مال کو اتنا ہی صرف کرتا ہے کہ سانپ کے زہر کا تریاق بن سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی اولاد کے لیے بقدرِ ضرورت ہی مال طلب کیا، اور فرمایا کہ جو آدمی حاجت سے زیادہ خواہاں ہے، وہ اپنی ہلاکت کا سامان کر رہا ہے۔

اسی طرح مال کا یک لخت خرچ کر دینا بھی بُرا ہے کہ ضرورت کے لیے بھی نہ رہے۔ اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔

قناعت کے فوائد اور حرص کے نقصانات

حرص و ہوس جب آدمی بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت اس کی شرم و حیا اُٹھ جاتی ہے اور انسان بداخلاق ہو جاتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ آدمی جس سے حرص کے ساتھ ملے گا، اس کی خوشامد کرے اور خوشامد کرنا ظاہرداری کے مترادف ہے، اور ظاہرداری کا دوسرا نام منافقت ہے۔ جب ریاکاری پیدا ہوتی ہے، تو خدا اور اس کی مخلوق سب کے ساتھ آدمی ریاکاری ہی کرتا ہے۔

خداوند عالم نے آدمی کو حریص پیدا کیا ہے، جو کچھ اس کو میسّر ہو۔ اس پر قناعت نہیں کرتا، اور قناعت نہ کرنے والا طامع ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر آدمی کو دو میدان سونے کے دے دیئے جائیں، پھر بھی وہ تیسرے کا حریص رہے گا۔ یہاں تک کہ موت نہ آجائے۔ انسان کی تمام چیزیں بہ تقاضائے عمر گھٹتی جاتی ہیں، لیکن دو چیزیں اور جوان ہوتی ہیں۔ ایک زندگی کی حرص، دوسرے مال کی محبت۔ یہ دونوں ہمیشہ جوان ہی رہتی ہیں۔ جس مسلمان نے خدا کے دیئے ہوئے مال پر قناعت کی وہ خوش بخت ہے۔ جبرئیل امین نے ایک بار مجھ سے کہا کہ آدمی جب کہیں سے جاتا ہے تو اوّل اس کا رزق وہاں سے اُٹھ جاتا ہے۔ خدا سے ڈرو، اور دُنیا کے طالب تیزی کے ساتھ نہ بنو۔ اس لیے کہ یہ حرص و ہوس کی نشانی ہے۔ اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز کرنا "عابد" کی نشانی ہے، جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر قناعت کرو۔ تاکہ شاکرین میں شمار ہو سکے۔

حضرت عوف بن اشجعی سے روایت ہے، کہ ایک بار ہم کئی آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ خدا کے رسولؐ کی بیعت کرو۔ ہم نے عرض کی کہ ہم بیعت کر چکے ہیں۔ سرکار رسالت نے پھر حکم دیا۔ ہم سب نے ہاتھ بڑھا دیے۔ ایک ایک ہوا کہ خدا کی پرستش کرو، اور پانچوں وقت کی نماز پڑھو

خدا کے احکام کے آگے گردن جھکا دو - اور ایک حکم انتہائی خاموشی سے دیا کہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرو - یہ حکم سُن کر اُن لوگوں کی عجیب حالت ہوگئی - وہ لوگ سہم گئے -

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ تیری درگاہ میں تونگر کون ہے؟ ندا آئی، قانع! عرض کیا کہ عادل کون ہے؟ ندا آئی کہ جو اپنے جسم میں انصاف کرے -

حضرت واسع رحمۃ اللہ علیہ سُوکھی روٹی پانی سے بھگو بھگو کر کھاتے اور فرماتے کہ جو اس روٹی پر قناعت کرتا ہے، وہ دنیا سے بے نیاز ہے - ہر روز ایک فرشتہ ندا دیتا ہے کہ جس مال سے آدمی کو غفلت اور خوشی زیادہ ہو، اس سے وہ مال کہیں زیادہ اچھا ہے - جو تیری حسبِ ضرورت مِلتا رہے -

حضرت سمیط ابنِ عجلان فرماتے ہیں کہ تیرا ایک بالشت کا پیٹ دوزخ میں لے جانے کا باعث کیوں ہوتا ہے حدیث قدسی میں ہے کہ خداوند عالم بندوں سے فرماتا ہے کہ میرا یہ احسان کیا کم ہے؟ کہ تیرے حساب کتاب کو دوسروں کے سپرد کر دوں، وہ اس طرح دوسرے کو تجھ سے زیادہ مالدار کر دوں تاکہ تو سبکدوش ہو جائے -

ایک حکیم کا مقولہ ہے کہ لالچی آدمی سے زیادہ کوئی دوسرا رنج کو برداشت نہیں کر سکتا - اور قانع سے زیادہ آرام اُٹھانے والا کوئی نہیں - حاسد سے زیادہ کوئی تکلیف برداشت نہیں کرتا - تارک الدنیا سے زیادہ کوئی ہلکا نہیں - عالم بے عمل سے زیادہ کوئی دوسرا شرمندہ نہیں ہوتا -

حضرت سماک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حرص و ہوا تیرے گلے کا پھندا ہے لہٰذا اس کو کاٹ دے تاکہ دنیا سے چھٹکارا پا سکے -

دفعیۂ حرص

مسلمانو! حرص اور طمع کا لالچ اس طرح ہو سکتا ہے کہ صبر کی تلخیاں برداشت کرو - اور علم کی شیرینی سے لُطف اندوز ہو! اور نیک عمل کی تکالیف کو خندہ پیشانی سے سہہ لو! دل کی تمام بیماریاں انھیں چیزوں سے جاتی ہیں - حرص کا دفعیہ پانچ چیزوں کے ذریعہ ہوتا ہے -

اوّل یہ کہ آدمی اپنے اخراجات کو کم کر دے - گھٹیا کپڑے استعمال کرے - اور دال روٹی کھانے کی عادت ڈالے - ان عادات سے تکلیف کم اٹھائے گا - اور اگر اخراجات کی فراوانی کم ہوگی تو قناعت ناممکن ہے -

سرکارِ رسالت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ میانہ روی کی چال چلنے والا آدمی کسی کا دست نگر یا پریشان حال نہیں ہو سکتا - آدمی کی نجات تین چیزوں میں مضمر ہے - اوّل یہ کہ خداوند عالم سے ہر حال میں ڈرتا رہے - دوسرے ہر حال میں اخراجات کو درمیانی درجے پر رکھے - تیسرے یہ کہ فارغ البالی اور خوشی کے زمانے میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے -

ایک آدمی نے حضرت ابوالدرداکو خرمے کی گٹھلیاں چُنتے ہوئے دیکھا۔ آپ فرماتے جا رہے تھے، کہ خوش حالی کے زمانے میں نرمی سے کام لینا عقل اور علم کی دلیل ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا قول ہے کہ جو آدمی میانہ روی کی چال چلے گا۔ خداوندِ عالم اس کو بے نیاز کر دیتا ہے اور فضول خرچ آدمی محتاج رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ اور قاعدے کے اندر خرچ کرنا آدھے عیش و آرام کا درجہ رکھتا ہے۔ جب دن بھر کے کھانے پھر مل جائے تو زیادہ حرص نہ کرنا چاہیے کہ عمر بھر کے لیے آج ہی دولت کمائی جائے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ وہ ہر آدمی کو رنج و تکلیف میں دیکھنا چاہتا ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ، کو رنجیدہ دیکھ کر فرمایا کہ رزق کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہو، جتنا تمھارے مقسوم میں ہے ضرور ملے گا۔

حضرت ابُوسفیان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پرہیزگاری کو اپنا شعار بنا لے۔ خلق اللہ پرہیزگار کے پاس خود آتی ہے اور وہ کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔

حضرت ابوحازم فرماتے ہیں کہ آدمی دو باتوں کو سمجھ لے تو نقصان میں نہیں رہ سکتا۔ اوّل یہ کہ دُنیا والے اگر کوشش کریں گے کہ تیرے مقسوم میں جو چیز ہے وہ تم کو نہ ملے، تو بھی ضرور ملے گی۔ اسی طرح اگر دُنیا کے تمام لوگ وہ چیز تجھ کو مہیا کرنا چاہیں گے کہ جو تیرے مقدر میں نہ ہو، وہ تم کو نہیں مل سکتی۔ لہٰذا مقسوم پر شاکر رہنا ہی باعثِ ثواب دین اور دنیا ہے۔ اور ہوا و ہوس کا بندہ دارین میں ذلیل ہو کر رہتا ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ خلق سے بے نیازی سب سے عزّت کی دلیل ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ارشاد فرماتے ہیں کہ تو اگر کسی کا محتاج ہے۔ تو گویا کہ اس کا قیدی ہے۔ اور اگر بے پروا ہے تو اس کی برابری کر سکتا ہے۔

چوتھی خرابی یہ ہے، کہ آدمی حرص و طمع کی اصل حقیقت پر غور کرے کہ کس غایت سے کر رہا ہے؟ اگر صرف پیٹ کی خاطر ہے، تو کتّا اور کوّا بھی تیری طرح پیٹ بھرتے ہیں۔ اور اگر شہوت کو دُور کرنے کے لیے ہے، تو سُور اور ریچھ کی خواہشات کا تابع ہے۔ اور اگر ظاہری شان و شوکت چاہتا ہے، تو کفار تجھ سے کہیں زیادہ زرق برق رہتے ہیں۔ لہٰذا حرص و ہوس کو چھوڑ دے، تاکہ بندگانِ خاص کی خاصیات پیدا ہوں۔

پانچویں تکلیف یہ ہے کہ مال اگر زیادہ ہے، تو اتنا ہی اس کی حفاظت میں جدّوجہد کرنا پڑے گی۔ لہٰذا اپنے سے نیچے آدمی کو دیکھ کر مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اور اس کی دی ہوئی نعمات پر شکر بجالانا چاہیے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اپنے سے غریب آدمی کو دیکھو۔ اپنے سے امیروں کو دیکھ کر حرص میں مبتلا ہونا شیطانی وسوسہ ہے۔ اسی طرح [illegible] و مذہب کے معاملات میں بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ

کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ ہم سے برتر ہیں ــــ دراصل شیطان آدمی کے پیچھے لگا ہے، جو ہر وقت بھڑکاتا ہے۔ لہٰذا اگر آدمی ایک ہی راستہ اختیار کرلے، کہ مال کے لحاظ سے غریبوں کو دیکھ کر مطمئن ہوجائے، اور علم و شریعت دینیہ کے لیے اولیاء اللہ کو دیکھ کر اور بڑھنے کی کوشش کرے۔ تو یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔

سخاوت

اگر آدمی کے پاس مال ہے، تو سخاوت اختیار کرے اور اگر غریب ہے تو قناعت کرے۔ بخل اور کنجوسی کو قریب نہ آنے دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ سخاوت بہشت میں ایک درخت ہے۔ اور سخی آدمی اس کی شاخ کو پکڑے رہتا ہے۔ اسی طرح حریص اور کنجوس آدمی دوزخ کے درخت کی شاخ پکڑتا ہے۔

نیک خلقی اور سخاوت اور دو عادات خداوند عالم کے لیے پسندیدہ ہیں: سخاوت۔ نیک عادات اسی طرح دو عادات خداوند عالم کو ناپسندیدہ ہیں۔ بخل اور بد خوئی۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ سخی اور نیک خو کا میں خود ضامن ہوں، اور اگر وہ گناہ بھی کرے تو اس کو معاف کردو!

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جہاد سے کچھ لوگوں کو قید کر کے لائے۔ حضور نے اُن کو قتل کا حکم دیا، لیکن ایک آدمی کو بری کردیا۔ حضرت علیؓ نے عرض کی کہ یہ آدمی بھی انھیں کے دین کا تھا۔ پھر اس کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ فرمایا کہ یہ آدمی سخی تھا۔ سخی جنت سے قریب ہے اور بخیل دُور۔ خداوند عالم جاہل سخی کو بخیل عابد سے زیادہ دوست رکھتا ہے۔ میری اُمت کے لوگ صرف روزہ نماز کی وجہ سے جنت میں نہ جائیں گے، بلکہ سخاوت اور خوش خلقی کی وجہ سے۔

اقوال و احادیث برائے سخاوت ایک بار حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ سامری کو قتل نہ کیا جائے، یہ سخی ہوئے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے کہ جب دنیا میں تیرے پاس مال ہو تو سخاوت کر! تاکہ وہ مال اور زیادہ ہو اور دنیا تیری طرف اور متوجہ ہو! اور اگر مال نہ ہو تب بھی خرچ کر! تاکہ دُنیا جلدی سے تجھ سے الگ ہوسکے۔

ایک آدمی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے اپنی تمام تکالیف لکھ کر دیں۔ آپ نے بغیر پڑھے فرمایا کہ تیری حاجات بر آئیں۔ لوگوں نے دریافت کیا، یا حضرت! یہ کاغذ آپ نے کیوں نہ پڑھا۔ تو فرمایا کہ اتنی دیر اس کو سائل کی حیثیت سے کھڑا رہنا پڑتا۔ حضرت ام ذرہ خادلہ۔

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضرت زبیرؓ نے دو تھیلیاں چاندی کی اور ایک لاکھ اسّی ہزار روپیہ بطور نذر بھیجا۔ آپ نے فوراً درویشوں میں تقسیم کردیا، اور خود روغنِ زیتون اور روٹی سے روزہ افطار کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، جب مدینے [illegible] حسین علیہ السلام نے اُن سے اپنے قرض کے متعلق

فرمایا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک اُونٹ جس پر اسّی ہزار روپیہ تھا، اُن کو دے دیا۔

روایت ہے کہ ایک بار امام حسن رضی اللہ عنہ، امام حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ جعفر رضی اللہ عنہ حج کو جارہے تھے۔ راستے میں وہ اونٹ جس پر کھانے کا سامان تھا پیچھے رہ گیا۔ جب بھوک زیادہ بڑھی، تو ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں تشریف لے گئے اور معلوم کیا کہ تھوڑا پانی پینے کو ہے؟ اس نے اس بکری کا دُودھ دوہ کر پیش کر دیا۔ پھر فرمایا اب کچھ کھانے کو ہو تو دے۔ بڑھیا نے بکری ذبح کی اور گوشت بھون کر پیش کر دیا۔ آپ نے سیر ہو کر تناول فرمایا، اور حکم دیا کہ ہم قریش سے ہیں، جب حج سے واپس آئیں تو ہمارے پاس آنا، اور تشریف لے گئے بڑھیا کا خاوند جب آیا تو اس پر بہت خفا ہوا۔

اتفاقاً کچھ ہی دنوں بعد دونوں میاں بیوی مفلوک الحالی کے باعث مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، نے اُس بڑھیا کو پہچان لیا اور تینوں نے مل کر تین تین ہزار بکریاں اور تین تین ہزار اشرفیاں مرحمت فرمائیں وہ بڑھیا بخوشی یہ سب کچھ لے کر اپنے خاوند کے پاس گئی۔

حکایت : حضرت ابوسعید خرگوشی علیہ الرحمۃ سے روایت ہے کہ مصر میں ایک شخص محتسب نامی تھا وہ فقیروں کو بہت کچھ تقسیم کرتا تھا۔ ایک آدمی کے یہاں لڑکا ہوا، اور وہ شخص محتسب کے پاس آیا۔ محتسب کئی مالداروں کے یہاں اس کو لے گیا۔ لیکن ناکامی ہوئی۔ آخر کار ایک فقیر کے پاس جا کر اس نے کہا کہ اے مرنے والے! تو زندگی میں بڑا سخی تھا۔ یہ شخص آج محتاج ہے، اس کی اعانت کر! یہ کہہ کر دونوں کھڑے ہو گئے اور وقتی طور پر محتسب نے اس شخص کو ایک درہم کا آدھا اس کو دے دیا۔ رات کو محتسب نے اس شخص کو خواب میں دیکھنا وہ کہہ رہا تھا کہ میرے گھر میں چولھے کے قریب پانچ سو روپیہ دفن ہے، میرے لڑکے سے کہو کہ وہ کھود کر اس حاجت مند کو دے دے۔ چنانچہ محتسب اس کے لڑکے کے پاس گیا اور پورا واقعہ بیان کیا۔ اس نے زمین کھود کر وہ رقم نکالی اور محتسب کو دے دی۔ چنانچہ محتسب اس شخص کے پاس لے گیا۔ اس نے آدھی رقم اپنے قرضے میں صرف کر دی اور آدھی واپس کر دی۔

اے مسلمانو! یاد رکھنا چاہیے کہ سخی آدمی مرنے کے بعد بھی سخاوت کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام مہمان رکھنے سے بہت خوش ہوتے تھے، اور آج تک آپ کے مزار پر مہمان رہتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ایک بار گریہ فرما رہے تھے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ہفتے سے میرے یہاں کوئی مہمان نہیں آیا۔

ایک آدمی نے اپنے دوست سے چار سو دینار قرضہ ادا کرنے کے لیے مانگے۔ اس نے فوراً دے دیئے اور رونے لگا۔ اس کی بیوی نے سبب دریافت کرنے کہ اگر تکلیف پہنچی تو کیوں دیتے تھے۔ تو جواب دیا کہ مجھے اس

کا افسوس ہے کہ میں اس کے حال سے ناواقف اور غافل ہو گیا اور اس کو سوال کرنا پڑا۔

بُخل؛

خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (یعنی جو بُخل سے محفوظ رہا اس کو نجات ملی) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (یعنی اس بات کا خیال بھی نہ کرنا کہ خدا کی عطا کردہ چیزوں میں بُخل کرنا اچھا ہے۔ بلکہ قریب ہے کہ اس چیز کا طوق بنا کر اُن کے گلے میں لٹکا دیا جائے گا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بُخل کی وجہ سے پہلی قومیں تباہ ہو گئیں۔ لہٰذا تم پرہیز کرو، اور آدمی کو تین چیزیں ہلاک کر دیتی ہیں۔

بُخل[۱] اگر تو اس کی مخالفت نہ کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔

خواہشات[۲] باطل، اگر آدمی اختیار کرے گا۔

خود پسندی[۳]، اگر مغرور ہو جائے گا۔

حضرت ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں دو آدمی آئے، اور ایک اونٹ کی قیمت مانگی۔ حضورؐ نے عنایت کر دی۔ جب وہ دونوں واپس ہو گئے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے شکریہ ادا کیا۔ آپ نے جب دریافت کیا، جواب میں ارشاد فرمایا کہ جو آدمی لجاجت اور فریاد کے ساتھ مانگے وہ آگ کی مثل ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی اگر آگ ہے تو کیوں عنایت فرماتے ہیں؟ تو فرمایا اس لیے کہ وہ فریاد کرتے ہیں اور خداوند عالم بُخل کو ناپسند کرتا ہے۔ لہٰذا دیتا ہوں۔ ایک دن آپ طواف کعبہ میں مشغول تھے کہ ایک آدمی کعبے کے حلقے کو پکڑ کر کہہ رہا تھا کہ اے خدا تو اپنے اس گھر کے صدقے میں میرے گناہ معاف کر دے۔ آنحضرتؐ نے دریافت کیا، کیا گناہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ اپنے اس گناہِ عظیم کو بتا نہیں سکتا۔ تو فرمایا کہ تیرا گناہ خداوند عالم کی رحمتوں سے زیادہ تو بڑا نہیں ہے۔ تب اس نے واقعہ بیان کیا کہ میں ایک مالدار آدمی ہوں اور جس فقیر کو آتے دیکھتا ہوں، اس کو آگ سمجھتا ہوں، کہ کہیں اس کی آگ مجھے جلا نہ دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ارشاد فرمایا کہ مجھ سے بچ جا! ورنہ تیری آگ مجھے نہ جلا دے۔ اور قسم ہے اس پروردگار کی کہ اگر تو عمر بھر توبہ کرتا رہے اور روتا رہے۔ مگر اپنے بُخل پر قائم رہے تو تیرا گناہ معاف نہ ہو گا۔ اس لیے کہ بُخل کُفر ہے اور کفر بمنزلہ آگ کے ہے۔ افسوس کہ تو نے خداوند عالم کا فرمان نہیں سُنا۔ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ اور وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

روایت ہے کہ دو فرشتے اس بات پر مقرر ہیں کہ خرچ کرنے والوں کے مال میں اور اضافہ کرتے ہیں اور بخیل

کے مال کو اور کم کرتے ہیں۔ حضرت ابُو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بخیل کی گواہی قابلِ قبول نہیں کیونکہ وہ زیادہ عوض لے کر گواہی دے سکتا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شیطان سے دریافت کیا کہ تو کس کو دوست رکھتا ہے۔ کہنے لگا کہ زاہد بخیل کو۔ اس لیے کہ وہ عبادات کرتا ہے اور اس کے بخل کی وجہ سے سب رائیگاں جاتی ہیں۔

دریافت فرمایا کہ دُشمن کس کو سمجھتا ہے؟ کہنے لگا وہ فاسق و فاجر جو سخی ہو کہ زندگی انتہائی عیش و تنعم میں گزارنے کے بعد بھی خداوند عالم اس کی سخاوت کی وجہ سے اس کو بخش دیتا ہے اور اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے

ثواب ایثار

ایثار اور ثواب میں یہ فرق ہے کہ سخاوت اپنی حاجت کے علاوہ دوسرے کو بخشش کرنا ہے۔

مگر ایثار اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایثار اس کو کہتے ہیں کہ آدمی تمام حاجات کو روک کر دوسرے کی حاجت پوری کرے۔

اسی طرح بخل کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی نہ خود ہی خرچ کرے اور نہ کبھی دوسرے کو، اور بجائے اس کے دوسروں سے لے کر اور جمع کرتا ہے۔

ایثار دنیا میں بڑی چیز ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔

سرکار رسالتؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی ایثار کرتا ہے، خداوند عالم اس کو بخش دیتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے کبھی تین دن متواتر آسودگی کے ساتھ نہیں کھایا، بلکہ ایثار کیا۔

آنحضرتؐ کے یہاں ایک مہمان آیا — ایک انصار اس مہمان کو اپنے ساتھ لے گیا۔ رات کو کھانا کچھ کم تھا اس نے چراغ گل کر دیا۔ اور خود اس کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا تاکہ مہمان پیٹ بھر کر کھالے اور کھانے کی کمی کا اس کو احساس نہ ہو۔ چنانچہ صبح کو آنحضرتؐ نے اس سے فرمایا کہ تُو نے رات انتہائی ایثار سے کام لیا۔ اور خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اشتیاق ظاہر کیا۔ آسمان سے ندا آئی کہ اے مُوسیٰ! تم اس کو نہیں دیکھ سکتے، مگر میں صرف ایک صفت کا پرتو تم کو دکھاتا ہوں۔ چنانچہ ایک جلوہ نظر آیا، قریب تھا کہ حضرت موسیٰ بے ہوش ہو جائیں۔ اس وقت عرض کیا کہ بارالہا! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درجہ کیسے پایا؟ ندا آئی ایثار کے ذریعہ۔ اور اے مُوسیٰ جو آدمی ایک بار بھی ایثار کرتا ہے، میں اس سے حساب نہیں لیتا، اور جنت کے دروازے اس پر کھلے رہتے ہیں۔ وہ جہاں چاہے رہ سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ایک بار ایک باغ میں پہنچے وہاں کا محافظ ایک حبشی تھا، اس کو دیکھا کہ تین روٹیاں اس کے کھانے کے لیے آئیں۔ وہ کھانے بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک کتا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک روٹی اس کتے کو ڈال دی۔ جب کتا وہ روٹی ختم کر چکا تو دوسری بھی ڈال دی۔ اس کے بعد تیسری بھی۔ آپ بہت حیران ہوئے اور پوچھا کہ اب تو کہاں سے کھائے گا۔ حبشی کہنے لگا یہ کُتا کہیں سے آج آ نکلا ہے۔ اور بُری بات تھی کہ پاس سے بھُوکا واپس جاتا۔ میں آج صبر کروں گا ـــــ آپ نے فرمایا کہ لوگ مجھے سخی کہتے ہیں لیکن یہ مجھ سے بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس حبشی کو مع باغ کے خرید کر آزاد کر دیا اور وہ باغ بھی اس کو دے دیا۔

حضرت علیؑ کا رسُولؐ اللہ کے لیے ایثار

شب ہجرت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سوئے۔ تاکہ کفارِ مکہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ آپ یہاں تشریف نہیں رکھتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنی جان کی پروا بھی نہ کی۔ خداوند عالم نے جبرائیل اور میکائیل سے فرمایا کہ تم دونوں کو باوجود بھائی ہونے کے اپنی عمر کی زیادتی کی خواہش ہوئی، لیکن میں نے علی کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھائی بنایا۔ اور علی میرے رسُولؐ پر جان فدا کرنے کو تیار ہو گیا۔ میں نے اسی لیے دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے۔ یہ ہے ایثار ـــ اب تم جاؤ! اور علی کی حفاظت کرو۔ چنانچہ دونوں آئے، اور اِرد گرد کھڑے ہو گئے۔ حضرت علیؑ کے خراٹے بلند ہو رہے تھے، اور دونوں مقرّب ترین فرشتے کہتے جاتے تھے کہ اے ابنِ ابی طالب! خداوند عالم آج تمھاری ذات پر فخر کر رہا ہے، اور اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔

بزرگانِ دین میں سے حضرت انطاکی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک گروہ ایک جگہ جمع ہوا۔ کھانے کے وقت روٹیاں کچھ کم تھیں۔ اس کے ٹکڑے کر کے سامنے رکھ لیے تاکہ سب مل بانٹ کر کھالیں۔ چراغ گل کر دیا گیا۔ بعد میں چراغ جب روشن کیا تو کسی نے بھی اس خیال سے کھانا نہ کھایا تھا کہ میں نہ کھاؤں اور دوسرے ہم صحبت سیر ہو کر کھالیں۔

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ جنگِ تبوک میں منجملہ اور بہت سے شہدا کے میرا چچازاد بھائی بھی شہید ہوا تھا۔ میں نے ایک گلاس پانی چاہا کہ اس کو پلا دوں۔ چنانچہ اس کے پاس لے گیا اور پانی پلانے کا ارادہ کیا، کہ برابر سے دوسرے زخمی نے پیاس، پیاس کہا۔ میرے بھائی نے اشارہ کیا کہ اوّل اس کو پلا دیا جائے۔ میں اُن کے پاس لے گیا۔ چنانچہ تیسرے زخمی نے کراہتے ہوئے پانی مانگا۔ اس کی آواز سے ہشام بن العاص رحمۃ اللہ علیہ نے اس تیسرے پیاسے کی طرف اشارہ کیا۔ کہ اس کو اوّل پلا دیا جائے، میں اس کے پاس پانی لے گیا، لیکن وہ راہیِ جنت ہو چکا تھا۔ پھر ہشام بن عاص کے پاس آیا، وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ آخر میں پھر اپنے بھائی کو دیکھا

تو وہ بھی دم توڑ چکا تھا۔

بزرگوں کے قول کے مطابق کوئی آدمی ایسا نہیں مرا، جیسا کہ وہ پیدا ہوا تھا (یعنی بغیر کپڑوں کے) لیکن حضرت بشر حافی کہ آپ جب عالمِ سکرات میں تھے، ایک فقیر آیا اور اس نے آپ کا کرتا طلب کیا۔ آپ نے فوراً اُتار کر دے دیا اور خود کسی سے مستعار مانگ کر پہنا اور انتقال فرما گئے۔

حدود بخل وسخاوت

سخی اور بخیل کی شناخت

یوں تو دنیا کا ہر آدمی اپنے کو سخی سمجھتا ہے، چاہے دوسرے اس کو کنجوس ہی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے، تاکہ ہر آدمی بخل سے پرہیز کرنے لگے۔

دنیا میں ایسا بہت کم ہے کہ کوئی کسی کو جب بھی جو کچھ مانگے اور فوراً دے دے۔ لہٰذا صرف یہ دلیل "بخل" پر صادق نہیں آتی —— ہم کچھ بزرگانِ دین کے اقوال اس کی مثالوں میں پیش کرتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں، کہ اگر کوئی آدمی کوئی چیز طلب کرے اور وہ شرعاً دینا ضروری ہے، اس کو نہ دینا بخل ہے۔

بخل کے متعلق مصنف کتاب کی رائے

مگر ہمارے خیال میں بخیل وہ ہے کہ آدمی نانبائی کو روٹی اور قصاب کو گوشت اس خیال سے واپس کر دے کہ یہ کم ہے، وہ شخص بخیل ہے۔ یا کوئی آدمی اپنے اہل وعیال کو مقررہ آرزوؤں سے زیادہ نہ دے۔ وہ بخیل ہے۔ اور جس آدمی کے روٹی کھاتے وقت فقیر سوال کرے مگر وہ نہ دے وہ بھی بخیل ہے، شرعی اصول نے بخل کو یہاں تک محدود کر دیا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ بخیل وہ آدمی ہے جو دینے کی لائق چیزوں کو بھی نہ دے۔

بخیل کی تعریف

(توجیہہ) خداوند عالم نے مال کو صرف کرنے کے لیے دیا ہے۔ لہٰذا اس کا صرف نہ کرنا بخل ہے۔ اور صرف کرنے کے لیے شرع نے حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے، اور وہ حالات کے ماتحت بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا مقصد یہ نکلا کہ مال کا رکھنا ضرورت پر خرچ نہ کرنے پہ بخل ہوتا ہے۔ اور اگر رکھنا مناسب ہے اور صرف کر دیا جائے تو وہ اسراف میں داخل ہے۔

یہ دونوں چیزیں افراط وتفریط میں داخل ہیں جو اخلاقاً بُری ہیں۔

اگر کوئی مہمان آجائے اور اس پر مناسب طور پہ خرچ نہ کیا جائے، تو یہ بھی بُرا ہے، اور اگر ہمسایہ بھُوکا ہے اور تمہارے پاس اپنی احتیاج سے زیادہ کھانا ہے، تو اس کو نہ دینا بھی بخل ہے۔

اگر آدمی شرعی حدود کے ماتحت زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات ادا کر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی خیرات کرنا باعثِ ثواب ہے۔ اسی طرح دنیا کے تغیرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مال کا رکھ چھوڑنا بھی ضروری ہے، لیکن ثواب کو

نفل اندازہ کر کے جمع کرنا بخل میں داخل ہے۔ بہر حال اگر شرعی حدود کے اندر اس نے زکوٰۃ وغیرہ نکال دی ہے تو وہ بخیل نہیں رہتا، لیکن سخاوت اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جتنا بھی نیک کاموں میں صرف کرتا رہے گا اتنا ہی سخاوت کا ثواب بڑھتا رہے گا سخی کی عادت ایسی ہونا چاہیے کہ کسی کو دنیا اس کی طبیعت پر ناگوار نہ گزرے۔

حقیقی سخی وہ ہوتا ہے جو بغیر کسی غرض کے دے۔ آج کل یہ بات ناپید سی ہی ہے۔ یہ صفت خداوند عالم کی صفات میں سے ہے۔ بہر حال اگر کوئی آدمی آخرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سخاوت کرتا ہے۔ اس کو بھی مجازاً سخی کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے بھی اس کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ یہ دنیا کی سخاوت ہے، اور دین کی سخاوت وہ ہے کہ دینِ خداوندی کے لیے اگر جان کی ضرورت ہو تو چون وچرا نہ کرے اور اس کو آخرت کا بھی یہ خیال نہ ہو کہ مجھے شہادت کا اجر وہاں ملے گا۔ اس کو صرف خلوص اور مودت ہونا چاہیے۔ اگر کسی اُمید کی غرض سے کرے گا، تو اس میں معاوضہ شامل ہو جائے گا، اور سخاوت کے درجات میں کمی آجائے گی۔

دفعیۂ بخل

بخل سے بھی علم و عمل کے ذریعہ نجات ملتی ہے۔ اوّل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ بخل کن اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ بغیر اصل سبب معلوم ہوئے دفعیہ ناممکن ہے۔

سببِ بخل سب سے بڑی وجہ بخل کی خواہشاتِ دنیا ہیں۔ دوسرے عمر کے متعلق معلوم ہونا کہ اس کی عمر کتنی ہے؟ اگر وہ سمجھ لے کہ عمر بہت کم ہے تو بخل نہ رہ سکے گا۔ لیکن اس صورت میں اگر اس بخیل کے اولاد ہے تو بخل میں اور زیادتی ہو گی۔ اس لیے کہ آدمی اولاد کو اپنی اور اپنے نام کو بقا کا سبب سمجھتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اولاد مرد کو بیوقوف، بزدل اور بخیل بنا دیتی ہے اور اس اولاد کی وجہ سے اس کو مال سے ہی بذاتِ خود محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کسی وقت بیمار ہو جائے تو دوا تک نہیں کرتا۔ اس کا دفعیہ تقریباً ناممکن سا ہی ہے۔

دفعیۂ بخل علم کے ذریعے پھر بھی اگر آدمی سمجھداری سے کام لے کر خواہشات اور لذاتِ دنیا کو ترک کر دے ہر وقت موت کا تصور رکھے۔ اس کے بعد مال کی محبت خود بخود کم ہو جائے گی۔ اب اولاد کے مسئلے میں آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کسی دوسرے کی امانت ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے، تو وہ کھانے کو ضرور دے گا۔ دنیا میں سینکڑوں ایسے ہیں کہ باپ انتہائی غریب تھا مگر اولاد امراء میں شامل ہو گئی یا باپ سے بڑی بڑی میراث ملی بعد میں پھر بھیک مانگ رہے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر اولاد لائق اور سعادت مند ہے اور خدا کی مطیع ہے تو وہ خود ان کا کفیل ہو گا، ورنہ غربت مصلحت خداوندی کا سبب ہو سکتی ہے۔

اس کے متعلق احادیث و روایات دیکھے [illegible] دوزخ میں گھر بناتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی عبادت

کرے۔ لہٰذا آدمی کو دوزخ سے بچانے والی چیز سخاوت ہی ہے۔ اگر وہ خود غور کرے کہ بخیل کو دنیا والے کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو غالباً وہ بخل چھوڑ دے گا۔ یہ طریقہ صرف پڑھے لکھے ہونے پر موقوف ہے اور اگر آدمی سمجھدار ہے تو ان باتوں کو سوچ کر بخل چھوڑ سکتا ہے۔

اگر ان باتوں کو سوچنے کے بعد صرف کرنے کی طرف رغبت پیدا ہونے لگے۔ تو اس کا عملی پہلو سوچے اور خرچ کرنا شروع کر دے۔

حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ نے حمام سے ہی اپنے نوکر کو حکم دیا کہ میرا پیراہن دے دے۔ یہ اس لیے کہ جب تک وہ فراغت پائیں، ہو سکتا تھا کہ خیال تبدیل ہو کر اس نیکی سے محروم رہیں (یہ واقعہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے) مترجم

لہٰذا جب مال کی محبت رہے گی، بخل باقی رہے گا، اور جب صرف کرنے کی محبت شروع ہو جائے گی بخل ختم ہو جائے گا اور دراصل مال دنیا کو دنیا میں بہا دینا بخیلی سے زیادہ اچھا ہے۔

سب سے بہتر بات یہ ہے کہ آدمی نیک نامی کی خواہشات پیدا کرے اور سوچے کہ دنیا والے مجھے کم از کم سخی کے نام سے ہی ذکر کیا کریں گے اور جاہ و حشمت کی خواہش سے مال کی خواہش کو زیر کر دے۔ اور جب مال کی محبت قطعاً ختم ہو جائے تو اپنی ریاکاری کی طرف متوجہ ہو۔ ایک بُری عادت کو چھوڑنے کے لیے دوسری بُری عادت اختیار کرے۔ اور جب پہلی عادت ختم ہو جائے تو دوسری عادت بھی چھوڑنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ کسی بدعادتی کو چھوڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح جیسے کسی بچے کا دُودھ چھڑاتے وقت اس کی ماں کوئی مزیدار چیز اس کو چٹاتی ہے، تاکہ دُودھ کے مزے کو بھول جائے۔

ایک اور مثال بھی اسی طرح کی ہے کہ جب کپڑے پر کوئی دھبہ خون کا لگ جاتا ہے تو اس کو اوّل پیشاب سے دھوتے ہیں، اور جب خون صاف ہو جاتا ہے، پھر اس کو پانی سے پاک کر دیتے ہیں۔ لہٰذا بخل کو ریاکاری کے ذریعہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ریاکاری کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ریا بڑی چیز ہے۔ لیکن بہرحال جب ایک بُری عادت چھوڑنے پر انسان قادر ہے تو دوسری بھی چھوٹ سکتی ہے۔

(مسئلہ) دوسرے یہ کہ ریا صرف عبادت میں ناجائز ہے، نیک نامی کی غرض سے اگر سخاوت کریں تو حرام نہیں۔

لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ فلاں آدمی صرف ظاہرداری کے لیے خرچ کرتا ہے۔ وہ شخص بخیل آدمی سے بدرجہا بہتر ہے۔ لہٰذا بخل کا دھبہ اسی طرح دُور ہو سکتا ہے۔

بعض بزرگانِ دین نے اپنے مُریدین کا علاج اس طرح کیا ہے کہ اوّل ایک جگہ بیٹھے رہنے کی ہدایت کرتے اور جب مُرید کو اس جگہ سے محبت ہو گئی، تو جگہ تبدیل کر ... کسی مُرید کو کسی چیز سے زیادہ دلچسپی ہوتی، وہ چیز

اس سے لے لیتے، تاکہ چھوڑنے کی طاقت پیدا ہو سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنی نعلین (جوتے) میں نیا تسمہ ڈالا۔ درمیان نماز میں اس تسمے پر نظر پڑی، تو اس کو آپ نے فوراً بدل دیا۔ (یہ روایت پہلے بھی بیان ہو چکی ہے۔ مترجم)

مال سے محبت کم کرنے کا یہ بہترین علاج ہے کہ اس کو اپنے سے الگ کر دیا جائے، اور جب محبت مال دل میں نہ ہوگی تو طبیعت میں کشادگی پیدا ہوگی۔ محتاج زیادہ تر فراخ طبیعت ہوتے ہیں، لیکن جب کچھ پیسہ جمع ہو جاتا ہے تو بخل آنے لگتا ہے۔ قاعدہ ہے کہ آدمی جس چیز سے ناآشنا ہے اس سے اس کو دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایک شخص بادشاہ کی خدمت میں فیروزے کا پیالہ لایا۔ بادشاہ نے حکیم سے دریافت کیا، بتاؤ یہ کیا ہے؟ حکیم نے جواب دیا کہ اس پیالے سے آپ میں حرص پیدا ہو رہا ہے لہٰذا اس کا انجام تکلیف اور غربت ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ کیسے سمجھے؟ جواب دیا کہ اگر یہ کبھی ٹوٹ گیا، تو تکلیف دہ ہوگا، اس لیے کہ اب ایسا پیالہ ملنا ناممکن ہے، اور اگر چوری ہو گیا تو تکلیف اور غربت دونوں کا سبب ہوگا۔ چنانچہ کچھ زمانے بعد وہ پیالہ ٹوٹ گیا۔ بادشاہ انتہائی رنجیدہ ہوا اور کہا کہ وہ حکیم سچ کہتا تھا۔

مالِ دُنیا کے مصائب کا دفعیہ

دُنیا میں مال ایک سانپ کی طرح ہے۔ اب اگر بغیر اس کے علاج کے سمجھے۔ آدمی اس پر ہاتھ ڈال دے گا۔ تو ظاہر ہے کہ جانبری ناممکن ہے۔ لہٰذا اول مال کے مصائب سے بچنے کے لیے تدابیر اختیار کرے۔ اس کے بعد مال دُنیا حاصل کرنا اس کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

صحابہ کرام میں بھی بعض لوگ مالدار تھے، جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ۔

مالداری بُری بات نہیں ہے، لیکن ہر آدمی مالداری کی خواہش سے تباہی کے راستے پر لگ جاتا ہے اور اِس تباہی سے بچنے کے لیے پانچ طریقے ہیں۔

مال کو رکھنے کے اچھے طریقے پہلا طریقہ یہ ہے کہ آدمی مال کی غرض وغایت کو سمجھے۔ ہم نے اس کے متعلق پہلے لکھ دیا ہے کہ مال، قوت، لباس اور مکان بنانے کے لیے ہے۔ کیونکہ انسان کو دُنیا میں رہنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا مال کو صحیح طور پر خرچ کرنے سے اس کی غرض وغایت جاننا ضروری ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسب حلال کی کوشش کرے، تاکہ مال کسی شبہہ والے سبب سے کسب نہ کیا جائے۔ مثلاً رشوت اور گدائی وغیرہ۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مال حاجات ضروریہ سے زیادہ جمع نہ کرے۔ اگر جمع ہو تو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دے۔

چوتھا یہ کہ بے جا مال خرچ نہ کرے، اگر [illegible] کرے گا، تو بے جا طریقوں پر کمانے کی فکر ہوگی۔

پانچواں یہ کہ آمدنی اور خرچ میں توازن قائم کرنے کی کوشش کرے اور صرف عبادت خدا میں زندگی گزارنے کے لیے کمائے، اِس سے زیادہ نہیں۔

ان باتوں کے بعد "مال" انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ حضرت علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر عابد کو دنیا کا تمام مال مل جائے، تو اس تارک الدنیا سے بہتر ہے جو خدا کے علاوہ کسی دوسرے مقصد سے دنیا کو چھوڑے ہوئے ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنا ہر عمل خدا کے لیے مقرر کرے۔ چاہے وہ کوئی بھی عمل کیوں نہ ہو۔ اصل میں ہر کام نیت پر موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آدمی ان پانچوں طریقوں کو سمجھ کر عمل کر سکے تو مال دنیا اس کے لیے اچھا ہے ورنہ نہیں۔

(واقعہ) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جب انتقال کیا تو صحابہ نے آپس میں کہا کہ اتنا زیادہ مال چھوڑنے کی وجہ سے ہم کو اُن کی طرف سے خوف ہے۔ ایک صحابی نے فرمایا کہ اُن کا تمام مال جائز طریقے پر کمایا ہوا ہے۔ اور انھوں نے کبھی بے جا طور پر خرچ بھی نہ کیا۔ پھر خوف کا ہے کا؟ یہ اطلاع حضرت ابوذر غفاری کو ملی، تو بہت غصہ ہوئے اور حضرت کعب الاحبار کو مارنے کے لیے تلاش میں نکلے، وہ بھاگ نکلے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں آکر پناہ لی۔ حضرت ابوذر وہاں بھی پہنچ گئے۔ اور فرمایا کہ اے یہودی کے بچے تو نے کیا کہا؟ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا ہے کہ قیامت کے دن مالدار لوگ سب سے کمتر درجے پر فائز ہوں گے، اور سب سے آخر میں جنت میں جائیں گے۔ سوائے اس کے جو اپنے ہر طرف کے عزیزوں پڑوسیوں کو بخشش کرتا ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد لا انتہا مال چھوڑ جاؤں —— تو اے یہودی کے بچے، رسولؐ کا قول یہ ہے، اور تو یہ کیا بکتا ہے؟ تو جھوٹا ہے۔ حاضرین میں سے کوئی نہ بولا۔

ایک بار عبدالرحمٰن بن عوف کے اونٹ فروخت ہونے کے لیے مدینے آئے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سن کر فرمایا کہ آنحضرتؐ نے صحیح فرمایا تھا۔ اس کی اطلاع عوف کو پہنچی، وہ حاضر ہوئے، اور عرض کی کہ اُمّ المومنین! کیا ارشاد ہوا ہے۔ فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ جب جنت میرے سامنے پیش کی گئی، تو سب صحابہ بآسانی داخل ہو گئے، لیکن عبدالرحمٰن بن عوف گرتا پڑتا چلا تو بمشکل جنت کے دروازے تک پہنچا۔ چنانچہ عوف نے تمام اونٹ اور غلام تقسیم کر دیئے۔ اور عرض کی کہ اب شاید صحابہ کے ساتھ میں بھی آسانی سے جا سکوں۔

(مثال) ایک صحابی کا ارشاد ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ ایک ہزار روپیہ روزانہ لاؤں اور غربا میں تقسیم کروں۔ اس لیے کہ اس میں مشغول ہونے سے نماز جماعت کے ثواب سے محروم رہوں گا۔ دوسرے اس کا حساب کتاب جو روزِ قیامت دینا پڑے گا۔ وہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔

(حدیث) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن ایک ایسا شخص لایا جائے گا کہ جس کی خرچ اور کمائی سب حرام پر مبنی ہوگی۔ اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ اس کے بعد دوسرا آدمی وہ ہوگا، جس نے حلال سے کماکر حرام میں خرچ کیا ہوگا۔ وہ بھی دوزخ میں جائے گا۔ تیسرا آدمی ایسا بھی دوزخ ہی میں بھیج دیا جائے گا جس نے حرام سے پیدا کر کے حلال میں خرچ کیا ہوگا۔ چوتھا آدمی ایسا پیش کیا جائے گا۔ جو حلال سے کماکر حلال ہی میں خرچ کرے گا۔ اس کو ٹھہرانے کا حکم ہوگا۔ کہ اس کے رکوع و سجود، طہارت وعبادت پر غور کریں کہ سب ٹھیک تھے۔ وہ شخص عرض کرے گا کہ بارِ الٰہا میں نے تیرا ہر حکم مانا ہے، اور کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ پھر ندا آئی گی کہ تم نے تکلف لباس پہن لیا ہو اور گھوڑے کی سواری اختیار کی ہو۔ وہ شخص پھر جواب دے گا کہ ایسا بھی نہیں کیا۔ پھر ندا آئے گی ہو سکتا ہے کہ تو نے پڑوسیوں اور عزیزوں کے حقوق ادا نہ کیے ہوں۔ اتنے میں اس کے چاروں طرف آدمی اکٹھے ہو کر کہیں گے کہ اس سے ہمارے حقوق کے متعلق دریافت کیا جائے، لیکن اُن سب کے حقوق بھی اس نے ادا کیئے ہوں گے۔ اس کے بعد اس سے اپنی دی ہوئی نعمتوں کا شکریہ ادا کرایا جائے گا۔

انھیں اسباب کی بناء پر بزرگانِ دین مالداری سے نفرت کرتے تھے۔ چاہے عذاب نہ ہو۔ لیکن ذرّے ذرّے اور پیسے پیسے کا حساب تو دینا پڑے گا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی فقر اسی لیے اختیار فرمایا کہ مُسلمانوں کو فقیری سے محبت ہو۔

حضرت عمر حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ کے حرم میں جانے کا شرف مجھے بھی حاصل تھا۔ چنانچہ ایک دن سرکار رسالت جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا کی عبادت کے لیے مجھے بھی لے گئے۔ دروازے پر آواز دی۔ جواب آیا، رسُولؐ کی بیٹی کا، کہ آیئے حضورؐ نے فرمایا کہ میرے ساتھ عمر حصین بھی ہیں۔ اندر سے جواب آیا۔ بابا! میرے پاس اتنا کپڑا نہیں کہ پورا جسم ڈھک سکوں۔ آنحضرتؐ نے اپنی چادر بھجوا دی۔ سیدہ عالم نے سر ڈھک لیا۔ پھر ہم دونوں اندر گئے۔ سرکار رسالتؐ نے بیٹی کی مزاج پُرسی کی۔ بیٹی نے باپ سے عرض کیا کہ بابا! تکلیف ہے۔ باپ نے فرمایا، بیٹی! اطمینان رکھ۔ مَیں نے تجھ کو ایسے شوہر کے سپُرد کیا ہے عالم وعالمیان کا سردار ہے اور تو خود بہشت کی عورتوں کی سردار ہے۔ بیٹی نے باپ سے عرض کی! بابا آسیہ زن فرعون کے متعلق بھی تو یہی ہے۔ فرمایا کہ وہ اپنے زمانے کی سردار ہیں، لیکن تو ہر زمانے کی۔

لہٰذا کسی بھی بدبخت اور جادوگر تک کو مال جمع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، صرف بقدر حاجت کمائے اور خرچ کرے۔ اِس لیے کہ دُنیا میں زیادہ تر سانپ کے مداری سانپ کے کاٹنے سے ہلاک ہوتے ہیں۔ لہٰذا مالدار آدمی مال ہی کی وجہ سے تباہ ہوتا۔

ساتواں اصُول

دُنیا

ہزاروں آدمیوں کی تباہی اور ہلاکت کا باعث صرف اُن کی جاہ وحشمت، آپس کے تنازعات، اور مخلوق سے محبت ہوتی ہے، اور ان تمام ہنگاموں کی وجہ سے ہی انسان دین سے بھٹک کر دُنیادار ہوتا ہے۔ دل میں نفاق اور کبر وغرور پیدا ہو جاتا ہے۔

(حدیث) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ محبّتِ دنیا نفاق کو سبزے کی طرح اُگاتی ہے، اور بھوکے بھیڑیئے سے بکریاں اتنی پریشان نہیں ہوتیں، جتنا دین نفاق سے منتشر ہوتا ہے۔ ایک بار حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آدمی دو چیزوں سے ہلاکت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ پہلے خواہشات، دوسرے خود نمائی اور خودستائی یہ دونوں چیزیں دُنیا کی جڑ ہیں۔ اگر آدمی فارغ ہے تو ان کی پروا نہیں کرتا اور جب ان کی پروا نہ ہوگی، تو دُنیا اس کے سامنے ہیچ ہے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (یعنی آخرت کی نیکیاں اس کے ساتھ ہیں، جو جاہ وحشمت کا اس دُنیا میں طالب نہیں) حدیث ہے خاک پر بسر کرنے والے لوگ ہی جنّت میں جاتے ہیں، اور اُن لوگوں کو کوئی آدمی نگاہ میں نہیں لاتا۔ وہ دُنیا سے بے خبر رہتے ہیں۔ پریشان حالی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اگر نکاح کرنا چاہتے ہیں تو کوئی لڑکی بھی دنیا میں پسند نہیں کرتا، اور وہ ہی لوگ ایسے نورانی ہیں، کہ اگر اُن کا نور تمام مخلوق پر تقسیم کیا جائے، تو دُنیا نورانی ہو جائے۔ دُنیا والے اُن کو ایک پیسہ نہیں دیتے۔ لیکن خدا سے اگر وہ دنیا مانگے، تو مل جائے۔

(واقعہ) ایک بار حضرت معاذؓ مسجد میں رو رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ تشریف لائے، پوچھا کیوں روتے ہو؟ عرض کی، حدیث رسولؐ ہے کہ آدمی میں ذرا سی ریا بھی شرک کا کام کرتی ہے۔ خداوند عالم ایسے پرہیزگاروں کو دوست جانتا ہے، جن کے سینے اتقا سے بھرے ہوں، اور دُنیا والے اگر اُن کو تلاش کرنا چاہیں تو وہ نہ ملیں۔ اگر مل بھی جائیں تو پہچان میں نہ آئیں۔ اُن کے ضمیر حقیقی روشنی سے منوّر ہیں۔ اور وہ خواہشات سے مبرا ہیں۔

حضرت ابراہیم ابن ادہم کا مقولہ ہے کہ جو آدمی عزّت وشہرت اور نیکنامی چاہتا ہے وہ دین میں پختہ نہیں

(واقعہ) حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی اپنے کو پہچوانے کی کوشش نہ کرے یہ صدق کی علامت ہے۔

ایک بار حضرت ابی بن کعب کے مُرید اُن کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اُن کو دُرّے مارنا شروع کیے۔ سب نے کہا اے خلیفۂ وقت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ تو فرمایا کہ یہ طریقہ پیچھے چلنے والوں کے لیے ذِلّت کا باعث ہے، اور آگے والوں کے دل میں نخوت پیدا کرتا ہے۔

(واقعہ) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ احمق آدمی اپنے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جب لوگوں کو دیکھتا تو ضرور اکڑتا ہے۔ ایک بار حضرت ایوبؓ کسی سفر میں جا رہے تھے، آپ کے پیچھے پُورا گروہ جا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا میں اس کو معیوب سمجھتا ہُوں۔ لہٰذا مجھے کوئی ڈر نہیں۔

(واقعہ) حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ کپڑے نہ اتنے پھٹے ہوں اور نہ اتنا شاندار کہ لوگ انگلیاں اُٹھائیں، بلکہ ایسے ہوں کہ کسی کی توجہ اس طرف نہ ہو سکے۔

(واقعہ) حضرت حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی آدمی ایسا نہیں ہے کہ لوگوں میں شہرت پانے کے بعد رُسوا نہ ہوا ہو۔ اور آخر بس اس کا دین ملیامیٹ نہ ہو گیا ہو۔

اقتدار وجاہ؟

جاہ و مرتبہ جن لوگوں کی مخلوق پر حکومت ہو، خوف غالب ہو۔ اور جانیں انھیں کے قبضۂ قدرت میں ہوں وہ صاحبِ اقتدار کہلاتا ہے۔ جب کسی شخص کا خوف دل پر غالب ہوتا ہے تو اس کا مال اور جسم بھی اس کا تابع ہونا ضروری ہے۔

لیکن اگر صرف کسی شخص کے لیے آدمی کے اعتقادات اچھے ہیں تو یہ سب چیزیں تابعدار ہونا ضروری نہیں ہیں، اور پھر اقتدار کی صف میں بھی نہ آسکے گا۔

اعتقاد اس شخص کی طرف سے اچھا ہوتا ہے جس میں کمال ہو۔ وہ کمال خواہ علم کی وجہ سے ہو یا عبادت اور نیک خُلقی کی بناء پر۔ اس کے بعد لوگ اس کے معتقد ہو کر مسخّر ہو جاتے ہیں، اور پھر اس کی اطاعت فرمانبرداری کی اقتدار یا حشمت کے خوف سے نہ ہو گی، بلکہ فی سبیل اللہ ہو گی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مال کی وجہ سے اس کے اعضا کی ملکیت ہو گی، اور جاہ و مرتبے کی وجہ سے دلوں پر حکومت ہو گی۔ صاحبِ مال کی فرمانبرداری اور اطاعت عموماً تین سبب پر مشتمل ہے۔

پہلا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی صاحب مال و صاحب جاہ سے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ لیکن اگر صاحب مال و حشمت کمینہ خصلت ہے، تو اس پر اغراض بھی پوری نہیں ہوتیں۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ مال کے لیے کمی اور چوری کا خطرہ ہے۔ لیکن جاہ و مرتبے کے لیے یہ خدشات نہیں ہوتے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ مال بغیر کسی محنت کے نہیں بڑھتا، لیکن مرتبہ و عزت خود بخود دن بدن بڑھتی رہتی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے اور وہ ہر جگہ تعریف کرے گا۔ اور جس کے سامنے تعریف کی جائے گی اس کے دل پر بھی ضرور اثر کرے گی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شہرت پا جاتا ہے۔ اور وہ شہرت ہی اس کے اقتدار کا باعث ہوتی ہے۔ اس شہرت کے لیے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ دوسرے شہروں میں جہاں وہ خود نہ جا سکے، وہاں بھی شہرت و اقتدار حاصل ہو جائے۔ چاہے وہاں کے لوگوں کی اس کو کبھی حاجت ہو یا نہ ہو اس میں ایک بہت بڑا راز پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آدمی فرشتوں کی اصل سے ہی بنایا گیا ہے، اور وہ خدائی کارخانوں کا ایک نمونہ ہے۔ خداوند عالم نے اسی کے متعلق ارشاد فرمایا ہے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔
چونکہ آدمی کو ربوبیت سے تعلق ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب جاہ فطری بات ہے جس طرح فرعون نے کہہ دیا تھا۔ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ۔

لہٰذا ربوبیت، ہر آدمی چاہتا ہے اور ربوبیت کے اصل معنی ہیں کہ اس کے مقابل کوئی دوسرا نہ ہو، اور اگر اس کا مقابل پیدا ہوگا، تو اس کی حشمت پر ضرور ٹھیس لگے گی، اور یہ صفت صرف خداوند عالم ہی کو حاصل ہے کہ اس کے برابر کوئی نہیں ہے۔ اور ہر چیز اس کے علاوہ فانی ہے۔ اور دُنیا سب اسی کی صفات کا آئینہ ہے۔ اس کی ذات کا شریک نہیں۔ جیسے سورج میں کوئی ساتھی نہیں، بلکہ اس کی روشنی سے دوسری چیزیں روشن و منوّر ہونے اور کرنے میں ساتھی ہیں۔ آفتاب صرف وہی ایک ہے جو دنیا کو منور کرتا ہے اور یہی آدمی کی صفت میں داخل ہے کہ وہ اپنے مقابلے میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا، لیکن وہ اس پر قادر نہیں۔ لہٰذا وہ دُنیا کے تمام مال کو اپنے قبضۂ قدرت میں کرنا چاہتا ہے، تاکہ وہ سب میں افضل ہو کر سب پر چھا جائے۔ لیکن وہ اس پر بھی قادر نہیں۔ اس لیے کہ موجودات عالم میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔

خواہشِ ربوبیت خواہشِ مال سے پیدا ہوتی ہے

ایک وہ جن کا تعلق انسان سے ہی نہیں۔ وہ انسان کے بس میں آ ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً آسمان، ستارے، زمین اور زمین میں جو کچھ ہے۔ مثلاً دریاؤں کی گہرائیاں پہاڑوں کی بلندیاں۔ لہٰذا آدمی ان چیزوں کو اپنے علم کے ذریعہ مسخر کرنا چاہتا ہے کہ وہ تمام عالم و عالمیان کو مسخر کر لے۔ جس طرح کوئی آدمی شطرنج نہ جانے اور جاننا چاہے۔ کیونکہ یہ ارادہ ہے اور قبضے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

دوسری قسم وہ ہے، جس پر آدمی کا تصرف ممکنات سے ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو زمین کے اوپر ایسی ہیں جیسے حیوانات، نباتات اور جمادات۔ لہٰذا انسان کی خواہش ہے کہ وہ ہی اس کے قبضۂ قدرت میں رہیں، بلکہ وہ اصل جوہر (یعنی دل) کو مسخر کرنا چاہتا ہے تاکہ دلوں پر حکومت کر سکے۔ اور یہ ہی "ربوبیت" کہلاتی ہے، اور

جاہ وحشمت کے یہ معنیٰ ہیں کہ بجائے اس کے خدا کی طرف رجُوع ہو، تاکہ کمال ربوبیت خدا ہی کو حاصل رہے۔ اور کمال کے دوسرے معنیٰ غلبہ ہیں، جو استیلا کہلاتا ہے۔ اور استیلا علم قدرت، سے حاصل ہو سکتا ہے اور علم قدرت جاہ وحشم سے حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ جاہ و مال کی محبت، علم قدرت کا باعث ہو سکتی ہے۔

توجیہات

ربوبیت کی خواہش اگر یہ استدلال دیا جائے، کہ ربوبیت کی چاہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور ربوبیت طلب جاہ و مال سے مل سکتی ہے، جو علم قدرت سے حاصل ہوتی ہے اور علم کا حصول بہت اچھی چیز ہے۔ لہٰذا طلب جاہ وحشمت اچھی چیز ہوئی، اور جتنی اس میں زیادتی ہو گی علم میں اضافہ ہو گا اور جتنا جتنا علم میں اضافہ ہو گا، اُتنا ہی خدا سے قرب بڑھے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علم اور قدرت دونوں ربوبیت کے پرتو ہیں۔ لہٰذا انسان علم حقیقی کو کسب کر سکتا ہے۔ قدرت حقیقی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ آدمی مال حاصل کرنے کے بعد لوگوں کے دلوں پر حکومت کر کے سوچ لیتا ہے کہ مجھے قدرت حاصل ہے، لیکن دراصل وہ صرف زندگی ہی میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔ موت کے ساتھ ساتھ وہ بھی الگ، ہو جاتی ہے، اور موت کے وقت الگ ہو جانے والی شے بَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتِ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اِس کی کوشش فضول ہے، جو حاصل نہ ہو سکے۔ لہٰذا اپنے دِل کو علم کی طرف رجُوع کرے، چونکہ دل ہی موت کے بعد باقی رہنے والی چیز ہے، اور اس میں جو علم ہو گا وہ علم نور کہلائے گا، اور وہ اس کے ذریعہ جنّت سے کہیں زیادہ لذات حاصل کرتا ہے۔ وہ علم کبھی فنا نہ ہو سکے گا۔ اس لیے کہ اس کا تعلق براہِ راست خدا سے ہے اور اسی کی صفات، کا ایک پرتو ہے جو ہرگز ہرگز تبدیلی قبول نہیں کر سکتا۔ اور نہ فانی اور نہ فانی اشیاء سے تعلق ہی رکھتا ہے اور وہ علم جو فانی ہے، وہ مثلاً علم لغت ہے، جو صرف کتاب وسنّت کے علوم سمجھنے کا ایک وسیلہ ضرور ہوتا ہے، اور مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کتاب وسنّت کا علم ہی خدا تک پہنچانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے معلوم ہوا کہ ہر تغیّر پذیر چیز فانی ہے۔ اس کا علم بذاتِ خود نہیں ہوتا بلکہ علم الٰہی کا تابع ہوتا ہے اور عِلم الٰہی "باقیات الصالحات" میں آتا ہے۔ اور وہ درگاہ قاضی الحاجات ہے، جو ازل سے ہے اور ابد تک باقی رہے گی۔

لہٰذا آدمی کو علمِ حقیقی تو حاصل ہو سکتا ہے۔ قدرت حقیقی حاصل ہونا ممکن نہیں۔ ایک چیز البتہ "باقیات الصالحات" سے ہو سکتی ہے۔ اور اس کا شمار قدرت میں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ خواہشاتِ نفسانی پر قدرت حاصل کرنا اور ان پر اتنا حاوی ہو جانا کہ جو خدا چاہتا ہے وہ تم چاہو۔ یہ کمال البتہ ملائکہ اور خدا میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا جتنا ان خواہشات سے دُور ہوتا جائے گا، خداوند عالم کی اس صفت سے قریب ہوتا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ علمِ معرفت ہی درجہ کمال ہے اور تمام خواہشات سے آزاد ہونا ہی بڑی صفت جاہ ہے۔ صرف جاہ وحشم دنیوی کوئی شئے نہیں، اس لیے کہ وہ بعد موت فنا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آج کل کے لوگ اصل کمال حاصل کرنے سے معذور ہیں، بلکہ کمال ظاہری چاہتے ہیں اور ہر آدمی اس کی تگ و دو میں ہے۔ اصل کمال سے غافل ہیں، اور صرف تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ خداوند عالم اسی لیے ارشاد فرماتا ہے کہ (وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ)

توجیہہ

جس طرح مال دنیا سے دلچسپی رکھنے والا آدمی اپنا دین کھو دیتا ہے۔ اسی طرح ظاہری جاہ وحشمت کا طالب بھی دین کی راہ سے بھٹک جاتا ہے، اِس لیے کہ جاہ وحشمت کے لیے غلام، لونڈی، نوکر چاکر، بادشاہ اور لشکر سب کچھ چاہیے، تاکہ اس کی اور اس کے مال اور عزت کی حفاظت کر سکیں۔ مگر ظالموں کے شر سے بچانے کے لیے اگر بادشاہ کی قربت چاہیں تو البتہ کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ فرمایا۔

طلب جاہ کے طریقے | طلب جاہ بقدر حاجت مباح ہے جس طرح مال بقدر ضرورت۔ اور طلب جاہ میں مثلاً استاد کی عظمت ضروری ہے تاکہ وہ اس کو علم پڑھا سکے۔

جاہ وحشم، چار ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، جن میں دو صورتیں تو حرام ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ آدمی عبادت میں ریاکاری کرے کہ لوگ اس کی قدر و منزلت کریں۔ عبادت صرف خلوص سے ہونا چاہیے۔

دوسرا حرام طریقہ یہ ہے کہ آدمی مکر و فریب سے اپنے کو اونچا ظاہر کرے کہ لوگ دھوکے میں آ کر اس کی عزت کرنے لگیں، مثلاً وہ اپنے کو حسب ونسب میں بلند بتانے لگے۔ یا عالم جید مشہور کرے حالانکہ حقیقت نہ ہو۔

باقی دو طریقے مباح ہیں، وہ یہ کہ کسی ایسی چیز کے ذریعہ طلب جاہ کرتا ہو، کہ اس میں کوئی فعل حرام بھی نہ ہو اور مکاری کا دخل نہ ہو، اور عبادت کو بھی ذریعہ اقتدار نہ بنائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ اپنے گناہوں کو لوگوں سے پوشیدہ رکھے، تاکہ وہ عوام اور حاکمِ وقت کی نظروں سے گرنے نہ پائے اور اس کی عزت برقرار رہ سکے۔ لیکن اپنی پارسائی اور نیکی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔

حُبِّ اقتدار

مال کا طالب جس طرح گنہگار ہوتا ہے، اسی طرح اقتدار کا طالب بھی گمراہ ہے۔ اور اس سے تمام مفسدہ پردازیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جو آدمی اقتدار کو ضرورت سے زیادہ سوچے گا وہ گمراہ ہوگا۔ اور اس کی درستی کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر بقدرِ ضرورت ہی ہے تو وہ حدود شرع میں ہے، وہ دراصل دین کے راستے میں ممد و مددگار ثابت ہوتا ہے بعض لوگ صرف عوام کی نگاہیں اور حرکات دیکھتے ہیں۔ اپنے متعلق افواہیں سنتے ہیں کہ اُن کے لیے دُنیا

کیا کہتی ہے؟ اور ان پر کتنا لوگوں کا اعتقاد ہے۔ ایسے لوگوں کے خیالات گمراہ ہیں اُن کو درست کرنا ضروری ہے اِس کی دُرستی بھی علم و عمل دونوں کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

علمی ذریعہ یہ ہے کہ اقتدار کی بُرائیوں پر نگاہ رکھے اور سوچے کہ اقتدار کی وجہ سے جو پریشانیاں دُنیا میں پیدا ہوتی ہیں، وہ کیا ہیں۔ مثلاً جاہ کا طالب ہمیشہ رنج و تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کے ساتھ رعایات برتنا پڑتی ہیں تاکہ اپنا اقتدار قائم کر سکے۔ اور اگر اقتدار نہیں ہوتا تو ذلیل رہتا ہے۔ اور اگر ہو جائے تو لوگ اس سے حسد کرتے ہیں اور تکالیف پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور مجبوراً اپنی حفاظت کی تدابیر کرتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت تکلیف و اذیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر دُشمنوں پر قابو پالے تو وہ بالکل دریا کی موجوں کی طرح بے ثبات ہوتے ہیں کہ آج اس کے بندے ہیں، کچھ ہی دنوں بعد مخالف ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ حاکمِ وقت جو چند دنوں کے بعد تبدیل یا معزول ہو جاتا ہے اور عوام چند دن کی خاطر اس کا حکم مانتے ہیں۔

اگر آدمی کو کچھ بھی حقیقت سے لگاؤ ہے، تو وہ تمام دُنیا کی بادشاہی اور تمام مخلوق کی فرمانبرداری کو بھی خوشی کا سبب نہیں سمجھتا اور سوچتا ہے کہ یہ سب زندگی کے جھگڑے ہیں۔ کچھ دنوں بعد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ سوچتا ہے کہ جس طرح بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ ختم ہو گئے جن کو دنیا بھول کر بھی یاد نہیں کرتی۔ پھر مجھے کون یاد کرے گا؟

اور جس آدمی نے اس ظاہری اقتدار پر جان دی اور خوش ہوا، اس کو خدا کی محبت دراصل جاتی رہتی ہے اور اگر اسی حالت میں مرے گا تو سوائے عذاب کے اس کو کوئی اجر نہ مل سکے گا۔

جاہ و عظمت کو عملی طور پر دو طریقوں سے کھویا جا سکتا ہے۔

پہلے یہ کہ آدمی کہیں دُور جا کر گوشہ نشینی اختیار کرے۔ اگر اپنے شہر ہی میں گوشہ گیر ہوگا، تو لوگ اس کو طعن کریں گے کہ طلب دُنیا اور جاہ و حشمت سے کیوں بیزار ہوا ہے۔ اور ان چرمی گوئیوں سے عاجز آکر وہ اپنی بریت کے استدلال پیش کرنے پر مجبور ہوگا۔ نیز اس دُنیا والوں کے اعتراضات پر رنج ہوگا۔ لہٰذا دُور جا کر کہیں جنگل میں رہنا بہتر ہے۔

دوسرے یہ کہ ایسے افعال لوگوں کی نظروں میں عمل میں لائے، جس سے لوگ گھُٹ کر دُور بھاگنے لگیں۔ اور اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ لیکن صرف اس وجہ سے کسی گناہ میں مبتلا نہ ہوں۔ جس طرح بعض بیوقوف آج کل گناہ کرتے ہیں اور اس پر اکڑتے بھی ہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل قصے سے سبق لے۔

کسی زمانے میں ایک زاہد تھا اس کے پاس روزانہ حاکمِ وقت آتا، تاکہ اس کی بزرگی سے کچھ نصائح حاصل

کرے - وہ زاہد جب تنگ آگیا تو ایک دن جب اس کو آتے دیکھا تو روٹی منگا کر بے ڈھنگے اور بے تکے طریقے سے کھانا شروع کر دی جس کی وجہ سے وہ حاکم وقت اس کے تقدس سے مکدر ہو گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

اسی طرح ایک بزرگ کو لوگوں نے بہت پریشان کرنا شروع کیا - وہ جب اس کی زندگی سے عاجز آگئے تو ایک حمام میں غسل کرنے کے بعد دوسرے کسی امیر آدمی کے کپڑے پہن لیے اور اپنے پرانے کپڑے حمام میں چھوڑ دیئے - لوگوں نے یہ دیکھ کر اُن کو پکڑ لیا اور خوب زدوکوب کیا کہ یہ بزرگوں کے لباس میں چور ہے چنانچہ اِس طرح اُن کا پیچھا چھوٹا - ایک بزرگ عموماً سُرخ رنگ کا پانی لوگوں کے سامنے پیا کرتے، تاکہ لوگ شرابی سمجھ کر اُن کے پیچھے نہ پڑیں - حرص و جاہ سے بچنے کے لیے یہ تدابیر کافی ہیں - اِنشاء اللہ -

ستائش و مذمّت مخلوق

خوشامد بعض لوگ اپنی تعریف کرانا چاہتے ہیں، چاہے وہ شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو - لوگوں کی مذمت بھی سُننے سے پرہیز نہیں کرتا، چاہے دُنیا کچھ بھی کہے - وہ صرف اپنی ظاہری نیک نامی چاہتا ہے - چاہے لوگ اس کو سرزنش بھی کریں - وہ ان باتوں کی پروا نہیں کرتا کہ دُنیا اس کو کیا کہہ رہی ہے - لہٰذا اس بات کو دُور کرنا بھی ضروری ہے - اس کے لیے سب سے پہلے ستائش و ہجو کی تکلیف اور خوشی کو سمجھنا ضروری ہے -

تعریف سُننا اور اچھا سمجھنے کے اسباب آدمی کی ستائش میں چار لذتیں حاصل ہوتی ہیں -

پہلی تو یہ ہے کہ آدمی اپنے کمال کو چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا دوست رکھتا ہے - اور نقصان کو بُرا سمجھتا ہے - جب اپنی تعریف سُنتا ہے تو اپنے کردار کو اچھا سمجھنے لگتا ہے - اس سے اس کو آرام ملتا ہے، اور لذت حاصل ہوتی ہے - اگر کسی کے عیب کو سُنتا ہے تو اس کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے - لہٰذا اگر کوئی بزرگ آدمی اس کی تعریف یا بُرائی کرے تو اس سے وہ رنجیدہ و مسرور ہو گا، ورنہ عوام کے کہنے سُننے سے زیادہ اثرات پیدا نہیں ہوتے - اس لیے کہ اس کو اُن لوگوں کی باتوں کا یقین نہیں ہوتا -

دوسری لذت یہ ہے کہ تعریف کرنے والا اس کا تابع ہے - اب اگر مداح بڑی عزت کا مالک ہے تو ممدوح بھی اسی مراتب کا آدمی ہو گا - لہٰذا اور لوگ جب اس کی زبان سے تعریف سُنیں گے تو خواہ مخواہ اس سے متاثر ہوں گے، اور خود کو بھی اتنی ہی لذت حاصل ہو گی -

تیسرا سبب یہ ہے کہ تعریف سے لوگوں کے دلوں کا حال معلوم ہوتا ہے کہ تعریف کرنے والے لوگ اس کے گرویدہ ہیں - لہٰذا اگر کھُلّم کھُلّا اس کی تعریف کی جائے گی تو وہ خود بھی اور سننے والے بھی اس سے اثر لے کر اس کے گرویدہ ہو جائیں گے -

چوتھا سبب یہ ہے کہ مداح اس کی حشمت کو مانتا ہے اور ذاتی جاہ و حشمت کا ہر آدمی گرویدہ ہوتا ہے

چاہے وہ اچھی ہو یا بُری - مدّاح چاہے مجبوری ہی تعریف کرے - اس لیے کہ وہ صرف ضرورت پورا کرنے کے لیے تعریف کرتا ہے - لہٰذا ممدوح اس بات کو بھی اپنا کمال ہی سمجھتا ہے کہ میں مخالفین سے اپنی تعریف کرا لیتا ہوں اور جذبہ کے ماتحت وہ اپنے پر ناز کرتا ہے - لیکن ممدوح یہ سمجھ کر کہ یہ تعریف محض مسخرا پن سے کر رہا ہے، تو البتہ اس میں کوئی لذت حاصل نہ کر سکے گا - کیونکہ لذّت کے اسباب اس میں سے نکل گئے -

جب یہ معلوم ہوگیا کہ تعریف اور ہجو سننے اور کرنے میں کیا کیا فوائد و نقصانات ہیں، تو یہ اس کو آسانی سے دُور کر سکتا ہے -

تعریفِ مباح

پہلا سبب لذّت یہ ہے کہ مدّاح جو کچھ تمھارے لیے کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں - اور اگر صحیح ہے تو یہ سمجھو کہ یہ صفات خداوند عالم کی عطا کردہ ہیں - لہٰذا خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تم کو ان صفات کا حامل بنایا - اس لیے کہ یہ صفات کسی مدّاح کے کہنے سے کم و بیش نہیں ہو سکتیں - اور اگر صرف تمھارے مال کی وجہ سے تعریف کرتا ہے تو خوش نہیں ہونا چاہیے - اور اگر واقعی وہ مناسب ہے تو ضرور خوش ہونا چاہیے - مدّاح کی تعریف سے نہیں، بلکہ اُن صفات سے جو وہ بیان کر رہا ہے، یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اگر یہ صفات مرنے سے پہلے تم ہی سے معدوم ہوگئیں تو خوش ہونا قطعی بیکار ہوگا، اور ایسی حالت میں تم کو وہ سب تعریفیں زیب نہیں دیتیں - اسی طرح کسی عالم کو اپنی تعریف سے خوش نہیں ہونا چاہیے - اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ سب صفات اس میں سے نکل جائیں، اور اگر نکل جائیں گی، تو وہ دوزخ کے راستے کو اپنے لیے تیار کر رہا ہے - اور اگر یہ سمجھتے ہوئے بھی وہ خوش ہوتا ہے تو دیوانگی ہے اور جاہ و حشمت کی وجہ سے یہ سب کچھ سننا چاہتا ہے - اسی طرح اگر کوئی آدمی تمھاری مذمت کرے تو رنجیدہ نہ ہونا چاہیے - اِس لیے کہ اگر وہ سچ کہہ رہا ہے تو اس سے نصیحت حاصل کرو، اور اگر جھوٹ بول رہا ہے تو وہ شیطان ہے، اور اگر اس کے جھوٹ کو جھوٹ نہیں سمجھ رہا، تو یہ بیوقوفی ہے، اور دراصل وہ انسان لباس میں گدھے کی مثل ہے - لہٰذا کسی کے شیطان بنانے سے نہ تو شیطان ہو سکتا ہے اور نہ فرشتہ بنانے سے فرشتہ خصلت ہی ہو سکتا ہے - پس چاہیے کہ اپنے میں وہ نقص دیکھو اگر ہے تو اس کو دُور کرنے کی کوشش کرو - اگر وہ عیب دین کا عیب ہے تو وہ اس کے کہنے کے موجب نہیں ہے اور اگر دُنیا کا ہے تو اس سے کسی شخص پر کوئی اثر نہیں پڑتا - لہٰذا کسی کی تعریف یا مذمت کی کوئی پروا نہ کرنا چاہیے -

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مدّاح کی تعریف تین حال سے کسی طرح خالی نہ ہوگی - یا تو دوستی میں کہے گا - اگر دوستی اور محبت میں کہتا ہے تو وہ قابلِ شکر نہ ہے، جس طرح اگر کوئی یہ کہہ دے کہ تیرے کپڑوں میں سانپ ہے - اور

اس کے نہانے کی وجہ سے تو محفوظ ہو جائے، تو گویا کہ تو اس کا مشکور ہو گا، اور ہونا بھی چاہیے، اور عیوبِ ایمانی سانپ سے زیادہ خطرناک اور باعثِ ہلاکت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر تو بادشاہ کے پاس جا رہا ہو اور کوئی آدمی کہے کہ تیرے کپڑے ناپاک ہیں، ان کو پاک کرلے۔ اور اگر وہ تجھ کو اس طرف متوجہ نہ کرتا اور تو وہاں چلا جاتا تو بادشاہ کے سامنے باعثِ سزا ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ناصح تیرے لیے باعثِ شکریہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ تجھ کو غصّے سے بھی نصیحت کرے، تو مان لے اور اپنی بُرائیوں کو دُور کرنے کی کوشش کر، اس کا گناہ اس کے ساتھ ہے، اگر تو اپنے سے وُہ برائی الگ کر دے۔ اور اگر وہ عیوب تجھ میں نہیں ہیں تو دوسرے عیوب پر نظر کر! کہ جن پر اس کی نظر نہ گئی اور یہ سوچ کر شکریہ ادا کر کہ خداوندِ عالم نے تیرے عیوب چھپائے اور تو بدنامی سے بچ گیا۔ نیز تیری ہجو کرنے والا آدمی خود ہی گنہگار ہوا، اور اس کی نیکیاں تیرے پاس آگئیں۔

لہٰذا جو آدمی اپنی ہجو سُن کر ناخوش ہوتا ہے، وہ بالکل ظاہر بینی سے کام لیتا ہے، اور اصلیّت و حقیقت کو نہیں پہچانتا۔ عاقل اور بیوقوف لوگوں میں اتنا ہی فرق ہے کہ عقلمند ہر بات کی اصل کو دیکھتا ہے، اور بیوقوف صورتِ ظاہری کو۔

نتیجے میں اوّل دُنیا کی حرص کو دل سے نکال دو، تو اپنی ہجو یا مدح سے بے نیاز ہو جاؤ گے۔

مدارجِ مدح و مذمّت

تعریف اور مذمّت کے کرنے اور سُننے والوں کے چار درجات ہیں۔

پہلے وہ لوگ جو تعریف سُن کر خوش ہوتے ہیں اور اُن کو مذمّت سے غصّہ آتا ہے اور ہجو کرنے والوں سے بدلہ لینے کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ یہ سب سے بدترین درجہ ہے۔

دوسرے وہ پارسا لوگ کہ جو مذمّت سے ناخوش اور تعریف سے خوش ہوتے ہیں، لیکن معاملاتِ دنیا میں اس سے بالکل غیر متعلّق سے رہتے ہیں۔

تیسرے وہ لوگ جو تعریف اور مذمّت کو برابر ہی خیال کرتے ہیں۔ نہ اُن کو اپنی ہجو پر غصّہ آتا ہے اور نہ تعریف پر خوشی ہوتی ہے۔ اُن کے خیال میں ظاہر و باطن سب یکساں ہے۔ یہ متّقی کہلاتے ہیں۔ اور بڑے مرتبے کے لوگ ہیں بعض عابدوں کا خیال ہے کہ وہ اس درجے پر پہنچ گئے، لیکن نہیں پہنچتے۔

اس مرتبے پر پہنچنے کی مثال یہ ہے کہ ہجو اگر اُن کے سامنے کی جائے تو قطعی طبیعت پر گرانی نہ ہو، اور اگر وہ کسی قسم کی امداد طلب کرے تو وہ مدّاح کے مقابلے میں اس امر کو بُرا سمجھنے لگیں یا اگر وہ آدمی اُن کے پاس کم آئے تو اس کو بُلانا چاہیے، اور اگر ہجو گر فوت ہو جائے تو اس کا رنج نہ ہو، اور اگر کسی رنج میں مبتلا دیکھیں تو اسی طرح مدد نہ کریں جس طرح کہ اپنے مدّاح کی کرتے۔ اور اگر اُن کا مدّاح اس کی اہانت کرے تو اس کا رنج نہ ہو۔ یہ درجہ نہایت دُشوار ہے۔

ہو سکتا ہے کہ عابد ہجو گو پر غصّہ کرنے لگے اور سبب یہ بتائے کہ وہ چونکہ گناہ کر رہا تھا، اس لیے مجھے غصّہ آگیا۔ لیکن یہ شیطانی بات ہے۔ اور اس کا ظاہر و باطن بالکل مختلف ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اُن کا ذاتی غصّہ ہے۔ باطنی نہیں۔

چوتھا درجہ صدیقین کے لیے ہے، جو مداح کو اپنا دُشمن سمجھتے ہیں اور ہجو کو بھاتے ہیں۔ مذمّت کرنے والے سے اس کو تین فائدے پہنچتے ہیں۔

ایک تو اس سے اپنے عیب معلوم کر لیتا ہے۔

دوسرے ہجو گو کی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھی گئیں۔

تیسرے یہ کہ ہجو گو نے اس کو اس بات کی طرف متوجّہ کر دیا۔ کہ وہ گناہوں کو سمجھ کر اُن سے پرہیز کرے۔

حدیث شریف میں ہے کہ افسوس اس شخص پر ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے اور اعمال بھی نیکوں کے سے کرتا ہے، لیکن اپنے مدح گو سے نفرت نہیں کرتا۔

اگر یہ حدیث صحیح ہے، تو یہ مرتبہ بڑا مشکل ہے، یہاں تک کہ درجہ دوم پر جو پہلے بیان ہو چکا پہنچنا دُشوار ہے۔

اس لیے کہ عموماً وقت پڑنے پر اپنے لوگوں کی طرف ہی ہر آدمی جھکتا ہے۔

لیکن اس آخری مرتبے پر وہ آدمی پہنچ سکتا ہے، جو اپنے نفس کا قطعی دشمن ہو گیا ہو اور جب اپنے نفس کے عیوب سُنے تو خوش ہو۔ یہ بڑی مشکل بات ہے کہ آدمی مدح گو اور ہجو گو کو ایک ہی نظر سے دیکھے۔

سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ مدح اور مذمّت کے فرق کو سمجھنے کے بعد "مدح" سُننے کا جذبہ آدمی پر غالب ہوتا ہے۔ تو آدمی ویسے ہی کام کرنے لگتا ہے اور اپنے کو آرام پہنچانے کے لیے عبادت میں بھی ریا کاری شروع کر دیتا ہے۔ بلکہ بعض تو گناہوں کو ہی اپنا حصولِ زندگی سمجھ لیتے ہیں، اور گناہ ہی کر بیٹھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس ہے اس روزے دار اور نمازی پر۔ تو غالباً اسی بناء پر کہا ہے کہ اگر وہ تعریف کی طرف مائل ہوگا، تو عبادات سے کنارہ کشی اختیار کرے گا۔ اور گناہوں کی طرف مائل ہو کر حرام کاموں کا مرتکب ہوگا۔

مدح و مذمّت کے لیے مصنّف کا ذاتی خیال

اپنی مذمّت کو مکروہ جاننا اور بُرا سمجھنا اور سچّی تعریف سے خوش ہونا بذاتِ خود حرام نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس عمل سے دوسری کوئی بُرائی پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو لیکن فی زمانہ یہ بہت مشکل ہے کہ آدمی اپنی تعریف سُن کر مذمّت کو بُرا نہ سمجھے۔ عموماً لوگ اسی طرف گرویدہ ہیں کہ ہر کام میں لوگوں کے ساتھ رواداری ہونا چاہیے۔

عموماً ایسے نظریات کے لوگ ناشائستہ عادات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کی رواداری میں ریاکاری شامل نہیں ہے تو وہ حرام نہ ہو گی۔

آٹھواں اصُول

(بابُ الاطاعت)

ظاہری اطاعت و عبادت

خداوند عالم کی عبادت میں ظاہرداری کرنے سے زیادہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ عابدوں کو سب سے زیادہ بیماری یہ ہی لگتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہماری عبادات سے لوگ مرعوب ہو کر معتقد ہو جائیں اور اگر صرف اسی عقیدے کے لیے آدمی عبادت کرے گا تو عبادت کا صحیح مفہوم پورا نہیں ہوتا، بلکہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اور اگر عبادت خدا میں کسی دوسرے کا خیال بھی مقصود ہے، تو شرک ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۔ (یعنی جو شخص خداوند عالم کی طرف جانے کی اُمید رکھتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے) دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (یعنی اُن لوگوں کی نمازوں پر افسوس ہے جو ریاکاری اور سہو سے نماز ادا کرتے ہیں)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جو آدمی خلوص سے عبادت کرتا ہے نجات اس کے لیے ہے۔ دوسری حدیث ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص خدا سے کہے گا کہ میں نے جہاد کیا اور تیری راہ میں مارا گیا۔ ندا آئے گی یہ جھوٹا ہے۔ اس نے صرف لوگوں کو اپنی بہادری جتانے کی وجہ سے جنگ کی تھی۔ اس کے بعد ایک دوسرے شخص کو میدانِ قیامت لایا جائے گا، اور فرشتے دریافت کریں گے کہ تو نے کیا اطاعت کی، وہ جواب دے گا کہ جو کچھ تو نے دیا تھا، وہ سب کچھ تیری راہ میں ہی لُٹا دیا۔ ندا آئے گی یہ جھوٹا ہے، اس نے صرف اپنی شہرت کے لیے ایسا کیا تھا۔ پھر تیسرے آدمی کو لایا جائے گا۔ اس سے بھی یہ ہی سوال کیا جائے گا۔ وہ جواب دے گا کہ علم کلام اللہ کما حقہٗ پڑھا اور تیری راہ میں تکالیف برداشت کیں۔ خداوند عالم کا ارشاد ہو گا، کہ یہ کاذب ہے، یہ صرف لوگوں پر اپنا اتقا ظاہر کرنے کے لیے سب کچھ کرتا تھا۔ اس کے بعد ان سب کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ... سے نہیں ڈرتا جتنا اپنی امت کے اس شخص سے

کہ جو چھوٹا مشرک ہو۔ دریافت کیا لوگوں نے کہ چھوٹا مشرک کیا؟ فرمایا کہ ریاکاری۔ اور ان ریاکاروں کے لیے ایک الگ جہنم بنایا جائے گا جس کا نام جُبّ الحُزن ہوگا۔ اور خداوند عالم ارشاد فرمائے گا کہ اے ریاکارو! تم لوگ آج انھیں کو ڈھونڈو، جن کی عبادت کرتے تھے، اور میرے شریک جن کو گردانتے تھے۔ میں شرکت سے بے نیاز ہوں۔ میں نے تمھاری عبادات اسی تمھارے شریک کے حوالے کردیں۔ ارشاد نبوی ہے کہ جس عبادت میں ذرہ برابر بھی ریا ملی ہوتی ہے وہ عبادت قبول بارگاہِ ایزدی نہیں ہوتی۔

حضرت معاذ ایک بار رو رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا، کیوں روتے ہو؟ تو عرض کی کہ مجھے وہ حدیث یاد آرہی ہے کہ عبادت میں ذراسی ریا بھی شرک ہے۔

شداد بن اوس سے مروی ہے کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا۔ حضورؐ فرما رہے تھے میری امت شرک کرے گی، بُت پرستی سے نہیں، بلکہ عبادت میں ریاکاری ہوگی۔ اور عرش کے سائے میں وہ آدمی ہوں گے جنھوں نے صدقہ بھی اس طرح دیا ہوگا کہ اُن کے دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوئی ہوگی۔

حدیث ہے کہ جب خداوند عالم نے زمین بچھائی، وہ کانپنے لگی، اس پر پہاڑ بنائے۔ فرشتوں نے کہا کہ پہاڑوں سے زیادہ مضبوط کوئی چیز نہیں۔ اس کے بعد لوہا بنایا گیا۔ فرشتے اس کو مضبوط کہنے لگے۔ خداوند عالم نے آگ پیدا کی۔ اس کے بعد پانی کو پیدا کیا۔ کہ اس نے آگ کو بھی سرد کردیا۔ اور اس کے بعد پانی کو بھی ساکن کردیا۔ اس کے بعد ملائکہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور خداوند عالم سے مناجات کی کہ تیری مخلوق میں برترین کون چیز ہے؟ ندا آئی کہ وہ آدمی جس نے ایک ہاتھ سے صدقہ دیا ہو اور دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی ہو۔

وہ فرشتے جو صبح سے شام تک آدمیوں کے اعمال کا حساب کتاب لکھتے ہیں، اور جب کسی کی انتہائی عبادات ہوتی ہیں تو وہ فرشتہ آسمان پر پہنچ کر کہتا ہے کہ اس نے آفتاب کی روشنی کی برابر عبادت کی ہے، تو دوسرا فرشتہ کہتا ہے کہ میں غیبت کا محافظ ہوں۔ اس کی عبادات اس شخص کے مُنہ پر مار دو۔ جس آدمی نے غیبت نہ کی ہوگی، اس کے اعمال دوسرے آسمان تک پہنچتے ہیں۔ وہ فرشتہ بھی یہی کہتا ہے کہ اس شخص نے صرف ظاہرداری کے لیے عبادت کی ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت اس کو واپس کردو۔

اس کے بعد چوتھے آسمان کا موکل عُجب کی وجہ سے عبادات کو واپس کردیتا ہے۔

اگر کسی کی عبادت میں یہ بات بھی نہ ہو تو اس کی عبادت تیسرے آسمان پر پہنچتی ہے۔ وہاں کا فرشتہ کہتا ہے کہ میں ان لوگوں کے کبر و نخوت کا ... شخص نے ہمیشہ کبر و غرور کے باعث عبادت کی ہے

لہٰذا اس کی عبادات یہاں نہیں آسکتیں - اس کو ہی واپس کردی جائیں - یہ اعمال اتنے حسین اور خوبصورت ہوتے ہیں کہ جتنی شبِ عروسی میں دُلہن - اس کے بعد پانچویں آسمان پر پہنچتی ہے وہاں کا موکل کہتا ہے کہ ان اعمال کو انھیں لوگوں کی گردن پر مار دو - یہ حسد کی وجہ سے کی گئی ہیں - اس کو یہاں آنے کی اجازت نہیں - اس کے بعد چھٹے آسمان پر لے جاتے ہیں ، وہ فرشتہ کہتا ہے کہ یہ شخص قاطع رحم تھا ، اس کے اعمال اوپر نہیں جاسکتے - لہٰذا اسی کو واپس کردیئے جائیں - یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر بعض لوگوں کے اعمال پہنچ جاتے ہیں - وہاں کے فرشتے اِنتہائی سختی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان اعمال کو انھیں کو واپس کردو ، اس لیے کہ یہ لوگ ریاکار ہیں ، اور خدا کی عبادت میں انھوں نے شرک کیا ہے - یہاں کے تمام فرشتے ان اعمال کی گواہی دیتے ہیں - تو خداوند عالم کی طرف سے ندا آتی ہے کہ تم لوگ ان کے ظاہری محافظ تھے ، میں ان کے دل کی حالت جانتا ہوں - ان لوگوں نے یہ اعمال میرے لیے نہیں کیے ہیں ، بلکہ اس میں کوئی دوسرا شریک تھا - اس کے بعد تمام ملائکہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں -

"ریا" کے متعلق اور بھی بہت سی روایات اور احادیث ہیں -

ایک شخص کی گردن جھکی ہوئی تھی ، اور وہ اپنے کو پارسا کہتا تھا - حضرت عمر رضی اللہ عنہ ، نے فرمایا کہ اپنی گردن سیدھی کر ! خضوع وخشوع دل سے ہوتا ہے نہ کہ گردن سے -

ابو تمامہ نے ایک شخص کو مسجد میں روتے دیکھا ، تو فرمایا اگر گھر میں روتا تو زیادہ ثواب ملتا -

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ ریاکار کی تین نشانیاں ہیں - پہلا یہ کہ جب وہ تنہا ہو تو سُست سا رہتا ہے -

دوسرا یہ کہ لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے -

تیسرا یہ کہ جب تعریف سُنے تو زیادہ عبادت کرے ، اور مذمت سُنے تو کم -

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دُرہ مارا اور کہا کہ اپنا بدلہ لے لے - اس نے کہا کہ میں نے خُدا اور آپ کی راہ میں معاف کیا - فرمایا یہ بخشش بیکار ہے - یا تو میرے لیے بخش تاکہ میں اپنا حق پہچان سکوں ، یا پھر خدا کی راہ میں ہی بخش ! یہ شرکت بُری ہے - تو اُس نے عرض کی کہ میں نے بلا شرکت خدا کی راہ بخش دیا -

حضرت فضیل علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ ایک وہ وقت بھی تھا کہ ہر آدمی کا ہر عمل "ریا" پر مبنی ہوتا تھا اور اب نہ کرنے میں بھی ریاکاری ہے -

حضرت قتادہ علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ ریاکار آدمی جب ریا کرتا ہے تو خداوند عالم فرماتا ہے کہ دیکھو ! یہ میرا بندہ مجھ ہی سے مذاق کر رہا ہے

ظاہری اعمال دُنیا

وہ کام جن میں ریاکاری کی جاسکتی ہے

اپنی نیکی کو لوگوں پر جتانے کو ریاکاری کہتے ہیں، جو چیزیں عزت والی ہوتی ہیں۔ وہ دُوسروں پر ظاہر کر کے اپنی شان و شوکت آدمی دکھاتا ہے، اس کی پانچ قسمیں ہیں

پہلی ۔ یہ ظاہری بدن سے متعلق ہے۔ مثلاً اپنے چہرے کو عابدوں جیسا یا شب بیداروں جیسا زرد بنالے، اور غمگین و رنجیدہ رہے تاکہ لوگ سمجھ لیں، کہ اس کو عبادت سے فرصت ہی نہیں۔ باتیں آہستہ آہستہ کر کے رُک رُک کر بولے۔ ہونٹ خشک رکھے تاکہ دوسروں کو اس کے روزہ دار ہونے کا خیال ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ روزہ رکھنے والوں کو بالوں میں کنگھی کرنا چاہیے اور اپنے ہونٹوں کو تیل سے تر کرے۔ آنکھوں میں سرمہ لگائے تاکہ لوگ اس کے روزے سے واقف نہ ہوں۔

دوسری کپڑوں کے ذریعہ ریاکاری اور ظاہر داری جتائی جاتی ہے۔ مثلاً موٹے قسم کے کپڑے پہنے یا پھٹے پُرانے اور نیلے قسم کی گُدڑی پہنے۔ جانماز بغل میں دبی ہو تاکہ لوگ طہارت میں اس کی احتیاط کے قائل ہو جائیں۔ چاہے اس میں دراصل صوفیوں والی ایک بھی صفت نہ ہو، اور یا دوسرے قسم کا ظاہر دار ہو جیسے بہترین ریشمی کپڑے صوفیوں جیسے زیب تن ہوں اور اعلیٰ قسم کی چادر کاندھے پر پڑی ہو تاکہ لوگ اس کو عالم جید سمجھیں۔

لباس کے لحاظ سے دو قسم کے ظاہر دار لوگ ہوتے ہیں۔

ایک وہ لوگ جو عوام میں اپنے کو مقبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پھٹے پُرانے کپڑے پہنتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو عوام اور خواص یعنی بادشاہ امراء و رؤسا سب میں مقبولیت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے اچھے لبادے پہنتے ہیں۔ قبائیں اور چغائیں زیب تن ہوتی ہیں تاکہ بڑے لوگوں کی نظروں سے گرنے نہ پائیں۔ وہ لوگ باریک پھولدار بیل بوٹے والے کپڑے پہننے کی فکر میں رہتے ہیں۔ بعض صالحین اور زہاد کے سے کپڑے پہنتے ہیں تاکہ لوگ ان کو دیکھ کر مرعوب ہوں۔ اگر اُن کو دوسرے قسم کا لباس پہننا چاہو، تو وہ سخت ناگوار کرتے ہیں۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ وہ اس قسم کا لباس پہننے کو ہرگز تیار نہ ہوں گے کہ جس سے اُن کے زہد پر کوئی بٹہ لگ جائے، لیکن وہ لوگ اپنے گھر میں ہر قسم کا لباس پہن لیتے ہیں، لیکن وہ اس فعل پر یہ نہیں سمجھتے کہ وہ مخلوق اور دنیا کی پرستش میں مشغول ہیں، اور اگر جانتے ہیں تو ان کو خدا کا خوف نہیں۔

تیسری ظاہر داری یہ ہے کہ باتوں میں اپنے کو باکمال ظاہر کرے، اور ہر وقت ہونٹ ہلتے رہیں۔ لوگ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ہر وقت ذکرِ الٰہی میں محو رہتا ہے۔ صوفیوں کی باتیں سیکھ کر لوگوں کے سامنے ویسے ہی عمل کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اس کو ایک پہنچا ہوا صوفی سمجھیں۔ مجمع کے سامنے گردن جھکا لیتا ہے تاکہ لوگ اس کو وجدانی کیفیات میں مشغول سمجھیں [illegible] اللہ، توبہ توبہ کرتا ہے، تاکہ لوگ بہت بڑا

عابد اور عالم خیال کریں اور تجربہ کار تصور کریں۔

چوتھی ریاکاری یہ ہے کہ نماز پڑھتے میں اگر کسی کو آتا دیکھے تو بڑے قرأت اور شد و مد کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دے۔ رکوع و سجود میں دیر لگائے۔ یا صدقہ کھلم کھلا دے۔ تنہائی میں جلدی جلدی چلے، اور سب کے سامنے آہستہ آہستہ۔

پانچواں گناہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے سے لڑے، تو اس پر ظاہر کرے کہ میرے پاس ایسے ایسے مُرشد آتے ہیں، فلاں فلاں رئیس شہر میرے مُرید ہیں۔ میں نے بڑے بڑے مُریدوں کے آگے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ میں نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے۔ اسی طرح کھانے پینے میں بھی ریاکاری سے کام لے۔

ایک راہب نے صرف لوگوں کی تعریف کی وجہ سے اپنی غذا گھٹاتے گھٹاتے ایک چنے کی مقدار کے برابر کر لی تھی۔ یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ لیکن اگر عبادات کے علاوہ صرف شان و شوکت ظاہری کے لیے مثلاً اچھے کپڑے پہنے تو ناجائز نہ ہوگا۔ بلکہ سنّت ہے۔ کیونکہ یہ عمل اظہارِ محبت و اخوت پر مبنی ہے۔ اسی طرح علاوہ علم دین کے دوسرے علوم کے متعلق اپنے کو مشہور کرنا مباح ہے۔

اس قسم کی ریا میں اگر آدمی حد سے زیادہ بھی بڑھ جائے تو بھی روا ہوگا۔

ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم باہر تشریف لے جا رہے تھے، تو آپ نے پانی کے سائے میں اپنا عمامۂ مُبارک اور ریش اقدس دُرست فرمائی۔ حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ جب آدمی کسی دوست سے ملنے جائے تو چاہیے کہ آراستہ ہو کر جائے۔

خداوند عالم کی طرف سے سرکار رسالتؐ کو رکھ رکھاؤ اور اقتدار کے لیے حکم دیا گیا تھا، تاکہ لوگ اقتدار کر سکیں۔ لہٰذا اگر کوئی دوسرا مسلمان صرف تجمّل ظاہری کے لیے یہ اعمال کرے تو سنّت ہوگا۔ اس لیے کہ اگر خراب لباس پہنے ہوگے تو تمھارے ملنے والے تمھاری مروّت نہ کریں گے اور غیبت کریں گے۔

لیکن اگر ریاکاری عبادت الٰہی میں کی جائے، تو دو وجہ سے حرام ہوتی ہے۔

پہلے یہ کہ وہ پیر یا مُرشد اپنے مریدین کے ساتھ دغا اور فریب کرتا ہے اور اپنے کو مخلص ظاہر کرتا ہے، حالانکہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ عبادات صرف خدا کے لیے کی جاتی۔ اس میں ریاکاری کرنا خداوند عالم کے ساتھ مذاق کے مترادف ہوگا۔ اور اپنے مُریدین اور چھوٹے آدمیوں کو دھوکہ دے کر اپنی طرف متوجہ کیا، جب کہ وہ خدا کی طرف ہونا چاہتے تھے۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی بادشاہ کے سامنے اس کی کسی خواص کو عشق کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔ گویا کہ یہ بادشاہ کے ساتھ مذاق ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ کی خدمت سے زیادہ

اس کو اُس خواص کا دیکھنا تھا - اسی طرح ریاکار آدمی صرف اپنی ریاکاری کی وجہ سے عبادت کرتا ہے اور خدا کا (معاذ اللہ) مذاق اُڑاتا ہے - اور شرک ہے، اس لیے کہ اس نے ہر عبادت میں اپنی شان و شوکت کا اظہار شریک کرلیا - وہ سجدہ کر رہا ہے اور خداوند عالم کی عبادت میں اپنی مقبولیت کا خواہاں ہے - لہٰذا یہ چیز ریا ہے اور شرک ہے -

ریاکاری کے درجات

ریاکاری کے مختلف درجات ہیں جو تین اصول پر مبنی ہیں -

پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی بالقصد یا بلاقصد ریاکاری کرے - مثلاً روزہ اور نماز صرف لوگوں کی وجہ سے کرے، ورنہ نہ کرتا -

ظاہری عبادت کے لیے مصنّف کتاب کی ذاتی رائے

یہ سب سے بدترین درجہ ہے، اور اگر اس کے دل میں ثواب کا خیال بھی ہے لیکن اگر تنہا ہوتا تو یہ عبادت نہ کرتا تو بھی اسی کا ہم پلّہ ہے اور خداوند عالم کے نزدیک یہ گناہ معافی کے لائق نہیں ہوتا - اسی کے ماتحت تیسری بات اور یہ ہے کہ اس کے دل میں ثواب کا ارادہ بھی ہے، اور اگر تنہا ہوتا تو بھی عبادت کرتا، لیکن دوسروں کی وجہ سے نماز میں ذرا زیادہ خضوع و خشوع ہوگیا — تو ہمارے خیال میں اس کا ثواب ملتا ہے، اور عبادت بھی ضائع نہ ہوگی - لیکن آدمی کو اس کی ریاکاری کے بقدر سزا ضرور ملے گی، اور اگر ریا اور عبادت کا خیال مساوی ہے تو شرک کے درجے پر پہنچ جاتا ہے - جس کی معافی ناممکن ہے -

دوسرا درجہ ریاکاری یہ ہے کہ اصول عبادت میں ریاکاری کی جائے - مثلاً عبادت میں - اس کے تین الگ الگ درجے ہیں -

ریا کے مدارج

۱ - آدمی اصل ایمان میں ریاکاری کرے - ایسا آدمی منافق ہے، اور اس کی معافی ناممکن ہے - وہ کافروں کی مثل ہیں، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے -

۲ - آدمی اصل عبادت میں ریاکاری کرتا ہے - مثلاً لوگوں کو دیکھ کر بغیر وضو ہی نماز پڑھنا شروع کرے - اور اگر تنہا ہوتا تو ہرگز نہ پڑھتا - یہ بھی بڑا زبردست گناہ ہے، مگر پہلے درجے سے ذرا سا فرق ہو جاتا ہے -

۳ - سنّت میں ریاکاری کرنے والا، مثلاً روزہ، نماز، صدقہ، حج، زکوٰۃ اور سُنّتیں ادا کرے، اور یہ سب صرف لوگوں کے دکھانے کے لیے ہو، تاکہ لوگ اس کو بُرا نہ کہیں - یا یہ خیال ہو کہ لوگ ان وجوہات کی بنا پر اس کی تعریف کریں گے - اسی طرح اگر آدمی سُنّت احکام کے لیے کہہ دے کہ یہ سب باتیں ثواب اور عذاب سے تعلق نہیں رکھتیں - اور میں ثواب کا طالب ہی نہیں، اور پھر دل میں سوچے کہ میرے اوپر ان باتوں

کا عذاب بھی نہ ہو۔

یہ بات قطعی غلط ہے، اس لیے کہ ہر عبادت خدا کے لیے ہے، اس میں مخلوق سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر کوئی تعلق کرے گا تو بمنزلہ شرک ہوگا۔ البتہ فرض کے مقابلے میں نہ ہوگا۔ لیکن جو سنتیں فرض کی برابر ہیں، ان میں ظاہر داری سے کام لیتا۔ اس کی منزلت رکھتا ہے۔ مثلاً تنہائی کی بجائے جماعت میں نماز پڑھنا چاہیے رکوع وسجود طولانی کر دے۔ روزہ، نماز سب کے سامنے کرے۔ صدقہ لوگوں کو دکھا کر دے۔ حج اور زکوٰۃ بھی ظاہری وجوہ کی بنا پر کرے۔ تو یہ سب منافقت کی دلیل ہیں۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ ظاہر دار آدمی کا دلی مقصد اس کام سے کیا ہے؟ اور وہ دراصل کیا چاہتا ہے اس کے بھی تین مراتب ہیں۔

پہلا یہ کہ آدمی اپنے کو متقی ظاہر کرے کسی مسجد یا وقف کا متولی ہونا چاہے۔ یا کوئی انجمن قائم کر کے اس کی صدارت سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یا قوم کا مال اس ریاکاری کے ذریعہ کھانا چاہے۔ یا کسی عورت کو اپنے اتقا کے جال میں پھانس کر اس سے زناکاری کی خواہش ہو۔ یا صدقہ صرف اس لیے دے کہ لوگ اس کو پارسا سمجھنے لگیں۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کی غرض وغایت مباح کاموں کے لیے ہو۔ مثلاً وعظ اور تقریر میں آدمی کچھ لینا چاہتا ہو۔ یا کسی عورت سے نکاح کی خواہش ہو۔ ایسا آدمی بھی عذاب سے تو محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن دوسرے ریاکاروں کی نسبت اس درجہ سخت نہ ہوگا۔ اس لیے کہ عبادت صرف خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے، اور اس کو اپنے مقاصد کے لیے کیا گیا تو یہ خباثت ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کی ذاتی اغراض وابستہ نہ ہوں، بلکہ ظاہر داری جتانا ضرور ہو۔ مثلاً آہستہ آہستہ چلنا، سر جھکا کر چلنا، تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ شخص راستے میں بھی خدا کی یاد میں مستغرق رہتا ہے۔ سرد آہیں بھرتا ہو۔ ہنسی آئے تو اس کو روکے اور یہ تمام عمل تنہائی میں نہ کرنا۔ یا مثلاً غیبت دوسرے لوگ کر رہے ہیں، تو اپنے کو صرف ظاہری طور پر اس سے بچائے۔ یا عاشورے کے دن پیاسا رہے، صرف اس لیے کہ لوگ اس کو پرہیزگار سمجھیں۔ یا اگر روزہ نہ ہونے کی حالت میں کسی کے پیش کردہ کھانے کو منع کر دے۔

ایسا ریاکار دو افعالِ بد کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک نفاق وہ یہ کہ لوگوں پر خواہ مخواہ ظاہر کیا، کہ میں روزہ دار ہوں، یا دوسرے دل پر جتانا نہیں چاہتا کہ میں روزہ دار ہوں۔ ایسی صورت میں کہ وہ جتانا نہیں چاہتا۔ تو اصل

حقیقت کو چھپانے کے لیے طرح طرح کے بہانے گھڑتا ہے۔ مثلاً میں نے بیماری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا وہ آدمی اپنی عبادات کو ضائع کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ظاہرداری آدمی کو ضرور سمجھ لینا چاہیے۔

بعض ظاہرداری تو قطعی نامعلوم سی ہوتی ہے۔ جس کو معلوم کرنا ناممکن ہوتا ہے، تو بھلا عوام اس کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔

پوشیدہ ریاکاریاں

بعض ریاکاریاں بالکل ظاہر ہوتی ہیں، جیسے لوگوں سے آدمی نماز پڑھے اور تنہائی میں نہ پڑھے۔

لیکن نامعلوم ریاکاری یہ ہے کہ مثلاً ——— نماز تہجد پڑھتا ہے، لیکن لوگوں کے سامنے انتہائی خضوع و خشوع سے ادا کرے۔ اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی ریاکاری یہ ہے کہ دوسروں کی وجہ سے نہ تو خوشی کا اظہار دوسروں پر کرے اور نہ آسانی ہی ہو، بلکہ حسب معمول نماز ادا کرے۔ لیکن جب کہ آدمی اپنے نفس کا جائزہ لے تو سوچے کہ میں اتنا نیک بندہ ہوں کہ نمازیں ادا کرتا ہوں، اور نیک کام کرتا ہوں، یہ وہ ریاکاری ہے جیسے لوہے میں آگ پنہاں ہوتی ہے۔ جب لوگوں سے باتیں کرے تو ظاہر میں تو یہ سب کچھ ظاہر نہ کرے مگر اپنی باطنی خواہشات میں خوش ہو، کہ میں ان صفات کا حامل ہوں، اور اُن صفات کو پوشیدہ طور سے لوگوں پر ظاہر کرنے کے جذبات پیدا ہونے لگیں کہ میں کسی طرح زبان سے نہ کہوں، بلکہ ان لوگوں پر خود بخود ہی میرے اتقا کی دھاک بیٹھ جائے۔ یا کوئی آدمی اس کی عزت نہ کرے۔ تو اس وقت وہ سوچنے لگے کہ اگر میں یہ سب نیکیاں ظاہراً طور پر کرتا تو ضرور میری بھی تعظیم کی جاتی اور وہ اس قسم کے معاملات میں اپنے نفس سے جھگڑتا ہے۔ لہٰذا یہ سب باتیں ریا میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ عبادت انتہائی خلوص میں ہونا چاہیے۔ اس میں نہ کسی سے بدلے کا طالب ہو اور نہ اپنی عزت و جاہ کا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن خداوند عالم قاریوں سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ لوگ تمہاری خدمات کرتے رہے اور ہر کام میں تمہارے خدمت گذار ہے۔ تم کو دیکھ کر تمام لوگ پہلے سلام کرتے تھے، لیکن تم لوگوں نے خلوص کو برطرف رکھ دیا۔ اور میرے احکامات کی مخالفت پر جمے رہے۔

ایک آدمی عبادت میں مشغول تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہم دُنیا کے فتنے سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اور خوف ہے کہ عبادت میں خرابی پیدا نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ ہم جب لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں تو اُن سے عزت کرانا چاہتے ہیں۔

اسی وجہ سے مخلص لوگ دُنیا سے دُور رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنی عبادات کو بھی پوشیدہ رکھتے تھے، جس طرح لوگ اپنے گناہوں کو چھپاتے ہیں، وہ لوگ جانتے تھے کہ عبادت کے علاوہ دُنیا کا کوئی عمل

قیامت کے دن قبول نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ پوشیدہ ترین ظاہر داری بھی شرک کی برابری کرتی ہے اور وہ اس کا سبب ہے کہ خداوند عالم پر وہ شخص ایمان کلّی نہیں رکھتا۔

توجیہات | عبادت کے متعلق لوگوں کو معلوم ہوجانے پر خوش ہونا ہی ریاکاری کے مترادف ہے عبادت میں چار قسم کی خوشی جائز قرار دی گئی ہے۔

پہلے وہ بہر ور کہ اس نے اپنی عبادات کو پوشیدہ رکھنا چاہا، لیکن خداوند عالم نے لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ اور اس کے گناہ چھپے رہے۔ اور یہ خداوند عالم کے رحم و کرم کا باعث ہو۔ لہٰذا آدمی خداوند عالم کے فضل و کرم سے خوش ہو۔ لوگوں پر ظاہر ہونے کے تصورات سے نہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہہ دو، کہ وہ خدا کے فضل سے خوش ہوں۔

دوسرے وہ خوشی کہ آدمی یہ سوچے کہ آج جس طرح خدا نے میرے گناہ چھپائے اسی طرح بروز قیامت بھی گناہ معاف کر دے گا، اور فضل و کرم کرے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ خداوند عالم کا رحم و کرم تیرے گناہوں سے کہیں زیادہ ہے کہ تو اس دنیا میں چھپائے۔

تیسرے یہ کہ لوگوں کو اپنی اقتدا کرتے دیکھ کر خوش ہو کر نیک کاموں میں ان لوگوں کا محد ہوا۔ لہٰذا وہ آدمی بڑے ثواب کا حق دار ہے کہ لوگوں کو عبادت کی طرف رجوع کیا۔ حالانکہ وہ خود ظاہر داری کرنا چاہتا تھا۔

چوتھی خوشی یہ ہونا چاہیے کہ جب آدمی اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرے اور نیک اعتقاد بن جائے اس کی تعریف کرکے خدا کی عبادات کا مطیع بن جائے، تو وہ شخص خدا کی عبادت کرنے سے خوش ہو، نہ کہ اپنی تعریف پر، اور اسی طرح وہ خود بھی دوسروں کی عبادات پر خوش ہو۔

عبادات کو باطل کر دینے والی ریاکاری

ریا کے خطرات عبادت سے پہلے، درمیان اور بعد تینوں مواقع پر ہو سکتے ہیں۔

پہلے یہ کہ نیت کے وقت بھی اخلاص ضروری ہے۔ مثلاً اوّل وقت نماز پڑھنے کا قصد نہ ہو، لیکن دوسرے لوگوں کی وجہ سے جلدی کرے، تو اوّل وقت کا ثواب نہ ملے گا۔ لیکن نماز کی نیت بہر حال اس کی تھی۔ لہٰذا ثواب اس کو ضرور ملے گا۔ مثلاً اگر کوئی آدمی غصب شدہ زمین پر نماز پڑھے تو نماز ادا ہو جائے گی، لیکن گناہ الگ سے ہوگا۔ وہ آدمی اصل نماز میں گنہگار نہیں ہوا۔ لہٰذا وہ نفس نماز میں ریاکار نہیں ہوا، اور وقت میں ریاکاری ہوگی۔ اور اگر نماز کے اختتام کے بعد ریا کا خیال ہو تو نماز ضائع نہ ہوگی، لیکن اس خیال سے ضرور گناہ ہوگا۔

حضرت ابن مسعود کے سامنے ایک آدمی نے کہا کہ کل رات میں نے سورۂ بقر کی تلاوت کی تھی، تو فرمایا کہ صرف اتنا ہی

ثواب اس کو ملتا تھا جتنا اس نے زبان سے کہہ دیا۔

ایک آدمی نے سرکار رسالتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں روزہ رکھتا ہوں، فرمایا کہ تو نہ روزہ داروں کی صف میں ہے نہ روزہ خوروں کی۔ بس اتنا ہی ثواب تجھ کو مل گیا۔

مصنف کتاب کی ذاتی رائے مگر ہمارے خیال میں یہ دونوں احکامات اس لیے تھے کہ نفس عبادت تو باقی رہی، لیکن اس کے ظاہر کرنے کی وجہ سے ریاکاری کا گناہ الگ رہا۔

بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ معنی نکالے ہیں کہ اگر ریا کا خیال درمیان میں آجائے تو متواتر روزے رکھنا منع ہیں۔ اسی طرح اگر نماز میں ریاکاری اصل نیت پر مغلوب ہو جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آجائے، یا خوش کرنے والا خیال درمیان نماز میں پیدا ہو جائے اور وہ لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے نماز نہ توڑ سکے، تو نماز باطل ہو جائے گی۔ کیونکہ عبادت کی نیت ختم ہو گئی، لیکن اگر اصل نیت برقرار ہے اور نماز اختتام تک پہنچ جائے، تو ہمارے خیال میں نماز درست ہے۔ لیکن وہ ریا اس کے لیے عذاب کا باعث ضرور ہوگی۔ لیکن اگر وہ نماز میں یہ سوچ رہا ہے کہ مسجد کے موجودہ دیکھنے والے لوگ مجھے نماز پڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ اس بات سے خوش ہوتا، تو نماز کے بطلان اور جائز ہونے میں اختلافات ہیں۔

محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کا مسئلہ محاسبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے پہلے کچھ شک تھا لیکن اب یقین ہے کہ اس طرح نماز باطل ہو جائے گی، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی یہ استدلال پیش کرے، کہ

میں نے ایک بار آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ میں اپنے اعمال کو بطور خود پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں، لیکن اگر وہ ظاہر ہو جاتے ہیں تو خوش ہوتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تجھ کو دو ثواب ملیں گے، ایک پوشیدہ کا اور ایک ظاہری کا۔

اس حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث مستند نہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ سرکار رسالت نے اس سے بعد عبادت خوش ہونا مراد لیا ہے۔ یا خداوند عالم کا وہ رحم و کرم مراد ہو جو لوگوں کو عبادت کی طرف متوجہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے

مصنف کتاب کا خیال یہ محاسبی علیہ الرحمۃ کا خیال ہے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ نیت کرنے کے بعد عبادت کا ثواب برقرار رہتا ہے اور نماز ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کے بطلان کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ریاکاری سے دل کا تعلق

ریاکاری دل پر جو اثرات مترتب کرتی ہے، وہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کا وظیفہ بہت ضروری ہے اس لیے کہ جو بات دل میں ایک بار بیٹھ جائے گی، وہ مشکل سے رفع ہوگی۔

دراصل اس قسم کی ریاکاریاں بچپن سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب بچّہ لوگوں کو ظاہری برتاؤ کرتے دیکھتا ہے اور جیسے عمل اپنے بزرگوں سے سیکھتا ہے، ویسے ہی خود کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہی عادات اس کی فطرت بن جاتے ہیں، اور عقل کے کمال کے وقت تمام عادات فطرت بن کر کام کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کا دفعیہ ضروری ہے۔

اوّل اس کی بنیاد کو درست کیا جائے، تاکہ باطنی طور سے یہ چیز ختم ہو جائے۔ وہ اس طرح کہ آدمی سوچ لے کہ ریاکاری اتنا بڑا گناہ ہے کہ خداوند عالم کا مقہور ہوتا ہے، اور آخرت میں عذاب کا مستحق۔ یہ جذبہ جب دل میں راسخ ہوگا تو ریاکاری کی فطرت رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے جاتی رہے گی۔

ریاکاری کی بنیاد صرف امارت اور ریاضت سے پڑتی ہے۔ اور اس کے بعد اس میں تین قسم کی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

تعریف اور صفات کی محبت۔ دوسرے لوگوں کی مذمت کا خطرہ۔ تیسرے حرص وطمع کے جذبات۔

ایک بار ایک شخص نے سرکار رسالت سے دریافت کیا کہ وہ آدمی جو صرف خلوص سے جہاد کرے، اور ایک وہ شخص جو لوگوں کو اپنی بہادری اور وجاہت کو جتانے کے لیے سرکارؐ نے فرمایا کہ خلوص کا جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور ظاہری جہاد میں صرف نیت کا ثواب ملتا ہے۔

لہٰذا یہی تین باتیں اس کی بنیاد قرار پاتی ہیں۔ تعریف اور صفت کو اس لیے چھوڑنا ضروری ہے کہ اس کے سب اعمال ظاہری ہیں۔ اور وہ اپنی عبادات کو بندوں کی تعریف و توصیف کے عوض فروخت کر رہا ہے۔ اور خداوند عالم کی قربت کو اچھا نہ سمجھا۔ اس شخص سے زیادہ بھلا کون ذلیل آدمی ہوگا۔ یہ صفت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ تعریف کا جذبہ بھی شامل ہے۔ وہ خواہش اس طرح دُور ہوتی ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ خداوند عالم کی تعریف کے بدلے اپنی تعریف کرانا چاہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا میں شرک کے خواہاں ہیں۔ اور اگر وہ نیکیوں اور عبادات کا پلّہ بھاری کر لے، تو اپنی تعریف کا خیال بھی نہ ہوگا۔ اور وہ انبیاء علیہم السّلام کی رحمتوں میں ساتھی رہے گا۔ ورنہ شیطان کا شریک ہوگا، لیکن مخلوق کی رضا حاصل نہ ہو سکے گی۔ وہ اس لیے کہ اگر کوئی خوش کرے گا، دوسرا بہرحال ناراض ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایسا آدمی نہ دُنیا کا رہا اور نہ دین کا۔

نسلی طور پر "ریاکاری" کا دفعیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آدمی اپنی عبادات اور اطاعات کو اس طرح پوشیدہ رکھے، جس طرح گناہوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ قناعت اور صبر کا عادی ہو جائے۔ خداوند عالم کے احکامات کی پیروی کرے۔ حالانکہ اوائلِ عمری میں یہ کام بہت مشکل ہے، لیکن کوشش شرط ہے۔ اور آخر میں اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر دُنیا اس کی طرف مائل ہو تو وہ تمام خواہشات [illegible]

ہر چیز سے غافل سا ہو جاتا ہے۔

دوسرا مرتبہ تسکین ہے یعنی جب ریاکاری کا جذبہ عود کرے، اپنے نفس سے جنگ کرے۔ تعریف اور مال دونوں سے بے نیاز ہو جائے۔ پھر بھی شیطان اس کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی وجہ سے مختلف قسم کے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً پہلا خیال یہ آتا ہے کہ میری عبادات طشت از بام ہو جائیں گی۔ یا طشت از بام ہونے کی اُمید نہ پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا تصور یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری عبادت کی وجہ سے لوگوں کو میری طرف توجہ بڑھ جائے گی۔ تیسرا خیال یہ ہوگا کہ مخلوق کی دلچسپیاں اور اس سے رغبت کرنے کو وہ خود بھی معلوم کرے۔

لہٰذا سب سے پہلا خیال ہی (کہ میری عبادت لوگوں میں ظاہر ہوں) کو دُور کرے۔ اس لیے کہ جب خداوندِ عالم ہر چیز کا عالم ہے، تو میں کسی بات کو دنیا والوں پر ظاہر کر کے کیا کروں گا؟ میرے تمام کاموں کا انحصار خدا پر ہے مخلوق سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا جاننا میرے لیے کافی دوائی ہے۔

اسی طرح دوسرا خیال جب پیدا ہو، تو جو کچھ پہلے خیال میں سوچا تھا، وہی سوچ لے۔

تیسرے یہ کہ اس "ریا" کو دُور کر دے۔ اور اگر یہ جذبہ اتنا اثر کر چکا ہے۔ تو اس کو رفتہ رفتہ کم کر دے۔ لیکن اگر اس اصل جذبے کو کم نہ کر سکے گا تو شیطان کا دوست ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی بردبار ہو اور اس جذبے پر قابو پالے۔ لیکن جب کوئی موقع آئے، تو غصہ آنے لگے اور اس کی برائی کو فراموش کر دے۔ یا خدا کی معرفت ہو۔ اور ریا کی برائیاں بھی سمجھتا ہو، لیکن جب موقع آئے، ریاکاری پر اُتر آئے۔ اور امکانات یہ بھی ہیں کہ ریا سے کراہت پیدا ہو، لیکن وہ کراہت بدرجہ اتم نہ ہو، اور لوگوں کی رغبت کو دل سے نہ نکال سکے۔

بہت سے عالم بھی ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سب ریاکاری کر رہے ہیں اور توبہ نہیں کرتے۔ لہٰذا ریا کے جذبات کو دُور کرنا کراہیت پر موقوف ہوتا ہے۔ اور قوتِ کراہت خداوندِ عالم کی معرفت کی مقدار سے مطابقت کرتی ہے اور معرفتِ خدا ایمان کے متناسب ہے۔ اور ایمان امداد ملائکہ اور پیغمبران اولوالعزم کی طرف سے ہوتی ہے۔ اسی طرح خواہشاتِ دُنیا کی امداد شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ انسان کا دل دونوں کے بیچوں بیچ ہے۔ لہٰذا جس کی مناسبت زیادہ ہوگی، اس کی طرف زیادہ رجوع ہوگا۔ یہ رجوع آدمی کی طبیعت میں پہلے سے ہوتا ہے۔ اگر آدمی نیک ہے تو وہ اپنے کو نماز کے لائق بنا لیتا ہے اور اخلاقی کیفیات اس پر غالب آجاتی ہیں۔ اسی طرح اگر طبیعت میں ریاکاری زیادہ ہے تو شیطانی وسوسے جگہ پکڑ لیتے ہیں۔ لہٰذا اس کے مقدر میں قسامِ ازل نے جو لکھ دیا ہے وہ آخر وقت تک ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے

دلائل | اگر ریاکاری کے خلاف برابر آدمی جہاد کرتا رہا ہے، اور اس کے بعد بھی کوئی چنگاری باقی رہ گئی ہے

تو انسان اس میں ماخوذ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت میں ہوتا ہے۔ اور فطرت انسان خود نہیں بدل سکتا۔ صرف اتنا حکم ہے کہ اس کو مغلوب کرنے کی کوشش میں مصروف رہو۔ اگر یہ کوشش جاری رہی تو آدمی بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم کو بہت سے وسوسے پریشان کرتے ہیں، وہ اتنے سخت ہیں کہ اگر ہم کو آسمان سے زمین پر گرا دیا جائے تو اتنی تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن ہم اُن شبہات کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ ہی کافی ہے۔ اور تمہاری کراہت ہی اس گناہ کا کفّارہ ہے۔ اور جب خداوند عالم کے لیے ان وسوسوں کا کفّارہ کراہت کے ذریعہ دُور کر دیا، تو انسان پاک ہو گیا۔ بعض اوقات شیطان اُن لوگوں سے حسد کرنے لگتا ہے، اور وہ آدمی اس حسد کی وجہ سے مناجات کے درجات کو بھول جاتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسی جگہ اکتفا کر کے اس کو جھٹلا دے۔ اور خدا سے دعا میں مشغول ہو جائے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کی تکذیب اور دفعیہ کی کوشش نہ کرے۔ اس لیے کہ اس میں بھی وقت ضائع ہوتا ہے۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ اپنے میں اخلاص زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور وسوسوں کی طرف قطعی توجہ نہ کرے۔ آخری اور سب سے بلند مرتبہ یہ ہی ہے۔ کیونکہ شیطان اس موقع پر کمند چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس شخص کی مثال ان چار آدمیوں کی سی ہے، جو علم کے حصول کے لیے کہیں جائیں، اور کوئی حاسد اُن سے منع کرے کہ وہاں نہ جاؤ۔ تو ان میں ایک آدمی تو اس سے لڑنے کو آمادہ ہو جائے، اور اس طرح اپنا وقت خراب کرے، اور دوسرا آدمی صرف باتوں سے اس کو ٹال دے۔ تیسرا اس کی باتیں سُنے، لیکن اپنے سفر کو جاری رکھے۔ اس کی طرف کوئی اعتنا نہ کرے۔ چوتھا وہ آدمی کہ جو اس کی طرف آنکھ پھیر کر بھی نہ دیکھے اور پہلے کی طرح اطمینان سے چلتا جائے۔

ایسی صورت میں حاسدوں نے پہلے دو آدمیوں سے تو کچھ نہ کچھ حاصل کیا، لیکن تیسرے نے اس کو کچھ نہ دیا اور چوتھے کی وجہ سے اس کو سخت صدمہ اور دھکّا لگا۔ بہتر یہ ہی ہے کہ شیطان کی باتوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہو۔

اطاعت وعبادت کا اظہار

جس طرح اطاعت کے پوشیدہ رکھنے میں آدمی ریاکاری سے بچتا ہے، اس طرح اس کے ظاہر کرنے میں بھی فوائد ہیں۔ مثلاً لوگ اس کو دیکھ کر عبادت میں مشغول ہوں گے۔ اور اسی لیے خداوند عالم دونوں کی

تعریف فرما رہا ہے۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (یعنی اگر صدقہ ظاہری طور پر دیا جائے تو بہتر ہے، اور اگر چھپا کر دیا جائے، تو اور بھی زیادہ اچھا ہے)۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ روپیہ ایک شخص سے مانگا، وہ ایک تھیلی لایا۔ دوسرے صحابہ اور انصار بھی روپیہ لاکر پیش کرنے لگے۔ تو فرمایا کہ اس شخص کو اپنا بھی ثواب ملا اور ہر آدمی کے ثواب میں سے اس کو حصہ پہنچا۔ کہ اس نے ان سب کو اس کام کی طرف توجہ دلائی۔ اسی طرح جو آدمی حج کو جائے تو لوگوں کے سامنے سامانِ حج تیار کرے، تاکہ ان کو بھی ترغیب ہو۔ اگر ایسا ہے تو ریاکاری اور ظاہر داری نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر ظاہر داری کسی خلوص پر مبنی ہے، تو اس کا بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔ آدمی اگر اپنی عبادت کو ظاہر کرنا ہی چاہے تو ایسی جگہ کرے کہ لوگ اس کے دیکھا دیکھی اور بھی نماز میں مشغول ہو جائیں تو یہ ظاہر داری بری نہ ہوگی۔ بعض لوگوں کے اہل و عیال ہی اس کی تاسی کرتے ہیں، لیکن بازاری آدمی تاسی نہیں کرتے۔

آدمی کو اپنا ضمیر بھی ٹٹولنا چاہیے کہ اس میں تو کہیں کوئی ریا کا پہلو نہیں چمک رہا۔ جو دوسروں کو ظاہر کرنے پر اُسے آمادہ کرتی ہے، اور یہ بات ہی اُس کو قعرِ مذلّت میں پھینک دے گی۔ اور اگر مضبوط ہے تو وہ ایسا ہے، جیسے کوئی آدمی دریا کی گہرائیوں میں سے خود بھی عبور کر آئے اور دوسروں کو بھی تیراکر نکال لائے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے۔ کوئی نماز ایسی نہ تھی کہ اس میں میں نے یہ سوچا ہے کہ مجھ سے خدا یہ سوال کرے گا تو اس کو میں یہ جواب دوں گا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے جو کچھ سُنا، وہ سب صحیح پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبح کو بیدار ہوتے ہی ہر کام کی نیکی اور بدی کو سمجھ لیتا ہوں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ جب سے سرکار رسالت کی بیعت کی ہے، آج تک نہ جھوٹ بولا اور نہ اپنی شرمگاہ کو داہنے ہاتھ سے مَس کیا۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، نے مرتے وقت فرمایا کہ میں نے اسلام لانے کے بعد سے آج تک کوئی گناہ نہ کیا۔ لہٰذا مجھے کیوں روتے ہو؟ خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو حادثہ مجھ پر پیش آیا میں نے صبر کیا اور سوچا کہ میری تقدیر میں یہ ہی لکھا تھا۔

ریا بعض اوقات اچھی ثابت ہوتی ہے

مسلمانو! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ خداوندِ عالم کی مصالح کو کوئی

نہیں پہنچ سکتا۔ ہر شر کی تہہ میں خیر و برکت پوشیدہ ہے۔ "ریا" میں بھی انسانوں کے لیے بہت سی نیکیاں ہیں۔ اگرچہ فی الجملہ ریاکاری باعثِ ہلاکت ہی ہوتی ہے، لیکن پھر بھی بعض ریاکاروں کے عمل دوسروں پر اچھا اثر کرتے ہیں۔

حکایت : بصرے میں ایک زمانے میں ہر آدمی تلاوتِ کلامِ پاک میں مشغول رہتا۔ ایک شخص نے "ریاکاری" پر ایک کتاب لکھی۔ لوگوں نے اس کو پڑھ کر تلاوت کرنا کم کر دی اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو اچھا ہوتا۔ (اگرچہ ریاکار خود تباہ ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کو راستے پر لگا دیتا ہے)

عیوب پوشی

گناہوں کو پوشیدہ رکھنا ہی بہتر ہے

عبادت کا ظاہر کرنا "ریا" میں شامل ہے۔ اسی طرح گناہوں کو پوشیدہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس کی سات وجوہات ہیں :۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم فسق و فجور کو چھپانے کا حکم دے رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ ہو جائے تو اس پر پردہ ڈال دو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہاں گناہ چھپے رہیں گے تو آخرت میں چھپ جانے کی امید ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سخت باتوں سے اس کو ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ اور اس کی عبادت میں فرق پڑے گا۔

چوتھی وجہ یہ کہ دل دوسروں کی ملامت سے رنجیدہ ہوگا۔ اور فطرۃً آدمی کو خوشی سے خوش ہونا اور تکلیف سے رنج ہونا لازمی ہے۔ اور مدح و مذمت دونوں کو برابر سمجھنا۔ حق شناسی کی حد ہوتی ہے۔ اور ہر آدمی اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا بوجہ اخلاص چھپانا ہی اچھا ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر لوگوں کی طرف سے تکلیف دینے کا گمان ہو تو شرعاً اس کے گناہ چھپائے جائیں۔

چھٹے اس سبب سے کہ لوگوں سے گناہوں کی اطلاع ہونے سے شرم کرے۔ اس لیے کہ شرم بڑی اچھی چیز ہے اور ریاکاری بُری۔

ساتویں یہ کہ گناہوں کے آشکارا ہونے سے دوسرے بھی گناہوں میں ملوث ہوں گے۔ لہٰذا اُن کا چھپانا ہی اچھا ہے، لیکن ریاکاری کی وجہ سے چھپانا باعثِ گناہ ہے۔

اگر کسی آدمی کا ظاہر و باطن یکساں ہے، تو یہ صدیقوں کے مراتب ہیں۔ اور صدیق ظاہر اور پوشیدہ کسی طرح بھی گناہ نہیں کرتے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کی ہر بات سے خدا واقف ہے۔ لہٰذا بندوں سے کیا ڈر؟ یہ بات انتہائی بے وقوفی کی ہے۔

بعض اوقات ریاکاری کو روکنے کے لیے نیکی ترک کی جا سکتی ہے۔

اطاعت کے تین مدارج ہیں :

پہلی : وہ اطاعت جو صرف خدا ہی سے متعلق ہو۔ مثلاً روزہ ۔ نماز ۔ حج ۔

دوسری : وہ اطاعت جو مخلوق سے متعلق ہو جیسے خلافت ، ولایت وغیرہ ۔

تیسری : یہ کہ اس کے اثرات دوسرے لوگوں پر پڑ سکیں ۔ مثلاً تقاریر کرنا ۔ وعظ کرنا ۔

پہلا درجہ ، نماز ۔ روزہ وغیرہ ریاکاری کی وجہ سے ہرگز ترک نہ کرے ۔ اور اگر ظاہرداری کا خیال درمیان عبادت میں آبھی جائے تو اس کو نکال دے ، اور عبادت کی نیت کو تازہ کرے ۔ اور اگر صرف ظاہرداری ہی پر عبادت مبنی ہے ، تو عبادت کا تصور ہی بیکار ہے ، لیکن نیت کے ختم ہونے تک عبادت ختم نہ کرے ۔

حضرت فضیل علیہ الرحمۃ کا مقولہ ہے کہ ریاکاری ، مخلوق سے ڈر کر عبادت کو ترک کر دینے کو کہتے ہیں ، اور جو لوگ صرف مخلوق کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں وہ مشرک ہیں ۔

دراصل شیطان کی یہ خواہش ہے کہ کوئی عبادت نہ کی جائے ۔ اور جب وہ اس پر پورا نہیں اُترتا تو بہکاتا ہے کہ لوگوں کے خیال میں تیری عبادت ریاکاری ہے ، اور اسی بہانے سے آدمی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے ۔ شیطان آدمی کے ساتھ ہر جگہ لگا ہے ، یہ کہیں بھی چلا جائے وہ پیچھے پیچھے جا کر ہر وقت بہکانے کی کوشش کرتا ہے ۔

لوگ بظاہر اس بات کو سمجھیں گے کہ تو زاہد ہو گیا ، بلکہ یہ زہد نہیں ہے ۔ اس میں سمجھنا چاہیے کہ عبادت میں لوگ دیکھیں نہ دیکھیں عابد کے لیے سب برابر ہے ۔ لہٰذا زاہد کو سوچنا چاہیے کہ میری عبادت اس گوشۂ تنہائی میں ہی صحیح ہے ۔ صرف تجھ کو اپنے اخلاص کی ضرورت ہے ، تجھے دوسروں سے کیا کام ؟

حضرت ابراہیم نخعی تلاوتِ کلام اللہ کے وقت جب کوئی آتا تو چھوڑ دیتے اور فرماتے کہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ جب کوئی میرے پاس آئے تو تلاوت میں مشغول دیکھے ۔ لہٰذا تلاوت کو پوشیدہ رکھنا ہی اچھا ہے ۔

دوسری عبادت وہ ہے ، جس کا تعلق مخلوق سے ہے ۔ مثلاً جیسے ولایت اور خلافت وغیرہ ۔ یہ چیزیں عبادات سے زیادہ ہیں ۔

جو آدمی اپنے ساتھ عدل نہ کر سکے ۔ اس کے لیے ان باتوں کا ماننا مشکل ہے ۔ کیونکہ روزہ ، نماز وغیرہ تو بے لذت عبادتیں ہیں ، لیکن بادشاہت اور خلافت میں جو لذت ہے ، وہ ان میں نہیں ہے ۔ اس لیے کہ اس میں نفس کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن حکومت کرنا اس کو ہی مناسب ہے ، جو اپنے پر بھروسہ رکھتا ہو اور اپنے کو آزما چکا ہو ۔ اور کسی بے انصافی کا خطرہ پیدا نہ ہو ، اور معزولی کی وجہ سے خوشامد کرنا پڑے گی ۔

اس صورت میں علماء کو اختلافات ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ حکومت قبول کر لینا چاہیے۔ یہ سب وسوسے ہیں، جو آدمی کو پریشان کرتے ہیں، اور آدمی کو اپنے پر اعتماد کرنا چاہیے۔

لیکن ہمارے نزدیک درست یہ ہے کہ قبول نہ کرے۔ اس لیے کہ جو نفس آج اِنصاف کا وعدہ کر رہا ہے، وہ کل پھر منحرف بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس سے پرہیز ہی بہتر ہے، اور حکومت کرنا سوائے اہلِ ارادت کے دوسرے کے لیے مشکل ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت رافع سے کہا کہ حکومت ہرگز قبول نہ کرو۔ چاہے وہ دو آدمیوں پر ہی کیوں نہ کی جائے۔ جب حضرت ابوبکر خود خلیفہ ہوئے تو حضرت رافع نے کہا کہ آپ مجھ سے منع کرتے تھے اور خود کیوں قبول کی؟ تو فرمایا کہ میں اب بھی تم سے منع کرتا ہوں۔ خداوند عالم کی لعنت ہو اس پر جو حکومت میں اِنصاف نہ کرے۔

یہ اعتراض ایسا ہی ہے کہ آدمی خود اپنے بیٹے کو دریا میں جانے سے منع کرے، اور خود اپنے پر بھروسہ کر کے دریا میں اُتر جائے اور اگر لڑکا بھی اُتر جائے گا، تو وہ یقیناً ڈوب جائے گا۔

بادشاہ اگر عدل و انصاف سے کام نہ لے سکے، تو اس کو ہرگز حکومت قبول نہ کرنا چاہیے، اور اگر قبول کرے گا تو خوشامد کرنے کے مترادف ہوگا، اور وہ معذرت نہ خیال کی جا سکے گی۔ ایسے وقت میں عدل و انصاف سے سختی کے ساتھ کام کرتا رہے۔ کہ اگر بادشاہ معزول بھی کر دے تو وہ بھی خدا کی خوشنودی کے ماتحت بخوشی قبول کرے۔

تیسری قسم یہ ہے، کہ آدمی لوگوں کو وعظ کرے اور فتویٰ دیتا ہو، جس میں روایات اور احادیث نیز درس و تدریس سب شامل ہیں۔ اس میں ریاکاری نماز اور روزے سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہ بادشاہت اور خلافت کے بالکل قریب ہی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وعظ اور نصائح سننے اور کہنے والے کو برابر فائدہ پہنچاتی ہیں۔ دین کی طرف بلاتی ہے، اور ریاکاری سے پرہیز کرنا سکھاتی ہے۔ حکومت میں یہ بات نہیں ہے۔ اگر واعظ ظاہر دار ہے تو اس میں علماء کے اختلافات ہیں۔ بعض علماء اس کو پسند نہیں کرتے۔

اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم سے اگر کوئی فتویٰ دریافت کرتا، تو دوسرے کے پاس بھیج دیتے۔

حضرت بشر حافی نے بہت سی احادیث کو زمین میں دفن کر دیا۔ اُن کو محدث ہونے میں اعتراض تھا۔ بعض لوگ "حدثنا" کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مجھے فاضل بنا دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے وعظ و پند کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تیری طرف سے مغرور ہونے کا خیال ہے

حضرت ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ جب بات کرنے کو جی چاہے تو خاموش رہو۔ اور اگر خاموشی کو جی چاہے تو باتیں کرو۔

مصنف کتاب کی رائے لیکن ہمارے نزدیک یہ مناسب ہے کہ محدث اور واعظ پہلے اپنے نفس کو تول لے، اگر اطاعت کی نیت میں کچھ ریا شامل ہے، تو دست بردار نہ ہونا چاہیے، پہلے اس کو اپنے ضمیر میں پوری طرح راسخ کرے۔ اس لیے کہ وعظ اور نصائح کا ثواب نوافل کے برابر ملتا ہے۔

لہٰذا اوّل اپنے نفس کو تول لے اور عمل کر کے دیکھ لے۔ صرف "ریا" کے تخیّل سے ہی وعظ اور نصائح کو ترک نہ کرے، لیکن حکومت اگر پیش کی جائے تو اس "ریا" کا شائبہ بھی ہو تو ہرگز قبول نہ کرے۔ کیونکہ ہر چیز میں باطل رُخ جلدی بنیاد کو مستحکم کر لیتا ہے، اور یہی وجہ تھی کہ

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی کے عہدے کو قبول نہ کیا، حالانکہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

مصنف کتاب رح کی رائے لیکن ہم اس طرف ہیں کہ اگر آدمی کے وعظ و پند صرف لہو و لعب کی طرف دلچسپی دلانے والے ہیں، تو بہرحال اس سے پرہیز ضروری ہے، لیکن اگر وہ حدیث اور قرآن کی تعلیم دیتا ہے اور بعض لوگ اس کی تقاریر سُن کر متاثر بھی ہوتے ہیں تو اس کو ضرور یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ اور صرف ایک آدمی کی وجہ سے سینکڑوں کی بہتری کو ختم کر دینا خلاف عقل ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ہمارے دین کی اشاعت ایسے آدمیوں سے ہوگی، جن کا حصّہ اس دین سے کچھ نہ ہوگا، وہ حدیث اس قسم کے لوگوں کے متعلق ہے

(سوال) مثلاً کوئی دریافت کرے کہ وعظ و پند میں نیّت کا حال کس طرح معلوم ہو سکتا ہے۔

جواب یہ ہو سکتا ہے کہ واعظ کی نیّت صرف لوگوں تک خداوند عالم کا راستہ بتانے کی ہو، اور اپنے ہم عصر واعظین کی تقاریر سے خوش ہونا چاہیے، لیکن اگر کوئی آدمی اُن سے حسد کرتا ہے، تو البتہ اس کی نیت خراب ہوگی اور وہ لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ اگر کوئی دنیوی حاکم درمیان وعظ میں آجائے، تو قطعاً اپنے مقاصد کو بیان کرنے میں کمی نہ کرے، اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ دے۔ یا اگر شریعت کے خلاف بات ہو، اور لوگ اس کو سُننے کے لیے تیار نہ ہوں تو بھی اس کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر اس قسم کی باتوں سے کراہت نہ ہو تو ریاکاری کی علامت یہی ہے۔

تفصیلات لوگوں کو عبادت میں مصروف دیکھ کر بعض لوگ خوش ہوتے ہیں یہ عمل نیک ہے اس لیے کہ

ہر مسلمان کو عبادت سے دلچسپی لینا اچھا ہے۔ اور اگر آدمی گھر کی مشغولیات کی بناء پر عبادت نہ کر سکے تو اس کے پاس جاکر عبادت کی ترغیب دینا بھی ثواب ہے۔ اسی طرح اگر تراویح یا نماز جماعت میں صرف دیکھا دیکھی میں جانے لگے۔ تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ کسی سستی کی وجہ سے یہ عبادت نہ کرتا ہو۔ اور اور اس کے باطن میں ریاکاری نہ ہو۔

بعض اوقات انسانی مشاغل بھی عبادات کو روک دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ کسی وجہ سے عبادت کی طرف متوجہ ہونا چاہے، تو گویا کہ اس ریاکاری کا مادّہ کم تھا، اور یہ اس مسبب کے لیے اور خود اس شخص کے لیے بھی باعثِ خیر ہے، جو اس کی وجہ سے عبادت کی طرف مائل ہوا۔

بعض اوقات لوگوں کی دیکھا دیکھی بہت سے نیک عمل سرزد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تلاوت قرآن میں لوگ روتے ہیں، تو خود بھی رونے لگتا ہے، چاہے وہ تنہائی میں نہ روتا۔ لہٰذا یہ بھی ریاکاری کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ رونا رقّتِ قلب کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اگر آدمی باآوازِ بلند روئے، تو البتہ ریا میں داخل ہو جائے گا۔ اور اگر روتے روتے حقیقۃً بے ہوش ہو جائے اور ایک ہی لمحے کے بعد ہوش آئے، لیکن معاً یہ خیال بھی پیدا ہو کہ اگر میں ابھی اٹھ جاؤں گا تو لوگ میرے اوپر مشتبہ نظریں ڈالیں گے اور اس خیال سے پڑا رہے، تو بھی ریاکاری میں شامل نہیں۔

بعض اوقات آدمی اعوذ باللہ یا توبہ توبہ خود بخود ہی کہنے لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو اس وقت اپنا گناہ یاد آگیا ہو اور اس کی وجہ سے لوگوں میں گناہوں سے توبہ کرنے کا جذبہ دیکھ کر یہ الفاظ نکلنے لگیں، تو بھی ریا نہیں ہوگی۔ اور اگر صرف لوگوں کو دکھانا ہی مدِنظر ہو تو البتہ ریاکاری ہوگی۔

دراصل ریاکاری اور ظاہر داری کی میزان خود انسان کا دل ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنا جائزہ خود لے، اور خود طے کر لے کہ وہ کس راستے پر جا رہا ہے۔

سرکارِ رسالتؐ کا ارشاد ہے کہ ریاکاری کے ستّر دروازے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو خود سوچنا چاہیے، کہ خداوند عالم اس کا ہر عمل دیکھ رہا ہے، اور اگر خلوص پیدا نہ کرے گا تو اس کے قہر سے مقہور ہوگا۔ اور فرمایا کہ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ خُشُوْعِ النِّفَاقِ (یعنی خداوند عالم ہمارے خضوع و خشوع میں ریاکاری سے پناہ میں رکھے)

یہ ورجہ نفاق ہے کہ بظاہر ہمارے اعضا عبادت میں مشغول ہوں، اور دل میں ریاکاری بھری ہو۔

توجیہہ : آدمی کو دنیا کے تمام اعمال نیک صرف من وجہ اللہ کرنا چاہئیں۔ کسی سے بدلے کی خواہش نہ کرے۔ یہاں تک کہ استاد کو اپنے شاگرد سے بھی ادب و تہذیب کی خواہش نہ کرنا اچھا ہے۔ اگر شاگرد کوئی

خدمت کرنا چاہتا ہے، اس حالت میں اگر استاد خاموش رہے، تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بعض لوگوں نے اس میں بھی احتیاط رکھی ہے۔

مثلاً کوئی استاد کنوئیں میں گرے اور اوپر سے رسّی ڈالی گئی تو انھوں نے قسم دے دی کہ جس نے مجھ سے تعلیم حاصل کی ہے، وہ اس عمل سے باز رہے!

ایک آدمی حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں اشرفیوں کی دو تھیلیاں لایا، اور عرض کی کہ میرا باپ مرگیا آپ اس کے نیک اعمال سے واقف ہیں۔ اس کی میراث سے یہ اشرفیاں ہیں۔ آپ نے قبول کرلیں، جب وہ شخص چلاگیا تو اپنے بیٹے کو پیچھے پیچھے روانہ کیا اور وہ اشرفیاں واپس بھیج دیں۔

بیٹے نے باپ سے عرض کی! کہ میں عیال دار ہوں اور تکلیف میں ہوں۔ آپ نے یہ اشرفیاں کیوں واپس کردیں؟ تو فرمایا کہ تو یہ چاہتا ہے کہ تو یہاں مزے اڑائے اور جواب مجھے دینا پڑے۔

ایک آدمی کوئی تحفہ پیش کرنے لایا، تو فرمایا کہ تیرے بھائی کو میں نے پڑھایا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کی طرف یہ ہدیہ منسوب ہوجائے۔ لہٰذا اس تحفے کو واپس لے جا۔

اس طرح طالب علم کو بھی استاد سے اس قسم کی باتیں اخذ کرنا ضروری ہیں۔

ماں باپ کی رضامندی اور خدمت بھی خداوند عالم کے لیے ہونا چاہیے۔ ان کے مقابلے میں اپنے کو بڑا یا پارسا ظاہر نہ کرے۔

قصہ مختصر ہر آدمی اپنے کو اخلاص کی طرف رجوع کرے۔

نواں اصول

(بابُ الغرور والنخوت)

کبر و نخوت

دنیا میں بدترین خصلت غرور تکبّر ہے۔ اور یہ ایمان کے خلل سے پیدا ہوتی ہے۔ جس آدمی کو خدا کی محبت نہ ہوگی، وہ مغرور ہوگا۔ اس لیے کہ بزرگی و برتری سوائے خدا کے کسی کو زیبا نہیں۔ خداوند عالم نے متکبّر کی بڑی مذمت کی ہے۔ وہ فرماتا ہے۔ كَذَالِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ۔ دوسری جگہ حکم ہوتا ہے۔ اِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ۔

(حدیث) سرکار رسالت کا ارشاد ہے کہ جس آدمی کے دل میں رائی کے برابر تکبّر کا شائبہ ہوگا، وہ جنت سے محروم رہے گا۔ بعض لوگ تکبّر کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں۔ تمام ظالموں کا جبر اس کے نام پر لکھا جائے گا۔

حضرت سلیمان کو جنات قصرِ آسمانی اور تحت الثریٰ کی سیر کرا لائے۔ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ اگر سلیمان کے دل میں تکبّر کا شائبہ بھی ہوتا تو قبل اس کے اُن کو زمین کے اندر پہنچا دیا جاتا۔

سرکارِ رسالت کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن متکبّر چیونٹی کی طرح لوگوں کے پیروں کے نیچے روندے جا رہے ہوں گے۔ ان لوگوں کے لیے ایک خاص دوزخ ہوگا، جس کا نام "ہب ہب" ہے۔ یہ سب لوگ اسی میں جائیں گے اور فرمایا کہ جو آدمی تکبّر کے ساتھ کپڑے لٹکاتا ہوا چلتا ہے۔ خداوند عالم اس کی طرف نظر بھی نہیں کرتا۔

حدیث ہے کہ ایک آدمی بہت اکڑ کر چلا کرتا تھا۔ خداوند عالم نے اسی طرح اس کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور وہ برابر قیامت تک اسی طرح دھنستا رہے گا۔

حضرت محمد بن واسع نے اپنے بیٹے کو اکڑتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ تجھے معلوم ہے کہ تیری کیا ہستی ہے؟ تیرے باپ نے تیری ماں کو دو سو درہم کے عوض خریدا تھا۔

حضرت مطرفؒ نے سہلب کو اکڑتے ہوئے چلتے دیکھا تو فرمایا کہ خداوند عالم ایسی چال کو اچھا نہیں سمجھتا جواب دیا کہ تم میری خصلات سے بخوبی واقف ہو، فرمایا ہاں! پہلے ایک قطرۂ نجس تھا۔ اور اب نجاست کا پُتلا ہے، اور آخر میں مُردار اور بدنام ہوگا۔

عاجزی

(حدیث) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ عاجزی کرنے والے آدمی کو خداوند عالم بلند مرتبہ عنایت فرماتا ہے کہ ہر آدمی پر ایک فرشتہ مسلّط ہے جس کے ہاتھ میں آدمی کی دو لگامیں ہیں۔ جب وہ غرور کرتا ہے تو اس کو نیچے کھینچ دیا جاتا ہے۔ اور جب عاجزی کرتا ہے تو اس بندے کے لیے دعا کرتے ہیں، اور فرمایا کہ نیک بخت وہ آدمی ہے عاجز نہ ہونے پر عاجزی کرے۔ اپنا مال خدا کی راہ میں غریبوں کو دے اور علماء و حکماء کی صحبت میں بیٹھے۔

روایت ہے کہ سرکارِ رسالت کا روزہ تھا۔ افطار کے وقت ایک دُودھ کا پیالہ پیش کیا گیا، اس میں قدرے شہد بھی ملا ہوا تھا، فرمایا کہ میں اس کو نہ پیوں گا۔ اس لیے کہ عاجزی خداوند عالم کو بہت پسند ہے۔ خداوند عالم اس کو عزّت دیتا ہے، اور مغرور کو ذلیل کرتا ہے۔ اور عاجزی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فضول خرچی نہ کی جائے، اور مصرف آدمی کو محتاج رکھتا ہے۔ جو آدمی اس کو یاد کرتا ہے، خدا بھی اس کو یاد کرتا ہے۔

ایک بار ایک آدمی نے سرکار سے سوال کیا، اس وقت آپ کھانے میں مشغول تھے۔ اس کو اندر بلا لیا۔ حاضرین نے اس سے کراہت کی، لیکن حضورؐ نے اس کو ران پر بٹھا لیا اور فرمایا کہ ان میں سے ایک آدمی نے

اس کو بُری نظر سے دیکھا، اور وہ آدمی اسی بیماری میں مرا۔ یہ سب باتیں میرے اختیارات میں تھیں کہ میں چاہے بادشاہت لے لوں، لیکن جبرئیل امین نے مجھے عاجزی کا مشورہ دیا اور میں نے رسالت اور اس کی بندگی اختیار کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ میں متواضع آدمی کی نماز قبول کرتا ہوں اور میرا خوف اس کے دل میں ہونا چاہیے۔ اپنی خواہشات کو میری عبادت پر ترجیح نہ دے۔

حدیث ہے کہ کرم تقویٰ ہے، عاجزی انسان کا شرف ہے اور تونگری خداوند عالم پر یقین محکم رکھنا۔ اہل تواضع کو بہشت میں جگہ ملے گی، اور جو لوگ دُنیا میں صلح کرائیں گے اُن کے بڑے درجات ہیں۔

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کیا سبب ہے کہ مجھے تم لوگوں سے ایمان کی مٹھاس نہیں معلوم ہوتی؟ سب نے عرض کیا کہ ایمان کی حلاوت کیا ہے؟ فرمایا کہ کسی کو عاجز دیکھو تو عاجزی برتو اور مغرور دیکھو تو رکھ رکھاؤ سے کام لو۔ تاکہ اس کی ذلت اور خواری سامنے آجائے۔

تواضع کے متعلق چند اقوال بزرگانِ دین لکھے جاتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ تم لوگ عبادت کی حقیقت سے غافل ہو۔ اور وہ حقیقت صرف تواضع ہے۔

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق بات کو قبول کرو! چاہے وہ کسی کی زبان سے سنو۔

حضرت ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ اپنے سے غریب آدمی سے بھی تواضع سے پیش آؤ۔

حضرت سماک رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون رشید سے فرمایا کہ تیری عاجزی تیری بزرگی سے زیادہ ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ آپ نے بہترین بات کہی ہے۔ پھر فرمایا کہ اے خلیفہ! جس کو خداوند عالم مال، جمال اور بزرگی بخشتا ہے اور وہ اپنا مال دوسروں کی غمخواری ہی صرف کرتا ہے۔ جمال میں نیکی دکھاتا ہے۔ اور بزرگی میں تواضع۔ تو خداوند عالم اس کو بزرگوں کی فہرست میں رکھتا ہے۔ خلیفہ نے یہ الفاظ قلمبند کر کے اپنے پاس بطورِ نصیحت رکھ لیے۔

حضرت سلیمان کا قاعدہ تھا کہ صبح کے وقت مالداروں کے پاس بیٹھا کرتے۔ پھر محتاجوں کے پاس۔ اس وقت آپ فرمایا کرتے کہ ایک مسکین، مسکین کے پاس بیٹھا ہے۔

حضرت مالک بن دینار نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی مسجد کے باہر آواز دے کہ تم میں جو بدترین آدمی ہے وہ باہر آجائے تو میں باہر آجاؤں۔ حضرت مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ مالک کی بزرگی کی یہی وجہ ہے۔

کسی بزرگ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ آخرت کے ثواب کو مدِ نظر رکھ کر امیر کا فقیر کے سامنے عاجزی سے پیش آنا بہت اچھا ہے اور فقیروں کے لیے خدا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے امیروں سے تکبر کرنا اس سے بھی اچھا ہے۔

حضرت جنیدؒ نے جمعہ کے دن ایک بار وعظ میں فرمایا کہ اگر حدیث میں یہ نہ ہوتا کہ قوم کا آخری سردار وہ ہوگا جو ان سب میں کم تر ہوگا، تو میں کبھی اس کو وعظ نہ کہتا۔

یہ بھی روایت ہے کہ اہلِ توحید تواضع کو تکبر کے مترادف سمجھتے ہیں کہ آدمی عمداً اپنے کو کم درجے پر لائے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ آدمی درجہ بلند پر اپنے کو سمجھتا رہا ہے اور ضرورت کے وقت عاجزی کر رہا ہے۔

حضرت عطا سلمی رحمۃ اللہ علیہ بادل گرجنے اور بجلی چمکنے کے وقت اپنے پیٹ کو پکڑ لیتے اور کہتے کہ یہ تمام مصائب صرف میری وجہ سے دُنیا پر ٹوٹ رہے ہیں۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ، سے کچھ لوگوں کی بہت تعریف کی۔ آپ نے فرمایا کہ میری ابتدا ایک نجس قطرے سے ہوئی ہے اور انتہا بھی مردار پر ہوگی۔ اور اس کے بعد مجھے میزان پر رکھا جائے گا۔ اگر نیکیاں زیادہ ہیں تو بزرگ ہوں گا، ورنہ کمترین۔

تکبّر

تکبّر کی منزلیں تکبّر کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کو دوسروں سے اچھا سمجھنے لگے، جو جذبہ آدمی کو افضل بناتا ہے، وہ تکبّر کہلاتا ہے۔ تکبّر کا اصل تعلق دل سے ہی ہوتا ہے۔ اور یہ بڑی بُری عادت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باری تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ میں متکبّر سے پناہ مانگتا ہوں۔ جب یہ جذبہ آدمی پر طاری ہوتا ہے، تو وہ دوسروں کو اپنے سے کم سمجھنے لگتا ہے، بلکہ بعض لوگ تو اپنی خدمت کرانا بھی پسند نہیں کرتے۔ جس طرح کہ بادشاہ کی قدمبوسی بھی بعض لوگ نہیں کر سکتے۔ اور وہ اپنے کو بندہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ تکبّر کا آخری درجہ ہے۔ اس میں وہ گویا کبریا کی کبریائی سے بھی اپنے کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ خدا تو بندوں کے سجود و بندگی کو قبول کرتا ہے اور وہ اس سے انکاری ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تکبّر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آدمی خدا کے سامنے نہ جھکے اور دوسروں کو اپنے سامنے ذلیل تصوّر کرے۔ انھیں سے دنیا سے تمام بُرے خصائل پیدا ہوتے ہیں، اور آدمی اچھے اعمال نہیں کر سکتا۔

کسی مسلمان کے ساتھ عاجزی نہ کرنا ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔ اور متقی آدمیوں سے عاجزی نہ کرنا حسد اور بغض کی علامت ہے۔

(مغرور) مغرور آدمی ہر وقت اپنی ہر بات کو بلند رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، جس کی وجہ سے نفاق اور فریب کرنے سے باز نہیں آتا، اور چاہتا ہے کہ لوگوں میں ہر وقت اپنے کو بلند رکھے اور اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ آدمی اپنے کو بھلا دے۔ لہٰذا وہ آدمی اسلام کے قریب بھی نہیں ہے۔

(قول) ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر تو بہشت کا خواہاں ہے تو ہر آدمی سے اپنے کو کمتر سمجھ! اگر واقعی آدمی دیکھنے کے لیے دونوں آنکھیں رکھتا ہے، تو سوچے گا کہ وہ متکبّر اور مغرور آدمی کتّوں کی خصلات کے حامل ہیں۔ وہ اپنے ظاہر کو عورتوں کی طرح آراستہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں آپس میں انس و محبّت ہوتا ہے۔ وہ مغرور آدمی میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم کو اطمینانِ قلب اس وقت نصیب ہو سکتا ہے، جب کہ آپس میں یگانگت پیدا کرو، اور آپس میں اتنی محبّت کرو کہ ایک دوسرے میں سما جاؤ۔ اور کمالِ محبّت یہ ہی ہے کہ تو دوست کی ضرورت کے مقابل میں اپنے کو بالکل بھول جائے۔ پس معلوم ہونا چاہیئے کہ دوئی اس وقت دُور ہو سکتی ہے کہ جب تکبّر اور غرور کو دل سے قطعی طور پر نکال دے گا۔

تکبّر کے مدارج

بعض غرور تو بہت زیادہ بُرے ہوتے ہیں، جس بات پر غرور کیا جائے، اس چیز کے مطابق ہی اس کے گناہ بھی ہیں۔

سب سے بدترین تکبّر وہ ہے، جو خدا اور رسول پر کیا جائے۔ جیسے نمرود، فرعون، ابلیس اور دوسرے خدائی کے دعویداروں نے کیا۔ خداوند عالم کا ارشاد ہو رہا ہے کہ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ - (یعنی نہ عیسیٰ کو بندگی سے عار ہے اور نہ ملائکہ کو نہ مقرّبین کو) دوسرا درجہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر تکبّر کرنا ہے، جیسے کفّارِ قریش نے کیا۔ اور کہا کہ ہم اپنے جیسے آدمی کے سامنے سر جھکائیں۔ جو ایک یتیم ہے اور فرشتے کو رسول بنا کر کیوں نہ بھیجا۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ -

دو گروہ اس قسم کے اعتراضات کرتے تھے۔ ایک کا تکبّر حجاب بن گیا، اور انھوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراض کر دیا۔ اس کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے کہ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (یعنی ہم مغرور لوگوں کو خدا کی نشانیوں کے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے) دوسرا گروہ وہ تھا جو ماننے کے باوجود منکر تھا۔ اس لیے کہ مغرور تھے اور اپنا سر نہ جھکانا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق ارشاد ربُّ العزّت ہے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا -

تکبّر کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ مخلوقِ خدا سے تکبّر کرے۔ اپنے کو اُن سے بہتر سمجھے۔ اُن کے حقوق کو تسلیم نہ کرے

ان کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ یہ درجہ پہلے دونوں سے تو کم ہے لیکن اپنی جگہ سخت ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

پہلی وجہ یہ کہ خداوند عالم کے علاوہ وہ بزرگی کسی کو نہیں ہے۔ لہٰذا وہ آدمی جو خود عاجز ہے وہ دوسروں کے سامنے کیا بزرگ بن سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے کو بزرگ سمجھنے والا آدمی خدا کی بزرگی میں گویا کہ شرک کا قائل ہے اور وہ ایسا ہے، جیسے کوئی آدمی بادشاہ کا تخت و تاج لے کر خود اس پر قابض ہو جاتے ہیں۔ تو ایسے آدمی کے لیے کیا سزا ہو سکتی ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے۔ اَلْعَظَمَۃُ اِزَارِیْ وَالْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ فِیْہِمَا قَصَمْتُہٗ (حدیث قدسی: یعنی عظمت اور بزرگی صرف میرے لیے ہے، اگر کوئی آدمی ان کو اپنائے گا تو ہلاک ہوگا) لہٰذا تکبر بندوں سے نہیں بلکہ خدا سے ہوا۔ جیسے غلام کو بادشاہ بنا دے حالانکہ بادشاہ، بادشاہ ہی ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ تکبر صحیح بات کو قبول کرنے میں مانع ہوتا ہے، اور جب دو آدمیوں میں ایک آدمی صحیح بات کہتا ہے تو دوسرا اپنے کبر کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِہٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ دوسری جگہ اور فرما رہا ہے کہ وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (یعنی جب خدا سے اس شخص کو ڈراتے ہیں تو وہ اپنے کبر و نخوت کی وجہ سے اس کی بزرگی کا قائل نہیں ہوتا اور اپنی معصیت پر مُصر ہوتا ہے) اگر کسی سے کہا جائے کہ خدا سے ڈر! اور وہ نہ ڈرے، تو یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو داہنے ہاتھ سے کھانے کے لیے حکم دیا۔ اس نے کہا نہیں! تو سرکار رسالتؐ نے فرمایا کہ کیا تو داہنے ہاتھ سے نہیں کھا سکتا۔ اس کے بعد اس شخص کا داہنا ہاتھ حرکت کرنا بند ہو گیا۔

ابلیس کا قصہ صرف افسانہ ہی نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس نے صرف تکبر کی وجہ سے کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ پھر میں آدم کے آگے کیوں جھکوں؟ اور ان کی اطاعت نہ کی اور اپنے غرور پر اکڑا رہا۔ یہاں تک کہ ملعون کر کے ہمیشہ کے لیے نکال دیا گیا۔

اسبابِ تکبر

دوسروں کے مقابل میں اپنے کو ایسی صفات کا حامل سمجھنا کہ سوائے خود کے دوسروں میں نہ ہو۔ یہ تکبر کہلاتا ہے۔

تکبر سات صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

پہلے یہ کہ جب آدمی فارغ التحصیل ہوتا ہے، تو دوسروں کو جاہل سمجھنے لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ

بغیر میرے احکامات کے یہ لوگ کیوں کوئی اقدام کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس کی تعظیم و عزت نہیں کرتا تو اس کو تعجب ہوتا ہے۔ اپنے علم کے احسانات لوگوں پر رکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کو نصائح کرتا ہے، اپنے کو انتہائی نیک خیال کرتا ہے۔ دوسروں کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ میری ہی دعاؤں سے نجات پا سکیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آفَۃُ العِلمِ الخُیَلَاءُ (یعنی علم کے لیے سب سے زیادہ بڑی آفت اپنے کو بزرگ جاننا ہے) حقیقتاً وہ لوگ جاہل ہوتے ہیں۔ عالم کی شناخت یہ ہے کہ آخرت کے راستے کو صحیح طور پر پہچانے۔

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں، کہ علم کے ساتھ ساتھ مصائب بھی بڑھتے ہیں، لیکن اگر غرور پیدا ہو جائے تو دو اسباب کے ماتحت ہوتا ہے۔ پہلا یہ کہ علم آخرت سے کام نہیں لیتے، یعنی یہ کہ اپنے کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر وہ در اصل علم دین سے واقف ہوں تو تمام حجابات اٹھ جائیں، اور ان پر پوشیدہ چیز نظر آنے لگے۔ اس کے بعد ان میں عاجزی کی شان پیدا ہو جائے۔ لیکن علم طب، نجوم، علم لغت کے حصول کے بعد خواہ مخواہ غرور و تکبر پیدا ہوتا ہے۔ علوم دین سے قریب ترین علم "علم فتویٰ" ہے جس سے دین کو ترقی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ علم بھی دنیاوی علم ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے اصلاح کا کام کرتا ہے۔ لہٰذا اس پر صرف اکتفا کرنے سے تکبر اور غرور پیدا ہوگا۔

علمائے وقت کو ذرا غور سے دیکھو، تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لوگ اپنی طہارت اور لمبی چوڑی باتوں سے دوسروں کی ہنسی کا موقع ملتا ہے۔ وہ علمائے زمانہ خود متعصب ہوتے ہیں، اور ویسی ہی باتیں سکھاتے ہیں۔ دیکھنے والے بھی انہیں کے مطابق دین کا اصل مقصد ان کے احکامات کے بموجب سمجھ لیتے ہیں۔ یہ سب باتیں عوام میں کبر، حسد اور نخوت پیدا کرتی ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی علم تفسیر، علم اخبار یا سیرت وغیرہ پڑھتا ہے۔ یا مثلاً یہ موجودہ کتاب "کیمیائے سعادت" یا "احیاء العلوم" کا مطالعہ کرے اور اس کے بعد بھی غرور پیدا ہو جائے۔ وہ اس وجہ سے ہوگا کہ اس کا ضمیر اور باطن برا ہے۔ وہ صرف اس کو پڑھ کر لوگوں میں اپنے کو بلند کرنا چاہتا ہے، اس پر عمل مقصود نہیں ہے۔ علم در اصل آدمی کی طبیعت کا آئینہ دار ہے جیسی طبیعت ہوگی ویسا ہی اثر پڑے گا۔ جیسے آسمان سے پانی ایک طرح کا ہر جگہ برستا ہے۔ لیکن بیج کے پاس پہنچ کر اس کا ہم جنس پیدا کرتا ہے۔ یا معدے میں جو دوا پہنچتی ہے۔ اول وہ اس میں خلط ملط ہو کر اس سے متاثر ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ تلاوت کلام کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کے حلق سے نیچے بھی نہیں اترتا۔ حالانکہ وہ لوگ بظاہر دوسروں کے سامنے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سے زیادہ کوئی تلاوت نہیں

کرتا۔ یہ ارشاد فرما کر صحابہ کی طرف دیکھا! اور فرمایا کہ تم ہی لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ علماء متکبر نہ ہوں، ورنہ جاہل کے جاہل ہی رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاجزی کا حکم دیا ہے وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور اسی وجہ سے صحابہ غرور سے ڈرتے تھے۔

واقعہ تکبر حضرت حذیفہ نے امامت کی اور بعد میں فرمایا کہ تم لوگ اپنا کوئی دوسرا امام مقرر کر لو۔ اس لیے کہ میں تم سب سے برتر ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب امام خود یہ کہے تو عوام میں تکبر کے جذبات کس طرح پیدا نہ ہوں گے!

عام طور پر علماء ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ دوسروں پر اپنے رُعب کا اظہار کر کے اپنی قابلیتوں کو منوانا چاہتے ہیں۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک زمانہ وہ ہوگا کہ جب تمھاری عبادات کا دسواں حصہ بھی باعثِ نجات ہوگا۔ اس کا مقصد یہ ہی ہے کہ غرور اور ظاہرداری بڑھ جائے گی۔ عبادت میں خلوص نہ رہے گا، اور اب وہ ہی زمانہ ہے کہ تھوڑی سی عبادت خلوص کے ساتھ باعثِ نجات ہو جاتی ہے۔ اس لیے پُرخلوص عالم "بیچارا" انتہائی محنتوں کے بعد بھی لوگ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔

دوسرا سبب غرور پیدا ہو جانے کا یہ ہوتا ہے کہ آج کل کے زاہد، صُوفی اور عابد سب ہی ظاہردار ہیں۔ بعض تو دوسروں کو اپنی مجلس میں آنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے علوم کا دوسروں پر احسان رکھتے ہیں۔ اپنے کو ناجی اور دوسروں کو ناری سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی مخالفت کرے اور اس مخالفت پر اتفاق سے کوئی افتاد پڑ جائے تو وہ برسرِ عام اپنی کرامت کہتے ہیں۔ کہ یہ شخص میری دعاؤں کی وجہ سے مقہور ہوا۔

سرکار رسالت مآبؐ کا حکم ہے کہ جو آدمی دوسروں کو گمراہ کہے گا وہ خود گمراہ ہے اور گناہ کبیرہ کا مرتکب۔ ہر مسلمان کو اپنے برابر سمجھنا چاہیے۔ خصوصاً وہ آدمی جو عالم سے کوئی بات پوچھنا چاہتا ہو۔ ورنہ ہو سکتا ہے۔ کہ عالم کے بجائے زہد و اتقا کا مرتبہ اس شخص کو مل جائے۔ جس کے لیے کوئی عالم بدگمانی کرے۔

حکایت بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا عالم تھا۔ ایک دن تمازتِ آفتاب میں ایک بادل کا ٹکڑا اس پر سایہ کیے تھا۔ ایک انتہائی فاسق نے دیکھا، اور سوچا کہ میں اس عالم کے پاس جاؤں تو شاید دھوپ کی شدت کم ہو۔ وہ یہ سوچ کر عالم کے پاس بیٹھ گیا۔ عالم نے اس کو دیکھ کر کہا کہ تو فاسق ہے۔ میرے پاس سے اٹھ کر چلا جا! وہ بیچارہ وہاں سے کھڑا ہو گیا۔ اب بادل کا ٹکڑا بجائے عابد کے اس فاسق کے ساتھ ساتھ سایہ کیے چلا گیا۔

پیغمبرِ وقت پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہہ دو کہ اب پھر نئے سِرے سے اعمال کریں۔ اس لیے کہ عابد کی عبادات اس کی کبر کی وجہ سے چھین لی گئیں، اور فاسق کے گناہ ہمارے اوپر ایمان رکھنے کی وجہ سے

بخش دیئے گئے۔

کسی آدمی نے ایک عالمِ وقت کی گردن پر پیر رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم تو ہرگز نہیں بخشا جا سکتا۔ چنانچہ پیغمبرِ وقت پر وحی نازل ہوئی کہ اس عالم سے کہہ دو کہ تو صرف قسم کھا کر ہم کو خریدنا چاہتا ہے، ایسا ہرگز نہ ہوگا۔

اکثر کفار نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ظلم کیے، لیکن اُن سے کوئی قصاص نہ لیا گیا۔ اور نتیجے میں ان میں لوگ مسلمان بھی ہوئے۔

جاہل عابد اپنے کو ایسا ہی سمجھتے ہیں، لیکن "معارف" ہمیشہ دوسروں کی تکلیف کو بھی اپنی تکلیف خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود اتنے اخلاص کے ایک بار دریافت کیا کہ اے حذیفہ! تم مجھ میں نفاق کی کون سی بات دیکھتے ہو، مسلمان کی شان یہ ہونا چاہیے۔

جو آدمی اپنے کو بہتر سمجھتا ہے، وہ اپنی عبادات کو رائیگاں کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ جہل ہے اور جہل سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کسی آدمی کی تعریف کر رہے تھے، وہ خود اتفاق سے وہاں آگیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مجھے اس میں نفاق کی بُو آ رہی ہے۔ صحابہ اس حکم پر متعجب ہوئے۔ تب آنحضرتؐ نے اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا تو کبھی کبھی اپنے کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتا ہے؟ اس نے جواب دیا جی ہاں! آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کے باطن کو سمجھتے تھے۔

عموماً یہ باتیں علماء میں بہت پائی جاتی ہیں اور تین مدارج پر مبنی ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی بظاہر بڑی سیر چشمی سے کام لے، لیکن خلوص پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے افعال سے تکبر کی بو نہ آتی ہو۔ ایسا آدمی تکبر کو چھوڑنے پر مجبور ہے، لیکن اپنے ظاہر کو اس سے پاک کر دیتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے کسی کے سامنے اپنے کو بڑا نہ کہے۔ بلکہ اپنے کو کمتریں جانے۔ لیکن اس کے افعال سے تکبر کی بُو آتی ہو۔ مثلاً ہر جلسے میں اچھی جگہ بیٹھنے کا خواہش مند ہو۔ آگے آگے چلنے کی خواہش کرے۔ ہر وقت غصے میں رہنے کو ظاہر کرے، یا عالم صرف سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہے۔ یہ دونوں علامات بھی تکبر کی ہیں۔ اس لیے کہ عاجزی اور ماندگی سب سے اچھی چیز ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے، تو مسکرا کر باتیں کرتے۔ ہر آدمی سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ خداوند عالم نے وحی نازل فرمائی وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اور فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ

(یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خداوند عالم تمام رحمتوں کے منجملہ یہ بھی ایک رحمت تُم پر تھی کہ تم لوگوں سے عاجزی اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اور لوگ تمھاری اس عادت کی وجہ سے نفرت نہ کرتے تھے)

تیسرا سبب غرور کا یہ ہے کہ وہ زبان سے اپنی برتری کا اظہار کرے۔

مثلاً عابد دعویٰ کرے کہ میں سب سے زیادہ عبادت کرتا ہوں۔ تہجد سب سے زیادہ پڑھے۔ روزہ سب سے زیادہ رکھے۔ نمازیں سب سے زیادہ پڑھے، وہ صرف اس لیے کہ میرے مقابلے میں یہ لوگ کیا ہیں۔

عالم اپنے علم کو سب سے افضل سمجھے، اور کسی دوسرے عالم کو نگاہ میں نہ لائے۔ مناظرے اور مباحثے میں صرف مخالف کو شکست دینے کی فکر ہو۔ گفتگو میں بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرے۔ ہر وقت احادیث سُناتا رہے۔ یہ تمام باتیں آج کل کے عابد اور عالموں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ اس حدیث سے باخبر ہے کہ اگر کسی کے دل میں ایک جتے کے برابر بھی غرور ہے تو جنت میں نہ جا سکے گا۔ تو اس کے خوف سے پھر تکبر نہ کرے گا، اور خداوند عالم کا مخاطب بن جائے گا۔ کہ اے میرے خاص بندے اگر تو اپنے خیال میں عاجز ہی ہے، تو میرے خیال میں بڑی عزت رکھتا ہے۔

تیسرا درجہ تکبر یہ ہے کہ آدمی حسب ونسب میں اپنے کو اونچا سمجھے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ کی اولاد یا بادشاہوں کے بیٹے دوسروں کو اپنے مقابلے میں کم ہی سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ عالم و عابد ہی کیوں نہ ہوں۔ بعض لوگ زبان سے ظاہر نہیں کرتے، بلکہ غصے کے وقت بے قابو ہو جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنے خاندان کو سمجھو! اور شرماؤ!

حضرت ابوذر غفاری نے کسی شخص کو ایک دن حبشی کہہ دیا۔ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اپنے سے باہر نہ ہو، اس لیے کہ کسی خوبصورت کو کسی بدصورت آدمی پر کوئی فوقیت نہیں۔ میں اس بات سے ڈرا اور لیٹ کر اس سے کہا کہ تو اپنا پیر میرے سینے پر رکھ تاکہ اپنا بدلہ لے سکے۔

مغروروں کی باتیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو آدمی غرور کی باتیں کر رہے تھے کہ میں فلاں ہوں تو کیا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں بھی ایک شخص نے غرور کیا تھا، تو خداوند عالم نے وحی نازل فرمائی کہ اے موسیٰ اُن سے کہو کہ اس کے نو آدمی تو دوزخ میں جل گئے دسواں وہ باقی ہے۔ لہٰذا دوزخ میں جانے والوں کے لیے کوئی فکر نہ کرو، نہ اُن پر فخر کرو۔

چوتھا سبب تکبر یہ ہے کہ اپنے حسن وجمال کو اچھا سمجھے، اور یہ عموماً عورتوں میں ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ایک عورت کے متعلق فرمایا کہ یہ کوتاہ قد ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عائشہ! تم نے تکبر کیا۔

پانچواں سبب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مال پر غرور کیا جائے۔ اور دوسروں سے یہ کہے کہ میں تیرے مقابل میں اتنا پیسے والا ہوں۔ "سورۂ کہف" میں ایک شخص کے لیے آیا ہے کہ اس نے دوسرے سے اپنے مال اور حسب و نسب کے لیے کہا تھا کہ میں ایسا ہوں۔

چھٹا سبب یہ ہے کہ آدمی اپنی طاقت پر غرور کرے اور وہ اپنے سے کمزوروں کے ساتھ ہو۔

ساتواں تکبّر اپنے ماتحتوں سے ہوتا ہے۔

عموماً سب آدمی جس چیز کے مالک یا جس چیز پر قادر ہوتے ہیں، اس پر تکبر کیا کرتے ہیں۔ چاہے وہ اچھّی ہو یا نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہیجڑے بھی اپنی صفت پر اکڑتے ہیں۔

غرور کے سبب اور بُنیادیں صرف حسد اور عداوت پر مبنی ہیں۔ آدمی میں جب کسی سے بغض کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ تب ہی وہ دوسروں سے کہتا ہے کہ میں اس شخص کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل ہوں۔ اور اس کی لاف و گزاف میں اپنی تعظیم و عزت کے منوانے کا جذبہ مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کسی سے بحث کرے اور اس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ یہ مجھ سے زیادہ قابل ہے، لیکن محض تکبّر کی وجہ سے اکڑتا ہے اور سب پر رُعب جمانے لگے۔

یہاں تک غرور کے متعلق تمام پہلو بتائے گئے اور اب اس کے دفعیہ کے پہلو بتائے جاتے ہیں۔

تکبّر کا دفعیہ

انسان کے منازل ازل سے ابد تک

دین سے گمراہ کرنے والی ہر چیز چاہے وہ کتنی ہی ناچیز کیوں نہ ہو، اس کی روک تھام ضروری ہے۔ غالباً ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی روگ ضرور ہے۔ اس کا دفعیہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔

پہلا اجمالی (مختصر) اور دوسرا تفصیلی۔

اختصار کے ساتھ اگر دفعیہ کرنا ہے، تو وہ علم و عمل دونوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ آدمی خداوند عالم کی وحدانیت کی معرفت حاصل کرے۔ اس کے بعد اپنی حقیقت اور بساط کو غور کرے۔ پھر یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ خداوند عالم سے بڑھ کر اور خود سے کمتر کوئی ذات دنیا میں نہیں ہے۔ بس یہ طریقہ ہی باطنی طور سے تکبّر کی بیخ کنی کر سکتا ہے۔ اور اگر آدمی اپنی حیثیت کو کلّی طریقے پر سمجھنا چاہتا ہے، تو قرآن مجید کی ایک آیت اس کے لیے کافی ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے کہ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ۔ اس طرح خداوند عالم نے اپنی قدرت کو پہچنوایا۔ اور انسانیت سے پہلے، درمیانی اور بعد کے مدارج بھی بتا دیے

کہ ابتدائے خلقت میں آدمی سمجھ لے کہ اس سے زیادہ ذلیل چیز کوئی نہیں ہے۔ وہ نہ پہلے تھا اور نہ آئندہ رہے گا۔ فرمایا کہ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ خداوند عالم نے پہلے خاک کو پیدا کیا اور ذرا سے قطرے سے انسان کو بنایا کہ اس سے زیادہ ذلیل چیز کوئی نہیں ہے معلوم ہوا کہ آدمی کی اصل مٹی اور ایک نجس ترین قطرہ ہے۔ اس کے بعد وہ ایک مزغہ گوشت بنا، جس میں کسی قسم کا کوئی حس نہ تھا۔ اس کے بعد خداوند عالم نے اس گوشت کے ٹکڑے میں حرکت پیدا کی، اور حرکت کے بعد قوتِ سماع، قوتِ بصر، اور دوسرے قواء عنایت فرمائے۔ اس کے بعد قوتِ ادراک بخشی تاکہ خداوندِ عالم کو پہچانے۔

اِنسان خود کچھ نہ تھا اور نہ اس میں بڑھنے کا بذاتِ خود مادہ تھا۔ وہ خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اس میں ہر چیز اس کی عطا کردہ ہے۔ لہٰذا کہاں تک مناسب ہے کہ وہ تکبّر کرنے لگے۔ خداوند عالم نے اس کی تفصیل بھی اس طرح بیان فرمادی وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ۔ اس کے بعد آدمی سوچے کہ وہ کہاں تک تکبّر کرسکتا ہے۔

درمیانی کام (اِنسان کی زندگی) ہے۔ کہ وہ پلتا ہے، بڑھتا ہے۔ ادراک کے ذریعہ ہر چیز کی اچھائی اور بُرائی کو سمجھتا ہے۔ اس کے بعد بھی زمانے کے خشک وتر سے دوچار ہو کر نقصان اور فائدہ اٹھاتا ہے تکالیف اور محنت برداشت کر کے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اگر بیمار ہے تو دوا استعمال کرتا ہے۔ اور اس کی تلخی کو برداشت کرتا ہے۔ اس کے بعد تندرستی عود کرسکتی ہے۔ اگر یہ سب گرم وخشک آرام اور تکالیف آدمی کے پیچھے نہ لگے ہوں تو وہ ضرور مغرور ہوسکتا ہے۔ لیکن خداوند عالم نے یہ تمام فطری چیزیں اپنے لیے محفوظ کر لی ہیں کہ آدمی اپنی ہستی پہچان کر تکبّر نہ کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اگر آدمی کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو کر نہیں سکتا۔ سوچنا چاہتا ہے تو سوچ نہیں سکتا، جو چیز یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس سے بھاگتی ہے اور جو چیز بُھلا دینا چاہتا ہے، وہ اس کو بار بار جھنجھوڑتی ہے تکلیف اٹھاتا ہے صعوبات سہتا ہے۔ اس کے بعد بھی خداوند عالم چاہتا ہے، تو اس کو آرام اور خوشی دیتا ہے، ورنہ نہیں۔

آخری کام انسان کا یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے واپس جائے۔ اب جو قواء اس کو پہلے دی گئی تھیں، سب کی سب واپس لے لی جاتی ہیں۔ نہ جسم ہے، نہ ادراک، نہ ہاتھ ہیں نہ پیر، نہ آنکھیں نہ کان۔ حد یہ ہے کہ لوگ اس کو دیکھنا تک گوارہ نہیں کرتے۔ اِس کو نجس سمجھتے ہیں، ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے۔

اس وقت اگر اس کو صرف مٹی میں بنادیا جائے، تو بھی غنیمت ہے تاکہ وہ ایک مشتِ خاک کی طرح سطحِ زمین پر پڑی رہے، لیکن نہیں۔ بلکہ اس کو آسمانوں اور زمینوں کی ہیبت ناک سیر کرائی جاتی ہے۔

جہنمیوں کے شعلے دکھائے جاتے ہیں اور جو جو اس دُنیا میں اس نے عمل کیے ہیں وہ ایک ایک کر کے اس کو وہاں گنائے جاتے ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں کہ تو نے یہ کیا کیا ہے؟ وہ خاموش کھڑا صورت دیکھے گا۔ پھر اس کو جہنم بھیج دیا جائے گا۔ اس وقت اس کی حسرت اور یاس عجیب قسم کی ہوگی۔ وہ کہے گا، افسوس اس سے بہتر ہوتا کہ میں بجائے انسان کے کُتّا یا سُور ہوتا، تو یہ اعمال کی سزا نہ بھگتنا پڑتی۔

اس کے بعد آدمی سوچے کہ اس کو غرور و تکبّر کرنا چاہیے؟ لہٰذا آدمی اگر اپنی ہستی کو پہچان لے بس تکبّر کا دفاع خود ہی ہو جائے گا۔

عملی حیثیت سے تکبّر کا دفاع صرف عاجزی اور انکساری ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی۔ حضورؐ کبھی کھانا کھانے میں تکیہ نہ لگاتے اور فرماتے کہ میں بندہ ہوں، لہٰذا بندوں ہی کی طرح رہنا چاہیے۔

حضرت سلیمان سے لوگوں نے دریافت کیا، کہ آپ نیا لباس کیوں نہیں پہنتے؟ تو فرمایا کہ آخرت کے دن جب آزاد ہوں گا، تو پہنوں گا۔

اسلام کے اصول اور ارکان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی راز ہے مثلاً نماز کے اسرار میں رکوع و سجود کا حقیقی مقصد عاجزی اور انکساری ہے۔ انسان اپنا چہرہ جو تمام اعضا میں باعزّت اور محترم ہے۔ اس کو زمین پر رکھتا ہے جس سے عاجزی کی خو پیدا ہوتی ہے۔

تکبّر انسان کے ہر کام اور عضو سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر عضو میں تواضع کی نشانی پیدا کرے۔

غرور کی بہت سی شناختیں ہیں:

مثلاً آدمی تنہا کہیں نہ جائے۔ حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ تیرے ساتھ جتنے بھی آدمی ہوں گے اتنا ہی گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کبھی لوگوں کے بیچ میں چلتے اور کبھی سب کو آگے کر دیا کرتے تھے۔

ایک شناخت غرور کی یہ ہے کہ آدمی اپنی تعظیم چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑے رہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ اگر کسی دوزخی کو دیکھنا چاہو، تو ایسے آدمی کو دیکھ لو! کہ جو خود بیٹھا ہو اور اپنے سامنے لوگوں کو کھڑا رکھے۔

ایک شناخت تکبّر کی یہ بھی ہے کہ آدمی کسی غریب یا فقیر کو اپنے پاس بٹھانا نہیں چاہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فقیروں کو خود بلا کر کھانا کھلاتے اور اس وقت تک اس کے پاس بیٹھتے جب تک کہ وہ خود

نہ چلا جاتا۔

بازار سے کوئی چیز ہاتھ میں لانا مغرور آدمی اپنی بے عزتی خیال کرتا ہے۔ ایک بار آنحضرتؐ بازار سے کوئی چیز خرید کر لائے تو ایک شخص نے اس کو خود اٹھانا چاہا، لیکن آپؐ نے منع فرمادیا۔

حضرت ابوہریرہؓ اپنی پیٹھ پر خود لکڑیوں کا گٹھر باندھ کر لایا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ اپنے امیر کا راستہ دو۔

(واقعہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ہاتھ میں گوشت کی گٹھری اٹھاتے، دوسرے میں دُرّہ لیے بازار میں جاتے۔

متکبر آدمی میلے کپڑے پہن کر بازار میں نہیں نکلتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی چادر میں چودہ پیوند ہوتے اور بازار جاتے۔ بعض پیوند چمڑے کے بھی لگے رہتے۔

(واقعہ) حضرت علی کرم اللہ وجہہ، ہمیشہ اپنے جسم سے چھوٹا کپڑا استعمال کرتے۔ آپ فرمایا کرتے کہ اس سے خلوص پیدا ہوتا ہے۔ لوگ تقلید بھی کرتے ہیں اور فقرا خوش ہوتے ہیں۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے لوگوں سے دریافت کیا کہ آپ راہبوں کا سا لباس کیوں پہنتے ہیں جبکہ تمھاری ظاہری شکل بھیڑیوں کی سی ہے۔ بادشاہوں کا لباس پہنو اور خدا کے خوف سے ڈرو تاکہ دل بھی نرم ہو۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے لیے قبل خلافت، ایک ہزار دینار کا قیمتی لباس خریدا گیا۔ پھر بھی آپؒ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ نرم ہونا چاہیے۔ لیکن جب خلافت ملی تو پانچ درہم کا لباس خریدا اور فرمایا کہ بہت اچھا ہے۔ لیکن موٹا اور ہوتا تو اچھا ہوتا۔ لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ تو جواب دیا کہ مجھے خلافت کی لذت مل چکی ہے اس سے اچھا لطف کسی دوسری چیز میں نہیں ہے۔

یہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ آدمی اچھے لباس میں تکبر کرے۔ بعض لوگ گھٹیا کپڑوں کے بعد بھی مغرور ہوتے ہیں۔ عاجزی اور تواضع ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھو۔ کہ آپ اپنے جانوروں کو چارہ کھلاتے۔ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے۔ ہر آدمی کو سلام میں سبقت فرماتے۔ اگر کوئی غریب دعوت دیتا تو قبول فرمالیتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات عجیب وغریب تھیں۔ انتہائی خوش خلق، ملنسار اور ہنس مکھ تھے۔ اگر کسی بات پر خوش ہوتے تو قہقہہ نہ لگاتے اور اگر غمگین ہوتے تو تیوری پر بل نہ پڑتا۔ ہر وقت سر جھکا رہتا۔ دنیا میں کسی چیز کی طمع نہ تھی۔

لہٰذا دنیا میں جو آدمی نیکی اور رضائے الٰہی کا جویا ہو، وہ آپ سے سیکھے! خداوند عالم نے خود تعریف

فرمائی ہے اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔
غرور کا اجمالی خاکہ بتا دیا گیا۔
اب تفصیل کے ساتھ سُن لو!

کہ اول جس چیز میں تُم کو تکبر پیدا ہو، اس کو سوچو! کہ اس کی اصلیت کیا ہے، مثلاً نسب میں تکبر ہو۔ اس کے متعلق خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ (یعنی انسان کی اصل خاک ہے اور اس کے فروع نطفے سے۔ لہٰذا تیرا نطفہ تیرا باپ ہے اور خاک تیری جد) اس کے بعد سوچو کہ ان دونوں چیزوں سے زیادہ کون شے ذلیل ہے۔ اسی طرح تیرے باپ میں اور اس کے باپ میں یہ تمام کمزوریاں موجود ہیں۔

اور ان لوگوں سے سبق لو! کہ جو چمار اور مہتروں کی اولاد ہے کہ وہ اپنے باپ کے لیے کبھی نہیں سوچتے کہ وہ لوگ اتنا گندہ کام کرتے ہیں معلوم نہیں کہ تو کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی اپنے کو "سید" کہے، اور وہ دراصل کسی حجام ہی کا بیٹا ہو۔ اور اگر دو عادل آدمی اس بات کو ثابت کر دیں، تو اس وقت تمھارا غرور کہاں رہ سکتا ہے۔

نسب کی وجہ سے مغرور ہونے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تم دراصل اپنے پر فخر نہیں کر رہے، بلکہ اپنے باپ دادا پر فخر کرتے ہو۔ آدمی دوسروں پر کیوں فخر کرے۔ اپنے اعمال اور اپنی ذات پر فخر کرنا چاہیے۔

آدمی کو اپنے اچھے اور حسین چہرے پر بھی تکبر ہوتا ہے۔ اس میں بھی یہ سوچے کہ اس کے کان، ناک، آنکھیں اور پیٹ میں کیسی کیسی نجاسات بھری رہتی ہیں۔ جن کی طرف وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور حالانکہ وہ اپنے جسم میں سب کو لادے لادے پھر رہا ہے، اور اس کے بعد اپنے حسین چہرے کو دیکھ کر اپنی خلقت کے اسباب کو دیکھے کہ اس کا یہ حسین جسم ماں اور باپ دونوں کے پیشاب کے مقاموں سے خلق ہوا، وہیں وہ پلا، اور وہیں سے پیدا ہوا۔

حضرت طاؤس نے ایک شخص کو اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ یہ اس شخص کی چال نہیں ہو سکتی، جو یہ سوچ لے کہ میرے پیٹ میں پاخانے کے انبار بھرے پڑے ہیں۔ جو روز اس کے پیٹ سے نکلتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی یہ اکڑ جاتی رہے گی۔

دوسرے یہ کہ انسان کا حسن و جمال صرف ایک ذرا سی بیماری سے خاک میں مل جاتا ہے، اگر آدمی کے چیچک نکل آئے تو کتنا بدشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا حسن و جمال ظاہری بھی تکبر کے لائق نہیں۔

اب اگر آدمی اپنی طاقت پر ناز کرے، تو سوچے کہ ایک مکھی یا مچھر کے کاٹنے یا ایک کانٹے کے لگ

جانے سے وہ کیسا بلکنے لگتا ہے اور اس کی طاقت زائل ہوجاتی ہے۔ یا یوں سمجھ لو کہ گدھا اور بھینسا آدمی سے کہیں زیادہ طاقت ور ہیں۔ پھر ایسی چیز میں تکبّر کرنا فضول ہے۔

اگر انسان اپنے مال وجاہت اور نوکروں کی وجہ سے متکبّر ہے تو سوچے کہ یہ سب چیزیں اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل سکتی ہیں۔ مال کو چور لے جاسکتے ہیں، اس کی حکومت کو بادشاہ ختم کر سکتے ہیں۔ نوکر اور غلام اس کو چھوڑ کر آزاد ہو سکتے ہیں۔ اور اگر مال ہو بھی تو سینکڑوں یہودی اور کافر اس سے کہیں زیادہ مالدار ہیں پھر اس چیز پر تکبّر کرنا لاحاصل ہے۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ بعض لوگ اپنے علم اور عبادات پر بھی متکبّر و مغرور ہوتے ہیں۔ اس کا دُور کرنا اور سمجھنا مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ علم اور عبادات کو خداوند عالم خود دوست رکھتا ہے اور بندگانِ عالم خواہ مخواہ ایسے آدمی کی طرف جھکتے ہیں۔ لہٰذا اول یہ سوچو کہ علم کی وجہ سے آخرت میں بہت سختی ہوگی۔ علماء زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے، کیوں کہ جاہل کو بہر حال عفوِ گناہ زیادہ ہونا لازمی ہے۔ علماء کے متعلق جو احادیث ہیں اُن پر غور کرو۔ اس طرح قرآن مجید نے بھی عالم بے عمل کو گدھے کا خطاب دیا ہے۔ وہ ارشاد فرمارہا ہے کہ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا یا کَمَثَلِ الْکَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْہِ یَلْھَثْ اَوْ تَتْرُکْہُ یَلْھَثْ۔ کُتّے اور گدھے سے زیادہ اور کون خبیث ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ جانے یا نہ جانے، وہ اپنی فطرت سے باز نہیں آیا۔ اگر عالم آخرت میں نجات نہ پاسکا، تو کنکر اور پتھر سے بدتر ہے تو حیوانات تو اس سے کہیں افضل ہیں۔ ایک صحابی کی خواہش تھی کہ میں چڑیا ہوتا۔ ایک صحابی سوچا کرتے کہ میں بکری ہوتا اور مجھے لوگ ذبح کر کے کھا جاتے۔ ایک صحابی گھاس ہونے کی تمنّا کرتے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علم وعبادت میں تکبّر بھی لاحاصل ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی آج کسی پر فخر کرے اور وہ کل کو مسلمان ہو جاتا، تو اس کو گناہ ہوگا۔ بہت سے آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پر اعتراض کرتے، لیکن بعد قبول اسلام وہ قائل ہو گئے۔ لہٰذا اپنی عزّت علم اور عبادت پر بھی کسی کو نازاں نہیں ہونا چاہیے۔

اور کیا خبر کہ اس کے تمام اعمال قبول بارگاہِ ایزدی ہو رہے ہیں۔ کون سی دعا قبول ہوئی ہے اور کون سی نہیں۔ اور مان بھی لیا جائے کہ تمام اعمال قبول ہوجائیں گے، تو خدا کا حکم ہے کہ تکبّر نہ کرو۔

سرکارِ رسالتؐ کا حکم ہے کہ عالم کو عابد پر یہی فوقیت حاصل ہے، جو مجھ کو میرے صحابہ پر۔

اگر کوئی عابد کسی جاہل کو دیکھے تو یہ سوچے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی عبادات مجھ سے زیادہ ہوں اور اس نے پوشیدہ رکھا ہو۔ اسی طرح اگر کسی ظالم یا فاسق کو دیکھے تو سوچے کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گناہ میرے ضمیر کے اندر

ایسا پوشیدہ ہو جو اس کے ظلم اور فسق سے زیادہ ہو۔ یا اس کے باطن میں کوئی ایسا نیک عمل جاگزیں ہو، جو اس کے اعمال سے زیادہ وقیع ہو۔ اور مرتے وقت تک اس کے اعمال ختم ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ ہر بات ممکن ہے تو تکبر اور غرور کرنا کسی بات پر بھی قطعی بیکار ہے، اور یہی سبب تھا کہ بزرگان دین اور اولیاء اللہ عاجزی کو مسلک بنائے رہے۔

خُود نمائی

سرکار رسالتؐ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے لیے تین عادات باعثِ ہلاکت ہوتی ہیں۔ بخل، حرص اور خود نمائی اور اگر تم لوگ گناہوں سے پرہیز بھی کرو تو مجھے ایک چیز کا خوف لگا رہتا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ آدمی بدکار کب ہوتا ہے، تو فرمایا کہ جب آدمی اپنے کو نیک سمجھنے لگے۔

حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ آدمی کی ہلاکت خود پسندی اور یاسیت میں مضمر ہے۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ مایوس آدمی کوشش نہیں کرتا اور طلب سے بے نیاز بھی نہیں رہتا۔

حضرت شبیر ابن منصور رحمۃ اللہ علیہ ایک دن نماز میں مشغول تھے، ایک شخص برابر متعجب نظروں سے دیکھتا رہا۔ آپ نے فراغت پاکر اس سے کہا کہ متعجب کیوں ہوتا ہے، تجھے معلوم ہے کہ شیطان کی عبادات کا سر انجام کیا ہوا؟

خود پسندی بڑے گناہوں کا موجب ہوتی ہے۔ اور یہ ہی تکبر کی بنیاد ہے، کہ آدمی اپنے کو سب سے اچھا سمجھتا ہے۔ وہ سرے اپنے گناہوں کو گناہ نہیں سمجھتا۔ خوف و ہراس خداوندی کی جگہ نڈر پن آجاتا ہے۔ اپنی تعریف کرتا ہے۔ اپنے ہر عمل کو نیک اور صحیح سمجھتا ہے۔ خود نمائی کے بعد دوسرے کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا اور اگر اس کی رائے کے خلاف کوئی کام ہوتا ہے، تو اس طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ ذلیل سمجھتا ہے۔

ناز اور خود نمائی کی بُنیادیں

خداوند عالم کا خوف جس شخص کو ہو گا، اس میں خود پسندی اور خود نمائی نہ ہوگی، اور جو ہر نعمت سے خوش ہوتا ہے، اپنی صفت ذاتی نہیں سمجھتا، وہ بھی خود نمائی کی عادت سے بری ہے۔

ناز اور خود نمائی میں فرق "ناز" اسے کہتے ہیں کہ آدمی خدا کی نعمتوں کو اور عبادات کی عادت کو اپنی صفت ذاتی سمجھنے لگے اور سوچے کہ میں ہی اس خدمت کے لیے موزوں ہوں، کہ اس کی عبادت کر سکوں۔

اگر آدمی کوئی چیز کسی کو بخشش دے کہ سوچ کر میں نے بڑا کام کیا۔ یہ خود پسندی ہے۔ اور اگر اس بخشش کے بدلے میں اس سے بھی کسی بدلے کی خواہش کرے، تو نازاں کہلائے گا۔

سرکار رسالتؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اپنی نماز پر نازاں ہے اس کی نماز بس اسی کے پاس رہتی ہے آگے

نہیں بڑھتی، اور اگر آدمی اپنے گناہوں کا اقرار کرے اور ہنسے، تو بہتر یہ ہے کہ وہ روئے اور اپنے گناہوں کو بُرا تصوّر کرے۔

خُود نمائی کا دفاع

خود نمائی کس طرح دُور کی جا سکتی ہے — خود نمائی صرف جہالت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کا دفیعہ صرف معرفت حقہ، کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

اب آدمی یہ سوچے کہ جو کچھ عبادات کرتا ہے، وہ سب بغیر کسی ارادے کے عمل میں آتی ہیں۔ بانجھ میں اس عبادت کا جوہر تھا کہ بغیر کسی ارادے کے عمل میں آ گئیں۔ اور تیری خود نمائی نے تیری ذاتی قوت سے ان کو حاصل کیا ہے۔

اگر تجھ میں اس کا جوہر موجود ہے، تو خود پسندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے کہ خود خداوند عالم کا فرمانبردار ہے۔ اور اگر تو اپنی قوتِ ارادی کے ماتحت تمام عبادات کرتا ہے، تو یہ سوچے کہ یہ قوت ارادی جو تیرے اعضاء میں آئی وہ کس کے حکم سے پیدا ہوئی۔ اور اگر یہ خیال ہو کہ یہ تمام ارادے میری خواہش سے ہی پیدا ہوتے ہیں، تو اس خواہش کا پیدا کرنے والا بھی کوئی ہونا لازمی ہے، کہ اس خواہش کو پیدا کرنے والا کون ہے۔ جس نے تجھ کو اس کام کرنے پر مجبور کر دیا کہ تو ضرور کرے گا۔ درحقیقت یہ خواہش تیری ذات سے نہیں ہوتی۔ کیونکہ غیر محسوس طریقے پر تیرے ضمیر پر کوئی مؤکل مسلّط ہے۔ جس کو تو سمجھ نہیں پاتا۔ اور یہ تیری خود نمائی تیری جہالت کا سبب ہے۔ کیونکہ تیری ذات تیرے جوہر سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ سب خدا کی عطا کردہ ہے، اور اس کا فضل و کرم ہے کہ تجھ کو نیک راستے پر لگا دیا، اور گنہگاروں کے راستے سے نجات دی۔ یہ اس کی عنایت اور کرم ہے۔ بلکہ یوں کہو، کہ تجھ کو اپنے قہر کی زنجیروں میں جکڑ دیا، تاکہ تو کوئی گناہ نہ کر سکے۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنے کسی غلام کو بغیر کسی معاوضے کے خلعت انعام میں دے۔ اور وہ اس پر حیران ہو جائے۔

تجھ کو بھی متعجب ہونا چاہیے، اور اس کا شکر گذار، کہ بغیر مانگے سب کچھ مل گیا، اور سوچ کہ تجھ کو یہ سب کچھ کیسے مل گیا۔ اس میں خود نمائی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہ مسئلہ آسانی سے اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ بادشاہ تجھ کو ایک گھوڑا انعام میں عنایت کر دے تو تجھ کو تعجب نہ ہو۔ اور اگر غلام عنایت کر دے، تو یہ سوچ کر متعجب ہو کہ چونکہ گھوڑا میرے پاس موجود تھا۔ لہٰذا غلام عنایت ہوا ہے اور چونکہ گھوڑا بھی اسی نے دیا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں اسی کے کرم کے نتیجہ ہیں اس میں خود پسندی کا کیا محل ہے؟

اسی طرح اگر تم یہ کہو، کہ مجھ میں عبادت کی طاقت تھی اور اس کی محبت۔ اس لیے خداوند عالم نے وہ جذبہ بھی عنایت کر دیا۔ لہٰذا یہ سوچو، کہ تم میں محبت اور طاقت کا جذبہ کس نے عنایت فرمایا؟ اور اگر یہ جواب دو گے کہ خداوند عالم کی محبت اس کی معرفت کے سبب تھی۔ تو یہ سوچو، کہ معرفت کیسے پیدا ہو گئی، اور اگر معرفت دوست رکھنے کی وجہ سے ہوتی، تو دوستی اور دیدار کی خواہشات کہاں سے آئیں؟

معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اسی کی بخشش کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا اس میں خود نمائی کی ضرورت نہیں تم اس کے پیدا کئے ہوئے ہو۔ وہ جوہر جو عبادات، معرفت دوستی کا تم میں ودیعت کر دیا ہے۔ لہٰذا تم صرف ایک مظہر ہو جس کے ذریعہ وہ اپنی عبادات کرا رہا ہے، باقی کچھ نہیں ——— صفر

(سوال) اس میں البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب کچھ اس کی دین ہے تو ہم کو سزا و جزا کی کیا ضرورت رہ گئی۔ نہ ہماری نیکی کی وجہ سے ثواب ہو گا، نہ گناہوں کا عذاب!

اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے، کہ انسان خداوند عالم کی طاقت اور قدرت کا نمونہ ہے۔ وہ اپنی ذات سے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (یعنی خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ تم نے کیا وہ ہم نے ہی کیا تم نے نہیں کیا) لیکن یہ سب کچھ علم خدا کے ارادے کے بعد عمل میں آیا۔ لہٰذا یہ خیال ہوتا ہے کہ جو کچھ کرتا ہے، وہ سب کچھ انسان نے کیا ہے۔

ان میں بڑے بڑے رموز پوشیدہ ہیں، جو آسانی سے سمجھ میں نہ آسکیں گے۔ بہر حال انشاء اللہ توکل و توحید کے باب میں کچھ نہ کچھ اس کے متعلق بیان کیا جائے گا۔

یہاں تھوڑی سی بات اس سلسلے میں سمجھ لینا چاہیے! ——— فرض کیا کہ عمل تمام کے تمام تمہاری ہی طاقت کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں، لیکن وہ طاقت بغیر ارادے اور علم کے بھی ناممکن ہے، اور انسان کے اعمال کی بنیاد تین صفات پر مجتمع ہے۔ اور وہ صفات بھی خداوند عالم ہی کی عنایت کی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب مثال کے ذریعے یوں سمجھ لو! کہ

ایک عظیم الشان خزانہ جو تمہارے حصولی قدرت سے باہر ہو، اور اس کا خزانچی اس کی کنجیاں تم کو دیدے اور وہاں تک تم پہنچ جاؤ۔ اور وہ سب خزانہ حاصل کر لو، تو کیا وہ پورا خزانہ اس خزانچی کو واپس کر دو گے؟

لہٰذا معلوم ہوا کہ تمہاری قدرت (طاقت) جو تمہارے اعمال کی بنیاد ہے۔ اس کے تمام ذرائع خداوند عالم نے ہی مہیا فرمائے ہیں، اور تم کو اس کا شکر گذار رہنا چاہیے، کہ اس نے تم پر اتنا رحم کیا، کہ ایک شخص کو اس سے محروم کیا اور وہ فاسق ہو گیا۔ تم کو عبادات کے راستے بتا دیے، تاکہ نجات پا سکو! یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ فاسق کو گناہوں کی کنجی دے کر عبادات کے دروازے اس پر سے بند کر دیئے۔ یہ اس لیے نہیں

کہ انھوں نے کوئی گناہ کیا ہے، بلکہ اُن کی عقل کے مطابق ایسا کیا گیا ہے۔ اسی طرح تجھ کو بھی کسی نیکی کے بدلے میں عبادات کی قدرت نہیں دی، بلکہ اس کا فضل تمھارے شاملِ حال ہوگیا، اور اس کی توحید سے واقف ہو گئے ـــــ اور جب توحید سے واقف ہو گئے، تو خود نمائی تمھارے قریب نہیں آنا چاہیے۔

اگر کوئی ہوشیار آدمی یہ سوچنے لگے کہ میں عقلمند ہوتے ہوئے مال سے محروم ہوں اور بیوقوفوں کے پاس اس کی افراط ہے، تو یہ بھی خود نمائی ہوگی، بلکہ اس کو سوچنا چاہیے کہ عقل دنیا میں سب سے بہترین دولت ہے۔ لہٰذا یہ بات ذرا بعید از عدل ہوتی کہ مال اور عقل دونوں ایک ہی جگہ جمع کر دیا جاتا۔ لہٰذا کوئی سمجھ دار آدمی اس بات کو خود بھی نہ مانے گا۔

اسی طرح ایک حسین عورت ایک بدشکل مالدار کو دیکھ کر کہنے لگا، کہ یہ تمام زر و جواہر سے آراستہ ہے، اور میں محروم ہوں۔ ذرا وہ خود انصاف کرے کہ سب سے بہترین دولت حُسن اس کو بخشی گئی، اب وہ دُنیوی مال کو کیوں چاہتی ہے۔

جناب داؤد علیہ السلام نے عرض کی، کہ بار الٰہا! کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ میری امت میں سے کوئی نہ کوئی روزے نہیں رہتا۔ اور کوئی دن ایسا خالی نہیں جاتا کہ میری اولاد میں سے کسی نہ کسی نے نماز نہ پڑھی ہو۔ تب وحی نازل ہوئی، اے داؤد تم صحیح کہتے ہو۔ لیکن اگر میں اُن لوگوں کو توفیق نہ دوں، تو کیا ہو۔ اور اگر تم کو آزمانا ہے تو میں کچھ وقت کے لیے تم کو تمھاری رائے کے مطابق کام کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔ چنانچہ اس مہلت کے وقت وہ غلطی سرزد ہوئی کہ تا زندگی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

حضرت ایوبؑ نے ایک بار عرض کی، بار الٰہا! میں نے ہر مصیبت پر ہزار شکر ادا کیا۔ ندائے آسمانی آئی، ایوب! اگر ہم صبر نہ دیتے، تو تم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ حضرت ایوب نے فوراً توبہ کی اور عرض کی صحیح ہے خداوندا، اگر تو صبر کی توفیق نہ دیتا تو میرے بس سے باہر تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے، کہ اگر خدا کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو دنیا کا کوئی آدمی بھی صرف اپنے اعمال کی وجہ سے نجاتِ اُخروی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس لیے صحابہ کی خواہش تھی کہ اگر ہم خاک ہوتے تو اچھا ہوتا۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد کوئی سمجھ دار آدمی خود پسندی نہیں کر سکتا۔

توجیہات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، کہ بعض لوگ اپنے مال و اسباب یا بعض اپنے حسن و جمال میں خود نمائی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ ان تمام چیزوں کا لگاؤ اُن کی ذات سے ذرہ برابر نہیں ہوتا۔

اگر کسی بادشاہ کی کیفیت دوزخ میں دکھادی جائے تو اس کے نسب کی کیفیت اس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ اس اعلیٰ نسبی پر فخر کرتا تھا، اور آج کیا حال ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نسب میں دنیا کا کوئی آدمی نہ تھا۔ لہٰذا کسی کو اپنے نسب پر گمان نہ کرنا چاہیے۔ بعض لوگ گناہ کرتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ اس کی کوئی مکافات نہیں ہے اور وہ خود سری میں تمام افعالِ شنیعہ کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور اپنے باپ دادا کے اعمال کو بھول جاتے ہیں، اور وہ صرف ان لوگوں کے اعمال پر فخر کرتے ہیں، حالانکہ اُن میں بھی بعض بعض لوگ گنہگار تھے۔

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نسب کے متعلق فخر کرنے کو منع فرمادیا۔ اور صرف اولادِ آدم ہی کا خطاب سب کو دیا ہے۔

حضرت بلال جب اذان دیتے تو صحابہ کہتے کہ اس حبشی غلام کو مؤذن کا عہدہ کس طرح مناسب ہے؟ اس اعتراض کے بعد ہی یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰىکُمۡ۔ اس کے بعد یہ آیت آئی وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ۔ تب جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا سے فرمایا کہ بیٹی! اپنا راستہ خود درست کرو میں روزِ قیامت کچھ کام نہ آؤں گا۔ اور جناب صفیہ سے فرمایا کہ اپنے اعمال خود درست کرو۔ اس لیے کہ میں کام نہ آسکوں گا۔ اگر آپ کے عزیزوں کو آپ کی ذات کی وجہ سے ان کے اعمال میں کوئی فائدہ پہنچ سکتا۔ تو اپنی بیٹی حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کو عبادت کی تکلیف سے نجات دلادیتے اور خوشی سے زندگی گذارتیں۔

لیکن پھر بھی یہ طے ہے کہ اعزا و اقربا کی بخشش کی اُمیدیں واثق ہیں جیسا کہ خداوند عالم فرمارہا ہے کہ وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی (یعنی اے رسول جیسے چاہنا کرنا، تم مالک ہو!)

اگر کوئی بیمار صرف اپنے باپ کی وجہ سے کسی چیز سے پرہیز نہ کرسکے، تو ایسے بیمار کو معلوم ہونا چاہیے کہ بعض بیماریاں ہی لاعلاج ہیں طبیب کا کامل ہونا ہی کام نہیں آتا۔

یا کوئی بادشاہ اپنے ہر آدمی کی شکایت نہیں کرے گا۔ چہ جائیکہ بادشاہ کسی کو دشمن سمجھتا ہو۔ لہٰذا اس کی شفاعت خود کرنا تو درکنار، دوسروں کی سفارش پر بھی عمل نہ کرے۔

اب یوں سمجھ لینا چاہیے، کہ گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب خدا ہی کے ہیں۔ لہٰذا اگر آدمی کوئی چھوٹا سا بھی گناہ کرے گا، ہو سکتا ہے کہ وہ ہی معصیت کا باعث ہو جائے، اور خداوند عالم اسی وجہ سے ناراض ہو جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جس بات کو تم تھوڑا سا تصور کرتے ہو، وہ بڑی ہے۔ مسلمان تو سب ہی بخشش کا سہارا لگائے ہیں، لیکن سمجھدار لوگ صرف اُمید پر نڈر ہو کر گناہ نہیں کرتے۔ اور جب خوفزدہ ہوں گے تو گناہ سرزد نہ ہوگا، اور جب گناہ نہ ہوگا تو خودنمائی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

دسواں اصُول

غفلت - غرور - گمراہی

جو آدمی گمراہ ہوا اور ایمان کی نورانی شعاعوں سے محروم رہا۔ اس نے دُنیا و آخرت میں اپنا دین اور ایمان سب کچھ کھو دیا۔ اور وہ اس لیے کہ وہ دین و ایمان سے ناواقف تھا، اور اس کے جہل نے اس کو خواہشات نفسانی کا اسیر بنا دیا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ گمراہ ہو گیا، بھٹک گیا، یا غفلت کی وجہ سے کچھ سمجھ میں ہی نہ آسکا۔ اور جو آیا بھی وہ اُلٹا۔ ایسے آدمی کا ذکر تفصیلی طور پر لکھا جا چکا ہے۔

نادانی کے سبب جو گمراہیاں اور تاریکیاں انسان میں پیدا ہوتی ہیں، وہ بیان کی جاتی ہیں:

صحیح راستے پر گامزن نہ ہونے والے آدمی کی مثال ایسی ہی ہے کہ آدمی کسی پیچیدہ راستے یا مشکل ترین راہوں کو اپنے جہل یا کمزوری یا نادانی کی وجہ سے عبور نہ کر سکے۔

راہ ایمانی میں رکاوٹ ڈالنے والی چیزیں بس صرف خواہشاتِ دُنیوی ہیں۔ جو مثلاً جاہ و مال کی محبت شکم پروری کی خواہش اور نفسانی ضرورت کو پورا کرنا۔

ان تینوں دُشوار گذار راستوں میں سے بعض تو ایک ہی طے کرتا ہے بعض دوسری راہ تک پہنچ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن ان دُشواریوں کو مکمل طور پر طے کیے بغیر آدمی کی تکمیل نہیں ہوتی۔

جہل کی وجہ سے انسان کو جو دُشواریاں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے تین سبب ہیں:

غفلت اور بے خبری، اس کا نام جہالت اور نادانی ہے۔ وہ ان لوگوں میں ہے کہ قافلہ آگے بڑھ جائے اور وہ غفلت میں پڑا سوتا رہے۔

دوسرے وہ گمراہی ہے، جو آدمی کو قطعی اُلٹا چلا جاتی ہے۔ راستہ کسی طرف ہے، اور وہ کسی طرف جاتا ہے۔ اور جتنا جتنا وہ راستہ چلتا ہے، اتنا اتنا اپنی اصل منزل کو چھوڑتا ہے۔ اسی کو ضلالت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

تیسرے غرور اور عقل کا پھر جانا ہے۔ مثلاً آدمی گھر سے حج کے لیے چلے اور انتہائی بے فکری سے خرچ کرتا چلا جائے۔ راستے میں جب کمی ہو، اور وہ مزید زادِ راہ حاصل کرنا چاہے، تو اس کو جو کچھ ملے، وہ سب بیکار اور کھوٹا ہو، اور بروقت وہ بیکار ثابت ہو، اس وقت وہ ہاتھ ملتا رہے۔

خداوند عالم اس قسم کے لوگوں کے لیے ارشاد فرما رہا ہے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (یعنی سب سے زیادہ

وہ لوگ خسارے میں رہیں گے جنھوں نے عمر بھر اپنے خیال میں نیکیاں کی ہوں گی، لیکن درحقیقت سب کچھ غلط تھا۔ وہ لوگ اوّل کسوٹی پر ہر عمل کو کسنا سیکھتے اور کھرے کھوٹے کی پہچان کے بعد اعمال کرتے۔

معیارِ آخرت کی راہ | کسوٹی کا جاننے والا اور پرکھنے والا اُستاد ہوتا ہے۔ یا تو آدمی میں خود وہ صلاحیتیں موجود ہوں۔

اس میں صرف اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ خواہشات کی روک تھام ہی صرف کسوٹی ہے۔ جس کام کو تمھارا جی چاہے، اس کی مخالفت کرو۔ لیکن اگر اس میں بعض جگہ غلطی سے کوئی اس کام کو کر بیٹھا تو بڑی نادانی ہوگی۔ اس اصل نادانی کی تین قسمیں ہیں۔ اُن میں ہر ایک کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اور جو آدمی اس اصل راستے کو سمجھ گیا، اس کو آگے چلنا آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، صرف اسی وجہ سے ایک مختصر سی دُعا پر اکتفا کرتے اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ (یعنی اے اللہ! تو مجھے نیک ہدایت دے اور اس کے اتباع کی توفیق دے) اب تک اُن طریقوں پر نہ چلنے کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔

غفلت اور نادانی کا دفاع

سرشتِ انسانی | خداوندِ عالم نے انسان کی سرشت میں یہ جوہر پیدا کیا ہے، کہ وہ جس چیز میں خطرہ دیکھے، اس سے پرہیز کرے۔ چاہے اس میں پریشانیاں ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔

غفلت | زیادہ تر بلکہ ننانوے فیصدی آدمی خداوندِ عالم کی خوشنودیوں سے صرف غفلت اور بے وقوفی کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ ان دشوار گذار راستوں اور غفلتوں سے باخبر ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ یہ کہ آدمی خدا کے بتائے ہوئے راستوں پر نبوّت کی روشنی میں قدم اٹھائے، یا ان کے جانشینوں سے سمجھے ورنہ علمائے وقت ہی بتا سکیں گے۔

علمائے وقت | جو لوگ خود علمِ دین سے واقف ہیں، ان کا بھی فرض ہے کہ اہلِ غفلت کو جگائیں اور ان میں ذات پاک اور بلند ترین ہستی حضرت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے اور علماء اُن کے قائم مقام ہیں۔ خداوندِ عالم نے علماء کو ہدایت کے لیے مبعوث کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (اے رسول تم تمام خلق کو بیدار کر کے یہ کہہ دو کہ ایمانداروں اور صالحین کے علاوہ سب دوزخ کے راستے پر چل رہے ہیں) دوسری جگہ فرماتا ہے کہ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (یعنی جس آدمی کا مقصدِ زندگی ہوا و ہوس ہو، وہ دوزخ میں گیا) ایسا آدمی اس گڑھے پر رکھی ہوئی چٹائی پر چلتا ہے، جس پر قدم رکھتے ہی اوندھے بل نیچے گر جاتا ہے اور جس آدمی نے اپنی خواہشات

کی مخالفت کی وہ نجات پا گیا۔

خواہش خواہشات وہ گڑھا ہے کہ جو جنّت کے راستے میں بنا ہوا ہے۔ اب اگر آدمی غافل ہے تو اس کو عبور نہیں کر سکتا، اور اگر معارف ہے تو سیدھا بہشت میں داخل ہو گا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ دوزخ خواہشات سے گھری ہوئی ہے اور جنّت مکروہات کی محصور۔ اب جس نے بھی اس کی اصل کو پہچان لیا وہ فائدے میں رہا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اَھْلُ الْکُوْرِ اَھْلُ الْقُبُوْرِ، یعنی گاؤں والے ایسے رہتے ہیں جیسے قبر میں۔ اسی لیے گاؤں والے اپنے دین سے زیادہ تر غافل رہتے ہیں۔ چونکہ ان کے یہاں عالموں کی کمی ہوتی ہے، اور غفلت و نادانی کی وجہ سے راہِ دین سے بھٹک جاتے ہیں۔ اور اگر کسی شہر کے علماء دُنیا داری میں مشغول ہیں، تو وہاں کی حالت بھی یہی ہوتی ہے، اس لیے کہ جب وہ خود ہی غافل ہوں تو دوسروں کو کیا بیدار کریں گے۔

اگر کوئی عالم لوگوں کو غلط راستوں پر لگا دیتا ہے، اور خواہ مخواہ بات میں بال کی کھال نکالتا ہے، وہ گمراہ کرتا ہے۔ بعض تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی سنّت پر عمل کر رہے ہیں۔ بہشت میں جائیں گے۔ اس لیے کہ خدا کی رحمتیں ہمارے گناہوں سے کہیں زیادہ ہیں، وہ لوگ غافلوں سے زیادہ گمراہ ہیں، اور ایسے شرابی کی طرح ہیں، جس کو سوتے سے اُٹھا کر شراب پلا دی جائے۔ اور وہ نشے سے قطعاً مدہوش ہو جائے۔

جہالت اسی طرح جو لوگ اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں وہ آخرت کا دھیان بھی نہیں کرتے، اور اگر اس کو کوئی ہدایت کرے تو یہ جواب دے دیتا ہے کہ خداوند عالم کو میری نیکیوں کی کیا ضرورت ہے اس کی رحمتیں کہیں زیادہ ہیں، وہ اسی طرح کے خرافات سوچتا ہے اور زبان سے بھی کہتا ہے۔ ایسے ہی آدمی کو جاہل کہتے ہیں۔

اور اس قسم کے علماء بھی دین سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ علماء ایسے اطباء کی طرح ہیں کہ جو کثرت گرمی میں شہد پلا دے، اور یہ سوچے کہ اس میں شفاء ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ شہد میں شفا ہے، لیکن ایسے مریض کے لیے وہ شفا نہیں بنتا۔ خداوند عالم کے احکامات اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث باعث رحمت و شفاعت ضرور ہیں۔ لیکن اس شخص کے لیے جو اپنے گناہوں کی کثرت سے خدا کی طرف سے نا اُمید ہو گیا ہو۔ اور اس مایوسی کی وجہ سے توبہ بھی نہ کرے۔ وہ سوچے کہ توبہ کے دروازے اس پر بند ہو گئے ہیں۔

دوسرے قسم کی بیماری یہ ہے کہ آدمی عبادت کی وجہ سے دیوانہ ہو جائے اور ہر وقت خوف و ہراس طاری رہے۔ یہاں تک کہ کھانا پینا بھی بند کر دے۔ ایسے آدمی کے لیے آیات رحمت مرہم کا کام کریں گی۔

اور اگر نڈر آدمی کے سامنے وہ احادیث یا آیات پڑھی جائیں گی تو اس کو اور بہادر بنا دیں گی۔ ایسا عالم لوگوں کو گمراہ کرنے والا ہے اور شیطان کا پیرو ہے۔

جہاں ایسے عالم ہوں، وہاں شیطان کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح عالم بے عمل کے احکامات اور وعظ وغیرہ کا بھی لوگوں پر اثر نہیں ہوتا اور اگر باعمل ہے، تو ہر آدمی اس کے اقوال اور اعمال سے متاثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ عالم عوام میں مقبول بھی ہو۔ اور اگر مقبولیت نہ ہو تو عالم کو سب کے گھروں پر جاکر ہدایت کرنا چاہئیں۔

ایسے لوگ ننانوے فیصدی ہیں، جو صرف غفلت کا شکار ہیں، اور وہ خود اس کے دفعیّے سے قاصر ہیں جب تک اُن کو ہدایت نہ کی جائے جس طرح ماں باپ یا مدرس بچوں کو باقاعدہ تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کو بھی تربیت دینا ضروری ہے۔

فی زمانہ عالم باعمل کم ہیں۔ اور غفلتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور اُن وعظ اور تقاریر میں وہ اثر نہیں رہا۔ ان کی یہ ظاہری کوشش بیکار رہے۔

گمراہی کا دفعیّہ

دنیا میں بہت سے آدمی آخرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن اُن کے اعتقادات باطل ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ لوگ راہِ راست سے ہٹ گئے ہیں، اور یہ گمراہی ان کے لیے موجبِ حجاب ہو گئی ہے۔

اس گمراہی اور ضلالت کو پانچ طریقوں پر سمجھاتے ہیں تاکہ اس کو سمجھ کر نیک کام کرنے کی کوشش کرو۔ پہلے وہ لوگ ہیں جو آخرت کو قطعی لایعنی سمجھ کر کہتے ہیں کہ انسان موت کے بعد چراغ کی بتّی کی طرح خشک اور نابود ہو جاتا ہے۔ اور اس خیال میں وہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ جاتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی نصائح کو صرف دنیاداری پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ ہی تصوّر دوزخ کے متعلق بھی ہوتا ہے کہ وہ اس خوف کی طرح ہے، جو کسی بچّے کو دلایا جائے کہ اگر وہ مدرسے نہ جائے گا تو چوہے کے بل میں اس کو بند کر دیں گے اور ان کے خیال میں یہ بات بالکل ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ وہ اُن اہلِ بصیرت کے بالکل اضداد ہیں، جو خدا اور عالم کے درمیانی حجابات کو دوزخ سے زیادہ بڑا عذاب سمجھتے ہیں اور اُن کے یہ اعتقادات اُن کی کج روی میں ممدّ و معاون ہوتے ہیں۔ اور وہ شہوت نفسانی کے بندے ہو کر ہر چیز سے انکار کرنے لگتے ہیں۔ یہ باتیں رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہیں، اور ایک وقت وہ آئے گا کہ زیادہ تر لوگ دنیاداری کی طرف محو ہو جائیں گے۔ اُن کو صرف دنیا کی خوش آیند چیزوں سے خوشی ہوتی ہے۔ اور مستقبل کے حوادثات کی فکر۔ لیکن اگر وہ ایمان کو ایمان تصوّر کریں، تو یہ دنیا کی خوشیاں اور تفکّرات اُن کی نظروں میں ہیچ ہو جائیں۔

ایسے لوگوں کو راہِ ایمانی دکھانے کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ آخرت اور ایمان کا تصور اُن کے اذہان میں اُجاگر کیا جائے۔ اور وہ تین طریقوں پر ہو سکتا ہے۔

مثلاً وہ خود جنّت و دوزخ کو اپنی نگاہوں سے دیکھ لیں، لیکن یہ چیز سوائے اولیاء اللہ کے ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اُن میں خواہشاتِ نفسانی کا شائبہ ہی نہیں ہوتا۔ جو انوار اس کی دید کے لیے حجاب بن جاتے ہیں اس کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا جو آدمی آخرت پر ایمان نہیں لاتا، وہ گمراہ ہے۔ اور اس کا راہِ راست پر لانا ناممکن سا ہی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ منکرِ آخرت کو دلائل اور ثبوت کے ذریعہ سمجھایا جائے۔ کہ انسان کی روح ایک ایسا جوہر ہے جو بذاتِ خود موجود ہے۔ اس کو صورتِ جسمیہ کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اس ظاہری جسم کی فنا سے وہ اصل جوہر (روح) فنا نہیں ہوتی۔ اس کو سمجھنے کے لیے بھی بڑی عقل کی ضرورت ہے۔ یہ بات وہ علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، جو اپنے علوم اور عقائد میں پختہ ہوں۔ اس کے متعلق بھی پہلے عنوان میں مفصّل بیان کیا جا چکا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ انبیاء و اولیاء اور علمائے دین کے علوم سے ایسے آدمیوں کو روشنی مل جائے۔ اور یہ بات انھیں لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے، کہ جو ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں۔

اور جو احتراز کرتے ہیں وہ گم گشتہ راہ ہی رہتے ہیں۔ اور عالم، مُرشد یا پیر بلند مرتبے والا ہوگا، اتنا ہی صحبت نشین اس سے فیوض حاصل کر سکے گا۔ اس کی بہترین مثال ہمارے سامنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ہے کہ سرکارِ رسالتؐ کی صحبت سے فیوض حاصل کرتے اور ایمان کی راہ میں وہ مکمّل ہو گئے تھے۔ انھیں صحابہ کی صحبت سے اُن کے تابعین نے فیوض حاصل کیے۔

سرکارِ رسالتؐ کا ارشاد ہے کہ میرے زمانے کے لوگ آئندہ کے لوگوں سے بہتر ہیں۔ ان لوگوں کی مثال ایسی ہوگی کہ جو بچہ اپنے بزرگوں کو سانپ سے پرہیز کرتے دیکھتا ہے، تو خود بھی اس سے بھاگنے لگتا ہے۔ لیکن اگر لڑکا سانپ سے پرہیز کرنے کی اصل وجہ سمجھ لے، تو وہ صحیح راستے پر آ سکتا ہے۔ صرف نام معلوم ہو جانے سے کام نہیں چلتا۔ بہر حال اس کے نام سے بھی خوف ضرور پیدا ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام کا علم اس پائے کا ہے کہ وہ سانپ کو متعدد بار کسی کو کاٹتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھیں اور اس کی وجہ سے ہر آدمی کو موت آ جائے۔ لہٰذا یہ علم تو صرف انھیں کی ذریات کے دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

علماء کا علم ایسا ہے، کہ زہر کے اثرات کو وہ جانتے ہیں کہ آدمی کے مزاج سے بالکل مختلف ہے جس وقت زہر انسانی جسم میں سرایت کرے گا، آدمی مر جائے گا۔ ان کے بعد عوام کا علم، بزرگانِ دین کی صحبت میں

بلبٹھ کر پیدا ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ قُرب، حاصل کرے گا اپنے دل کی بیماریاں کم کر سکے گا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ بعض لوگ آخرت، پر قطعی طور سے نہ یقین کرتے ہیں اور نہ اس کے عدم کا ہی اُن کو تیقّن ہوتا ہے۔ وہ بین بین سوچتے ہیں کہ نہ معلوم کیا راز ہے۔ شیطان ان کو راستے سے بھٹکاتا ہے اور کچھ زمانے بعد وہ لوگ اس بات پہ آجاتے ہیں کہ دنیا ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، اور آخرت کے لیے شبہ ہے لہٰذا شبہ والی چیز، یقین والی چیز چھوڑ کر کیوں لی جائے

لیکن اگر ذرا سا اس بات پر غور کریں گے تو اُن کے شبہات ختم ہو جائیں گے۔ مثلاً دوا ضرور کڑوی ہوتی ہے اور وہ ہر بیمار آدمی پیتا ہے۔ صرف اسی شبہ میں کہ بیماری کم ہو جائے گی۔ یہ بھی شبہ یقین کے بدلے خریدتا ہے اگر گلاس میں پانی ہو اور تم کو شدت کی پیاس بھی لگی ہو، تم پینا چاہو، اور ایک شخص یہ کہہ دے کہ اس میں زہر ہے، تو پیاس چاہے کتنی ہی ہو، ہرگز اس کو منہ سے نہ لگاؤ گے۔ صرف شبہہ کی وجہ سے اپنی پیاس کا خیال نہ کرو گے۔ اسی طرح تجارت میں منافع صرف مشکوک ہے، لیکن آدمی لاکھوں روپیہ صرف کرتا ہے اور اس شبہہ کو مول لیتا ہے

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس دُنیا کی لذّت قطعی فانی ہے۔ ہم کو یقین محکم ہے کہ انتہا سے زیادہ سو برس یہاں رہیں گے۔ اس کے بعد کی زندگی جو غیر معیّنہ مدّت کی ہوگی، وہ سب وہاں گزارنا ہے۔ اس بات میں تو شک کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ آدمی کو موت کا منہ دیکھنا لابدی ہے۔ لہٰذا آخرت پر ایمان لانے والوں کے لیے مرنا آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ایک ملحد سے فرمایا کہ اگر تو سچ کہتا ہے کہ آخرت نہیں ہے اور خدا کی ضرورت نہیں ہے، تو ہمارا اس میں کیا نقصان ہوتا ہے۔ اور اگر خدا اور آخرت کا وجود ہے تو تو یقیناً گنہگار ہوگا۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جو دنیا کو نقد سمجھ کر آخرت کے قرض پر چھوڑنا نہیں چاہتے، لیکن ذرا غور کرنے سے یہ جواب بھی مل جائے گا کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کو ہزاروں برس کی لافانی زندگی سے کیا مقابلہ۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی عقلمند آدمی ایک روپیہ نقد نہ لے گا، اور ہزار روپیہ قرض پر چھوڑ دے گا۔ لہٰذا یہ بھی گمراہی کی طرف لے جانے والا خیال ہے۔

چوتھے اس قسم کے لوگ ہیں، جو یہاں عیش و تنعّم سے زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جس طرح یہاں آرام میں ہیں، وہاں بھی عیش و آرام میں گزر ہوگی۔ اور خداوند عالم کا ہمارے اوپر یہاں پر کرم ہے اور وہاں بھی ہوگا۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے جو واقعۂ سورۂ کہف میں ایک بہن بھائی کا بیان کیا گیا ہے کہ مالدار نے کہا وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا۔ دوسرے نے جواب دیا اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی

یہ بات اِس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ آدمی اپنے بیٹے کو پڑھنے لکھنے اور کسب علوم کی متعدد محنتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن اپنے نوکر پر کوئی اس قسم کی نگہداشت نہیں کرتا، وہ بے لگام گھومتا ہے۔ لہٰذا خداوند عالم نے بھی اپنے نیک بندوں کو امتحاناً اور اُن کی ترقّی کے لیے یہ تمام محنت وجانفشانی کرنا بتائی ہے اور وہ آخرت میں اُن کو اپنا مقرب بندہ سمجھے گا۔ اور وہ عیش وتنعم کا پرورش شدہ آدمی اس کسان کے مثل ہوگا جو کھیت میں کچھ نہ بوئے اور کھیتی کاٹتے وقت دوسروں کا مُنہ تکا کرے۔

پانچویں اُس قسم کے لوگ ہیں، جو صرف اس کے رحم وکرم پر بیٹھے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ہمارے گناہ اس کی رحمتوں سے کہیں کم ہیں۔ لہٰذا ایسے آدمی کو یہاں زراعت۔ تجارت اور تمام کام چھوڑ دینا چاہئیں۔ کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ محنت اٹھانے کی، اس لیے کہ اس نے پیدا کیا ہے وہ ضرور دے گا۔

رزق کے متعلق خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا اور اس کے بعد بھی اگر تیرا ایمان درست نہیں، تو آخرت کے لیے بھی اس نے فرمادیا ہے۔ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ اگر اس کے بعد بھی وہ راہِ راست پر نہیں آنا چاہتا، تو وہ گمراہ ہے۔ وہ ایسا ہے کہ بغیر جماع کیے بیٹے کا خواہشمند ہو۔ حالانکہ خداوند عالم اس پر بھی قادر ہے، لیکن اس نے ایک طریقہ بتا دیا ہے۔ اگر اس پر عمل کروگے تو بیٹا ہوگا، ورنہ نہیں۔

اسی طرح جو آدمی ایمان تو لائے، مگر نیک اعمال نہ کرے تو وہ بیوقوف ہوگا۔ وہ نیک اعمال کے بعد ہی فضل کا مستحق قرار پاسکتا ہے۔ خداوند عالم نے ایک راستہ بتا دیا ہے، اگر اس پر عمل کروگے تو نجات پاؤگے ورنہ نہیں۔ اور اپنے وعدے کے ایفا کرنے کو بھی فرما دیا ہے۔ کہ اگر نیک اعمال ہوں گے تو اچھا اجر ملے گا۔ ورنہ بُرا۔ لہٰذا اس کے حکم کو اچھی طرح غور کرلو۔ دنیا کے عیش وتنعّم پر نہ اکڑو، اور نہ خدا کی رحمت پر غرّہ کرو۔

پندار

پندار کے اصل معنی ہیں، اپنے متعلق غلط فہمی پیدا ہو جانا۔

جو لوگ اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل دھوکے میں ہیں اور پندار میں مبتلا ہیں۔

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ پندار اور غرور کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس کے رموز سے ناواقف ہیں اور جہالت کی وجہ سے وہ اس گناہ میں پڑے ہیں۔ وہ تو درکنار ہم تو پڑھے لکھے آدمیوں میں سے ننانوے فیصدی آدمیوں کو اس دھوکے میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت آدم کو خداوند عالم ندا دے گا کہ اپنی اولاد میں سے دوزخیوں کو الگ کرو۔ آپ عرض کریں گے کہ میں آخر کس کو جنّت کے لیے چنوں؟ آواز آئے گی ہزار میں صرف

ایک جنتی الگ نکال دو۔ باقی سب دوزخی ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ عارضی طور پر ہی دوزخ میں جائیں گے۔

ان میں بعض گمراہ ہوں گے۔ بعض غفلت کی وجہ سے۔ بعض اپنے غرور وتکبر کی وجہ سے۔ بعض اپنی خواہشات کے مطیع، یہ سب ایک طرف، اور اہلِ پندار کی تعداد اَن گنت ہوگی۔ یہ لوگ زیادہ تر علماء، عابدین، صُوفیاء، اور مال دار ہوں گے۔

علماء کا پندار پہلا طبقہ اہلِ پندار میں علماء کا ہے، کہ عالم ہمیشہ حصولِ علم میں کوشاں رہتا ہے۔ مگر معاملاتِ دین و دنیا میں کمزور رہے۔ وہ گناہ سے پرہیز نہیں کرتا اور سوچتا ہے۔ کہ میرا علم تمام گناہوں کا کفارہ ہے، بلکہ ایک عجیب دھوکا ہے۔ یہ ہوگا کہ یہ تمام مخلوق بھی ہماری وجہ سے بخشی جائے گی۔ ایسی علماء کی مثال یہ ہے کہ جو بیمار طبیب سے بحث وتکرار کے بعد نسخہ لکھائے، اور دَوا کی تلخی کی وجہ سے اس کو استعمال نہ کرے۔

خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ نجات وہ ہی حاصل کرے گا جو پاک اور صاف ہو، اور علمِ دین سیکھے۔ اور خواہشاتِ نفسانی کے خلاف عمل کرنے والا جنت میں جاسکے گا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ عالمِ بے عمل کو دوزخ میں اس طرح ڈالا جائے گا کہ اس کی پیٹھ اور گردن ٹُوٹ جائے گی۔ بعض علماء علم وعمل دونوں میں ظاہری طہارت کرتے ہیں، لیکن باطن ان کا ناپاک رہتا ہے، اور ریاکاری وحسد، بغض عداوت کرتے رہے۔ رسول اور خدا کے احکامات کو نہ مانا۔ وہ بہشت میں نہ جا سکیں گے۔ ایمان، حسد کی وجہ سے اس طرح تباہ ہوجاتا ہے، جیسے آگ لکڑی سے۔ وہ لوگ ایسے ہیں جیسے بیت الخلاء، کہ باہر سے سفید ہے اور اندر گندگی کی وجہ سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

عالمِ بے عمل کی آنحضرتؐ نے چھلنی سے تشبیہہ دی ہے، کہ اس میں سے آٹا نکل جاتا ہے بھُوسہ رہ جاتا ہے وہ لوگ علم وہنر کی باتیں دوسروں کو سکھاتے ہیں، لیکن خود مکروفریب میں پھنسے رہتے ہیں۔

بعض علماء گناہ کرنے کے باوجود اپنے کو پاک تصور کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے زیادہ گناہ گار ہیں، جو جہالت میں گناہ کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ لوگ گناہوں کو دیدہ دانستہ کرتے ہیں، اور شیطان اُن کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ وہ اس عالم سے کہلواتا ہے کہ اگر عوام ہماری عزت نہ کریں گے، تو اسلام کی کیا عزت کر سکتے ہیں؟

ایسے علماء آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کی سیرت کو "معاذ اللہ" اسلام کی ذلت کا باعث سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری وجہ سے اسلام کی عزت ہوگی۔ وہ دربارِ شاہی میں انتہائی شوق سے جاتے ہیں اور سبب یہی بیان کرتے ہیں کہ یہ ہماری رواداری ہے۔ اس سے مسلمانوں کی سفارش کا موقع ملتا ہے۔

وہ لوگ مناظرہ ومباحثہ ہی سیکھتے ہیں۔ باقی اور علوم سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ ایسے آدمی کو علم سے معذور سمجھتے ہیں کہ جو علومِ باطنی کی تحصیل میں لگے ہوں۔

اس پندار کی تفاصیل ہم نے احیاء العلوم میں بیان کردی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تفصیل بیان کرنے سے طول ہونے کا خیال ہے بعض علماء صرف مسجع و مقفیٰ عبارت بولتے ہیں۔ حالانکہ ان کی اصلیت فقط جملے ہی جملے ہوتے ہیں۔ اور لوگ ان کے وہ جملے سن کر واہ واہ کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ عوام کو نصیحت کرنا چاہیے تاکہ وہ آخرت کے کاموں میں اپنا وقت صرف کریں۔

بعض علماء ظاہر فقہ میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ دراصل فقہ ایک مختصر سی تعریف کے ساتھ بتائی جا سکتی ہے۔ دراصل وہ فقہ جو آخرت کے متعلق ہوتی ہے، وہ چیز ہی دوسری ہے۔ بظاہر فقہ بادشاہوں کے مخلوق پر حکومت کرنے کے طریقوں کو کہتے ہیں۔

فقیہہ اس امر سے واقف ہے کہ جو بات بظاہر درست ہے، اس کا سرانجام کیا ہوگا۔ مثلاً ایک آدمی زکوٰۃ کا مال سال کے آخر میں اپنی بیوی کو دے کر پھر اس کو خود خرید لے تو بظاہر فقہی مسئلے کے ماتحت زکوٰۃ اس پر سے ساقط ہو جائے گی۔ مثلاً

بادشاہ سے زکوٰۃ لینے والے آدمی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ زکوٰۃ لے۔ اس لیے کہ یہ مسئلہ سال کے ختم سے پہلے ہی منقطع ہو جاتا ہے، اور فقیہہ اس پر ظاہر حالات دیکھ کر فتویٰ بھی دے گا کہ اس پر سے زکوٰۃ ساقط ہوگئی۔ حالانکہ اس کو اصل معاملے کی خبر بھی نہیں۔ کہ اس نے ایسا صرف اس لیے کیا ہے کہ زکوٰۃ کے وجوب کو قطع کرنا چاہتا ہے۔ اور تمام بہانے تراشیاں خدا اور رسولؐ کے نزدیک بے ایمانی اور گناہِ عظیم ہے۔ اس کے بعد قیاس کر لینا چاہیے، کہ ایسے آدمی آخرت میں کہاں تک درست ہیں۔

اسی طرح جو مرد اپنی عورت کو پریشان کرے۔ جس کی وجہ سے وہ اس سے مہر واپس کر کے خلع لے تو بظاہر یہ سب جائز ہی ہوگا، لیکن آخرت میں وہ دستِ بگریباں ضرور ہوگا۔ اس لیے کہ بدل اس نے ظلم کیا ہے، اور یہ خلع مکروہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چیز کسی آدمی سے مانگو اور وہ شرما کر حضوری میں دے دے۔ تو وہ جائز نہ ہوگی، بلکہ اس کو مصادرہ کہتے ہیں۔ یعنی دراصل وہ غصبی چیز ہے۔ اسی قسم سے ظاہری طور پر فقہ کے مسائل میں فتویٰ دیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل معاملات کچھ اور ہی ہوتے ہیں اور باطنی علوم نہ رکھنے کی وجہ سے ایسے علماء پندار میں مبتلا رہتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگ فضیلت کی وجہ سے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہم کی وجہ سے طہارت میں دیر کرتے ہیں، اور اس طہارت کی وجہ سے نماز دیر سے پڑھتے ہیں۔ پانی کو فقط اپنے گمان کی وجہ سے نجس سمجھتا ہے۔ لیکن کھانے وقت اس کے نزدیک ہر چیز طاہر اور جائز ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حرام چیزیں بھی زہر مار کر لیتا ہے۔ وہ شخص سیرت صحابہ کو بھلا چکا ہے۔ ویسے جھوٹے اور ظاہر دار عابد اس قسم کی ظاہری

احتیاطیں برتتے ہیں۔

بعض علماء دھوبی کے دُھلے ہوئے کپڑے کو پہننا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ سرکار رسالت کو تحفۃً کفار جو کپڑے بھیجا کرتے، وہ بغیر کسی تکلف کے زیب تن فرما لیتے، اور کوئی روایت ایسی نہیں ملتی، جس میں دھو کر پہننے کے متعلق ہو۔ بلکہ حضورؐ کفار کے ہتھیار لگا کر ہی نماز ادا کرتے تھے اور اُن ہتھیاروں کے چمڑے وغیرہ کو کوئی بھی نجس قرار نہ دیتا۔

جو آدمی پیٹ کے لیے تو ہر طرح کا کھانا کھالے اور بظاہر تمام احتیاطیں برتے وہ شیطان کا مرید ہے

ہم کہتے ہیں کہ اگر آدمی تمام احتیاطیں بجالاتا ہے اور صرف پانی ہی کا اصراف زیادہ کرتا ہے اور نماز کو وقت پر ادا نہیں کر پاتا۔ تب بھی وہ اہلِ پندار ہی سے ہے۔

مسئلہ برائے نماز — ان تمام احتیاطوں کو باب الطہارت میں لکھ دیا گیا ہے بعض لوگوں پر نیت کے وقت دوسرے اوہام طاری رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیت کرتے وقت آواز زور سے نکالتے ہیں اور ہاتھ جھٹک کر اُٹھاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پہلی رکعت باطل ہو جاتی ہے —— سمجھنے والی بات یہ ہے کہ نیت جس طرح صدقے اور زکوٰۃ کی ہوتی ہے۔ اسی طرح نماز کی بھی۔ مگر نیت خراب ہونے پر کوئی دوبارہ نماز نہیں پڑھتا۔

بعض لوگ سُورۂ فاتحہ کے پڑھنے میں صحیح مخارج کو روا کرنے میں خضوع و خشوع کو بھول جاتے ہیں، لیکن نمازی کا پہلا فرض یہ ہے کہ حالتِ نماز میں صرف اس کی حقیقت کو سمجھے اور قرآن کے معانی میں اپنا دل رجوع کرے۔

(نوٹ) اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ باب نماز میں لکھا جا چکا ہے۔ مترجم)

زاھد

زاہد، پرہیزگار کو کہتے ہیں۔ یعنی جو آدمی دُنیا کی جاہ و حشم سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ زاہد ہے بعض ناتجربہ کار زاہد لوگوں کے خوف اور لعن طعن کی وجہ سے کسی کا تحفہ یا ہدیہ بھی قبول نہیں کرتے، اور اُن کو یہ کہہ کر بھی دیا جاتا ہے کہ کسی مستحق کو دے دیا جائے، تو یہ اس کے لیے اور بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے زہاد، امرا کی عزت زیادہ کرتے ہیں۔ اور عمل صرف نادانی اور تکبر کی وجہ سے عمل پذیر ہوتا ہے بعض لوگ ہر قسم کی ظاہری عبادات کرتے ہیں، لیکن اپنی بد اخلاقی اور غرور سے اپنی عادات کو پاک نہیں کرتے۔ وہ لوگ عموماً حاسد اور غصہ ور ہوتے ہیں۔ لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور ناراض رہتے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے، کہ یہ عادات تمام اعمال حسنہ کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس لیے کہ خوش اخلاقی ہی تمام اعمال کی بنیاد ہے، مگر وہ اپنی عبادت کے غرور

میں مخلوق کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم جو تمام عابدین اور زہاد کے سردار تھے۔ انتہائی خندہ پیشانی سے ہر ایک کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور گندے سے گندے آدمی سے بھی مل کر بیٹھتے اور مصافحہ کرتے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ آنحضرتؐ سے بھی اپنے کو اونچا سمجھے، وہ کیسا ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر بہت سیدھے سادھے ہوتے ہیں، اور شریعتِ اسلام پر چلنے کے دعوے دار ہیں۔ لیکن پیغمبرِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کے بجائے ہر کام میں مصر ثابت ہوتے ہیں۔

صُوفی

صُوفیوں کے مدارج صُوفیوں سے زیادہ تکبّر و غرور کسی دوسرے طبقے میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان لوگوں کا مسلک انتہائی مشکل ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اننتے ہی دھوکے میں مبتلا رہتے ہیں۔

تصوّف میں سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ صوفی درجات پہلے حاصل کرے۔

پہلا یہ کہ صوفی اپنے نفس پر اتنا قابو پالے کہ اس میں کسی خواہش کا جذبہ ہی نہ پیدا ہو۔ مثلاً خواہشاتِ نفسانی۔ غصہ، حسد اور دیگر بری خواہشات اور وہ ہر کام بغیر شریعت کے حکم کے نہ کریں۔ جس طرح قلعے کو فتح کرنے کے بعد اس کی آبادی کو بجائے قتل کے صرف اپنا تابعدار ہی بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح سالک بھی شریعتِ اسلام کا محکوم مطلق ہو جانا چاہیے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ دین دنیا دونوں کو بھول جائے۔ یعنی عالم حسیات کے حدود کو عبور کر گیا ہو۔ اس لیے کہ قوتِ احساس اگر کام کرے گی تو اس میں حیوانیت باقی رہتی ہے۔ اور اسی سے تمام خواہشات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے سامنے کچھ بھی آئے وہ سب گھاس ہو، اس لیے کہ اس میں قوتِ احساس مفقود ہو چکی ہے اور تصوّر میں آنے والی چیزیں ہیچ ہوتی ہیں اور وہ اس آیت کا مصداق بن جائیں کہ جنّتی لوگ اکثر بہت سیدھے ہوتے ہیں۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ صُوفی جمال الٰہی میں گم ہو کر رہ جائے۔ اب اس میں کوئی قوتِ حس کا شائبہ ہی باقی نہ رہے۔ اور قوتِ احساس اور قوتِ تخیلات سے جو چیز بنتی ہے اس کا تعلّق صرف اتنا ہی ہو، جیسے انسان کی آواز کو آنکھ کے ساتھ (یعنی آنکھ اور آواز کے سننے سے کوئی تعلق نہیں) اور کان کا تعلّق رنگ کی معلومات سے کوئی نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا تین درجات کے بعد سالکوں کے سینوں میں اور بھی اسرار ہوتے ہیں، جو بیان نہیں کیے جا سکتے۔ بلکہ بعض نے تو یگانگت ہی کہہ دیا ہے اور بعض حلول کے قائل ہو گئے ہیں۔

اتنا بتا دینا اس وقت کافی ہے کہ صوفی پر "حال" میں جو کیفیات طاری ہوتی ہیں اور اس مدہوشی کے

عالم میں وہ جو کچھ کہتا ہے، لوگ بظاہر اس کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ وہ سب مکاشفات ہوتے ہیں، لیکن سمجھنے اور بیان کرنے والے اس کو سمجھ یا بیان نہیں کر سکتے۔

یہاں مختصر طور پر تصوف کی ایک جھلک سی دکھائی گئی ہے۔

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ لوگ صوفیوں کے کپڑے پہن کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، اُن کا پیشہ تو صوفیوں کا سا ہوتا ہے۔ اسی طرح وجد میں آتے ہیں۔ اور اسی حال کو تصوف کا آخری درجہ سمجھ رکھا ہے، بلکہ بعض تو اُن میں سے صوفیوں کے سے کپڑے بھی نہیں پہنتے، بلکہ بہترین تہبند اور ریشمی چادریں زیب تن کیے رہتے ہیں۔ وہ لوگ صرف رنگین لباس کو تصوف کی معراج سمجھتے ہیں۔ حالانکہ پہلے صوفی کپڑوں کو اس لیے رنگ لیا کرتے تھے کہ اُن کے کپڑے جلدی میلے اور گندے نہ ہو جائیں۔ لیکن نقلی صوفیوں پر کیا بار ہے؟ کہ اپنے کپڑے بھی صاف نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ غضب یہ ہے کہ نئے کپڑوں پر عمداً پیوند لگاتے ہیں، مگر بدبخت پرانے کپڑوں میں پیوند نہیں لگاتے۔

سب سے پہلے گدڑی پوش حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے ہیں، جن کی گدڑی میں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

دنیادار صوفیوں کی سزا

آج کل کے عیار صوفی اپنے جسم سے چھوٹا یا بڑا کپڑا پہننے کو عار سمجھتے ہیں۔ یہ ظاہری حالت ہے۔ اب عمل پر غور کیا جائے کہ وہ گناہوں کو ترک نہیں کر سکتے اور فرائض کو ادا کرنے کی نیت رکھتے۔ اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اپنے گناہوں کا اعتراف تو کیا، بلکہ اُن پر نادم بھی ہونے کو تیار نہیں۔ وہ لوگ شیطان اور خواہشاتِ نفسانی کے بندے ہیں۔

ان کا قول ہے کہ ہم ظاہری صورت کو نہیں دیکھتے، بلکہ ہمارے دل میں ہر وقت خدا کا تصور رہتا ہے۔ تو ہم کو ان ظاہری اعمال کی کیا ضرورت ہے۔ ان ظاہری عبادات کا حکم اسیرانِ ہوس کے لیے ہے۔ ہمارا نفس تو ویسے ہی مُردہ ہو چکا ہے، اور ہمارے دین میں خلل کا کوئی اندیشہ ہی باقی نہیں رہا۔ عابدوں کو دیکھ کر بیگاری کا خطاب دیتے ہیں اور علماء کو فضول باتیں کرنے والوں کا لقب دیتے ہیں۔

اس قسم کے صوفی قتل کرنے کے لائق ہیں، اور اُن کا خون سب پر مباح ہے بعض لوگ صوفیوں کی خدمات میں تن من دھن لگاتے رہتے ہیں، اور دراصل حق خدمت ادا کرتے ہیں، لیکن ایسے ظاہر دار صوفیوں کے مُرید بھی ایسے ہی ہیں کہ جہاں کہیں مال دیکھیں، فوراً حاصل کر لیں اور اُن صوفیوں کی آڑ میں شہرت چاہتے ہیں ایسے لوگ انتہائی مکار اور فریبی ہیں۔

بعض ایسے بھی ہیں کہ ان تمام دنیوی خواہشات کو مغلوب کر کے خدا کی لو لگاتے ہیں۔ اور گوشہ نشینی کے بعد اسرار خداوندی سے واقف ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ جو چاہیں معلوم کر لیں۔ وہ لوگ اگر کسی وقت ڈگمگا جائیں، تو

من جانب اللہ ان کو تنبیہہ بھی ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ ایک سچّے خواب کی طرح سب کچھ دیکھتے ہیں۔ فرق اتنا ہوگا کہ عوام وہ سب چیزیں سوتے میں دیکھتے ہیں اور وہ جاگتے ہیں۔ اگر کم ظرف ہے تو وہ اس منزل پر آکر چیخنے چلّانے لگتا ہے کہ مجھے سب کچھ نظر آنے لگا، اور اپنے کو کامل ترین صوفی سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ابھی وہ کسی ایک صفت سے بھی واقف نہیں ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، بس وہی موجود اللہ ہے اس کے آگے کچھ نہیں۔ حتیٰ کہ اب اپنے کو آگے بڑھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ نتیجے میں وہ اصل ریاضت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اس کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو نفس آج تک اُن کا مغلوب تھا، سرتابی کرنے لگے، لیکن وہ اس کو مغلوب ہی سمجھتا رہے۔ یہ سب سے بڑا دھوکا ہے۔ ایسے آدمی پر اعتماد کرنا غلطی ہے، بلکہ معتمد لوگ وہ ہیں، جو بخوشی شریعت کو تسلیم کرلیں اور اپنا تصرّف ہی قطعی نہ خیال کریں۔

شیخ سیوان سمرگرگانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا اور غیب کی باتیں کرنا کوئی کرامت کی بات نہیں۔ کرامت یہ ہے کہ آدمی امر الٰہی بن جائے۔ یعنی اس کی شریعت میں قطعی چون وچرا ہی نہیں بلکہ بخوشی سر تسلیم خم کرلے۔ یہ درجہ اعتماد کا ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ لوگ پانی پر چلیں اور ہوا میں اُڑیں، لیکن یہ شیطان کی طاقت سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی غیب دانی میں ماہر ہے، اور بہت سے کاہن بھی غیب کا حال جانتے ہیں۔ لہٰذا یہ چیزیں اعتماد کے قابل نہیں ہو سکتیں۔

بلکہ اعتماد اس پر ہے، جس کا ہر عمل شریعت کا عمل بن جائے اور اس کا ہر فعل شریعت اسلام کا اتباع کرنے لگے۔ اس کے بعد تجھ کو شیر پر سوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ سینکڑوں مغلوب الغضب کتّے تیرے قبضے میں آچکے ہیں۔ اسی طرح اگر غیب کی باتیں نہ معلوم ہو سکیں تو بھی کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ نفس سے بے نیاز ہونا ہی بڑی غیب دانی ہے، اور اگر پانی پر چلنے اور ہوا میں اُڑنے سے قاصر ہے تو کوئی پروا نہیں۔ اس لیے کہ اب احساس اور تخیلات سے بلند دنیا آباد کر رہا ہے۔ اب تجھ کو نہ ہوا میں اُڑنے کی ضرورت ہے اور نہ پانی پر چلنے کی۔ یہ سب چیزیں تیری محکوم ہیں۔ اب تجھ کو ان ظاہری چیزوں کی ضرورت نہیں۔ اب تو ان سب ظاہری مراتب سے بالا و برتر ہے۔

ظاہر دار صوفیاء کے چند مقامات تم کو سمجھا دیے گئے اب زیادہ بیان کرنا یہاں مناسب نہ ہوگا۔

اُمراء و رؤسا

امارت چوتھے طبقے میں مالدار لوگ ہیں، جو حرام کی کمائی ہی کارِ خیر میں صرف کر دیتے ہیں۔ مثلاً مدرسہ، مسجد، کنواں، سرائے وغیرہ کی تعمیر ہیں۔ لہٰذا کسبِ حرام کا گناہ اس ثواب سے کہیں زیادہ ہے۔

اور بعض اُمراء حلال کمائی صرف اپنے نام و نمود کی خاطر ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں، تاکہ عوام اُن کے نام سے آگاہ ہو جائیں۔ مثلاً اپنے نام کا پتھر نصب کراتے ہیں۔ یہ باتیں ظاہر داری اور ریاکاری کی بنیاد ہیں۔ اُن کو سمجھنا چاہیے کہ سب سے بڑا عالم الغیب بغیر ان تمام ظاہر داریوں کے بھی نظر رکھتا ہے۔ اور ہمارے اعمال دیکھتا ہے۔

اوّل اُن امراء کو سوچنا چاہیے کہ انھیں کے پڑوس میں معلوم نہیں کون ایسا نادار ہوگا کہ جو نانِ شبینہ سے محتاج ہے بہ نسبت ان کاموں کے اس میں لگانا زیادہ باعثِ ثواب ہوتا ہے۔

بعض مالدار خلوص کے ساتھ مسجدوں کی تعمیر میں روپیہ لگاتے ہیں، لیکن ان کا روپیہ نقش و نگار اور آراستگی میں صرف ہوتا ہے۔ اس میں دو بُرائیاں ہیں۔

پہلے وہ نقش و نگار نمازیوں کی نظر پڑیں گے تو وہ لوگ اس طرف مشغول رہیں گے۔

دوسرے یہاں کی دیکھا دیکھی وہ لوگ اپنے مکانات میں بھی ایسے ہی پھول پتے بنوانے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح دنیا کی آرائش ان اذہان میں بیٹھتی ہے اور اس کام کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔

(حدیث) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ وائے ہو تم پر، اگر تم قرآنوں کے غلاف چڑھاؤ یا مسجدوں کو آراستہ کرو۔ مسجدوں کی آرائش صرف تمہارا خضوع و خشوع ہے۔ یہ عمل دنیا کی آراستگی سے متعلق ہیں۔ ان سے مسجدوں کا کیا تعلق۔

بعض رؤسا، غرباء کو اپنے یہاں بلاکر بالاعلان دیتے ہیں۔ اور اپنے نام و نمود کی خاطر حج کے قافلوں کی امداد دیتے ہیں، تاکہ لوگوں میں وہ سخی مشہور ہو سکیں۔ لیکن کسی یتیم کی پرورش نہیں کرتے۔ اس لیے کہ وہ صرف اپنی شہرت چاہتے ہیں۔ اور اسی میں ثواب سمجھتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت بشر حافی سے عرض کیا، کہ میرے پاس دو ہزار روپیہ جمع ہے۔ میں اب حج کا ارادہ کرتا ہوں۔ تو فرمایا کہ تو دُنیا کی سیر کی طرف دلچسپی لے رہا ہے۔ اس نے عرض کی کہ میں صرف خوشنودی خدا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر غربا اور مساکین کا قرضہ چکا دے۔ یہ سو حجوں سے زیادہ ہے۔ یا کسی اہل و عیال والے آدمی کو دیدے۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں حج ہی کروں۔ تب فرمایا، اس لیے کہ یہ روپیہ تو تُو نے ناجائز طریقے پر جمع کیا ہے۔ لہٰذا اسی طرح خرچ بھی کرنا چاہتا ہے۔

بعض مالدار صرف زکوٰۃ میں نکالتے ہیں۔ وہ بھی طلباء اور معلّمین کو دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ اُن کی عزت کریں اور جب کسی معلّم سے تعلق ختم ہو جائے، تو وہ زکوٰۃ دینا بھی بند کر دے۔ یہ قطعی تنخواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعض مالدار ایسے بھی ہیں کہ وہ صرف پارسائی اور نیکی کا ڈنکہ پٹوانا چاہتے ہیں۔ اور اپنا ایک حبہ بھی راہِ خدا میں صرف کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہمیشہ روزہ نماز کرتے ہیں۔ وہ آدمی بالکل ایسا ہی ہے کہ سر میں درد ہو اور پیر میں دوا لگائے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ وہ بخیل ہیں۔ اس کا دفعیہ صرف خرچ سے ہی ہو سکتا ہے۔ صرف اپنے آپ بھوکا مر کر پیسہ جمع کرنا ایثار اور کارِ ثواب نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تر مالدار اس تصوّر میں صرف ہی نہیں کرتے، اور پھر بھی اپنے کو نیک سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کتاب کو بغور پڑھیں تاکہ اُن کو اچھائی، برائی، نیکی، بدی کی تمیز ہو سکے۔ خدا کی محبت غالب ہو جائے اور دنیا کو وہ لوگ ہیچ سمجھنے لگیں۔ اس کے پڑھنے سے طبیعت کی افراط و تفریط جاتی رہے گی۔ موت اور آخرت کے تصوّرات سے ہمیشہ نیک راستے پر چلتے رہیں گے۔ اور دنیا و دین دونوں آسان ہو جائیں گے۔ خداوند عالم کا فضل جس پر ہوتا ہے۔ اس پر ہر چیز آسان ہو جاتی ہے" واللہ اعلم بالصواب۔

بفضلہ تعالیٰ رکن سوم ختم شد

باب ۵

چوتھا رُکن

(منجیّات)

اِس کو بھی دس اصول پر منقسم کیا گیا ہے۔
پہلے توبہ۔ دوسرے صبر و شکر۔ تیسرے خوف و رجا۔ چوتھے فقر و زہد۔ پانچویں اخلاص نیت اور صدق و صفا۔ چھٹے محاسبہ و مراقبہ۔ ساتویں تفکر۔ آٹھویں توحید و توکل بر خدا۔ نویں محبت و عشق۔ دسویں موت و آخرت۔

پہلا اصُول

(توبہ)

مُرید کا پہلا قدم خدا کی طرف یہ ہے کہ وہ توبہ کرے۔ سالکان راہِ حقیقت یہیں سے اپنی عبادات کی ابتدا کرتے ہیں۔ سوائے فرشتگان و مقربین کے کوئی آدمی بھی پیدائش سے لے کر آخر عمر تک ایسا نہیں کہ جو گناہ نہ کرے۔ اسی طرح ہمیشہ گناہ کرنا بھی شیطانی شیوہ ہے۔

خداوند عالم سے توبہ کرنا، اس کی طرف رجُوع کرنا۔ بہرِ انسان کا درجہ ہے پس توبہ کرنا حضرت آدم کے پوتا ہونے کی خاص شناخت ہے۔ اسی طرح گناہ کرنا اور توبہ نہ کرنا شیطنت ہے۔

اِنسانی تخلیق نقص کے ساتھ ہوئی۔ بعد میں عقل ودیعت فرمائی گئی۔ لہٰذا اس سے گناہوں کا اعادہ ضروری ہے، اور اس کے ساتھ خواہشات لگا دی گئیں، جو اس کو ہر وقت بہکاتی ہیں۔ اوّل خواہش کا غلبہ ہوا۔ بعد میں عقل دی گئی۔ لہٰذا انسان کو اپنے نفس اور خواہش پر قابو پانا ہے۔ وہ ذریعہ صرف توبہ ہے۔ کہ آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کرے، تو شیطان "اس کا نفس" اور اس کی خواہشات اس کی محکوم ہو جاتی ہیں عقل و شریعت کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں اور آدمی گناہوں کو چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

ثواب توبہ

خداوند عالم نے اپنی تمام مخلوق کو توبہ کرنے کا حکم دیا ہے، وہ ارشاد فرما رہا ہے کہ تُوبُوٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (یعنی اگر فلاح چاہتے ہو تو توبہ کرو)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبح کے وقت توبہ کرنا افضل ہے۔ شرمندگی اور پشیمانی بھی توبہ ہی کی مترادف ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا ہے، کہ راستے میں بک بک کرنے والوں کے سامنے نہ کھڑے ہو۔ اس لیے کہ وہ سب سے مسخرا پن کرتا ہے۔ یہاں تک کہ گناہوں کی وجہ سے اس پر جہنم کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

اور فرمایا کہ میں ستر بار روزانہ استغفار کرتا ہوں، جو آدمی توبہ کرے گا۔ خداوندِ عالم اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ اور توبہ کرنے والے کے گناہ اس کے مرنے سے پہلے ہی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ خداوندعالم کے رحم کا دروازہ اس شخص پر کھلا ہے جو دن کو گناہ کرے اور رات کو توبہ کرلے۔ اور کوئی آدمی گناہ سے خالی نہیں، لیکن جو توبہ کرے وہ سب گناہگاروں سے اچھا ہے۔ توبہ کے بعد آدمی بالکل بے گناہ ہو جاتا ہے۔ لیکن توبہ کے بعد اس گناہ کا اعادہ نہ کرے، ورنہ وہ توبہ نہ ہوگی۔ آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا (یعنی خداوندعالم سب کی توبہ قبول کرتا ہے۔ لیکن اس گروہ کی جو مسلمان کہلاتا ہے) خداوندعالم ان سے بیزار ہے اور وہ اس سے بیزار ہیں۔

(حدیث) حدیث میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو آسمان کی طرف لے جا رہے تھے، تو آپ نے ایک مرد کو زنا کا ارتکاب کرتے دیکھ کر اُن کے حق میں بددُعا فرمائی، اور وہ دونوں زناکار ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد اور لوگوں کو گناہوں میں مشغول دیکھ کر بددُعا کی، یہاں تک کہ خداوندعالم کی وحی نازل ہوئی اے ابراہیم! ان بندوں کو نظرِ ملاطفت سے دیکھ! اس لیے کہ یہ گناہ کے بعد تین باتوں میں سے ایک ضرور کریں گے۔

اگر توبہ کریں گے، تو قبول کرلوں گا۔ استغفار کریں گے تو معاف کر دوں گا۔ یا ان کی اولاد ہی اُن کے لیے توبہ کرے گی، تو بھی معاف کر دوں گا۔

(حدیث) حدیث ہے کہ خداوندعالم جس بندے کو پشیمان دیکھتا ہے قبل اس کے کہ وہ توبہ کرے، اس کو معاف کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آسمان پر ایک بہت بڑا دروازہ ہے جو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اور جو لوگ توبہ کرتے ہیں، اُن کی استغفار اسی سے گزرتی ہے۔ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو دنیا والوں کے اعمال بارگاہِ ایزدی میں پیش کیے جاتے ہیں اور جو لوگ توبہ کرلیتے ہیں، ان کو معاف کر دیا جاتا ہے، اور جو لوگ کینہ پرور ہیں وہ گنہگاروں ہی میں رہتے ہیں۔

(حدیث) حدیث ہے کہ خداوندعالم اپنے بندوں کی توبہ سے اتنا خوش ہوتا ہے جتنا وہ اعرابی اپنے اُونٹ کے ملنے سے خوش ہوا۔ جو جنگل میں تنہا سو گیا اور آنکھ کھلنے پر اس کا اونٹ غائب تھا جنگل

بھیانک تھا۔ ساتھ میں نہ غذا نہ پانی ۔ اس کے بعد اس نے سوچا تھا کہ اس سے مر جانا اچھا ہے ۔ اس کے بعد اس کو اس کا اونٹ مل گیا اور اس نے خدا کی درگاہ میں اتنی توبہ کی کہ میں تیرا خدا ہوں اور تو میرا بندہ ہے (معاذ اللہ) لیکن خداوند عالم نے اس کو معاف کر دیا۔

توبہ کی حقیقت

توبہ معرفت خدا کا زینہ ہے، اور توبہ ہی کے ذریعہ آدمی کو نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے۔ جب انسان گناہوں کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے تو ایک نہ ایک وقت پشیمانی ضرور ہوتی ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اس وقت تمام گناہ انتہائی خندہ پیشانی سے کیے۔ لیکن وہ میرے لیے سانپ کا زہر ثابت ہوئے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ انسان زہر کھالے اور اس کے بعد اس کو رنج ہو اور پشیمانی کی وجہ سے اس کو قے کرنے کی کوشش کرے اور دواؤں کی تدبیر کرے

لہٰذا جب آدمی اپنے کو مصائب اور گناہ میں آلودہ دیکھتا ہے، اور اس کی انتہا ہو جاتی ہے تو ایک وقت ضرور آتا ہے کہ اس پر حسرت ٹپکنے لگتی ہے۔ وہ ظلم و گناہ کو چھوڑ کر نیکی و بخشش کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اپنے غرور و تکبر نیز غفلت کو چھوڑ کر گریہ و حسرت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ گنہگاروں کی صحبت چھوڑ کر نیکوں کے پاس بیٹھنے لگتا ہے۔ اور یہ ہی پشیمانی توبہ کہلاتی ہے اور اس کی حقیقت نور ایمانی کی جھلک ہے اور فروع حالات کے بدلنے سے متعلق ہیں۔ جس کے بعد اپنے اعضاء کو خداوند عالم کے احکامات پہ پابندی کرنے اور عبادت کی طرف مشغول کرتا ہے۔

وجوب توبہ

ہر شخص پر ہر وقت توبہ کرنا واجب ہے

توبہ کے واجب ہونے کی آسان مثال یہ ہے کہ آدمی اگر کافر ہے تو اپنے کفر کی وجہ سے توبہ کرے، اور مسلمان ہے تو اس کا اسلام صرف ماں باپ کی پرورش کی وجہ سے ہے لہٰذا توبہ ضروری ہے۔ زبان سے کلمہ پڑھتا ہے اور دراصل اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتا تو اس کی غفلت سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

اپنے میں یقین راسخ پیدا کرنے کے بعد توبہ کرنا چاہیے تاکہ آئندہ وہ گناہ سرزد نہ ہو۔ ورنہ وہ پھر گناہ کرے گا۔ اس لیے اس کے جسم میں ایمان کی نورانی شعاعیں کہیں نہ رہیں۔ اور جب اس کا دل ایمان سے روشنی حاصل کرے گا تو اس کی توبہ صحیح ہوگی، اور پھر گناہ بھی نہ کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی گناہ کرتے وقت مومن نہیں رہتا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کافر ہو جاتا ہے، لیکن ایمان کی تکمیل کی مختلف بنیادیں ہیں منجملہ اوروں کے یہ بھی ہے کہ آدمی گناہ کو زہر

سمجھ لے۔ اور اگر زہر سمجھ لے گا تو اس کو ہرگز نہ کرے گا۔ لہٰذا زنا کے وقت اگر اُس کی قوتِ شہوت کو ایمان کامل نے شکست دیدی تو وہ ہرگز زنا نہ کرے گا اور اگر ایمان کمزور ہو گیا تو ضرور گناہ کا مرتکب ہوگا۔

سب سے پہلے کفر سے توبہ کرنا واجب ہے۔ اور اگر کافر نہ ہو، تو صرف دیکھا دیکھی جن چیزوں پر ایمان لائے اس پر توبہ ضروری ہے۔ اور جب اِس بات پر توبہ کر لی تو اپنے گناہوں پر توبہ کرے اور جب اُس کا ظاہری جسم گناہوں سے الگ ہو گیا، تو باطنی کے لیے کوشش کرے کہ گناہ نہ ہو۔ مثلاً حرص، حسد، ریاکاری وغیرہ اس لیے کہ یہ سب چیزیں بھی گناہوں کی جڑ ہیں اور ان سب سے توبہ کرنا ضروری ہے اور توبہ مجاہدے کے بعد کر سکتا ہے، اور توبہ کے بعد تمام خواہشات اعتدال پر آتی ہیں۔ اس کے بعد آدمی پر توہمات غالب ہوتے ہیں۔ ان سے بھی توبہ ضروری ہے۔ ان سب سے بڑا وہم خداوندعالم کے لیے ہے، چاہے وہ دم بھر کے لیے کیوں نہ ہو؟ لیکن اس سے بھی توبہ ضروری ہے۔

اور اگر آدمی ہر وقت خدا کی عبادات میں مشغول رہتا ہے، دُنیا کے مشاغل سے قطعی الگ تھلگ ہے۔ تو ایسے آدمی کے لیے بھی مختلف مدارج ہیں۔ جو ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ، گر کوئی درجہ کم ہے تو اپنے سے بلند کے مقابلے میں ضرور اس میں کوئی نقص ہے اور نقص بہرحال کمزوری ہے۔ لہٰذا اس سے بھی توبہ ضروری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ستّر بار روزانہ توبہ کرنا غالباً اس امر کے باعث ہوگا۔ کہ آپ کا ہر کام ہر وقت بلندی کی طرف ترقی کر رہا تھا۔ لہٰذا پچھلے وقت سے توبہ کرتے تھے۔

توبہ کی مثال جس طرح پہلے ایک روپیہ ملنے پر خوشی ہوتی، اس کے بعد اگر دو مل جائیں تو زیادہ ہوگی اور اسی طرح تین اور چار پر اور بھی زیادہ، اور اس کے بعد اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ صرف ایک روپیہ کے لیے اتنی خوشی بیکار تھی اور وہ خوشی اس کے نقصان کا باعث ہوئی۔ لہٰذا وہ اس خوشی سے شرمندہ ہوتا ہے۔ یہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ (نیکوں کی نیکیاں صالحین کے لیے بدیوں کے برابر ہیں) اس لیے کہ وہ اُن سے بھی توبہ کرتے ہیں۔

اس جگہ ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ کفر سے توبہ کرنا واجب ہے، اور درجات کی کمی پر پشیمانی اور شرمندگی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں توبہ کا وجوب کب ثابت ہوتا ہے۔

لہٰذا عرض ہے کہ وجوب دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو بظاہر حالات کے ماتحت صرف اتنا کیا جائے کہ اگر دُنیا والے فلاں کام کریں گے تو اُن کی تباہی کا باعث ہے۔ اور لوگ اس طرف پھر بھی متوجہ رہیں۔ لہٰذا یہ حکم عذابِ دوزخ سے لوگوں کو بچاتا ہے۔

دوسرا واجب وہ ہے کہ عوام اس حکم کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ تو وہ لوگ دوزخ میں تو نہ جائیں گے لیکن اپنے موجودہ درجات سے بلند ہونے کی خواہش ضرور کریں گے اور وہ ہی حسرت ہے۔ اور یہ حسرت ہی عذاب کی مثل ہے، اور اس عذاب سے نجات پانے کے لیے توبہ ضروری ہوگی۔ اس لیے روزِ قیامت کو "روزِ تغابن" کہا جاتا ہے کہ ہر آدمی "غبن" میں مبتلا ہوگا۔ یعنی جس نے عبادت بالکل نہ کی وہ بھی اور جس نے کی وہ بھی، کہ اس نے کم کی اور اسی طرح درجہ بدرجہ۔

انبیاء علیہم السلام ہر ممکن عبادت کرتے۔ اب سوچو! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ کھانا کھانا حرام یا گناہ نہ تھا، لیکن بھوکے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے آپ کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر فرمایا تھا کہ اے خدا کے رسول! اگر آپ سیر ہو کر کھانا کھائیں تو کیا حرج ہے؟ الخ (یہ حدیث پہلے نقل ہو چکی ہے۔ مترجم)

اور سرکارِ رسالتؐ نے جواب دیا کہ مجھ سے پہلے انبیاء گزرے ہیں انھوں نے بڑی عبادات کی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میرے دوستوں سے میرا مرتبہ کسی حال میں بھی کم ہو۔

(واقعہ) حضرت عیسیٰؑ ایک دن سر کے نیچے پتھر رکھ کر لیٹے تھے۔ شیطان نے کہا کہ آپ نے تو ترکِ دنیا کر دیا تھا؛ آپ نے فوراً پتھر نکال دیا اور شرمسار ہوئے کہ میں نے اس پتھر کی وجہ سے آرام پایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نعلین مبارک میں تسمہ لگایا۔ اور وہ ذرا خوش معلوم ہوا تو فوراً نکال دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک بار دودھ پیا۔ اس میں کچھ شبہہ معلوم ہوا، تو آپ نے اُنگلی ڈال کر اتنی سخت قے کی کہ آپ کی جان کا خطرہ ہو گیا۔

جہاں وہ لوگ کیا کہیں گے؟ کہ ظاہری احکامات کی بنا پر یہاں قے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ (یہ روایت بھی پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ مترجم)

یہ لوگ تو ہر بات سمجھتے تھے، لیکن صرف خطرے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ثواب کی فضیلت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

ان لوگوں نے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی پیروی کرو، عام احکام کو نہ دیکھو۔

ان باتوں سے کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آدمی توبہ سے کسی وقت بھی مستفیض نہ ہونا چاہیے۔ حضرت ابوسلیمان دارانیؒ علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ اگر آدمی صرف اپنے گزشتہ زمانے کو یاد کرتے ہی روئے تو پوری عمر رو سکتا ہے۔

اب اس آدمی کے لیے سوچنا چاہیے کہ اپنا مستقبل بھی نہیں سوچتا۔ وہ جتنا بھی اس پر روئے کم ہے۔

اس لیے کہ اگر کسی کا ایک موتی کھو جاتا ہے تو ہمیشہ افسوس کرتا ہے۔ چہ جائیکہ آدمی کی عمر کا ہر سانس ایک موتی کی برابر ہے اور وہ رائیگاں ہونے پر پشیمان نہ ہو۔ اور اگر کوئی اپنی پوری عمر گناہ میں صرف کرے، تو کیا کرے؟ مگر ایسے لوگوں کو اس وقت خبر ہوئی، جبکہ درِ توبہ بند ہو جاتے ہیں۔ خداوند عالم اس کے لیے ارشاد فرما رہا ہے کہ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔

اس آیت کی تفسیر بزرگانِ دین نے یہ بتائی ہے کہ عالمِ سکرات میں جب ملک الموت قبضِ رُوح کے لیے آتا ہے، تو آدمی ایک دن کی مہلت مانگتا ہے۔ کہ وہ گناہوں سے توبہ کر سکے۔ ملک الموت کہتا ہے، کہ تجھ کو بہت دن دیے گیے اور توبہ نہ کی۔ تیری موت کا وقت معین آ گیا۔ لہٰذا مہلت کا کوئی سوال نہیں۔ آدمی اس وقت پریشان ہوتا ہے۔ اور ایک گھنٹے کی مہلت مانگتا ہے، لیکن ملک الموت اس کا بھی انکار کر دیتا ہے۔ اس وقت اس شخص کی رُوح سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ قبضِ رُوح ہوتا ہے۔ اگر اس کے لیے دوزخ کا حکم ہوتا ہے تو اس کو دوزخ میں بھیج دیا جاتا ہے اور اگر نیکیاں اس کے اعمال میں لکھی ہوتی ہیں تو اس کا ایمان سلامت رہتا ہے۔ خداوند عالم نے اسی لیے ارشاد فرمایا ہے کہ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ۔

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دو راز مخفی ہیں۔ پہلے ماں کے پیٹ میں خداوند عالم اس سے کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو دنیا میں پاک و پاکیزہ کر کے بھیجا۔ دیکھوں کہ تو کس طرح میرے احکامات کی پابندی کرتا ہے۔ اس کے بعد موت کے وقت ندا آتی ہے کہ میں نے تجھ کو زندگی دی تھی تو نے اس میں کیا کیا؟

اگر نیکیاں کی ہیں، تو جزا پائے گا۔ اور نہیں تو سزا۔ لہٰذا تجھ کو اب تیار ہونا چاہیے۔

قبولیّت توبہ

اگر آدمی خلوص سے توبہ کرے گا، تو ضرور مقبول ہوتی ہے۔ البتہ شرائط کے ماتحت ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے جسم کا تعلق خدا کے ساتھ سمجھے۔ دراصل انسان کے گناہ ہی خداوند عالم کی دوری اور حجاب کا سبب ہوتے ہیں، اور توبہ تمام حجابات کو اٹھا دینے والی چیز ہے۔

قبولیت کی شناخت آدمی کا دل آئینے کی طرح صاف ہے، اور اس کو فرشتوں کے جوہر سے مزین کیا گیا ہے۔ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل کے آئینے پر زنگ آ جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ خدائی

احکامات سے گمراہ ہو کر راستہ بھٹک جاتا ہے۔ لہٰذا اگر توبہ کے بعد اس کے دل کا آئینہ صاف ہو جائے۔ اور انوارِ الٰہی نظر آنے لگیں۔ اس کی قدرت کے نمونوں سے محظوظ ہونے لگے۔ تو سمجھ لے کہ توبہ قبول ہو گئی۔ اور اگر انسان گناہوں کی تاریکیوں میں انتہا سے زیادہ ملوث ہو گیا ہے، تو پھر اس کے بعد وہ توبہ کرتا ہی نہیں لیکن اس کے بعد بھی اگر توبہ کرے، تو قبول بارگاہ ایزدی ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگ اپنے گناہ کی وجہ سے بھی جنت میں جائیں گے۔ اور یہ وہ لوگ ہوں گے کہ اپنے گناہوں پر عمر بھر شرمندہ رہیں یہاں تک کہ موت آجائے۔

سرکار رسالتؐ نے فرمایا کہ نیکیاں گناہوں کو اس طرح دھو دیتی ہیں۔ جیسے میلے کپڑے کو صابن، اور فرمایا کہ خداوند عالم نے جب ابلیس کو ملعون بارگاہ کیا، تو اس نے کہا کہ قسم تیری عزت کی کہ تیرے بندے کو پیدائش سے لے کر موت آنے تک بہکاؤں گا۔ تو خداوند عالم نے فرمایا کہ قسم ہے مجھے اپنی عزت کی کہ میں بھی اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا رکھوں گا کہ میرے بندے جب چاہیں توبہ کر لیں اور میں ان کو معاف کر دوں۔

ایک حبشی بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر دریافت کرنے لگا کہ خداوند عالم گناہوں کو توبہ کرنے سے معاف کر دے گا؟ فرمایا کہ ہاں، توبہ قبول ہوتی ہے۔ وہ حبشی چلا گیا۔ اور پھر واپس آکر کہنے لگا کہ جب میں گناہ کرتا تھا تو کیا وہ دیکھتا تھا؟ فرمایا کہ ہاں، وہ ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ حبشی یہ سُن کر بے ہوش ہوا اور گر پڑا۔ جب دیکھا تو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

خداوند عالم نے ایک پیغمبر پر وحی نازل فرمائی کہ اے میرے رسول! اپنی اُمت سے کہہ دے! کہ تم اپنے گناہوں سے توبہ کرو میں قبول کروں گا۔

حضرت حبیب ابنِ ثابت کا مقولہ ہے کہ جب گناہوں کو آدمی کے سامنے رکھا جائے گا، تو وہ شرمسار ہوگا۔ اس کی اس عاجزی پر ہی خداوند عالم گناہ معاف فرماوے گا۔

حکایت | بنی اسرائیل میں ایک بڑا گنہگار شخص تھا۔ اس نے ایک بڑے عابد سے جا کر دریافت کیا، کہ میں نے بڑے گناہ کیے ہیں اور بے قصور ننانوے آدمی قتل کر چکا ہوں۔ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ اس عابد نے کہا کہ نہیں۔ اس شخص کو غصہ آگیا، اس نے اس عابد کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کو اس بات کے جواب کے لیے ایک بہت بڑے پرہیزگار کا پتہ بتایا۔ وہ گنہگار وہاں چلا گیا۔ اس سے دریافت کیا تو جواب ملا کہ تو اس سرزمین کو چھوڑ کر فلاں مقام پر چلا جا! تیری توبہ ضرور قبول ہوگی۔ وہ وہاں سے سیدھا چل دیا۔ راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ فرشتوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ تب خدا نے

حکم دیا کہ صلحا اور منافقین کی سرحد کو دیکھو۔ جب زمین ناپی گئی تو وہ ایک بالشت صلحا کی زمین پر آ چکا تھا، چنانچہ فرشتگانِ رحمت نے اس کو لیا اور تمام گناہ بخش دیئے گئے۔

گناہانِ کبیرہ وصغیرہ

چھوٹے گناہ کو اگر اس پر اصرار نہ کرے، یعنی بار بار وہ گناہ نہ کیا جائے، اس کو گناہ صغیرہ کہتے ہیں اور اس گناہ کی وجہ سے آدمی توبہ کر لے تو جلدی معاف ہوتی ہے، بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ نماز پنجگانہ ہمارے گناہانِ صغیرہ کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نماز جمعہ دوسرے جمعہ کی نماز تک گناہانِ صغیرہ کا کفارہ ہوتی ہے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْھَوْنَ عَنْہُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ یعنی اگر بندہ گناہ کبیرہ نہ کرے تو گناہانِ صغیرہ میں معاف کر دوں گا۔ لہٰذا یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ گناہانِ کبیرہ کون کون ہیں۔

گناہانِ کبیرہ

صحابہ نے اِس سلسلے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک گناہانِ کبیرہ سات ہیں بعض نے اس سے زیادہ، اور بعض نے اس سے کم۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ گناہانِ کبیرہ سات ؑ فرماتے ہیں۔ حضرت ابنِ عباس نے ستّر تک تعداد بتائی ہے۔ حضرت ابوطالب کے قول کے مُطابق سترہ گناہانِ کبیرہ ہیں۔ آپ نے صحابہ کرام کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ اُن میں چار دل اور رُوح سے متعلق ہیں۔ ایک کفر سے۔ دوسرا گناہ پر اصرار کرنے کا ارادہ کرنا چاہے وہ گناہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہوں۔

تیسرے خداوندِ عالم کی رحمتوں سے مایوسی۔ اس کو قنوط کہتے ہیں۔ چوتھا خداوند عالم کے قہر و غضب سے نڈر ہونا، اور نہایت بے باکی کے ساتھ گناہ کرنا۔

چار اُن میں زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے جھوٹی شہادت دینا۔ دوسرے تہمت زنا لگانا تیسرے جھوٹی قسمیں کھانا۔ چوتھے جادو۔

باقی سترہ میں تین گناہانِ کبیرہ، انسان کے اندرونی حصّے (پیٹ) سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ سب سے پہلے شراب نوشی یا دوسری منشیات کا استعمال کرنا۔ دوسرے یتیموں کا مال کھا جانا۔ تیسرے سود خواری۔

دو گناہ خواہشاتِ نفسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک زنا۔ دوسرے امرد پرستی۔

دو گناہ ہاتھوں سے متعلق ہیں۔ قتل۔ چوری۔

ایک پیر سے تعلّق رکھنے والا ہے۔ وہ کفّار کے مقابلے میں میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھاتا ہے، لیکن اگر کفّار دُگنے سے زیادہ ہوں تو بھاگنا درست ہے۔

ایک آخری گناہ ماں باپ کا ہے، جو تمھارے پورے جسم سے تعلّق رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا گناہوں میں بعض پر تو حدِ شرع لگائی جاتی ہے، اور بعض کے متعلّق قرآن مجید نے خود "حد" لگادی ہے۔ اس کی تفصیل میں بعض پیچیدہ مسائل ہیں جو احیاء العلوم میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس کی تفصیل یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔

یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ گناہانِ کبیرہ سے احتیاط برتی جائے۔ اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرے۔ حالانکہ گناہِ صغیرہ کا کفّارہ ہماری نماز پنجگانہ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی مسلّم ہے کہ اگر مخلوقِ خدا پر ذرا سا ظلم بھی کیا ہے تو وہ نہ بخشا جائے گا، البتّہ خدا کے گناہ بخشے جاسکتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ہر آدمی کے تین اعمال نامے مرتب کیے جاتے ہیں۔ ایک وہ جس میں گناہ لکھے جاتے ہیں۔ اور وہ ناقابلِ معافی ہیں، اُن میں شرک بھی ہے۔

دوسرے اعمال نامے میں خداوند کے گناہ ہیں، جو بخشے جائیں گے۔

تیسرے میں عوام النّاس کے گناہ ہوں گے، جن کی بخشش کا کوئی ذریعہ نہیں، جب تک وہ آدمی خود نہ بخش دے۔ چاہے وہ انسان کی ذات سے ہو، یا اس کے مال وغیرہ کی وجہ سے یا دین سے۔ مثلاً کوئی آدمی کسی کو بدعتی بنالے، اور اس کا دین تباہ کردے یا وہ باتیں سکھائے، جس سے لوگ دین کے خلاف ہوجائیں۔

"گناہانِ صغیرہ" اصرار کرنے سے گناہانِ کبیرہ بن جاتے ہیں

گناہ صغیرہ کا گناہ کبیرہ ہونے کے اسباب

گناہ صغیرہ کے ارتکاب سے خداوند عالم معاف کردیتا ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ گناہ بھی کبیرہ ہوجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گناہ کبیرہ کی بخشش مشکل ہے۔

وہ چھ وجوہ کی بناء پر ہوتے ہیں:

پہلے یہ کہ آدمی گناہ کو برابر کرتا رہے۔ مثلاً غیبت کرے، اور برابر کرتا رہے۔ ریشمی لباس برابر پہنتا رہے گانا بجانا اور ناچ کو اپنی عادت بنالے۔ یہ سب گناہانِ کبیرہ ہوجاتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ متواتر گناہ کرتے رہنے پر دل تاریک ہوجاتا ہے۔ مثلاً ایک ایک قطرہ پانی کسی پتھر پر برابر پڑتا رہے، تو وہ قطرہ ہی اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ اور یکبارگی پانی اس پر سے بہہ جائے، تو وہ اثر نہیں کرتا۔ لہٰذا گناہوں کا تدارک "استغفار" کے ذریعہ کرنا چاہیے، اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کی قسم کرلے۔ بلکہ یہاں تک روایت ہے کہ استغفار اتنی عجیب چیز ہے کہ گناہِ کبیر بھی صغیرہ ہوجاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اپنے گناہ کو ناچیز سمجھے گا تو نتیجے میں وہ کبیرہ ہو جائے گا۔ اور اگر گناہ صغیرہ کو پہلے ہی بڑا خیال کر کے ترک کر دے گا، تو وہ ہی صغیرہ بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایمان کی پہچان ہے کہ آدمی گناہ سے خوف کھاتا ہے۔ اور گناہوں کے ساتھ دلچسپی لینے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی نے اس سے مناسبت پیدا کر لی ہے

یہ تمام کام دل سے متعلق ہیں، اور اس کے لیے ایک حدیث ہے کہ مسلمان اپنے گناہوں کو پہاڑ سمجھ کر اُن سے ڈرتا ہے اور منافق اُن گناہوں کو مکھی سمجھ کر نظر انداز کرتا ہے۔

بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ گناہ کو ناچیز سمجھنا ہی نہ بخشے جانے کی دلیل ہے۔

ایک پیغمبر سے خداوند عالم نے فرمایا کہ گناہ کی کمی یا زیادتی کو نہ دیکھو، بلکہ یہ سوچو، کہ تم نے ہماری مرضی کے خلاف کیا ہے۔

دراصل خداوند عالم کا جلال جتنا جتنا انسان کے دل میں بڑھتا جائے گا۔ اتنی اتنی ہیبت بیٹھتی جائے گی۔ اور وہ اس کی وجہ سے گناہوں کے پاس نہ پھٹکے گا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے گناہ کو بال جیسا سمجھتے ہو اور ہم پہاڑ جیسا۔ اس لیے کہ ہر گناہ میں خدا کا غضب شامل ہے اور ہو سکتا ہے کہ جو گناہ کرو۔ اس کی وجہ سے غضب نازل ہو جائے۔

خداوند عالم خود ارشاد فرما رہا ہے کہ تَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ (یعنی تم جس کو آسان سمجھتے ہو خداوند عالم کے نزدیک وہ عظیم ہے)۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی خوش ہو۔ مثلاً فلاں آدمی کو خوب ڈانٹا یا فلاں کا مال اس طرح خوبصورتی سے کھالیا، یا اس کو گالیاں دیں۔ یا فلاں آدمی کو مناظرہ کرنے میں زک دی۔ ایسی باتوں پر فخر کرنا گناہ ہے۔ اور اس کے دل کی تاریکی کا سبب ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم ستار العیوب ہے، وہ آدمی کے عیوب کو چھپاتا ہے اور آدمی برابر گناہ کرتا رہے، یہ سوچ کر کہ خداوند عالم معاف کر دے گا چاہے اس کے لیے صرف ڈھیل دی جا رہی ہو۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ آدمی خدا کے غضب کو نظر انداز کر دے اور اپنے گناہ لوگوں سے بہ فخر بیان کرے۔ اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی گناہوں میں ملوث ہو جائیں۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کے گناہ بھی اس کی گردن پر رہیں گے۔

بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ اس سے زیادہ نہیں کہ دوسرے کی نظر میں گناہ کی وقعت گھٹا دے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ آدمی عالم اور زاہد ہوتے ہوئے گناہ کرے، اور لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں کہ اگر یہ فعل گناہ ہوتا تو فلاں زاہد یا عالم یہ عمل کیوں کرتے؟ یا مناظرے میں سختی کرے اور لوگوں پر غصہ کرے۔ یہ سب باتیں اس کے شاگرد یا مرید بن بھی کرنے لگیں گے، اور ان سب لوگوں کے گناہ اسی عالم کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

بزرگانِ دین نے کہا ہے کہ آدمی اپنے گناہوں کے ساتھ مر جائے تو اچھا ہے، تاکہ گناہوں میں زیادتی نہ ہو۔ بعض لوگوں کے گناہ ہزاروں برس تک پھیلے رہ جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل میں سے ایک عالم نے توبہ کی تو خدا کا حکم ہوا، کہ اس عالم سے کہہ دو کہ تو نے میرے بندوں کا گناہ کیا ہے۔ میرا گناہ میں بخش سکتا ہوں۔ مخلوق کا نہیں، تو نے توبہ کرلی، لیکن جس قوم کو تو نے گمراہ کیا، وہ سب ضلالت کے راستے پر مری۔ اس کا کیا حشر ہوگا؟

اسی لیے عالم کی عبادت اور گناہ عوام الناس سے ہزار گنا ہے۔ اس لیے کہ ان کے گناہوں اور عبادتوں سے ہزاروں آدمی اقتدا کرتے ہیں۔ لہٰذا گناہ کرنا عالم کے لیے قطعاً بُرا ہے، اور اگر کرے تو چُھپا کر تاکہ لوگ اس کی تاسّی نہ کریں۔

زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ ہم پہلے خوب ہنستے تھے۔ لیکن اب مقتدی ہونے کے بعد مسکرانا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے علماء کی ذرا سی لغزش بھی بڑے گناہوں کا سبب بن جاتی ہے، اور ہزاروں عوام الناس اس کو دیکھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں، اور گناہوں کے عادی ہو کر صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں۔ لہٰذا عوام کے مقابل میں علماء کے گناہوں کا پوشیدہ رہنا انتہائی ضروری ہے۔

شرائطِ توبہ

آدمی جب کسی بات پر پشیمان ہوتا ہے، تب توبہ کرتا ہے، اور توبہ کے اثرات بعد میں ظاہر ہوتے ہیں، کہ آدمی عاجزی اور پشیمانی کرے۔ اور اپنے کو گناہ گار سمجھ کر ہر وقت ہیبت کا عالم اس پر طاری رہے۔ اس کے حرکات و سکنات سے مُلزمانہ کیفیت ظاہر ہوتی ہو۔ مثلاً کسی کا لڑکا بیمار ہو اور وہ کسی حکیم یا ڈاکٹر کو لائے، اور وہ اس کی بیماری کو نازک سمجھ کر باپ پر ظاہر کر دے، تو باپ کی حالت اس وقت کیا ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ باپ اپنی زندگی سے زیادہ بیٹے کی زندگی کو سمجھتا ہے۔

اس کے بعد یہ سوچ لے کہ خداوند عالم اور اس کے رسُول دونوں طبیب سے کہیں زیادہ مرتبت رکھنے والے ہیں۔ وہ ناصح حقیقی ہیں۔ ان کے احکامات بھی اتنے ہی زیادہ حقیقی ہیں۔ لہٰذا گناہ کرنا، ہلاکت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ آدمی کے گناہوں پر خداوند عالم کو غصہ آتا ہے۔ لہٰذا اگر اس سے آدمی خوف نہیں کھاتا

اور توبہ کے بعد پھر بھی غرور کرتا ہے، تو گویا کہ اس نے توبہ کی ہی نہیں۔

حدیث میں تائبوں کے پاس بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کا دل صاف ہوتا ہے اور صفائیٔ قلب گناہوں سے دُور رکھتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک گنہگار کے لیے پیغمبرِ وقت نے خداوند عالم سے اس کے گناہوں کی معافی کے لیے سفارش کی ندا آئی کہ اگر تمام فرشتے بھی اس کے لیے سفارش کریں گے، تو بھی گناہ معاف نہ ہوں گے۔ جبتک کہ اس کے دل سے گناہوں کی محبت ختم نہ ہو جائے۔

توبہ کے ارادے کی اشکال اور اس کے متعلقات

گناہ بظاہر بہت لذیذ ہوتے ہیں، لیکن توبہ کرنے والے آدمی کے لیے وہ زہر آلود شہد کی مثل ہیں، کہ اس کے قصور سے وہ گھبرانے لگتا ہے اور اس کی لذت اس کے خوف کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ گناہ اس نے ایک بار کر کے اس سے توبہ کرلی ہے۔ بلکہ ہر گناہ کے متعلق وہ یہ ہی سوچتا ہے کہ میرا وہ گناہ خداوند عالم کے احکامات کے خلاف تھا۔ لہٰذا یہ بھی اس کی طرح مخالف ہے۔ اس شرمندگی میں جو ارادہ وہ کرتا ہے، وہ تین زمانوں سے متعلق ہے۔ ماضی، حال، مستقبل۔

ماضی سے یہ تعلق ہے، کہ آدمی پچھلے گناہوں سے توبہ کرے اور سوچے کہ میں نے کیا کیا گناہ کیے ہیں۔ اور خداوند عالم اور عوام الناس کے حقوق اس نے کس طرح ادا نہیں کیے۔ خداوند عالم کے حقوق اس پر دو قسم کے ہیں۔ ایک اس کے فرائض کو بجالانا۔ دوسرے گناہوں سے پرہیز کرنا۔

فرائض کے متعلق جس روز سے آدمی بالغ ہو، سمجھ لے کہ نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اور اگر کسی نماز میں شکیات نماز کیوں نہ ہو، زکوٰۃ ادا کردے۔ اور اگر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، تو شروع سے چاہے قبل بلوغیت ہی کا زمانہ ہی کیوں نہ ہو زکوٰۃ ادا کردے۔ اور ہر حال میں سے اصول زکوٰۃ کے ماتحت غریبوں کو دیدے۔ یا اگر روزے نہیں رکھے ہیں (تو شریعت کے ماتحت اُن کی قضا یا کفارہ جو باب الصوم میں بیان کر دیا گیا ہے) ادا کردے۔

اسی طرح گناہوں کو دیکھے کہ اس کے اعضاء اور دل نے کیا کیا گناہ کیے ہیں۔ اور کس کس قسم کے کیے ہیں اُن سب سے بخلوص توبہ کرے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حاکم وقت کے پاس جاکر اُن کو ظاہر کرے اور بعد میں توبہ کرے، بلکہ اُن کو پوشیدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔ صرف اپنے اعمالِ حسنہ اور استغفار کے ذریعہ توبہ کرے۔ وہ گناہ چاہے صغائر ہوں یا کبائر، صرف اسی طرح بخشے جا سکتے ہیں، جو گناہ جس قسم کا کیا ہے اس قسم کا کفارہ ادا کرے، تاکہ اس کی تلافی ہو سکے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ جو کفارہ ادا کیا جائے اس کے اثرات اوّل گناہ سے زیادہ ہونا ضروری ہیں۔ مثلاً

شراب خواری کا کفارہ یہ ہے کہ حلال مشروبات جو اس کی مرغوب ہوں، اُن کو بھی ترک کر دے۔ بلکہ اُن کو صدقے میں دے۔ اسی طرح تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔

بلکہ جو خوشی ہو اس کو رنج میں بدل دے، تاکہ اس رنج سے دُنیا کی محبت جاتی رہے اور نفرت پیدا ہو جائے۔

(حدیث) حدیث میں وارد ہوا ہے کہ مسلمان کے جسم میں کانٹا بھی چبھ جائے تب بھی باعثِ تکلیف ہوتا ہے۔ اور اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بعض گناہ صرف رنج اور تکلیف اٹھانے ہی سے بخشے جا سکتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جو آدمی انتہائی گنہگار ہو، تو خداوند عالم اس کو رنج دیتا ہے، تاکہ اس کے گناہوں کا کفارہ بجائے اس کی عبادات کے بن جائے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ غم و اندوہ آدمی کے بس سے باہر ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی خود دنیا کے کاموں سے عاجز ہو کر رنجیدہ ہو گیا ہو، اور اگر یہ جواب دیا جائے کہ ارادتاً کوئی رنج مول لینا خود گناہ ہے، تو وہ رنج کسی گناہ کا کفاہ کیسے ہو سکتا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دُنیا سے نفرت کرنے میں جو رنج آدمی کو ہوتا ہے، وہ ہرگز گناہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ آدمی کی بہبودی کے لیے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے قابو میں ہوتا، تو اس کے بدلے میں آدمی دنیا کو حاصل کر لیا کرتا۔

حضرت جبرئیلؑ سے حضرت یوسفؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے لیے دریافت کیا کہ تم نے اُن کو کس حال میں دیکھا؟ تو عرض کی کہ اتنے غمزدہ تھے کہ جیسے کسی ماں کے سو بیٹے مارے جائیں۔ اور وہ اُن کے غم میں سوگ منائے۔ تو فرمایا! کہ ان کی رنجیدگی کا کیا بدلہ ہو سکتا ہے؟ تو جواب دیا کہ سوا ماموں اور شہدا کا ثواب۔

دوسرا زمانہ حال ہے۔ اس سے یہ تعلق ہے کہ آدمی تمام گناہوں سے پرہیز کرے اور عبادات میں مصروف ہو جائے۔

تیسرا زمانہ مستقبل کا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی طے کرلے کہ ہر مصیبت کے وقت صبر کروں گا۔ اپنا ظاہر و باطن سب کچھ خداوند عالم کی اطاعت میں رکھوں گا۔ گناہوں سے دُور رہوں گا۔ تمام فرائض عبادات کو خوشی بجا لاؤں گا۔ ان ارادوں اور عہد کے وقت دل میں وہم کو قطعی جگہ نہ دے، اور جو کچھ کھاؤں گا وہ سب عبادات

کے لیے دُنیا کے لذیذ ترین کھانوں اور اچھے پھلوں سے پرہیز کروں گا۔ اس لیے کہ آدمی جب تک ترکِ لذات یا مشتبہ چیزوں کو نہیں چھوڑتا، محتاط نہیں بن سکتا، اور اگر کسی چیز سے تکلیف پہنچتی ہو، تو آدمی سات مرتبہ اس سے ہاتھ کھینچے۔ اس کے بعد کارہائے شنیعہ کو ترک کر دینا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔

توبہ ہمیشہ قائم رکھنا چاہیے

گناہوں کا کفارہ اور توبہ کے درجات

گناہ کے تدارک اور توبہ میں جتنی جلدی کرو گے اتنا ہی اچھا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ آٹھ عمل گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں، ان میں چار دل سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلے توبہ۔ یا توبہ کا ارادہ کرنا۔

دوسرے یہ تہیہ، کہ اب ایسا نہ کروں گا۔

تیسرے یہ خوف کہ اگر گناہ کروں گا، تو عذابِ الٰہی نازل ہو گا۔

چوتھے خداوند عالم سے رحمتوں کی اُمید کرنا۔

اسی طرح چار اعمال جسم ظاہری سے متعلق ہیں۔

پہلے دو رکعت نمازِ توبہ پڑھ کر ستر بار استغفار کرے اور سو بار سُبحَانَ اللہِ العَظِیمِ وَبِحَمدِہٖ پڑھے، اور اگر ہو سکے تو ایک روزہ بھی رکھے۔

بعض بزرگ کہتے ہیں کہ یہ نماز بھی مسجد میں جا کر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن احادیث کے مطابق گھر میں پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر گناہ چُھپ کر کیا ہے تو کفارہ بھی چھپ کر ہی دے۔ اور اگر گناہ کھلم کھلا کیا ہے، تو اس کی توبہ بھی سب کے سامنے کرے۔

اس توبہ میں استغفار صرف زبان سے پڑھنا کافی نہ ہو گی، جب تک خلوص اور تضرع و زاری نہ ہو لیکن پھر بھی نہ پڑھنے سے پڑھنا زیادہ اچھا ہے۔

حضرت ابوعثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرید نے عرض کیا کہ بعض اوقات ذکرِ خدا میں بددلی سی محسوس کرنے لگتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ شکر ادا کرنا چاہیے کہ کم از کم تیرے اعضائے ظاہر تو اللہ اللہ کرتے ہیں اصل میں تیری بددلی اس شیطان کے بہکانے کی وجہ سے ہے، جو تمام رگوں میں حلول کیے رہتا ہے اور تیری زبان کو بھی یہ کہہ کر روکنا چاہتا ہے کہ تو کسی نہ کسی طرح اس کے ذکر کو بھول جائے۔

شیطان کے لیے تین قسم کے آدمی مسلط ہیں، تاکہ اس کی ریشہ دوانیوں کو منہ توڑ جواب دے سکیں۔

ایک وہ گروہ، کہ جو یہ کہتا ہے کہ تو ہم کو بہکاتا ہے، تو بہکا، میں تیرے جلانے کے لیے ہی اللہ اللہ کرتا ہوں،

چاہے دل حاضر ہو یا نہ ہو۔ یہ گروہ شیطان کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کرتا ہے۔

دوسرا گروہ ظالمین کا ہے، جو شیطان کے کہنے سے زبان کو بھی بند کر لیتے ہیں۔

تیسرا گروہ ہے، جو شیطان کو یہ جواب دیتا ہے، کہ چاہے اللہ اللہ کا اثر نہ ہو، لیکن زبان سے کہنے میں کیا حرج ہے۔ خاموشی سے بہتر بولنا ہے۔ جس طرح خاکروبی سے صرافی اور صرافی سے حکومت بہرحال اچھی ہے۔ اگر بادشاہی نہ ملے تو صرافی کو بھی چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔

توبہ نہ کرنے کے اسباب

توبہ نہ کرنے والوں کو اپنے ضمیر کا جائزہ لینا چاہیے، کہ وہ آخر گناہوں پر کیوں مُصر ہیں۔ اور توبہ سے بھاگتے ہیں۔ عموماً اس کے پانچ سبب ہیں، اور اُن کا الگ الگ دفاع کا طریقہ ہے۔

پہلے یہ کہ آدمی کا ایمان آخرت پر۔ ایمان ہی نہ ہو۔ یا مشکوک ہوں۔ اس کے متعلق پوری تفصیلات مہلکات کے بیان میں لکھ دی ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ آدمی پر شہوت اس قدر غلبہ کر جائے کہ اس کے چھوڑنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو جائے۔ اور دنیاداری کی وجہ آخرت سے بالکل بے بہرہ ہو جائے۔ زیادہ تر دنیاداری کی رنگ رلیاں ہی آدمی کو غافل بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب خدا نے بہشت بنائی تو جبرئیل کو اس کے دیکھنے کے لیے حکم دیا۔ جبرئیل نے عرض کی کہ جو چیز تجھ سے منسوب ہو تو بھلا کون اس کو دیکھنے کی خواہش نہ کرے گا؟ چنانچہ جبرئیل نے جنت کو دیکھ کر کہا، کہ کون شخص اس کو سن کر یا دیکھ کر اس کی خواہش نہ کرے گا؟ اس کے بعد تمام مکروہات اور گناہوں کو اس کے آس پاس مقرر کر دیا اور جبرئیل سے پھر اُن کو دیکھنے کا حکم دیا۔ جب جبرئیل نے گناہوں کی دُنیا کو دیکھا، تو عرض کی، بارالہا! کوئی شخص ان سختیوں کو دیکھ کر اندر جانے کی خواہش نہ کرے گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے خیال میں آخرت صرف وعدے پر قائم ہے، اور دُنیا نقد پر۔ لہٰذا نقد کو کیوں نہ قرض پر ترجیح دیں؟ اور ظاہر ہے کہ نظر نہ آنے والی شئے آنکھ اور دل دونوں سے دُور ہوتی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ توبہ کرنے کا ارادہ روز کرتا ہے، لیکن سوچتا ہے، کہ آج نہ سہی کل کر لوں گا، اور اسی طرح اور نئی خواہش کو پورا کرنے کا خیال کر کے سوچتا ہے کہ اس کے بعد توبہ کر لوں گا اور عمر بھر توبہ نہیں کر پاتا۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں جانے کو ضروری خیال نہیں کرتا۔ بلکہ خدا کی رحمتوں

کو زیادہ سمجھ کر گناہوں میں آغشتہ رہتا ہے۔ اور انسان کی یہ فطرت ہے کہ اپنے ہر کام پر خوش اعتقادی کا خیال رکھتا ہے۔ اور جب کوئی خواہش غلبہ کرتی ہے۔ تو یہ سوچ کر کر لیتا ہے کہ خداوند عالم رحیم ہے، وہ مُعاف کر دے گا۔

پہلے سبب کے متعلق تفصیلی جواب لکھا جا چکا ہے۔ جس کا حوالہ ہم نے دیا ہے۔

لیکن جو آدمی آخرت کو آنکھوں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے قرض خیال کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ اور دنیا کو حاضر سمجھ کر لے لینا پسند کرتا ہے، اور آخرت کو دل سے بھی دُور رکھتا ہے۔

اس خواہش کو دُور کرنے کی آسان تدبیر یہ ہے کہ جو آدمی یہ طے کر لے کہ جو چیز یقیناً آنے والی ہے، وہ کل آئے گی، اور جب کل کے متعلق سوچا۔ تو یقین کرے کہ آج آگئی۔ اور جب اس وقت اس کے وجود کا یقین ہو گیا تو وہ چیز نقد ہو گئی۔ مثلاً آدمی موت کا یقین کرے، اور سوچے کہ ابھی ٹھوکر لگے تو دم نکل جائے۔ جب یہ سوچ لیا تو آخرت بھی نقد ہی ہو گئی۔ اور دنیا گذر کر خواب و خیال بھی نہ رہی۔

جو لوگ ترکِ لذات نہیں کر سکتے، وہ ذرا سوچیں کہ دوزخ کی تاب کیوں کر ہو سکے گی اور بہشت کے آرام و آسائش کو کیسے صبر کر پائے گا۔ مثلاً بیمار کو ٹھنڈا پانی سب سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی کافر ڈاکٹر بھی اس کی خرابی سے آگاہ کرتا ہے، تو وہ اس کو نہیں پیتا۔ اب سوچو، کہ حکیم مطلق جب یہ خبر دے رہا ہے، تو یقین کیوں نہیں آتا؟

اور اپنی ابدی آسائش کو شہوات فانی کے مقابلے میں کیوں نہیں قبول کر لیتا۔

اسی طرح جو آدمی توبہ میں دیر پر دیر کرتا ہے، وہ سوچے کہ توبہ جب کرنا ہی ہے، تو کیوں کل پر رکھتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کل تجھ کو نصیب نہ ہو سکے، اور آج ہی موت کے ہم آغوش ہو جائے۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دوزخ میں ایسے لوگ زیادہ شور مچائیں گے، جو توبہ کرنے میں تاخیر کرتے ہیں توبہ میں چون و چرا کرنے والا آدمی اگر امروز فردا میں رہتا ہے۔ تو اس کے توبہ کرنا محال ہے۔ اس لیے کہ وہ خواہشاتِ نفسانی کا اتنا اسیر ہو چکا ہے، کہ اب راہ راست پر آنا ناممکن سا ہے۔

اس آدمی کی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص سے کہا جائے کہ درخت اُکھاڑ دے، اور وہ درخت کی مضبوطی اور اپنی کمزوری کا عذر کر کے منع کر دے۔ اور کہے کہ ایک سال اور انتظار کر! حالانکہ وہ نہیں سمجھتا، کہ درخت کی جڑیں سال بھر میں اور مضبوط ہو جائیں گی، اور تو انحطاط کی طرف قدم رکھ رہا ہے۔ لہٰذا اور کمزور ہو جائے گا۔ لہٰذا جتنا جلد ہو سکے، اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ بعض لوگ خدا پر بھروسہ کیے رہتے ہیں کہ وہ بڑا رحیم ہے۔ ہم کو معاف کر دے گا۔ ایسے آدمی کا ایمان کمزور ہے۔ اس کے لیے ہر وقت خطرہ ہے۔ کہ

ہلاکت اور تباہی کی آندھیاں کسی وقت بھی برباد کر سکتی ہیں۔

بہرحال اگر اس ایمان کے ساتھ آدمی مر جائے، تو بھی دونوں باتوں کا امکان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بخش دیا جائے، اور یہ بھی امکان ہے کہ قعرِ مذلت میں پھینک دیا جائے۔ لہٰذا اس امید پر توبہ کرنا عاقبت اندیشی ہے۔

ایسا آدمی اس شخص کی طرح ہے، جو اپنی کمائی سب لٹا دے اور اہل وعیال کو توکل پر چھوڑ دے، کہ خداوند عالم غیب کے خزانے سے ان کی پرورش کرے گا۔

یا وہ ایسا شخص ہے کہ جو اپنا مال حفاظت سے نہ رکھ سکے، اور قزاقوں کے آنے پر یہ کہے کہ یہ خود اندھے ہو جائیں گے، یا مال لینے سے پہلے موت ان پر چھا جائے گی۔ اور یہ سب کچھ ناممکن سا ہے۔

اسی طرح خداوند عالم کی طرف سے بخشش کی امیدیں کرنا تو بہرحال جائز ہے۔ لیکن صرف اس کے توکل پر ہر قسم کے گناہوں میں آلودہ ہونا انتہائی بے وقوفی ہے۔

مسئلہ توبہ | تفصیلات - ایک آدمی اگر اپنے گناہوں میں کسی ایک پر توبہ کرے اور باقی گناہ اسی طرح کرتا رہے، تو اس کی بخشش کے متعلق علمائے اسلام کو اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ توبہ تمام گناہوں سے یکبارگی ضروری ہے۔ اس لیے کہ چوری، زنا اور شراب نوشی سب گناہ ہیں۔ لہٰذا سب سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

مصنف کتاب کا فتویٰ | لیکن ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے، بلکہ اگر آدمی کسی بھی ایک گناہ کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کو دوسرے گناہوں سے زیادہ برا سمجھتا ہے، تو وہ تائب قرار پائے گا۔

مثلاً ایک آدمی غیبت سے توبہ کرتا ہے اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ غیبت کرنا عباد کا گناہ ہے۔ لہٰذا زیادہ سخت ہے اور شراب نوشی صرف مجھ سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اس سے توبہ نہیں کرتا۔ اور اس کے متعلق وہ کمی کر دے اور قطعی چھوڑنے کے لیے اپنے پر قادر نہ ہو۔ لہٰذا وہ کم از کم ایک گناہ سے بری الذمہ ضرور ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ (یعنی توبہ کرنے والے کو خداوند عالم دوست رکھتا ہے) خود خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (خداوند عالم توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے) بہرحال یہ تو بالکل سطحی بات ہے کہ جو آدمی تمام گناہوں سے تائب ہو جائے، وہ سب سے زیادہ دوست ٹھہر سکے گا۔ لیکن یہ بھی ناممکن ہے کہ توبہ کرنے والا بالکل ہی گناہوں پر اصرار کرنے والے کے ہم پلہ ہو گا۔ یہ بات عقلاً بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ ہر گناہ صغیرہ کا کفارہ اس کی توبہ کیوں ہو سکتی ہے۔ بلکہ تمام گناہوں سے توبہ کرنا یکبارگی جب تک عمل میں نہ آئے۔ اس وقت وہ توبہ بیکار ہو جائے گی۔ یہ بات بالکل فضول سی ہے، بلکہ آدمی جتنی توبہ کرے، اس کا ثواب ضرور ملنا چاہیے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

دوسرا اصُول
صبر و شُکر کے متعلّق

دُنیا میں کوئی کام بغیر صبر و شکر کے دُرست نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی گُناہ سے توبہ بھی بغیر صبر کے نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ایمان صبر میں مضمر ہے۔ دوسری حدیث میں صبر کو نصف ایمان کا درجہ دیا گیا ہے۔

حتّٰی کہ خداوند عالم نے اپنے کلام پاک میں ستّر سے زیادہ مقامات پر صبر کا ذکر کیا ہے، اور بڑے مراتب اور درجات کو صبر سے متعلّق کیا ہے، وہ فرماتا ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا اس کے بعد فرماتا ہے کہ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (کہ صابروں کو بے حساب اجر ملے گا) ایک جگہ یہ فرما رہا ہے کہ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (خدا صابرین کے ساتھ ہے)

نیز درُود، رحمت خدا، اور ہدایت یہ تینوں نعمتیں صرف صابروں کو ہی اکٹھا ملتی ہیں۔ وہ فرما رہا ہے کہ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ خداوند عالم صابروں کو عزیز رکھتا ہے اور صبر کی صفت سوائے اپنے دوستوں کے کسی دوسرے کو نہیں دیتا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے۔ إِنَّ أَقَلَّ مَا أُوتِيتُمُ الْيَقِينُ وَعَزِيمَةُ الصَّبْرِ (یعنی خداوند عالم نے صبر اور یقین کے مراتب کو بہت کم عطا کیا ہے) اور اگر کسی کو دونوں چیزیں یکجا عنائت ہو گئی ہیں، تو وہ کسی بات سے نہ ڈرے! چاہے عبادات کم ہی کرے، اور اے دوستو! میں تم سب کو دوست رکھتا ہوں۔ اگر تم صبر سے کام لیتے رہو، لیکن مجھے ڈر ہے کہ بعد میرے دُنیا تمھارے لیے کشادہ نہ ہو جائے۔ تم آپس میں جھگڑو! اور ایک دوسرے کی مخالفت کرو، اور جو آدمی صبر کرتا ہے۔ اس کو ثواب ضرور ملتا ہے۔ تم صبر کرو، یہ دنیا فانی ہے، لیکن خداوند عالم کا ثواب غیر فانی ہی رہے گا۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا اس کے بعد اس آیت کو پورا تلاوت فرمایا۔

اور ارشاد ہوا کہ صبر ایک خزانہ ہے۔ بہشت کے خزانوں ہی سے۔ اگر صبر مرد کی شکل میں ہوتا تو انتہائی کریم ہوتا۔ خداوند عالم صابرین کو دوست رکھتا ہے۔

حضرت داؤد کو وحی ہوئی کہ میرے اخلاق کے آئینہ دار رہو۔ اور صبر بھی میرے اخلاق میں شامل ہے کہ میں صابر ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ بغیر صبر کے تمھاری خواہش کے مطابق کوئی چیز نہیں مل سکتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم لوگ مومن ہو؟ انھوں نے عرض کی ہم مومن ہیں۔ سرکارِ رسالت ﷺ نے دریافت کیا، کہ کیا نشانیاں ہیں مومنیت کی تمھارے پاس۔ اُن لوگوں نے عرض کی کہ نعمت پر شکر کرتے ہیں، اور تکلیف کے وقت صبر اور خداوند عالم کے احکامات سے خوش رہتے ہیں۔

ارشادِ نبوی ہوا کہ تم حقیقتاً مسلمان ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ صبر ایمان کا سر ہے، جیسے بدن کا سر۔ اور اگر آدمی سے سر کو جدا کر دیا جائے تو وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ للہٰذا معلوم ہوا کہ حِلم ہی انسان کی شانِ بندگی کی دلیل ہے۔

صبر کے حقائق

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے۔ اس لیے اس میں صبر کی کیفیات ہیں۔ ورنہ جانوروں میں صبر کا مادہ ہی نہیں۔ اسی طرح ملائکہ کو صبر کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے کہ وہ خواہشات سے آزاد ہیں۔ اور جانور خواہشات کے فرمانبردار ہیں، اور وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں کسی بات کو سوچنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

مدارجِ انسانی لیکن انسان ہی ایک ایسی چیز ہے، جس میں دونوں صفات مجتمع کر دی گئی ہیں۔ صفاتِ ظاہر میں جانوروں کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً کھانا، پینا، زیب و زینت اور ضروریاتِ زندگی۔ یہ سب چیزیں حیوانوں کی اس میں شامل ہیں۔

اسی طرح فرشتوں کی فطرت میں بھی وہ شریک ہے۔ خداوند عالم نے فرشتوں کا نور انسان کی تخلیق میں بھی شامل کیا ہے۔ جس کے بعد وہ دُور اندیشی، عقلمندی اور اپنی اچھائی بُرائی کو سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسی جوہرِ ملکوتی کے ذریعہ معرفتِ حق، حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے فوائد و نقائص کو ہر گوشے اور ہر حیثیت سے سمجھ لیتا ہے، کہ دنیا میں گناہ کے کیا نتائج ہیں۔ اور اگر اُن سے خوشی ہوتی ہے، تو ایک ہی آن کے بعد ختم ہو جاتی۔ دُنیا کی خوشی خوشی نہیں۔ یہ سب کچھ فانی ہے۔ یہاں کی تکالیف اور رنج ایک عرصہ تک رہتا ہے۔

جانوروں کو یہ محسوسات عطا نہیں کیے گئے۔ ورنہ وہ بھی خواہشاتِ نفسانی کو بُرا سمجھ کر اس سے پرہیز کرتا۔

(صبر) پس معلوم ہوا، کہ ملائکہ کا جوہر اس کو شہوات کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ قوتِ احساس کو اُجاگر کر کے نیکیوں کی طرف لاتا ہے۔ اور شیاطین اس کو بہکانے کے لیے پیچھے لگے رہتے ہیں، تاکہ اس کو شہوات کی طرف دلچسپی ہو۔ انسان درمیان میں کھڑا دونوں طرف کے نظارے کرتا ہے۔ اب اگر وہ شیطان کو شکست دے کر اپنے جوہرِ اصلی کو نہیں بھولتا۔ اس کے پیر نہیں ڈگمگاتے پس اس کو ثباتِ قدم کہتے ہیں۔

(ظفر) (جہادِ نفس) اور شہوانی خواہشات کو مغلوب کر لینا، ظفر ہے۔ اور ابلیس کے بہکانے سے اس نے اپنے نفس کو مغلوب کر لیا، اس کا نام "جہادِ نفس" ہے۔

اور اگر انسان کے ساتھ یہ تمام مخالفین نہ ہوں، تو نہ صبر، نہ ظفر اور نہ جہادِ نفس کا۔ خداوندِ عالم نے دو فرشتے ہر آدمی پر مسلط کئے۔ ان کا نام کراماً کاتبین ہے۔ اور انسان کو عقل عنایت کر کے قوتِ ادراک عطا کی، تاکہ وہ اچھے بُرے کو سوچ لے۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کا کوئی مخالف ہوگا۔ اس کی حفاظت کا سامان بھی ضروری ہے۔ یہ تمام انتظامات صرف اسی لیے کیے گئے ہیں، کہ انسان اپنے کو بچا سکے۔ چنانچہ بچپن میں اس کو "ادراک" نہیں ہوتا وہ جانوروں کی مثل خواہشات کا مطیع رہتا ہے۔ اور جب جوانی آتی ہے تو شہوات اس پر اپنا غلبہ اور زیادہ کرتی ہیں وہ دُنیا کی گوناگوں کیفیات سے محفوظ ہو کر عورت کے حُسن کو دیکھتا۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسری کو چاہتا ہے اس موقع پر آدمی سمجھتا ہے، کہ ہدایت من جانب اللہ ہوتی ہے۔ اور اس ہدایت پر عمل کرنے کی طاقت اور ارادہ بھی اسی کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے۔ پس جن فرشتوں کو تیری ہدایت کے لیے متعین کیا گیا ہے اگر اُن کے احکامات کو کان لگا کر سُنے گا، تو یہ توجہ باعثِ احسان ہوگی۔ اور یہ بھی ایک نیکی ہوگی، اور اگر حیوانوں اور بچوں کی طرح نہ عمل کرے گا، تو گناہگار ہوگا، اور اسی کو غلطی (تقصیر) کہتے ہیں۔ یہ غلطی تیرے اعمالنامے میں لکھی جائے گی۔

اور اگر اس کی نصائح سُن کر گناہوں اور غلطیوں سے دُور رہنے کی کوشش کرے گا، تو وہ نیکی بھی اسی میں لکھی جائے گی۔ چنانچہ اسی طرح یہ دونوں فرشتے تیرے ہر کام کو دیکھتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ انسان اُن کو اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ ان کتابچوں پر نظر کر سکتا ہے، جو اعمال نامے سے منسوب ہیں۔ لیکن جب اس عالم ظاہر سے باطنی وجوب کی طرف پرواز کرے گا۔

قیامتِ صغریٰ موجودہ آلائشِ ظاہری کو یہاں چھوڑ کر چشمہائے حقیقت اس کو عطا کی جائیں گی۔ تب وہ اپنے کراماً کاتبیں اور اس اعمال نامے کو اپنے ساتھ منسلک دیکھے گا۔ اس کے بعد قیامت صغریٰ کا ملاحظہ کرے گا۔ "قیامتِ صغریٰ" موت کے وقت ہی کا نام ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مر گیا اس کی قیامت عمل میں آگئی۔ اس کے بعد قیامت کبریٰ ہوگی۔ اس کی تفصیل ہم نے احیاء العلوم میں لکھی۔ یہاں اس سے طول ہوگا، لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ صبر کے متعلق آپ کو بتا دیں کہ وہ کیا چیز ہے؟

صبر کے مقامات صبر وہاں ہوتا ہے، جہاں دو ضدیں آپس میں جمع ہوں۔ ایک نیکی اور ایک بدی۔ نیکی ملائکہ کے ساتھ ہے، اور بدی شیطانی لشکر ہیں۔ پس ان دونوں کی جنگ دین کی جنگ ہے۔ اور انسان کا اس لڑائی میں قدم رکھنا دین کی حفاظت کا اقدام ہے۔

بچپن میں خواہشات غالب رہیں۔ لہٰذا شیاطین کی خواہشات اس پر غالب رہیں۔ ادھر جوانی میں اس نے قدم رکھا اور شہوات نے بھی اس پر غلبہ کیا، گویا کہ شیطان کو اب اور تقویت ملی، لیکن ادھر عالمِ ملکوتی سے دو فرشتے اس کی حفاظت کے لیے مامور ہوئے، اور اُنھوں نے قوتِ ادراک اس میں ودیعت کردی، تاکہ وہ اپنا بُرا بھلا سوچ کر شیطانی دلچسپیوں سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ اور جس نے کنارہ کشی اختیار کی، اس نے اپنے نفس کو مغلوب کرلیا۔ بس یہی شرع کی اطاعت و فرمانبرداری ہے اور فتح و ظفر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شیطان کے مقابلے میں خداوندِ عالم نے میری مدد فرمائی اور مسلمان ہوا۔ آدمی جب لشکرِ شیطانی سے برسرِ پیکار ہوتا ہے، تو کبھی فتح و شکست دونوں میں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ اس پر غالب آتا ہے۔ اور کبھی شیطان اس پر غلبہ کرلیتا ہے۔ لہٰذا ایسے وقت صبر کرنے کی ضرورت ہے۔ جب خواہشات کے اوہام اس کو گھیرلیں۔

نصف ایمان صبر ہے۔ اور نصف صبر روزہ ہے

ایمان بذاتِ خود تنہا نہیں ہے، بلکہ اس کی بہت قسمیں ہیں۔ اور وہ خود کئی صفات کا مجموعہ ہے۔

حدیث شریف ہے کہ ایمان کے ۷۳ دروازے ہیں۔ اور سب سے بڑا باب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور سب سے چھوٹا راستے سے کوئی کانٹا اُٹھا کر لوگوں کو تکلیف سے بچانا ہے۔ اگرچہ قسمیں تو بہت ہیں، لیکن اس کے اصول صرف تین ہیں۔ معارف۔ احوال۔ اعمال۔

ایمان کسی حال میں بھی ان تینوں کے اندر ہی ہوگا۔ مثلاً توبہ اور شرمندگی و عاجزی، جو دل سے متعلق ہیں، اس کی بُنیاد معارف ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ گناہ کرنا انسان کے لیے زہرِ ہلاہل کا کام کرتا ہے۔ لہٰذا آدمی گناہوں سے بچے، اور عبادات میں مشغول رہے۔ لہٰذا یہ عبادت "ایمان" میں شامل ہے۔ ایمان تین ان چیزوں سے پہچانا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی معرفت سے ایمان مکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اصول میں شامل ہے۔ اور حالات کا تغیّر و تبدّل معرفت کی منازل کے ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ اُن میں جو حالات بنتے رہتے ہیں، وہ اس ایمان کا نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ کہ اب انسان معرفت کی کس منزل پر پہنچ رہا ہے۔

لہٰذا انسان کا افعال اور معرفت دو ہی چیزوں پر ایمان کا دار و مدار ہوا۔ افعال میں اگر آدمی صبر نہ کرے تو کردار خراب ہوجائیں گے۔ معلوم ہوا کہ صبر نصف ایمان ہے۔

کردار کو دُرست کرنے کے لیے صبر سے دو مواقع پر کام لینا ضروری ہے۔ پہلے شہوات جسمانی کے وقت۔ دُوسرے قوّتِ غضب جب غالب ہوجائے۔ شہوات کو دبانے کا ذریعہ "روزہ" ہے۔ انسان پر روزے کی حالت میں قوّتِ شہوت غالب نہیں ہوتی۔ لہٰذا روزہ نصف صبر ہی ہوا۔

ایمان کی بُنیادیں صبر سے ہی استوار ہوتی ہیں

دوسرے یہ کہ انسان کو کردار کا خیال اوّل رکھنا ضروری ہے، اور کردار کے ذریعہ ہی ایمان کو درست کیا جاتا ہے۔ مثلاً انسان تکلیف و مشقت برداشت کرتا ہے، اور اس برداشت کا دوسرا نام صبر ہے۔ اسی طرح عیش و تنعّم کے زمانے میں شکر بجالاتا ہے۔ ہر حیثیت سے صبر کرنا ضروری ہے۔

حدیث میں ہے، کہ اگر صبر کو اپنے افعال کی بُنیاد قرار دے دی جائے، تو ایمان حاصل ہو سکتا ہے۔ اور صبر انتہائی مُشکل ہوتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "صبر" ایمان ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صبر کرنا انتہائی مُشکل ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسے عرفہ حج کے لیے ضروری ہے، اور اگر عرفہ نہ کرے تو حج نہ ہوگا۔ لہٰذا اگر صبر نہ کرے تو ایمان کا قیام ناممکن ہے۔

شعبۂ زندگی میں صبر کی اہمیّت

اِنسان کے ساتھ نفس کو لازم و ملزوم کی حیثیت ہے کہ یا تو وہ نفس کی پیروی کرے یا مخالفت۔ مخالفت کرنے میں صبر کی ضرورت ہے۔ خواہشاتِ دنیا، مثلاً جاہ و مرتبہ، اہل و عیال، مال و دولت وغیرہ میں صبر کرنا ضروری ہے۔ ان چیزوں کی خواہشات جب حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی ہیں، تب غرور کی منازل شروع ہوتی ہیں۔

بزرگانِ دین کا مقولہ ہے، کہ رنج و تکلیف کے وقت تو ہر آدمی صبر کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، بچاہے وہ صبر کر سکتا ہو یا نہیں، لیکن عیش و آرام اور تنعمات کے وقت صبر کرنا صدیقین کی شان ہے۔

خداوند عالم نے اسی لیے مال اور اہل و عیال کو فتنہ قرار دیا ہے۔ اِنسان سب سے بڑے مرتبے پر اس وقت پہنچتا ہے کہ نعمات دنیوی ہوتے ہوئے صبر سے کام لے۔ دنیاوی عیش و تنعّم کو چند روزہ حیثیّت دے کر صبر کرے۔ بلکہ ان تمام نعمتوں کو اچھا ہی تصور کرے۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ غالباً یہ مال و منال ہی میرے مناصب کے زوال کا باعث بن جائیں۔ لہٰذا خداوند عالم کا شکر ادا کرے۔ اور اس شکر کے ادا کرنے کے لیے جذبۂ صبر کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں انسان کی خواہشات کے خلاف ہوتی ہیں، وہ مخالفت نفس تین طرح پر ہے۔

پہلی یہ کہ آدمی مخالفتِ نفس کر کے گناہوں کو چھوڑ دے، اور عبادات میں مصروف ہو جائے۔

دوسرے مصائب کے وقت صبر کرنا، جو سب اس کے اختیارات سے باہر ہوں۔

تیسرے دوسروں سے جو تکالیف پہنچیں، اُن کو برداشت کرنا۔

تفصیل پہلی قسم یعنی مخالفتِ نفس کے بعد عبادات الٰہی میں مشغول رہنا — اس میں صبر کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ آدمی کاہلی کی وجہ سے نماز وغیرہ کی ادائیگی سے محروم رہتا ہے۔ لہٰذا ہر عبادت میں قوتِ ارادی

آدمی کی زبردست ہونا چاہیے۔ اور قوتِ ارادی صبر سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ عبادت کرنے میں ہر وقت صبر کرنا پڑتا ہے۔ پہلے، درمیان اور آخر تینوں اوقات میں۔

عبادت سے پہلے اس لیے کہ آدمی جب عبادت شروع کرے تو خلوص کی ضرورت ہے۔ یہ منزل انتہائی مشکل ہے کہ آدمی ظاہرداری اور "ریا" کو دل سے نکال دے۔

درمیانی عبادت میں آدمی کو خلوص رکھنا ضروری ہے مفاسد سے پرہیز کرے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھے اور سوائے خداوند عالم کے کسی طرف خیالات منتشر نہ ہوں۔

ختم عبادت پر انسان کو اپنے پر غرور نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ عبادت کا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔

ترکِ گناہ میں صبر کی ضرورت خصوصاً ترکِ گناہ میں انتہائی صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جتنا گناہ کے کرنے میں آسانی ہوگی، اتنا ہی اس کے صبر میں تکالیف۔ مثلاً سطحی بات پر غور کریں کہ زبانی گناہوں پر صبر کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ انسان کو زبان سے کچھ بھی کہہ دینا عادت میں ہوتا ہے، اور وہ ہی فتنہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی باتیں شیطان کی پیری کی موجب ہیں، اور دوسروں کو بُرا کہہ دینا۔ اپنی تعریف کرنا یہ سب باتیں آدمی بہت آسان سمجھتا ہے۔ بعض اوقات ایسی باتیں عوام کے سامنے کرنا پڑتی ہیں، جن سے وہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔ ایسے وقت کہنے والا قطعی یہ نہیں سوچتا کہ میں کوئی گناہ کر رہا ہوں۔ لہٰذا ایسے وقت صبر ناممکنات سے ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس کو اپنے گناہ کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے وقت جب کہ آدمی بذاتِ خود مجبور ہے۔ مثلاً دوسرے لوگ اس کو تکلیف پہنچاتے ہیں اُس وقت وہ صرف بدلہ لے سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے وقت بھی صبر کی ضرورت ہے۔ یا تو بدلہ ہی نہ لے، یہ تو صبر کی بڑی بلند منزل ہے۔ اور اگر جذبۂ بشریت کے ماتحت لے بھی تو حد سے زیادہ نہ بڑھے۔

ایک صحابی کا مقولہ ہے کہ جب تک آدمی دوسروں کی باتوں پر صبر کی طاقت نہ رکھے۔ تب تک وہ ایمان میں مکمل نہیں ہوتا۔

خداوند عالم نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دیا، کہ اے رسول! تم ظلم کرنے والوں کو نظر انداز کرو۔ اور اپنے خدا پر توکل کرو۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (یعنی اے میرے رسول! مخالفین کی باتوں پر صبر کرو! اور ہجرت اختیار کرو!) ایک جگہ اور ارشاد ہو رہا ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (یعنی میں سمجھتا ہوں کہ تم دشمنوں کی باتوں سے غمزدہ ہوتے ہو، لیکن عبادت ہی میں مشغول رہو)۔

(واقعہ) ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال تقسیم کر رہے تھے۔ ایک شخص نے اعتراض کر دیا کہ (معاذ اللہ)

یہ تقسیم صحیح نہیں ہے۔ یہ اطلاع آنحضرتؐ نے بھی سُنی۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند عالم میرے بھائی موسیٰ پر صبر کرے۔ اُن کو اُن کی اُمت اس سے زیادہ سخت سُست کہا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَہُوَ خَیۡرٌ لِّلصّٰبِرِیۡنَ (یعنی اگر تم کو کوئی تکلیف پہنچائے اور تم بدلہ لو، تو اتنا ہی جتنا اس نے تم کو تکلیف پہنچائی ہے۔ اور اگر اس پر صبر کرلو، تو بہترین عمل ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک بار فرمایا کہ مجھ سے پہلے انبیاء نے اپنی اُمتوں کو یہ حکم دیا، کہ ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، اور آنکھ کے بدلے میں آنکھ۔ اور دانت کے بدلے میں دانت ہی کا بدلہ لو۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی تم کو تھپڑ مارے تو دوسرا گال اس کی طرف بڑھا دو! اور اگر کوئی تمھاری ٹوپی چھین لے تو تم اپنی قمیض بھی اس کو پیش کر دو۔

اور ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ اگر کوئی آدمی تم کو تمھارے حصّے سے محروم کرے تو تم اس کو اور بخش دو! اور بدی کرنے والے کے ساتھ نیکی کرو، اور یہی مرتبہ تم کو صدیقوں میں شامل کر دے گا۔

تیسری وہ باتیں، جو آدمی کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ وہ آفات سماوی ہیں۔ مثلاً بیٹا مر جائے مال چوری ہو جائے۔ یا اپنے جسم میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے۔ ان چیزوں میں صبر سے کام لینا۔ انتہائی ثواب کا باعث ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایسے صبر کو تین منازل میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے عبادت میں صبر کرنا۔ اس کا ثواب تین سو گنا ملتا ہے۔ دوسرے حرام کاموں سے پرہیز کرنے کا ثواب چھ سو گنا ملتا ہے تیسرا مصیبت کے وقت صبر کرنا۔ اس میں نو سو گنا ثواب ہوتا ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم نے فرمایا کہ میں جس بندے کو کوئی بیماری دیتا ہوں اور وہ کسی سے اس بیماری کا گلہ نہیں کرتا، تو اس کو پہلے سے زیادہ تندرست کرتا ہوں، اور اگر وہ دُنیا سے اُٹھتا ہے تو میری رحمتیں اس کے شامل حال ہوتی ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک مرتبہ بارگاہِ ایزدی میں صبر کے متعلق دریافت کیا۔ ندا آئی کہ صبر کرنے والے کو ایمان جیسی بے بہا چیز عنایت ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فراغت کی اُمیدیں صبر کے ساتھ عبادت کا درجہ رکھتی ہیں اور مصیبت کے وقت آدمی کہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔ اَللّٰھُمَّ اْجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَعَقِّبْنِیْ خَیْرًا مِّنْھَا (یعنی بے شک ہم خدا ہی کے واسطے ہیں اور اسی کی طرف رجوع ہوں گے۔ اور اے خدا تو میری تکالیف کا اجر عنایت فرما! اور اس کا اچھا بدلہ دے) خداوند عالم یہ دعا قبول فرماتا ہے۔ اور

ایک بار خداوند عالم نے جبرئیل سے فرمایا کہ میں جس شخص سے بینائی لیتا ہوں اس کو جنت میں جگہ دیتا ہوں۔
ایک بزرگ نے ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ جب کبھی اُن کو کوئی تکلیف پہنچتی تو اس کو پڑھ لیتے۔

سالم مولائیؒ سے مروی ہے کہ میں نے ایک بار حضرت حذیفہ کو میدانِ جنگ میں زخمی دیکھا۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کو پانی کی خواہش نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ مجھے گھسیٹ کر دشمن کے پاس لے جا، اور میری تلوار کی ڈھال میں پانی بھر دے۔ اگر شام تک زندہ رہا، تو روزہ افطار کر لوں گا، ورنہ نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے "ابراہیم" نے جب اِنتقال کیا، تو آپ رونے لگے صحابہ نے عرض کیا کہ رونے کو تو حضورؐ نے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ رونا رحمت ہے اور خداوند عالم رحمت کرتا ہے۔

اگر آدمی پر کوئی مصیبت پڑے، تو اس کے چہرے پر کوئی تغیر نہ ہونا۔ صبر کی علامت ہے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی رمیصنہ سے روایت ہے، کہ ایک بار ابوطلحہ باہر گئے ہوئے تھے۔ میرا بیٹا اُن کے پیچھے انتقال کر گیا۔ جب واپس آئے تو میں نے اپنے بیٹے کی لاش کو چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ میرے شوہر نے بیٹے کی حالت دریافت کی۔ میں نے کہا کہ آج تمام راتوں سے آرام میں ہے۔ اس کے بعد میں نے اور میرے شوہر نے کھانا کھایا۔ اور اس رات کو میں نے اپنے کو خوب آراستہ کیا، اور رات کو شوہر نے مجھ سے جماع کیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے بیٹے کے متعلق اظہار کیا۔ شوہر نے کہا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ صبح کو یہ واقعہ آنحضرتؐ کو سُنایا۔ آپؐ نے فرمایا کہ کل رات تیرے لیے مبارک ترین رات تھی۔

ان تمام روایات اور احادیث و آیاتِ خداوندی سے معلوم ہوا کہ آدمی کو "صبر" سے کسی وقت کنارہ کش نہ ہونا چاہیے، بلکہ اگر آدمی عبادات شروع کر دے، اور گوشہ نشینی و ترکِ دنیا اختیار کر لے۔ پھر بھی اوہام و وساوس اس کو گھیرتے ہیں اور صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ بے فکر جوان خدا کی نگاہوں میں دشمن ہے، اور غالباً یہ اس لیے کہ نوجوان آدمی کو وسوسے زیادہ پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے شیطان اپنی کارفرمائیاں کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا اگر عبادت نہ کر سکے تو کارِ دنیا میں ہی مشغول ہو، لیکن وہ کام نیک ہونا چاہئیں، تاکہ گناہوں کے اوہام اس کو پریشان نہ کریں۔ بلکہ ایسے آدمی کو کسی کام میں ہر وقت مشغول رہنا چاہیے۔

تدابیر "صبر"

صبر کرنے کی ہزاروں تدابیر ہیں۔ اس کے متعلق "مہلکات" کے ماتحت بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے۔

یہاں صرف ایک مثال کے طور پر سمجھائے دیتے ہیں، تاکہ وہ ہر بات کو اس پر منطبق کر کے کسی اچھے نتیجے پر پہنچ جایا کرے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شہوات کے مقابلے میں کارِ دین کو سبقت دینا "صبر" کہلاتا ہے۔ یہ دونوں اسباب آپس میں متضاد ہیں۔ لہٰذا ایک کو دبانے کے دوسرے کی مدد کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ جس کو دبانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے دُشمن کی مدد کی جاتی ہے۔

پہلے یہ کہ اس قوت کو دبایا جائے، جس کی وجہ سے شہوت زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً بہتر ین غذائیں کھانا چھوڑ دی جائیں، اور "روزہ" رکھنا شروع کر دیا جائے۔ تاکہ نفس اور اعضاء میں گناہ کی قوت کم ہو جائے۔

دوسرے شہوت کو بڑھانے والی صورتوں سے پرہیز کرے۔ یعنی ایسی جگہ نہ جائے جہاں حسین عورتیں ہوں۔

تیسرے اپنے نفس کو اچھے کاموں سے تسکین دینے کی کوشش کریں۔ مثلاً شادی کر لی جائے، تاکہ فعل حرام سے بچ سکے۔ نفس ایک ایسا جانور ہے کہ جو بغیر اپنی خواہش کے قرار نہیں پاتا۔ لہٰذا یا تو اس کی خواہشات کو دبایا جائے یا خواہشات کو اچھی جگہ استعمال کیا جائے تاکہ گناہ نہ ہو۔

اسی طرح شہوت کو اتنا کمزور کر دے کہ وہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو۔

دین کی طرف توجہ کرنے کے لیے بھی دو طریقوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ آدمی کو چاہیے کہ دل کو اُن شہوات کو مفتوح کرنے میں جو خوبیاں ہیں، اُن کو پیشِ نظر رکھے۔ یا احادیث رسُول کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ کہ شہوت صرف چند لمحوں کا لُطف حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اور دین میں سعادت ابدی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا دین اور ایمان ان خیالات سے مضبوط ہو جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ نیک عادات کو بآہستگی نفس کے مقابلے میں استوار کرنے کی کوشش کرے۔ کسی چیز کو مفتوح کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے، کہ اس کو آہستہ آہستہ دبائے اور جب وہ قطعی طور پر ختم ہو جائے تو خواہشات دین کی طرف متوجہ کرے۔ کسی چیز کو زیر کرنے یا اپنے کو طاقت ور بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی اوّل چھوٹے چھوٹے گناہوں کو ترک کرے، اور اسی طرح اس کا عادی ہو جائے، اور وہ صرف "صبر" کرنے سے کر سکتا ہے۔ لہٰذا صبر کی تدابیر یہی ہو سکتی ہیں۔

شُکرِ خدا

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے، کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں، جو میرا شکر ادا کرتے ہیں۔ ابلیس اسی کے متعلق طنز کر رہا ہے، کہ ان میں سے زیادہ تر شاکرین نہیں ہیں۔

شکر ایک ایسا بلند مقام ہے، جس پر ہر شخص نہیں پہنچ سکتا۔

منجیات کے اقسام

منجیات دو قسموں پر منقسم ہے۔

ایک تو وہ اعمال جو دین کے لیے وسیلہ قرار پاتے ہیں۔ مثلاً زہد۔ اتقا۔ خوف اور صبر وغیرہ۔ یہ سب چیزیں فی نفسہ دین سے متعلق ہیں (بذات خود دین نہیں ہو سکتیں)۔

دوسری وہ چیزیں جو بذاتِ خود دین کا مقصد ہیں۔ وہ دوسرے کاموں کا وسیلہ نہیں ہیں۔ جیسے محبت رضا۔ توحید۔ توکل اور شکر وغیرہ۔ یہ چیزیں آخرت تک ساتھ رہیں گی۔

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (یعنی آخری دُعا اُن لوگوں کی یہ ہوتی ہے کہ تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جو تمام عالمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگرچہ شکر کا درجہ آخری ہے، اور اس کو بعد میں ہی بیان کرنا چاہیے، لیکن چونکہ صبر سے متعلق تھا۔ اس لیے یہاں بیان کیا گیا۔

شکر کے متعلق پروردگارِ عالم ایک جگہ فرما رہا ہے کہ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ (یعنی تم مجھے یاد کرو، تو میں تمھیں یاد کروں گا، اور میری نعمات کا شکر ادا کرو۔ کفرانِ نعمت نہ کرو!)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی کھانا کھا کر شکر ادا کرتا ہے وہ صابرین اور روزہ داروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، سے فرمایا کہ اپنے میں تین چیزیں جمع کرو۔ شکر کرنے والا دل، عبادت کرنے والی زبان اور مومنہ عورت۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں یہ تینوں باتیں آدمی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ شکر نصف ایمان کے مترادف ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا، کہ آنحضرتؐ کا کوئی بہترین عمل بتائیں۔ آپ نے فرمایا کہ آنحضرتؐ کا ہر فعل عجیب و غریب تھا۔ ایک بار آنحضرتؐ شب خوابی کے لیے میرے پاس تشریف لائے اور میرے ہی بستر پر میرے پاس لیٹ گئے۔ جب آنحضرت کا ننگا جسم میرے ننگے جسم سے مس ہوا، تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے اس وقت چھوڑ دے، تاکہ میں خدا کی عبادت کروں۔ میں نے عرض کی کہ اگرچہ میں اس وقت آپ کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن تشریف لے جائیے! آنحضرتؐ کھڑے ہو گئے، اور وضو فرما کر نماز میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ حضورؐ زاری میں مشغول تھے۔ میں نے عرض کی کہ یا حضرت! آپ کے تمام گناہ بخش دیئے گئے ہیں، پھر زاری میں کیوں مشغول ہیں؟ فرمایا کہ شکر گذار بندے کو ہر حال میں رونا چاہیے۔ آج میرے اُوپر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ (یعنی عقلمند آدمی ہر وقت خداوند عالم کی یاد میں مشغول رہتے ہیں۔ اور عجائبات عالم کو غور و فکر سے دیکھتے ہیں اور اپنے درجات کی مُسرّت میں آنسو بہاتے ہیں۔ خوفِ خدا سے نہیں۔

مروی ہے ایک پیغمبر علیہ السلام ایک طرف جا رہے تھے۔ دیکھا ایک پتّھر سے پانی بہہ رہا ہے۔ آپ کو بڑا تعجب ہُوا۔ اس پتھر نے بحکمِ خدا عرض کیا کہ جب سے یہ آیت نازل ہوئی، کہ آدمی اور پتھر دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ میں برابر رو رہا ہوں۔ چنانچہ آپ نے دُعا فرمائی اور دُعا مستجاب الدعوات ہوگئی۔ دوبارہ پھر کبھی اس طرف کو تشریف لائے تو پتّھر رو رہا تھا۔ آپ نے پھر سبب دریافت کیا۔ پتّھر نے عرض کی کہ پہلے خوف کی وجہ سے رو رہا تھا۔ اور اب شکرِ خدا میں آنسو نکل رہے ہیں۔

یہ مثال صرف شقی القلب آدمی کے لیے ہے، کہ وہ کبھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ آدمی کو چاہیے کہ روئے۔ کبھی رنج کی وجہ سے کبھی خوشی کی وجہ سے تاکہ اِس کا دل نرم ہو جائے۔

شکر کیا چیز ہے؟

پہلے تم کو بتایا جا چکا ہے کہ دین کے مدارج تین ہیں۔ علمؔ۔ حالؔ۔ عملؔ۔

علمؔ اصل بنیاد ہے۔ حال اس کی فرع ہے، اور اعمال حال کی فرع ہیں۔ اسی طرح خداوند عالم کی عطا کردہ نعمات کو سمجھنا اور اس کا شکر ادا کرنا "علم" کے مترادف ہے، اور اُن نعمات سے خوش ہونا حال کا مرتبہ رکھتا ہے، اور نعمات خداوندی کا صحیح مصرف اعمال ہیں۔

اعمال نیک کا تعلّق دل اور زبان دونوں سے ہے۔ لہٰذا دونوں کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ لہٰذا شکر کو سمجھ لینے کے لیے علم کا جاننا ضروری ہے۔

علم کے ذریعہ خداوند عالم کی بخششوں کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔ کہ وہ تنہا تجھ کو یہ نعمات عطا کر رہا ہے۔ اور اگر درمیان میں کوئی ذریعہ یا واسطہ سوچا، تو تیرا شکر نامکمّل ہوگا۔

ادنیٰ اسی مثال ہے کہ اگر بادشاہ کی طرف سے کوئی انعام ملے، تو وزیر کا شکریہ ادا کرنا کس طرح مناسب ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کاغذ اور قلم وزیر کے ہاتھ میں ہے، اور انعام کی کُنجی خزانچی کے قبضے میں۔ لہٰذا اس لحاظ سے کہ وہ چیزیں بادشاہ کے حکم کی تابع ہیں۔ لہٰذا اُن کا شکریہ بھی ادا کیا جائے۔ لیکن اصلی شکر صرف بادشاہ کے لیے ہوگا۔ کہ اس نے وزیر کو حکم دیا، وزیر نے کاغذ پر قلم کے ذریعہ لکھ دیا اور خزانچی نے اپنے خزانے سے وہ انعام تجھ کو بخش دیا۔ بس اتنا تعلّق اس سے ہے۔ لہٰذا صرف اس تعلّق سے صرف خداوند نعمت کہہ دینا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ شکر کے درجات کو گرا دیتا ہے اور انسان کے ایمان کی کمزوری کا باعث ہے۔ اس لیے کہ بغیر حکم

شاہی خزانچی ایک پیسہ تجھ کو نہ دے گا۔ لہٰذا وہ حکم خدا ایک موکّل کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کے ذریعہ تم کو دلوایا گیا۔ بلکہ وہ شخص جو تیرے پاس تک نعمت پہنچانے کا ذریعہ بنا۔ اس کو بھی اس ثوابِ عظیم میں شریک کر لیا۔ یہ اس پر الگ احسان ہوگا۔

لہٰذا انسان کو صرف خداوند عالم کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہی حقیقی شکر کی علامت ہے۔

ایک بار حضرت موسیٰؑ نے عرض کی کہ بار الٰہا! تو نے آدم کو اپنے ہاتھ سے خلق کیا، اور انھوں نے شکر ادا کیا۔ وہ طریقہ شکر کیا تھا؟ ندا آئی، کہ آدم نے وہ تمام نعمات جو اُن کو عطا کی گئی تھیں، صرف من جانبِ اللہ سمجھا۔ اور درمیان میں کسی کو واسطہ قرار نہ دیا۔ بس یہ یقین ہی آدم کا، میرا شکر تھا۔

یہ معرفت ایمان کی ایک کڑی ہے۔ اس سے بلند "تقدیس" ہے۔ تقدیس وہ ہے کہ انسان کے وہم و گمان سے بھی اس کی ذات قطعی الگ ہے۔ بس سبحان اللہ اس کے لیے کہہ دینا کافی ہے۔

دوسرے توحید۔ یعنی خداوند عالم کو یکتائی کا درجہ حاصل ہے اور اسی کا مقصد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔

تیسرے تحمید۔ یعنی ہر موجود اس کے سبب سے ہے اور یہ سب نعمتیں ہیں، جس کو الحمد للہ کے ذریعہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

آنحضرتؐ نے ان تینوں کے درجات کو اس طرح الگ الگ فرما دیا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ میں دس ثواب ملتے ہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں بیس اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں تیس ثواب۔ یہ ثواب صرف زبان سے ادا کرنے سے حاصل نہیں ہوتے، بلکہ اصل معرفت سے حاصل ہوتے ہیں۔

علم شکر یہ ہی ہے۔ اب حال کے متعلق سمجھ لینا چاہیے۔ کہ حال وہ سرور ہے جو معرفت سے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جس آدمی کو کوئی چیز کہیں سے ملتی ہے وہ ضرور خوش ہوتا ہے اور یہ خوشی تین درجات پر مشتمل ہوتی ہے۔

پہلے یہ کہ اس نعمت کی اس کو ضرورت تھی، اور ملنے کے بعد خوش ہوا۔ یہ بات شکر میں داخل نہیں۔ اس لیے کہ وہ صرف اپنی ضرورت کے پورا ہونے میں خوش ہو رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ موجودہ نعمات پر اظہار تشکر کرے اور آئندہ کے لیے امیدوار ہو۔ یہ اصل شکر ہے۔ اس لیے کہ یہ اظہار "منعم" کی ذات کے لیے ہے۔ اپنے لیے نہیں، بلکہ امیدوں کو برقرار رکھنا اس کی قدرت کے تعارف کی منزلت رکھتا ہے، لیکن یہ شکر بھی ناقص ہے۔

تیسری منزل یہ ہے، کہ اُن نعمتوں پر اس لیے شکریہ ادا کرے، کہ اس نعمت کے ذریعہ خداوند عالم کی عبادات کروں گا۔ اس کی راہ میں صدقہ دوں گا۔ صرف یہ مقصد شکریہ، واقعی شکریہ ہے یا وہ اس لیے شکر ادا کرے کہ خدا نے اس کی یہ نعمات اس لیے دی ہیں کہ وہ اس بندے کے فعال سے

خوش ہے۔ بس آخری منزل شکریہ کی یہ ہے کہ نعمتوں کو خدا کی عبادات میں صرف کرنے اور راہِ معرفت کا ذریعہ سمجھے۔ اس کے بعد شکریہ ادا کرے۔

عملی طور پر شکرِ خداوندی کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے

عمل سے شروع اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی اپنی زبان اور جسم کو اطاعتِ خداوندی میں لگا دے۔ اور زبان سے ہر وقت الحمد للہ کہتا رہے۔

اپنے دل کو اس کی طرف رجوع کرے۔ دنیا کے ہر شخص کے ساتھ نیکی کرے۔ حسد اور بغض کو قریب نہ آنے دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کی مزاج پرسی فرمائی۔ اس نے عرض کیا "الحمد للہ" آپ نے فرمایا کہ تو نے صحیح جواب دیا۔ پہلے زمانے میں مزاج پرسی سے متعلق خداوند عالم کا شکر بجالانا ہوتا تھا۔

بدن کے ذریعہ اس طرح شکر ادا کیا جاتا ہے کہ دنیا سے الگ رہ کر اپنے اعضائے جسم کو عبادت میں لگا دے جو اس کے لیے وجہ تخلیق ہوا۔ اس لیے کہ انسان کو صرف آخرت کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ اگر انسان نے آخرت کے کاموں میں اپنے جسم کو مشغول نہ کیا، تو اس کی اصل وجہ ختم ہو گئی۔ اور اگر آخرت کی طرف متوجہ ہو گا تو صرف من وجہ اللہ ہی ہو گا۔ اس لیے کہ ان کاموں میں انسان کو بذاتِ خود کوئی لطف نہیں آتا، اور خداوند عالم کو بھی تیری اطاعت کی کوئی حاجت نہیں اور تو اس کا اطاعت گزار بندہ ہے اور شکریہ ادا کر رہا ہے۔ لہٰذا شکریے کی شان بہت بلند ہے۔

لہٰذا عبادات شکریہ ہیں اور کارہائے دنیا اس کی طرف سے منحرف کرنے والی ہیں، اور کفرانِ نعمت ہے۔ اسی طرح دنیا داری میں لگا رہنا بھی کفران نعمت ہی ہو گا۔

البتہ ایک بات رہ جاتی ہے کہ خداوند عالم کے نزدیک اچھے اور برے کاموں کو سمجھنا۔ لیکن اس کی تمیز بذاتِ خود ایک علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس کو سمجھنے کے لیے تخلیق عالم کی کنہ سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں چھوٹی چھوٹی مثالوں کے ذریعہ تم کو سمجھائے دیتے ہیں۔ اگر با تفصیل معلومات چاہتے ہو تو "احیاء العلوم" میں پڑھو۔

کفرانِ نعمت

خداوند عالم کی عطا کردہ نعمات کو اس کی رضا جوئی میں صرف کرنا "شکر نعمت" ہو گا، اور غلط کاموں میں صرف کرنا "کفرانِ نعمت"۔ لہٰذا نعمت کو اس کی پسندیدگی میں صرف کیا جائے۔

اور ان راہوں کے متعلق ارشاد رب العزت ہو رہا ہے، کہ صاحبانِ بصیرت، کاموں کی اچھائی اور برائی کو خلوص نیت کی وجہ سے پرکھ لیتے ہیں۔

ان میں بعض باتیں تو ظاہر ہیں۔ مثلاً پانی اس لیے برستا ہے کہ زمین سے گھاس اگنے لگے، اور گھاس

جانوروں کا چارہ ہے، اِس لیے اُگتی ہے۔ یا آفتاب سے دن اور رات بنتے ہیں۔ تاکہ مخلوقِ خدا رات کو آرام اور دن کو کام کر سکے۔ یہ چیزیں بالکل سطحی ہیں۔ اب اس میں وہ باتیں سمجھا دینے والی ہیں، جو عموماً نظر نہیں آتیں۔

اس کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ آدمی کی غرضِ خلقت "صرف آخرت" ہے۔ دُنیا نہیں ہے اور دنیا میں آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اور اسی لیے یہاں اس کو تمام ضروریات کا محتاج کیا ہے۔ اور دنیا کی تمام چیزیں اس کے لیے بنائی ہیں۔ لیکن آدمی کو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے ہے۔ اور وہ ہر شئے کو اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ اور جو چیز استعمال کے لائق نہ ہو وہ کیوں پیدا کی ہے۔ مثلاً سانپ کو کیوں تخلیق کیا؟ چیونٹی کو کیوں بنایا؟ اس طرح اور سینکڑوں چیزیں اس لیے کہ اس کو یہ سوچنے کا حق نہیں اور اگر وہ یہ سوچے تو چیونٹی بھی یہ سوچ سکتی ہے کہ آدمی کو بیکار بنایا کہ وہ ہماری خلق کو پیروں سے روندتا ہوا چلا جاتا ہے۔

دُنیا کی ہر چیز کو خُدا نے اپنی مصلحت کے مُطابق آراستہ کر کے تخلیق کی ہے

لہٰذا یہ طے کر لینا ضروری ہے، کہ خداوند عالم نے ہر چیز اپنی مصلحت کے ماتحت خلق کی، اور اس چیز کو "بدرجہ اتم" ضروریات سے آراستہ کیا۔ حیوانات، نباتات اور جمادات میں ہر چیز اس کی صلاحیت کے مُطابق اس میں ودیعت کی۔ اب یہ اعتراض غلط ہوگا کہ کسی جانور کو جمال عنایت نہیں ہوا۔ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے یہاں بُخل کو کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ ہر چیز اپنی ضرورت کے مطابق مکمل ہے۔ مثلاً آگ، یہ مروّت اور لطافت کی قطعی ضد ہے، جہاں ٹھنڈ ہوگی وہاں آگ ناممکن ہے۔ اور گرمی، سردی دونوں کا وجود بھی لازمی ہے۔ لہٰذا آگ اور پانی کو ان کے حالات کے ماتحت تخلیق کیا۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو الگ کر دیا۔

اسی طرح مکھی کو جس رطوبت سے بنایا گیا ہے، وہ رطوبت اس قابل تھی کہ اس میں رُوح پھونک دی جاتی اور جو رطوبت اس لائق نہ تھی، وہ صورتِ جسمیہ کے علاوہ حس و حرکت کے لائق نہ رہی۔ اسی طرح آدمی اس رطوبت سے پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس رطوبت میں وہ اہلیت نہ تھی۔ کیونکہ اس رطوبت میں اور انسانی ضمیر میں اضداد تھے، جو آپس میں جمع ہونا ناممکن ہیں۔ اسی طرح مکھی کو اس کی ضروری چیزیں مثلاً بال و پر، اور معدہ، آنکھ وغیرہ سب کچھ دیا۔ آنکھوں کے اوپر بجائے پلکوں کے دو "زائد" ہاتھ دے دیے، تاکہ اُن سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتی رہے۔

اس طولانی بحث سے صرف مقصد یہ تھا کہ ناظرین کو خداوند عالم کی حکمتِ کاملہ کا پتہ چل سکے، کہ اس نے ہر چیز کو اس کی ضروریات کے مطابق آراستہ و پیراستہ کر کے تخلیق کیا ہے۔ صرف انسان پر ہی اس کی عنایات

کچھ مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ لاکھوں قسم کی مخلوق ہے۔ اور ہر ایک کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ہر کامل کو اس کے ناقص پر قبضہ دے دیا ہے۔ اور اس روئے زمین میں انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اور دوسری مخلوق کو اس کا محکوم قرار دے دیا۔ لیکن دریاؤں کے اندر اور ہواؤں کی لہروں میں لاکھوں جاندار ایسے ہیں کہ آدمی کو ان کی خبر بھی نہیں۔ لیکن اس مخلوق میں بھی ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے والی چیزیں بنائی گئی ہیں، مگر انسان اگر اُن کو ایک نظر دیکھ بھی لے تو اُن کی بناوٹ اور آراستگی پر "انگشت بدنداں" رہ جائے۔ اُن کے متعلق بڑے بڑے حکماء و علماء کو بھی کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون ہیں اور کیسے ہیں۔ بہرحال ان کو بیان کرنا ایک طویل عمل ہے۔

البتہ انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ دنیا کی ہر چیز پر قادر نہیں۔ اور جو تمہارے لیے مفید نہ ہو، اس کی تخلیق میں چون وچرا کرنے لگو۔ یہ تمام کیڑے، مکوڑے اور مکھیاں، مچھر کسی نہ کسی مصلحت کے ماتحت پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً مکھی اس لیے کہ وہ خراب اور بدبودار چیزوں کو کھا جائے۔

اسی طرح سورج کو آدمی صرف اپنے فائدے کے لیے متصوّر نہ کرے۔ اس لیے کہ وہ اپنی عبادت میں مصروف ہے۔ اس کے لیے صرف یہی کام ہے کہ وہ صبح کو نکلے اور شام کو غروب ہو جائے۔ اور طلوع کے وقت تمہاری نظروں میں نور پیدا کر دے۔ اور زمین کے اندر کے دانوں میں "قوّتِ نمو" پیدا کر دے۔ لہٰذا وہ چیزیں جو تم سے متعلق نہ ہوں اُن کے لیے "شکر" کے متعلق بیان کرنا بیکار ہے۔

انسان کے اعضاء کی تخلیق کی غرض و غایت

اسی طرح جو چیزیں انسان سے متعلق ہیں۔ وہ لاکھوں ہیں، اور سب کا ذکر کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا چند مثالوں کے ذریعہ سمجھا دینا کافی ہوگا۔

مثلاً آنکھ اس لیے بنائی، کہ تم اس سے اپنا اچھا بُرا پہچان کر اچھے مقصد کو حاصل کرو۔ اور بُرے سے پرہیز کرو۔ اور خداوند عالم کی تخلیق کردہ گوناگوں نعمات پر نظر کرکے اپنی راہ سے واقف ہو سکو، اور خداوند عالم کی معرفت حاصل ہو سکے۔ اب اگر آنکھ سے تم نے نامحرم عورتوں کو تکنا شروع کر دیا تو یہ کفرانِ نعمت ہو جائے گا۔ پہلے بتایا گیا ہے کہ آفتاب کے بغیر تمہاری آنکھ بے نور ہے۔ اور اسی طرح بغیر آفتاب کی روشنی کے دن رات اور یہ دنیا بے کار ہے۔ لہٰذا تمہارا کسی عورت کو گھورنا آفتاب اور دنیا کے لیے بھی کفرانِ نعمت ہے۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ گناہ گار آدمی پر زمین و آسمان بھی لعنت کرتے ہیں۔ (یہ حدیث اسی مقصد سے منطبق ہوتی ہے)

اس کے بعد ہاتھوں پر غور کرو، کہ وہ اس لیے ودیعت کیے گیے ہیں کہ تم اپنے کاموں کو نیکی کے راستے میں مدد لے سکو۔ اُن سے طہارت کرو۔ کھانا کھاؤ۔ عبادت کے اور کسبِ معاش کے وقت اُن سے کام لو۔ اگر تم اِن ہاتھوں سے گناہ اور ظلم کرنے لگو گے، تو یہ کفرانِ نعمت ہوگا، بلکہ اگر داہنے ہاتھ سے طہارت کرو گے۔

یا بائیں ہاتھ سے قرآن مجید اٹھاؤ گے تو بھی کفرانِ نعمت میں شامل ہے۔ اس لیے کہ اچھے کام کے لیے داہنا ہاتھ بنایا گیا ہے اور اس کو بائیں ہاتھ کی بہ نسبت طاقتور بھی بنایا ہے۔ اس کے لیے عدل یہ ہی ہوگا کہ کھانا ہمیشہ داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔

اِنسان دو قسم کے کاموں میں مشغول رہتا ہے بعض شریف اور بعض حقیر۔ لہٰذا داہنے ہاتھ سے شریف قسم کے کام کرنا چاہئیں، اور بائیں ہاتھ سے حقیر، تاکہ عدل تمھارے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

اسی طرح اگر قبلہ کی طرف رُخ کر کے تھوکو گے یا پیشاب کرو گے، تو تُم نے گویا کہ چاروں سمتوں کا کفران کیا۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے قبلے کی سمت کو مقدّس ترین کیا، تاکہ اس کی طرف کھڑے ہو کر نماز ادا کرو۔ اور اس سمت کی طرف اپنا گھر بنایا، جو تمھارے خیالات کی تسلّی کر سکے۔ لہٰذا اگر اس کے خلاف کرو گے، تو جانوروں اور تم میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

اگر بے مقصد کسی ہری بھری شاخ کو توڑ لو گے تو بھی کفرانِ نعمت ہوگا۔ اس لیے کہ خداوند عالم کی بنائی ہوئی نعمت پر تم نے عدل سے کام نہ لیا۔ بس اس جگہ سے تمھاری اشرفیت ثابت ہوتی ہے۔ کہ اگر تم کو اس کی حاجت ہے تو اس شاخ کو توڑ کر اپنے کام میں لا سکتے ہو۔ اس لیے کہ وہ تمھارے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔

اس میں ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی دوسرے کی ملکیت ہے، تو بغیر اس کے مالک کی اجازت کے توڑنا بھی کفرانِ نعمت ہوگا۔ اگرچہ دُنیا کی کوئی چیز کسی کی ذاتی ملکیّت میں نہیں، لیکن خداوند عالم نے ہر ایک چیز پر ایک شخص کو تعینات کر دیا ہے، اور وہ بمنزلہ مہمان کے اس پہ قابض ہے۔ لہٰذا مہمان اگر ایک چیز لے لے تو اس سے چھین لینا یقیناً کفرانِ نعمت ہوگا۔

اسی مثال سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کسی مہمان کو بھی اس چیز کو اپنے قبضے میں کر لینے کا حق نہیں کہ وہ دوسروں کو اس سے مستفیض نہ ہونے دے۔ اگر کوئی مالدار ہے، تو وہ فقراء کو نہ دے، لیکن ظاہری فتوے کے ماتحت یہ حکم نہیں کہ وہ مال اس کی ملکیّت میں نہیں ہے۔ اور اگر یہ کہہ دیا جائے تو آپس میں لوٹ مار مچ جائے۔ لہٰذا اس مسئلے پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بہر حال خلافِ حکمت ضرور ہے۔ لہٰذا مال جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

مسئلہ برائے فروخت غلّہ اور سونا چاندی

خصوصاً غلّے کو جمع کرنا زیادہ بُرا ہے، اس لیے کہ وہ غذا ہے، لہٰذا اس کو گراں فروخت کرنے کی نیت سے جمع کرنا خدا کی لعنت کا موجب ہے۔ اسی طرح غلّے کو غلّے کے عوض سود لے کر فروخت کرنا یا بغیر تول کے لے کر فروخت کرنا گناہ ہے۔

اسی طرح سونا چاندی میں بھی یہ چیز ناجائز ہے ——— سونا چاندی کو خداوند عالم نے دو وجوہ سے پیدا کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ سونے چاندی سے غلّے اور دیگر اشیاء کی قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے مثلاً ایک گھوڑا کتنے غلاموں کے عوض فروخت کیا جائے۔ یا ایک گھوڑے کے عوض کتنا کپڑا واپس لیا جائے۔ لہٰذا اس کی تعداد مقرر کرنے کے لیے سونا چاندی ہے، تاکہ آپس کے لین دین میں سہولت پیدا ہو سکے۔ لہٰذا سونا چاندی کا جمع کرنا ایسا ہے جیسے مسلمانوں کے بادشاہ کو قید کر لیا جائے۔

دوسری خلت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ذریعہ دنیا کی تمام اشیاء خریدی جاتی ہیں، اور لوگ اس کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ اور جس آدمی کے پاس سونا یا چاندی ہے، وہ دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہے۔ یہ بات دوسری چیزوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً آدمی کے پاس کپڑا ہے تو غلّے کی ضرورت ہوتی ہے اور غلہ ہے، کپڑا کس طرح حاصل کرے؟

لہٰذا سونا چاندی ہی دنیا میں لین دین کا ذریعہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ذخیرہ کرنا، دنیا کے کاروبار اور مخلوق خدا کو تکلیف پہنچانا ہے، یا سونے اور چاندی کو آپس میں فروخت کرنے سے بھی دوسری اشیاء کی کساد بازاری ہو جائے گی۔ اور لین دین کا ذریعہ مسدود ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کو جمع کرنا ناجائز ہے۔

بعض اور بھی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ جن سے کوئی عالم بھی واقف نہیں، صرف تقلید پر حکم لگاتے ہیں۔ لیکن تقلید پر حکم لگانا ناقص ہے۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے عوام بات کو عقل کے تکے لگا کر طے کرلیں عالم اگر ان باتوں سے واقف ہو جائے تو عوام جس کو جائز سمجھتے ہیں، وہ اس کے خیال میں ناجائز ہوتی ہیں۔

یہاں تک کہ ایک بار کا واقعہ ہے، کہ ایک بزرگ نے اپنا بایاں پیر ایک بار پہلے اپنے جوتے میں ڈال دیا۔ اور بعد میں اس کا کفارہ میں گیہوں ادا کیے۔

لہٰذا اگر عوام الناس اس قسم کی غلطیاں کریں، جیسے کسی ہرے بھرے درخت کی شاخ توڑ لیں یا قبلے کی طرف پیشاب کرنے لگیں یا بائیں ہاتھ سے قرآن مجید اٹھائیں تو اتنے اعتراضات نہ ہوں گے جتنے کسی عالم پر ہو سکتے ہیں۔

عوام کم علمی کی وجہ سے ان باتوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ان باریکیوں کو نہیں سمجھ پاتے۔ اسی طرح اگر کوئی انجان آدمی جمعہ کی نماز کے وقت کسی چیز کی خرید و فروخت کرنے لگیں تو لوگ کم اعتراض کریں گے۔ بہ نسبت اس جاننے والے کے، جو اس وقت بیع و شرا کے مکروہ ہونے کو خوب سمجھتا ہے۔

"معاذاللہ" اگر کوئی آدمی مسجد کی محراب کے قریب قبلے کی طرف پشت کر کے قضائے حاجت کرنے لگے

تو قبلے کی طرف رُخ کرنا قابلِ عفو ہے۔ اس لیے کہ محض قبلے کی طرف پشت کرنا بہ نسبت اس بڑے گناہ کے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

اسی لیے یہ ظاہری فتویٰ صرف عوام الناس کے لیے ہوتے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ حدود شرع میں نرمی برتی جاتی ہے۔ مگر سالکانِ راہِ طریقت کو ظاہری فتویٰ کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہیے، اور اس کا فرض ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باریکیوں کو نگاہ میں رکھے، تاکہ عدل اور حکمت میں فرشتوں کے خصلات پیدا کر سکے۔ ورنہ عوام کی طرح جانوروں میں مشمور کیا جائے گا۔

حقائق نعمت

خداوند عالم کی پیدا کی ہوئی چیزیں انسان کے لیے چار قسموں پر منقسم ہیں۔

پہلے وہ چیزیں جو اس موجودہ دنیا اور عالمِ آخرت دونوں کے لیے مفید ہیں۔ جیسے علم۔ بردباری اور نیک خلقی وغیرہ حقیقتاً تو اس جہان کے لیے بھی یہ چیزیں نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔

دوسرے وہ چیزیں جو دُنیا و آخرت دونوں کے لیے باعثِ مضرت ہیں۔ مثلاً کج خلقی۔ بیوقوفی۔ یہ سب سے زیادہ باعثِ تکلیف و بلا ہوتی ہیں۔

تیسرے یہ کہ دُنیا کے لیے نعمت اور آخرت کے لیے مصیبت کا باعث ہوتی ہیں۔ عارفانِ حقیقت انھیں چیزوں کا باعثِ تکلیف سمجھتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ نعماتِ دنیوی بالکل زہر آلود شہد کی مثل ہوتی ہیں، جن کو وہ انتہائی بھوک اور پیاس کے باوجود ہاتھ نہیں لگاتے۔

چوتھے وہ نعمات جن سے اِس دنیا کا کوئی تعلق اور لگاؤ نہیں، بلکہ آخرت کے لیے باعثِ آرام و عیش ہوتی ہیں۔ اور وہ مجاہدۂ نفس اور عباداتِ الٰہیہ ہیں۔ ان چیزوں کو سالکان راہ حقیقت ہی نعمت سمجھتے ہیں جس طرح بظاہر تلخ دوائیں بیماروں کے لیے دمِ مسیحی کا کام کرتی ہیں، اور بیوقوف لوگ اس کی تلخی کی وجہ سے مُنہ نہیں لگاتے۔

دلائل نعمات

نعمت خُدا کی دلیلیں دنیا کی زیادہ تر چیزیں اچھائی اور بُرائی سے خلط ملط ہیں، اُن میں بعض خوبیاں ہوتی ہیں، اور بعض کمزوریاں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ چیزیں جن میں اچھائیاں زیادہ ہوں، اور بُرائیاں کم، وہ اختیار کرنا بھی اچھا ہوگا۔ یہ صفات حالات کے ماتحت تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً مال کا زیادہ ہونا انسان کے لیے باعثِ تکلیف ہو جاتا ہے۔ اور بقدرِ احتیاج روپیہ پیسہ ایک نعمت ہے۔ مال کی زیادتی انسان کو حرص و ہوا میں مبتلا کر کے انسانیت کو تباہ کر دیتی ہے، اور اگر قطعی افلاس ہو تو بھی وہ دوسروں سے حسد

اور حرص و طمع میں مشغول ہوجاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی گزرے اور ہیں کہ کثرتِ مال سے وہ فائدہ ہی اُٹھاتے ہیں۔ نقصان کا انہیں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ مال کی غایت کو سمجھ کر لوگوں کو تقسیم کرتا ہے لٰہذا معلوم ہوا کہ ایک ہی چیز دنیا میں بعض لوگوں کے لیے باعثِ آخرت ہوتی ہے اور بعض کے لیے باعثِ کفر۔

خیر و شر

جن نعمات کو لوگ باعثِ خیر سمجھتے ہیں، وہ یا تو زمانہ حال (موجودہ) ہی میں مفید ہوگا۔ یا آئندہ مفید ہونے کی اُمیدیں وابستہ ہوں گی اور یا وہ چیز بذاتہٖ مفید ہوگی۔

اسی طرح شر والی چیزیں بھی تین زمانوں سے خالی نہ ہوں گی۔ اسی طرح کہ یا تو وہ بذاتِ خود بری ہوگی، یا موجودہ زمانے میں بری ہوگی، یا آئندہ کے لیے نقصان دہ ہوجانے کا اندیشہ ہوگا۔

لٰہذا پہلی اچھی چیزیں آدمی کے لیے اچھی ہیں اور دوسری بُری چیزیں باعثِ تکلیف۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شر بہ نسبت خیر کے بری چیز ہے۔ لٰہذا ہم کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ بہتر ین چیز انسان کے لیے کیا ہوسکتی ہے اور وہ بہت سطحی چیز ہے کہ علم سے بڑھ کر آدمی کے حال اور مستقبل میں جتنا وہ معاون ہوسکتا ہے۔ وہ دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ مثلاً علم کے ذریعہ جہل کو دُور کر سکتا ہے اور جہل اگر دُور ہوجائے، تو شر کی حقیقت کو سمجھ لے گا۔ اور اس کے بعد اس سے پرہیز کر سکتا ہے۔

جہل آدمی کے اندر چھُپی ہوئی ہالک بیماری ہے۔ اور "شر" ایک کھلی ہوئی چیز ہے۔ لٰہذا جہل کو دُور کرنے سے شر بھی دفع ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ زیادہ بیماری کو دُور کرنے کے تصور سے چھوٹی بیماریاں مُول لی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ایک ہاتھ کے کٹنے کا اندیشہ ہو، تو ایک اُنگلی بخوشی آدمی کٹوا دیتا ہے۔

اسی طرح بعض چیزوں میں خیر و شر برابر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کشتی پر سامان لیے دریا عبور کرے اور کشتی جب ڈگمگانے لگے تو اپنا مال دریا بُرد کر کے اپنی جان بچالے، یہ بات اچھی ہے۔

(مذاکرات) دنیا والوں کے خیال میں اچھی اور خوش آیند چیزیں ہی "نعمت" کہلاتی ہیں۔ دنیا کی لذات تین قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ پہلی وہ لذّات کہ جو بہت کمتر درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً زبان کا چٹخارہ اور عورت کی ضرورت۔ زیادہ تر لوگ اپنی زندگی کو صرف انھیں دونوں چیزوں کا ماحصل بنائے ہوئے ہیں۔

لیکن اگر وہ یہ سوچ لیں کہ دنیا کے تمام جانور بھی اس جذبے میں ان کے ہم پلہ ہیں، بلکہ بڑھے ہوئے ہیں اور صرف اسی چیز کو لائحہ زندگی بنا لینا کتے اور سور، نیز دیگر حشرات الارض کے ہم پلہ ہونے کا ثبوت ہے۔

دوسری لذات یہ ہیں، کہ انسان مغلوب الغضب ہوجائے۔ جس میں ریاست، حکومت کی بُو پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا درجہ پہلی کیفیت سے ذرا کچھ بلند سا ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں درندگی آتی جاتی ہے جیسے شیر، بھیڑیا اور خونخوار دوسرے درندے۔

تیسرا شوق آدمی کو علم و حکمت اور معارف و حقائق کا ہوتا ہے اور وہ گوناگوں صنائع و بدائع کے علم پر انحصار کرتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کے لیے انتہائی اعلیٰ و ارفع ہے۔ کیونکہ یہ صفت آدمی کو ملائکہ سے ملاتی ہے اور خداوند عالم کی صفات میں سے ہے۔ پس یہ ہمارا معیار ہے۔ کہ ان صفات کا حامل، تو کمال انسانیت پہ فائز ہے۔ اور اس کا مخالف انسانیت سوز جذبات کا مجموعہ۔

اکثر مسلمانوں میں دونوں درجات پائے جاتے ہیں۔ شہوت اور عبادت۔ بعض میں شہوت کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے اور بعض میں روحانیت کا درجہ۔ اگر روحانیت کے جذبات اُبھر آتے ہیں تو شہوات و خواہشات دب جاتی ہیں، لیکن جذبۂ روحانیت انتہائی ریاضت کے بعد اُبھرتا ہے۔ اگر آدمی ریاضت نہیں کرتا، تو وہ خواہشات کے جذبات میں ہی دبا رہتا ہے۔

اقسامِ نعمت

نعمت بذاتِ خود اپنا درجہ رکھتی ہے، وہ کسی دوسرے کی محتاج نہیں اور آخرت کے لیے یہ خود معاون ہوتی ہے۔

ہمارے لیے چار چیزیں نعمتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

اوّل غیر فانی — بقا۔

دوسرے وہ مسرّتیں جس میں رنج و غم کو دخل ہی نہ ہو۔

تیسرے وہ مکاشفات اور علوم روحانی، جو جہالت اور دنیاداری سے دُور لے جائے۔

چوتھے وہ بے نیازی جس میں احتیاجات کا جذبہ ہی پیدا نہ ہو سکے۔

ان چاروں کی حقیقت اس طرح سمجھنا چاہیے کہ انسان عشقِ حقیقی میں اتنا مستغرق ہو گیا ہو، کہ اس کو تنزّل کی طرف آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکے۔ اسی کو نعمتِ حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ نعمت ہی آخرت میں وسیلہ بنتی ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اَلْعَیْشُ عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ (یعنی حقیقی عیش آخرت ہی کا عیش کہلاتا ہے) ایک مرتبہ جب حج سے واپس تشریف لا رہے تھے اور تمام اُمّت کے لوگ چاروں طرف سے مسائل کے دریافت کرنے میں مشغول تھے۔ اس وقت یہی جملہ ارشاد ہوا۔ ایک شخص نے عرض کی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ تَمَامَ النِّعْمَۃِ (یعنی اے خدا میں کل نعمت کا خواہاں ہوں) تب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اے شخص کل نعمت وہ ہے کہ تو جنّت میں داخل ہو۔ یہ دنیوی نعمات کلِ نعمت نہیں ہو سکتیں۔

آخرت کا سبب سولہ چیزیں ہو سکتی ہیں — ان میں سے
چار دل سے متعلق ہیں۔ چار بدن کے اندر۔ چار بدن سے باہر۔ اور ان سب بارہ کو مجتمع کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

دل سے متعلقہ چیزیں حسب ذیل ہیں۔ مکاشفہ[1]۔ معاملہ[2]۔ غفلت[3] اور عدل[4]۔

مکاشفے کے ذریعے انسان خداوندِ عالم اس کی صفات اس کے دویعت کردہ انبیاء و مرسل اور فرشتگان و مقربین کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

معاملات کے جاننے کے لیے دین اور آخرت کی راہیں، اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے۔ اس کے راستے کی منازل وغیرہ کو سمجھ لینا ان سب کے متعلق ہم سب کچھ مختلف ابواب میں لکھ چکے ہیں۔

عفت۔ خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی کو پیدا کرے۔ غصہ اور خواہش کو چھوڑ دے۔

عدل۔ خواہشات دنیا اور قوتِ غضب کو قطعی طور پر نابید کر دے۔ اور نہ قطعی طور پر ان کا مطیع ہو جائے۔ ان دونوں باتوں میں نقصان ہے —— خداوندِ عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ - ان چیزوں میں عدل سے کام لے۔ یہ نعمتیں بدن کی نعمتوں کے ذریعہ ہی نشو و نما پاتی ہیں۔

بدن کے اندر کی چار نعمتیں یہ ہیں۔ تندرستی[1]۔ عافیت[2] خوبصورتی[3] اور درازیٔ عمر[4]۔

ان نعمتوں میں تندرستی، درازیٔ عمر اور طاقت، تینوں نعمتیں راہِ آخرت میں اطاعت و فرمانبرداری کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ذریعہ آدمی خداوندِ عالم کی عبادت بہت اچھی طرح کر سکتا ہے۔

لیکن حسن و جمال کی اس میں چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن حسن و جمال دنیاداری کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اور جو چیز دنیا کے لیے مفید ہو، اس سے لطافت بڑھتی ہے اور جب طاقت میں اضافہ ہوگا، تو محالہ آدمی اطاعت خداوندی میں زیادہ توجہ دے گا۔ دیگر آنکہ، ظاہری حسن و جمال آدمی کی باطنی خوبصورتیوں کو اُجاگر کر دیتا ہے۔ یہ حسن من جانبِ اللہ ہوتا ہے، اور بچے کی پیدائش کے وقت ہی سے جگمگانے لگتا ہے۔

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ ہر آدمی اپنی بدعادتی کی وجہ سے بدصورت ہی ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ اپنی حاجات خوبصورت آدمیوں سے طلب کرو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "قاصد" اگر کہیں بھیجنا ہو تو خوبصورت ہونا چاہیے۔

فقہاء کا حکم یہ ہے کہ اگر حاضرین امام میں سب ایک ہی جیسے علم اور قرأت جاننے والے موجود ہوں تو خوبصورت آدمی کو اپنا امام بناؤ۔ اس خوبصورتی سے شہوت کو اُبھارنے والی خوبصورتی ... [illegible]

مردانگی اور وجاہت ہونا چاہیے۔

جسم کے باہر کی چیزوں کی ضرورت جو بدن کو پڑتی ہے وہ ہیں، مال۔ عزت ۔ اہل وعیال۔ شرافت نسب آخرت کے لیے مال کی اس لیے ضرورت ہے کہ تنگدست آدمی دن بھر کمانے اور محنت کرنے کی فکر میں تگ و دو کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے علم و عبادت کی طرف توجہ کم ہوگی۔ لہٰذا بقدرِ ضرورت مال ایک نعمت ہے۔ جاہ و مرتبے والا آدمی لوگوں کی نظروں میں عزت پاتا ہے، ورنہ دنیا والے ذلیل سمجھتے ہیں۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نِعْمَ الْعَوْنُ عَلٰی تَقْوَی اللّٰہِ الْمَالُ (یعنی مال اگر باعثِ پرہیزگاری ہے تو کتنی اچھی نعمت ہے)

اہل وعیال بھی نعمت ہیں۔ بیوی۔ خواہشاتِ نفسانی اور گناہوں سے بچانے کا سبب ہوتی ہے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی نعمتیں تین ہیں۔ زبان اطاعت میں کھلنے والی۔ دل شاکر اور عورت مومنہ۔

اسی طرح اولاد ماں باپ کے مرنے کے بعد دعائے خیر کے سبب بنتی ہے۔ اگر خداوند عالم نے نیک اولاد عطا فرمادی ہے، تو وہ سینکڑوں کاموں میں مدد ہوتی ہے۔

شرافت نسب، ایک بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کہ امامت خاندانِ قریش کے لیے مخصوص تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تَخَیَّرُوْا لِنُطْفِکُمْ اَلْاَکْفَاءَ وَاِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ (یعنی اپنا نطفہ اچھے نسب والی عورت کو دو، اور خوب صورت بد اصل عورتوں سے پرہیز کرو) عموماً انسان میں اپنے آباؤ اجداد کی عادات و خصائل آتی ہیں۔ جیسا بیج ہوگا ویسا ہی پھل پیدا ہوگا —— خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے —— وَکَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا (تھے اُن کے ماں باپ نیک)۔

وہ باہری چار نعمتیں جو ان بارہ نعمتوں کا سبب ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

ہدایت۔ رشد۔ تائید۔ تسدید۔ ان سب کا ایک ہی نام توفیق ایزدی ہے۔

دنیا کی کوئی نعمت انسان کو نہیں ملتی، جب تک کہ توفیقِ خداوندی شاملِ حال نہیں ہو جاتی۔

انسان کے ارادے اور حکم الٰہی میں جب مطابقت پیدا ہوتی ہے، اس کو توفیق کہتے ہیں۔ توفیق کے ذریعہ نیکی و بدی دونوں کام سرانجام پاتے ہیں۔

توفیق کی تکمیل چار چیزوں سے ہوتی ہے۔

پہلے ھدایت، اگر آدمی دین الٰہیہ کا متمنّی ہے، تو اس کو لائحہ عمل بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا اس لائحہ عمل کو مرتب کرنے کے لیے کسی نہ کسی رہبر اور ہادی کی ضرورت پڑے گی۔ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (یعنی ہمارا خدا ایسا ہے کہ اس نے صورتِ جسمیہ عطا فرمائی اور اس کو ہدایت بھی دی) اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی - یعنی خدا نے ہی ہر چیز کو اندازہ کر کے ہدایت عطا فرمائی۔

اس ہدایت کے تین درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی نیکی اور بدی کی تمیز کر لے اور یہ تمیز خداوند عالم نے ہر ذی عقل کو ودیعت فرمائی ہے وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ سے یہی مراد ہے۔ کہ ہم نے عقل کے ذریعہ ہی آدمی کو راہِ ہدایت عطا فرماتی ہے) ایک جگہ اور ارشاد ہو رہا ہے کہ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَھَدَیْنٰھُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْھُدٰی (یعنی ثمود کو ہم نے ہدایت دی، لیکن وہ گمراہ ہو گئے) اس ہدایت سے انبیاء علیہم السلام کی وساطت کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگ حسد اور تکبر یا دنیاداری کی وجہ سے گمراہ ہیں، کہ وہ علماء اور انبیا کی بات سننے کو تیار ہی نہیں، ورنہ ہدایت ہر آدمی کو ہوتی ہے۔

دوسرا درجہ ہدایت خاص ہے، جو دین اور مجاہدہ نفس دونوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ انسانی عقل جواہرات قدرت سے روشناس ہوتی جاتی ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (یعنی وہ لوگ جنھوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا۔ یقیناً ہم اُن کو ہدایت کرتے ہیں) مقصد یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت چاہتے ہیں، اُن کو ہدایت ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔

تیسرا درجہ مخصوص ترین رتبہ ہے۔ یہ درجہ "نبوت اور ولایت" میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ہدایت صرف اس کی ذات کی طرف عود کرتی ہے۔ اس کی خوشنودی اور اطاعات کی طرف نہیں۔

ایک جگہ ارشاد ربّ العزّت ہو رہا ہے کہ اے نبی! کہدو کہ یہ ہدایت ہی ہدایت ہے اس سے بھی ہدایت مطلق ہی مراد ہے۔ اور اس کو حیاتِ جاوید مراد لیا ہے وہ فرما رہا ہے کہ اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ (یعنی جو مُردہ تھا، اس کو زندہ کیا) مقصد یہ ہے کہ جو لوگ گمراہ تھے اُن کو ہدایت کے راستے پر لگا دیا اور ایک نور پیدا کر دیا، تاکہ وہ بندگانِ خدا کے قلوب کو منور کر سکے۔

اس میں سے بڑا رتبہ یہ ہے کہ آدمی کو ہدایت سے جو راستہ ملے۔ اس پر وہ چلنے کا خواہش مند بھی ہو۔ اس کے متعلق بھی ایک جگہ ارشاد ہو رہا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰھِیْمَ رُشْدَہٗ (یعنی ہم نے ابراہیم کو پہلے سے ہی رشد عطا کر دیا) جوانی میں تجربہ کاری کے بعد اگر آدمی ہدایت پائے اس کو رشد سے تعبیر نہیں کرتے، بلکہ رشید وہ ہے، جو ہدایت یافتہ ہو۔

تسدید وہ قوت ہے، جو آدمی کے اعضا کو نیکی کی ہدایت دے، تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ ہدایت پانے کے بعد آدمی کو معرفت ہوتی ہے اور رشد کے بعد خواہشات اور قوتِ ارادی میں استحکام پیدا

ہوتا ہے۔ اور تسدید کے بعد انسانی اعضا میں صحیح حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تائید، مدد غیبی کا دوسرا نام ہے، جو باطنی طور پر عقل میں سرایت کرتی ہے۔ اور ظاہری طور پر اعضا کی حرکات درست کرتی ہے۔ ارشاد ربّ العزت ہو رہا ہے کہ وَاَیَّدْنَاہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (یعنی ہم نے اس کو روح القدس کے ذریعہ امداد پہنچائی) عصمت اس سے نزدیک ترین درجہ ہے۔

عصمت وہ جذبہ ہے، جو اس کے باطن میں گناہوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اور انسان اس جذبے کو بخوبی سمجھ بھی لے، کہ یہ کہاں سے آیا ہے، خداوند عالم اس کے متعلق بھی فرما رہا ہے کہ وَلَقَدْ ھَمَّتْ بِہٖ وَھَمَّ بِھَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّہٖ۔

یہ دنیاوی نعمتیں آخرت کا سامان ہیں —— لہٰذا آدمی یہ سوچے کہ دنیا کی ان نعمتوں کا سبب اور اس کے سبب کا سبب۔ اسی طرح اور آگے کے تمام اسباب کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ سوچو گے! تو ایک منتہی درجہ ضرور ملے گا، جو تمھارا مرکز قرار پائے گا۔ یہی وہ رہبر ہے اور وہ ہی مسبب الاسباب ہے۔

تمام اسباب دنیوی کی تفصیل بہت طوالی ہے۔ لہٰذا یہاں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے۔

شکر اور عادات کا باہمی تعلق

ادائیگی شکر میں نقائص کیوں پیدا ہوتی ہیں

شکر کی ادائیگی میں انسان سے دو وجوہ سے کمی واقع ہوتی ہے۔

اوّل یہ کہ انسان خداوند عالم کی گوناگوں نعمتوں سے لاعلم ہوتا ہے۔ اس کے لیے ان تمام نعمتوں کا احصا ناممکن ہوتا ہے۔ خداوند عالم خود فرما رہا ہے کہ تم ہماری نعمتوں کا احصا نہیں کر سکتے۔

ہم نے طعام سے متعلق چند نعمتوں کی تفصیل "احیاء العلوم" میں کی ہے۔ لہٰذا یہاں طول کے سبب ان کو بیان نہیں کرتے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی عام نعم کو نعمت ہی نہیں سمجھتا۔ مثلاً ہوا، جو ہماری زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اور ہماری روح کی بقا کے لیے لازم ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں چیزوں کو ہم خیال میں نہیں لاتے۔ کہ ہمارے لیے کتنی بے بہا نعمتیں ہیں —— مثلاً آنکھ جب تک ٹھیک ہے، تو اس کا احساس شکر نہیں ہوتا۔ اور اگر آدمی اندھا ہو جائے، تب آنکھوں کی قدر ہوتی ہے۔ لہٰذا آدمی کو ہر وقت نعمتوں کو یاد کرنا چاہیے۔

یہ طریقہ اہل طریقت کے لیے مخصوص ہے۔ عوام الناس کو اس طرح سمجھنا چاہیے، کہ وہ ظاہری جیل خانوں اور قبرستانوں میں جا کر خاموشی کا منظر دیکھیں کہ وہ شہر خموشاں کتنی عبرتوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد اس کو اپنے وجود کا احساس ہوگا اور وہ شکر خدا میں مشغول ہو سکتا ہے۔ اور سوچ سکتا ہے کہ مجھے بھی یہاں آنا ہے۔ لہٰذا دنیا کے گناہوں سے توبہ کر لوں۔

اِنسان کی ذات بھی عجیب ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو قطعی نعمت میں شمار نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنے کو سب سے عقلمند، اہلِ خرد اور خوش اخلاق سمجھتا ہے۔ اگر وہ ذرا سا اس بات پر غور کرلے، کہ میں دوسروں کی نسبت زیادہ عقلمند ہوں، اور میری عادات سب سے اچھی ہیں۔ تو بھی وہ اس نعمت کا شکر ادا کرے گا۔ اِنسان اپنے عیوب کو خود ہی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ دوسرا اس کو نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ ہر آدمی کو جو تصورات اور تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اگر کسی کو معلوم ہو جائیں، تو بھی اس کو بڑی شرمندگی ہوگی۔ لہٰذا اگر آدمی صرف اپنے عیوب کو چھپے رہنے پر ہی، شکر اَدا کرتا رہے، تو کیا کم ہے۔

آدمی اُن چھوٹی چھوٹی نعمتوں کو سمجھے کہ بغیر کسی حق کے بھی خداوند عالم نے اس کو ودیعت فرمادی ہیں۔ لیکن وہ نہیں سوچتا کہ یہ سب باعثِ شکر ہیں۔

ایک شخص نے کسی بزرگ سے زمانے کی شکایت کی، کہ میں بہت تنگدستی کے عالم میں بسر کر رہا ہوں۔ بزرگ نے دریافت کیا کہ اگر تجھ کو تیری ایک آنکھ، ایک کان کے عوض دس ہزار روپیہ دے دیا جائے، تو تو قبول کرلے گا؟ اس نے کہا ہرگز نہیں۔ تو فرمانے لگے کہ تیرے تمام اعضا سمجھ لے کہ دس دس ہزار روپیہ کے ہیں۔ اور سب کو اس روپیہ کے عوض فروخت کرنے کو تیار نہیں۔ لہٰذا تو انھیں اعضا کے وجود اور تندرستی پر خداوند عالم کا شکر گذار رہ! کہ تجھ کو سب کچھ عنایت فرمایا اور بہت سے بندگانِ خدا ایسے ہیں کہ ان نعمات سے محروم ہیں۔

ہر حال میں شُکر اَدا کرنا چاہیے

آدمی کو ہر مُصیبت اور تکلیف میں شکر ادا کرنا چاہیے! دُنیا میں سوائے کفر اور گناہ کے جو مصیبت بھی آدمی پر پڑتی ہے، اس خداوند عالم کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے، لیکن اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس کو نہیں سمجھتا۔ لہٰذا ہر مصیبت میں شکر ادا کرنا ضروری ہے۔

شُکر کے مختلف طریقے | شکر پانچ صورتوں سے اَدا کیا جا سکتا ہے۔ جو ہر مصیبت و بلا کے لیے ضروری ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ اگر دنیا کے کام میں کوئی خلل ہو، تو آدمی شکر ادا کرے کہ راہِ آخرت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مصیبت ایسی نہیں، کہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسری مصیبت نہ ہو۔ لہٰذا آدمی یہ سوچ کر شکر ادا کرے کہ خداوند عالم نے اس سے بڑی مصیبت و بلا میں گرفتار نہ کیا۔ نیز یہ سوچنا چاہیے کہ یہ مصیبت دنیا ختم ہو جائے گی، آخرت میں کوئی مصیبت ڈالی جاتی تو کیا ہوتا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا میں سختیاں برداشت کرنے والے آدمی کو آخرت میں

آسانیاں ہوتی ہیں۔ تکالیف دنیا انسان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ لہٰذا مصیبت جھیلنے کے بعد وہاں کی مصیبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چوتھا طریقہ شکر یہ ہو سکتا ہے کہ جو مصائب اور تکالیف انسان کی قسمت میں لکھی گئی تھیں، لہٰذا اُن کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے خُداوندِ عالم کا شکر بجالائے۔ حضرت شیخ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار گدھے پر سے گر کر "الحمد للہ" زبان پر جاری کیا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ گر کر شکر یہ ادا کیوں کرتے ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ امر قضا الٰہی میں تھا۔ اور اس سے گریز کرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا کیوں نہ مشیتِ ایزدی پر شکر بجالاؤں۔

پانچویں وجہ شکر یہ ہے کہ آدمی کو دو وجوہ سے دُنیاوی مصائب کے بدلے آخرت میں ثواب ملتا ہے۔ پہلے یہ کہ ثواب کی عظمت زیادہ ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے، کہ دُنیادار آدمی کو آخرت ایک قید معلوم ہوتی ہے اور اگر اس پر دُنیا میں مصائب پڑتے ہیں تو وہ دُنیا کو قید سمجھنے لگتا ہے لہٰذا وہ آخرت کو قید نہیں سمجھتا۔ اس طرح اس کی وہ تکلیف نجات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوندِ عالم اپنے دوستوں کی ضیافت بلا و مصائب سے کرتا ہے جس طرح تم کھانے اور شراب سے مہمان نوازی کرتے ہو۔ ایک بار یہ بھی ارشاد ہوا کہ خدا کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا مال چوری جائے اور وہ بیماری کے مصائب کو برداشت کرے۔ جنّت میں بہت سے مراتب ایسے ہیں کہ جن میں انسان کی ذاتی کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن خداوندِ عالم اپنے مصائب ڈال کر وہ مراتب عنایت فرمادیتا ہے۔ ایک بار آنحضرتؐ آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور مُسکرا کر فرما رہے تھے۔ کہ میں مومن کے متعلق سوچتا ہوں کہ وہ صرف حکم خدا پر شکر ادا کرتا ہے۔ اگر خوشی عنایت فرمادے تو شکر، اور اگر مصائب میں مبتلا کر دے تو بھی شکر ادا کرتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب اہلِ عافیت مصیبت زدہ لوگوں کو جنّت میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ہم پر مصائب کیوں نہ پڑے۔ ایک پیغمبر نے بارگاہ ایزدی میں عرض کی کہ بار الہا! کیا وجہ ہے؟ کہ تو مومنوں پر سختیاں اور اغیار کو آسانیاں عنایت فرماتا ہے۔ ندا آئی، کہ میں اپنے بندگان خاص کو اپنے پاس تمام گناہوں سے پاک صاف کر کے بلاتا ہوں۔ اور کفّار کو گناہوں میں ملوث ہونے سے اس کی نیکیاں اسی دُنیا میں چکا دیتا ہوں، اور آخرت میں اس کا کوئی حصّہ باقی نہیں ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم لوگ کس طرح بخشے جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی بیماریاں اور مصائب تمھارے گناہوں کا کفّارہ ہیں۔

حضرت خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز نے بیٹے کی سکرات کے عالم میں فرمایا کہ بیٹا! میں اس بات کو زیادہ اچھا سمجھتا

ہوں کہ میں تیرے گناہوں کو ادا کر دوں، بہ نسبت اس کے کہ تو اوّل جا کر میرے لیے کفارہ بنے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب اُن کی لڑکی کی وفات کی اطلاع ملی، تو آپ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر فرمایا کہ عزّت بچ گئی، اور خرچ دنیا کم ہوگیا۔ ثواب ہاتھ کے ہاتھ مل گیا۔ اس کے بعد دو رکعت نماز شکر ادا کی اور فرمانے لگے کہ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ (خداوند عالم سے صبر اور نماز کے ذریعہ مدد کے طلب گار رہو!) لہٰذا میں نے یہ دونوں فریضے ادا کر دیئے۔

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ خداوند عالم چار قسم کے آدمیوں کی وجہ سے چار گروہوں کے آدمیوں کو معاف کرے گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وجہ سے مالداروں کی۔ غلاموں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے درویشوں کو اور حضرت ایوبؑ علیہ السلام کے سبب اُن لوگوں کو جنھوں نے مصائب میں صبر کیا۔

یہاں شکر کے متعلق اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا اصُول

خوف و رجا

منزلت خوف و رجا سالکان راہِ حقیقت کے لیے "خوف و رجا" نہایت ضروری چیزیں ہیں۔ اس لیے کہ معرفت حقیقی کی منازل کی پیچیدگیوں کو طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خداوند عالم کا خوف دل میں ہو، اور خوف و رجا کے بعد ہی آدمی گناہوں سے نجات پا کر حقیقی راستوں پر گامزن ہو سکتا ہے۔

خوف و رجا کی منزلت انتہائی عظیم ہے۔ رجا آدمی کی ترقی کا ذریعہ ہے، جو اس کو گناہوں سے بچاتا ہے، اور خوف اس کے ساتھ آگے بڑھانے میں تازیانے کا کام دیتا ہے۔

پہلے "رجا" کے متعلق تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد خوف کے متعلق بتایا جائے گا۔

فضائل "رجا"

کوئی کام بھی خوف اور ڈر کی وجہ سے کیا جائے۔ وہ اتنا اچھا نہیں ہوتا، جو امیدوں اور محبت کے سہارے پر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح خداوند عالم کی عبادت اگر خوف اور ڈر کی وجہ سے ہوتی ہے، تو اتنی اہم نہیں ہوتی، جتنا کہ اس سے محبت اور امید مغفرت میں کی جائے۔ خوف اور ڈر سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور محبت میں خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وَلَا یَمُوتَنَّ اَحَدُکُمْ اِلَّا ھُوَ یُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰہِ (یعنی تم میں سے ہر آدمی کو خداوند عالم کے ساتھ نیک خیال رکھنا چاہیے) خداوند عالم کی معرفت انسانوں کے عقول اور اُن کی سمجھ کے مطابق ہوتی ہے۔ اب جو چاہو اور جہاں چاہو، اس کو قیاس کرلو۔

ایک شخص سے عالم سکرات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تیری کیا حالت ہے؟ اس نے عرض کی، کہ گناہوں کی وجہ سے خوفزدہ ہوں، اور اس کی رحمتوں کا طالب۔ تو فرمایا کہ یہ جذبات اس شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ جس کو خداوندِ عالم بے خوف ہونے کا جذبہ عطا کرتا ہے اور جس کی امیدیں وہ کررہا ہو وہ اس کو عطا ہوتی ہیں۔ حضرت یعقوب پر وحی نازل ہوئی کہ میں نے یوسف (علیہ السلام) کو تم سے اس لیے الگ کیا کہ تم نے دوسرے بیٹوں سے کہا تھا (کہ میں ڈرتا ہوں، کہ تم اس کو تنہا چھوڑ دو اور کوئی بھیڑیا یوسف کو کھاجائے) اے یعقوب! تم بھیڑیے سے ڈرے اور میری طرف سے امید نہ رکھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک شخص سے فرمایا کہ اپنے گناہوں کی کثرت سے خوف زدہ نہ ہو۔ اس لیے کہ اس کی رحمت کہیں زیادہ ہے۔

عمل آنحضرتؐ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کو وہ سب معلوم ہوجائے، جو میں جانتا ہوں، تو تم ہنسنا چھوڑ دو۔ اور جنگل میں رہنا پسند کروگے۔ حضرت جبرئیل نے آکر عرض کی کہ خداوند عالم فرمارہا ہے کہ میرے بندوں کو مایوس نہ کرو۔ اس کے بعد حضورؐ نے سب کو رحمت خدا کی امیدوں سے وابستہ رہنے کی تلقین فرمائی۔

کسی نے حضرت یحییٰ بن اکثم کو خواب میں دیکھا، اور دریافت کیا کہ آپ پر کیا گزری؟ فرمایا کہ میں خدا کے حضور میں جب پہنچا، تو مجھ سے دریافت کیا گیا، کہ اے یحییٰ تو نے یہ یہ کیا؟ مجھ پر انتہائی خوف طاری ہوا۔ اور عرض کی کہ بارِ الٰہا! مجھے یہ خبر دی گئی تھی کہ تیری رحمتیں میرے گناہوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ ندا آئی کس نے خبر دی تھی۔ میں نے جواب میں عرض کیا، کہ میں نے عبدالرزاق سے سُنا اور انھوں نے معمر سے اور معمر نے زہری سے، زہری نے انس سے اور انس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آنحضرتؐ نے جبرئیل سے اور جبرئیل نے تیری درگاہ سے۔ اور وہ آواز یہ تھی کہ بندوں کی اُمیدوں کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ پس ندا آئی کہ ہاں تو نے سب سے ٹھیک سُنا۔ اس کے بعد مجھ کو خلعت عنایت ہوئی اور جنت میں اعلیٰ جگہ دی گئی۔

حدیث شریف میں ہے کہ بنی اسرائیل میں کا ایک شخص لوگوں کو رحمتِ خداوندی سے مایوس کیا کرتا تھا۔ لہٰذا خداوند عالم روزِ قیامت اس کو اپنی رحمتوں سے نااُمید کردے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک ہزار برس تک جس آدمی کو دوزخ میں رکھا جائے گا، اور وہ درگاہ قاضی الحاجات

میں عرض کرے گا کہ یا حنان یا منان - اس فریاد سے خداوند عالم اس کو وہاں سے بلوائے گا، اور جب وہ بارگاہ ایزدی جائے گا، تو اس سے دوزخ کے متعلق دریافت کیا جائے گا - کہ کیسا پایا؟ وہ عرض کرے گا کہ بدترین جگہ ہے - اس کے بعد اس کو پھر دوزخ میں لے جانے کا حکم ہو گا - وہ عرض کرے گا کہ میں تیری رحمتوں کی وسعت سے سمجھتا تھا کہ ایک بار دوزخ سے نکال کر پھر نہ جاؤں گا - خداوند عالم اس کو معاف کر دے گا، اور وہ جنت میں چلا جائے گا - یہ جنت اس شخص کو صرف امید کے سہارے نصیب ہو گی -

رجا کی حقیقت

اچھی اُمیدیں رکھنا "رجا" کہلاتا ہے - بعض لوگ اس امید کو تمنا اور بعض بے وقوفی اور حماقت سے تعبیر کرتے ہیں، اُن کو سمجھنا چاہیے کہ یہ اُمید تو ضرور ہے، لیکن اچھی اور نیک اُمید ہے جس طرح ایک کسان اچھا بیج زمین میں بوتا ہے اور اس سے اچھا ہی پودے یا اناج کا طالب اور امیدوار ہوتا ہے - اس امید کو "رجا" کہتے ہیں، لیکن خراب بیج کو خراب زمین میں بداحتیاطی سے بو کر اچھی امیدیں لگانا آرزو اور تمنا کہلاتا ہے -

اب اس مثال کو انسان کی عبادات پر منطبق کیا جا سکتا ہے - کہ آدمی اگر اچھے اعمال کرتا ہے، اور خداوند عالم سے اس کے بدلے میں اچھائی کی اُمیدیں وابستہ رکھتا ہے - تو یہ امید و رجا ہے - اور اگر وہ گناہ کرتا ہے، اور اس کے بعد بھی وہ بخشش کی اُمیدوں پر سہارا لگائے تو اس کو حماقت اور بیوقوفی کہتے ہیں - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ آدمی انتہائی احمق ہے کہ اپنے نفس کی پیروی کرتا رہے اور خداوند عالم سے رحمتوں کا طالب ہو -

اُمید، آرزو، حماقت، غرور اور رجا میں فرق

بارگاہِ ایزدی سے ارشاد ہو رہا ہے کہ (جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ہدایت پاتے رہے - لیکن اُن کے بعد وہ لوگ دُنیاداری میں مشغول ہو گئے، لیکن وہ ہماری رحمتوں کے طالب ہیں، وہ اچھا نہیں کرتے) -

انسان خود اپنے اسباب پیدا کرتا ہے - اگر اچھے اسباب بنا کر امید مغفرت رکھنا ہی "رجا" کہلاتا ہے اور اگر اسباب خراب ہوں، تو یہ ہی حماقت پر مبنی ہو گی - اور آخری درجہ اس کا غرور کہلاتا ہے - اگر آدمی دُنیا میں بین بین چلتا رہا ہے اور پھر اُمیدیں اچھی لگائے ہے، تو اس اُمید کو "آرزو" کہا جائے گا -

آرزو کے متعلق آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ دین کا کام آرزو سے نہیں چلتا - آدمی اگر گناہوں کے بعد صرف رنجیدہ ہو کر امید میں رہے گا اور توبہ نہ کرے گا، تو یہ آرزو بیکار ہے، لیکن اگر اس کی رنجیدگی اس لیے ہے کہ اس نے بُرا کیا ہے اور وہ اس پر شرمندہ ہے اور خداوند عالم کے توبہ کا خواستگار ہے - یہ جذبہ "رجا" میں داخل ہے، لیکن اگر بغیر توبہ کیے گناہوں کی بخشش کو سوچتا ہے، تو بیوقوفی کی علامت ہے اور غرور میں شامل

ہے۔ خداوند عالم اسی کے متعلق ارشاد فرما رہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (جن لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر راہِ خدا میں جہاد کیا، اُن کو ہماری طرف سے اُمید مغفرت ورحمت رکھنا جائز ہے)

حضرت معاذ رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ کہ اس سے زیادہ حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی دوزخ کا بیج بو کر جنت کا سہارا کرے۔ گناہ کرتا رہے، اور نیک بدلوں کی اُمیدیں رکھے۔

ایک شخص زاہد بخیل کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ خداوند عالم ایک شخص کے ساتھ بھلائی اور نیکی کا خواہاں ہے اور ایک کے ساتھ نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب میں فرمایا کہ تو خود اپنا عمل دیکھ کر کیا کرتا ہے؟ عرض کی کہ میں جب صبح کو اُٹھتا ہوں تو نیک کاموں کی ادائیگی میں جلدی کرتا ہوں اور بُرے کاموں کو چھوڑتا ہوں، اگر نیک کام میں تاخیر ہوتی ہے، اس سے رنج ہوتا ہے۔ اچھے لوگوں سے محبت کرتا ہوں اور اسی کا اجر چاہتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ بس! اسی لیے وہ تیرے لیے نیکی کا خواہاں ہے۔ اگر تو بُرائی کی طرف مرغوب ہوتا، تو وہ بھی تجھ کو نیکیوں کی طرف متوجہ نہ کرتا۔ اور وہ تیری ہلاکت اور عذاب پانے سے لاپروا ہو جاتا۔

حصول رجا کی تدابیر

رجا کے اختیار کرنے کے طریقے دو قسم کے گنہگاروں کو "رجا" کی ضرورت ہے۔ ایک تو وہ آدمی، جو گناہوں کی کثرت کے خوف سے توبہ نہیں کرتا۔ اور سوچتا ہے کہ میرے یہ لاتعداد گناہ کیسے بخشے جا سکتے ہیں۔

دوسرا وہ گنہگار جو عبادت اور اطاعت سے محنتِ شاقہ کو برداشت کرتا ہے اور اسی میں ختم ہو جاتا ہے۔

ان دونوں گنہگاروں میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ غفلت شعار کے لیے "رجا" اور زیادہ بُرا ثابت ہوتا ہے ـــــ اُمید و رجا دو سببوں سے آدمی پر غالب آتی ہے کہ آدمی دنیا کی رنگا رنگ نعمتوں کو دیکھ کر عبرت پذیر ہو۔ جیسا کہ باب الشکر میں بیان کیا گیا ہے، تاکہ خداوند عالم کی نعمتوں کے مقابلے میں ساری دنیا ہیچ نظر آنے لگے۔ اور اپنی تخلیق پر غور کرے کہ اس کو خداوندِ عالم نے وہ سب کچھ بخوبی عنایت فرمایا، جس کی اس کو ضرورت تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ضروریات کو مہیا کرنے کی تمام تر محرکات دے دیں کہ وہ خود اپنے لیے دنیا میں ضروریاتِ زندگی پیدا کرے۔ ایسے آدمی کے لیے کسی خوف اور غلبے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور خوف و رجا دونوں متوازن ہو جاتے ہیں اور اگر ایسے حالات میں "رجا" کا پلہ بھاری ہو جائے تو بھی اچھا ہے۔ چونکہ اس کی رحمتیں اس پر زیادہ وسیع ہو جائیں گی۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ میں سب سے زیادہ اُمید دلانے والی آیت مداینات ہے۔ وہ فرما

رہا ہے کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے، کہ جس آدمی کو قرضہ دیا جائے اور وہ اس کو امانت کے طور پر رکھے ـــــ ہمارے نیک اعمال کے بدلے میں ہم کو کیسے عذاب ہوگا، اور ہم کو دوزخ میں جانے کا خطرہ کیوں لاحق ہو سکتا ہے؟ بس یہی "رجا" ہے۔ لیکن اس کو سمجھنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان "رجا" سے متعلق آیات و احادیث کا مطالعہ کرے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ کوئی آدمی میری طرف سے مایوس نہ ہو۔ دوسری جگہ پھر فرماتا ہے کہ فرشتے بھی بندوں کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ایک جگہ فرماتا ہے کہ دوزخ کفّار کے لیے ہے اور مسلمانوں کے لیے خوف زدہ ہونے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کی مغفرت کی دعاؤں سے کبھی اطمینان نہ پاتے تھے۔ یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی کہ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ۔ اس کے بعد پھر دوسری آیت آئی وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا۔ جب تک میری اُمت کا فرد فرد بہشت میں نہ چلا جائے گا۔ ایسی اور بھی متعدد آیات ہیں

احادیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت مرحومہ ہے۔ اس کے گناہوں کا کفارہ اسی دنیا میں ہو جائے گا۔ آخرت میں ہر کافر ایک ایک مسلمان کا فدیہ قرار پائے گا۔ دُنیا میں مسلمانوں کا بخار دوزخ کی طرح ہے اور یہ ہی دوزخ کا اس کو حصہ مل جاتا ہے۔ آپؐ نے دُعا فرمائی کہ میری اُمت کا حساب میرے ساتھ کیجیو! ندا آئی کہ اے رسول! یہ تمہاری امت میں ہیں اور میرے بندے ہیں۔ میں ان پر رحم کا خواہاں ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہاری امت سے زیادہ کوئی دوسری اُمت نہ ہو۔

فرمایا کہ میری زندگی تمہاری زندگی ہے اور تمہاری نیکیاں میری نیکیاں ہیں۔ میری موت بھی تمہارے لیے خیر کا باعث ہے۔ اگر زندہ ہوں تو تعلیم خدا دوں گا۔ اگر مر جاؤں گا، تو تمہارے اچھے اعمال پر شکر خُدا کروں گا۔ اور بُرے ہوں گے تو طالب بخشش ہوں گا۔

ایک دن آنحضرتؐ فرما رہے تھے یا کریم العفو، حضرت جبرئیل فوراً نازل ہوئے اور عرض کی کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا وند عالم بندے کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ جب آدمی توبہ کرتا ہے تو خداوند عالم اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ دیکھو میرا بندہ توبہ کرتا ہے اور مجھے اپنا مالک سمجھتا ہے، میں اس کو معاف کرتا ہوں

حدیث ہے کہ آدمی کے گناہ چھ گھنٹوں تک نہیں لکھے جاتے۔ اور اگر وہ اس درمیان میں توبہ کرے، تو وہ گناہ نہ لکھا جائے گا۔ ایک بار فرمایا کہ آدمی کے تمام گناہ لکھے جاتے ہیں۔ ایک شخص نے عرض کی کہ اگر وہ توبہ کرلے، تو فرمایا کہ پھر اس کو مٹا دیا جاتا ہے۔ اور جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو عمل سے پہلے اس کی نیکی لکھی جاتی ہے۔ اور جب نیکی کر لیتا ہے تو اس کے عوض میں دس نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو سات سو

گنا کر دیتے ہیں ۔ اور اگر گناہ کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے ۔

خداوند عالم کی رحمتیں اس کے گناہوں سے بہت بلند ہیں ۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ میں پنج وقتہ نماز ادا کرتا ہوں اور روزے بھی رکھتا ہوں ، اور کوئی عبادت نہیں کرتا ۔ روپیہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے حج مجھ پر عائد نہیں ہوتا ۔ لہٰذا میں روزِ حشر کہاں ہوں گا ؟ آپؐ نے فرمایا تو میرے ساتھ ہوگا ۔ لیکن حسد کو دل میں نہ آنے دینا ۔

ایک شخص نے عرض کی کہ قیامت میں حساب کتاب کون کرے گا ۔ فرمایا کہ خداوند عالم خود ہی حساب کرے گا ۔ وہ شخص خوش ہوا ۔ آپ نے فرمایا ۔ خوش کیوں ہوتا ہے ؟ عرض کی کہ کریم جب حساب کرتا ہے ، تو معافی کو مدِّنظر رکھتا ہے اور حساب کتاب میں آسانی ہوتی ہے ۔ آپ نے فرمایا ، سچ ہے ، اس سے زیادہ کوئی کریم نہیں ۔ اور تو فقیہہ ہے ۔ اس نے عرض کی ! کہ اس کے ولی کون ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا کہ سب مومنین اور تو نے نہیں سنا ؟ خود فرما رہا ہے کہ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے بندوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے پیدا کیا نہ کہ خود فائدہ حاصل کرنے کے لیے اور اس کی رحمت اس کے غصّے پر غالب ہے ۔

اور فرمایا کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ زبان سے کہا ، اس پر جنّت واجب ہے ، اور جو مرتے وقت یہ کلمہ پڑھے گا ، دوزخ کی آگ اس کے قریب نہیں آسکتی ۔ اور جو آدمی بلا شرک کیے مرے گا ، اس پر دوزخ کی آنچ حرام ہے ـــــ اور اگر تم گناہ نہ کرو ، تو خداوند عالم دوسری مخلوق کو پیدا کرے تاکہ گناہ کریں اور وہ بخش دے ۔

اپنے بندوں پر خداوند عالم ماں سے زیادہ مہربان ہے ۔ خداوند عالم روزِ حشر میں اتنی رحمتیں نازل کریگا ۔ کہ مخلوق کے قلوب روشن و منور ہو جائیں گے ، اور انتہائی سرور کا عالم طاری ہوگا ۔ اس وقت شیطان بھی "رحمت" کا طالب ہوگا ۔

حدیث ہے کہ خداوند عالم نے اپنی سو رحمتوں میں ایک رحمت دنیا پر مسلّط کی ۔ باقی ننانوے رحمتیں میدانِ قیامت کے لیے رکھ لی ہیں ، اور دنیا کے تمام رحم و کرم اور محبتیں ، حتّٰی کہ ماں کی شفقت بیٹے پر بھی اسی ایک رحمت کا اثر ہے ۔ اس دن اس کی رحمتوں سے کوئی شخص ہلاکت میں نہ پڑے گا ، سوائے اس آدمی کے جو ازل میں تباہ ہو گیا ہو ۔

آپؐ نے فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ میری دعائیں پرہیزگاروں کے لیے ہیں ، بلکہ میں گناہانِ کبیرہ کرنے والوں کی شفاعت کروں گا اور آتشِ دوزخ سے نجات دلاؤں گا ۔

حدیث ہے کہ قیامت کے دن خداوندِ عالم اپنے حقوق آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حق میں بخش دے گا اس کے بعد بندگانِ خدا کے آپس کے حقوق رہ جائیں گے، جو ایک دوسرے کو معاف کر دے گا۔ جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، کہ
روزِ قیامت خداوندِ عالم اس شخص کو بھی بخش دے گا۔ جس کے دل میں ایک دانے کے برابر نیکی ہوگی۔ اور اس کے بعد آدھے دانے کے برابر خیر رکھنے والوں کو بخشدیا جائے گا۔ اس کے بعد ذرہ برابر نیکی کرنے والوں کو معاف کیا جائے گا۔ اس کے بعد خداوندِ عالم کی رحمتِ کاملہ جوش میں آئے گی۔ اور جو قطعی نیک نہ ہوں گے اُن کو دوزخ سے نکال کر معاف کر دیا جائے گا۔ وہ لوگ بارگاہِ ایزدی میں عرض کریں گے کہ تو نے وہ رحمت ہم پر نازل کی ہے، جو کسی کو عطا نہیں کی۔ اس وقت ندا آئے گی کہ میرے خزانے میں وہ وہ رحمتیں ہیں، جس کا اندازہ نہ کر سکو گے۔ تب یہ لوگ عرض کریں گے کہ اب اس سے زیادہ کیا رحمت ہو سکتی ہے؟ جواب آئے گا کہ وہ رحمت خاص کہ میں اب تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم شریف میں حضرت عمر بن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تین دن متواتر اپنے حرم سے سوائے نماز کے کسی وقت باہر تشریف نہ لائے۔ چوتھے دن فرمایا کہ خداوندِ عالم نے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ ان تین دن میں میں نے اور دُعا کی، تو اس نے اپنے رحم سے ہر آدمی کے ساتھ ستر ستر ہزار آدمیوں کو اور معاف کر دیا۔ میں نے اس وقت بارگاہِ ربّ العزّت میں عرض کی کہ میری امت اتنی ہو سکے گی؟ تو ندا آئی! کہ اہلِ عرب کو ملا کر یہ تعداد پوری ہو سکے گی۔

روایت ہے کہ ایک جنگ میں ایک لڑکے کو قید کر لیا گیا۔ اس روز دھوپ سخت تھی۔ ایک عورت نے اُسے دیکھ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کو سایہ کر کے محفوظ کر لیا۔ اور کہنے لگی کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم وہاں تشریف لائے، تو لوگوں نے یہ واقعہ بتایا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ تعجب نہ کرو۔ جتنی یہ عورت اس لڑکے پر مہربان ہے اس سے کہیں زیادہ خداوندِ عالم اپنے بندوں پر رحیم ہے مسلمانوں نے یہ کلمات سُن کر بڑا اظہارِ مسرت کیا۔

حضرت ابراہیم ادہم سے روایت ہے کہ ایک بار میں کعبے میں طواف کے لیے تنہا رہ گیا اور بارش شروع ہو گئی۔ میں نے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی کہ مجھے گناہوں سے بچا اور نیکیوں کی توفیق عطا کر۔ ندا آئی کہ اگر سب بندے گناہ نہ کریں گے، تو میری اُمت کس کے کام آئے گی؟

اس قسم کی بہت سی احادیث ہیں۔ پس خوف جس پر غالب آجائے، یہ تمام احادیث اس کے قلب کو مطمئن کرتی ہیں بعض مسلمان دوزخ میں بھی جائیں گے، جیسا کہ بعض احادیث سے واضح ہوتا ہے اور سب سے آخری مسلمان وہ ہوگا، جو سات ہزار سال بعد دوزخ سے نکالا جائے گا۔ لہٰذا اگر ایک ہی مسلمان کو دوزخی فرض کیا جائے تو بہت زیادہ کو بھی فرض کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا خوف و رجا دونوں ہر آدمی کے لیے ضروری ہیں۔ تاکہ نیکی کے راستے پر چلتا رہے۔ تاکہ وہ ستر ہزار برس کا گمان کر کے گناہوں سے بچتا رہے۔ بلکہ دوزخ میں ایک رات گذارنا بھی انتہائی تکلیف دہ ہے۔ لہٰذا خوف و رجا برابر ہونا لازمی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر قیامت میں یہ ندا دی جائے کہ تمام مخلوق میں صرف ایک آدمی جنت میں نہ جا سکے گا، تو میں سمجھوں گا کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ اسی طرح اگر یہ حکم ہوگا کہ دوزخ میں جلنے والوں میں تمام مخلوق میں صرف ایک ہی آدمی ہے، تو بھی میں ڈرتا ہوں کہ وہ شخص میں ہی نہ ہوں۔

اقسامِ خوف

خوف کی قسمیں خوفِ خدا بہترین صفت ہے۔ اس کا ثواب حالات کے مطابق آدمی کو ملتا ہے، اور جس آدمی میں علم ہوتا ہے اور معرفت ہوتی ہے، اس میں خوف بھی ہوگا۔ خداوند عالم فرما رہا ہے کہ بندوں میں سوائے علماء کے اور کسی کو خوفِ خدا نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خوف کے ثمرات میں عفت، تقویٰ اور زہد ہیں۔ اور یہ ہی سعادتِ ابدی کی بنیاد ہیں۔ اس لیے کہ ترکِ شہوات کے لیے ہی آدمی دین کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔

شہواتِ انسانی جتنی خوف سے کم ہوتی ہیں، کسی چیز سے کم نہیں ہوتیں۔ باری تعالیٰ عز اسمہٗ نے خوف کرنے والوں کے لیے رحمت اور ان کے مراتب کا ذکر تین آیتوں میں جمع فرمایا ہے وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ۔ اور إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ" اور خوف کا پھل جو انسان کو تقویٰ کا عادی بناتا ہے۔ اس کو خداوندِ عالم نے اپنی طرف منسوب کیا ہے وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میدانِ حشر میں جب تمام مخلوقات اکٹھا ہوں گی، اس وقت ندا آئے گی اے میرے بندو! اب تک ہمیشہ میں تمہاری سنتا رہا۔ آج تم میری بھی سنو۔ میں نے ایک نسب تم کو دیا، اور ایک نسب تم نے خود اپنے لیے مقرر کر لیا۔ میرے نسب کو جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ تم میں سب سے زیادہ بزرگ تقویٰ کرنے والے ہیں۔ اس کو پسِ پشت ڈال دیا اور اپنے نسب کو بلند کرنے کے لیے فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں کہنے لگے۔ آج میں اپنے نسب کو بلند کرتا ہوں۔ کہاں وہ پرہیزگار جو میرے دین کے جھنڈے

کے نیچے آئیں۔ چنانچہ متقی اور پرہیز گار سب اس علم کے سائے میں آجائیں گے اور جنت میں داخل گے۔ اس وقت خدا سے ڈرنے والوں کو دوگنا ثواب ملے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ خداوند عالم دو خوف یا دو امن ایک بندے کو یکجا نہیں دیتا۔ اگر اس دنیا میں خوف ہوتا ہے تو وہاں اس کو امن قرار دیتا ہے۔ اور خدا سے ڈرنے والے سے دنیا والے خوف کھاتے ہیں، اور جو آدمی خدا سے نہیں ڈرتا اس کو دنیا کی تمام چیزیں ڈراتی ہیں۔

ارشاد نبوی ہے کہ جس آدمی کے آنسو خوف میں بہہ جائیں، چاہے وہ ایک قطرہ ہی کیوں نہ ہو اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے، اور جس آدمی کے موئے بدن خداوند عالم کے خوف سے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس کے گناہ قطعی معاف ہو جاتے ہیں۔ اور ارشاد ہوا کہ سات قسم کے آدمی رب العزت کے سائے میں پناہ لیں گے۔

پہلے وہ آدمی جو گوشہ نشینی میں خدا کی عبادت کرتا ہے۔ اور گریہ زاری کرتا ہے حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو نصائح فرما رہے تھے، اور سب لوگ گریہ زاری میں مبتلا تھے۔ میں اسی عالم میں گھر واپس آیا، اور بچوں کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جب خیال آیا تو باہر نکل کر اپنے حال پر آہ و زاری کرنے لگا، اور کہا کہ میں منافق ہو گیا۔ اسی طرف سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تو منافق نہیں ہوا۔ اس کے بعد بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ جواب مبارک ملا حنظلہ منافق نہیں ہوا۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ اگر تم لوگ اسی طرح رہو، جس طرح میرے سامنے رہتے ہو تو فرشتے تمھاری تاسی کرنے لگیں۔ لیکن تم لوگوں پر وہ کیفیات تھوڑی ہی دیر طاری رہتی ہیں۔

خوف کے بارے میں بزرگانِ دین کے اقوال

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا، کہ میں خوف نہیں کرتا، اور کوئی نہ کوئی عبرت حاصل نہ ہوتی ہو۔

حضرت یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ انسان کے گناہ خوف اور رحمتوں کی امیدوں کے درمیان اس طرح ہوتے ہیں جیسے دو شیروں کے درمیان لومڑی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ آدمی اگر گناہوں سے اس طرح خوف کرنے لگے، جیسے غربت سے ڈرتا ہے تو جنت میں جائے گا۔

ایک بار آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ قیامت کے دن کون بے خوف ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ جو خدا سے بہت زیادہ خائف رہا ہوگا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ بعض لوگ ہم کو خوفِ خدا دلاتے ہیں ایسے لوگوں کی صحبت کے متعلق کیا خیال ہے! آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، تاکہ آخرت میں تم لوگ بے خوف رہو، اور جو لوگ اس سے خوف نہیں دلاتے، وہ لوگ یہاں خوش رکھتے ہیں، مگر آخرت میں خوف کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک بار بارگاہِ نبوی میں عرض کی کہ اس آیت سے کیا مراد ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ" (یعنی کام کرتے اور ڈرتے ہیں) کیا چوری اور زناکاری مراد ہے۔ جواب ملا کہ کام ان کے روزہ، نماز اور صدقہ ہیں۔ اور ان کا خوف ان عبادات کا قبول نہ ہونا ہے۔

حضرت امیر المومنین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر نہ رو سکو تو کوشش کرو، یعنی رونے والوں کی صورت ہی بنا لو

حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رونے کو اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک ہزار روپیہ صدقہ میں دوں۔

خوف کی حقیقت

خوف دراصل کیا چیز ہے ڈر اور خوف انسان کے دل میں ایک دھوئیں کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اسباب اور نتائج بھی ہیں۔

خوف کا سبب "معرفت" ہے۔ اس لیے کہ جب انسان آخرت پر یقین کر لیتا ہے اور وہاں کے پُرخطر منازل کو دیکھتا ہے، تو اس کو ڈر محسوس ہوتا ہے، اور اس ڈر کے جذبے سے وہ دھواں پیدا ہو کر تمام جسم میں رعشہ پیدا کر دیتا ہے۔

خوف کا جذبہ دو معرفتوں سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک تو یہ کہ انسان اپنی صحیح حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ میری عبادات، میرا خُلق اور عادات کیسی ہیں؟ اس کے بعد وہ گناہوں کو دیکھ کر اس کے خوف سے لرزہ اندام ہو جاتا ہے — اس کی مثال ایسے شخص کی ہے کہ کسی آدمی کو بادشاہ کی طرف سے ہر قسم کے الوانِ نعمت ملے ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے محلات اور خزانوں میں خیانت کرے اور آخر میں اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرے ذرہ ذرہ حرکات بادشاہ برابر ملاحظہ کرتا رہا ہے۔ اور اب نہ کسی کی سفارش اس پر کارگر ہو سکتی ہے اور نہ میری عفو تقصیر۔ اور وہ شخص بادشاہ کے غیظ و غضب سے بھی اچھی طرح واقف ہو، کہ وہ کسی کو بخشتا نہیں، اور صحیح قسم سے کیفرِ کردار کو پہنچاتا

ہے۔ اس کے بعد اس شخص کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ بس یہی خوف کا جذبہ اور آگ ہے۔

دوسرا وہ شخص جس کو علمِ معرفت کی وجہ سے خوف کا جذبہ پیدا نہ ہو، بلکہ خداوندِ عالم کی ہیبت اور طاقت کو دیکھ کر خوف زدہ ہو۔ جیسے کوئی آدمی شیر سے اس وقت ڈرتا ہے، جب وہ تنہائی میں شیر کے سامنے پڑ جاتا ہے۔ اور اس کی طاقت کو دیکھ کر ڈرتا ہے۔ اپنے کردار کی وجہ سے نہیں۔ اس قسم کے خوف کے جذبات پہلے جذبات سے بالاتر ہیں۔ اس لیے کہ اس شخص کو وہ جذبہ زیادہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہو سکتا ہے چونکہ اس نے اس کی طاقت اور قہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا ہے۔

رقّت اور گریہ و زاری اس کی ذات سے بالکل الگ ہیں۔ اگر آدمی پر یہ کیفیت طاری ہو تو اس کو ڈرنا ہی چاہیے۔ انبیاء علیہم السلام اگرچہ اپنے متعلق سمجھتے تھے کہ ہم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوگا، لیکن اُن کا خوف اتنا ہی بلند تھا۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں تم سے زیادہ معرفت رکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں، خداوندِ عالم اس کے متعلق ارشاد فرما رہا ہے کہ جاہل آدمی زیادہ بے خوف ہوتے ہیں۔

حضرت داؤدؑ کو حکم ہوا کہ مجھ سے شیر خشم ناک کی طرح ڈرو۔

خوفِ انسان کے دل اور اعضاء و جوارح سب میں پیدا ہوتا ہے۔ دل میں خدا کا خوف اس وقت سمجھو کہ حبِ دُنیا کی خواہشات سے متنفر ہو جائے۔ مثلاً کسی آدمی پر انتہائی شہوت طاری ہو اور اس وقت شیر سامنے آجائے تو شہوت ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح آدمی کو خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا خوف ہونا چاہیے۔ یا کسی آدمی کو بڑے قہر اور غضب والے بادشاہ کے قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کی اطاعت اور فرمانبرداری صرف خضوع و خشوع سے ہوگی۔ مکر و ریاکاری قطعاً جاتی رہے گی۔ ہر وقت اس بادشاہ کا خوف غالب رہے گا، اور اس خوف سے اس کا چہرہ زرد ہو جائے گا۔

اعضاء و جوارح میں خوف اس طرح ہوتا ہے کہ انسان گناہوں کے ارتکاب سے اپنے اعضا کو محفوظ رکھے، بلکہ اطاعتِ خداوندی میں سربسجود رہے۔

اس طرح خوف کے درجات الگ الگ ہیں:

انسان اگر خوف کی وجہ سے خواہشاتِ نفسانی سے پرہیز کرنے لگے۔ اس کو عفت کہتے ہیں۔ اور حرام سے پرہیز کرنے لگے تو اس کو زہد کہتے ہیں۔ اور اگر شبہات والی اشیا سے پرہیز کرنے لگے تو اس کو تقویٰ کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان سب سے بلند مرتبہ صدق کا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی صرف راہِ آخرت کے اسباب کے علاوہ سب چیزوں کو ترک کر دے۔

بعض اوقات بعض آدمی خوف کے جذبے میں روتا ہے، اور جب دل میں ذرا یہ جذبہ کم ہوتا ہے، تو لاحول ولا قوۃ کہہ کر پھر دنیاداری میں مشغول ہوجاتا ہے، اس کو رقت زمانی کہتے ہیں۔ اور یہ حقیقتاً خوف میں داخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ جذبہ اس پر قطعی طور پر غالب آتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی اصلیت کی طرف عود کر جاتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے خائف کی تعریف دریافت کی تو جواب دیا کہ خائف اس طرح خدا سے ڈرتا رہتا ہے جس طرح آدمی موت کے وقت، اور وہ دُنیا کو قطعی طور سے چھوڑ دیتا ہے۔

مدارج خوف

خوف کے تین درجات ہیں۔ ضعیف[1] ۔ قوی[2] اور معتدل[3]

درجہ اعتدال ہر چیز میں ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا فرق بھی معتدل درجے کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔

ضعیف وہ ہیں جو کام کے ارادے کو پورا نہ کرسکیں۔ جیسے عورتوں کے آنسو۔

قوی یہ ہے کہ جس خوف سے آدمی موت، غفلت، بے ہوشی کے ہم کنار ہوجائے۔ ان دونوں میں افراط و تفریط ہے۔ اس لیے بذاتِ خود "خوف" کا کوئی مرتبہ نہیں ہے، بلکہ خوف اپنے جہل یا عجز و انکساری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خداوند عالم کی صفات میں داخل نہیں ہے۔

عموماً خوف اس وقت ہوتا ہے، جب آدمی میں ناعاقبت اندیشی یا فطرت سے پرہیز کرنے کی عادات ہوں گی۔ لیکن غفلت شعار آدمی کے لیے خوف ایک تازیانے کا کام کرتا ہے کہ جانور اس سے راستے پر سیدھے جاتے ہیں۔ لیکن اگر تازیانہ زیادہ کمزور ہے، تو وہ نہ جانور کو چلنے پر آمادہ کر گیا اور نہ لڑکے کو پڑھنے کے خوف پر۔ اسی طرح اگر تازیانہ زیادہ سخت ہے تو جانور کی کھال اُدھیڑ دے گا۔ یا لڑکے کو بے ہوش کر دے گا۔ تو بھی وہ بیکار ہے۔ لہٰذا یہ تازیانہ خوف معتدل ہونا ہی ضروری ہے، تاکہ راہِ راست پر چلا سکے اور دنیا کے گناہوں سے آدمی بچ سکے۔

علماء میں خوف کا مادہ "معتدل" درجے پر ہی ہوتا ہے۔ اگر عالم اپنے علم کا دعویٰ کرنے لگے اور خوف کو دل سے بالکل نکال دے، تو وہ عالم نہیں، بلکہ جاہلوں سے زیادہ بُرا ہے۔ عالم میں جب خوف کا جذبہ بڑھتا ہے تو "رجا" کی کیفیات میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور گھٹتا ہے، تو اس کی ہدایت میں فرق آجاتا ہے۔ وہ بالکل بازاری مجمع لگانے والے حکیموں کی طرح ہوتا ہے جس کو حکمت سے قطعی لگاؤ ہی نہیں ہوتا۔

معرفت کا سب سے پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو اور ذات باری تعالیٰ کو پہچانے کہ وہ خود کتنا ناقص ہے اور ذات خدا کتنی کامل ہے۔ وہ ہر وقت دنیا کو ختم کرسکتا ہے۔ بس ان دونوں باتوں کی معرفت کے بعد "خوف" دل میں پیدا ہوتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے کہ اَوَّلُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ الْجَبَّارِ وَاٰخِرُ الْاَمْرِ تَفْوِیْضُ الْاَمْرِ اِلَیْہِ (یعنی پہلے آدمی کے لیے ضروری یہ ہے کہ خداوند عالم کے جبار اور قہار ہونے کا یقین کرے۔ اور آخری منزل یہ ہے کہ اپنے تمام کام اس پر چھوڑ دے اور دنیا سے قطعی بے تعلق ہو جائے) لہٰذا اِس بات کو سمجھ لینے کے بعد ناممکن ہے کہ آدمی "خوف" نہ کرنے لگے۔

خوف کیسے پیدا ہوتا ہے

خوف معرفت کے خطرات سے آدمی کو پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر آدمی کو مختلف قسم کا خوف پیدا ہوتا ہے بعض لوگ تو دوزخ کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ مثلاً وہ آدمی جو توبہ کر کے پھر گناہوں میں ملوث ہو جائیں، یا خدا کی طرف سے غافل ہو جائیں یا بغیر توبہ کیے مر جائیں یا دنیا کی محبت غالب آ کر وہ لوگ مغرور ہو جائیں اور اپنے گناہوں کو یہ سمجھنے لگیں کہ خداوند عالم ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا اِس تصور سے آدمی کو چاہیے کہ خوف کرے اور اس چیز سے پرہیز ہی کرے، جس سے ڈر لگتا ہو۔

اگر آدمی اپنے خیالات کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کے نزدیک بُرے ہیں تو انھیں ترک کر دے۔

دوسرے اس قسم کے لوگ بھی ہیں، جو اپنے مرنے اور آخرت سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنا ایمان کمزور رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ازل کو غور کریں کہ جو اصل ہے اور اس وقت اُن کا خوف کس درجہ پر تھا۔ آخرت تو اس ازل کی فرع ہے۔

ایک دن منبر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خداوند عالم نے تمام جنت والوں کے نام ایک کتاب میں درج کر لیے ہیں۔ پھر آپ نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کر کے فرمایا کہ ایک کتاب میں دوزخیوں کے نام لکھے ہیں۔ اور بعد میں بایاں ہاتھ بلند کر کے فرمایا کہ اُن ناموں میں نہ زیادتی ہوئی ہے نہ کمی۔ ہو سکتا ہے کہ بعض نیک آدمی شقاوت کے کام کریں۔ حالانکہ وہ نیک ہوں۔ لہٰذا ہر آدمی کے نام ازل میں نیکی و بدی لکھ دی گئی ہے ہو سکتا ہے کہ آدمی عمر بھر بُرے کام کرے اور آخر عمر میں خداوند عالم کی توفیق ہو جائے اور وہ نیکیاں ازل سے اس کے نام لکھی جا چکی ہوں، اس کی کسی کو خبر نہیں!

چند بصیرت رکھنے والے زیادہ تر اسی خیال سے زیادہ خوف کرتے ہیں کہ کہیں ہمارا نام ازل سے ہی شقاوت میں نہ لکھا گیا ہو۔ یہ ہی خوف کامل ہے کہ جو خداوند عالم کے جلال کے مقابل میں اپنے گناہوں کا خوف زیادہ کرتے ہیں۔ اور اسی لیے یہ خوف کبھی کم نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کو صرف اپنے گناہوں کا خوف ہے اور اس نے توبہ کر لی، تو مغرور ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ اب جب کہ میں نے توبہ کر لی تو خوف کی کیا ضرورت ہے۔

ذرا سی بات سمجھنے والی یہ ہے کہ ابوجہل اور ہمارے رسول آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدائش سے پہلے

کوئی نہ قصور تھا اور نہ وسیلۂ نجات، اور پیدائش کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم معرفت اور کمالات و جمالات میں منتہی قرار دے دیا اور آنحضرت ہر طرح کامل تھے۔ آپ میں معاذاللہ کسی قسم کے نقص کا شائبہ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

لیکن ابوجہل کے لیے راہِ بصیرت کو مسدود کر دیا۔ اس کی وہ تمام طاقت سلب ہو گئی جس کے ذریعہ نورِ الٰہی کا مشاہدہ کر سکتا۔

معلوم ہوا کہ ازل میں دونوں مجبور تھے۔ خداوند عالم نے اپنی مشیت کے ماتحت دونوں کو بنایا۔ ابوجہل کو شقاوت اور ظلم و جہل میں مبتلا کر کے اسفل السافلین کی راہ میں بھٹکا دیا اور آنحضرتؐ کو تمام جاہ و جلال سے آراستہ کر کے اعلیٰ علیین کی بلندیوں پر جگمگایا۔ لہٰذا وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کو کسی کا خوف نہیں۔ لہٰذا ایسی ذات سے خوف کرنا ضروری ہے۔

اسی لیے حضرت داؤدؑ کو حکم دے رہا ہے کہ مجھ سے شیر خشمناک کی طرح ڈرو! اس لیے کہ شیر کا غصہ انسان کی خطاؤں کی بناء پر نہیں ہوتا، بلکہ شیر ہونے کی حیثیت سے اس کا غصہ ہی ہلاک کرنے والا ہے اور اگر وہ انسان کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کو ناچیز سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ رحم اور کرم کی بناء پر نہیں۔

جس شخص نے خداوند عالم کی یہ صفات سمجھ لیں، ناممکن ہے کہ وہ خوفِ خدا نہ کرے۔

موت

موت کیا ہے؟ دنیا میں زیادہ تر لوگ موت کے وقت سے تھراتے ہیں۔ اس لیے کہ موت ایک عجیب بھیانک منظر پیش کرتی ہے، اور انسان کا دل ایک پھر جانے والی چیز ہے، اس کو ایک جگہ پر قیام نہیں، کہ "دل" مرتے وقت کس عالم میں ہو۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر ایک آدمی پچاس برس تک میرے پاس رہا اور مجھے اس کے موحد ہونے کا یقین ہوا، اور وہ مجھ سے صرف ایک دیوار کا پردہ رہ جائے، تو اس کے لیے میں گواہی نہ دوں گا، اس لیے کہ دل ہر وقت پلٹ سکتا ہے۔

دوسرے بزرگ کا مقولہ ہے کہ اگر لوگ مجھ سے عبادت کے حجرے میں مرنے کے لیے دریافت کریں، تو میں اس کو بہتر سمجھوں گا۔ اس لیے کہ گھر جانے تک میرا دل اپنی موجودہ حالت سے بدل سکتا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ بقسم موت کے وقت سے ہر آدمی کو ڈرنا چاہیے۔ نہ معلوم اس وقت دل کی کیا حالت ہو؟

حضرت سہل تستری کا قول ہے کہ ہر محتاط آدمی کو موت کے بُرے وقت سے ڈرنا چاہیے۔

حضرت سلیمان ثوری عالم سکرات میں رو رہے تھے۔ لوگوں نے کہا آپ کی نیکیاں اور ثواب لاتعداد ہیں۔ آپ کو غم کیوں ہے؟ تو فرمایا کہ اگر مجھ کو اپنے موحد ہونے کا یقین ہو، تو نہ روؤں گا۔ چاہے میرے گناہ پہاڑوں کے برابر کیوں نہ ہوں۔ اس کے بعد ایک شخص کو اپنا تمام مال سپرد کیا اور فرمایا کہ اگر میرے مرنے کے بعد تم کو یہ علامت نظر آئے، تو اس مال سے بادام خرید کر لڑکوں کو تقسیم کر دینا، اور کہہ دینا کہ یہ سلیمان ثوری کے عرس کے ہیں۔ جو دُنیا سے ایمان لے کر گیا۔ اور اگر یہ علامت نہ پاؤ، تو لوگوں کو میرے لیے نماز پڑھنے کو بھی منع کر دینا۔ تاکہ وہ لوگ میرے مرنے کے بعد تو میری وجہ سے گمراہ نہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے اپنی اُمت کے لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ گناہوں سے ڈرتے ہو اور ہم لوگ کفر سے پیغمبر کے۔

ایک پیغمبر کئی سال تک سروپا برہنہ رہے اور گریہ وزاری میں مشغول رہے۔ خداوند عالم نے فرمایا کہ میں نے تیرے دل کو کفر سے نکال کر ایمان سے معمور کر دیا ہے۔ کیا تو اس سے خوش نہیں ہے۔ اور اب دُنیا کی خواہش ہے آپ نے توبہ کی اور عرض کی کہ میں اپنے سوال پر نادم ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

نفاق

نفاق کے ساتھ مرنا بُری موت کی دلیل ہے۔ اسی لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نفاق سے بہت ڈرتے تھے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ مجھ میں نفاق نہیں، تو میں دنیا کی تمام خوشیوں میں اس کو برتر سمجھوں ——— اور فرمایا کہ دل اور زبان میں ظاہر و باطن کا فرق ہونا بھی نفاق کی علامت ہے۔

بُری موت سے تمام بزرگان دین ڈرتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ موت کے وقت کسی کے ایمان میں خلل نہ آجائے۔ ایمان میں خلل کئی وجوہ سے آسکتا ہے۔ اصل میں تو وہ اسباب پوشیدہ ہیں۔ لیکن بظاہر دو وجوہ سے ایمان میں خلل آتا ہے

پہلے یہ کہ کسی باطل عقیدے پر پوری عمر گزار دے۔ اور آخر وقت تک اپنا قصور نہ سمجھے۔ لیکن موت کے وقت خداوند عالم اس پر وہ کیفیت ظاہر کر دے اور اس کو اپنے ایمان پر شک پیدا ہو جائے۔ اور اسی حال میں دم نکل جائے۔ اس قسم کا خطرہ بدعتی اور علم کلام کے جاننے والوں کے لیے زیادہ تر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ صرف دلیل اور شبوٗب کی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کے ماننے والے سیدھے سادھے مسلمان اس خوف سے الگ ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے عَلَیْکُمْ بِدِیْنِ الْعَجَائِزِ وَاَکْثَرُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ الْبُلْہُ (یعنی تم کو بڑھیوں کا دین اختیار کرنا ضروری ہے، اور اکثر جنتی لوگ بھولے ہی ہوتے ہیں) اور اسی لیے بزرگانِ دین

نے مذہب میں زیادہ تلاش کے لیے منع کیا ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی اس کا متحمل ہونے کی وجہ سے ضرور کسی نہ کسی بدعت کا شکار ہو سکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی کا ایمان درحقیقت کمزور ہوتا ہے۔ اور محبتِ دنیا اس پر غالب ہوتی ہے۔ اور موت سے گھبراتا ہے، اور مرنا نہیں چاہتا۔ اس میں اس کو کراہت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس وقت تھوڑا بہت اس کا ایمان جو ہوتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی اپنے بیٹے کو دوست رکھتا ہو اور وہ بیٹا اس کی پسندیدہ چیز ہی اس سے چھین لے۔ تو اس بیٹے کو بھی وہ بُرا سمجھنے لگتا ہے اور وہ محبتِ پدری بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اسی لیے شہادت کا ثواب زیادہ ہے۔ اس میں آدمی اپنے قدم سے مرنے کی طرف بڑھتا ہے اور دُنیا کو پسِ پُشت ڈال دیتا ہے۔ جہاد میں موت آجانا بہت باعثِ ثواب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایمانی اور جذبہ بہت جلد سرد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دل اس کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔

پس جس آدمی کے دل میں خداوند عالم کی معرفت ہوتی ہے، وہ شخص من جانب اللہ دنیا سے پرہیز کرتا ہے اور وہ موت کے وقت اس قسم کے خطرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اور موت کے وقت وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا ہے کہ میں اپنے مالک کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ لہٰذا موت اس کے لیے ایک خوش آئند ہوتی ہے۔ یہ وقت خاتمہ اس کے لیے نیکی اور ثواب کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آدمی موت سے بچنا چاہتا ہے، تو بدعتوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

قرآن و حدیث پر ایمان لائے، جو کچھ جانتا ہو، اس پر یقین کرے، اور جو نہ مانے اور سُن لے اس کو مان لے۔ اور خداوند عالم کی محبت کو محبتِ دُنیا پر غالب کرے۔

دنیا کی محبت کو کم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ شرعی احکامات کا کاربند رہے۔ اور دُنیا اس پر تنگ ہو جائے اور وہ نفرت کرنے لگے۔

خداوند عالم کی عبادت اور ذکر سے دُنیا کی دوستی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے دوستوں سے محبت رکھے اور اس کے دُشمنوں سے دشمنی۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو ایمان کے لیے خطرے کے امکانات ہیں، جیسا کہ خداوندِ عالم نے ارشاد فرما دیا ہے کہ دنیا میں ماں باپ اولاد اور مال جو کچھ بھی تمھارے پاس ہے۔ اس کو خدا سے زیادہ عزیز رکھتے ہو، تو میرے حکم کے منتظر رہو۔ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ۔

خوفِ خدا دل میں پیدا کرنے کی تدابیر

خداوند عالم کا خوف کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے؟

دین اور ایمان کی منازل میں سب سے پہلی منزل یقین اور معرفت ہے۔ ان دونوں کے بعد خوف اور اس کے بعد زہد، صبر اور توبہ پیدا ہوتی ہے۔ زہد

اور توبہ سے خلوص اور عبادات کی قوت تفکر و عبادت پیدا ہوتی ہے۔ تفکر و تذکر کے بعد خداوند عالم سے موانست ہوتی ہے۔ درجہ موانست قرب الٰہی کا موجب ہوتا ہے۔ بس یہ ہی مقام منتہی ہے۔ تمام باقی چیزیں اسی کے تابع ہیں

پہلے ہی بتایا گیا کہ تیقن اور معرفت کے بعد خوف کی منزل آتی ہے۔ خوف تین طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔

اوّل علم و معرفت کے ذریعہ، اس لیے کہ آدمی اپنی اور خداوند عالم کی معرفت کے بعد ہی خوف میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی شیر کو دیکھے تو اس کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس سے ڈرو! بلکہ وہ خود ہی رعشہ براندام ہو جاتا ہے۔ بس اس طرح جب آدمی نے اپنی عاجزی اور خداوند عالم کی ملکیت کو سمجھ لیا۔ لہٰذا اس سے خوف کرنا ضروری ہے۔ اور جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے لیے ازل میں سب کچھ مقسوم ہو چکا ہے، نیکیاں یا ظلم و جور۔ اور اب وہ آدمی بذاتِ خود قطعی مجبور ہے۔ لہٰذا وہ ضرور خوف کرے گا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے جناب آدمؑ پر اعتراض کیا۔ اُن کے جواب میں حضرت آدمؑ نے بھی دلائل دیں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ اعتراض کیا کہ باوجود ان تمام نعمتوں کے آپ نے پھر ہم سب کو اپنے ساتھ مصائب میں مبتلا کر دیا۔ حضرت آدمؑ نے یہ ہی جواب دیا کہ وہ سب کچھ قسامِ ازلی نے میرے اعمال نامے میں لکھ دیا تھا۔ اس کو ٹال دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ خاموش ہو گئے

وہ معرفت جو خوف پیدا کرتی ہے، اس کے متعدد مدارج ہیں۔ جتنا عرفان آدمی کو بڑھتا جاتا ہے۔ اتنا ہی خوف میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل دونوں رویا کرتے تھے۔ اور درگاہ ربّ العزّت میں عرض کرتے تھے کہ ہم تیرے احکامات سے ڈرتے ہیں۔ یہ معرفت کا آخری درجہ ہے

جنگِ بدر کے پہلے دن مسلمانوں کا کچھ نقصان ہوا۔ درگاہِ ربّ العزّت میں آنحضرتؐ نے عرض کی کہ بارِ الٰہا اگر یہ مسلمان بھی شہید ہو گئے، تو تیری عبادت کرنے والا کون رہے گا۔ حضرت ابُوبکر صدیقؓ نے عرض کی کہ آپ سے اس نے وعدہ کیا ہے، اور وہ ضرور پورا کرے گا، کہ ہم کو فتح نصیب ہو گی —— یہاں سے جناب ابوبکر صدیقؓ کے مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو خداوند عالم کے وعدے پر اعتمادِ کلّی تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ یہ تھا کہ خیر الماکرین کے مکر سے ڈرتے تھے۔ یہ اکمل درجہ ہے۔ اور اس بات سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ اس کے بھیدوں کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے، کہ آدمی اہلِ خوف کی صحبت اختیار کرے۔ ایسا خوف اور معرفت اگرچہ تقلیدی ہوتی ہے۔ لیکن خوف ضرور پیدا ہوتا ہے۔ یہ ڈر حقیقی خوف سے کمتر ہے اور غافلوں کی صحبت میں غفلت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی صحبت میں بیٹھنا اچھا نہیں خصوصاً ان علماء سے جو خود غفلت شعار ہوں۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر آدمی کو اہلِ خوف و اہلِ معرفت نہ ملیں تو اُن کی کُتب کی سیر کرے۔ اس لیے کہ ان کی

کتب میں یہ سب کچھ مل جائے گا کہ انبیاء علیہم السّلام بھی خوف کرتے تھے اور ان ذواتِ مقدّسہ کی تاسّی کرنے کے لیے آراستہ و ہموار ہو جائے۔

خوف سے متعلّق پیغمبرانِ اُولوالعزم اور فرشتگان و مقربین کی حکایات

جب ابلیس ملعون درگاہ ایزدی ہوا، تو جبرئیل و میکائیل دونوں رویا کرتے تھے، ندا آئی کہ کیوں روتے ہو؟ عرض کی! بارالٰہا! ہم تیرے احکامات سے ڈرتے ہیں۔ ارشادِ ربّ العزّت ہوا کہ خوف کرنا ہی مناسب ہے۔

محمد بن المکندر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب ملائکہ کو پیدا کیا گیا۔ اور اس کے بعد دوزخ بنایا۔ تو تمام ملائکہ میں تلاطم برپا ہو گیا۔ لیکن جب انسان کو بنایا تو ملائکہ کو اطمینان ہوا کہ دوزخ ان لوگوں کے لیے ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس جب بھی جبرئیل وحی لے کر آتے، رعشہ براندام ہی ہوتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سرورِ کائنات نے فرمایا کہ میں نے جبرئیل سے دریافت کیا کہ میکائیل ہمیشہ روتے ہیں، تو کہا کہ جب سے دوزخ کا وجود ہوا، آج تک وہ کبھی نہیں ہنسے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت داؤد ایک بار برابر چالیس دن تک سجدے میں روتے رہے، یہاں تک کہ اُن کی حالت نازک ہو گئی۔ اور آپ کے آنسوؤں سے گھاس اُگ آئی۔ ندا آئی کہ داؤد کیوں روتے ہو؟ اگر کوئی حاجت ہے، تو پوری کی جائے۔ آپ نے پھر رونا شروع کر دیا۔ چنانچہ آپ کی توبہ قبول ہوئی، اور عرض کی کہ میرے گناہوں کو میرے ہاتھ پر رکھ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد جب آپ کھانے پر بیٹھتے تو اوّل گناہوں کو دیکھ لیتے۔ اور گریہ فرماتے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ ایک بار اتنا روئے کہ جسم کی طاقت زائل ہو گئی۔ اور عرض کی کہ خدایا تو میرے اوپر رحم نہیں کرتا؟ ندا آئی، داؤد! گناہوں کو یاد کرو۔ عرض کی کہ میں گناہوں کو ہر وقت یاد رکھتا ہوں۔ جب زبور پڑھتا تھا، تو تمام جانور اکٹھا ہو جاتے تھے۔ دریاؤں کا پانی ٹھہر جاتا تھا۔ اور درندگان صحرائی جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن اب وہ کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اور اب وحشت رہ گئی ہے۔ ندا آئی، کہ ہاں! وہ محبت و اطاعت کا جذبہ تھا۔ اور یہ وحشت کا جذبہ ہے۔ اور اے داؤد! سمجھ! کہ آدم کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا، خلعتِ انسانیت بخشا۔ تمام ملائکہ سے سجدہ کرایا۔ اور اس کی تنہائی کا تصوّر کر کے حوّا کو پیدا کیا، اور دونوں کو جنّت میں رہنے کی اجازت دے دی۔ لیکن صرف ایک گناہ کے باعث میں نے اس کو ننگا کر کے بہشت سے نکال دیا۔ اب سوچ! کہ تو گنہگار ہے اگر تو توبہ کر کے ہمارے خاص بندوں میں آنا چاہتا ہے تو تیرا گناہ معاف ہو سکتا ہے

حضرت یحییٰ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت داؤد اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لیے حضرت سلیمان سے فرماتے ہیں کہ تمام مخلوق سے کہہ دو کہ داؤد کی فریاد جو سننا چاہے، سُن سکتا ہے۔ چنانچہ چرند پرند وحش وطیور اور انسان اکٹھا ہو جاتے۔ آپ اول حمد و ثنا کرتے، بعد میں توبہ۔ اس وقت حاضرین میں سے بہت سے مرجاتے۔ ایک بار چالیس ہزار جانداروں میں تیس ہزار ختم ہو گئے۔ تب حضرت سلیمان نے عرض کی، کہ اب توبہ ختم کیجئے، مخلوق کا بُرا حال ہے۔

حضرت یحییٰ ابن حضرت زکریا پیغمبر علیہ السلام بچپن میں ہی بیت المقدس میں عبادت کے لیے تشریف لے جاتے ہم جھولی کھیل کود کے لیے اصرار کرتے، تو فرماتے کہ خدا نے ہم کو لہو و لعب کے لیے خلق نہیں کیا۔ ایک دن آپ صحرا میں چلے گئے۔ حضرت زکریا کو جب معلوم ہوا تو جا کر دیکھا کہ پانی میں کھڑے ہیں، مگر پیاس کی شدت سے جاں بلب ہیں، اور درگاہ قاضی الحاجات میں دست بدعا ہیں کہ قسم ہے۔ تیری بزرگی کی، کہ جب تک اپنا مرتبہ نہ جان لوں گا۔ پانی کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ اور اتنا روئے کہ آپ کے چہرے کا گوشت باقی نہ رہا۔ آپ نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا کہ دوسرے نہ دیکھ سکیں۔

واقعات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب کسی پرندے کو دیکھتے، تو کہتے کہ میں ایسا ہی ہوتا۔ حضرت ابوذر غفاری فرمایا کرتے کاشکہ میں درخت ہی ہوتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتیں، کاشکہ میرا نام و نشاں ہی نہ ہوتا۔

قرآنی آیات سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنا روتے کہ کبھی کبھی بے ہوش ہو جاتے۔ آپ کے چہرے پر کثرت گریہ سے نشانات پڑ گئے تھے، اور فرمایا کرتے کاشکہ میں اپنی ماں کے یہاں پیدا ہی نہ ہوتا۔ ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں تلاوت کلام پاک کی آواز سُنی۔ وہاں رُک گئے۔ جب اس آیت کو سُنا اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ" تو آپ اونٹ سے اُتر کر ایک دیوار پر گر پڑے، لوگ آپ کو اٹھا کر مکان پر لے گئے۔ اور ایک ماہ تک لگاتار بیمار پڑے رہے۔ اور کسی کو بیماری کا سبب تک نہ معلوم ہو سکا۔

(تمثیلات) حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اچھے مرتبے پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بہشت سے زیادہ بہتر جگہ کوئی نہیں ہے، اور وہاں آدم کو دیکھ! اور اُن سے سبق لے۔ اپنی عبادات پر بھی نازاں نہ ہو۔ اس لیے کہ ابلیس کی لاکھوں برس کی عبادت ایک سجدے کے نہ کرنے سے خاک میں مل گئی۔

ایک شخص بلعم باعور نامی اپنی عبادات سے بڑے مرتبے پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسم اعظم تک معلوم ہو گیا لیکن بعد میں اس کے لیے یہ آیت نازل ہوئی (کہ وہ ایک کتے کی طرح ہے کہ اگر اس کو گود میں لے تب بھی ہانپتا رہے اور چھوڑ دے تب بھی)

حضرت عطا سلمی رحمۃ اللہ علیہ خائفین میں شمور تھے۔ آپ نے چالیس سال تک آسمان کی طرف نہیں دیکھا۔ اور ایک بار نظر پڑ گئی تو بے ہوش ہو گئے۔ آپ فرمایا کرتے کہ دُنیا کی تمام آفات میرے وجود کے باعث ہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو کوئی آفت نہ رہے۔

حضرت سری سقطی علیہ الرحمۃ اپنی ناک کو روزانہ دیکھتے اور سوچتے کہ کہیں میں کالا تو نہیں ہو گیا۔

حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے "خوف" کی دُعا مانگی۔ چنانچہ عنایت ہوا۔ اس کے بعد آپ ڈرنے لگے کہ کہیں عقل نہ جاتی رہے۔ چنانچہ عرض کی کہ بارِ الٰہا! اس کے بار کو سنبھالنے کی بھی طاقت دے۔

حضرت حسن بصری سے کسی نے مزاج دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کا حال پوچھتے ہو جس کی بیچ دریا کے کشتی ٹوٹ گئی ہو اور ایک تختے پر جان بچائے تیر رہا ہو —— ایک آدمی کو دوزخ سے ایک ہزار برس بعد نکالیں گے۔ کاش کہ میں ہی وہ آدمی ہوں۔ آپ کو اپنے مرنے کے بعد کا اتنا ڈر تھا کہ کہیں ہمیشہ دوزخ میں نہ رہوں۔

خلیفہ عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک کنیز تھی۔ ایک صبح کو اُٹھنے کے بعد کہنے لگی کہ رات عالم رویا میں دیکھا کہ دوزخ کی آگ روشن کی گئی، اور پُل صراط آراستہ کر کے خلفا کو وہاں عبُور کرنے کے لیے لایا گیا۔ چنانچہ خلیفہ عبد الملک ابن مروان پل صراط پر سے گزرا اور نیچے گر گیا۔ خلیفہ نے کہا کہ جلدی کہو، پھر کیا ہُوا؟ کنیز نے کہا پھر ولید بن عبد الملک کو پل صراط پر سے گزارا گیا اس کا بھی یہ ہی حشر ہوا۔ اس کے بعد سلیمان بن عبد الملک کو لایا، وہ بھی اسی طرح گر گئے۔ اس کے بعد آپ کو لایا گیا۔ ابھی کنیز یہ کہہ رہی تھی کہ خلیفہ بے ہوش ہو کر گر گئے۔ کنیز چلائی، کہ بخدا آپ پُل صراط سے بسلامت گزُر گئے۔ وُہ چلا رہی تھی، اور آپ زمین پر تڑپ رہے تھے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ اتنی عبادات کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اتنے پژمردہ رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں خدا سے ڈرتا ہوں کہ کوئی گناہ کیا ہو، اور وہ مجھے ڈھیل دے دے۔

اسی طرح اور بھی بہت سے واقعات ہیں کہ یہ خاصانِ خدا خوفِ خدا میں آہ و زاری کیا کرتے تھے۔ اب ہر آدمی کو اپنے نفس کا جائزہ لینا چاہیے، کہ وہ خود اُن ذوات کے مقابلے میں کتنا گنہگار ہے۔ اور کتنا خوفِ خدا کرتا ہے۔ تم باوجود گناہوں کے اس سے نہیں ڈرتے۔ اور وہ اتنے عظیم المرتبت ہونے کے باوجود ڈرتے تھے۔

خوف و رجا کی تفصیل

تفصیلات خوف و رجا

اگر کوئی آدمی خوف و رجا میں فرق تلاش کرنے کی خواہش کرے۔ ان میں تفصیلات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انسان کے لیے کمال کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ خدا کی معرفت میں اپنے کو اتنا کھوئے کہ دنیا کی

خبر نہ رہے۔ وہ وقت کی پابندی نہ کرے، بلکہ وقت کے مختارِ کلّی کی طرف متوجہ رہے۔ یہ ہے آدمی کا مرتبہ اعلیٰ، لیکن ایسے لوگ نادر و نایاب ہیں۔

البتہ اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ موت کے وقت "رجا" کا طاری ہونا ضروری ہے۔ اور اس سے پہلے "خوف" اس لیے کہ موت کے وقت خداوندِ عالم سے اُمیدیں رکھنا ہی اچھا ہے، اور اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے زندگی بھر خوف کا غالب رہنا مناسب ہے۔

اگر آدمی اطاعت کرتا ہو، تو غلبہ رجا ضروری ہے۔ کیونکہ دُعاؤں کے وقت محبت ضروری ہوتی ہے اور رجا محبت کی بُنیاد ہے۔ اس طرح گناہ کے وقت خوف کا غلبہ ہونا ضروری ہے، ورنہ گناہوں میں زیادتی ہوگی۔

معلوم ہوا کہ خوف و رجا انسان کے ذاتی حالات کے ماتحت بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا افضلیت کا اس میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

چوتھا اصُول

(بابُ الفقر والزہد)

فقر و زہد

دین اور آخرت کا دار و مدار چار اصول پر مبنی ہے جس کی تفصیل مسلمان کے عنوان کے ماتحت لکھ دی گئی ہے۔ دُنیا۔ آخرت[۲]۔ نفس[۳] انسانی اور خداوند[۴] عالم۔ ان چاروں میں دو کو اخذ کرنا چاہیے اور دو کو چھوڑ دینا چاہیے۔ خداوندِ عالم کے حق میں اپنے نفس کی خواہشات کو ترک کر دینا چاہیے اور آخرت کے لیے اپنی دُنیا چھوڑ دینا ضروری ہے۔ باقی چیزیں مثلاً خوف۔ صبر۔ توبہ اور رجا یہ سب دین کے مقدمات میں سے ہیں۔

اب ہم دوستی و محبت دنیا کی مذموم باتوں کو بالتفصیل لکھتے ہیں کہ دنیا سے قطعِ تعلق کرنا ہی باعثِ نجات دارین ہے۔

فقر و زہد اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

فقر و زُہد کی حقیقت

فقیر کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، وہ اس کے پاس نہ ہوں۔

آدمی کو سب سے پہلے دائمی زندگی کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بقائے عمر کی، پھر لوازماتِ زندگی کی جیسے مال و جاہ و مرتبہ وغیرہ، ان سب چیزوں کا آدمی بذاتِ خود مختار نہیں ہے، بلکہ ہر چیز کا حاجت مند ہے۔

اسی طرح امیر وہ ہے، جس کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو، اور وہ خود مختار ہو، اور وہ ذات صرف باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ

کی ہے۔ لہٰذا علاوہ اس کے دنیا کی تمام ذی رُوح فقیر ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرمارہا ہے کہ وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ یعنی سوائے خداوند عالم کے تمام ذی رُوح محتاج ہیں حضرت علیسیٰؑ نے فقیر کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے کہ میں اپنے اعمال کا مالک ہوں اور میرا مالک دوسرا ہے۔ لہٰذا مجھ سے زیادہ حاجت مند کون ہوسکتا ہے خداوند عالم بھی فرمارہا ہے کہ وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُوالرَّحْمَۃِ اِنْ یَّشَأْ یُذْہِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِکُمْ مَا یَشَآءُ (یعنی غنی وہ ہے، کہ اگر چاہے تو تمام مخلوق کو تباہ کرکے دوسری مخلوق پیدا کرلے۔

اہلِ تصوف کے یہاں فقیر کی تعریف یہ ہے کہ آدمی اپنے متعلق یہ سمجھ لے کہ اس کا یہاں کچھ نہیں ہے نہ آئندہ ہوگا، اور نہ کبھی تھا۔

بعض بیوقوفوں کا قول ہے کہ فقیر اس کو کہتے ہیں، جو عبادت نہ کرے، اور اگر عبادت کرے گا، تو اس کا ثواب تیرے نام جمع ہوتا رہے گا۔ لہٰذا تجھ کو فقر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ لوگ زندقہ اور اہلِ قباحت میں سے ہیں۔ ان لوگوں کو شیطان نے راہ سے بے راہ کردیا ہے۔ یہ بات ایسی ہے کہ جو آدمی خدا رکھتا ہے وہ سب کچھ رکھتا ہے۔

فقیر دراصل وہ ہے، جو اطاعت کرتا رہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ اطاعت میری چیز نہیں ہے، اور نہ میرے اختیار میں ہے، بلکہ میں اس کا احسان مند ہوتا ہوں۔

بہرحال یہاں اہلِ تصوف کا نظریہ فقر بیان کرنا مقصود نہیں، اور نہ ہر شخص کے خیال کے مطابق اس پر بحث کرنا ہے، بلکہ ہم صرف ظاہری مال کے فقیر کے متعلق بیان کریں گے۔

آدمی کی حاجات چاہے وُہ پوری ہوجائیں، سب فقر کی نشانی ہیں۔ لہٰذا مال بھی انھیں میں شامل ہے۔

فقرِ مال

مال کا نہ ہونا یا تو اس لیے ہوگا، کہ وہ دستیاب ہی نہ ہوسکے۔ یا اس لیے کہ آدمی کو مل سکتا ہے، لیکن اس کو حاصل نہیں کرتا۔

زاھد جو آدمی قصداً مال نہ حاصل کرے، اُس کو زاہد کہتے ہیں۔

فقیر اور جس کے پاس مال آنے کے اسباب نہ ہوں، وہ فقیر ہوتا ہے۔ فقیر کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔

یا تو اس کے پاس مال ہوتا ہی نہیں، لیکن وہ ہر وقت متلاشی رہتا ہے، وہ فقیر حریص کہلاتا ہے۔

یا وہ فقیر کہ نہ خود سوال کرتا ہے اور اگر کوئی لے آئے تو اس کو بخوشی لے لیتا ہے۔ وہ ہر حال میں خوش ہے۔ ایسا فقیر "قانع" کہلاتا ہے۔

تیسرے نمبر پر وہ فقیر ہے کہ نہ حصول مال کی فکر کرتا ہے۔ اور اگر اس کو کوئی دیتا ہے تو لیتا بھی نہیں۔ یہ زاہد کا

درجہ ہے۔

(نوٹ) لہٰذا اوّل فقر کی فضیلت اس کے بعد زہد کی فضیلت بیان کریں گے۔
اس لیے کہ مال کا نہ ہونا بھی آدمی کے مرتبے کو بلند کرتا ہے۔

فقر کا ثواب

درویشی کے ثواب خداوند عالم فرما رہا ہے کہ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ یہاں ہجرت کو فقر پر مقدم رکھا گیا ہے۔ سرکار رسالت کا ارشاد ہے کہ زیادہ عیال دار درویش کو خداوندِ عالم دوست رکھتا ہے۔ چنانچہ بلال حبشی سے فرمایا کہ درویشی کی خواہش کر! تونگری تو دل سے نکال دے۔ اس لیے کہ میری امت کے فقیر امراء سے پانچسو برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

ایک حدیث کے مطابق فقراء امراء سے چالیس برس پہلے جنت میں جائیں گے۔ ان فقراء سے حریص فقیر مقصود نہیں ہیں، بلکہ فقیر وہ ہے جو فقر سے خوش رہے۔ اور فرمایا کہ جو آدمی درویشی اور جہاد سے خوش ہو۔ میں اس کو دوست رکھتا ہوں۔ ایک بار جبرئیل حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی کہ خداوند عالم فرما رہا ہے کہ اگر آپ فرمائیں تو تمام پہاڑ سونے کے ہو جائیں۔ آنحضرت نے جواب دیا کہ مال جمع کرنا احمقوں کا کام۔

حضرت جبرئیل نے عرض کی، یا رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خداوند عالم آپ کو آپ کے قول پر ثابت قدم رکھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کے متعلق بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ یہ بندہ اس دنیا میں بیکار ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں۔ جواب آیا کہ میں جن کو دوست رکھتا ہوں، اُن کو خالی ہاتھ ہی رکھتا ہوں۔

ایک شخص آنحضرت کی خدمت میں آیا، لیکن اس روز آنحضرتؐ کے پاس کچھ نہ تھا۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے مجھے ایک یہودی کے یہاں سے کچھ آٹا قرض لانے کا حکم دیا۔ میں گیا، لیکن اس نے آٹا نہ دیا۔ میں نے واپس درگاہ نبوی میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ بقسم میں اس کا قرضہ ادا کر دیتا۔ اور اب تم میری زرہ لے جا کر اس کے پاس بالعوض آٹے کے رہن رکھ دو۔ چنانچہ میں زرہ رکھ کر آٹا لایا، اور اس کے بعد ہی یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (یعنی اے رسُول تم دنیا والوں کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھو۔ دُنیا ان لوگوں کے لیے فتنہ ہے۔ اور جو چیز خداوند عالم کے پاس تمھارے واسطے ہے وہ بہت دیرپا ہے۔

(حدیث) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم جب کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کو مصائب میں مبتلا رکھتا ہے اور اگر بہت مہربان ہوتا ہے تو اس کا مال و اسباب اور اہل و عیال کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔

حدیث ہے کہ درویشوں سے خداوند عالم خود روزِ قیامت عذر خواہی کرے گا کہ میں نے تم لوگوں کو دُنیا میں تکالیف دی تھیں۔ وہ تمہاری ذلت و خواری کی وجہ سے نہیں تھیں۔ بلکہ میں تم کو یہاں فراخی دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا اب تم جاؤ اور جن لوگوں نے تمہاری اطاعت کی تھی، ان کے ساتھ تم بھی اعانت کرو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مخلوق مال کی محبت میں مبتلا ہو کر فقراء کا خیال نہ رکھے گی تو خداوند عالم ان پر چار مصائب نازل کرے گا۔ قحطِ زمانہ۔ بادشاہ وقت کا ظلم۔ قاضیوں اور حاکمانِ عدالت کی خیانت، اور دشمنانِ دین کی شوکت و حشم۔

حضرت ابن عباس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی ملعون ہے، جو کسی کو غربت کی وجہ سے ذلیل اور امارت کی وجہ سے باعزت سمجھتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ کا قول ہے کہ مسکین اگر فقیر کی طرح دوزخ سے ڈرتا تو دنیا و دین دونوں سے بےخوف رہتا اور دنیا کی طرح جنت کی خواہش کرتا تو دونوں چیزیں اس کو ملتیں۔ اور ظاہر کی طرح باطن میں بھی خدا کا خوف ہوتا، تو دونوں جہاں میں خوش بختی نصیب ہوتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر قیامت میں میرے ساتھ رہنے کی خواہش مند ہو، تو فقراء کی زندگی اختیار کرو۔ امرا کی صحبت اور محبت سے پرہیز کرو اور اس وقت تک کپڑا استعمال کرو، جب تک پیوند نہ لگ جائے۔

درویش قانع

سرکار رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ وہ آدمی سب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ جس کو خداوند عالم نے ضرورت کے مطابق مال عنایت فرمایا، اور اس نے اس پر قناعت کی اور اے فقیر! اپنے فقر پر صدق دل سے قانع رہو، ورنہ ثواب نہ ہوگا۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ حرص کرنے والے فقیر کو ثواب نہیں ملتا۔

بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے درویشوں کو بھی ثواب ملتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ خداوند عالم نے بہشت کی کنجی صابر فقرا کو دے دی ہے۔ اب جو اُن سے محبت کرے گا وہ جنت میں جگہ پائے گا۔

خداوند عالم نے جناب اسمٰعیل پر وحی نازل فرمائی کہ اگر مجھے ڈھونڈنا ہے تو فقراء کے پاس تلاش کرو۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بروزِ قیامت خداوند عالم ارشاد فرمائے گا کہ وہ فقیر اور غریب مسلمان جو میری نعمتوں پر خوش تھے۔ اُن کو جنت میں لے جاؤ۔ جس وقت تمام لوگ حساب کتاب میں پھنسے ہوں گے وہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

حضرت ابوالدرداء علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جو آدمی دنیا کی زیادتی پر خوش اور عمر کے طویل ہونے پر خوش نہیں ہوتا وہ بیوقوف ہے۔ اس لیے کہ اس میں کون سی بہتری ہے کہ دنیا زیادہ حاصل ہو جائے اور عمر کم ہی رہے

حضرت عامر بن قیس روٹی ساگ کے ساتھ تناول فرما رہے تھے۔ ایک شخص سامنے سے گزرا، وہ کہنے لگا کہ آپ نے صرف اسی پر صبر کر لیا۔ عامر نے جواب دیا کہ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں، جنھوں نے اس سے بھی بہت کم پر قناعت کی ہے۔

حضرت ابوذر کچھ لوگوں سے بیٹھے ہوئے نصائح فرما رہے تھے۔ آپ کی بیوی نے آ کر عرض کی کہ آج گھر میں کھانے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے وہ پل صراط ہے۔ جس پر سے وہ ہی آدمی عبور کر پائے گا، جو آدمی زیادہ سے زیادہ ہلکا ہو گا۔ آپ کی بیوی اس نصیحت سے خوش ہوئیں اور خاموش واپس چلی گئیں۔

توجیہہ

صبر کرنے والے فقیر اور قناعت کرنیوالے مالدار کا مقابلہ

درویش صابر اور تونگر شکر ادا کرنے والے کی فضیلت میں علماء کا اختلاف ہے لیکن میرے خیال میں صابر فقیر زیادہ افضل ہے۔ اور اب تک جتنی روایات ہم نے لکھیں وہ سب اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

اگر اس بات کو سمجھنا چاہتے ہو، تو سنو!

ہر وہ چیز جو خداوند عالم کی عبادات میں روڑا اٹکا سکے، وہ یقیناً بُری ہے بعض لوگوں کو تونگری مانع ہوتی ہے، اور بعض کو فقر۔ یہ اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہر چیز کا بقدر ضرورت موجود ہونا قطعی نہ ہونے سے بہر حال اچھا ہوتا ہے۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے اپنی اولاد کے لیے دعا فرمائی ہے کہ بقدر کفایت ان کو عنایت فرمایا لیکن اس سے زیادہ ہونا یا بالکل نہ ہونا دونوں صورتوں میں آدمی کو حرص یا لالچ میں مبتلا کر دے گا۔ فقیر کو نہ ہونے کی وجہ سے لالچ ہو گا، اور امیر کو زیادہ ہونے کا سبب۔ فرق اتنا ہے کہ دنیا دار فقیر رنج و تکالیف کی وجہ سے متنفر ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ والے کو یہ تکالیف روحانی آرام پہنچاتی ہیں اور وہ مرتے وقت سوائے خدا کے اور کسی طرف دھیان بھی نہیں دیتا۔ مالدار آدمی اس کے خلاف دنیا سے فائدہ حاصل کرنے کی وجہ سے اس میں اُلجھا رہتا ہے۔ موت کے وقت ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مرنے کے وقت ہی نہیں بلکہ خداوند عالم سے دُعا اور مناجات کرنے میں بھی دونوں کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ درویش کو خداوند عالم کے سامنے آہ و زاری میں جو لطف آتا ہے، مالدار کے لیے ناممکنات سے ہے۔

اس لیے کہ وہ صرف ظاہراً اول سے خداوند عالم سے مناجات کرتا ہے اور کسی سے فریاد کرنے میں جب تک خلوص نہ ہو، لطف نہیں آتا۔ پھر بھی اگر کوئی مالدار اور فقیر دونوں کے دلوں میں برابر کا خلوص ہو۔ جب بھی دونوں

کا مقابلہ ناممکن ہے۔ اس لیے کہ فقیر کی الحاح وزاری مالدار کی فریاد سے ضرور زیادہ موثر ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہوتی ہے۔

لیکن اگر کسی مالدار کا مال چھن جائے اور وہ اپنے خلوص کی بناء پر اس مال کا قطعی افسوس نہ کرے، اس کو صرف خدا سے لو لگی ہو۔ دوسری طرف فقیر صرف طمع اور حرص کا بندہ ہو۔ تو ضرور اس کی فریادوں میں اثرات ہوں گے۔ اور فقیر کی چیخ پکار بیکار ہوگی۔

بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ فقیر ہو یا مالدار، ان سب کی قربت و دوری خداوند عالم سے صرف دنیا کی دوری اور قربت کے مطابق ہوتی ہے۔ آدمی جتنا دنیا سے دور ہوگا، اس سے قریب ہوتا جائے گا۔ اور اگر کوئی مالدار صرف حاجات خلق کو پورا کرنے کے لیے مال رکھتا ہے، اور ذاتی اغراض قطعی اس سے وابستہ نہیں ہیں۔ تو یہ مال اس کے لیے قربتِ خدا کا باعث ہوگا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک روز ایک لاکھ درہم صدقے میں تقسیم کیے، اور اپنے لیے ایک پیسے کا گوشت نہ خریدا۔ اس درجے پر پہنچ کر فقیر اور امیر کا درجہ متساوی ہو جاتا ہے

لیکن اگر فقیر اور مالدار دونوں طبیعت اور تفکر میں متساوی ہیں تو فقیر کا درجہ بہر حال بلند ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

کچھ غربا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کے ذریعہ شکایت کی، کہ امرا اپنے حج اور صدقات کی وجہ سے اعلیٰ وارفع درجات کے مالک ہیں اور ہم یہ ثواب حاصل کرنے سے معذور ہیں۔ سرکارِ دوعالم ؐ نے جواب میں فرمایا کہ اے شخص! تو جن لوگوں کا فرستادہ ہے، اُن کو میں دوست رکھتا ہوں۔ اور فرمایا کہ اُن سے جا کر میری طرف سے کہو کہ صابر فقراء کے لیے تین درجات ایسے عطا ہوئے ہیں، جو امراء کو نہیں ملیں گے۔ پہلے یہ کہ فقراء کے لیے جنت میں ایسے مسمد ہیں، جو صرف انبیاء و رسل اور فقراء ہی کو ملیں گے۔ اُن کو اُمراء نہیں پاسکیں گے۔ دوسرے یہ کہ فقراء، امراء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے۔ تیسرے یہ کہ جب فقیر اور امیر دونوں سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَ اللہُ اَکْبَرُ پڑھیں، تو جو ثواب فقرا کو ملتا ہے، وہ امراء کو نہیں ہوتا۔ جب یہ فرمان ان تک پہنچا تو بہت خوش ہوئے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ مدارج خداوند عالم سے خلوص کے مطابق ملتے ہیں، اور خلوص اتنا ہی زیادہ آدمی ہو سکتا ہے جتنا اس کی توجہ اس طرف مبذول رہے گی، اور ظاہر ہے کہ مالدار آدمی کو اپنے مال کی طرف کچھ نہ کچھ رغبت ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہ دونوں خلوص کے مراتب میں مساوی حصے کے حقدار ہوں اور اگر مالدار کو کچھ مغالطہ پیدا ہو جائے کہ میں اپنے مال کے باوجود خلوص میں کمی نہیں کرتا، تو وہ اپنے کو جناب عائشہ رضی اللہ

عنہا کے واقعے سے منطبق کو دیکھتے کہ انھوں نے ایک لاکھ درہم مٹی کی طرح دیدے۔

ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دنیا سے پرہیز کرتے رہے۔ جب سب سے پہلے دنیا نے اپنے کو آپ کے سامنے پیش کیا، تو یہ ہی فرمایا کہ میرے سامنے سے دُور ہوجا!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ دُنیا داروں سے الگ رہو، تاکہ اُن کا سایہ بھی تم پر نہ پڑے۔ یہ حکم صرف اسی لیے تھا کہ ایک دل میں دو چیزیں بیک وقت جمع ہونا ناممکن ہیں۔ محبتِ دُنیا اور معرفتِ خدا۔

اس عالمِ اجسام میں بھی دو ہی چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ ایک ایمان اور دوسرا بے ایمانی، جو لوگ ایمان میں دل لگاتے ہیں۔ وہ اس سے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں اور جو بے ایمانی کرتے ہیں وہ مہجور ہوتے جاتے ہیں۔

حضرت ابو سلیمان کا مقولہ ہے کہ فقیر کی ایک آہ، امیر کی صد سالہ عبادات سے افضل ہوتی ہیں۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کی کہ میرے لیے اولاد اور مال کی دُعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ جب تیرے اولاد ہوجائے اور وہ روٹی طلب کرے اور تو اس وقت عاجز ہوجائے تو ایسے وقت دُعا میں مجھے یاد رکھنا۔ اس لیے کہ تیری اس وقت کی دُعا ضرور قبول ہوگی۔

آداب درویشی (غربت)

درویشی کے آداب میں خلوص اگر ہے تو "رضائے الٰہی" کا سمجھنا، اور بظاہر درویشی، درویشی میں خداوند عالم سے گلہ نہ کرنا۔ ہر فقیر کے لیے باطنی طور سے تین حالتوں کا ہونا ضروری ہے۔

پہلے یہ کہ فقر میں خوش رہے اور شاکر بہ رضائے الٰہی ہو کہ یہ نعمت ہے جو اپنے دوستوں ہی کو بخشتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آدمی کو فقر چاہے ستاتا ہو اور اس سے خوش نہ ہو، لیکن رضائے الٰہی کا جویا ہونے کی وجہ سے وہ اس سے خوش رہنے کی کوشش کرے۔ یہ بھی درجہ بلند ہے کہ وہ خدا کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔

تیسرے یہ کہ خداوند عالم کا فقر کی وجہ سے شاکی ہوجائے، یہ حرام ہے۔ اس لیے کہ آدمی کو اس کی مصلحتوں کے آگے دم نہیں مارنا چاہیے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم رہنا چاہیے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کا مقولہ ہے کہ درویشی کبھی کبھی عذاب الٰہی کے سبب بھی آتی ہے، لیکن اس وقت بھی آدمی کو صبر سے کام لینا چاہیے، اور کبھی سعادت کے باعث ہوتی ہے اس وقت اس کو شکر بجالانا چاہیے۔

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ فقر و فاقے کو پوشیدہ رکھنا۔ ایک معمورہ ہے، اور اس کے آداب یہ ہیں کہ امراء کی خوشامد اور چاپلوسی نہ کرے۔

حضرت سفیان ثوری کا مقولہ ہے کہ وہ فقیر جو امرا کے پاس بیٹھنے کی خواہش کرے، وہ دراصل ریاکار ہے اور اگر بادشاہ کی صحبت چاہے، تو چوروں کی مثل ہے۔

دوسرا آداب یہ ہے کہ کبھی کبھی حتّی المقدور صدقہ دیا کرے۔ آنحضرتؐ کا فرمان ہے کہ اس کا ایک روپیہ ایک لاکھ روپیہ کے برابر ہے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ وہ کس موقع پر؟ آپ نے فرمایا اگر آدمی کے پاس دو درہم ہوں ان میں سے ایک دے دے یہ لاکھوں درہم صدقے میں ایک مالدار کے دینے سے زیادہ باعثِ ثواب ہیں۔

کون سی بخشش قبول کرنے کے لائق ہے

جس بخشش میں کوئی شُبہ ہو، اس کو نہ لے، یا اپنی حاجت سے زیادہ ملے، تو انکار کر دے، لیکن اگر فقرا کی خدمت کر رہا ہو تو ضرور لے لے۔ اگر ظاہر لے کر پوشیدہ طور پر خرچ کر دے تو یہ صدیقوں کے مرتبے کے برابر ہے، اور اگر اس بات کی اہلیت نہیں رکھتا، تو لوگوں سے مال خود نہ لے، بلکہ دوسروں کو ہدایت کر دے تاکہ وہ خود غربا میں تقسیم کر دیں۔

صدقہ لیتے وقت، دینے والے کی نیّت پوچھ لینا ضروری ہے۔ اگر وہ صرف ہدیے کے طور پر دے رہا ہے تو اس کا قبول کرنا سنّت ہے، لیکن اگر احسان رکھے، تو نہ لے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک آدمی نے گھی، پنیر اور ایک بکرا بھیجا۔ آپ نے گھی اور پنیر لے کر، بکرا واپس کر دیا۔ معلوم ہوا کہ تھوڑا سا احسان لے لینا بھی بُرا نہیں ہے۔

حضرت سفیان ثوری کبھی کسی کا تحفہ قبول نہ کرتے اور فرماتے کہ مجھے یہ یقین ہو کہ یہ خلوص نیّت سے دے رہا ہے اور پوشیدہ رکھے گا تو ضرور لے لیتا۔

بزرگانِ دین نے احسان لینے سے حتّی الامکان صبر ہی کیا ہے۔

حضرت بشر حافی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ضرورت کو سوائے حضرت سری سقطی کے کسی دوسرے سے کبھی پورا نہیں کیا۔ کیونکہ میں آپ کے زہد سے بخوبی واقف تھا۔

اگر کوئی آدمی صرف ریاکاری کے ماتحت کچھ دینا چاہتا ہے تو ہرگز نہ لے۔ ایک بزرگ کے پاس کچھ لوگ تحفہ لے کر آئے۔ اُنھوں نے واپس کر دیا۔ لوگوں نے شکایت کی، تو فرمایا کہ میں نے اُن کا تحفہ واپس کر کے اُن پر احسان کیا ہے۔ اس لیے کہ اگر میں لے لیتا تو وہ لوگوں سے کہتے پھرتے، اور ایسی صورت میں ان کا مال بھی ضائع ہوتا اور ثواب بھی نہ ملتا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کو بغیر مانگے کچھ مل جائے، وہ خداوند عالم کی طرف سے عطا ہے۔ بعض بزرگوں کا مقولہ ہے، کہ اگر کسی شخص کا تحفہ رد کر دیا جائے، تو وہ تکلیف اُٹھائے گا۔ اس لیے کہ جب اس کو ضرورت پڑے گی اور خواہش ہوگی، تو لوگ نہ دیں گے۔

حضرت سری سقطی علیہ الرحمۃ، امام حنبل رضی اللہ عنہ کے لیے کبھی کبھی کچھ نہ کچھ ضرور بھیجا کرتے۔ وہ قبول نہ

کرتے۔ تو کہا، کہ اے امام! ردِ تحفہ کے گناہ سے پرہیز کرو۔ امام نے فرمایا کہ ایک مرتبہ پھر کہو۔ حضرت سری سقطی نے مکرّر دہرا دیا، تو امام صاحب نے فرمایا کہ اچھا۔ ایک ماہ کے خرچ کے واسطے میرے پاس روپیہ ہے۔ جب وہ خرچ ہو جائے گا تو لے لوں گا۔ فی الحال اس کو رکھ لو۔

بغیر ضرورت کسی سے سوال کرنا حرام ہے

سوال کس وقت کرنا چاہیے؟ حدیث شریف ہے کہ سوال کرنا فواحشات میں سے ہے اور بے ضرورت کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا حلال نہیں۔ اس کے علاوہ فحش ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ متعدد خرابیاں بھی ہیں

مثلاً اپنی تنگدستی کو لوگوں پر ظاہر کرنا خداوند عالم کی ناشکری اور اس کی شکایت ہے

دوسرے یہ کہ آدمی خود بھی سوال کرنے سے ذلیل ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکے سوال کرنے سے پرہیز ہی کرے

تیسرے یہ کہ سوال کرنے سے بعض لوگوں کو رنج اور تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی آدمی ظاہر داری کی وجہ سے تمہارے سوال پر دے بھی دے گا تو اس کو تکلیف ہوگی۔ لہٰذا ایسے آدمی سے اگر مانگو، تو سوال کی تخصیص نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس طرح سوال کرو کہ تمہارے سوال سے اگر وہ کترانا چاہے تو باسانی کترا سکے۔ اور اگر کسی شخص کے اوپر زکوٰۃ واجب ہے، اور تم بھی کسی دوسرے کے لیے لینا چاہتے ہو، تو بصراحت مانگ لینا چاہیے۔ اور اگر اپنے لیے بھی مانگ لو تو بھی کوئی قباحت نہیں۔ ایسے موقع پر وہ دینے والا آدمی اگر صرف ملامت یا لوگوں کی شرم کی وجہ سے دیتا ہے تو اس کی زکوٰۃ واپس کر دینا چاہیے۔ چاہے اس کو ناگواری کیوں نہ ہو؟ اس لیے کہ ایسا لینا زبردستی کے مترادف ہوگا۔

فتویٰ یہ بات صرف تم اپنے دل سے اقتباس کر سکتے ہو کہ یہ آدمی بکراہت دے رہا ہے یا بالصدق۔ اس لیے کہ علماء تو بظاہر حالات کے ماتحت ہی فتویٰ دے سکتے ہیں۔ چونکہ یہاں بادشاہوں کے ظاہری حالات پر ہی فتاوے دیے جا سکتے ہیں۔

لہٰذا اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ آدمی دینا نہیں چاہتا تھا، تو اس سے لینا حرام ہے۔ اس کے بعد بھی اگر اشد ضرورت لاحق ہو تو لے لینے میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔

لذیذ کھانوں اور نفیس غذاؤں کے لیے دستِ سوال دراز کرنا اچھا نہیں۔ سوال اس آدمی کے لیے مناسب ہے، جو خود واقعی عاجز ہو، اور ضرورت مند ہو، اور کسب مال بھی کرنے سے قاصر ہو، یا پھر طلب علم کی وجہ سے کسب کرنے سے معذور ہو۔

اگر عبادت میں مشغول رہنے کی وجہ سے مانگتا ہے، تو درست نہیں۔ اس لیے کہ کسب کرنا خود عبادت میں شامل ہے۔ لہٰذا خود کمانے کی کوشش کرے۔

اور اگر آدمی کے پاس کوئی زائد از خرچ چیز رکھی ہے۔ مثلاً کتابیں، کپڑے وغیرہ تو اس کو فروخت کر کے خرچ چلا لے۔

صرف شان و شوکت کے لیے سوال کرنا ناجائز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی خواہ مخواہ لوگوں سے مانگتا ہے اور بے ضرورت طلب کرتا ہے، وہ قیامت کے دن اس طرح میدانِ حشر میں آئے گا کہ اس کے جسم پر صرف ہڈیاں ہوں گی، گوشت کا نام نہ ہوگا۔ دوسری جگہ اور ارشاد ہو رہا ہے کہ بے ضرورت لے کر کھانا، دوزخ کی نشانیوں سے ہے۔ چاہے وہ زیادہ ہو یا کم۔

لوگوں نے سوال کیا کہ یا حضرت! کتنا مال اپنے پاس ہونا چاہیے کہ آدمی دوسروں سے نہ مانگے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک دن کا کھانا جب تک اس کے پاس ہو، سوال نہ کرے۔ ایک حدیث کی رو سے اگر آدمی کے پاس پچاس درہم چاندی کے ہوں تو سوال نہ کرے۔ یہ غالباً اس لیے حکم ہوگا کہ سال میں صرف ایک بار زکوٰۃ مل سکتی ہے، اور یہ مقدار روپیہ کی درمیان میں خرچ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ پہلے سے لے کر رکھ لے، تاکہ درمیانِ سال میں تکلیف نہ اُٹھائے۔

اور صبح شام کے متعلق ایسے شخص کے لیے حکم ہے، جو روزانہ بقدرِ ضرورت مانگ لیتا ہے اور اس کو صرف کر کے دوسرے روز پھر سوال کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کو دُنیا میں صرف تین چیزوں کا استحقاق ہے۔ کھانا[۱]، اتنا کہ وہ سیدھا کھڑا ہو سکے۔ کپڑا[۲] اتنا کہ اپنا جسم ڈھانپ کر زمانے کے سرد گرم سے محفوظ رہ سکے۔ رہنے کے[۳] لیے گھر، اور سامانِ زندگی۔ تاکہ دنیا میں رہ سکے۔ ضروریاتِ زندگی تو ہر آدمی کے نظریے کے مطابق جداگانہ ہیں۔ اُن کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے بعد اگر خاص ضرورت پیش آ جائے، تو دستِ سوال دراز کرے، ورنہ پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔

فقرا کے مدارج

غربا و فقرا، مساکین اور درویش کے مختلف درجات ہیں۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فقیر کے تین مدارج ہیں۔

پہلے وہ درویش جو نہ کسی سے خود مانگتا ہے اور اگر کوئی دیتا ہے، تو نہیں لیتا۔ ایسے درویش اعلیٰ علیین میں جگہ پاتے ہیں۔

دوسرے وہ فقرا جو خود سوال نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی دے دیتا ہے تو لے لیتے ہیں۔ ایسے فقرا مقربانِ بارگاہِ ایزدی کے ساتھ فردوس میں مکیں ہوں گے۔

تیسرے نمبر پر وہ فقیر ہیں، جو بقدرِ ضرورت مانگتے ہیں۔ ایسے فقرا اصحاب کے مراتب رکھتے ہیں۔
ایک بار ابراہیم ادہم نے شفیق سے دریافت کیا کہ تمھارے وہاں کے فقرا کی کیا عادت ہے؟ کہا کہ ملتا ہے تو کھاتے ہیں اور نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ ابراہیم ادہم نے کہا کہ بلخ کے کُتّوں کی بھی یہ ہی عادت ہے۔ شفیق نے کہا آپ کے یہاں فقرا اور صوفیا کیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر نہیں ملتا تو شکرِ خدا بجالاتے ہیں، اور ملتا ہے تو خرچ کرتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت ابوالحسن نوری کو کسی سے سوال کرتے دیکھ کر حضرت جنید سے اِنتہائی تعجّب کے ساتھ ذکر کیا۔ آپ نے اپنے پاس سے سو روپیہ ایک پیالے میں رکھ دیے اور اس کے بعد بہت سے اوپر سے ملا دیے اور فرمایا کہ اب حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لے جاؤ۔ میں اُن کے درہم تولنے اور اس کے بعد اور زیادہ ان گنت رکھنے پر متعجب بھی تھا۔ بہر حال حضرت نوری کو جاکر پیش کیے۔ اُنھوں نے فوراً ترازو منگائی اور سو درہم کے بقدر واپس کر دیے۔ باقی بے حساب لے لیے۔ کہنے لگے کہ جنید ہوشیار ہے اور چاہتا ہے کہ دونوں طرف سے ثواب کمائے۔ یہ عجیب بات دیکھ کر میں پھر حضرت جنید کے پاس آیا اور پورا قصّہ بیان کر دیا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ واللہ جتنے درہم اُن کو دینے کی نیت میں نے کی تھی۔ صرف اتنے ہی اُنھوں نے لے لیے۔ باقی واپس کر دیے۔ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن کو لوگوں کے قلوب کا حال معلوم ہو جاتا تھا لہٰذا کوشش کرو کہ اس صفت تک پہنچ سکو، اور اگر نہ پہنچ سکو، تو ان باتوں سے سبق حاصل کرو۔

زہد اور پرہیز گاری

زہد کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے پاس "برف" محفوظ رکھ لے تاکہ پانی ٹھنڈا کر کے اس سے بہ وقت ضرورت پیاس بجھا سکے۔ اور اس سے کوئی آدمی سونا دے کر وہ برف لینا چاہے، تو ظاہر ہے کہ اگر آدمی ہوشیار ہے تو سونا لے کر وہ برف دے دے گا، اور وہ سوچ لے گا کہ ایک وقت گرم پانی پر قناعت کر لوں گا۔ ورنہ یہ سونا جو دیرپا ہے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ برف بہر حال پگھلنے والی چیز ہے۔ لہٰذا وہ برف دے کر سونا لے لیتا ہے

زہد اس کا یہ عمل کہ برف کی حرص کو چھوڑ کر دیرپا چیز "سونا" لے لینا زہد کہلاتا ہے۔

عارفانِ حقیقت کے اعمال یہ ہی ہیں۔ وہ دُنیا کو فانی سمجھتے ہیں اور عاقبت کو باقی۔ دنیا ان لوگوں کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے اور آخرت کو اپنا مرکز بنا لیتے ہیں۔ بس اس کا نام "زہد" ہے۔

لیکن اُن کا زہد بھی مباح اشیاء میں ہو اور ممنوعات سے پرہیز کریں۔

شرائطِ زہد زاہد کی پہچان یہ ہے کہ وہ اُن اشیائے دنیا سے پرہیز کرے جن پر وہ قادر ہے اور اگر وہ کسی چیز پر قدرت ہی نہیں رکھتا، تو زہد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یا پھر ایسا ہے کہ اگر اس کو مال دینا پیش کیا جائے

تو وہ بدل منع کر دے۔ لہٰذا اس کو پرکھنے پر ہی پتہ چل سکتا ہے کہ وہ نفس کا مطیع ہے یا نہیں۔ اگر وہ صرف ظاہر دار ہے تو معلوم ہو جائے گا۔

دوسری پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال ہو، اس کو بغیر کسی لالچ کے خرچ کر دے اور اس کی حفاظت کی کوئی پروا نہ کرے۔ اس لیے کہ یہ آخرت کے لیے ایک قسم کی خرید و فروخت ہے۔ خداوند عالم خود فرما رہا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (یعنی خداوند عالم نے مومنین کا مال جنت کے عوض خرید لیا۔ دوسری جگہ اور ارشاد ہوتا ہے۔ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ (یعنی یہ خرید و فروخت تمہارے لیے مبارک ہو اور تم خوش رہو کہ اس کا منافع ملے گا)

جو لوگ صرف ظاہرداری کے لیے ترکِ دنیا کرتے ہیں، وہ زاہد نہیں ہیں۔ زاہد حقیقی وہ ہے جو دنیا و آخرت دونوں کی خواہشات سے مبترہ ہو۔ اس لیے کہ خواہش جنت بھی خواہش ہی ہے، اور زہد ہر قسم کی خواہشات کو روکتا ہے، وہ صرف معرفت حق کا طالب ہوتا ہے۔ اس میں چاہے اس کو تکالیف ہوں یا جو حال بھی ہو جائے وہ کسی بھی خواہش کو درندگی سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں سوائے خدا کی معرفت کے تمام چیزیں "ہیچ" ہوتی ہیں۔ یہ زہد کا بلند ترین مرتبہ ہے۔ اور وہ لوگ معارف و حقائق کے بلند ترین درجات پر فائز ہیں۔ ان لوگوں کا مالِ دنیا لے کر فقرا و مساکین کو تقسیم کرنا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہ تمام روئے زمین کا مال آپ کے قبضے میں ہونے کے باوجود آپ بے نیاز رہتے۔ یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لاکھ درہم تقسیم کر دیے، اور اپنے کو تکلیف میں رکھا۔ معلوم ہوا کہ عارفانِ حقیقی کے پاس اگر ایک درہم بھی ہو تو بھی وہ زاہد ہیں، اُن کا دل دنیا اور مالِ دنیا سے متنفر رہتا ہے۔ وہ نہ اس دنیا سے بھاگتے ہیں، نہ دلچسپی لیتے ہیں، بلکہ الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔

اور کمال یہ ہی ہے کہ الگ نہ رہے، بلکہ اسی دُنیا میں مشغول ہوتے ہوئے نفرت کرے۔ تمام خزانے اس کی نظر میں دریا کے پانی کی طرح بہہ رہے ہوں۔ لیکن اس کی نظر کبھی ان پر نہ جائے۔ وہ اس سے قطعی لاپروا ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کو اس کی پرواہ ہو گی، تو ہرگز "زاہد" کے بلند درجات پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے کہ اُن کو خواہشِ دنیا ہونے کی وجہ سے اس کو مال کی پروا ہوتی ہے۔

لہٰذا زاہد حقیقی وہ ہے، جو مال پر قابض ہونے کے باوجود اس سے بے نیاز رہے۔ ایک شخص نے شیخ مبارک کو "زاہد" کے خطاب سے یاد کیا۔ آپ نے فرمایا کہ زاہد عمر ابن عبدالعزیز ہیں۔ اس لیے کہ وہ مال پر قابض ہوتے ہوئے بے نیاز ہیں۔ میں خود فقیر آدمی ہوں، بھلا مجھ سے اور زاہد سے کیا تعلق؟

ابن ابی لیلیٰ نے ابن شبرمہ سے کہا کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو جولاہے کا بیٹا ہے اور میرے فتاویٰ پر اعتراض

کرتا ہے۔ ابن شبرمہ نے جواب دیا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس حسب نسب سے ہے، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ دنیا اس کی طرف آتی ہے، اور وہ دنیا سے بھاگتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے (کہ بعض تم لوگوں میں دنیا کے خواہاں ہیں اور بعض آخرت) میں یہ سمجھتا ہی نہ تھا کہ ہم میں کچھ لوگ دنیا کے خواہش مند بھی ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کہا کہ اگر ہم دنیا کے خواہاں ہیں تو معرفت کون سے عمل میں ہے؟ اس کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ (یعنی اگر ہم اُن کو یہ حکم دیں کہ تم خدا کی راہ میں اپنے کو قربان کردو تو ان میں چند آدمیوں کے سوا کوئی بھی عمل نہ کرے گا)۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ سونے کے بدلے میں برف (جو جلدی پگھل جانے والی چیز ہے) ضرور لے لینی چاہیے۔ لیکن عوام النّاس تین اسباب کی بنار پر اس چیز سے ناواقف ہیں۔

پہلے ان لوگوں کا ایمان کمزور ہے۔ دوسرے خواہشاتِ دنیا اُن پر غالب ہے۔ تیسرے کاہلی کی وجہ سے وہ لوگ امروز کو فردا پر ٹالتے ہیں، اور یہ سُستی و کاہلی صرف شہوت کے غلبے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ آج اپنی خواہشات کو پورا کرلوں۔ کل دستبردار ہو جاؤں گا، اور اسی طرح زندگی کو ختم کردیتا ہے۔

زہد

دنیا سے محبت کرنے میں جو بُرائیاں پہلے بیان کی گئی ہیں، وہ سب "زہد" کہلاتی ہیں۔ یعنی دُنیا سے نفرت کرنے والا آدمی زاہد ہوتا ہے۔

دوستی دنیا سے اِنسان ہلاکت کی طرف جاتا ہے اور نفرت کرنے والا جنّتی ہے۔ زہد کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے "زاہد" کو اہل علم میں مشہور گردانا ہے۔

قارون جب اپنے گھوڑے پر آراستہ ہوکر باہر آیا، تو لوگوں نے کہا کاش! ہم بھی ایسے ہی ہوتے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے، جو علم معرفت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ آخرت کا ثواب اس تمام ظاہری سازوسامان سے بہتر ہے۔

سرکارِ رسالتؐ کا فرمان ہے کہ اگر خدا کی دوستی مدِّنظر ہے تو "زاہد" بن!

حضرت حارثہؓ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں مومن حقیقی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ مومنیت کی تجھ میں کونسی علامت ہے؟ عرض کی کہ دنیا میں سونا اور پتھر سب میری نگاہوں میں یکساں ہیں، اور میں دوزخ و جنّت یہیں دیکھا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے۔ اس کی حفاظت کرتے رہو۔ پھر فرمایا (ترجمہ آیۂ کلام اللہ) کہ یہ حقیقی بندہ ہے۔ خداوند عالم نے اس کے دل کو نور عنایت فرمایا۔ اس کے بعد جب یہ آیت نازل

ہوئی فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ الآیہ تفسیر: آنحضرتؐ نے اس کی تفسیر یوں فرمائی ہے کہ دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے اور اس سے وہ روشنی حاصل کرتا رہتا ہے، اور اس کی پہچان یہ ہے کہ دل اس دنیا سے اچاٹ ہو کر آخرت سے دلچسپی لیتا ہے اور موت کو یاد کر کے یہاں سے سامانِ سفر مہیا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ خداوند عالم سے شرم کرو، جیسا کہ اس کا حق ہے صحابہ نے متعجب ہو کر دریافت کیا کہ کیا ہم شرم کرتے؟ فرمایا اگر شرم کرتے، تو اتنا مال کیوں جمع کرتے؟ جس کو صرف کرنے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ اور ایسی جگہ گھر بناتے ہو۔ جہاں رہنے کی نوبت نہ آئے۔

ایک دن خطبے میں ارشاد ہوا۔ کہ جو آدمی خلوص دل اور بغیر کسی آلودگی کے لاالٰہ الاّ اللہ زبان پہ لائے وہ جنّتی ہے۔

حضرت علیؑ نے دریافت کیا کہ آلودگی کیا ہو سکتی ہے۔ فرمایا کہ دنیا کی دوستی اور اس کی تلاش بہت سے آدمی دل سے دنیا دار ہیں اور زبان سے لاالٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر اونٹوں کے گلے کی طرف ہوا۔ وہ اونٹ نہایت خوبصورت توانا اور تندرست تھے۔ آپ نے ان کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا، تو فرمایا کہ مجھے ان کو دیکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

کچھ لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے اُن کے رہنے کے مکان بنانے کی خواہش کی۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی محبّت میں پھنس کر عبادتِ الٰہی ناممکن ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر تو خداوند عالم کی طرف جانا چاہتا ہے تو دُنیا سے محفوظ رہ اور دُنیا سے دوستی چاہتا ہے، تو دنیا والوں کے مال کی طرف متوجّہ نہ ہو۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد صاحب سے عرض کی کہ آپ مالِ غنیمت میں سے اچھے کپڑے اور اچھا لباس استعمال کیا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بیٹی! اپنے شوہر کے متعلّق اس کی بیوی سے زیادہ کوئی رازدار نہیں ہوتا۔ ذرا بتاؤ کہ آنحضرتؐ کے اہل وعیال کس طرح کھاتے پیتے ہیں؟ اور تم کو معلوم ہے کہ اگر صبح کو کھاتے تو رات کو بھوکے رہتے۔ اور رات کو کھاتے تو دن میں بھُوکے رہتے اور اے حفصہ! تم کو تو معلوم ہے کہ جنگ، کے بعد کئی سال تک آپ نے خرمے بھی سیر ہو کر نہ کھائے۔ اور اے حفصہ! تم کو تو معلوم ہے کہ ایک آنحضرتؐ کے سامنے طعام کا خوان رکھا گیا، اور آپ نے کوئی اعتنا نہ کی۔ یہاں تک کہ اس کو اُٹھا لیا گیا، اور تم کو معلوم ہوگا کہ رات کو آنحضرتؐ اپنی کملی کی دو تہیں کر لیا کرتے۔ ایک دن چوہرا کر کے

بچھایا تو صبح کو فرمایا کہ اس کی نرمی کی وجہ سے آرام ملا، اور نماز شب ادا نہ ہو سکی، اور اس کے بعد تم نے ہمیشہ دوہرا کر کے ہی بچھایا اور اے حفصہ! تم کو معلوم ہے کہ آنحضرتؐ کے پاس صرف ایک ہی کپڑا استعمال میں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ بلال سے اذان کہلایا کرتے۔ اور آپ کے کپڑے دُھلے ہوئے سوکھنے میں دیر ہوتی تو مسجد میں تشریف نہ لا سکتے، اور تم کو معلوم ہے کہ قبیلۂ بنی ظفر کی ایک عورت سرکار رسالتؐ کے لیے تہبند اور چادر بنا کر لائی تھی۔ اس نے ایک بار ذرا جلدی بھیج دیا، تو اس کو پیٹھ پر ڈال کر باہر تشریف لائے۔ حالانکہ آپ کے تہبند میں آگے کی طرف ایک گرہ لگی ہوئی تھی۔ حضرت حفصہ نے جواب دیا کہ اے پدر بزرگوار! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ پھر دونوں باپ اور بیٹی اتنا روئے کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو کہا کہ میرے دونوں محب اس دنیا سے گزر گئے۔ اب مجھے انھیں کے اصول پر کاربند رہنا ہے۔ ورنہ اُن تک نہ پہنچ سکوں گا۔

کسی صحابی نے دوسرے سے کہا (جو اُن سے پہلے طبقے میں تھے) کہ اگرچہ تم عبادات زیادہ کرتے ہو، لیکن اُن لوگوں کے مراتب زیادہ تھے۔ جو تم سے پہلے گزر گئے۔ وہ تم سے زیادہ زاہد تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ زہد دنیا میں دل اور جسم دونوں کے لیے وجہ آرام ہے۔

حضرت مسعود رضی اللہ عنہ، کا مقولہ ہے کہ دنیا کے زاہد کی نماز مجتہدین کی عمر بھر کی نمازوں سے افضل ہے۔

حضرت سہل تستری کا قول ہے کہ اگر تم چار چیزوں (بھوک۔ عریانی۔ ذلت اور فقر) سے مقابلہ کر لو، تو تمھارے اعمال خلوص کے ماتحت ہو سکتے ہیں۔

مدارجِ زہد

زہد کے درجات زہد کے تین درجے ہیں۔

پہلا یہ کہ آدمی دُنیا سے دستبردار ہو جائے۔ لیکن دل دُنیا میں لگا رہے اور وہ نفس اور دل سے جنگ کرتا رہے۔ ایسے آدمی کو "متزہّد" کہتے ہیں۔ زہد کا منزل یہ ہی ہے۔

دوسرا درجہ زہد یہ ہے کہ آدمی کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو، لیکن وہ زہد کی وجہ سے اپنے کو بڑا آدمی سمجھنے لگے۔ اگرچہ وہ زاہد ضرور ہے، لیکن بلند مرتبے کا مالک نہیں۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنے زہد کے متعلق خیال بھی نہ گزرے کہ میں زاہد ہوں۔ یہ درجہ کمال ہے۔ ایسا شخص اس آدمی کی طرح ہے کہ آدمی بادشاہ کی وزارت کے لیے دربار میں جائے اور وہاں دربان میں کتا بیٹھا ہو۔ اور اس کو اندر جانے سے روکے، اور اس کو ایک روٹی کا ٹکڑا ڈال کر اندر داخل ہو جائے، اور عہدۂ وزارت پر فائز ہو جائے، تو اس وقت اس روٹی کے ٹکڑے کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح زاہد آدمی دُنیا کو قطعی

ناچیز سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کی نگاہوں میں دنیا قطعی ناچیز ہوتی ہے۔

ایک بار لوگوں نے حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ فلاں آدمی زہد کی باتیں کرتا ہے۔ تو آپ نے وجہ زہد دریافت کی۔ اُن لوگوں نے کہا کہ دنیا میں زہد کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا بھی بھلا زہد کرنے کے لائق ہے۔ ایسی چیز زہد کے لائق ہی نہیں ہوتی۔

انسان کی ذات سے متعلق بھی زہد کے تین مدارج ہیں۔

پہلے زہد خائفین کا ہوتا ہے۔ جو لوگ عذاب آخرت کے ڈر سے زہد اختیار کرتے ہیں۔ وہ اِس درجے کے مالک ہیں۔

دوسرا درجہ مکمل زہد کا ہے، کہ آدمی آخرت کے ثواب کے لیے زہد اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ یہ زہد رجا کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی کو نہ دوزخ کا خوف ہو، اور نہ جنت کی تمنا اور خوشی، بلکہ وہ صرف خدا پر نظر رکھے۔ اس کی محبت میں فنا ہو جائے اور دُنیا کی ہر چیز سے متنفر ہو۔ یہ درجہ کمال کا زہد ہے۔

ایک مرتبہ جناب رابعہ سے لوگوں نے جنت کی تعریف کی تو فرمایا کہ وہ خدا سے زیادہ تو برتر نہیں ہے۔

خداوند عالم سے محبت رکھنے والوں کو جنت کی محبت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے بادشاہ کی محبت کے مقابلے میں بچے کھلونوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ بچہ ناقص العقل ہوتا ہے، اور اس کو بادشاہ کی صحیح وقعت نہیں ہوتی۔ اسی طرح کم عقل دنیا والے خدا کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے دُنیا داری میں پڑے رہتے ہیں۔

جن چیزوں کو ترک کر کے زہد اختیار کیا جاتا ہے اس کے بھی مختلف مدارج ہیں۔

بعض لوگ تو کار ہائے دنیا میں سے کچھ کو ترک کر دیتے ہیں اور کچھ کرتے رہتے ہیں، اور بعض لوگ صرف نفس کو ختم کر کے ضروریات دین پر ہی اکتفا کریں۔ یہ درجہ کاملین کا ہے۔ دراصل لوگوں کی صحبت درس و تدریس اور نصائح کرنے سے اگر نفس کو لذت حاصل ہوتی ہے، تو وہ زہد کے خلاف ہے۔

حضرت ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ میں نے زہد کے متعلق بہت سے اقوال سُنے، لیکن اصل زہد یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے دُور رکھنے کا سبب ہوں، اُن کو ترک کر دیا جائے۔ اسی طرح نکاح اور سفر کرنے، نیز حدیث نویسی میں مشغول رہنا بھی دنیا داری میں شامل ہے۔

آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ خداوند عالم نے قلب سلیم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ، اس میں قلب سلیم سے کیا مراد ہے۔ حضرت ابو سلیمان نے جواب دیا۔ وہ قلوب جن میں سوائے خداوند عالم کے کسی چیز کی گنجائش نہ ہو۔

حضرت ابن زکریا علیہ السلام ٹاٹ پہنا کرتے تھے۔ کیونکہ کپڑے کی نرمی کی وجہ سے نفس کو آرام ملتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے جسم میں زخم ہو گئے۔ آپ کی مادر گرامی نے فرمایا کہ نرم کپڑا پہن لو۔ آپ نے پہن لیا۔ چنانچہ وحی نازل ہوئی کہ اے یحییٰ تم نے ہم کو چھوڑ کر دنیا اختیار کر لی۔ آپ نے توبہ کی اور پھر ٹاٹ پہن لیا۔ یہ زہد کا بلند ترین مرتبہ ہے۔

زہد میں جتنا آدمی لذات کو ترک کرتا رہے گا، اتنا ہی اس کا مرتبہ بلند ہوتا رہے گا۔ جس طرح سے گناہ کر کے توبہ کرنا اچھا ہے۔ اسی طرح زہد میں بعض چیزیں فقط نفس کے لیے درست ہیں، لیکن اس کے مراتب میں ضرور کمی ہو جائے گی۔

زاہد کو دنیا میں کن چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا ضروری ہے

یوں تو دنیا کی وسعتیں لا انتہا پھیلی ہوئی ہیں اور بندگانِ خدا دوزخ کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن دنیا میں چھ چیزیں بہت ضروری ہیں۔ کھانا پینا۔ گھر۔ گھر گرہستی کا سامان۔ بیوی۔ جاہ و مرتبہ۔

پہلی چیز کھانا ہے۔ انسان کے لیے غذائیں ہزاروں قسم کی ہیں۔ لیکن آدمی کا پیٹ بھرنے والی سب سے کمتر چیز بھوسی ہے۔ اس کے بعد جَو اور باجرہ اور موٹے اناج ہیں۔ اور سب سے اعلیٰ روٹی چھنے ہوئے گیہوں کے آٹے کی ہے۔ اگر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھاتا ہے تو زہد نہیں ہو سکتا۔ وہ تن پروری کی نشانی ہے۔

شریعت نے ہر آدمی کے لیے غذا کی مقدار مقرر کر دی ہے۔ اس سے زیادہ تجاوز کرنا زہد کو ختم کر دیتا ہے۔ کھانے کو دوسرے وقت کے لیے رکھ چھوڑنا بھی اچھا ہے۔ اس میں بہتر یہ ہے کہ آدمی ایک وقت کے کھانے سے زیادہ محفوظ نہ کرے، اور اس میں سے قطعی نہ رکھنا زہد کی اعلیٰ شان ہوتی ہے اور حرص کی وجہ سے زیادہ کھانا دوسرے وقتوں کے لیے رکھ دینا حرص و طمع میں داخل ہے۔

اوسط درجہ یہ ہے کہ آدمی سوا ماہ تک کی غذا محفوظ کر سکتا ہے۔ اور سب سے کمتر درجہ یہ ہے کہ ایک سال کی غذا جمع کر لے، اور اس کے بعد حرص کا درجہ آ جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال کے لیے ایک سال تک کی غذا رکھا کرتے۔ لیکن اپنے لیے ایک رات کا کھانا بھی نہ رکھتے۔

کھانے میں سب سے کمتر درجہ سرکہ اور ساگ کا ہے، اور اعلیٰ درجات میں گوشت آتا ہے۔ اگر آدمی روزانہ گوشت کھائے تو زہد کے خلاف ہے، اور اگر ہفتے میں دو بار کھائے تو اوسط کا درجہ ہے۔

اسی طرح دن میں ایک بار غذا استعمال کرے، اور اگر دو دن میں ایک بار کھائے گا، تو یہ مکمل زہد ہوگا۔

اگر آدمی زہد کے متعلق سب کچھ سمجھنا چاہے تو سیرت صحابہ پر غور کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی کبھی تو متواتر چالیس دن تک گھر میں چراغ تک نہ جلتا اور صرف خرما پر ہی بسر ہوتی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ اگر آدمی جنت میں جانا چاہتا ہے تو جَو کی روٹی پر بسر کرے، اور کتوں کے ساتھ اس کی جگہ پر سوئے۔ آپ نے اپنی امت سے ساگ کے متعلق فرمایا کہ تم لوگ چوں کہ خشک روٹی پر بسر نہ کر سکو گے۔ لہٰذا ساگ روٹی کھایا کرو۔

زاہد کے لیے لباس شرعی دوسری استعمال کرنے والی چیزوں میں لباس ہے۔ زاہد کی شان یہ ہے کہ اس کے پاس دوسرا کپڑا بدلنے کے لیے نہ ہو، حتیٰ کہ اگر کپڑے دھونے کے لیے اتارے ہوں ننگا ہونا پڑے۔

جنس لباس میں ادنیٰ ترین ٹاٹ ہے۔ اکثر زاہدین ایک کرتا، ایک ٹوپی اور معمولی جوتا پہنتے ہیں۔ بعض کے پاس ایک پگڑی اور ایک چادر بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا نرم رُوئی دار کپڑا پہننا زہد کی نشانی نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد صرف ایک تہبند اور ایک کملی تھی۔ حدیث میں ہے کہ آدمی جب تک باعث شہرت وغیرت لباس پہنے رہتا ہے۔ خداوند عالم اس سے ناخوش رہتا ہے۔ آنحضرتؐ کے کپڑے کبھی کبھی انتہا سے زیادہ میلے ہو جاتے، اور لوگ پہچان نہ سکتے۔

ایک بار آنحضرتؐ منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپ کی نظر اپنی مہر والی انگوٹھی پر پڑ گئی۔ آپؐ نے اُس کو اتار لیا۔ ایک بار آنحضرتؐ کے لیے نئی نعلین آئیں۔ آپؐ نے دیکھ کر سجدہ کیا، اور پہن کر باہر تشریف لائے۔ اور فقیر کو دے دیں۔ فرمایا کہ مجھے یہ پسند آ گئی تھیں۔ میں نے اسی لیے سجدہ بھی کیا، کہ خداوند عالم مجھے اپنا دشمن نہ سمجھ لے۔ آپ نے ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر قیامت کے دن مجھ سے ملنا چاہو تو دنیا میں پرہیزگاری اختیار کرو، اور کپڑا اس وقت تک نہ اتارو جب تک اس میں پیوند نہ لگ جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کپڑوں میں ایک بار چودہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں تین درہم کا پیراہن لیا، اور اس کی آستینیں خود پھاڑ دیں۔ اور فرمایا کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ پیراہن مجھے عنایت فرمایا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے کپڑے اور جوتا دونوں ایک درہم اور چار دانگ ایک شخص نے قیمت لگائی تھی۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی اچھے لباس کی مقدرت رکھتے ہوئے نہ پہنے، خداوند عالم سے ہر چیز کا مستحق ہو جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے کہ خداوندِ عالم نے ائمہ سے وعدہ لیا ہے کہ وہ ادنیٰ لباس استعمال کریں تاکہ اُمرا اُن کی تقلید کریں اور غربا کا دل نہ ٹوٹے۔

فضالہ بن عبید اللہ حاکمِ مصر تھے۔ وہ بہت چھوٹا موٹا لباس پہنا کرتے۔ عوام نے عرض کی کہ آپ حاکمِ وقت ہیں۔ اچھا لباس پہنا کیجئے۔ فرمایا کہ ہمارے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہی تعلیم دی ہے۔

محمد بن واسع صوف کے کپڑے پہنے ہوئے قتیبہ بن مسلم کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کپڑے کیوں پہنے ہیں۔ محمد بن واسع نے کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے پھر دریافت کیا تو کہنے لگے کہ کیا بتاؤں۔ اگر یہ کہتا ہوں کہ غربت کی بنا پر ایسا کیا ہے تو خدا کی ناشکری ہوتی ہے اور اگر زہد کا سبب بتاتا ہوں تو اپنی تعریف ہے۔

حضرت سلمان سے لوگوں نے اچھا لباس نہ پہننے کی وجہ دریافت کی، تو کہا کہ ایک بندے (غلام) کو اچھے لباس سے کیا کام۔

خلیفہ ابن عبدالعزیز رات کو ٹاٹ کے کپڑے پہنتے اور دن کو دوسرے۔ تاکہ لوگ نہ دیکھیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرقد سنجی سے کہا کہ تم کمل جیسے کپڑے پہنتے ہو۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ کمل پوش صرف ظاہر داری کے لیے ایسے کپڑے پہنتے ہیں اور دوزخ میں جلتے ہیں۔

زاہد کے لیے مکان کی ضرورت تیسری منزل آدمی کا گھر ہے۔ اس کا کمترین درجہ تو یہ ہے کہ آدمی کسی جنگل یا مسافر خانے یا مسجد کے گوشے میں زندگی گزار دے۔ اعلیٰ درجہ یہ ہوگا کہ ایک کوٹھڑی کرائے پر رکھ لے، وہ بھی بقدرِ ضرورت ہو۔ اگر چھ گز سے زیادہ عریض وطویل ہوگی تو درجہ زہد سے گر جائے گا۔ مکان کا مقصد صرف یہ ہے کہ آدمی سرد گرم موسم سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے دنیاداری لوگوں نے مکانات کے سلسلے میں کی کہ مکانات اچھے بنوائے اور کپڑوں میں زیادہ سلوٹیں کرانے لگے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایک بلند عمارت بنوائی لیکن آنحضرتؐ نے اس کو منہدم کرا دیا۔ ایک بار آنحضرتؐ نے ایک بلند مکان دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ کس کا ہے۔ لوگوں نے بتایا۔ چنانچہ جب وہ شخص حاضر دربار ہوا، تو اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ لوگوں نے وجہ ناراضگی اس کو بتائی۔ اس نے وہ مکان جاکر فوراً گروا دیا۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لیے دعائے خیر فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم جس کی ویرانی چاہتا ہے اس کا پیسہ مٹی اور پانی کے ذریعے خراب ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، کا مقولہ ہے کہ آنحضرت ایک دن تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے عرض کی گھر خراب ہو گیا ہے اس کی درستی کر رہا ہوں، فرمایا موت سے زیادہ قریب ہے۔

حدیث ہے کہ جو آدمی ضرورت سے زیادہ مکان بنوائے گا۔ قیامت کے دن وہ ہی مکان اس کے سر پر رکھا جائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک جھونپڑا ناریل کے پھوس کا بنا لیا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ پختہ مکان بنوا لیجیے۔ فرمایا کہ جس کو زیادہ جینا ہو، وہ یہ سب انتظامات کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے راستے میں ایک بلند عمارت دیکھ کر فرمایا کہ میں اب تک لاعلم تھا کہ اس امّت میں بھی لوگ ہامان کی طرح مکانات بنوائیں گے۔ (فرعون نے سب سے پہلے پختہ اینٹوں کی بنیاد ڈالی)
حدیث میں ہے کہ جو آدمی چھ گز سے زیادہ اونچی عمارت بنواتا ہے۔ فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ اے بدبخت! تجھ کو زمین کے اندر جاتا ہے، تو بھلا آسمان کی بلندیوں پر کیوں چڑھ رہا ہے۔
حضرت فضیل علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات پر تعجب نہیں کہ آدمی گھر بناتا ہے، بلکہ اس پر تعجب ہے کہ لوگوں کے مکانات سے عبرت حاصل نہیں کرتا۔

اساس البیت

اساس البیت ایک زاہد کے یہاں کتنا ہونا چاہیے؟

چوتھے گھر گرہستی کا سامان۔ اس مسئلے میں حضرت عیسیٰ کی مثال اعلیٰ ترین مرتبہ رکھتی ہے۔ آپ کے پاس صرف ایک کنگھا اور ایک پیالے کے علاوہ کچھ نہ تھا، لیکن ایک شخص کو جب ہاتھوں سے کنگھا کرتے دیکھا تو اس کو پھینک دیا، اور جب چلّو میں پانی پیتے دیکھا تو پیالہ بھی توڑ دیا۔
متوسط یہ مٹی اور لکڑی کا سامان ہے۔ اگر تانبا اور پیتل کے برتن رکھے گا، تو درجہ زہد سے گر جائے گا۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر بوریے کے نشانات دیکھ کر گریہ کرنے لگے۔ آپ نے وجہ دریافت کی۔ عرض کی، قیصر وکسریٰ جو خدا کے دشمن تھے، وہ تو عیش وآرام سے زندگی گزاریں اور آپ تکالیف برداشت کریں۔ آپؐ نے فرمایا وہ دُنیا میں آرام اُٹھا گئے، ہم آخرت میں اُٹھائیں گے۔
ایک شخص حضرت ابوذرؓ کے یہاں گیا۔ اس نے تمام گھر خالی دیکھ کر کہا کہ آپ کے یہاں تو کچھ نہیں، کم ازکم سامان ضروری تو فراہم کر لیجئے۔ فرمایا کہ میں جو کچھ جمع کرتا ہوں، آخرت کے لیے ہوتا ہے۔
حضرت عمیر بن احمد ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے دریافت کیا کہ مال دُنیا سے تمہارے پاس کیا کیا ہے۔ عرض کی ایک عصا، ایک انبال، ایک پیالہ، ایک لوٹا (بس یہی چیزیں آدمی کی ضروریات کے لیے کافی ہیں باقی سب غیر ضروری ہیں)۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پردہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ عائشہ! یہ پردہ دیکھ کر مجھے دُنیا یاد آتی ہے۔ اسے فلاں آدمی کو دے دو۔
ایک بار آپؐ کے نیچے ایک نرم کپڑا بچھا دیا۔ آپ رات بھر بے چین رہے۔ دوسرے دن فرمایا کہ تمہارے اس گدّے نے میری نیند اچاٹ کر دی تھی۔ حضرت صدیقہ نے پھر وہی دوہری کملی بچھا دی۔ ایک بار کچھ مال غنیمت آیا، تو آپؐ نے تقسیم کر دیا۔ صرف چھ دینار باقی رہ گئے، آپ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ حتّٰی کہ وہ بھی کسی کو عنایت

فرمائے، اس کے بعد چین کی نیند سوئے۔

نکاح کے متعلق | پانچویں نکاح۔ حضرت سہل تستری اور علماء کا ایک گروہ اس طرف ہے کہ نکاح میں بھی زہد جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کو زیادہ چاہتے تھے۔ اگرچہ آپ عالم و عالمیان کے سردار تھے۔ اور آپؐ کی نو بیویاں تھیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چار عقد کئے اور دس بارہ حرم آپ کے پاس تھیں۔ یہ اس لیے آپ نے کیا کہ لوگ نکاح سے پرہیز نہ کریں اور زہد میں نکاحوں کی زیادتی سے کمی نہیں آتی۔ نکاح میں بقاءِ نسل کے علاوہ اور بھی فوائد ہیں۔ لہٰذا نکاح نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی کھانے پینے جیسی لازمی چیزوں کو ترک کر دے۔ اور صرف لذّت کا بہانہ کرے۔

ظاہر ہے کہ نہ کھانے سے آدمی ہلاک ہو جائے گا۔ اور اس کی نسل قطع ہو جائے گی۔ لیکن اگر نکاح سے خدا کی اطاعت میں فرق پڑ جائے، تو نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

زاہد کے لیے ضروری ہے کہ اگر اس کو نفسانی خواہشات زیادہ ہوں تو حسین عورت سے شادی نہ کرے۔ امام حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا عقد لوگوں نے ایک خوبصورت عورت سے طے کر دیا۔ اور یہ بھی کہا کہ اسی عورت کی ایک بہن ہے وہ اس سے زیادہ عقلمند ہے، لیکن خوبصورت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی کو ترجیح دی۔

حضرت جنید فرماتے ہیں کہ میں ابتدائی منزل میں مرید کے لیے تین چیزوں کو بُرا سمجھتا ہوں۔ کسبِ معاش۔ نکاح اور حدیث لکھنا۔ ایک روایت کے مطابق آپ صُوفیوں کی تعلیم کے بھی قائل نہ تھے۔ اس لیے کہ اس سے آدمی کا دل بٹتا ہے۔

جاہ و حشم کے لیے زہد میں درجات | چھٹی مُہم جاہ و مرتبہ ہے۔ اس کے متعلق ہم رکن مہلکات میں لکھ چکے ہیں کہ یہ آدمی کے لیے زہر ہیں۔ لیکن اگر راہ آخرت کے لیے مدد درکار ہو، تو بقدرِ ضرورت ہونا ضروری ہے۔

ایک بار حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے کسی شخص سے کچھ قرض مانگا، وحی نازل ہوئی اے میرے خلیل! تو نے مجھ سے کیوں نہیں مانگا۔ عرض کی کہ مجھے خوف ہوا کہ جس دُنیا کی دوستی تو اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ ہی تجھ سے مانگوں۔ ندا آئی اے خلیل! ضروریاتِ زندگی تعیش دُنیا میں داخل نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ آدمی بقدرِ ضرورت مال حاصل کر سکتا ہے اور وہ جاہ و مرتبے کی خواہش سے الگ رہتا ہے۔ آدمی جب اس دنیا سے جائے گا تو اس کا سر نیچے اور مُنہ پیچھے کر دیا جائے گا۔ یعنی وہ دنیا کو لوٹ لوٹ کر نہ دیکھ سکے۔

جو لوگ دُنیا کو صرف بیتُ الخلاء کی طرح ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں، وہ مرنے کے بعد کبھی بھی

اس طرف متوجہ نہیں ہوتے ۔ دنیا دار آدمی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی کسی جگہ سے نہ جانا چاہے اور اپنے سر کے بال کسی چیز سے باندھ دے ۔ یہاں تک کہ اس کو لوگ کھینچ کر لے جائیں اور اس کے بال اکھڑ جائیں اور بالوں کے اُکھڑنے سے جو زخم آئیں گے وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گے ۔

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے کچھ لوگوں سے کہا کہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مصائب میں اتنا خوش ہوتا ہے جتنا لوگ نعمتوں سے نہیں ہوتے ۔ اور وہ تم کو دیکھ لیں تو شیطان سمجھیں ۔ وہ لوگ دنیا سے متنفر رہے ہیں ، تاکہ موت کے وقت دُنیا کا خیال ہی نہ ہو ۔ اور اگر تم لوگ اُن کو دیکھو گے ، تو دیوانہ سمجھو گے ۔

واللہ اعلم بالصواب

پانچواں اصُول

(باب النیات)

نیات ۔صدق ۔اخلاص

معارفانِ حقیقی سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز فانی ہے ۔سوائے عبادت گزاروں کے ، اور عابدین بھی فانی ہیں ۔سوائے علماء اور علما بھی ہلاک ہو جائیں گے ، لیکن مخلصین رہیں گے ۔ یہاں تک کہ مخلصین کے لیے بھی بڑے خطرات ہیں ۔لہٰذا ہر چیز خلوص نیت پر مبنی ہے ۔ لہٰذا نیت کا سمجھنا ضروری ہے ۔ہم نے اس اصول کے تین باب کر دیے ہیں ۔ باب النیت ۔ باب الخلوص ۔ باب الصدق ۔

اوّل نیت کے متعلق سب کچھ سمجھاتے ہیں ۔

باب اوّل

نیت

دنیا میں ہر کام نیت پر موقوف ہوتا ہے اور خداوند عالم بھی اپنی عبادات میں بندوں کی نیت کو دیکھتا ہے ۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ نیت کو دیکھتا ہے ۔آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ ہر عبادت کا ثواب نیت کے مطابق ہوگا ۔

جو آدمی حج کے لیے سفر کرتا ہے اس کو وہ ہی ثواب ملتا ہے ، اور جو آدمی عورت یا مال کے لیے سفر کرتا ہے اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا ۔حدیث میں ہے کہ میری امت کے بہت سے آدمی بستر اور تکیوں پر سر رکھ کر مرتے ہیں اور وہ شہید ہوتے ہیں ۔اور بہت سے آدمی صفِ جنگاہ میں مرتے ہیں ، لیکن شہید نہیں ہوتے ۔

آدمی دن میں سینکڑوں ایسے کام کرتا ہے کہ اس کو فرشتے نیک سمجھتے ہیں، لیکن خداوندِ عالم اس کی نیکیوں سے نکلوا دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ کام اس نے فی سبیل اللہ نہیں کیے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ دنیا میں چار قسم کے لوگ آباد ہیں۔

پہلے وہ لوگ جو مال دار ہیں اور مال کو اپنی معرفت اور علم کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں، جن کے پاس مال نہیں ہے، لیکن اُن کی نیت یہ ہی ہے، یہ لوگ بھی اُسی مرتبے کے ہیں۔

تیسرے وہ لوگ جو مال کو بے جا طور پر خرچ کرتے ہیں۔

چوتھے وہ گروہ جن کے پاس مال اگر ہوتا، تو وہ بھی اسی طرح بے جا طور پر خرچ کرتے اور آخر اللہ کر دونوں قسم کے لوگ گنہگار ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ جنگ تبوک کے دن جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، تو فرمایا کہ مدینے میں بہت سے لوگ ہیں، جو ہماری طرح سفر اور بھوک کی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ ہم نے دریافت کیا کہ وہ کیسے لوگ ہیں؟ فرمایا، کہ اُن لوگوں کی نیت آنے کی تھی لیکن وہ مجبوراً نہ آسکے۔

قحط کا زمانہ تھا، بنی اسرائیل کا ایک آدمی ریت کے ٹیلے پر سے گزرتے ہوئے سوچنے لگا۔ کاش کہ اتنا انبار میرے پاس گیہوں کا ہوتا اور میں ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیتا۔ رسول وقت پر وحی نازل ہوئی، کہ اس شخص سے کہہ دو کہ اس کا صدقہ بارگاہِ ربُّ العزت میں مقبول ہو گیا۔

حدیث میں ہے کہ جو آدمی دنیاوی محبت اور نیت رکھتا ہے وہ ہمیشہ فقر و افلاس میں بسر کرتا ہے اور جس کی نیت میں آخرت اور خلوص ہو گا، وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتا ہے۔ بارگاہِ رسالتؐ سے ارشاد ہوا کہ جب جنگ میں مسلمان لڑتے ہیں، تو فرشتے ان کے نام لکھتے جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ اُن کی نیت بھی لکھی جاتی ہے

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی نکاح میں مہر کی اُدائیگی کی نیت نہیں کرتا، وہ زنا کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور اگر قرض اس نیت سے لیا جاتا ہے کہ ادا نہ کیا جائے، تو وہ چوری کرتا ہے۔

علماء کا مقولہ ہے کہ اوّل اعمال میں خلوص نیت سیکھو۔ اس کے بعد کام کرو۔ ایک شخص نے عمل خیر سیکھنے کا طریقہ دریافت کیا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ اگر عملی طور سے نہیں کر سکتا تو نیک نیتی سے کام لے، وہ ہی ثواب ملے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے کہ میدانِ حشر میں ہر آدمی کی نیت پر فیصلہ کیا جائے گا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ بہشت صرف ظاہری اعمال سے نہیں ملے گی، بلکہ نیات کے اوپر دارو مدار رہے گا۔ اس لیے کہ نیت کے لیے وقت معین نہیں ہوگا۔

نیت کی حقیقت

آدمی بغیر مندرجہ ذیل تین حاجات کے کوئی عملی کام نہیں کرتا۔

پہلے علم، جو عقل سے متعلق ہے۔

دوسرے ارادت، جس کا تعلق عشق اور خواہش سے ہے۔

تیسرے قدرت، جو طاقت اور قدرت سے متعلق ہے۔

مثلاً آدمی جب تک کھانے کو جانتا نہیں، خواہش نہیں ہوتی، اور وہ دیکھتا ہے تو خواہش پیدا ہوتی ہے اور خواہش ہونے کے بعد اگر اس کے ہاتھوں میں رکھنے کی طاقت نہیں ہے، تو بھی نہیں کھا سکتا، کیونکہ اس میں قدرت نہیں ہوتی کہ کھا سکے۔

معلوم ہوا کہ بغیر ان تین خواہشات کے آدمی کوئی عملی اقدام نہیں کرتا۔

انسانی خواہشات اور اس کے عملی اقدامات قدرت کے تابع ہیں، اور قدرت ارادے کی مطیع ہے۔ کیونکہ ارادہ ہی انسان کو طاقت پہنچاتا ہے۔ اور وہ طاقت جو ارادے کو استوار کرتی ہے۔ اس کو علم کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ آدمی کو ہزاروں چیزوں کا علم ہوتا ہے، لیکن اس کی خواہش ہر چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا علم کے مطابق ارادہ اور خواہشات ناممکن ہیں —— لہٰذا ان تین صورتوں "ارادے" کا دوسرا نام "نیت" ہوا۔

نیت کا تعلق، علم اور قدرت و طاقت سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ ارادہ آدمی کو کسی کام کی طرف عملی طور سے کرنے پر تیار کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو نیت اور مقصد کہتے ہیں۔ لہٰذا ارادہ نیت اور مقصد تینوں الفاظ ایک ہی مقصد میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

البتہ غرض و غایت جو آدمی کو ارادے پر مستعد کرتی ہے۔ وہ کبھی تو ایک اور کبھی دو ور دو سے زیادہ بھی ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک ہی غرض ہے تو اس کو خالص کہیں گے۔

مثلاً ایک شخص شیر کے سامنے سے بھاگ جاتا ہے، تو اس کی غرض صرف اپنی جان بچانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جائے، تو یہ محض اس کی عزت کرنا مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ لہٰذا اس کی غرض بھی خالص ہی ہوئی۔

اگر کسی ایک کام میں دو اغراض جمع ہو جائیں، تو وہ تین اقسام پر ہوتی ہیں:

پہلے یہ کہ اگر کوئی کام ایسا ہو کہ اس میں ایک ہی غرض ہوتی تو بھی وہ کام ضرور کر لیتا۔ مثلاً اگر کوئی غریب

عزیز تم سے پیسہ مانگے اور تم اس کو غریب سمجھ کر دے دو۔ لیکن اگر وہ غریب نہ ہوتا، اور فقط عزیز ہی ہوتا، تو بھی تم دے دیتے۔ لہٰذا یہ دونوں اغراض باہم تمھاری نیّت میں ایک دوسرے کی شریک ہیں۔

دوسری قسم یہ ہے کہ تم یہ سوچ کر یہ مانگنے والا آدمی عزیز ہی ہوتا۔ محتاج ہوتا یا محتاج نہ ہوتا۔ عزیز ہی ہوتا، تو اس کو پیسہ نہ دیتا۔ اور جب دونوں چیزیں یک جا جمع ہو گئیں، اس وقت تم نے اس کی مدد کی۔

پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ دو آدمی مل کر ایک بھاری پتھر اُٹھائیں۔ حالانکہ اُن میں ہر ایک الگ الگ بھی اُٹھا سکتا تھا۔

دوسری قسم، مثلاً دو آدمی مل کر اپنی کمزوریوں کے سبب پتھر اُٹھائیں۔

تیسری، مثلاً آدمی کے ذہن میں دو اغراض پوشیدہ ہوں۔ اُن میں ایک غرض زیادہ سخت ہو۔ ایک کم۔ لہٰذا کم اغراض کو بڑی غرض مدد پہنچا کر آدمی کو اس کام کی طرف متوجّہ کر دیتی ہے۔

اب ایک مثال سے یہ بھی سمجھ میں آ سکتا ہے، کہ مثلاً ایک آدمی تہجّد کی نماز تو پڑھتا ہے، لیکن اگر کئی آدمی اکٹھا ہو جائیں تو اس کی نیت اور بڑھ جاتی ہے اور جذبۂ عبادت بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس میں وہ پہلو بھی پوشیدہ ہے کہ اس کا خلوص شامل ہے، اگر نماز سے ثواب نہ ملتا، تو وہ آدمی صرف دوسروں کو دکھانے کے لیے نماز ہرگز نہ پڑھتا۔

لہٰذا اس کو لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں ذرا سی ہمّت افزا تسلّی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن یہ غرض مدد بالکل دل کو بہلانے والی ہے۔ بہر حال اس کے متعلّق "باب الاخلاص" میں بالتفصیل بتایا جائے گا۔

اس طویل بحث کا مقصد در اصل صرف یہ بتا دینا ہے کہ "نیت" میں انسان کی غرض اور سبب، نیز اس کا محرک یہ تینوں چیزیں کبھی خلوص پر مبنی ہوتی ہیں اور کبھی ظاہر داری اور خلوص دونوں ہوتے ہیں۔

توجیہات

سرکارِ دو عالمؐ کا ارشاد ہے کہ مومن کی نیّت اس کے اعمال سے بہتر ہے۔

معلوم ہوا کہ آدمی کے اعمال بغیر نیّت کے بالکل بیکار ہیں اور نیّت بغیر عمل کے بیکار ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ نیّت دل سے کی جاتی ہے اور اعمال اعضائے جسم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں میں دل اور جسم سے کتنا کتنا تعلق ہے۔

تمام اعمال کا دارومدار صرف نیّت پر ہے | اطاعت کا تعلق جسم سے ہے اور دل سے نیّت کا۔ تو ظاہر ہے کہ دل کا تعلق جس خواہش کو ہے، وہ ہی زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ عبادت ظاہری جو ہم جسم کے ذریعہ کرتے ہیں وہ نیّت کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ بدن کی صفات کو تبدیل کرنے کے لیے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جب عمل کرنے والے ہوں، اُس وقت نیت کی ضرورت ہے۔ حالانکہ نیت کے بعد اعمال سرزد ہونا چاہئیں۔ اس لیے کہ اعضائے جسمانی تو یہاں ہی فنا ہو جائیں اور دل ہمارے ساتھ یہاں بھی ہے اور رُوح کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور تمام اعمال کی سزا و جزا میں وہ ہی موجب قرار پائے گا۔

دل ہی کے ذریعہ ہم کو دنیا اور آخرت کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل دل میں دُنیا داری کے جذبات آتے ہیں۔ اس کے بعد خدا کی معرفت کے ساتھ ساتھ وہ آخرت کی طرف خود بھی جاتا ہے اور اعضائے بدن کو بھی لے جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تمام اعمال اور کردار کی بنیاد دل ہے۔ ہم سجدہ کرتے ہیں اس کا اصل مقصد اپنے دل کو عاجزی کی طرف مائل کرنا ہے۔ صرف پیشانی کو خاک پر رکھنا مقصود نہیں ہوتا۔

لہٰذا تمام اطاعات میں صرف دل کو خداوند عالم کی طرف متوجہ کرنا۔ اس کے سامنے عجز و انکساری کرنا مقصود ہے۔ جس طرح قربانی سے پہلے بکرے کی جان لینا نہیں ہوگا۔ بلکہ صرف اپنے دل کو بُخل سے پاک کرنا اور خدا کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ آدمی اس وقت کہتا ہے کہ لَبَّیْكَ بِالْحُجَّةِ حَقًّا تَعَبُّدًا وَرِقًا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ خداوند عالم کے احکامات کے مطابق جانوروں پر رحم کرو، بمقتضائے طبیعت خود نہ کرو۔ مثلاً جب کسی یتیم پر رحم آتا ہے۔ وہ جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد عمل کیا جاتا ہے کہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا جائے۔ اس عمل سے وہ جذبۂ رحم اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اوّل دل سے نیت کرنا ہی اعمال کی خوبیوں کی بنیاد ہے۔ اسی طرح نیکی کی خواہشات آدمی کو ترک کر دینا سکھاتی ہیں۔ اور اس نیت پر عمل کرنے پر آخرت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اعمالِ ظاہری اس نیت کے تابع ہیں معلوم ہوا کہ نیت میں ہر چیز کا دار و مدار ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جب اعمال اوّل دل میں نیت کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں، اور اگر وہ اعمال ظاہری طور پر ادا نہ ہو سکیں، تو وہ نیت بھی بیکار جاتی ہے۔ اس لیے کہ اگر عمل ظاہری طور پر نہ کیا جائے۔ تو نیت ہی کر لینے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا اصل غرض آدمی کی نیت ہے اور اعمال سے اس کو تقویت پہنچتی ہے۔

نفسانی خواہشات اور وسوسے
شریعت کی نظر میں

صحیح مسلم اور صحیح بخاری شریف میں یہ احادیث موجود ہیں کہ جو آدمی گناہ کی نیت کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا، تو اس کے نامۂ اعمال میں وہ گناہ درج نہیں ہوتا، اور اگر نیکی کا ارادہ کرے اور نیکی نہ کرے تو اس کے

کتا بچے میں وہ نیکی درج ہو جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم نے میری اُمّت کو صرف خیالاتِ نفسانی دل میں لانے کا گناہ معاف کر دیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہیں سے یہ مسئلہ بنا لیا ہے، کہ آدمی صرف تخیلات کی بناء پر گناہ گار نہیں ہوتا، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ دل سے ہی تمام اعمال کیے جاتے ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرمارہا ہے کہ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ۔ (یعنی خداوندِ عالم تمھارے دل کی پوشیدہ چیزوں کا بھی حساب لے گا) دوسری جگہ اور ارشاد ہوتا ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا۔ (یعنی تمھارے دل اور آنکھ اور کانوں سے باز پُرس کی جائے گی) ایک جگہ اور فرماتا ہے لَایُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ (یعنی صرف زبانی لغویات پر آدمی گنہگار ثابت نہ ہوگا، بلکہ نیّت دیکھی جائے گی۔

تمام حکماء و علماء اس مسئلے پر اتّفاق کر رہے ہیں کہ انسان اپنے حسد منافقت اور غرور و کبر کی وجہ سے ماخوذ کیا جائے گا۔ اور یہ سب چیز صرف دل ہی سے متعلق ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دل ہی اصل شئے ہے۔ اب ہم دل کے وہ تمام منازل جو اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ بالتفصیل لکھتے ہیں تاکہ فرق سمجھ میں آجائے۔

دل کی چار منازل اور حالتیں ہیں، جن میں دو تو اس کے اختیار میں ہیں اور دو اختیار سے باہر ہیں۔ اور ان کی وجہ سے وہ ماخوذ بھی نہیں ہوتا۔ اِس لیے کہ اس کا تعلق خداوند عالم سے ہے۔

پہلی دو، جو آدمی ہی سے متعلق ہیں۔ ان کو مثال کے ذریعہ سمجھا دینا ضروری ہے۔

حدیثِ نفس فرض کرو کہ تم راستے میں جا رہے ہو اور ایک خوبصورت عورت تمھارے پیچھے پیچھے آرہی ہو۔ اس وقت تم یہ سوچنے لگو کہ اگر میں گردن پھیر لوں، تو یہ عورت مجھ کو دکھائی دے سکتی ہے۔ یہ خیال پیدا ہونا "حدیثِ نفس" کہلاتا ہے۔

دوسرے تمھارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں لوٹ کر اس کو دیکھ لوں۔ اور دیکھنے کی رغبت ہو جائے اس کو "طبیعت" کہتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دل تم کو اس بات پر متوجّہ کرے کہ تم گردن موڑ کر اس طرف دیکھو، اور وہاں اس کو مُڑ کر دیکھنے میں کوئی خطرہ بھی نہ ہو، لیکن اس میں شہوت دل کے ماتحت نہ ہوگی۔ اس لیے کہ عورت کو جب دیکھوگے تو شہوت کا جذبہ ضرور پیدا ہوگا، اور ایسی صورت میں اگر دل تم سے اس خواہش کو مٹا دیکھ

دل ہی کے حکم کے بموجب تم نے اس طرف دیکھا۔ لہٰذا دل ہی اس کا سبب ہوا۔ اس کو حکم دل سے موسوم کیا جاتا ہے۔
چوتھے یہ کہ آدمی دیکھنے کا ارادہ کرے اور فوراً ہی خداوند عالم اور خلق اللہ کا خوف نہ ہو جائے تو یہ ارادہ قطعی پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

حدیثِ نفس وہ میل طبیعت کو جن ارادوں سے تعبیر کیا گیا، اُن میں آدمی گنہگار نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خود اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ خداوند عالم یہ ارشاد فرما رہا ہے کہ خداوند عالم ہر نفس کو اس کی طاقت کے مطابق تکلیف دیتا ہے۔

ایک شخص حضرت عثمان بن مطعون نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں عرض کیا کہ اپنی شہوات کو کم کرنے کے لیے جی چاہتا ہے کہ میں خصّی ہو جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا یہ عمل مسلمانوں کے لیے روزہ رکھنے ہی کے برابر ہوتا ہے۔ پھر عرض کیا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نکاح کرنا سنّت ہے۔ پھر عرض کی میرا نفس کہتا ہے کہ دنیا چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر لوں۔ فرمایا کہ اسلام میں سب سے بڑی رہبانیت حج اور جہاد ہے۔ عرض کیا نفس مجھ کو گوشت کھانے سے منع کرتا ہے۔ فرمایا کہ نہیں۔ اگر گوشت مجھ کو ملتا تو میں بھی کھایا کرتا۔
اس قسم کے تمام خیالات "خیالاتِ نفس کہلاتے ہیں اور معاف ہیں۔

باقی وہ صورتیں جو آدمی کی قوّتِ خود اختیاری سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ حکم دل اور رجحانِ طبیعت ہے۔ اس میں اوّل انسان کی طبیعت کام کرنے کی طرف راغب ہوتی ہے۔ اوّل دل میں ارادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اِن دونوں صورتوں میں آدمی ہی ماخوذ ہوگا۔ آدمی کے گنہگار ہونے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس پر کوئی عذاب اور قہر نازل ہوگا، بلکہ خداوند عالم کی ذات سے انتقام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ وہ بارگاہ ایزدی اور معرفتِ خدا سے اتنا ہی دُور ہو جاتا ہے۔ اور یہ اسی کی شقاوت کے اثرات ہوں گے جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سعادتِ ابدی اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان صرف خدا کی طرف توجّہ کو مبذول کرلے اور تمام چیزیں ماسوای اللہ کو ختم کر دے۔ اور اگر وہ دنیا کے ساتھ تعلّق رکھے گا تو دنیا کی محبت اس کو صرف دنیا ہی کا بنا دے گی، اور معرفتِ حقیقی سے دُور ہو جائے گا۔ لوگ قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ خداوندِ عالم انتقام لیتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ آدمی اپنی خواہش اور عقل کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر آدمی ذرا سی سمجھ سے کام لے تو ان توہّمات سے باز رہ سکتا ہے۔

اس کے متعلّق ایک دلیل سے سب مسئلہ صاف ہو جائے گا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جب دو آدمی آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں، تو وہ دونوں دوزخ میں جاتے ہیں۔ صحابہ نے اس کا سبب پوچھا۔ فرمایا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے قتل پر آمادہ ہو کر میدان میں آتے ہیں۔ لہٰذا دونوں ہی

گنہگار ہوں گے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ایک مالدار آدمی اپنے مال کو بے جا طور پر خرچ کرتا ہے اور دوسرا یہ کہنے لگے کہ اگر میرے پاس ہوتا تو کارِ خیر میں ہی صرف کیا کرتا۔ لہٰذا یہ دونوں گناہ میں برابر کے حصے دار ہیں۔

یہ تمام خواہشات دل سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی آدمی بیوی کو بیوی تصور نہ کرے اور اس کے ساتھ جماع کرلے تو گنہگار ہے۔ اور اگر وضو کے متعلق یہ شک ہو کہ نہیں ہے اور نماز پڑھ لے تو نماز ہو جاتی ہے۔ اور اگر باوضو ہو اور یقین ہو کہ وضو نہیں ہے تو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر گناہ کا ارادہ ہو اور ارتکاب نہ کرے تو گناہ نہیں لکھا جاتا۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کا ارادہ اس کی خواہشات کے ماتحت ہوتا ہے اور گناہ کا ارادہ کرنے کے بعد اس کو خوفِ خدا سے باز رہنا مجاہدۂ نفس ہے۔ لہٰذا اس میں آدمی کو ثواب ملتا ہے اور اگر آدمی ارادے کے بعد اپنی ذاتی کمزوری کے باعث ارتکابِ گناہ نہ کرے تو وہ حقیقتاً گنہگار ہوگا۔ جس طرح اوپر حدیث میں ہے کہ مقتول بھی برابر کا گنہگار ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے دشمن کو قتل نہ کر سکا اور خود ہو گیا۔

اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

اعمال کی تین قسمیں ہیں۔ پہلے اطاعات۔ دوسرے مباحات۔ تیسرے معاصی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ گناہ نیت اچھی ہونے کی وجہ سے گناہ نہیں رہتا۔ یہ ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ بُری نیت آدمی کے عمل کو اور زیادہ بُرا کر دیتی ہے۔

مثلاً ایک آدمی کسی کی غیبت کرے۔ یا مال حرام سے کوئی مدرسہ، مسجد، سرائے یا کنواں بنوائے اور اپنی نیک نیتی کا دعویدار رہے، تو یہ اور بھی ایک گناہ زیادہ ہوگا کہ اس نے گناہ کو گناہ نہ سمجھا۔ یہ فاسق ہونے کی علامت ہے۔ یہ دراصل جہالت کی دلیل ہے، اور جہالت ایک الگ گناہ ہے۔ جو آدمی کو اطاعتِ خدا سے باز رکھتی ہے۔ ایسے آدمی کو تعلیم دینا بھی حرام ہے، جس کی غرض تعلیم حاصل کرنے سے دنیاداری ہو، اور محض اپنے کو جتانے کے لیے مباحثے اور مناظروں میں حصہ لے۔ بعض مدرسین کا خیال ہے کہ شاگرد کی دنیاداری اور گناہوں سے اس کی ذات سے کیا تعلق؟ اس لیے کہ وہ ایک نیک کام کر رہا ہے۔ اس کی نیت میں کوئی قصور نہیں۔ لیکن یہ غلط ہے، بلکہ وہ ایسا ہے، جیسے کسی قاتل کو تلوار دے دی جائے یا شراب کھینچنے والے کو "انگور" بزرگانِ دین نے ہمیشہ فاجروں سے پناہ مانگی ہے، اور اگر کسی مرید یا شاگرد کی طبائع کے رجحانات بھی بُری طرف دیکھتے تو اس کو الگ کر دیتے۔

امام حنبلؒ نے اپنے ایک شاگرد رشید کو صرف اپنے دروازے کے آگے کہگل کرنے پر نکال دیا، اور فرمایا

کہ تو نے ایک ناحق زمین راستے سے غصب کر لی۔ لہٰذا گناہ اچھی نیت کر لینے سے نیکی نہیں ہو سکتے۔ نیکی نیکی ہی رہے گی اور بدی بدی۔

دوسرے یہ کہ نیت جتنی مکمل ہوگی اور مستحکم ہوگی، اتنا ہی ثواب ملے گا۔ اگر آدمی "نیت" کی افضلیت کو سمجھ کو لے، تو ایک نیت سے دس نیکیاں کر سکتا ہے۔

مثلاً ایک آدمی مسجد میں اعتکاف کے لیے جاتا ہے۔ تو پہلی نیت تو مسجد میں جانے کی ہے کہ مسجد میں جانا حدیث کے ماتحت خدا کے دیدار کے لیے جاتا ہے۔ دوسرے نماز کی نیت سے جاتا ہے تیسری یہ نیت کر سکتا ہے کہ وہ اپنے اعضائے بدن کو بُرے کاموں سے بچائے گا، اور یہ ایک قسم کے "صوم" میں شمار ہوتا ہے۔ چوتھی نیت یہ کہ آدمی کو دنیاداری سے بچائے رکھتا ہے۔ اور خداوند عالم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پانچویں یہ کہ خلق کے مکر و فریب سے محفوظ رہے گا۔ چھٹے یہ کہ اگر کوئی آدمی مسجد میں غلط کام کرے گا تو اس کو روک دے گا۔ ساتویں وہاں ایمان والوں سے ملوں جلوں گا۔ آٹھویں یہ کہ وہاں بیٹھ کر تمام گناہوں سے الگ رہوں گا، جن کی وجہ سے خداوندِ عالم کے سامنے شرمساری نہ ہوگی۔ اسی طرح ہر نیک عمل میں ثواب کو بڑھانے کے لیے بہت سی نیتیں کر سکتا ہے۔

مباحات اعمال کی تیسری قسم "مباحات" ہے۔ تمام اعمال دنیوی میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر اچھی نیت ہے تو ثواب ہوتا ہے اور بُری ہے تو عذاب۔ اور اگر آدمی بغیر کسی نیت کے ہی کوئی کام کرتا ہے تو وہ بیکار ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (یعنی دنیا ختم ہو جانے والی ہے۔ لہٰذا تم اپنا حصہ لے لو)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دُنیا کے چھوٹے بڑے تمام کاموں کی باز پرس آدمی سے کی جائے گی۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے کپڑے کو اگر مس کیا ہے، وہ بھی دریافت کیا جائے گا۔

مباحات کے متعلق جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ اور وہ ہزاروں باتیں ہیں۔ مثلاً کوئی شخص جمعہ کو عطر لگائے اور اس کی نیت صرف اپنی بلندی مرتبہ کو ظاہر کرنا ہو، یا عورت پر اپنے اثرات جمانا مقصود ہوں۔ اسی طرح خوشبو کا استعمال اچھا بھی ہوتا ہے۔ خوشبو کے استعمال سے مسجد کی تعظیم مقصود ہو۔ اور اپنے ہم نشینوں کو آرام پہنچانے کی نیت سے لگائے۔ یا دماغ کو طاقت پہنچانے کی نیت ہو اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کے قلوب نیکیوں سے معمور ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انسان کا ہر کام اور نیت باری تعالیٰ کی قربت کا سبب بن جاتی ہے یہاں تک کہ اگر بیوی کے ساتھ جماع کرتے یہ نیت ہونا چاہیے کہ اپنی نسل بڑھانا مقصود ہے تو ثواب ہوتا ہے۔

حضرت سفیان ثوری نے ایک بار الٹا کپڑا پہن لیا۔ لوگوں نے دیکھ کر سیدھا کرنے کو کہا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ

اُسی کے لیے اُلٹا پہنا گیا ہے اور سیدھا بھی اسی کے لیے کیا جائے گا۔

حضرت زکریا محنت اور مزدوری کے بعد کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ آپ کے پاس آئے۔ آپ نے اُن کی تعظیم کی اور کھانے سے فراغت پاکر فرمایا کہ اگر میں پیٹ بھر کر نہ کھاتا تو یہ محنت اچھی طرح نہ کرسکتا۔ سخاوت اور کرم کی بناء پر فرض خدمت سے محروم رہ جاتا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کھانے میں مشغول تھے، ایک آدمی وہاں آگیا۔ لیکن آپ نے اس سے کھانے کو نہ کہا اور بعد فراغت فرمانے لگے کہ اگر یہ کھانا میں نے قرض نہ لیا ہوتا تو ضرور کھلاتا۔

اگر کھانے والا صرف ظاہری تعظیم کرنے والے آدمی پر ایک گناہ "نفاق" ہوتا ہے۔ اور اگر کھانا کھانے بیٹھ جاتا، تو دو گناہوں کا مرتکب ہوتا۔ ایک نفاق۔ دوسرے خیانت۔ اس لیے کہ کھانے والے کو اگر نیت معلوم ہو جاتی، تو ہرگز نہ بیٹھتا۔

نیّت خود اختیاری چیز نہیں ہے

نیّت صرف ایک رغبت کا نام ہے۔ وہ خود بخود پیدا ہوتی ہے، جو عقلمند آدمی یہ سُن لے گا کہ ہر اچھے کام میں نیت کرنا چاہیے تو غالباً وہ زبان سے نکاح کے وقت پر نہیں کہتا کہ میں یہ نکاح خدا کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ سب باتیں محض دل کو سمجھانے والی ہیں اور "حدیث نفس" سے تعلق رکھتی ہیں۔ دراصل نیت کرنے سے نہیں ہوتی، بلکہ خود پیدا ہو کر بدن کو اس کام کے کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ یہ بات اس وقت ہوتی ہے۔ جب حقیقتاً اس کی نیت ہو، ورنہ ایسا ہوگا جیسے آدمی پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد کہہ دے کہ میں نے روزے کی نیت کی ہے۔ یا کوئی آدمی صرف جذبات کو دبانے کے لیے جماع کرے، اور کہے یہ کہ میں نے اولاد پیدا کرنے کے لیے جماع کیا ہے۔ لہٰذا یہ سب باتیں بالکل بیکار ہیں۔ نیّت کے لیے آدمی کو اول اپنی شریعت پر ایمان مکمل ہونا ضروری ہے۔ جب ایمان مکمل ہو جائے، اس کے بعد نماز کی نیت صحیح ہے۔ ورنہ وہ نماز خالصاً لوجہ اللہ نہ ہوگی۔ اور اس کی نیت بھی بیکار ہوگی۔ جس طرح بھوکا آدمی یہ کہنے لگے کہ بھوک کی نیت سے روٹی کھاؤنگا حالانکہ وہ مجبور ہے کہ روٹی کھائے۔

اگر آدمی دُنیا داری میں پھنس کر اسی کا ہو جائے، تو پھر آخرت کے متعلق کسی کام کی نیت ناممکن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر دین کی طرف آدمی کے رجحانات زیادہ ہوں تو اس کی ہر بات دین کے لیے ہوگی اور وہ ہی نیت بھی ہوگی۔

معلوم ہوا کہ نیت اس قوت کا نام ہے جو آدمی کو اپنے کام میں لاتی ہے۔ انسان کی خواہش اس کے اختیارات سے باہر ہے کہ تیرا جی چاہے تو کرے، بلکہ تمام خواہشات انسان کی اس کی حسب عادت پیدا ہوتی

ہیں - مثلاً آدمی اگر خلوص اور معرفت رکھتا ہے - تو اس قسم کے جذبات بھی پیدا ہوں گے - اور وہ ہی اعتقادات دل میں راسخ ہو جائیں گے - اور آدمی جب اس کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے، تو اس کی خاصیت اور حقائق سے متعارف ہو جاتا ہے، جس کے بعد بہت سی عبادتیں اپنی نیت کے نہ ہونے کی وجہ سے ترک کرنا پڑتی ہیں - کیونکہ وہ اس عبادت کے لیے نیت نہیں دیکھتا -

مثلاً ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ پڑھانے کو انکار کر دیا، اور فرمایا کہ میری نیت اس وقت نماز پر تیار نہیں ہوتی -

حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اپنے لیے دعا کرنے کی استدعا کی - آپ نے جواب دیا، کہ نیت ہونے تک انتظار کرو - لوگ جب آپ سے حدیث بیان کرنے کے لیے اصرار کرتے تو کہہ دیتے کہ ہمت میں مخلص ہونا ضروری ہے - لہٰذا جب نیت ہوگی بیان کروں گا - ایک بزرگ نے کہا کہ میں ایک بیمار کی عیادت کے لیے نیت کو استوار کر رہا ہوں اور ابھی تک نہیں جا سکا۔

قصہ مختصر، جب تک آدمی پر دنیا غالب رہتی ہے، دین کے کاموں میں نیت کا پختہ ہونا ناممکن ہے - حتیٰ کہ فرائض کی ادائیگی میں بھی مشکل پڑ جاتی ہے - اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو جہنم کا خوف دلاتا ہے - اس کے بعد اس کا نفس عبادت کے لیے مجبوراً تیار ہوتا ہے - اور جب آدمی اس کی اصل سے باخبر ہو جاتا ہے تو مباحات میں مشغول ہوتا ہے -

مثلاً اگر آدمی کسی سے بدلہ لینے کی نیت دیکھے تو بدلہ لینا ہی بہتر ہے - اسی طرح اگر رات کو نماز تہجد اس نیت سے نہ پڑھے کہ اگر اس وقت نہ سوؤں گا تو نماز صبح قضا ہو جائے گی، تو رات کو سو رہنا ہی مناسب ہے - اور یہی نہیں بلکہ اگر عبادت سے کسی وقت دل اُچاٹ ہو رہا ہو تو آدمی کچھ دیر کسی سے مزاح کر سکتا ہے، یا بیوی کے پاس بیٹھ کر خوش ہو سکتا ہے، تاکہ عبادت کے لیے پھر دماغ تازہ ہو جائے -

حضرت ابوالدرداءؓ کا قول ہے کہ میں کبھی کبھی تفریح اور خوشنودی سے اپنا دماغ تازہ کر لیتا ہوں، تاکہ عبادت خلوص سے کر سکوں -

بعض لوگ میدانِ جنگ سے صرف اس لیے بھاگتے ہیں کہ دشمن پر پیچھے سے حملہ کریں گے - اس طرح بہت سے بزرگوں نے خوش طبعی سے کام لیا ہے، تاکہ عبادات میں خلوص رہ سکے - اور عبادت چونکہ نفس سے جنگ کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا اس کے لیے ہر اس قسم کے حیلے کرنا روا نہیں -

بزرگانِ دین کے نزدیک اس قسم کے حیلے درست ہیں، اور وہ پسند کرتے تھے - بعض علماء نے اس کی مخالفت بھی کی ہے، لیکن وہ اس کے فوائد سے ناواقف ہیں -

مباحثہ و توجیہات

جب یہ طے ہو گیا کہ جس سبب سے اعمال سرزد ہوتے ہیں، وہ اصل سبب نیت ہے۔
لہٰذا اب نیت کی تفریق کو دیکھتا ہے، بعض لوگ تو دوزخ کے ڈر سے عبادات میں مشغول رہتے ہیں اور بعض جنت کے لالچ سے۔ لیکن ایسے آدمی حریص ہیں۔ اور اپنے نفس کے بندے ہیں، اور جو لوگ دوزخ کے ڈر سے عبادت کر رہے ہیں وہ ایسے سرکش غلام کی طرح ہیں جو بغیر مار کھائے باز نہیں آتے۔ یہ دونوں خداوندِ عالم کی "رضا" نہیں چاہتے۔

خداوندِ عالم کے لیے دراصل وہ لوگ عبادت کرتے ہیں جن کا عمل خالصاً لوجہ اللہ ہو۔ اور وہ شخص ایسا ہے کہ جو اپنے عیوب کو صرف اپنی محبت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس سے کوئی لالچ کی اُمید نہیں رکھتا۔
یہ ہی معیار آدمی کا عبادت میں ہونا چاہیے کہ وہ صرف اس کے جمال کے نظارے کا خواہاں ہو اور اپنے جسم کو بھی اس کی خدمت میں مکمل طور پر لگا دے۔ تاکہ وہ بھی دنیاوی سے بیگانہ ہو جائے۔
حضرت احمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ نے خداوند عالم کو خواب میں دیکھا۔ وہ فرماتا ہے کہ سب لوگ مجھ سے مانگتے ہیں اور بایزید مجھے مانگتا ہے۔

کسی نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ سے پوچھا کہ خداوندِ عالم نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آپ نے فرمایا، عتاب! اس لیے ایک بار میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ اگر بہشت نہ ہو، تو کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ خداوند عالم نے فرمایا کہ جو نقصان میرے دیدار کے نہ ہونے سے ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا نقصان ہوگا۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اصل محبت کے عنوان میں بیان کی جائے گی۔

باب دوم
اخلاص اور حقیقت کے درجات

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَمَآ اُمِرُوٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (دین خالص خداوند عالم ہی کے لیے ہے)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے کہ "خلوص" میرے اسرار میں سے ایک بھید ہے۔ جو شخص خلوص رکھتا ہے۔ میں اس کو دوست سمجھتا ہوں۔
اور فرمایا کہ اے معاذ! عبادت چاہے تھوڑی کر، لیکن خلوص کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔
(نوٹ) ریاکاری کی مذمت میں جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں وہ ہی اخلاص کی تعریف ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اچھی نظر بھی اخلاص کو کم کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے سبب بھی خلوص کو کم کرنے والے ہیں۔

اقوال برائے خلوص حضرت معروف کرخی اپنے کوڑے لگایا کرتے، اور کہتے، کہ اے نفس اپنے میں خلوص پیدا کر! تاکہ نجات حاصل ہو۔

ابو سلیمان کا مقولہ ہے کہ وہ آدمی نیک بخت ہے جو دنیا میں ایک قدم بھی خلوص نیت سے رکھتا ہے۔

ابو ایوب بحستانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ نیت میں خلوص رکھنا اصل نیت سے زیادہ مشکل ہے۔

کسی بزرگ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا۔ اُن سے دریافت کیا کہ آپ پر وہاں کیا گزری؟ جواب دیا، کہ نیکیوں کے پلّے میں میرے تمام چھوٹے بڑے اعمال نیک رکھے تھے۔ حتیٰ کہ میرے یہاں ایک بلّی پلی ہوئی تھی، وہ بھی موجود تھے، لیکن گدھا نہ تھا اور وہ اس لیے کہ اس کے مرنے کے وقت میں نے "علی لعنت اللہ" کہا تھا ورنہ وہ بھی ہوتا۔ ایک بار میں نے صدقہ دیا اور لوگوں نے مجھے شفقت سے اس وقت دیکھا۔ میں اُن کی شفقت سے خوش ہوا، اور اسی خوشی کے باعث میرا صدقہ کالعدم کر دیا گیا۔

بنی اسرائیل میں ایک عابد سے کسی نے کہا کہ لوگوں نے ایک درخت کی پرستش شروع کر دی ہے۔ عابد کو سخت غصہ آیا اور کلہاڑی لے کر اس درخت کو اکھاڑنے کے لیے چلے۔ راستے میں شیطان ایک انسانی شکل میں نظر آیا، اور کہا کہ تو وہاں نہ جا۔ اس لیے کہ تجھ کو خدا نے اس درخت کے اکھاڑنے کا حکم نہیں دیا، لیکن عابد نہ مانا دونوں میں تکرار کے بعد کشتی ہو گئی، اور عابد نے شیطان کو زیر کر لیا۔ شیطان نے کہا کہ اب مجھے چھوڑ دو، اور ایک بات کہتا ہوں، اگر ماننے کے قابل ہو گی تو مان لینا۔ عابد نے چھوڑ دیا۔ شیطان نے کہا کہ تم کو عبادت سے مطلب ہے۔ تم نہ پیر نہ مُرشد، نہ پیغمبر نہ نبی۔ پھر تم کو کیا مطلب۔ اِس پر پھر تکرار شروع ہُوئی اور نوبت لڑائی پہ پہنچی۔ یہاں تک کہ شیطان پھر زیر ہو گیا، اور اس نے دوسری بات سمجھانا چاہی۔ وہ کہنے لگا کہ اگر تو اپنی عباوات دوسروں کو دے گا تو لوگ خوش ہوں گے۔ اور اس درخت کے اُکھاڑنے میں تجھ کو کیا حاصل ہو سکے گا؟ اس لیے کہ پرستش کرنے والے ویسا ہی دوسرا درخت لگا لیں گے، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم کو دو درہم روزانہ دیا کروں گا۔ عابد نے سوچا کہ یہ بات زیادہ مفید ہے، اس لیے کہ ایک درہم میں خود خرچ کروں گا اور ایک راہِ خدا میں دوں گا۔ چنانچہ وہ واپس ہو گئے۔ تین دن برابر روزانہ دو دینار ملتے رہے۔ عابد اس عمل سے بہت خوش تھا، مگر چوتھے دن اس کو کچھ نہ ملا اور اس کو پھر غصہ آیا اور کلہاڑی اُٹھا کر پھر درخت کاٹنے کے لیے چلا۔ راستے میں پھر شیطان ملا۔ اس نے کہا کہ اب کیا ارادہ ہے۔ عابد نے پھر وہی کہا اور دونوں میں پھر تکرار کے بعد کشتی کی نوبت آ گئی۔ اس بار شیطان نے عابد کو گرا دیا۔ عابد سخت پریشان تھا۔ کہنے لگا کہ پہلی دو بار میں نے

تجھ کو کیسے گرا دیا تھا۔ شیطان نے جواب دیا، کہ پہلی دونوں مرتبہ تو خلوص کے ساتھ مجھ سے لڑ رہا تھا۔ اس مرتبہ ریاکاری شامل ہوگئی اور خداوند عالم کے حکم سے جو مجھ سے لڑتا ہے، اُس پر میں فتح نہیں پا سکتا۔ لیکن چونکہ اب تو اپنے لیے لڑ رہا ہے، اس پر میں فتح نہیں پا سکتا۔ لیکن چونکہ اب تو اپنے لیے لڑ رہا ہے۔ لہٰذا میں نے تجھ پر فتح پائی معلوم ہونا چاہیے کہ خواہشات کے بندے مجھ سے سر نہیں ہو سکتے۔

اخلاص کی حقیقت

اب تک یہ بتایا گیا کہ تمام اعمال "نیت" پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر نیت صرف خلوص کی بناء پر ہے تو اُسے "نیت خالص" سے معنون کریں گے۔ اور اگر کسی خواہش میں دو نیتیں ہو جائیں تو خلوص جاتا رہتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آدمی روزے رکھے اور ساتھ ہی ساتھ سوچے کہ کھانے سے پرہیز بھی ہو جائے گا۔ یا ایک دن کے اخراجات کو بچا لے گا۔ یا کھانے پکانے کی زحمت سے بچ جائے گا، تو یہ نیت خالص نہیں کہلاتی۔ اسی طرح "حج" کے لیے یہ نیت ہو، کہ آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی یا سیر و تفریح ہو گی۔ تہجد کی نماز اس لیے پڑھے کہ مال کی حفاظت بھی کرتا رہے گا۔ یا کسبِ معاش کی نیت سے تعلیم حاصل کرے یا کرائے سے بچنے کے لیے مسجد میں رہنے لگے۔ سائل کی آہ و زاری اور اس کے رنج سے بچنے کے لیے خیرات دے۔ اس خیال سے دوسروں کی عیادت کو جائے کہ اس کی بیماری میں دوسرے لوگ آئیں گے۔ اسی طرح اور تمام اعمال ریاکاری میں شامل ہوں گے جن کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں۔

یہ تمام خیالات خلوص کو ختم کر دیتے ہیں۔ نیت خالص وہ ہے جس میں اپنے متعلق کوئی شائبہ ہی نہ ہو۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اخلاص کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ انسان صرف یہ کہے کہ میرا پروردگار صرف وہ ہی ایک خدا ہے اور اس کے بعد صرف اس کے احکامات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا اصول بنا لے ——— خلوص اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا، جب تک کہ انسان اپنی بشریت کو نکال نہیں دیتا۔ اسی لیے بزرگوں نے اخلاص کو سب عبادات سے زیادہ مشکل بتایا ہے۔

حدیث ہے کہ اگر آدمی تمام عمر میں صرف ایک بار بھی اخلاص سے کوئی عمل کرے گا، تو اس کے نجات کی اُمیدیں ہیں۔ ورنہ ذاتی مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خلوص ناممکن ہے۔

تدابیر اخلاص

آدمی کو اگر خلوص پیدا کرنا ہے تو دنیا سے قطعی متنفر ہو جائے اور جب دُنیا سے تنفّر پیدا ہو جائے گا تو خدا کی طرف رجوع ہوگا۔ ایسا خالص عشق اختیار کرے۔ کہ اس کا ہر کام اپنے محبوب کے لیے ہو حتّٰی کہ کھانا بھی اس لیے کھائے کہ وہ اپنے محبوب کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔

جس آدمی پر دُنیا کی مُحبّت تسلط جمالیتی ہے، اس کے لیے تو روزہ اور نماز میں بھی خلوص مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا دل ہر وقت دنیا داری میں مشغول رہتا ہے اور دنیاداری کی وجہ سے اس کی عادات میں وہ ظاہرداری کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے تمام اعمال میں ظاہرداری آجاتی ہے اور اُس کے بعد خلوص ناممکن ہو جاتا ہے۔

اکثر علماء اپنے کو مخلص گردانتے ہیں، بلکہ بعض عابد بھی اس سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ میں تیس سال تک جماعت کی صفِ اوّل میں شریک ہوتا رہا۔ ایک دن ذرا دیر سے آیا، تو پچھلی صف میں جگہ ملی۔ میں نے اس روز یہ سوچا کہ میرا اگلی صف میں کھڑا ہونا صرف لوگوں پر ظاہر کرنا ہوتا تھا کہ میں نمازی ہوں، اور سب سے پہلے نماز میں شامل ہونے آتا ہوں ـــــ لہٰذا اب مجھے یقین ہے کہ سابقہ تیس سال کی نمازیں مجھ پر قضا ہیں۔

اخلاص کی صفات کو سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا انتہائی مشکل اور اہم ہے، اور اگر انسان کے اعمال بر بنائے خلوص نہ ہوں تو اس کی عبادات قطعی بیکار اور لاحاصل ہیں۔ اُن میں قبولیّت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

امثال و توجیہات متعلقہ خلوص

بزرگانِ دین کا مقولہ ہے کہ عالم کی دو رکعت نماز جہلا کی عمر بھر کی نمازوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ جہلا اپنے اعمال نیک و بد کی مکافات سے متعارف نہیں ہوتے اور نہ اس کو اپنے اعمال میں اپنی نیت ہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی عبادات کو خلوص نیت پر مبنی سمجھتا ہے۔ لیکن اعمال بھی کھرا کھوٹا دونوں ہوتے ہیں۔ جس طرح سونا کہ صرف کسوٹی پر کس کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔ عبادات میں اخلاص کے نہ ہونے کے چار مدارج ہیں۔ اُن میں بعض بہت نامعلوم سے ہوتے ہیں، اور انھیں کو ہم ریاکاری سے منسوب کرتے ہیں۔

وہ منازل جہاں خلوص جاتا رہتا ہے

پہلا درجہ۔ آدمی کے نماز پڑھتے میں جب کوئی آجائے، تو اس کا نفس اس سے کہتا ہے کہ ذرا سنبھل سنبھل کر نماز پڑھ! ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ نماز کیسی رہ گئی۔

دوسرا یہ کہ آدمی اپنے نفس کو سمجھ لے، کہ یہ شیطان کی پیروی کر رہا ہے۔ اور اس طرف توجّہ نہ دے اس کے بعد شیطان اس کے نفس کو دوسری بات سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نماز کو بڑے شدّ و مد کے ساتھ پڑھ تاکہ لوگ تیری پیروی کرنے لگیں، اور نمازی اس دھوکے میں آجائے۔ حالانکہ امام اور مقتدی اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کی عبادات کی روحانیت دوسروں پہ اثر انداز ہو جائے۔ اور اگر وہ خود صرف "ریا" سے کام لیتا ہے، تو "پیرو" پر کوئی اثر نہیں، بلکہ اس کا گناہ بھی اسی مقتدی پر ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی تنہائی میں اچھی طرح نماز پڑھنے کی عادت ڈالے تاکہ عادی ہونے کے بعد عوام کے سامنے اپنی قرأت اور شدّو مدظاہر کرسکے ۔ یہ درجہ نہایت پوشیدہ ہے اور کسی کو پتہ نہیں چل سکتا۔ اس میں کچھ ریاکاری کی جھلک بھی پائی جاتی ہے ۔ اس لیے کہ جماعت کو چھوڑ کر تنہائی میں ریاکاری کا سبب بنتا ہے۔

چوتھے یہ کہ آدمی کے خضوع و خشوع مخلوق کے دکھانے کے لیے نہیں ہے، اور شیطان اس کو خداوند عالم کی طرف سے دہشت پیدا کردے کہ تو ابھی کس مرتبے پر ہے، اور وہ اس خوف سے خشوع و خضوع کر کے دنیا والوں کی نظروں میں بلند ہوجائے ۔ لہٰذا یہ خیالات اگر تنہائی میں آتے ہیں تو ظاہر میں کرنا چاہئیں۔ ورنہ ریاکاری میں داخل ہوں گے ، اور یہ درجہ سب سے زیادہ تاریکی میں رہتا ہے کہ کوئی آدمی اس کو پہچان نہیں سکتا۔

اِس کے بعد انسان سوچنے لگتا ہے ، کہ دنیا والے آخرت میں ایک دوسرے کے کام نہ آئیں گے، تو اس کے ظاہری خطرات دُور ہوجاتے ہیں ——— لہٰذا ایسے وقت میں آدمی کو چاہیے کہ انسان اور حیوان کو ایک ہی نظر سے دیکھے ۔ اگر اس کی نظر میں کچھ بھی فرق محسوس ہوتا ہو، تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ آدمی خلوص کے درجات پر فائز نہیں ہوسکا ۔ اس کے متعلق ہم نے "باب الریا" میں سب کچھ دیا ہے۔

اِس قسم کی غلط فہمیاں آدمی کو بہت سی پیدا ہوجاتی ہیں ۔ لہٰذا ان باریکیوں کو سمجھ لینا ضروری ہے، ورنہ اس کی عبادات رائیگاں جاتی ہیں ۔ خداوند عالم نے اس آیۂ کریمہ میں اسی شخص کے لیے ارشاد فرمایا ہے وَبَدَا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (یعنی اُن پر خدا کی طرف سے وہ ظاہر ہوتا ہے جس کا ان کو گمان بھی نہیں ہوتا)

ریا اور خلوص میں ثواب کا درجہ توجیہہ : جب آدمی کی نیت میں خلوص نہ رہا اور "ریا" اگر غالب آگئی ہے ۔ تو بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہوگا ۔ اور اگر خلوص و ریا برابر ہی برابر ہیں تو نہ ثواب رہا اور نہ عذاب ، اور اگر ظاہرداری اور ریا کم ہے ، خلوص اس پر حاوی ہے تو ثواب ملنا چاہیے ۔ حالانکہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کے لیے خدا کا حکم ہوگا کہ جس کے لیے یہ عمل کیا تھا ، اس سے اجر بھی مانگ لا!

مُصنّف کی رائے لیکن میرے خیال میں اس حدیث کے ماتحت وہ اعمال آئیں گے جس میں ریا اور خلوص کا پلہ برابر ہوگا ، اس وقت ثواب سے محروم کردیا جائے گا ۔ اور یہ حدیث دراصل اس شخص کے لیے ہے جس کے دل میں صرف "ریا" ہی ہو ۔ لیکن اگر خلوص کا پلہ بھاری ہے تو ثواب ملنا چاہیے ۔ یا اگر خلوص و ریا دونوں بھی برابر ہیں تو بھی وہ ثواب کا مستحق ہونا چاہیے ، اور اس کے جواز میں دو دلائل ملتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ سزائے الٰہی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ درگاہ باری سے انسان کا دل دُور رہتا ہو، اور یہ دوری ہی باعثِ عذاب ہوتی ہے۔ اس کے متعلق پہلے بہت سی مثالیں دی جاچکی ہیں۔

اسی طرح خداوندعالم کی قربت کو حاصل کرنے کا "اجر" ثواب ہے۔ لہٰذا جب آدمی نے دونوں راستے (یعنی گناہ اور ثواب کے) اختیار کیے، تو دُوری اور نزدیکی دونوں برابر ہوئیں۔ اگر وہ راہِ آخرت سے ذرا ہٹ جاتا ہے۔ تو اتنا ہی قریب بھی ہوتا ہے۔ خداوندعالم ارشاد فرمارہا ہے کہ فَمَن یَّعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ خَیرًا یَّرَہٗ وَمَن یَّعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اس کا اجر کاٹے گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس میں احتیاط ضرور برتنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی اپنی غرض کو مضبوط ہونے کے باوجود کمزور سمجھے۔ یہ انسان کی عقل کا بھی فتور ہے۔

دراصل آدمی کی نیک نفسی اور راہ روی کی نشانی تو یہ ہے کہ وہ اعمال میں نفس کی پیروی کو قطعی دخل ہی نہ دے۔

حج میں تجارت جائز ہے | دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر آدمی حج کو جائے اور راستے میں تجارت کرے، تو وہ تجارت جائز ہے۔ اگرچہ اس حج کا ثواب قطعی خالص نہ رہ سکے گا۔ لیکن ثواب ضرور ملے گا۔ اس لیے کہ اس کا اصل مقصد حج ہے، اور باقی کام اس کے ماتحت ہیں۔

اسی طرح آدمی جہاد کو یہ سمجھ کر کرسکتا ہے کہ کفار کو ختم بھی کرے اور مالِ غنیمت بھی لے، لیکن اگر صرف مالِ غنیمت ہی اکٹھا کرنے کے لیے جہاد کر رہا ہے تو البتہ ثواب میں اندیشہ پیدا ہوسکتا ہے۔

(نوٹ) اس مسئلے پر تمام علماء و اکابرین کو اتفاق ہے۔

ظاہر ہے کہ خداوندعالم جب تک انسان کو اس عالم ظاہر سے قطعی الگ نہ کرلے گا، اس قسم کی کمزوریاں باقی رہتی ہیں خصوصاً درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں۔ یا وہ تمام اعمال اور اخلاق جو مخلوق سے متعلق ہیں۔ جیسے کسی کی تصنیف کو کسی دوسرے سے منسوب کردیا جائے۔ یا اس کے کلام کو دوسرے سے نسبت دے دی جائے۔ چاہے اس شخص کو معلوم ہوجائے، اور وہ بُرا بھی سمجھے، لیکن یہ عمل اچھا نہ ہونے کے باوجود بھی لوگ اس میں ملوّث رہتے ہیں۔

باب سوم

"صدق"

صدیق | صدق بھی اخلاص کے بالکل قریب ہی ہے، جو آدمی "صدق" کے درجات حاصل کرلیتا ہے۔ اس کو صدیق کہتے ہیں۔ خداوندعالم کلام اللہ میں صدیقین کی تعریف فرمارہا ہے۔ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيهِ دوسری جگہ اور ارشاد ہورہا ہے کہ لِيَسئَلَ الصَّادِقِينَ عَن صِدقِهِم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ درجہ کمال آدمی کو کب نصیب ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا، کہ سچائی اور صدق کو حاصل کرنے پر۔

صدق کے معنی سچائی کے ہیں۔ صدق چھ چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جو آدمی ان چھ مدارج کو طے کرے گا۔ وہ صدیق کہلاتا ہے۔

پہلا "صدق" آدمی حال، ماضی اور مستقبل کسی زمانے کے لیے کبھی جھوٹ نہ بولے۔ پہلے ہم نے لکھا ہے کہ دل، زبان سے صفات کو کسب کرتا ہے اور جب جھوٹ بولا جائے گا دل کی صفائی میں ضرور فرق آجائے گا۔

کمال صدق دو باتوں سے حاصل ہوتا ہے۔

اول یہ کہ آدمی ایسی بات بھی نہ کہے کہ جس سے سننے والا کوئی دوسرا مطلب نکال لے۔ اگر متکلم صحیح ہی کہہ رہا ہو۔ نہ مصلحتاً ہی کہیں جھوٹ بولے۔ مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شوہر اور بیوی میں صلح کرانے میں جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں۔ یا دو مسلمانوں کے آپس میں صلح کرانے میں مصلحتاً جھوٹ بول سکتے ہیں۔ دراصل صدیق کی تعریف یہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی جھوٹ نہ بولے، اور حتی الوسع سچ بولنے کی کوشش کرے اور اگر خدا کے لیے یا خلق اللہ کی بہتری کے لیے جھوٹ بولے گا تو البتہ صدیقیت سے نہ گرے گا۔

دوسرا کمال یہ ہے کہ خداوند عالم سے دعا کرے کہ مجھے سچ بولنے کی توفیق عطا فرما! مثلاً جس وقت بندہ کہتا ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ (یعنی میں تیرا بندہ ہوں) اور دراصل وہ اس وقت بھی دنیا داری میں مشغول ہے تو گویا کہ اس نے جھوٹ بولا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ (عبد الدرہم و عبد الدینار) یعنی ایسا آدمی روپے پیسے کا غلام ہے۔

انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے آزاد ہو جائے۔ یہاں تک کہ خود کو بھی بھول جائے اور ہر چیز کو رضائے الٰہی پر چھوڑ دے۔ اپنی طرف سے اچھی بری، نیک و بد کی خواہش نہ کرے۔ بس اسی کے ارادے کا محکوم رہے۔ جب آدمی اس کمال کو پہنچتا ہے۔ اس وقت وہ "صدیق" ہو سکتا ہے۔

صدق دوم۔ نیت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کس طرح یا کسی حیثیت سے بھی رضائے الٰہی کے خلاف نہ سوچے۔ اور اس کا کسی طرح بھی شریک کسی چیز کو خیال نہ کرے۔ اس کے معنی ہیں اخلاص، اور اخلاص ہی کو یہاں صدق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر انسان اپنی عبادات میں کسی دوسری چیز کو دل میں لائے گا، تو بھی درجۂ صدق باقی نہیں رہ سکے گا۔

صدق سوم۔ انسان کے ارادے اور خیالات سے متعلق ہے۔ مثلاً آدمی سوچنے لگے کہ اگر میں بادشاہ

ہو جاؤں تو تمام دُنیا میں عدل و انصاف کا بازار گرم کر دوں۔ یا مالدار ہو جاؤں، تو تمام مال فقراء کو تقسیم کر دوں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے توہمات اگر آدمی علم یقین کے ساتھ کرتا ہے تو اس کو "صدق عزم" کہتے ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ یہ خواہش بے اصل (بے سروپا) ہے یا یہ خواہش صحیح ہے۔

صدّیق وہ ہے جس کے دل میں صدقہ اور خیرات کا عزم راسخ ہو، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر میری گردن مار دیں تو میں اس امارت سے زیادہ پسند کروں گا جہاں حضرت ابو بکر صدیق موجود ہوں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ آپ کے دل میں قتل ہونے کا عزم راسخ موجود تھا۔ اور اگر کوئی آدمی ایسا بھی موجود ہو کہ جس کو جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے قتل کا اختیار دیں، اور وہ ان کے مقابلے میں اپنی زندگی زیادہ عزیز سمجھے، تو سوچنا چاہیے کہ حضرت عمر اور اس شخص میں کتنا تفاوت ہوگا۔

صدق چہارم - ارادوں کا اتنا پکّا ہو، کہ میدانِ جنگ میں اگر جان کی ضرورت ہو، تو قربان کر دے گا۔ یا مثلاً اس سے بہتر کوئی اور آدمی ہو، تو حکومت اس کو سونپ دے گا، لیکن اس کی نیّت اور عمل میں فرق پڑ جاتا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ مردوں نے اپنے وعدوں کو پورا کیا اور اپنے کو قربان کر دیا۔ اسی طرح جن لوگوں نے مال کے متعلق وعدہ کر کے بھی وفا نہ کی، اُن کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ تا وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ - یہ آیت وعدہ خلاف لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے۔

صدق پنجم یہ ہے کہ آدمی اپنی اصل صفت کے مطابق ہی بات کہے۔ یعنی انسان کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ یہ درجہ اس کو زیادہ تر نصیب ہوتا ہے، جس کا باطن ظاہر سے زیادہ اچھا ہوتا ہے، یا ظاہر و باطن ایک سا ہی ہو، تو بھی غنیمت ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دُعا کی کہ بار الٰہا! میرا باطن بہتر بنا دے۔

پس جو آدمی اس معیار پر نہیں اُترتا، وہ جھوٹا ہے۔

صدق ششم یہ ہے کہ آدمی راہ آخرت اور معرفتِ الٰہی کا حقیقی دل سے طلب گار ہو۔ صرف چند خصوصیات پر نظر نہ رکھے کہ میں زاہد، عابد ہو جاؤں یا خوف و رجا کی منازل پہ پہنچ جاؤں۔ باتیں تو تھوڑی بہت ہر مسلمان میں ہی پائی جاتی ہیں، لیکن بہت ضعیف ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، تو وہ صدیق کہلاتا ہے ——— خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (یعنی مومن وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسُول پر ایمان لائے، اور کسی قسم کا شبہ نہیں کرتے، اور خدا کی راہ میں اپنے مال

اور جان سے جہاد کرتے ہیں اور وہ ہی صادقین ہیں) معلوم ہوا کہ صادق کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور جس کا ایمان مکمل ہو، وہ ہی صادق ہو سکتا ہے۔

اس کی پہچان یہ ہے، کہ آدمی اگر کسی فعل کے ارتکاب سے ڈرتا ہے تو وہ کپکپانے لگتا ہے۔ اس کا چہرہ مارے خوف کے کانپنے لگتا ہے۔ اور اس ڈر میں وہ کھانا پینا بھی چھوڑ دیتا ہے۔ پس اگر آدمی خداوند عالم سے اتنا ڈرتا ہے تو وہ "صادق" ہے۔ اور اسی کو خوف صادق سے منسوب کیا جائے گا۔ اور اگر آدمی صرف زبانی خوف جتاتا رہے، اور ساتھ ہی ساتھ گناہ بھی کرتا رہے تو وہ خوف "کاذب" کہلائے گا۔

یہ معیار تم کو بتا دیا گیا ہے کہ جو آدمی ان چھ چیزوں میں سچا اترے، وہ "صدیق" ہے۔ اب جتنا جتنا اس کے درجات بڑھتے جائیں گے درجہ صداقت بھی بلند ہوتا رہے گا، اور اس کا معیار صرف اسی کے دل سے تعلق رکھتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چھٹا اصول

(باب المحاسبہ)

محاسبہ و مراقبہ

ارشاد ہو رہا ہے کہ روزِ قیامت ہر ایک کے اعمال ترازو میں تولے جائیں گے۔ اگر کسی نے شمہ برابر بھی نیکی کی ہے، اس کا بدلہ بھی اس کو دیا جائے گا ——— پس جب خداوندِ عالم نے پہلے یہ وعدہ کیا اس کے بعد فرمایا کہ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔

حدیث میں ہے کہ عقلمند آدمی اپنے لیے چار اوقات مقرر کر لیتا ہے۔ ایک مرتبہ اپنے اعمال کو تولتا ہے، اس کے بعد خداوندِ عالم سے دعا کرتا ہے، پھر کسب معاش میں بہتری کی خواہش کرتا ہے، اور آخر میں ان سب چیزوں سے محظوظ ہوتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کا قول ہے کہ اپنے نفوس کا جائزہ لو! قبل اس کے کہ میدانِ حشر میں تمہارا اعمالنامہ پیش کیا جائے اور خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (یعنی صبر سے کام لو، اور اپنے نفس سے جہاد کرو، تاکہ بہتر سے بہتر بن سکو) اسی لیے صاحبان بصیرت نے اپنا نظریہ یہ بنا لیا کہ ہم اس دنیا میں صرف تجارت کرنے آئے ہیں، اور وہ تجارت نفس سے ہے اور اس کے منافع یا نقصان جنت و دوزخ سے ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے اپنے نفس کو اس تجارت میں اپنا شریک بنا لیا، اور اس سے چھ شرائط بحیثیت شریک کے طے کیے۔

مشارطہ[1] - مراقبہ[2] - محاسبہ[3] - معاقبہ[4] - مجاہدہ[5] - معاتبہ[6] -

پہلا معاہدہ مشارطہ : اس کی تفصیل اس طرح سمجھنا چاہیے کہ اہل شرکت ہمیشہ نفع ونقصان کا شریک رہتا ہے - ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں بے ایمانی آجائے ، اور وہ تمھارا دشمن ہوجائے - لہٰذا اس سے سختی کے ساتھ "حساب کتاب" میں پیش آنا مناسب ہے - اور یہ معاملہ تو ابدالآباد تک کا ہے - لہٰذا اس میں ہر قدم پھُونک پھُونک کر رکھے - اگر محض دُنیاوی معاملات ہوں ، تو وہ فانی ہوں گے اور اس میں کوئی پروا نہ ہونا چاہیے -

بزرگوں کا قول ہے ، کہ مٹ جانے والا شر ، باقی نہ رہنے والے خیر سے اچھا ہے - انسان کا نفس چونکہ ایک بے بہا خزانہ ہے ، لہٰذا اس میں جہاں تک ہوسکے ، حساب کتاب رکھے -

عاقل وہ ہے ، جو نمازِ صبح کے بعد اپنے نفس کا جائزہ لے اور اس کو ہدایت کرے کہ ہر نفس زندگی گزر رہا ہے ، جو سانس گزر گیا ، وہ واپس نہیں آتا - اور یہ سانس جو خداوندِ عالم نے مقرر کردیے ہیں - اگر سب گزر گئے تو تجارت کا سلسلہ ہی ختم ہوجائے گا - لہٰذا جو نیک کام کرنا ہے ، اس کو کر ڈالنا چاہیے - اس لیے کہ اس زندگی کے بعد آرام ہی آرام ہے - وہاں کوئی کام نہیں - اور آرام ہی آرام ہے - لہٰذا اس زندگی کے لمحات کو غنیمت جان - کہیں رات کو سوتے میں ہی عمر ختم نہ ہوجائے - اس کے بعد دستِ حسرت ملے گا ، اور پھر تیرے لیے کچھ نہ ہوگا - اب یہ سمجھ لے کہ صرف ایک ہی دن کی مہلت ملی ہے - لہٰذا وقت خراب نہ کر ! لہٰذا جتنا جلد ہوسکے سعادت ابدی حاصل کرلے -

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ، دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے عوض "چوبیس خزانے" آدمی کو دیئے جائیں گے ، اور اگر اس نے دنیا میں نیک اعمالیاں کی ہیں ، تو اس میں ایک ہی خزانے سے اس کا دل اتنا معمور ہوجائے گا ، کہ اگر وہ تمام دوزخ والوں کو اس کے نور کا کچھ حصہ دے دے تو وہ دوزخ کے مصائب کو بھول جائیں گے - اس کے بعد دوسرا خزانہ کھولے گا وہ بہت تنگ وتاریک ہوگا - اس میں سے اتنا تعفن پھیلے گا کہ اگر اہل جنت کو سُنگھا دیا جائے ، تو جنت بھی اُن پر دوزخ بن جائے گی -

پھر تیسرا خزانہ کھولا جائے گا ، لیکن وہ بالکل خالی ہوگا - وہ انسان ایسے دنیوی اوقات سے متعلق ہوگا ، آدمی کہ جس نے اس کے گناہ اور ثواب کوئی کام نہ کیا ہو - اس خزانے کو دیکھ کر بندہ بہت شرمندہ ہوگا - اس کے بعد یکے بعد دیگرے چوبیس گھنٹوں کے عوض میں چوبیس خزانے کھولے جائیں گے -

لہٰذا اس دنیا میں آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت نیکی کرے ، اور اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ تجھ کو خداوند عالم نے بخش ہی دیا - تو تجھ کو صالحین کا درجہ تو ملنا ناممکن ہے - لہٰذا کوشش کرو ، کہ اپنے تمام اعضا کو گناہوں سے

محفوظ رکھو۔

اور تیرے جسم کے سات اعضا کی طرح سات ہی دوزخ کے دروازے بھی ہیں۔ اور اس میں ہر ایک عضو کے گناہ کے بدلے میں ہر دروازے سے الگ الگ جانا پڑے گا۔ لہٰذا اس کا تصوّر کر کے گناہوں سے پرہیز کرو۔

اپنے نفس کو ہر وقت ہدایت کرنا چاہیے، کہ وہ گناہوں سے بچا رہے۔ اگرچہ نفس سرکشی کرتا ہے، لیکن پھر بھی تیرا مطیع ہو سکتا ہے اور اس کی اطاعت تیری ریاضت کی وجہ سے ہوگی —— یہ تمام باتیں محاسبے میں داخل ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ
آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ دُور اندیش آدمی وہ ہے، جو اپنے نفس سے محاسبہ کرتا ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ نفس سے روز محاسبہ کرے اور صبح اُٹھتے ہی اوّل اپنے نفس کو ہدایت کر دے۔

دوسری منزل مراقبہ دوسری منزل مراقبہ ہے۔ مراقبے کے معنی محافظت کے ہیں۔ جس طرح آدمی اپنے حصّہ دار کو اپنا مال سپُرد کر کے اس کی خبر گیری کرتا ہے۔ اسی طرح نفس کی حفاظت اور نگہبانی کی ضرورت ہے۔ ورنہ تمھارا نفس سرکشی پر آمادہ ہو کر شہوت کی طرف رجُوع ہو جائے گا، اور آخرت کی یہ پُونجی تباہ کر دے گا۔

خداوند عالم کے متعلق یہ یقین ہونا کہ وہ تمہارے تمام افعال کو ہر وقت دیکھتا ہے، یہ حقیقی مراقبہ کہلاتا ہے۔ اگر آدمی کو اس بات کا یقین نہیں ہے، تو وہ کافروں کی مثل ہے۔ خداوند عالم خود فرما رہا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (یعنی بندہ یہ نہیں جانتا کہ خدا دیکھ رہا ہے؟)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ایک حبشی نے عرض کیا کہ میرے گناہ بخش دیئے جائیں گے، اگر مَیں توبہ کر لوں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں! اس نے پھر عرض کیا کہ میرے تمام گناہوں کو خداوند عالم ہر وقت دیکھتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! حبشی نے یہ سُنا اور ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑا، اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ آدمی کے افعال اور کردار اس وقت تک دُرست نہیں ہو سکتے جب تک وہ یہ یقین نہ کر لے کہ خداوند عالم اس کو ہر وقت دیکھتا ہے۔ وہ خود ارشاد فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا"، بلکہ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر وقت اس کے جلوے کا نظّارہ کرتا رہے۔

حکایت ایک پیر اپنے تمام مریدوں میں ایک آدمی کو زیادہ چاہتا تھا۔ دوسرے مُرید اس کے اس عمل سے بدظن تھے۔ ایک دن پیر نے تمام مُریدوں کو ایک ایک چڑیا دی اور حکم دیا کہ اس کو ایسی جگہ ذبح کریں کہ کوئی نہ دیکھ پائے۔ چنانچہ سب مُرید اس چڑیا کو تنہائی میں ذبح کر لائے، لیکن وہ شاگردِ رشید چڑیا کو زندہ ہی واپس لے آیا۔ پیر نے اس سے سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہ ملی

جہاں وہ ناظرِ حقیقی مجھے نہ دیکھ رہا ہو۔ اِس کے بعد مُریدوں کو سمجھایا کہ اس لیے قابلِ قدر ہے کہ اِس کو ہر جگہ خُدا نظر آتا ہے۔

جب زلیخہ نے حضرت یُوسُف کو تنہائی میں بُلایا، تو اُس بُت پر کپڑا ڈال دیا، جس کو وہ پُوجتی تھی۔ حضرت یُوسُفؑ نے فرمایا کہ تو اِس پتھر سے اتنا شرم کرتی ہے، تو میرا خدا تو دُنیا کے ہر کونے کا مالک ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ پھر میں اس سے کیوں نہ شرم کروں؟

حضرت عبداللہ بن دینار سے روایت ہے کہ میں ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکّہ معظّمہ جا رہا تھا۔ ایک گڈریا اپنی بکریوں کو چراتا ہوا اُدھر آ نکلا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کر دے۔ اس نے کہا کہ میں صرف ان کی نگہبانی پر مقرر ہوں۔ یہ بکریاں میرے آقا کی ملکیت ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تیرے مالک کو کیا خبر ہوگی، کہ بکری تو نے فروخت کر دی، تو اس سے کہہ دینا کہ بکری کو بھیڑیا لے گیا۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں دیکھ رہا، لیکن وہ خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سُن کر بہت روئے اور اُس کو خرید کر آزاد کر دیا کہ اس دنیا میں بھی تو آزاد ہو گیا اور آخرت میں بھی آزاد ہو گا۔

مدارجِ مراقبہ

مراقبے کے دو درجات ہیں۔ ایک صدیقین کا مراقبہ، کہ ان کا دل سوائے خدا کے اور کسی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ دوسرا مراقبہ صرف ظاہر پرستی کا ہے۔ اس لیے کہ جب دل خداوندِ عالم کے علاوہ کہیں ٹھہر جائیگا۔ تو ظاہر ہے کہ مناجات نہ کر سکے گا۔ اور ایسی صورت میں اس سے علاوہ گناہوں کے کیا سرزد ہو سکتا ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ مَنْ اَصْبَحَ وَهُمُوْمُهٗ هَمٌّ وَاحِدٌ كَفَاهُ اللّٰهُ هُمُوْمَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (یعنی جو آدمی صبح کو ہمّت والا ہو کر اٹھتا ہے، خداوندِ عالم اس کے ارادوں میں توفیق عطا فرماتا ہے، تاکہ آخرت کے کاموں میں زیادتی ہو سکے)۔

بعض لوگ تو مراقبے میں اتنے مستغرق رہتے ہیں کہ لوگ اُن کے پاس جاتے ہیں تو باوجود آنکھ کھلی ہونے کے بھی وہ اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ حضرت عبدالواحدؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا کوئی ایسا آدمی ہے، جو دنیا میں کسی کام کی طرف مشغول نہ ہو، اور وہ خدا کی طرف ہی لَو لگائے بیٹھا رہے۔ آپ نے فرمایا ہاں! ایک آدمی ہے اور وہ ابھی آتا ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عتبۃ الغلام رحمۃ اللہ علیہ سامنے سے آ رہے ہیں۔ آپ سے دریافت کیا کہ آپ نے راستے میں کس کس کو دیکھا؟ جواب دیا کہ کسی کو بھی نہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام جا رہے تھے، انھوں نے یکبارگی ایک عورت پر ہاتھ مارا اور اس پر گر پڑے۔ لوگوں نے متعجب ہو کر دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس کو دیوار سمجھا تھا۔

ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ تیر اندازی میں مشغول ہیں، لیکن ایک شخص ان سے بالکل الگ تھلگ بیٹھا ہے۔ بزرگ نے اس شخص سے بات کرنا چاہی، تو فرمایا کہ بات کرنے سے بہتر یہ ہے کہ خدا کا ذکر کروں اور اس سے باتیں کروں۔

حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ مراقبے میں اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کے جسم کا ایک بال بھی نہ ہلتا تھا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا کہ یہ عمل کس سے سیکھا؟ حضرت نوری نے فرمایا کہ بلی سے۔ اس لیے کہ وہ جب کسی بل کے سامنے چوہے کا انتظار کرتی ہے تو اس سے زیادہ سکوت طاری ہوتا ہے۔ یہ ہے صدیقین کا مراقبہ!

دوسرا مراقبہ نیکوں اور اصحاب یمین کا ہوتا ہے۔ وہ لوگ خداوند عالم کے جلال میں اس قدر کھو نہیں جاتے بلکہ اُن کو احوال عالم کا بھی علم ہوتا ہے۔ جیسے ایک آدمی تنہائی میں نہا رہا ہو، اور کوئی بچّہ وہاں آ جائے تو وہ اس کی شرم کی وجہ سے اپنے کو حتی الامکان چھُپانے کی کوشش کرے۔ اس میں دوسری صورت یہ ہے کہ اگر آدمی ننگا ہو اور بادشاہ سامنے سے گزر جائے تو اس کو اپنے جسم کی پروا نہ ہو، بلکہ بادشاہ کی ہیبت اور ڈر سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ایسے آدمی کو اپنے حرکات اور سکنات میں مراقبہ ضروری ہے۔ اور اُس کی نظر دو چیزوں پر ہونا چاہیے۔ پہلے یہ کہ جو بات اس کے دل میں آئے، وہ اس کو سمجھے کہ کیا کیا تخیلات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ تصورات خدا کے لیے ہوں، تو مراقبے میں رہے۔ اور اگر دنیاوی خیالات پیدا ہونے لگیں تو چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ یہ تخیلات ہی کیوں اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ لہٰذا اِن دونوں چیزوں کو پہلے سوچ لینا ضروری ہے۔ اور مراقبے میں یہ چیزیں اوّل ضروری ہوتی ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ بندوں سے اُن کے حرکات و سکنات کے متعلق تین قسم کے سوالات کیے جائیں گے۔

پہلے یہ کہ اس نے وہ عمل کیوں کیا؟ دوسرے یہ کہ کیسے کیا۔ تیسرا یہ کہ کس لیے وہ عمل سرزد ہوا۔

پہلے کیوں اور "کیا" کے یہ معانی ہیں کہ اس سے اس عمل کی باز پرس کی جائے گی۔ اگر اس نے خدا کے لیے کیا ہے تو اس سے "کیونکر" کا سوال ہوگا۔ اس لیے کہ ہر عمل کے لیے اس کے علم اور ادب کا ہونا ضروری ہے یعنی اُس نے وہ کام جان بوجھ کر کیا ہے، یا نادانی سے عمل در آمد ہو گیا ہے۔ اگر اس نے اخلاص اور علم کی بناء پر کیا ہے، تو اُس کو اجر دیا جائے گا، اور اگر دُنیا داری کے لیے ہوگا تو عذاب نازل ہوگا۔

جو آدمی اِس بات کو سمجھ لے گا اس کے بعد اس کا دل حقیقی مراقبے کی طرف رجوع ہوگا، اور اگر ان تمام خطرات کو اوّل دُور نہ کرے گا تو رفتہ رفتہ یہ عادات پختہ ہو کر ویسے ہی عمل سرزد ہوں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے اِن چیزوں کو دل سے نکال دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جس کام کی نیت کرے اوّل خدا سے ڈرے۔

خطرات کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے کہ کون کام نفس کے لیے ہے اور کون خدا کے لیے۔ ایسے آدمی کو کسی باعمل صالح کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تاکہ اس سے استفادہ حاصل کرے۔ ظاہری علماء سے پرہیز کرے۔ اس لیے کہ وہ شیطان کے پیرو ہوتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ دُنیا دار عالم میری راہ سے بھٹکانے والے ہیں۔ اُن سے پرہیز کرنا ہی ضروری ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم دُور اندیش آدمی کو دوست رکھتا ہے۔ اور اُن لوگوں کو جو خواہشات کے غلبے کے وقت عقل سے کام لیتے ہیں۔

آدمی کا کمال صرف انھیں دو امور میں مضمر ہے کہ کام کی تہ کو اپنی عقل سے پہچان کر اس خواہش کو ختم کر دے۔ یہ دونوں باتیں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے کہ اگر عقل کو شہوت دُور نہ کر سکے گی تو چشمِ بصیرت گناہوں کو پرکھنے میں قاصر رہتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی جب گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو عقل اس سے قطعی طور پر الگ ہو جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ انسان کے کام تین بُنیادوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یا تو قطعی طور پر باطل ہوں گے، یا قطعی طور پر دُرست ہوں گے، اور یا کسی کام میں آدمی کو شبہات ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے کاموں کو عالموں سے دریافت کر لو اور باطل امور کو چھوڑ دو۔

دوسرے وہ مراقبہ جو آدمی کی نظر تین حالات سے خالی نہیں ہوتی۔ آدمی کا وہ اقدام یا تو اچھا ہوگا یا بُرا، یا با اطاعت اور فرماں برداری کے ماتحت۔ اطاعت میں آدمی ہر کام کو خلوص کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کو تمام آداب کا خیال رہتا ہے۔

(معصیت) میں مراقبہ اس طرح کرے کہ اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کرے اور استغفار کرے ——

مباح میں یہ صورت ہونا چاہیے کہ تمام دُنیا کی نعمتوں کو دیکھ کر "خدا" کی معرفت حاصل کرے، اور اپنے تن من دھن کو ہر وقت خداوندِ عالم کی بارگاہ میں حاضر سمجھتا رہے۔ مثلاً جب بیٹھے تو ادب کے ساتھ، اور سوئے تو داہنی کروٹ سے سوئے۔ یہاں تک کہ سوتے وقت بھی ذکرِ خدا اور معرفت کی منازل سامنے رہیں۔ تفکّر تمام عبادات سے اسی لیے افضل بتایا گیا ہے۔ آدمی اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو دیکھ کر خدا کو یاد کرتا رہے۔ انسان کے تمام اعضا خداوندِ عالم کا آئینہ ہیں یہ تفکّر علما کے مرتبے کو پہنچاتا ہے۔

موحّدین، صدّیقین اور زہاد

موحّدین اور صدّیقین بعض لوگ دُنیا کی گوناگوں صنائع سے سبق لیتے ہیں اور اس کے جمالات سے مستفیض

ہو کر ترقی کی راہوں کو طے کرتے ہیں۔ یہ موحدین اور صدیقین کا درجہ ہے۔

زہاد بعض لوگ کھانے سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور بقدرِ ضرورت کھا کر بھی اس خواہش میں رہتے ہیں۔ کہ ہم کو کھانے کی خواہش ہی نہ ہوتی تو اچھا ہو، یہ زہاد کی نشانی ہے۔

بعض لوگ کھانے پر بھی جان دیتے ہیں اور کھانے کے ذائقے کو چکھ کر اس کے عیوب تلاش کرتے ہیں ان کا دل ہر وقت کھانے میں ہی لگا رہتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ عیب بھی نکالتے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب چیزیں خداوند عالم کی صفتوں کا نمونہ ہیں اور ان پر نکتہ چینی کرنا صانع حقیقی کی عیب جوئی کے برابر ہے یہ غفلت شعاروں کا طریقہ ہے۔ یہ سب مدارج مباحات سے متعلق ہیں۔

محاسبہ تیسرا مقام محاسبہ ہے ——— محاسبہ انسان کے اعمال کے بعد ہوتا ہے۔ لہٰذا آدمی کو خود چاہیے کہ رات کو سوتے وقت جب بستر پر لیٹ جائے تو اپنے اعمال کو پرکھ لے کہ اس نے دن بھر کیا کیا کیا ہے؟ انسان کے لیے "سرمایہ" کے واجبات ہیں۔ اور ادائیگی نوافل اس کا منافع ہوتے ہیں اور نفس اس کا شریک ہے۔ لہٰذا اس سے باقاعدہ بازپرس کرے۔ اگرچہ نفس انسان کے سامنے خوف کی وجہ سے جھکتا ہے۔ لیکن دراصل یہ اس کا منافقانہ رویہ ہے۔ اگر اس سے سختی نہ کرے گا تو وہ سر پر چڑھ جائے گا۔

ایک بزرگ کی عمر ساٹھ سال تھی۔ انھوں نے دنوں کا حساب لگا کر دل میں سوچا کہ اگر روز میں نے ایک گناہ کیا ہے تو ساٹھ سال میں اکیس ہزار چھ سو گناہ ہو گئے، اور اگر کسی دن اور زیادہ ہو گئے تو یہ سب گناہ کیسے بخشے جائیں گے؟ انھوں نے یہ سب کچھ سوچا اور ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑے۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ انتقال ہو چکا تھا۔

آدمی اس بات کا عادی ہے کہ تمام دن لہو و لعب میں گزار دے گا، اور کوئی پرواہ نہ کرے گا، لیکن اگر "سُبحانَ اللہ" پڑھے گا، تو ہاتھ میں تسبیح لے کر اور لوگوں سے اس کے اعداد و شمار بھی بتائے گا کہ میں نے اتنی بار پڑھا ہے۔ آدمی اس کے سوچنے میں بڑا غافل ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ اگر وہ ایک گناہ روزانہ کرتا ہے تو عمر بھر میں کتنے گناہ جمع کرے گا۔ اب وہ اپنے نیک اعمال سے لہو و لعب کا توازن کرے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس نے گناہ کتنے کیے اور ثواب کیا کمایا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اس وقت سے پہلے کہ تمھارے اعمال کا حساب کتاب ہو خود ان کو پرکھ لو! چنانچہ جب آپ رات کو واپس ہوتے، تو اپنے پیروں پر دُرّے مارتے اور کہتے کہ آج تو نے کیا کیا کیا ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری وقت فرمایا،

کہ مجھے عمر سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنے نفس کا جائزہ لیا اور فرمایا نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ابن سلام رحمۃ اللہ علیہ ایک بار لکڑیوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ کام تو آپ کے لیے موزوں نہیں ہے۔ فرمایا کہ میں اپنے نفس کا جائزہ لینا چاہتا تھا ــــــ حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک بار حضرت عمرؓ ایک دیوار سے لگے ہوئے اپنے نفس سے فرما رہے تھے کہ سُبحان اللہ! تجھ کو لوگ امیر المومنین کہتے ہیں، اور تو اتنا نڈر ہے۔ لہٰذا خدا کے عذاب کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہو!

معاقبہ چوتھی منزل

چوتھی منزل مُعاقبۂ نفس ہے۔ اگر آدمی اپنے نفس کی لجام کو ڈھیلا چھوڑ دے، تو وہ خود سر ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد اس کا قابُو میں آنا ناممکن ہے۔ لہٰذا ہر کام میں اس کی نگہداشت ضروری ہے۔ مثلاً اگر کسی وقت نامحرم کی طرف نظر کی، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ آنکھ بند کر لے۔ یا اگر حرام شئے کھالی ہے تو پھر بھوکا رہے تاکہ نفس کو اس سزا سے سبق مل سکے۔

بزرگانِ دین کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر عضو کو اسی قسم کی سزائیں دیتے تھے۔ مثلاً ایک بزرگ نے ایک نامحرم عورت کو چھو دیا۔ اس کے بعد اس ہاتھ کو آگ سے جلا دیا۔ بنی اسرائیل میں ایک شخص گوشہ نشین تھے۔ ایک عورت اُن کے پاس آئی، اور اُن سے خواہش ظاہر کی۔ نفس باطل اس وقت بھڑک اُٹھا۔ وہ وہاں سے باہر آئے۔ لیکن باہر نکلتے ہی اس گناہ کا خیال آگیا، اور پھر صومعہ میں واپس آنے لگے اور اپنے اِس پَیر کو یہ سزا دی کہ سردی گرمی کی کوئی احتیاط نہ برتی، حتیٰ کہ وہ سُوکھ کر جسم سے الگ ہو گیا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ابن الکرینی کو بدخوابی ہو گئی۔ رات کو اُنہوں نے نہانے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کو سردی کی وجہ سے کچھ جھجک محسوس ہوئی۔ انھوں نے فوراً طے کر لیا کہ میں اپنے نفس کو یہ سزا دُوں گا کہ مع کپڑوں کے نہاؤں گا۔ اور ان کپڑوں کو اپنے جسم پر ہی سکھاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ ایک بزرگ نے ایک بار ایک محرم کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد سے اُنھوں نے ٹھنڈا پانی پینا چھوڑ دیا۔ حضرت حسّان رحمۃ اللہ علیہ ایک باغیچے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ منظر بہت پسند آیا۔ آپ نے کسی سے پُوچھا کہ یہ کس نے بنایا۔ یہ سوال کرتے ہی پھر خیال آیا کہ مجھے کیا غرض! اور اس سزا میں ایک سال تک روزے رکھتے رہے۔ حضرت طلحہؓ ایک بار اپنے نخلستان میں نماز پڑھ رہے تھے۔ سامنے سے ایک چڑیا بہت خوب صُورت اُڑ رہی تھی، اس کو دیکھ کر نماز کی رکعتوں کا شمار بھُول گئے۔ اِس کے کفّارے میں پُورا نخلستان صدقے میں دے دیا۔ مالک بن ضیغم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک بار رباح القیسی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور میرے والد ماجد کو بُلایا۔ نماز عصر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ وہ سو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سونے کا کون سا وقت ہے؟ یہ فرمایا اور واپس ہو گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

وہ اپنے نفس سے کہتے جارہے تھے کہ تجھے اس سوال سے کیا غرض تھی؟ لہٰذا ایک سال تک برابر تکیئے پر سر رکھ کر نہ سوؤں گا۔ مجمع نامی ایک شخص نے چھت کی طرف دیکھا، تو ایک عورت کی طرف نظر پڑی۔ پھر قسم کرلی کہ آئندہ سے آسمان کی طرف کبھی نہ دیکھوں گا۔ احنف بن قیس علیہ الرحمۃ روزرات کو چراغ لے کر اپنی انگلیاں جلایا کرتے اور کہتے جاتے کہ فلاں دن تو نے فلاں گناہ کیا اور فلاں دن فلاں۔

یہ تھیں احتیاطیں بزرگانِ دین کی —— وہ سمجھتے تھے کہ اگر نفس کو فوری طور پر انتباہ نہ کیا گیا تو سرکش ہو جائیگا۔

مجاہدۂ نفس

پانچویں منزل مجاھدہ : بعض بزرگوں نے اپنے نفس پر عبادات کا بوجھ ڈال کر سزائیں دی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اگر نماز جماعت رہ جاتی تو ایک رات نہ سوتے، اور پوری شب نماز میں گزار دیتے۔ ایک بار ایسا ہوا، تو آپ نے دو لاکھ کی زمین صدقے میں دے دی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ، سے ایک بار نماز مغرب میں اتنی سی تاخیر ہو گئی کہ دو ستارے آسمان پر چمکنے لگے۔ تو آپ نے اس کی پاداش میں دو غلام آزاد کر دیئے۔ اسی طرح اور بھی متعدد واقعات پیش آئے ہیں۔

لہٰذا چاہیے کہ جب نفس کوئی سرکشی کرے تو علمائے حقیقی کی صحبت اختیار کرلے تاکہ اس کی عبادات سے سبق ملتا رہے۔ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جب مجھ سے عبادات میں کاہلی ہوتی ہے تو حضرت واسعؒ کے چہرے پر نظر کرلیتا ہوں۔ اور ایک ہفتے تک اس کا اثر مجھ پر باقی رہتا ہے۔ اور اگر معارف نہ مل سکے، تو ان کے واقعات ہی پڑھ کر سبق حاصل کرلے۔

بعض اصحاب کی ریاضت کے حالات لکھے جاتے ہیں :

ریاضت سے متعلق واقعات

حضرت داؤد طائی بجائے روٹی کے آٹا گھول کر پھانک لیا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ میں اتنی دیر عبادت ہی کیوں نہ کروں، کہ جو روٹی کے پکانے میں وقت خراب ہو۔

حضرت احمد بن رزین رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز سے لے کر عصر کی نماز تک ایک جگہ بیٹھے رہتے اور کسی طرف نہ دیکھتے۔ لوگوں نے سبب دریافت کیا، تو کہا کہ یہ آنکھیں صرف اس لیے ہیں کہ خداوند عالم کی صنائع بدائع کو دیکھیں، باقی چیزوں کو دیکھنے سے وقت خراب ہوتا ہے اور گناہ ہے۔

حضرت ابوالدرداء رحمۃ اللہ علیہ کا قول تھا کہ میں صرف تین چیزوں کی وجہ سے اپنی زندگی کو دوست رکھتا ہوں۔ اوّل تو یہ کہ راتوں میں سجدۂ معبود میں مشغول رہ سکوں۔ دوسرے یہ کہ دن بھر پیاسا رہوں۔ تیسرے بزرگانِ دین کی صحبت اختیار کروں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ میں نے سوائے حضرت سقطی کے اور کسی کو ایسا نہیں دیکھا کہ اٹھانوے سال کی عمر میں بھی زمین پر سوائے موت کے وقت کے نہ لیٹا ہو۔

حضرت ابوکتانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابومحمد جریری سے دریافت کیا کہ آپ ایک سال تک مکہ معظمہ میں رہ کر کیسے اتنی بڑی عبادت کر سکے کہ سال بھر نہ سوئے اور نہ آرام کیا اور نہ کسی سے بات کی۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے باطنی خیالات نے ان تمام ریاضات کی قوت عطا فرما دی۔

حضرت فتح موصلی رحؒ خون کے آنسوؤں سے روتے تھے۔ ایک بزرگ نے فرمایا کہ آپ کیسے روتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ کافی عرصے تک آنسوؤں سے رویا کیا، لیکن وہ پُرخلوص نہ تھے۔ اب اُن کا کفارہ دے رہا ہوں۔ چنانچہ اُن کی وفات کے بعد کسی نے اُن سے خواب میں اُن کا حال دریافت کیا، تو کہا کہ یہ اُن خُونی آنسوؤں کا نتیجہ ہے کہ چالیس سال تک میرے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

حضرت داؤد طائیؒ کا مقولہ تھا کہ بالوں میں کنگھی کرنا بھی غفلت کی نشانی ہے۔

حضرت اویس قرنیؒ نے ہر رات کی عبادت الگ الگ مقرر کر لی تھی۔ ایک رات کو سجدہ کرتے، ایک رات میں رکوع میں مشغول رہتے۔

حضرت ربیع رضی اللہ عنہ، ایک بار آپ کے پاس گئے، آپ صبح کی نماز میں مشغول تھے۔ میں بیٹھا رہا یہاں تک ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز بھی ادا کی اور رات بھر اسی مصلّے پر بیٹھے تسبیح میں مشغول رہے۔ حتّٰی کہ صبح کی نماز سے فراغت کے بعد کچھ نیند نے غلبہ کیا۔ کچھ دیر بعد چونک کر بیدار ہوئے اور فرمایا، کہ غفلت شعاروں سے خدا پرہیز میں رکھے —— میں نے اپنے لیے آپ کا یہ ہی عمل کافی سمجھا اور واپس چلا آیا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت رابعہ کے پاس گیا۔ وہ نماز میں مشغول تھیں۔ میں بھی ایک کونے میں نماز ادا کرنے کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ رات گزر گئی۔ میں نے عرض کی کہ خدا کا شکر کس طرح ادا کیا جائے کہ ہماری پوری رات عبادت میں بسر ہو سکی۔ آپ نے فرمایا کہ شکر میں کل روزہ رکھا جائے۔

اسی قسم کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ سب کو بیان کرنے سے کافی طول ہو جائے گا۔ اُن میں سے کافی حکایات احیاء العلوم میں نقل کر دی گئی ہیں۔

(نوٹ) اگر آدمی یہ عبادت نہ کر سکے تو کم از کم باتیں ہی سُنے، تاکہ گناہوں سے بچ سکے۔

نفس انسانی کی تخلیق میں اس طرح ہوئی، کہ انسان کو عبادت سے بھگاتا ہے سُست اور کاہل بناتا ہے اور راہ سے بے راہ کر دیتا ہے۔

نفس کبھی تو تمھارے ساتھ نرمی برتتا ہے، کبھی سختی۔ اس لیے کہ اس کو انسان سے اپنا کام نکالنا ہے۔ چاہے اس میں تکلیف ہی کیوں نہ برداشت کر سکے —— لیکن اگر انسان اس پر تاکید و تنبیہ کرتا رہے تو وہ اس

کا فرمانبردار ہو سکتا ہے۔

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ "نصیحت کرو، یقیناً نصیحت مفید ثابت ہو گی"۔ لہٰذا دوسروں کی نصیحت کی طرح اپنے نفس کو بھی نصیحت کرو، وہ بھی اس کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا پہلے اس کو سمجھاؤ، اس کے بعد عتاب کرو، اور کہو، کہ تو عقل کا دعوے دار بنتا ہے، حالانکہ خدا کے فرشتے تیری گرفتاری کے درپے ہیں۔ اور تو لہو ولعب میں مشغول ہے۔ بھلا اس سے زیادہ کیا بیوقوفی ہو سکتی ہے؟

اور اے نفس! تیری دشمن، جس کا نام اجل ہے وہ تیری منتظر ہے۔ کیا خبر؟ کہ تجھ کو کس وقت آکر دبوچ لے۔ وہ صبح، شام، دوپہر، رات۔ سردی گرمی کا انتظار نہیں کرتی۔ اگر چھوڑ دے گی، تو ایک نہ ایک دن تو اس کی مٹھی میں ہو گا۔ تو اتنا غفلت شعار ہے کہ دنیا کی رنگینیوں اور لہو ولعب میں سرگرداں ہے۔ بھلا تجھ سے زیادہ بیوقوف کون ہو گا۔ تجھے نہ خدا کا خوف ہے، نہ رسولؐ کا۔ تجھے گناہوں سے ڈر نہیں لگتا، اور کس قدر بہادری سے خدا کے اصول کے خلاف میدان بنائے ہوئے ہیں۔ تو کافروں سے زیادہ بدتر ہے تجھے خدا سے انکار ہے۔ تجھ کو قرآن پر یقین نہیں۔ تجھ کو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر ایمان نہیں۔ تو معاذ اللہ ان سب کو جھٹلانے کی کوشش میں ہے۔ افسوس! صد افسوس!! تو سب کو جھوٹا سمجھتا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے کہ جو برائی کرے گا، برائی پائے گا"۔ تجھے نہیں معلوم؟ کہ وہ قہر بھی نازل کر سکتا ہے۔ ذرا کان دھر کر سن! کہ وہ تمام قسم کی بیماریاں کیوں دیتا ہے۔ اگر وہ فقط رحیم ہے تو لوگ مصائب کا شکار کیوں ہوتے ہیں۔ تو غافل ہے اور نہیں سمجھتا کہ گناہوں کے بدلے میں تجھ کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ ذرا سوچ! کہ اس نے محنت کرنے کا حکم دیا ہے، جو نیکیاں کرے گا، اجر پائے گا۔ اور جو گناہ کرے گا دوزخ میں جائیگا۔ آدمی جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔

اور اے نفس! ذرا سوچ! کہ جب تجھ کو مال وزر کی خواہش ہوتی ہے تو ہزاروں اچھی بری تدابیر اختیار کرتا ہے اور چاہتا ہے کسی نہ کسی طرح یہ مال میرے ہاتھ لگ جائے۔ اس وقت تجھ کو خداوند عالم کا رحم وکرم یاد نہیں آتا ــــ تو کیوں دنیائے دنی میں وقت گذارتا ہے۔ اپنی خواہش کو ترک کر دے۔ اس لیے کہ دوزخ دنیا کی بدترین بلاؤں سے زیادہ سخت ترین ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہ خیال نہ کرو، کہ اپنی عمر کے کسی حصے میں توبہ کر لوں گا۔ اگر کہیں موت نے آلیا، تو ہاتھ ملتا ہوا چلا جائے گا۔ لہٰذا جو کچھ کرنا ہے آج کر! بلکہ ابھی کر! اگر موت کے وقت توبہ کی بھی تو بیکار ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے، کہ خدا کو میرے گناہوں سے کیا نقصان پہنچ رہا ہے، بلکہ آدمی کے گناہ ہی دنیا میں دوزخ کی آگ تیار کرتے ہیں۔ جیسے زہر کھانے سے آدمی کو موت واقع ہو جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ دنیا میں

زہر کھا رہا ہے اور حکیم مطلق (خُدا) کو معاذ اللہ الزام لگاتا ہے۔
سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تجھ کو موت کا یقین نہیں۔ یاد رکھ! کہ وہ عنقریب تجھ کو ناکارہ کردیگی۔ اور تو خاک میں مل جائے گا۔ اس کے بعد تو کفِ افسوس ملے گا ـــــ اور پھر کوئی حاصل نہ ہوگا۔ تو دُنیا کو آخرت کے عوض خریدنا چاہتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ سونے کے برتن کے عوض مٹی کے برتن لے رہا ہے۔ جو فوراً ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح دنیا ختم ہوجائے گی۔ اس کے بعد آخرت ہی آخرت ہے۔ پھر تو صرف حسرت و تمنّا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے گا۔
اِنسان کو چاہیے! کہ نفس سے اس قسم کی باتیں کرے اور برابر اس کی لجام کستا رہے تاکہ تیرا حق اَدا ہوجائے۔ وعظ و نصیحت دُوسروں کو کرنے سے پہلے اپنے نفس ہی سے شروع کرے۔

ساتواں اصُول

(بابُ التّفکّر)

تفکّرُ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں کہ تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ (یعنی ایک گھنٹہ کا تفکّر ایک سال کی عبادات سے بہتر ہے۔
خداوندِ عالم بار بار تفکّر، تدبّر اور چشمِ حقیقت کا حکم دیتا ہے۔ یہ سب چیزیں تفکّر ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ لہٰذا اوّل تفکّر کی افضلیّت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ تفکّر کن اشیاء میں ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے؟ ان سب چیزوں کا سمجھا دینا ضروری ہے۔ لہٰذا
سب سے پہلے تفکّر کی افضلیّت کے متعلّق بتاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی حقیقت اور سبب وغیرہ بتائیں گے۔

تفکّر کی افضلیّت

حدیث نبوی کے مُطابق جس کام میں صرف ایک گھنٹہ کا مشغول رہنا سال بھر کی عبادات سے افضل ہے۔ تو اس عمل کی فضیلت کتنی ہوسکتی ہے؟
ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ آدمی خداوندِ عالم کی ذات میں تفکّر کرتے تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اس کی ذات میں تفکّر نہ کرو۔ اس لیے کہ وہ تمہاری عقول سے کہیں بالاتر ہے۔ اس کے صنائع بدائع کی حقائق کو معلوم کرنے کی کوشش کرو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ ایک بار نماز پڑھتے جاتے اور روتے جاتے۔ مَیں نے عرض کی، یا رسول اللہؐ! آپ کے گناہ تو عفو کر دیئے گئے ہیں۔ پھر رونے کا کیا سبب ہے؟ ارشاد ہوا کہ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وائے ہو، اس شخص کی عقل پر کہ جو اس کے بعد بھی اس کی ذات میں تفکّر کرے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے لوگوں نے عرض کی کہ دُنیا میں آپ جیسی عظمت رکھنے والا کوئی دوسرا آدمی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! وہ آدمی جو خاموش رہے تو تفکّر کرے اور گفتگو کرے تو ہر بات اس کی عبادت ہو۔ اور جدھر دیکھے، عبرت حاصل کرے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ تلاوت کلام اللہ اور اس میں تفکّر کرنا نیز عجائباتِ عالم سے عبرت حاصل کرنا آنکھوں کی عبادت ہے۔

ابوسلیمان دارانیؒ کا مقولہ ہے کہ دُنیا میں تفکّر کرنا حجاب آخرت ہے۔ اور آخرت میں تفکّر نیکی کا باعث ہے۔

حضرت داؤد طائیؒ رحمۃ اللہ علیہ ایک بار ملکوتُ السّمٰوٰات کے تفکّر میں مستغرق تھے کہ ہمسائے کے کوٹھے پر جا گرے۔ ہمسایہ اُٹھا اور چور سمجھ کر تلوار نکال لی۔ جب آپ کو دیکھا، تو عرض کی کہ آپ کو کس نے گرا دیا؟۔ آپ نے فرمایا کہ میں عالم و عالمیان سے مدہوش تھا۔

تفکّر کی حقیقت

کسبِ علم کے معنی "تفکّر" کے ہیں۔ جو علوم ایسے ہیں کہ بغیر پڑھے آجائیں۔ اُن کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور اُس کے حصول کے لیے دو معرفتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اُن دو معرفتوں کو آپس میں اس کو مدغم کر دے، تاکہ اس سے تیسری معرفت پیدا ہو جائے، اور اس کے بعد چوتھی اور پانچویں۔

یہ ہی طریقہ علوم کو حاصل کرنے اور فروغ دینے کا ہے۔ لہٰذا اوّل ہم اُن دونوں معرفتوں کو سمجھاتے ہیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ تمام تفکّرات کی حقیقت طلب علم ہے۔ اور وہ طلب دو معرفتوں کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، لیکن ان علوم کے حصول کے بعد۔ انسان کی مرضی کے مطابق کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ہر ایک بات اپنے علم کے مطابق ہی پیدا ہوگی۔ اور علم کی تمام اقسام دو دو اصول پر مبنی ہیں —— اب اوّل دونوں اصول علم کے متعلق بحث کریں، تاکہ اُن اصول سے واقفیت ہو سکے۔

سببِ تفکّر

تفکّر کیوں کیا جائے؟ اِنسان کی تخلیق ظلمت اور تاریکی میں ہوتی ہے۔ جب وہ پیدا ہوتا ہے، تو اُس کو کچھ خبر نہیں ہوتی، کہ دُنیا کیا ہے؟ لہٰذا اس کو اپنی یہ حالت ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ راہِ ہدایت اختیار کرے۔

اب وہ یہ سوچے کہ دُنیا و دین کے یہ راستے ہیں، اور اس کے بعد اپنا راستہ اختیار کرلے ——— اِس بات کی سمجھ صرف معرفت کے انوار سے ہی ہوسکتی ہے۔ اور "معرفت کا نُور" تفکّر سے پیدا ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خَلَقَ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَۃٍ ثُمَّ رَشَّ عَلَیْھِمْ مِنْ نُوْرِہٖ۔

لہٰذا تفکّر کے بعد "معرفت کا نُور" حاصل کرنا ضروری ہے۔ اب یہ دونوں جذبے اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ جب آدمی کو آگے کا راستہ سجھائی نہیں دیتا، تو وہ پتھر کو لوہے پر مار کر چراغ روشن کرتا ہے۔ اور اس کی روشنی میں راستہ دیکھتا ہے ——— لہٰذا اِن دونوں معرفتوں سے تیسری معرفت اسی طرح پیدا ہوسکتی ہے اور اس کے بعد لاتعداد انوارِ الٰہیہ اس کی نظروں کے سامنے جگمگانے لگتے ہیں ——— بس اصل یہ ہے کہ آدمی کی عقل تفکّر کے ذریعہ ترقّی کے راستے اختیار کرتی ہے۔ تب اس کے کام اور مقصد میں ترقّی ہوتی ہے ——— اِس لیے کہ جب اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آخرت دنیا سے کہیں زیادہ بلند ہے، تو وہ اس کو چھوڑ کر معرفت کی طرف قدم رکھتا ہے۔

لہٰذا تفکّر کے تین درجات ہیں۔ معرفت، حالت، عمل۔

عمل حالات کا تابع ہوتا ہے۔ اور حالات معرفت کی تابع ہے اور معرفت تفکّر کی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تفکّر دین میں تمام نیکیوں کی بُنیاد ہے۔ اب اس کی فضیلت کے متعلق بیان کرتے ہیں۔

قوّتِ فکر کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

قوّتِ فکر اور اس کی اِقسام جس طرح "فکر" ایک غیر منتہی چیز ہے کہ انسان جتنا تفکّر کرتا رہے، اتنا ہی آگے کی منازل اس کی نظروں میں اُجاگر ہوتی رہیں گی۔ اسی طرح علم بھی لامحدود شے ہے۔ قوّتِ فکر ہر چیز میں ساری و جاری ہے۔ وہ دنیا ہو یا آخرت۔ ہر معاملے میں فکر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم کو دنیوی تفکرات سے اس وقت کوئی بحث نہیں۔ ہم صرف "راہِ آخرت" کی فکر کے متعلق بتائیں گے۔ اگرچہ یہ مبحث بھی انتہائی طویل ہے، لیکن مختصر طور پر "قوتِ فکر" کی اقسام بیان کرتے ہیں۔

آدمی کا تفکّر یا تو اپنی ذات سے متعلق ہوگا، یا خداوندِ عالم کی معرفت کے متعلق۔ لہٰذا یہاں خداوندِ عالم اور مخلوقِ خدا کے درمیان جو معاملات ہوتے ہیں، اُن سب سے متعلق "لمحہ فکریہ" کی توضیح و تشریح کی جائے گی۔

اِنسان کا تفکّر اگر اپنی ذات سے متعلق ہے، تو اس میں بھی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو اس کا تفکر خداوندِ عالم کے بتائے ہوئے راستوں کے متعلق "اپنے لیے" سوچنا ہوگا۔ اور یا اس کے خلاف ——— اگر خلاف ہے، تو وہ راہِ آخرت اور خدا کے احکامات کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا ایسا تفکّر دُنیا سے متعلق ہے۔ اور اس سے ہمیں یہاں کوئی سروکار نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہی گناہ اور آدمی کے لیے ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں، اور انھیں کو معاصی و

مہلکات کہتے ہیں، اور خداوندِ عالم کی پسندیدہ صفات میں تفکّر کرنا طاعات و منجیات میں داخل ہے۔ لہٰذا چار اقسام فکر ہیں۔ دو اپنی ذات کے متعلق اور دو خداوندِ عالم کی صفات کے متعلق۔

اِنسان، ایک عاشق کی طرح ہے۔ لہٰذا عشق کی شان یہ ہے کہ اس کا ہر عمل ہر حرکت و سکون صرف اپنے محبوب کے لیے ہو۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہیں کرتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی محبت میں کامل نہیں ہوا۔

عاشقِ حقیقی کے لیے چار ہی صُورتیں ہیں کہ یا تو وہ اپنے محبُوب کے حُسن و جمال کا نظارہ کرتا ہے۔ اور اسی سے محفُوظ ہوتا ہے۔ یا اپنے محبوب کی حرکات و سکنات، افعال و اخلاق کی طرف توجہ دیتا ہے۔

ان دو صُورتوں کے علاوہ تیسری صُورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عاشق اپنے افعال اور کردار کی طرف نظر رکھتا ہے تاکہ اس کی حرکات و سکنات محبوب کو پسند آئیں، اور اُن کی وجہ سے وہ اس کی طرف متوجہ ہو، اور پھر آخری صُورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عاشق سے ایسے اعمال سرزد ہوں کہ اس کا محبوب اس سے نفرت حقارت کرنے لگے۔

ان چاروں صورتوں کے علاوہ اور کوئی صُورت ایسی نہیں کہ جو عاشق کے لیے صادق آسکے۔ لہٰذا دینِ الٰہی اور محبتِ خداوندی کو بھی اسی پر منطبق کر دیا جائے

میدانِ تفکّر

پہلی صُورت آدمی اپنے متعلق یہ سوچے کہ اس میں کون کون سی عاداتِ بد سرایت کر گئی ہیں۔ اور وہ ظاہری طور پر کن گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ باطنی صُورت میں اس کے اندر کون کون سی صفاتِ بد داخل ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ بعض گناہ تو اعضائے بدن کے ذریعے ہوتے ہیں اور بعض باطنی خباثت کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں ہی عادات (باطن و ظاہر) تین خیالات پر مبنی ہیں۔

پہلے یہ کہ ہر گناہ اور نیکی کا تعلق آدمی کے تفکّر سے ہے کہ آیا وہ گناہ ہے؟ اور اگر گناہ ہے تو وہ ظاہری اعضاء سے متعلق ہے یا اس کے باطن سے۔

دوسرے یہ کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد آدمی یہ سوچے کہ فلاں فلاں صفاتِ مکروہہ مجھ میں سرایت کر گئی ہیں۔ اس پر یقین کرے۔

تیسرے یہ کہ اُن صفاتِ بد کو دُور کرنے کی تدابیر کیا کیا ہو سکتی ہیں۔

ظاہری حالات، کردار اور حق الناس کے متعلق قوّتِ فکر کیسے کام میں لائی جائے

لہٰذا آدمی صبح کو یہ تفکّر کرے! کہ فلاں فلاں کام گناہ ہیں اور ان سے پرہیز ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ لے کہ فلاں گناہ ظاہر سے متعلق ہے اور فلاں باطن سے۔ اس کے بعد یہ سوچے کہ آج مجھے کیا کیا عمل کرنا ہیں۔ مثلاً فرض کرو

کہ روزی کے کمانے کا طریقہ جھوٹ ہے، تو پھر اس کے لیے سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس جھوٹ سے میں کیسے بچ سکوں گا اور اگر کسی دوسرے ناجائز کام کے لیے سوچتا ہے تو اس کے پرہیز کی تدابیر اختیار کرے۔ اسی طرح ہر ایک اعضا اور ہر ایک کام کے متعلق تفکر کرلے۔ اس کے بعد اپنی عبادات کے متعلق سوچ لے کہ اس میں تو کوئی ریا کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

تفکر برائے اعمالِ ظاہری

اس کے بعد کی منزل یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ مجھے آج اپنے کام اور عبادات کیا کیا بجالانا ہیں۔ یا مثلاً حق الناس کس طرح ادا کرنا ہے اور اس میں کیا کیا چیزیں کام آتی ہیں۔ جیسے "زبان" کہ اس کے ذریعہ خداوند عالم کی عبادت بھی ہوتی ہے اور خلق اللہ کی بھلائی کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔

لہٰذا یہ سوچے کہ زبان کے ذریعہ صرف اچھے الفاظ ادا کروں تاکہ مخلوق خدا کے لیے مفید ثابت ہوسکیں۔

پھر آنکھ کے متعلق سوچے کہ آنکھ صرف اس لیے ہے کہ اس سے صرف اچھی چیزیں جو آخرت میں کام آنے والی ہیں۔ دیکھوں۔ علما و فقہا کو دیکھ کر تعلیم بجالاؤں اور بدکاروں کو دیکھ کر اُن سے نفرت کروں۔

اسی قسم کی باتیں تمام اعضا کے متعلق سوچنا چاہییں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب باتیں چند منٹ سوچنے کے بعد گناہوں سے اس کو محفوظ کرلیں اور اسی لیے حدیث میں ہے کہ ایک ساعت کا تفکر ایک ساعت کی عبادات سے افضل ہے۔

تفکرات برائے اعمالِ باطن

حقیقی اعضا اور تصورات کے متعلق قوتِ فکریہ

ظاہری اعمال سے فراغت پاکر باطن کی طرف نظر کرے۔ اِس کا مقصد یہ ہے کہ آدمی میں جو بداخلاقیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اُن کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

اوّل سوچے کہ اچھے اخلاق میرے اندر کیا کیا نہیں ہیں۔ جب یہ سمجھ لے تو اس کی وجوہ پر غور کرے، کہ یہ اخلاق کیوں نہیں ہیں۔ اس کے بعد اُن کے حصول کی کوشش کرے۔

مہلکات

مہلکات بُری عادات جو آدمی کو بُرائیوں کی طرف لے جاتی ہیں، اور قعرِ مذلت میں ڈال دیتی ہیں۔ اُن کو کہتے ہیں ـــــ ویسے تو یہ مہلکات لاتعداد ہیں۔ لیکن اُن سب کی بنیاد صرف دس عادات بد پر موقوف ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

بخل[۱]۔ تکبر[۲]۔ عجب[۳]۔ ریا[۴]۔ حسد[۵]۔ غضب[۶]۔ حرص طعام[۷]۔ حرص خلم[۸]۔ حُبِّ مال[۹]۔ حُبِّ جاہ[۱۰]۔

اِن سب سے نجات پانا آدمی کی نجات کے لیے ضروری ہے۔
اسی طرح آدمی کو آخرت میں نجات دلانے والے اصول بھی دس ہیں۔

منجیّات گناہ پر شرمندگی کا ظاہر کرنا (توبہ[1]) تکلیف میں صبر کرنا (صبر[2])۔ احکاماتِ الٰہیہ پر رضا مند رہنا (رضا[3]) نعمات پر شکر خدا بجالانا (شکر[4])۔ خوف[5]۔ رجا۔ زہد۔ طاعات اللہ میں خلوص برتنا (اخلاص[8]) خلق اللہ کے ساتھ نیکی سے پیش آنا (نیک خلقی[9]) دوستی خداوند عالم (عشقِ حقیقی[10])۔

ان تمام منجیات اور مہلکات میں تفکّر کے لیے آدمی کے واسطے ایک بڑا میدان ہے، جس کی تفصیلات پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کو باری باری سوچے اور مہلک چیزوں کو چھوڑ دے۔ منجیات کو حاصل کرے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ تمام چیزوں میں محتاط ہیں، لیکن ایک کمی اُن میں رہ جاتی ہے۔ مثلاً عالم ویسے ہر چیز میں باعمل ہے، لیکن اپنے علم کی وجہ سے اکڑتا ہے اور اپنا علم و فضل لوگوں پر خواہ مخواہ ظاہر کرتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کی خلاف منشاء بات کہہ دے، تو وہ اس کی طرف سے بغض رکھنے لگتا ہے۔

لہٰذا اِس عالم کو چاہیے کہ اِن بُری عادات و خصائل کو ترک کرنے کی کوشش کرے، تاکہ مقرّب بارگاہِ ایزدی ہو جائے۔ آدمی کو اس قسم کی تفکرات میں کافی سہولتیں مہیا ہیں۔ اگر وہ چاہے تو رفتہ رفتہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس میں بڑی گنجائش ہے۔ اُن سب کا بیان کرنا بھی ممکنات میں سے نہیں۔

دوسری صُورت تفکّر، خداوند عالم سے تعلّق رکھتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم کی عطا کردہ نعمتوں اور اس کی بنائی ہوئی گوناگوں صنائع بدائع میں تفکّر کرے۔

خداوندِ عالم کے متعلّق فکر یہ سب سے بلند چیز ہے۔ اور انسان کی عقول وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی اس راستے میں کوئی غلط تفکّر کر بیٹھے۔ اور اس کے نتیجے میں کوئی گناہ سرزد ہو جائے۔ لہٰذا اس تفکّر کے متعلّق منع کر دیا گیا ہے، کہ اس کی ذات اور صفات کے متعلّق کچھ نہ سوچو۔ یہ حکمِ امتناعی اِس لیے نہیں کہ اس کی طاقت اور قدرت پوشیدہ ہے۔ بلکہ اس لیے کہ آدمی کی عقل اس کے کمالاتِ نُورانی کی شعاعوں کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اور وہ پہلے منازل پر ہی مدہوش ہو جاتا ہے —— جس طرح چمگادڑ، کہ وہ دن میں اِس لیے پرواز ہی نہیں کرتی، کہ اس کی آنکھیں سُورج کی نُورانی شعاعوں سے چکا چوند ہو جاتی ہے، مخلوقات عالم کی یہ ہی نظر ہوتی ہے۔

لیکن صدیقین اور بزرگانِ دین کی نظروں میں یہ قوت ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ ہر وقت اس کے جمال کو ملاحظہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح جیسے کوئی آدمی آفتاب کو ایک لمحے کے لیے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر برابر دیکھے جائے گا۔

تو یقیناً اندھا ہو جائے گا۔

اِسی لیے بزرگانِ دین پر بعض انوار کُشادہ ہو جاتے ہیں، تب بھی وہ عوام کے سامنے انھیں پیش نہیں کرتے صرف اتنی اجازت دے دی گئی ہے کہ جن کو سُن کر عوام الناس حیران و متعجب نہ ہو جائیں۔

صرف اِتنی ہی اجازت ہے۔ مثلاً لوگوں کے سامنے خداوند عالم کا یہ تصور پیش کیا جائے کہ وہ عالم ہے اور متکلّم ہے۔ اِس لیے انسان اپنے میں عالم اور متکلّم ہونے کی صفات دیکھتا ہے اور اسی تناسب کے ماتحت وہ خداوند عالم کے متعلّق سمجھ لیتا ہے۔ کہ مجھ سے کہیں زیادہ عالم اور متکلّم ہوگا۔ لیکن یہ بھی تشبیہہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی ذات میں کوئی دخل نہیں دیا جاسکتا۔ یہاں اِتنا بتا دینا اور ضروری ہے کہ ہمارے اور خداوندِ عالم کے تکلّم میں فرق ہے۔ وہ اس طرح نہیں بولتا جس طرح ہم مُنہ سے بولتے ہیں۔ ہمارے لیے آواز اور الفاظ کی نفثش کے قیود ہیں۔ وہ ان تمام باتوں کا محتاج نہیں۔ لیکن عوام کو اسی بات پر اعتراض ہوگا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خداوندِ عالم کا کلام بغیر کسی آواز اور الفاظ کے جوڑ توڑ کے ہے۔ مثلاً کسی سے یہ کہا جائے کہ خداوندِ عالم کی ذات ایسی نہیں ہے جیسے آدمی کا وجود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں جوہر اور عرض کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ اس کو کسی جگہ کی قید ہے، اور نہ جگہ کی ضرورت۔ وہ کسی دنیا سے نہ قریب ہے نہ بعید۔ ہر جگہ ہے اور سب جگہ ہے۔ تو وہ غالباً اس سے بھی انحراف کر جائے گا۔ کہ یہ تو عقلاً ناممکن ہیں۔ اور اس کی یہ دلیل دینے لگے کہ میری ذات اور میرا وجود تو ایسا ہے، تو خدا کا ایسا کیوں نہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو صرف شہنشاہ زمانہ کا تصوّر دلائے کہ وہ ایک اعلیٰ ترین تخت مرصّع پر جلوہ افروز ہے۔ اور اس کے ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان سب کچھ ہمارے جیسے ہی ہیں، تاکہ وہ سمجھ سکے اور تعجب نہ کرے۔ ذرا سی مثال سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے، کہ اگر مکھی کے پاس ذرا سی بھی قوّتِ ادراک ہوتی تو اپنے خدا کو اس تصوّر کے ماتحت سمجھتی، کہ اس کے بھی پر ہوں گے اور میری طرح ہواؤں کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہوگا۔

اسی طرح آدمی بھی اپنی عقل کے مُطابق سب کچھ سوچ پاتا ہے۔ اسی لیے اس کے متعلّق سوچنے کا حکم ہی نہیں دیا گیا۔ بزرگانِ دین نے اس کی بھی تہدید کی ہے کہ اس کے متعلّق عوام کے سامنے یہ بھی کہو کہ وہ دنیا کے اندر ہے یا باہر ہے۔ الگ ہے یا ملا ہوا ہے، بلکہ اسی پر اکتفا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (یعنی نہ وہ کسی کی مثل ہے، نہ اُس کی مثل کوئی چیز ہے)۔

اِس سے زیادہ اس کے متعلّق کہنا بدعت کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ لوگ اس کے متحمّل نہیں ہوسکتے۔ بلکہ بعض انبیاء کے پاس وحی نازل ہوئی کہ ہماری صفات کا تذکرہ نہ کیا کرو، بلکہ اُن سے اُن کی عقل

کے مطابق بات کرو۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس قسم کا تذکرہ ہی اُن کے سامنے نہ کیا جائے۔
ہاں البتہ مخلصین اور موحدین کو اختیار ہے کہ وہ اپنے "فکریہ" کو جتنا چاہیں بلند کریں بعض اوقات بڑے بڑے پہنچے ہوئے لوگ بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔
یہ تمام عالم وعالمیان اور جو کچھ ان سب میں ہے، یہ سب کچھ اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ اس کی نورانی شعاعوں کو ملاحظہ کر کے اس کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ جس طرح آدمی آفتاب کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دنیا کی ہر چیز کو دیکھتا ہے جو اس کی وجہ سے روشن و منور ہوتی ہیں۔

تیسری صورت خلق اللہ کے متعلق قوتِ فکر کو بلند کرنا ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ تمام عالم وعالمیان اس کی صفات کا پرتو ہیں۔ اب اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ دُنیا جو ہم کو نظر آرہی ہے۔ یہ ہی پوری طرح سمجھ میں آجائے تو ناممکن ہے۔ چہ جائیکہ تمام عالم وعالمیان کو پہچاننا اور جاننا قطعی محال ہے۔
اور ہم نے یہی کہا۔ اگر تمام دُنیا کا پانی روشنائی بن جائے اور تمام درختوں کے قلم بنا لیے جائیں، اور تمام کائنات اس کی حقیقت لکھنے کو بیٹھ جائے تو بھی وہ ایک شائبہ نہیں لکھ سکتے۔
خداوند عالم خود ارشاد فرما رہا ہے کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔ (یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دُنیا والوں سے کہہ دو کہ اگر تمام دریا سیاہی بن جائیں اور قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں وہ دریا ختم ہو جائیں گے۔ چاہے ویسے ہی دریا اور بھی بنا کر صرف کر دیے جائیں)۔
مختصر یہ ہے کہ موجودہ عالم میں مخلوق دو قسم کی ہے۔ ایک تو وہ مخلوق ہے جس کے متعلق ہم کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا ہے، اور کیسی ہے؟ لہٰذا اس کے لیے "تفکر" کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
خداوند عالم بھی اس کے متعلق ارشاد فرما رہا ہے کہ سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ (یعنی کتنی پیاری ہے وہ ذات کہ جس نے پیدا کیا اس کو کہ جو اُگاتی ہے تمام اجناس کو اور زمین کو اور انسانوں کو پیدا کرتی ہے) لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں۔ اور جس ایک چیز کے متعلق معلومات ہے، وہ بھی دو قسم کی چیزیں ہیں۔
ایک وہ جن کو ہم اپنی نظروں سے دیکھ نہیں سکتے۔ مثلاً عرش و کرسی۔ دیو، پری۔ جنات اور فرشتے وغیرہ موجودہ کتاب میں ان تمام چیزوں کے متعلق "تفکر" کرنے کے طریقے کو لکھنا ناممکن ہے۔ لہٰذا جو اشیاء

ہم کو نظر آتی ہیں۔ انھیں کے متعلق بتائے دیتے ہیں۔
ان چیزوں میں جو آسمان پر ہیں، وہ ستارے، آفتاب اور مہتاب ہیں اور زمین پر پہاڑ۔ جنگل۔ دریا۔ شہر اور جمادات جو زمینوں اور پہاڑوں کے اندر پوشیدہ و مدفون ہیں۔ یہ سب شامل ہیں۔ اس کے بعد بعض وہ چیزیں ہیں جو ہواؤں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اولے۔ بادل۔ بجلی۔ برف اور قوس قزح وغیرہ۔
ان تمام چیزوں کے لیے تفکر کی کافی گنجائش ہے۔ اور انھیں کو اجمالی حیثیت سے بیان کریں گے۔ ان چیزوں کے متعلق خداوند عالم بھی سوچنے اور غور کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَاتٍ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (یعنی زمین و آسمان میں بہت سی نشانیاں ہیں کہ جن کو سب دیکھتے ہیں اور اُن سے گزرتے ہیں، لیکن ان کو نظر انداز کرتے ہیں)۔ اس کے بعد ایک جگہ اور ارشاد ہوتا ہے کہ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (یعنی یہ یقیناً دن رات کے اختلافات اوقات اور زمین و آسمان کی پیدائش میں نشانیاں ہیں، لیکن صرف عقلمندوں کے لیے) لہٰذا ان پر غور کرنا ضروری ہے۔
دنیا کی تمام چیزوں میں قریب ترین انسان کی خود ہی ہستی ہے۔ کہ جس سے زیادہ عجیب و غریب شے کوئی نہیں، لیکن انسان اپنے ہی کو نہیں پہچانتا۔ حالانکہ وہ فرما رہا ہے کہ اے انسان تو اپنی ذات کے متعلق سوچ تاکہ ہماری قدرت کی نشانیاں اس میں پا سکے۔

تخلیق انسان

اوّل یہ دیکھو، کہ تم کہاں سے آئے، کیسے بنے۔ خداوند عالم نے ایک نجس قطرے سے انسان کو تخلیق کیا۔ اس تخلیق سے پہلے انسان اپنے باپ کی سلب میں تھا اور ماں کے پیٹ میں۔ اس کے بعد وہ بیج ماں کے پیٹ کی طرف منتقل ہوا، اور وہ ماں کے رحم میں پہنچکر پہلے پہل مزغہ گوشت بنا اور اسی طرح پرورش پاتے پاتے اس میں جان پڑگئی، اور موجودہ شکل وجود میں آئی۔ یہ سب کچھ خداوند عالم ہی کی کاریگری ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس نے ہر عضو کو متناسب اور حسب ضرورت بنایا۔ مثلاً سر کا گول ہونا۔ دونوں ہاتھ دو پیر، اور ہر ہاتھ میں پانچ انگلیاں۔ ہر انگلی میں تین تین پورو بنائے کہ بغیر ان اعضا کے انسان کی شکل ناقص رہتی ہے۔ اس نے آنکھ ودیعت کی، جو دیکھنے میں بالکل ناچیز سی ہے۔ لیکن اس کے اندر سات پردے، اس طرح رکھے کہ اگر ایک پردہ خراب یا ناقص ہو جائے، تو یہ تمام دنیا تیرے خیال میں اندھیری ہو جائے اور تجھ کو کوئی چیز نہ دکھائی دے۔ اگر صرف آنکھ کے حقائق کو ہی بیان کیا جائے، تو پورا ایک دفتر بھی کم ہے۔ اس کے بعد اپنی ہڈیوں پر غور کرو، کہ ان میں بعض سخت ہیں، بعض نرم، اور ان سب کو اس

طرح ایک دوسرے میں ختم کر دیا کہ ہر ایک میں ایک حُسن پیدا ہو گیا - ایک ہڈی دوسری ہڈی کے اندر پیوستہ ہے ، اور وہ دوسری کی مددگار ہے - پیٹھ - کمر - گردن اور ٹانگوں کے الگ الگ جوڑ بنائے تاکہ آدمی اچھی طرح بیٹھ سکے - منہ میں دانتوں کی ایک لڑی آراستہ کر دی - اور وہ کتنی حکمت کے ساتھ ڈھالے گئے - کہ بعض اُن میں لمبے بعض چوڑے اور بعض چپٹے ہیں - اُن میں ہر ایک کا کام الگ الگ ہے - گردن کو اس طرح بنایا کہ اس میں سات مُہرے ہیں - اور اوپر رگوں اور پٹھوں کا جال باندھ کر اس کو مضبوط کر دیا - اسی طرح ہر ایک عضو کی ساخت اور ضرورت پر غور کرو کہ یہ سب کچھ اُسی ایک قطرے کا نتیجہ ہیں - اگر ان اعضاء میں کوئی ایک بھی ناقص رہ جائے تو تمام نظامِ بدن درہم برہم ہو جائے - کیا کبھی تم نے اپنے جسم کی ہڈیاں شمار کی ہیں؟ تم کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ تمہارے جسم میں ہڈیوں کی مجموعی تعداد دو سو سینتالیس ہے - اس کے بعد تمام اعضاء میں پانچ سو ستائیس عضلے ہیں اور اُن میں کا ہر ایک عضلہ مچھلی کی شکل کا ہے بعض چھوٹے ہیں بعض بڑے - ان سب کو گوشت اور پٹھوں کے بیچ میں مرتب کیا ہے ، تاکہ گوشت کا غلاف اُن کی حفاظت کرے - اُن میں ۲۴ عضلات صرف نگاہوں کو پھیرنے کے کام میں آتے ہیں - اسی طرح دوسرے عضلاتِ بدن کا تصور کیا جائے کہ وہ کتنے ہو سکتے ہیں - اُن سب کو تفصیلاً بیان کرنا ناممکن ہے - اس کے بعد خداوندِ عالم نے انسان کے بدن میں تین حوض آراستہ فرمائے ، اور تینوں حوضوں میں تین نہریں جاری فرمائیں - پہلا حوض دماغ ہے ، جس سے تمام جسم اور رگ پٹھوں میں خون دوڑتا ہے - جس کی روانی سے انسان میں حس و حرکت کی قوت پیدا ہوئی - اس میں سے ایک نہر کا تعلق پشت کی طرف ہے ، تاکہ مغز اور پٹھوں کا تعلق برقرار رہ سکے -

دُوسرا حوض جگر ہے ، جس کے ذریعہ تمام جسم کی نشوونما ہوتی ہے -

تیسرا حوض دل ہے ، جو تمام اعضائے بدن کا شہنشاہ ہے اور عضو کی باگ سنبھال رہا ہے - اس سے تمام جسم میں رگیں پھیلتی ہیں اور خون دوڑتا ہے -

انسان کو چاہیے کہ ہر عضو میں "تفکر" کرے کہ کون عضو ، کس مقصد اور کس طرح بنایا گیا ہے -

آنکھوں کی ساخت خوبصورت پردوں پر مشتمل ہے ، جس سے بہتر کوئی رنگ سمجھ میں نہیں آ سکتا - اس کے اوپر پلکوں کا "چھجہ" حفاظت کے لیے پہرہ دے رہا ہے - تاکہ کسی قسم کی باہری چیز بس اندر داخل ہو کر آنکھ کو خراب نہ کر سکیں - اِتنی ذراسی چیز جب کھلتی ہے تو آسمان کے مابین جو کچھ ہے ، سب کچھ نظر آ جاتا ہے - اگر آنکھ کے متعلق بالتفصیل لکھا جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں -

کان کی ساخت دیکھو ، کتنی عجیب چیز ودیعت کی ہے - اس کے اندر ایک زہریلا "میل" پیدا کیا تاکہ اگر کوئی کیڑا گھس جائے تو فوراً مر جائے - اسی طرح "ناک" اور مُنہ وغیرہ کے متعلق بھی کوئی غور کرو - اگر ان

سب کے متعلق بالتصریح لکھا جائے تو کتاب میں خواہ مخواہ طول ہوگا۔

ان تمام چیزوں کو بتانے سے صرف "قوتِ فکریہ" کو جگانا مقصود ہے تاکہ انسان یہ سمجھ لے کہ اس کی ہر چیز فکر کی محتاج ہے کہ آخر اس کی غرض و غایت کیا ہے۔

انسان کے اندرونی اعضائے بدن

اس کے بعد وہ عجائبات جو انسان کے اندرونی حصہ جسم میں ہیں۔ اُن سے کیا کیا کام لیے جاتے ہیں۔ مثلاً دماغ اور تمام جسم کی رگیں کہ جن میں قوتیں پیدا کر دی گئی ہیں وہ عجیب قدرت کا نمونہ ہیں ـــــ اسی طرح سینے اور پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں بھی عجائباتِ قدرت میں سے ہیں۔

معدہ مثلاً معدہ، ایک دیگ کی طرح ہر وقت گرم ہے اور اس میں کھانا پک رہا ہے اور وہ کھانا پک کر جب گل جاتا ہے تو

جگر جگر اسی کو خون بنا دیتا ہے۔ اور وہ باقی تمام رگوں میں خون کو تقسیم کر دیتا ہے۔

پتّا اس خون کے خراب حصے کو پتّا اپنا لیتا ہے، جس کو صفرا بولتے ہیں۔

تلّی خون کا تلچھٹ (جس کو سودا کہا جاتا ہے) تلّی حاصل کر لیتی ہے۔

گردہ جب جگر خون کو اپناتا ہے، تو گردوں کا کام یہ ہے کہ خون اور پانی کو الگ الگ کر کے خالص کردے خون کو رگوں کی طرف منتقل کر دے۔ اور پانی کو مثانے کی طرف، جس کو ہم پیشاب، کہتے ہیں۔

عجائباتِ عالم

اسی طرح عورت کے رحم پر نظر کی جائے تو اس میں بھی عجیب عجیب رموز پوشیدہ ہیں کہ اس میں بچہ بنتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔ (نوٹ: اس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے)۔

اسی طرح حواسِ خمسہ پر نظر کی جائے تو اُن میں بھی ہر ایک قوت قدرت خداوندی کا نمونہ ہے ـــــ اگر کوئی دُنیاوی آرٹسٹ (مصوّر) کوئی تصویر بناتا ہے تو لوگ اِس کی نقاشی سے کس قدر محظوظ ہوتے ہیں اور اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں۔

لیکن کبھی یہ بھی سوچا؟ کہ انسان صرف ایک قطرے سے پیدا ہوا، وہاں نہ قدرت کے قلم ظاہری گلکاریاں ہیں نہ اسباب ظاہری ہیں۔

اِن تمام چیزوں کو دیکھ کر بھی تم کو کبھی تعجب ہوا، کہ صنّاعِ حقیقی نے اس کی ہر ہر چیز کو کس طرح مرصّع کیا، بچہ پیدا ہو ـــــ تو اس کے کھانے پینے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے ماں کے سینے میں دودھ نہریں بہا دیں کہ ابھی وہ دنیا سے بالکل آزاد ہے۔ تو کیوں کسی کا مرہونِ منّت رہے ـــــ اور بچے کو دانت نہیں عنایت کیے کہ ماں کو تکلیف نہ پہنچ سکے۔

اگر آدمی ان تمام چیزوں کو دیکھ کر صانع قدرت کے متعلق تفکّر نہ کرے۔ تو افسوس ہے اس عقل پر

اور بینائی پر کہ سب کچھ دیکھتا ہے، اور اس کی صنائع کا قائل نہیں ہوتا —— وہ اپنی عقل کو ضائع کرتا ہے اور اس سے دُنیا کی اُلجھنوں کے کام لیتا ہے —— اپنے نفس کی آگ کو دباتا ہے۔ جب بھوک لگتی ہے تو کھاتا ہے۔ جب کھانے کو نہیں ملتا، تو مغلوبُ الغضب ہو کر کسی سے لڑ بیٹھتا ہے۔ وہ درندوں کی طرح خداوند عالم کی صنائع کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

یہ تمام عجائبات مچھر سے لے کر ہاتھی تک ہر ایک جسم میں موجود ہیں۔ اس کو کہاں تک بیان کیا جا سکتا ہے انسان کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، جو کچھ بیان کر دیا گیا۔

آیات اللہ

زمین خُدا کی ایک نشانی ہے

اس کے بعد "زمین" کو دیکھا جائے۔

اگر انسان اپنے جسم کے عجائبات کے سمجھنے کے بعد زمین کے عجائبات پر غور کرے کہ اس کے اُوپر اور اس کی گہرائیوں میں کیا کیا جواہر پنہاں ہیں۔ تو اُس پر چلتا ہے، پھرتا ہے، سب کچھ دیکھتا ہے، لیکن آج تک کوئی آدمی اس کا کنارہ تک معلوم نہیں کر سکا۔

زمین کے اوپر پہاڑ آراستہ کئے۔ انھیں پہاڑوں سے آبشار رواں کیے، تاکہ تھوڑا تھوڑا پانی نکلتا رہے اور تمام زمین کو بہا نہ لے جائے۔

موسمِ بہار پر نظر کرنے سے عجیب عجیب حکمتوں کا اندازہ ہوتا ہے —— کہ ابھی وہاں بادِ خزاں کے جھکڑوں سے زمین اور درخت خشک تھے —— اور ابھی بادِ بہاری نے بادلوں کی مدد سے سبزہ کھلا دیا۔ درختوں میں جان پیدا ہو گئی۔ پھول کھل گئے۔ اناج ہر قسم کے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کو انسان ہی اپنے تصرّف میں لاتا ہے۔

تیسری نشانی جمادات وغیرہ

تیسری نشانی —— خداوند عالم نے پہاڑوں میں جو عجیب عجیب چیزیں محفوظ کر دی ہیں مثلاً لوہا۔ تانبا۔ پیتل۔ جواہرات۔ سونا۔ چاندی۔ فیروزہ و یاقوت۔ اور اس کے ساتھ ہمارے روزانہ استعمال کی چیزیں بھی وہیں سے حاصل ہوتی ہیں جیسے نمک وغیرہ۔

نمک ہماری زندگی کا اہم ترین جزو ہے۔ اگر کھانے میں نمک نہ ہو، تو کھانا کس قدر بدمزہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے نمک صرف پانی کے جماؤ سے جو خمیر بن جاتا ہے، اس سے پیدا کیا۔ ان تمام جمادات کو دیکھ کر اگر انسان قوّتِ تفکّر کے لاتھاہ سمندروں میں مستغرق ہو جائے تو کم ہے۔

چوتھی نشانی حیوانات

چوتھی نشانی —— وہ حیوانات ہیں، جن کو ہم ہر وقت زمین پر چلتا پھرتا دیکھتے ہیں۔ اور ہواؤں میں اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں —— بعض ان میں پیروں کے ذریعے چلتے ہیں بعض پیٹ سے

رینگتے ہیں۔

اِن سب کو ذرا غور کر کے دیکھو، کہ ہر ایک کی شکل قطعی ایک، دُوسرے سے جُدا گانہ ہے۔ اور دیکھنے میں ایک دوسرے سے اچھا معلوم ہوتا ہے، اور تمام جانوروں کو طریقۂ پرورش بھی سکھا دیا گیا ہے۔

مثلاً چیونٹی ہی کو دیکھا جائے کہ وہ برسات سے پہلے اپنے لیے غذا جمع کر لیتی ہے۔ اور صرف جمع ہی نہیں بلکہ جس غذا کو حفاظت کی غرض سے جیسا چاہتی ہے، بنا لیتی ہے۔ مثلاً گیہوں کو خراب ہونے اور سڑنے کے خطرے سے بچانے کے لیے چُورا چُورا کر دیتی ہے اور دھنیے کو ثابت رکھتی ہے۔

مکڑی اپنا گھر کتنی احتیاطوں کے ساتھ بُنتی ہے، کہ اس کے جال میں بھی کہیں بھدا پن نظر نہیں آتا، اور اپنا گھر تیار کرنے کے بعد اپنی غذا خود ہی شکار کرتی ہے۔

اسی طرح زنبور اپنا گھر بالکل تکونہ بناتی ہے۔ اس میں بھی ایک قدرت کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر وہ چوکور بنائے گی تو ظاہر ہے کہ اس کے کونے پُوری طرح نہ بھر سکیں گے۔ لہٰذا وہ ان کاریگروں کو سمجھتے ہوئے اپنے رہنے کا ٹھکانا اپنے مزاج کے مُطابق ہی بنا لیتی ہیں۔

مچھر کو یہ تمیز پیدا ہوتی ہے کہ اس کی اچھی غذا خُون ہے۔ وہ ایک نامعلوم سی سونڈ آدمی کے جسم میں پیوست کر دیتا ہے اور خون کھینچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی قوتِ ادراک کا کیا ٹھکانا ہے؟ کہ ادھر آدمی کے ہاتھ کو حرکت ہوئی اور وہ اپنے نازک پروں سے اُڑا ــــ اور فوراً ہی واپس بھی آتا ہے۔ وہ بھی خداوندِ عالم کا شکر ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ خود ارشاد ہوتا ہے کہ (اے اِنسان تو اُن کی عبادت کو نہیں سمجھ سکتا۔ ترجمہ)

اِس قسم کے لاکھوں عجیب و غریب جانور پیدا کیے ہیں، جن کے متعلق لکھنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔

کیا یہ تمام جانور، درندے، پرندے کسی اِنسان نے پیدا کیے یا وہ خود ہی عالمِ وجود میں آ گئے، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

کیا شان ہے اس صانعِ حقیقی کی، کہ باوجود آنکھ کے بھی روشنی نہیں رہتی، اور باوجود علم کے آدمی جاہل رہتا ہے۔ یہ سب من جانب اللہ ہوتی ہیں، وہ اس لیے کہ آنکھ رکھتے ہیں اور قدرتِ خدا کو نہیں دیکھتے۔ باتیں سُنتے ہیں لیکن سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ چڑیوں کی چہچہاہٹ کو درندوں اور چوپاؤں کی آوازوں کو صرف آواز لایعنی سمجھتا ہے۔ اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ جو سیاہی حروف کو پیدا کرتی ہے، وہ کِس طرح ہے اور دُنیا کے ذرّے ذرّے پر خطِ قدرت نے اپنی صنائع و بدائع سے کیا کیا گلکاریاں کی ہیں۔

اِنسان کیا جانے کہ چیونٹی کا انڈا، جو اس کے سر کے مقابلے میں بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ اس کو نہیں دیکھ پاتا۔ حالانکہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے، کہ اے غافل اِنسان! ذرا میری حقیقت پر غور کر۔ کہ نقاشِ ازل

نے مجھے کیا صورت اور حقیقت عطا کی ہے۔ میرے اس ناچیز جسم میں دماغ، سر، ہاتھ، پیر سب ہی کچھ ودیعت کیے گئے اور تمام قوا اُن میں پیدا کی گئی ہیں۔ اور مجھے قوتِ شامہ تجھ سے کہیں زیادہ عطا کی گئی۔ اسی طرح تمام اعضاء بنا دیے کہ میں اُن سے کام لیتی ہوں۔ اور جب تو اپنا کھیت جوت بو کر تیار کر لیتا ہے، تیرا غلہ تیار ہو جاتا ہے۔ اور تو اس کو بحفاظت تمام اپنی کوٹھیوں میں بھر لیتا ہے، پھر میری قوتِ شامہ جاگتی ہے۔ میں اس کو اپنے کام میں لاتی ہوں۔ مجھے معلوم رہتا ہے کہ بارش کب ہوگی۔ اور اس کے پہلے ہی اپنے کھانے کے لیے انتظامات کر لیتی ہوں۔ اے انسان! تیرے جمع کیے ہوئے خرمن آفاتِ سماوی سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، لیکن میرے ذخیرے ان آفاتِ ظاہری سے امن میں رہتے ہیں۔ میں بڑے آرام سے اس کو کھاتی ہوں۔

اس طرح تمام جانور۔ درندے، پرندے، چرندے اپنی زبانِ حال سے اس کا شکر بجالاتے ہیں۔ لیکن یہ بدقسمت اس کو قطعی نہیں سمجھتا۔

خداوندِ عالم خود ارشاد فرما رہا ہے کہ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ - وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ - تمام ذرات اُس کی ثناخوانی میں مشغول ہیں۔ موجوداتِ عالم کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ بے شمار ہیں۔ اُن کے متعلق تشریحات ناممکن ہیں۔

پانچویں نشانی پانچویں نشانی ـــــ زمین پر بہنے والے دریا ہیں، جو تمام زمین پر بہہ رہے ہیں۔ وہ سب سمندروں کا ایک حصہ ہیں، جن سمندروں نے تمام زمین کو چاروں طرف سے محصور کر لیا ہے۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ زمین پانی کے مقابلہ میں صرف چند اصطبل کی حقیقت رکھتی ہے۔

لہٰذا اب دریاؤں کے عجائبات کو دیکھو۔

سمندر زمینوں سے جتنا وسیع تر ہے۔ اتنے ہی اس کے عجائبات بھی وسیع ہیں جس طرح زمین پر لاکھوں قسم کے جانور آباد ہیں، اسی طرح سمندروں میں بھی لاکھوں قسم کے چھوٹے بڑے جانور ہیں۔ اُن میں سے بھی بعض نظر بھی نہیں آتے، اور بعض اتنے بڑے ہیں کہ بڑے بڑے جہاز اُن کے اوپر رک جاتے ہیں۔

اس کے بعد سوچو! کہ خداوندِ عالم نے سمندر میں ایک وہ جانور بھی پیدا کیا ہے جو بارش کے وقت کنارے پر آکر اچھے پانی کی بوندوں کو حلق میں ڈال لیتا ہے۔ اس سے موتی بن جاتے ہیں، اور یہ ہی صدف کہلاتا ہے۔ یہ سب اسی کی کاریگری کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ اور یہ لاکھوں کیڑے ایک مدتِ دراز کے بعد موتی کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اُن میں کوئی چھوٹا ہوتا ہے، کوئی بڑا۔ اور کوئی زیادہ بڑا۔

اسی طرح سمندر کے اندر ایک سرخ درخت پیدا ہوتا ہے۔ وہ دراصل گھاس کی طرح ہی ہوتا ہے لیکن

اصطلاح میں اس کو درخت ہی کہا جاتا ہے۔ اس کو ہم لوگ مرجان بولتے ہیں، جو اصطلاحاً "مونگا" کہلاتا ہے۔ اس کے کف سے سمندری کناروں پر ایک چیز رہ جاتی ہے، جس کو ہم عنبر کے نام سے بولتے ہیں۔

اسی طرح بہت سی عجائبات اور بھی ہیں جو سطح پر ہیں۔ جو انسان سے متعلق ہیں۔ مثلاً تم کشتی بناتے ہو اور وہ اُن خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جو پانی کے تھپیڑوں سے بھی نہ ٹوٹتی ہے اور نہ ڈوبتی ہے۔ تم اس کو پانی میں چلاتے ہو، اور دُنیا کا سفر کرتے ہو۔ پانی میں تم کو ہواؤں کا رُخ بھی معلوم ہوتا ہے۔ جو بادبانی کے کام میں آتا ہے۔ اور ستاروں کے ذریعے دنیا کی سمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

پانی کو متفرق اجزاء کے ایسے رقیق حصوں سے متصل کر دیا، اور اس کو اتنا صاف وشفاف بنایا اور تمام دُنیا میں بہا دیا۔ اس کی ضرورت کو اتنا اہم کر دیا کہ ہر ذی رُوح کو اس کا محتاج بنایا۔

یہاں تک کہ اگر آدمی کو پیاس کے وقت ایک قطرۂ آب نہ ملے تو وہ اپنی لاکھوں، کروڑوں روپیہ کی ملکیت ایک پیاس کے بجھانے کے لیے دے سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ پانی کا ایک ہی گھونٹ غلط طریقے سے انسان کے مثانے سے باہر نہ نکلے۔ تو اس کو باہر نکالنے کے لیے بھی آدمی بے چین ہو جاتا ہے اور اپنی عمر بھر کی دولت دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ غرض کہ پانی کے عجائبات بھی اتنے لاتعداد ہیں کہ اُن کا احصاء ناممکن ہے۔

چھٹی نشانی

چھٹی نشانی ہوا اور جو کچھ ہواؤں میں پوشیدہ ہے وہ سب کچھ ہے۔

ہوا بھی ایک دریا کی طرح ہے، جو موجیں مار رہی ہے۔ وہ ایک ایسا لطیف جسم ہے کہ جس کو انسان دیکھ بھی نہیں سکتا، حالانکہ وہ انسان کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ اہم ترین چیز ہے۔ کھانے کی ضرورت صرف ایک بار یا دو بار ہوتی ہے، لیکن ہوا کی ضرورت ہر ہر لمحے، ہر ہر سیکنڈ ہے۔ اس لیے کہ آدمی سانس نہ لے تو اسی وقت زندگی ختم ہو جائے۔

ہوا کے ذریعہ ہی دریاؤں کی کشتیاں سطح آب پر رُکی رہتی ہیں، ورنہ ایک منٹ نہ ٹھہر سکتیں۔

آسمان کے حقائق کو دیکھنے سے پہلے ہواؤں کی حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خُداوندِ عالم نے اس میں کیا کیا عجائبات محفوظ کر دیئے ہیں۔

مثلاً ابر جو کثیف اشیاء کا مجموعہ ہے۔ ہواؤں میں بلند ہو کر کتنا لطیف ہو جاتا ہے۔ اور فضاؤں کی بلندیوں پر چڑھ کر کس قدر پیاری صُورت سے ایک ایک قطرہ برستا ہے۔ اس کا ہر قطرہ وہیں گرتا ہے جہاں کے لیے خداوندِ عالم نے اس قطرے کو حکم دیا ہے۔ ہر قطرے کے لیے حکم ہے کہ فلاں درخت کو سیراب کرے گا۔ اس طرح پہاڑوں کی سربلند چوٹیوں پر روئی کے گالوں کی طرح برف گرتی محسوس ہوتی ہے اور

وہاں کی ٹھنڈی فضاؤں کے باعث وہ برف پگھلتی نہیں، بلکہ فصلِ بہار میں رفتہ رفتہ پگھل کر دریاؤں میں پانی کی زیادتی کا سبب ہوتی ہے۔ اس میں کتنی بڑی قدرت نظر آتی ہے کہ گرمی میں اگر یہ برف پگھل کر دریاؤں کی فراوانی میں زیادتی پیدا نہ کرتی، تو اس سخت دھوپ کی تپش میں نہریں اور دریا خشک ہو جاتے اور اس موسم میں بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے تمام کھیتیاں خشک ہو کر جل جاتیں۔ یہ غذائیں جو ہم استعمال کرتے ہیں، کہاں سے آئیں؟

ان تمام چیزوں میں اس کی قدرت آشکارا ہے۔ اس نے ہر چیز اپنی قدرت کے مطابق پیدا کی اور ہر ایک میں عدل و انصاف سے کام لیا۔

ایک جگہ فرماتا ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے صرف کھیل تماشے کی غرض سے نہیں بنایا گیا، بلکہ سب کی غرض و غایت ہے۔ اور سب میں مصلحتیں پوشیدہ ہیں، اور وہ سب حق ہیں۔ لیکن تم سے اکثر نہیں جانتے۔

ساتویں نشانی

ساتویں نشانی آسمان اور ستارے اور بلندیوں کے عجائبات ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے، وہ ان عجائبات ملکوتی کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ کلام اللہ میں متعدد جگہ آسمانوں کے متعلق تفکر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ارشاد فرما رہا ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰیٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ (اور بنایا آسمانوں کو تاکہ وہ چھت کی طرح نگاہوں میں رہے۔ لیکن وہ ہماری ان نشانیوں کے منکر ہیں۔ دوسری جگہ اور ارشاد ہو رہا ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (یعنی آسمان و زمین انسان کے مقابلے میں بہت بڑی تخلیق کے مالک ہیں، لیکن مخلوق اس کو نہیں سمجھتی)

اسی طرح متعدد مقامات پر تنبیہہ کی گئی ہے۔

آسمان کی نیلگوں چھتری اور ستاروں کی روشنی پر نظر رکھنا کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر ظاہری چیزیں تو تمام جانور بھی چکھتے ہیں، بلکہ اس کی حقیقت پر غور کرنا ہی تفکر ہے۔

اگر آدمی اپنے متعلق اور اپنی قریب ترین چیزوں کے متعلق غور نہ کر سکے گا، تو بھلا آسمان کو کیا سمجھ سکے گا۔ وہ تو اس دنیا سے بہت دور ہے، بلکہ اس کو رفتہ رفتہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے —— اول اپنے کو سمجھو، اس کے بعد زمین اور اس میں نباتات، جمادات کو۔ پھر حیوانات کی اصل و حقیقت کو پہچانو! اس طرح بتدریج بڑھتے چلے جاؤ۔ ہواؤں پر غور کرو، بادلوں اور اس کے اندر چمک اور گرج کی حقیقت

کو سمجھو۔ ان تمام منازل کے بعد آسمانوں کا نمبر آتا ہے۔ آسمانوں میں تفکر کے بعد عرش و کرسی، لوح و قلم کی حقیقت میں معرفت کرنا چاہیے۔ آخر میں جسم و جسمانیات سے بالاتر اشیاء کی سیاحت کرنا چاہیے۔ وہ عالمِ ارواح ہے۔ وہاں ملائکہ ہیں، اور ان کے مقابلے میں شیاطین ہیں۔ اس کے بعد ان درجات عالیہ کی معرفت کو سمجھنا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ اسی طرح سیارگاں کی شکل و صورت اور ماہیت پر تفکر کرنا چاہیے۔ کہ کون سیارہ کس شکل کا ہے۔ اُن میں کوئی چھوٹا ہے، کوئی بڑا ہے۔ کوئی گائے کی شکل کا ہے، کوئی بیل کی صورت ہے۔ ان ستاروں کی گردش کو بھی سمجھنا چاہیے، کہ کوئی تو ایک ماہ میں ہی آسمان کو طے کر لیتا ہے، کوئی ایک سال میں۔ کوئی بارہ برس، کوئی تیس سال میں۔ اور بعض ستارہ ایسا بھی ہے کہ چھتیس ہزار سال میں پوری مسافت طے کرے گا۔

ان تمام عجائبات کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہر ستارہ اپنی بناوٹ کے ساتھ ساتھ مختلف منازل پر گامزن ہے۔

آفتاب کی رفتار آفتاب پر غور کرو! وہ زمین سے ایک سو ساٹھ گنا بڑا ہے۔ اور اتنا بڑا ہونے کے باوجود بھی اتنا ذرا سا نظر آتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب ہم سے کروڑوں کوس دُوری پر ہے۔

اِس دُوری کے بعد سوچنا چاہیے کہ اس کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ نصف گھنٹے میں پوری زمین کے مدوّر کو طے کر لیتا ہے۔ اور اسی سے دن رات کا ظہور ہوتا ہے۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار جبرئیل سے فرمایا کہ آفتاب کے زوال کا وقت ہے، تو جواب دیا کہ ہاں ــــ نہیں! آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا جواب دیا؟ جبرئیل نے کہا کہ جس وقت میری زبان سے "نہیں" نکلا اور ہاں کہنے والا تھا، اس وقفے میں آفتاب کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا۔

آسمان کا ایک ہی ستارہ زمین سے سو گناہ وسیع ہے، لیکن اپنی بلندیوں کی وجہ سے ہم کو اتنا ذرا سا دکھائی دیتا ہے۔

موسم کیسے بنتے ہیں؟ اس سے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ ایک ستارہ جب اتنا بڑا ہے تو آسمان کتنی وسیع شے ہو سکتی ہے۔ اسی آفتاب کی وجہ سے سردی، گرمی اور برسات کے موسم بنتے ہیں۔ وہ ہی آفتاب سرد ہوائیں چلاتا ہے، اسی زمانے میں ہماری زمین سے ذرا ہٹ جاتا ہے اور اس کی گرمی کم ہو جاتی ہے اور گرمیوں میں، ذرا قریب آجاتا ہے تو سردی پڑنے لگتی ہے۔

دن رات اور اس کی گردش سے ہی دن رات بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جب اس کا سفر اپنی جگہ پر ختم ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور اسی رفتار کی وجہ سے ہی دن رات میں فرق پڑ جاتا ہے، اور کبھی دن بڑا ہوتا ہے

اور کبھی رات۔

ان تمام باتوں کو اگر ایک ایک کر کے بیان کیا جائے گا تو بڑی طوالت ہو جائے گی۔ لہٰذا اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے ـــــ کہ ہم اس میں تفکر کریں، اور حتی المقدور سمجھنے میں کوتاہی نہ کریں۔

انبیاء علیہم السلام کا علم کہیں بلند تھا ـــــ یہ سلسلہ اس طرح چلتا ہے کہ ہمارا علم اولیاء سے کم ہے اولیاء کا علم انبیاء سے کم ہے اور انبیاء علیہم السلام کا علم ملائکہ سے کم ہے۔ لیکن خداوند عالم کے علم اس کو نسبت دینا قطعی غلط ہے۔ اس لیے کہ اُن کو اگر اس کے علم کا حامل قرار دیں گے تو اس نے خود ارشاد فرمایا ہے، کہ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ یہ تفکر کے لیے ایک اچھا خاصہ داغ ہے۔

تفکر کے متعلق بتا دینا صرف اس لیے تھا کہ انسان اپنی غفلتوں سے باہر نکل کر بیداری کی طرف قدم رکھ سکے، اور تفکر کے ذریعے معرفت خداوند عالم حاصل کر سکے۔

اب اگر آدمی چیونٹی کی طرح ہی ذلت برداشت کر کے جینا چاہتا ہے تو مجبوری ہے، ورنہ اس کو راستہ بتا دیا گیا ہے اور معرفت کے منازل طے کر سکتا ہے تاکہ اس کی نگاہوں سے غفلت کے پردے ہٹ جائیں۔

آٹھواں اصول

(باب التوکّل)

توکّل

مقربانِ الٰہی کے لیے توکّل بھی ضروری چیز ہے۔ یہ جتنا اعلیٰ درجہ رکھتا ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔

اگر کوئی آدمی کسی موجود میں بھی خداوند عالم کے علاوہ کسی چیز کو شامل کرتا ہے۔ یہ اس کے شرک اور توحید میں نقص کی وجہ ہے۔ اور اگر ہر چیز کے درمیانی وجوہ کو الگ کر دے تو شریعت سے ہٹا جا رہا ہے۔ اور بغیر سبب کسی چیز کو سمجھنا عقل سے بعید بات معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر سبب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو امکانات اس کے بھی ہیں کہ وہ علاوہ خدا کے کسی دوسرے سبب کو ہی اپنا مرکز بنا لے، اور یہ ہی توحید میں شرک کا باعث ہو جائے گا۔

توحید، شریعت اور عقل کو یکجا جمع کرنے سے توکّل کی اصلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ انتہائی مشکل مسئلہ ہے۔ یہاں ہم اوّل فضیلت بتائیں گے، اس کے بعد توکّل کی حقیقت اور اس کے بعد توکّل کے ماتحت حالات اور اعمال سے مثالیں دیں گے۔

توکّل کے فضائل

خداوندِ عالم نے توکّل کو ہی ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا کہ ہر آدمی کے لیے توکّل ضروری ہے۔

آیاتِ توکّل ارشاد ہو رہا ہے کہ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (یعنی اگر مومن ہو تو خداوندِ عالم پر توکّل کرو)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (یعنی خداوندِ عالم متوکّلین کو دوست رکھتا ہے)

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (جو آدمی خدا پر توکّل کرتا ہے اس کے لیے وہ کافی ہے)

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (کیا خداوندِ عالم اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں)

اور بھی متعدد آیات توکّل کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔

احادیث آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جب میں نے اپنی اُمّتوں کی کثرتِ تعداد دیکھی تو بہت خوش ہوا۔ ندا آئی، کہ اے رسُول! تم ان اُمّتوں سے خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا، ہاں میں خوش ہوا۔ اس کے بعد ربّ العزّت نے وعدہ فرمایا کہ اس میں سے ستّر ہزار بغیر حساب کتاب کے جنّت میں داخل ہوں گے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ بغیر حساب و کتاب کے جنّت میں داخل ہونے والے کون ہوں گے۔ ارشاد ہوا کہ وہ لوگ جو صرف خدا کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حضرت عکاشہ نے پھر دریافت کیا کہ یا حضرتؐ! میرے لیے بھی دُعا فرماویں کہ انھیں ستّر ہزار میں میرا شمار ہو جائے۔ آپ نے دُعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیئے۔ اس کے بعد دوسرے صحابی نے عرض کی اور یہی استدعا کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عکاشہ اس مسئلے میں سب سے سبقت لے گیا۔

یہ بھی ارشاد ہوا کہ اگر بندہ خدا پر توکّل کرے، تو وہ اس کو اس طرح روزی پہنچاتا ہے جس طرح پرندوں کو۔ اور جو آدمی صرف اسی پر بھروسہ کرتا ہے، اس کی تمام حاجات پوری ہوتی ہیں۔ متوکّلین کو رزق ایسی جگہ سے مل جاتا ہے، جہاں سے اُن کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ دنیا والوں کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔ وہ بھی ان لوگوں کو دُنیا پر ہی چھوڑ دیتا ہے۔

واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام حضرت ابراہیمؑ کو کفّار نے آگ میں پھینکنے کے لیے جب منجنیق میں بٹھا دیا، تو آپ نے فرمایا حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ چنانچہ جب آپ ہوا میں معلّق تھے تو جبرئیل آئے اور عرض کی، یا ابراہیم! کیا کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا کچھ نہیں۔ میں اپنے خدا پر توکّل کرتا ہوں۔

حضرت داؤد علیہ السّلام پر وحی نازل ہوئی کہ جو بندہ مجھ پر توکّل کرتا ہے، میں دُنیا کے تمام مکروفریب سے اس کو نجات دلاتا ہوں اور اس کی تمام مشکلات حل کرتا ہوں۔

حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ میں نے ایک راہب سے دریافت کیا کہ تیری روزی

کا کیا ذریعہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ روزی دینے والے سے دریافت کرو کہ کہاں سے دیتا ہے۔

ایک عابد سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تو ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا ہے، پھر تیری روزی کا کیا ذریعہ ہے۔ اس نے اپنے دانت اور منہ کھول کر اشارہ کیا کہ جس نے یہ چکّی بنائی ہے وہ کھانے کا بھی انتظام کرتا ہے۔ میں نے اس کی کبھی فکر نہیں کی۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت ہرم بن حبان نے دریافت کیا کہ میں کہاں ٹھہروں؟ پوچھا کہ وہاں روٹی کا کیا بندوبست ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایسے دلوں پر افسوس ہے جو خداوندِ عالم پر بھروسہ نہیں کرتے اور نصیحت کو نہیں سنتے۔

توکّل کی بُنیاد

توکّل کی بُنیادیں توحید کی حقیقت پر مبنی ہیں

توکّل ایمان کی روشنی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ ایک کیفیت ہے جو دل میں ایمان کی وجہ سے جاگزیں ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ توکّل ہے۔

ایمان کی متعدد اقسام ہیں اور اُن اقسام میں دو قسموں پر ایمان رکھنا توکّل کی نشانی ہے۔

پہلا ایمان

پہلے توحید پر ایمان لانا۔

دوسرے رحمتِ خداوندی پر ایمانِ کامل رکھنا۔

توحید کو تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی حسبِ ضرورت بتائے دیتے ہیں۔ تاکہ توکّل کی حقیقت سمجھ میں آسکے۔

مدارجِ توحید

توحید چار مدارج پر مبنی ہے۔ اس کا ایک اصل خزانہ ہے۔ اور اس خزانے کے اندر بھی ایک خزانہ ہے۔ اندر کے خزانے کے اُوپر ایک غلاف ہے۔ اسی طرح اُوپر کے خزانے کے اوپر بھی ایک غلاف ہے۔

فی الجملہ توحید، دو مغز اور دو غلافوں پر مبنی ہے۔

اس کی مثال آسانی سے "اخروٹ" سے دی جاسکتی ہے، کہ اس کے اوپر کے دونوں چھلکے اور اندرونی گری تو صاف ظاہر ہے۔ اور مغز کے اندر کا مغز اس کا "تیل" ہے۔

اب اس کو درجات کی شکل میں اس طرح سمجھنا چاہیے کہ

پہلے درجے پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے، کہ آدمی زبان سے کہتا ہے، لیکن دل میں خلوص و مودّت نہیں۔ اس کو منافقت کہتے ہیں۔

دُوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ زبان سے کہے اور دل میں بھی اس کے معنی کی عظمت کرتا ہو
تیسرے یہ کہ اس کو کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں سب کچھ نظر آتا ہو، اور وہ سمجھ لے کہ دنیا کے تمام افعال کا فاعل صرف ایک ہے۔

یہ اعتقاد آدمی کے دل میں ایک قسم کا نُور پیدا کر دیتا ہے۔ اور اِس نور کی شعاعوں میں وہ مشاہدات نظر آنے لگتے ہیں۔

لیکن یہ درجات صرف اعتقادات یا تقلید اور سمجھنے سے نہیں حاصل ہوتے۔ اِس لیے کہ صرف تقلید یا دلائل کے ذریعہ سمجھنے میں صرف ایک دائرے کے اندر علم و مشاہدہ محدود رہتا ہے لیکن مشاہدات نُور سے دل کی گتھیاں سُلجھ کر کھل جاتی ہیں۔ پھر اس کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اِس کے بعد عوام النّاس کے متعلق بھی بتا دینا ضروری ہے کہ اُن کی تقلید کے کیا کیا مدارج ہیں۔

عوام کا عقیدہ فرض کرو کہ ایک آدمی کو یہ اعتقاد ہو کہ ایک شخص فلاں گھر کے اندر ہے اور اس کا اعتقاد محض اس لیے ہو کہ اس نے صرف کسی سے سُنا ہے۔

یہ بالکل جاہل آدمی کی تقلید ہے کہ جن طریقوں پر اس کے آباؤ اجداد عمل کرتے آتے ہیں وہ ہی عقیدے اِس کے بھی ہیں۔

متکلّمین کا عقیدہ متکلّم کے اعتقادات کی تمثیل یہ ہو سکتی ہے ـــ کہ ایک آدمی نے کسی مکان کے دروازے پر گھوڑے اور نوکر کو کھڑے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ اس مکان کے اندر اِس گھوڑے کا سوار گیا ہے، یہ صرف اس کے قیاسات پر مبنی ہے۔

عارفین کا عقیدہ اِس کے بعد عارفین کا درجہ شروع ہوتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ایسا ہوتا ہے، کہ اُنھوں نے اِس مکان کے اندر اس شخص کو آنکھوں سے دیکھا ہو۔ وُہ اِتنا یقین رکھتے ہیں۔ یہ عارفوں کا درجہ توحید ہے اِس میں بعض عارفین کو خالق و مخلوق دونوں نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ خالق کی بنائی ہوئی یہ تمام مخلوق ہے۔ لٰہذا اس میں دو چیزوں کا عقیدہ ہونے کی وجہ سے منزلت میں فرق آجاتا ہے۔

درجہ فنا فی التوّحید چوتھا درجہ جو سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ لوگ صرف خدا کو دیکھتے ہیں۔ ہر چیز میں صرف وہ ہی وہ نظر آتا ہے۔ صُوفیائے کرام اِس مرتبے کو فنا فی التوحید کہتے ہیں۔

ایک بار حسین حلّاج رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خواص کو بیابان میں روتے دیکھا ـــ تو دریافت کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ حضرت خواص نے جواب دیا کہ توکّل کے حصول کی کوشش میں مصروف ہوں۔ آپ نے کہا کہ پوری عمر تو یوں ہی گزار دی۔ اب بھلا نیستی سے مقامِ توحید پر کیسے پہنچ پاؤ گے؟

توحید کے یہ ہی چار درجات ہیں :

پہلی توحید، منافقت پر مبنی ہے۔ جو صرف اوپر کا نظر آنے والا چھلکا ہے، جس کے کھانے سے مُنہ بھی بدذائقہ ہوجاتا ہے۔ وہ نہ رکھنے کے کام کا ہے نہ کھانے کے، صرف اپنے اوپر اس کا وجود بار گزرتا ہے۔ البتہ اس کو چند دن کے لیے اندر والے چھلکے کی حفاظت کے لیے لگا رہنے دینے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔

اسی طرح منافق کی توحید بھی ہے کہ اس کے جسم کو تلوار سے بچاتی ہے، اور اس کی وجہ سے دنیا میں اِس کو زندہ رہنے دیا گیا۔ لیکن جب وہ مرے گا تو پھر اس کی رُوح بیکار ہے۔

اب دوسرے درجے کی مثال اخروٹ کے اندرونی غلاف کی طرح ہے کہ جو کھانے کے کام کا نہیں ہوتا، بلکہ اس کو صرف اس کے اصل مغز کی حفاظت کے لیے روک لیا جاتا ہے۔ اور یہ چھلکا بھی اس کے مغز سے کہیں کم تر ہوتا ہے۔

بس یہ ہی فرق ہے متکلّمین اور عوام کی توحید میں —— اگرچہ یہ توحید بھی دوزخ کی آگ سے بچانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، لیکن مغز اور روغن کے مقابلے میں قطعی ہیچ ہے۔

آدمی اخروٹ کی گری کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ لیکن اگر اخروٹ کا تیل ہاتھ آجائے تو اس گری کی وقعت بھی کم ہوجاتی ہے —— لہٰذا آخری درجہ کمال "چوتھا" ہی ہے۔ کیونکہ اس میں صرف "وہ ہی وہ" رہ جاتا ہے اور علاوہ اس کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ انسان اپنے کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔

توجیہات توحید

توجیہات برائے توحید بعض لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب ہم آسمان، زمین، سیارے، سُورج اور دُنیا کے گوناگوں اشیاء دیکھتے ہیں تو اُن میں یہ بدیہی تفرقات ہیں۔ ان سب چیزوں کی دوئی کو کیسے مٹایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے تھوڑی سی توجیہہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہم بتاتے ہیں۔

یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ منافقین کی توحید صرف زبان پر موقوف ہوتی ہے۔ عوام کی صرف سُنی سُنائی اور اعتقاد پر —— متکلمین کی توحید دلالتوں کے ماتحت ہوتی ہے۔

دُنیا کی ہر چیز کا مرکز ایک ہے ان تینوں وحدانیتوں کو ہر آدمی آسانی سے سمجھ لیتا ہے لیکن چوتھی منزل پر انسان کی عقل مشکل سے پہنچتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ توکّل کے لیے چوتھی منزل کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ تیسری منزل ہی کافی ہوجاتی ہے۔ اور نہ ایسے آدمی کی سمجھ میں توحید کی آخری

منزل آ سکتی ہے، جو خود اس کے معارف سے آگاہ نہ ہو۔

پھر بھی مجملاً اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا دیا جائے تاکہ بہت سی چیزوں کے آپس میں لگاؤ کے بعد جو ایک چیز بنتی ہے، اس کی حقیقت سے آگاہ ہو سکے۔ اس لیے کہ عارفانِ حقیقی توحید کو اسی وحدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

انسان کی ساخت بہت سے اعضا سے ملی جلی ہے۔ لیکن ہم ان تمام اعضاء کو جب یکجا مجتمع دیکھتے ہیں، تو آدمی کا تصور ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اعضا اس کی وحدت میں شامل ہیں۔

یہ بھی ممکنات میں سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے مل جائیں کہ جو اپنے اعضا کے متعلق یہ سوجھ بوجھ ہی نہ رکھتے ہوں کہ ہمارے ہاتھ، پیر، سر، پیٹ اور اس کے اندر معدہ، جگر، تلی وغیرہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ بلکہ وہ آدمی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اور اگر اس سے دریافت کیا جائے تو بھی وہ یہ ہی جواب دے گا کہ میں صرف ایک ہی مجسّمے کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز مجھ کو دکھائی نہیں دے رہی۔ اور نہ اس کے تخیّل میں ہی ایک سے زیادہ کوئی چیز ہوگی۔ اور وہ مثلاً اپنے محبوب ہی کو دیکھ رہا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے کو بھی فراموش کر چکا ہے۔ اس کو صرف اس کا محبوب ہی نظر آتا ہے۔

بس اسی طرح وہ عارفِ حقیقی بھی ہے کہ جو دنیا و مافیہا میں صرف ایک ہی چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اس کو دنیا کی اور کسی چیز کی خبر نہیں، حتیٰ کہ اپنی بھی خبر نہیں۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو ایک دوسرے سے ملا جلا سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں آسمان زمین، ستارے یہ سب اجزا ایک ہی مرکز رکھتے ہیں۔ جس طرح کسی جاندار کے تمام اعضا مل کر وہ حیوان صورتِ جسمیہ اختیار کرتا ہے۔ اور ان تمام چیزوں میں ایک تعلق صرف تدبر کے لیے ہے۔ جس طرح حیوان کو اس کے اعضا سے تعلق ہے اور انسانی بدن، عقل اور روح کا تعلق باہمی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، لیکن اس نسبت کو آدمی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا، جب تک کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ کی اصل کو نہ سمجھ سکے۔ اور اس قسم کے باریک نکتے اس کی عقل میں نہ آ سکیں گے۔

کتاب کے عنوان میں ہم نے اس مسئلے پر کافی روشنی ڈال دی ہے۔ یہاں بیان کرنا خواہ مخواہ ہی ہوگا۔

ان درجات کو سمجھنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو یہیں ختم کر دینا ہی مناسب ہے۔

توحیدِ فعلی

اب رہی توحید کی تیسری منزل، جس کو ہم لوگ توحیدِ فعلی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم احیاء العلوم میں سب کچھ لکھ چکے ہیں۔ اگر چاہتے ہو تو اس کا مطالعہ کر سکتے ہو۔ یہاں

صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جو شکر کے اصول کے ماتحت پیچھے بیان کر دیا گیا ہے۔

پھر بھی یہاں اتنا اور بتا دیں کہ آفتاب و ماہتاب، ستارے، ہوا، ابر وغیرہ قدرت کے قبضے میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی کاتب کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اور قلم کو جب خود نہیں ہلاتا، اس وقت تک وہ قطعی ہل بھی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم کی اتنی جنبشیں بھی ہیں کہ وہ جہاں چاہے اور جتنا چاہے چلائے۔ اسی طرح یہ تمام چیزیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں وہ بھی اپنی قوتِ ارادی سے جنبش نہیں کرتیں، بلکہ ان سب کی باگ ڈور دستِ قدرت میں ہے کہ وہ جب چاہے اور جیسا چاہے اُن کو بنا دے۔

اسی طرح آدمی کے ہاتھ میں دُنیا کا سب کچھ ہے۔ لیکن اس کو خود مختار سمجھنا غلطی ہے۔ دراصل وہ بھی کسی کا محتاج ہے، اور اس کی قوتِ ارادی کسی بڑی طاقت کی محکوم ہے۔ اور وہ بڑی طاقت قدرت خداوندی ہے، اور وہ طاقت ارادے کی تابع ہے۔ اور ارادہ خداوندِ عالم کا مطیع ہے۔ جب خداوندِ عالم ارادے کو پیدا کرتا ہے۔ اس وقت انسان کی تمام طاقتیں اور قوتیں جاگ جاتی ہیں اور وہ اس کام پر مستعد ہو جاتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ انسان کے ہاتھ میں اور اس کی قدرت میں کوئی شے نہیں۔ اس کو ایک آسان مثال کے ذریعہ یوں بھی سمجھ سکتے ہو کہ آدمی کے افعال تین اقسام پر مبنی ہوتے ہیں۔

آدمی کے افعال کی بُنیاد

پہلے مثلاً آدمی پانی کی سطح پر پیر رکھتا ہے۔ اور اس کا پیر غیر ارادی طور پر اس پانی کی سطح کو چیر کر دو حصّوں میں منقسم کر دیتا ہے۔ اس وقت بظاہر یہ کہا جائے گا کہ آدمی کے پیر نے پانی کے ایک حصّے کو دو حصّوں میں الگ الگ کر دیا۔ اس فعل کو فعلِ طبعی کہا جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آدمی سانس خود لیتا ہے۔ ایسے فعل کو فعلِ ارادی کہتے ہیں۔

تیسرے فعل اختیاری ہوتا ہے کہ مثلاً آدمی ایک کام کرے یا کسی سے بات کرے اور فوراً وہاں سے چلا جائے۔

فعل طبعی آدمی کے اختیارات سے باہر ہے۔ اس لیے کہ وہ جب بھی پانی پر پیر رکھے گا، پانی ضرور اِدھر اُدھر ہٹ جائے گا۔ اس میں آدمی کو کوئی اختیار نہیں۔ یہ ہی نہیں، بلکہ اگر ایک پتھر بھی پانی پر پھینکا جائے گا، تو وہ بھی پانی کو اپنی جگہ سے ہٹا دے گا، تو یہ فعل پتھر کا فعل نہیں ہوا، بلکہ یہ اس کی طبع حقیقی کے مُطابق ہے۔

اسی طرح اگر فعلِ ارادی پر بھی غور کیا جائے، کہ آدمی کے بس میں یہ بات بھی نہیں کہ وہ اپنے ارادے سے جب چاہے سانس لے، اور جب چاہے نہ لے، بلکہ وہ سانس بھی قادر نہیں، اور مجبوراً سانس لیتا

قادر نہیں، اور وہ مجبوراً سانس لیتا

ہے۔ جس طرح کوئی آدمی کسی کو آنکھ میں سوئی چبھونا چاہے تو آدمی چاہے جتنا آنکھ کو کھولے رکھنے کا ارادہ کرے، لیکن اس کی آنکھ فطری طور سے جھپک جائے گی۔

لہٰذا ان دونوں افعال سے آدمی کی ذاتی مجبوریاں ظاہر ہوتی ہیں۔

البتہ فعل اختیاری مثلاً چلنا، پھرنا، بیٹھنا، اُٹھنا ان سب میں آدمی کو اختیارات کلّی حاصل ہیں اس میں بھی ایک چیز ضرور پیدا ہوتی ہے کہ آدمی ہمیشہ اس کام کو کرتا ہے کہ جب اس کی عقل اس کو حکم دیتی ہے کہ اس کام میں تیرے لیے بہتری ہے۔ اور اگر کوئی مسئلہ اُلجھا ہوا ہے۔ تو اس میں بھی آدمی پس وپیش کرتا ہے اور سوچتا ہے۔ لہٰذا جب عقل طے کر لیتی ہے کہ تیری بھلائی اس کام کے کرنے میں ہے، تو وہ اس کو کرتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی دُور سے سوئی پھینکے اور وہ آنکھ کی طرف آ رہی ہو تو یہ بدیہی امر ہے کہ آنکھ کے لیے سوئی مضر ہے۔ اس میں سوچنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اور آنکھ خود بخود بند ہو جائے گی — اس میں اس کی عقل فوراً ارادے کو حکم دیتی ہے اور ارادہ آنکھ کو بند کر دیتا ہے۔ یہ قدرت کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اگر یہاں ذرا سا بھی تساہل برتا گیا، تو وہ یہی نقصان وہ ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر ایک آدمی کے کوئی شخص لاٹھی مارنے کے لیے اُٹھائے اور وہ مکان کی چھت پر ہو۔ تو وہ یہ سوچتا ہے کہ لاٹھی کی چوٹ، زیادہ مضر ہوگی یا کوٹھے سے نیچے کُود جانے سے چوٹ زیادہ آئےگی وہ یہ سوچتا ہے، اور جب دونوں باتوں میں کسی ایک بہتری کی طرف تیقّن ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت جو ارادہ وہ کرتا ہے، وہ فوراً حرکت میں آتا ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ حرکت اس کے ارادے کی مطیع ہے۔ اور ارادہ عقل کے احکامات کے ماتحت بنتا ہے جس کو بہتر سمجھ کر طے کرتی ہے۔

اسی طرح اگر آدمی خودکشی کرنا چاہے، اس کے ہاتھ میں تلوار بھی موجود ہو، لیکن اوّل عقل اس کی بہتری اور برتری کو سوچتی ہے، اور وہ آدمی اپنے فعل کو کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔ فعل کرنے میں اس کا ہاتھ ہی نہیں ہلتا، اس لیے کہ اس کا ہاتھ اس کے ارادے کا تابع ہوتا ہے اور ارادہ عقل کا مطیع۔ لہٰذا عقل اس کو مجبور کر دیتی ہے اور وہ اپنے ارادے سے باز آ جاتا ہے۔

لیکن بعض اوقات حالات ایسے بھی ہو جاتے ہیں کہ کوئی اتنی سخت مصیبت آدمی پر پڑ جاتی ہے کہ وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے، تو عقل اس وقت اس میں بہتری سمجھتی ہے کہ وہ اپنے کو قتل کر دے۔ اس کو فعل امتیازی کہتے ہیں۔ چونکہ یہ اس کی تمیز اور عقل کے ماتحت ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس میں مجبوری شامل ہو جائے، تو وہ فعل طبعی یا فعل ارادی ہو جاتا ہے۔

اس کے متعلّق کافی بحث کی جاسکتی ہے اور کتاب "احیاء العلوم" میں بسیط طریقے پر اس کو بیان کر دیا گیا ہے ——— خداوند عالم نے اِنسان کو جو طاقت اور قدرت بخشی ہے، وہ اس قسم کی ہے، اور اس کی وجہ سے انسان کو بہت سے گمان پیدا ہو جاتے ہیں کہ میں خود مختار ہوں۔ حالانکہ یہ حماقت کی دلیل ہے۔ آدمی کو صرف اتنے ہی اختیارات دیے گئے ہیں کہ وہ چونکہ قدرت خدا کا مظاہرہ ہے۔ اس کو تھوڑے سے اختیارات دے دیے گئے ہیں، وہ محلّ قدرت ہے۔

مثلاً درخت ہوا کی وجہ سے ہلتے ہیں۔ خود اُن میں ہلنے کی کوئی طاقت نہیں۔ اس لیے کہ اِس میں ارادہ اور قوت کو دخل ہی نہیں۔ یہ چیزیں اس کو ودیعت ہی نہیں کی گئیں۔

قوتِ اختراع | خداوند عالم کی قدرت کسی دوسری شئے کی مقیدّ نہیں اس کو قوتِ اختراع کہتے ہیں۔

اِنسان چونکہ نہ درختوں کی طرح ہے اور نہ اس کے اختیارات اتنے ہی وسیع ہیں، کہ جو چاہے کرے بلکہ اس میں قوت اور ارادے کی طاقت دے دی گئی ہے۔ تو اس میں کیفیت اضطراری بھی نہیں ہوتی۔ جب یہ طے ہو گیا کہ اس میں نہ تو قطعی خود ارادیت بھی نہیں ہوتی۔ اور درختوں کی طرح مجبور بھی نہیں ہوتا۔ تو جتنا ان دونوں کے بین بین کوئی چیز ہوتی ہے، اور اس کا نام بھی کوئی اور ہی رکھنا پڑے گا۔ لہٰذا اس کو "کسب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اِس پوری بحث سے معلوم ہوا کہ آدمی اگرچہ اپنے ذاتی کاموں پر قادر ہوتا ہے، لیکن اس کی مجبوریاں بھی اس کے نفس خود اختیاری کے ساتھ ساتھ منسلک ہیں۔ لہٰذا نتیجے میں وہ بھی خود مختار نہ رہا۔

خُود اختیاریٔ اِنسان

اِنسان کی خُود مختاری کہاں تک سزا و جزا کی مستحق ہے | توحید در شرع / شرع در توحید } مندرجہ افعال اِنسانی کے بیان کے بعد "آدمی" یہ کہہ سکتا ہے کہ اب نہ شریعت کی ضرورت رہ جاتی ہے، اور نہ سزا و جزا کی، اس لیے کہ آدمی کے اختیارات میں کوئی چیز نہیں۔

یہ ہی مقام توحید در شرع اور شرع در توحید کہلاتا ہے۔

ان تمام چیزوں کو پڑھ کر بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ قعرِ مذلت میں اندھے مُنہ گر پڑتے ہیں۔ اور صرف چوتھی منزل پر پہنچا ہوا آدمی جس کے متعلق "فعل طبعی" بیان کیا گیا ہے، وہ ہی یہاں آکر ٹھہر سکتا ہے، اور اس میں اس مسئلہ مشکلہ کی سُوجھ بوجھ ہو سکتی ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں پانی پر پیر رکھ کر نہ ڈوبنے والے ہی اس کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اُن کے بعد وہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں، جو کم از کم دریا میں تیر ہی سکتے ہیں۔ اور یا وہ لوگ جو ان معارف کی طرف،

متوجہ ہی نہیں ہوتے اور ڈرتے ہیں کہ ہم گمراہ نہ ہو جائیں۔ عوام الناس کے لیے مناسب یہ ہی ہے کہ وہ اُن کو اس دریا کے قریب ہی نہ آنے دیا جائے۔

بعض لوگوں نے توحید کو سمجھنا چاہا، لیکن وہ اور گمراہی میں پڑ گئے۔ اُن میں کچھ تو اس لیے کہ وہ علوم توحید سے قطعی ناواقف تھے۔ اور نہ اُن کی سمجھ میں یہ آہی سکا کہ علم توحید سے ہی ناواقف ہونے کی وجہ سے مجبور ہوں اور نہ اُن میں اس کے سیکھنے کی خواہش ہوئی جس کی بنار پر وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اور کہتے یہ ہی ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں، سب کچھ وہ ہی کرتا ہے۔

ہمارا علم، ہماری محنت کا اس مسئلے میں کوئی دخل نہیں۔ جس کو وہ نیکی کا حکم دیتا ہے، وہ نیکی کرتا ہے۔ اور جس کو گمراہی میں ڈالتا ہے، وہ گمراہ رہتا ہے۔ یہ آدمی کے بس سے باہر ہے۔ لیکن یہ کہنا قطعی جہالت کی دلیل ہے اور انسان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

ان مسائل کو کتب میں لکھنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس منزل پر پہنچنے کے بعد مسئلے کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھ دینا ضروری ہے۔

جبر و اختیار جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز میں خداوند عالم خود مختار ہے۔ اور جب وہ خود مختار ہے تو پھر سزا و جزا کی ضرورت کہاں باقی رہتی ہے۔

اس کو ذرا سا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آدمی کو سزا اس کے گناہوں کی وجہ سے نہیں ملتی۔ یا نیکیوں کی وجہ سے انعام نہیں ملتا۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں صفاتِ الٰہیہ سے دُور ہیں —— بلکہ اس کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ جب آدمی کے جسم میں صفرا، بلغم یا خون وغیرہ کی زیادتی اور کمی پیدا ہو جاتی ہے —— وہ ہی انسان کی بیماری کا سبب ہوتی ہے۔ اور جب وہ دوا پیتا ہے۔ تو یہ سب چیزیں حد اعتدال پر واپس ہوتی ہیں۔

اسی طرح جب کوئی خواہش زیادہ غلبہ کرتی ہے، وہ ایک آگ کی طرح بھڑکنے لگتی ہے، اور وہ ہی موت کا باعث بن جاتی ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "غصّہ" آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔

پس جس طرح عقل غصّے پر غالب آکر غصّے کو ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح دوزخ کی آگ کو "ایمان کا نور" ختم کر دیتا ہے۔ اس وقت دوزخ کہتا ہے جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَاِنَّ نُوْرَکَ اَطْفَأَ نَارِیْ (یعنی اے مومن میرے پاس سے ہٹ جا! تیرا نور میری آگ کو بجھائے دے رہا ہے) یہاں ایک دوسرے کا سامنا نہیں ہوتا حتیٰ کہ دوزخ ایمان کی روشنی کے سامنے ٹھیرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتی۔ وہ اس طرح بھاگتی ہے جیسے مچھر ہوا سے —— اسی طرح خواہشات کی آگ بھی عقل کی شعاعوں سے دب جاتی ہے۔

دوزخ کی حقیقت

معلوم ہوا کہ اِنسان پر عذاب کے کہیں دوسری جگہ سے کوئی چیز نہ آئے گی۔ بلکہ خود اسی کے غصّے کی آگ میں اس کو جلایا جائے گا۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اِنَّمَا ھِیَ اَعْمَالُکُمْ تُرَدُّ اِلَیْکُمْ۔ یعنی تمھارے اعمال ہی تمھارا دوزخ ہے، جو تمھاری طرف بڑھتے ہیں۔ لہٰذا دوزخ کی حقیقت یہ ہے کہ اِنسان کے اندر اس کی خواہشات کی آگ موجزن ہے۔ وہ ہی اس کا دوزخ ہے۔ اور وہ اسی میں جلے گا۔ اگر آدمی کو علم "یقین" ہوتا تو اس کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کہ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ۔

دوسری مثال اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ جس طرح زہر کھانے کے بعد آدمی مرتا ہے اور مرنے کے بعد وہ قبرستان لے جایا جاتا ہے۔ پس اسی طرح گناہوں اور شہوت کی آگ کی وجہ سے وہ بیمار ہوتا ہے۔ اور اس بیماری سے ہلاک ہو جاتا ہے اور وہ ہی بیماری اس کے لیے آگ بن جاتی ہے، جو دوزخ کی ہم جنس ہوتی ہے۔ در اصل وہ عذاب کسی جذبۂ انتقام کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ وہ آتش دوزخ کا تعلق اس دُنیا کی آگ سے نہیں ہوتا۔

مقناطیس جس طرح لوہے کو اپنا ہم جنس ہونے کی وجہ سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اسی طرح دوزخ بھی دوزخی کو ہم طبع ہونے کی وجہ سے اپنی طرف بُلاتا ہے۔ کسی کے انتقام اور غصّے کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح نیکیوں اور جنّت کو بھی ایمان کے ساتھ منطبق کر لیجیے۔

شریعت کی ضرورت اور انبیاء کی بعثت کا سبب

یہ بات اس اعتراض کے جواب میں تھی کہ ثواب اور عذاب کا تعلق آدمی سے نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ایک سوال اور رہ جاتا ہے کہ شریعت کی ہمارے لیے پھر کیا ضرورت ہے۔ اور انبیاء علیہم السّلام کو کیوں مبعوث کیا گیا؟

اس کو اگر اچھی نظر سے دیکھا جائے تو اپنی مخلوق کے ساتھ خداوند عالم نے محبت کا ثبوت دیا ہے، کہ بندوں کی ہدایت کے لیے پیغمبروں کو مبعوث کر دیا گیا، تاکہ وہ اُن کو جنّت کی طرف لائیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرما رہے ہیں کہ اَتَعْجَبُ مِنْ قَوْمٍ یُقَادُوْنَ اِلَی الْجَنَّۃِ بِالسَّلَاسِلِ (یعنی اس قوم سے تعجب کیوں ہے؟ جو زنجیروں کی جکڑ کے ساتھ جنّت کی طرف لائی گئی ہے، اور قہر کا خوف دلا کر اس کی حفاظت کی جاتی ہے) تاکہ دوزخ کی راہ اختیار نہ کر لیں۔

دوسری جگہ اور ارشاد ہوتا ہے کہ اَنْتُمْ تَتَھَافَتُوْنَ عَلَی النَّارِ وَاَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِکُمْ (یعنی تم پروانوں کی طرح خود آگ پر گرتے ہو، لیکن مَیں تمھاری کمر پکڑ کر دوزخ سے بچاتا ہُوں)۔

معلوم ہوا کہ پیغمبروں کی ہدایات خداوند عالم کی طرف سے ایک سخت ہدایت کی زنجیر ہے، تاکہ آدمی ڈرنے

لگے - اور یہ ڈر اور معرفت عقل پر قلعی کر کے تمام آلودگیوں کو دُور کر دے ۔ اور یہ سمجھ میں آجائے کہ اِس دُنیا سے دین کی راہیں بہت اچھی اور بہتر ہیں اور اس بہتری کو سمجھ کر نیکی کا ارادہ کرے ، اور اس ارادے کے سبب سے انسان کے اعضا نیکیوں کی طرف رجُوع ہوں - چونکہ انسانی اعضا اس کے ارادے کے ماتحت ہوتے ہیں ، اور وہ ہی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں ، تاکہ دوزخ سے بچ سکے ۔

پیغمبرانِ اولوالعزم ہمارے اوپر ایک چرواہے کی طرح مسلط ہیں ، جو اپنے گلّے کی حفاظت اس طرح کرتے ہیں ، جیسے کوئی بکریوں کے گروہ کو بھیڑیوں سے بچانے کے لیے لکڑی سے بھی انتباہ کرتا ہے اور جہاں بھیڑیے کا خطرہ ہو ، اس طرف نہیں جانے دیتا - بس یہ ہے ہمارے انبیاء علیہم السّلام کی بعثت کا فائدہ -

قسّامِ ازل نے انسان کے لیے سعادت و شقاوت کو مقدّر کر دیا ہے اس کا جواب

اس کے بعد ایک اعتراض اور رہ جاتا ہے ، وہ یہ کہ جب آدمی کی شقاوت کا حکم ازل میں ہی ہو چکا ہے - اس کے بعد کسی نیکی اور بدی کا سوال انسان کی ذات سے پیدا ہی نہیں ہوتا ۔

اس کا جواب یہ ہے ، کہ اگر آدمی سے یہ نہ کہا جائے کہ تو نیکی کر ، تو وہ کسی وقت بھی بدی سے باز نہ آئے گا - مثلاً اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ بھُوکا ہی مرے گا ، تو نہ کھیت جوتے گا نہ بوئے گا اور نہ کھیت کاٹے گا - اور ہر وقت پڑے پڑے اس طرح جان دے دے گا - اسی طرح اگر آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ بہشت اس کے نام پر مقدر کر دی گئی ہے ، تو وہ نیکیاں کرے گا ہی نہیں - بلکہ مطمئن ہو جائے گا کہ میں جنّتی ہوں - لہٰذا تمام گناہ کر سکتا ہوں - لہٰذا اس کے لیے بھی اسباب بتا دیئے گئے کہ کسبِ حلال کرو ، اور روزی کماؤ - خواہ تجارت کرو یا کھیتی کرو - یہاں تک کہ خداوند عالم نے ہر شخص کے اندر اہلیت اور قابلیت ودیعت فرما دی ہے - جو کام اس کو کرنا ہے اس کے اسباب اس کے اندر منجانب اللہ موجود ہوتے ہیں -

اِسی کے ثبوت میں آنحضرتؐ کا ارشاد ملتا ہے کہ کام کرو - اس لیے کہ ہر شخص پر آسان کر دیا گیا ہے - ہر وہ کام جو وہ کرتا ہے -

یہ سب کام انسان کی اہلیت اور ارادتِ خود اختیاری پر مبنی ہیں اور بعض کام ایسے ہیں جو جبراً و قہراً کرائے جاتے ہیں - اُن کے ذریعہ عاقبت کی راہوں کو مدِّ نظر رکھو - مثلاً تحصیل علم میں اگر تمھارے اعضا تمھارے ذہن زیادہ مشغول ہوں تو اس کی علامت یہ ہے کہ سعادتِ ابدی تمھاری راہوں میں جگمگا رہی ہے ، لیکن اس میں انتہائی جدّ و جہد ضروری ہے - اور اگر کاہلی دماغ میں بس گئی ہے ، تو گویا کہ مقصد اس کا یہ ہو گا کہ انسان کے لیے جہالت و گمراہی مقدر میں لکھ دی گئی ہے ۔

لہٰذا اپنے دنیا کے کاموں سے ہی آخرت کا اندازہ لگا لینا چاہیے - اسی کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے -

مَا خَلۡقُکُمۡ وَلَا بَعۡثُکُمۡ اِلَّا کَنَفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ سَوَآءً مَّحۡیَاھُمۡ وَمَمَاتُھُمۡ ۔ ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد یہ تمام باتیں آدمی کے سامنے آجاتی ہیں، اور وہ توحید کے متعلق تفکر سے کام لینے لگے گا۔

اس میں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ شریعتِ اسلام، توحید اور عقل اس سلسلے میں انسان کے مددگار ہی ثابت ہوتے ہیں۔

(نوٹ) اس سے زیادہ اس مسئلے پر بحث کرنا اب مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا اب مسئلے کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

ایمان دوم (بنائے توکل)

دُوسرا ایمان جس پر توکل کی بُنیادیں استوار ہوتی ہیں

یہ بتا دیا گیا ہے کہ توکّل دو ایمانوں کی بُنیادوں کا ماحصل ہے۔ پہلے "توحید" پر ایمان کامل ہونا ضروری ہے جس کے متعلق ہم مفصّل اوپر لکھ چکے ہیں اب دوسرا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ اِنسان یہ یقین کرلے کہ اس کی آفرینش کا باعث صرف اس کی ذات ہے اور دنیا میں ہر چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ اور آپس کے تعلقات میں "رحم" اور محبّت بھی اسی نے ودیعت فرمائی ہے اس لیے کہ رب حکیم ہے، اور رحیم ہے۔ اس کی حکمتیں دنیا کی ہر چیز میں موجود ہیں۔ کوئی چیز بھی اس کی رحمت اور حکمت سے خالی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کی تخلیق اس کی صورت و شکل کی مناسبت سے اِنتہائی بُلند اور مکمل بنائی ہے۔ اب اگر دُنیا کے عقلا اور علماء آپس میں جمع ہو کر کسی ایک شکل کو اس سے اچھی شکل دینا چاہیں تو ناممکن ہے۔ (نوٹ) اس کے متعلق پوری تفصیل پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے)۔

جس میں کوئی نُقص سمجھ میں آئے، وہ در اصل نقص نہیں ہے، بلکہ اس چیز کی مناسبت کے لیے وہ ہی شکل موزوں تھی۔ اور وہ چونکہ سب سے بہترین حکمت والا ہے، اس لیے اس نے اسی صورت کو مناسب سمجھا۔ ہاں البتہ اتنی بات ضرور ہوتی کہ ہر چیز ایک دوسری کے مقابل میں مناسب ہے۔ لازم و ملزوم بھی ہیں، مثلاً باپ کی تخلیق بیٹے کے لیے اور بیٹے کی تخلیق باپ کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ مقابل دو چیزوں سے کم ہی نہیں ہوتا۔ اگر دوئی ختم ہوگئی، تو پھر یگانگت کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

لہٰذا ہمارا ایمان مکمل اس پر ہونا چاہیے کہ اس نے جس چیز کے لیے جو صورت، عادت اور نیکی بدی یا اور جیسے بھی بنادی یا مقدر کردی وہ ہی اس کے لیے بہتر اور مناسب تھی۔ اگر اس نے کسی کو فقیر بنایا تو اس میں ضرور بہتری تھی۔ اسی طرح مالدار کے لیے بھی یہ ہی غور کرنا چاہیے۔

اس مبحث پر بڑی طویل بحث ہو سکتی ہے اور نہ معلوم کتنے آدمی اس بحرِ بیکراں میں غوّاصی کرتے کرتے غرق ہو گئے پس اس کو اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ قضا و قدر ہیں اور اس کے ہاتھ میں ان کو ظاہر کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اِس سلسلے میں صرف اپنے ایمان کے متعلق اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے۔ آدمی اس کی ہر چیز ہر حکم اور تدبیر پر ایمان لے آئے کہ معاذ اللہ اس سے کوئی کمی واقع ہونے کا امکان ہی نہیں۔

توکّل کی حقیقت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ توکّل دل کی کیفیت کا نام ہے۔ جو خداوندِ عالم کے کمالات پر ایمان لانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اِنسان کا فرض صرف یہ ہے کہ اس کے کسی کام میں چون و چرا نہ کرے اور ہر حیثیت سے اس کی رحمتوں پر شاکر رہے۔ اگر غربت ہو تو شکستہ دل نہ ہو، اور امارت ہو تو دماغ میں فرعونیت نہ سما جائے۔ غرضکہ ہر حال میں اسی پر اعتماد کامل رکھنا ضروری ہے —— اس کو مثال کے ذریعہ سے سمجھ لینا ضروری ہے۔

مثلاً ایک شخص پر کوئی آدمی فریب دہی کا جھوٹا دعویٰ کرے اور مدّعا علیہ اپنے اوپر سے اس جرم کی صفائی کے لیے کسی وکیل کو انتخاب کرے، تو اس وکیل پر جب تک اعتماد کلّی نہ ہوگا۔ اس وقت تک اپنے معاملات کی باگ ڈور اس پر کیسے چھوڑ دے گا، اور اس وکیل پر اعتماد قائم رکھنے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

متوکّل کی شان
یقین محکم اور قلبِ مطمئن

پہلے یہ کہ وکیل اپنے پیشے میں مکمّل ہے، وہ دھوکہ اور فریب کی ہر چال سے واقفیت رکھنے والا ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح اس قانون پر عبور ہے اسی طرح وہ مباحثے میں بھی طاق ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگ قوّتِ کلام کی کمی کی وجہ سے اپنی بات کو کسی سے منوانے میں قاصر رہتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ میرا وکیل مجھ سے انتہائی خلوص سے پیش آئے گا، اور میرے مفاد کو اپنا مفاد سمجھے گا۔

ان تینوں صفات کو دیکھنے کے بعد مدعا علیہ وکیل کو مقرر کرے گا۔ اور وہ زبانِ حال سے یہ پکار اُٹھے گا۔ کہ "نعم المولیٰ ونعم الوکیل" اور یہ ہے اس وکیلِ حقیقی کے لیے، جو اس دنیا کا مختارِ کلّی ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد پھر وہ دنیا کے وکلا کی حقیقت کو کچھ نہ سمجھے گا۔ اور ہر چیز کو خدا پر بھروسہ کر کے عمل میں لائے گا۔

اس مرتبے پر پہنچ کر انسان متوکّل بن جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر یقین کرے کہ اس نے جو کچھ عنایت کیا ہے۔ وہ میرے لیے مناسب ترین ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی دل سے یقین کرتا ہے، لیکن بعض اوہام اس کو پریشان کرتے ہیں، مثلاً ایک مُردہ سامنے پڑا ہو، تو آدمی کو اس کے لیے اگرچہ یقین ہے کہ اس میں کوئی طاقت نہیں، لیکن تنہا اس کے قریب نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے صرف وہم، جو یقین کامل کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ یقین کے ساتھ ساتھ دوسری طاقت جس کو قلب مطمئنہ کہتے ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ نہ ہوں متوکّل کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔

جناب ابراہیمؑ کو یقین اور اعتماد دونوں طاقتیں حاصل تھیں، لیکن پھر بھی کہہ اُٹھے کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (یعنی اے پالنے والے! مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں میں کیسے جان ڈال دیتا ہے، ندا آئی! کیا تم ہمارے اوپر ایمان نہیں رکھتے؟ آپ نے عرض کی، ایمان کامل ہے، لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں، تاکہ میرا دل اور مطمئن ہو جائے)۔

دراصل دل کا مطمئن ہونا ابتداءً تخیلات کی تکمیل پر مبنی ہوتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ پختہ ہو کر یقین کی منزلوں پر پہنچتا ہے۔ اس کے بعد انسان کو ظاہری حالات کو سمجھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

مدارج توکّل

توکل کے تین مدارج ہیں:

پہلے یہ کہ آدمی اپنے مخالف کے مقابلے میں اسی مدعا علیہ کی خصوصیات رکھنے والا ہو، جو اوپر بیان کی گئیں کہ اس کے مقابلے میں اچھا اور لائق وکیل تلاش کرے، جس پر اعتمادِ کلی حاصل ہو جائے۔

دوسرا درجہ اس سے اُونچا ہے، وہ یہ کہ آدمی کی سرشت بالکل اس بچّہ کی طرح ہو، جو ماں کا دُودھ پیتا ہے۔ اس کے ارادے، اس کی تمیز اور قوتِ ادراک کے ماتحت نہ ہوں، بلکہ جس وقت بھوک لگے ماں کے سامنے رونے لگے اور دُودھ مانگ لے۔ بس اسی طرح وہ آدمی بھی جس چیز کی ضرورت جس وقت بھی محسوس کرے فوراً بغیر کسی جھجھک کے قسامِ حقیقی سے طلب کرے۔ اس کو سوچنے کی ضرورت نہ پڑے۔

تیسرا درجہ اس سے بھی بلند ہے۔ اس میں آدمی اُس بچّے کی طرح ماں کے سامنے بھی نہیں روتا، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری ماں، میری بھوک کے متعلق جانتی ہے کہ کس وقت دُودھ کی ضرورت ہوگی اور وہ خود دُودھ پلائے گی۔ وہ آدمی اس منزل پر پہنچ کر اپنے کو قطعی مُردہ خیال کر لیتا ہے جو غسل دینے والے کے قبضے میں ہوتا ہے کہ جدھر کو چاہئے لٹا دے اور جیسا چاہے کرے۔ یہ متوکّل کی آخری شان ہے کہ آدمی اپنے کو قطعی خدا کے اِرادوں پر چھوڑ دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پہلے درجے میں آدمی کو اختیارات ہوتے ہیں کہ اپنا بُرا بھلا سوچتا ہے۔
دوسرے میں اختیار تو نہیں ہوتے، لیکن عاجزی، اِستدعا اور وکیل پر بھروسہ رہ جاتا ہے۔
تیسرے مراتب میں قدم رکھ کر یہ سب کچھ اُٹھ جاتا ہے اور صرف مُردے کی طرح
اسی کے حکم کا منتظر رہتا ہے —— اور

کارہائے دُنیا کو بھی (مثلاً تجارت، زراعت یا پیشے) اسی پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔
اِنسان اس وقت لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہنے لگتا ہے، اور اس کی حقیقت کو جان جاتا ہے کہ حول

کے معنی حرکت کے ہیں اور قوت کے معنی قدرت کے ہیں —— وہ اپنے تمام کام خدا پر چھوڑ کر کہتا ہے کہ دنیا کی کوئی حرکت اور طاقت سوائے خدا کے نہیں ہے۔

مختصر یہ ہے کہ جب آدمی اپنے تمام ظاہری کام خداوند عالم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہر چیز کو منجانب اللہ سمجھنے لگتا ہے وہ "متوکل" ہوتا ہے۔

بلند ترین توکل کی مثال حضرت ابو یزید سے ابو موسیٰ دویلی نے دریافت کیا کہ توکل کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ دوزخ والوں کو معذب اور اہل بہشت کو اہل سلم سمجھ کر ان میں فرق سوچنا بھی متوکل کی شان نہیں ہے۔ بلکہ متوکل اس سے کہیں بلند ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ اشعری نے متوکل کی شان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ متوکل کو اپنے جذبات سے کام نہ لینا چاہیے۔ اس لیے کہ غار میں حضرت ابوبکرؓ جب جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ تو آپ نے سانپ کے بل پر پیر کی ایڑی رکھ دی، حالانکہ آپ متوکل تھے، اور اس سانپ سے کوئی خوف نہ تھا جو سانپ میں حرکت پیدا کرتا ہے۔

معلوم ہوا بلند ترین متوکل کی شان یہ ہے کہ ہر کام میں "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللہِ" پر ایمان کامل رکھے۔

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کا معیار توکل سب سے بلند ہے اور یہ ہی ایمانِ کامل کی نشانی ہے کہ آدمی خداوند عالم کی نعمتوں اور تکالیف کو بھی فرق سے نہ دیکھے کہ یہ کیوں اور کیسے ہیں؟

اعمال توکل

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دین کی بنیاد تین اصول پر مرتب ہوتی ہیں۔ علم[۱]۔ حال[۲]۔ عمل[۳]۔ علم اور حالات میں توکل کے درجات کو بتا دیا گیا۔ اب عمل کے متعلق بتایا جاتا ہے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اعمال صرف خدا کی طرف سے ہیں، جیسا کہ پہلے لکھا گیا، پھر توکل میں اعمال کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟

اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسبِ رزق بھی چھوڑ دے۔ اور اگر سامنے شیر آجائے، تو اس سے بھی حفاظت کی تدبیر نہ کرے۔ یا بیمار ہو جائے تو دوا نہ کرے۔ یہ خیالات شریعت سے مخالفت کرتے ہیں —— توکل شریعت اسلام کے ماتحت ہے اور یہ تمام احکامات شریعت نے جائز رکھے ہیں۔ ان کے کرنے کا حکم دیا ہے پھر ان پر عمل نہ کرنا شریعت کی مخالفت ہوگی۔ اعمال دنیا کے ساتھ بھی توکل ہوتا ہے۔ اس کی چار صورتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً آدمی کے پاس کوئی مال نہ ہوگا، تو اس کو حاصل کرے گا۔ یہ پہلی صورت ہے۔ یا اگر مال ہے تو اس کی حفاظت کی تدابیر۔ یہ دوسری صورت ہے اور اس مال کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے تدابیر

اختیار کرنا تیسری صورت ہے اور چوتھی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مال کی حفاظت اس اندیشے سے کی جائے کہ آئندہ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

پہلی صورت حال حاصل کرنے کے متعلق، یا مثلاً کسی قسم کا فائدہ اٹھانے سے متعلق ہے وہ تین مدارج پر ہوتا ہے۔

خرق عادات پہلے یہ کہ آدمی کو فطری طور پر کوئی بات معلوم ہے کہ بغیر ہاتھ ہلائے یہ کام ہونا ناممکن ہے اور اس کام میں توکّل پر بیٹھے رہنا خلافِ عقل ہے۔ مثلاً کوئی آدمی روٹی کا نوالہ خود نہ توڑے اور توکّل پر بیٹھا رہے، کہ یہ روٹی خود میرے مُنہ میں چلی جائے گی۔ یا عورت سے مباشرت نہ کرے اور سوچے کہ اولاد یوں ہی پیدا ہو جائے گی۔ یہ تمام باتیں عقلاً خلاف ہیں۔ اور وہ اسباب جو کسی مقصد کے لیے بُنیاد قرار پاتے ہیں، اُن میں توکّل کرنا کردار سے متعلق نہیں ہوتا، بلکہ (پہلی دو منزلیں علم اور حالات کے ماتحت، جو بتائی گئی ہیں) ان کے ماتحت ہوتا ہے۔

علم تو یہ ہے ــــ کہ آدمی موجوداتِ دُنیا کے متعلق یہ یقین کامل کرلے کہ سب کچھ اس کا تخلیق کیا ہوا ہے۔ حال کا مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم کے فضل پر اپنے دل سے اعتماد قائم کرلے کہ یہ میرے تمام اعمال خداوندِ عالم کے حکم سے ہیں۔ میں روٹی ہاتھ کے ذریعے نہیں کھاتا، بلکہ خداوند عالم کا فضل جب شاملِ حال ہوتا ہے تب میرا ہاتھ روٹی توڑنے کے لیے حرکت کرتا ہے، ورنہ میں قطعی لاچار ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اسبابِ دُنیا پر نظر رکھے، اور ظاہری طور پر مقاصد اس سبب ہی کی بنا پر ہی پُورے ہوتے ہوں، لیکن توکّل کی اعلیٰ منزل میں زادِ راہ ظاہری کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کی ذات پر یقین کامل ہوتا ہے۔ کہ جو زادِ راہ کے مہیا کرنے پر قدرت کامل رکھتا ہے، لیکن اگر صحرائے بیکراں کا سفر درپیش ہو، تو البتہ زادِ راہ رکھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاں اگر متوکّل اس درجے پر پہنچ چکا ہے، جہاں تک کہ اس کو کافی دنوں تک کھانے کی حاجت نہ ہوتی ہو، یا صرف گھاس پر ہی بسر کر کے زندگی گذار سکتا ہے، اور امکانات اس کے ہیں کہ اس کو صحرائے بیکراں میں ہی رزق بہم پہنچ جائے۔

حضرت ابراہیم خواص میں یہ دونوں صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں کہ آپ بغیر کسی انتظام کے صرف چاقو اور ڈول رسّی ساتھ لے کر جنگل کے سفر کو جایا کرتے تھے۔ چونکہ یہ اسباب ظاہری ہیں اور انسان سے ہی متعلق ہیں۔

توکّل حرام ایسا توکّل قطعی ناجائز ہے کہ آدمی ایک ایسے غار میں گوشہ نشینی اختیار کرے، جہاں کھانے پینے کو کچھ نہ ہو، اور یہ سوچے کہ یہاں کھانے کو خود بخود مل جائے گا اور دنیوی اسبابِ ظاہری سے

ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حکایت : کسی زمانے میں ایک شخص نے تنہائی میں توکّل اختیار کیا اور سوچتا رہا، کہ خداوندِ عالم میری روزی ہمیں پہنچائے گا۔ کچھ ہی دن بعد اس کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ پیغمبرِ وقت پر وحی نازل ہوئی کہ اس سے کہہ دو کہ وہ پھر ہماری مخلوق سے مل جل کر رہے اور ہم نے ایک دوسرے کی روزی کو آپس میں تعلقات سے وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں سے ملنے جلنے لگا۔ لیکن اس کو اپنے خیال میں یہ خدشہ ہوا کہ توکّل میں کوئی کمی ہے۔ پھر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص نے ہماری حکمت کو باطل کرنا چاہا تھا اور جو احکاماتِ ظاہری دنیا کے لیے ہم نے بنا دیے ہیں، وہ اُن کے خلاف عمل کرانا چاہتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اسبابِ یقینی پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ لہٰذا آدمی توکّل کر کے خداوندِ عالم پر نظر رکھے لیکن دُنیا سے الگ تھلگ ہو کر نہ بیٹھ رہے۔ ایسے آدمیوں پر بزرگانِ دین کا یہ قول ثابت ہوگا کہ جو دینِ آخرت میں روٹی سے بھاگتا ہے، روٹی اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ لیکن اس کو یہ دُعا نہ کرنا چاہیے کہ ربّ العالمین مجھ کو روٹی ہی نہ دے۔ اس لیے کہ خداوندِ عالم نے اس کو دُنیا میں زندہ رہنے کے لیے پیدا کیا ہے اور زندگی بغیر روٹی اور پیٹ بھرنے کے لیے ناممکن ہوتی ہے۔ لہٰذا روٹی کھانا قطعی لابدی ہے۔ معلوم ہوا کہ توکّل کے انتہائی منازل کے لیے بھی اسبابِ ظاہری ضروری ہیں۔ بس اتنی بات، کہ اُن اسبابِ ظاہری کے ہونے کے باوجود بھی خداوندِ عالم پر ہر وقت نظر رکھنا ضروری ہے۔

تیسری صورت ہے کہ آدمی کو اکثر اس دُنیا میں اُن چیزوں کی حاجت ہوتی ہے۔ جو زندگی کے لیے ضروری نہیں ہوتے، مثلاً کسی بیماری کے لیے کوئی منتر پڑھنا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ متوکّلین منتر وغیرہ کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ اس فرمان کے ماتحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ توکّل میں کسبِ معاش وغیرہ کے لیے منع نہیں کیا گیا کہ متوکّل صرف جنگلوں میں رہائش اختیار کرنے میں متوکّل بن سکتا ہے۔

توکّل کے درجات دنیوی اعتبار سے یہاں توکّل سے تین شاخیں پیدا ہوتی ہیں :

پہلی منزل یہ ہے کہ جو آدمی بغیر زادِ راہ کے جنگلوں میں چلے جاتے ہیں اور اُن کو خدا کا بھروسہ ہوتا ہے اور یہ درجہ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ یہ درجہ بلند ترین ہے۔ اور اس میں ملا جلا مرتبہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں موت کے خیال سے کوئی خوف پیدا نہ ہوتا ہو۔ بلکہ اس خیال سے خوش ہو اور اپنی بہتری سمجھتا ہو۔ اس لیے کہ آدمی جب صحرائے بیکراں کی طرف سفر کرے گا۔ تو اس کا زادِ راہ بھی چوری جا سکتا ہے اور موت سے دوچار ہونے کا بھی امکان ہے۔ لہٰذا اس ظاہری ساز و سامان سے پرہیز کرنا ہی ضروری ہے۔

دوسری منزل یہ ہے کہ آدمی شہر کی مسجد میں خدا پر بھروسہ کیے بیٹھا رہتا ہے۔ نہ کسب معاش میں تگ و دو کرتا ہے اور نہ کسی سے سوال کرتا ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ آدمی کسب معاش کرے، لیکن شریعت اسلام کے حدود میں رہ کر، اور اگر کمائی میں دُنیا کی فریب کاریوں کو کام میں لائے گا تو توکل ختم ہو جاتا ہے، بلکہ وہ جادو اور منتر کی منزل میں آجاتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، جب تختِ خلافت پر بیٹھے تو روزانہ کپڑوں کی تجارت کیا کرتے۔ لوگوں نے کہا کہ امیر المومنین! آپ کو اپنے ہی عہد میں تجارت کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا کہ میں اپنے عیال کے لیے کسب کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ چنانچہ آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ اور آپ اس کے بعد سکون و اطمینان کے ساتھ خلافت کرتے رہے۔

بغیر زھد توکل ناممکن ہے

ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ توکل "زہد" کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا زہد توکل کے لیے ضروری ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پیر حضرت جعفر حدّاد نے فرمایا کہ میں بیس سال ... توکل سے کام لیا، اور قطعاً کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ میرا وطیرہ یہ رہا کہ میں کسب معاش کرتا او... سب کا سب صرف کر دیتا اسی طرح حضرت جنیدؒ بھی اپنے توکل کا اظہار اپنے پیر تک ... کرتے تھے۔ اور فرماتے، کہ مجھے اظہارِ توکل سے شرم آتی ہے۔

سینکڑوں متوکلین کے پیرو کس... کرتے ہیں، لیکن اُن مُریدوں اور پیروں کا توکل ضعیف ہوتا ہے۔ اگر آدمی کسی کو اپنانے ... توکل میں بیٹھتا ہے، تو روا ہوگا، لیکن اگر کسی معروف و مشہور جگہ پر بیٹھا ہوگا تو بازاریوں کی طرح ... تو شہرت کا طالب ہے۔

... آدمی "توکل" ہر جگہ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن صرف ان شرائط پر نظر رکھے کہ وہ صرف خدا کے ... سی چیز کو مدِ نظر نہ بنائے۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل میری رہبری کر سکتے تھے، لیکن صرف اپنے دل میں یہ خدشہ محسوس کیا کہ کہیں ان پر بھروسہ کر کے "توکل" علی اللہ کو ہاتھ سے نہ کھو بیٹھوں۔

حضرت امام حنبلؒ نے ایک مزدور کو طے شدہ مزدوری سے کچھ زیادہ دینا چاہا۔ اس نے انکار کر دیا، اور چلا گیا۔ آپ نے اپنے ایک شاگرد کو اس کے پیچھے بھیجا کہ اب جا کر راستے میں یہ اُجرت زائد دے دو۔ شاگرد نے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت اگر لے لیتا تو وہ حرص و طمع کے ماتحت ہوتا اور توکل جاتا رہتا۔ لیکن اب طمع جاتی رہی تو لے لینا چاہیے۔

توکّل کی نشانیاں یہ ہوتی ہیں، کہ لوگ کماتے ہیں اور اس پیسے پر بھروسا نہیں کرتے۔ اگر مال چوری ہوجاتا ہے، تو اس کی پروا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو ہر طرح خداوند عالم پر اعتمادِ کلّی ہوتا ہے، کہ اگر دے گا، تو درست ہے اور نہ دے گا تو اس کی مصلحت ہے۔ ہر طرح اپنی بہتری کے متعلق سوچتے ہیں۔

ہر حال میں مصلحتِ خداوندی پر توکّل کر کے شکر ادا کرنا

توکّل کے درجات میں خداوند عالم کی ذات پر اعتمادِ کلّی حاصل کر لینا بھی بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ کہ وہ مال ضائع ہونے کے باوجود یہ سوچ لے کہ یہ نعمت خداوندی تھی۔ اور دنیا میں لاکھوں آدمیوں کے پاس نہیں ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اس مال کی وجہ سے کسی گناہ میں آلودہ ہو جاتا۔ لہٰذا اس مال کا چلا جانا ہی غنیمت ہوا، اور یہ سوچ کر خداوند عالم کا شکر بجا لائے۔ یہ درجات محال نہیں ہیں، لیکن مشکل ضرور ہیں۔

سرکارِ رسالتؐ کا ارشاد ہے کہ آدمی رات کو سوتے وقت نہ معلوم کیا کیا سوچ کر سوتا ہے، کہ کل میں یہ یہ تدابیر کر کے فلاں ترقی کروں گا، اور درپردہ وہ تمام خیالات اس کو برائیوں کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ اور خداوند عالم اس کو بچانے کے لیے خود انتظام فرما دیتا ہے۔ اور جس وقت اس شخص کے وہ سب کام حسبِ منشا پورے نہیں ہوتے تو وہ اپنے اعزا و اقربا اور دوستوں کے متعلق توہّمات میں مبتلا ہوتا ہے۔ کہ میرے تمام کام فلاں فلاں نے خراب کر دیے۔ اور وہ یہ نہیں سوچتا کہ درحقیقت یہ رحمتِ خدا ہوتی ہے۔

اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس کا ذرّہ برابر غم نہیں، کہ میں صبح کو غریب ہو کر اٹھوں یا مالداری کی حالت میں۔ اس لیے کہ میں اس پر شاکر ہوں۔

دراصل فقر اور درویشی سے ڈرنا شیطان کی تابعی کے مترادف ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے۔ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ۔ اسی طرح خداوند عالم پر نظر رکھنا کمالِ معرفت ہے۔ انسان کو اپنی طرف سے ایسے اسباب پر نظر نہیں کرنا چاہیے کہ میں فلاں فلاں ذرائع سے روزی کما سکتا ہوں، بلکہ صرف اپنے پروردگار کی طرف نظر رکھے کیا خبر؟ کہ وہ کس طرح اور کس ذریعے سے عنایت کر دے۔

ایک متوکّل "عابد" کی صورت بنائے ہوئے مسجد میں رہا کرتا۔ امامِ مسجد نے کئی بار اس سے کہا کہ تجھ کو کسبِ معاش کرنا چاہیے۔ چونکہ تیرے پاس کھانے کا کوئی سہارا نہیں۔ اس نے کہا کہ میرے لیے دو روٹی ایک یہودی دے جاتا ہے۔ امام نے کہا کہ پھر تیرے لیے گوشہ نشینی میں کوئی قباحت نہیں۔ عابد کہنے لگا کہ افسوس ہے اے امامِ مسجد تیرے حال پر، اور تجھ کو امامت نہ کرنا چاہیے کہ تجھے ایک یہودی کی کفالت خدا کی کفالت سے زیادہ پسند آئی۔

ایک امام نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ تیرا ذریعہ معاش کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ابھی بتاتا ہوں، ذرا صبر کر، تاکہ تیرے پیچھے پڑھی ہوئی نماز دوبارہ پڑھ لوں۔ اس لیے کہ تو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اور تیرے پیچھے میری

نماز رائیگاں ہوگئی۔

جو لوگ ان راہوں سے گذرے ہیں، اُن کو تجربات ہوئے ہیں کہ خداوندعالم کس کس طرح رزق پہنچاتا ہے۔ خداوندعالم حکم دے رہا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (اس حکم پر اُن راہروانِ راہِ آنحضرت کا ایمان مکمل تھا)

حضرت حذیفہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ حضرت ابراہیم ادہم کی خدمت میں کیوں رہتے ہیں — جواب دیا کہ ایک بار میں اور وہ دونوں مکّہ معظمہ جارہے تھے۔ کوفے میں جب پہنچے، تو مجھ پر بھوک کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہوگئے۔ تو انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں نے کہا! جی حضرت! انھوں نے ایک پُرزہ کاغذ پر "بسم اللہ" لکھی اور اس کے بعد تحریر یہ فرمایا کہ اے وہ ذات کہ ہر حال میں تو ہی میرا سہارا ہے۔ ہر طرف تو ہی ہے۔ میں تیرا ہی ثناخواں ہوں۔ اور تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ تیری عبادت کرتا ہوں، لیکن میری بھوک اور پیاس کا تو ضامن ہے اور میں تیری عبادت اور شکرگزاری کا ضامن ہوں۔ لہٰذا میری ضمانت بھوک میں کر! یہ رقعہ لکھ کر مجھ کو دیا اور فرمایا کہ باہر چلا جا اور جو شخص ادھر سے آتا ہوا پہلی بار دکھائی دے۔ اس کو دے دینا میں باہر آیا، ایک شخص اُونٹ پہ آرہا تھا۔ میں نے وہ رقعہ اسی کو دے دیا۔ اس سوار نے پڑھ کر کہا کہ اس پرچے کا مالک، کہاں ہے؟ میں نے اس کو پتا بتا دیا۔ اس نے چھ سو اشرفیوں کی تھیلی مجھ کو دے دی۔ میں نے تھیلی لے کر لوگوں سے اس شخص کا نام ونشان دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نصرانی ہے۔ میں وہ تھیلی لے کر حضرت ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا ذرا ٹھہر! ابھی اس کا مالک بھی آتا ہے۔ اِتنے میں وہ نصرانی حاضر ہوا اور اسلام قبول کرلیا۔

حضرت ابو یعقوب بصری رحمۃ اللہ علیہ دس دن تک حرم کعبۃ اللہ میں بھوکے رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب بھوک کی تاب نہ رہی تو باہر آیا اور دیکھا، ایک شلغم راستے میں پڑا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر کھانا چاہا۔ لیکن میرے صبر نے مجھ سے کہا کہ دس دن کی بھوک کے بعد اس شلغم پر اکتفا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے شلغم وہیں ڈال دیا اور حرم شریف میں واپس آیا۔ کچھ ہی دیر بعد دیکھا کہ ایک شخص روغنی روٹیاں اور بادام وغیرہ لایا اور کہنے لگا کہ میں سمندری سفر میں طوفان میں پھنس گیا تھا اور منّت مانی تھی کہ اگر نجات پاؤں گا تو سب سے پہلے جو شخص درویش مجھے ملے گا، اس کو یہ چیزیں پیش کروں گا۔ میں نے ہر چیز میں سے ایک ایک مشت لے کر کہا کہ اب تجھ کو میں اپنی طرف سے بخشتا ہوں اور خداوندعالم کا شکر ادا کیا۔ اور سوچا کہ خداوندعالم نے صرف میری وجہ سے ہواؤں کو تیز چلنے کا حکم دیا، تاکہ پانی میں تلاطم برپا ہوجائے، اور اس طرح میرے لیے یہ رزق عنایت فرمایا۔ لیکن میں ابھی ابھی دوسری جگہ سے ڈھونڈ رہا تھا۔

اہل وعیال رکھنے والے آدمی کے توکّل کا طریقہ | توکّلِ عیالدار: عیالدار کے لیے تیسرے درجے کا توکّل ہی مناسب ہے۔ جو دُنیا داری میں مشغول ہوئے، توکّل کر سکتا ہے۔

حضرت ابُوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی توکّل کے لیے ارشاد فرمایا ہے کہ عیال دار آدمی وہ دونوں قسم کے توکّل نہیں کر سکتا کہ دُنیا چھوڑ کر جنگلوں میں زندگی گزارے اور گھاس کھا کر دن گزارے۔ یا اپنی موت ہی کو مقدر سمجھنے لگے۔

اہل وعیال رکھنے والے آدمی کے لیے کمانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اپنے آپ کو تو جبراً بھی بھُوکا رکھ کر توکّل کرنا جائز ہے، لیکن عیال کو بھوکا چھوڑ کر توکّل کرنا دُرست نہیں۔ لیکن اگر آدمی تقویٰ اور پرہیز گاری میں خلوص برتتا ہے، اور خداوند عالم کے اوپر یقین کامل ہے کہ اس نے سب کو روزی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تو کسب کو ترک کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

جیسے ماں کے پیٹ میں بچے کو خود ہی غذا ملتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ پیدا ہوتا ہے اور پیدائش کے بعد خداوند عالم کے حکم سے ہی ماں کی چھاتیوں میں دُودھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح آگے بڑھ کر اس کے دانت نکل آتے ہیں۔ اور اگر ماں باپ مر جاتے ہیں تو خداوند عالم ہی دوسرے لوگوں کو اس پر مہربان کر دیتا ہے کہ وہ اس کو پرورش کرتے ہیں پالتے ہیں اور ماں سے زیادہ اس پر مہربان رہتے ہیں۔ ماں باپ کے سامنے تو صرف دو ہی مشفق اس کی سرپرستی کرتے تھے، لیکن اب بے شمار مشفقین اس کی نگہداشت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہوشمند ہوا تو خود کمانے کی طاقت اس میں عود کر آتی ہے۔ اور اب وہ سب مشفق لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اور وہ خود بھی کماتا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کا فضل شاملِ حال ہوتا ہے۔ تو وہ تقویٰ اور پرہیز گاری کی طرف ملتفت ہو کر تمام دُنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ اس کو اللہ والا تصوّر کرنے لگتے ہیں، اور تمام لوگ اس کو نیک سمجھ کر اچھی سے اچھی چیزیں پیش کرتے ہیں۔ اب پھر وہ تمام لوگ مہربان ہو جاتے ہیں۔ بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ اس کی دیکھ بھال میں کوشاں رہتے ہیں۔ اور اگر وہ لہو ولعب اور دُنیا داری میں مشغول ہو کر کمانا شروع کر دیتا ہے، تو دنیا والے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا ایسے آدمی کو توکّل کرنا اور کسبِ معاش کو چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ اس لیے کہ اس کو اپنے نفس سے دوستی کرنا چاہیے۔

اور اگر خداوند عالم اس پر مہربان ہوتا ہے، اور وہ اپنے کو اپنے جسم سے بھی یتیم سمجھتا ہے، تو پھر لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں۔ اس لیے آج تک کسی نے نہ سُنا ہوگا کہ کوئی مُتقی بھی بھوکا پیاسا مر گیا ہو۔

پس جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، کہ وہ منتظم حقیقی ہے۔ ایسے آدمی اس ارشاد ربّ العزّت کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ اور وہ یقین محکم رکھتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی شخص بھی تباہ نہیں ہوتا اور اگر کوئی شخص ظاہری غربت میں مبتلا ہوتا ہے، تو وہ بھی مصلحت ایزدی

کے ماتحت — وہ کسبِ معاش کو ترک کر دینے کی وجہ سے برباد نہیں ہوتا۔

موٹی سی بات ہے کہ سینکڑوں ایسے لوگ بھی ملیں گے جو لاتعداد مال دار ہونے کے باوجود بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کو ترک کسبِ معاش کی بنا پر فقیر نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ ہر کام میں مصالحِ ایزدی ہوتی ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ان تمام مسائل کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمام اہلِ بصرہ میرے عیال ہو جائیں اور گیہوں کے یہ سب دانے دینار بن جائیں۔

کچھ لوگوں نے حضرت جنیدؒ سے عرض کیا کہ ہم اپنے لیے روزی تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا، کہ اگر تم اس پر یقین رکھتے ہو کہ وہ تم کو بھول گیا ہے تو ضرور کوشش کر کے اپنی یاد اس کو دلا دو۔ اُن لوگوں نے عرض کیا کہ اچھا توکّل کریں اور دیکھیں کہ پردۂ غیب سے کیا امداد ہوتی ہے۔ تو فرمایا کہ یہ تمھاری آزمائش ہوگی، اور شکوک کی اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اُن لوگوں نے عرض کی پھر کیا صورت کی جائے۔ پھر فرمایا کہ خداوند عالم کی ضمانت میں تدابیر سے دستبرداری ہونا ہی کافی ہے۔ جب روزی کی ضرورت ہو اس کی طرف رجوع کرو۔

غلّہ اندوزی

غلّہ جمع کرنا توکّل کے خلاف ہے

بعض لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں کہ سال بھر کے کھانے کا اناج جمع کر لیتے ہیں۔ وہ صرف ظاہری امکانات کے تحت اپنی فراغت کی کوشش کرتے ہیں۔ اور خداوند عالم کی طرف سے جو وعدہ کیا گیا ہے، اس کو بھول جاتے ہیں۔ ایسے لوگ توکّل کے درجے سے گرے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے ہر وقت کا رزق الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ اور وہ اپنے وقت پر ضرور ملے گا۔

جس شخص نے حسبِ ضرورت غلّے پر اکتفا کی، وہ ہی قانع اور شاکر ہوتا ہے۔ اور وہ ہی متوکّل کہلایا جا سکتا ہے۔

اقوالِ بزرگاں برائے غلّہ اندوزی

حضرت ابراہیم خواص کے نزدیک چالیس روز تک کا غلّہ جمع کرنا توکّل کی حدود میں آتا ہے۔
حضرت سہل تستری کا قول ہے کہ غلّہ اندوزی توکّل کو باطل کر دیتی ہے۔

حضرت ابوطالب مکّی کے خیال میں چالیس دن سے زیادہ غلّہ رکھنا بھی توکّل سے نہیں گراتا، لیکن اس غلّے پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت بشر حافی کا ایک مرید جن کا نام حسین منازنی ہے، اُن سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کہیں سے آئے حضرت نے مجھے ایک مٹھی بھر کر چاندی دی، اور حکم دیا کہ بہترین سے بہترین کھانا خرید کر لاؤ۔ چنانچہ میں لے آیا۔ وہ کھانا اُن دونوں نے مل کر کھایا۔ اوّل تو مجھے یہ تعجب تھا کہ میں نے حضرت بشر حافی رح کو

آج سے پہلے کبھی کسی کے ساتھ کھاتے ہی نہ دیکھا تھا۔ میں متعجب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ اُن بزرگ نے کھانے کے بعد جو کچھ بچا وہ سمیٹ لیا اور روانہ ہو گئے۔ میں برابر اُن کے اس عمل کو دیکھ رہا تھا۔ حضرت بشر حافی نے میرے تعجب کو دیکھ کر فرمایا کہ تم حیران نہ ہو، کہ حضرت فتح موصلی رحمۃ اللہ علیہ بڑے برگزیدہ متوکلین میں سے ہیں۔ ان کا یہ عمل میرے لیے ایک سبق تھا کہ جب توکّل کے مدارج پایہ تکمیل کو پہنچ جائے پھر پس خورد کھانا یا بچا ہوا غلہ جمع کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس لیے کہ ایسا آدمی صرف خدا پر نظر رکھتا ہے۔ اور غلے پر اس کی نگاہ ہی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو بھی خزانہ الٰہیہ ہی سے سمجھتا ہے۔ لہٰذا مال پر بھروسہ نہ رکھنے والے لوگوں کا غلہ رکھ لینا بھی توکل سے نہیں گراتا۔

اب تک متوکلین کی شرائط صرف ان لوگوں کے لیے بیان کی گئیں، جو اہل وعیال رکھنے والے نہیں ہیں۔ عیالدار آدمی ایک سال کا ذخیرہ رکھنے میں درجہ توکل سے نہیں گرتا، لیکن اس سے زیادہ میں باطل ہو جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل وعیال کے لیے ایک سال کا غلہ جمع کر لیا کرتے۔ اور اپنی ذات کے لیے شام کی بھی فکر نہ کرتے، اور اگر ہوتا بھی، تو آپ کے توکل میں کمی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ آپ کے نزدیک تمام چیزوں کا، آپ کے خود قبضے میں ہونا اور دوسروں کی ملکیت میں ہونا بالکل یکساں حیثیت رکھتا ہے —— لیکن دوسروں کو اُن کے ضعفِ اعتقاد کے باعث ذخیرہ اندوزی کو منع ہی فرمایا۔

(روایت) روایت ہے کہ اصحاب صُفّہ میں کسی سے کسی صحابی کا انتقال ہوا۔ اُن کے پاس دو درہم برآمد ہوئے، تو سرکار رسالتؐ نے فرمایا کہ اس کے دو ہی داغ ہوں گے۔ یا اس نے صرف مکاری کی وجہ سے چھپائے ہوں اور یا اُس نے مکاری نہ کی ہو، بلکہ اِس دُنیا میں ان دونوں درہم کی وقعت گھٹانا ہی مقصود ہو۔ جس طرح چہرے کے نشان ہوتے ہیں۔ اس طرح آپ نے ایک درویش کے متعلق ارشاد فرمایا تھا، کہ اس کا چہرہ قیامت کے دن چودھویں رات کے چاند کی مثل ہوگا۔ اور اگر اس میں ایک کمی نہ ہوتی۔ کہ یہ ایک موسم کے کپڑے دوسرے موسم کے لیے رکھ لیا کرتا، تو آفتاب کی طرح روشن ہوتا۔

یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو صبر اور یقین کم ہے، یعنی کپڑوں کا آئندہ کے لیے محفوظ رکھنا یقین کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔

موٹا دستر خوان۔ پیالہ اور اسی قسم کی دوسری اشیائے ضروریہ کا رکھ لینا بُرا نہیں۔ اِس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ غلہ تو ہر سال پیدا ہوتا ہے، لیکن ہر چیزیں ہر سال اور ہر وقت نہیں مل سکتیں۔ لہٰذا سنت کے موافق ہی عمل کرنا دُرست ہے، لیکن کپڑوں کو دوسرے موسم کے لیے محفوظ، رکھنا یقیناً خدا پر بھروسا رکھنے

کے منافی ہوگا۔

اسبابِ غلّہ اندوزی

غلّہ جمع کرنا اگر آدمی میں توکّل کا اتنا مادّہ نہیں ہے کہ کھانے کو گھر میں نہ ہو، تو وہ گھبراتا ہو اور اعتماد نہ کرتا ہو، تو ایسی صورت میں غلّہ جمع کر لینا ہی بہتر ہوگا۔ اسی طرح اگر زمین کے بغیر وہ گھبراتا ہے، تو زمین بھی خرید سکتا ہے۔ اس لیے کہ بعض آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ غربت و تنگ دستی میں یادِ خدا بجالانے میں بڑی تن دہی سے کام لیتے ہیں، اور ان کو کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اور بعض آدمی کو تنگدستی ہی عبادتِ خدا میں مانع آتی ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو غلّہ جمع کر لینا ہی بہتر ہے۔ تاکہ وہ عبادت میں کم از کم مشغول رہ سکیں۔ لیکن اس قسم کے آدمی توکّل سے گرے ہوئے ہوتے ہیں، اور دین داری کے درجات پر فائز نہیں ہیں۔

تیسرا مقام آفات اور تکالیف کو دفع کرنے کے طریقوں کو پہچاننا۔

ہر وہ سبب اور وجہ جو بالکل کسی امر پر پوری اُتر آئے، یا اکثریت کے ساتھ عادی ہو جائے، تو اس سے پرہیز کرنے میں توکّل باطل نہیں ہوتا۔

اگر کوئی متوکّل اپنے گھر کو چوروں کے خوف سے تالا لگا کر چلا جائے یا دُشمن کے خوف سے تلوار باندھ لے، یا سردی کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے لبادہ پہن لے، یا اپنے باطن کو تازہ کرنے کے لیے خُوب سیر ہو کر کھالے، تو توکّل باطل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ خطرات صرف وہم کی حدود تک ہی ہوں تو توکّل برقرار نہیں رہ سکتا۔

ایک اعرابی سرکارِ رسالتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اونٹ کہاں چھوڑا؟ عرض کیا، کہ توکّل علی اللہ چھوڑ آیا ہوں۔ حکم ہوا، کہ اوّل اس کو کسی جگہ باندھ دو، اس کے بعد توکّل کرو۔

اگر کوئی آدمی تکلیف پہنچائے اور اس سے کوئی بدلہ لے، تو البتّہ توکّل سے گر جاتا ہے۔ خداوندِ عالم ارشاد فرمارہا ہے وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ لیکن اگر درندوں یا سانپ وغیرہ سے کوئی ایذا پہنچے تو صبر نہ کرنا چاہیے! بلکہ اُن کو دفع کرنا اچھا ہے۔

دُشمن سے محفُوظ رہنے کے لیے اگر آدمی ہتھیار باندھے، پھر خدا پر ہی بھروسا رکھنا توکّل کی شان ہے۔ اس طرح اگر چور تالا توڑ کر مال نکال لے جائیں، تو رضا برضائے الٰہی رہنا چاہیے، بلکہ تالا لگاتے وقت ہی یہ نیت کر لے کہ اگر یہ مال کسی دوسرے کے مقدّر میں ہے تو میں خدا پر توکّل کرتا ہوں اور اس کے حکم پر راضی ہُوں اور جب گھر میں واپس آئے اور مال کوئی لے گیا ہو، تو یہ سمجھ لے کہ وہ مال میرے پاس عارضی طور سے حفاظت کے لیے رکھ دیا گیا تھا۔ اب جس کا تھا، وہ لے گیا۔ اور اگر اس مال کے چوری جانے پر افسوس کرے گا، تو

درجۂ توکّل سے گر جائے گا۔ اور اگر رنجیدہ بھی ہو، لیکن زبان سے کچھ نہ کہے، اور خاموشی اختیار کرے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ صبر کی شان باقی رہ جاتی ہے۔ اور اگر چور کی تلاش شروع کردی تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا، اور ایسی صورت میں نہ وہ صابرین میں ہوگا، اور نہ متوکلوں میں۔ لہٰذا خاموشی اختیار کرنا صبر کی نشانی ہے۔

(اعتراض) اس جگہ ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر اس کے دل میں اس مال کی ہوس نہ ہوتی تو تالا ہی کیوں لگاتا، اور تالا لگانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنے مال کی حفاظت مقصود تھی۔ اور اب مال کے چوری ہونے کے بعد اس کا رنجیدہ ہونا قطعی قابلِ قیاس ہے۔

(جواب) اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جب تک وہ مال اس کے پاس تھا، وہ اس کو اپنا مال سمجھتا تھا۔ اور اس مال کی حفاظت میں وہ اپنی بھلائی اور فرض سمجھتا تھا، لیکن جب وہ مال اس کے پاس سے نکل گیا تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مال میرے پاس صرف اس وقت تک کے لیے عاریۃً دیا گیا تھا، اور اب جس کا تھا اس کے پاس چلا گیا۔

آدمی جب اس تصوّر کے ماتحت سوچے گا، اس کو رنج اور تکلیف کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔۔ اس کو خداوند عالم پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کے لیے بہتر ہی کیا۔

(تمثیل) اس کا جواب ایک مثال کے ذریعے بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا، وہ یہ کہ۔ مثلاً ایک لڑکے کا باپ طبیب ہے۔ وہ اس کو گوشت کھانے کو دیتا ہے اور کبھی روکتا ہے، تو بیٹا یہ سوچے کہ جب اس نے گوشت کھانے کی اجازت دی، تو میری تندرستی اور طاقت کو بڑھانے کے لیے تھا، اور جب منع کر دیا تو بھی میرے لیے بہتر یہی تھا کہ ضرور اس سے کوئی نقصان پہنچ جاتا۔۔۔۔ یہ درجۂ توکّل کا ہے اور اس کے علاوہ سب ظاہری باتیں ہیں۔

آدابِ متوکّل

مال کے چوری جانے کے اندیشہ میں چھ آداب کو مدِّنظر رکھنا چاہیے۔

پہلے یہ کہ دروازہ کو بہت زیادہ محفوظ کرنے کی کوشش نہ کرے اور نہ پڑوسیوں سے اس کی حفاظت کے متعلّق فرمائش کرے۔

حضرت دینار رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اپنے دروازے کو ایک دھاگے سے باندھ دیا کرتے اور فرماتے کہ اگر کتّے کے آجانے کا خیال نہ ہوتا، تو یہ عمل بھی نہ کرتا۔

دوسرے یہ کہ ایسے مال کو جمع ہی نہ کرے، جس سے چوروں کے آجانے کا خطرہ ہو، ورنہ اُن کی چوری کی طرف رغبت میں وہ مالک بھی شریک ہوگا۔۔۔۔ ایک بار مغیرہ نے حضرت مالک دینار کے پاس کچھ مال بھیجا۔

آپ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس مال سے میرے دل میں شیطانی وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ اور چوروں کو اس مال کے چرانے کی طرف رغبت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بھی گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ بات حضرت سلیمان دارانی کے کانوں تک پہنچی، تو فرمایا کہ صوفیائے کرام کا یہ خیال باطل ہے اور یہ بزدلی کی نشانی ہے۔ کہ یہ مال چور لے جائے گا۔ اس لیے گھر میں ہی نہ رکھا جائے۔

تیسرے یہ کہ گھر چھوڑتے وقت نیت کرے کہ اگر میرا مال چور لے جائیں گے، تو ان سے کوئی پرسش نہ کروں گا، اور اس کو معاف کر دے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ چور زیادہ ضرورت مند ہو اور اس مال سے اس کے بہت سے کام نکل جائیں اور اس مال کے حصول کے بعد دوسروں کے یہاں چوری نہ کرے۔ ایسی صورت میں اس کی طرف سے صدقہ دیا جائے گا۔ اور جانبین کے لیے یہ بات مفید ہوگی اور چور مسلمان پر مہربانی کا باعث بھی ہوگی۔

اس نیت سے خداوند عالم کی طرف سے ایک درم کے بدلے میں سات سات سو درہم عطا کیے جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ بیوی کے ساتھ صرف اولاد پیدا کرنے کی نیت سے مباشرت کرنے سے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے (اور وہ غلام جو جہاد کر کے شہید ہو جائے) چاہے اولاد ہو یا نہ ہو، لیکن اس کی نیت تو صرف بیٹے کے لیے نطفہ قرار پانے کی تھی۔ تمام اعمال نیتوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ چوری ہونے کی وجہ سے غمگین نہ ہو، اور سمجھ لے کہ میرے لیے اس میں مصلحتِ خداوندی تھی۔ اور اگر مال کو فی سبیل اللہ بخش دے، تو پھر اس کی تلاش نہ کرے۔ حتّٰی کہ واپس کریں تو بھی نہ لے، اور اگر لے بھی لے گا تو مال میں اس کی ملکیت باقی رہے گی۔ اس لیے صرف نیت کرنے سے ملکیت فسخ نہیں ہو جاتی، لیکن درجۂ توکل سے ضرور گر جائے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک بار اونٹ کھو یا گیا۔ آپ نے اوّل تلاش کیا، لیکن جب نہ ملا تو آپ نے "فی سبیل اللہ" کہا۔ کچھ دیر بعد ہی کسی نے آکر اطلاع دی کہ فلاں جگہ اونٹ موجود ہے۔ آپ اوّل تو چلنے کو تیار ہوئے، لیکن پھر بیٹھ گئے اور سوچا کہ میں نے خداوند عالم کی راہ میں چھوڑ دیا۔ لہٰذا اب واپس لینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

ایک بزرگ نے کسی شخص کو خواب میں رنجیدہ دیکھا۔ اس سے وجہ دریافت کی، تو جواب دیا کہ میں نے ایسے مقاماتِ اعلیٰ علّیین میں دیکھے کہ جنت میں جگہیں نہیں ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ انھیں مقامات میں سے کوئی نہ کوئی مجھے بھی ملے گی۔ لیکن ندا آئی کہ یہ درجات اس شخص کے لیے ہیں، اس لیے کہ اس نے ایک بار "فی سبیل اللہ" کہہ کر اس کی پروا نہ کی۔ اگر تو نے اپنا عہد پورا کیا ہوتا تو یہ درجہ تجھ کو بھی ملتا۔

ایک شخص مکہ معظمہ میں سو رہا تھا۔ جب بیدار ہوا تو اپنی ہمیانی وہاں نہ پائی۔ ایک بزرگ جو برابر میں تھے۔ اُن سے کہنے لگا، آپ نے لی ہوگی۔ وہ بزرگ اس شخص کو گھر لائے اور جتنے روپے اس نے بتائے تھے دیدیئے۔ جب روپیہ لے کر وہ واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کی ہمیانی اس کے ایک دوست نے مذاقاً لے لی تھی۔ یہ شخص اُن بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یہ واپس لے لیے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے دیتے وقت خدا کی راہ میں دینے کی نیت کی تھی۔ لیکن وہ شخص بہت مصر ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ روپیہ مساکین میں تقسیم کردو۔ جو چیز خدا کی راہ میں دے دی جاتی ہے، وہ واپس نہیں لی جاتی۔

بزرگانِ دین یہاں تک احتیاط برتتے تھے کہ جب کسی کو روٹی دینے جاتے اور وہ اتفاقاً نہ ملتا تو وہ روٹی واپس نہ لاتے، بلکہ دوسرے کسی فقیر کو دے دیتے۔

پانچویں یہ کہ چور چاہے ظالم ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس کے لیے بد دعا نہ کرے، اور نہ گزشتہ واقعات پر افسوس کرے۔ حضرت ربیع بن خثیم رحمۃ اللہ علیہ کا گھوڑا چوری ہو گیا، اور آپ نے خود لے جاتے ہوئے دیکھا لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ نے پکڑا کیوں نہیں؟ جواب دیا کہ میں نے اُن کو معاف کر دیا۔ لوگ چور وں کے لیے بد دُعا کرنے لگے، لیکن آپ نے سب کو روک دیا۔

ایک بزرگ سے کہا گیا کہ ظالم کے لیے بد دُعا کی جائے۔ تو فرمایا کہ اس کا ظلم ہی اس کے لیے کافی ہے۔ میں کیوں شر کا وزن اس پر ڈالوں۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کسی شخص کے ظلم کے بدلے میں بد دُعا کر کے اس سے پورا بدلا یہیں چکا لیتا ہے۔ اور بعض اوقات تو ظالم کے حقوق بد دُعا کرنے والے کے اُوپر رہ جاتے ہیں۔

چھٹے یہ کہ چور کے ظلم کو ظلم سمجھ کر بد دُعا نہ کرے۔ اس لیے کہ اس نے ظلم سمجھ کر چوری نہیں کی، اور اپنے لیے شکر ادا کرے کہ مال دُنیا ہی چوری گیا، اس کا دین اس کے قبضے میں ہے۔ نقصان مال کوئی مستقل نقصان نہیں۔

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے کا مال چوری گیا، اور دیکھا کہ وہ روتے ہیں۔ دریافت کیا کہ کیا تم مال کے لیے رو رہے ہو؟ عرض کی نہیں، بلکہ ان چوروں کی اس افعالی پر، کہ انھوں نے گناہ کیا، اور ایسا آدمی قیامت کے دن بخشا نہ جا سکے گا۔

چوتھا مقام: بیماری کا علاج اور اس کے نقصانات کو دُور کرنا۔

بیماریاں اور اُن کے علاج | بیماری کے معنی میں کسی قسم کی کمی واقع ہو جانا۔ اور اُس کے علاج کے تین درجات ہیں۔

پہلے وہ علاج یا تدارک جو قطعی یقینی ہے۔ مثلاً بھوک کا تدارک کھانا کھا لینا۔ یا پیاس کو کم کرنے کے لیے پانی پی لینا — اسی طرح آگ پر پانی ڈالنا — یا اسی قسم کے اور کام — بلکہ اگر اس قسم کے کام نہ کیے جائیں تو توکل میں کمی آجاتی ہے۔

دوسرا وہ علاج، جس سے بیماری یا کمی کے قطعی رفع ہونے کا امکان یا قطعی یقین نہ ہو۔ یہ دونوں حیثیتوں سے گمان ہی میں داخل ہے۔ مثلاً جادو، ٹونہ اور عملیات وغیرہ۔ اس طرح کے علاج اور تدابیر بالکل نہ کرنا چاہئیں۔

حدیث میں وارد ہوا ہے — کہ اس قسم کی حرکات مبالغے کی بنا پر سرزد ہوتی ہیں۔ یا اُن پر اگر اعتماد ہو تب یہ افعال سرزد ہوتے ہیں۔ اِس میں سب سے پہلے داغ، اس کے بعد منتر، اور اس کے بعد فال وغیرہ دکھانا، جس کو طیرہ بھی کہتے ہیں۔

تیسرے وہ علاج جو یقینی نہ ہو، لیکن امکانات اچھے پائے جائیں۔ جیسے طبیب کے مشورے سے گرمی کا علاج سردی سے یا سردی کا گرمی سے۔ یا مسہل لینا وغیرہ۔

ایسے تدارک اور دفعیوں کی تدبیر کرنا درست ہوگا — لیکن توکل کو یہاں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ دراصل ایسی صورت میں بعض مواقع پر علاج کرنا نہ کرنے سے اچھا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات علاج کرنا چاہیے۔ اس کے ثبوت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور بعض عمل لکھے جاتے ہیں۔

اقوال و احکام آنحضرتؐ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم لوگ علاج کرو۔ دنیا کی ہر بیماری علاج سے رفع ہو سکتی ہے، لیکن موت! حاضرین نے عرض کیا کہ جادو، ٹونہ اور منتر جنتر سے بھی یہ بیماریاں دور ہو سکتی ہیں؟ آپ نے فرمایا، یہ بھی حکم الٰہی میں داخل ہے — اور مجھ سے فرشتگان و مقربین نے ہمیشہ یہ ہی کہا کہ اپنی امت کو فصدیں لگوانے کی ہدایت کیجیے اور پچھنوں کی بہترین تاریخیں سترہ انیس اور اکیس ہیں۔ بعض دفعہ خون کی زیادتی بھی انسان کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ لہٰذا یہ عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح سانپ، بچھو یا گھر میں آگ کا بجھانا ضروری ہے۔

اگر منگل کے دن یا سترھویں تاریخ کو پچھنیں لگوائی جائیں، تو سال بھر کے لیے بیماری دفع ہوتی ہے۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن معاذ کو فصد لگوانے کا حکم دیا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھیں آشوب کر آئی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ خرمہ نہ کھاؤ اور چقندر کشک جو کے ساتھ پکا کر کھانا بہتر ہوگا۔

افعال آنحضرتؐ آپ رات کو روزانہ سرمہ استعمال فرماتے اور ہر ماہ پچھنے لگواتے، اور ہر سال دوا استعمال فرماتے۔ جب آپ پر وحی نازل ہوتی، تو آپ کے سر میں درد ہو جاتا تو مہندی استعمال کرتے اور جسم میں زخم ہوتا

تو وہاں مہندی رکھ لیا کرتے، اور کبھی کبھی زخم پر مٹی ڈال لیا کرتے۔

طب نبوی میں روایت ہے کہ حضرت موسیٰ ایک بار کچھ بیمار ہو گئے۔ لوگوں نے علاج کے لیے عرض کیا۔ لیکن آپ نے علاج نہ کیا۔ وحی نازل ہوئی کہ موسیٰ! جب تک علاج نہ کرو گے آرام نہ ہوگا۔ آپ نے دوائیں استعمال کیں اور صحت یاب ہو گئے۔ وحی آئی کہ دواؤں میں اثرات بھی میں نے ہی پیدا کیے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے عرض کی کہ بیماری اور صحت کیوں اور کس وجہ سے وجود میں آئیں۔ ندا آئی، ہماری لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ عرض کیا، پھر یہ حکماء کا وجود؟ جواب آیا کہ ان لوگوں کو صرف حکمت کے ذریعہ کمانے اور پیٹ بھرنے کے لیے ایک پیشہ دے دیا گیا ہے۔

علاج پر توکّل کرنا، علم اور حال کے تحت میں ہے۔ لہٰذا علاج پر توکّل نہ کرے، بلکہ اُس پر توکّل کرے جو دواؤں کو پیدا کرنے والا ہے کہ ہزاروں آدمی علاج کراتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔

داغ ۔ منتر جنتر کی ممانعت

بعض لوگ بیماریوں میں داغ لگاتے ہیں یا منتر اور عملیات پھونکتے ہیں۔ یہ فعل شریعت کی رُو سے منع ہے۔ لیکن منتر کے لیے اتنی سختی کے ساتھ منع نہیں کیا گیا۔ اس لیے داغ لگانے سے زخم کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور یہ فصد کی جگہ ہرگز نہیں آ سکتا۔ بلکہ داغ کے بجائے اور دوسرے علاج بھی کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت عمران بن حصین ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ لوگوں کے اصرار کے بعد آپ نے داغ لگوا لیا۔ بعد میں فرمایا کہ داغ لگوانے سے پہلے مجھے تمام نورانی چہرے نظر آتے تھے۔ مقربین بارگاہ ایزدی سے ملاقات اور سلام علیک ہوتی تھی۔ لیکن اب وہ تمام باتیں جاتی رہیں۔ آپ نے پھر توبہ کی اور وہ سب کرامات پھر واپس ملیں۔

ترکِ علاج بیماری

بعض اوقات دوا کا استعمال بہتر ہوتا ہے
عمل آنحضرتؐ کی روشنی میں

بعض بزرگان نے علاج کبھی نہیں کیا۔ لیکن بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم دوائیں استعمال فرماتے رہے ہیں۔ لہٰذا یہ عمل سنّت ہے۔ اس کے متعلق ہم چند مثالیں اور واقعات لکھتے ہیں:

علاج نہ کرنا چھ وجوہ کی بناء پر ہوتا ہے۔

پہلی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی حقائق و معارف میں اتنا بلند مرتبہ ہوتا ہے کہ بیماری میں اس کو اپنی صحت اور موت کے متعلق سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے اور وہ علاج کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ سے جب لوگوں نے علاج کے لیے کہا، تو فرمایا کہ مجھ سے حکیم مطلق نے پہلے ہی فرما دیا ہے کہ میں وہ کرتا ہوں جو میری مشیت میں ہے۔ پھر علاج کرنے کی کیا احتیاج باقی رہ جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی خداوند عالم کے خیال میں اتنا مستغرق ہو کہ اس کی نظر دوسری جانب جا ہی نہ سکے —— حضرت ابوالدردا جب بیمار ہوئے، تو کراہ رہے تھے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ فریاد کا کیا سبب ہے؟ فرمایا، کہ گناہوں سے توبہ کر رہا ہوں۔ پھر عرض کیا کہ اب کوئی حسرت باقی ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں خُداوند عالم کی رحمت کی حسرت ہے۔ پھر عرض کی کسی طبیب کو علاج کے لیے بُلایا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس حکیم مطلق نے ہی بیمار کیا ہے۔ اس کے بعد کسی حکیم کی ضرورت نہیں۔

حضرت ابوذر غفاری آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ لوگوں نے علاج کے لیے عرض کیا۔ تو فرمایا کہ میں علاج سے زیادہ اچھے کام میں مشغول ہوں۔

بعض لوگوں نے حضرت سہل تستری سے عرض کیا کہ غذا سب میں اچھی کیا ہونا چاہیے۔ آپ نے جواب دیا کہ حَیٌّ وَقَیُّوْمٌ کا وِرد۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ دیرپا بیماری کی وجہ سے بیمار کسی دَوا کے متعلق اپنے کو مطمئن ہی نہ کر سکے کہ کون سی دَوا مفید ہو سکے گی۔

چوتھے، اس لیے دَوا نہ کرے کہ بیماری سے صبر کی عادت کو استوار کر سکے۔

حدیث میں ہے کہ خداوند عالم اپنے مخصوص بندوں کو مصائب کے ذریعہ آزماتا ہے جس طرح سونے کو آگ پر رکھ کر پرکھتے ہیں۔

پانچویں اس لیے کہ آدمی انتہائی گناہوں میں مبتلا ہو۔ اور بیمار ہو جائے تو دَوا نہ کرے تاکہ بیماری کے طول پکڑنے سے تمام گناہ جھڑ جائیں۔ حدیث میں ہے کہ گنہگار کو بخار آتا ہے تو وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گناہ بالکل دُھل جاتے ہیں، جس طرح اولہ گرد و غبار سے پاک و صاف ہوتا ہے۔

اقوال انبیاء علیہم السلام | حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص بیماری کو اپنے گناہوں کا کفارہ نہیں سمجھتا، وہ دین دار نہیں ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے ایک بیمار کے لیے دُعا کی۔ ندا آئی کہ یہ بیماری ہی اس پر رحم کرنے کے مترادف ہے۔

چھٹے اس سبب سے کہ آدمی تندرستی کے زمانے میں خواہشات اور غفلتوں کا شکار رہتا ہے، لیکن بیماری میں ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا بیماری کا طول کھینچنا ہی غفلت اور پندار سے بعد کا سبب ہوتا ہے۔

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ مسلمانوں کا امتحان خداوند عالم ہمیشہ اور ہر وقت غربت۔ بیماری اور دُنیوی زحمت کے ذریعہ لیتا رہتا ہے۔

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ بیماری اور درویشی میری مہر ہے - اور میں جس کو ان مصائب میں مبتلا کرتا ہوں ، وہ میرا دوست ہوتا ہے ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ایک قوم کو رنگ رلیوں اور سفید پوشیوں میں دیکھا - وجہ دریافت کی معلوم ہوا کہ آج ان لوگوں کی عید ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان کی عید اس دن ہے جس دن وہ گناہ نہ کرے ۔

ایک بزرگ سے کسی نے خیریت دریافت کی - جواب دیا کہ خیریت اس دن ہوتی ہے ، جس دن کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا ۔

فرعون کی عمر چار سو برس کی ہوئی ، لیکن اس کو کبھی بھی کوئی بیماری نہ ہوئی - اور اگر کسی بیماری میں کبھی بھی مبتلا ہو جاتا تو خدائی کے دعوے سے پرہیز کرنے لگتا ۔

بعض بزرگوں کا عقیدہ ہے کہ کسی بندۂ مومن کو چالیس دن تک متواتر خوش و خرم نہیں رہنا چاہیے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت سے نکاح کی خواہش کر رہے تھے ۔ لوگوں نے اس عورت میں اچھی صفت سمجھتے ہوئے عرض کیا کہ یہ عورت کبھی بیمار نہیں ہوتی ، لیکن آنحضرتؐ نے اس سے نکاح کی خواہش ترک کر دی ۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکالیف اور بیماریوں کا تذکرہ فرما رہے تھے ۔ ایک اعرابی نے عرض کیا ، میں تو آج تک بیمار نہیں ہوا ۔ آپ نے حکم دیا کہ میرے سامنے سے دُور ہو جا ! اور فرمایا کہ جس کو کسی دوزخی کے دیکھنے کی خواہش ہو ، وہ اس شخص کو دیکھ لے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خدمت میں عرض کیا کہ درجہ شہادت پر کون شخص فائز ہوتا ہے ۔ فرمایا جو آدمی دن رات میں بیس بار موت کو یاد کرے ۔

یہ حقیقت ہے کہ بیمار آدمی موت کو یاد کرتا رہتا ہے ۔

انھیں وجوہات سے بزرگانِ دین نے دواؤں سے پرہیز کیا ہے اور بیماریوں کی خواہشات کی ہیں ، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ظاہری حالات کے تابع نہ تھے ۔ اس لیے آپ علاج کرتے تھے ۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کو تشریف لے جا رہے تھے ۔ وہاں اس زمانے میں طاعون کی کثرت تھی ۔ لوگوں نے جانے سے پرہیز کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ ڈرتے کیوں ہو ؟ ہم لوگ حکم خدا سے قضائے الٰہی کی طرف جا رہے ہیں ، جس طرف ہمارا مالک لے جائے ۔ ہمارے لیے بہتری اسی میں ہے ۔ اس کے بعد حضرت عوف کو بلایا اور دریافت کیا ۔ جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایسی جگہ نہ جاؤ ، جہاں کوئی وبا ہو ۔ اور اگر کسی وبا کے مقام پر موجود ہو ، تو اس کو بھی نہ چھوڑو ۔ اس کے بعد آپ نے شکر خُدا ادا کیا ۔ کہ میری رائے حدیث شریف سے مُطابقت رکھتی تھی ۔

وبا کی جگہ کو چھوڑ کر چلے جانے کی ممانعت اس لیے ہے ، کہ بیماروں کی تیمارداری کون کرے گا ؟ بعض احادیث

میں ہے کہ مقام وبا سے کنارہ کشی کرنا، جہادِ اسلام سے مُنہ موڑنے کی برابر ہے۔
یہ غالباً اس لیے بھی ہے کہ جہاد سے مُنہ موڑنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہاں کے زخمیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ دوسرے یہ کہ جب اپنے ساتھیوں کو بھاگتا ہوا دیکھیں گے تو رنجیدہ ہوں گے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو معاف نہ کیا جائے گا۔

بیماریوں کو پوشیدہ رکھنا

بیماریوں کا اظہار کرنا

بیماری کو چھپائے رکھنا توکّل کی نشانی ہے اور لوگوں کے سامنے واویلا مچانا یا لوگوں کو ظاہر کرنا مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی ہی بیماری لاحق ہو تو مکروہ نہ ہوگا۔ مثلاً طبیب اور ڈاکٹر سے اپنا حال کہنا یا اپنے دل سے کیفیات کا بخار کم کرنا مطلوب ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک بار بیمار ہوئے۔ لوگوں نے دریافت حال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا نہیں ہوں۔ لوگوں کو تعجب ہوا، تو فرمایا کہ کیا خداوند عالم کو بھی بہادری دکھائی جائے۔

اس قسم کے اقدامات انھیں ذوات کے لیے مناسب تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم سے سلامتی کی دُعا کرو۔ اور اسی لیے آپ نے بنفسِ نفیس دُعا مانگی ہے کہ مجھے صبر عنایت فرما۔

بغیر کسی بیماری کے اپنے کو بیماری ظاہر کرنا ناجائز ہے۔ اور اگر بیمار ہے اور شکایت کے طور پر اظہار نہیں کر رہا، تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن پھر بھی چھپانا ہی مناسب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شاید مبالغہ ہو جائے۔ اور سامع ان الفاظ پر شکایت کا خیال کر سکے۔

علماء کے نزدیک بیماری میں ہائے واویلا مچانا درست نہیں۔ کیوں کہ اس سے بھی اظہار مقصود ہوتا ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت بشر حافیؒ اور حضرت وہب ابن الورد رحمۃ اللہ علیہم جب بیمار ہوا کرتے تو گھر سے نہ نکلتے، اور فرماتے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری عیادت کو بھی کوئی نہ آئے۔

نواں اصول

(باب المحبّت والرّضا)

محبّت و رضا

خُداوند عالم کی مُحبّت کے متعلق متکلّمین کے تصوّرات

دُنیا کے تمام کام اور ہر چیز میں نیک اعمال صرف خداوند عالم کی دوستی کی بُنیادوں کو استوار کرنے کا سبب ہیں۔ انسان کے لیے صرف خداوند عالم کی معرفت اور محبّت ہی اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ رکن مہلکات میں ان سب چیزوں کی مخالفت کے لیے حکم دیا گیا ہے

اور منجیات میں احکامات کی فرمانبرداری کا حکم ہے، اور یہ سب احکامات صرف خداوند عالم کی معرفت کے لیے ہیں صبر۔ شکر۔ توبہ۔ زہد وغیرہ کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں، وہ سب اصول ہیں اور محبت و رضا اسی کے فروع میں داخل ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کو بھول کر صرف خدا کی معرفت حاصل کرے اور اگر قطعی طور پر نہ کر سکے، تو کم از کم دُنیا کی محبت پر محبت خدا غالب ہونا چاہیے۔

خداوند عالم کی حقائق کی معرفت اِنتہائی مشکل کام ہے۔ بعض متکلمین کے خیال میں تو محال ہے۔ اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم جنس کے علاوہ کسی چیز سے محبت کرنا خلافِ عقل ہے۔ لہٰذا خداوند عالم کے احکامات کی فرمانبرداری تو ممکن ہے، لیکن محبت ناممکنات سے ہے۔

مُصنّف کتاب کی رائے متکلمین کا یہ مقولہ اُن کے دین میں کمزوری اور ناواقفیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیلات لکھنا ضروری ہیں۔

سب سے پہلے خداوند عالم کی محبت کے اثبات میں شرعی دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد محبت کے حقائق اور احکامات بتائیں گے۔

فضائل محبّت حقیقی

دُنیا کے تمام مُسلمان اِس مسئلے پر متفق ہیں کہ خداوند عالم کی محبت اور دوستی ہمارا فرضِ عین ہے خداوند عالم خود ارشاد فرما رہا ہے۔ یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ۔

خداوندِ عالم سے دوستی کرنے کے مراتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی خداوند عالم اور اس کے رسول کو دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ دوست نہ سمجھے اُس کا ایمان مکمل نہیں۔

ایک بار صحابہ نے دریافت کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ بندے کو خدا اور اس کے رسول کے ساتھ سب سے زیادہ دوستی ہو۔ اور مومن کامل اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک وہ اپنے مال۔ اہل و عیال اور تمام دُنیا سے زیادہ خداوند عالم اور اس کے رسول سے محبت نہیں کرتا۔

خداوند عالم بھی ارشاد فرما رہا ہے کہ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ الخ (یعنی اگر تم اپنے باپ دادا، اولاد اور اعزاء کو خدا اور رسول سے زیادہ دوست رکھتے ہو تو تیار رہو کہ تم اسی کی طرف موت کے بعد آؤ گے)

ایک شخص نے آنحضرتؐ کی دوستی کا دعویٰ کیا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ فقر کے لیے آمادہ ہو جا! اُس نے پھر عرض کیا کہ خداوند عالم کو بھی دوست جانتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ مصائب کے برداشت کی قوت پیدا کر لے۔

ملک الموت حضرت خلیل اللہ کی قبض رُوح کے لیے آئے تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ کیا کوئی دوست،

دوست کی رُوح قبض کر سکتا ہے۔ وحی نازل ہوئی، کہ کیا کوئی دوست، دوست کی طرف جانے سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی ملک الموت سے فرمایا کہ میری روح قبض کر لو۔

(اقوال) روایت ہے کہ ایک اعرابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ قیامت کب ہوگی؟ آپ نے دریافت فرمایا کہ تو نے اس دن کے لیے کوئی سامان مہیا کیا ہے؟ عرض کی روزہ نماز تو زیادہ نہیں ہیں، لیکن خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اطمینان رکھ، کہ جن کو تو دوست رکھتا ہے، انھیں کے ساتھ وہیں رہے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جس نے دوستی خدا کا مزا چکھ لیا، وہ دنیا سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی کو خداوند عالم کی معرفت ہوتی ہے، وہ اس سے محبت کرتا ہے، اور جس کو دنیا کی معرفت ہوتی ہے وہ خدا کو دوست نہیں رکھتا — ہمیشہ یاد رکھو کہ مسلمان غفلت کے وقت ہی مسرور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جس خدا کو یاد کرے گا، فکر پیدا ہو جائے گی۔

حضرت عیسیٰؑ نے کچھ لوگوں کو انتہائی نحیف و زار حالت میں دیکھا۔ دریافت کیا کہ تم لوگوں کی یہ کیا حالت ہے۔ اُن لوگوں نے عرض کیا کہ خداوند عالم کے خوف سے ڈرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمھارا اس پر حق ہے اور وہ تم کو دوست رکھتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے ایک گروہ کو اس سے زیادہ کمزور حال میں دیکھا۔ اُن سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہشت کی تمنا میں یہ حال ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند عالم تمھاری آرزو پوری کرے گا — اس کے بعد ایک تیسرا گروہ اور بھی کمزور اور ضعیف ملاحظہ فرمایا۔ ان لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خداوند عالم کی محبت کی وجہ سے یہ حال ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ مقربین میں سے ہو، اور مجھے ایسے ہی لوگوں کے پاس بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت سقطی علیہ الرحمۃ کا مقولہ ہے، کہ قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے رسُول کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ لیکن خدا کو دوست رکھنے والوں کو آواز دی جائے گی، اے خدا کے دوستو! تم اس کے پاس آجاؤ۔ یہ سُن کر اُن کے دل خوشی سے مسرور ہو جائیں گے۔

بعض صحیفوں میں مذکور ہے کہ خداوند عالم اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ میں تجھ کو دوست رکھتا ہوں، چونکہ تو مجھ کو دوست رکھتا ہے۔

حقائق دوستی خدا

خداوند عالم کی دوستی کے متعلق جیسا کہ بیان کیا گیا کہ ایک گروہ قطعی انکار کرتا ہے کہ اس کی دوستی انسان سے ناممکن ہے۔ لیکن اس مسئلے کی باریکیوں کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ پھر ہم اس کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔

سب سے پہلے آدمی کو محبت کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ محبت کیا چیز ہے۔

محبت اس رغبت کا نام ہے کہ جو کسی چیز کی، اس کے اچھا معلوم ہونے کی وجہ سے آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، یا خود آدمی اس طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ رغبت اور دلچسپی محبت کے بعد زیادہ مستحکم ہوتے ہوتے عشق کے درجات اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح بری معلوم ہونے والی چیز سے نفرت ہوتی ہے۔ اور اس جذبہ نفرت کو عداوت کہا جاتا ہے۔

ان دونوں کے مابین ایک درجہ یہ ہے کہ نہ محبت ہو، نہ نفرت و عداوت۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ آدمی کو ایک چیز نہ اچھی معلوم ہوتی ہے اور نہ بری۔

طبع و خلقِ انسانی اور حواسِ خمسہ

اب اچھی چیز کی خصوصیات کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے۔

انسان کی طبیعت اور مزاج کی مطابقت میں ہر چیز تین حالتوں سے خالی نہ ہوگی۔ یا تو چیز اچھی معلوم ہوگی یا بری۔ اور یا نہ اچھی نہ بری — اور اچھی بری کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ اس شئے کے متعلق معلومات نہ ہو جائے۔

معلومات کا ذریعہ، انسان کی قوتِ ادراک ہے اور حواسِ خمسہ۔ بس یہ دو ہی چیزیں ہر چیز کی معرفت کے لیے کام آتی ہیں۔ حواسِ خمسہ میں ہر ایک کے لیے الگ الگ امتزاج ہوتا ہے جس کے ماتحت آدمی ہر چیز سے کوئی لطف یا سرور یا کوئی بھی دوسرے قسم کی لذت محسوس کرتا ہے اور اس کے مزاج کو وہ پسند آتی ہے۔ مثلاً "باصرہ" کو دیکھنے والی چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے سبزہ زار، پھل پھول اور مناظرِ قدرت ان چیزوں کو دیکھ کر آدمی کو ان کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ اور یہی محبت کا باعث بن جاتا ہے۔

قوتِ سامعہ کو دلکش آوازیں پسند آتی ہیں، اور آدمی ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔

قوتِ شامہ، سونگھنے والی چیزوں سے حظ حاصل کرتا ہے۔

چکھنے والی قوت، مزیدار اور عمدہ کھانوں کو پسند کرتی ہے۔

اور چھونے والی قوت (قوتِ لامسہ) نرم اور ہاتھ کو بھلی محسوس ہونے والی چیزوں سے دلچسپی رکھتی ہے۔

ان تمام چیزوں سے انسان اور حیوان سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

انسان کی چھٹی قوت

لیکن ایک چھٹی قوت انسان کو اور ودیعت ہوئی ہے۔ جو بصیرت در نورِ عقل کہا جاسکتا ہے۔

یا جو الفاظ چاہو اس کے لیے استعمال کر سکتے ہو — اور اسی قوت کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے - باقی تمام چیزوں میں حیوان اور انسان دونوں برابر ہی ہیں -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دُنیا میں تین چیزیں میرے لیے خداوندِ عالم نے مرغوب و پسندیدہ قرار دی ہیں - عورت - خوشبو اور نماز —— اور میری آنکھوں کا نور نماز ہے - آپ نے نماز کے درجات کو سب سے بلند تر فرمایا ہے - جو لوگ صرف جانوروں کی طرح حواسِ خمسہ ہی رکھتے ہیں - اور نورِ عقل ان میں نہیں ہوتا - وہ نماز کی فضیلت کو نہیں سمجھتے - اور جو چشمِ بصیرت رکھتے ہیں ، وہ اس دُنیا کی ہر چیز کو چشمِ باطن سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں - دنیوی آرائش پر "جمال الٰہیہ" کو ترجیح دیتے ہیں ، اور دُنیا کی آرائشیں ان کی نگاہوں میں ہیچ ہوتی ہیں -

اسبابِ دوستی خداوند عالم

دوستی خُدا کے طریقے اور اسباب

سب سے بہترین سبب اور طریقہ خداوندِ عالم سے دوستی کرنے کا یہ ہے کہ اس کی طرف لَو لگائی جائے - اس سے ربط ضبط بڑھایا جائے اور وہ پانچ طریقوں پر قائم ہو سکتا ہے -

پہلے یہ کہ آدمی اپنی ترقیوں ، اپنے کمالات اور اپنی بقا کو "دنیا میں" دوست رکھتا ہے - اور جن باتوں میں اس کو زوال کا اندیشہ ہو ، اُن سے نفرت کرتا ہے - اس لیے بقا سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے - لہٰذا وہ سوچ لے کہ بقا دوامی کیوں نہ حاصل کرے - اس ظاہری دنیا سے زیادہ کم قیمت کون سی چیز ہے - اس لیے کہ یہاں ہر چیز فنا ہونے والی ہے ، اور فانی چیزوں سے دل لگانا دلچسپی کا باعث ہو نہیں سکتا - حتّٰی کہ آدمی اپنی اولاد کو بھی صرف اس لیے چاہتا ہے کہ اس کو اپنی ذاتی ترقیاں مدِ نظر ہوتی ہیں - لہٰذا اس کو ہر اس چیز سے محبت ہوتی ہے جو اس کی بقا کے لیے ضروری ہے - تو وہ سوچے کہ اس کی بقا اِس دنیا میں ہرگز نہیں ہے ، بلکہ کہیں اور ہے ، اور اس سے محبت کرنا اپنا نظریہ زندگی بنا لے -

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہر اس شخص سے محبت کرتا ہے ، جو اس کے ساتھ محبت سے پیش آئے - اسی لیے آدمی کے متعلق لوگوں کا قول ہے کہ انسان احسانات کا بندہ ہے -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی ہے کہ کسی فاجر کو میرے اوپر احسان کرنے کی توفیق نہ دے - کیونکہ اس کے احسان کی وجہ سے میرا دل دوست رکھنے لگے گا -

آدمی کی فطرت میں یہ بات داخل ہے - اس کو وہ کسی حال میں چھوڑ نہیں سکتا اور حقیقتاً بھی یہ بات ہے کہ آدمی احسان کو ضرور مانتا ہے - حتّٰی کہ وہ اپنی تندرستی سے اسی لیے خوش ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے خوشی

اور مسرت کا باعث ہوتی ہے، اور بیماری تکلیف کا — لہٰذا وہ اپنی تندرستی کو بھی اسی لیے دوست رکھتا ہے کہ وہ اس کو خوش رکھنے کا باعث ہوتی ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ نیک آدمی نیک آدمیوں ہی کو دوست رکھے گا۔ حتیٰ کہ ایک دور دراز آدمی کے عدل وانصاف کا شہرہ سن کر بھی اس کی وقعت دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چاہے اس شخص سے ملنے کا عمر بھر کوئی امکان نہ ہو۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ آدمی فطرۃً خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اس خوشی کی وجہ سے دوست رکھتا ہے۔ خوبصورت آدمی بھی پسند اسی لیے ہونا چاہیے، اس سے نفس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن وہ اچھا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی بہترین نظارہ یا سبزہ زار سامنے آتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کاش کہ انسان خداوند عالم کے حسن حقیقی کو سمجھ کر اس سے محبت ہی کرنے لگے۔

پانچواں یہ کہ آدمی کو اپنا مزاج جب کوئی مل جاتا ہے تو خواہ مخواہ اس کی صحبت میں لطف آنے لگتا ہے۔ طبیعت کی مناسبتیں بھی انسان میں محبت پیدا کر دیتی ہیں۔ جیسے جواری، جواری کے پاس بیٹھتا ہے، لڑکا لڑکے کے پاس اور عالم عالم کے پاس۔ زاہد، زاہد کے پاس — اور کبھی کبھی اصل جوہر بھی انسان کی حقیقی طبیعتوں کے ایک سے ہو جاتے ہیں، جو تخلیق انسان سے متعلق ہیں۔ اس کی وجہ سے مزاجی کیفیات یکسانیت ظاہر کرتی ہیں اور آپس میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات آدمی کی خود اختیاری اور خود ارادیت سے باہر ہے — جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ارواح کو ایک دوسرے کے ساتھ یگانگت اور بیگانگی دونوں ہوتی ہیں۔ اگر یگانگت ہوتی ہے تو محبت ہوتی ہے اور بیگانگی ہوتی ہے تو دشمنی۔

حقائق حسن

بعض لوگ صرف چہرے کے رنگ اور خوبصورتی و نزاکت ہی کو حسن کہتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ نفسانی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں اور عقل سے بعید باتیں سوچتے ہیں۔

دراصل جو سیرت میں رنگ و بو نہیں رکھتا، وہ حسین نہیں ہو سکتا۔

مدبرین کا خیال ہے کہ ہر وہ چیز خوبصورت ہوتی ہے جو اپنی ذاتی صفات میں ہر اس جوہر کی حامل ہو، جو اس کے لیے ظاہری اور باطنی حیثیت سے ہونا ضروری ہیں۔ ہر چیز کا کمال الگ ہے جیسے خط کا کمال حسن یہ ہے کہ اس میں دائرے بھی اچھے ہوں اور اس کے معانی و مطالب بھی حسین ہوں۔

ظاہری آرائش والے گھر کو اچھا کہنا یا حسین چہروں کو خوبصورت کہنا غلط ہے۔ یہ صرف چشم ظاہری سے دیکھنے والوں کا نظریہ ہوتا ہے۔

عام طور پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کے اطوار اور اخلاق بہت اچھے ہیں۔ فلاں آدمی انتہائی بہادر ہے۔ لیکن یہ تمام صفات کوئی شخص اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ چشمِ بصیرت سے ہی دیکھی جاسکتی ہیں "ریاضت النفس" میں اس کے متعلق سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے کہ صُورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری دوسری باطنی۔ نیک خلقی صُورتِ باطنہ سے متعلق ہے۔ اور فطرتاً وہ ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی آدمی امام شافعی اور امام ابُوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کو دوست رکھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کو دوست رکھے، تو یہ بات ناممکن نہیں۔ اس لیے کہ بعض لوگ تو اپنی جان و مال بھی ان پر نثار کر دیں گے۔ اور اُن کی دوستی صرف اُن صفات کو سُن کر اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے دیکھنے سے نہیں۔ اس لیے کہ اب وہ اس دُنیائے ظاہری میں موجود نہیں۔ لیکن اس شخص کی حُسنِ سیرت ان لوگوں کے اخلاق کو سمجھ کر عزّت کرنے پر مجبُور کر رہی ہے۔

اسی وجہ سے پیغمبرانِ دین کو لوگ دوست رکھتے ہیں اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جو آدمی حضرت صدّیق کو دوست رکھتا ہے، وہ صرف اُن کے اخلاقِ حسنہ کو دوست رکھتا ہے۔ اُن کی جسدِ خاکی کو نہیں۔ اور اسی سیرت کی بناء پر آپ "صدّیق" کہے جاتے ہیں۔ چونکہ علم اور صدق صدّیق کی صفات میں داخل ہیں۔ اور وہ ایسا جزء ہے، جو اس ذات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس صفت میں رنگ و بُو نہیں جو ختم ہو جائے یا اُڑ جائے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی محبوب چیز میں ظاہری گوشت اور حُسن داخل نہیں۔ بلکہ حقیقی صفات کی وجہ سے محبت کی جاتی ہے۔ لہٰذا عقلمند آدمی وہ ہے، جو جمالِ باطنی اور حقیقی کو سمجھتا ہو، اور اس پر اس کو یقینِ کامل ہو۔ ایسا آدمی صورتِ جسمیہ سے زیادہ "صفات" کو دوست رکھے گا۔

اُن لوگوں میں بھی فرق و امتیاز پیدا ہو جاتا ہے، جو اخلاق اور صفات کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کسی پیغمبر کو دوست رکھتا ہے، یا کوئی آدمی صورتِ ظاہری کو ہی اچھا جانتا ہے۔ ان دونوں میں زمین، آسمان کا بل ہے۔

وہ یہ کہ اگر کسی سے کوئی محبت کرے تو اُس کے ظاہر حُسن و صورت کو اس سے بیان نہ کریں گے، بلکہ اُس کی سیرت کے متعلق کہیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کو نفرت دلانا مقصود ہو گا تو اس کے بُرے عادات کا اُس کے سامنے تذکرہ کریں گے۔

انھیں وجوہ سے لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو دوست اور ابوجہل کو دشمن سمجھتے ہیں۔

اس پوری تفصیل کے بعد سمجھ میں آجانا چاہیے کہ حُسن دو قسم کے ہیں، ایک ظاہری دوسرا باطنی۔

صورت باطنی کا جمال اور حُسن وہ محبوب حقیقی ہے۔ جس کی اطاعت اور فرمانبرداری ہم پر واجب ہے۔ اور عقلمندوں کے نزدیک اسی کا جمال دوستی کے لائق ہے۔

اِنسانی مجبّت کا مرکز صرف خداوند عالم ہے

سوائے خداوند عالم کے دُنیا میں کوئی شے دوستی اور محبّت کے لائق نہیں۔ جو آدمی دنیا والوں کو دوست رکھتا ہے اور خداوند عالم کی محبت نہیں ہے، وہ جاہل ہے۔ لیکن جو آدمی خداوند عالم سے محبت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے سے بھی محبت کرتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

مثلاً سرکار رسالت کی محبت اسی کی محبت ہے۔ اور اسی طرح علمائے دین اور صالحین سے محبت بھی اسی کی محبّت کا زینہ ہے ـــــ اسباب محبت کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

سببِ اوّل : انسان اپنے وجود اور اپنے کمالات یا عادات کو دوست جانتا ہے۔ اس میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آدمی کا وجود اور اس میں جو کمالات ہیں، اُن سب کا خالق وہ ہی ہے۔ لہٰذا اس کی محبت ضروری ہے۔ اگر آدمی پر اس کا فضل نہ ہوتا تو نہ اِنسان کا خود ہی وجود ہوتا، اور نہ اس کے کمالات کا ـــــ یہ ایسی ہی بات ہے کہ آدمی کسی درخت کے سایے سے تو محبّت کرے، لیکن اس درخت سے بے التفاتی برتے جس کا وہ سایہ ہے۔ یہ انسانی کی نادانی کا سبب ہے۔

سببِ دوم یہ ہے کہ آدمی فطرۃً ان چیزوں سے محبّت کرتا ہے جو اس کے لیے مفید ہوں، یا اس آدمی سے جو اس کے ساتھ سلوک سے پیش آتا ہو۔ اور خداوند عالم کے علاوہ دُنیا میں اس کے ساتھ سلوک کرنے والا کوئی نہیں ہے ـــــ لہٰذا اس کی محبت سب سے زیادہ ضروری ہے، ورنہ یہ بھی جہالت کا سبب ہے، کہ وہ محسنِ حقیقی کو نہیں سمجھتا، اور دوسروں کو اپنا مُحسن جانتا ہے۔ خداوند عالم کے احسانات کے متعلق بابُ التفکر میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔

سببِ سوم یہ ہے کہ بعض لوگ نیک آدمیوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ چاہے اُن کے ساتھ کوئی نیکی کی ہو یا نہ کی ہو۔ مثلاً کسی دُور دراز کے رہنے والے آدمی کے متعلق کوئی شخص یہ سُنے کہ وہ بڑا نیک مزاج اور سخی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف سے دل میں محبت پیدا ہو جائے گی ـــ اس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بھی خداوند عالم سے محبت ہونا ضروری ہے۔ اس لیے نیکی اور عدل وسخاوت کا جوہر ہر انسان کے دل میں وہ ہی ودیعت کرتا ہے۔ بندہ بذاتِ خود قاصر ہے، لہٰذا خدا کی محبت اور دوستی ہی انسان کے دل میں ہونا چاہیے۔

سببِ چہارم یہ ہے کہ آدمی کسی اس کے حسن وجمال باطنی کی وجہ سے دوست رکھتا ہو۔ اور سمجھتا ہے کہ اس شخص میں صفاتِ حسنہ موجود ہیں۔ لہٰذا محبت کے قابل ہے۔ جیسے امام اُبوحنیفہ، اور امام شافعی رحمۃ اللہ

علیہم، یا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے محبت کرنا۔ یا پیغمبرانِ اسلام کو دوست رکھنا صرف اس لیے ہے کہ ان تمام بزرگانِ دین کے قلوب نورِ ایمانی سے روشن تھے۔ لیکن اس جمال باطن میں تین صفات حسنہ پوشیدہ ہوتی ہیں۔

پہلی صفت، یہ اُن کا علم ہے، اور عالم اسی لیے محبوب سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ وہ شریف اور نیک ہوتا ہے۔ اب اس میں محبت کے درجات بڑھتے جاتے ہیں، آدمی جتنا جتنا مرتبے میں بلند ہوتا جائے گا، اتنا اتنا اس کا علم بھی بڑھتا جائے گا۔ اور اس کی وجہ سے جمال باطن میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا رہے گا۔ اب معلوم ہوا، کہ اُن کے جمال باطن سے محبت ہوتی ہے، اُن کی ذات سے نہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اُن میں جمال باطن کو ودیعت کرنے والی وہی ذات ہے۔ لہٰذا ہم اس کی ذات سے دوستی و محبت کیوں نہ کریں اور اسی کی معرفت تمام رسولانِ سلف کی محبت میں مضمر ہے۔ اور اگر ذرا غور کر کے اپنے قلوب کا اندازہ کریں، تو معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کی محبت بھی اسی لیے ہے کہ ان کو خداوند عالم کی معرفت کامل حاصل تھی۔

دوسری صفت۔ قدرت اور طاقت، جیسے انسان اپنے نفس کو سنوارنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح خداوند عالم بھی اپنے بندوں اور اُن کے ظاہر و باطن کو سنوارنے کی قدرت رکھتا ہے۔

تیسری خوبی یہ ہے کہ انسان اپنی تخلیق کے لحاظ سے عیوب اور ناپاکیوں نیز خباثت باطنی اچھا نہیں سمجھتا۔ اور اگر وہ غفلت کی وجہ سے کوئی ارتکاب کرتا ہے، تو اس کو بُرا بھی سمجھتا ہے۔ لہٰذا یہ صفات فطری طور پر جس شخص میں زیادہ ہوں گی، اس کی محبت کے جذبات بھی زیادہ ہوں گے۔ اسی لیے ہر شخص سے اس کے مرتبے کے مُطابق لوگ محبت کرتے ہیں۔ جیسے امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے زیادہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کی محبت ہے۔

اب ان تینوں صفات پر غور کرنا چاہیے، کہ خداوند عالم میں یہ سب بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس لیے کہ دُنیا کو کوئی بشر جو خدا کو مانتا ہے، وہ یقین کامل رکھتا ہے کہ اس کے علم کو بندے ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

خداوند عالم خود بھی ارشاد فرما رہا ہے کہ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (یعنی تم کو تھوڑا سا علم عطا کیا گیا ہے) حتیٰ کہ اگر تمام عالم مچھر کی حقیقت کو سمجھنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ اور جتنا بھی انسان جانتا ہے، وہ بھی خدا کی نسبت سے جانتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کا علم کسی کا محتاج نہیں اور سب کے علوم اسی کے محتاج ہیں۔ اور اگر قدرت اور طاقت پر غور کرو تو بھی اس کا ثبوت مل سکتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی شجاعت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست کے آج تک لوگ گرویدہ ہیں۔ اس لیے کہ دونوں صفات قدرت سے ہی متعلق ہیں۔

اس نے جتنی طاقت جس کو عطا کر دی ہے، اس سے زیادہ وہ شمہ برابر نہیں بڑھ سکتے۔ ذرا سا غور کرنے کی بات ہے کہ مکھی جیسی ناچیز شے انسان کے ہاتھ میں جو چیز ہوتی ہے وہ کھا جاتی ہے اور انسان مکھی سے وہ چیز واپس لینے میں قاصر ہوتا ہے۔

صرف خداوند عالم ہی کی قدرت ایسی ہے کہ اس نے تمام دنیا اور جو کچھ اس میں عجائبات موجود ہیں، سب کو پیدا کیا۔ اِنسان بیچارہ ایک تنکا بھی بغیر اس کے حکم کے نہیں ہلا سکتا۔ وہ اگر چاہے تو یہ تمام آسمان اور زمین ختم کر کے ایسے ایسے عالم ہزاروں پھر پیدا کرے۔ اس کے علم میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ لیکن انسان وہ خواہ پیغمبر ہوں یا اولیاء، سب ہی قاصر ہیں۔

خداوند عالم کی ذات اور قدرت میں کبھی نہ کمی آئی ہے، نہ آئے گی۔ لہٰذا کیوں نہ اس کی طرف توجہ دی جائے ــــــ اور اس کا عشق کامل حاصل نہ کیا جائے۔

جب خداوند عالم کی بزرگی کا تصوّر ہوتا ہے اور اس سبب سے اس کی محبت ہوتی ہے تو یقیناً اُس وقت عشق مکمّل ہو سکے گا۔ اسی لیے حضرت داؤد علیہ السّلام پر وحی نازل ہوئی تھی کہ اُس بندے کو میں بہت عزیز رکھتا ہوں، جو میری ربوبیت کا حق ادا کرتا ہے، صرف مال دنیا کے لالچ سے میری اطاعت اور عبادت نہیں کرتا۔

زبور میں ہے کہ وہ بندہ سب سے زیادہ ظالم ہے، جو میری عبادات صرف دوزخ کے خوف اور بہشت کی لالچ سے کرتا ہے۔ اور وہ شاید یہ سمجھتا ہے کہ اگر جنّت دوزخ نہ بناتا تو شاید میری اطاعت ہی نہ کرتا۔

پانچواں سبب آپس کی مناسبت ہوتی ہے۔ خداوند عالم کو بھی مخلوق سے ایک قسم کی مناسبت ہے ارشاد ہو رہا ہے کہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (کہہ دو کہ رُوح میرا حکم ہے)

حدیث میں ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (یعنی یقیناً خداوند عالم نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا) اس حدیث میں اس نے اپنی طرف نسبت دے دی ہے۔ حدیث قدسی میں بھی اسی کی طرف بیان کیا گیا ہے کہ میرا بندہ میرا تقرّب ڈھونڈتا ہے تاکہ میں اس کو دوست بناؤں۔ اور جس وقت میں واقعی دوست بن جاتا ہوں اس وقت اس کا کان، ہاتھ اور مُنہ سب کچھ میں ہی بن جاتا ہوں۔

موسیٰؑ سے خطاب کیا جا رہا ہے کہ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ یَا مُوْسٰی۔ یعنی ہم بیمار ہوئے اور تم نے عیادت بھی نہ کی۔ حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام کو بڑی حیرت ہوئی۔ دریافت کیا کہ مالک تو دنیا کا خالق ہے، بھلا تو بیمار کیسے ہو سکتا ہے۔ ندا آئی کہ ہمارا ...... وہ بندہ بیمار تھا۔ اس کی عیادت ہماری عیادت تھی۔

اِنسان میں جمالیاتی عنصر

آدمی کی صورت سے خداوند عالم کی مناسبت کے متعلق ہم نے "عنوان" کے ماتحت مفصل لکھ دیا ہے اور اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جن کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں۔ عوام تو اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بلکہ بعض اہل حل وعقد نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اُن میں کچھ لوگ تو تشبیہہ کے قائل ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ صورت جسمیہ کے علاوہ اور کوئی صورت مقصود ہی نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگ حلول اور اتحاد کے قائل ہو گئے ہیں۔ بہرحال یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ جب تم محبت اور اسباب کے متعلق سب کچھ جان گئے، تو پھر سوائے "محبت خداوندی" کے دوسری طرف رجوع کرنا، انتہائی حماقت کی بات ہے۔

متکلمین کا نظریۂ توحید منطقیوں کا نظریہ کہ ہم اپنے غیر جنس سے محبت ہی نہیں کر سکتے۔ کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے۔ اس نے صرف یہ ہی سمجھا ہے کہ جس طرح عورت سے اور اس کے اعضا سے دلچسپی اور محبت ہوتی ہے، اسی قسم کی محبت خداوند عالم سے بھی ہے۔ لیکن ہم نے یہ ثابت کیا ہے، خدا کی محبت محض اس کے جمال باطنی سے محبت ہے۔ صورتِ ظاہری کا وہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور اسی لیے پیغمبران اولوالعزم کی محبت ہوتی ہے، اس لیے کہ ان کا جسدِ خاکی موجود نہیں، بلکہ وہ ہماری طرح زندہ ہیں۔ اُن کے عقول وہ ہی کام کر رہی ہیں۔ اور اُن کا ادراک بعینہٖ عمل میں مشغول ہے۔ ہم اُن کے صفات حسنہ سے محبت کرتے ہیں۔ اب صفات کے کمال میں ہر موقع پر نمایاں فرق ہوتا ہے۔

پیغمبروں کے ذوات میں کمالات حسنہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اور ان میں ہماری مناسبت بحیثیت ایک جسدِ خاکی کے موجود ہے۔ لہٰذا کمالات کی بلندیاں دوری پیدا کرتی ہیں قطعی کسی چیز کو الگ نہیں کر دیتیں۔ انسان کی آپس میں مناسبت کے متعلق ہر شعبہ علم والے متفق الرائے ہیں، لیکن مناسبت کے حقائق سے صحیح طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔ خداوند عالم نے اس مناسبت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ۔

مذہب اسلام کا نظریہ دیدار و معرفت مذہب اسلام صرف خداوند عالم کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا نظریہ صرف دیدار رب العزت ہے۔ اور ایسی شے کی محبت و دیدار جو کسی شکل میں متشکل ہی نہ ہو، بھلا کس لذت سے متعلق ہو سکتی ہے۔ اب وہ لوگ حقیقی طور پر شوق خداوندی میں تو مستغرق نہیں ہو سکتے۔ لیکن محض کتابوں میں پڑھنے کی وجہ سے مخالفت پر آمادہ نہ ہوں گے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آدمی جس راز سے واقف نہیں، اس سے کوئی دلی لگاؤ ہونا بھی ناممکن ہے۔ اور ایسے لوگوں کو توجہ ہونا بھی مشکل ہے۔

دیدارِ خداوندی کے رازہائے سربستہ اس بھید کے متعلق تمام تفصیلات تو بیان کرنا ناممکن سا ہے۔

لیکن اجمالی طور پر ذکر کیے دیتے ہیں - اس بھید کا چار نظریات پر دار و مدار ہوتا ہے۔
پہلے یہ کہ آدمی کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ خداوند عالم کی صرف معرفت سے اس کا دیدار بہر حال زیادہ سبب قربت ہوتا ہے۔
دوسرے یہ کہ خدا کی معرفت و محبت اور دنیا والوں میں ہر ایک کی محبت سے بہر حال بہتر ہو سکتی ہے۔
تیسرے یہ کہ فطرتاً معرفت سے دل کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ چاہے اس میں اعضائے جسمانی کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔
چوتھے یہ کہ روحانی خوشی اعضائے ظاہری کی خوشی سے بہر حال بہتر ہوتی ہے - اور اس میں زیادہ حظ حاصل ہوتا ہے۔
ان چاروں اسرار کے سمجھ لینے کے بعد آدمی اس نتیجے پر ضرور پہنچ جائے گا کہ خداوند عالم کے دیدار اور اس کی محبت و معرفت کے علاوہ دنیا کی تمام محبتیں اور اشغال قطعی بیکار اور غیر مفید ہیں۔

معرفت خدا کے لیے انسان کو اعضائے ظاہر کی ضرورت نہیں ہے

(نوٹ) ان چاروں نظریات کے علاوہ بعض ایسے نظریات بھی ہیں، جو صرف دل اور روحانی کیفیات کے آئینہ دار ہیں۔ ان کو اعضائے جسمانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - بلکہ مقابلتہً موجودات سے کہیں زیادہ افضل ہیں۔
ہم نے ان کو بھی چار اصول پر تقسیم کر دیا ہے، اور وہ اس طرح پر ہیں۔
پہلا اصول - دل بغیر صورت جسمیہ کے روحانی معرفت کی کیفیات سے زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔
دوسرا اصول - معارف اور علوم کی حقیقی لذات سے دل جتنا محظوظ ہوتا ہے، اتنا ظاہری اعضاء کی لذات سے محظوظ نہیں ہوتا۔
تیسرا اصول - خداوند عالم کی معرفت حقیقی معرفت ہے - اس لیے "دل" بہ نسبت دنیاوی علوم اور معرفتوں کے اس طرف زیادہ متوجہ ہو سکتا ہے۔
چوتھا اصول - لذات چشم ظاہر، لذات معرفت سے زیادہ اچھی ہوتی ہیں۔
اب ہم ان چاروں اصول کو انتہائی اختصار کے ساتھ واضح کریں گے تاکہ آپ کی سمجھ میں "معرفت خدا" اور معرفت دنیا کا فرق "صورت جسمیہ" کی مناسبت کے ساتھ آسکے۔
اصول اوّل : دل بغیر بدن کے معرفت کی لذات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔
خداوند عالم نے انسان کو بہت سے خواص اور قوا سے آراستہ کیا ہے۔ اور ہر قوت و حواس کے لیے الگ الگ کام ہیں۔ اور وہ سب کام بھی الگ الگ طاقتوں کے مالک ہیں۔

مثلاً آنکھوں کو دیکھنے کی قوت ہے، جو قوت شامہ سے زیادہ ہے۔ اسی طرح قوت شہوت (خواہش) کو غذا کو حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔ ان قوا اور طاقتوں کی شناخت کے لیے ایک نور عطا کیا ہے کہ جس کے ذریعہ ہم ہر چیز کو سمجھتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ وہ "عقل" کا نور ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج کو ان تمام چیزوں کے سمجھنے اور پہچاننے کے لیے ودیعت کیا گیا ہے۔ اور وہ اس عقل کے ذریعہ یہ سمجھتا ہے کہ اس دُنیا کو پیدا کرنے والا کوئی دوسرا ہی ہے۔ اور اس کی ہستی کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمام صنائع و بدائع پر نظر کرے۔ ان تمام چیزوں کو سمجھنے کے لیے انسان کی قوائے ظاہری قطعی قاصر ہیں۔ مثلاً علوم کا سمجھنا اور ان علوم سے دوسرے نکات کا نکالنا، جیسے کتب کی تصنیف یا علم ہندسہ کا سمجھنا اور بنانا یہ سب چیزیں ظاہری حسیات سے بالاتر ہیں۔ لیکن ان سب میں آدمی کو لطف ضرور محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کہیں شطرنج ہو رہی ہو۔ اور اس کا جاننے والا وہاں آکر کوئی بہتر بن چال بتا دے۔ جس سے مات کھانے والا بچ جائے تو اپنی تعریف سُن کر وہ بھی ایک کچھ کیفیات روحانی محسوس کرنے لگتا ہے۔

پس اسی طرح یہ تمام معرفتیں ہیں، جن کے سمجھنے کے لیے انسان کے قوائے ظاہری کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ دل بذاتِ خود معرفت حاصل کرتا ہے۔ وہ صرف اسی لیے کہ یہ قوت خداوند عالم کی ودیعت کردہ ہے

غالباً مسئلہ صاف ہو گیا ہو گا کہ انسان میں وہ روحانی طاقت موجود ہے جس کے لیے کسی ظاہری اعضاء کی ضرورت نہیں، بلکہ صرف دل کے ذریعہ ہی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

دُوسرا اصول ۔ دل کی لذات، محسوساتِ ظاہری سے زیادہ روح افزا ہیں۔

فرض کرو، ایک شخص شطرنج کھیلنے بیٹھ جائے، اور وہ اچھا کھلاڑی ہے، تو اس کو کھانے کی پروا بھی نہیں رہتی اور برابر کھیلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دن اور رات برابر گزر جاتا ہے۔ مگر وہ کھانے کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔ معلوم ہوا لذتِ دل کو اس نے لذتِ جسم پر فوقیت دی۔ اسی طرح اگر کسی شخص سے کہا جائے کہ فلاں کام کرلو تو سلطنت مل جائے، تو وہ ہر کام کر لیتا ہے، اس کو سلطنت کے حاصل کرنے کی خوشی ہوتی ہے اور اگر کسی ایسے شخص سے جو علوم کی کدوکاوش میں مصروف ہے، اس سے کہا جائے کہ تم کو سلطنت دے دی جائے تو وہ اپنے علوم کو ہی فوقیت دے گا۔ اور سلطنت و حکومت کی پرواہ نہ کرے گا۔ حالانکہ دونوں خواہشات کو خداوند عالم نے ہی پیدا کیا ہے۔ ظاہری اور باطنی، لیکن ظاہری خواہشات باطنی خواہشات کے اُبھرنے کے بعد رکھی رہ جاتی ہیں۔ اور روحانی کیفیات میں انسان کو جو لطف آنے لگتا ہے۔ وہ ظاہری کاموں میں نہیں آتا۔

لہٰذا جو شخص علوم اور معرفت میں کامل ہوگا۔ اس کو جسم و جسمانیات متعلق شہوات و خواہشات کی کوئی پروا

نہ رہے گی۔۔۔ اور یہ ہی ہمارا اصل منشا ہے، کہ دل کی معرفت اور علوم کی لذات دنیوی خواہشات سے کہیں بالاتر ہوتی ہیں

تیسری بُنیاد ۔ خداوند عالم کی معرفت دُنیا کی تمام معرفتوں سے افضل ہے۔

جب یہ طے ہوگیا کہ علم و معرفت دنیاوی چیزوں سے افضل ہیں۔ اور یہ بھی طے ہوچکا ہے کہ بعض علوم بعض علوم سے بہتر ہیں۔ اِنسان کا نفس جتنا اچھا ہوگا، اتنا ہی اس کا علم بھی بہتر ہوگا۔ اسی طرح آدمی کا علم جتنا جتنا ترقّی کرتا جائے گا۔ اس کی لیاقت بھی ترقّی کرتی جائے گی، جیسے شطرنج کے علم کی بُنیاد ڈالنے والا شطرنج کھیلنے والوں سے بہتر تھا۔

اسی طرح اب علم کا توازن کر لینا چاہیے کہ ہر چھوٹا علم اپنے سے بڑے علم کے ماتحت ہوگا، مثلاً زراعت سے زیادہ اچھا علم بادشاہت اور سیاست ہے۔ علمِ نجوم اور علمِ لغت شریعت کے برابر نہیں ہو سکتے۔۔۔۔ اسی طرح آگے بڑھتے بڑھتے ایک آخری مرکز وہ ہے کہ جو دنیا کے تمام علوم سے زیادہ بہتر ہوگا اور اس سے بہتر کوئی دُنیا کا علم نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لامحدود علم خداوند عالم کا ہے۔

اب اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ آدمی کی عقل جتنی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنا اتنا اس کا علم بھی بڑھتا جائے گا۔ معرفت عقل کے مُطابق ہوتی ہے۔ اِنتہائی معرفت اور علوم کا کماحقہٗ جاننے والا آدمی ہی خداوند عالم کے علوم کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی نگاہوں میں دنیا کے تمام علوم ہیچ ہوجائیں گے۔ اس کو صرف خدا کی معرفت میں لذت و حظ حاصل ہوگا۔ اسی طرح معرفتوں میں بڑھتے بڑھتے آخری درجات پر جو عارف بھی ہوگا۔ وہ عارف کامل کہلائے گا۔ اس کو اس دنیا کی ظاہر چیزیں اور علوم سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ وہ صرف خداوند عالم کی معرفت ہی کو جنّت تصوّر کرے گا۔ اور اس کی نگاہوں میں یہ دنیا بھی جنت ہوگی۔ اس لیے کہ وہ یہاں کی ہر چیز کو نورِ خدا کا پَرتو ہی سمجھے گا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ خداوند عالم کی معرفت ہی دُنیا کی تمام معرفتوں سے افضل ترین ہے۔

چوتھا اصُول ۔ لذّاتِ نظر، لذّاتِ باطنی سے زیادہ خوش کن ہوتی ہیں۔

ادراک اس کو سمجھنے کے لیے اوّل یہ سوچنا ضروری ہے کہ قوتِ ادراک دو قسم کی ہیں۔ وہ کہ جو تصورات میں آسکتی ہے۔ مثلاً پھول کا رنگ یا اس کی خوشبو۔

اور بعض ادراک ایسے ہیں کہ جو صرف عقل ان کو متصوّر کر سکتی ہے، جیسے خداوند عالم کی صفات اور ذات بلکہ بعض صفات انسان کی سمجھ سے ہی بالاتر ہیں۔ جیسے قدرت۔ اِرادہ اور جہات۔ اس لیے کہ اس میں سوچنے اور سمجھنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ بعض اِنسانی خواہشات مثلاً

عشق، جاہ وحشم کی خواہش اور راحت و تکلیف کے تصوّرات ذہن میں نہیں آتے۔ صرف عقل ہی ان کے تصوّرات کو قائم کر سکتی ہے۔

تصوّرات اور سامنے دیکھنے کا فرق

جو ادراک آدمی کو پیدا ہوتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ چیزیں کہ آدمی کو سامنے نظر آجاتی ہیں، ان میں تصوّر کی ضرورت ہی نہیں رہتی یہ ادراک مکمل کہلاتا ہے۔ دوسرے وہ جو صرف تخیّلات اور تصورات میں آتے ہیں، اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم ان کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ ادراک ناقص ہے۔ اگرچہ محبوب کے تصوّرات اور تخیلات کے مقابلے میں اس کے دیدار میں کہیں زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تصوّرات اور حقیقی دیدار میں معشوق کی صورت کچھ تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ مثلاً آدمی معشوق کو رات کی تاریکیوں میں دیکھے یا صبح کی سپیدی، تو بتدریج خط وخال کے نظر آنے میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ رُوح کی شعاعوں میں دیکھے گا تو بالکل صاف دکھائی دیتا ہے۔

مشاہدہ و معرفت

اس کے بعد ایک چیز اور سوچنا ہے کہ جو چیزیں صرف ادراک میں پیدا ہوتی ہیں، اور تخیّلات میں نہیں آتیں، وہ بھی دو منزلوں کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ایک معرفت دوسری وہ منزل جو معرفت سے بھی زیادہ ہوتی ہے، جس کو مشاہدہ کہتے ہیں۔

جب انسانی کمالات کے درجات کو طے کر لیتا ہے۔ تو معرفت اور مشاہدات میں وہی فرق ہوتا ہے، جو دیدار، اور خیال میں ہے۔ جیسے آدمی پلک جھپکانے میں انسان اپنے تخیّلات کے تسلسل کو جاری رکھتا ہے۔ لیکن پلک کے جھپکنے کے بعد اگر آنکھ نہ کھلے تو دیدار کا تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آدمی جب تک مٹی اور پانی نیز دیگر عناصر اربعہ سے متشکل ہے، اس وقت تک دنیوی خواہشات کا اس پر غلبہ رہتا ہے اور اور وہ مشاہدات کے لیے ایک حجاب بنا رہتا ہے۔ لیکن اس آب وگل کی دنیا میں معرفت اس کے لیے مانع نہیں ہوتی۔ لیکن جب تک یہ تعلق (عناصر اربعہ) صورت جسیمہ کو ختم نہیں کر دیتے۔ حجابات باقی رہتے ہیں اور مشاہدہ ناممکن ہوتا ہے۔

مشاہدہ اور دیدار کی حقیقت

یہ سبب تھا کہ حضرت موسیٰ کو لَنْ تَرَانِیْ کی تنبیہہ کی گئی، کہ موسیٰ تم نہ دیکھ سکو گے۔ اور مشاہدہ جتنا جتنا کامل ہوتا جائے گا، اتنی اتنی اس کی لذت بھی بڑھتی جائے گی۔ جیسے تصورات اور دیدار میں فرق بتایا گیا۔

اس کو دوسری صورت سے یوں سمجھنا چاہیے کہ آدمی بظاہر نطفے سے پیدا ہوا ہے لیکن میدانِ قیامت میں اس کی صفت اور ہیئت بالکل تبدیل ہو جائے گی، اور دُنیاوی نسبت ہی نہ رہے گی۔ اس وقت وہ

صرف جوہر ہی جوہر رہ جائے گا۔ پس اس کو مشاہدۂ نظر اور دیدار کہتے ہیں —— یہ پہلے بتایا گیا ہے کہ دیدار کا کمال ادراک کی آخری سرحدوں سے ملتا ہے۔ اور مشاہدہ اس ادراک کی آخری منزل کا سب سے اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ لہٰذا جس طرح دنیا میں معرفت کسی سبب کی محتاج نہیں۔ اسی طرح مشاہدہ بھی کسی سبب کا محتاج نہیں ہے۔

حضرت صدیق رضؓ کا مرتبۂ دیدار

لہٰذا معرفت دیدار کے مقابلے میں ایک تخم کی حیثیت رکھتی ہے کہ اگر معرفت نہ ہو گی تو دیدار نصیب نہ ہو گا۔ اب جتنا جتنا کمال معرفت بڑھتا جائے گا، اتنا ہی معرفت میں بھی اضافہ بھی ہوگا۔ ہر آدمی کو دیدار اور اس کی روحانی کیفیات میں یکسانیت ہونا ناممکن ہے۔ بلکہ ہر آدمی اپنی معرفت کے مطابق دیدار حاصل کرے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ خداوند عالم تمام دُنیا والوں کے لیے عام "دیدار" بخشے گا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے خاص طور سے۔ لیکن اس میں یہ بات سمجھنے والی ہے کہ جلوہ بالکل ایک سی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن انسان کی صفات اپنی اپنی منزل کے مطابق دیدار کریں گے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو چونکہ معرفت الٰہی انتہائی درجے پر ہے لہٰذا اُن کا دیدار بھی خاص ہی ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ روزہ اور نماز تمام صحابہ کا بالکل ایک ہی درجہ رکھتا ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے روزہ، نماز میں ایک بھید ہے، جو آپ کے دل میں روشن ہے —— یہ حدیث اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لہٰذا خداوندِ عالم کا دیدار بالکل ایک ہی ہے، لیکن تمام مخلوق اپنی معرفت کے مطابق اس کے دیدار سے محظوظ ہوگا۔

جو لذت دیدار علماء کو ہوگی، وہ عوام الناس کو نہ ہوگی۔ اسی طرح درجہ زہاد متقی اور اس کے آگے عارفین پھر صدیقین کے درجات بڑھتے چلے جائیں گے۔

لہٰذا کمال سعادت کے لیے صرف معرفت ہی کافی نہیں ہوتی، بلکہ محبت ہونا بھی ضروری ہے، اور وہ محبت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب دُنیا سے نفرت ہو جائے، اور اس کا ذریعہ صرف زہد و اتقا ہے —— معلوم ہوا کہ عارف اور زاہد کو کامل معرفت ہو سکتی ہے۔

دیدار معرفت سے افضل ہے اس کے متعلق دلائل

تفصیلات: دلیل اوّل۔ یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب دیدار معرفت ہی کی ایک شاخ ہے، تو لذت اس میں کیا حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن دراصل اس کی وجہ جہل اور کم علمی ہے۔ اس لیے کہ کچھ لوگوں نے تھوڑا بہت علم حاصل کیا یا صحبت علماء میں بیٹھ کر معرفت کا لفظ سُنا۔ اور اس کے متعلق سب کچھ "گویا کہ" جان گئے، اور وہ دعویٰ بھی کرنے لگتے ہیں اور بغیر علم کے حقیقتاً معرفت کی لذت سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ معرفت کی لذات سے آشنا ہیں، وہ ہی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی کو سلطنت بھی پیش کی جائے تو معرفت کے مقابل میں اس کو بھی ٹھکرا دے گا۔
مختصر طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے، کہ دیدار اور معرفت میں ایک بیّن فرق ہے۔ ایسے جیسے کسی کھانے کے سونگھنے اور کھا لینے میں، مختلف قسم کے حظ حاصل ہوتے ہیں اور کھانے میں بہ نسبت سونگھنے کے زیادہ لطف آتا ہے۔ اسی طرح معرفت کے مقابل میں دیدار سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں۔

دوسری دلیل | دلیل دوم : یہ اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ معرفت دل کے ذریعے ہوتی ہے اور دیدار آنکھ کے ذریعے۔ اور "دل" چونکہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ اور آنکھ فنا ہو جائے گی، لہٰذا معرفت کی منزل ہی بلند ہوئی۔

لیکن اُن لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ دیدار "بالعین" بہ نسبت معرفت کے بہر حال بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ ایک وہ شے جس کو صرف سن کر ایمان لایا جائے بہ نسبت دیکھنے کے کمی کا باعث ہوگی۔ اب رہا یہ کہ آنکھ ظاہر چیز ہے۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے۔ آنکھ چونکہ ہمارے موجودہ وجود میں صورتِ جسمیہ رکھتی ہے۔ اِس لیے ہم اس کو آنکھ کہتے ہیں۔ اور اس دیدار کا ذریعہ آنکھ بناتے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم آنکھ کے بجائے عقل میں قوت پیدا کر دے، جو اس وقت آنکھ میں ہے۔ لہٰذا اِس دنیا میں کسی چیز کی اجبیت اور سبب ہونا ضروری ہے اور وہاں کے لیے سبب کی ضرورت نہیں۔

حقیقتاً اِس مسئلے کو متکلمین، فلاسفر۔ محدّث اور مفسّر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ان میں کا ہر آدمی اس سلسلے میں عوام النّاس کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ باتیں بہت بلند ہیں۔ لہٰذا اس کو سوچنا ان کی عقل سے باہر ہے۔ بس اچھا یہ ہے کہ وہ موجودہ عقیدے کو قائم کر لیں، اور اپنے دل میں حجت اور دلیل کو دخل نہ دیں۔ ان لوگوں کا کام صرف دوسروں کو فریب پر باقی رکھنا اور اہلِ بدعت سے بچانا ہے۔

تیسرا اعتراض اور اس کا جواب | دلیل سوم : ایک خیال البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آخر وہ کیا لذت ہے جو جنت اور سلطنت دنیا دونوں سے برتر ہے۔ کم از کم اس کو سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کی تدابیر اختیار کرنے سے شاید حاصل ہو سکے۔

لہٰذا وہ چار تدابیر سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلے یہ کہ اب تک جو اسباب بیان کیے گئے ہیں، اُن کو بار بار غور کیا جائے تاکہ وہ سب ذہن نشین ہو کر تمھاری توجہ کو اس طرف مبذول کر دیں اور تم کو یقین آجائے۔ اس لیے کہ جب ایک بات کو بار بار دیکھا اور سمجھا جائے تو وہ ضرور ذہن نشین ہو کر قلب کو متاثر کرتی ہے۔

دوسرے یہ کہ آدمی کو تمام قوا یکے بعد دیگرے عطا کی گئی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے کھانے کی قوت، اور اسی طرح جب وہ جوان ہو جاتا ہے۔ اس وقت قوا شہوانی اور اس قوت سے پہلے وہ عورت کی طرف خیال بھی نہیں کرتا کہ یہ کس کام آتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ بیس سال سے تجاوز کرتا ہے تو جاہ و حشمت اور عزت و افتخار کا جذبہ اُجاگر ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کا آخری اور سب سے بڑا درجہ ہے۔ خداوندِ عالم اسی کے لیے ارشاد فرما رہا ہے کہ اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ الخ۔ لہٰذا اس عمر کے پہنچنے تک اگر وہ خواہشات شہوانی کا مطیع نہیں ہو گیا ہے اور اس کی توجہ تخریبات کی طرف نہیں پہنچ گئی ہے۔ تو اس میں معارف و حقائق اور عالم ملکوتی کے ادراک کا مادہ پیدا ہو سکتا ہے۔

اور پہلے کی تمام لذات اس آخری لذت سے دب کر ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ فطرت ہے کہ آدمی جب ذرا آگے بڑھتا ہے، تو پچھلی چیزیں اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا تمام لذاتِ اولیٰ لذت معرفت کے مقابل میں ختم ہو جائیں گی۔ اور پھر اس کو خواہشات کی طرف توجہ بھی نہ ہو گی۔

حضرت رابعہ سے لوگوں نے بہشت کا ذکر کیا۔ آپ کی معرفت کی منزل کا یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اوّل صاحب خانہ (خداوند عالم) کا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد "گھر" کا۔

حضرت ابوسلیمان دارانی کا مقولہ ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں معدودے چند ہی ہوں گے جن کو خداوندِ عالم کی یاد میں بہ نسبت دوزخ کے خوف اور بہشت کی خوشی کے زیادہ لطف آتا ہو۔ اور ان کو خدا کی یاد میں ہی حظ حاصل ہوتا ہے۔

کسی نے حضرت بشر حافی سے خواب میں دریافت کیا کہ ابونصر تماز اور عبدالوہاب وراق کا وہاں کیا حال ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ کھانے پینے کی رغبت نہ ہونے کی وجہ سے خداوند عالم نے اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔

اعمال و اقوال بزرگانِ دین علی ابن الموفق کا مقولہ ہے کہ ایک روز میں نے خواب میں لوگوں کو اچھے اچھے کھانے کھاتے ہوئے دیکھا، لیکن حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ صرف "دیدار" میں مشغول تھے۔ میں نے وجہ دریافت کی، تو معلوم ہوا کہ آپ نے دوزخ کے ڈر اور بہشت کی خوشی کی وجہ سے عبادات نہیں کیں۔ لہٰذا آپ کو یہ درجات نصیب ہوئے۔

حضرت ابراہیم ادہم نے ایک بار درگاہ قاضی الحاجات میں عرض کیا کہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے کوئی عبادت جنت و دوزخ کے تصور سے نہیں کی اور جنت میری نگاہوں میں ایک شمہ کے برابر بھی نہیں۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا سے دریافت کیا کہ آپ سرکار رسالت کو کتنا دوست رکھتی ہیں، تو

آپ نے فرمایا کہ آپ کی محبت اور خلوص شکلی درجات رکھتی ہیں، اور خداوند عالم کی محبت نے مجھ کو مخلوق کی محبت سے بالاتر بنادیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ دنیا میں بہترین عمل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند عالم کی رضا اور محبت اور اس کے فرمان کے آگے گردن جھکا دینا۔

اولیاء اللہ کے عادات اور اعمال سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیے کہ ان کی نگاہوں میں خداوندِ عالم کی مودت کے مقابلے میں جنت کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

غیبت پروردگار عالم

خداوند عالم کے پوشیدہ ہونے کے اسباب

ہر چیز کے علم میں حجابات دو اسباب کی بناء پر ہوتے ہیں۔ یا تو وہ چیز عالم غیب میں ہوگی۔ یعنی انسان کی نظر میں آنے والی نہ ہوگی اور یا اس کے انوار ہم لوگ اپنی ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ ہی نہ سکتے ہوں گے۔ ہماری آنکھوں میں اس کے جلوے کی طاقت ہی نہ ہوگی۔

جیسے چمگادڑ سورج کی روشنی میں اپنی آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اور رات کو اسے نظر آتا ہے۔

پس اسی طرح خداوند عالم کے جمالیات کے نظارے کی طاقت نہ ہمارے دل میں تھی اور نہ نظر میں۔ لہٰذا اِس کا نورُ پوشیدہ ہے۔

اس راز کو سمجھانے کے لیے ایک مثال قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس سے غالباً جلدی سمجھ میں آسکتا ہے۔ جب ہمارے سامنے کوئی سِلا ہوا کپڑا یا کوئی تحریر آتی ہے، تو ہم کو فوراً اس درزی اور کاتبِ تحریر کی معرفت (صفات کا پہچاننا) ہوتی ہے۔ یہ دونوں صفات صرف ایک ایک ہیں۔ لہٰذا اُن کا وجود بھی سامنے آجاتا ہے۔ لیکن خداوند عالم کی کروڑوں بلکہ لاانتہاء مصنوعات ہیں، جو ہیئت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتیں۔ اس لیے وہ تمام مصنوعات تو نظر آتی ہیں، اور صانع قدرت کی معرفت ان تمام مصنوعات میں چھپ گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی صفت فعل خداوند عالم کے تحت نہ ہوتی، تو اس کی معرفت کا ظہور ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اب تمام صفات صرف اسی کی طرف منسوب ہیں۔

لہٰذا اس کی پوشیدگی ضروری ہے اور تمام مصنوعات کی وجہ سے ہی صانع کی معرفت پوشیدہ ہو گئی ہے۔ اس کو دوسری مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً آفتاب کی روشنی اگر برابر ہمارے سامنے رہتی اور رات کی تاریکیاں اس کو اُجاگر نہ کرتیں، تو ہم کو اس کے نور کی صفت کا امتیاز نہ ہو سکتا۔ لہٰذا ہم نے آفتاب کے نہ

ہونے سے آفتاب کی معرفت معلوم کی، کہ آفتاب کتنی بڑی نعمت ہے۔ اسی طرح اگر خالق کل کائنات کا وجود ہماری نظروں کے سامنے ہوتا تو یہ مصنوعات عالم درہم برہم ہو کر ختم ہو جائیں اور ان کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ اور موجودہ صورت میں مصنوعات عالم سے ہی صانع حقیقی کی معرفت ہو جاتی ہے اور یہ تمام عالم و عالمیان اس کی ذات پر شہادت دے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ انسان جب بچہ تھا تو اس عالم وجود کی تمام چیزوں کو بھی یہ سمجھ پاتا تھا کہ یہ کس کی بنائی ہوئی ہیں، اور جب ذرا ہوش سنبھالا، تو ان کی محبت میں اضافہ ہو گیا، اور وہ اس کی اندرونی تہہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، لیکن اگر کسی عجیب و غریب چیز کو دیکھتا ہے، تو فوراً اس کے ذہن میں بارک اللہ اور سبحان اللہ کا تصور پیدا ہوتا ہے، بلکہ زبانِ حال سے پکار اٹھتا ہے اور اس کو صانع حقیقی کی قدرت نظر آجاتی ہے۔ اب ایسے آدمی پر غور کرو، جو ہر چیز میں صانع کی قدرت کو ہر وقت دیکھتا ہے۔ وہ اس مصنوع پر نظر نہیں کرتا۔ بلکہ صانع کو دیکھتا ہے۔ اور اس کو کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کی مصنوعات سے نظر آتا ہے۔ اور ہر شے اس کے سامنے اپنے پروردگار کی صفات میں جھوم جھوم کر نغمہ کہتا ہے اور گواہی دے رہا ہے کہ دنیا میں اس کی معرفت افضل ترین عمل ہے۔ لیکن بندے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس کی معرفت سے عاجز رہتے ہیں۔

محبت خدا کے اسباب

خدا کی محبت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے

محبت کے اسرار و رموز اس عالم میں سب سے زیادہ اعلیٰ و ارفع ہیں۔ ان کا سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل اور ویسا ہی ضروری ہے۔

اگر کوئی آدمی کسی سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبت میں عشق کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے تو دنیا کے ہر موجود کو بھلا کر اس کا دھیان رکھے۔ اس کو چاہیے۔ اگر اس کا چہرہ نظر آجائے تو اس کے اعضا کی خوبصورتی پر خیال کرے کہ وہ کتنے متناسب ہو سکتے ہیں اور اس طرح عشق کی آگ دل میں زیادہ ہو سکتی ہے۔

عشق مجازی کی طرح ہی عشقِ حقیقی پر ایک نظر ڈال کر دیکھو کہ خداوندِ عالم کی محبت بھی اسی طرح بڑھ سکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ آدمی کی کوشش پر منحصر ہے۔ اگر سعی بلیغ کرتا رہے تو ناممکن ہے کہ عشقِ حقیقی پیدا نہ ہو۔

شرائط عشقِ حقیقی

ہر محبت کے لیے کسی ابتدا کے بعد کی منازل پیش آتی ہیں۔ لہٰذا عشقِ حقیقی کی بھی منازل ہیں۔ جب تک آدمی منزل بہ منزل طے نہ کرے گا، کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اب ہم اس کی منازل لکھتے ہیں۔

پہلی منزل۔ آدمی سوائے خدا کے اور کسی چیز سے دل نہ لگائے۔ اس لیے کہ محبت دنیا بالکل لایعنی چیز ہے اس میں دل لگانے سے کچھ حاصل نہیں۔ دنیا سے نفرت کرنے لگے اور پھر معرفت کی طرف رجوع ہو۔

جو لوگ اس سے محبت نہیں کرتے حقیقتاً اس کو معرفت ہی نہیں، ورنہ ان کے کمالات اور انوار تو طبعاً معیوب ہونا چاہئیں۔

مثلاً جو آدمی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کو پہچان لے گا، وہ اُن کے درجات سے ضرور واقف ہو جائے گا، اس لیے کہ وہ لوگ اپنے صفات اور کمالات کی وجہ سے ہی بلند پایہ رکھنے والے ہیں۔

حصول معرفت معرفت کے حصول کی کوشش زمین میں بیج بونے کے برابر ہے۔ اس کے بعد اس کی عبادت اور تفکر بمنزلہ آبیاری کے ہیں۔ جب آدمی ہر وقت اس کی طرف متوجہ ہوگا تو ناممکن ہے کہ محبت پیدا نہ ہو جائے۔

درحقیقت کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ جس میں محبت پروردگارِ عالم کا عنصر موجود نہ ہو، لیکن ان عناصر میں تھوڑا بہت فرق ہے اور وہ فرق تین وجوہ کی بنا پر ہے۔

پہلے یہ کہ دنیا کی دوستی اور مشاغل میں ہر آدمی الگ الگ دلچسپی لیتا ہے، اور ایک چیز کی محبت دوسری شے کی محبت کو کم کر دیتی ہے

دوسرے یہ کہ دنیا والے معرفت میں بہرحال متفاوت درجات رکھتے ہیں۔ جیسے ایک عام آدمی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو دوست رکھتا ہے، لیکن اتنا نہیں جتنا ایک عالم۔ اُن کے علوم سے متعارف ہے۔ اور عام علماء کے مقابلے میں آپ کے خاص شاگرد "مزنی" زیادہ محبت رکھتے تھے، چونکہ وہ آپ کے علوم کو بہت قریب سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح خداوند عالم کی معرفت جتنی جتنی جس شخص کو ہوگی، اتنی اتنی محبت اس کے دل میں بڑھتی جائے گی۔

تیسرے یہ کہ ہر آدمی کی عبادات بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ سے محبت میں امتیازات پیدا ہو جاتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جو آدمی خدا سے محبت نہیں کرتا، وہ گویا کہ اس کو جانتا ہی نہیں، اور معرفت محبت ہی کے نتیجے سے پیدا ہوتی ہے۔

معرفت کاملہ کے حصول کے طریقے معرفت کامل کا حصول دو طریقوں سے ہوتا ہے۔

پہلے اہل تصوف کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور دنیا کے وجود کو قطعی بھلا دیتے ہیں اور مجاہدۂ نفس کرتے ہیں۔ جب وہ ماسوا اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں، تب اُن کو معرفت کے منازل نظر آتے ہیں اور خداوند عالم کی عظمت اتنی ہی ان کی نگاہوں میں بڑھتی جاتی ہے، جتنا جتنا وہ دنیا سے دُور ہوتے ہیں۔ ان کی محبت اور معرفت میں بھی بڑا فرق ہے۔ اور ہر ایک کو اس کے مرتبے کے مطابق محبت ہوتی ہے۔

دوسرا طریقہ معرفت کے علوم کا حصول اور طریقہ حصول ہے اور وہ صرف مصنوعاتِ عالم میں تفکر

کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ (چنانچہ تفکر کے ذیل میں اس کے متعلق سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)

اسی طرح ترقی کرتے کرتے اس کے جمال اور کمالات میں تفکر کرتا رہے تاکہ مکاشفات ہوتے رہیں۔ اس علم کو صرف بڑے اولوالعزم اور دانا پیر اور مرشد سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اور وہ بھی آدمی خود عقل مند ہو۔ ورنہ حصول مشکل ہے۔

معرفت خدا بھی بالکل تجارت اور زراعت کی طرح ہے کہ آدمی جتنی محنت کرے گا اس کا پھل "اس کو" اتنا ہی ملے گا۔ اگر وہ اس کا راستہ چھوڑ دے گا وہ قطعی غلط راستے پر جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں راستوں کے علاوہ اور کوئی راستہ محبت و معرفت خداوندی تک پہنچنے کا نہیں ہے اور کوئی طریقہ اس کی محبت تک پہنچنے کا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر آدمی بغیر محبت کے آخرت کی نیکیوں کو حاصل کرنا چاہے تو ناممکن ہو گا۔ اس لیے کہ آخرت خدا کی معرفت کی ہی کڑی ہے۔

اور اگر آدمی پہلی منازل معرفت میں تکالیف اٹھاتا ہے، لیکن اپنا مرکز نہیں چھوڑتا، تو ایک منزل وہ ضرور آجاتی ہے کہ اس کو سعادت دارین حاصل ہو جاتی ہے۔ اور سعادت عشق و محبت کے برابر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا میں اس نے دوسری چیزوں سے دلچسپی رکھی ہو گی، تو آخرت میں اس کو سعادت ہونا ناممکن اور وہ وہاں رنج و تکالیف برداشت کرے گا۔ اس لیے کہ آخرت میں سوائے جمالاتِ الٰہیہ کے اور کسی چیز کا وجود نہیں۔

اب سعید وہ شخص ہو گا، جس نے دنیا میں اس کی معرفت کے ماتحت تمام عادات اختیار کی ہوں اور انہیں عادات کا نام محبت ہے۔

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ——— اور قَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا، اس کا مقصد یہ ہی ہے کہ دنیا کی تمام خواہشات اسی محبت کی ضد ہیں۔

بعض اہل بصیرت و معرفت اس مسئلے میں تقلید سے زیادہ بلند ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اس محبت کو پیغمبروں کے کردار اور صدق سے پہچانا ہے، بلکہ بعض نے تو صدق پیغمبر کو درجہ تیقّن دیا ہے کہ ان کا صدق بغیر معجزے کے تھا۔

اس لیے کہ وہ لوگ اتنے پہنچے ہوئے تھے، جیسے کوئی طبیب کسی طبیب کی ایک بات سن کر سمجھ لے کہ یہ بھی طبیب ہے۔ اسی طرح سچی نبوت اور جھوٹی نبوت کے دعویداروں کو وہ لوگ سمجھتے تھے۔ اس کے بعد مراتب اور بلند ہوتے ہیں۔ اور وہ ایسے انبیا اس کے مراتب ہیں جو اپنی بصیرت تامہ سے ہی سب کچھ پہچان لیتے ہیں ان کو عصا کے اژدہا بن جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ورنہ ایسے علم میں ضرور کوئی نہ کوئی کمی ہو گی۔ اس لیے کہ جہاں وہ عصا کو اژدہا بن جانے کا یقین کرتے ہیں، وہاں "گوسالہ" میں آواز پیدا ہونے سے درجہ یقین کو گرا

لیتے ہیں۔ کیونکہ معجزے اور جادو کے فرق کو سمجھ لینا ہر ایک کا کام نہیں۔

علاماتِ محبّت

معیارِ محبّتِ صادق ہر آدمی کو اپنے متعلق مغالطہ ہے کہ میں خداوند عالم سے محبت کرتا ہوں۔ لیکن اس دعوے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ محبت دنیا میں ایک عزیز ترین چیز ہے۔ جو ہر آدمی میں نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ہم نے کچھ معیار مقرر کر دیے ہیں۔

لہٰذا ہر آدمی کو چاہیے کہ اس معیار پر آدمی اپنے کو جانچ لے۔ اس کے بعد یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو سکے گا۔

پہلا معیار یہ ہے کہ آدمی موت سے کراہت نہ کرتا ہو، اور موت کو اپنے محبوب کے دیدار کا سبب سمجھتا رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی خداوند عالم کو دوست رکھتا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

حضرت ابو العلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ کیا تو موت کو دوست سمجھتا ہے؟ اس نے جواب دینے میں ذرا توقف کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر تو محبت صادق ہوتا تو موت سے نہ ڈرتا۔

دراصل اگر آدمی اس تصور سے موت کے جلدی آنے کی خواہش نہ کرے، کہ دنیا میں رہ کر اور معرفت حاصل کرے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ اور ایسے آدمی کی شناخت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آخرت کو یاد کرتا رہتا ہے، اور عبادت میں مشغول رہتا ہے۔

دوسرا معیار یہ ہے کہ خداوند عالم کے محبوب پر اپنی تمام محبوب ترین چیزیں اور محبوب ترین آدمی کو نثار کر دے۔ اپنی قربت کی تمام چیزیں ترک کر کے خداوند عالم کی محبوب اشیا میں دلچسپی لے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو خداوند عالم کے محب کو تلاش ہو۔ وہ سالم رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔

کسی شخص کا گناہ کرنا خداوند عالم سے محبت نہ کرنے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہاں البتہ اس کی محبت میں ضرور نقص ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ نعمان کو شراب پینے پر کئی بار تنبیہہ کی گئی۔ اور ایک آدمی نے اس پر لعنت کی۔ تو آنحضرتؐ نے اس کو روک دیا کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

تیسرا معیار یہ ہے کہ خداوند عالم کا ذکر اور عبادت اس کی زبان اور دل میں تازہ رہے۔ اور اس سے پژمردگی نہ پیدا ہو سکے۔ کیونکہ جتنا جتنا دوستی کا درجہ بڑھتا جائے گا، اتنا ہی اس کے ذکر میں لطف آتا رہے گا۔ اور اگر کامل محبت ہو گی تو اس کو ہر وقت دل میں بھی رکھے گا اور زبان پر بھی اسی کا ذکر رہے گا۔

اسی طرح اگر خداوند عالم سے محبت ہے تو ہر وقت اس کا ذکر اور عبادت اس کی زبان پر ہوگی، اور اگر نہیں تو وہ ضرور اس کی عبادت میں کمی کرے گا۔

چوتھے یہ کہ قرآن مجید اور ہر اس چیز کو جس سے خداوند عالم سے نسبت ہے۔ دوست رکھے، بلکہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس حیثیت سے دوست رکھے کہ یہ سب اس کی مصنوعات ہیں۔

پانچویں یہ کہ خلوت میں جلوت کا مشتاق رہتا ہو، اور سوچے کہ رات ہو اور دنیا کے دھندوں سے آزاد ہو کر سوتا ہے۔ اس کا دعویٰ محبت قطعی بے بنیاد ہے۔

چھٹے یہ کہ آدمی کی محبت اس درجے پر پہنچ گئی ہو کہ اس میں کیف اور سرور محسوس ہوتا ہو۔ اس لیے کہ محبوب ترین چیز سے کسی وقت بھی آدمی اکتاتا نہیں ہے۔

ساتواں معیار محبت یہ ہے کہ خداوند عالم فرمانبردار اور مطیع بندوں سے محبت رکھے، اور گنہگاروں اور کفار سے سختی و دشمنی کے ساتھ پیش آئے۔ خداوند عالم نے خود معیار محبت اس طرح قائم کیا ہے، وہ فرما رہا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ کسی پیغمبر نے عرض کی، کہ بارالہا! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ندا آئی کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو میری محبت میں ایسے مبہوت ہیں جیسے بچہ اپنی ماں کے دودھ میں۔ یا چڑیا اپنے گھونسلے کی محبت میں۔

اور وہ میرے دشمنوں پر ایسے خشمناک ہیں جیسے شیر غصے کے وقت نڈر ہو کر حملہ کرتا ہے۔

(نوٹ) اس قسم کے اور بھی بہت سے دلائل ہیں جو معیار محبت بن سکتے ہیں — لہٰذا جو آدمی ان تمام معیاروں پر پورا اُترے تو واقعی محب صادق ہے، اور اگر کسی معیار میں کوئی نقص ہے تو اس کی محبت بھی ناقص ہوگی۔

اشتیاق پروردگار عالم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے اَسْئَلُكَ اِلٰی لِقَآئِكَ وَلَذَّۃَ النَّظَرِ اِلٰی وَجْھِكَ (یعنی مجھے تیری ملاقات کا اشتیاق ہے اور تیرے دیدار کی لذت چاہتا ہوں)

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے وَطَالَ شَوْقُ الْاَبْرَارِ اِلٰی لِقَآئِیْ وَاَنَا اِلٰی لِقَآئِھِمْ لَاَشَدُّ شَوْقًا (یعنی نیک بندے میری ملاقات کے مشتاق ہیں۔ اور میں ان سے زیادہ ان کی ملاقات کا مشتاق ہوں)

جس شخص نے محبت سے انکار کیا، اس کو شوق ہونا بھی ناممکن ہے۔ یہاں شوق کی تعریف بتا دینا بھی ضروری ہے۔

شوق کی تعریف | شوق و اشتیاق ایک عجیب چیز ہے — جس چیز کو ہم نہیں چاہتے، اس کا اشتیاق تو قطعی

محال ہی ہے۔ اب رہی وہ چیز جو ہمارے سامنے موجود ہے، وہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کو پسند نہ ہو۔ اور اس لیے ہم اس کے مشتاق نہ ہوں۔ اسی طرح جو چیز ہمارے سامنے موجود نہیں اس کا اشتیاق بھی نہیں ہوتا۔

اشتیاق انسان کو اس وقت ستاتا ہے جب اپنا محبوب نظروں سے غائب ہو۔ اور دل میں ہر وقت اس کے تصوّرات موجود ہوں۔ لہٰذا شوق کے معنی محبوب کی تلاش کے ہوئے۔ یعنی ہمارا محبوب ہمارے سامنے آجائے۔ تب ہماری قوتِ اشتیاق پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ اور ادراکات مکمل ہو سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عالم میں ہمارے اشتیاق خداوندی کی تکمیل محال ہے۔ کیونکہ اس کی معرفت تو موجود ہے، لیکن مشاہدہ ناممکن ہے۔

اس دنیا میں حواس اور قوتِ ادراک، دو وجوہ سے ناقص رہتا ہے۔

پہلے یہ کہ معرفت صرف ایک دھندلکے میں خداوند عالم کے دیدار کا نام ہے۔ جو تاریکی اور اجالے کے مابین ایک نامعلوم سی روشنی میں ہوتی ہے۔ اور اسی میں دیدار مضمر رہتا ہے اور مرنے سے پہلے اس اشتیاق کا پورا ہونا ناممکن ہے

لیکن یہ ہی قوتِ ادراک، عالم آخرت میں جگمگا جائے گی۔

دوسرے یہ کہ کسی نے اپنے محبوب کا چہرہ ہی دیکھا ہو، اور اس سے اس کو محبوب کے حسن بالکل کا یقین ہو گیا ہو، کہ تمام اعضا انتہائی خوبصورت اور متناسب ہوں گے۔ ایسے آدمی کو اپنے معشوق کے دیدار کا اشتیاق ہوگا۔ لیکن خداوند عالم کے جمال کی کوئی انتہا نہیں۔ چاہے آدمی کتنا ہی معرفت میں کامل ہو جائے۔ لیکن اس کی حقیقت کی آخری حدود سے بہت دور رہے گا۔ چونکہ انسان کا علم اور ادراک محدود ہے، اور اس کی ذات اور جمال لامحدود ہے۔

انس و اشتیاق کا فرق جب انسان کسی چیز کو دل سے دیکھتا ہے، تو اس کو مسرت ہوتی ہے اور اس مسرت کا ماحصل انس (محبت) ہوتا ہے۔

لیکن جب دل کی نظر اس کی کشش کی طرف طلب و تقاضے کے ساتھ پڑے تو اس کا نام اشتیاق ہے۔

یہ دونوں قسم کے جذبات دنیا اور آخرت دونوں میں بدرجۂ اتم ہوتے ہیں، بلکہ لامحدود۔ آخرت میں آدمی پکاریں گے رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (یعنی اپنا مکمل نور دکھا دے) لیکن یہ لوگ، اس نور کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتے اور خداوند عالم کی ہستی کو بدرجۂ اتم کوئی نہ پہچان سکے گا۔ اور جب پہچاننے سے عاجز ہوں گے تو دیکھنے سے بھی عاجز ہوں گے، لیکن مشتاقان نور الٰہی کے لیے ہمیشہ دیدار کی نورانی شعاعیں بڑھتی ہی رہیں گی اور جنت کی آخری منزل جو انتہائی بلند ہے، وہ یہ ہے، اور جو لوگ اس درجے پر فائز ہوں گے وہی

خداوند عالم کے انس اور شائق ہیں، اور وہ اس دنیا میں بھی اس کے انس اور اشتیاق میں سرگرداں رہتے ہیں۔
ایک پیغمبر پر وحی نازل ہوئی کہ جو لوگ میرے دوست ہیں، میں اُن کا دوست ہوں جو مجھے یاد کرتے ہیں، میں انھیں یاد کرتا ہوں۔ جن کی نگاہیں میری مشتاق ہیں، میری نگاہیں ان کی مشتاق رہتی ہیں۔ لہٰذا انھیں کی پیروی کر، تو تو بھی میرا دوست ہے، ورنہ نہیں۔

اس قسم کی بہت سی روایات اور واقعات ہیں۔

(نوٹ) یہاں شوق کا بیان کر دینا ہمارے خیال میں اتنا ہی کافی ہوگا۔

فضائل و حقائق رضا

رضا و قضائے الٰہی کی حقیقت محبت ایک ایسا معیار ہے جو دنیا میں ہر چیز کے لیے امتحان میں کام آتا ہے۔ خداوند عالم کی محبت دُنیا میں سب سے بلند ترین مقامات کی حامل ہے۔ لہٰذا اس کا حکم بھی اسی طرح ماننا ضروری ہے۔ اس لیے کہ جس سے ہم کو محبت ہوتی ہے اس کا ہر حکم ہر وقت بدل و جان مانتے ہیں۔ اور یہ ہی اس کی محبت کا بدلہ اور معیار ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلرِّضَاءُ بِالْقَضَاءِ بَابُ اللّٰہِ الْاَعْظَمُ (یعنی حکم خدا پر رضامند رہنا ہی اس کا سب سے بڑا دروازہ ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کے کچھ افراد سے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں کے "ایمان" کا معیار کیا ہے؟ اُن لوگوں نے جواب دیا کہ اس کی دی ہوئی تکالیف میں صبر کرتے ہیں، اور نعمات کا شکر بجا لاتے ہیں۔ اور اس کے حکم پر گردنیں جھکا لیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ عالم ہیں اور ان کا مرتبہ انبیاء کے برابر ہے۔ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ روز قیامت اُن کے پر لگ جائیں گے اور وہ جنت کی طرف پرواز کریں گے۔ فرشتے اُن سے دریافت کریں گے کہ تم نے کوئی حساب کتاب نہیں دیا، اور جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ مرتبہ تم نے کیسے پایا، وہ لوگ کیسے کہیں گے کہ وہ خصائل کی بنا پر:

پہلے یہ کہ تنہائی میں بھی گناہ سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ خداوند عالم ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

دوسرے یہ کہ جو کچھ وہ رزق دیتا، ہم اس کا شکر بجا لاتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے دریافت کیا کہ رضائے الٰہی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔
وحی نازل ہوئی کہ میرے احکامات کے آگے سر اطاعت خم کر لینے سے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے۔

میں خدائے واحد ہوں، اور میرے علاوہ دوسرا کوئی خدا نہیں۔ اگر میری دی ہوئی مصیبتوں پر صبر نہیں کر سکو، اور نعمتوں پر شکر ادا نہ کرو اور میری قضا پر راضی برضا نہ رہ سکو، تو کوئی دوسرا خدا تلاش کرو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے مقدر پر راضی ہوں۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو حق تعالیٰ کا میرے لیے حکم ہو چکا ہے۔

ایک عابد مدت دراز تک عباداتِ الٰہیہ میں مشغول رہے۔ خواب میں دیکھا کہ جنت میں فلاں عورت تیری رفیقہ ہے۔ انھوں نے تلاش کیا، تو دیکھا کہ نہ وہ روزہ رکھتی ہے اور نہ تہجد پڑھتی ہے لیکن فرائض بجالاتی ہے۔ اس سے دریافت کیا کہ تیرا کیا عمل ہے؟ جواب ملا کہ میں جب بیماری اور مصائب میں مبتلا ہوتی ہوں تو صحت کی دعا نہیں کرتی۔ اگر دھوپ میں ہوتی ہوں تو سائے کی تمنا نہیں ہوتی۔ اگر سائے میں ہوں تو دھوپ کی خواہش نہیں ہوتی۔ عابد نے یہ سنا اور فرمایا کہ یہ معمولی بات نہیں۔ بہت بڑی خصلت کا نمونہ ہے

رضائے الٰہی

پہلا نظریہ ایک گروہ کا مقولہ ہے کہ خواہشات کے خلاف کسی چیز پر راضی رہنا ناممکن ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ اس پر صبر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مصائب اور تکالیف کے متعلق بھی سمجھتے ہیں لیکن یہ لوگ غلطی پر ہیں۔

حقیقت رضائے الٰہیہ اس لیے کہ جب محبت خواہشات پر غالب آجاتی ہے۔ تو اپنی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں۔

پہلے یہ کہ محبت میں آدمی اپنے سے بھی قطعی مدہوش ہو جائے۔ جیسے کوئی آدمی اپنے دشمن سے لڑنے میں اپنے زخموں کا بھی خیال نہیں کرتا۔ لیکن بعض لوگ جو صرف کسی چیز کی حرص میں گھومتے ہیں، اُن کے پیر میں اگر کانٹا لگ جاتا ہے تو وہ تکلیف اور درد محسوس نہیں کرتے —— اور انھیں بھوک اور پیاس کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔

اسباب رضا اب یہ دیکھنا چاہیے کہ جب دنیا میں یہ سب چیزیں ممکنات میں سے ہیں تو عشقِ الٰہی کی منزل کیا ہو سکتی ہے۔ اس لیے کمالات ظاہری اور کمالات باطنی میں زمین آسمان کا فرق ہو۔

دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو زخم پہنچنے پر درد اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ مگر وہ اپنے محبوب کی رضا پر قائم رہتے ہیں اور اُف نہیں کرتے۔ بلکہ اگر دوست اُن سے کچھ خون بھی مانگتا ہے، تو اس سے بھی گریز نہیں کرتا، تاکہ اس سبب سے اس کی خوشی حاصل کر سکے۔

لہٰذا جو آدمی یہ سوچتا ہے۔ اور ان درجات پر پہنچ جاتا ہے کہ خداوند عالم کی رضا کو ہر قربانی کے عوض لے لے۔ وہ دُنیا کے تمام مصائب و ابتلاء اور محنت و مشقت پر راضی رہتا ہے اور اس کا ہر حکم مانتا ہے۔

جس طرح ایک دنیا دار لالچی اور تجارت پیشہ آدمی صرف منافع کی خاطر تمام دنیا کی صعوبات اٹھا کر خشکی اور سمندری سفر کرتا ہے۔

بزرگانِ دین کے اعمال ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں، جو ہر حال میں رضائے الٰہی پر ثابت قدم رہتے ہیں ایک بار حضرت موصلی رحمۃ اللہ علیہ کی زوجہ کا ناخن اکھڑ گیا۔ آپ ہنسنے لگیں حضرت موصلی نے فرمایا، کہ تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ جواب دیا کہ مجھے اس کے اجر کی خوشی اس تکلیف سے کہیں زیادہ ہے۔

حضرت سہل تستری کے جسم میں ایک بار درد ہو گیا۔ لوگوں نے علاج کے لیے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ دوست کی عطا کی ہوئی چیز تکلیف دہ نہیں ہوتی

حضرت جنیدؒ نے حضرت سری سقطی سے دریافت کیا کہ خدا کا معارف کسی مصیبت سے رنجیدہ ہوتا ہے آپ نے فرمایا نہیں۔ آپ نے دریافت کیا۔ اگر اس کو تلوار سے مارا جائے۔ پھر فرمایا کہ اگر ستر زخم لگائے جائیں تب بھی وہ تکلیف محسوس نہ کرے گا۔

حضرت بشر حافی سے روایت ہے کہ بغداد میں ایک شخص کے ایک ہزار لاٹھیاں ماریں۔ لیکن اس کی زبان سے کراہ تک نہ نکلی۔ میں نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ میرا معشوق میرے سامنے تھا۔ اور یہ سب زخم پھول کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر تو معشوقِ حقیقی کا نظارہ کرے تو کیا حال ہو گا؟ اس نے یہ سُنا اور ایک چیخ اس کے مُنہ سے نکلی۔ اب دیکھا تو رُوح پرواز کر چکی تھی۔

ایک دوسری روایت بھی آپ ہی کی طرف سے منقول ہے کہ ایک بار اوائل عمری میں ہی ابدان کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جذامی دیوانہ پڑا نظر آیا۔ اس کے گوشت کو کیڑے کھا رہے تھے۔ مجھے اس پر رحم آیا۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس نے غصے سے کہا کہ یہ کون مجہول آدمی ہے، جو میرے اور میرے محبوب کے درمیان مخل ہوا۔

سُورۂ یوسف میں ارشاد ہو رہا ہے کہ حضرت یوسف کے دیدار میں مصر کی عورتیں اتنی مبہوت ہو گئی تھیں کہ اپنی اُنگلیاں کاٹ لیں۔ جس زمانے میں مصر میں قحط پڑا تو لوگ حضرت یوسف کی زیارت کرتے اور اس کے اثر سے اُن لوگوں کی بھوک پیاس جاتی رہتی۔

جب انبیاء اور اولیاء کا نور اس قدر مؤثر ہو سکتا ہے، تو انوارِ حقیقی کی شعاعیں کس قدر بلند ترین ہو سکتی ہیں؟ لہٰذا اگر کوئی شخص خداوند عالم کے نور سے بے خبر ہو جائے تو دنیا والے کیوں تعجب کرتے ہیں۔

(واقعہ) ایک شخص جنگل میں رہا کرتا تھا، وہ ہر گھڑی خداوند عالم کے حکم پر رضامندی ظاہر کرتا، اور کہہ دیتا کہ میرے ان تمام کاموں میں خدا کی طرف سے بھلائی رہی ہے۔ اس کے پاس ایک کُتّا۔ ایک مُرغ صبح کو بیدار کرنے کے لیے اور ایک گدھا باربرداری کے لیے تھا۔ ایک دن ایک بھیڑیا اس گدھے کو پھاڑ گیا۔ اس نے شکر خدا ادا کیا۔ اور مُرغ کو کتّے نے پھاڑ دیا۔ اس نے پھر شکر ادا کیا۔ آخر میں کتّا بھی کسی بیماری میں مرگیا۔ اس نے پھر شکر ادا کیا۔۔ اس کے اہل وعیال نے کہا کہ ہم لوگوں کی غذا اور خوراک کا ذریعہ یہ چیزیں تھیں اور تم ہر بات میں خدا کا شکر ادا کرتے ہو۔ ان لوگوں نے شکایت کی۔ اسی روز رات کو قریب کے لوگ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہوگئے اور ان کا مال واسباب چوری ہوگیا۔ لیکن یہ لوگ خاموشی کی وجہ سے بچ گئے۔ چونکہ مُرغ اور کُتّے کی آوازوں نے اس روز لوگوں کو محفوظ کرلیا۔ تب اس مرد باخدا نے کہا کہ دیکھو ہر کام میں مصلحت خداوندی ہوتی ہے۔ وہ ہر کام اپنے بندوں کے لیے اچھا کرتا ہے۔

(واقعہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا جسم قطعی طور سے مفلوج ہوچکا ہے اور آنکھیں بھی جاتی رہی ہیں۔ لیکن شکرِ خدا میں مشغول ہے۔ کہ بار الہا تو نے بہت نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ کون سی نعمت ملی ہے، اس نے کہا کہ معرفت، جو ہزاروں کو نصیب نہ ہوسکی۔ حضرت عیسیٰ اس کے پاس بیٹھ گئے اور دستِ شفقت اس کے جسم پر پھیرا۔ وہ بالکل تندرست ہوگیا۔ اور اس کے بعد سے ہمیشہ آپ کے ساتھ عبادتِ خدا میں مشغول رہنے لگا۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ خداوند عالم کی معرفت میں اتنے مدہوش ہوگئے تھے کہ لوگوں نے دیوانہ سمجھ کر پاگل خانے میں ڈال دیا تھا۔ ایک بار کچھ دوست آپ سے ملنے گئے تو آپ نے پتھر مارے اور کہا کہ اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری تکالیف پر صبر کرتے۔

رضائے الٰہیہ کے متعلق دُوسرا عقیدہ

دُوسرا نظریہ رضائے الٰہی کے متعلق ایک گروہ کہتا ہے کہ رضائے الٰہی پر ثابت قدمی کی شان یہ ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ ہو، اس پر شکر کرے، اور زیادہ کے لیے دعا نہ کرے۔ اگر گناہوں کی تاریکیاں دیکھے، تو وہاں کی مکدر فضاؤں سے نہ گھبرائے۔ اس لیے کہ وہ بھی من جانب اللہ ہوتی ہیں۔ گناہوں اور وباؤں کی جگہوں سے پرہیز نہ کرے۔ کیونکہ یہ قضائے الٰہی سے روگردانی ہوگی۔

مصنفِ کتاب کی رائے لیکن یہ لوگ بھی غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود دُعا مانگتے اور دوسروں کو دعا مانگنے کے لیے حکم دیتے۔ چونکہ دعا کرنا عبادت کی بنیادوں کو استوار کرتا ہے اور دُعا کے ذریعہ انسان میں انکساری اور عجز کی خوبی پیدا ہوتی ہے اور دُعا ومناجات صفاتِ نیک میں شامل ہیں

جس طرح آدمی بھوک میں روٹی کی تلاش کرتا ہے اور پیاس میں پانی کی ۔ اسی طرح بلاؤں کے رد ہونے کی دُعا مانگنا بھی رضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہے ـــــ بلکہ جس کام کو خود خداوند عالم منع فرما رہا ہے، اس کام سے توبہ استغفار یا نجات چاہنا کس طرح رضا کے خلاف ہو سکتا ہے ۔ اس لیے کہ گناہوں کو دیکھ کر خاموش رہنا بذاتِ خود ایک گناہ ہے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی گناہوں کو دیکھ کر خاموش رہتا ہے، وہ خود بھی گناہ میں شریک ہے ۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا کہ اگر کوئی بے گناہ مشرق کی سمت قتل کر دیا جائے اور مغرب کی طرف کوئی سُن کر اس پر رضامندی کا اظہار کرے تو وہ اس کے قتل میں شریک ہے ۔

اگرچہ گناہ خداوند عالم کے احکامات کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے دو رُخ ہوتے ہیں

ایک آدمی کی طرف، وہ اس لیے کہ وہ خود صفاتِ الٰہیہ کا حامل ہوتا ہے ۔

اور دوسرا رُخ خداوند عالم کی طرف ہوتا ہے ۔ اس لیے گناہ، تقدیرِ الٰہی اور قضائے الٰہی پر مبنی ہیں ۔ اور وہ اس لیے کہ عالمِ معصیت کو خالی نہیں رہنا چاہیے تھا ۔ اور گناہ پر راضی نہ ہونا خداوند عالم کی محبت کی نشانی ہے ۔ اس لیے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تناقض نہیں ہے ۔ چونکہ خداوند عالم اس پر رضا کا اظہار نہیں کرتا ۔

فرض کرو کہ ایک شخص کا کوئی دُشمن مر جائے، اور وہ اس کے دُشمن سے بھی دُشمنی کرتا ہو، تو وہ خوش بھی ہوگا اور رنجیدہ بھی ـــــ لیکن اس کی خوشی اور رنج دونوں کے اسباب الگ الگ ہوں گے ۔ تناقض اس وقت ہوتا ہے کہ جب دونوں کے اسباب و وجوہ ایک ہوں ۔ یعنی جذبہ خوشی اور جذبہ غم ایک ہی سبب کے ماتحت ہوں ۔

لہٰذا ایسی جگہ سے جہاں گناہوں کی بہتات ہو، کنارہ کشی ہی مناسب ہوگی ۔

خداوند عالم خود ارشاد فرما رہا ہے کہ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (یعنی اے پروردگار تو ہم کو ایسے شہر سے نکال دے جہاں کے لوگ ظالم ہوں)

بزرگانِ دین ایسی جگہوں سے ہمیشہ کنارہ کرتے رہے ہیں، جہاں گناہوں کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہوتی تھیں اس لیے کہ وہاں قہرِ الٰہی سب کو تباہ کر دیتا ہے ۔ اس کے متعلق قرآن مجید شہادت دے رہا ہے ۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ـــــ اگر ایسی جگہ سے ہٹ جائے جہاں نامحرم پر نظر پڑتی ہے تو رضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہے ۔

اسی طرح ایسی جگہ کو چھوڑ دینا بھی بُرا نہیں، جہاں قحط اور کال پڑا ہوا ہو ـــــ لیکن وباؤں مثلاً (طاعون) کی جگہوں کو چھوڑنا منع ہے ۔ کیونکہ اس عمل سے بیماروں کی تیمارداری میں فرق آتا ہے ـــــ لیکن یہ حکم دوسری آفات

اور بلاؤں کے ماتحت نہیں ہے بلکہ ہر مصیبت کے وقت الگ الگ احکامات کا صدور ہوگا، اور اس کے احکامات کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں، لیکن رضائے الٰہی پر سر جھکا دینا ضروری ہے اور آدمی کی نجات اسی میں مضمر ہے۔

دسواں اصول

موت کو یاد رکھنا

موت کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیے

جس آدمی کو موت کا یقین ہے — کہ ایک دن اس کی آغوش میں جانا ہے، اور نکیرین کو دنیا کے تمام کرداروں کے جوابات دینے ہیں اور آخری منزل قبر ہے، قیامت برحق ہے وہ ضرور آخرت کے لیے نیک اعمال میں مصروف رہے گا، اور موت کو ہر وقت یاد کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ (یعنی عقلمند وہ آدمی ہے، کہ جس نے اپنے نفس کو مسخر کر لیا، اور موت کے بعد کے لیے اعمال اکٹھا کیے)

موت کو جتنا آدمی یاد رکھے گا، اتنا ہی اس کے لیے سامان کرنے کی کوشش کرے گا، اور وہ ہی آدمی قبر کو چمن اور باغ سمجھتا ہے، اور موت سے بھاگنے والا آدمی زادِ آخرت سے بے خبر ہو کر دنیاداری میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور قبر اس کو ایک خطرناک گڑھے کی طرح نظر آتی ہے۔ اسی لیے موت کو یاد کرنا بڑی فضیلت کا باعث ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَكْثِرُوْا مِنْ ذِكْرِ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ (اے دنیا کے ایسے لوگو! جو دنیاداری میں پھنسے ہوئے ہو (موت) کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو) اور ارشاد فرمایا کہ اگر چرندے اور پرندے موت کو انسان کی طرح سمجھ سکتے، تو وہ اتنے تازہ نہ ہو سکتے، جیسے کہ اس وقت نظر آتے ہیں۔

بزرگانِ دین موت کو کس طرح یاد کرتے تھے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن میں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ شہداء کے درجات کون پا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جو آدمی دن بھر میں بیس مرتبہ موت کو یاد کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ ایسے ذکر کرو کہ تمھاری یہ خوشیاں اور لذتیں رنج و تکلیف سے بدل جائیں، ان لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ کاہے کا ذکر ہے، آپ نے فرمایا موت!

ایک بار ارشاد ہوا کہ كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا (یعنی مخلوق کے لیے سب سے بڑی نصیحت موت ہے) ایک

عورت نے جناب عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ میرا دل بہت سخت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ موت کو یاد کرنے سے دل رقیق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور جب اس کی حالت بدل گئی تو پھر حاضر ہوئی اور شکریہ ادا کیا۔

حضرت ربیع بن خثیم نے اپنے گھر میں ایک قبر کھودی تھی اور روزانہ کئی بار اس میں جا کر لیٹا کرتے تھے تاکہ موت کو کسی وقت نہ بھول جائیں۔ اور یہ بھی فرماتے کہ اگر ایک ہی ایک لمحے بھی موت کو بھول جاؤں، تو میرے لیے گمراہی کی دلیل ہوگی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص سے موت کو یاد کرنے کے لیے کہا، کہ اس میں دو فوائد ہیں۔ پہلے یہ کہ اگر مصائب اور تکالیف میں رہ کر موت کو یاد کرے گا، تو ایک قسم کا سکون نصیب ہوگا۔ اور اگر ناز و نعم کی زندگی گزار رہا ہوگا، تو عیش و آرام میں تلخ کامیاں پیدا ہو جائیں گی۔

ابو سلیمان دارانی نے اُمِ ہارون سے دریافت کیا کہ تم موت کو پسند کرتی ہو؟ انھوں نے جواب دیا، کہ نہیں! آپ نے فرمایا، کیوں؟ جواب دیا کہ میں جب کسی آدمی کا گناہ کرتی ہوں، تو اس کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتی ہوں، تو اس قادرِ مطلق کے گناہ کرنے کے بعد اس کے سامنے جانے سے کیوں نہ ڈروں؟

موت کو یاد کرنے کے طریقے

موت کو تین طریقوں پر یاد کیا جا سکتا ہے:

پہلے، ان غافلوں کو موت یاد کرنا ہے، جو موت کو سوچ کر اس دُنیا کی آرائش اور عیش و تنعم کے ساز و سامان کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہم سے چھوٹ جائے گا، اور ہم کو موت کا منہ ایک دن ضرور دیکھنا ہے۔ یہ سوچ کر وہ موت سے کراہت کرتے ہیں، اور عبادتِ خدا میں اور بھی غفلت برتنے لگتے ہیں۔

(نوٹ) لیکن اگر دنیا سے آدمی کسی بھی جہت سے نفرت کرنے لگے، تو یقیناً اچھا ہے۔

دوسرے یہ کہ آدمی توبہ کرے، اور اپنے گناہوں کے ڈر سے موت کو یاد کرے، اور گناہوں کو یاد کر کے اور بھی توبہ کرے کہ موت قریب ہے۔ ایسے آدمی کو بہت ثواب ہوتا ہے۔ عموماً تائب موت سے نہیں ڈرتے لیکن جلدی مرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس لیے کہ ابھی پوری طرح گناہوں سے توبہ نہیں کر سکتے۔ اور عبادت کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ ایسے آدمی کا موت کی خواہش نہ کرنا کوئی قباحت نہیں رکھتا۔

تیسرے عارفانِ الٰہی کا موت کو یاد کرنا ہے۔ وہ اس لیے کہ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ موت کے بعد ہی دیدارِ الٰہی ہو سکتا ہے، اس سے پہلے نہیں — لہٰذا اپنے محبوب کے دیدار کا ہر وقت شوق غالب رہنا چاہیے۔ اور اسی لیے اس کو ہر وقت موت کا خیال رہتا ہے۔

جیسا کہ حضرت حذیفہ نے موت کے وقت فرمایا تھا، کہ حَبِیْبٌ جَآءَ عَلٰی فَاقَۃٍ (یعنی دوست آیا

اور وقت ضرورت آگیا) اور بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ میری موت کو آسان کر دے، تاکہ تیرے دیدار سے راحت نصیب ہو سکے۔

اس کے بعد بھی ایک اور اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ وہ یہ کہ نہ آدمی موت سے بیزار ہوتا اور نہ اس کی تمنائیں اس کو ستاتی ہے۔ نہ وہ تاخیر چاہتا ہے نہ جلدی، بلکہ راضی بہ رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ اپنے آپ کچھ سوچتی ہی نہیں۔ وہ تسلیم و رضا کے درجات کو حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہ درجہ اس وقت ملتا ہے۔ جب کہ موت تو یاد رہے لیکن ہر وقت موت کا تصور آنکھوں کے سامنے نہ رہے۔ اس وجہ سے کہ اس کو یہاں بھی خداوند عالم کے مشاہدات ہوتے ہیں۔ وہ بہر حال اس کی یاد میں مستغرق رہتا ہے۔ اس کے خیال میں دنیا و آخرت ایک درجہ رکھتی ہیں لہٰذا وہ مرے یا زندہ رہے۔ دونوں چیزیں اس کے لیے برابر ہیں۔

موت کا تصوّر حقیقی معانی میں کیسے دل نشین کیا جا سکتا ہے

دُنیا کے لوگوں کے دلوں میں دُنیا داری اتنی سرایت کر چکی ہے کہ باوجود اس کے کہ لوگ موت کو یاد کرتے ہیں، مگر اس کا اثر اُن کے ذہن نشین نہیں ہو پاتے۔ لیکن موت ایک زبردست ترین مرحلہ ہے اور ایک خطرناک منزل —— اس لیے لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور تسبیح و عبادت میں بھی حقیقی لطف نہیں اٹھا سکتے ——

لہٰذا اس کے ذہن نشین کرنے کا طریقہ یہ ہے —— کہ

موت کو ذہن نشین کرنے کا پہلا طریقہ

آدمی گوشہ نشینی اختیار کرے، اور تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے کی طرف مشغول ہو، اور چند لمحات کے لیے یہ سوچے کہ موت آج ہی آجانے کے امکانات ہیں —— لہٰذا اے دل! اگر تجھ کو کسی اندھیری کوٹھڑی میں ڈال دیا جائے، تو کیا خبر کہ وہاں کیا ہوگا۔ کہیں کنواں ہوگا۔ کہیں خار دار پتھر ہوں گے اور تو ان سے ٹکرائے گا اور مارے دہشت کے تیرا پتہ پھٹ جانے کے امکانات ہیں —— اس تصور کو سامنے رکھے اور سوچے کہ موت کے خطرات اس اندھیری کوٹھڑی سے کم نہیں ہو سکتے —— لہٰذا اے دل! تو موت سے کیوں غافل ہے؟

دُوسرا طریقہ۔ اس سے بہتر اور بھی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ —— اپنے ہی سامنے کے ایسے لوگوں کو یاد کرے، جو کل تک سامان عیش و راحت کے ساتھ بڑی بڑی باشوکت عمارتوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ بڑے بڑے خدم و حشم سے اُن کی سواریاں سرِ عام نکلتی تھیں، اور ایک لمحے میں موت کے پنجے نے اُن کو آدبوچا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے رُخصت ہو گئے۔ اس کے بعد —— اب وہ قبریں ہوں گے۔ اُن کے اعضاء میں تعفّن پیدا ہو گیا ہوگا۔ اور تمام عضو ایک دوسرے سے الگ ہوں گے۔ ان کے جسم کو جس پر کبھی چیونٹی نہ رینگتی تھی، آج سینکڑوں کیڑے پیٹے ہوئے اپنا لقمہ بنا رہے ہوں گے —— اُن کا خود تو وہاں یہ حال ہوگا،

لیکن یہ اُن کے بعد اُن کا مال ـــــ بڑی شان و شوکت کے ساتھ آپس میں مل بانٹ لیا، اور خوشی کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ اُن کی عورتیں دوسروں کی آغوش کی زینت ہیں۔ اور اب ان کو یاد تک نہیں کرتیں۔ اسی طرح اور لوگوں کا تصوّر کرے۔ اور اُن کی غفلتوں کو یاد کر کے سبق حاصل کرے۔

اُن لوگوں کے اعمال کو یاد کرے کہ زندگی میں انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ اور ان کا تدارک کر لیا۔ پھر اُس طرف کا رُخ تک نہ کیا، بلکہ سینکڑوں تکالیف برداشت کرتے۔

بعض لوگ، ایسے تھے کہ وہ اپنی ذات سے اتنے بے خبر تھے کہ کپڑے کو کبھی کفن کی حیثیت سے نگاہ نہ کی۔ اس کے بعد اپنے متعلق سوچے کہ میں ابھی یہاں موجود ہوں، اور میرے پاس وقت ابھی ہے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ فَاِنَّ السَّعِیْدَ مَنْ وَّعِظَ بِغَیْرِہٖ (یعنی نیک وہ ہے کہ جو دوسروں کے اعمال سے نصیحت حاصل کرے) اس کے بعد تصوّر ہونا چاہیے کہ یہ میرے ہاتھ، پیر، آنکھیں، ناک، کان، سب کچھ ایک دن، ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ کر الگ الگ ہو جائیں گے، جن کی آج میں دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ کل انھیں کو کیڑے کھا رہے ہوں گے۔ اور ایک مُردار لاش کی طرح قبر میں بے حس و حرکت پڑا ہوں گا۔

اس قسم کے تصوّرات کم از کم روزانہ ایک گھنٹے کے لیے ذہن میں آنا چاہئیں۔ تصوّرات سے یقیناً دل پر کچھ نہ کچھ اثرات ہوتے ہیں۔ ورنہ آدمی "موت" سے قطعی بے خبر ہوتا ہے ـــــ اسی کے متعلق ایک بار آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا۔ کہ تشییع جنازہ کرنے والے لوگ، مرنے والے کو خاک میں ملا کر واپس آتے ہیں۔ اور اس کی میراث کو آپس میں تقسیم کر کے لاپرواہی سے کھاتے ہیں۔ اور اپنے متعلق نہیں سوچتے کہ ہم بھی کبھی وہاں جا کر واپس نہ ہوں گے۔

سینکڑوں آدمی ایسے ہیں کہ جو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی موت کو یاد نہیں کرتے ـــ اور زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگ دُنیا سے، بڑی بڑی اُمیدیں لگاتے ہیں، جن کی وجہ سے انھیں زندگی سے پیار ہو جاتا ہے۔ اور وہ موت سے اُن کا دم گھٹنے لگتا ہے۔

اُمیدوں کا بڑھانا اِنسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے

موت کو یاد کرنا ہی تمام نیکیوں کی بُنیاد ہے

ایسا آدمی جو اپنی زندگی کے متعلق یہ تصوّر کر رہا ہو، کہ اس کو ابھی زندہ رہنا ہے۔ وہ نیک کاموں سے الگ ہی رہتا ہے۔ اس لیے کہ اس کو بار بار یہ تخیّلات ہوتے ہیں کہ زندگی کافی ہے۔ بڑھاپے میں نیکیاں کر کے موجودہ زندگی کا تدارک ہو جائے گا۔ اور اسی طرح مست ہو کر زندگی گذارتا ہے، اور جو آدمی موت کو ہر وقت خیال کرتا ہے کہ ابھی آ سکتی ہے، وہ اس قسم کی غفلت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ موت کو یاد کرنا ہی تمام نیکیوں کی بُنیاد ہوتی ہے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک بار نصیحت فرمائی کہ صبح کو جب آنکھ کھُلے، تو شام تک یہ سوچ کہ شاید موت آجائے۔ اور جب سونے کے لیے رات کو لیٹ جائے تو صبح تک اُمید نہ کر۔ اپنی تندرستی سے بیماری کو یاد کر، کچھ نہیں معلوم کہ خدا کی مشیت میں کیا ہے اور تیرے لیے کیا مقدّر کر دیا گیا ہے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کوئی چیز خریدی، تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہاں! اسامہ کو اپنے جینے کی ایک ماہ تک اُمید ہے۔ وہ سامان خرچ اکٹھا کرتا ہے۔ لیکن مجھے اپنی زندگی کے متعلّق خبر نہیں کہ کب ختم ہو جائے اور پلک جھپکتے میں سوچتا ہوں کہ آنکھ کھلنے سے پہلے موت سر پر سوار ہوگی۔ اگر آنکھ کھولتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اب آنکھ جھپکانے سے پہلے ہی موت آجائے گی۔ اگر "لقمہ" مُنہ میں رکھتا ہوں تو یہ تصوّر ہوتا ہے کہ حلق سے اُترنے سے پہلے ہی موت آجائے، تو کیا تعجّب ہے؟ —— اس کے بعد زبانِ حال سے یہ بھی ارشاد ہوا کہ اے مُسلمانو! اپنی موت کو ہر وقت یاد رکھو! اس لیے کہ اس نے وعدہ کیا ہے، وہ ضرور پورا کرے گا۔ اور نہ بچ سکوگے!

اِنتہا یہ تھی کہ آنحضرتؐ قضائے حاجت کے بعد فوراً وضُو فرما لیتے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پانی قریب ہے وُضو فرما لیجیے۔ آپؐ نے فرمایا ہو سکتا ہے کہ پانی تک پہنچنے میں رُوح پرواز ہو جائے۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کے اعضا دن بدن ضعیف ہوتے ہیں، لیکن اس کی حرص و ہوس روز بروز جوان ہوتی ہے۔ آدمی کو مال کی تمنّا اور حرص بڑھتی جاتی ہے۔ زندگی کی آرزوئیں دراز ہوتی جاتی ہیں۔

ایک دن آپؐ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ جنّت کی خواہش کرتے ہو؟ سب نے عرض کی، جی حضور! فرمایا کہ موت کو ہر وقت یاد رکھو! اور حرص و تمنّا کو دل سے نکال دو۔ خداوند عالم سے شرم کرو! جیسا کہ حق ہے۔

ایک بزرگ نے اپنے بھائی کو خط میں لکھا کہ دُنیا ایک خواب ہے اور آخرت ہماری بیدار زندگی اور ان دونوں کا درمیانی وقت "موت" —— اور ہم اس وقت صرف تخیلات "پریشان کن" کے عالم میں چاروں طرف دیکھتے ہیں۔

اُمیدیں زیادہ کیوں بڑھ جاتی ہیں؟

درازیٔ اُمید کی بُنیادیں

دو وجوہ کی بنا پر آدمی اپنی زندگی کو طولانی سمجھنے لگتا ہے۔ پہلے جہالت اور بیوقوفی کی بنا پر۔ دوسرے محبتِ دُنیا جب اس کے عقل و ہوش پر پوری طرح مسلّط ہو جائے۔ آدمی پر جب دُنیا کی محبت غالب ہو جائے، تو موت کے وقت گویا کہ اس کی محبوب ترین چیز چھین لی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جو چیز ہم کو محبوب ہوگی، اگر وہ چھین لی جائے تو ظاہر ہے کہ ہم کو کتنا صدمہ

پہنچ سکتا ہے۔

اِنسان موت کو اپنے تصوّرات رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ فطرتاً اپنی آرزوؤں کے خلاف کوئی بات سوچنا نہیں چاہتا۔ وہ سوچتا ہے ام مال و اسباب دُنیا کی رونقیں، اہل و عیال کی رنگ رلیاں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیں گی، اور اسی خوش آیند تصوّر میں اگر کسی وقت ایک دھندلا سا خیال موت کا آ بھی جائے تو اس طرف سے گردن جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے، اور سوچتا ہے کہ ابھی بہت دنوں زندہ رہنا ہے جوانی میں بڑھاپے کو خیال کرتا ہے کہ ابھی دُور ہے، اور بڑھاپے میں دُنیا کے جھگڑوں میں پھنس کر ایسا ٹوٹ ہو جاتا ہے کہ نت نئے دن نئی اُلجھنوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور یہ ہی تصوّر رہتا ہے، کہ اس قضیے کو ہٹاؤں، تو زادِ آخرت تیار کروں۔ اور اسی طرح برابر دن بیت بیت کر ایک دن بغیر سوچے سمجھے موت کا فرشتہ آدبوچتا ہے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہے، کہ اب کیا کروں گا۔

حدیث شریف ہے کہ تم جس چیز کو چاہو، اس سے محبت کرو۔ لیکن دُنیا کی یہ تمام چیزیں تم سے چھین لی جائیں گی۔

اِنسان اس معاملے میں اتنا بھولا ہے کہ وہ ضعیفی کے زمانے کو یاد کر کے موت کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے حالانکہ موت تو جوانی اور عنفوانِ شباب میں بھی آ سکتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں بوڑھے لوگ کم ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے تر لوگ جوانی میں مرجاتے ہیں دوسرے یہ کہ آدمی موت کو اپنے سے بہت دُور سمجھتا ہے، اگرماں ئے کہ موت دُور ہے لیکن بیماریاں تو ہر وقت آدمی کے پیچھے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ اور جہاں بیماری نے آ پھر موت بھی سر پہ منڈلانے لگتی ہے ــــ لہٰذا موت کو بالکل ایسا سمجھے! کہ جیسے آفتاب ہمارے سامنے رہا ہے ــــ اور ہم اس کی طرف جاتے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے آگے ہی رہتا ہے۔

درازئ امّید کا انقطاع

کسی مرض یا بُری عادت کا دفعیہ اس وقت ہی ممکن ہے، جب اس کی اصل حقیقت اور سبب کو سمجھ لیا جائے ــــ لہٰذا اوّل اسباب پر نظر کرے۔ پھر اس کے دُور کرنے کی کوشش کرے۔ اپنی امیدوں کو اسی طرح منقطع کرنے کی کوشش کرے، جو ہم نے دنیا کی دلچسپیوں سے دُور رہنے کے طریقے بتائے ہیں۔

دراصل آدمی اگر دنیا کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو گیا ہے، وہ پھر اپنی امیدوں کو بھی دراز نہیں کرتا اور سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ چند روزہ ہے، اور ایک نہ ایک دن موت ان تمام چیزوں کو مجھ سے چھین لے گی۔

جو آدمی کہ آخرت کو دُور سمجھتا ہے۔ اور اس دُنیا سے اُمید لگائے رہتا ہے، وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ․․․ شہ ․․․ تا ہے اور بیداری کو اس کے عوض مفت میں دے دیتا ہے۔ اِس لیے کہ یہ

دُنیا ایک خواب ہے، اور اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَھُوْا —— (یعنی آدمی اس دُنیا میں سوئے ہیں اور مرنے کے بعد ہی بیدار ہوں گے)۔

آدمی کو یہ یقین کر لینا چاہیے کہ موت اور زندگی اس کے قبضے میں نہیں ہے۔ اور یہ یقین ہونے کے بعد اپنی آخرت کو بڑھاپے پر نہ چھوڑے، بلکہ جو وقت بھی ہے اُسے غنیمت جانے۔

طول اُمید کے مدارج

اُمید مختلف طریقوں پر ہر آدمی کے دل میں جگہ لیے ہے۔ بعض ہمیشہ دنیا میں رہنے کی اُمید لگائے بیٹھے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے کہ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ (یعنی ان میں ایک آدمی ایسا بھی ہے جو ہزار برس تک زندگی کی خواہش کرتا ہے۔

موت کو یاد کرنا بعض اُن میں اس سے کم اور بعض کو بُوڑھا ہونے کی خواہش بھی نہیں، اور بعض کو ایک ماہ کی زندگی کی امید نہیں ہوتی، اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اُن کو ایک دن سے زیادہ زندگی کی امید نہیں ہوتی، اور وہ آئندہ کے لیے کوئی تدبیر نہیں کرتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا ارشاد ہے کہ کل کے لیے رزق کی فکر نہ کرو، اگر کل زندہ رہو گے، تو خداوند عالم رزق ضرور دے گا۔

اور ایک آدمی ان میں ایسا بھی ہے کہ ایک لمحے کی زندگی کی امید نہیں ہے جیسے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کہ آپ پانی تک پہنچنے کے وقفے میں بھی موت کا تصوّر فرماتے اور تیمم فرما لیتے۔

بعض لوگ ہر وقت موت کو یاد کرتے ہیں —— حضرت اسود حبشی رحمۃ اللہ علیہ چاروں طرف دیکھتے بھی جاتے اور باتیں کرتے جاتے۔ لوگوں نے دریافت کیا، آپ چاروں طرف کیا دیکھتے ہیں؟ فرمایا کہ ملک الموت کو دیکھتا ہوں، کس طرف سے آجائے؟

الغرض اس سلسلہ میں لوگوں کے الگ الگ مراتب ہیں۔ جو لوگ ایک ہزار برس زندہ رہنا چاہتے ہیں، اُن لوگوں سے ایک سال کی زندگی کے خواہش مند زیادہ اچھے اور ان سے ایک ماہ کی زندگی چاہنے والے، اور اس کے بعد سب سے بڑے درجات اس شخص کے ہیں جو ہر لمحہ موت کو یاد کرتا ہو۔

ان میں ہر خصوصیت کا حامل اپنے کو کم امیدوں کا حریص سمجھتا ہے۔ لیکن امیدوں کی کوتاہی کی علامت یہ ہے کہ انسان نیک اعمال میں محبت کرے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ پانچ صفات کو پانچ صفات سے سمجھ کر عبادت میں مشغول رہو! جوانی[۱] ضعیفی سے غنیمت ہے۔ تندرستی[۲] کو بیماری سے۔ مالداری[۳] کو فقر سے پہلے۔ آرام[۴] محنت سے پہلے۔ زندگی[۵]

کو موت سے پہلے۔ اور زیادہ تر آدمی تندرستی اور مال کی فراغت کے سبب قہر خداوندی سے مقہور رہتے ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اصحاب میں سے کسی کو غفلت کرتے دیکھتے تو فرماتے کہ موت نزدیک ہے، اب تم شقاوت کرو یا نیکی، وہ تم کو نہ چھوڑے گی۔

اقوالِ بزرگانِ دین

حضرت حذیفہ رحانی فرماتے ہیں کہ روز صبح کی ایک منادی ندا دیتا ہے کہ سفر تیار ہے سفر تیار رہے۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نماز کے لیے دوڑے جا رہے تھے، لوگوں نے کہا کہ نماز کا کافی وقت ہے۔ آپ اس طرح کیوں جا رہے ہیں۔ فرمایا کہ قبرستان کے مُردے۔ شہر کے دروازے پر میرے منتظر ہیں۔ چاہتا ہوں کہ فریضے کو ادا کر لوں کہیں میری نماز نہ رہ جائے، اور موت آ جائے۔

حضرت موسیٰ اشعری آخر عمر میں کافی محتاط ہو گئے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ اپنی ریاضت میں کچھ کمی کر دیجئے۔ فرمایا کہ جب گھوڑے کو مقابلے میں دوڑایا جاتا ہے، تو جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اب میرا بھی آخری وقت ہے جو کچھ کر سکتا ہوں، کر لوں اس لیے کہ موت سامنے آچکی ہے۔

عالمِ موت

دنیا میں انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم ترین اور سخت وقت جان کنی عالم سکرات ہے اگر انسان ایسے وقت دوسروں کی بے بسی سے سبق لے، تو عمر بھر کسی گناہ کی طرف متوجہ بھی نہ ہوگا اور دنیا کا کوئی کام اس کو اچھا نہ معلوم ہوگا۔ اور اس کو موت کا خوف ہر وقت لرزہ براندام کیے رہے گا۔ اس کو یقین ہونا چاہیے کہ ملک الموت کا اس کے پاس آنا ضروری ہے۔ لیکن لوگ غافل ہیں اور کسی وقت بھی نہیں سوچتے کہ کتنا اہم ترین وقت آنا ہے۔

تمام بزرگانِ دین اور علما اس امر پر متفق ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ سخت ترین تکلیف "روح" نکلتے وقت ہوتی ہے۔ اگر آدمی کو "تلوار" ماری جائے تو صرف اسی جگہ تکلیف ہوگی، جہاں تلوار کا زخم لگے گا۔ اس لیے کہ اصل تکلیف جسم کو نہیں ہوتی بلکہ روح کو ہوتی ہے اور رُوح تمام جسم میں رواں ہوتی ہے۔ لہٰذا تلوار کا زخم جہاں لگا ہے۔ وہاں جتنا روح کا حصہ ہے۔ اتنی ہی تکلیف بھی ہوگی۔ اور اگر آدمی کو آگ میں ڈال دیا جائے تو چونکہ تمام جسم میں آگ لگتی ہے اور رُوح پورے طور پر تکلیف محسوس کرتی ہے۔ لہٰذا اذیت زیادہ ہوتی ہے۔ اب یُوں سمجھا جائے کہ انسان کی ہر ہر رگ پے میں روح موجود ہے اور قبض رُوح کے وقت ایک ایک رگ و ریشے سے نکالی جاتی ہے تو کتنی سخت تکلیف ہوتی ہوگی۔ آدمی عالم سکرات میں اتنا مدہوش اور بے خبر ہو جاتا ہے کہ فریاد و آہ بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس تکلیف کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس کے اوپر بیتی ہو

دوسرا نہیں جان سکتا۔ یا پھر وہ اولوالعزم انبیاء اس کو محسوس کرتے ہوں گے جنھوں نے اپنی معرفت سے اس کو سمجھ لیا ہوگا۔ جس طرح :

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ میرے لیے دُعا کرو کہ میری مشکل آسان کر دے کہ میں قبض رُوح سے اتنا ڈرتا ہوں کہ میں مرنے کے قریب ہو جاتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عالمِ سکرات میں فرمایا کہ اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَکَرَاتِ الْمَوْتِ۔ (یعنی اے پالنے والے محمدؐ پر موت کو آسان بنا دے)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عالمِ سکرات میں جس کو تکلیف کم ہوتی ہے۔ اس کے درجات بھی کم ہیں۔ اس لیئے کہ میں نے خود آنحضرتؐ کو عالمِ سکرات میں دیکھا ہے کہ آپ کی ہر ہر رگ سے رُوح کھینچی جارہی تھی اور آپ دُعا میں مشغول تھے کہ خداوندا ! میرے لیے قبض رُوح آسان کر دے !

آنحضرتؐ ایک شخص کے پاس عالمِ نزع میں تشریف لے گئے۔ اور فرمایا کہ میں اس کی تکلیف کو سمجھتا ہوں کہ قبض رُوح میں عجیب قسم کا سخت ترین درد محسوس ہوتا ہے۔

ایک صحابی سے روایت ہے کہ تمام اعمالِ حسنہ کے بعد بھی بعض درجات رہ جاتے ہیں۔ ان کا حصول صرف جان کنی کی سختی میں آسان ہوتا ہے۔ اور اگر کافر دنیا میں نیک اعمال رہتا ہے تو اس پر قبض رُوح آسان ہوتی ہے تاکہ خداوند عالم پر آخرت کے لیے اس کا کوئی حق باقی نہ رہ جائے۔

(واقعہ) حضرت موسیٰ کے عالمِ سکرات میں وحی نازل ہوئی کہ تم نے قبض رُوح کی منزل کو کیسے پایا؟ عرض کی یاالٰہا ! ایسا مرغ کہ جو زندہ ہو اور اس کو آگ میں بھونا جائے، نہ وہ مر سکے، نہ زندہ رہ سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے جان کنی کے وقت کی تکلیف دریافت کی تو عرض کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی خاردار شاخ کو آدمی کے جسم کے اندر داخل کر دیا جائے اور بار بار اندر باہر نکالا جائے، تو اس شاخ کا ہر کانٹا اس کی ہر ہر رگ میں چُبھ کر وہیں اُلجھ جائے اور اس کے بعد طاقت کے ساتھ اس کو وہاں سے کھینچا جائے۔

خوف جان کنی

عالمِ سکرات میں جان کنی کی سخت ترین ایذا کے علاوہ تین قسم کا خوف اور بھی آدمی پر غالب ہوتا ہے۔ پہلے یہ کہ گنہگار آدمی کو ملک الموت کی شکل ہی اتنی ہیبتناک معلوم ہوتی ہے کہ عالم جان کنی سے زیادہ وہ اس سے تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے

پہلی ہیبت | حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ نے ایک بار ملک الموت سے کہا کہ میں تمہاری وہ شکل دیکھنا چاہتا

ہوں، جس ہیبت کے ساتھ گنہگار کی قبض روح کے ساتھ جاتے ہو۔ ملک الموت نے عرض کیا، آپ اس کی تاب نہ لا سکیں گے۔ آپ نے پھر اصرار کیا۔ چنانچہ ملک الموت نے اپنی وہ شکل بنالی۔ اس کے بال بڑھے ہوئے اور موٹے موٹے جسم پر لٹک رہے تھے۔ منہ سے آگ کے شعلے اُبل رہے تھے۔ تمام جسم سیاہ تھا اور دھواں اُٹھ رہا تھا۔ آپ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا، تو فرمایا کہ ایک انسان کے لیے تمہاری یہ ہیبت ہی کافی ہے۔

خداوند عالم کے فرماں بردار بندے اس ہیبت کذائی سے ملک الموت کو نہ دیکھیں گے۔

واقعات قبض رُوح حضرت سلیمانؑ نے ایک بار ملک الموت سے فرمایا کہ تم بندوں کے ساتھ عدل و انصاف کیوں نہیں برتتے؟ کسی کے سامنے کسی شکل سے جاتے ہو اور کسی کے سامنے کسی شکل میں۔ ملک الموت نے عرض کیا کہ یہ بات میرے اختیارات سے باہر ہے۔ میرے پاس ہر آدمی کے متعلق احکامات من جانب اللہ موجود ہوتے ہیں، بس اس کے ماتحت عمل کرتا ہوں۔

حضرت وہب سے روایت ہے کہ ایک نیک بندے کے پاس ملک الموت نے آکر کہا کہ میں تم سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔ بزرگ نے کہا کہو، کیا بات ہے؟ جواب دیا کہ میں ملک الموت ہوں۔ بزرگ کا چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا، فرمایا، مرحبا، خوش آمدید، میں مدت سے تمہارا منتظر تھا —— آؤ اور میری روح قبض کرو! ملک الموت کہنے لگے، اگر کوئی حاجت ہو تو پورا کر سکتے ہو۔ بزرگ نے کہا، کہ مجھے موت سے زیادہ کوئی حاجت نہیں۔ چنانچہ وضو کیا اور سجدۂ شکر میں جھک گئے، اور اس حالت میں رُوح قبض ہو گئی ——

یہ مقولہ بھی انھیں سے منسوب ہے کہ:

ایک نہایت مقتدر و معزز، دیانتدار اور ایمان دار بادشاہ تھا۔ ملک الموت اس کی قبض روح کے بعد آسمان کی طرف واپس ہوئے، تو فرشتوں نے دریافت کیا کہ تم کو کسی شخص پر بھی آج تک رحم آیا؟ جواب دیا۔ ہاں۔ ایک عورت کے ایک صحرائے میں لڑکا پیدا ہوا۔ اور مجھے اس عورت کی قبض روح کا حکم تھا۔ چنانچہ وہ بچہ وہاں بے یار و مددگار رہ گیا۔ اس پر مجھے البتہ بڑا ترس آیا —— فرشتوں نے کہا تمھیں معلوم ہے؟ کہ یہ وُہی بچہ تھا جو آج دنیا کا بے مثال بادشاہ ہوا، اور اس کی رُوح تم نے قبض کی ہے۔ ملک الموت کی زبان سے بے ساختہ یہ جملے نکل گئے۔ سُبْحَانَ اللَّطِيْفُ لِمَا يَشَاءُ۔

ایک صحابی کا مقولہ ہے کہ شعبان کی پندرھویں تاریخ کو سال بھر کی فہرست ملک الموت کو دے دی جاتی ہے کہ فلاں فلاں کی رُوح قبض کرنا ہے۔ حالانکہ وہ ہی لوگ اس وقت عجب عجب رنگ رلیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ اب خدا کے یہاں مُردوں کی فہرست میں آچکے ہیں۔

ان واقعات سے صرف موت کو یاد دلانا مقصود ہے۔

دوسری ہیبت دوسری ہیبت اُن فرشتوں کی ہوگی جو آدمی پر مسلط رہتے ہیں —— حدیث میں وارد ہوا ہے کہ موت کے وقت وہ فرشتے آدمی کو نظر آنے لگتے ہیں اور اگر وہ فرماں بردار بندہ ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا اور اگر گنہگار رہتا ہے تو کہتے ہیں کہ لَا جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا (یعنی تو نے کوئی اچھا کام نہیں کیا) اس وقت اس کی آنکھیں پھٹنے لگتی ہیں۔

تیسری ہیبت تیسری ہیبت اس وقت پیش آتی ہے۔ جب آدمی جانکنی میں اپنی جگہ (جنت و دوزخ میں سے ایک) کو دیکھتا ہے۔ اس وقت ملک الموت فرماں بردار بندے سے کہتے ہیں کہ اے نیک بندے تیری جگہ بہشت ہے اور گنہگار سے کہا جاتا ہے کہ تو خدا کا دشمن ہے اور دوزخ تیرا گھر ہے۔

ان تینوں ہیبتوں کے اثرات جان کنی کی تکالیف سے بھی دوگنا ہوتے ہیں اور اس کے بعد آخری منزل قبر کی ہوتی ہے، جہاں ان تکالیف اور خطرات سے کہیں زیادہ ہیبت ناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ اس کے سامنے یہ دنیوی تکالیف اور خطرات کچھ بھی نہیں۔

قبر کی باتیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مُردے کو قبر میں دفن کرتے ہیں تو قبر سے آواز آتی ہے کہ اے شخص! تو کتنا غافل تھا کہ تو میرے سینے کو عمر بھر بے دردی سے روندتا رہا۔ حالانکہ تو جانتا تھا کہ تیری آخری منزل میں ہوں اور میرے اندر کیڑوں کی پناہ گاہیں ہیں۔ میں رنج و تکلیف کی جگہ ہوں۔ میں وہ ہیبتناک مقام ہوں جہاں صرف تاریکیاں ہیں —— لیکن تُو نے کبھی نہ سوچا —— اگر آدمی نیک ہوتا تو اس کی طرف سے فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اے زمین! یہ بندا خدا کا ہے اور ہمیشہ عبادات میں مشغول رہا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ادا کرتا رہا۔ زمین جواب دیتی ہے کہ ہاں، تو میں اس کے لیے ایک نو بہار چمن کی مثل ہوں میں اس کے لیے جنت ہوں —— آ —— اور آرام کر! اس کے بعد اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔

ایک حدیث میں اس طرح روایت ہے کہ مُردے پر جب فشار قبر ہوتا ہے تو برابر کی قبر والے کہتے ہیں کہ ہم تو تجھ سے پہلے یہاں آ گئے تھے، لیکن تو نے ہم سے عبرت حاصل نہیں کی۔ تجھ کو ہم سے زیادہ موقع ملا۔ مگر تو نے غفلت میں گنوا دیا۔ اسی طرح چاروں طرف سے اس کو ہیہات ہیہات کی آوازیں آتی ہیں کہ تو نے وقت کی قدر نہ کی۔

حدیث میں ہے کہ جب نیک بندے کو قبر میں اُتارا جاتا ہے تو فرشتے اس کو آکر دلاسا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرحبا! آ —— اور آرام کر! اس کے بعد قبر میں قندیلیں روشن کر دی جاتی ہیں اور قبر کو کشادہ کر

دیا جاتا ہے تاکہ وہ وہاں سیر کر سکے۔

ایک اور حدیث ہے کہ جب مُردے کو قبرستان کی طرف لایا جاتا ہے تو لوگوں کے پیر کی آہٹ بار بار سُنتا رہتا ہے۔ لیکن کوئی اس سے بات نہیں کر سکتا۔ جب قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو قبر سے ایک آواز آتی ہے کہ اے شخص! دُنیا میں تو نے میرے بہت سے قصے سُنے ہیں، جس میں میرا قہر اور رحم دونوں تھا۔ اب تو بتا! کہ اپنے ساتھ کیا کیا لایا ہے؟

نکیرین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مُردے کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو دو فرشتے آتے ہیں اُن کی شکلیں بالکل سیاہ ہوتی ہیں اور آنکھیں نیلگوں۔ ان میں ایک کا نام "مُنکر" اور ایک کا نام "نکیر" ہے۔

وہ اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رسول کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں اور خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے ——— فرشتے یہ سُن کر مرحبا! کے نعرے بلند کرتے ہیں اور اس کی قبر کو وسیع کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اب تو ایک دُلہن کی طرح یہاں آرام کر! اب تجھ کو سوائے تیرے محبوں کے اور کوئی نہ جگائے گا۔

لیکن اگر منافق ہوتا ہے تو وہ خدا کی احدیت اور رسول کی رسالت سے بے خبر ہوتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت فرشتے زمین سے کہتے ہیں کہ اس پر فشار کر! زمین دونوں پہلوؤں سے اس کو اتنا بھینچتی ہے کہ اس کی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتی ہیں اور قیامت تک وہ اسی عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب کوئی کافر مرتا ہے تو اس پر دو اندھے اور بہرے فرشتے مسلط ہوتے ہیں اور تا قیامت گُرزوں سے مارتے رہتے ہیں۔ اُن کے گرز ایسے ہوتے ہیں جیسے اونٹ کو پانی پلانے والا ڈول ہوتا ہے۔ وہ فریاد کرتا ہے، الحاح وزاری کرتا ہے۔ لیکن وہ فرشتے نہ سُن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور یوں ہی اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب کا جب انتقال ہوا اور آپؐ نے قبر میں اُتارا تو آپؐ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ آپؐ جب قبر سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ چہرے کی زردی جاتی رہی ہے۔ آپ سے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ میں قبر کے فشار یاد کر رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے بشارت ہوئی کہ زینب کو فشارِ قبر سے معاف کر دیا گیا ——— لیکن باوجود اس کے بھی قبر اس کو اس طرح دبا رہی ہے کہ اس کی آواز تمام جانور سُن رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ کافر کو جب قبر میں اتارا جاتا ہے تو اس پر ننانوے اژدھے مسلط ہوتے ہیں اور ہر ایک کے نو نو سر ہوتے ہیں اور ہر ایک قیامت تک اس کو کاٹتا رہے گا۔

سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قبر دُنیا کی آخری منزل ہے۔ اگر اس میں آدمی بچ گیا تو آخرت کی منازل میں بھی نجات پائے گا۔

مرنے کے بعد منازل کی دشواریاں

قبر اور اس کے بعد کی منازل میں جو خطرناک مقامات آئیں گے وہ قدم قدم پر خوف سے بھرے ہوں گے۔

ان میں سب سے پہلے نفخ سور ہوگا۔ اس کے بعد قیامت کی گرمی کا لاتھا پسینہ۔ اس کے بعد آدمی کے دونوں ہاتھوں میں اس کا نامۂ اعمال، جس کی وجہ سے اس کو شرمندگی اور رُسوائی ہوگی۔ اس کے بعد میزانِ عدالت میں گناہوں کے وزن کا خوف۔ پھر پُل صراط کا دُشوار گزار راستہ۔ دوزخ کا خوف۔ فرشتوں کی ہیبت ناک آوازیں۔ طوق و سلاسل کی جھنکار۔ سانپ بچھو کے خطرات اور اس طرح جسم کے تمام عذابوں کا خوف اور ہیبت ہوگی۔ ہم نے مفصّل طور پر ان تمام منازل کو "احیاء العلوم" میں ذکر کر دیا ہے۔ اور اس کے دلائل، موت کی حقیقت، رُوح کی حقیقت اور مرنے کے بعد کے حالات کو عنوان کتاب میں بیان آچکا ہے، لہٰذا دوبارہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟

آخر میں مرنے والے جن کے حالات بزرگانِ دین نے خواب میں دیکھے ہیں بیان کر کے کتاب کو ختم کر رہے ہیں ——— اس لیے مُردوں کا حال عالمِ بیداری میں معلوم نہیں کیا جا سکتا اور مردوں کے حالات اس عالم سے ہمیں نظر نہیں آسکتے۔

لیکن آدمی ایک خصوصیت کی بنا پر دیکھ سکتا ہے۔ لیکن دُنیا کی مشغولیات اس کے لیے حجاب میں رہتی ہیں۔ اور سوتے وقت وہ اس عالمِ ظاہر کی تفکرات سے بالاتر ہو کر اس باطنی عالم کی سیر کرنے لگتا ہے کہ مردوں کی دُنیا کا حال اس کے سامنے آسکتا ہے۔

اسی طرح مُردے بھی ہمارے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر گناہ کرتے ہیں تو ناراض اور نیک کام کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق تمام احادیث اور اقوال موجود ہیں۔ ان کا بیان کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ عوام کو معلوم ہو جائے کہ مرنے والوں کے حالات ہم کو اور ہمارے ان کو معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کو خواب میں نظر آتا ہے۔ اگر ہم مرنے والوں کو اچھی یا بُری حالت میں دیکھتے ہیں۔ اس سے ہم کو کافی اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد عذاب و ثواب ہوتا ہے اور وہ لوگ بھی ہماری طرح اچھائی یا بُرائی کو تمیز کرتے ہیں۔

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ۔ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ۔ (یعنی جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوئے

اُن کو مُردہ نہ سمجھو! بلکہ وہ زندہ ہیں اور خداوند عالم اُن کو روزی بخشتا ہے، اور وہ اپنے خدا کے فضل سے خوش رہتے ہیں)

عالمِ خواب میں مُردوں کے حالات کی معلومات

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جو شخص مجھ کو خواب میں دیکھے، گویا کہ اُس نے مجھے زندگی میں دیکھا، اس لیے کہ میری شکل میں شیطان نہیں آسکتا۔

روزے کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینا ناجائز نہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اپنی بیوی کا بوسہ بحالتِ روزہ لیا کرتے تھے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرتؐ تنبیہہ فرمارہے ہیں اور ناراض ہیں کہ تو اِس سے پرہیز نہیں کرسکتا، چنانچہ اس کے بعد سے آپ نے عمر بھر اپنی بیوی کا بوسہ نہ لیا۔ اگرچہ یہ امر حرام نہیں۔

صدیقین سے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بازپرس ہوتی ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ، کا مقولہ ہے کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، کو خواب میں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک سال بعد دیکھا کہ آپ آنکھیں مل کر فرمارہے ہیں کہ میں اب فارغ ہوا ہوں اور اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو کام بہت سخت تھا۔

حضرت عباسؓ سے ہی روایت ہے کہ ابولہب کو خواب میں دیکھا کہ آگ میں جل رہا ہے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگا عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن شب دوشنبہ کو عذاب سے رہائی مل جاتی ہے۔ (آنحضرتؐ کی شب ولادت) کیونکہ میں نے اس رات کو آپؐ کی ولادت کی مُسرت میں ایک غلام کو آزاد کیا تھا۔

حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں حقِ خلافت کا فیصلہ

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک بار آنحضرتؐ کو خواب میں دیکھا کہ حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ آئے اور ایک کمرے میں چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ، باہر نکلے اور فرمایا کہ واللہ کہ میں ہی حق دار تھا اور میرے ہی حق میں فیصلہ ہوا۔ کچھ دیر بعد امیر معاویہ بھی نکل آئے اور کہنے لگے کہ خداوندِ عالم نے مجھے بخش دیا۔

کسی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنی زبان سے آہستگی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور جنت مجھے دے دی گئی (آپ ہر کام کو اشارہ سے فرمایا کرتے تھے)

حضرت یُوسف ابن حسین سے کسی نے خواب میں وہاں کا حال دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ میں نے سچّی بات کا مذاق کبھی نہ اُڑایا۔ جس کے بدلے میں خداوندِ عالم نے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائی۔

منصور ابن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز خواب میں عبداللہ بزاز رحمۃ اللہ علیہ سے خواب میں وہاں کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جتنے گناہوں کا میں نے اقرار کیا۔ معاف کر دیے گئے۔ لیکن ایک بار میں

ایک خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر للچایا تھا اور اس سے مجھے شرمندگی تھی کہ خدا کے سامنے اس حرکت کو کیسے بیان کروں۔ چنانچہ اس گناہ کی شرم سے مجھے اتنا پسینہ آیا کہ میرے چہرے کا گوشت گل کر گر پڑا۔

حضرت ابوجعفر صیدلانی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ کو میں نے ایک بار خواب میں دیکھا اس وقت صوفیائے کرام آپؐ کے حضور میں حاضر تھے۔ دو فرشتے آفتابہ لے کر حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے اوّل ہاتھ دھوئے، اس کے بعد اور صوفیوں کے ہاتھ دھلوائے گئے۔ آخر میں طشت میرے سامنے رکھا گیا تاکہ ہاتھ دھو سکوں۔ انھیں میں سے کسی نے کہا کہ یہ اُن میں سے نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ نہ دُھلائے جائیں۔ میں نے عرض کیا یا حضرتؐ! میں اس گروہ سے محبت کرتا ہوں اور یہ روایت حضور سے ہی منسوب ہے کہ محب اس گروہ میں شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے حکم دیا اور میرے بھی ہاتھ دھلوائے گئے۔

کسی نے حضرت زادہ ابن ابی اوفی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ دریافت کیا کہ کون سا عمل افضل ترین ہے۔ فرمایا کہ امید کی کمی اور رضائے الٰہی کے سامنے گردن جھکا دینا۔

حضرت ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بھائی سے خواب میں دریافت کیا کہ وہاں کا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ جس گناہ سے توبہ کرلی وہ معاف ہوگیا اور جس سے استغفار نہ کی وہ معاف نہ ہوسکا۔

حضرت زبیدہ رحمۃ اللہ علیہا کو خواب میں کسی نے دیکھا تو دریافت کیا کہ وہاں کیا گزری؟ فرمایا کہ وہ مال جو مکہ معظمہ کے راستے میں صرف کیا تھا اس کا ثواب تو مالک کو ملا۔ لیکن مجھ کو نیک نیتی کی وجہ سے بخش دیا گیا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں کسی سے فرمایا کہ میں نے ایک قدم پُل صراط پر رکھا اور دوسرا بہشت میں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں کتانی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میرے تمام اعمال رائیگاں گئے۔ لیکن رات کو دو رکعت نماز پڑھا کرتا تھا وہ میری مغفرت کا سبب بن گئی۔

بی بی زبیدہ نے کسی نے خواب میں دریافت کیا کہ آپ پر کیا گزری؟ فرمایا کہ ان چار کلمات نے میری بخشش کرادی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَفْنِیْ بِھَا عُمْرِیْ - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ بِھَا قَبْرِیْ - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَخْلُوْا بِھَا وَحْدِیْ - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَلْقٰی بِھَا رَبِّیْ -

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ خداوند عالم نے مجھے بخش دیا اور یہ بھی فرمایا کہ تو میری رحمتوں کو جانتے ہوئے بھی اتنا ڈرتا تھا۔

حضرت ابوسلیمان رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے خواب میں دریافت کیا کہ آپ پر وہاں کیا گزری؟ جواب دیا کہ میں بخش دیا گیا۔ لیکن دین داروں کی انگشت نمائی نے مجھے بھی نقصان پہنچایا۔

حضرت ابو سعید نے ایک بار شیطان کو خواب میں دیکھا اور لاٹھی اُٹھائی کہ اس کو ماریں۔ لیکن وہ قطعاً نہ ڈرا کسی نے آواز دی کہ اس کو صرف نورِ الٰہی ہی ڈرا سکتا ہے اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔

حضرت صبوحی نے ایک بار شیطان کو خواب میں دیکھا تو کہا کہ تجھ کو انسان سے شرم نہیں آتی؟ شیطان کہنے لگا۔ کہ ان میں کوئی انسان نہیں۔ اگر انسان ہوتے تو اس طرح نہ کھیلتے جیسے بچے گیند سے کھیلتے ہیں۔ انسان وہ ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار دمشق میں آنحضرتؐ کو خواب میں دیکھا کہ حضرت عمرؓ و حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہم کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے تشریف لا رہے ہیں ۔۔۔۔۔ میں اس وقت اپنے سینے پر ہاتھ مار کر ایک شعر پڑھ رہا تھا۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ تیرے اس عمل میں اچھائی سے زیادہ نقصان ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو وفات سے تیسرے دن خواب میں دیکھا۔ ان کا حال دریافت کیا۔ فرمایا کہ پرسشِ اعمال کے وقت جب میں مایوس ہوا تو میرے گناہ بخش دیے گئے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے خواب میں دریافت کیا۔ آپ کا کیا حال ہے؟ فرمایا اچھا ہوں۔ خدا کی رحمت شاملِ حال ہے۔ دریافت کیا عبداللہ ابن مبارک کی کیا حالت ہے؟ فرمایا کہ دن میں دو بار دیدار سے شرف اندوز ہوتے ہیں۔

حضرت مالک ابن انس کو کسی نے خواب میں دیکھا تو دریافت کیا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ فرمایا کہ ایک جملہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے سُنا کرتا تھا۔ جب وہ کسی جنازے پر نظر کرتے تو فرمایا کرتے تھے سُبْحَانَ اللّٰہِ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ بس اسی جملے کی وجہ سے رحمتیں نازل ہوئیں۔

حضرت حسن بصریؒ کا جس دن انتقال ہوا اس رات کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ آسمان پر مُنادی ندا دے رہا ہے کہ حسن بصری نے خدا کا دیدار کر لیا اور آپ کے لیے جنت کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رات ابلیس کو خواب میں دیکھ کر فرمایا کہ تجھ کو آدمیوں سے شرم آنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا کہ آدمی وہ ہیں جو مسجد شنیزیہ میں گوشہ گیر ہیں، اور اُن کے پاس تک میں نہیں گزر سکتا۔ صبح ہوتے ہوتے آپ مسجد شنیزیہ میں پہنچے اور دیکھا کہ بندگانِ الٰہی سر زانو پر رکھے تفکّر میں مشغول ہیں۔ جب اُن کو آتے دیکھا تو فرمایا، جنید! اِس ملعون کے بہکانے میں نہ آنا!

حضرت عتبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حُور کو خواب میں دیکھا اور چاہا کہ اس کو حاصل کر لیں۔ اس نے کہا خبردار! اس کام سے پرہیز کرو، ورنہ تم مجھ سے الگ کر دیئے جاؤ گے! چنانچہ آپ نے صبح اُٹھ کر دُنیا کو تین طلاقیں کہیں۔ اور فرمایا کہ ہرگز اس دُنیا کی طرف دھیان نہ دوں گا۔

حضرت ابوایوب سجستانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مفسد کا جنازہ دیکھ کر نماز نہ پڑھنے کی نیت سے اپنے کوٹھے پر چڑھ گئے۔ اس کے بعد کسی نے اس مُردے کو خواب میں دیکھا وہ کہہ رہا ہے کہ خداوند عالم نے مجھ پر رحمتیں نازل فرمائیں اور کہنے لگا کہ ابوایوب سے کہہ دینا کہ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ (یعنی اگر خداوند عالم کے خزانے تم کو سونپ دیئے جائیں، تو تم کنجوسی کی وجہ سے کچھ بھی خرچ نہ کرو۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کا جس رات کو انتقال ہوا، اس رات میں کسی نے خواب دیکھا، کہ فرشتے آسمان سے اُتر رہے ہیں۔ دریافت حال پر جواب ملا کہ آج داؤد طائی کا انتقال ہوا ہے۔ جنت کو اس کے لیے آراستہ کیا جا رہا ہے۔

حضرت ابوسعید شجام رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ میں نے ایک بار سہیل صعلوکی کو خواب میں دیکھا۔ دریافت کیا کہ خواجہ! کیا حال ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ خواجہ کے لفظ کو چھوڑ دو! یہ سب کام بیکار ہو گئے۔ صرف وہ مسائل کام آئے جو میں بڑھیا عورتوں کو کبھی کبھی بتایا کرتا تھا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بار ایک ربیع سلیمان نے جواب میں دیکھا۔ دریافت حال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہاں ایک مرصع کرسی دی گئی اور موتی نچھاور کئے گئے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک بار سخت مسئلے میں میں حیران تھا کہ رات کو ایک شخص نے خواب میں کہا کہ اے ادریس! یہ دعا پڑھ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا وَّلَا اَسْتَطِيْعُ اَنْ اٰخُذَ اِلَّا مَا اَعْطَيْتَنِيْ وَلَا اَنْ اَتَّقِيَ اِلَّا مَا وَقَيْتَنِيْ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ فِيْ عَافِيَةٍ۔

چنانچہ صبح کو اُٹھا اور یہ دعا پڑھی اور سب کام حل ہو گئے۔ لہٰذا ہر آدمی کو یہ دعا یاد کر لینا چاہیے۔

ایک شخص نے عتبۃ الغلام کو خواب میں دیکھا۔ دریافت کیا، وہاں کیا گزری؟ فرمایا کہ اس دعا کی برکت نے تمام گناہ بخشوا دیئے جو تیرے مکان کی دیوار پر لکھی ہے۔ جب بیدار ہوا، تو دیوار پر، انہیں کے ہاتھ سے یہ دعا لکھی پائی۔ دعا یہ ہے:

يَا هَادِيَ الْمُضِلِّيْنَ وَيَا رَاحِمَ الْمُذْنِبِيْنَ وَمُقِيْلَ عَثَرَاتِ الْعَاثِرِيْنَ اِرْحَمْ عَبْدَكَ ذَا الْخَطَرِ الْعَظِيْمِ وَالْمُسْلِمِيْنَ كُلَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ وَاجْعَلْنَا مَعَ الْاَحْيَاءِ الْمَرْزُوْقِيْنَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ مِنَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِيْنَ اٰمِيْنَ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ۔

موت کے متعلق یہ تمام حالات اور واقعات ہمارے خیال میں کافی ہیں۔

ختمِ کتاب و دُعا

اب ہم موت کے بیان پر ہی اپنی کتاب کو ختم کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ برادرانِ اسلام اِس کا مُطالعہ کر کے فائدہ حاصل کریں گے ۔ اور ہم کو دُعا خیر سے یاد کریں گے ۔ نیز میرے لیے خداوندِ عالم سے اس کے رحم وکرم کی درخواست کریں گے ۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی بات سہواً اس کتاب میں رہ گئی ہو یا کوئی کمی واقع ہوگئی ہو، یا کہیں خُدانخواستہ تکلّف وظاہرداری (غیر ارادی طور پر) عمل میں آگئی ہو، تو خداوندعالم کی رحمتِ کاملہ برادرانِ اسلام کی دُعاؤں کے باعث مجھ کو معاف فرمائے گی تاکہ اِس خدمتِ اسلام سے محروم نہ ہوسکوں۔ اس لیے کہ دُنیا میں اس سے بڑھ کر بدبختی کیا ہوسکتی ہے ؛ کہ کوئی آدمی دُوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہدایت روشن کرے اور خود گمراہی وضلالت میں رہ جائے اور خداوندعالم کے سامنے شرمندہ ہو۔

نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْهَا وَنَقُوْلُ فِيْ خَاتِمَةِ الْكِتَابِ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَنَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ ۔



احادیث

صحیح بخاری (مکمل)
(عربی اردو)

مولانا سید نائب حسین

نظرثانی : مولانا سید محمد علی خطیب سنہری مسجد

تقطیع ½۷" × ۱۰" ضخامت تقریباً ۲۰۰۰ صفحات

مکمل تین جلدوں میں - مجلد ہدیہ -/۵۱ روپے

جدید رجحانات کے ماتحت ہر پارے کا سرورق الگ کر کے تمام عنوانات کو نئی طرز پر ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں صحیح بخاری کے عہد کا نصف (تیسری صدی ہجری) سے عہدِ حاضر تک کی مفصل و مکمل تاریخ موجود ہے۔ اور بجا طور پر صحیح بخاری کا انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ ½۱۱ سو سال کے بعد صحیح بخاری میں "ہمارا انڈکس" بنیادی حیثیتوں کا مالک ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اب آپ اپنی خواہش کے مطابق ہر حدیث چند منٹ میں تلاش کر سکتے ہیں۔

صحیح مسلم (مکمل)
(عربی اردو)

رئیس احمد جعفری (ندوی)

تقطیع ½۷" × ۱۰" ضخامت ۲۰۶۰ صفحات

ہدیہ مجلد مکمل -/۴۲ روپے

مکمل اردو ترجمہ مع عربی متن اور شرح امام نووی۔

امام مسلم رح کے پندرہ سالہ تجسس اور حصول کمال کا نچوڑ۔

امام مسلم رح کے عادات و اخلاق اور نجی زندگی کا مکمل خاکہ۔

صحیح مسلم کی مفصل و جامع تاریخ اور حدیث نبوی کی اہمیت

الگ الگ عنوانات، مکمل و جامع فہرست، عربی عبارت کے مدِمقابل عام فہم سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ۔ آفسٹ طباعت عکسی، کاغذ گلیز، پائیدار، نفیس جلد۔

مظاہرِ حق (اردو ترجمہ)
شرح مشکوٰۃ شریف

تہذیب و ترجمہ : مولانا قطب الدین

دیباچہ و مقدمہ : عبدالرحمٰن طارق

تقطیع ۱۰" × ۱۴" (بہترین کتابت و طباعت دبیز کاغذ، بھاری سائز)

ہدیہ مکمل چار جلدیں : -/۶۰ روپے

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ وحی الٰہی ہوتے ہیں جو سب صحاح ستہ میں مجتمع ہیں اور مشکوٰۃ شریف مکمل صحاح ستہ کا انتخاب ہے۔ جس کا ایک آنکھ دیکھنا جس کا گھر میں رکھنا۔ جس کا ورد کرنا باعثِ اجر بن جاتا ہے۔

سیرت و سوانح

سیرۃ النبیؐ کامل

مرتبہ : ابن ہشام

مکمل دو جلدوں میں — ترجمہ : مولانا عبدالجلیل صدیقی

تقطیع ۶½" × ۱۰" - ضخامت ۱۲۷۵ صفحات — -/۴۰ روپے — نظر ثانی : مولانا غلام رسول مہر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت پر ایک مستند اور لازوال اوّلین تصنیف۔ آج تک جتنی بھی سیرت نبویؐ پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ تمام کی تمام اس عظیم و لاثانی کی ماخذ ہیں۔ یہ کتاب نقشِ اوّل ہے۔ اس کے تراجم دُنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور دُنیا کے تمام بڑے مؤرخ اسی کتاب کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔

رحمۃ اللعالمینؐ

قاضی سلیمان سلمان، منصور پوری

ہدیہ : بلا جلد -/۱۷ روپے

تقطیع ۶½" × ۱۰" - ضخامت ۱۳۴۸ صفحات — مجلد -/۲۰ روپے

قاضی صاحب نے اپنی اس مشہور و معروف اور نہایت بلند پایہ تصنیف میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت، تورات، زبور، انجیل اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے حوالہ سے آنحضرتؐ کی بے مثال فضیلت و عظمت پر مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ حصہ اوّل -/۵ روپے حصہ دوم ۷/۵۰ روپے۔ حصہ سوم ۷/۵۰ روپے۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ، خوبصورت گرد پوش۔ مکمل تین جلدوں میں۔

انبیائے قرآن (تقطیع ۶½" × ۱۰")

محمد جمیل احمد ایم۔ اے

قرآنِ کریم کے اُن تمام انبیائے کرام (جن کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے) کے مفصل، جامع، مستند، معیاری احوال اور واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ کتاب کا مطالعہ نہ صرف تاریخی اور علمی نقطہ نظر سے بے حد نفع بخش ہے، بلکہ بقول مولانا احتشام الحق تھانوی فہم قرآن میں بھی کافی ممد و معاون ثابت ہوگا۔

حصہ اوّل — ضخامت ۳۸۸ صفحات — قیمت -/۱۲ روپے

حضرت آدمؑ سے حضرت یوسفؑ تک کے حالات اور سوانح (از ابتدا تا ۱۸۱۷ ق م) ۲۲ نقشے اور شجرے بھی شامل ہیں

حصہ دوم — ضخامت ۳۴۰ صفحات — قیمت -/۱۲ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔ حیدر آباد۔ کراچی

حضرت ایوبؑ سے حضرت یوشع علیہ السلام تک کے حالات کا جائزہ (سولھویں صدی قبل مسیح سے چودھویں صدی قبل مسیح سے چودھویں صدی قبل مسیح تک) ۲۲ نقشوں اور طغروں سے مزین۔

حصہ سوم — ضخامت ۵۹۶ صفحات — قیمت-۱۵ روپے

حضرت شمویلؑ سے حضرت عیسٰیؑ تک کے حالات (گیارھویں صدی قبل مسیح تا ۳۳ء) ۳۲ نقشے اور طغرے بھی شامل ہیں۔

حضرت علی ابنِ ابی طالب

ارمان سرحدی

تقطیع ۱/۲ ۶" × ۱۰" - ضخامت ۴۰۸ صفحات — قیمت -/۱۱ روپے

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی سیرت اور حیات مبارکہ جزوی و کلی مستند حالات معہ حوالہ جات تواریخ و کتب احادیث مندرج ہیں۔ امیرالمومنینؑ کی ولادت، عہد طفولیت، دعوتِ اسلام کے وقت آپ کی شمولیت، ہجرت، کارنامے جہاد اسلامی اور فتوحات، زندگی کے نمونے، اخلاق و عادات، ادب، شاعری، فلسفہ، علم کلام اور تصوف سے متعلق آپ کے ارشادات گرامی اور آپ کی دعائیں۔ اصول اسلام اور عامۃ المسلمین کی خدمات کے واقعات۔ نیز آپ کے منتخب خطبات و خطوط کے اقتباسات یہ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ انشاءاللہ اس کتاب سے تشنگان معرفت مستفیض ہو سکیں گے

انوارِ انبیاء

ادارۂ تصنیف و تالیف

تقطیع ۱/۲ ۷" × ۱۰" - صفحات ۶۵۶ — قیمت -/۱۲ روپے

انبیائے اولوالعزم کی سوانح مبارکہ

قرآن کریم کی روشنی میں انبیائے کرام کے حالات زندگی اور اقوالِ زریں کا منفرد مجموعہ علاوہ قرآن مجید کے بائیبل وغیرہ جیسے صحیفوں سے بھی بعض استدلال پیش کیے گئے ہیں۔ انبیاء کرام کے مکمل و مستند حالات کا نچوڑ طباعت بذریعہ آفسٹ کاغذ سفید

انوارِ اولیاء

سید رئیس احمد جعفری

تقطیع ۱/۲ ۷" × ۱۰" ضخامت ۶۰۰ صفحات — قیمت : -/۱۲ روپے

بزرگانِ دین کے سیرت و کردار کا انسائیکلوپیڈیا۔ پہلا حصہ تذکرۃ الاولیاء مصنفہ حضرت فریدالدین عطار سے ماخوذ ہے اور دوسرے تیسرے حصے میں پاکستان و ہندوستان کے تمام مشہور اولیائے اللہ و صوفیائے کرام کے حالات و تعلیمات بالتفصیل درج ہیں۔ درحقیقت یہ کتاب نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے۔ تمام اولیاء کرام کے حالات یکجا قلمبند کر دیئے گئے ہیں۔